سالنامہ

# بیسویں صدی

دہلی

Annual N

**Biswin Sad**

DELHI

2
RUPEES

## ★ میں ہوں جوش ملسیانی

فصیح الملک حضرت داغ کے تقریباً دو ہزار شاگردوں میں اب ایک میں ہی اپنی سخت جانی کی وجہ سے میدانِ حیات میں ڈٹا ہوا ہوں۔ نا طق گلاؤٹھی میرے رفیقِ سفر تھے۔ تھوڑے دن ہوتے وہ بھی چل دئے۔ اِس سانحہ سے یہ ظاہر ہے کہ عظمت مآب خاندانِ داغ کے دل کش نغمہ زار میں اُدبی رباب کی آخری تان اب مجھ پر ٹوٹے گی۔

عمر کا ۹۰ واں سال گزر رہا ہے۔ پہلے تیس سال ملسیاں تحصیل نکودر میں بسر ہوئے۔ ۱۹۱۵ء سے مستقل سکونت نکودر میں ہے۔ ملسیاں کو میں خراب آباد کہا کرتا ہوں۔ اِسی سلسلے میں ایک غزل کا بھی ہے ؎ —— کیا کروگے جوشؔ تم جاکر وہاں ملسیاں اب بھی خراب آباد ہے

۷۰-۷۲ سال اُردو کی خدمت کی ہے۔ کلاسیکل شاعری میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بہت پابندیوں کے باوجود اردو ہر قسم کے مضامین نظم کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دو سو سے زائد مجھ سے اِصلاح لیتے رہے ہیں جن میں سے زیادہ تر ہندوستان میں ہیں اور ایک خاصی تعداد پاکستان میں ہے۔ تصانیف میں شرحِ دیوانِ غالبؔ اور آئینۂ اِصلاح بہت مقبول کتابیں ہیں۔ شرحِ دیوانِ غالبؔ پانچ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ فارسی کی ایک گرائمر دستور القواعد کے نام سے تقسیمِ ملک سے پہلے شائع ہے۔ فردوسِ گوش، جنون و ہوش اور بادۂ سرجوش تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جوشؔ ملسیانی

[illegible] ایک [illegible]
[illegible] کے لحاظ سے ایرانی ہوں!
[illegible] ۱۹۰۷ء میں لاہور میں پیدا ہوا۔ ۱۹۴۷ء
سے ہندوستان میں مقیم ہوں اور ۱۹۶۱ء سے
۱۹۶۴ء تک ایران میں کنور جگن دہلی کی [illegible]
میں مصروف رہا ہوں۔ اردو فارسی اور تاریخ میں
ایم اے کرنے کے بعد ایک مدت تک پنجاب کے
گورنمنٹ ڈگری کالجوں میں لڑکوں کو پڑھاتا رہا۔
بعد ازاں حکومتِ ہند نے دانشگاہِ تہران
سے ڈاکٹریٹ کرنے کے لئے وظیفہ عطا کیا تو
"شعرِ فارسی در ہند" کے عنوان سے ایک
مبسوط تحقیقی مقالہ جدید فارسی میں لکھ مارا۔ خوش
قسمتی سے اسے ڈاکٹر سعید نفیسی، ڈاکٹر ذبیح اللہ
صفا اور ڈاکٹر رضا زادہ شفق جیسے ایرانی علماء
نے پسند کیا اور "درجۂ دکترای زبان و ادبیاتِ
فارسی" (ڈی لٹ) کی سند میرے نام کے ساتھ
دُم چھلے کے طور پر تجویز کی گئی۔ اب پانچ سال سے
بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی
میں بحیثیت استاد مقیم ہوں اور شب و روز
زندگی کی تمام تر لذتوں سے ہمکنار ——— ممکن ہے میرا یہ جملہ بہت سے پڑھنے والوں کو غیر معمولی معلوم ہو۔ لیکن حقیقت یہی
ہے کہ زندگی نے ہمیشہ مجھ سے قابلِ رشک سلوک کیا ہے کامیابیوں اور خوش نصیبیوں کے موتی میرے قدموں پہ نچھاور کئے ہیں
حسن و عشق کے "انڈر گراؤنڈ ٹورنامنٹ" میں بھی "چیمپین" رہا ہوں۔ اسی سلسلے میں ایک عدد بیوی کا شوہر اور تین عدد لڑکوں کا ڈیڈی
ہوں۔ ادب، تاریخ، دست شناسی اور موسیقی سے گہری دلچسپی رکھتا ہوں۔ لیکن اگر شکار کی بات درمیان میں آ جائے تو دوسری کسی
سرگرمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شاداب وادیوں، سرسبز مرغزاروں اور رومان آفریں کوہساروں کی سیر و سیاحت کے دوران آہوانِ
صحرائی اور مرغابیانِ دشتی کا شکار بھی کرتا ہوں اور فکرِ شعر میں بھی مصروف رہتا ہوں۔ میرے خیال میں فکر و نظر کی شادابیاں مجھے اسی ماحول سے
حاصل ہوتی ہیں اور میرا جی چاہنے لگتا ہے کہ زندگی کا سارا حسن میرے کلام میں سمٹ آئے۔ شعر کے اسلوب اور مضمون دونوں میں ندرت
پسند ہوں۔ غزل میری محبوب صنفِ سخن ہے، اپنے دلی محسوسات اور عینی مشاہدات کو تخیل کی رنگ آمیزی سے اسی لباس
میں پیش کرنا پسند کرتا ہوں۔ "ایران صدیوں کے آئینے میں" اور سلسلۂ معتق کے "محزونِ بنارس" میری جدید ترین نثری تصانیف ہیں۔ اوّل الذکر پر
مارچ ۱۹۷۹ء میں حکومت یوپی نے بارہ سو روپے کا "اکبر الٰہ آبادی انعام" بھی دیا ہے۔ آج کل مجموعۂ کلام کے ساتھ ساتھ "اردو ادب پنجاب میں" کی ترتیب
[illegible] میں مصروف ہوں
[illegible]

## ★ ملیے ہوئے ضیا فتح آبادی

ٹن ٹن ٹن ٹن ———" ہیلو۔ میں مہرلال سونی بول رہا ہوں" ——— "جی ——— سوری ——— رانگ نمبر"

ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ——— "جی"——— "میں ضیاؔ فتح آبادی صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں" ——— "جی فرمایئے۔ میں ہوں ضیا فتح آبادی۔ آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"اوہ، ضیاؔ صاحب۔ آداب عرض، اِس سمع خراشی کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ مجھے آپ جانتے ہیں مگر پہچانیں گے نہیں کیوں کہ جب آپ مصروفِ خلقت ہوتے ہیں تو مجھے بھول جاتے ہیں۔ حالاں کہ آپ کی ہر تخلیق میرے لئے ہوتی ہے۔ آپ کا کلام ۱۹۲۹ء سے رسائل و اخبارات میں میرے زیرِ مطالعہ ہے۔ آپ کی اوّلین تصنیف "طلوع" (مطبوعہ ۱۹۳۴ء) کے قطعات نے مجھے چونکایا۔ یہی وہ چھوٹا سا مجموعہ تھا جس نے منصور احمد ایڈیٹر ادبی دنیا لاہور کو تعارفی مضمون لکھنے پہ مجبور کیا۔ پھر "نورِ مشرق" (مطبوعہ ۱۹۳۷ء) کی نظموں، گیتوں اور سانیٹوں نے محظوظ کیا۔ غالباً یہ اُردو نظم کا پہلا مجموعہ تھا جس میں گیت شامل تھے اور بعض دقیانوسی حلقوں میں اِس جدت کو ناپسند بھی کیا گیا۔ بعد میں "نئی صبح" (مطبوعہ ۱۹۵۲ء) میں آپ کی وہ تخلیقات دیکھنے کو ملیں جن سے آپ کا ذہنی اور فنی بلوغ ظاہر ہوا۔ "گردِ راہ" (مطبوعہ ۱۹۶۳ء) اِس بات کی دلیل ہے کہ شاعر شعر و ادب کا طویل سفر کامیابی سے طے کر کے منزل سے قریب آگیا ہے۔ آپ نے ہر ادبی تحریک سے اثر لیا اور اُس پر اپنا اثر چھوڑا بھی۔ مجھے یقین ہے کہ آج نہیں تو کل کا ادبی مؤرخ آپ کی خدمات کو ضرور سراہے گا۔ آپ نے خود بھی تو کہا ہے ؎

جانتا ہوں، مری نظموں کی، مری غزلوں کی    قدر سمجھائیں گے یارانِ سخن میرے بعد

ہاں تو آپ کے بارے میں یہ سب کچھ جاننے پر بھی میں آپ سے متعلق خود آپ کی زبان سے کچھ سننا چاہتا ہوں" ——— "یعنی میں اپنا تعارف خود کراؤں۔ اب آپ اِسے میری خوبی کہیئے یا خامی کہ میں خود نمائی کے معاملے میں ....." ——— "ٹھہریئے ضیا صاحب۔ یہ خود تعارفی کا سلسلہ نیا نہیں۔ غالباً سب سے پہلے میر نے اپنا تعارف لکھنؤ کے کسی مشاعرے میں کرایا تھا۔ ماضی قریب کے شعرا میں سیمابؔ نے اپنے متعلق ایک نظم قلمبند کی ہے" ——— "صاحب آپ جیتے اور میں ہارا، تو سُنیئے، بزرگوں کا کہنا ہے کہ میں جب پیدا ہوا تو وہ وقت طلوعِ آفتاب کا تھا اور اِس کو کم و بیش ستاون برس ہوتے ہیں۔ شعر گوئی کا مرض خاندان میں دُور دُور تک دیکھا نہ سُنا۔ اِس کے جراثیم ساتھ لے کر پیدا ہوا۔ زائچہ دیکھتے ہی اِک برہمن نے کہا تھا کہ جس بچّے کے لگن میں اوچ کا شکر، دسویں گور و منگل کا یوگ اور ساتویں چندرماں ہو اُسے فنونِ لطیفہ سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اُس کا قلم لاکھوں پر چلتا ہے مگر اُسے تازیست قلبی سکون نصیب نہیں ہوتا اور دشمن اُس کے زیادہ ہوتے ہیں۔ اُس کم بخت برہمن کی بددعا کا آج تک شکار ہوں۔ سوچتا ہوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو بنک کی طویل ملازمت اور ہندسوں کا روزانہ شمار میری شاعری کا گلا گھونٹ دیتے۔ بقول جوشؔ ملیح آبادی روپے آنے پائی کے ماحول میں رہ کر شاعری کا سلسلہ جاری و باقی رکھنا ایک معجزہ ہے۔ شاعری میرا ذریعۂ معاش نہ سہی۔ لیکن شعر کہنے سے میرے ذہن و قلب کو تسکین ملتی ہے۔ میرے دشمن تو اُس وقت سے ہیں جب سے میں پیدا ہوا۔ مگر مجھے ایسے دوست بھی ملے ہیں جن کی دوستی پر مجھے فخر ہے۔ اُن میں ایک نمایاں شخصیت خوشترؔ گرامی کی ہے۔ میرے ذوقِ شعر گوئی کی تربیت و ترقی میں اُن کا بڑا حصہ ہے" ——— "شکریہ، ضیاؔ صاحب۔ اچھا یہ تو بتایئے کہ آپ کے ٹیلیفون پر ابھی ابھی مہرلال سونی کون صاحب بول رہے تھے؟ ....." "حضرت، یہ مہرلال سونی۔ ضیاؔ فتح آبادی کے نصفِ اوّل ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو آپ کے ضیاؔ فتح آبادی کبھی نہ ہوتے"۔

# ★ میں ہوں پُشکر ناتھ

دراصل میں ایک آدمی نہیں، دو ہوں، شاید تین۔

ایک پُشکر ناتھ ٹکو جو ۳۰ مئی ۱۹۳۳ کو سرینگر کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوا اور قدم قدم پہ بدقسمتی سے دوچار ہوتا ہوا سرکاری ملازمت میں آگیا۔ شادی کی، بچوں کا باپ بنا اور اپنے اندر ہی رُوپوش ہو کر صرف ایک سفید پوش شہری کی زندگی بسر کرتا رہا۔ دوسرا پُشکر ناتھ وہ جو جنوری ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوا۔ اور اپنا پہلا افسانہ لیکر "بیسویں صدی" کے درخشاں صفحات پہ نمودار ہو گیا اور قدم قدم پر خوش قسمتی سے ہمکنار ہوتا ہوا افسانہ نگاروں کی صف میں آ شامل ہوا۔ افسانے لکھے، ڈرامے لکھے، ریڈیو نشریات میں حصہ لیا۔ دو کتابوں کا مصنف بن گیا۔ دونوں کتابوں کے لئے انعامات سے نوازا گیا ——— کبھی میں اِن دونوں شخصیتوں کو ساتھ ساتھ کھڑا کر کے دیکھتا ہوں تو ایک کو کمزور سا، دبا دبا سا، اَن گِنت اندیشوں اور ذمہ داریوں میں گھِرا ہوا پاتا ہوں اور دوسرے کو پارے کی طرح بے قرار سا، کچھ کھوجتا ہوا سا، اور زندگی کی حرارت سے معمور پاتا ہوں اور دیکھتے دیکھتے مجھے اُس تیسری شخصیت کا خیال آتا ہے، جس کا تعارف میں کسی سے نہیں کرا سکتا۔ وہ شخصیت ہے اُس پُشکر ناتھ کی، جو اِن دونوں کے درمیان ایک پُل کی طرح کھڑا ہے اور دونوں میں توازن قائم رکھتا ہے۔ اگر میں مُصوّر ہوتا تو اپنی تصویر کبھی نہ بنا پاتا ———

کہتے ہیں اپنے ملک میں افسانہ نگاری ذریعۂ معاش نہیں بن سکتی ——— ٹھیک ہے ——— کون کافر اِسے ذریعۂ معاش بنانا چاہتا ہے۔ فن اپنا صلہ آپ ہے۔ یہ اِنسان کے دِل میں محبت کے دیئے روشن کر دیتا ہے اور دماغ میں خود آگاہی کی قندیلیں ——— میرے لئے افسانہ نگاری ایک ریاضت ہے اور اِس ریاضت کا ایک ہی مقصد ہے ——— ایک بہتر اِنسان، ایک بہتر زندگی اور ایک بہتر دُنیا ——— اس بہتر زندگی کا تصوُّر اِس قدر خوبصورت ہے کہ افسانہ نگار یا شاعر یا مُصوّر اِنسان کو کبھی رنگ اور نسل، زبان اور مذہب، اپنے اور پرائے کے الگ الگ خانوں میں بٹا ہوا نہیں دیکھ سکتا ——— اس کو اِنسان صرف اِنسان نظر آتا ہے۔ خوبصورت، محبت کرنے والا، سورج مکھی کی طرح ہنس مُکھ اور چاند کی طرح اُجلا ——— میں بحیثیت انسان اور بحیثیت افسانہ نگار اِسی انسان کا متلاشی ہوں۔ اور اِسی کے لئے افسانے لکھتا ہوں ؎

پُشکر ناتھ

★ ★

ٹیلیفون دفتر — ۲۶۱۹۳۴
ٹیلیفون رہائش — ۷۹۹۳۷
دو روپے
جنوری ۱۹۷۰ء

سالنامہ

1970

1970

# یر و نشتر

## خوشتر گرامی

"لیڈر کی تلاش" ایک عنوان ـــــ پریشان ہونے کی ضرورت
ں، نجلنگپا کو اپنایئے۔ وہ اوراُس کی پلٹن حاضر ہے۔

---

"سنڈیکیٹ کے ممبروں کی طرف سے حکومت پر شدید حملے" ایک
ان ـــــ وزارتیں چھن جانے کا غصّہ۔

---

"نجلنگپا کے گروپ میں سابق ورکنگ کمیٹی کے گیارہ ممبر شامل ہیں"
عنوان ـــــ راون کے بھی گیارہ ہی سر تھے۔ اُنھیں رام نے توڑا تھا
نجلنگپا کا غُرور سیتا کی ایک ہم جنس نے خاک میں ملایا ہے۔

---

"اوچھے ہتھیار" ایک خبر ـــــ جو نجلنگپا کے اسلحہ خانے میں ملتے
یا۔

---

"فرقہ پرستی کا زہر" ایک عنوان ـــــ انگریز نے بیج ڈالا۔
ندو مہاسبھا اور مُسلم لیگ نے پروان چڑھایا۔ جن سنگھ پھل کھا رہا
ہے۔

---

"ہم گورنمنٹ کا تختہ اُلٹنا نہیں چاہتے" ایس۔ کے پاٹل ـــــ
اس لئے کہ آپ خود اُس پر بیٹھنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

---

"کانگریس کے نجلنگپا گروپ کا کیا نام رکھا جائے" ایک عنوان ـــــ
سنڈیکیٹ پرائیویٹ لمٹیڈ۔

---

"گاندھی جنم صدی کے دوران کانگریس میں پھوٹ" ایک عنوان
ـــــ گاندھی جی کی وصیت کے عین مطابق ہے۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ
کانگریس کو ختم کر دو۔

---

دِلّی کے اجلاس اے۔ آئی۔ سی۔ سی نے نجلنگپا کو کانگریس کی صدارت سے ہٹا دیا۔

"گجرات کے فسادات کے لئے حکومت ذمہ دار ہے" بادشاہ خاں

"شہروں میں جنگلی جانور" ایک خبر ـــــ احمد آباد میں سب سے زیادہ درندے پائے گئے جو انسانوں کے رُوپ میں انسانوں کو پھاڑ کھاتے ہیں۔

"سب سے بڑی سمسیا" ایک جن سنگھی اخبار کی سُرخی ـــــ ہندستان کی سرزمین پر آپ کا وجود۔

"اپنے اندر بے لوث اور ایماندار رہنما پیدا کیجئے" بادشاہ خاں ـــــ رہنما بہت ہیں یہاں۔ ایمانداری پختونستان سے بھجوا دیجئے۔

"گپتا کا جن سنگھ سے گٹھ جوڑ" ایک خبر ـــــ ع
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

"ڈاکوؤں نے ساگر یونیورسٹی کے محقق کو اغوا کر لیا" ایک خبر ـــــ ڈکیتی پر ٹھیسس لکھوانے کے لئے۔

"چاند پر زلزلے کا علاج" ایک خبر ـــــ سب سے سستا نسخہ۔ دوا کے دام نہیں۔ آمد و رفت پر صرف ایک ارب، ۲ کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔

"چینی کی قیمت اور گر گئی" ایک خبر ـــــ ایک چینی کیا پورے چین کی قیمت گر گئی۔

"انسانی بھائی چارہ" ایک عنوان ـــــ عنقا کہوں یا ہما اسے۔

"نئے ڈھنگ کی سنسنی خیز چوری" ایک خبر ـــــ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔

"عورت نے جیب کاٹ لی" ایک خبر ـــــ یہ اُس کا پیدائشی حق ہے۔ مہینے میں ایک بار تو ضرور ہی یہ کام انجام دیتی ہے۔

"امریکی خلابازوں نے پھر چاند کی سیر کی" ایک عنوان ـــــ اور ہم ابھی تک زمین پر لڑ رہے ہیں۔

---

"طلبا کو چاہئے کہ دیہات کی طرف مائل ہوں" بادشاہ خان کی تلقین ـــــ

۱۔ جہاں نہ ٹیڈی کوٹ ہیں نہ ٹیڈی پتلون۔
۲۔ جہاں نہ ہڑتالیں ہوتی ہیں نہ مظاہرے۔
۳۔ جہاں نہ سینما ہیں نہ اوپن ایر تھیٹر۔
۴۔ جہاں نہ کلب ہیں نہ کافی ہاؤس۔
۵۔ جہاں نہ محفلِ رقص ہے نہ بزمِ موسیقی۔

---

"پارلیمنٹ میں پھر جگجیون رام کا چرچا" ایک عنوان ـــــ ایک پارلیمنٹ ہی میں کیا ہے

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں ان کی

---

"کانگریسیوں میں جوتے چل گئے" ایک خبر ـــــ فری اسٹائل قرار دے کر ٹکٹ لگاؤ۔

---

"پیر جی کو مریدنی کا جھانسہ" ایک خبر ـــــ [illegible] جھانسہ نہیں جھانسی کہیے۔

---

"خود جیو دوسروں کو بھی جینے دو" ایک عنوان ـــــ اور احمد آباد، جبلپور اور رانچی نہ بناؤ۔

---

"سادھو گرفتار" ایک خبر ـــــ یہ ظلم نہ ہوتا اگر سادھو سماج کے جنم داتا گلزاری لال نندہ وزیرِ داخلہ ہوتے۔

---

"مظفر نگر میں بھٹے لوٹ لئے گئے" ایک خبر ـــــ کیا وہاں بینک نہیں ہیں جو لوگوں نے روپیہ بھٹوں میں رکھا اور وہ لٹ گئے۔

---

شریمتی اندرا گاندھی کے خلاف نجلنگپا گروپ، جن سنگھ، سوتنتر پارٹی، پی۔ ایس۔ پی اور ایس۔ ایس۔ پی کی مشترکہ تحریکِ التوا ناکام۔

نجلنگپا گروپ کانگرس سے الگ

• اکسٹرو ایک عنوان ـــــ اپنے وطن میں سب کہاں ہو گئی غریب۔

• "ڈاکٹروں کا سربراہ عشق میں مبتلا ہو گیا" ایک خبر ـــــ اب تو قائل ہو جائیے غالب کے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

• "نعرے بازی کی نہیں کام کرنے کی ضرورت ہے" ایک عنوان ـــــ علی ہذا القیاس لیڈروں کو بھاشنوں کی نہیں عمل کی ضرورت ہے۔

• "پارلیمنٹ نہیں توڑی جائے گی" چوہان کا اعلان ـــــ ط
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

• "سابق صدر ایوب کا غیر ملکی بنکوں میں ساڑھے تین ارب روپیہ جمع ہے" ایک پاکستانی اخبار کا انکشاف ـــــ دس سالہ خدمات کا پراویڈینٹ فنڈ، بونس اور گریچویٹی سب کچھ شامل ہے۔

• "پنجاب میں نئے ٹیکس لگیں گے" ایک خبر ـــــ سال نو کی خوشی میں۔

• "۷۲ فیصدی لوگ فلموں میں بوسہ بازی کے خلاف" ایک خبر ـــــ نہایت بدذوق لوگ ہیں۔

• "ہونے والی دلہن فریب دے گئی" ایک خبر ـــــ چلو اچھا ہوا فریب دے کر ٹھہری نہیں اور زندگی بھر فریب کھانے سے بچ گئے۔

• "مرکز کی گورنمنٹ اب کانگریس گورنمنٹ نہیں رہی" ـــــ ط
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

"امریکی خلابازوں نے پھر چاند کی سیر کی" ایک عنوان —— اور ہم ابھی تک زمین پر لڑ رہے ہیں۔

---

"طلبا کو چاہئے کہ دیہات کی طرف مائل ہوں" بادشاہ خان کی تلقین ——

۱۔ جہاں نہ ٹیڈی کوٹ ہیں نہ ٹیڈی پتلون۔
۲۔ جہاں نہ ہڑتالیں ہوتی ہیں نہ مظاہرے۔
۳۔ جہاں نہ سینما ہیں نہ اوپن ایر تھیٹر۔
۴۔ جہاں نہ کلب ہیں نہ کافی ہاؤس۔
۵۔ جہاں نہ محفلِ رقص ہے نہ بزمِ موسیقی۔

---

"پارلیمنٹ میں پھر جگجیون رام کا چرچا" ایک عنوان —— ایک پارلیمنٹ ہی میں کیا ع

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں ان کی

---

"کانگریسیوں میں جوتے چل گئے" ایک خبر —— فری اسٹائل قرار دے کر ٹکٹ لگاؤ۔

---

"پیر جی کو مریدنی کا جھانسہ" ایک خبر —— مرید پھنسے تو پھر جھانسہ نہیں جھانسی کہیے۔

---

"خود جیو دوسروں کو بھی جینے دو" ایک عنوان —— اور احمد آباد، جبلپور اور رانچی نہ بناؤ۔

---

"سادھو گرفتار" ایک خبر —— یہ ظلم نہ ہوتا اگر سادھو سماج کے جنم داتا گلزاری لال نندہ وزیر داخلہ ہوتے۔

---

"مظفر نگر میں بھتے لوٹ لئے گئے" ایک خبر —— کیا وہاں بینک نہیں ہیں جو لوگوں نے روپیہ بھتوں میں رکھا اور وہ لٹ گئے۔

---

شریمتی اندرا گاندھی کے خلاف نجلنگپا گروپ، جن سنگھ، سوتنتر پارٹی، پی۔ ایس۔ پی اور ایس۔ ایس۔ پی کی مشترکہ تحریک۔ التوا کام۔

نجلنگپا گروپ کانگرس سے الگ

* "آنسو ہے ایک عنوان ——— پنڈال میں بے دلی کی غریب"

---

* "ڈاکٹروں کا سرطانِ عشق میں مبتلا ہو گیا" ایک خبر ——— اب تو قائل ہو جائیں گے غالب کے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

---

* "نعرے بازی کی نہیں کام کرنے کی ضرورت ہے" ایک عنوان ——— علیٰ ہٰذا القیاس لیڈروں کو بھاشنوں کی نہیں عمل کی ضرورت ہے۔

---

* "پارلیمنٹ نہیں توڑی جائے گی" چوہان کا اعلان ——— ؎

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

---

* "سابق صدر ایوب کا غیر ملکی بنکوں میں ساڑھے تین ارب روپیہ جمع ہے" ایک پاکستانی اخبار کا انکشاف ——— دس سالہ خدمات کا پراویڈینٹ فنڈ، بونس اور گریجویٹی سب کچھ شامل ہے۔

---

* "پنجاب میں نئے ٹیکس لگیں گے" ایک خبر ——— سالِ نو کی خوشی میں۔

* "۲۷ فیصدی لوگ فلموں میں بوسہ بازی کے خلاف" ایک خبر ——— نہایت بد ذوق لوگ ہیں۔

---

* "ہونے والی دلہن فریب دے گئی" ایک خبر ——— چلو اچھا ہوا فریب دے کر چلی گئی نہیں اور زندگی بھر فریب کھانے سے بچ گئے۔

---

* "مرکزی گورنمنٹ اب کانگریس گورنمنٹ نہیں رہی" ——— ؎

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

---

# گورو نانک دیو

**خوشتر گرامی**
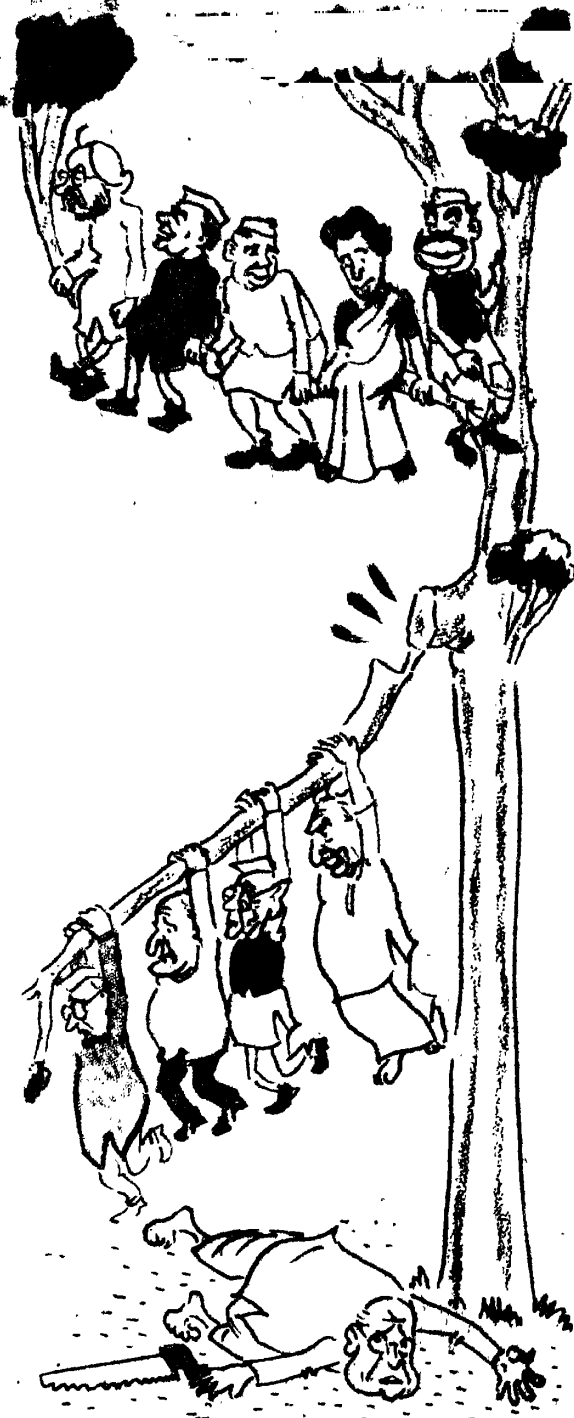
پانچ سو برس قبل اس سرزمین پر ایک انسان نے جنم لیا جو شکل وصورت اور گوشت پوست کے ڈھانچے کے اعتبار سے ہی انسان نہیں تھا بلکہ اپنی سرشت، اپنے کردار، اپنی گفتار اور اپنے عمل سے حقیقی انسان اور انسانیت کا سچا روپ تھا ـــــ اس کی پیشانی سے نورِ عرفان کی بارش ہوتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے پریم او محبت کے چشمے جاری تھے۔ اس کے لبوں پر اخوت اور بھائی چارہ کا پیغام تھا۔ اس کی زبان پر انسانیت کا درس تھا ـــــ یہ تھا دنیا کا ایک مہاپرش اور اس ملک کا ایک عظیم فرزند ـــــ

ست گورو نانک دیو

وہ نہ ہندو تھا نہ مسلمان۔ اس کے دائیں مسلمان تھا (بھائی مردانہ) تو بائیں ایک ہندو (بھائی بالا) اس نے آنکھ کھولی تو دیکھا، کوئی کہتا ہے وہ ہندو ہے۔ کوئی کہتا ہے وہ مسلمان ہے۔ لیکن ان میں کوئی بھی انسان نہیں ہے۔ دونوں کے لبوں پر دھرم اور مذہب ہے۔ لیکن کسی کے عمل میں نہ انسانیت ہے نہ مذہب ـــــ اور آج پانچ سو برس بعد بھی یہاں کے انسان مذہب، دھرم اور پنتھ کے الگ الگ خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان کے دل انسانیت کے ناطے کہیں بھی جڑے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ کچھ بھی ہوں، انسان نہیں ـــــ گورو نانک دیو کی ہندو مسلمان سکھ سبھی زبان سے عزت کرتے ہیں مگر عمل سے کوئی بھی اپنے آپ کو انسانیت کے اس سانچے میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتا جو گورو جی نے پیش کیا اور جس میں ڈھل کر انسان واقعی انسان بن سکتا ہے ـــــ گورو نانک کا جنم جن حالات میں ہوا تھا پانچ سو برس بعد آج پھر وہی حالات ہمارے ملک میں نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان کی زندگی، ان کے کردار اور ان کے پیغام کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس میں وہی رس، وہی اثر اور وہی تازگی آج بھی نظر آتی ہے جو ان کی زندگی میں تھی۔ ان کا پیغام ہمہ گیر اور آفاقی تھا۔ وہ کسی ایک خاص فرقے یا طبقے، کسی ایک شہر یا ملک، کسی ایک جگہ یا قوم کے لئے نہیں تھے۔ اس لئے ان کا پیغام ہندوستان کی سرحدوں کے باہر بھی پہنچا۔ اس میں سچائی ہے۔ اس لئے آج تک باقی اور امر ہے ـــــ ان کا پیغام تھا ع مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ـــــ خدا کی وحدت ان کا ایمان تھا، انسانوں میں مساوات ان کا پیغام تھا۔ خدا کے بندوں کی خدمت ان کا عمل تھا۔ وہ خدا کو ایک مانتے تھے۔ انسان کو انسان جانتے تھے۔ کہا کرتے تھے مجھے نہ کوئی ہندو نظر آتا ہے نہ کوئی مسلمان۔ مجھے صرف انسان نظر آتے ہیں ـــــ آج گورو نانک نہیں ہیں۔ مگر ان کا پیغام ہمیں روشنی دکھانے کے لئے موجود ہے ـــــ افسوس پانچ سو برس گزرنے پر بھی ہم ان کے پیغام کو اپنی زندگی میں مشعلِ راہ نہیں بنا سکے۔ قوم کی اسی بے عملی سے متاثر ہو کر ڈاکٹر اقبال نے کہا تھا ؎

آہ بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر\
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر

افسانہ

# ڈریم لینڈ

کشمیری لال ذاکر ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

۱۳۶ سیکٹر ۱۹ اے۔ چنڈی گڑھ

برادرم گرامی! تسلیم و نیاز

میرا کل والا خط مل گیا ہوگا۔ "ڈریم لینڈ" حاضر ہے! ــــــ ان دنوں ایک ساتھ کئی الجھنیں سامنے آئیں۔ صحت خراب ہوئی اور ابھی تک خراب ہے۔ دوا دارو تو ہو رہی ہے لیکن نتائج تسلی بخش نہیں ــــــ کچھ ذاتی قسم کے بکھیڑے ہیں جو سلجھنے ہی میں نہیں آتے۔ دوستوں کے ہاتھوں کچھ ایسے زخم ملے ہیں جو جلد مندمل نہ ہو سکیں گے۔ آجکل یہ شعر بار بار یاد آتا ہے ؎

نشتر لگے نہیں اُن کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

حسرت تھی کہ خان بادشاہ سے نیاز حاصل کر سکوں۔ لیکن یہ بھی توفیق نہ ہوئی۔ ایک فقیر امن و آشتی کی صدا دے رہا ہے اور اُن اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کر رہا ہے جو انسانی زندگی کی اساس ہیں۔ مجھے کئی برس پہلے کا خان عبد الغفار خاں یاد آ رہا ہے جسے ہم نے سٹوڈنٹس یونین کی طرف سے کشمیر میں مدعو کیا تھا۔ پنڈت نہرو اور خان بادشاہ دو سفید گھوڑوں پر سوار جب بازاروں میں سے گزرے تھے تو زندگی دُلہن کی طرح سنور گئی تھی۔ اور آج وہی زندگی اپنی بقا کے لئے کیا کیا جتن کرتی پھرتی ہے ــــــ خان بادشاہ دلی واپس آ جائیں تو ایک بار آؤں گا۔ جب تک شاید میرے اپنے زخم بھی مندمل ہو جائیں۔ . . .

نیاز کیش ــــــ کشمیری لال ذاکر

میں کل یہاں آیا تھا۔ بس سے اترا تھا تو بارش ہو رہی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے بارش ہی میں میرا سامان کمرے میں رکھا تھا۔ بارش اتنی تیز تھی کہ میں سڑک سے ریسٹ ہاؤس تک پہنچنے میں بالکل بھیگ گیا تھا۔ لیکن گرمی کے موسم میں بارش کی بوندیں خوشگوار معلوم ہوتی ہیں خصوصاً اُسے جو میدانوں کی تپش سے بھاگ کر کسی پہاڑی مقام پر آیا ہو۔ میں نے بال تولئے سے پونچھے۔ چہرے سے پانی کے قطرے صاف کئے اور ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں کھڑا ہو کر سامنے کی پہاڑیوں سے گھٹاؤں کے ریلوں کو گھاٹی میں تیرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ کرپال نے ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار کو سب ضروری ہدایتیں دے رکھی تھیں۔ اُس نے برآمدے میں آرام کرسی بچھادی اور تپائی سامنے رکھ دی۔ تپائی پر بچھا ہوا میز پوش گندہ تھا۔ اُسے میں نے اُٹھا دیا۔

"کل ایک صاحب جو یہاں ٹھہرے تھے اسے خراب کر گئے ہیں۔ آج دھوبی دوسرے میز پوش دے جائے گا تو بدل دوں گا۔" چوکیدار نے بہت عاجزی سے کہا۔

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" میں نے جواب دیا۔

یہ ریسٹ ہاؤس اس علاقے کا بہترین ریسٹ ہاؤس سمجھا جاتا ہے۔ ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک الگ سی پہاڑی پر مین سڑک کے

کنارے یہ ریسٹ ہاؤس واقعی بہت خوبصورت ہے۔ میں اِس ریسٹ ہاؤس میں پہلی بار آیا تھا۔ چیل کے درختوں سے گھری ہوئی سُرخ رنگ کی عمارت جس کی ڈھلوان چھت دُور سے نظر آجاتی تھی۔ ہریالی کے اُس جنگل میں ایک دلکش پھول کی طرح دکھائی دیتی تھی جیسے کسی پہاڑی دوشیزہ نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں میں ایک بڑا سا جنگلی پھول اَڑس رکھا ہو۔

میں ماحول کی دلکشی میں ڈوبا آرام کرسی میں بیٹھ گیا اور کُرسی کی پُشت سے پیٹھ ٹیک کر اپنے تلوؤں کی ہلکی ہلکی ٹھنڈک محسوس کرنے لگا۔ کئی روز کے بعد گھٹن کا یوں کُھل کر رہ جانا اور ایک خاموش جگہ پر اکیلے بیٹھ کر اپنے آپ میں ڈوب جانا بہت اچھا معلوم ہو رہا تھا۔

چوکیدار نے چائے کا سامان میز پر رکھ دیا۔

"اس وقت چائے کی کیا ضرورت تھی چوکیدار!"

"صاحب کہہ گئے تھے چائے میں پلادوں۔ باقی انتظام وہ شام کو خود آکر دیکھ لیں گے۔" چوکیدار نے کہا۔

"اچھا شکریہ۔ تم جاؤ چوکیدار!"

چوکیدار چلا گیا۔ اُس وقت کسی کا بھی میری سوچ میں مخل ہونا مجھے اچھا نہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ کرپال جی لمحہ دو لمحہ دیر سے آئیں تو بہتر ہے۔

میں نے چائے کی پیالی بنائی۔ تازہ سگرٹ سُلگایا۔ گرم گرم چائے کا ذائقہ لبوں پر محسوس کیا اور اُس کی ہلکی سی مٹھاس کو سگرٹ کے دھوئیں کی تلخی سے سہلاتے ہوئے سامنے کی گھاٹی کو دیکھنے لگا جس پر چھائی گھٹاؤں کی تہیں ہلکی ہوتی جا رہی تھیں اور کہیں کہیں کوئی کچا پہاڑی مکان نظر آنے لگا تھا۔ ایسے اوقات جب مجھے بلندی نصیب ہو اور تنہائی کا ماحول ہو اور شہر کی مصنوعی فضا سے الگ کہیں کچھ لمحے گزارنے کو مل جائیں تو میں زندگی کی بنیادی قدروں کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں اور پتہ نہ جانے کیسے ماضی کی کچھ یادیں دبے پاؤں میرے ذہن کی سطح پر چلنے لگتی ہیں اور میری سوچ ایک طویل سفر پر چل نکلتی ہے۔ ایسا سفر جس کی کوئی منزل نہیں۔ جس میں صرف راستے ہی راستے ہیں کہیں کہیں پڑاؤ بھی ہیں جہاں دن کے اُجالے میں درختوں کی چھاؤں میں باتیں ہیں اور جہاں رات کی تاریکی میں ایک آدھ چراغ جل کر ہمت بندھائے رکھتا ہے۔ ایسی گھڑیوں میں مجھے محسوس ہونے لگتا ہے جیسے میں ایک سرکاری دفتر میں کام کرنے والا ایک عام کرمچاری نہیں سقراط جیسا بہت بڑا آدمی ہوں اور زندگی کی تلخیاں ڈر ڈر کر چکھنے کی بجائے زہر کا بھرپور پیالہ ہونٹوں سے لگا کر اُسے ایکدم ختم کر سکتا ہوں۔ زہر کے پیالے پینے والے میرے جیسے کئی اور بھی ہوں گے۔ ایسے اور بھی بہت سارے لوگ ہیں جو زندگی کا زہر دھیرے دھیرے انجانے میں پیتے رہتے ہیں اور جن کے سینوں میں وہ زہر کینسر بن کر پھیلتا رہتا ہے اور کسی صبح اُن کے حصّے کے زہر کی مقدار ختم ہو جاتی ہے۔ اُن کا پیمانہ بھر جاتا ہے اور وہ اپنے ہونٹوں پر زہر خند کی تلخی کھنڈاتے اپنے رشتہ داروں، اپنے دوستوں، اپنے ساتھیوں اور اپنے محبوبوں کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں اور تعلّقات کے مارے ہوئے اُن کے ساتھی اُن کی قبروں پر پھول چڑھاتے ہیں یا اُن کی تصویروں کو اپنے مینٹل پیس پر رکھ کر کبھی کبھی انہیں یاد کر لیتے ہیں۔ یہی زندگی ہے یہی ہستی کا سارا پروسیس ہے یہی انسانی تواریخ کی کُل داستان ہے یہی دُنیا بھر کے کلچر اور ادب کی رُوح ہے۔ انسان مر جاتا ہے لیکن اُس کی رُوح زندہ رہتی ہے اور کبھی کبھی اپنی چھوڑی ہوئی جگہوں اور جُدا ہوئے دوستوں کو پریشان کرتی رہتی ہے اور اُس سے محبت کا دم بھرنے والے اُسے بھوت پریت کا نام دے کر اُس سے پیچھا چھڑانے کے جتن کرتے رہتے ہیں۔ زندگی کی یہ تصویر کتنی دردناک ہے لیکن یہی اُس کی اصلی تصویر ہے۔

وہیں برآمدے میں بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی تھی۔ میں جب اپنی سوچ کے سمندر سے باہر نکلا تو محسوس ہوا جیسے میرے اردگرد پھیلی ہوئی ریت گذشتہ انسانوں کے وہ ارمان تھے جو تشنہ رہ گئے تھے اور اب شام کے دھندلکے میں سمندر کی طرف اپنی پیاس بُجھانے کے لئے دَوڑ رہے تھے اور تشنہ ارمانوں کے اِس ہجوم میں کوئی کسی کو نہیں پہچانتا تھا۔ میں نے آنکھیں جھپکیں، ایک لمحہ کے لئے سوچ کا توازن ٹھیک نہ ہوا اور پھر مجھے اپنے ماحول کا احساس ہوا۔ میں تو ایک پہاڑی ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں بیٹھا تھا جو سمندر سے ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا اور سمندر یہاں سے سینکڑوں میل دُور تھا اور یہاں کوئی ساحل نہ تھا اور کہیں کوئی ریت کا ذرہ نہ تھا یہاں تو سمندر کی لہروں کی آواز نہیں چیل کے درختوں میں سے سنسناتی ہوئی ہوا کا شور تھا۔ میں نے دیکھا سامنے سے کرپال آرہا تھا گھٹائیں کب کی پہاڑیوں کے دامن میں سو چکی تھیں۔ آسمان نکھر گیا تھا اور دُور بستی کے مکانوں میں روشنیاں جلنے لگی تھیں۔ لیکن ریسٹ ہاؤس کے کمروں میں اندھیرا تھا کیونکہ چوکیدار نے ابھی بجلی نہیں جلائی تھی۔

کرپال میرا پُرانا دوست ہے۔ بہت پُرانا تو نہیں لیکن آدمی اچھا ہے۔ مجھے اپنے محکمے کے لوگ کچھ زیادہ پسند نہیں۔ وہی عام قسم کے لوگ جو اپنی چھوٹی چھوٹی ذاتی رنجشوں اور لگاوٹوں کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ جو ایک دوسرے کی چُغلی کھاتے ہیں۔ اُن کی پرائیویٹ زندگی کے بخیے اُدھیڑتے ہیں اور جب آمنے سامنے ہوں تو بناوٹی مُسکراہٹوں سے ایک دوسرے سے

ملتے ہیں۔ کرپال بھی میرے محکمے کا آدمی ہے لیکن اُن سے مختلف ہے۔ وہ اپنی ذاتی رنجشوں سے باہر بھی نکل سکتا ہے اور دوست کو دوست سمجھ کر بھی ملتا ہے۔ میں دوسرے چوتھے مہینے اِن پہاڑوں کی طرف نکل آنے کی کوشش کرتا ہوں، کبھی دو ایک دن کی مہلت لے کر لیکن یہ مہلت بھی کبھی کبھی نصیب ہوتی ہے، اکثر نہیں۔ کرپال اِس سب ڈویژن کا انچارج ہے اس لئے اُس کی ڈویژن کے ریسٹ ہاؤسوں میں ایک آدھ دن گزارنے کا انتظام آسانی سے ہو جاتا ہے۔ جب کبھی میں اِدھر آیا ہوں اُسی کا مہمان رہا ہوں اور اب بھی اُسی کا مہمان ہوں۔ وہ کافی وقت میرے پاس رہا اور میرے ہی ساتھ کھانا کھا کر اپنے گھر چلا گیا جو ریسٹ ہاؤس سے قریب ایک میل دُور تھا۔ اگلی صبح اتوار تھا اِس لئے اُس کے آنے پر اِدھر اُدھر گھومنے کا پروگرام تھا۔

صبح اُٹھ کر ریسٹ ہاؤس کے وسیع احاطے میں نکل آیا۔ اب نظارہ ہی بالکل دوسرا تھا۔ پہاڑیاں جیسے نہا کر دُھل گئی تھیں چیڑ کے درخت ایکدم تر و تازہ معلوم ہو رہے تھے۔ آسمان کی نیلاہٹ بہت ہی گہری ہو گئی تھی۔ چڑھتے سُورج کی کرنیں پہاڑیوں کی چوٹیوں کو چھُوتی ہوئی دھوپ کی سیڑھیوں سے اُتر کر اِدھر اُدھر پھیلنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرے ذہن پر چھایا ہوا کسل بھی قدرے کم ہو گیا تھا اور میری سوچ کے آنگن میں بھی دُھوپ پھیل رہی تھی اور میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر باہر گھوم کر میں اندر آ گیا۔ نہا دھو کر تیار ہوا۔ چوکیدار نے میز پر ناشتہ لگا دیا تھا۔ ناشتہ کے بعد میں برآمدے میں آ گیا۔ اور سامنے بستی کے مکانوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کو دیکھتا رہا۔ بستی اسی طرح آبادی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ڈھلوان والی چھتوں کے مکانوں کے یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ایسے ہی کسی جزیرے میں کرپال بھی رہتا تھا اور وہ اُس جزیرے سے نکل کر اور اس جیسے کئی اور جزیروں کو پار کرتے ہوئے میرے پاس آنے والا تھا تاکہ ہم گھومنے نکل سکیں اور جی چاہے تو کسی جزیرے میں داخل ہو کر کچھ لمحوں کے لئے وہاں کی زندگی کا حصّہ بن جائیں۔

اور پھر کرپال کی جیپ ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوئی اور کرپال مُسکراتے ہوئے میری طرف لپکا۔

"ہیلو راجندر! کیسے حال ہیں؟"

"فائن!" میں نے جواب دیا۔

"کیا ارادہ ہے؟ یہیں بیٹھیں یا کہیں گھومنے چلیں؟"

"گھومنا چاہئے۔"

"دوپہر کا کھانا تمھیں میرے ساتھ کھانا ہے، گھر میں۔"

"یز یو لانگ۔" میں نے کہا۔

"جیپ سے چلیں؟"

"نہیں پیدل چلیں گے۔ ڈرائیور سے کہہ دو جیپ لے جائے گا۔"

کرپال نے ویسے ہی عادتاً ایک چکر ریسٹ ہاؤس کا لگایا۔ منٹ دو منٹ چوکیدار سے بات کی اور پھر ہم دونوں باہر سڑک پر آ گئے۔

"کس طرف چلیں؟" کرپال نے پُوچھا۔

"جدھر تمھارا جی چاہے۔"

"ہمارے یہاں واٹر سپلائی کا ایک نیا ٹینک بن رہا ہے۔ مکمل ہو گیا تو شہر میں پانی کی قلّت مستقل طور پر ختم ہو جائے گی۔ وہ سائڈ بھی اچھی ہے۔ کچھ نئی کوٹھیاں بنی ہیں۔ کچھ لوگ اپنے آرچرڈ بھی بنا رہے ہیں۔ کہو تو اُس طرف چلیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

تنگ پہاڑی سڑک پر چلتے ہوئے ہم نے اپنے اپنے سگرٹ سُلگائے اور باتیں کرتے ہوئے چلنے لگے۔

"آجکل کس چھوکری سے رُومانس چل رہا ہے؟"

"اِن دِنوں کُرسی کا زمانہ ہے۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

"شادی کر لو یار اب!"

"کبھی کبھی تو میں بھی اِس معاملے پر سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہوں۔ جب بھی توجہ کسی لڑکی پر جمتی ہے اور اُسے اِس زاویے سے پرکھنے لگتا ہوں کہ وہ کیسی بیوی ثابت ہو سکتی ہے، کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے کہ معاملہ ایکدم ٹھپ ہو جاتا ہے۔"

"کوئی اور لڑکی ٹکرا جاتی ہے؟"

"کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن عام طور سے تو وہ لڑکی جسے میں بیوی کے روپ میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگتا ہوں۔ لمحہ بھر میں اپنا کوئی ایسا پہلو اُجاگر کر دیتی ہے کہ میں اُس سے اگلے دن ملنا چھوڑ دیتا ہوں۔"

"بیوی کا کیا تصور ہے تمھارے ذہن میں؟"

"جس پر اکثر بیویاں پوری نہیں اُترتیں۔" میں ہنس دیا۔ "چھوڑ یار کیا بکھیڑا لے بیٹھا ہے؟"

"تو آجکل تنگی کا زمانہ ہے؟"

"کبھی کبھی رومان بھی کالے بازار کی چیز بن جاتا ہے۔ ڈھونڈنے سے ملتا ہی نہیں کمبخت!"

میں اپنی بات کہہ ہی رہا تھا کہ ایک کار لڑکیوں سے ٹھسا ٹھس بھری قریب سے گزر گئی۔ میرا دعویٰ جیسے جھٹلایا جا رہا تھا۔

اِسی طرح کی لائٹ ٹاک کرتے ہوئے ہم اُس علاقے میں پہنچ گئے جہاں کئی نئے بنگلے بنے تھے۔ کچھ پرانے بنگلے پرانے مالکوں کی ملکیت سے نکل کر نئے مالکوں کے پاس آگئے تھے جنھوں نے انھیں چھوٹے چھوٹے حصّوں میں بانٹ کر کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ سڑک کے بائیں طرف دُور تک ایک کھائی سی چلی گئی تھی جہاں ایک پہاڑی نالہ بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ نالے کے اوپر بنگلوں سے ملحقہ پہاڑی کے حصّے میں لوگ سیب کے آرچرڈ ڈیولپ کر رہے تھے۔

"اگلے دو تین سال میں یہ ساری گھاٹی خوبصورت آرچرڈز سے بھر جائے گی اور بہت اچھے سیب پیدا ہوں گے۔"

"سستے بھی ہوں گے کبھی؟"

"نہیں، عام آدمی کے لئے نہیں۔"

"کیا عام آدمی کے لئے کبھی کوئی چیز سستی اور فراواں نہ ہوگی؟"

"اِس نسل کی زندگی میں تو نہیں!" کرپال نے کہا۔

"اِس نسل کے بعد بھی کوئی اور نسل ہوگی؟"

"ہوگی کیوں نہیں؟ لیکن اِس کی نسبت زیادہ ٹارمینٹڈ اور کہیں زیادہ سفوکیٹیڈ۔ ایک مار بِڈ نسل جو چاند کی ریت پھانکے گی اور ایٹم بموں کی زہریلی گیسوں میں سانس لے گی۔"

"ایمان سے کیا بات کہہ دی ہے تم نے!" میں نے کرپال کے کندھے کو تھپتھپایا۔

"راجندر کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، انسان کی موت اُس کے اپنے ارتقا کے ہاتھوں ہوگی۔ وہ اپنے ہاتھوں خلا میں بنائی جانے والی شٹولیوں پر لٹکے گا اور اُس کی لاش گریویٹی کی کھینچا تانی میں نہ زمین پر گر سکے گی نہ کوئی اور سیارہ ہی اُسے اپنی طرف کھینچ سکے گا۔"

مجھے آج محسوس ہوا کہ کرپال بھی کبھی کبھی میری طرح سقراط بنتا ہوگا اور زہر کے پیالے کو غٹا غٹ پی جاتا ہوگا اور چلتے چلتے میں ایک بنگلے کے سامنے لکڑی کے بنے چھوٹے سے گیٹ پر رک گیا۔ گیٹ کے باہر لکھا تھا "ڈریم لینڈ"۔ میرے ذہن میں نہ جانے کیوں ایک تُند سی جھنجھلاہٹ ہوئی۔ دماغ کی نسیں تن گئیں۔

"ڈریم لینڈ!" میں نے ایک بار قدرے اونچی آواز میں پڑھا۔

"یہاں ایک ریٹائرڈ کرنل رہتا ہے۔ اپنی بیوی کے ساتھ جو عمر میں اُس سے کم سے کم تیس برس چھوٹی ہے۔ اِن لوگوں نے کوئی پانچ برس پہلے یہ بنگلہ بنوایا تھا۔"

"کہاں سے آئے تھے یہ لوگ؟"

"کسی ریاست میں تھے۔ اِن کے بارے میں لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔"

"کیسی باتیں؟" مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے دماغ کی نسیں اور بھی زیادہ تن رہی تھیں۔

"یہی کہ کرنل کی بیوی اُس کی اپنی بیوی نہیں۔ کہیں سے ہتھیائی ہوئی ہے اور کرنل کے پاس جو روپیہ ہے وہ بھی چوری کا ہے۔"

"چوری کا کیسے؟"

"اُس کا تعلق کسی گروہ سے تھا۔ یہ لوگ یہاں کسی سے ملتے نہیں جاتے۔ نہ اِن سے کوئی ملنے آتا ہے۔ باہر ہی کے لوگ اِن کے پاس آتے ہیں اور یہ بھی اکثر باہر جاتے رہتے ہیں۔"

"تم کرنل کو جانتے ہو کیا؟"

"ہاں! دو ایک بار بنگلے کی ایکس ٹینشن کے لئے ڈیزائن بنوانے کے لئے بُلایا تھا اُس نے۔ ظالم نے گھر بڑا خوبصورت بنا رکھا ہے۔"

"کیا اُس سے ملا جا سکتا ہے؟"

"کہہ نہیں سکتا۔ لیکن تم کیا کرو گے اُس سے مل کر؟"

"میرے دماغ کی نسیں بہت تن گئی ہیں شاید ڈھیلی پڑ جائیں"

"میں سمجھا نہیں تمہاری بات"

"تم مجھے کرنل سے ملوا دو"

"آؤ تم ای کرتے ہیں" یہ کہہ کر کرپال نے ڈریم لینڈ کا گیٹ کھولا اور جب ہم اندر داخل ہو گئے تو گیٹ بند کر دیا۔

کرپال آگے تھا اور میں اُس کے پیچھے کیونکہ راستہ تنگ تھا اور اُس کے دونوں طرف جنگلی پھولوں کے انبار تھے اور فضا میں ایک عجیب سی بو رچی ہوئی تھی۔ ہم جب بنگلے کے برآمدے میں پہنچے تو ایک نوجوان لڑکی برآمدے میں رکھی کرسیوں کو جھاڑ رہی تھی۔ غالباً وہ کوئی پہاڑی لڑکی تھی جو اُن کے گھر میں کام کرتی تھی۔

"کرنل صاحب اندر ہیں؟" کرپال نے اُس لڑکی سے دریافت کیا۔

"جی نہیں، تھوڑی دیر پہلے کہیں باہر گئے ہیں!" لڑکی کے تیکھے نقوش کی طرح اُس کا لہجہ بھی تیکھا تھا۔

لڑکی کا جواب سُن کر کرپال نے میری طرف دیکھا۔

"مسز کرنل گھر میں ہیں؟" میں نے لڑکی سے پُوچھا۔

"جی ہاں۔ آپ بیٹھئے، میں اُنھیں بھیجتی ہوں" لڑکی نے برآمدے میں پڑی اُن کرسیوں کی طرف اشارہ کیا جنھیں وہ جھاڑ چکی تھی اور کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

کچھ لمحوں تک کوئی نہ آیا۔ میں برآمدے میں کھڑے کھڑے باہر ہی سے گھر کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا رہا۔ میرے دماغ کی نسیں اُسی طرح تنی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور ہمارے سامنے مسز کرنل کھڑی تھی۔

"اوہ انجینئر صاحب! آپ تو کئی دنوں میں نظر آئے!"

"بس جی یوں ہی مصروف رہا" کرپال نے جواب دیا۔ میں اُس عورت کے سراپا کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ "یہ میرے دوست ہیں مسٹر ملہوترہ، پنجاب میں انجینئر ہیں" مسز کرنل نے ایک بار بہت توجّہ سے مجھے دیکھا۔

"محسوس ہوتا ہے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟" میں نے اُسے اور بھی دھیان سے دیکھا۔ انسان کی شخصیت کی کچھ بنیادی چیزیں وقت کے ساتھ کبھی نہیں بدلتیں۔ وہ چاہے کتنا بھی بدل جائے۔ اُس کے جسم میں کیسی بھی تبدیلیاں رُونما ہو جائیں لیکن ایک نہ ایک پہلو ایسا رہ جاتا ہے جو فوراً پہچانا جاتا ہے۔

"جی ہاں، مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے" مسز کرنل نے جب اپنے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے آنکھیں جھپکیں تو دو گہری نیلی آنکھیں جن میں شرارت ڈورے ہوا کرتے تھے ایکدم میری نگاہوں کے سامنے چمک اُٹھیں۔ بیس برس پہلے کی گرد کی تاریکی میں جیسے کوئی شمع جل اُٹھی ہو۔ اچانک اور غیر متوقع طور پر!

"او! ماسٹر جی!" اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

"کتنا زمانہ گزر گیا! ہم کتنے بدل گئے ہیں۔ ماحول اور حالات کتنے تبدیل ہو گئے ہیں!"

میں نے ایک بار پھر اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا جو ایکدم زیادہ نیلی اور زیادہ گہری ہو گئی تھیں اور جن میں ایک عجیب طرح کی چمک اُبھر آئی تھی۔

"انجینئر صاحب! میں اِن کی سٹوڈنٹ رہی ہوں۔ ہائے کیا زمانہ تھا وہ! میں اِن پر کتنا ڈپینڈ کیا کرتی تھی۔ اُن دنوں اِن کے سوا میرا کوئی رازدار نہ تھا۔ کوئی دوست نہیں، کوئی ایڈوائزر نہیں ——— ان کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے"

"آپ اندر آیئے۔ وٹ اے سٹوپڈ لیڈی آئی ایم!" وہ مُسکرائی۔ پھر اُس نے دروازہ کھولا اور ہمیں ڈرائنگ رُوم میں لے گئی اور میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ میرے دماغ کی نسوں کا تناؤ ویسا ہی تھا۔

"لالہ رُخ!" اُس نے آواز لگائی اور وہی پہاڑی لڑکی ایک لمحہ کے بعد کمرے میں آگئی۔

"بہت اچھی چائے بناؤ!"

لڑکی چلی گئی۔

"آپ کو یاد ہے میں اپنے نوکروں سے کتنی پریشان تھی اُن دنوں۔ آپ سے میں نے کہا تھا کہ میں کسی خوبصورت لڑکی کو ملازم رکھوں گی اور اُسے لالہ رُخ کے نام سے پُکارا کروں گی"

"جی ہاں یاد ہے" میں نے جواب دیا۔

"تو اِس لڑکی کا اصلی نام لالہ رُخ نہیں؟" کرپال نے پُوچھا۔

"اصلی نام تو بے چاری کا کلّو ہے۔ لیکن ہمارے اصلی نام کب تک ہمارا ساتھ دیتے ہیں! یا یوں کہیے کہ ہم اپنے اصلی ناموں سے چھٹکارا پانے کی ہمیشہ ہی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ماسٹر جی جب مجھے پڑھایا کرتے تھے، راجندر ناتھ تھے اب انجینئر ملہوترہ بن گئے ہیں۔ میں کبھی رُکمنی دیوی ہوتی تھی، پھر رُکمنی گپتا بنی، پھر سروج بھاردواج بنی اور اب مسز کرنل ہوں۔ اپنا ہر نام میں نے اپنی مرضی ہی سے بدلا ہے۔ کسی اور کے کہنے سے تو نہیں"

"لالہ رُخ نام بہت پیارا ہے" کرپال نے کہا۔

"لڑکی کم پیاری ہے کیا؟" وہ ہنس دی اور میں نے محسوس کیا جیسے ایک ساتھ کئی خوبصورت ہنسی ہنستی تھیں۔ ہر کمنی دیوی، ہر کنی گیتا، سروج بھاردواج اور مسز کرنل، کتنی شخصیتیں ہیں ان میں، کتنی ماحول، کتنی فضائیں، کتنی لمحے، کتنی زمانے چھپے تھے۔ ایک ہی لمحہ میں، ایک ساتھ کتنے لوگ ہنس سکتے ہیں ایک ہی ہنسی میں۔ کتنے لوگ رو سکتے ہیں، ایک ہی آنسو کی نمی میں۔ کتنی آہیں سلگ اٹھتی ہیں ایک ہی آہ میں۔ ایک انسان کے مرنے یا جینے سے کتنے ہی انسان مر یا جی جاتے ہیں!

مجھے محسوس ہوا میرے دماغ کی نسیں ٹوٹ جائیں گی۔

"آیئے ماسٹر جی میں آپ کو اپنا گھر دکھاؤں۔"

میں صوفے سے اٹھا۔ کرپال وہیں بیٹھا رہا اور اس نے اسے اٹھنے کو کہا بھی نہیں۔ جیسے وہ مجھے یوں اچانک دیکھ کر ہر کسی کے وجود سے غافل ہو گئی تھی۔

ڈرائنگ روم سے نکل کر کھلنے والے کمرے کی دیواروں پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے وہ مجھے دوسری طرف کے برآمدے میں لے آئی جس کے سامنے وہ چھوٹی سی خوبصورت گھاٹی تھی جو اوپر سڑک سے نظر آتی تھی اور جس میں بہتے نالے کا پانی چمک رہا تھا۔ گھاٹی کے اوپر پہاڑوں کا سلسلہ اور چیلوں کے درخت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔

"یہ ساری پہاڑی وہ ارتھ پڑھے جسٹ ڈی دلیپ کرنے میں میں آجکل لگی ہوں۔ سب سے اچھے ویرائٹی کے سیب ہیں یہ۔" برآمدے کے سامنے خوبصورت لان تھا جو پھولوں سے بھرا تھا۔ برآمدے میں بیلوں کی اتنی بہتات تھی کہ وہ خوشبوؤں سے بھرا ایک کنج معلوم ہو رہا تھا۔ ادھر سے گھما کر وہ مجھے اپنے اسٹڈی روم میں لے گئی جو کتابوں سے بھرا تھا۔ ایک طرف ایک بہت ہی صاف ستھری قیمتی میز تھی جس کے ساتھ لگی کرسی کا زاویہ بدلا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے آنے پر وہ کرسی سے اٹھ کر باہر گئی تھی اور کرسی کے سرکانے ہی سے زاویہ بدلا تھا۔ میز پر ایک آدھی کھلی کتاب پڑی تھی جس کے ساتھ ایک سرخ رنگ کی پنسل رکھی تھی۔

"جیسا آپ نے مجھے بیس برس پہلے کہا تھا میں کتاب کے کسی صفحے کو موڑتی نہیں، نہ کتاب الٹی رکھتی ہوں۔ جو سطر پسند آتی ہے اس کے نیچے سرخ لکیر کھینچ دیتی ہوں۔ کتاب کے پہلے صفحے پر اوپر والے حصے کی بجائے سب سے نچلے حصے کے دائیں کونے میں اپنا نام لکھتی ہوں اور جگہ اور تاریخ درج کرتی ہوں جہاں اور جب کتاب خریدی تھی ـــــ یہی تو کہا کرتے تھے نا آپ؟" اس نے میری طرف دیکھا اور پھر بہت شفقت سے اپنا ہاتھ میرے بالوں پر پھیر دیا۔

"ایسے ہی پھیرا کرتی تھی نا ہاتھ میں آپ کے بالوں پر؟"

میں ایکدم خاموش تھا اور اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی گہری نیلی آنکھوں میں نیم گلابی مدھم ڈورے اور سرخ ہو رہے تھے۔

"ان کتابوں میں وہ کتابیں بھی موجود ہیں جو آپ نے مجھے دی تھیں اور جن پر آپ نے اپنے ہاتھ سے میرا نام لکھا تھا۔ میں نے ان سب کتابوں پر اپنے نام کے اوپر بعد میں آپ کا نام لکھ ڈالا تھا۔ ان کتابوں پر دو نام ہیں اور دونوں کی تحریر مختلف ہے جس کا نام ہے اس کی تحریر نہیں اور جس کی تحریر ہے اس کا نام نہیں۔" وہ مسکرائی۔ "لیکن آپ تو ایکدم سیریس ہو گئے ہیں۔"

"نہیں۔ ایسی بات نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر وہ مجھے کندھے پر ہاتھ رکھے گیسٹ روم میں لے گئی جو نہایت ہی خوبصورت انداز سے آراستہ تھا۔

"لیکن آپ کا قیام یہاں نہ ہوگا۔ یہ مہمانوں کے لئے ہے۔"

"میں مہمان نہیں ہوں کیا؟"

"بیس برس کے بعد آنے والا مہمان نہیں ہوتا۔"

"تو کیا ہوتا ہے وہ؟"

"وہ ایک خدائی نعمت ہوتی ہے! ایک فرشتہ ہوتا ہے! ایک خدا ہوتا ہے!!"

"سروج!" میں جیسے چیخ اٹھا تھا۔ "تم بیس برس کے بعد بھی اتنی ہی جذباتی ہو؟"

"برا معلوم ہوا تمہیں؟"

"کہہ نہیں سکتا۔"

"کیا تمہاری زندگی نے، تمہارے پروفیشن نے، تمہارے مسائل نے تمہارے جذبات تم سے چھین لئے ہیں؟"

"نہیں میں نے کسی کو ایسا نہیں کرنے دیا۔ کچھ لوگوں کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہی ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔"

پھر وہ مجھے اس کمرے سے نکال کر ایک اور کمرے میں لے آئی۔ یہ کرنل کا بیڈ روم تھا۔ جس میں فوجی تمغے، تین چار قسم کی بندوقیں، ایک پریس کی ہوئی پرانی فوجی وردی، تین چار جوڑے پالش کئے ہوئے جوتے اور سامنے دیوار پر ایک شیر کا سٹفڈ سر ٹنگا ہوا۔

مجھے ایکدم بیس برس پہلے کا منظر یاد آگیا جب میں پہلی بار سروج کو پڑھانے گیا تھا۔ وہ زمانہ کرنل کے اقتدار کا زمانہ تھا جس کمرے میں مجھے بٹھایا گیا تھا وہاں بھی سامنے کی دیوار پر شیر کا سٹفڈ سر لکڑی کے فریم میں جڑا لٹکا تھا۔ میں گریجویشن کر چکا تھا لیکن انجینئرنگ میں داخلہ لینے کے لئے روپے نہیں تھے۔ مجھے دو دو برس ٹیوشن ورک کرکے رقم اکٹھی کرنی تھی، سروج سے ملاقات اسی سلسلے میں ہوئی تھی۔ میں نے جب اُسے پہلی بار دیکھا تھا تو وہ ایک لڑکی نہ تھی۔ بھرپور عورت تھی جسے کرنل کہیں سے بیاہ کر لایا تھا۔ اُس کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں تھیں۔ لیکن جس شخص نے میرا نام تجویز کیا تھا اُس نے میری بے حد تعریف کی تھی اور مجھے کہا تھا کہ کرنل کی بیوی بی۔ اے کا پرائیویٹ امتحان دینا چاہتی تھی، دو برس کی بجائے ایک برس میں فیس معقول تھی، میں نے حامی بھر لی تھی۔ لیکن گھر کا فوجی رکھ رکھاؤ دیکھ کر من کچھ بجھ گیا تھا جب میں نے ٹیوشن شروع کی تو مجھے معلوم ہوا کہ سروج کا کہیں بھی آنا جانا نہیں تھا۔ وہ سارا دن گھر ہی میں رہتی تھی۔ اس لئے اُس نے کئی برس کی چھوڑی ہوئی تعلیم دوبارہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

سروج کی زندگی کی قدریں خاصی اُلجھی ہوئی تھیں۔ وہ شادی کر لینے کے بعد بھی یہ فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ اُسے ایسا کرنا چاہئے تھا کہ نہیں؟ اُس کے پہلے خاوند کو مرے پانچ برس ہو گئے تھے اور اُس نے اس عرصہ کے بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ کرنل اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے چکا تھا اور اُس نے بھی دوسری شادی کی تھی۔ اِس طرح دونوں کی یہ دوسری شادی تھی۔ کرنل رنگین مزاج انسان تھا اور اسی کے ساتھ شکی اتنا کہ گھر کے اردلی پر بھی اعتبار نہ کرتا تھا۔ سروج کو مجھ میں اسی لئے دلچسپی تھی کہ میرے سوا گھر میں اُسے کوئی نہ ملتا تھا اور اسی لئے بھی کہ میں اُس سے ادب کی اور فن کی اور تصویروں کی باتیں کر سکتا تھا۔ یہ دلچسپی رفتہ رفتہ دوستی میں بدل گئی اور وہ میرے ساتھ زندگی کے کئی اہم اور بے حد ذاتی مسئلوں پر گفتگو کرنے لگی اور ایک ایسا وقت آگیا جب میں اُس کا ہمدم اور رازدار تھا۔

بہت دن گزر گئے۔ شروع شروع کی قربت گہری دوستی میں بدل گئی اور ہم بہت قریب ہو گئے۔ لیکن اپنی اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس رہا۔ لیکن ایک دن ایک ایسی بات ہو گئی جس سے حالات نے اچانک ایک عجیب سا موڑ لے لیا۔ اُس دن سروج کا کرنل سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں جب اُسے پڑھانے گیا تو اُس نے بیماری کا بہانہ کرکے مجھے باہر ہی سے واپس کر دیا تھا۔ یہ ایک نئی بات تھی اور اس سے مجھے صدمہ ہوا۔ اُس کے گھر سے واپس آتے ہوئے سائیکل چلاتے راستے بھر میں اُس کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور پھر میں کئی دنوں تک اُس کے ہاں نہیں گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہاں کبھی نہ جاؤں گا! اور پھر ایک دن اُس کا اردلی میرے گھر آیا اور کہا کہ سروج مجھ سے فوراً ملنا چاہتی ہے اور مجھے ضرور جانا چاہئے۔ میں جب اُس کے گھر پہنچا تو وہ برآمدے میں کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ اردلی میرے لئے گیٹ کھول کر خود بنگلے کے پیچھے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ سروج نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ خیریت تک نہ پوچھی۔ اُس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا، مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا اور پھر کمرے میں آکر مجھے ایکدم گھورنے لگی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

"کون ہو تم اور یہاں کیا کرنے آئے ہو؟" میں حیران سا اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"بولتے کیوں نہیں، تم کون ہو؟" وہ پھر بولی۔

"مجھے معلوم نہیں،" میں نے جواب دیا۔ "میں خود نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔"

"لیکن میں جانتی ہوں، تم وہ شخص ہو جس نے مجھے کئی مہینوں تک بھٹکایا ہے۔ مجھے نیم بے ہوشی کی حالت میں ایک ڈریم لینڈ میں دھکیلتے رہے ہو جس کے دروازے باہر سے بند تھے۔"

"نہیں دروازے کبھی بند نہیں تھے۔ تمہاری آنکھیں بند تھیں" میں نے کہا۔ "اور کتنی خوبصورت ہیں تمہاری آنکھیں! ان میں سینکڑوں ڈریم لینڈز بکھر رہے ہیں۔ کبھی دیکھا ہے تم نے اپنی آنکھوں کو آئینے میں؟"

"ہاں دیکھا ہے لیکن میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ اپنی فیس کا حساب کر لو۔ تم نے پچھلے چار ماہ سے فیس نہیں لی۔"

"مجھے اپنی محنت کا پورا صلہ مل گیا ہے، مسز کرنل!" میں یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے دیکھا میز پر میرے نام کا لکھا ہوا دستخط شدہ بغیر رقم بھرا چیک پڑا تھا۔

"رُکو! یہ چیک لے جاؤ!"

"اب نہیں۔ زندگی میں پھر کبھی بلا تو لے لوں گا۔"

یہ کہہ کر میں چلا آیا تھا اور وہ برآمدے میں کھڑی مجھے دیکھتی رہی تھی اور جب میں سڑک پر آگیا تو وہ پیچھے کی طرف کھسکتے ہوئے برآمدے میں کھڑی تھی۔

یہ سروج سے آخری ملاقات تھی۔

مجھے سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر اُس نے کہا۔

"شیر کو دیکھ کر ڈر گئے ہو، یہ تو سٹفڈ ہے!"

"بیس برس پہلے بھی تو یہ سٹفنڈ ہی تھا" میں نے جواب دیا۔
"سو تو تھا ہی" اس نے بھرپور نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
اور ایک بار پھر ڈرائنگ روم سے نکل کر ایک اور کمرے کی طرف مڑی۔ ڈرائنگ روم میں تپائی پر چائے کا سامان رکھنے کی آواز آرہی تھی۔

"الہ رکھی چائے لے آئی ہے" میں نے کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھے وہ جس کمرے میں داخل ہوئی وہ اس کا بیڈ روم تھا۔ دیوار سے لگا ہوا ایک ہی پلنگ جس پر نہایت ہی خوبصورت بیڈ کور بچھا تھا۔ دیواروں پر خوبصورت ترین تصویریں اور سامنے کی کھلی ہوئی کھڑکیوں سے ہمالہ کی برف سے ڈھکی چوٹیاں! ایکدم طلسمی ماحول!

"یہ ہے میرا ڈریم لینڈ" وہ مسکرائی اور اچانک میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "میرے پرنس چارمنگ، گاڈ بلیس یو!"

اور پھر باہر سے آواز آئی۔

"میم صاحب چائے رکھ دی ہے!"

اور پھر وہ بغیر کچھ کہے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے مجھے ڈرائنگ روم میں لے آئی جہاں کرپال بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔

چائے پی چکنے کے بعد کرپال نے اور میں نے چلنے کی اجازت مانگی۔
"کرنل صاحب آتے ہی ہوں گے، انجینئر صاحب!" اس نے مخاطب کرپال کو کیا تھا، مجھے نہیں۔
"پھر کبھی حاضر ہوں گا" یہ کہہ کر کرپال نے دروازہ کھولا میں بھی باہر آگیا۔
سروج ہمیں بنگلے کے باہر والے چھوٹے گیٹ تک چھوڑنے آئی گیٹ سے باہر نکل کر لیچ بند کرتے ہوئے کرپال نے کہا۔

"آپ نے اپنے بنگلے کا نام بہت خوبصورت رکھا ہے!"

"جی" وہ مسکرائی اور پھر ایکدم بنگلے کی طرف پلٹ گئی اور میں نے دیکھا اس کی گہری نیلی آنکھوں میں نہ جانے کتنے ہی ڈریم لینڈز کے جلتے ہوئے کھنڈروں کا دھواں سلگ اٹھا ہو۔

کرپال اور میں کچھ دیر تک خاموش چلتے رہے۔ جیسے ہمارے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ رہا تھا۔

جوں ہی ہم سڑک کے موڑ پر پہنچے تو میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کر دیکھا۔ ایک پکی عمر کا شخص ہاتھ میں فوجی چھڑی لئے ڈریم لینڈ کا گیٹ کھول رہا تھا!!

---

ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی
جانشین حضرت داغ دہلوی

ہوگئی راہِ طلب اور بھی مشکل مجھ کو — نئی منزل نظر آئی سرِ منزل مجھ کو
تھا دلآ ویز کچھ ایسا مرا اندازِ جنوں — ہوش مندوں نے کہا رونقِ محفل مجھ کو
اتنے چرکے دئے احساسِ ندامت نے انھیں — قتل کے بعد سمجھتے ہیں وہ قاتل مجھ کو
لوگ یہ بات اُچھالیں گے کہ جی چھوڑ دیا — جینا مشکل ہے تو مرنا بھی ہے مشکل مجھ کو
بارِ خاطر تھی اگر تجھ کو مری آہ و فغاں — کیوں دیا روزِ ازل دردبھرا دل مجھ کو
ناخداؤں کی تو کوشش تھی سراسر ناکام — نہ نشیں ہو کے نظر آیا ہے ساحل مجھ کو
خستگی میں بھی جو گر گر کے سنبھلتے دیکھا — آفریں کہنے لگی دوریِ منزل مجھ کو
کل کی ہر بات کہ خود دل کو میں سمجھاتا تھا — آج یہ کیا ہے کہ سمجھانے لگا دل مجھ کو
یہ اندھیرا یہ بیاباں یہ بھیانک منزل — کس جگہ چھوڑ گیا رہبرِ منزل مجھ کو
میں تو غافل تھا مگر یہ بھی کہوں گا یارب — تیری رحمت نے کیا اور بھی غافل مجھ کو

کیف پرور تھے مرے شعر کچھ ایسے اے جوش
اہلِ محفل نے کہا ساقیٔ محفل مجھ کو

جوش ملسیانی

# تازہ ہوا اور باسی پھول

پروفیسر عاصی کرنالی ایم۔ اے

اسلامیہ کالج ملتان (پاکستان)

عالی جاہ!

تقریباً ایک سال سے "بیسویں صدی" کی محفل سے غیر حاضر ہوں۔ آپ نے پوچھا ہی نہیں کس حال میں ہوں بہر حال اب حاضرِ خدمت ہو گیا ہوں۔ "تازہ ہوا اور باسی پھول" نذر ہیں۔ قبول کیجئے۔ یہ ایک تجزیاتی افسانہ ہے۔ طلعت اس کا مرکزی کردار ہے اُس نے خود اپنی شخصیت پر قلم اُٹھایا ہے اور اُسے دو ٹکڑوں، جسم اور ذہن میں تقسیم کر دیا ہے۔ شخصیت ایک اکائی ہے۔ لیکن طلعت اِسے ٹکڑے کر دینے پر مُصر ہے۔ پھر وہ ایک ایک ٹکڑا اٹھاتی ہے اور دونوں کی پیوندکاری سے ایک نئی شخصیت کی تخلیق کرنا چاہتی ہے!....

آپ کا ——— عاصی کرنالی

ڈیر سہیلی ناز

تم اچھی ہونا؟ کہو شادی راس آئی؟ دولہا بھائی کیسے نکلے؟ مزاج کیسا ہے؟ صورت شکل کیسی پائی ہے؟ ایک تصویر تو بھیجنا اُن کی، ہم بھی دیکھیں، ناز کے دولہا خیر سے کیسے ہیں۔ کبھی میں شادی میں شریک نہ ہو سکی۔ بہت افسوس ہے تم دونوں ہمارے شہر آ نکلو نا!

ناز! تم نے اپنے پچھلے خط میں پوچھا تھا، کیسی گزر رہی ہے—؟ تمہارے اِس فقرے نے دل کے زخم کرید ڈالے۔ جی چاہا تمہیں سب کچھ لکھ ڈالوں۔ تم سے پیاری میری سہیلی کون ہے۔ ناز! میری شادی کو پندرہ سولہ برس ہو گئے ہیں۔ خدا نے پانچ بچے دیئے۔ یوسف یعنی تمہارے دولہا بھائی عالم فاضل آدمی ہیں۔ اُنہوں نے مجھے پڑھایا اور پڑھوایا۔ تم تو جانتی ہو جب میری شادی ہوئی میں پانچ جماعت پاس تھی۔ اب میں خیر سے ایم اے ہوں اور ایک کالج میں پروفیسر ہوں۔ یہ سب یوسف کا احسان ہے اور سچی بات یہ ہے کہ میرا تو بال بال اُن کا احسان مند ہے۔ لیکن ناز! زیادہ علم نے اُنھیں بہت سنجیدہ بنا دیا ہے۔ بہت محتاط اور پُر تکلف سی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ تم جانو میں ایک زندہ دل لڑکی ہوں اور ذہنی طور پر بچپنے کے عہد میں زندگی گزارنا میری فطرت ہے۔ تمہیں یاد ہے نا! ایک دن تم اور میں آموں کے ایک باغ میں گھس گئے تھے اور آم چُراتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ بس وہی چوری چھپے کی عادت پختہ ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے، میں اپنے ذہن کو زنجیریں نہیں پہنا سکتی۔ میں پروفیسر ہوں لیکن میرا بچپنا میرے ساتھ ہے۔ جس دن اِس نے ساتھ چھوڑ دیا، یوں سمجھنا تمہاری طلعت کی موت ہو گئی۔ کیسا آدمی ہے یوسف بھی، کہتا ہے ذہن کے دریچے اور دل کی کھڑکیاں بند رکھو مطلب یہ ہوا کہ کہیں سے تازہ ہوا کا جھونکا نہ آ ئے۔ بس گھُٹ کے مر جاؤ۔ لیکن ناز! ذہن کے دریچوں کو کتنا ہی مقفل کر لو۔ تازہ ہوا کا کوئی نہ کوئی شوخ و شریر جھونکا آ ہی نکلتا ہے۔ یہ جھونکے میری زندگی ہیں۔ کیوں کہ یوسف کو علم اور متانت کی گھٹن نے باسی پھول بنا دیا ہے اِس لئے اُسے یہ جھونکے ناگوار ہی گزرنے چاہئیں۔ میں یوسف سے محبت کرتی تھی اور کرتی ہوں۔ وہ میرا شوہر ہے۔ وہ میرے جسم اور میرے پورے مادّی وجود کا مالک ہے۔ ناز! وہ میرے ذہن اور خیالات کا بھی مالک رہا ہے۔ لیکن یہ بہت شروع کی بات ہے۔ شادی کے وقت وہ حسین تو نہ تھا لیکن قبول صورت

ضرور تھا۔ چہرے میں سانولے پن کا نمک تھا۔ آنکھیں چھوٹی لیکن ذہانت کی چمک سے معمور۔ مسکراہٹ میں بھی جان تھی۔ سب سے زیادہ اُس کی سبھی گفتگو نے مجھے متاثر کیا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ اُس کی شخصیت پر علم اور ذہانت کا غلبہ چھاتا چلا گیا۔ کثرتِ مطالعہ نے اُسے گنجا کر دیا۔ آنکھیں اور چھوٹی ہو گئیں۔ چہرے کا نمک نہ جانے کہاں گھل گیا۔ تم جانو میں ہمیشہ سے جمال پرست ہوں۔ میرے ذوق کو بڑا دھچکا لگا۔ میں اب بھی اُس سے محبت کرتی ہوں۔ لیکن اِس جذبے پر احترام کا رنگ غالب ہے۔ میں اُسے اپنے بچوں کا باپ سمجھتی ہوں اور جب وہ مجھے نصیحتیں کرتا ہے تو میرا باپ معلوم ہوتا ہے۔ اُس کے مجھ پر عظیم احسانات ہیں۔ آج میرا علم، عزت، عہدہ سب اُس کی دین ہے۔ اُس نے مجھے پڑھانے اور میری شخصیت بنانے میں خود کو قربان کر ڈالا۔ اپنی صحت تباہ کر لی۔ اِسی لئے میں اُس کا بے حد احترام کرتی ہوں۔ لیکن میرا بچپنا، میری زندہ دلی، میری جمال پرستی مجھے تازہ ہوا کی طرف بلاتی ہے اور اُسے تازہ ہوا سے چڑ ہے۔ وہ مجھے لیکچر پلاتا ہے —— تازہ ہوا سے بچو۔ اِس سے نمونیہ ہو جاتا ہے زکام کا خطرہ ہے۔ فالج کا امکان بھی ہے۔ میں دل میں کہتی ہوں، علم کی زہریلی اور بدبودار ہوا نے اِس شخص کو مسموم کر دیا ہے۔ بے چارہ قابلِ رحم ہے!

ایک دن میں بازار گئی۔ میرے بچوں کا باپ میرے ساتھ تھا۔ ایک جانب سے تازہ ہوا کا جھونکا آیا۔ یہ جنرل سٹور تھا۔ یہ اُس مہکتی ہوا کا مرکز تھا۔ یہ خالد تھا، اِس دکان کا نوجوان اور خوب صورت مالک۔ میں نے اُسے دیکھا۔ وہ مسکرایا۔ یہ شوخ و شریر جھونکا میرے ذہن کے دریچے کے کسی چھوٹے سے سوراخ سے آ گھسا۔ میرے دل و دماغ معطر ہو گئے۔ ساری رات یہ جھونکا میرے ذہن میں سیٹیاں بجاتا رہا۔ میں اگلے دن شاپنگ کو گئی۔ پھر گئی۔ پھر گئی جاتی رہتی ہوں اور یہ تازہ ہوا اپنی خوشبو سے میرے وجود کو مہکاتی رہتی ہے۔

ناز! دنیا میں اِن جھونکوں، اِن معصوم اور پُرخلوص ہواؤں کی کمی نہیں۔ جب ہم ایک لمبی اور گہری سانس لیتے ہیں تو یہ جھونکے ہماری روح میں اُتر جاتے ہیں اور ہمیں ہزار برس کی زندگی عطا کر جاتے ہیں لیکن گنجے لوگ ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی جھونکا اُن کی کھوپڑی کو چٹخا کر نہ رکھ دے۔ میرا شہر اِن معطر جھونکوں کا مسکن ہے۔ یہاں رشید بھی ہے۔ اسلم بھی ہے۔ عشرت بھی ہے۔ نوید بھی ہے۔ جاوید بھی ہے اور نسیم بھی ——!

اور یہ بے ضرر سے مسکراتے سے جھونکے مجھے اور مجھ جیسے تمام اہلِ ذوق کو زندہ رکھتے ہیں!

نہیں معلوم، میری طبیعت کو کیا ہو گیا ہے۔ شام کو گھر میں جی نہیں لگتا جیسے شام کی اُداسی مجھے ڈس لے گی۔ گو میں ننھے منے بچے ہیں مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ مجھ سے محبت چاہتے ہیں۔ لیکن میں گھر سے اکثر غائب رہتی ہوں۔ بچے میرے ہیں۔ لیکن بہت غیر مہذب ہیں۔ چاہتی ہوں اُنہیں تہذیب سکھاؤں۔ لیکن مجھے پر دیسری بھی کرنی ہوتی ہے۔ پھر شاپنگ وغیرہ کے لئے بھی جانا پڑتا ہے۔ سوشل مصروفیات بھی جان کو لگی ہوئی ہیں۔ میں ویسے اُن سوشل تقریبات کا بائیکاٹ کر دیتی ہوں جہاں صرف بیگمات ہوں۔ اِن کم بختوں کو اپنی نمائش کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ ہر وقت اپنی انا میں مُبتلا رہتی ہیں۔ رلی مِلی تقریبیں کتنی بھلی ہوتی ہیں۔ اُن میں ہواؤں کے تازہ اور مہکتے جھونکے بھی ہوتے ہیں جو ہم سے کچھ نہیں لیتے اور ہمیں بہت کچھ دے جاتے ہیں!

ناز! تم یہ خیال نہ کرنا کہ خدا نہ کرے میں ایسی ویسی ہوں۔ خدا گواہ ہے میرا جسم میرے شوہر کی ملک ہے۔ کوئی اور مجھے چھو کر دیکھے میں اُسے قتل نہ کر ڈالوں۔ میں بددیانت نہیں ہوں۔ لیکن بھئی! میرا ذہن میرا اپنا ہے۔ یہ میری خاص ملک ہے۔ اِسے میں جیسے چاہوں استعمال کروں اور خدا مارے یا چھوڑے میں تازہ ہوا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

کم بخت گنجا، بدصورت —— توبہ توبہ! بھئی معاف کرنا میں ذرا جذباتی ہو گئی تھی۔ آخر وہ میرا شوہر، میرا محسن اور میرا اُستاد ہے۔ اِس لئے قابلِ احترام ہے۔

بہرحال، وہ کچھ مجھ سے کھٹک گیا ہے۔ کچھ شک اور وسوسے اُس کے قدامت پسند دماغ میں کیڑوں کی طرح رینگنے لگے ہیں۔ کاش! وہ میرے نظریے کی عظمت اور تقدس کو سمجھ سکتا۔ کاش وہ جان سکتا میرا جسم اُس کا ہے۔ میں ننانوے فی صد اُس کی ہوں۔ لیکن ایک فی صد مجھے تازہ ہوا میں جینے کا حق ہے۔ وہ اتنا پڑھا لکھا ہو کر قطعاً رومان پسند نہیں ہے۔ میں گلاب کا پھول اِس لئے دیکھتی ہوں کہ اُس سے حصولِ مسرت کر سکوں۔ وہ اِسے نظروں کی بددیانتی کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے مجھ سے حصولِ مسرت کرو۔ پندرہ سال گزرنے کے بعد میں اُس سے کیسے حصولِ مسرت کروں —— پچھلے ہفتے خالد اور اُس کی کزن آ گئے۔ کچھ پینے پلانے کی بات چل پڑی۔ یوسف کو کپوں پر چھوڑ گئی۔ آئی تو منہ پھُلا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا،

کیا ہوا ؟ کھٹکے گا، تمہیں ذہنی طور پر اتنا کرپٹ نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے طیش تو آیا لیکن پی گئی۔ دوسرے دن بعد رات کو گیارہ بجے گھر آیا۔ کہاں تھے آپ ؟ میں نے پوچھا۔ بھئی وہ میں بجرہ ہی نا ہماری ٹائپسٹ وہ اور اُن کے ایک رشتے کے بھائی اور میں ذرا پکچر چلے گئے تھے۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے سوچ خود تو بس بجرہ کے ساتھ گل چھرّے اُڑاتا ہے اور میں کسی شریف نوجوان کے ساتھ چلی جاؤں تو نام رکھتا ہے۔ کرپٹ کہیں کا ! میں نے کبھی کسی دن مرد سے بات نہیں کی۔ ویسے اُسے میری بے نیازی سے اپنے ظاہری رنگ روپ کی کمی کا احساس ہو گیا ہے۔ اب وہ مجھے دوسرے دام پھیلا کر جیتنا چاہتا ہے۔ وہ گھر میں برتن مانجھتا ہے۔ میرے کپڑوں پر استری اور جوتی پر پالش کرتا ہے۔ گھر میں جھاڑو دیتا ہے۔ کمرے صاف کرتا ہے۔ میرے بچوں کے لئے کھانا اُتارتا ہے اور اُنہیں کھلاتا ہے۔ چھوٹے بچوں کو گود میں رکھتا ہے۔ سمانتا کو میرا بدن دابتا ہے اور پاؤں چومتا ہے۔ میں اپنے بستر اُس سے مکمل پاتی ہوں۔ میرے پرچے وہ بناتا ہے۔ لڑکیوں کے جوابات کی کاپیاں وہ جانچتا ہے۔ اچھا خاصا مُفت کا نوکر ہے۔ خدا کی قسم ! کتّے کی طرح وفادار ہے۔ لیکن نوکر اور کتّے سے حصولِ مسرت کس حد تک ممکن ہے ؟

پچھلی چھٹیوں میں ہم سب ایبٹ آباد چلے گئے۔ وہاں میری رشتے کی پھوپھی ہیں، اُن کے گھر ٹھہرے۔ ایبٹ آباد میں انجم مل گیا۔ وہی میرا لڑکپن کا دوست۔ جس نے مجھ سے محبت کی۔ مجھے اپنانے کے لئے فوج کی ملازمت چھوڑ دی اس لئے کہ میرے بزدل باپ کا خیال تھا میری بچی جلد بیوہ ہو جائے گی کیوں کہ فوجی جلد مر جاتے ہیں۔ انجم نے میری خاطر فوج کی نوکری پر لات مار دی اور ایک دفتر میں جونیئر کلرک ہو گیا۔ میرے باپ نے پھر اُسے مسترد کر دیا کیونکہ وہ معاشرے کا حقیر فرد تھا یعنی کلرک تھا۔ کچھ عرصے بعد اُس نے پھر آرمی جوائن کر لی۔ اُس کی بے عزتی ہوئی تھی اس لئے وہ انتقاماً ہم سے دُور ہوتا چلا گیا۔ لیکن وہ میرے تحت الشعور میں بس گیا تھا۔ اُس کی قربانی نے میرے وجود کو ہلا ڈالا تھا۔ میں فوجیوں کا احترام کرنے لگی۔ سانولی، سمارٹ زندگی، اُن کے بھرے بھرے چہرے، ان کا ورزشی جسم، اُن کی تندروی، ان کا حسن تکمیل مجھے پسند آنے لگا۔ اس پسند کا پس منظر وہی میرے تحت الشعور میں بسا ہوا فوجی انجم تھا۔ بیس سال بعد میں نے اُسے ایبٹ آباد میں دیکھا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے خوشبودار ہواؤں کے سینکڑوں جھونکے ایک دم میرے ذہن کے بند دریچے پر حملہ آور ہو گئے ہیں اور انہوں نے ایک پٹ توڑ دیا ہے۔ ذہن کے مقفل قید خانے کی چابی یوسف کے پاس تھی۔ لیکن قفل ٹوٹ چکا تھا۔ ایبٹ آباد میں میں سکون کی تلاش میں گئی تھی۔

بین اضطراب لے کر لوٹی۔ انجم نے شادی کر لی تھی۔ اُس کے سات بچے تھے۔ لیکن اُس کی نگاہوں میں شکست کا جو کرب تھا اُسے میں برداشت نہ کر سکی ! میرے عالم اور ذہین شوہر نے اُس اضطراب کی لَم کو سمجھ لیا۔ وہم کے بدبودار اور غلیظ کیڑے پہلے اُس کے دماغ میں اور پھر اُس کی زبان پر رینگنے لگے۔ میں نے بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کہا ۔۔۔ بدمعاش ! مجھ پر الزام لگاتے شرم نہیں آتی ؟ پھر رو رو کر وہ حشر اُٹھایا کہ محلے بھر کی عورتیں آ گئیں۔ اُن سب نے اُس پر لعنتیں بھیجیں۔ اُس کے بعد وہ بولا ہو تو اُس کی ماں مرے۔ خاموشی سے دُم دبائے وقت گزارتا رہا۔

اے ڈیئر ناز ! ایک ماہ ہوئے میرا تحت الشعور مجسّم ہو کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔ یہ ہوا کا ایک نرم و نازک جھونکا ہے جس نے ذہن پہ ہلکے سے دستک دی اور میں نے دوسرا پٹ بھی گرا دیا ۔۔۔۔۔۔ یہ ہے کیپٹن وقار ! بہاروں کی کوکھ سے اِس سے زیادہ حسین پھول پیدا نہیں ہوا ! میرا شوہر مجھے ہوا کے جھونکوں سے روکتا ہے۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ آئندہ اور کوئی جھونکا میرے ذہن کو نہ گدگدا سکے گا۔ میں پہلے تمام جھونکوں کو واپس کر دیتی ہوں۔ جاؤ، تم سب جاؤ۔ نکلو، جلد نکلو۔ آ جایئے وقار صاحب ! یہ ذہن آپ کا مکان ہے۔ یہ لیجئے اِس مکان کا ملکیت نامہ۔ یہ لیجئے قفل۔ یہ چابی ہے۔ اِسے اندر سے بند کر لیجئے۔ لیکن دیکھئے، آپ میری طرف معنی خیز نظروں سے

نہیں دیکھ سکتے۔ میری طرف ایک قدم نہیں بڑھ سکتے۔ میرا جسم آپ کا نہیں ہے میرے ذہن میں چھلانگیں لگائیے۔ پریڈ کیجئے۔ اگر میں منہ بناؤں تو کورٹ مارشل کر دیجئے!

ناز! میں نے وقار پر کوئی بُری نظر نہیں ڈالی۔ میرے دل میں کوئی SEX پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے کوئی ایسی شے مل گئی ہے جس نے میری شخصیت کے خلا کو پاٹ دیا ہے اور جیسے میں ذہنی طور پر مکمل ہو گئی ہوں۔ میں نے ایک شام صرف یوسف کے ساتھ گزاری۔ اُس نے مجھے پکچر دکھائی۔ اُف کتنی بور تھی پکچر۔ پھر وہ پیراڈائز ہوٹل لے گیا۔ اُف کتنی بدمزہ تھی چائے! کتنے بور گزرے یہ چار گھنٹے ——— اور اگلے دن ہم پھر گھر سے نکل پڑے۔ یوسف ساتھ تھا اور وقار بھی تھا۔ آج بھی ہم نے وہی پکچر دیکھی۔ مارے یہ تو بہترین پکچر ہے! میں نے تو کل خود ہی بور کیا تھا۔ واقعی مزا آگیا! اور کیفے خان کی چائے کا تو جواب ہی نہیں! یوسف بھئی! ہم تو روز یہیں چائے پیا کریں گے۔ وقار صاحب آپ بھی تشریف لائیں گے نا؟

ناز! اُس دن ہم بارہ گھنٹے گھر سے باہر رہے۔ سینما، ہوٹل، گارڈن اور سڑکوں کی آوارہ خرامی۔ قسم لے لو مَیں ذرا بھی بور نہ ہوئی۔ میرا ذہن شگفتہ تھا، معطر تھا، اس لئے کہ ایک نرم و نازک اور شوخ و شنگ جھونکا میرے ذہن کے آنگن میں مُسکرا رہا تھا!

ناز! خط طویل ہو گیا۔ تم بور ہو چکی ہو گی۔ اچھا بھئی ہمارا قصہ ختم یہاں اِس خط کو پڑھ کر جلا دینا ——— اور ہاں دولہا بھائی کی تصویر بھیجنا نہ بھولنا۔ اچھا خدا حافظ!

---

پنڈت بالمکند عرشؔ ملسیانی بی۔اے

## غزل

اِس شمع محبت کے پروانے کو کیا کہئے | دیوانہ ہے دل اپنا دیوانے کو کیا کہئے

کی ترکِ وفا اِس نے غیروں نے بگاڑا کیا | اپنا ہی نہیں اپنا بیگانے کو کیا کہئے

دُنیا میں جسے دیکھا دیوانۂ دنیا ہے | دیوانہ ہے دیوانہ فرزانے کو کیا کہئے

جو چیز حرم میں ہے ہر بُت میں اُسے دیکھا | کعبہ نہ اگر کہئے بتخانے کو کیا کہئے

جلوت میں جو شرمائیں ہے نام حیا اِس کا | خلوت میں حسینوں کے شرمانے کو کیا کہئے

تقدیر جو اُلٹی ہے تدبیر کا رونا کیا | مینا ہی ملا خالی پیمانے کو کیا کہئے

محفل سے گئے جب وہ محفل کی نہ پوچھو کچھ | آنا ہی قیامت تھا اب جانے کو کیا کہئے

آویزشِ باہم بھی آرائشِ پیہم بھی | اُس زلف کو کیا کہئے اُس شانے کو کیا کہئے

جو خدمتِ واعظ میں لاتے ہیں مئے رنگیں | اُن مست فقیروں کے نذرانے کو کیا کہئے

وعدہ ہے جہاں مے کا کہتے ہیں اُسے جنت | حاضر ہے جہاں یہ شے میخانے کو کیا کہئے

ہر چند ہے صحرا بھی ہے سجدہ گہِ دنیا | دیوانۂ اُلفت کے کاشانے کو کیا کہئے

بھرپور اُداسی ہے حیرت گہِ عالم پر | آبادی ہے ویرانہ ویرانے کو کیا کہئے

اُس نے کبھی ہمیں باندھا اُس نے کبھی ہمیں پھانسا | اب دام کو کیا کہئے اب دانے کو کیا کہئے

اے عرشؔ سُنا جس نے ایمان لُٹا بیٹھا
تیرے مئے و مینا کے افسانے کو کیا کہئے

عرشؔ ملسیانی

الف ۲۲، ماڈل ٹاؤن، دہلی ۹

میسرز ... دہلی جنوری ۱۹...

# میں تمہاری ہوں

واجدہ تبسم ایم۔ اے

فلیٹ نمبر ۱۰۔ ریلوے بلاک ۱۳۱۔ شانتا کروز ویسٹ بمبئی نمبر ۵۴

عزیز بھیّا!

آپ کے اتنے سارے خط آپ کی بے پناہ محبت کا ثبوت ہیں۔ آپ نے اتنی چاہت سے کہانی کی فرمائش کی ہے کہ میں بیمار ہونے کے باوجود لکھنے پر مجبور ہو گئی۔ یہ کہانی "میں تمہاری ہوں" میں نے سالنامے کے لئے خاص طور سے ایک ہی سٹنگ میں لکھی ہے ——— ناممکن ہے کہ آپ کو پسند نہ آئے۔ شاید آپ کو کچھ طویل معلوم ہو لیکن یہ تو سوچئے کتنے دنوں بعد "بیسویں صدی" میں آ رہی ہوں۔ (ویسے اگلی کہانی آپ کے حکم کے بموجب جلد ہی بھجوا رہی ہوں) ——— مجھے آپ سے بے حد شکایت ہے کہ آپ اتنی کم دیر کے لئے میرے ہاں آئے (اور آتے ہیں) کہ جی بھر کے باتیں بھی نہ ہو سکیں۔ کھانا کھانا تو بہت دور کی بات ہے! آپ چین سے چائے بھی تو نہیں پیتے۔ بہرکیف میں خوش ہوں کہ آپ جب بھی بمبئی آتے ہیں اپنی بہن کے ہاں آنا نہیں بھولتے ——— آپ نے تصویر کی فرمائش کی ہے! نئی تصویر تو میرے پاس کوئی نہیں ہے۔ دیکھئے اگلے ہفتہ تک ہو سکا تو آپ کی یہ فرمائش بھی پوری کر دوں گی۔ ویسے میری ڈا       جاری ہے (جس کا آپ نے اپنے خط میں حوالہ بھی دیا ہے) پچھلے تین ماہ میں ۲۲ پونڈ گھٹایا ہے ——— آجکل میرے گھر میں اتنے سارے لوگ بیمار ہیں (اور میں بھی) کہ میں تیمارداری کرتے کرتے اور بیماری جھیلتے جھیلتے پریشان ہو گئی ہوں۔ ہمارے ہاں صرف میرے میاں ایسے تھے کہ جن کی صحت کی مثال دی جاتی تھی، پچھلے ہفتہ سے وہ بھی بیمار ہیں۔ لیکن اب سب اچھے ہو رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے۔ یہ سب لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ دیکھئے اتنی پریشانیوں کے باوجود میں نے آپ کی بات نہیں ٹالی ——— بھابی کو بے حد محبت کہئے۔

بہت سی محبت اور پیار کے ساتھ

آپ کی بہن ——— واجدہ تبسم

آج میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں

دکھ سے بھاری یہ رات ——— جو زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے۔ آج بڑی منتوں کے بعد میرے دوار تک آئی ہے۔ میں اس لمحے کو کھونا نہیں چاہتی۔ یہ رات وہ رات ہے جس کی آس میں مدتوں میں نے دکھ کا زہر پیا ہے۔

آج کی رات اقرارِ محبت کی رات!

پتہ نہیں آج تم کہاں ہو گے۔ جہاں تم ہو گے پتہ نہیں وہاں اس سمے کیسا موسم ہو۔ ہو سکتا ہے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہو اور تم کسی پیڑ کے نیچے بھیگتے ہوئے مجھے ہی یاد کر رہے ہو! ہو سکتا ہے کوئی ٹھنڈی خون منجمد کر دینے والی رات ہو اور تم کہیں آتش دان کے سامنے آگ کے دہکتے شعلوں میں مجھے ڈھونڈ رہے ہو!!

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت کہیں کالی گھور اندھیری رات ہو، چاند روپوش ہو، ایک دو تارے بھی نظر نہ آتے ہوں۔ رات کی بے پناہ

تاریکی میں تم یادوں کے جگنوؤں کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہو ـــــ یادیں جو مجھ سے متعلق ہوں گی۔ یہ مجھے یقین ہے کہ تم جہاں بھی ہوگے میرے ہی لئے ہوگے۔ جب بھی سوچو گے، میرے ہی لئے سوچو گے۔ تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ میرے ہی نام سے آتی ہوگی۔ تمہاری آنکھیں میرے ہی لئے روتی ہوں گی۔ تمہارا دل میرے ہی نام پر دھڑکتا ہوگا۔ تم جو مجھے اِتنا چاہتے تھے کہ جب سے دنیا بسی ہے شاید کسی نے کسی کو اتنا نہ چاہا ہوگا!

آج سوچتی ہوں سارے سمندروں کی سیاہی بنا کر بھی لکھنے بیٹھوں تو تمہاری محبت کی داستان ادھوری رہ جائے گی! مجھ میں ایسی کیا بات تھی؟ تم نے مجھے کیوں ٹوٹ کر چاہا ـــــ؟ کیا دُنیا میں مجھ جیسا تمہیں کوئی نظر نہ آیا تھا ـــــ؟

ایک بار میں نے تم سے کہا تھا "یادیں تو چاند ہوتی ہیں ـــ جو گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں لیکن فنا نہیں ہوتیں۔" آج تمہاری یادوں کا چاند پوری آب و تاب سے ذہن کے آسمان پر جگمگا رہا ہے۔ اِس جگمگاہٹ کے صدقے میں تم سے آج اپنے دل کی بات کہہ دینا چاہتی ہوں ـــــ حالانکہ بہت دیر ہو چکی ہے، لیکن دل پر ایک مدّت سے جو ایک بوجھ رکھا ہے اسے ہٹانے کی سعیِ لاحاصل تو کر لوں۔

آج میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ اعترافِ گناہ کہو یا اعترافِ محبت۔

میں تمہاری ہوں!

میں تم سے محبت کرتی ہوں!

شاید آج سے برسوں پہلے تم یہ جملے سن پاتے تو خوشی سے پاگل ہو جاتے۔ سارے میں ناچتے پھرتے۔ آسمان کے چاند ستاروں کی طرف لپک پڑتے ـــــ لیکن اُن دِنوں میری زبان پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ میں خود ساختہ ڈر، خوف اور انجانے جذبوں کے حِصار میں گھری اپنے آپ سے بھی چھپتی پھرتی تھی اور کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ تمہارے نام پر مسکراؤں۔

آج تمہارے نام کے ساتھ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں ـــــ میں جو کبھی مسکراتے ہوئے ڈرتی تھی آج تمہارے لئے کھلے عام روتی پھرتی ہوں!

یاد ہے ایک بار تم نے کہا تھا ـــــ "محبت کرنے والے نڈر ہو جاتے ہیں۔ خوف کا کوئی جذبہ انھیں باندھ نہیں سکتا۔" آج تمہاری کہی ہوئی کتنی ہی باتیں یاد آتی ہیں۔ تمہاری وہ آواز یاد آتی ہے جس نے زندگی کے اندھیروں میں روشنیوں کے چاند کھلا دیتے تھے۔

وہ دن ـــــ زندگی کا وہ دن ـــــ پتہ نہیں اسے کس نام سے موسوم کروں ـــــ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتے ہی میں کارنر کی طرف لپکی۔ ارشد صبح سے باہر گئے ہوئے تھے۔ میں سمجھی اُنہی کا فون ہوگا۔ بے صبری سے میں نے ریسیور میں منہ ڈال کر کہا۔

"آپ اب تک کہاں تھے؟"

اُدھر سے ہلکی سی ہنسی کی آواز کے ساتھ سُنائی دیا۔

"آپ نے میری آواز پہچانی؟"

میں اسی بے صبری سے بولی ـــــ "یہ آواز ـــــ؟ یہ آواز تو وہ ہے جسے سُنتے ہی بجھے ہوئے چراغ جل اُٹھتے ہیں! بھلا میں اس آواز کو نہ پہچان پاؤں گی؟"

پھر وہی ہنسی اور اب کی بار ـــــ "تب تو آپ غلطی کر گئیں" ایک تیز سی ہنسی اور پھر کسی نے کہا ـــــ "بہرحال آج میں نے جان لیا کہ آواز کا جادو کیا ہوتا ہے۔ دیکھئے آپ کو قسم ہے فون بند نہ کیجئے گا! اتنا سُن لیجئے کہ میں نے آپ کو اب تک دیکھا نہیں ہے لیکن اب سوچ سکتا ہوں کہ آپ کیسی ہوں گی . . ."

میں جیسے نیند سے چونکی ـــــ "ہائے اللہ! مجھ سے بھول ہو گئی۔ آپ ارشد نہیں تو کون ہیں؟"

اُدھر سے آواز آئی ـــــ "ایک آواز جسے سُنتے ہی بجھے ہوئے چراغ جل اُٹھتے ہیں!" اور کھٹ سے فون بند ہو گیا۔ میں سراسیمہ سی ہو کر کتنی ہی دیر تک ریسیور کو دیکھتی رہی پھر میں نے آہستہ سے کریڈل میں فون رکھ دیا۔

رات کو ارشد آئے تو میں نے بڑی بے زاری سے صبح والا واقعہ کہہ سُنایا۔

"پتہ نہیں کس نالائق کا فون آگیا تھا ارشی! میں سمجھی تمہارا ہوگا۔"

ارشد نے بات کاٹ دی ـــــ "ارے وہ میرے دوست کا ہوگا۔ سچ مچ بے حد نالائق آدمی ہے۔" پھر وہ ہنس ہنس کر بتانے لگے کہ بعد میں وہ سیدھا میرے آفس ہی چلا آیا۔

"رہتا کہاں ہے؟" میں نے بلاوجہ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کلکتہ"

"یہاں کس لئے آیا ہے؟"

"ارے وہ کوئی معمولی آدمی ہے۔ بے حد قابل ڈاکٹر ہے بھئی۔"

"ٹھہرے گا کہاں ——؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"میرے ہی ساتھ، اور کہاں جائے گا —— میں اُسے لا رہا تھا لیکن اُسے کچھ کام تھا —— کل آجائے گا۔"

میں سُن رہ گئی۔ کچھ بول نہ پائی۔ اُسی دم بہت سارے بچّے ایک کٹی ہوئی پتنگ کے پیچھے شور مچاتے بھاگتے آئے۔ ارشد بھی بچّوں میں بچے بنے پتنگ لوٹنے کو لپکے۔ میرا جی دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

"ارشی خدا کے لئے . . .

خدا کے لئے ارشی . . ."

ڈولتی ہوئی پتنگ ارشی کے ہاتھوں نہ لگ سکی۔ وہ ہاتھ ملتے ہوئے، ہنستے مُسکراتے پھر میرے پاس آبیٹھے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اِتنے میں جیسے میرا سب کچھ لُٹ چکا تھا ——

دوسرے دن میں نے زندگی میں پہلی بار تمھیں دیکھا۔ میں تمھیں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ میں ارشد کی منگیتر تھی۔ چند دنوں بعد ہماری شادی ہونے والی تھی۔ میں کسی اور کو اپنے اور ارشد کے بیچ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اور پھر کل تم نے فون پر چند ایسی باتیں ایسی کی تھیں کہ میں دہل کر رہ گئی تھی۔ اِس لئے میں بہت بُجھی بُجھی سی رہی۔

"شبنم —— امّی سے کہہ دینا یہ سالا اب یہیں رہے گا۔" ارشد نے محبت اور بے تکلفی سے اپنے دوست کی پیٹھ ٹھونکی۔ "ارے ہاں شبنم! میرے کمرے سے ملا ہوا جو کمرہ ہے وہ درست کروا دینا۔" پھر جیسے ارشد کو کچھ یاد آیا —— "ارے ہاں ثاقب —— تعارف کرانا بھول گیا۔ یہ میری خالہ کی بیٹی ہیں شبنم . . ." اور وہ تعارف ادھورا چھوڑ کر مُسکرانے لگے۔

آج سوچتی ہوں اُس دن ارشد تعارف مکمل کرا دیتے تو میری زندگی کا یہ رنگ نہ ہوتا۔ تم بھی میرے اِتنے قریب نہ آتے اور میں —— میں بھی یوں نہ لُٹی ہوتی۔

تم نے مجھے ایک جھلملتی ہوئی نظر ڈال کر دیکھا اور سگریٹ جلانے لگے۔

ارشد اپنے دوست کو نوکروں کے اور میرے حوالے کرکے آفس چلے گئے اور میں نے اُس دن زندگی کا سب سے بڑا دُکھ سہا —— جب میں تمھیں کھانے کے لئے بُلانے تمھارے کمرے میں آئی تو تم نے مُسکرا کر بہت پسندیدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور شرارت آمیز بے تکلفی سے بولے۔

"آپ تو بہت رئیس معلوم ہوتی ہیں بھئی!"

مجھے اچانک ہنسی آگئی —— "یہ آپ نے کیسے جانا؟"
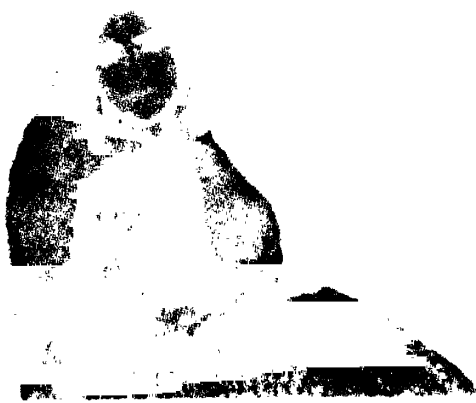
"بھئی یہ آپ کا سونے کا بدن، ہیروں کی سی آنکھیں، یاقوت کے ہونٹ، چاندی کی گھنٹیوں والی ہنسی اور . . اور . ."

میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔

"آپ کو پتہ ہے میں . . . میں . ."

میں تمھیں سُنانا چاہتی تھی کہ میں ارشد کی ہونے والی دُلہن ہوں۔ لیکن میں کہہ نہ پائی —— میں نے کہا تو بس یہ کہا۔

"میں ایسی باتیں سُننے کی عادی نہیں ——"

اور میں نے سوچ لیا کہ شام کو جب ارشد آئیں گے تو میں کہہ دوں گی کہ آپ کے دوست کی ذمّہ داری مجھ سے نہ سنبھلے گی —— لیکن شام کچھ اور ہی رنگ لے کر آئی۔ اُس شام سردی کچھ زیادہ تھی۔ میں نے سیاہ رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ نہ جانے کیوں سر میں درد سا محسوس ہو رہا تھا اِس لئے میں نے نہ چوٹی گوندھی نہ جُوڑا باندھا، یونہی کُھلے بال پیٹھ پر چھوڑ رکھے۔ ارشد دیر سے لوٹنے والے تھے۔ فون آچکا تھا۔ اُن سے پہلے تم آگئے —— مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے جب میں چائے کے لئے پوچھنے تمھارے کمرے تک آئی تو تم نے سر اُٹھا کر مجھے دیکھا تھا اور اچانک ٹھٹک گئے تھے۔

"آپ ـــــ؟"

میں یونہی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"آج کی سیاہ رات چاند کے لئے ترسے گی ـــــ لیکن چاند اِدھر تو یہاں آ چھپا ہے ـــــ"

میں نے گھبرا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔ ایسا کرتے میں میرے بال میرے چہرے پر، ہاتھوں پر آ گرے۔ میں آج تک تمہاری اُس بے باکی پر حیرت کرتی ہوں۔ تم نے آگے بڑھ کر میرے بالوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا اور ترسی ہوئی آواز میں بولے تھے۔

"اِتنا بے پناہ سونا نہ لٹاؤ ـــــ یہ سونے کے تاروں سے بنے ہوئے تمہارے بال، یہ جھلملاتا ہوا جسم، یہ ہیرے موتیوں کی آنکھیں۔ ۔" اور میرا چہرہ اُٹھا کر تم نے عجیب سی بے کسی سے سوال کیا۔

"تم نے میرا فون کیوں ریسیو کیا تھا شوبی ـــــ؟"

اُس شام نے مجھے گونگے پن کا تحفہ عطا کیا ـــــ اور جب ارشد آفس سے لوٹے تو میں یہ بھی نہ کہہ سکی کہ تمہارا مہمان میرے بس کا نہیں ہے! ـــــ میں جیسے اپنی زبان کہیں رہن رکھ چکی تھی۔ ارشد نے جب ہنستے ہوئے تم سے پوچھا۔

"کہو یار! یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے نا تمہیں؟"

تو یاد ہے جواب میں تم نے کیا کہا تھا ـــــ؟

"تکلیف ـــــ؟ نہیں ارشد یہاں آ کر تو مجھے زندگی ملی ہے۔ اب میں نے طے کر لیا ہے کہ یہیں پریکٹس کروں گا ـــــ"

تمہارا یہ فیصلہ ارشد نے خوش ہو کر اور میں نے سہم کر سُنا۔

میں کچھ نہ کہہ سکی ـــــ کچھ نہ کر سکی ـــــ!

پھر اُس کے بعد اتنے سارے دن گزرے، اتنے سارے حادثات ہوئے کہ میں جو یہ سمجھتی تھی کہ میں ارشد سے محبت میں اپنی جگہ چٹان کی مانند ہوں، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اپنی جگہ سے کچھ ہل سی گئی ہوں ـــــ اپنی محبت کے ننھے سے دیئے کو سنبھالتے سنبھالتے میں تھک تھک گئی۔ بس ہر لمحہ ایسا محسوس ہوتا تھا اب بجھا کہ تب بجھا ـــــ ہر لمحہ ایک ہی سوال دل کو ڈسے لیتا تھا۔

"میں کیا کروں ـــــ کدھر جاؤں ـــــ؟"

پہلے سے میں ارشد کی صرف منگیتر ہی تھی لیکن اپنی جگہ تو میں یہ سمجھے ہوئے تھی کہ میں ارشد کی ہو چکی ہوں۔ کیا نکاح کے دو بول ہی سب کچھ ہوتے ہیں؟؟

آج سے برسوں پہلے جب میں بالکل چھوٹی سی تھی، امّی کی حالت بے حد نازک تھی، ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا، ایسے میں خالہ امّی نے امّی کو تسلی دے کر مجھے گود لے لیا۔ میں تین سال کی تھی لیکن دُھندلی دُھندلی یادیں آج بھی ذہن کے پردے پر جھلملا جاتی ہیں کہ خالہ امّی نے آٹھ سال کے ارشد کے بازو مجھے بھی بٹھا لیا ہے اور دَم توڑتی ہوئی امّی سے کہہ رہی ہیں "دیکھو نسیم میں نے اِس گڑیا کو اپنی بہو بنا لیا ہے۔ دیکھو ارشد نے اِس کا ہاتھ کیسی مضبوطی سے تھام لیا ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ تم اچھی ہو جاؤ گی تو ہم گڑیا گڈے کی طرح دھوم دھام سے اِن دونوں کا بیاہ کریں گے۔"

لیکن امّی یہ سب دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہیں ـــــ اور میں وقت سے پہلے، بغیر برات کی دُلہن بنی خالہ امّی کے گھر آ گئی۔ بچپن سے لے کر آج تک میری یادداشت میں کوئی لمحہ ایسا نہ آیا جب کسی نے مجھے ترچھی نگاہ سے بھی دیکھا ہو۔ خالہ امّی کے اتنے سارے بچے تھے۔ پھر بھی وہ سب سے زیادہ مجھی کو چاہتیں ـــــ سارے خاندان میں یہ بات مشہور تھی کہ میری اور ارشد کی شادی طے ہے۔ شادی ہونے میں کوئی رکاوٹ تھی بھی نہیں صرف میرے بی۔ اے کرنے کا انتظار تھا۔ یہ آخری سال اور آخری مہینے تھے۔ ایک بار خالہ امّی کو میں نے کہتے سُنا تھا ـــــ "شبنم اپنی تعلیم پوری کر لے تو ہو جائے گی شادی بھی۔ بن ماں کی بچی یہ نہ سوچے کہ میری تعلیم تک پوری نہ ہونے دی اور لے کے گھریلو بکھیڑوں میں ڈال دیا۔"

گھر میں بے حساب پیسہ تھا۔ نوکر چاکر، کاریں، آسائشیں ـــــ کئی طرح کے بزنس تھے ـــــ سب کی اور خاص طور سے ارشد کی بے پناہ چاہت مجھے میسّر تھی۔ ایسے میں میں اور کیا سوچ اور چاہ سکتی تھی؟ کہ میری خوبصورت اور جھیل کی سی ساکن زندگی میں تمہارے پیار کا پتھر آ گرا!

سچ مانو میں نے زندگی میں اتنا دُکھ کبھی محسوس نہ کیا تھا میں تمہاری چاہت دیکھ کر گھبرا کر رہ گئی۔ میں تمہیں چاہ بھی کیسے سکتی تھی۔ پیاسے کی حالت تو پیاسا سا لگتا ہے۔ میں تو آگے ہی سیراب تھی۔ میں کیا دیکھ کر تم پر ریجھتی؟ میری دُنیا میں کس چیز کی کمی تھی۔

تم ارشد کی مرضی سے وہیں پریکٹس کرنے لگے تھے۔ میں نے کہیں سُن رکھا تھا کہ ڈاکٹر لوگ جذبات سے عاری ہو جاتے ہیں۔ کوئی لطیف حِس اُن میں باقی نہیں رہ جاتی، لیکن تم تو بالکل برعکس نکلے۔ تم جذبات سے کتنے بھرپور تھے اور تمہاری حُسن پرستی اِس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ لگتا تھا تم کوئی شاعر یا فنکار ہوتا ـــــ ایک بار تم نے میری کسی بات پر مسکرا کر کہا تھا ـــــ

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں!

میں نے کچھ جھلا کر کچھ شرما کر کہا تھا — "سچ؟"
یاد ہے تم نے کہا تھا — "تمہارے منہ سے ادا ہو کر تو وہ بھی پاک ہو جاتا ہے۔"

تم میرا کتنا احترام کرتے تھے —!؟

ویسی چاہت پھر مجھے کبھی نصیب نہ ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بار تم چند دنوں کے لئے کلکتہ چلے گئے تھے تو روزانہ میرے نام ایک لفافہ آتا تھا جس میں صرف ایک کورا کاغذ رکھا ہوتا۔ مجھے یاد ہے اس سفید اور کورے کاغذ پہ ہر جگہ ایک ساتھ میرا اور تمہارا نام لکھا ہوتا — جسے کوئی آنکھ نہ پڑھ سکتی لیکن وہ دل کی آنکھ!

ایک دن ایک لفافہ ایسا بھی مجھے ملا تھا جس میں ایک کورا کاغذ تھا جس پہ صرف ایک شعر کونے میں لکھا ہوا تھا ؎

اِس قدر تیرا تصور کبھی بڑھ جاتا ہے
آئینہ دیکھوں تو مُنہ تیرا نظر آتا ہے

یہ کیسی چاہت تھی خدایا —؟ میں — جس نے تمہاری طرف کبھی محبت کی ایک نظر تک نہ پھینکی — اور تم، جس نے اپنی ساری زندگی ہی جیسے وار کر رکھ دی!!

تم واپس آئے تو جیسے گھر کا کونا کونا روشن ہو اٹھا — (یا میں نے ہی ایسا محسوس کیا تھا؟)

تمہاری بے تابی اور دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ تم نے آتے ہی میرے ہاتھ تھام لئے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا —؟

میں سہم کر بولی تھی — "پلیز آپ میرا ہاتھ نہ پکڑیے!"

"کیوں — کیا اس ہاتھ پر میرا حق نہیں؟"

"نہیں — یہ گناہ ہے!"

"ارے چھوڑو یہ گناہ ثواب کی باتیں — میں جو اتنا چاہتا ہوں تمہیں — سب سے بڑا مذہب محبت ہے اور میں محبت کرتا ہوں — تم سے — تمہیں!"

"آپ تو پاگل ہو رہے ہیں — آپ کو کچھ بھی نہیں معلوم ہے"

تم ہنسے — "ارے مجھے سب معلوم ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ مجھے عام لوگوں سے چند باتیں زیادہ ہی معلوم ہیں اور سب سے بڑھ کر مجھے یہ معلوم ہے کہ تم میری ہو! سو فیصدی میری!!"

میں پاگل سی ہو اٹھی

"خدا کے لئے مجھے اتنا نہ آزمایئے — آپ نہیں سمجھتے آپ کیا کر رہے ہیں —" میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا اور سسک اٹھی تھی۔

---

اُن دنوں بہاریں کیسے جھوم جھوم کر آتی تھیں۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے بہاروں نے اپنے دریچے بند کر دیے ہیں — خوشبوؤں سے لدی ہوائیں اب میرے کواڑوں پر دستک نہیں دیتیں۔ میں بہاروں کی رُت، پھولوں کے رنگ، کلیوں کی خوشبوئیں سب کچھ بھول بیٹھی ہوں۔ اُن دنوں میں کس قدر شوخ رنگ کے کپڑے پسند کرتی تھی۔

تمہیں یاد ہوگا تمہارے طویل قیام نے تمہیں ہمارے ہی گھر کا ایک فرد بنا دیا تھا۔ سب تم سے بے حد بے تکلف تھے۔ اُن دنوں میں بی۔ اے سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہو کر سارا دن سکھی سہیلیوں اور بہنوں کے ساتھ ہنستی چہکتی رہتی — خالہ امی کو شاپنگ اور سلائی سے فرصت نہ ملتی۔ باہر برانڈے میں ایک ساتھ درزی اور سنار مصروف رہتے۔ گھر کے سب سے بڑے بیٹے کی شادی ہونے والی ہو تو یہی سب کچھ ہوتا ہے۔

اُس دن سب تمہیں پکڑ کر گھیر لائے۔

"دیکھیے ثاقب بھائی! یہ آپی کے دُلہناپے کا جوڑا ہے — کیسا ہے —؟"

چھپر کھٹ پر سرخ جوڑا آگ کی طرح دہکتا ہوا پڑا تھا۔ تم نے ایک نظر جوڑے پر ڈالی تھی اور پھر مجھے دیکھ کر دھیرے سے کہا تھا۔

"کیا کہوں یہ جوڑا کیسا ہے — تم پر کیسا کِھلے گا — کاش تم یہ صرف میرے لئے پہنتیں —"

میں اپنی جگہ لرز کر رہ گئی۔

اُس رات جب سب سو چکے تھے، چاند بُجھا بُجھا اور ستارے دھواں دھواں تھے۔ میں اُس اُداس رات کا سارا درد چھپائے تمہارے کمرے میں آئی۔ کتنی ہی دیر تک ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر میں نے جیسے ہمت سمیٹ کر بات شروع کی۔

"آپ ڈاکٹر ہیں — ہیں نا —؟"

تم کچھ نہ بولے۔ بس دیکھتے رہے — "مجھے تھوڑا سا زہر دے دیجئے۔

میں ایسی زندگی نہیں گزار سکتی۔ آپ کو پتہ ہے ارشد سے میرا کیا رشتہ ہے؟؟
میں مرنا چاہتی ہوں میں۔۔۔میں۔۔"
آنسوؤں نے میرا گلا رُوندھ دیا۔ تم دھیرے دھیرے میری طرف بڑھے۔ میں سحر زدہ سی یوں ہی کھڑی رہی۔ تم آگے بڑھے۔ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تم نے میرا چہرہ لیا ——— پھر تم میرے چہرے پر جھک گئے ——— میں جذبات کی شدت سے لرز کر رہ گئی ——— تم نے سر اُٹھایا۔ سر اُٹھا کر کہا۔
"شوبی ——— یہ میری زندگی کا پہلا اور آخری اقدام ہے ———"
اور جیسے زندگی سے سب کچھ چلا گیا ——— سب کچھ ——— تم نے مجھے کچھ کہنے تک کی مُہلت نہ دی اور چلے گئے۔ ایک جملہ ——— ایک تیر ——— جو دل میں گڑ سا گیا۔
"شوبی! تم ہمیشہ سے میری تھیں۔ میری ہو! میری رہو گی!! لیکن صرف تمہاری خوشیوں کی خاطر ——— میں تمہاری راہ میں نہ آؤں گا۔ ۔ ۔ خدا کرے۔ تم خوش خوش ارشد کی دُلہن بنو ———"

---

اور جس رات مجھے دلہن بننا تھا۔ مجھے سہاگ چڑھنا تھا ——— مجھے سُرخ جوڑا پہننا تھا ——— میں یوں بے حس تھی جیسے کوئی پتھر! جب زرتار طشت میں سُرخ جھم جھماتا جوڑا میرے لئے لایا گیا تو میں نے ساتھ بیٹھی سہیلی سے انکار کر دیا ———
"میں یہ سُرخ کپڑے نہ پہنوں گی ———"
میرے کانوں میں تمہاری یہ بات گُونج رہی تھی (کیا کہوں یہ جوڑا کیسا ہے ——— تم پر کیسا کھلے گا ——— کاش تم یہ صرف میرے لئے پہنتیں!؟)
"اری پاگل ہوئی ہے۔ ۔ ۔ سب لوگ کیا کہیں گے ———" سہیلی نے کہا۔
"کیوں دُلہناپا تو محض رنگوں سے عبارت ہے۔ سُرخ رنگ کی کیا تخصیص ہے ——— اِتنے سارے جوڑے ہیں۔ نیلے، پیلے، گلابی، ہرے، نارنجی، زعفرانی ——— میں کوئی بھی پہن لوں گی ——— سیاہ کیوں نہیں؟"
سہیلی نے مجھے لرز کر دیکھا۔ پھر وہ بھاگی بھاگی گئی اور خالہ امّی کو بُلا کر لے آئی۔ خالہ امّی نے اسے بھی میری ایک معصوم ضد سمجھ کر ہر ضد کی طرح سہہ لیا اور مجھے نارنجی رنگ کا جوڑا پہنا دیا۔ لیکن یہ میں کیسے سُناتی کہ یہ رنگ بھی تمھیں کتنا پسند تھا۔ ایک دن نارنجی ساڑی میں تم نے مجھے دیکھا تو کہا تھا۔
"سُورج مارے ندامت کے اب دھوپ بکھیرنا چھوڑ دے گا تم نے اس کی نگاہیں جُھکا دیں ———"

---

وہ جوڑا میں نے کبھی نہ پہنا ——— وہ سُرخ جوڑا جو صرف اس لئے بنا تھا کہ میں تمہارے لئے پہنتی ——— اتنے سارے برسوں سے سنبھال سنبھال کر رکھا ہوا وہ جوڑا آج میرے جسم پر ہے ——— اس کی سُرخیاں ذرا بھی ماند نہیں پڑی ہیں۔ گوٹے کناری کی جھلملاہٹ آج بھی ستاروں کو شرما رہی ہے ——— آج یہ جوڑا میں نے اس لئے پہنا ہے کہ آج میرے دُلہنا پے کی رات ہے۔ میرے سہاگ کی ——— میرے اقرارِ محبت کی رات!!
کیسے کیسے زمانے اِس دل پہ سے ہو کر گزر گئے ہیں ثاقب ———
تم نے میرے لئے کیا کچھ نہیں سہا، کیا کچھ نہیں کیا، کیا کچھ نہیں دیا۔ میں تو ایک جملے سے بھی تمہارا دل نہ رکھ سکی کہ ہاں میں تمہاری ہوں ——— میں تم سے محبت کرتی ہوں!
ایک بار ——— ہاں صرف ایک بار تم نے بڑی آس سے پوچھا تھا۔
"شوبی! اگر تم یہ کہہ دو کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو تو میں زندگی کا سارا زہر امرت سمجھ کر پی جاؤں!"
لیکن میں نے اپنے دل کو تھام کر بڑا سا جھوٹ بولا تھا۔
"میں ایسی بات کیسے کہہ دوں جو میرے دل نے کبھی سوچی ہی نہیں؟"
پھر میری شادی ہو گئی اور میں ارشد کے ساتھ دوسری کوٹھی میں چلی آئی ——— میں آ گئی لیکن زندگی کی ساری اچھی بُری یادیں وہیں چھوڑ آئی۔ (یا شاید میں ایسا سمجھتی تھی کہ میں اپنا ماضی چھوڑ آئی ہوں!)
ایک زمانے بعد ایک بار تم سے ملاقات ہوئی۔ تم اِس قدر بدل گئے تھے کہ پہچانے بھی نہ جاتے تھے۔ تم نے پریکٹس وغیرہ بھی چھوڑ دی تھی۔ تمہاری بدحالی اور تباہی پر میرا جی دُکھ کر رہ گیا ——— میں نے بہت کرب سے تمہیں دیکھا اور ایک ہی التجا کی ———
"تم شادی کر لو ——— میری خاطر ———"
تم ہنسے ——— وہ ہنسی جو لاکھ آنسوؤں سے بھیگی تھی۔
"کیا تم شادی کر کے خوش ہو ———؟؟"
کتنی ہی دیر ہمارے درمیان خاموشی کی دیوار تنی رہی ——— پھر میں ہمت کر کے بولی۔

"لیکن تمھیں شادی شدہ دیکھ کر میں خوش ہو سکوں گی"
"لیکن شادی بار بار تو نہیں ہوتی ناشوبی ——؟"
میں نے گھبرا کر تمھیں دیکھا —— "میں سچ ہی تو کہہ رہا ہوں شوبی!
میں نے مدت ہوئی تم سے شادی کر لی اور سچ مچ بے حد خوش ہوں ——"
اور تم منہ پھیر کر رو دیئے۔

میں خاموش بیٹھی رہی —— ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے تن سے جان نکل گئی ہو —— دھیرے دھیرے میرے آنسوؤں سے میرا آنچل بھیگتا رہا اور میں قطرہ قطرہ کر کے شمع کی مانند پگھلتی رہی —— اچانک تم بولے۔

"شوبی! تم نے جو کہا میں نے صحیفۂ آسمانی سمجھ کر اُس پر عمل کیا —— آج بھی میں تمھاری بات مان لوں گا —— بتاؤ میں کس سے شادی کروں —— لیکن سچ کہوں شوبی! دنیا میں —— اتنی بڑی بھری پُری دنیا میں تمھارا ثانی کوئی نہیں —— کوئی نہیں ہو سکتا —— تم نے کبھی آئینہ دیکھا ——؟؟"

میرے کہنے پر تم نے غزالہ سے شادی کر لی بھولی بھالی، تصوراتی پریوں جیسا حُسن رکھنے والی غزالہ! جس سے شادی کر کے کوئی بھی مرد اپنے نصیب پر رشک کر سکتا تھا —— میری چچازاد نند —— جو میری سہیلی بھی تھی۔ شادی کے بعد بھی تم نہ بدلے —— شادی کے کچھ ماہ بعد غزالہ ماں بننے والی تھی۔ ایک دن اُس نے بہت حسرت سے کہا تھا۔

"بھابی —— آپ میری دوست بھی ہیں اِس لئے میں اپنائیت سے کہہ رہی ہوں کہ بھابی میرے نزدیک محبّت کی سب سے بڑی نشانی پیار ہے۔ لیکن بھابی شادی کو اِتنے دن ہو گئے —— آج تک ثاقب نے مجھے پیار نہیں کیا —— ایسا کیوں ہے بھابی ——؟"

میں سُن رہ گئی۔

کئی صدیاں مجھ پر سے ہو کر گزر گئیں —— مجھے وہ رات یاد آئی —— وہ لمحے یاد آئے —— وہ پیار یاد آیا جو کسی کی محبّت کی پہلی اور آخری نشانی تھی اور جیسے میں نے زندگی اور زندگی کی خوشیوں سے ہار مان لی۔

"اپنی شادی شدہ زندگی کا صدقہ کہو، دان کہو، بھیک کہو —— مجھے ایک خوشی، ایک وعدہ دو ثاقب کہ تم کبھی خودکشی نہ کروگے!"

تم نے ہنس کر (ایسی ہنسی جو آنسوؤں میں ڈوبی ہوتی ہے) کہا تھا ——

"اگر خودکشی کرنے پر یقین ہوتا کہ تم مل جاؤ گی تو ضرور کر لیتا لیکن جی کر تمھیں نہ پایا تو مر کر کیا پاؤں گا! اچھا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں ——!"

اور یہ وعدہ میں نے تم سے یوں لیا تھا کہ اُن دنوں تم اکثر کہا کرتے تھے کہ "میری ڈسپنسری میں رکھے ہوئے زہر مجھے زندگی سے بغاوت پر اکساتے رہتے ہیں"

تم نے زندگی میں میری کوئی بات نہ ٹالی۔ یہ بات بھی مان گئے —— تم نے خودکشی نہیں کی۔ لیکن اِس ڈر سے کہ تم بنے، اپنے دُکھوں کو اپنے میں سموتے تم ایک دن اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلے گئے —— کیسی کیسی تمھاری تلاش ہوئی۔ لیکن تمھیں کوئی نہ پا سکا۔ اپنی زندگی پر نظر ڈالتی ہوں تو سراسر غموں کی پوٹ معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ بھی سوچتی ہوں کہ میں تمھیں ویسے بھی کیا سکتی تھی۔ لیکن اِتنے سال گزر جانے پر آج جو میرے چاروں طرف دُکھ کا وسیع سمندر پھیلا ہوا ہے اور میں اس میں ڈوب جاتی ہوں تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ ایک سچائی جو زندگی کی سب سے بڑی سچائی تھی میں نے تم سے کیوں چھپائی —— میں نے تم سے یہ کیوں چھپایا کہ میں! میں بھی تم سے پیار کرتی تھی —— میں وہ حوصلہ کبھی اپنے میں پیدا نہ کر سکی جو میرے ہونٹوں پر پڑے ہوئے قفل کو توڑ سکتا، لیکن آج جبکہ بہاروں کی رُت مجھ سے رُوٹھ چلی ہے اور زندگی موت سے بدتر ہو چلی ہے میں صرف یہ اقرار کرنے کی خاطر تمھیں پکار رہی ہوں کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں —— میں تمھاری ہوں ——!!

میں تمھاری ہوں —— صرف تمھاری!!!

---

پروفیسر ڈاکٹر منوہر سہائے انور ایم۔اے۔ ایم ایس۔ ایل ایل بی۔ پی ایچ ڈی

ملتی نہیں کہیں سے کچھ اپنی خبر مجھے
گُم کر گئے کہاں وہ بلا کر نظر مجھے

رکھا ہے نامُراد محبت نے بامُراد
دیتی رہی ہے رنج و الم عُمر بھر مجھے

ہو جائے گی اِسی سے طبیعت سُکوں پذیر
تُو اور چند روز پریشان کر مجھے

منزل رسی کے بعد بھی رُکتے نہیں قدم
رکھتے ہیں کس ترنگ میں گرمِ سفر مجھے

سیلِ سرشک نام ہے میرے وُجُود کا
پگھلا چکی ہے آتشِ غم سر بسر مجھے

ناپید ہیں وسائلِ عِرفان و آگہی
میں کس مقام پر ہوں نہیں کچھ خبر مجھے

اب اے مُعالجو نہ کرو اور کچھ عِلاج
بِل جُل کے ڈال دو درِ دِلدار پر مجھے

ہر چند تھی وہ نیم نِگہ نیم کش خدنگ
پھر بھی لگا ہے زخم بڑا کارگر مجھے

تُم دیکھتے تھے میری محبت میں کیا کمی
کیوں رنج بیشتر نہ دیا پیشتر مجھے

کیا وہ بھی بے قرار اُدھر ہیں جو آج کل
ہوتی نہیں قرار کی خواہش اِدھر مجھے

وہ شُعلۂ برق تاب جلا ہی نہ دے نگاہ
دیدارِ یار سے لگتا ہے ڈر مجھے

اس وقت کوئی دیکھنے والا یہاں نہیں
دنیا میں کیوں دکھیل نہ دے بے خطر مجھے

انورؔ نہ پُوچھ مجھ سے کہ رہتا ہے کیوں ملال
با وصفِ سام بخشیِ عِلم و ہُنر مجھے

منوہر سہائے انور
۱۰/۱، ایسٹ پٹیل نگر، نئی دہلی ـ ۸

تمہیں چاہئے تم بھی کھاؤ
دوڑ سکو تو لے لو آکر
اور مانگتے ہو کیوں بھائی
ہاتھ میں گلوکو بسکٹ لیکر
پیارے گلوکو
Gluco
★ بڑھیا ذائقہ
★ انوکھی لذت
★ کرکرے، ہمیشہ تازہ
★ بے مثال صحت و قوت
اسی لئے تو پارلے گلوکو' بھارت کے سب سے زیادہ بکنے والے بسکٹ ہیں!
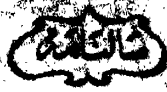
# پندرہ سال بعد

ڈاکٹر طلبشیشر پردیپ ایم-ایس-سی، پی ایچ-ڈی

۱۸-گلستان کالونی، حسیاباغ، لکھنؤ

محترمی خوشتر صاحب! تسلیم

لیجئے، "بیسویں صدی" کے سالنامہ کے لئے "پندرہ سال بعد" بھیج رہا ہوں - اُمید ہے کہانی پسند آئے گی

چند روز ہوئے انگریزی کے ایک ماہنامے میں ایک اشتہار پڑھا تھا —— "What's she got that your wife hasn't?" (اس عورت میں کیا چیز ہے، جو آپ کی بیوی میں نہیں ہے؟) یہ مجموعی مرد کی ذہنیت کا اشتہار تھا! اور مجھے اس جملے سے یہ افسانہ لکھنے کی تحریک ملی —— یہ سادہ سی کہانی مرد کی ذہنیت کی کہاں تک عکاسی کرتی ہے، یہ آپ اور قارئین "بیسویں صدی" ہی بتائیں گے۔

آپ کا ——
شیشر پردیپ

وہ چہرہ جس کی اُس کو تلاش تھی وہاں کہیں نہ تھا —— اور اب اُس کے آنے کی اُمید بھی نہ تھی! قریب قریب سب مہمان آچکے تھے۔ شام کو شادی تھی۔ وہ اِس شادی میں صرف اِس اُمید سے شریک ہُوا تھا کہ وہ بھی آئے گی۔

نیلی —— جسے اب وہ پندرہ سال کے بعد دیکھ سکتا!

اِنہی کھنہ صاحب کے ہاں، ایک شادی میں پندرہ سال پہلے نیلی سے اُس کی ملاقات ہُوئی تھی اور اِسی وجہ سے اُس نے اندازہ لگایا تھا کہ اپنے شوہر کے ساتھ نیلی اِس شادی میں بھی ضرور آئے گی۔

نیلی مسز کھنہ کی بھانجی تھی اور اُن کے وہ لوگ دُور کے رشتہ دار تھے، وہ کسی قریبی رشتہ دار کے ہاں بھی شادی بیاہ میں شریک نہ ہوتا تھا اور یہ کھنہ تو اُس کے بہت دُور کے رشتہ دار تھے۔ پندرہ برس پہلے صرف ماں کا ساتھ دینے کے لئے، اپنی خواہش کے خلاف اُن کے ہاں شادی میں شریک ہونا پڑا تھا۔ لیکن وہاں آنے کے بعد اُس نے اپنے آپ کو خوش قسمت ہی سمجھا تھا۔ ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی سے ملاقات ہوگئی تھی۔ لڑکی کا نام نیلما تھا لیکن سب اُسے نیلی کہتے تھے اور اِسی نام سے اُس کے ساتھ بھی اُس کا تعارف ہوا۔

نیلی کا حسن اُس کے متناسب جسم، صاف شفاف چہرے، موٹی سیاہ آنکھوں اور گھنے سیاہ بالوں میں مُضمر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، اپنی شخصیت کو پُرکشش بنانے کے لئے اُس نے خود بھی محنت کی تھی۔

اُسے نیلی کے ساتھ گذارنے کے لئے پُورے دس دن مِل گئے تھے۔ شادی کے بعد اُس کی ماں بیمار ہوگئی تھی - اِس لئے اُسے چند دِن کے لئے کھنہ صاحب کے ہاں رکنا پڑا تھا اور نیلی تو وہاں کافی دِن ٹھہرنے کا پروگرام بنا کر آئی تھی! دس دِن دو اِنسانوں کو ایک دُوسرے کے نزدیک لانے کے لئے کافی ہوتے ہیں —— اور شادی کے ہنگامے کے بعد جب سب رشتہ دار جا چکے تھے، اُسے نیلی کے ساتھ مِل بیٹھنے گھومنے پھرنے کا زیادہ وقت مِلا۔ لیکن اُسے نیلی سے محبت ہو گئی ہو، یہ بات نہ تھی —— وہ اب بھی کہہ سکتا ہے کہ اُسے نیلی کے ساتھ محبت نہیں ہوئی تھی۔ ہاں، وہ اُسے اچھی ضرور معلوم ہوتی تھی۔ بالکل اُسی طرح جیسے کوئی خوبصورت چیز کسی کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے کسی حسین چیز کو دیکھ کر اُسے پا لینے کی خواہش ہوتی ہے! اُس نے چاہا تھا وہ نیلی جیسی سُندر لڑکی کو شریکِ حیات بنائے گا۔ اُس وقت اُس نے نیلی

تم سا اور بہت چاہو ۔۔۔۔ آخر وہ جانے کہاں ہے ۔۔۔؟
اُس کی وہ ساری کی باتیں عذاب ہو چکی ہیں کہ کنک بیاہ
کر آپ جیسے بھی تو کنک سے کہیں زیادہ بہتر سمجھتا ہے اور چاہتا
ہے کنک بھی نیلی کی طرح بن جائے !

لیکن کنک نیلی کی طرح نہ بن سکی !

عجیب بات تو یہ تھی کہ اُس کے دوست اُس کے سامنے
کنک کی ہمیشہ تعریف ہی کیا کرتے ۔ "بڑے خوش قسمت ہو یار اتنا
عرصہ شادی کو ہو گیا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمہاری بیوی ابھی ابھی
ڈولی سے اُتری ہو ۔۔۔۔ اُس نے تو جیسے اپنی عمر کی رفتار روک لی
ہے !"

لیکن اُس پر اِن باتوں کا کچھ اثر نہ ہوتا ۔ ان لوگوں نے نیلی کو دیکھا
نہیں نا ۔۔۔۔ یہ کیا جانیں حُسن کی تعریف کیا ہے ۔ خوبصورتی کسے کہتے ہیں !!
اور نیلی کی تصویر اُس کی نگاہوں کے سامنے جھلملانے لگتی !

شادی ہوئے پندرہ سال ہو گئے ۔ لیکن وہ نیلی کو نہیں بھولا
اُس کے بچے بڑے ہو گئے ہیں ۔ منّو اب آٹھویں کلاس میں پڑھتا ہے
اسنیلا پانچویں جماعت میں ۔ اُس کی اپنی شکل و صورت پر بھی وقت نے
اپنے نشان چھوڑے ہیں ۔ اُس کے بال کہیں کہیں سفید نظر آنے لگے
ہیں ۔ چہرے کی ہڈیاں بھی کچھ اُبھر سی آئی ہیں ۔ پندرہ سال کا یہ طویل عرصہ
دو ذہین اور خوبصورت بچے ۔ خوش اخلاق اور محبت کرنے والی بیوی ۔۔۔۔ یہ
سب اُس کے ذہن سے نیلی کا خیال دُور نہ کر سکے ۔ وقت کے ساتھ نیلی کی
یاد اور بھی شدت اختیار کر گئی ۔ نیلی کو ایک نظر دیکھنے اُس کے ساتھ پل
بیٹھنے اُس سے باتیں کرنے کی خواہش اُس کے دِل میں بڑھتی ہی جا رہی تھی
یہ خواہش پوری نہ ہونے سے وہ اکثر اُداس رہنے لگا ۔

کنک سے بھی اُس کی اُداسی دُور نہ ہو سکی ۔ وہ ہر وقت کھویا کھویا
رہتا ۔ اور ابھی چند دن ہوئے کھنہ صاحب کی سب سے چھوٹی لڑکی کی شادی
کا دعوت نامہ ملا ۔ دعوت نامہ پا کر وہ بہت خوش ہوا ۔ اب وہ نیلی سے مل
سکے گا ۔ اُس سے باتیں کر سکے گا ۔ اُس کے ساتھ گھوم پھر سکے گا ۔ اور ممکن
ہے نیلی آج بھی ویسی ہی لگتی ہو ۔ اپنے جسم کے دِلکش خطوط کے ساتھ اپنے
حسن کی تمام رعنائیوں کے ساتھ ۔ لیکن کنک کے سامنے وہ اپنی خوشی
ظاہر نہ کر پاتا [illegible] کنک کے سامنے [illegible]
[illegible]

" لو ایک مصیبت اور آن پڑی ۔۔۔ بنارس جانا پڑے گا ۔ کھنہ
صاحب کی لڑکی کی شادی ہے ۔ ماں بیمار ہے ۔ مجھی کو جانا پڑے گا ! "

" واہ بنارس تو اچھی جگہ ہے ۔ گھوم آیئے گا ۔۔۔۔ مجھے تو ساتھ لیتے
چلو ۔۔۔۔ بچے اب بڑے ہو گئے ہیں ۔ ماں جی کے پاس رہ سکتے ہیں ۔
میری بھی سیر ہو جائے گی ۔ دعوت نامے میں بھی تو "ود فیملی" لکھا ہے "

" عجیب عورت ہو تم بھی ! اتنا نزدیکی رشتہ نہیں ہے کہ ہم
دونوں ہی پہنچ جائیں ۔ ود فیملی تو یوں ہی لکھ دیا جاتا ہے ۔۔۔۔ " اور
کنک دِل مسوس کر رہ گئی ۔

---

اور اب وہ پچھتا رہا تھا ۔۔۔۔ کیوں نہ کنک کو بھی ساتھ لیتا
آیا ۔ اکیلا یہاں بور ہو رہا ہے ۔ اِتنی بھیڑ بھاڑ میں بھی وہ اپنے آپ کو
اکیلا محسوس کر رہا تھا ۔ دو تین بار وہ کسی بہانے اُس کمرے کے سامنے
سے گزرا تھا ۔ جہاں عورتیں بیٹھی تھیں ۔ لیکن نیلی اُسے کہیں نہ دکھائی دی تھی
جو بھی عورت اُدھر سے گزرتی وہ اُسے غور سے دیکھتا لیکن وہ نیلی نہ ہوتی ۔
وہ کھنہ صاحب سے پوچھ نہ سکا ۔ کھنہ صاحب ڈرائنگ روم میں صوفے
پر بیٹھے بیٹھے پاؤں ہلاتے رہتے اور بیٹھے بیٹھے ہدایتیں دیتے رہتے
وہ زیادہ چل پھر نہ سکتے تھے ۔ وہ بھی کھنہ صاحب کے ساتھ ڈرائنگ روم

بیٹھا رہتا۔ ایک دو بار اُس نے کھنہ صاحب سے کہا بھی ——— "انکل! کوئی کام بتا دیجئے نا ———"

لیکن کھنہ صاحب نے کہا: "ارے بھئی، تم آ گئے ہو۔ یہ تھوڑا ہے! بس ذرا گھوم پھر کر دیکھ لو سب انتظام ٹھیک ہے نا ———"

کھنہ صاحب کے نوکر چاکر، اُن کے شہر کے ملنے والے بہت تھے اور سب کام سنبھالے ہوئے تھے اور سب انتظام ٹھیک تھا۔ باہر سے آئے ہوئے مہمان زیادہ تر گپیں مارنے میں مشغول تھے۔ یا انتظام کی تعریف کرنے میں ——— اُن میں سے چار پانچ کے ساتھ وہ متعارف ہو گیا تھا۔ اُن میں سے ایک مسٹر سہل تھے۔ زندہ دل اور لطیفہ باز۔ ہر آنے جانے والے پر فقرے کس رہے تھے۔ عورتوں کو بھی نہ چھوڑتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سب ہی کو جانتے ہوں! تھوڑی ہی دیر بعد اُسے پتہ چل گیا کہ مسٹر سہل، کھنہ صاحب کے رشتے میں داماد تھے۔ ایک بار کھنہ صاحب نے ہنس کر اُن سے کہا۔

"ہاں، یہ ٹھیک ہے ——— سہل صاحب! آپ اپنے چٹکلوں سے اِن سب کا دِل بہلاتے رہیئے ———"

مسٹر سہل سے وہ باتوں باتوں میں مہمان عورتوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈرائنگ رُوم کا ایک دروازہ کوٹھی کے صحن میں کھلتا تھا۔ اور وہ اندر بیٹھا سامنے سے گزرتی عورتوں کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ بظاہر وہ سہل صاحب کے ساتھ، یا دُوسرے ساتھیوں کے ساتھ، باتوں میں مشغول ہوتا لیکن اُس کا دھیان اندر صحن میں کھڑی عورتوں کی طرف ہوتا۔ وہ عورت، جس نے ناف سے نیچے ساڑھی باندھ رکھی ہے کون ہو سکتی ہے؟! نیچے ساڑھی باندھنے کی وجہ سے پیٹ کا گوشت تھوڑا سا لٹک آیا ہے۔ اور اُسے اِس لٹکے ہوئے گوشت کو دیکھ کر کراہیت سی ہوئی ——— وہ گلابی ساڑھی والی، بھاری جسم کی عورت کون ہے ———؟ اگر اُس نے اپنے جسم کا خیال رکھا ہوتا تو خوبصورت کہلاتی ——— زیادہ تر برآمدے میں کرسی پر بیٹھی رہتی ہے۔ یا تو وہ زیادہ چل پھر نہیں سکتی اور یا پھر آرام طلب ہے؟ اور وہ گہرے سبز رنگ کا غرارہ قمیص پہنے، دُبلی پتلی سی بالکل لڑکی سی لگتی ہے ——— پینتیس چھتیس سال سے کم نہ ہو گی۔ بعض بعض عورتیں اپنی عمر سے کتنی چھوٹی معلوم ہوتی ہیں؟! اور وہ چست قمیص اور چوڑی دار پاجامہ پہنے سانولے رنگ کی عورت ——— اتنی زیادہ عمر کی عورتوں کو پاجامہ قمیص کہیں اچھا لگتا ہے ———؟ نہ جانے عورتیں اپنے جسم اور عمر کے لحاظ سے لباس کیوں نہیں پہنتیں ———؟ اور وہ جو شلوار قمیص پہنے کھڑی ہے سفید رنگ کی عورت کے دائیں طرف۔ نئی نئی بیاہتا ——— کالی [illegible] گلے میں سفید موتیوں کی مالا ——— کتنی پھب رہی ہے ———؟ وہ لڑکی اِن سب سے زیادہ خوبصورت ہے ——— اور اُسے اپنی خوبصورتی کا احساس بھی ہے ——— احساس بھی تو شخصیت میں ایک اثر کی کشش پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن شاید اُس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ پانچ چھ سال کے بعد سب کچھ بھول جائے گی۔ احساسِ حسن رہے گا نہ شوقِ جلوہ نمائی! وہ دیکھو وہ لڑکی بھی حسین ہے۔ وہ جو بار بار اندر جاتی ہے باہر آتی ہے، کُرتا اور قمیص اور چوڑی دار پاجامہ پہنے۔ شاید کھنہ صاحب کی لڑکی کی سہیلی ہے۔ وہ بھی کافی حسین ہے۔ لیکن اِن میں سے کوئی بھی نیلی کی طرح خوبصورت نہیں۔ اُس کی بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ آئی نہیں یہاں ——— اگر آتی تو یہ سب اُس کے سامنے ماند پڑ جاتیں۔ کیا جسم کی تراش تھی! کیا شہزادیوں کی طرح چال تھی! لیکن وہ آئی کیوں نہیں ———؟! وہ کس سے پوچھے اُس کے بارے میں؟! کیسے پوچھے ———؟ مسٹر سہل سے پوچھے ———؟ یہ ضرور جانتا ہوگا۔ بتا سکے گا کہ وہ کیوں نہیں آئی ——— لیکن کیسے پوچھے ———؟!

شام کو برات آئی تو وہ ریسپشن (Reception) کے لئے سب کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ لیکن اُس کی نگاہیں اُن عورتوں کی طرف تھیں جو پاس ہی ٹولی بنا کر کھڑی برات دیکھ رہی تھیں۔ وہ اب بھی نیلی کو تلاش کر رہا تھا! اچانک اُس کا دھیان سہل کے قہقہے کی طرف گیا۔ وہ اُس بھاری جسم کی عورت کو اندر جاتے دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

"ارے بھئی، آہستہ چلو آہستہ۔ زیادہ بھاگ دوڑ کرنے سے اور موٹی ہو جاؤ گی ——— ہی ہی ہی ———"

وہ رُک گئی۔ اور سہل کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا کہا آپ نے جیجا جی ———؟ ——— پھر کہئے تو ذرا ———"

"ارے کچھ نہیں ——— کچھ نہیں ——— میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ تم ملہوترہ صاحب کو اِس لئے نہیں لائی ہو تاکہ اُس کے حصے کا کھانا بھی تم ہی ہڑپ کر جاؤ! لیکن یہ سمجھ لو، اگر اِس طرح ملہوترہ کا حق مارتی رہو گی تو ملہوترہ بیچارا تمہارے موٹاپے کے لئے، ڈاکٹروں کے چکر ہی لگاتا رہ جائے گا ———"

"اور آپ اپنی بھی تو کہئے۔ آپ بھی تو دیدی کو اِس لئے نہیں لائے تاکہ آپ کو زیادہ کھانے سے روک نہ سکے ——— پھر جیجا جی آپ

# کتنی ساری باتیں

رام لعل

آر 39/II ملٹی اسٹوری، بہادر شاہ، لکھنؤ نمبر ۱

کرمی خوشتر صاحب، آداب

کہانی "کتنی ساری باتیں" بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے قارئینِ "بیسویں صدی" پسند کریں گے اور میرے ساتھ حسبِ معمول کتنی ساری باتیں کریں گے، اس کا مجھے پورا اندازہ ہے . . .

آپ کا مخلص ——— رام لعل

میں کمپارٹمنٹ کے سامنے پہنچا تو ایک بزرگ سفید پوش چارٹ دیکھ رہے تھے۔ مجھے اندر جاتے دیکھ کر بولے ——— "معاف کیجیے، آپ ہی مسٹر پوری ہیں؟"

میں کچھ چونکا لیکن انھوں نے دوسری ہی سانس میں میری حیرانی دور کر دی۔ میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولے ——— "میں ڈاکٹر کپور ہوں۔ آپ میری بیٹی کے ہم سفر ہیں۔ مجھے آپ سے درخواست کرنی ہے راستے میں آپ اِس کا خیال رکھیں۔ وہ اکیلی ہے۔ آیئے اِس سے ملاقات بھی کرا دوں۔"

ہمیں باتیں کرتے ہوئے آتے دیکھ کر کوئی چھبیس برس کی ایک خوبصورت عورت اپنے برتھ سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے ہاتھ میں کوئی انگریزی میگزین تھا۔

"ماناتا، یہ مسٹر پوری ہیں۔ تمھارے ساتھ لکھنؤ تک جائیں گے۔ کیوں؟"

ڈاکٹر کپور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ کر مسکرا بھی رہے تھے۔ میں نے اُن کی تائید کرنے میں دیر نہ کی ——— "جی ہاں لکھنؤ تک ہی۔ آپ بھی کیا لکھنؤ جائیں گی؟"

"جی ہاں ماناتا بھی وہیں جا رہی ہے۔ اِس کا پورا نام مسز ماناتا گجرال ہے۔ آپ شاید کالکا سے آ رہے ہیں!"

"جی ہاں میں وہاں اوورسیر ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے ایک بار آپ سے مل چکا ہوں۔ انجکشن لگوانے آیا تھا آپ کے پاس۔"

اسی وقت گاڑی نے چلنے کے لیے سیٹی بجا دی۔ ڈاکٹر کپور اپنی بیٹی کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیر کر اور اُسے لکھنؤ پہنچ کر تار دے دینے کے لیے کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔ میرے ساتھ اُنھوں نے کھڑکی ہی سے ہاتھ ملایا اور کہا ——— "مسٹر پوری، واپسی پر مجھ سے ضرور ملیے گا۔ انجکشن کی ضرورت نہ ہو تب بھی!"

ہم دونوں ہنس پڑے۔ گاڑی جلدی جلدی پلیٹ فارم سے رینگ گئی۔ میں دروازہ بند کر کے پلٹا تو ماناتا گجرال ابھی تک کھڑی مسکرا رہی تھی۔ بولی ——— "میرے ڈیڈی بہت دلچسپ ہیں۔ بڑے ٹاکے ٹو! مائنڈ نہ کیجیے گا!"

میں ایک بار پھر ہنس دیا۔ بولا ——— "مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے اپنے ڈیڈی سے زیادہ آپ خود ٹاکے ٹو ہوں گی! میرا اندازہ غلط تو نہیں؟"

وہ بھی ہنس دی اور بولی "یہ صحیح ہے، میں باتیں کرنا پسند کرتی ہوں بشرطیکہ سوچ سمجھ کر چھیڑی جائیں!"

میں نے اپنے برتھ پر ہولڈال کھولتے ہوئے کہا ——— "میں کوشش کروں گا جو کچھ بولوں اُس میں کچھ نہ کچھ سنس ضرور ہو!"

اِس طرح قہقہوں اور ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش کے ساتھ ہمارے اِس سفر کا آغاز ہوا تھا۔ دھام پور سے لکھنؤ

تک۔ اُس وقت پونے آٹھ بجے تھے۔ کالاگڑھ سے میں جیپ سے ساڑھے پانچ
پر روانہ ہوا تھا۔ راستے کی برف کی طرح ٹھنڈی ہوا ابھی تک میری رگوں میں
سمائی ہوئی تھی۔ سُورج کی کرنوں کو کھڑکی کے ساتھ ٹکراتے دیکھ کر میں نے
کھڑکی کھول دی۔ ہمانتا سے کہا —— "ہوا سیدھی آپ پر پڑے گی، ذرا اِدھر
ہٹ کر بیٹھ جائیے تاکہ میں دھوپ میں اپنا بدن سینک لوں"

وہ برتھ کے دوسرے سرے پر جا بیٹھی۔ لیکن اُس نے فوراً ہی اپنی
تھرماس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا —— "میرے پاس چائے ہے —— مُوڈ ہو
تو لیجئے!"

"نو، نو۔ رئیلی ڈئیر! گھر سے چلتے وقت بھی میں نے تین کپ لیے تھے۔
لیکن معلوم ہوتا ہے دسمبر کی سردی سے چائے اندر پہنچتے ہی برف بن
گئی ہے!"

پلاسٹک کا ایک خوبصورت بھرا ہوا کپ میرے ہاتھ میں دے کر
اُس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ کہا "یوں بھی ٹریولنگ میں ٹھنڈی ہوا
زیادہ ٹھنڈی محسوس ہوتی ہے۔ اِسی وجہ سے میں نے رات کی گاڑی
نہیں لی"

"مجھے تو رات کی گاڑی سے ریزرویشن ہی نہیں مِلا۔ اِس لئے دن کی
گاڑی سے جانا پڑ رہا ہے۔ پُورا دن سفر میں غارت جائے گا!"

لیکن یہ کہتے کہتے مجھے یہ احساس بھی ہوا اِتنی دلچسپ اور حسین ہمسفر
کی موجودگی میں اِس سفر کو بیکار کیسے کہا جا سکتا ہے! کہیں وہ بُرا نہ مان
جائے! لیکن وہ اُسی دلچسپی سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ بڑی بڑی
ٹٹولتی ہوئی آنکھوں سے۔

میں نے موضوع بدلنے کے لئے اُس سے پُوچھا "آپ، مسز گجرال
لکھنؤ کیسے جا رہی ہیں؟ کیا وہیں رہتی ہیں؟ میرا مطلب ہے اپنے ہسبنڈ
کے پاس!"

"جی نہیں!" اُس نے میرے اندازے کی فوراً تردید کر دی "وہاں
میں اپنی آنٹی کے پاس جا رہی ہوں"

"مسٹر گجرال کیا دھام پور ہی میں رہتے ہیں؟" رشک کی ایک خاص
کیفیت کے تحت میں نے ایک ہی لمحے میں اپنے ذہن میں تیس اِکتیس برس کے
ایک خوش پوشش مہذّب آدمی کا اِمیج بنا لیا جو اِس عورت سے بے پناہ محبت
کرتا ہوگا! حسین خطوط سے آراستہ اِس کے جِسم اور ذہانت اور جذبات
سے بھرپور دماغ و دل پر حکومت بھی کرتا ہوگا۔ یقیناً ایک غاصب یا جابر
کی طرح نہیں، اِس خوبصورت عورت کی [illegible]
کی آنکھیں اُس وقت تک نسوانی غرور اور اعتماد سے چمک رہی [illegible]
میرے سوال پر وہ چونک اچانک [illegible] اُس نے چہرہ [illegible]
جیسے میری نگاہوں سے بچنا چاہتی ہو [illegible]
سہارنپور میں ہیں"

"سہارنپور میں؟ کیا [illegible] سہارنپور ہی میں ہے؟ کیا [illegible]
بھی وہیں کے ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟"
ایک آخری گھونٹ لے کر میں نے کپ خالی کر دیا تو اُس نے تھرماس
پھر آگے کر دی۔ —— "چائے اور لیجئے؟"

"اچھا دے دیجئے۔ اِس وقت مجھے ایسی ہی چائے کی ضرورت تھی۔
بہت اچھی بنی ہے"

ہمانتا چائے انڈیلتی ہوئی بولی —— "وہاں تو وہ سروس کے
سلسلے میں رہتے ہیں۔ کوئی گھر در نہیں ہے اُن کا وہاں۔ ریلوے ڈیپارٹمنٹ
میں لاء اسسٹنٹ ہیں۔ ریسٹ رُوم ہی میں رہتے ہیں"

میں نے چائے کا بھرپور گھونٹ لے کر پُوچھا "یہ لاء اسسٹنٹ
کون سی پوسٹ ہوئی؟ کیا ریلوے کے مقدموں کی پیروی کرتے ہیں؟"

"کچھ اِسی طرح کی ہوگی اُن کی جاب! ٹھیک ٹھیک تو میں بھی
نہیں جانتی" ایک خفیف سی ہنسی اُس کے ہونٹوں پر آگئی۔

مجھے محسوس ہوا مسز ہمانتا گجرال اپنے پتی میں پوری دلچسپی نہیں
رکھتی۔ نہیں تو گجرال کی سروس کے بارے میں اُسے ایک ایک تفصیل کا علم ہوتا۔
ہوتی ہیں بعض عورتیں ایسی! جنھیں اپنے شوہر کی بس تنخواہ ہی سے مطلب
رہتا ہے۔ کبھی جاننا ہی نہیں چاہتیں وہ روپیہ کہاں سے آتا ہے اور کتنی
تگ و دو سے لے آتا ہے! ہمانتا بھی اُنھیں عورتوں میں سے ہے۔ لیکن
میں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ کہا "مسٹر گجرال کا پتہ
بتا دیجئے گا۔ سہارنپور جانا ہوا تو اُن سے مِلوں گا۔ وہ بھی تو آپ لوگوں کی طرح
خوش مزاج ہوں گے؟"

اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر میں خالی کپ دھولانے کے لئے باتھ روم
کی طرف چلا گیا۔ واپس آیا تو اُسے بہت سنجیدگی سے کچھ کہنے کے لئے تیار پایا۔
جب تک میں سگریٹ کا پیکٹ نکالتا اور اطمینان سے ایک سگریٹ سلگاتا
اور لیٹے پیروں پر کمبل ڈال کر اُس کی طرف متوجّہ ہوتا وہ اپنے آپ کہنے لگی "اگر
آپ ڈیڈی کو نہ جانتے ہوتے تو شاید میں اِس بارے میں چُپ ہی رہتی۔ لیکن

اِسی پھولوں سے بھی گے اور شاید اُس کے بعد بھی کوئی بار ہیں گے ہیں ہے پہلے ہی تھوڑی تھوڑی آپ کو بھی بتا دیں بہتر ہو گا میں ہی سب بتا دوں یہ کہہ کر اُس نے اپنی صراحی دار گردن کو ذیب ترین کارڈیگن کے سب سے اوپر والے بٹن سے آزاد کیا اور پھر گردن کو اپنے ہاتھ سے دھیرے دھیرے سہلانے لگی۔

"میں اپنے ہسبنڈ سے دو سال سے نہیں ملی۔ ہماری میرج کو تین ہی سال ہوئے ہیں۔ اِن تین سالوں میں بس ایک ہی سال تک ہم ساتھ رہ سکے۔ پچھلے سال۔ اُن کے ساتھ رہتے ہوئے جیسے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ ویسے کوئی اور بات نہیں ہے۔ وہ پرسنلٹی میں بے حد چارمنگ ہیں۔ لیکن عورت اپنے شوہر میں صرف خوبصورتی ہی کا چارم تو نہیں دیکھتی!"

ایک لمحہ کے لئے وہ چپ ہوئی تو میں نے اپنی دلچسپی ظاہر کرنے کے لئے کہا "خوبصورتی کے علاوہ وہ اور کیا کیا چاہتی ہے؟ ایک عورت کی زبان سے معلوم کر کے مجھے واقعی خوشی ہوگی"

یہ سُن کر وہ مُسکرا دی۔ لیکن اُس کی مُسکراہٹ میں وہی کرب نمایاں تھا جو چند منٹ پہلے سے اچانک دکھائی دینے لگا تھا۔ بولی "مسٹر نوری، عورت کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اُس کا شوہر اُسے پوری طرح چاہے"

"کیا مسٹر گجرال آپ سے محبت نہیں کرتے؟ کسی اور کو تو نہیں چاہتے! مجھے یقین نہ آئے گا اگر آپ نے کہا تو! اِتنی خوبصورت عورت کو چھوڑ کر کوئی کیوں دوسری جگہ دل لگائے گا!"

ہمانسا نے کہا "نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے اور کوئی بھی عورت اُن کے قریب نہیں ہے۔ کوئی عورت ایسا کرے گی بھی تو خوش نہ رہ سکے گی۔ میں جانتی ہوں اُن کے نیچر کو۔ وہ اپنی بیوی ہی کو یہ احساس نہ دلا پائے کہ وہ تمام تر اُسی کے ہیں!"

"لیکن یہ بات آپ سب عورتوں کی طرف سے کیسے کہہ سکتی ہیں! ہر عورت ایک سی فطرت کی نہیں ہوتی۔ کوئی عورت یہ خواہش کر سکتی ہے کہ مرد ہی اُسے چاہے! اور کوئی ایسی بھی یقیناً ہو سکتی ہے جو خود ہی اپنے شوہر کو زیادہ پیار کرنا پسند کرے اِبھلے ہی شوہر اُسے اِتنا نہ چاہ سکے۔ چاہنے کا مطلب ایک طرح کا مِلک کا احساس ہے۔ جیسے کوئی اپنی جائداد کو ہر دم اپنے قبضے میں رکھنے کی فکر میں مبتلا رہتا ہے۔ بعض عورتیں اپنے شوہر کے بارے میں بھی اِسی طرح کا رویّہ اختیار کر لیتی ہیں"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے!" اب وہ اور بھی سنجیدہ نظر آئی۔ "مجھے افسوس ہوا ایک چہکتی ہوئی عورت کو ایسا بنا دیا۔ لیکن کر بھی کیا سکتا تھا اب! کہا۔۔۔ "اگر آپ کا مطلب یہ ہے مرد عورت کی ہر خواہش کو بغیر کہے سمجھ لے تو ایسا مکمل اور باہوش مرد تو اِس دُنیا میں کہیں کہیں ہی مِل سکے گا! اور اِس طرح سے سوچنے والی عورتیں عام طور پر فرسٹریٹڈ ہی ہوتی ہیں۔ سو فیصدی دلپسند پارٹنر تو لاکھوں میں سے کسی ایک کو مِلتا ہوگا!"

"آپ تو مردوں کے ٹوپک پر بہت جذباتی ہو گئے!" وہ مُسکرا دی۔ مجھے بہت اچھا معلوم ہوا۔ بہت دیر کے بعد وہ مُسکرائی تھی۔ بولی "دُنیا میں ہر عورت کے لئے کہیں نہ کہیں ایسا مرد ضرور موجود ہے جو اُس کے لئے جان بھی دے سکتا ہے۔ اِسی طرح ہر مرد کے لئے ایک ایسی عورت بھی ہے! اور وہ ایک دوسرے سے مِل بھی جاتے ہیں۔ یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ لیکن ٹریجڈی یہ ہے وہ مِل کر بھی ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پاتے!"

اُسی لمحے گاڑی مراد آباد اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ میں نے اُس سے کہا "میں یہاں بریک فاسٹ منگوا رہا ہوں۔ آپ بھی ساتھ دیجئے گا نا!"

"بریک فاسٹ میرے ساتھ ہے۔ میرا خیال ہے ہم دونوں کے لئے کافی ہوگا! آپ صرف چائے کا آرڈر دیجئے"

یہ کہہ کر اُس نے لال پلاسٹک کا ایک چوکور ڈبہ باسکٹ میں سے نِکال کر

میرے سامنے رکھ دیا۔ اُسے کھولا تو آملیٹ اور پراٹھے دکھائی دیئے۔ اُن کی خوشبو سے ناک بھر گئی۔ میں نے صرف چائے ہی منگوائی۔

چائے آگئی تو ہمانتا ناشتہ میرے سامنے رکھ کر بولی: "میرے اور اُن کے ڈفرنس کو ٹھیک طور سے سمجھنے کے لئے ایک بار اُن سے بھی مل لینا ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے اُن کے ساتھ کچھ ہی دیر رہ کر آپ میری باتوں کی تائید کرنے لگیں گے۔ لیکن ایسا کرنا اب ضروری نہیں ہے۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ اب لکھنؤ ہی میں رہوں گی۔ اِسی نیت سے وہاں جا رہی ہوں۔ جا کر پہلے تو آنٹی سے خوب لڑوں گی۔ یہ رشتہ اُنہی کا طے کرایا ہوا ہے۔ اُن سے کہوں گی اب مجھے اپنے پاس رکھیں اور کوئی سروس بھی دلائیں! اُس کے بعد میں ڈائیورس کے لئے درخواست دوں گی!"

جب کوئی عورت اپنی مرضی سے طلاق لے لینے کی بات کرتی ہے تو وہ عام عورتوں سے بالکل الگ نظر آنے لگتی ہے۔ ذہین، مشتعل، دسترس سے کافی دُور! اُس کے دل و دماغ تک پہنچنے کے لئے آدمی کو اپنے سارے منطقی ہتھیار کُند معلوم ہونے لگتے ہیں۔ کچھ دیر تک میں چُپ سا رہ گیا۔ اُس کے پیش کئے ہوئے ناشتے میں سے میں نے ایک پراٹھا اور تھوڑا سا آملیٹ لے رکھا تھا۔ لیکن اُس نے پُورے پراٹھے میری پلیٹ میں رکھ کر کہا — "لیجئے نا! اِتنا کم کیوں لیا ہے!"

اب اُس کے لہجے سے واضح طور پر احساس ہونے لگا وہ عام مزاج کی عورت نہیں ہے۔ اُس کی شخصیت کا کوئی ایک گوشہ غیر معمولی اور پیچیدہ ہے جو چہرے سے عیاں نہیں ہوتا۔ شکل و صورت کے اعتبار سے تو وہ اِتنی دلکش ہے کہ دُور بیٹھا ہوا مرد چاہے تو اور کچھ بھی نہ سوچے! صرف اُسے پا جانے کے منصوبے بناتا رہے۔ میں اُس کے اِتنا نزدیک ہو کر بھی صرف یہی سوچ کر مطمئن ہو سکا کہ اُس نے اپنی باتیں چھیڑ کر مجھے سوچنے کے لئے ایک موضوع دے دیا ہے۔ لیکن اُس کی بے تکلفی کے پیشِ نظر یہ پُوچھتے ہوئے مجھے ذرا بھی جھجک نہ ہوئی: "کیا آپ کسی اور کو چاہتی ہیں؟ معاف کیجئے میرا سوال بہت زیادہ فرینک سا ہے!"

"نہیں نہیں، آپ کچھ بھی پُوچھئے۔ آئی ڈونٹ مائنڈ! لیکن آپ کی یہ غلط فہمی دُور کر دوں۔ ابھی تک میں نے کسی اور کے بارے میں سوچا تک نہیں ہے!"

ہمانتا جھوٹ بولتی نظر نہ آئی۔ فوراً یقین سا ہو گیا۔ پتہ نہیں یہ سُن کر میں خوش کیوں ہو اُٹھا! مجھے مُسکراتے دیکھ کر بولی: "اگر میں اپنے شوہر کو پسند نہیں کرتی تو اِس کا یہ مطلب کیسے [illegible] ضروری ہے؟"

"ضروری تو نہیں ہے۔ میں صرف جاننا چاہتا تھا [illegible] مرد کس قسم کا ہو سکتا ہے؟ ابھی جو خوبی آپ کا شوہر [illegible] وہ کون سی ہو سکتی ہے!"

"دیکھئے چودھری صاحب! آدرش وادرش کے چکر میں [illegible] اِس طرح کی ڈی ٹیلز پر غور ہی نہیں کیا ہے کبھی۔ نہ اِس میں [illegible] ہوں۔ بس اِتنا کہہ سکتی ہوں مجھے اپنا شوہر کسی خاص وجہ [illegible] پسند نہیں ہے۔ اِس بات کا دُکھ بھی ہے مجھے!"

اُس نے چائے بنا کر پیالہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ کہا: [illegible] ایک ہی چمچ شکر ڈالی ہے اور چاہئے؟"

"جی نہیں، کافی ہے!" میں جلدی جلدی سِپ کرنے لگا [illegible] کرتے دیکھ کر بولی۔

"چائے تو آہستہ آہستہ پینی چاہئے۔ پہلے ہی ٹھنڈی [illegible] گرم گرم چائے پینے سے آدمی کی نزدیک ہو جاتی ہیں!"

ذرا سا ٹھٹکا میں۔ اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر اُسی طرح [illegible] پینے لگا۔ جلدی جلدی پیالہ ختم کر لیا تو کہا: "معاف کیجئے گا میں [illegible] پینے کا عادی ہوں!"

وہ چُپ رہی۔ اگر اُسے میرا جواب اچھا نہ معلوم ہوا ہوگا تو بھی اُس نے ضبط کر لیا۔ اپنا احساس ظاہر نہ ہونے دیا۔ گھونٹ گھونٹ [illegible] دھیرے دھیرے چائے پیتی رہی۔ میں نے سگریٹ سُلگا کر کہا: "مسٹر گجرال کا رویہ اپنے دوستوں کے ساتھ کیسا ہے؟ کیا وہ اُسے پسند کرتے ہیں؟"

بولی: "اُن کے دوستوں کا تو مت پُوچھئے۔ اُنہیں تو اپنے دوست جی جان سے بھی زیادہ پیارے لگتے ہیں۔ جہاں پہنچتے ہیں نئی نئی دوستیاں اُگانے لگتے ہیں!"

"آپ کو خوشی نہیں ہوتی کہ آپ کے ہسبنڈ اِتنے پاپولر ہیں؟"

"اِتنا تو برداشت کر سکتی ہوں کہ اُن کے دو ایک [illegible] ہوں لیکن اِس کے لئے وہ مجھ سے مشورہ ضرور کریں۔ آخر مجھ کو اُن کی ناز برداری کرنی پڑتی ہے۔ ایسے لوگوں کی خاطر داریاں [illegible] میں دیکھنا تک پسند نہیں کرتی!"

باتوں باتوں میں پتہ ہی نہ چلا ہم بریلی پہنچ گئے۔ وہاں [illegible]

[illegible] میں نے اُس سے کہا۔ "میرے خیال میں آپ [illegible]
[illegible] ڈر رہی ہو؟"

وہ کافی دیر چپ ہو گئی تھی، دیر تک کچھ کہہ نہ سکی۔ اُس کی باتوں میں
[illegible] سنا آ رہا تھا۔ [illegible] شاید اُس نے
[illegible] میں اُس کے ہر جواب سے متفق بھی ہو رہا ہوں۔ اسی لئے
وہ گفتگو میں سارا جوش دکھا رہی تھی۔ لیکن اب میں نے اُس کے چہرے پر ایک
جذباتی صدمے کی واضح لہریں اُبھرتی ہوئی دیکھیں۔ میں نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"بات وہی ہے جو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ آپ نے گجرال صاحب کو
اپنی ملک سمجھ لیا ہے۔ لیکن کوئی بھی آج کسی کی ملک بن کر نہیں رہ سکتا۔ ہر آدمی
کا ایک پیدائشی حق ہے اگرچہ اُس کی بھی حدود ہیں۔ اگر آپ غور کرنا پسند
کریں تو ہم اس پر بھی گفتگو کریں گے۔ تھوڑی دیر بعد سہی۔ کھانا کھا لینے کے
بعد مجھے نیند آنے لگتی ہے۔ اجازت ہو تو ذرا سو لوں؟"

یہ کہہ کر میں لیٹ گیا۔ وہ بھی کافی دیر تک سگریٹ پیتی رہی۔ [illegible] معلوم نہیں ہوا
وہ واقعی کچھ سوچ رہی تھی یا میرے رویے ہی کے بارے میں کچھ سوچ رہی تھی۔
یقیناً سوچ رہی ہو گی۔ لیکن میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جمانے کی بجائے
مُنہ پھیر لیا۔ سو گیا۔

قریباً دو گھنٹے کے بعد اچانک میری آنکھ کھلی تو ہمانتا کو اُس کے برتھ
پر نہ پایا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رُکی ہوئی تھی۔ ہر دوئی پر۔ وہ پلیٹ فارم پر
کھڑی تھی۔ بُک سٹال کے سامنے۔ ایک کتاب خرید کر اُس نے بیرے کو بُلایا۔ دُور
سے اپنا کمپارٹمنٹ دکھا کر چائے لے آنے کے لئے کہا۔ مجھے کھڑکی میں سے
جھانکتے دیکھ کر ہمانتا میری طرف آنے لگی۔

بہت سے لوگوں اور گرد و پیش کے درمیان وہ پہلے سے زیادہ
خوبصورت نظر آئی۔ شاید یہ میری دو گھنٹے کی گہری نیند کا ردِ عمل تھا۔ اونچی،
شاہانہ اور ضبط آمیز سنجیدگی! میں نے پہلی بار ہی غور کیا اُس کے بال کالے
نہیں سُنہرے ہیں۔ سفر کی گرد نے ہی انہیں ایسا کر دیا ہو گا! گرد اُس کے
چہرے پر بھی تھی۔ لیکن اُس کی تابناک رنگت اور شوخ ہو گئی تھی۔ ہلکے
[illegible] رنگ کا چوڑی دار پاجامہ، اُسی رنگ کا ریشمیں دوپٹہ اور کیسری
رنگ کا کُرتہ۔ کارڈیگن اُس نے اُتار دیا تھا۔ اُس نے کھڑکی ہی سے کتاب
میرے حوالے کر دی۔ بغیر کسی تبصرے کے۔ میں بھی خاموشی سے چند منٹ تک
اوراق اُلٹتا رہا۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ گاڑی بھی چلنے لگی۔ وہ جلدی سے
اندر آ گئی۔ میرے برتھ پر بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔ میں نے محسوس کیا ہماری
[illegible] جیسے اُس موضوع پر میرے بولنا [illegible]
کے لئے ہچکچاہٹ [illegible] مجھے بہت عجیب سا احساس
ہوا۔ اُس کی ہنسی بھی [illegible] نظر آئی تھی۔ میں جس طرح [illegible] خاموش تھی۔ ہم
ایک دوسرے کی طرف ایک عجیب سی [illegible] سے دیکھ رہے تھے [illegible]
بھی تھی اور ایک طرح کی قربت بھی۔ لیکن بے اطمینانی سے عاری!

چائے اُس نے خاموشی سے پی لی تھی۔ چائے ختم ہوئی تو میرا جی چاہا سگریٹ پیش کر
دیا تو جانتے ہیں مجھ سے نہیں رہا گیا ـــــ بولی: میں ایک بار [illegible] گئی
تھی۔ بہت بڑی قیم بن رہی ہے!"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اُس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی
تھی جس پر میں کچھ بولتا۔ اُس نے کچھ دیر تک چپ رہ کر پھر ایک بات چھیڑی۔
"چودھری صاحب کیا آپ نے کسی سے محبت کی ہے؟" یہ پوچھ کر وہ مسکرا بھی
دی۔

میں نے دیکھا اُس کی آنکھوں میں اچانک ایک چمک آ گئی تھی، وہی
چمک لوٹ آئی تھی جو آغازِ سفر پر میں نے دیکھی تھی۔ اُس کے سوال پر میرے
اندر کسی قسم کا جوش تو پیدا نہ ہوا لیکن میں نے اپنے اندر بولنے کی
ایک تحریک ضرور محسوس کی۔ بات کی جا سکتی ہے۔ سوال بھی خاصا دلچسپ
ہے۔ میں نے کہا: "کئی سال ہوئے جب میں سِول انجینئرنگ کا اسٹوڈنٹ تھا۔
چھٹیوں میں گھر لوٹ رہا تھا۔ ایسے ہی سفر میں ایک لڑکی کو دیکھا۔ اپنے ماں
باپ کے ساتھ تھی۔ خوبصورت۔ نسوانی حُسن کی ایک مثالی تصویر! اُسے دیکھ کر
میں نے اپنے اندر بہت بے اطمینانی محسوس کی۔ بے اطمینانی سمجھتی ہیں
نا آپ! ایسی جس کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ جس کا کوئی جز معنی نام بھی نہیں
ہوتا لیکن اُس کا احساس ہوتا ہے۔ اُس کی ایک میٹھی چبھن ہوتی ہے۔ دل کی
دھڑکن بھی تیز ہو جاتی ہے۔ آپ شاید مجھے بے وقوف سمجھ رہی ہیں! بات ہی
ایسی ہے جو میں نے آج تک کسی اور کو نہیں بتائی۔ پہلی بار آپ کو بتا رہا ہوں۔
مجھے ہنسی بھی آ رہی ہے۔ آپ بھی تو مسکرا رہی ہیں! ہاں۔ اُن کے ساتھ کافی
دیر تک سفر کرنے کے بعد مجھے اچانک احساس ہوا۔ اُس لڑکی کو تو شاید
مسکرانا ہی نہیں آتا! یوں وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ باتیں کرتی رہی تھی۔
اُس کی آواز میں نے سُنی تھی۔ جو میرے کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوئی۔ اُس نے
کئی بار میری طرف دیکھا بھی تھا۔ اُس کی نظر بھی بہت میٹھی محسوس ہوئی لیکن
پتہ نہیں کیوں میرے اندر یہ کریز پیدا ہو گئی جب تک وہ مسکرائے گی نہیں
مجھے اطمینان نہیں مل سکتا۔ صرف ایک ہی بار مسکرا دے۔ میری طرف دیکھ کر۔

میرے لئے! لیکن وہ کئی گھنٹوں کے سفر میں ایک بار بھی نہ مسکرائی تو مجھے ایک صدمے کا احساس ہونے لگا۔ اُس کی مسکراہٹ دیکھنے کے لئے میری کریز شدت میں بدل گئی۔ مجھے راستے ہی میں اتر جانا تھا۔ سہارنپور میں لیکن میں نے سفر جاری رکھا۔ دل ہی دل میں طے کر لیا جس جگہ وہ مسکرا دی میں وہیں اتر جاؤں گا۔ اپنا سفر ختم کر دوں گا۔ اُن لوگوں نے تین جگہ گاڑی بدلی۔ میں بھی ساتھ ساتھ رہا لیکن وہ کہیں بھی نہ مسکرائی۔ پھر ہریانہ کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر اُتر گئی۔ میں بے حد مایوس، بے حد غمگین، بے حد غصّے میں بھرا ہوا لوٹ آیا۔ اُس واقعے کو کبھی بھول نہ سکا۔ اس لڑکی کو بھی۔ اُس کا چہرہ ابھی تک میری نظروں کے سامنے ہے۔ مسکراہٹ سے عاری چہرہ! شاید میں اب بھی اُس سے محبت کرتا ہوں! اگر محبت اسی کا نام ہے!"

ہمانتا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں نے بھی ہنسنے میں اُس کا ساتھ دیا۔ اُس نے ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "لطیفہ بہت دلچسپ ہے!"

اُسے یقین نہ آیا۔ لیکن ہماری بات وہیں ختم ہو گئی۔ کیونکہ اُس کے بعد گاڑی لکھنؤ پہنچ گئی۔ اسٹیشن پر اُسے آنٹی کے مل جانے کی توقع نہ تھی۔ پھر بھی وہ بہت بے صبری سے باہر جھانکتی رہی۔ باہر نکلنے سے پہلے بولی۔ "میں ڈیڈی کو یہاں سے تار دوں گی۔"

میں نے اُسے پلیٹ فارم پر بنی ٹیلیگراف ونڈو کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اُس کا اور اپنا سامان بھی اُسی کے پاس چھوڑ دیا۔ کہا "جب تک آپ تار دیجئے۔ میں اپنے فرینڈ کو فون کر آؤں جس کے ساتھ مجھے ٹھہرنا ہے۔"

میں جلدی ہی واپس آ گیا۔ وہ تار دے دینے کے بعد میرا انتظار کر رہی تھی۔ اُس سے کہا "چلئے آپ کو ٹیکسی کر دوں۔"

بولی "ایسا نہیں ہو سکتا مجھے آپ مہانگر چھوڑ کر اپنے فرینڈ کے یہاں جائیں۔ کیونکہ دیر بہت ہو چکی ہے۔"

سردیوں میں سات ہی بجے رات ہو جاتی ہے۔ میں نے اُس کی بات مان لی۔

جب ہم اُس کی آنٹی کے گھر کے سامنے رُکے تو وہاں ایک بھیڑ دیکھی۔ دس پندرہ خاموش آدمیوں کی بھیڑ۔ جو دروازے کے اندر اور باہر کھڑے تھے۔ ہمانتا کا چہرہ انھیں دیکھتے ہی فق ہو گیا۔ اُس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ بولی "ذرا جلدی سے جا کر اُن سے معلوم تو کیجئے۔ کہیں میری آنٹی کو تو کچھ نہیں ہوا ہے!"

یہ کہتے کہتے اُس کا گلا بھر آیا۔ لیکن مجھے یقین نہ آیا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے!

اتنے غیر متوقع طور پر ٹیکسی سے باہر آ کر ہم ان لوگوں کی طرف گئے تو [illegible] بھی میری طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ گہری اور [illegible] سے۔ لیکن انھوں نے کچھ کہنے کی بجائے اندر جانے کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ میں اندر جا کر بھی دُور تک آگے نہ بڑھ سکا [illegible] پر ایک لاش رکھی تھی۔ لال کفن میں لپٹی ہوئی۔ چند عورتیں اس کے پاس کھڑی تھیں۔ صدمے سے نڈھال۔ لیکن کوئی رو نہیں رہا تھا۔

میں جلدی سے باہر آ گیا۔ ہمانتا کے پاس گیا۔ وہ ابھی تک ٹیکسی کے اندر ہی تھی۔ باہر آنے کی ہمت نہ کر سکی تھی۔ میں نے بہت دھیرے سے کہا "کسی کی ڈیتھ تو یقیناً ہوئی ہے۔ کیا آپ کی آنٹی اسی گھر میں رہتی تھیں؟ [illegible] تو کسی کو بھی نہیں جانتا۔ آپ باہر آئیے!"

یہ سنتے ہی وہ بے اختیار رو پڑی۔ کچھ لوگ ہمارے قریب آ گئے۔ ایک آدمی نے کہا ــــــ "شاید آپ مس کپور ہی سے ملنے کے لئے آئی ہیں! بچاری کا تو تین گھنٹے پہلے اچانک ہارٹ فیل ہو گیا! ہم اسے شمشان لے جا رہے تھے!"

---

کسی اجنبی گھر میں ایسے حالات میں رہنے کا یہ میرے لئے پہلا تجربہ [illegible] بے حد تکلیف دہ نکلنے کی کوئی راہ بھی نہ تھی۔ میرے پاس جتنے روپے تھے وہ [illegible] شمشان جا کر خرچ کر دئے۔ رات کو دو بجے واپس آیا۔ ہمانتا میرا انتظار کر رہی [illegible] مجھے دیکھتے ہی میرے ساتھ لپٹ کر رو اٹھی۔ اُسے میں نے دلاسہ دیا [illegible] میں اُس کے ساتھ ہوں۔ اُس کے پاس محلے کی ایک بوڑھی سردارنی بھی تھی [illegible] اُس نے روک رکھا تھا۔ ہم تینوں ساری رات باتیں کرتے رہے۔ ہمانتا کی آنٹی کے بارے میں۔ اُس نے ساری زندگی شادی نہیں کی تھی۔ پچاس تک۔ کئی سال پہلے کسی کے ساتھ شادی طے ہوئی تھی۔ لیکن اُس آدمی نے [illegible] اور رشتہ کر لیا تھا۔ اب وہ اُسے بھول چکی تھی لیکن شادی نہیں کی تھی۔ [illegible] اسکول میں پڑھاتی تھی۔ لوگ اُس کی بہت عزت کرتے تھے۔

صبح سردارنی کے مشورے سے ہم نے وہاں اکھنڈ پاٹھ رکھوانے [illegible] پروگرام بنایا۔ قریب کے ایک گردوارے میں جا کر میں اپنے سر پر گرنتھ صاحب اُٹھا کر لے آیا۔ ننگے پاؤں چل کر۔ میرے ساتھ ساتھ [illegible] گوروبانی کا پاٹھ کرتے ہوئے۔ گرنتھ صاحب پر چنور بھی جھلتے ہوئے۔ [illegible] کمرے میں تخت پر گرنتھ صاحب کا پرکاش کرایا۔ اُن پر ایک نیا [illegible] چڑھا لیا۔ بوڑھی سردارنی ہی مجھے قدم قدم پر ہدایت دیتی رہی۔ ایک گرنتھی

…کا انتظار کیا۔ دو گھنٹے بعد اُس کی جگہ دوسرے نے لے لی۔ دونوں کی بہت شریف سی تھیں بہت سجی ہوئی اور پاکیزہ۔ ایک گرنتھی جو تھا۔ دوسرا بھی اپنے کام سے دونوں ہی بہت عقیدت رکھتے تھے۔ گوردوانی سُننے والے ہم تین ہی تھے۔ سردارنی، ہمانشا اور میں۔

ہمانشا میری طرف عجیب نظروں سے دیکھتی تھی۔ احسان مندی اور ہیجان سے بھرپور۔ کسی کسی وقت اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی آ جاتی۔ بلکہ مسکراہٹ کا گمان ہی سا ہونے لگتا۔ وہ ابھی مسکرا دے گی! اتنے گہرے دُکھ میں مبتلا ہو جانے کے بعد بھی آدمی مسکرانا بھولتا نہیں ہے۔ اندر میں اُسے بہت عجیب نظر آتا تھا۔ میں نے سر پر رومال باندھ رکھا تھا۔ اپنے خوبصورت اُبھرے ہوئے بال چھپ گئے تھے۔ گوردوارے میں ننگے سر بیٹھنا اُن کی شان کے خلاف تھا۔

دوپہر کے وقت سردارنی اور گرنتھیوں کو وہاں چھوڑ کر ہم ڈاکخانے گئے۔ ہمانشا نے ٹرنک کال پر ڈاکٹر کپور کو کل کے واقعے کی اطلاع دی۔ ڈاکٹر یہ سُن کر بہت مطمئن ہوئے کہ میں ابھی تک ہمانشا کے ساتھ ہوں۔

ڈاکخانے سے نکل کر ہم ایک ہوٹل میں گئے۔ اچانک ہمارے اندر کوئی لذیذ سا کھانا کھانے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ کل رات سے ہم پریشان تھے۔ لیکن کھانے کے دوران ہمارے درمیان بہت کم باتیں ہو سکیں۔ جی تو چاہتا تھا ہمانشا کی دلجوئی کی خاطر کچھ کہوں۔ لیکن وہ میرے خیال ہی سے مضطرب دکھائی دیتی تھی۔ وہ کچھ کہہ نہ پاتی تھی۔ بس ایک بار بہت دھیرے سے کہا "میری وجہ سے آپ بھی پھنس گئے ہیں۔ لیکن آپ ساتھ نہ ہوتے تو میری تو جان ہی نکل گئی ہوتی!"

مجھے تھوڑی دیر کے لئے اپنے محکمے میں جانا تھا جس کام کے لئے آیا تھا اُسے پورا کرنا ضروری تھا۔ اُس دوست کے ہاں بھی جانا تھا جسے میں نے اسٹیشن پر پہنچتے ہی اطلاع دی تھی۔ میں نے چاہا ہمانشا کو گھر بھیج دوں۔ شام تک میں بھی اُس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ لیکن وہ مجھے چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ بولی "مجھے بھی نہ چھوڑئے۔ جہاں بھی جائیے مجھے ساتھ لے چلئے۔"

وہ ہر جگہ میرے ساتھ گئی۔ پھر ہم مہانگر لوٹ گئے۔ گرنتھی پاٹھ میں مصروف تھے۔ سردارنی سر جھکائے، آنکھیں موندے سُن رہی تھی۔ ہم بھی اُس کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔

اگلے دن صبح سویرے ڈاکٹر کپور اور اُن کی مسز آ گئے۔ اُن کے آتے ہی گھر کا ماحول بدل سا گیا۔ ہمانشا کی اُداسی بھی دُور ہو گئی۔ اب وہ خاصی اونچی آواز میں بولنے لگی۔ جسے میں اوپر کے کمرے میں لیٹا ہوا بھی سُن سکتا تھا۔ لیکن وہاں مجھے اب اپنا وجود بے معنی سا محسوس ہونے لگا —— مجھے یہاں سے چلا جانا چاہئے۔ میرا دوست مجھے اپنے یہاں چلے آنے کے لئے کہہ چکا تھا۔ یوں بھی وہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ بولتے تھے، میرے ساتھ کم۔ اُن کے پاس بولنے کے لئے گھریلو مسائل تھے۔ جو عورت مر گئی تھی اُس کی زندگی تھی۔ میرے اور اُن کے درمیان کوئی جذباتی رشتہ نہ تھا۔ اس کے سوا اگر میں جب ڈاکٹر صاحب کے سامنے آ جاؤں یا کوئی کام کرتا ہوا دکھائی دے جاؤں وہ میرا ہاتھ پکڑ کر شکریہ ادا کرنے لگیں۔ اس سے مجھے بہت گھبراہٹ ہوتی۔ اس لئے میں اب اُس ماحول کا حصہ بننے کے لئے تیار نہ تھا۔

موقع پا کر میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا "اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ اپنے دوست کے ہاں جا کر رہوں گا۔"

یہ سُن کر وہ مغموم سے ہو گئے۔ بولے "مجھے آپ کی تکلیف کا پورا احساس ہے۔ لیکن ہم لوگ بھی تو دو ایک دن میں چلے جائیں گے۔ اب کرنا بھی کیا ہے۔ آخری رسوم قریب قریب ختم ہی ہیں۔"

ہمانشا نے سُنا تو اُس نے ڈاکٹر صاحب سے کہا "نہیں ڈیڈی انھیں جانے نہ دیجئے گا۔ آپ نہیں جانتے اِن کی وجہ سے مجھے کتنا حوصلہ ملا ہے! جس دن ہم جائیں اُسی دن یہ بھی اپنے فرینڈ کے ہاں جائیں گے!"

ہمانشا کو میری کتنی ضرورت تھی۔ اِس بات کا احساس مجھے اُس دن گھومتے ہوئے ہوا۔ وہ میرے ساتھ پھر دفتر میں گئی۔ وہاں میری جان پہچان کے لوگوں نے بہت دلچسپی کا اظہار کیا جس پر ہم دونوں بہت محظوظ ہوتے۔ اپنے اپنے دل میں۔ پھر ہم حضرت گنج میں گھومے۔ بیلی گارڈ کے کھنڈروں میں بھی۔ ایک پکچر بھی دیکھی۔ ایک ریسٹوران میں چائے بھی پی اور لکھنؤ والوں کے مزاج کا بھی مطالعہ کیا۔ کبھی مسکرا دئے۔ کوئی ایک ہی صورت دیکھ کر۔ کسی کے اندازِ گفتگو پر۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے بھی دیکھا۔ جیسے اب ہمارے درمیان، ہماری پسند اور ناپسند کے سلسلے میں ایک ذہنی سمجھوتہ سا ہو گیا ہو! لیکن پھر بھی ہم ویسے نہ ہو سکے جیسے لکھنؤ پہنچنے سے پہلے گاڑی کے سفر میں تھے۔ مسرور، باتونی، بحث کے لئے ہر لمحہ آمادہ! اب زیادہ تر خاموش تھے۔ خاموش رہ کر بھی ساتھ ساتھ گھوم رہے تھے۔ چلتے تھے گھومتے ہی رہیں۔ خاموش بھی رہیں۔ زبان سے کچھ نہ کہیں۔ کوئی بھی بات! من ہی من میں سوچتے بھی تھے۔ بہت کچھ! لیکن محسوس ہوتا تھا جو کچھ سوچ رہے ہیں وہ اپنے تک ہی رہے گا۔ اپنے اپنے خیال پر جمے رہنے میں بہت سُکھ ہے۔ اپنے خیالات مضبوط اور محفوظ قلعوں کی مانند ہیں۔

[illegible] لیکن وہ کئی گھنٹوں کے سفر میں ایک بار بھی نہ مُسکرائی تو مجھے
ایک [illegible] احساس ہونے لگا۔ اُس کی مُسکراہٹ دیکھنے کے لئے میری
کریز [illegible] ہو گئی۔ مجھے راستے ہی میں اُتر جانا تھا۔ سہارنپور میں لیکن میں نے
سفر جاری رکھا۔ دل ہی دل میں طے کر لیا جس جگہ وہ مُسکرا دی میں وہیں
اُتر جاؤں گا۔ اپنا سفر ختم کر دوں گا۔ اُن لوگوں نے تین جگہ گاڑی بدلی میں
بھی ساتھ ساتھ رہا لیکن وہ کہیں بھی نہ مُسکرائی۔ پھر ہریانہ کے ایک چھوٹے
سے اسٹیشن پر اُتر گئیں۔ میں بے حد مایوس، بے حد غمگین، بے حد غصّے میں
بھرا ہوا لوٹ آیا۔ اُس واقعے کو کبھی بھول نہ سکا۔ اُس لڑکی کو بھی۔ اُس کا
چہرہ ابھی تک میری نظروں کے سامنے ہے۔ مُسکراہٹ سے عاری چہرہ!
شاید میں اب بھی اُس سے محبت کرتا ہوں! اگر محبت اسی کا نام ہے!"

ہمانتا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں نے بھی ہنسنے میں اُس کا ساتھ دیا۔
اُس نے ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "لطیفہ بہت دلچسپ ہے!"

اُسے یقین نہ آیا۔ لیکن ہماری بات وہیں ختم ہو گئی۔ کیونکہ اُس کے
بعد گاڑی لکھنؤ پہنچ گئی۔ اسٹیشن پر اُسے آنٹی کے مِل جانے کی توقع نہ تھی۔
پھر بھی وہ بہت بے صبری سے باہر جھانکتی رہی۔ باہر نکلنے سے پہلے بولی۔
"میں آنٹی کو یہاں سے تار دوں گی۔"

میں نے اُسے پلیٹ فارم پر بنی ٹیلیگراف ونڈو کے سامنے لے
جا کر کھڑا کر دیا۔ اُس کا اور اپنا سامان بھی اُسی کے پاس چھوڑ دیا۔ کہا: "جب
تک آپ تار دیجئے۔ میں اپنے فرینڈ کو فون کر آؤں جس کے ساتھ مجھے ٹھہرنا ہے۔"
میں جلدی ہی واپس آ گیا۔ وہ تار دے دینے کے بعد میرا انتظار
کر رہی تھی۔ اُس سے کہا: "چلئے آپ کو ٹیکسی کر دوں۔"

بولی: "ایسا نہیں ہو سکتا مجھے آپ یہاں گھر چھوڑ کر اپنے فرینڈ کے یہاں
جائیں۔ کیونکہ دیر بہت ہو چکی ہے۔"

سردیوں میں سات ہی بجے رات ہو جاتی ہے۔ میں نے اُس کی بات
مان لی۔

جب ہم اُس کی آنٹی کے گھر کے سامنے رُکے تو وہاں ایک بھیڑ دیکھی۔
دس پندرہ خاموش آدمیوں کی بھیڑ۔ جو دروازے کے اندر اور باہر کھڑے
تھے۔ ہمانتا کا چہرہ اُنھیں دیکھتے ہی فق ہو گیا۔ اُس نے گھبرا کر میری طرف
دیکھا۔ بولی: "ذرا جلدی سے جا کر اُن سے معلوم تو کیجئے۔ کہیں میری آنٹی کو تو
کچھ نہیں ہوا ہے!"

یہ کہتے کہتے اُس کا گلا بھر آیا۔ لیکن مجھے یقین نہ آیا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے!

اتنے غیر متوقع طور پر ٹیکسی سے باہر آ کر سب حاضر لوگوں کی طرف [illegible]
بھی میری طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ گہری اور ہمدردی [illegible]
سے۔ لیکن اُنھوں نے کچھ کہنے کی بجائے اندر جانے کے لئے میرے لئے راستہ
چھوڑ دیا۔ میں اندر جا کر بھی دُور تک آگے نہ بڑھ سکا۔ سامنے [illegible]
پر ایک لاش رکھی تھی۔ لال کفن میں لپٹی ہوئی۔ چند عورتیں [illegible]
کھڑی تھیں۔ صدمے سے نڈھال۔ لیکن کوئی رو نہیں رہا تھا۔

میں جلدی سے باہر آ گیا۔ ہمانتا کے پاس گیا۔ وہ ابھی تک ٹیکسی کے
اندر ہی تھی۔ باہر آنے کی ہمت نہ کر سکی تھی۔ میں نے بہت دھیرے سے کہا۔
"کسی کی ڈیتھ تو یقیناً ہوئی ہے۔ کیا آپ کی آنٹی اسی گھر میں رہتی تھیں۔ میں
تو کسی کو بھی نہیں جانتا۔ آپ باہر آیئے!"

یہ سُنتے ہی وہ بے اختیار رو پڑی۔ کچھ لوگ ہمارے قریب آ گئے۔
ایک آدمی نے کہا — "شاید آپ مس کپور ہی سے ملنے کے لئے آئی ہیں۔ اُن
بیچاری کا تو تین گھنٹے پہلے اچانک ہارٹ فیل ہو گیا! ہم اُنھیں شمشان لے جا رہے
تھے!"

---

کسی اجنبی گھر میں ایسے حالات میں رہنے کا یہ میرے لئے پہلا تجربہ تھا۔
بے حد تکلیف دہ! نکلنے کی کوئی راہ بھی نہ تھی۔ میرے پاس جتنے روپے تھے وہ میں
شمشان جا کر خرچ کر دئے۔ رات کو دو بجے واپس آیا۔ ہمانتا میرا انتظار کر رہی تھی۔
مجھے دیکھتے ہی میرے ساتھ لپٹ کر رو اُٹھی۔ اُسے میں نے دلاسہ دیا یقین دلایا
میں اُس کے ساتھ ہوں۔ اُس کے پاس محلے کی ایک بوڑھی سردارنی تھی جسے
اُس نے روک رکھا تھا۔ ہم تینوں ساری رات باتیں کرتے رہے۔ ہمانتا کی
کی آنٹی کے بارے میں۔ اُس نے ساری زندگی شادی نہیں کی تھی۔ پچاس سال
تک۔ کئی سال پہلے کسی کے ساتھ شادی طے ہوئی تھی۔ لیکن اُس آدمی نے کہیں
اور رشتہ کر لیا تھا۔ اب وہ اُسے بھول چکی تھی۔ لیکن شادی نہیں کی تھی۔ ایک
اسکول میں پڑھاتی تھی۔ لوگ اُس کی بہت عزت کرتے تھے۔

صبح سردارنی کے مشورے سے ہم نے وہاں اکھنڈ پاٹھ رکھوانے کا
پروگرام بنایا۔ قریب کے ایک گُوردوارے میں جا کر میں اپنے سر پر گورو گرنتھ
صاحب اُٹھا کر لے آیا۔ ننگے پاؤں چل کر۔ میرے ساتھ ساتھ دو [illegible]
گُوروبانی کا پاٹھ کرتے ہوئے۔ گرنتھ صاحب سر پر خود بھی چلتے ہوئے۔ ایک
کمرے میں تخت پر گرنتھ صاحب کا پرکاش کرایا۔ اُن پر ایک نیا [illegible]
چڑھایا۔ بوڑھی سردارنی ہی مجھے قدم قدم پر ہدایت دیتی رہی۔ ایک گرنتھی نے

...ا ہو گیا۔ دو گھنٹے بعد اس کی جگہ دوسرے نے لے لی۔ دونوں کی ... بہت عزت تھی بہت ہی بھولی اور پاکیزہ۔ ایک گرنتھی معمر تھا۔ دوسرا ... اسے دونوں ہی بہت عقیدت رکھتے تھے۔ گور بانی سننے ... ہم تین ہی تھے۔ سردارنی، ہماننا اور میں۔

ہماننا میری طرف عجیب نظروں سے دیکھتی تھی۔ احسان مندی اور ...یان سے بھرپور۔ کسی کسی وقت اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی ...ائی دیتی۔ بلکہ مسکراہٹ کا گمان ہی سا ہونے لگتا۔ وہ ابھی مسکرا دے گی! ...ے گہرے دکھ میں مبتلا ہو جانے کے بعد بھی آدمی مسکرانا بھولتا نہیں ہے۔ ...در میں اسے بہت عجیب نظر آتا تھا۔ میں نے سر پر رومال باندھ رکھا تھا۔ ...ے خوبصورت ابھرے ہوئے بال چھپ گئے تھے۔ گوردوارے میں گرنتھ صاحب کے ...بار میں ننگے سر بیٹھنا اُن کی شان کے خلاف تھا۔

دوپہر کے وقت سردارنی اور گرنتھیوں کو وہاں چھوڑ کر ہم بڑے ڈاکخانے گئے۔ ہماننا نے ٹرنک کال پر ڈاکٹر کپور کو کل کے واقعے کی اطلاع دی۔ ڈاکٹر ...یہ سن کر بہت مطمئن ہوئے کہ میں ابھی تک ہماننا کے ساتھ ہوں۔

ڈاکخانے سے نکل کر ہم ایک ہوٹل میں گئے۔ اچانک ہمارے اندر کوئی ...یذ سا کھانا کھانے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ کل رات سے ہم پریشان تھے۔ لیکن ...انے کے دوران ہمارے درمیان بہت کم باتیں ہو سکیں۔ جی تو چاہتا تھا ہماننا ...دلجوئی کی خاطر کچھ کہوں۔ لیکن وہ میرے خیال ہی سے مضطرب دکھائی دیتی تھی۔ ...ین کچھ کہہ نہ پاتی تھی۔ بس ایک بار بہت دھیرے سے کہا: "میری وجہ سے آپ ...فت پھنس گئے ہیں۔ لیکن آپ ساتھ نہ ہوتے تو میری تو جان ہی نکل گئی ہوتی!"

مجھے تھوڑی دیر کے لئے اپنے محکمے میں جانا تھا۔ جس کام کے لئے آیا تھا ...نصپورا کرنا ضروری تھا۔ اُس دوست کے ہاں بھی جانا تھا جسے میں نے اسٹیشن پر ...اترتے ہی اطلاع دی تھی۔ میں نے چاہا ہماننا کو گھر بھیج دوں۔ شام تک میں بھی ...ن کے پاس پہنچ جاؤں گا لیکن وہ مجھے چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ بولی: "مجھے ...یلی نہ چھوڑیئے۔ جہاں بھی جایئے مجھے ساتھ لے چلیے۔"

وہ ہر جگہ میرے ساتھ گئی۔ پھر ہم مہانگر لوٹ گئے۔ گرنتھی پاٹھ میں مصروف تھے۔ سردارنی سر جھکائے، آنکھیں موندے سن رہی تھی۔ ہم بھی اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔

اگلے دن صبح سویرے ڈاکٹر کپور اور ان کی مسز آ گئے۔ ان کے آتے ہی ...ھر کا ماحول بدل سا گیا۔ ہماننا کی اُداسی بھی دور ہو گئی۔ اب وہ خاصی اونچی آواز میں بولنے لگی۔ جسے میں اوپر کے کمرے میں لیٹا ہوا بھی سن سکتا تھا لیکن وہاں مجھے بے پناہ جو دبے دبے سے ساعتوں ہونے لگا ــــ مجھے یہاں سے چلا جانا چاہئے۔ میرا دوست مجھے اپنے یہاں چلے آنے کے لئے کہہ چکا تھا۔ یوں بھی وہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ بولتے تھے، میرے ساتھ کم۔ اُن کے پاس بولنے کے لئے گھریلو مسائل تھے۔ جو صورت پیدا ہو گئی تھی اُس کی زندگی تھی۔ میرے اور ان کے درمیان کوئی جذباتی رشتہ نہ تھا۔ اس کے سوا کہ جب ڈاکٹر صاحب کے سامنے آ جاؤں یا کوئی کام کرتا ہوا دکھائی دے جاؤں وہ میرا ہاتھ پکڑ کر شکریہ ادا کرنے لگیں۔ اس سے مجھے بہت گھبراہٹ ہوتی۔ اس لئے میں اب اس ماحول کا حصہ بننے کے لئے تیار نہ تھا۔

موقع پا کر میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا: "اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ اپنے دوست کے ہاں جا کر رہوں گا۔"

یہ سن کر وہ مغموم سے ہو گئے۔ بولے: "مجھے آپ کی تکلیف کا پورا احساس ہے لیکن ہم لوگ بھی تو دو ایک دن میں چلے جائیں گے۔ اب رہنا بھی کیا ہے۔ آخری رسوم قریب قریب ختم ہی ہیں۔"

ہماننا نے سُنا تو اُس نے ڈاکٹر صاحب سے کہا: "نہیں ڈیڈی! انھیں جانے نہ دیجئے گا۔ آپ نہیں جانتے اِن کی وجہ سے مجھے کتنا حوصلہ ملا ہے! جس دن ہم جائیں اُسی دن یہ بھی اپنے فرینڈ کے ہاں جائیں گے!"

ہماننا کو میری کتنی ضرورت تھی۔ اس بات کا احساس مجھے اُس دن گھومتے ہوئے ہوا۔ وہ میرے ساتھ پھر دفتر میں گئی۔ وہاں میری جان پہچان کے لوگوں نے بہت دلچسپی کا اظہار کیا جس پر ہم دونوں بہت محظوظ ہوئے۔ اپنے اپنے دل میں۔ پھر ہم حضرت گنج میں گھومے۔ بیلی گارڈ کے کھنڈروں میں بھی۔ ایک پکچر بھی دیکھی۔ ایک ریسٹوران میں چائے بھی پی اور لکھنؤ والوں کے مزاج کا بھی مطالعہ کیا۔ کبھی مسکرا دئے۔ کوئی ایک ہی صورت دیکھ کر۔ کسی کے اندازِ گفتگو پر۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے بھی دیکھا۔ جیسے اب ہمارے درمیان، ہماری پسند اور ناپسند کے سلسلے میں ایک ذہنی سمجھوتہ سا ہو گیا ہو! لیکن پھر بھی ہم ویسے نہ ہو سکے جیسے لکھنؤ پہنچنے سے پہلے گاڑی کے سفر میں تھے۔ مسرور، باتونی، بحث کے لئے ہر لمحہ آمادہ! اب زیادہ تر خاموش تھے۔ خاموش رہ کر بھی ساتھ ساتھ گھوم رہے تھے۔ چاہتے تھے گھومتے ہی رہیں۔ خاموش بھی رہیں۔ زبان سے کچھ نہ کہیں۔ کوئی بھی بات! من ہی من میں سوچتے بھی تھے۔ بہت کچھ! لیکن محسوس ہوتا تھا جو کچھ سوچ رہے ہیں وہ اپنے تک ہی رہے گا۔ اپنے اپنے خیال پر جمے رہنے میں بہت شکھ ہے۔ اپنے خیالات مضبوط اور محفوظ قلعوں کی مانند ہیں۔

پہلے جیسے شوخ رنگوں والے کپڑے نہیں پہنے تھے،
۔ اب وہ بہت ہی سادہ سی ساڑی باندھے ہوئی تھی۔
سادگی سے بالوں کو سنوار کر رکھا تھی لیکن پھر بھی
زیادہ پرکشش، زہین اور سنجیدہ!
اس کے چند ستھے دار اور بھی آچکے تھے۔
سکے تھے۔ اس سے مل کر میں بہت خوش نہ ہوا۔
مرد تھا۔ ٹھیک میرے اندازے کے مطابق نکلا
لئے نہایت ہی موزوں! ہمانتا بھی اُسے
چلی گئی۔ ایسے لمحے کے لئے بھی گجرال کے پاس نہ
رکی۔ اس کی اس حرکت کو گجرال نے اور میں نے
سے۔ میں نے سوچا گجرال کے ساتھ بھی بہت سی
با ہے۔ میں ہمانتا کی نفسیات کو کافی حد تک
اس موضوع پر ایک لمبی گفتگو کر سکتا تھا۔ لیکن
دیا تھ ہی سُننے میں نکل گیا۔ سب لوگ وہاں زیادہ
ہتے تھے۔

اندر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اوپر، جہاں میں
انتا کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے اپنے
کیا؟ ایک تعلیم یافتہ عورت بہت آزادی سے
تنی صلاحیت موجود ہے۔ اذیت سے بھری
خوش اسلوبی سے الگ ہو جائے!
سویا ہوا تھا کہ اچانک وہاں گجرال آگیا۔ اُسے
ہمانتا کے بارے میں گفتگو کروں گا۔ اُسے
نا دوں گا۔ یقیناً وہ سُننا پسند کرے گا۔ نہیں
ل تھا وہ بھی میرے ساتھ باتیں ہی کرنے
بیٹھ کر وہ چپ رہا۔ دیر تک۔ جیسے اُس کے
ا۔ یقیناً۔ اُسے ہلکا ہونا ہی چاہئے۔ میں نے
چھا۔
تھر کی طرح اُس کا ہاتھ بھی جلتا ہوا محسوس

ضروری کام سے۔ مجھے معلوم ہے آپ میری
بتا دیا ہے۔ جو جو باتیں آپ سے ہوئی ہیں
اس کی۔ وہ آپ کی بے حد شکر گزار ہے۔ آپ سے کچھ کہہ نہ سکی۔ اس لئے آپ کے
پاس مجھے بھیجا ہے۔ ابھی ہمیں اور بھی باتیں کرنی ہیں لیکن تنہائی نہیں ملتی۔
نیچے بہت سے لوگ ہیں! ڈسٹرب ہوتے ہیں۔ اگر آپ وہاں چلے جائیں! جہاں
میرا بستر بچھا ہوا ہے!"

یہ کہہ کر اُس نے بہت گرمجوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔ میرا خیال ہے
اُس وقت اُس کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں۔ اندھیرے کی وجہ سے میں
دیکھ نہ پا رہا تھا۔ میں ایک جھٹکے کے ساتھ نیچے چلے جانے کے لئے کمرے سے
باہر نکل گیا۔ سیڑھیوں سے اُترتے وقت میں نے دیوار کے ساتھ ایک سایہ سا
چپکا ہوا دیکھا۔ اپنے بہت قریب! بس ایک ہی ہاتھ کے فاصلے پر۔ چُپ چُپ،
بے حس، سانس تک روکے ہوئے! چند لمحوں تک میں رُکا رہا پھر دھیرے دھیرے
نیچے اُتر گیا۔ صرف ایک بار سر گھما کر دیکھا۔ آخری سیڑھی سے۔ اوپر والے سرے
پر۔ وہ سایہ دھیرے دھیرے حرکت کرتا ہوا میرے کمرے کے اندر داخل
ہو رہا تھا!!

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کیلئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے بصورت دیگر اپنے
مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے۔ ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

## ملاقات

نافع رضوی بی اے ایل ایل بی علیگ

اس زندگی کی راہ میں تم کیوں مل گئے آج
اب میرے صبح و شام کا کچھ اور حال ہے
سینے کی دھڑکنوں میں نہیں لحنِ انبساط
احساس پر بھی ہوئی گردِ ملال ہے

جھکتی ہوئی نگاہیں یہ قربت کے بوجھ سے
کچھ کہہ رہی ہیں جس کو سمجھتا نہیں ہوں میں
اندازِ گفتگو میں عنایت کی جھلکیاں
مجھ کو بتا رہی ہیں کہ تنہا نہیں ہوں میں

آنچل سنبھالنے کی ادا میں کئی پیام
طرزِ سخن میں دعوتِ اُلفت چھپی ہوئی
پھر اک مسکراہٹیں آئینہ دارِ شوق
لہجے کی تازگی میں محبت چھپی ہوئی

اس دل کی تیرگی میں دیئے جل تو جائیں گے
کیوں کر مرے نصیب کی ظلمت مٹاؤ گی
اُجڑے ہوئے چمن کی طرف، کس طرح، بتاؤ
روٹھی ہوئی بہار کو واپس بلاؤ گی؟

مدت کے بعد ہم جو ملے ہیں تو کیا ہوا
پہلے کی طرح شیشۂ دل پھر سے توڑ دو
تم کو بلا رہی ہیں کئی تازہ منزلیں
راہِ وفا میں تم مجھے تنہا ہی چھوڑ دو

نافع رضوی

## غزل

شباب للت ایم۔ اے

مری تکمیلِ رندی میں اک ایسا بھی مقام آیا
"اُٹھایا میں نے جب ساغر فرشتوں کا سلام آیا"

پرستش کا محل آیا، عبادت کا مق
ادب اے دل! کہ پھر اُس جانِ محبوبی

زمانہ غور سے سُننے لگا ہے داستاں میری
جب اے جانِ وفا اِس داستاں میں تیرا نام آیا

ہم اُس محفل میں دم سادھے ہوئے گو
مگر ایسے میں کچھ بے باک نظروں کا پ

لہو سے اپنے جن لوگوں نے تاریخِ وفا لکھی
تعجب ہے نہ تاریخِ وفا میں اُن کا نام آیا

ستم اپنے اچانک آپ کو یاد آگئے
نگاہیں جھک گئیں کیوں آپ کی جب می

مسلسل انتظارِ جام سے جی بھر گیا آخر
تمنا مر گئی پینے کی جب ہاتھوں میں جام آیا

مُسلّط ہو گئیں دل پر حسیں یادوں کی غ
اچانک جب کسی دیرینہ ہمدم کا س

وہ رنگینی کہاں میرے سخن میں جب سے تم بچھڑے
نہ وہ اندازِ فکر آیا نہ وہ حُسنِ کلام آیا

شباب اپنے لہو سے ہم نے کتنے پیڑ سینچے تھے
مصائب کی کڑکتی دھوپ میں کوئی نہ کام آیا

شباب
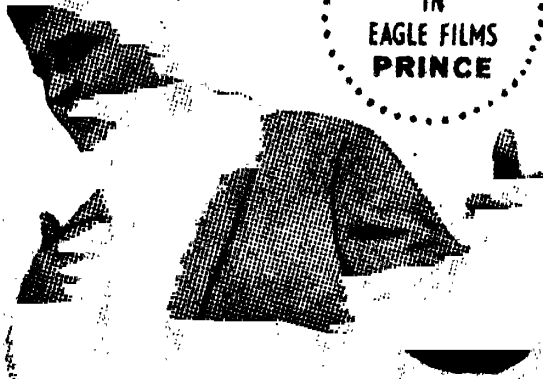
# مِس بہار

رضاء الجبار ایم کام۔ ایل ایل۔ بی

یونیورسٹی ہاسٹل۔ بی روڈ۔ چرچ گیٹ۔ بیرن ڈرائیو۔ بمبئی نمبر ۱

عزیز بھائی جان! تسلیمات

"بیسویں صدی" کے صفحات سے میری طویل غیر حاضری کا مجھے افسوس ہے۔ بہت سے قارئین نے مجھے اِس اِس سلسلے میں کئی بار توجہ دلائی جن کا میں ممنون ہوں۔ مجھے اِس بات کا بھی بے انتہا دکھ ہے کہ میں آپ کو اپنی زندگی کے رفیق سفر کا خیر مقدم کرنے کے موقع پر بھی مدعو نہ کر سکا۔ صرف یاد کرتا رہا۔ بہت بار اور بے اختیار ہر لمحہ آپ یاد آتے۔ کیونکہ "بیسویں صدی" میں شائع ہونے والے میرے افسانوں ہی کے باعث مجھے زندگی کا یہ شریکِ سفر ملا ہے۔ اِس کی مختصر ترین روداد یہ ہے کہ میرے افسانے "رانگ نمبر" کی اشاعت کے بعد زرینہ بانو نے پہلی بار مجھے پونا سے خط لکھا تھا۔ یہ افسانہ کی پسندیدگی کے بارے میں تھا اور یہ کہ وہ میری تحریریں بہت دلچسپی کے ساتھ دیکھا کرتی ہیں۔ ایم۔ اے کی کامیابی کے بعد وہ متواتر بمبئی آنے لگیں تو میرے ساتھ روابط بڑھے اور افسانوں کی بجائے انھوں نے افسانہ نگار کو پرکھنا شروع کیا۔ "بیسویں صدی" میں میرے افسانہ "گل لالہ" کی اشاعت کے بعد ہم نے ساتھ مل کر پھول پہننے اور ایک نشیمن کو سجا کر اپنے لئے گلستاں بنانے کا تہیہ کر لیا۔ ہمارا گھر بس گیا ہے جسے اپنے خلوص و محبت اور ارمان کے ساتھ سنوارنے کا اہتمام زرینہ بانو کرتی ہیں۔ آپ اکثر یاد آتے ہیں۔ کچھ مسائل تھے جن کے باعث میں بہت سے دوستوں کو اور مخلص ترین بزرگوں کو اپنی شادی کے موقع پر مدعو نہ کر سکا۔ سب کو گِلہ ہے، گِلہ آپ کو بھی ہوگا۔ لیکن آپ کے اور دوسرے احباب کے خلوص سے میں نا اُمید نہیں ہوں۔ توقع ہے کہ سب مجھے معاف کر دیں گے ——— میری ڈاک اوپر ہی کے پتے پر آتی ہے۔ پتہ ابھی میں نے نہیں بدلا۔ "بیسویں صدی" برابر مل رہا ہے۔ میں نے رسید نہیں بھیجی۔ اِس کے باوجود آپ مجھے یاد کرتے رہے۔ یہ بات میرے لئے بے انتہا مسرت کا باعث بنی۔ آپ کے اِسی خلوص نے مجھ سے یہ افسانہ لکھوایا ہے جسے آپ "بیسویں صدی" کے معیار کے مطابق پائیں گے۔ . .

آپ کا بھائی ——— رضاء الجبار

★

انگریزوں نے نظر آیا تھا کہ ایسا لگ رہا تھا مس بہار رہی ہے اتر رہی ہے۔ آہستہ آہستہ جیسے رونگٹہ شراب کسی پیرو مرشد کے حلق سے اترتی ہے، قطرہ قطرہ ٹپکتی ہے۔ پھر سرور آتا ہے اور ہوش چلا جاتا ہے۔ سب کے ہوش جانے لگے۔ سات رنگ۔ ہوٹل کے لان میں بیٹھ کر شربت پینے والے لان میں بیٹھ کر پلاسٹک کی چھتریاں لینے والے اندر اور باہر کے ہالوں میں سگریٹوں کے مرغولے اڑانے والے، یہ سب اپنے اپنے ڈھنگ سے اُن ساعتوں کا انتظار کر رہے تھے، جب مس بہار ہوٹل کی تیسری منزل سے نیچے اترے گی۔

یہاں رقاصہ مس بہار کی ہر ادا میں کچھ ایسی شوخیاں تھیں جو دیکھنے والوں کے لئے بجلیاں بن جاتیں۔ وہ سیدھی بھی چلتی تو رقصاں ہونے کا گمان ہوتا۔ جب وہ سچ مچ رقصاں ہوتی تو دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے!

مس بہار کے زینے اُترنے کے انداز اور اس کے چہرے سے اس کے پرستاروں نے اندازہ لگا لیا کہ بہار کسی قدر آزردہ ہے۔ کوئی غم اس کے عنابی ہونٹوں کو چوس رہا ہے۔ کوئی رنج اس کی مدبھری آنکھوں کو چوم رہا ہے۔ کوئی پریشانی اس کی پیشانی کی بندی بنی ہوئی ہے۔

اس کے ہاتھوں میں اس کے پروگرام کا اشتہار تھا جس میں ایک اخبار میں چھپے ہوئے مضمون کے جملے جلی حرفوں میں دہرائے گئے تھے۔

"بہار آتی ہے تو باغوں میں پھول کھلتے ہیں اور مس بہار جب اسٹیج پر جھومتی ہوئی نمودار ہوتی ہے تو تماشائیوں کے دل کھل جاتے ہیں۔ ان کے دلوں کے ویرانوں میں بہار آجاتی ہے۔ تمناؤں کی کلیاں چٹکنے کو بیقرار ہو جاتی ہیں!"

"سات رنگ" ہوٹل کے لان، لانج اور ہالوں میں بیٹھے ہوئے سب لوگوں کی آنکھوں میں بس یوں ہی سے سوال تھے۔

"مس بہار کو کیا ہو گیا ہے؟"

"مس بہار کو اُداسی سے رغبت کیوں ہو گئی ہے؟"

"بہار کے چہرے پر خزاں کی پرچھائیاں ——— اُف! کیا ایسا بھی ممکن ہے؟"

اس شام بہار کا پروگرام شہر میں کہیں بھی نہ تھا۔ بس اس لئے سات رنگ، ہوٹل میں ایک جمگھٹا تھا۔ جس شام کو شہر میں کوئی پروگرام نہیں ہوتا، اس شام کو مس بہار سات رنگ، ہوٹل کے اندر، باہر، اِدھر اُدھر تتلی کی طرح اُڑتی پھرتی۔ وہاں آنے والا کوئی فرد اس کے لئے اجنبی نہ ہوتا۔ نظر میں جو بھی آجاتا اُسے آشنا مسکراہٹ سے نوازتی، جدھر چاہتی چلی جاتی، کہیں بھی بیٹھ جاتی، گنگناتی، ہنستی اور قہقہے لگاتی۔ خالی جگہ نہ ہوتی تو جگہ خالی کروا کے بیٹھ جاتی۔ رقص کرتی ہوئی اِدھر سے اُدھر چلی جاتی۔ تھک جاتی تو سب کو چھوڑ کر اوپر اپنے کمرے میں چلی جاتی اور محفل برخاست ہو جاتی۔

اس شام کوئی پروگرام نہ تھا اور اگلی شام شہر میں اس کا آخری اور بہت ہی اہتمام سے کیا جانے والا شاندار پروگرام تھا جس کی خوب پبلسٹی ہوئی تھی۔ اس پروگرام کے چند ہی گھنٹوں کے بعد اس نے پیرس کے لئے فلائی کرنے کا انتظام کر لیا تھا کیونکہ وہاں اس کے اگلے پروگرام کی بات ہو رہی تھی۔ ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔

آخری پروگرام کی بنا پر اس کے پرستاروں نے اس کی اُداسی کو بھانپ لیا تھا اور یہ جدائی انھیں بے انتہا شاق گزر رہی تھی۔ پروگرام آخری اور بہت شاندار تھا اس لئے اونچی قیمتوں کے باوجود سارے ٹکٹ بک چکے تھے۔ وہ لوگ جنھیں ٹکٹوں کی بجائے مایوسی ملی تھی خاص طور سے سات رنگ، کو آئے تھے، لیکن اس شام مس بہار کا رنگ ہی اور تھا!

وہ اُداس تھی ———

جب نیچے اُتر گئی تو منیجر کا ایک اسسٹنٹ بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔

"مس صاحبہ! اخبار کا رپورٹر آپ سے ملنے کے لئے بہت دیر سے بیٹھا ہے۔ کہتا ہے آپ سے تنہائی میں کسی ضروری اور اہم خبر کی تصدیق درکار ہے۔ اس نے اصرار کیا تو ہم نے ایک الگ کیبن میں بٹھا دیا ہے" منیجر کے اسسٹنٹ نے کیبن کی طرف اشارہ کر کے کہا "آپ چاہیں تو مل سکتی ہیں"

"میں کسی رپورٹر سے اب ملنا نہیں چاہتی۔ اسے کہہ دو کہ وہ چند گھنٹوں کے بعد آئے۔ جب تک میں تنہائی چاہتی ہوں مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو اور ——— " بہار نے ایک بالکونی کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں وہاں بیٹھنا چاہتی ہوں۔ اردگرد کوئی نہ ہوگا سوائے میرے اور جسے میں اپنے ساتھ بٹھانا چاہوں گی"

"جی مس! میں اُن لوگوں کو وہاں سے دوسری بالکونی میں منتقل کروا دوں گا۔ بس ذرا پانچ منٹ!"

"میری سکریٹری حمیدہ کو بھی وہاں بھیج دو۔ آج کی ڈاک کے ساتھ"

"جی مس!" کہتا ہوا منیجر کا اسسٹنٹ چلا گیا۔ بالکونی کی جگہ خالی ہونے میں دیر نہ لگی۔ حمیدہ شارٹ ہینڈ بک، خطوط کے پلندے اور پنسل لئے ہوئے دوڑی آئی۔

"میں آج پیوں گی کوکا کولا میں رم ملا کر۔ حمیدہ! آج کی ڈاک میں میرے خطوط کتنے ہیں۔ کوئی بات اہم ———؟"

"ستائیس خطوط آئے ہیں۔ سات خطوط اُن پرستاروں کے ہیں جو آپ سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور شادی کا پیام بھیجا ہے۔ پندرہ خطوط لکھنے والے پرستاروں نے آپ کو خدا حافظ لکھا ہے اور پوچھا ہے کہ آپ کب جا رہی ہیں اور پھر اس ملک میں کب آئیں گی۔ وہ آپ کی سلامتی و عافیت کے لئے دُعا کرتے رہیں گے۔ پانچ خطوط مختلف سوسائٹیوں سے آئے ہیں جو آپ سے ایک آدھ مختصر ہی سا پروگرام چاہتے ہیں" حمیدہ نے

کہا: "انھیں شاید آپ کی روانگی کا علم نہیں۔ دوسروں کو بھی نہیں۔ صرف اتنا جانتے ہیں کہ آپ جلد ہی واپس چلی جائیں گی۔ بس یہی باتیں ہیں۔ کوئی خاص اور اہم بات نہیں ہے۔"

"شادی کا پیام لانے والے خطوط کیا اہمیت نہیں رکھتے حمیدہ؟" اُداسی کے باوجود مِس بہار نے کسی قدر شوخی سے سوال کیا تو کنواری حمیدہ کا چہرہ حیا کی ہلکی سُرخی سے بوجھل ہو کر ذرا سا جھک گیا۔ مِس بہار نے پھر کہا۔ "میں ایک آباد نگر جیسی ہوں۔ ایک روشنی کے شہر کی طرح ہوں۔ اس آباد شہر کو لوٹنے کے لئے ڈاکو ہر جگہ، ہر وقت تیار ملتے ہیں۔ شادی کے پیام والے خطوط کی تفصیل بتاؤ۔" ذرا سا رُک کر وہ پھر بولی: "آج کی شام تمھیں حسین معلوم ہوتی ہے نا حمیدہ؟"

"نہیں۔" حمیدہ نے جواب دیا: "جس شام آپ رقصاں نہیں ہوتیں وہ شام حسین نہیں ہوتی۔"

"اچھا؟" بہار نے اُسی شوخی سے کہا: "اگر میں یہ کہہ دوں کہ آج شام میں رقص کرنے کی بجائے اپنا نکاح پڑھواؤں گی۔ ایک بسے ہوئے شہر کو ایک لُٹیرے کے لئے کھول دوں گی، تب تم کیا کہو گی حمیدہ؟"

"چونکا دینے والی شام!" حمیدہ نے حیرت آمیز لہجے میں کہا: "آپ اچانک ایسا کیوں کریں گی۔ یہ کوئی کھیل ہے کیا؟"

"کھیل ہی سمجھو۔" مِس بہار نے کہا: "شام کی اُداسی کو دُور کرنے کے لئے ایک کھیل ہی سہی۔ شادی کا پیام لانے والے خطوط سناؤ۔"

حمیدہ نے خطوط الگ کئے اور پہلا خط نکال کر بولی۔

"مِس! یہ پہلا خط کسی مسٹر فیض کا ہے۔ گیارھویں بار اپنے خون سے لکھا ہے! گھر کا پتہ نہیں، کالج کا پتہ درج ہے۔ ایک تصویر ہے اور یہ بھی صاف لکھا ہے کہ آپ جب بھی 'سات رنگ' کے خوبصورت چمن میں آئیں گی تو انھیں مشرقی گوشے کے آخری ٹیبل پر انگور کا رس پیتے ہوئے دیکھ سکتی ہیں۔"

"اوہ! تو میں ابھی دیکھ لوں گی!" مِس بہار نے ہلکی سی مُسکراہٹ سے تصویر دیکھتے ہوئے کہا: "بیرے سے کہو کہ انھیں بُلائے اور تم حمیدہ! اپنے وکیل صاحب کو فون کرنا کہ وہ قاضی صاحب اور دو گواہوں کو لے کر ممکنہ عجلت سے یہاں آجائیں۔"

"آپ کو کیا ہو گیا ہے مِس بہار؟ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"اچھی ہے۔ اپنی سکریٹری سے میں ہمیشہ یہ توقع رکھتی ہوں کہ وہ میری بات لفظ بہ لفظ اور فوراً مانے۔ جاؤ حمیدہ!"

بیرا کوکا کولا کی بوتل اور گلاس لے آیا۔

حمیدہ جانے لگی۔ مِس بہار چُسکیاں لینے لگی۔ وہ کنکھیوں سے نیچے بیٹھے ہوئے اُن سب لوگوں کو دیکھ رہی تھی جو اپنی آنکھوں میں بہار کے لئے سوالیہ نشان لئے بالکونی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

چند ہی لمحوں کے بعد اُودے سُوٹ میں ملبوس ایک نوجوان آتا ہوا دکھائی دیا۔ مِس بہار کھڑی ہوئی اور سلام کرتے ہوئے بولی: "اچھا تو آپ ہی مسٹر فیض ہیں؟"

"جی ہاں۔ مسٹر نہیں صرف فیض کہئے۔" فیض کے چہرے پر خوشی اور حیرت کے نقوش بہت ہی آسانی کے ساتھ دیکھے جا سکتے تھے۔

"آپ بیٹھئے مسٹر فیض!" بہار نے خود بھی بیٹھتے ہوئے کہا: "آپ کیا پئیں گے؟"

"جی میں کچھ نہ پیوں گا۔ آپ سے باتیں کروں گا۔ آپ کی طرف دیکھوں گا! یہ بھی پینے ہی کے برابر ہے!"

"اوہ!" بہار نے مُسکرا کر کہا: "مجھے آپ کے گیارہ خطوط ملے۔"

"مطلب یہ ہوا کہ ایک خط ڈاک میں گُم ہو گیا۔ میں نے بارہ لکھے تھے۔" فیض نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سوچتے ہوئے اور آہستہ آہستہ کہا۔

"اچھا بارہ ہی سہی۔" بہار نے کہا: "میں یہ سوچتی ہوں تو میرا دل بھر آتا ہے کہ میری وجہ سے آپ کو بارہ زخم لگ گئے۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ آپ کو تیرھواں زخم نہ لگنے دوں گی۔ میں کسی کو زخم خوردہ نہیں دیکھ سکتی۔ آپ کے زخم بھر تو گئے ہیں نا؟"

"آپ کتنی رحم دل ہیں!" فیض کے لبوں پر مُسکراہٹ تھی: "جس طرح آپ کے خوبصورت پیکر کا ثانی نہیں ہے اسی طرح آپ کے نازک دل کی بھی مثال نہیں ہے۔"

"آپ کے الفاظ میرے کانوں میں رس گھول رہے ہیں!" بہار اُٹھی اور فیض کی بغل میں بیٹھتی ہوئی بولی: "آپ کے رُوبرو نہیں بلکہ آپ کے پاس بیٹھوں گی۔"

ہلکی سی مُسکراہٹ لبوں پر لئے بہار نے بہت سی چُسکیاں لیں اور اپنے لہجے کی دلفریبی میں لہرا کر بولی: "ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میری زندگی کے دن آج سے شروع ہو رہے ہیں۔ ایک سُرور سا میرے جسم میں بھرتا جا رہا ہے۔"

"یہی کیفیت میں بھی محسوس کر رہا ہوں بہار!" فیض نے الفاظ کو چباتے ہوئے کہا۔

"میں نے آپ کے پیام کو منظور کر لیا ہے۔ میں آپ سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ آپ وہی ہیں جسے میں نے برسہا برس تک ڈھونڈا ہے!"

"آپ مجھ سے شادی کریں گی؟ مجھ سے؟" فیض کے سوال میں حیرت تھی۔ اُس نے آگے کہا "میرے کانوں کو یقین نہیں آ رہا ہے کہ میرے خواب یوں اچانک ایک درخشاں حقیقت کا رُوپ لینے کے لئے مجھے پکار رہے ہیں؟"

"ہاں میں آپ سے شادی کروں گی۔ بہت ہی جلد کروں گی تاکہ آپ کے زخموں پہ مرہم اپنے ہاتھ سے رکھ سکوں۔"

"آپ کا دل بہت نازک ہے۔ اِس لئے سچ بات بتانی ہی ہوگی۔" فیض نے رُک رُک کر کہا۔ "زخم میرے دل پر ہیں۔ جسم پر نہیں ہیں۔"

"اوہ! پھر وہ خون جسے خط لکھنے کے لئے آپ نے استعمال کیا؟"

"وہ تین مہینوں پہلے کی بات ہے۔ میں ایک حادثے سے دوچار ہو گیا تھا۔ خون بہت نکلا۔ اُس خون کو محفوظ کر کے میں نے اُسی وقت پندرہ خطوط لکھ ڈالے تھے اور وقفہ وقفہ کے ساتھ آپ کے نام سپردِ ڈاک کرتا رہا اِس اُمید کو لئے کہ کسی وقت تو آپ میرا ایک ہی خط سہی پڑھ لیں گی۔ زخم میرے دل پر ہیں اور گہرے ہیں!"

"دل کے زخم ہی زندگی میں تلاطم لاتے ہیں فیض!" بہار نے ایک جھپکی لی اور کہا "چلئے آج ہی شادی کر لیں۔ آپ تیار ہیں نا؟"

"آج ہی شادی ——!" حیرت سے فیض اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سکتے میں آ کر بولا "شادی —— لیکن اُس کے لئے تو تیاری کرنی ہوتی ہے۔"

"کوئی تیاری نہیں۔" بہار نے اطمینان سے کہا "آپ بیٹھ جائیے۔ قاضی صاحب کو بُلا کر نکاح پڑھوا لیں گے۔ بات ختم۔"

"اوہ —— آں ہاں ——" فیض سوچنے لگا۔ بہار نے فوراً کہا۔ "مجھے عجلت ہے۔ بس ایک ہی دو گھنٹوں کے اندر شادی کر لیں گے!"

"اتنی جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ میں نے اپنی ماں سے اجازت نہیں لی" فیض بولا "میں ہر بات میں اپنی ماں کی اجازت لیتا ہوں۔ وہ اجازت دے دیں گی۔ ضرور دیں گی۔ آپ ٹھہرئیے میں اُن سے ابھی پوچھ کر آؤں گا۔ اُنھیں ساری بات بتا دوں گا۔ اپنے ساتھ اُنھیں بھی لے کر آؤں گا۔"

بہار پکارتی ہی رہ گئی اور فیض بھاگنے لگا۔ جب وہ زینے اُترتا ہوا نظر آیا تو بہار نے کوکا کولا کا گلاس فرش پر پھینک کر حمیدہ کو پکارا۔ حمیدہ بھاگتی ہوئی آئی تو بہار نے کہا۔

"ارے وہ تو اپنی ماں سے پُوچھنے چلا گیا حمیدہ! یوں دودھ پیتا بچہ تھا تو خط بھی ماں سے پُوچھ کر لکھے ہوتے۔ دوسرا خط دو!" لہجہ کو کسی قدر سخت بنا کر اُس نے پُوچھا "وکیل صاحب کو تم نے فون کر دیا ہے نا کہ وہ قاضی صاحب کو اور گواہوں کو لے کر آ جائیں؟"

"جی ہاں" کہہ کر حیرانی اور پریشانی کے مِلے جُلے لہجے میں حمیدہ نے پُوچھا "مِس آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میری طبیعت اچھی ہے۔" بہار کا لہجہ دم بھر میں نرم ہو گیا "دوسرا خط کس کا ہے؟ توقع ہے کہ اِس بار بہار کو کامیابی ہو گی۔"

"دوسرا خط کسی شاعر کا ہے" حمیدہ نے خط نکالتے ہوئے کہا۔ "معلوم نہیں نام کیا ہے لیکن ہر جگہ درد، درد نظر آ رہا ہے۔"

"چلو درد تخلص ہو گا۔ کام کی بات پہلے۔ قاضی آتے ہی ہوں گے۔"

"ہاں۔ جی ہاں ایک کونے میں نام بھی لکھا ہے۔ ہاشم درد" حمیدہ نے فوراً کہا "تصویر بھیجی ہے۔ چائے پیتے ہوئے مصرعے جوڑتے ہیں اور اکثر اِسی ہوٹل کے درمیانی ہال میں مِل جاتے ہیں۔"

"وہ تصویر مجھے دے دو۔" بہار نے ہاتھ بڑھا کر کہا "میں تصویر دیکھتی رہوں گی تب تک بہت ہی عجلت سے درد کا پتہ لگا کر بہار تک لے کر آؤ!"

حمیدہ بھاگتی ہوئی گئی۔ بہار کے ہاتھ میں تصویر تھی۔ سفید شیروانی میں ملبوس ایک نوجوان سا شاعر۔ سر پر بڑے بال، ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ کو دبائے۔ ذرا سا یوں ہی دیکھ کر بہار نے بے پروائی سے سامنے رکھی تپائی پر تصویر ڈال دی۔ چند لمحوں کے بعد بہار نے دیکھا وہی تصویر زینے طے کر رہی ہے۔ سفید شیروانی زیب تن کئے، ہونٹوں پر ویسی ہی مُسکراہٹ لئے ایک صاحب اوپر آ رہے تھے۔

بہار سے نظریں مِلتے ہی درد نے جُھک کر بہت ادب سے سلام کئے جیسے سامنا بہار کا نہیں، ایک بڑے مشاعرے میں بھرے مجمع کا ہے جو انہی کے شعر کو سراہ رہا ہے۔

ہاتھ کے اشارے سے بہار نے خوش آمدید کہا اور صوفے کی طرف بیٹھنے کا اِشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"لوگ مجھے بہار کہتے ہیں لیکن آپ کی آمد کے بعد ہاں میں اپنے آپ کو

بہار کہہ لوں گی۔"

"آپ اپنے آپ کو بہار کہیے۔" درد نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ایک شاعر کی نظر آپ کو ایک پیاری غزل کہہ لے گی جس کا ہر شعر خوبصورت ہے اور شعر کا ہر لفظ موزوں اور مناسب ہے!" انھیں لمحوں میں تپائی پر پڑی ہوئی اپنی تصویر پر نظر گئی تو بولا: "زہے نصیب میری تصویر آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے!"

"تصویر ہی نہیں۔ آپ کا خط، آپ کے قیمتی جذبات، سب ہی میرے خیالوں میں ہیں۔ یہ سب آپ کی خوبصورت شخصیت کو نمایاں کرتے ہیں۔"

درد نے فوراً کہا: "اور میری نظمیں جو میں نے خط کے ساتھ بھیجی تھیں، وہ بھی آپ کو پسند آئی ہوں گی۔ آپ کا تصور دل و دماغ میں عود و عنبر کے دھوئیں کی طرح ہر دم بسا رہتا ہے۔ اسی کی شہ پاکر میں نے بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ وہ دو نظمیں بھی!"

"نظمیں پیاری ہیں۔ بہت بار میں نے پڑھیں!" بہار نے فوراً کہا "اسی لئے ایک بڑا فیصلہ میں نے کر لیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک لاٹری کے انعام کی طرح اچانک آپ کے نصیب میں آجاؤں! آپ کے ساتھ شادی کرنے کے لئے میں نے اپنے آپ کو آمادہ کر لیا ہے۔ آپ کا پیام مجھے قبول ہے۔"

"میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں گا بہار!"

"اوہ! پاگل آپ بعد میں ہوئیے گا!" بہار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پہلے نکاح! ورنہ کوئی دوسرا مجھے آپ سے چھین لے گا تو میں اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں کہ میرے درد کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوگا!"

"شادی ایک وعدہ کا نام ہے۔" درد نے خوشی سے سرشار ہوتے ہوئے کہا: "ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہونے کا وعدہ میں آج بھی کر سکتا ہوں۔"

"گڈ!" بہار جھومی: "دو گواہ اور ایک وکیل کی موجودگی میں چلو ہم ایک دوسرے کے ہو جائیں۔ آج ہی بلکہ یوں کہوں گی کہ ابھی!"

"یوں جھٹ پٹ! جیسے آپ کے پاس الہ دین کا کوئی چراغ ہے!" درد مسکرایا۔

"ہاں ہے!" بہار نے مسکرا کر جواب دیا: "دیکھئے بتاتی ہوں۔" پلٹ کر بہار چیخی: "حمیدہ او حمیدہ!" اور درد سے مخاطب ہوئی۔ "الہ دین کے جادوئی چراغ کا جن میرے پاس حمیدہ کے روپ میں آرہا ہے۔"

جب تک حمیدہ آگئی تھی۔ بہار نے پوچھا۔

"وکیل صاحب؟"

"آ چکے ہیں۔" حمیدہ نے فوراً فقرہ مکمل کیا: "نیچے کمرہ نمبر ۹ خالی تھا میں نے وہاں بسا دیا ہے۔ اُن کے ساتھ قاضی صاحب اور دوسرے لوگ بھی ہیں۔"

جملہ مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے آپ میں گم سم سی ہو گئی۔ بس بہار اُس کے نزدیک ایک بہت بڑی فنکارہ تھی اور شادی کا فیصلہ اُس کی سوچ کے مطابق زندگی کا ایک اہم فیصلہ تھا۔ ایک بڑے فنکار کو ایک بڑا فیصلہ بڑے تزک و اہتمام، شان و شوکت اور دھوم دھام سے کرنا چاہئے تھا لیکن یہاں بات بالکل برعکس بن کر اُس کی سوچنے اور سمجھنے کی ساری قوتوں کو بے جان کر چکی تھی۔ وہ بس دیکھ رہی تھی۔

بہار صوفہ پر سے اُٹھی۔ درد بھی اُٹھا۔

بہار نے کہا: "چلو!" اور دونوں زینوں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔ زینوں کے قریب آئے تو بہار بولی: "آپ اپنا تخلص آج ہی سے بدل ڈالیے گا۔ درد کی بجائے باغ رکھ لیجئے۔ باغ و بہار کے اشتراک میں کیف ہوتا ہے۔"

"آپ کے خیالات بہت شاعرانہ ہیں!" درد نے کہا: "ساری زندگی آپ کا کہا ماننے کا وعدہ کرتا ہوں۔ چلئے آج سے میں اپنا تخلص باغ ہی لکھوں گا۔"

"بہار ایک رقاصہ ہے۔" اپنے ہی بارے میں بہار بولنے لگی: "رقص کے فن کو اس نے زندگی کی طرح اپنایا ہے۔ رقصاں رہنے میں اسے خوشی ملتی ہے۔ اس کی زندگی کی خوشیوں کے راستے میں رکاوٹ بن کر اسے دُکھ تو نہ دوگے؟ بہار کو کبھی طلاق دوگے کیا؟"

"آپ کی وابستگی مجھے ساری عمر دیوانہ بنائے رکھے گی۔ میں اپنی دیوانگی میں مگن رہوں گا۔ کوئی دوسری بات کرنے کا خیال ہی نہ ہوگا۔"

"تو یوں کرتے ہیں کہ قاضی صاحب کے سامنے معاہدہ کر کے طلاق دینے کے حق سے آپ دستبردار ہو جائیں گے۔ اس کا حق مجھے ہوگا۔ اس بات کا بھی وعدہ کرنا ہوگا کہ آپ میرے اپنائے ہوئے فن کے لئے اور میرے پروگرام میں کوئی رکاوٹ نہ بنیں گے۔"

"مجھے یہ شرائط منظور ہیں۔"

"نکاح کے بعد میں آپ کو وداع کر دوں گی کیونکہ آپ جانتے ہیں

کل میرا ایک بہت بڑا پروگرام ہے۔ اور پرسوں ندرسے اور میرے سب اہلکار میرا انتظار کر رہے ہیں۔ بس کل کا پروگرام ہو جانے دیجئے۔ اس کے بعد ہی ہم زندگی کے لئے اپنا ایک لائحۂ عمل بنائیں گے۔"

"مناسب ہے۔"

وہ زینوں کے نیچے اتر کر باتیں کر رہے تھے۔ باتیں ختم ہوئیں تو بہار نے ورد کے بازو کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کمرے کی طرف جانے لگی جہاں قاضی صاحب گواہوں کی موجودگی میں نکاح کے الفاظ پڑھنے کے منتظر تھے۔ سب باتیں جس طرح طے کی گئی تھیں اسی طرح رُوبہ عمل لائی گئیں۔ جمیدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور اس کے ہوش گم تھے۔

نکاح ہو جانے کے بعد بہار نے اپنے ہاتھ سے ورد کے بازو کو پکڑ لیا اور بولی۔

"چلئے میں آپ کو باہر کے گیٹ تک چھوڑ دیتی ہوں مجھے اپنے پروگرام کی ریہرسل کرنی ہے۔ آپ کو چھوڑ کر میں اوپر چلی جاؤں گی۔"

دونوں باہر نکلے۔ ہال میں سے ہوتے ہوئے لان میں سے گزر رہے تھے۔ لوگ پلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ ان کی نگاہوں میں ایک ہی مشترک سوال ہر ایک ہی مشترک چاہ تھی، وہ کون خوش نصیب ہے جس کے بازو کو بہار نے تھام لیا ہے، کیا یوں نہیں ہو سکتا کہ ہمارے بازو کو بھی یوں ہی تھام کر سب کو دکھاتی ہوئی اسی طرح سامنے سے گزر جاتے!

باہر کے آخری گیٹ پر آئے تو بہار نے ہاشم سے کہا۔

"میرا اگلا پروگرام پیرس میں ہے۔ چلو وہیں ہنی مون منائیں۔ ساتھ میں تو کم از کم بارہ ہزار ہوں گے۔ کل تک انتظام کر لو پھر ساتھ چلنے کی بات طے کر لیں۔"

"بارہ ہزار؟" گھبرا کر ہاشم پلٹا اور بولا "ہنی مون پیرس میں منانے کی کیا ضرورت ہے؟"

بہار زور سے ہنسی "اچھا خیر۔ خدا حافظ!"

ہاشم کو چھوڑ کر بہار پلٹی۔ اس کمرے کا رُخ کیا جہاں اس نے دو گواہوں اور وکیل صاحب کو چھوڑا تھا۔ قاضی صاحب جا چکے تھے۔ دروازے پر جمیدہ کھڑی تھی۔ ویسی ہی حیران اور پریشان۔ بہار نے بہت پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔

"میں جانتی ہوں تم مجھے مبارک باد دینے کے لئے یہاں کھڑی ہو۔ تمھیں سب کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا ہے نا؟ چلو، اندر چلو۔"

کمرے کے اندر آئے تو وکیل صاحب اور دوسرے دو افراد تھوڑی دیر کے لئے کھڑے ہوئے۔ بہار نے وکیل صاحب سے کہا۔

"شادی کی خبر کو پریس بھیجنے کا انتظام کر دیجئے گا۔ میں کل پروگرام کے بعد ہی بارہ بجے رات کے پلین سے جا رہی ہوں۔ لیکن دیکھئے گا یہ بات پریس کو نہ جائے گی ورنہ میرا جانا مشکل ہو جائے گا۔"

"میں جانتا ہوں آپ کے پرستار طوفان بن کر آپ کی راہ میں حائل ہو جائیں گے۔ اس لئے مناسب نہیں ہے۔"

بہار پھر بولی "شادی کی اطلاع کی نیوز بہت ضروری ہے۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ چوبیس گھنٹوں میں ملک کو چھوڑ دینے کے لئے اس سرکاری حکمنامے کی بات اب راز نہیں رہی۔ ایک رپورٹر مجھ سے ملنے آیا تھا۔"

"آپ فکر نہ کریں" وکیل صاحب نے کہا "اس نیوز آئٹم کو میں نے رکوا دیا ہے۔ اب شادی کی خبر کل کے اخباروں میں اگلے صفحہ پر ہوگی۔ آپ کے گواہ نے انتظام کر دیا ہے۔"

بہار مسکرا کر اس گواہ کی طرف پلٹی اور پوچھا۔

"سیٹھ صاحب کی طبیعت کیسی ہے رحیم صاحب؟"

"صبح سے انھیں دورے پڑ رہے ہیں۔ دوسرے پارٹنرز کے ساتھ روابط بگڑنے کا اندیشہ، بھاری نقصان سے دب کر ساکھ ختم ہو جانے کا ڈر اور مایوس تماشائیوں کا طوفان کی طرح خطرناک بن جانے کا تصور۔ یہ سب ان کے حواس کو گم کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اس سرکاری حکمنامے کے مطابق آپ کو کل دو بجے سے پہلے اس ملک کو چھوڑ دینا تھا۔"

دوسرے گواہ نے پوچھا۔

"کیا قانون اتنا سخت ہے کہ چند گھنٹوں کے لئے بھی وہ اس میعاد کو نہ بڑھا سکے۔ چند ہی گھنٹوں کے بعد آپ کا پروگرام ختم ہو جاتا ہے۔"

"بہت پہلے ہی آپ نے اس پروگرام کی اطلاع منسٹری کو دے دی تھی۔"

"قانون سخت نہیں ہے۔ منسٹری کے ایک انڈر سکریٹری کی شرارت ہے" بہار بولی "مجھے اپنے قابو میں کر کے ایک پھندے میں پھنسانے کی انھوں نے بہت کوشش کی۔ میں نے ہر وار کو خالی کر دیا۔ جھلا کر انھوں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ میرے غیر ملکی ہونے کی اساس پر انھوں نے

یہ وجہ تلاش کی ہے کہ میرا یہاں ٹھہرنا ملک کے لئے خطرہ کا باعث ہے۔ میں غیر ملکی ہوں نا!"

شربت کے گلاس لئے بیرا اندر آیا۔ حمیدہ نے گلاس تقسیم کئے۔ ایک گھونٹ پی کر بہانے حمیدہ سے کہا۔

"ہاشم صاحب آئیں تو انھیں کہہ دینا کہ وہ باغ سے پھر دستہ بن جائیں!"

اور وکیل صاحب کو مخاطب کرکے بولی۔

"بارہ ہزار روپے میں نے مانگے ہیں پیرس جانے کے لئے۔ حواس باختہ ہو گئے تھے۔ پرسوں ڈرد صاحب کو میرا دستخط شدہ طلاق نامہ بھجوا دیجئے گا۔"

شربت کا ایک گھونٹ لے کر آگے بولی "میں غیر ملکی ہوں۔ اپنے تماشائیوں کو میں مایوس نہ کروں گی۔ میرے پروگراموں کے لئے خطرہ مول لینے والے سیٹھ لوگوں کو میں نقصان اور پریشانی سے آشنا ہونے دوں گی۔ ایک ملکی سے شادی کرکے میں بھی ملکی ہو گئی ہوں۔ وکیل صاحب منسٹری کو آپ جواب دے دیجئے گا۔ اخبار میں چھپنے کی بات آئے تو یہ تصریح بھی آجانی چاہیے۔"

وہ اٹھی اور پھر کہا "کل کے پروگرام کا ریہرسل کرنے کے لئے مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں چلی!"

باہر نکل کر وہ پیچ دار زینے چڑھنے لگی!!

---

## غزل

### اعجاز صدیقی مدیر "شاعر"

راستے مربوط ہو سکتے ہیں خود منزل کے ساتھ
حال کے رشتے اگر گہرے ہوں مستقبل کے ساتھ

پنکھڑی میں پھول کی ہے اور نہ شبنم ہی میں ہے
نازکی جذبات کی وابستہ ہے جو دل کے ساتھ

یہ نہ ہو تو سانس کا لینا بھی ہو جائے محال
جھانکتی رہتی ہیں کچھ آسانیاں مشکل کے ساتھ

مانگنے کا گر سلیقہ مانگنے والے میں ہو
ہاتھ بڑھ جاتے ہیں لاکھوں دستِ سائل کے ساتھ

کیا خبر ان کو سفینے پھنس گئے منجدھار میں!
کھیلتی رہتی ہیں موجیں رات دن ساحل کے ساتھ

فطرتِ دل کو سمجھنا چاہیے اے اہلِ دل!
رونما ہوتے ہیں اتنے حادثے کیوں دل کے ساتھ

نغرۂ مطرب ہو یا ہوں دوستوں کے قہقہے
خود کو ہم پاتے رہے تنہا مگر، محفل کے ساتھ

یہ حقیقت آج کھل کر آگئی ہے سامنے
کون حق کے ساتھ ہے اور کون ہے باطل کے ساتھ؟

قتل گاہیں روز اے اعجاز سجتی ہیں یہاں
سیکڑوں خنجر نکل آتے ہیں اک قاتل کے ساتھ

INDIAN POST OFFICE SAVINGS BANK
PASSBOOK
نئے نظریئے
اپنائیے
آپ کا ڈاک گھر
(بڑا یا چھوٹا) آپ کو آپ کے سیونگز
بنک کھاتے کے لئے چیک کی جدید ترین
سہولتیں پیش کرتا ہے۔
سیونگز بنک کھاتے کے لئے چیک استعمال کیجئے
چیک کھاتے میں کم از کم ۱۰۰ روپے کی رقم باقی رہنی چاہیئے۔
حسب خواہش چیک جاری کر سکتے ہیں۔
مقامی چیکوں کی وصولی پر کمیشن نہیں لیا جاتا۔
چیک بھی حساب میں جمع کروائے جا سکتے ہیں۔
Post Office Savings Bank
چیکوں سے ادائیگی
آسان اور
محفوظ ہے
ڈاک گھر کے
سیونگز بنک میں
آج ہی کھاتا کھولئے
قومی بچت
آرگنائزیشن
davp 69/236
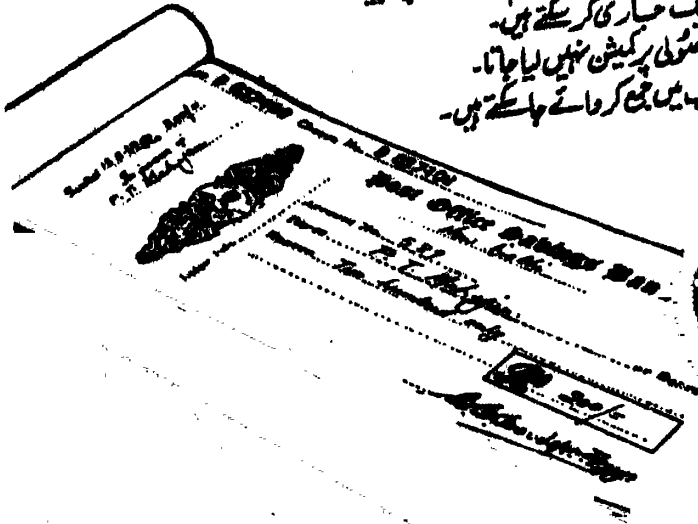
# رات کی بات

ڈاکٹر حامدی کاشمیری ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

۲۹۶۔ جواہر نگر۔ سری نگر (کشمیر)۔

پیارے بھائی! آداب

آپ کے دونوں عنایت نامے ملے، بلاشبہ آپ کی محبت کا کوئی جواب نہیں، آپ کا اصرار نہ ہوتا تو شاید میں سالنامے کے لئے یہ افسانہ لکھنے سے معذور رہتا۔ لیجئے یہ چھوٹا سا افسانہ "رات کی بات" حاضر ہے، امید ہے یہ افسانہ میرے قارئین کو پسند آئے گا ——— سردیوں میں حاضر خدمت ہو رہا ہوں! عندلیب شادانی، شاد اور مقدوم کی الدین کے انتقال سے ہم سب کو دکھ اور رنج ہے اور اردو زبان و ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے ....

آپ کا ——— حامدی کاشمیری

میں سول لائنز کے خاموش سفید بنگلوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ بس کالری سٹاپ پر رُکی تھی، میں بھی وہیں اُترا تھا اور تقریباً آدھ گھنٹے سے اُس سنسان سڑک پر قدم اُٹھا رہا تھا، درختوں کے سوکھے زرد استخوانی پتے میرے قدموں کے نیچے آ کر چرمرا کر ٹوٹ جاتے راستے کے سناٹے میں مسلسل چرائیں پڑ رہی تھیں، کبھی کبھی کوئی تیز رفتار کار بجلی کی طرح گزر جاتی اور فضا میں پتوں کے کچھ گرداب پڑ کر پھیل جاتے، دائیں بائیں سورج کی سنہری روشنی میں چنار کی شاخوں سے شعلے بلند ہو رہے تھے، ہوا اب تیز ہونے لگی تھی اور پتے کھڑکھڑاتے ہوئے نیچے آ رہے تھے۔

راستہ لمبا ہوتا جا رہا تھا، ٹھنڈی ہوا کے سرد جھونکے گرم سوٹ کے باوجود میرے جسم میں چبھ رہے تھے۔ میں نے احتیاطاً اوورکوٹ بھی پہن لیا تھا، شام ہو رہی تھی، میں نے بے چینی میں جیب میں ہاتھ ڈالا اور ڈائری نکال کر ورق اُلٹنے لگا، آر۔ کے۔ اگروال، روم نمبر ۲۴، کراؤن ہوٹل، میں ٹھیک راستے پر جا رہا تھا، کچھ دُور آگے جا کر میں نے دیکھا، سڑک کے دائیں کونے پر درختوں کے جھنڈ میں کراؤن ہوٹل نظر آ رہا تھا۔ بلند و بالا عمارت، خاموش گمبھیر، پُراسرار، چند لمحوں کے بعد میں ہوٹل کے بڑے گیٹ پر کھڑا تھا۔ ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے گرد و غبار کا ایک طوفان سا اُٹھ کر ہوٹل کی سیاہی مائل زرد کھڑکیوں سے ٹکرا رہا تھا، اور کھڑکیاں زور زور سے بج رہی تھیں۔

میں گیٹ کے اندر گیا۔

وہاں کوئی نہ تھا۔

دائیں بائیں کیاریوں میں پھول سوکھ گئے تھے۔ پتیاں سڑ چکی تھیں۔ اور سامنے ہوٹل کو جاتی ہوئی سڑک پتوں کے گرد و غبار سے اٹی ہوئی تھی کہیں کوئی نقش پا بھی نہ تھا، جیسے اِس سڑک سے صدیوں سے کوئی نہ گزرا تھا، اور پھر یہ پُراسرار سناٹا!

یہ کیسا ہوٹل ہے ؟ اس شہر میں پچھلے پندرہ برسوں سے رہنے اور ہوٹلوں میں جانے کی پُرانی عادت کے باوجود مجھے اِس عجیب سے ہوٹل میں جانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا، آج پہلی بار اِس ہوٹل میں جانے کا ارادہ کیا تھا۔ میری حیرت بڑھ رہی تھی، ہوٹل کی عمارت بہت ہی پُرانی وضع کی تھی، کھڑکیوں کے چوکھٹ منقش تھے۔ دُھندلائے ہوئے، اینٹوں کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔

میں ہوٹل کے دروازہ پر رُکا، دروازے کو ایک سوکھی بیل نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، دونوں طرف دیواروں پہ بارہ سنگوں کے سر نصب تھے، منہ کھولے ہوئے، جن میں دو رنگین بلب جل رہے تھے۔ میں نے بٹن دبایا، اور قدرے توقف کے بعد ایک ادھیڑ عمر کے بوائے نے دروازہ

کمرہ، وہ مجھے گھور رہا تھا، جیسے میں انسان نہ تھا۔ مورت پر بیٹھا تھا۔ جھکے ہوئے دیکھ رہے ہیں" اُس کے سیاہ ہونٹ ہلے۔

"میں مسٹر اگروال سے ملنا چاہتا ہوں ـــــــ"

"کون اگروال ـــــ؟" اُس نے پلکیں جھپکائیں اور دوسرے لمحے اُس کی یادداشت نے اُس کا ساتھ دیا۔ "اوہ سمجھا! روم نمبر تھری ـــــ"

"جی ہاں، وہی ـــــ"

"یاد آیا! اُنہوں نے صبح کہا تھا کہ شام کو ایک صاحب ملنے آرہے ہیں، تو وہ آپ ہی ہیں ـــــ"

"آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ـــــ"

"آئیے آئیے، میں لئے چلتا ہوں ـــــ یہاں اب کون آتا ہے؟ کوئی بھی نہیں، وہ دن بھی دیکھے ہیں صاحب، جب تمام ونٹیڑ باہر ہی سے کاؤنٹ ہوٹل کے کمرے بک کرلیتے تھے، کیا رش رہتا تھا یہاں! کب دن ہوا کب رات، کچھ خیال ہی نہ رہتا تھا۔ وہ بھی کیا دن تھے ـــــ وہ دن ـــــ"

وہ بڑبڑا رہا تھا، اُس کے چہرے کی جھریوں میں شگاف پڑ رہے تھے اور میں لکڑی کے پرانے منقش جنگلے کے سہارے دھندلے دھندلے زینے طے کر رہا تھا۔

میری ساری توجہ اگروال کی طرف تھی۔

کمرے میں بیٹھ کر میں نے اطمینان کی سانس لی، اگروال سامنے صوفہ پر بیٹھے سگار کے کش لے رہے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے گرمی کا احساس ہوا، کمرے میں مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ آتش دان میں چند لکڑیاں جل رہی تھیں، کھڑکیوں پر بڑے بڑے مخملی پردے آویزاں تھے، اور آتش دان کے اوپر شیر ببر کا سر نصب تھا، دیواروں کا روغن خراب ہو چکا تھا، جگہ جگہ ان پر دھبے پڑے تھے، میلے سے پرانے ڈیزائن کے بھاری بھرکم صوفہ سیٹ کے بازو میں طبلہ اور ستار رکھا ہوا تھا۔

"پورے پانچ سال کے بعد ہم یہاں آئے ہیں، پہلے تو ہر سال آتا رہا، لیکن اب مشکل ہو گیا ہے۔ ہر سال پروگرام بنتا ہے، لیکن کوئی نہ کوئی مصروفیت آ نکلتی ہے۔ بمبئی میں اب سانس لینا بھی انسان کے بس میں نہیں، صبح سویرے سے شام تک، بلکہ رات گئے تک کام! ہر آدمی مصروف، بھاگتا ہوا! اور ہمارے لئے روز نئی نئی انگیجمنٹ ـــــ اکاڈمی کے نت نئے پروگرام، فرصت کی ایک گھڑی بھی خواب ہو گئی ہے ـــــ یہاں آ کر میں چند دن کے لئے اپنے آپ کو پا لیتا ہوں ـــــ یہ خاموشی یہ جنگل ـــــ"

وہ دھوئیں کے مرغولوں میں تحلیل ہو رہے تھے۔

اُن کی باتوں میں وزن تھا، جھکی ہوئی سفید بھووں کے سا
اُن کی چمکتی ہوئی نیلی آنکھیں بے چینی سے گھوم رہی تھیں۔ اُن کا
چہرہ چمک رہا تھا، اُلجھے ہوئے لمبے بال شانوں تک جھک آئے تھے۔

میری بے چینی بڑھ رہی تھی!

وہ ـــــ؟

وہ کہاں ہے ـــــ؟ وہ کیوں نہیں آتی؟

دھوئیں کی آڑی ترچھی لکیریں ایک جال سا بُن رہی تھیں
کھنڈروں کے سائے بھاگ رہے تھے۔ سورج کی زرد روشنی
پتھروں پر پھیل رہی تھی۔ اگروال ٹوٹی ہوئی محرابوں اور ستونوں کی مٹی مٹی
تحریر پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اور ہم خاردار جھاڑیوں سے گھرے ہوئے کائی جمے برآمدے پر کھڑے تھے، سنگیتا کا سانولا چہرہ دمک رہا تھا، اکہرے جسم کی دلکش لڑکی، اُس کے سانولے چہرے کے متناسب خال دل کو موہ لیتے تھے۔ اُس کے گھنے بال اُس کی کمر پر بہت نیچے لہرا رہے تھے۔ وہ انتہائی نازک اور تاثر انگیز لے میں ایک گیت گا رہی تھی، سامنے نیلی دھند میں لپٹی ہوئی جھیل میں سونا پگھل رہا تھا!

میں سوچ رہا تھا یہ خاموش سی، کھوئی کھوئی سی، سہمی سہمی سی لڑکی میں کتنا درد چھپائے بیٹھی ہے، اس کی روح کی گہرائیوں میں روشنی کے سوتے ہیں، وہ گا رہی تھی، جیسے کھنڈروں کی زخمی روح فریاد کر رہی ہو۔

اچانک اگروال آ گئے۔ اُن کا چہرہ سیاہ پتھر کی طرح جامد تھا، اُنہوں نے سفید بھووں سے نکلتی ہوئی برچھی سی تیز نگاہ اُس پر ڈالی، وہ چونک سی گئی، سہم سی گئی، گیت رک گیا تھا اور وہ کالی چٹانوں پر چپ چاپ اگروال کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

اتنے میں دیوار پر لٹکا ہوا پردہ ہلنے لگا اور دوسرے لمحے سنگیتا آئی، وہ گہرے نیلے رنگ کی ساڑی میں لپٹی ہوئی تھی۔ شانوں پر لمبے گھنے خوشبودار بال کھولے ہوئے وہ اپسرا کی طرح کھڑی تھی۔

میں اُس کے بے پناہ حسن کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا!

میں نے اتنی حسین اور دلفریب لڑکی آج تک نہ دیکھی تھی!

اُس کی کاجل بھری بادامی آنکھوں میں جادو تھا!

میں نے اُسے آداب کہا۔

اُس نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا اور آہستہ سے مسکرائی۔

[illegible] اگروال نے [illegible]

گے

سنگیتا ہم تمہاری [illegible] صاحب آتی [illegible]

[illegible]

رہے گا۔

سنگیتا ایک ہلکے جسم [illegible] کی طرح [illegible] پر نصب ہو گئی تھی

صرف اُس کی لانبی پلکیں کانپ کانپ رہی تھیں۔

وہ کچھ کہے بغیر اندر چلی گئی، اور اگروال کہتے رہے۔

"سنگیتا کو میں نے میوزک کی اعلیٰ تعلیم دلوائی ہے، اِس وقت کلاسیکل اور لائٹ میوزک میں پورے ملک میں اس کا کوئی ثانی نہیں، میں نے خود اس کی تربیت کی ہے، دن رات ریاض کرایا ہے۔ سنگیتا میری زندگی کا سرمایہ ہے، میں اِسے اپنے سے جُدا نہیں کر سکتا۔ مجھے بہت سے اداروں کے بڑے بڑے آفرز آ رہے ہیں، میں سنگیتا کے کنٹریکٹ کو نیلام نہیں کر سکتا!" اُن کے لہجے میں شدت پیدا ہو گئی تھی، اُن سے جب تک ملاقات رہی، وہ اِس موضوع پر پوری شدت سے بولتے رہے۔

مجھے اِس وقت اُن کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی!

اور پھر ___ ہم آگ میں پگھلتے رہے!

میں نے بھی چند پیگ پی لئے، لیکن اگروال گلاس پہ گلاس خالی کر رہے تھے۔

شروع میں سنگیتا بالوں کے سیاہ آبشار میں گھری ستار کو گود میں لے کر سحر کار دُھنیں چھیڑتی رہی، اور اگروال طبلے پر سنگت کرتے رہے، رنگ و نغمگی پرچھائیوں کا ایک طلسمی ماحول تھا، جس میں میرا وجود گم تھا۔ سنگیتا بار بار اگروال کی نظریں بچا کر میری طرف دیکھ لیتی، اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ سر کو جھکا لیتی، وہ میرے وجود پر نشے کی طرح چھا رہی تھی اور اگروال صوفے پہ نیم دراز ہو کر نشے میں دُھت، رعشہ آلود ہاتھوں میں گلاس تھامے ہوئے تھے۔ اُن کی آنکھیں بے حس ہو چکی تھیں اور سفید ابروؤں کی چھت سے چھپ گئی تھیں۔

"سنگیتا ___ کو ___ ئی اور دُھن چھیڑو ___ سنگیتا ___"

اُن کا لہجہ لڑکھڑا رہا تھا۔

سنگیتا نے ستار رکھ دیا اور چہرے پر نفرت اور بیزاری کے ساتھ اندر سے ایک تکیہ لے آئی اور اسے اگروال کے سر کے نیچے رکھ دیا۔ دوسرے لمحے گلاس کی بچی شراب سے کپڑوں کو لت پت کرتے ہوئے وہ تکیے پہ گر پڑے۔

سنگیتا ایک طنزیہ قہقہہ لگاتے ہوئے میرے قریب آ گئی!

آتش دان میں تھوڑی دیر پہلے ادھیڑ عمر کا ملازم لکڑیاں ڈال کر گیا تھا۔

شعلے لہرا رہے تھے اور میں پھیلی ہوئی خاموشی میں سنگیتا کے حنا آلود ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا!

اُس کا چہرہ کندن کی طرح تپ رہا تھا اور اُس کے بھیگے بھیگے ہونٹوں کی خوشبو میرے وجود کے ویرانے کو سیراب کر رہی تھی!!

وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی، اُس کے لہجے میں آسودگی تھی۔ "خدارا میں اِس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں، ہر وقت مرنے کے خواب دیکھتی ہوں، کئی بار میں نے خودکشی کرنا چاہی، لیکن سانسوں کی یہ ڈور ___"

"معاف کرنا سنگیتا! تم پتا جی سے بہت زیادہ دبی دبی رہتی ہو۔"

"آپ کو نہیں معلوم کہ اگروال میرے پتا نہیں ہیں۔"

"کیا کہا؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں، میں اپنے پتا جی کو نہیں جانتی۔" اُس کی پلکوں پہ آنسو اُبھر آئے، "میری ماں اگروال کی کالونی میں کام کرتی تھی، میں بہت چھوٹی تھی جب اُس نے سنکھیا کھا لیا، اور پھر اگروال نے مجھے بیٹی بنا لیا۔ میرا اِس سنسار میں کوئی نہ تھا۔ اُنہوں نے مجھے بیٹی کا پیار دیا، لیکن

# دُوسری منزل

پشکر ناتھ بی۔ اے

تارا واس۔ نئی سڑک، ڈھکی پرشا۔ جموں توی کشمیر

برادر محترم! آداب و نیاز

پرسوں آپ کے نیاز حاصل ہوئے تو جیسے سارے جہاں کی دولت مل گئی! ـــــ اتنے برسوں کے بعد آپ نے مجھے صرف آواز سے پہچان لیا۔ اس بات سے ظاہر ہے کہ میں آپ کے کتنا قریب ہوں۔ بے شک ہمارے درمیان تقریباً ہزار کیلو میٹر کا فاصلہ ہے ـــــ دہلی آیا تو سوچا خالی ہاتھ آپ کے پاس کیسے آؤں۔ اس لئے یہیں آکر یہ کہانی لکھی ہے۔ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ کہانی کا عنوان ہے "دوسری منزل"۔ اُمید ہے آپ کو پسند آئے گی ـــــ کچھ باتیں جو رہ گئی ہیں، وہ آج کروں گا ـــــ کچھ آپ کی باتیں۔ کچھ اپنی باتیں ـــــ

خیر اندیش ـــــ پشکر ناتھ

دوسری منزل بس تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگاتا ہوا ایک فوارہ اپنا ہرا، لال، پیلا، نیلا اور نارنجی پانی اچھالتا ہوا میری نظروں کے دائرے میں آگیا اور پھر میرے پاس سے گزر کر دُور چلا گیا۔ کل شاید میں رنگوں کے اس عجیب صورت رقص کو نہ دیکھ سکوں گا کیونکہ کل بہت دُور ہے، بہت دُور ہے۔ میرے سینے میں رہ رہ کر ٹھہر ٹھہر کر درد کا ایک بگولا سا اُٹھتا ہے اور میری آنکھیں تکلیف سے بند ہونے لگتی ہیں میں جانتا ہوں کہ بس کی اوپر والی منزل میں نیشا بیٹھی ہے۔ پچھلے اسٹاپ پر جب وہ بس میں سوار ہوئی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کسی غیر مرئی آواز نے میرے کان میں کہا ہو: دیکھو وہ دیکھو لو!

میں نے انکھیوں سے دیکھا۔ وہی نازک پاؤں، وہی دلربایانہ ادا، ساڑی باندھنے کا وہی بانکا انداز۔ اور پھر بالوں کی آرائش نے چیخ چیخ کر پکارا ـــــ میں نیشا ہوں! میرے سینے میں ایک سحر زدہ سی خاموشی چھا گئی پھر میرے دل نے دھڑکنا بند تو نہیں کر دیا؟ میں نے زور کی ایک سانس لی میرے خدا! میرے خدا مجھ پر رحم کر ـــــ

"آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے کیا؟"

اپنے ساتھی مسافر کی آواز سن کر میں چونک اٹھا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہمدردی کی ہلکی سی جھلک تھی۔ خدا کا نیک بندہ!

"جی نہیں، ٹھیک ہوں میں ـــــ" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ دو ایک لمحوں تک مجھے دیکھتا رہا اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

میری باتیں اب کسی کو دھوکا نہیں دے سکتیں، کیونکہ میرے پورے وجود پر چھائی ہوئی ایک بدلی میرے تمام راز کھول دیتی ہے رک رک کر میرا تصور بس کی دوسری منزل پر پہنچ جاتا ہے اور سیٹ پر بیٹھی ہوئی اس سمٹی سمٹی جھکی جھکی سی لڑکی کو دیکھتا ہے جس کی گھنی پلکوں کی چھاؤں میں چھپی ہوئی آنکھیں وحشی ہرنی کی طرح بے قرار ـــــ جس کے بال سیاہ ریشم کے جال کی طرح سرسراتے ہوئے خوشبو اڑاتے ہوئے، تہہ در تہہ اُمڈی ہوئی گھٹاؤں کی طرح مشکبار۔ اور

سالنامہ

# دُوسری منزِل

**پُشکرناتھ بی۔ اے**

تارا واس، نئی سڑک، ڈسٹرکٹ پونچھ۔ جموں و کشمیر

برادرِ محترم! آداب و نیاز

پرسوں آپ کے نیاز حاصل ہوئے تو جیسے سارے جہاں کی دولت مل گئی! —— اتنے برسوں کے بعد آپ نے مجھے صرف آواز سے پہچان لیا۔ اِس بات سے ظاہر ہے کہ میں آپ کے کتنا قریب ہوں۔ بے شک ہمارے درمیان تقریباً ہزار کیلو میٹر کا فاصلہ ہے —— دہلی آیا تو سوچا خالی ہاتھ آپ کے پاس کیسے آؤں۔ اِس لئے یہیں آکر یہ کہانی لکھی ہے۔ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ کہانی کا عنوان ہے "دوسری منزل" اُمید ہے آپ کو پسند آئے گی —— کچھ باتیں جو رہ گئی ہیں، وہ آج کر لوں گا —— کچھ آپ کی باتیں۔ کچھ اپنی باتیں ——

خیر اندیش —— پُشکرناتھ

★

دو منزلہ بس تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ست رنگ رنگی روشنیوں سے جگمگاتا ہوا ایک فوارہ اپنا ہرا، لال، پیلا، نیلا اور نارنجی پانی اچھالتا ہوا میری نظروں کے دائرے میں آگیا اور پھر میرے پاس سے گزر کر دُور چلا گیا۔ کل شاید میں رنگوں کے اس خوب صورت رقص کو نہ دیکھ سکوں گا کیونکہ کل بہت دُور ہے، بہت دُور ہے۔ میرے سینے میں رہ رہ کر ٹھہر ٹھہر کر درد کا ایک بگولا سا اٹھتا ہے اور میری آنکھیں تکلیف سے بند ہونے لگتی ہیں میں جانتا ہوں کہ بس کی اوپر والی منزل میں تیشا بیٹھی ہے۔ پچھلے اسٹاپ پر جب وہ بس میں سوار ہوئی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کسی غیر مرئی آواز نے میرے کان میں کہا ہو: دیکھو او! دیکھو لو!

میں نے انکھیوں سے دیکھا، وہی نازک پاؤں، وہی دلربانہ ادا، ساڑی باندھنے کا وہی بانکا انداز۔ اور پھر بالوں کی آرائش نے چیخ چیخ کر پکارا —— میں تیشا ہوں! میرے سینے میں ایک سحر زدہ سی خاموشی چھا گئی کہیں میرے دل نے دھڑکنا بند تو نہیں کر دیا؟ میں نے زور کی ایک سانس لی میرے خدا! میرے خدا مجھ پر رحم کر! ——

"آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے کیا؟"

اپنے ساتھی مسافر کی آواز سن کر میں چونک اٹھا میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں ہمدردی کی ہلکی سی جھلک تھی۔ خدا کا نیک بندہ!

"جی نہیں، ٹھیک ہوں میں ——" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ دو ایک لمحوں تک مجھے دیکھتا رہا اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

میری باتیں اب کسی کو دھوکا نہیں دے سکتیں، کیونکہ میرے پورے وجود پر چھائی ہوئی ایک بے بسی میرے تمام راز کھول دیتی ہے رک رک کر میرا تصور بس کی دوسری منزل پر پہنچ جاتا ہے اور سیٹ پر بیٹھی ہوئی اس سہمی سہمی جھجکی جھجکی سی لڑکی کو دیکھتا ہے جس کی گھنی پلکوں کی چھاؤں میں چھپی ہوئی آنکھیں وحشی ہرنی کی طرح بے قرار —— جس کے بال سیاہ ریشم کے جال کی طرح سرسراتے ہوئے خوشبو اڑاتے ہوئے، تہہ در تہہ امڈی ہوئی گھٹاؤں کی طرح مشکبار۔ اور

[illegible] برابر بڑھ رہی ہے۔ میں بھی برابر گھبرا [illegible] ہوں۔ اب میں ایڈوکیٹ بن چکا ہوں۔ کافی پریکٹس ہے۔ [illegible] سمجھا جاتا ہوں۔ لیکن میرے دل کے کنارے پر ایک بوجھ سا [illegible] پچھلے سات برسوں سے [illegible]

ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے میرا دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔ دو ماہ کے بعد چیک اپ کرانے کی ضرورت ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کوئی دکھ [illegible] ہو سکتا۔

”آخر کیا وجہ ہے مسٹر زبل، بظاہر تو کوئی پریشانی آپ کو ہے نہیں۔ آپ کہاں کھوئے رہتے ہیں؟“

اب اس ڈاکٹر کو کیا بتاؤں۔ ماضی کی یہ ننھی سی بوند جو بظاہر اتنی چھوٹی سی ہے، بے ضرر سی ہے، میرے لئے کتنا بڑا بوجھ بن گئی ہے ۔۔۔۔ سارا دن کورٹ میں رہتا ہوں، شام کو کلب بھی جاتا ہوں رات کو اطمینان سے سوجاتا ہوں۔ ہاں! بظاہر تو کوئی بات نہیں۔ کوئی اتنی بڑی غلطی نہیں ہے۔ کیا محبت کرنا کوئی اتنی بڑی غلطی ہوتی ہے؟

آہ! یہ چھاتی کا درد ۔۔۔۔ کبھی کبھی جان نکال دیتا ہے!

اچانک بس ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اسٹیشن آگیا ہے باہر روشنی کا اکا دکا بلب گہرے اندھیرے کو چیرتا ہوا ٹمٹما رہا ہے۔ میں کھڑا ہو گیا۔ پہلے اوپر والی منزل کی سواریاں باہر جائیں گی۔ اوپر والی سواریوں کا رش کب نہیں تھا ۔۔۔۔ میں اپنا بریف کیس سنبھالے دروازے تک آگیا ہوں اور پھر ایک ریلا مجھے باہر دھکیل گیا۔

چلتے چلتے میں نے کئی بار سوچا، مڑ کر دیکھوں۔ شاید نیشا ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ مجھے اس لڑکی کے بارے میں سوچنے کا کوئی حق نہیں۔ میں مڑ کر نہ دیکھوں گا ۔۔۔۔ میں مڑ کر نہ دیکھوں گا۔

”وکیل صاحب ۔۔۔۔“ ایک نسوانی آواز آرہی ہے۔

میرے پاؤں رک گئے۔ مڑ کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکا۔

”وکیل صاحب ۔۔۔۔“ آہ! یہ آواز، اسے کیسے بھول سکتا ہوں!

”وکیل صاحب آپ مجھے پہچانتے ہیں کیا؟“

”جی ہاں ۔۔۔“

”وکیل صاحب میں دوپہر سے آپ کا پیچھا کر رہی ہوں۔“

اچانک میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہی شریر مسکراہٹ، وہی آواز [illegible]

”آپ دوپہر سے میرا پیچھا کر رہی ہیں؟“

”دوپہر ہی سے کیا، پچھلے سات برس سے کر رہی ہوں۔“

”کیوں ۔۔۔؟“

”آہ! اس کیوں کا جواب میرے پاس ہوتا تو میں اپنی اور اپنے پتی کی زندگی برباد نہ کرتی۔“

”آپ کے پتی ۔۔۔؟“

نہ جانے مجھ سے بولا کیسے گیا۔ سینے میں درد کی ایک تیز لہر ابھری اور میرے ماتھے پر پسینہ بن کے چمکنے لگی۔

”ہاں دو سال پہلے میں نے اپنی دانست میں خوب سوچ سمجھ کر اور چھان بین کر کے شادی کی تھی۔“

”کی تھی ۔۔۔؟“ میرا دل ڈوبنے لگا۔

”چار مہینے پہلے ہماری طلاق ہو گئی ہے ۔۔۔۔“

”اوہ ۔۔۔“ نہ جانے ایسے موقع پر کیا بولا جاتا ہے۔

میں ایک کھمبے کا سہارا لیکر کھڑا ہو گیا۔

”وکیل صاحب ۔۔۔ آج ڈاکٹر نے کیا بتایا ۔۔۔؟“

”آپ کو کیسے معلوم ۔۔۔؟“

”مجھ سے آپ کیوں اور کیسے نہ پوچھا کیجئے ۔۔۔ میں پہلے ہی سب کچھ ہار چکی ہوں۔“

اس کی آواز بھر آئی، پھر اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ میں بت بنا یہ سب دیکھتا رہا۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے خدا ۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے ۔۔۔؟

اچانک نیشا نے جھک کر میرے پاؤں چھوئے۔ ایک لمحے کے لئے میں سکتے میں آگیا ۔۔۔ اور دوسرے لمحے میں نے جھک کر نیشا کو اٹھایا۔ جیب سے رومال نکال کے اس کے آنسو پونچھے اور پھر اس کا بازو پکڑ کے کہا ۔۔۔ ”آؤ ۔۔۔ گھر چلیں۔“

---

## رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ چیک کرنے کے بعد ہی [illegible] ہر ماہ باقاعدگی سے پوسٹ کیا جاتا ہے

اس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمہ ڈاک سے بھی کیجئے۔ [illegible]

ہر دانش مند
مالکن
ہمیشہ
آرتی نیل
کو ہی
پسند کرتی ہیں

تی نیل سے
ڑے زیادہ پائیدار
زیادہ چمکیلے اور
زیادہ سفید رہتے ہیں

ARATI ULTRA

سیٹھ کیمیکل ورکس

میسرز سیٹھ ٹریڈنگ کمپنی - ۲۵۲۹ - چھر وارا - تلک بازار - دہلی نمبر ۶

بیٹی کو لاچار مرنے نہ دے ماں کے ذکھ درد کا احساس بن سکے ــــ یہ سب تم نے کہا ماں لیکن تم خود چلی گئیں میں وعدہ کرتی ہوں ماں کہ تمہاری خواہش پوری کرنے کی جی جان سے کوشش کروں گی ــــ"

اور بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے تھے۔ اس سے آگے پڑھنے کی ہمت مجھ میں نہ تھی۔ مالتی کی پُر درد زندگی کی کہانی کے اوراق پلٹ کر میں آگے بڑھ آیا تھا ــــ

"زندگی کا طویل سفر کبھی اکیلے طے نہیں ہوتا ایک ساتھی ــــ ایک ہم سفر کی جستجو پیدا ہونا قدرتی بات ہے۔ یہ مجھے بھی کرنا ہے۔ اس دُنیا میں اور بھگوان جو میرے سر پہ شفقت کا ہاتھ رکھ کر اس فرض کو نبھائے ، ماں، باپ، بھائی، بہن ــــ اپنا سبھی کچھ میں آپ ہی تو ہوں ــــ تم میرے قریب آئے تو اپنی زندگی کی کتاب میں نے کھول کر تمہارے آگے رکھ دی۔ تم میرے سب سے بڑے ہمدرد بن گئے نریش! تم نے اپنی محبت کا مجھے یقین دلایا تھا۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ ساتھ ساتھ زندگی کا سفر طے کریں گے لیکن تم بے وفا نکلے۔ تم نے میری محبت کا اپمان کیا، میرے ارمانوں کا لہو بہایا۔ کاش! تم نے میرے دل کی گہرائی میں جھانک کر دیکھا ہوتا ــــ تب شاید تمہیں احساس ہو جاتا کہ مالتی کے جذبوں میں رچی بسی محبت بیش بہا دولت سے زیادہ قیمتی ہے لیکن تم تو دولت کے عوض بِک گئے نریش ــــ !!!"

مالتی کی زندگی کے اِس ورق نے میرے سینے میں ٹیس پیدا کر دی تھی۔ میرے ذہن میں ایک ساتھ کئی سوال اُبھرے تھے، کئی خیال سوچ بن کر بیدار ہوئے تھے ــــ جبھی ڈائری کے اگلے صفحے پر ریش کا نام پڑھ کر میں چونک گیا تھا ــــ

"تم دوسرے شخص ہو ریش جس نے میرے زخمی جذبات پر نمک چھڑکا ہے۔ تم سے گلہ کیوں کروں! اپنی نادانی پہ مجھے افسوس ہے کہ تمہاری پُر فریب محبت پر میں نے یقین کیا ــــ تم دولت مند ہو، تمہارے پاس عالیشان بنگلہ ہے، کاریں ہیں، زندگی کے سبھی آرام و آسائش تمہیں میسّر ہیں لیکن میری محبت نے کبھی اِن چیزوں کی تمنا نہیں کی۔ میرے جذبوں نے پیار کے بدلے پیار کی چاہت کی ہے۔ محبت کا ڈھونگ رچ کر تم نے چاہا تھا کہ میں اپنا جسم تمہیں سونپ دوں، اپنی آبرو اور عزت تمہاری نذر کر دوں لیکن یہ ناممکن تھا۔ شاید تم نے میری محبت کو دولت کے عوض بازار میں بکنے والی ہوس زدہ محبت سمجھا تھا ــــ!"

مالتی کی تحریر نے ریش کی حقیقت میرے سامنے بیان کر دی تھی۔ میری رگوں کے خون میں آگ کی سی تپش بھر گئی تھی۔ میرے دل و دماغ میں اُس کے لیے نفرت کا جذبہ اُبھر آیا تھا اور اپنے آپ میں میں احساسِ شرمندگی سے دبا جا رہا تھا کہ ریش سا ذلیل انسان میرا دوست ہے! جبھی بوڑھی نوکرانی چائے لیے کمرے میں داخل ہوئی تھی اور میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔

چائے سِپ کرتے ہوئے میری نظریں سامنے دیوار پہ آویزاں مالتی کی تصویر کو دیکھ رہی تھیں۔ میری نظروں میں مالتی کی عظمت بڑھ گئی تھی، دِل میں احترام کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں ــــ دِل کی گہرائیوں میں اُس کی بے لوث اور مقدس محبت کی جگمگاتی شعاعیں پھیل گئیں تھیں ــــ جبھی ایک اور خیال ذہن میں کوند گیا تھا ــــ جب میرے بارے میں حقیقت کا علم مالتی کو ہوگا تب ــــ؟ میں کانپ ــــ کانپ اُٹھا تھا۔ اپنے آپ کو میں نے ایک مجرم محسوس کیا تھا۔ مالتی کی محبت کا احساس ہو جانے کے باوجود میں خاموش رہا تھا۔ میری خاموشی نے اُس کے معصوم خیالوں میں آرزوؤں اور جذبوں کو مچلتے ہوئے طوفانوں سے ہمکنار کیا تھا۔ ڈائری کی تحریر میں چاہت کی بے کراں آگ کی گرمی مجھے محسوس ہوئی تھی۔ میرا یہ احساس شدید تر ہوتا جا رہا تھا کہ میری خاموشی مالتی کی زندگی کی ہر دھڑکن کو مفلوج کر دے گی، اُس کے ہونٹوں کا تبسم سسکیوں میں بدل جائیگا، اُس کے جذبے مر جائیں گے اور ــــ اور ــــ ایک عجیب سے خوف سے میں لرز اُٹھا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ڈائری کے اُس ورق پر چند الفاظ لکھ دیئے تھے جہاں مالتی نے لکھا تھا ــــ "میں نے خدا اور انسان کو ایک ہی جگہ، ایک ہی رُوپ میں پالیا ہے ــــ میں نے تم پہ بھروسہ کیا ہے راجیو ــــ!" میں نے لکھا تھا" ــــ مالتی! تم عظیم ہو، عظیم تر! ہزار تلخیوں کے باوجود تمہارا وجود بے حد پیارا، بے حد شیریں ہے تمہاری سنجیدہ شخصیت میں گہرائی ہے، ٹھہراؤ ہے۔ تمہارے جذبوں میں محبت کی گرمی ہے، مقدس محبت کی تپش ہے۔ زندگی کی ناہموار راہوں پر بڑھتے جانے کی تم میں بے پناہ قوت ہے ــــ تم محبت کی دیوی ہو ــــ! تم ذہانت، عظمت اور استقلال کا زندہ مجسمہ ہو ــــ کاش! تمہیں ساتھ لیکر میں زندگی کی راہوں پر بڑھ سکتا! ــــ لیکن یہ ممکن نہیں ہے مالتی! تمہاری خاموش محبت کو میں سمجھ نہ سکا تھا اور جب میں نے سمجھا تو میرے

وابستگی کمزوری نے میرے ذہن میں اُبھرے تمہارے مستقبل کے خدشات نے مجھے تم پر حقیقت کے اظہار سے روک دیا۔ آج اچانک ہی تمہاری ڈائری پڑھ کر مجھے اپنے مجرم ہونے کا شدید احساس ہُوا ہے ——— مالتی! جن جذبات میں تم اپنی مقدّس محبت کی دھڑکنوں کو دھڑکتے دیکھنا چاہتی ہو، وہ جذبے تو بہت پہلے سے ویرانے ہو چکے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ زندگی کی اِس حقیقت کا علم تمہیں اُس وقت نہیں ہوا جب تمہارے جذبات میں میرے لئے چاہت نے سر اُبھارا تھا ——— شاید قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔

مالتی! مجھے غلط نہ سمجھنا۔ یہ حقیقت بہت ہی تلخ ہے۔ اِسے راز میں ہی رکھ کر میں تمہیں فریب نہیں دینا چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری چاہت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مایوسی کے سینے میں دفن کر دوں۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تمہاری نظروں میں میں زریش یا ایش جیسا بن کر رہ جاؤں۔ میری خواہش ہے، تم سے درخواست بھی ہے کہ اِس حقیقت کو فراخدلی سے قبول کرو۔ تم نراش نہ ہونا مالتی! زندگی ایک حقیقت ہے، غم، دکھ درد، حالات کی ستم ظریفی ہے لیکن اِس سب کے باوجود زندگی بے حد پیاری، بہت شیریں ہے۔ اِسے بکھر لے نہ دینا مالتی! اپنے عزم سے استقلال اور بہادری سے اِسے سنوارنے کی کوشش کرو ——— الوداع مالتی!"

سامنے، دروازے سے باہر، گملے میں کھلے گلاب پر میری نظر پڑی تھی۔ بڑھ کر پھول توڑ لیا تھا میں نے۔ چند لمحے ویران ——— اداس نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا تھا اور پھر اُسے اپنے تھرتھراتے لبوں کا لمس دے کر مالتی کی ڈائری میں، اپنی تحریر کے سینے پر رکھ دیا تھا۔ میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ میرے جذبے نم تھے۔ میری سوچ مفلوج ہو کر رہ گئی تھی اور مالتی سے ملے بغیر ہی میں آگرہ سے دہلی روانہ ہو گیا تھا۔ مالتی سے یہ آخری ملاقات تھی۔ چند روز بعد لکھنؤ لوٹنے پر مالتی کا بہت ہی مختصر خط مجھے ملا تھا، لکھا تھا ——— "تم آئے اور لوٹ گئے ——— مجھ سے ملے نہیں۔ میرے جذبے شدید ضرور ہیں لیکن پاگل نہیں۔ تم کچھ دیر رُک جاتے تو میرے جذبوں کی تشنگی مٹ جاتی۔ اب کبھی ملاقات ہو گی یا نہیں! کون جانے ——— خیر ——— ! تمہاری حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے میں زار و قطار روئی نہیں، صرف ایک خلش سی محسوس کی ہے جو شاید اب کبھی مٹ نہ پائے گی ——— میرے احساس کے ربط پر ہر لمحہ تمہاری محبت کے گیت اُبھرتے ہی رہیں گے۔ یہی گیت میری تنہا زندگی کو دھڑکن بخشیں گے ——— !"

اِس کے بعد کئی ماہ گذر گئے تھے۔ وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا تھا لیکن مالتی کو میں کبھی اپنے آپ سے الگ نہ کر پایا تھا۔ کسی بھی لمحے اُسے میں بھول نہ سکا تھا۔ میرے ذہن نے اکثر اُس کے بارے میں سوچا ——— میرے دل میں اکثر اُس کے لئے درد جاگا تھا ——— ایک دن اچانک ہی مالتی کا خط ——— آخری خط ——— مجھے ملا تھا جس میں اُس نے لکھا تھا "..... وعدہ کرو کہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر اب تم میرا راستہ نہ روکو گے۔ اپنی محبت کی زندگی کے لئے میں زندہ رہنا چاہتی ہوں ....." اپنے اِسی خط میں اُس نے زندگی کے ایک نئے موڑ کا ذکر کیا تھا، کیلاش کا ذکر کیا تھا اور میں مطمئن ہو گیا تھا کہ آخر اُسے کنارا مل ہی گیا!

---

ایک برس بعد آج مالتی کو یہاں دیکھ کر میں بیتے دنوں کی یادوں اُلجھ گیا ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں گذشتہ چند برسوں کے اُن واقعات کے بارے میں جو یکجا ہو کر ایک ایسی کہانی کو جنم دے گئے ہیں جو میری کہانی ہے، مالتی کی کہانی ہے ——— اِس کا انجام ——— ؟ میرے خیالوں میں ایک نیا سوال اُبھرا ہے اور ایک عجیب سی ہلچل میرے دل و دماغ میں مچ گئی ہے ——— دہرہ دُون میرے لئے قطعی اجنبی شہر ہے۔ اِس شہر میں نئے قائم ہونے والے میڈیکل تحقیقاتی ادارے کے چیف ڈائریکٹر کی حیثیت سے کل ہی مجھے چارج سنبھالنا ہے۔ لیکن یہاں مالتی کی موجودگی نے مجھے سوچ میں ڈال دیا ہے ——— کیا مالتی یہیں رہتی ہے ؟ میرے ذہن کی اُلجھن بڑھتی جا رہی ہے ——— بڑھتی ہی جا رہی ہے ——— !!!

تاریکی نے ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی ہے۔ تیز ہوا کے جھونکے جسم کو برف جیسا سرد لمس دے رہے ہیں۔ اپنے جسم کو اوورکوٹ میں لپیٹے ہوئے میں کمرے سے باہر آگیا ہوں۔ "سویٹ ہارٹ" کی سطحی منزل میں واقع کھلے کمپاؤنڈ کی خاموشی بے حد پُر سکون ہے۔ ہلکی نیلگوں روشنی آنکھوں میں راحت بن کر اُترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کہیں کہیں بیٹھے نوجوان جوڑے اپنے آپ میں مصروف ہیں۔ بیرے کو کافی کا آرڈر دے کر میں دائیں طرف کے ویران کونے کی میز پر بیٹھ گیا ہوں ——— میوزک کی مدھم پرچھائیں مجھ پر اپنا نقاب ڈال رہی ہے۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر مالتی کے یہ الفاظ اُبھرتے پھیلتے ہوئے میری اُلجھن میں اضافہ کر رہے ہیں ——— "وعدہ کرو کہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر

پھر اب میرا راستہ نہ روکو گے ــــــ"

"کتنا خوشگوار، مسحور کن ہے یہاں کا ماحول!" ابھی میرے کانوں سے جانی پہچانی سی ایک آواز ٹکراتی ہے۔ میں چونک جاتا ہوں۔ شاید سیمبھلو کے پودے کے اُس طرف کوئی کسی سے کچھ کہہ رہا ہے ــــــ "کسی ایسے ہی پُر سکون مقام پر رہنے کی میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی ہے ــــــ" جانی پہچانی سی یہ آواز مالتی کی ہو سکتی ہے۔ اس بات کا مجھے یقین ہو گیا ہے اور سنبھل کر بیٹھتے ہوئے اپنے آپ کو میں نے اُسی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دُوسری آواز اُبھرتی ہے ــــــ "میری تقرری دُوسری پوزیشن پر ہوئی ہے۔ پہلی پوزیشن حاصل کر لینے کی مجھے کامل اُمید تھی لیکن سُنا ہے لکھنؤ انسٹی ٹیوٹ آف میڈیسن کے ڈاکٹر راہو کو سرکار نے اس پوزیشن کی آفر دی ہے۔ میڈیکل تحقیق کے میدان میں وہ دیش کی ایک بڑی شخصیت ہیں!" میں کانپ اُٹھا ہوں۔ حالات کی ستم ظریفی نے مجھے کہاں لا کھڑا کیا ہے!!

"مالتی! تم یکایک خاموش کیوں ہو گئیں؟" پھر وہی آواز مجھے سُنائی دی ہے۔

"ــــــ جی ــــــ!" شاید وہ چونک گئی ہے ــــــ "سردی بہت بڑھ گئی ہے، آؤ کمرے میں چلیں" اور دُوسرے ہی لمحے وہ دونوں میرے برابر سے گزر گئے ہیں ــــــ مالتی اور کیلاش! ــــــ

---

میں نے بہت سختی سے اپنے ذہن کی اُلجھن سے سوچ کو آزاد کر لیا ہے۔ مالتی کے آخری خط کا ہر لفظ میرے ذہن میں اُبھر آیا ہے ــــــ مالتی کی ڈائری میں لکھی اپنی ہی تحریر کے یہ الفاظ بھی مجھے یاد آ گئے ہیں ــــــ "ناراض نہ ہونا مالتی! ــــــ زندگی ایک حقیقت ہے۔ غم، دُکھ درد، حالات کی ستم ظریفی ہے لیکن اس سب کے باوجود زندگی بے حد پیاری ہے، بہت شیریں ہے۔ اِسے بکھرنے نہ دینا مالتی! اپنے عزم سے، استقلال اور بہادری سے اِسے سنوارنے کی کوشش کرو ــــــ" میں محسوس کر رہا ہوں کہ مالتی نے زندگی کی حقیقت کو سمجھا ہے، اِسے سجایا سنوارا ہے۔ میری وجہ سے اُس کی سنوری زندگی بکھر جائے، یہ کبھی نہیں ہو سکتا ــــــ یہ کبھی نہ ہوگا ــــــ کبھی نہیں ــــــ!!

---

رات آدھی سے زیادہ بیت گئی ہے۔ ہیلتھ سیکریٹری کے نام ابھی میں نے خط لکھا ہے کہ "چند ذاتی وجوہ کی بنا پر میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں چیف ڈائرکٹر کی ذمہ داری نبھا سکوں۔ میری مجبوری میرا آخری فیصلہ ہے" کیلاش کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوئے بھی میں نے ہیلتھ سیکریٹری سے اپنی جگہ اُس کے نام کی سفارش کر دی ہے۔ اپنا مختصر سا سامان میں نے باندھ لیا ہے۔ سویرے پانچ بجے کی گاڑی سے میں لکھنؤ واپس جا رہا ہوں۔ میرے دل کا سارا بوجھ اُتر چکا ہے۔ میرے ذہن میں اب کوئی اُلجھن باقی نہیں ہے۔ پہلی بار میرے جسم نے دسمبر کی برفیلی رات کا احساس پایا ہے۔ دِل نے چاہا ہے کہ لحاف کی گرمی کو اپنے جسم میں جذب کر لوں ــــــ اور میں نے نہایت بے پروا ہو کر اپنے آپ کو پلنگ پر پھینک دیا ہے۔ شاید چند ہی لمحوں میں میرا وجود نیند کی آغوش میں جا گرے گا ــــــ ــــــ اب میرے دل میں کوئی خلش نہیں ہے۔

---

ڈاکٹر زیدی جعفر رضا ایم اے۔ پی ایچ ڈی

چاند کو نرم و نازک سمجھا چاند سے بھی پتھراؤ ہوا
شیشے کی احساس کو ایسی دل پر گہرا گھاؤ ہوا
چاہنے والوں کی جانب سے کچھ ایسا برتاؤ ہوا
ساری رات مری آنکھوں سے اشکوں کا چھڑکاؤ ہوا
برسوں کے دیرینہ رشتے کچھ لمحوں میں ٹوٹ گئے
آرزوؤں کے دور لہے پر جب دل کا ٹکراؤ ہوا
دُکھ کے چند تھپیڑے کھا کر چپکے چپکے ڈوب گیا
دل کی بات نہ پوچھو دل تو کاغذ کی اک ناؤ ہوا
سچ کہتے ہیں جعفر صاحب آج کوئی بھی دوست نہیں
دنیا کے بازار میں سب سے مہنگا پیار کا بھاؤ ہوا

# نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| شکست کے بعد | کرشن چندر | چار روپے پچاس پیسے |
| طوفان کی کلیاں | " | چار روپے |
| گرہن کی واپسی | " | تین روپے |
| آشا دُرخت | " | دو روپے پچھتر پیسے |
| دروازہ | " | دو روپے پچیس پیسے |
| سسرال | شوکت تھانوی | دو روپے |
| مسٹر ۵۸ | " | تین روپے پچاس پیسے |
| بقراط | " | دو روپے پچاس پیسے |
| جی ہاں پتے ہیں | " | تین روپے پچیس پیسے |
| جوڑ توڑ | " | پانچ روپے |
| داماد | " | دو روپیہ پچیس پیسے |
| گوشۂ عافیت | پریم چند | پانچ روپے |
| چوگان ہستی مکمل | " | گیارہ روپے |
| نروشک نیت | " | تین روپے |
| خاک پروانہ | " | تین روپے |
| صبح زندگی | راشد الخیری | دو روپے |
| شب زندگی | " | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| شام زندگی | " | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| سیدہ کی بیٹی | رازق الخیری | تین روپے |
| سمن پوش | مجنوں گورکھپوری | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| اقبال | " | چار روپے |
| گرد کارواں | کنھیا لال کپور | تین روپے |
| سنگ و خشت | " | دو روپیہ پچاس پیسے |
| سونا کا چھی | جمنا داس اختر | چار روپے پچاس پیسے |
| شعلۂ سنگ | کوثر چاند پوری | تین روپے پچاس پیسے |
| شمع | اے آر خاتون | پانچ روپے |
| چشمہ | " | دس روپے پچھتر پیسے |
| شکیلہ | مسعود ہمایوں | چار روپے پچیس پیسے |

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| شکست ظلمت | مخمور جالندھری | ایک روپیہ پچھتر پیسے |
| آرزو کی کلیاں | " | ایک روپیہ پچھتر پیسے |
| پہلی محبت | " | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| خواب گاہ میں | " | تین روپے پچاس پیسے |
| دنیا کے مشہور سائنسداں | " | دو روپے پچیس پیسے |
| شائستہ | نادرہ خاتون | چار روپے پچاس پیسے |
| ظالم | سعید امرت | دو روپے پچاس پیسے |
| فتح خیبر | صادق حسین | چار روپے |
| مقابلہ | خان محبوب طرزی | تین روپے |
| نیلوفر | " | تین روپے |
| اکبری دروازہ | " | چار روپے |
| دوشیزۂ روم | " | تین روپے |
| دیوانہ | " | تین روپے |
| دو دیوانے | " | دو روپے پچاس پیسے |
| سیلاب | " | تین روپے |
| گناہ | دت بھارتی | دو روپے پچاس پیسے |
| اندھیرے اجالے | عادل رشید | تین روپے |
| بہار آنے تک | " | تین روپے پچاس پیسے |
| دو پھول | " | تین روپے پچھتر پیسے |
| مغرور | رئیس احمد جعفری | چار روپے پچاس پیسے |
| قیامت | ذکی انور | دو روپے پچاس پیسے |
| سازش | " | دو روپے پچاس پیسے |
| گورا | ٹیگور | چار روپے پچاس پیسے |
| لٹ گئی بہار | ضیاء عظیم آبادی | تین روپے پچاس پیسے |
| دل ہی تو ہے | " | چار روپے پچیس پیسے |
| ممتاز | ایم اسلم | آٹھ روپے |
| آخری رات | " | پانچ روپے |
| ریحانہ | " | سات روپے |

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| درد | مہندر ناتھ | چار روپے پچھتر پیسے |
| گلی گلی | رام لعل | چار روپے |
| فردوس گوشش | حضرت جوش ملسیانی | پانچ روپے |
| کفر و ایمان | ہری چند اختر | چار روپے |
| وسکی کی بوتل | موہن یادو | دو روپے |
| لکھن سے کہا | منور لکھنوی | تین روپے |
| موٹر میکینک گائیڈ | شیو ناتھ تسکین | چار روپے |
| گلی گلی | رام لعل | چار روپے |
| آواز تو پہچانو | " | تین روپے |
| چراغوں کا سفر | " | چار روپے پچاس پیسے |
| انتظار کے قیدی | " | دو روپے |
| کل کی باتیں | " | پانچ روپے |
| اجالے سے پہلے | ابراہیم جلیس | دو روپے پچاس پیسے |
| ابھرتے جوبن | اطہر اثر | دو روپے |
| آندھی میں چراغ | غلام الثقلین | سات روپے پچاس پیسے |
| اقوال زریں | مصطفٰے احسن زیدی | پچاس پیسے |
| انارکلی | امتیاز علی تاج | دو روپے پچاس پیسے |
| آشا دیپ بجھے نا | ست پرکاش سنگر | دو روپیہ |
| ابراہیم لنکن | چندر موہن لانبہ | ایک روپیہ پچھتر پیسے |
| انسانیت موت کے دروازے پر | مولانا ابوالکلام آزاد | تین روپیہ پچاس پیسے |
| اصلی مکمل باورچی خانہ | جے سی داس ساجد | تین روپے پچاس پیسے |
| جینے کے لئے | ستیہ پال آنند | دو روپیہ پچاس پیسے |
| چھبیس سال بعد | امرتا پریتم | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| حادثہ | قیسی رامپوری | پانچ روپے پچاس پیسے |
| خون | شہزادہ تبسم | چار روپے |
| رضیہ کا شاہی دسترخوان | رضیہ سلطانہ | دو روپے پچاس پیسے |
| رسیلی | شہزادہ تبسم | دو روپے پچاس پیسے |
| زمین کے چاند | آزاد ملیح آبادی | تین روپے پچاس پیسے |

ملنے کا پتہ:- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲، دہلی

افسانہ

# لمحوں کی تصویریں

کوثر چاندپوری

ہمدرد کلینک، آصف علی روڈ، نئی دہلی

خوشترین!

صفیر احمد صوفی کے مجموعۂ کلام "گرمیٔ اندیشہ" کی رسم افتتاح کے سلسلہ میں 'بیسویں صدی' کا تصویری فیچر بہت دلچسپ ہے۔ صفیر احمد صوفی غزل پڑھتے ہوئے ایسے معلوم ہو رہے ہیں جیسے کسی فوجی دستہ کی کمان کر رہے ہوں۔ ۲۱ ستمبر کو انجمن تعمیر اردو کا ایک ہنگامہ خیز اعلان ہوا جس میں دلی اور بیرون دلی کے فنکاروں نے فرقہ وارانہ فسادات کی شدید مذمت کی۔ مسجد اقصے کے مسئلہ پر بھی عالمگیر انسانی برادری کے نقطۂ نظر سے گفتگو ہوئی۔ فرقہ وارانہ فسادات ہمارے ادب، تہذیب کا چہرہ مسخ کئے دے رہے ہیں۔ قومی یک جہتی کے بغیر ہماری ذہنی و دماغی ترقی ممکن نہیں۔ اس وقت ادیبوں اور شاعروں کا خاموش رہنا اپنے وجود، فن اور احساس کی نفی کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بربریت اور حیوانیت کا یہ دور باقی نہ رہے گا۔ انسانیت اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ جلد ہی سامنے آجائے گی اور عوام اپنا موقف پہچان لیں گے۔ ابھی تو وہ رہزن اور رہنما میں بھی فرق نہیں کر سکتے۔ جلد جلد نظریات بدلتے رہتے ہیں ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

نیازکیش ——— کوثر چاندپوری

رابعہ سوتے سوتے چونک کر بیدار ہوگئی۔

در و دیوار پر گھٹا ٹوپ اندھیری چھائی ہوئی تھی۔ آسمان پر ستارے بےشمار رہے تھے لیکن جگنوؤں کی چمک سے کہیں اندھیروں میں اُجالا ہوا ہے۔ تاریکی اِس طرح اُن کی دھیمی دھیمی جوت کو نگلتی جا رہی تھی جیسے ریت کے تودے بوندوں کی نمی جذب کر لیتے ہیں۔ وہ آنکھیں ملتی اور حیرانی کے عالم میں چاروں طرف دیکھتی رہی۔ انار کا درخت جس کی جڑ میں پانی ڈالنا رابعہ کا سب سے زیادہ دلچسپ کھیل تھا سیاہ غلاف میں لپٹا چپ چاپ کھڑا تھا۔ گوندنی نے بھی کالا دوپٹہ لپیٹ لیا تھا۔ اس کے لال چنگاریوں جیسے پھل ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے بیر بہوٹیوں کا آہستہ خرام کارواں زمین پر رینگنے کی بجگہ فضا میں اڑنے لگا ہو اور پھر یادوں کا بہت بڑا ہجوم رتو کے سامنے سے گزرنے لگا ——— اس کا بچپن جب وہ اچھی طرح اوڑھنی بھی سر پر نہ ڈال سکتی تھی اور گھر کے سارے چھوٹے بڑے اُسے رتو کے نام سے پکارتے تھے۔ رقیہ، قریشہ اور جمیلہ سے لڑنا جھگڑنا دن رات کا مشغلہ تھا۔ وہ کسی سہیلی کا کھیل بگاڑ دیتی تو فوراً ماں سے شکایت ہو جاتی۔

"تائی اماں! رتو نے ہماری گڑیا پھینک دی!" وہ دلیری سے جواب دہی کرتی۔

"بالکل جھوٹ ممی! اِس کی گڑیا کو چھوا تک نہیں میں نے۔ اتنی ہی بڑی مر جاؤں جو ہاتھ بھی لگایا ہو گڑیا کو!"

'اپنے پیاروں کی قسم کھا کر کہتی ہوں تائی اماں یہ جھوٹی ہے!'
امی دونوں کی ہدایت کرتیں۔
'لڑا نہیں کرتے!'
بچپن گزرتے ہی جوانی کا طوفان آ گیا —— لاوا سا اُبلنے لگا۔ وہ سر سے پاؤں تک ہل گئی۔ جیسے برگد کی شاخیں ہوا کے تیز جھونکوں سے زیر و زبر ہو جاتی ہیں اور سوکھے پتے ٹوٹ کر پتنگ کی طرح فضا میں اُڑنے لگتے ہیں۔ اُس کے جذبات بھی بدل گئے اور نگاہیں بھی بوجھل ہو گئیں۔ قہقہوں کے بگولے تھم گئے۔ اِن کی جگہ مسکراہٹ کی سُبک سُبک موجیں ہونٹوں پر دَوڑ جاتیں۔ وہ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگی۔ ایک دن اچانک اصغر کا اور اُس کا آمنا سامنا ہو گیا۔ وہ کالج میں قانون پڑھ رہا تھا۔ اُس نے ربّو پر بہکی بہکی نگاہیں ڈالیں اور بالوں سے لے کر پنڈلیوں تک ایک ایک چیز کی تعریف کر ڈالی۔
'بال کیا ہیں ریشم کے لچھے ہیں!'
'بھونرے سے زیادہ کالے اور کالوں سے زیادہ زہریلے!'
'آنکھوں میں تاروں کی سی چمک ہے اور ہونٹ شفق کی سُرخی میں رنگے معلوم ہوتے ہیں!'

اور نہ جانے کیا کیا کہتا رہا اصغر۔ ایک شاعر کے پاس الفاظ اور خیالات کی کمی نہیں ہوا کرتی۔ کتنے خوشگوار تھے وہ لمحات جب اصغر نے یہ باتیں کہی تھیں۔ رابعہ مغرور ہو گئی۔ اُس نے محسوس کیا انگ انگ ٹوٹ رہا ہے۔ رگ رگ دُکھنے لگی ہے۔ یہ دُکھتی گھڑی دو گھڑی کی نہیں تھی، جنم جنم کی تھی۔ اصغر ہر شام کو آتا ایک دم بہت سے شعر سُنا ڈالتا۔ ایک سُہانی سی جسٹ پٹی شام کو وہ آیا۔ اُداس اُداس چہرہ، سُوکھے سُوکھے ہونٹ اور اُن پر مری سی مسکراہٹ۔ وہ ذرا فاصلہ پر ٹھہر گیا اور ہولے ہولے گنگنانے لگا۔

کِشورِ عشق کا ظہور ہوں میں
دولتِ حُسن کا نسب تجھ سے

رابعہ نے بڑی تمکنت کے ساتھ اصغر کو گھورا۔ وہ بیزار نظر آ رہا تھا۔ تھکا تھکا مضمحل، جی چاہا پُوچھے۔
کیا بات ہے؟
بیمار ہو؟
سوئے نہیں؟
پہلی بار اُسے افسردہ دیکھ کر ربّو کے احساس میں نشتر سا چبھ گیا۔ اُسے ترس آنے لگا۔ پھول کو مُرجھاتے کون سنگدل دیکھ سکتا ہے۔ وہ آپ ہی آپ اُس کی طرف کھنچنے لگی۔ اصغر نے ربّو کو دیکھا پھر لبوں پر زبان پھیری اور غمناک لَے میں ایک شعر پڑھا ؎

یہی کہ ہو گیا افشا تمام دہر پہ میں
مِلا بھی کیا تری اُلفت کی رازداری میں

ربّو کو شاعری سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ شاعروں کو جھوٹا کہتی آئی تھی۔ اُس وقت یہ ترانے دل میں اُترتے چلے گئے اور دھڑکنوں میں گھُل کر سچائی کی شکل میں بدل گئے۔ اُس نے سوچا، شاعر جھوٹا ہو سکتا ہے اُس کے شعر سچائی سے خالی نہیں ہو سکتے۔ اصغر اُس کا عزیز تھا پھر بھی اُس کے اور ربّو کے متعلق عورتیں دھیرے دھیرے باتیں کرنے لگی تھیں۔ رات رانی کی کلی چٹکنے بھی نہ پائی تھی کہ اُس کی مہک سارے محلّہ میں پھیل گئی۔ سہیلیاں بھی بہت خاص انداز سے مُسکرانے لگی تھیں۔ اصغر کی میٹھی آواز اشعار کی تاثیر میں حل ہو کر رابعہ کے دل و دماغ پر چھا گئی۔ وہ اُس کے خوابوں میں بس کر رہ گیا ——
دن گزرتے رہے۔ اشعار کا تاثر گہرا اور گہرا ہوتا گیا۔ پھر ایک لمحہ ایسا آیا ابدی اور غیر فانی لمحہ! جب اصغر نے اُسے محبت کے جالوں میں اُلجھا لیا۔ وہ مکھی کی طرح بھنبھناتی نہیں، ہنستی اور مُسکراتی اِس اَن دیکھی دُنیا میں داخل ہو گئی۔ کتنی حسین اور رنگین تھی یہ دُنیا! اُس میں اَن گِنت پھول کھِلے ہوتے تھے۔ غنچوں کے چٹکنے کی صدائیں آ رہی تھیں، تتلیاں اُڑ رہی تھیں اور بہاریں گنگناتی محسوس ہو رہی تھیں اور جب اصغر کی گوری چِٹّی بانہیں اُس کی گردن میں حمائل ہو جاتیں تو ایسا محسوس ہوتا زندگی گلاب کا سدا بہار پھول ہے۔ اُس کی خوشبو فضا میں اُڑنے لگتی۔ اصغر وکالت کی مصروفیت میں بھی رابعہ کی باتوں سے دل بہلاتا اور اُس کے شاداب لبوں کی مٹھاس سے خوشی میں اضافہ کرتا۔ ماہ و سال کی گردشیں جاری رہیں، روز و شب کا چکّر تیزی سے چلتا رہا۔ ایک گھڑی ایسی بھی آئی جب رابعہ کے وجود سے ایک نئی ہستی نے جنم لیا۔ اختر پیدا ہوتے ہی ماں باپ کی توجّہ کا مرکز بن گیا۔ پہلے جیون کی پگڈنڈی میں دو موڑ تھے۔ اب ایک شاہراہ اور پھوٹ نکلی جو مدِّ نظر تک قوسِ قزح کی طرح رنگ بکھیرتی چلی گئی تھی۔ نہ جانے وہ کِدھر کو جا رہی تھی۔ پھر چلتے چلتے ایک موڑ اور آ گیا۔ انور کے نام سے ایک پھول اور کھلا۔ وہ اختر سے زیادہ معصوم اور دلفریب تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ پلتے بڑھتے رہے —— رابعہ نے بستر چھوڑ دیا۔ اُس کی نگاہوں کے سامنے بیتے لمحوں کی تصویریں ناچ رہی تھیں —— کتنی سُہانی تھی وہ گھڑی جب اصغر نے ڈریسنگ ٹیبل کے قریب کرسی پر بیٹھ کر ایک خوبصورت شعر پڑھ دیا تھا۔ اختر بھولا بھالا سا سُنتا

رہا تھا جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو اور انور دودھ کی شیشی مُنہ سے لگائے خاموش بیٹھا تھا۔

اصغر نے ماما کو پکارا۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی۔ اصغر بولا۔

'بابا لوگ کو لے جاؤ'

میز پر صرف رابعہ رہ گئی۔ اصغر اُٹھا اور کمرے میں جا کر کئی پیگ چڑھا لئے۔ وہاں سے ڈانس کرتا ہوا لوٹا۔ ایک بھرا ہوا پیگ ہاتھ میں تھا۔ ربّو چیخی۔

'ضد نہ کرنا میں نہیں پیوں گی!'

'کبھی نہیں!'

'دیکھیے لڑائی ہو جائے گی!'

اصغر نے ایک ہی سانس میں پیگ خالی کر دیا اور ہوا میں ہاتھ ہلا کر گانے لگا۔

دیکھو اب بھی سوچ سمجھ لو راہ بڑی ٹیڑھی ہے

اِک نرگس کے ساتھ چلی ہو جو شاعر بھی ہے

فوراً ہی رابعہ کو بھی ایک شعر یاد آ گیا۔ اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے چمچہ پلیٹ پر مارتے ہوئے بہت میٹھی دھن میں کہا ؂

پھول کی رُت صحنِ گلشن، اور تیرا سامنا

ساتھ دینا ہے تو اس رُت میں مجھے تنہا نہ کر

ربّو جذباتی ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ بچّے پھول سے رُخساروں پر آنسو بہتے دیکھ کر اصغر کا نشہ اُتر گیا۔ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ رابعہ برابر روتی رہی۔

اصغر نے پُوچھا۔

'روتی کیوں ہو ڈارلنگ؟'

'ایسی کیا بات ہو گئی؟'

رابعہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اصغر آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتا رہا۔ وہ بہت زیادہ ڈر گیا تھا جیسے اژدہا پھنکار رہا ہو اور تیزی سے اُس پر جھپٹ پڑا ہو۔ میز پر خلافِ معمول خاموشی رہی۔ چمچوں اور چھری کانٹوں کی مغموم آوازیں ڈرائنگ رُوم کی دیواروں سے ٹکراتی رہیں۔ اختر پردہ سے سر نکال کر بولا۔

'ممّی ہم آ جائیں؟'

'نہیں'

'ڈر لگ رہا ہے'

'تمھارے پاس آیا ہے۔ یہاں تمھارے پاپا ڈر گئے ہیں۔ انہیں دیکھ رہی ہوں!'

کھانا ختم ہو گیا۔ اصغر ہونٹوں میں سگار دبائے لائبریری میں چلا گیا۔

میز پر ایک موٹی سی فائل رکھی تھی۔ اُسے سپریم کورٹ میں بحث کرنی تھی، لیکن طبیعت بے کیف تھی۔ جی چاہتا تھا چیخ مار کر رو پڑے۔ خُمار بالکل اُتر چکا تھا۔ وہ آرام کرسی پر گر گیا اور آنکھیں بند کئے سگار کے کش لگاتا رہا، وہ اپنے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔

چند منٹ بعد رابعہ دبے پاؤں لائبریری میں آئی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں بھُولے ہوئے خواب کی طرح دکھائی دی اور اصغر اُس رنگین سپنے کو یاد کرنے میں محو ہو گیا۔ رابعہ کی آنکھیں اب بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ اصغر نے سگار نہایت بے دلی کے ساتھ ایش ٹرے میں ڈال دیا اور رومال رابعہ کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

'آنسو پونچھ ڈالو ربّو!'

'رونے کا کیا موقع ہے؟'

اُسی وقت وہ کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور جھپٹ کر الماری سے شراب کی بوتلیں نکال لیں۔ ایک ایک کر کے اُنھیں کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے بولا۔

'معاف کرنا ربّو ڈارلنگ! اِن بوتلوں نے نہ جانے تمھیں کتنا رُلایا ہے۔ تم رات رات بھر مسہری پر پڑی کروٹیں بدلتی رہی ہو اور میں لگاتار پیتا رہا ہوں۔ اِن آنسوؤں کی قسم کھا کر کہتا ہوں اب شراب کو مُنہ نہ لگاؤں گا۔ اِس نے تمھیں رُلایا ہے۔ تمھیں میری وفاداری پر شک ہو گیا تھا'

'ایسی کوئی بات نہیں' ربّو نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ 'اِس سے تو آپ کی رگوں میں گرمی آتی تھی، کام کرنے کی اُمنگ جاگ اُٹھتی تھی، بحث کے نئے نئے گوشے آنکھوں کے سامنے کھلنے لگتے تھے۔ اِس سے آپ کی تھکن دُور ہو جاتی تھی، کہو تو کھوئے ہیں اِس کی بُوند بُوند پلکوں سے اُٹھا لاؤں گی!'

'تمھیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میری بھول تھی کہ بوتلوں سے پیتا رہا۔ شراب تو تمھاری آنکھوں میں اتنی بہت سی بھری ہوئی ہے کہ اُنھیں بے تکلّف میخانوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ پھر جس چیز کو تم حرام سمجھتی ہو وہ میرے لئے بھی جائز نہیں!' —— اُسی وقت ایک بھیانک لمحہ کی ڈراؤنی تصویر نگاہوں میں گھوم گئی۔ ربّو کانپ اُٹھی۔ یہ وہی وقت تھا جب اُس کا شاعر بیماری کی آنچ سے موم کی طرح پگھل گیا تھا۔ آواز بلند ہو گئی تھی۔ سینہ میں چلتا ہوا کلاک رُک گیا تھا۔ اُس کی سُوئیاں جم گئی تھیں۔ فائلیں میز پر رکھی رہ گئی تھیں۔ اُنھیں اُلٹ پلٹ کرنے والی انگلیاں سو گئی تھیں۔ وہ زبان جو کورٹ میں بھی آگ برسانے لگتی تھی۔ بڑے بڑے حریفوں کے

تھے بل جاتے تھے، ہمیشہ کے لئے چُپ ہوگئی تھی۔ مصیبت تنہا نہیں آتی، ہزاروں مشکلات ساتھ آئیں۔ اختر جو باپ کی جگہ سنبھالنے والا تھا کراچی چلا گیا۔ وہاں اُس نے خوب ترقی کی۔ کارپوریشن کا لیگل ایڈوائزر ہو گیا۔ دریا کے کنارے بہت اچھی کوٹھی بنالی۔ جہاز سمندر میں تیرتے یوں دکھائی دیتے جیسے وہ بچپن میں کاغذ کی ناؤ پانی میں بہا رہا ہو۔ انور بھی ڈاکٹری کی ڈگری لے کر اختر کے پاس چلا گیا۔ رابعہ اکیلی رہ گئی۔ لیکن اُس نے کبھی اپنے کو تنہا محسوس نہ کیا۔ اصغر ہر وقت اُس کے پاس رہتا۔ وہ روز خواب میں آکر کہتا۔

'ربّو تم اکیلی نہیں ہو۔ میں شب و روز تمھارے تصوّرات کے دروازوں پر کھڑا رہتا ہوں۔'

دونوں بھائی ماں کے بُلانے پر اصرار کرتے رہے۔ وہ کسی صورت سے گھر چھوڑنے پر راضی نہ ہوتی تھی۔ اسی ہفتہ میں انور اُس کی ایجنسی بنواکر آگیا اور ماں سے ضد کی۔

"ممی اکیلا نہیں جاؤں گا۔ تمھیں لے کر ہی یہاں سے ٹلوں گا!"

"میں کب کہتی ہوں تنہا جاؤ۔ تمھاری منگیتر نے بی۔ اے کر لیا ہے۔ شادی کئے دیتی ہوں اُسے ساتھ لے جاؤ۔"

"اختر بھائی کی شادی پہلے ہوگی ممی۔ اُنھوں نے بہت اچھی کوٹھی بنالی ہے۔ باغ میں ریڈ بلڈ مالٹے کے بہت سے پیڑ ہیں۔ گیٹ سے ملا کھجور کا بہت اونچا درخت ہے۔ سمندر میں جوار بھاٹا آتا ہے تو موجیں مچھلیوں کی طرح تڑپتی ہیں، جہاز بُری طرح ڈولتے ہیں۔ ممی چل رہی ہو نا؟"

رابعہ گمبھیر ہوگئی۔ اُس کی آنکھیں خلا میں نہ جانے کیا ڈھونڈنے لگیں۔

"ممی چل رہی ہو نا؟" انور نے پھر وہی جملہ دُہرایا۔

"انور ضد نہیں کیا کرتے اب تم بچّے نہیں ہو۔"

"بُوڑھا ہو گیا میں ——— ممی بتاؤ میں بُوڑھا ہو گیا؟"

"اللہ رکھے جوان ہو گئے!"

"ممی میں تمھیں لے کر ہی جاؤں گا! اختر بھائی شادی کر رہے ہیں۔"

"شادی!!" ——— وہ چونک گئی۔ کتنا بُرا خیال ہے! شادی، شادی دو بچّے اور شوہر سے جُدائی!

"میں نہیں جاؤں گی انور!" اُس نے فیصلہ کُن انداز سے کہا۔

"تم لوگ مجھے کیوں اُجاڑنا چاہتے ہو۔ میں یہیں مرنا چاہتی ہوں، جہاں میرا نال گڑا ہے وہیں قبر بنے گی!"

انور سہم کر چُپ ہو گیا۔ رابعہ رات کو دیر تک جاگتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی اِس گھر کو میں کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ یہاں اصغر کی یادوں کے باغ ہیں۔ اِن باغوں کا ہر پودا کھجور سے اونچا ہے آسمان سے باتیں کرتا ہے۔ اِن کے چاروں اور میرے ماضی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اِس میں اصغر کے قہقہوں کی موجیں مچل رہی ہیں۔ اُس کے پسینہ کی خوشبو ہے اور یا ہر نالی میں وہ شراب بہہ رہی ہے جس کی بوتلیں اصغر نے پھینک دی تھیں۔ شراب کے اِس دریا میں اُس کی مُسکراہٹیں لہروں کی طرح آگے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔ اصغر کے گاتے ہوئے اشعار اُس کے حافظہ پر تیر رہے تھے۔ انار کا درخت رقا محسوس ہو رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو ———

"تم بھی جا رہی ہو ربّو!"

اُس نے انار کی شاخوں کو چوم کر پوچھا ———

"میں چلی جاؤں؟"

"تم سُوکھ تو نہ جاؤ گی؟"

پھر آپ ہی بولی ———

"میں نہیں جاؤں گی!"

"نہیں جاؤں گی!"

"انار کی جڑ میں پانی کون ڈالے گا؟ اِس کی کلیاں سُوکھ کر جھڑ جائیں گی! اور یہ اِتنا بڑا حادثہ ہوگا جس سے اصغر کی رُوح جل جائے گی۔"

پھر وہ کمرے میں چلی گئی اور کھانے کی میز پر سر رکھ کر کہنے لگی ———

'تُو نے تو اُن کے شعر سُنے ہیں۔ تیرے ریشے ریشے میں اُن کی البیلی مُسکراہٹیں سمائی ہوئی ہیں۔ بول کیا میں چلی جاؤں؟'

'بولتی کیوں نہیں؟'

'چلی جاؤں؟'

'جانتی ہوں تو کیا کہنا چاہتی ہے یہی نا کہ وہاں اصغر کی مہک نہ سُونگھ سکوں گی!'

'اچھا میں نہیں جاتی!'

نہیں جاتی!!"

سورج طلوع ہو چکا تھا۔ انور تولیہ کندھوں پر ڈالے غسل خانہ سے نکل آیا اور چائے کی میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ رابعہ نے میز پر چائے کی ٹرے رکھتے ہوئے کہا۔

"انور میں نہیں جاؤں گی۔ اس گھر کو کیونکر چھوڑ دوں جس میں تمہارے پاپا کی خوشبو بسی ہوئی ہے اور ان کی مسکراہٹوں کے جگنو چمک رہے ہیں۔ اپنا وقت برباد نہ کرو بیٹا! میں تو انار کے اس درخت کا سجا لگتا ہوا سایہ ہوں مجھے پکڑنے کی کوشش مت کرو!!"



مخمور سعیدی

گیت اگر گا نہ سکا اشک بہانا چاہا
کچھ نہ کچھ دل نے بہلنے کا بہانا چاہا

تیری ہی یاد نے کچھ دل سے نہ جانا چاہا
ورنہ ہم نے تجھے سو بار بھلانا چاہا

ہائے وہ دن، کہ جب اک دشمنِ جاں نے کیا کیا
زندگی بن کے مرے دل میں سمانا چاہا

اشک بن کر مری پلکوں پہ سلگ اٹھا ہے
میں نے جس پھول کو دامن میں سجانا چاہا

میری دیوانگیِ شوق مسلّم، لیکن
تم نے خود بھی نہ مجھے ہوش میں لانا چاہا

مل رہی ہیں دلِ ناداں کو سزائیں کیا کیا
جرم یہ تھا کہ تجھے اپنا بنانا چاہا

ہم ترے غم کی حسیں نیند سے چونکے نہ کبھی
شورشِ دہر نے ہر چند جگانا چاہا

انتقامِ دلِ ناکام تو آساں تھا بہت
ہم نے خود ہی نہ ترے دل کو دکھانا چاہا

میرے ہونٹوں پہ کچھ اتنا ہی تبسم مچلا
شدتِ غم نے مجھے جتنا رلانا چاہا

زندگی سے ہمیں بیگانہ رہے ہیں اب تک
زندگی نے تو بہت ربط بڑھانا چاہا

ہم کہ پابندِ رہ و رسمِ وفا تھے اے دوست!
تجھ سے بچھڑے تو ترے غم سے نبھانا چاہا

پردۂ شعر میں، اک شوخ حیا پرور کو
اپنا افسانۂ غم ہم نے سنانا چاہا

داغِ ناکامیِ الفت نہ مٹا جب دل سے
ہم نے مخمورؔ خود اپنے کو مٹانا چاہا

مخمور سعیدی

# قابلِ مطالعہ منتخب شعری مجموعے

| کتاب | شاعر | قیمت |
|---|---|---|
| آتشِ گل | جگر مراد آبادی | پانچ روپے |
| کلیاتِ اقبال | ڈاکٹر اقبال | چھ روپے |
| جنون و ہوش | جوش ملسیانی | چار روپے |
| جنتِ رنگ | عرش ملسیانی | تین روپے |
| آہنگِ حجاز | 〃 | ایک روپیہ |
| سحرِ غزل | ساحر ہوشیارپوری | تین روپے |
| دستک | نریش کمار شاد | دو روپے ۲۵ پیسے |
| پھوار | 〃 | دو روپے ۵۰ پیسے |
| فنکار | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| قاشیں | 〃 | تین روپے |
| آیاتِ جنوں | 〃 | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| سنگم | 〃 | تین روپے |
| سموم و صبا | جوش ملیح آبادی | آٹھ روپے |
| شکوہ جوابِ شکوہ | ڈاکٹر اقبال | پچیس پیسے |
| بالِ جبریل | 〃 | تین روپے ۵۰ پیسے |
| ابعین درگزشتہ | جوش ملسیانی | دس روپے |
| شکنتلا | ساغر نظامی | بارہ روپے |
| نگاہ و ناز | کرشن موہن | ایک روپیہ |
| آہنگِ وطن | 〃 | ایک روپیہ |
| کلیاتِ اکبر الہ آبادی (اول) | اکبر الہ آبادی | پانچ روپے |
| 〃 حصہ دوم | 〃 | چھ روپے |
| کلیاتِ اختر شیرانی | اختر شیرانی | آٹھ روپے |
| رعنائیاں | شکیل بدایونی | تین روپے |
| صنم و حرم | 〃 | دو روپے ۵۰ پیسے |
| گلِ رعنا | جگی رعنا | تین روپے ۵۰ پیسے |
| شبنم شبنم | کرشن موہن | پانچ روپے |
| دلِ ناداں | 〃 | چھ روپے |

| کتاب | شاعر | قیمت |
|---|---|---|
| خرابات | عبدالحمید عدم | چار روپے |
| رمِ آہو | 〃 | چار روپے |
| گلنار | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| قول و قرار | 〃 | تین روپے ۵۰ پیسے |
| گردشِ جام | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| بطِ مے | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| گجر | قتیل شفائی | تین روپے |
| رسالت مآب | رئیس احمد جعفری | چھ روپے |
| اسلام اور عورت | مولانا مظہر الدین | تین روپے |
| نماز کیا ہے | مولانا محمد علی | دو روپے ۲۵ پیسے |
| نیا نو دن | راشد سہسوانی | پانچ روپے ۷۰ پیسے |
| غم دستِ مستقل | انیس مرزا | چار روپے ۵۰ پیسے |
| شرارت | جمیل انجم | تین روپے |
| عشق اور خون | رائیڈر ہگرڈ | سات روپے |
| سوکھا ساون | انیس مرزا | دو روپے ۵۰ پیسے |
| محبت اور جرم | انور کمال حسینی | دو روپے ۷۵ پیسے |
| فن اور تنقید | 〃 | چار روپے ۵۰ پیسے |
| نوائے دل | منشاء الرحمٰن خاں منشاء | دو روپے ۵۰ پیسے |
| شاہنامۂ اسلام | حفیظ جالندھری | نو روپے نو روپے |
| تلامذۂ غالب | مالک رام | سات روپے ۷۵ پیسے |
| یادیں | اختر الایمان | چھ روپے |
| مضراب | شباب للت | تین روپے |
| تماشائی | کرشن موہن | ایک روپیہ |
| رُوپ درس (ہندی رسم الخط میں) | 〃 | ایک روپیہ |
| نگاہ و ناز | 〃 | ایک روپیہ |
| تبسمِ غم | وسیم بریلوی | دو روپے ۵۰ پیسے |
| دیوانِ مصحفی | مرتبہ نور نقوی | بارہ روپے |

| کتاب | شاعر | قیمت |
|---|---|---|
| طلوع | ضیا فتح آبادی | پچہتر پیسے |
| نئی صبح | 〃 | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| نورِ مشرق | 〃 | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |

**آئینۂ اصلاح** — ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر مع توجیہہ اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور عروض نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی۔ قیمت پانچ روپے

**شاہنامۂ اسلام** — جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام چار حصوں میں جن میں تیرہ سو سالہ اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے۔ ہر حصہ قریباً تین سو صفحات کا ہے۔ تازہ ایڈیشن اصلاح کے بعد چھپا ہے۔ قیمتی سولہ روپے اب صرف نو روپے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ محصول ڈاک ایک روپیہ ۵۰ پیسے الگ ہوگا۔

**مضراب** — شباب للت کے ایک ایک شعر میں اُس کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور اِن دھڑکنوں میں اُس نے سارے جہان کے دُکھ درد سمیٹ لئے ہیں۔ قیمت تین روپے۔

**گردِ راہ** — ضیا فتح آبادی کا چوتھا مجموعہ کلام۔۔۔ ضیا ایک صاحبِ طرز شاعر ہیں۔ اُن کے انداز بیان اور لب و لہجہ میں انفرادیت و ندرت ہے۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے۔

**آوازیں** — اُبھرتے ہوئے جواں سال شاعر گوپال کار جوش کے قطعات اور نظموں کا منفرد مجموعہ جس میں رومان کی چاشنی کے ساتھ ساتھ آپ کی اپنی آواز بھی ہے۔ قیمت تین روپے

**چاندنی اسارتھ کی** — راج نرائن راز کی نظموں کا مجموعہ۔ لوک گیتوں کی سی سادگی، مہکار، تازگی اور شگفتگی۔ ان میں ایک نئے انداز کی تخلیقی تشویش بھی ہے۔ سہ رنگا گرد پوش، کاغذ آفسیٹ۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ۔ قیمت صرف تین روپے۔

---

پتہ :۔ رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

# دوپٹہ

اختر ملیح آبادی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی

۷۲۔ چھتوا پور روڈ۔ لکھنؤ

برادرِ معظّم! سلام مسنون

"دوپٹہ" کا کاروبار تو نہیں کرنے لگا ہوں —— البتہ یہ ایک دوپٹہ نہ جانے میرے پاس کیسے اُڑ کر آگیا ہے یا کسی نے شرارتاً پھینک دیا ہے —— یہ افسانہ اُسی دوپٹے کا ہے! "دوپٹے کے روایتی و جذباتی" تصور سے ہٹ کر۔ ہو سکتا ہے افسانہ بہتوں کو فریب دے جائے! —— یہی فریب "دوپٹہ" کی جان ہے!! ——

سالنامہ "نئے چراغ" جلانا فضا کو معطر کرتا کب تک آرہا ہے؟...

آپ کا —— اختر ملیح آبادی

نیلی آنکھوں والا ویسا ہی ثابت ہوا جیسا کہ فلیٹ کی لڑکیوں نے اُسے بتایا تھا۔

آج سے دو ماہ پہلے جب وہ فلیٹ میں آئی تھی تو بلڈنگ کی رہنے والی لڑکیوں نے کہا تھا: "اپنے پورشن کے نیچے رہنے والے نیلی آنکھوں والے سے ہوشیار رہئے گا وہ بہت تیز (smart) کرتا ہے۔ اُسے لفٹ نہ دیجئے گا..." وہ صرف ہنس دی اور نیلی آنکھوں والے سے نہ تو دلچسپی کا اظہار کیا اور نہ کسی گھبراہٹ کا۔ کیونکہ فطری طور پر نوجوانوں سے خائف نہیں تھی اور نہ اُس کی نسوانیت نے کسی قسم کا کمپلکس (Complex) ہی پیدا ہونے دیا تھا۔ اُس کی یقینی وجہ یہ تھی کہ وہ خوددار تھی۔ والدین تھے نہیں خالہ نے اُس کی پرورش کی تھی اور اب تو وہ خود اپنے پیروں پر کھڑی تھی اور ایک ڈیپارٹمنٹ میں ٹائپسٹ گرل تھی۔ پھر خائف ہونے کا کیا سوال تھا ——!؟

تیسرے دن بلڈنگ کے زینے پر جب وہ دفتر جا رہی تھی نیلی آنکھوں والے سے اُس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ زینے کے خم پر دونوں کا ٹکراؤ ہو جاتا کیونکہ اُس نے نیلی آنکھوں والے کو راستہ کاٹتے دیکھ لیا تھا لیکن وہ داؤں دے کر نکل گئی۔ پشت سے آواز آئی "تتلی ہے تتلی..." اُس نے سُنی اَن سُنی کر دی۔

دوسرے دن جب وہ فراغ زینے کے پاس پہنچی تو اُسے کھڑا سیٹی بجاتے پایا۔ جب وہ زینے کی طرف بڑھی تو اُس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "گڈ مارننگ..." لیکن وہ ساڑی کا پلّو ٹھیک کرتی زینے پر ہولی۔ پھر آواز آئی۔ "نورجہاں! آئی ول سی" (Noorjahan! I will see...!) چند دن بعد جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو سفید لفافہ ملا جس میں ٹائپ کی ہوئی انگریزی میں یہ تحریر تھی ——

"مس! آپ اپنا راز چھپا نہ سکیں اور مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ منسٹری آف ٹرانسپورٹ میں کام کر رہی ہیں۔ مجھے آپ کا نام بھی معلوم ہو چکا ہے... میں وزیر پولیس کا پی۔ اے ہوں۔ فلیٹ کی سب لڑکیاں میرا خیال کرتی ہیں لیکن ایک آپ ہی ہیں جو رُخ تک نہیں کرتیں۔ حالانکہ میں دوستی کا دل سے متمنی ہوں۔ کیا آپ مجھے دوست بنانا پسند نہیں کریں گی؟ سوچ لیجئے پھر شکایت نہ کیجئے گا...!"

لیکن اُس نے دوستی تو درکنار سرِ راہ بات کا موقع بھی نہ دیا جس سے وہ اور تپ گیا۔

---

فلیٹ کی دوسری لڑکیوں کو قطعی امید ہو گئی تھی کہ نیلی آنکھوں والے

سے مگر کوئی لڑکی مقابلہ کر سکتی تھی تو وہی کر سکتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ لڑکیاں اُس کی شیدائی تھیں اور اُس کی حوصلہ افزائی کیا کرتی تھیں اور وہ مُسکرایا کرتی تھی۔

پچھلے دو ماہ میں اُسے تقریباً روزانہ نیلی آنکھوں والے کی شرارتوں کی کاٹ کرنی پڑی اور جب اُس نے دیکھا کہ شرارتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا تب وہ غور کرنے لگی کہ اِن شرارتوں کو روکا کیسے جائے؟

وہ اسی اُدھیڑ بُن میں تھی کہ ایک شام کو جب وہ اوپر زینے پر آ رہی تھی وہ جلدی جلدی کہنے لگا: "اچھا صاحب! اتنی بات تو مان لیجئے بری کی شکایت نہ صرف مجھے بلکہ فلیٹ کے ہر آدمی کو ہے کہ آپ اپنی بدصورت پڑوسن کے ساتھ کھڑے ہو کر گھنٹوں باتیں کرتی ہیں اور وہ منظر صرف آنکھوں پر ہی بارِ گراں نہیں ہوتا بلکہ . . ." باقی الفاظ اُس نے سُنے نہیں کیونکہ تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی اور وہ کھسیانا ہو کر کھڑا مُنہ بناتا رہ گیا ـــــ اور جب اُس نے کھڑکی دیکھ کر کھڑکی کھولی تاکہ نظارہ کرے تو یہ دیکھ کر اُسے بہت کوفت ہوئی کہ وہ بدصورت پڑوسن کے ساتھ کھڑی چائے پی رہی ہے اور ہنس ہنس کر باتیں بھی کر رہی ہے۔ یہ دیکھتے ہی اُس نے مُنہ بنایا اور کھڑکی بند کر دی۔

لڑکی کی ضد اور ہٹ پر نیلی آنکھوں والے نے اُس کا نام "چٹان" رکھ دیا تھا۔ اِس کا اظہار خود ہی اُس نے کیا۔ جب لڑکی کے پیچھے وہ بھی زینے طے کر رہا تھا اور کہتا جاتا تھا: "میری آنکھیں نیلی جھیل ہیں اور جب میں اُنھیں آنکھوں کے قریب پاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نیلے پانی کے پاس سفید پتھر کی چٹان ہو . . . جس پر نیلے پانی کی لہریں پھول نچھاور کرتی ہوں۔ لیکن سفید پتھر کی چٹان ظالم ہو بے وفا ہو . . . کیا سفید پتھر صرف پتھر ہوتا ہے . . . ؟!" اُس نے ہنسی کو دانتوں تلے ہونٹ داب کے بمشکل روکا اور زینہ طے کر گئی۔

لڑکیوں نے جب اُسے بتایا کہ نیلی آنکھوں والے نے اُسے سفید پتھر کی چٹان، مشہور کر دیا ہے تو اُس نے کہا: "ہاں! میں نیلے پانی والی جھیل کے کنارے وہ چٹان ہوں جسے جھیل کی لہریں گرانا چاہتی ہیں اور وہ اِن لہروں کو پاش پاش کر کے قطروں میں اِدھر اُدھر بکھیر دیتی ہے . . . !" فلیٹ کی لڑکیوں نے مل کر تالی بجا دی اور بہت خوش ہوئیں جواب سے اور رائے دی کہ یہ جواب 'جھیل' کے کنارے نصب ہونا چاہیئے۔ اُس نے بہت بے اعتنائی سے لڑکیوں سے کہا: "گھبراؤ نہیں اِس سے بہتر جواب دوں گی!"

---

"لائیے میں دوپٹہ دھو دوں!" اُس نے اپنی موٹی بھدّی اور بدصورت پڑوسن سے کہا: "اور میرے حصّے کی طرف دھوپ ہے وہیں پھیلا دوں گی۔"

"بڑی مہربانی ہوگی!" کالے پتھر کی سی کرخت ہنسی کے ساتھ پڑوسن نے کہا: "جب تک میں کچن میں ہو لوں۔" آج چھٹی کا دن تھا۔ اِس لئے اُس نے بدصورت پڑوسن کا دوپٹہ دھویا اور اپنی طرف جنگلے پر پھیلا دیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ سِنگھار میز کے سامنے کھڑی بال بنا رہی تھی تو اُس کی نظر اچانک اُٹھی، دوپٹہ نیچے سرکتا ہوا دیکھا اور جب تک جائے دوپٹہ گِر گیا۔ اُس وقت تک کھٹکا ہوا۔ اُس نے بڑھ کر دیکھا تو دوپٹہ نیلی آنکھوں والے کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا ـــــ ایک لمحے کے لئے وہ سٹپٹا گئی۔

شام تک سارے فلیٹ حسین دوپٹے والی بدصورت عورت کی چیخوں اور آوازوں سے گونج رہے تھے۔ وہ کہتی پھرتی تھی: "میرا دوپٹہ نہ مِلا تو قیامت ڈھا دوں گی!"

رات نیلی آنکھوں والا دیر سے آیا۔ بدصورت عورت کی کرخت چیخوں سے لاعلم تھا اِس لئے حسین دوپٹہ کا رومانی تصوّر اب تک دل و دماغ میں گونج رہا تھا۔ اگر سفید پتھر کی چٹان کے قریب وہ پہنچ نہ سکا تب اُس کا حسین دوپٹہ تو اِس کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ دوپٹہ واپس نہ کرے گا ـــ یادگاری سوغات کے طور پر محفوظ رکھے گا! یہ سوچتے ہوئے اُس نے حسین دوپٹے کو ہاتھوں پر اُٹھا لیا اور بے ساختہ ہونٹوں سے لگایا تو بھینی مہک نے اُسے فلیٹ سے گلمرگ پہنچا دیا اور دوپٹے کے نرم حسین اور رنگین تانے بانے سے وہ لڑکی نمودار ہو کر سامنے کھڑی ہو گئی جس سے دوستی کے لئے وہ اب تک پاپڑ بیل رہا تھا۔ خوابوں کی ملکہ حسین دوپٹے میں لپٹی دیکھی تو بہت جذباتی انداز سے کہا: "شاعر محبوبہ کا رومال ہو تو نظم کہہ دیتے ہیں ـــــ اگر مجھے لکھنا آتا تو تمہارے دوپٹے پر ایسی کہانی لکھتا کہ وہ شاہکار بن جاتی . . . !"

دوپٹہ کو تکیہ پر گال کے نیچے رکھ کر سویا تو ساری رات ایک حسین خواب ہی دیکھتا رہا!

---

صبح تکلیف دہ شور سے آنکھ کھلی تو اُسے محسوس ہوا جیسے کوئی دروازہ توڑے ڈالتا ہے۔ اُس نے جھلّا کر کہا۔

"کون ـــ ؟"

"اے مسٹر!" بدصورت عورت کی بھدّی آواز گونجی۔ "دروازہ کھولو ـــ دوپٹہ چور . . . !"

اُس نے گھبرا کر دوپٹے کی طرف دیکھا اور اُسی کیفیت میں اُس نے دوپٹہ تکیہ کے نیچے چھپا دیا ـــــ سمجھ گیا کہ بدصورت پڑوسن اپنے حسین دوپٹے کا

دوپٹہ ڈھونڈنے آئی ہے۔ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اُس نے طے کر لیا تھا کہ وہ دوپٹہ واپس نہ کرے گا!

"کیا پھر تعمیر ہو گئے ——— انہوں کہیں کے ——— !؟"

"کھول رہا ہوں!" اُس نے قدرے جھلا کر کہا۔ ہولے گھوڑے پر سوار ہو کر کسی کا کیا صورت تھی؟" یہ کہہ کر اُس نے دروازہ کھولا تو بدصورت عورت بپھری کھڑی تھی اور فلیٹ کی ساری عورتیں اور لڑکیاں اُس کے پیچھے کھڑی تھیں لیکن وہ ایک ہی نظر میں بھانپ گیا کہ صرف وہی نہیں تھی جس کے حسین دوپٹے نے اُسے ساری رات ایک ہی خوبصورت خواب دکھایا تھا۔

"لاؤ مسٹر!" موٹی بدصورت عورت بے ہنگم جسم کے ساتھ اندر آئی اور کہا: "دوپٹہ جلدی لے کر دو ورنہ ——— !"

"دوپٹہ کیسا؟" اُس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"یہ چار سو بیس مجھ سے نہیں چلے گی مجھے مسٹر!" بھدی عورت نے نخرا کر کے بھدے انداز میں کہا: "میں اس سے نہ ڈروں گی کہ تم وزیرِ پولیس کی جوتیاں سیدھی کرتے ہو... میں اپنا دوپٹہ لئے بغیر نہیں جانے کی!"

وہ بھی تپ گیا اور پوچھا: "دوپٹہ تھا کیسا؟" موٹی بدصورت عورت نے تفصیل بتلاتے ہوئے کہا: "یہ تھا جس پر تمہاری رال ٹپک پڑی ہے"

لڑکیاں کھِل کھِلا پڑیں، جانے کیوں۔ اُس نے کہا: "لیکن دوپٹہ تو آپ کبھی اوڑھتی نہیں ہیں۔ میں نے آپ کو ہمیشہ ساڑی میں دیکھا ہے؟"

"اس کے یہ معنی نہیں کہ میرے پاس دوپٹہ ہو ہی نہیں سکتا!"

دیر تک حجت ہوتی رہی۔ اُس کا کہنا تھا کہ بدصورت عورت نے دوپٹہ اگر پھیلایا تھا تب اس کے فلیٹ میں کیسے گر سکتا تھا اس لئے اسے دوپٹے کا علم نہیں لیکن بدصورت عورت نے کہا کہ دوپٹہ اُس نے اپنی پڑوسن کے جنگلے پر پھیلایا تھا۔ اِس انکشاف پر اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے دوپٹہ بے رونق ہونے لگا ہے۔ حسین تصور کو مٹنے سے بچانے کے لئے اُس نے گھبرا کر کہا: "آپ جو دوپٹہ بتا رہی ہیں وہ تو کسی حسین ہی لڑکی کا ہو سکتا ہے..."

بدصورت عورت نے چیخ کر احتجاج کیا اور نتھنے پھلا کر بولی: "تمہاری آنکھیں جلیں ——— میں کیا بدصورت ہوں... حسین اور قیمتی دوپٹہ میں نہیں اوڑھ سکتی...؟"

قہقہوں کے ساتھ وہ بھی مسکرا دیا اور سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دے کہ بدصورت عورت نے بڑھ کر تکیے پر ہاتھ مارا تو دوپٹہ وہاں رکھا تھا ——— دوپٹہ ہاتھ میں آتے ہی بدصورت عورت چیخی: "یہ دیکھئے ——— میں کیا کہتی تھی کہ دوپٹہ اسی نے اڑایا ہے ——— ارے یہ؟ ——— چور ہے چور! ——— ایسے بدمعاش کو یہاں سے فوراً نکلوا دینا چاہئے۔ بڑا بابو بنا پھرتا ہے ——— شریفوں کے ساتھ اسے رہنے کا کوئی حق نہیں ——— آج یہ دوپٹے پر ہاتھ صاف کر سکتا ہے کل نہ جانے کیا گُل کھلائے ——— لوفر کہیں کا..."

"دوپٹہ مجھے گرا پڑا ملا تھا!" اُس نے جلدی سے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم کس کا تھا...؟"

"چور کہیں کا!" بدصورت موٹی عورت نے غصّے سے اُسے دیکھا اور مڑتے

مسعودہ حیات ایم۔اے، بی ٹی

دردِ الفت نے کبھی چین سے جینے نہ دیا
میں نے چاہا تو مجھے زہر بھی پینے نہ دیا

اب گوارا ہے غمِ ہجر بھی لیکن اے دوست
تیری قربت میں تمناؤں نے جینے نہ دیا

زندگی غم سے سنورتی ہے یہ مانا لیکن
منزلِ غم میں سہارا تو کسی نے نہ دیا

"تیرے ملنے کی خوشی تیرے بچھڑنے کا ملال"
غمزۂ شام و سحر نے ہمیں جینے نہ دیا

کس سے شکوہ کریں ویرانیٔ ہستی کا حیات
ہم نے خود اپنی تمناؤں کو جینے نہ دیا

——— مسعودہ حیات

پوچھ کہا: دوپٹہ اُس وقت دے رہا ہوں تا کب میں جانتی اب باتیں بنا رہے ہو؟"

لڑکیاں کھلکھلا پڑیں اور عورتیں مسکرا دیں۔ آخر اُس نے جھینپ کر کہا۔
"اچھا صاحب اب تشریف لے جائیں!"

"جلدی لو پھر سینہ زوری!؟" موٹی عورت نے ہاتھ سے دوپٹے کی شکنیں برابر کرتے ہوئے کہا: "چور کے گھر تے ڈبے میں ڈرنے والی نہیں — تمھیں روز میری جلی کٹی سننا پڑے گی!"

"بھاگتی رہئے ریڈیو!" یہ کہتا ہوا وہ حمام کی طرف ہو لیا اور واقعی موٹی عورت دیر تک طعنوں کے بم برساتی رہی —— وہ حمام میں منحوس صبح کو کوستا رہا —— رات کے حسین خواب کا کیسا بھیانک اختتام ہوا؟

جب منہ دھو کر تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے اس نے دیوار میں لگے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو اسے اپنے عکس سے نفرت محسوس ہوئی! پھر آنکھیں چہرے کے عکس کے بجائے دل کے آئینے پر مرکوز ہو گئیں جہاں حسین دوپٹہ گھبرایا ہوا پڑا تھا اور ایک موٹی بدصورت عورت بھونڈی آواز میں واویلا کر رہی تھی —— اس وقت اسے ابکائی آئی جب اس نے سوچا اس عورت کے دوپٹے کو وہ ساری رات گال کے نیچے رکھ کر سویا ہے!

---

حمام سے وہ اس وقت نکلا جب وہ بدصورت عورت دوپٹہ لے کر جا چکی تھی۔ چہرے پر کوفت اور ندامت کے آثار ابھی باقی تھے۔ وہ دل کو بہلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ حسین دوپٹہ اُس بدصورت عورت کا ہو ہی نہیں سکتا یقیناً وہ جھوٹ بولی کہ اچانک وہ سن سے رہ گیا —— کیونکہ کھڑکی سے سفید چٹان جیسی لڑکی کا چہرہ مسکراتا ہوا نظر آیا۔ اسے یقین نہ آیا کہ وہ لڑکی اس کی کھڑکی کے پاس آ سکتی ہے۔ اس لڑکی نے مسکرا کر پوچھا۔
"مہربانی کر کے ٹائم بتایئے؟"

"ٹائم؟" وہ گھبرا کر بستر کی طرف گھڑی لینے کے لئے بڑھا۔ گھڑی اٹھائی اور ٹائم دیکھتے ہوئے، یہ کہتے ہوئے وہ بڑھا: اِس وقت آٹھ بج کر پچیس منٹ ہوئے ہیں.. یہ کہہ کر اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا تو ٹائم معلوم کئے بغیر وہ لڑکی جا چکی تھی —— اور اس کے ہاتھ سے گھڑی گر گئی! وہ سمجھ گیا کہ وہ لڑکی ٹائم پوچھنے نہیں اس کا "مزاج" پوچھنے آئی تھی۔

---

اُس دن وہ دفتر نہیں گیا اور نہ لڑکی کے موڑ پر نظر آیا —— اسے یہ احساس بُری طرح بے چین کئے ہوئے تھا کہ بدصورت موٹی بھدی عورت کے دوپٹے کو سینے سے لگائے رہا تھا اور اس تلخ غلطی نے نہ صرف اُس کے حسین اور رومانی جذبات کو قتل کیا بلکہ اس کی شخصیت کو بے اثر اور مضحکہ خیز بھی بنا دیا یہ احساس فلیٹ کی لڑکیوں کی کھلکھلاہٹ میں عیاں تھا اور فلیٹ کی عورتوں کی معنی خیز مسکراہٹ سے جھانکتا تھا!

چند دن بعد وہ اچانک غائب ہو گیا —— سفید چٹان نے بتایا کہ وہ رخصت پر گیا ہے۔

اور جب ہفتوں بعد آیا تو اپنا سامان اٹھانے کے لئے ——!!

---

جب اُس کی شادی ہوئی اور اُس نے ملن کی رات کو دلہن کا مُنہ دیکھنا چاہا تو اچانک وہ سہم گیا —— کیونکہ اُس کی بیوی جس دوپٹے میں مُنہ چھپائے تھی وہ ویسا ہی حسین و رنگین بنارسی دوپٹہ تھا جس کی تلخی وہ اب تک بھول نہ سکا تھا۔ اُس نے بہت نفرت سے دوپٹہ پھینک دیا۔ دلہن کو اپنی شال اڑھا دی اور کہا: "یہ دوپٹہ مجھے پسند نہیں!"

شرم سے گٹھری بنی ہوئی دلہن اِس نفرت کی وجہ سمجھ نہ سکی!؟

آج بھی وہ جب اِس نفرت کی وجہ پوچھتی ہے تو وہ صرف ہنس دیتا ہے اور زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ اُس کی بیوی کچھ سوچ کر لمبی سانس لینے لگتی ہے اور اُسے فلیٹ کی وہ سفید چٹان نما لڑکی یاد آ جاتی ہے جس نے بنارسی حسین ریشمی دوپٹے سے قتل کیا تھا۔ نہ کہ گولی اور تلوار سے ——!!!

---

| تصنیفات جناب محروم | | بیکراں | ۴/۵۰ | ابوالکلام آزاد | ۰/۲۵ |
|---|---|---|---|---|---|
| کاروانِ وطن | ۶/۵۰ | ستاروں کی ترنگ | ۲/۷۵ | خیر صاحب کرم | ۰/۲۵ |
| بہارِ طفلی | ۳/۵۰ | دلہن بین الہنی | ۲/۵۰ | مزار پر | |
| نیرنگِ معانی | ۵/۰۰ | نوائے پریشاں | ۲/۵۰ | ماتمِ سالک | ۰/۲۵ |
| شعلۂ نوا | ۶/۵۰ | اقبال اور اس کا عہد | ۳/۰۰ | خطرے کی آواز | ۰/۲۵ |
| بچوں کی دنیا | ۳/۰۰ | میرے گزشتہ روز و شب | ۱/۲۵ | انتخابِ کلامِ آزاد | ۱/۰۰ |
| انتخابِ کلامِ محروم | ۱/۰۰ | ماتمِ نہرو | ۰/۷۵ | افکارِ قرآن | قسیم ۵/۰۰ |
| تصنیفات جناب | | اجنتا | ۰/۷۵ | منظومات فراق | ۳/۵۰ |
| جگن ناتھ آزاد | | دہلی کی جامع مسجد | ۰/۲۵ | جگن ناتھ آزاد | ۵/۰۰ |
| تلوک چند محروم | ۳/۰۰ | اردو | ۱/۲۵ | [illegible] | |

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر

# شعلہ و شبنم

شعیب شمس ایم۔ اے

صبا منزل، راحت روڈ، کریم پک، پٹنہ

بھائی جان! خلوص و محبت

زندگی کے پچھلے چند ماہ بہت ہی پریشانی میں گزرے۔ والدِ محترم کی طویل بیماری، خسرِ محترم کی اچانک علالت اور پھر اُن کی جدائی، دفتری مصروفیات، سرکاری دورے۔ اس کے بعد کے دو تین ماہ اِس احساسِ شرمندگی میں گزر گئے کہ آپ کو کیسے خط لکھوں جب کہ آپ برابر اپنے خلوص سے نوازتے رہے۔ اُمید ہے میرے ناکردہ گناہوں کا آپ کچھ خیال نہ کریں گے اور قارئینِ "بیسویں صدی" میری اِس طویل غیر حاضری کو معاف فرمائیں گے ——— ایک تازہ ترین افسانہ ارسالِ خدمت ہے۔ اگر پسند آئے تو شریکِ اشاعت کرلیں۔

آپ کے جواب کا انتظار کروں گا . . .

آپ کا بھائی ——— شعیب

توبہ! یہ زندگی ہے یا پتھر کی سِل! آگے کھسکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ بس اڑیل گھوڑے کی طرح ایک جگہ جمی ہے تو جمی ہے۔ لاکھ ایڑیاں لگاؤ لیکن آگے کھسکے تو کیسے، جیسے میلوں گہرے غار ہی میں تو گِر جائے گی۔ مجھے ایسی یکسانیت بالکل پسند نہیں۔ صبح اٹھو، برش کرو، چائے پیو اور پڑھنے بیٹھ جاؤ۔ پھر کالج جاؤ اور کالج سے واپس آؤ تو گھر والوں کے ساتھ بے مقصد باتیں کرو۔ اندھیرا پھیلتے ہی کتابیں لے کر بیٹھ جاؤ اور پھر سو جاؤ۔ دوسری صبح اٹھو تو پھر وہی چکر! اور ڈیڈی ہیں کہ سامنے آرام کرسی لگا کر بیٹھ گئے۔ ذرا اِدھر کھسکو نہ اُدھر۔ کتابوں سے نظر بھی نہ ہٹے!

"ڈیڈی! مجھے ایسی پڑھائی بالکل اچھی نہیں لگتی۔"

"تو پھر باورچی خانہ میں جاکر روٹیاں سینکو لیکن یاد رکھنا وہاں بھی میں اپنی کرسی لے کر بیٹھا ہی رہوں گا تاکہ روٹیاں جلنے نہ پائیں۔"

میں جانتی ہوں ڈیڈی ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اُن کی فطرت ہے کہ جو کام شروع کر دیا جائے اُس کی آخری حد تک پہنچا کر ہی دم لینا چاہئے۔ انھوں نے اپنی جوانی میں پیار بھی تو ایسا ہی کیا تھا۔ چاروں طرف سے جب تھو تھو ہونے لگی تو شکرانے ہوئے دھیرے سے نازنین نہال سے الگ ہوگئے تھے جیسے کبھی کوئی واسطہ ہی نہ رہا ہو اور ایسی علیحدگی اختیار کی کہ پھر کبھی اُن کی صورت تک نہ دیکھی۔ بیچاری گھُل گھُل کر دِق میں مبتلا ہوکر چل بسیں۔ ڈیڈی کو جب اپنی زندگی سنوارنے کا خیال آیا تو اتنی محنت کی کہ پہلے یونیورسٹی میں پھر گورنمنٹ کالج کی لکچرری کی اور پرنسپل ہوکر ریٹائر ہوئے۔ شاید موت بھی انھیں اسی وقت آئے گی جب سارے دانت ٹوٹ جائیں گے اور آنکھ، کان، ہاتھ، پیر سارے اعضاء بیکار ہو جائیں گے۔ ابھی کیا ہے ابھی تو بالکل ہٹے کٹے ہیں ——— دسترخوان پر خوب تڑیاں چلاتے ہیں جیسے سو جوانوں کے ایک جوان ہوں!

لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ میں اُن کی بیٹی ہوں تو میں بھی اُن کی طرح ہو جاؤں۔ لیکن وہ کچھ کرنے بھی تو نہیں دیتے۔ ہر دوسرے تیسرے دن کالج میں پہنچ جاتے ہیں کہ میں کہیں کسی سے پیار تو نہیں کرتی۔ اگر ایسی ہی لگن ہو گئی تو ایسا کروں گی کہ انھیں کچھ پتہ ہی نہ چل سکے۔ بھلا وہ بھی کوئی پیار ہے کہ کرو تو ساری دنیا کو جتا کر۔ بس چپ چاپ خاموشی سے کسی کو چاہو کوئی جان کوئی نہ جانے۔ لیکن سچی زندگی کی ایسی یکسانیت ——— توبہ! اِدھر بس

کرتی ہوں کہ کاش میرا بھی کوئی بھائی یا بہن ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن ہماری زندگی میں۔

"ارے رخشی تم! اچھا ہوا تو آ گئی۔ اب کچھ جی بہلے گا۔ سچ کہتی ہوں میں تو اس ماحول میں گھٹن محسوس کرتی ہوں۔ بس زندگی کا ایک چکر ہے جو روز چلتا رہتا ہے اور سیڈ ڈیڈی، ان کا بس چلے تو ایک ہی رنگ اور ڈیزائن کے کپڑے روز پہننے پر مجبور کر دیں!"

"ارے ابا بس بھی کر۔ جب تبدیلیاں آنے لگیں گی تو روز روز کی تبدیلیوں سے تو خود ہی تنگ آ جائے گی!"

"پگلی! تو بھی کیا دقیانوسی باتیں کرتی ہے۔ امریکہ والے تو چاند کے بعد مریخ پر جانے کی کوشش کر رہے ہیں اور تو بس دو اور دو چار کے چکر ہی میں پڑی ہے!"

"وقت آنے دو تم بھی چار سے آگے کچھ اور سوچنے کی ساری صلاحیتیں کھو بیٹھو گی!"

"دیکھ لینا تم بھی!"

"زندگی رہی تو ضرور دیکھوں گی اور تب خیریت پوچھوں گی۔"

لیکن یہ کیا؟ —— بھلا یہ کیسی تبدیلی ہے؟ میں کب چاہتی تھی کہ ڈیڈی اس طرح چپ چاپ چل بسیں۔ رات کو اچھے بھلے سوئیں تو صبح اٹھنے کی بھی مہلت نہ ملے۔ نہیں نہیں میں نے ایسی تبدیلی کبھی نہیں چاہی۔ کیا ہو گیا میرے خدا اب تو اس دنیا میں میرا کوئی بھی نہ رہا! بس ایک ڈیڈی کا سہارا تھا وہ بھی چھن گیا —— یہ پہاڑ سی زندگی کس طرح بسر ہو گی؟

"رخشی! میں اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی ہوں۔ ماں کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا، ڈیڈی تھے وہ بھی چلے گئے۔ بڑی سی کوٹھی کاٹنے کو دوڑتی ہے بہت خوف محسوس ہوتا ہے۔ ہفتوں ہو گئے ہیں میں ایک رات بھی چین سے نہ سو سکی۔ یا تو خود ہی چلی آؤ یا مجھے ہی اپنے یہاں بلا لو۔ کچھ دن تو میرا دل تو بہلے گا۔ اب یہ پہاڑ سی زندگی تنہا نہیں گزاری جاتی!"

اور اب جب میں رخشی کے یہاں آ گئی ہوں تو کہیں آنے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ جی چاہتا ہے سارا دن کمرے ہی میں پڑی رہوں۔ لیکن نہ رخشی ایسا کرنے دیتی ہے نہ ارشد۔ اور رخشی کے بچے۔ توبہ توبہ! آفت ہیں آفت! مستقل عذاب!!

"انٹی دیکھیے ڈیڈی کتنی اچھی سی گڑیا لائے ہیں!"

"ارے یہ تو بالکل تیری طرح ہے!"

"مجھ میں بھی کیا کوئی گڑیا ہوں!"

"ارے تو تو گڑیا ہے ہی!" اور میں اسے پیار کر لیتی ہوں۔

"اونہہ آپ نے میرے گال گندے کر دیئے!"

"چلو دھو دوں!"

"نہیں نہیں آپ ایسا نہ کریں۔"

"کیوں؟"

"ممی ماریں گی۔"

"ممی کیوں ماریں گی؟"

"آپ کے کپڑے بھیگ جائیں گے۔ دیکھتی نہیں کہ ممی خود سے منہ ہاتھ دھونے ہی نہیں دیتیں۔"

اور وہ ارشد صاحب —— توبہ ——

"کہیے کیا ہو رہا ہے؟"

"کمرے میں پڑے رہنے کے سوا اور کام ہی کیا رہ گیا ہے۔"

"کبھی کمرے سے باہر نکل کر باہر کی زندگی کا بھی لطف اٹھانے کی کوشش کیجیے۔"

"اب تو بس اس کمرے ہی سے دل لگ گیا ہے۔"

لیکن مجھے کمرے سے نکلنا ہی پڑا۔ ارشد کے چھوٹے بھائی امجد میاں آ گئے۔ امجد میاں کیا آئے جیسے سارے گھر میں بھونچال سا آ گیا۔

"انٹی انٹی دیکھو انکل آئے ہیں!"

"آئے ہیں تو میں کیا کروں۔"

"ارے دیکھو تو ان کے کتنے خوبصورت گورے چٹے ہیں!"

"مجھے چھوڑ دے فرحت پریشان نہ کر ورنہ مار بیٹھوں گی۔"

"اچھا تو آپ مجھے ماریں گی؟"

"بدتمیزیاں کرو گی تو ضرور مار کھاؤ گی!"

لیکن یہ کیا؟ —— یہ تو رونے لگی۔ "ارے اب چپ ہو جا۔ چپ ہو جا بیٹی! میں تجھے ٹافیاں دوں گی، کھلونے لا دوں گی، اچھی سی گڑیا بنا دوں گی۔ گڑیا کی شادی رچاؤں گی۔ تو گیت گائے گی میں ناچوں گی، تیرے ڈیڈی ڈھول بجائیں گے!"

"تو پھر چلو میرے انکل کو دیکھ لو!"

"اچھا بابا چل۔"

"دیکھو انٹی یہ ہیں میرے انکل۔ میں کہتی نہ تھی کہ بہت خوبصورت ہیں۔"

# وصل

پرنسپل جوگندر پال ایم۔ اے

پاک ولا، مقبرہ روڈ۔ اورنگ آباد دکن (مہاراشٹر)

برادرم خوشتر صاحب! آداب

... لیجئے اپنی نئی کہانی "وصل" بھیج رہا ہوں۔ پڑھی لکھی کہانیاں عام طور پر بھاری بھاری ڈگ اور گاؤن پہن لیتی ہیں کہ ہماری یونیورسٹیوں کے بیشتر وائس چانسلروں کی طرح بوڑھی اور پُروقار معلوم ہوں، مگر "وصل" کا بانکپن آپ کے قارئین کو بے اختیار اپنی طرف متوجہ کرے گا۔

بہترین خواہشات کے ساتھ

آپ کا ——— جوگندر پال

میں چالیس سے اوپر پہنچنے کو آ رہا ہوں مگر ابھی تک کنوارا ہوں، کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ شادی کے بعد میرا اپنا آپ مجھ سے چھن جائے گا۔ مجھے اپنے آپ سے اتنی محبت ہے کہ ایک پل بھی اپنے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ایک بار ایک لڑکی مجھے بھا گئی (شاید اس لئے بھا گئی کہ اس کی شکل لیرا سے بہت ملتی جلتی تھی ——— مگر پھر میں نے لیرا کو قبول کیوں نہ کر لیا؟) اس لڑکی نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔

"نہ بابا، مانا تم بڑے خوبصورت ہو پر میں تم سے شادی نہ کروں گی!"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں تو تمہیں دیکھنے کے لئے تمہاری طرف دیکھوں گی مگر تم میری طرف اس لئے دیکھو گے کہ میری آنکھوں میں اپنا چہرہ دیکھ سکو۔"

"تو کیا ہرج ہے؟"

"بڑا ہرج ہے۔ تم اپنے آپ سے محبت کرتے رہو گے تو مجھ سے پیار کون کرے گا؟ کوئی اور آدمی؟ اگر یہی بات ہے تو خواہ مخواہ گناہ کرنے کی بجائے میں اُسی آدمی سے شادی کیوں نہ کر لوں؟"

اس لڑکی کے خیال کو دل سے نکال کر مجھے بالکل افسوس نہ ہوا۔ جو شخص ایک لمحہ کے لئے اپنے آپ سے جدا نہیں ہوتا اور جہاں بھی جاتا ہے وہاں ہمیشہ اپنے ساتھ ساتھ رہتا ہے کہ کہیں اتفاق سے اپنے آپ کو کھو نہ دے، وہ اتنا بے پروا کیسے ہو سکتا ہے کہ آنکھیں میچ کر اپنے آپ کو ایک ناتجربہ کار لڑکی کے سپرد کر دے، "یہ لو سنبھال لو مجھے!"

اور یہ لڑکیاں ہمیں سنبھال لینے کی ذمہ داری صرف اس لئے قبول کرتی ہیں کہ ہمیں ساری عمر خرچ کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ ہماری پائی پائی خرچ ہو جائے، ہمارا نام و نشان باقی نہ رہے!

ایک خوش رنگ خاتون نے مجھے بتایا تھا: "تم مرد لوگ دراصل ہمارا کیپیٹل ہو جسے ہم کام میں لا لا کر ایک کے دو یا دس بناتی ہیں۔ ہم نہ ہوں تو تم آپ سے آپ گھٹ گھٹ کر ختم ہو جاؤ۔"

"اور ہم نہ ہوں مادام، تو؟"

"تو کیا؟ کام کرنے والے زندہ رہیں تو سرمایہ اپنے آپ فراہم ہوتا رہتا ہے۔"

لیجئے، آپ ہوں نہ ہوں، ان کی بلا سے ——— آپ بڑے شوق سے ان خود غرضوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کر تھکتے رہئے، مجھے تو ان سے کوئی غرض نہیں۔ میری غرض صرف اپنی ذات سے ہے۔ اپنی ذات کے لئے میں اپنی جان دینے کو بھی تیار ہوں!

(میں شہر کے کس حصے میں آ نکلا ہوں؟ ——— چلو اور تھوڑی دور جا کے گھر لوٹ جاؤں گا)

مجھے آئینہ دیکھنے کا بہت شوق ہے، اِتنا کہ اپنے سامنے آئینہ نہ رکھا ہو تو بھی صاف نظر آتا ہوں۔

"ہیلو نیرج!"

"ہیلو نیرج!"

"تم مجھے بڑے سویٹ معلوم ہوتے ہو۔"

"اور تم مجھے!"

"تم بہت اچھے ہو نیرج!"

"اور تم بھی نیرج!"

اور میں آئینے کو اِتنا قریب لے آتا ہوں کہ میری شکل اوجھل ہو جاتی ہے۔ اپنی شکل کو ذرا دُور سے تو دیکھ سکتا ہوں، مگر اپنے اِتنا قریب آ کر دُور دُور تک اپنے آپ کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ بس یہی ایک صورت ہے کہ اپنی ذات کو کچھ فاصلے پر شیشے میں اُتار کر رکھ لیجئے اور اس سے اِس طرح ملئے جیسے کسی اجنبی سے اپنے ڈرائنگ روم میں مل رہے ہوں۔

"ہاؤ ڈو یو ڈو؟"

"ہاؤ ڈو یو ڈو؟"

یہ کوئی ملاقات ہے؟

میں اپنے پڑوسی سے ہر روز صبح و شام ملتا ہوں۔

"ہاؤ ڈو یو ڈو، مسٹر شام لعل؟"

"آئی ایم آل رائٹ، تھینک یو، مسٹر نیرج!" حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ جوڑوں کے درد سے اُسے ایک قدم اُٹھانا بھی موت سے کم نہیں معلوم ہوتا۔

کیا میں واقعی شام لعل سے مِل کر اُس سے ملاقات کر لیتا ہوں؟

حقیقت یہی ہے کہ ابھی تک ایک بار بھی شام لعل سے یا اپنے آپ سے ملاقات نہ ہوئی۔ میں اپنے عشق میں بُری طرح مبتلا ہوں اور میں نے اپنے ہجر میں ساری عمر کاٹ دی ہے۔ اِتنے طویل فراق میں تو بڑے بڑے عاشق مر کھپ جاتے ہیں، یا زندگی کے آداب یاد کرنے کی خاطر اپنا عشق وِشق بھول جاتے ہیں، مگر میں اپنی ضد پر اُسی طرح اَڑا ہوا ہوں۔

لیرا بـــــ لی ـــــ! فراق کا ذِکر آتا ہے تو یہ بے چین لڑکی کہیں سے دَوڑ کر میرے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ میری طرف بے اختیار بڑھی تھی مگر میں نے اُسے جھٹ 'نو اِنٹری' کا بورڈ دکھا کر روک دیا تھا (میری دائیں طرف سڑک کے کنارے 'نو اِنٹری' کا بورڈ لگا ہوا ہے اور وہ موٹرِسٹ اپنی گاڑی روک کر شاید سوچ رہا ہے کہ قانون توڑ کر یہیں سے داخل ہو جائے یا پُورے دو میل کا چکر کاٹ کر پچھلی طرف سے اِس سڑک میں داخل ہو؟)

لیرا نے بہت کوشش کی تھی کہ میں اُسے اپنی زندگی میں داخل ہو جانے دوں۔

(ہٹ کے بابو! — تانگے والے کی آواز سُن کر میں لپک کر سڑک کی ایک طرف ہو کر چلنے لگا ہوں۔)

یہ بات نہیں کہ لیرا مجھے اچھی نہ معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی طرف کھنچنے کا سبب اصل میں یہ تھا کہ وہ اِتنی اچھی کیوں معلوم ہوتی ہے۔ کئی بار تو اُسے دیکھ کر میں اپنا آپ بھی بھول جاتا۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا تھا؟

"نیرج، مجھے معلوم ہے تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔"

"مجھے تو یہ معلوم نہیں لیرا!"

"میں جو کہہ رہی ہوں ـــــ"

تو کیا محبت کرنے والے کو اپنے حواس پر اِتنا قابو بھی نہیں رہتا کہ وہ اپنی خواہش کا تعین کر سکے؟ میں لیرا کا شوہر بننا چاہتا تھا یا اپنی مرضی کا مالک؟

ـــــ میں لیرا سے پرے ہٹنے لگا۔

"میری طرف دیکھو نیرج! کیا میں تمھارے قابل نہیں؟" وہ رو پڑی۔

عورتیں جذباتی ہو جائیں تو مجھے بے وقوف معلوم ہوتی ہیں۔ میں ہنسنے لگا: "نہیں لیرا، تم اپنے قابل بنو، مجھے اپنے قابل بننے دو۔"

"یُو! ـــــ مجھے تم سے نفرت ہے!" بالآخر وہ جھلا گئی۔

"یہ بات نہیں لیرا!"

اُس کی برہم ہنسی نے مجھے ٹوک دیا۔

"تم مرد نہیں، میرے رقیب ہو! عورت ہو ـــــ نہیں، بیک وقت مرد اور عورت ہو! اِس لئے اپنے آپ سے محبت کا دم بھرتے ہو۔"

"لیرا!"

وہ مجھے چھوڑ کر جا رہی تھی۔

لیرا کو کھو کر مجھے خوشی ہوئی مگر یہ بھی محسوس ہوا کہ میں نے کچھ کھو دیا ہے۔

"کیا کھو دیا ہے؟" میں نے اپنے آپ سے پُوچھا۔

"اپنی حماقت!"

میں اپنے سوا کسی سے محبت نہیں کرتا۔ میں اپنا آئیڈیل خود آپ بننا چاہتا ہوں۔ مجھے کسی اور آئیڈیل کی ضرورت نہیں۔ کسی سے محبت کر کے میں اپنے اور اپنے درمیان خلل کیوں پیدا کر دوں؟

"محبت سے خلل پیدا نہیں ہوتا۔" راجیش مجھے اکثر سمجھاتا ہے "اپنے آپ کو محبوبہ کے تصور میں لیکس کر دو گے تو تمہاری کمزوریاں گھٹنے لگیں گی اور تم اپنے اعصاب پر قابو پا لو گے اور اپنے مشاغل پر تمہارا کنٹرول آسان ہو جائے گا۔"

"کیا تم نے کبھی کوئی آٹو موبیل بھی دیکھا ہے؟"

"کیا تم واقعی انسان ہو؟"

"بکواس بند کرو، میں تمہاری طرح ذہن سے عاری نہیں۔"

"مگر یہ تو ماننا ہو گا کہ ذہن سے عاری ہو، میری طرح نہیں ——— ارے بھائی میرے! محبت کے بغیر تم سوچ کیسے سکتے ہو؟ یہ تو نہیں کہ تمہاری سوچ سدا اپنے آپ ہی کو سوچتی رہتی ہے یعنی کچھ بھی نہیں سوچتی ———"

"سوچنے و چنے کو چھوڑو، بات محبت کی ہو رہی تھی۔" "کبھی بار مجھے شک ہوتا ہے کہ میں محبت سے اِس لئے بھاگتا رہتا ہوں کہ اِس سے بھاگ ——— بھاگ کر اِس کے قریب آ جاؤں۔"

"میں محبت ہی کی بات کر رہا ہوں۔ پورے چالیس برس اپنے آپ سے لپٹ کر گزار چکے ہو۔" (راجیش کی ججمنٹ میں کتنا سفاک غیر شخصی پن ہوتا ہے!) "اب باہر نکل کر جینا شروع کر دو۔" (اب!) "اگر بالکل مر نہیں گئے ہو تو اب بھی کسی سے محبت کر لو۔ اپنے بارے میں سوچنا بند کر دو۔ آل الف اور نو کے بارے میں سوچو ——— میں تو اپنے خالی خولی سینے پر بازوؤں کو اِس لئے کس لیتا ہوں کہ اِس میں میرا محبوب بسا ہوا ہے۔"

(چلتے چلتے میں اچانک ایک عورت سے ٹکرا گیا ہوں اور معذرت کی پیش کش کے لئے اپنے ذہن میں ڈھونڈنے کی بجائے وہیں رُکا رہ گیا ہوں اور ——— اور مسکرا دیا ہوں اور وہ عورت بھی مسکرا دی ہے)

تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ میں ابھی بالکل نہیں مرا۔ پچھلے دو ایک سال سے یہ ہو رہا ہے کہ کوئی عورت میری طرف ذرا بھی متوجہ ہوتی ہے تو میں خوش ہو جاتا ہوں، اِس لئے نہیں کہ میں بھی اُس کی طرف متوجہ ہو جاؤں، بلکہ اِس لئے کہ اُسے اپنی طرف متوجہ پا کر مجھے بھی اپنی توجہ کا مرکز بننے کا حیلہ مل جاتا ہے۔ میرے سب ہم عمر جان پہچان والوں کی عمارت اب آئے دن مرمت کے بغیر ٹھیک نہیں معلوم ہوتی مگر میرا اور یکھل رنگ روغن ابھی قائم ہے۔ ابھی ———

"نیرج!"

میں نے مُڑ کر دیکھا ہے۔ وہی عورت میرا نام پکار رہی ہے جس سے ابھی ابھی میری مڈ بھیڑ ہوئی ہے۔

"ارے تم؟!" جیسے نیرا میرے باطن کے اِس موڑ پر مجھ سے ملنے کے لئے اُسی دن سے میرا انتظار کر رہی ہو جب وہ مجھ سے جُدا ہوئی تھی۔

کیا یہ ممکن ہے؟ "تم یہاں کہاں؟"

جب وہ مجھ سے جُدا ہوئی تھی تو ایک بے چین سی لڑکی تھی اور اب؟ ایک اُداس عورت، جس کی خوبصورتی کا باعث اُس کی اُداسی ہو۔

(یہ اجنبی سڑکیں مجھے اِتنی مانوس معلوم ہونے لگی ہیں کہ بے اختیار گھر یاد آ گیا ہے)

نیرا اور میں یہاں سڑک کے کنارے ایک دوسرے کے آمنے سامنے جُڑ کر کھڑے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے ہوئے ہیں اور میری سوچیں میرے ذہن کی چوٹی کے کناروں کی طرف بڑھ کر نیچے ڈھلوانوں پر بہنے لگی ہیں اور میدانوں کی زمین کی رگیں جو سُوکھ سُوکھ کر بے ربط ہو چکی تھیں سیراب ہو ہو کر از خود جُڑنے لگی ہیں۔ بنجر زمین کا ربط اُس کے اندر ہی اندر قائم ہو گیا ہے اور وہ بنجر نہیں رہی، اور اُسے محسوس ہونے لگا ہے کہ وہ صرف اپنا آپ ہی نہیں، ساری زمین کی زرخیزی بھی اُسی کی ہے، جہاں جہاں زندگی آباد ہے، وہی ایک زندگی ہے۔

نہیں، میں اِس سیلاب میں ڈوب رہا ہوں۔ میں نے خود کو بچانے

...اس نے میری طرف دوڑنے کی کوشش کی ہے، مگر پانی اوپر چڑھ گیا ہے اور میں حماقت سا کھڑا ہوں کہ خواہ مخواہ پھنس گئے — مگر نہیں، حماقت آدمی کو اتنا خوش نہیں کرتا ہے، یا کہیں میرا حماقت ہی میری خوشی کا سبب تو نہیں؟

"تم اتنے سال کہاں رہیں لیرا؟"

"اپنے شوہر کے پاس۔"

"تمہارا شوہر —"

"ہاں، میرا۔ میں نے یہ تمام عرصہ اپنے شوہر، دو بچوں اور تمہارے یعنی تمہارے خیال کے ساتھ بسر کیا۔"

"اور اب؟"

"اب میرا شوہر چل بسا ہے۔"

"اور اب؟"

"اب میں تمہارے، اپنے بچوں اور اپنے شوہر یعنی اس کے خیال کے ساتھ باقی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔"

ہم دھیرے دھیرے سڑک پر چل رہے ہیں، جیسے زندگی کا کوئی بے سمت سفر طے کر کے اپنی منزل کی سمت دریافت کر رہے ہوں۔ وہ دھیرے دھیرے رو رہی ہے، شاید اس خوشی سے کہ جب یہ سفر شروع نہ ہو سکا، نہ سہی، اب تو شروع ہو گیا ہے، اور میری سوچیں دھیرے دھیرے میرے ذہن کی چوٹیوں سے بہہ بہہ کر مجھے نہلا نہلا کر اُجلا کئے جا رہی ہیں۔

"جب ہم جدا ہوئے تھے لیرا، تو تم اکیلی تھیں اور آج کئی سال بعد لوٹی ہو تو اپنے بچوں اور مرحوم شوہر کے خیالوں کو ساتھ لائی ہو —" لیرا کی غمزدہ بشاشت اچانک سہم گئی ہے اور میں نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ہے۔ "ڈرو نہیں لیرا — میں نے تمہارے خیال کو ہمیشہ پرے پرے رکھا ہے، اس لئے پرے پرے رکھا ہے کہ اپنے قریب رہوں۔ لیکن میرے چہرے کی طرف دیکھو۔ کیا مجھ سا تنہا آدمی کبھی تمہارے دیکھنے میں آیا ہے؟ اپنے قریب سرک سرک کر مجھے ہمیشہ وہاں کوئی نہ ملا۔ کون ملتا؟ اپنی ذات کی ویرانی میں میں اپنے آپ کو بے سُود ڈھونڈتا رہا، ہمارے اندر ہماری مشین کے سوا اور کیا رکھا ہے؟ — ہم تو اپنے وجود کے باہر ہوتے ہیں، اپنے آس پاس، ہماری ذات ہماری نظر ہی سے وجود میں آتی ہے —"

لیرا کی طرف دیکھ دیکھ کر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں سنِ شعور کو پہنچ رہا ہوں اور ہمارا بیاہ ہو رہا ہے اور ہماری خاموشی سنسکرت کے اشلوک بول بول کر ہمارے اندر ایک طربیہ ردھم پیدا کر رہی ہے۔

میں لیرا کو ساتھ لئے ایک پارک میں داخل ہو گیا ہوں، جیسے میری ذاتی زندگی کا دروازہ اسی پبلک پارک میں کھلتا ہو۔

"ویل کم سویٹ لیرا، ویل کم سویٹ لیرا کے بچو، ویل کم، میری سویٹ لیرا کے مرحوم شوہر! آؤ سب آؤ! یہ پارک ہم سب کے لئے بہت بڑا ہے۔ وامور، وامیر تر!"

اس گھنے درخت کی اوٹ میں پہنچ کر میں لیرا کو گلے لگا لوں گا۔ میں دل ہی دل [illegible] اس کے خوبصورت ریشمیں بالوں کو چوم رہا ہوں — اور لیرا کے بالوں [illegible] چوم چوم کر آج پہلی بار اپنے آپ سے ملاقات کر رہا ہوں! اپنے آپ سے مل رہا ہوں!!

چندر پرکاش جوہر بجنوری

جب کبھی اُن سے نظر ملائی ہے | دل نے تازہ حیات پائی ہے
ہر قدم پر شکست دے کے مجھے | ہم نے ہمت مری بڑھائی ہے
دیدنی ہے یہ جلوہ ہی جلوہ | کیا مرا عالمِ جُدائی ہے
غمِ دوراں سے نیم جاں ہو کر | غمِ جاناں تری دہائی ہے

اس جہانِ خراب میں جوہر
غم ہے اپنا موضوعِ چہرائی ہے

چندر پرکاش جوہر بجنوری

# ہمسفر

سہیل آذر

کیرآف حکیم حبیب احمد صاحب نینی تال روڈ ۸۲ تال پورہ۔ بہیڑی ضلع بریلی
مکرم و معظم! تسلیمات
"بیسویں صدی" کے میر کارواں کی خدمت میں "ہمسفر" لے کر حاضر ہوا ہوں۔ اگر اسے بھی اپنے ادبی کارواں میں شریک کر لیں تو بڑا کرم ہو۔ "ہمسفر" کیسا ہے؟ یہ تو آپ ہی کی ادب نواز نگاہیں بتا سکیں گی یا پھر "بیسویں صدی" کے بلند ذوق قارئین!...
نیاز آگیں ——— سہیل آذر

★

نینی تال ایکسپریس کے چھوٹنے میں صرف چند منٹ باقی تھے۔

میں نے جلدی جلدی صراحی میں پانی بھرا اور تیز قدموں سے اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف چل پڑا۔

دُور پلیٹ فارم کے آخری سرے پر سبز لائٹ چمکتی نظر آ رہی تھی۔

انجن کی وِسل کے ساتھ ہی پلیٹ فارم پر مسافروں کی بھیڑ چھٹنے لگی۔ لوگ خرید و فروخت چھوڑ کر عجلت کے ساتھ اپنے ڈبّوں کی طرف لپک رہے تھے۔

میں نے چار باغ اسٹیشن پر الوداعی نظر ڈالی اور دروازہ بند کرنے کے بعد صراحی ہاتھ میں لئے ہوئے اپنی سیٹ کی طرف چل دیا۔

سیٹ پر نظر پڑتے ہی میں چونک اُٹھا۔

میرے بستر پر ایک محترمہ پیر لٹکائے براجمان تھیں۔

میں اُس لڑکی کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

سُرخ سفید رنگت، فراخ پیشانی، جھیل کی طرح گہری گہری کشادہ آنکھیں، نوکیلے کانٹوں جیسی پلکوں کی گھنی جھالریں، نازک اور رسیلے ہونٹ، نُور کے سانچے میں ڈھلا ہوا گُداز جسم! بڑے بڑے خوبصورت پھولوں والے ٹیڈی کٹ جمپر اور چُست پاجامے میں وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔

اُس نے اپنی لانبی لانبی پلکیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میری نگاہیں لڑکھڑا گئیں۔

اُس کے خوبصورت لبوں پر دلآویز تبسّم رقص کر رہا تھا۔

"کیا یہ آپ کی سیٹ ہے جناب؟" ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میں نے مُڑ کر آواز کی طرف دیکھا۔

میرے سامنے والی سیٹ سے ایک صاحب مجھ سے مخاطب تھے۔

"جی ہاں" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"اوہ!" وہ مُسکرائے اور اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

"آپ یہاں آ جائیے" انھوں نے لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکی نے اُن کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی کے ساتھ میری سیٹ سے اُٹھی اور اُن کے برابر جا کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ صراحی کو سیٹ کے نیچے رکھنے کے بعد میں اپنی سیٹ پر قابض ہو گیا تھا۔

ٹرین پوری رفتار کے ساتھ بھاگی چلی جا رہی تھی۔

نومبر کے مہینے کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔ سردی کا موسم کسی نوخیز دوشیزہ کی طرح انگڑائی لے رہا تھا۔ خنک ہوا سے بچنے کے لئے میں نے کھڑکی کے شیشے نیچے گرا دئے اور جیب سے سگریٹ نکال کر سُلگانے لگا۔

"آپ شاید نینی تال جا رہے ہیں؟" اُس مرد نے پھر مجھے مخاطب کیا۔

"جی نہیں" میں نے لائٹر کا شعلہ سگریٹ کے قریب لاتے ہوئے کہا۔ "مجھے

## محبت

محبت دو نگاہوں کے تصادم کا نتیجہ ہے
یہ آتش مرد بھڑکی شعلہ ہے جو بجھائی نہیں جاتی ——— اختر شیرانی

محبت خامشی بھی ہے بھی نغمہ بھی نعرہ بھی
یہ اک مضمون ہے کتنے ہی عنوانوں سے وابستہ ——— حفیظ میرٹھی

محبت کیا ہے تاثیر محبت کس کو کہتے ہیں؟
ترا مجبور کر دینا مرا مجبور ہو جانا ——— جگر مرادآبادی

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے ——— غالب

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا ——— مخمور دہلوی

مرسلہ: کشور سلطانہ، بستی کرت پور، بجنور

صرف ناشتہ ہی تو کیا ہے۔"

"لکھنؤ سے کتنی دور ہے؟" اُس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہی کوئی تین سو پچاس کلو میٹر۔" میں نے سگریٹ کا دھواں منہ سے چھوڑتے ہوئے بے پروائی سے جواب دیا۔

وہ خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں جوتے اُتار کر بستر پر دراز ہو گیا اور کمبل سے اپنے پیروں کو ڈھانکنے کے بعد تکیے کے نیچے سے فلم فیئر کا تازہ شمارہ نکالا اور بلب کی مدھم روشنی میں لیٹے لیٹے پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ میرا دھیان ابھی تک اس حسین جوڑے کی طرف تھا۔ میرا خیال تھا، یہ دونوں میاں بیوی ہیں اور اپنی منزل کی طرف ایک ساتھ سفر کر رہے ہیں ——— زندگی کا سفر!

تھوڑی دیر بعد میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔

میں نے میگزین کی اوٹ لے کر کنکھیوں سے دیکھا۔ مرد اپنا ٹفن کیریر کھول رہا تھا۔ کھانے کا ڈبہ لڑکی کی طرف کھسکاتے ہوئے اُس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"لو ذرا تھوڑا بہت کھا لیا جائے۔"

"جی نہیں شکریہ۔" لڑکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔ آپ کھا لیجیے۔"

"اب کھا بھی لو۔" وہ نہایت بے تکلفی سے اُس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا "اتنا لمبا سفر ہے اور پھر رات کو بھوکا رہنا ٹھیک بھی نہیں۔" وہ محبت پاش نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"نہیں آپ ہی کھا لیجیے!" وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔

"آپ کے بغیر تو میں کھانے کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا!" اُس نے فیصلہ کن انداز سے کہا اور برتن سمیٹنے لگا۔

"ارے آپ تو ناراض ہو گئے!" لڑکی نے جلدی سے اپنی خوبصورت کلائی بڑھا کر اُس کے ہاتھوں کو پکڑ لیا۔

"اچھا لیجیے۔ آپ کی خاطر میں بھی تھوڑا بہت کھا لیتی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی۔ پھر وہ کھانے میں مشغول ہو گئے۔

میں دل ہی دل میں اُن کی خوشگوار ازدواجی زندگی پر رشک کرنے لگا۔ کتنا خوش قسمت ہے میرا یہ ہم سفر! کیسی حسین و جمیل اور محبت کرنے والی بیوی پائی ہے اِس نے! میں سوچنے لگا کتنا پیار کرتے ہیں یہ دونوں ایک دوسرے سے! اے کاش . . . میں نے سوچتے سوچتے میگزین بند کر دیا اور اُس خوش قسمت جوڑے کو دلچسپی اور رشک بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ سیٹ پر ایک دوسرے کے بالکل قریب آ بیٹھے تھے۔

کمپارٹمنٹ کے دوسرے مسافر نیند سے اونگھ رہے تھے۔ میں نے بھی بظاہر آنکھیں بند کر لیں لیکن پلکوں کی اوٹ سے برابر اپنے ہمسفر جوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

ٹرین کے مسلسل آہنگ نے شاید لوری کا کام کیا تھا۔ یا غذا کا خمار تھا۔ کیونکہ میں نے دیکھا تھوڑی ہی دیر کے بعد لڑکی کی بڑی بڑی غلافی پلکیں بند ہونے لگی تھیں اور گردن نرم و نازک شاخ کی طرح لچک کر بار بار مرد کے کندھے سے ٹک جاتی۔ لیکن فوراً ہی وہ چونک کر آنکھیں کھول دیتی اور پھر سنبھل کر بیٹھ جاتی۔ کچھ دیر تک تو میں دلچسپی کے ساتھ کنکھیوں سے دیکھتا رہا پھر میری بھی آنکھ لگ گئی۔

قلیوں کی چیخ پکار سے تھوڑی ہی دیر کے بعد میری نیند کھل گئی اور میں چونک کر اُٹھ بیٹھا۔

ٹرین شاید سیتاپور کے اسٹیشن پر آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

میری نظر سامنے والی سیٹ پر پڑی تو دیکھا کہ وہ دونوں اب ایک

سیٹ پر سو رہے تھے۔ مرد کا سر سیٹ پر ایک طرف تھا اور عورت کا دوسری طرف۔

میں نے ایک نظر دیکھ کر دوسری طرف کروٹ لے لی۔ بے خبر سوتے ہوئے جوڑے کو دیر تک اس طرح بے باکی سے دیکھتے رہنا مجھے اخلاقی جرم معلوم ہو رہا تھا۔

کمپارٹمنٹ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

دوسری بار میری آنکھ کھلی تو ٹرین بھوپال یارڈ میں داخل ہو رہی تھی۔ میرے وہ دونوں ہمسفر بھی جاگ گئے تھے۔ مرد اپنا ایئر بیگ درست کر رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر صبح کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ میں جماہی لے کر اٹھ بیٹھا۔ حواس یکجا ہوئے تو میں نے اپنے سر کے بالوں کو درست کیا۔ پھر بیگ سے تولیہ نکالنے کے بعد بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جوتے پہن کر میں باتھ روم کی طرف چل پڑا۔

کچھ دیر بعد جب میں ہاتھ منہ دھو کر باتھ روم سے نکلا تو وہ اس وقت اپنی سیٹ پر تنہا بیٹھی تھی۔ مرد شاید کسی ضرورت سے پلیٹ فارم پر گیا ہوا تھا۔ میں نے تولیہ تہہ کر کے بیگ میں رکھ دیا اور چائے کی تلاش میں پلیٹ فارم پر نگاہ دوڑانے لگا۔

"کمبخت کوئی چائے والا ابھی اِدھر نہیں ہے۔" میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔

ٹرین چھوٹنے میں چند منٹ باقی تھے۔

"سُنئے جناب!" میں نے چونک کر گردن اوپر اٹھائی۔ وہ میری طرف متوجہ تھی۔

"وہ سامنے کینٹین نظر آ رہا ہے۔" اس نے کھڑکی سے باہر پلیٹ فارم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ ایسا کیجیے کہ یہ تھرموس لے جائیے اور دو پیالی چائے اس میں بھروا لیجئے۔" وہ نہایت شُستہ لہجے میں بات کر رہی تھی۔

میں نے ایک بار اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور پھر اس کے ہاتھ سے تھرموس لے لیا۔

کچھ دیر بعد بیٹھے ہم چائے پی رہے تھے۔ میں اپنے لئے مٹی کا ایک سکورہ بھی لیتا آیا تھا۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا کہ "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" تھرموس کے گلاس میں چائے انڈیل کر اس نے میری طرف بڑھا دی۔

# ارمان

سر ہو ترے زانو پہ اور جان نکل جائے
مرنا تو مسلّم ہے ارمان نکل جائے ——— میر سوز

کافر ہوا گر وصل کا ارمان ہو دل میں
مجھ کو تو فقط دیکھنی تھی بات کسی کی ——— بیخود دہلوی

دیر ہو جائے بلا سے انہیں آرائش میں
رہ نہ جائے کسی کمبخت کا ارماں کوئی ——— داغ

خواہش مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ
دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا ——— مومن

میرے ارمانوں پہ جلتے ہیں جو صورت سے مری
ان کی صورت سے نمایاں مرے ارماں ہوں گے ——— نا معلوم

مرسلہ: ایس۔ ایس۔ پنکھا، ایم اے۔ بنگلور

"لیجئے نا!" وہ نہایت بے تکلفی سے بولی۔ "آپ پاس ہی بیٹھئے۔ میں بھی پی لوں گی۔"

میں نے جھجکتے ہوئے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میرا سر دو ایک لمحے کے لئے اس کی دہکتی ہوئی خوبصورت انگلیوں سے مَس ہو گیا۔

اس نے ایک لمحہ کے لئے میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور پھر مڑ کر تھرموس کے ڈھکن میں اپنے لئے چائے انڈیلنے لگی۔

"لکھنؤ میں آپ کس جگہ رہتی ہیں؟" میں نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"آئی۔ٹی کالج کے ہوسٹل میں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"اوہ! تو کیا آپ پڑھ رہی ہیں ابھی تک؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں تو کیا مجھے پڑھانا چاہیے؟" وہ میرے اس سوال پر ہنس پڑی۔ جیسے میں نے کوئی بہت بڑی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔

"نہیں... میرا مطلب یہ ہے کہ... آپ ہوسٹل میں کیوں رہتی ہیں اور آپ کے ہزبینڈ...؟"

"کیا مطلب آپ کا میرے ہزبینڈ؟؟" وہ حیرت سے بولی اور پھر جیسے سمجھ گئی ہو۔ ایک ثانیہ خاموش رہ کر وہ یکایک مسکرانے لگی: "آپ شاید اُن صاحب کو میرا ہزبینڈ سمجھ رہے ہیں جو ابھی کچھ دیر پہلے تک میرے ساتھ تھے؟" وہ ہنس کر بولی۔

"تو کیا میں غلط سمجھ رہا ہوں؟؟" میں نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"ارے!" وہ بے تحاشا ہنسنے لگی: "آپ بھی کمال کرتے ہیں! اجی صاحب! میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔ اور وہ حضرت؟" وہ ہنستے ہوئے نہایت بے باکی سے بولی: "شوہر تو کجا میرے شناسا بھی نہ تھے۔ دادا ہی کے سامنے اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ حضرت بریلی جا رہے تھے ریزرویشن نہ ہو سکنے کی وجہ سے پریشان تھی۔ انھوں نے اپنی سیٹ آفر کی۔ میں نے سوچا کا تھ گودام تک نہ سہی، چلو کچھ دور تک تو پوری سیٹ مل ہی جائے گی اس ہمسفر کے ساتھ!"

میرے ہاتھوں سے گلاس چھوٹ کر گر پڑا۔

ٹرین پوری رفتار سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی!!

## ایاز جھانسوی

سر جھکائے ہوئے خاموش کھڑا ہے کوئی
کتنے افسانوں کا عنوان بنا ہے کوئی

صبح کی پہلی کرن! تیری تمنا لے کر
رات بھر شمع کی مانند جلا ہے کوئی

جان جائے تو رہائی غمِ دنیا سے ملے
زندگی میری، مرے حق میں سزا ہے کوئی

یہ بھی کیا ترکِ تعلق ہے کہ اب چھپ چھپ کر
حال اِک اِک سے مرا پوچھ رہا ہے کوئی

یہ تعلق کی بھلا کونسی منزل ہے ایازؔ
جانتے بوجھتے انجان بنا ہے کوئی

ایاز جھانسوی

## مہدی پرتابگڈھی

جو درد مجھے تیری عنایت سے ملا ہے
سرمایۂ جاں بن کے مرے ساتھ رہا ہے

بے مہریِ حالات کی ظلمت، ارے توبہ
سائے نے بھی اب ساتھ مرا چھوڑ دیا ہے

پھر کشتیِ دل زد میں ہے طغیانیِ غم کی
پھر ذہن میں طوفان سا یادوں کا اُٹھا ہے

کیوں فاصلے بڑھتے چلے جاتے ہیں دلوں کے
اس دور کی تقدیر میں کیا جانئے کیا ہے

راتیں مری بے تاب ہیں، بے خواب ہیں مہدیؔ
جس دن سے کوئی جانِ وفا مجھ سے خفا ہے

# تیسرا شوہر

نور شاہ

ہسپتال روڈ۔ درگہ جین۔ سرینگر

برادر محترم خوشتر گرامی صاحب باخلوص وآداب

... ڈاکٹر رشنکر رینہ کی کشمیری کہانی کا اُردو روپ سراہا گیا۔ میں چند اچھی اور معیاری کشمیری کہانیوں کو اُردو روپ دے رہا ہوں اور جلد ہی آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں ـــــ لداخ کے پس منظر میں ایک کہانی "تیسرا شوہر" ارسال خدمت ہے۔ اُمید ہے کہانی آپ کو پسند آئے گی۔ آپ کی گراں قدر رائے کا حسب معمول انتظار رہے گا...

آپ کا بھائی ـــ نور شاہ

جب جہاز ایک انوکھا سا زاویہ بنا کر لداخ کی برفیلی چوٹیوں پر پرواز کرنے لگا نیلگوں آسمان کے وسیع آنگن میں سپید سپید بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے ان کے بنتے بگڑتے نقوش میں سے گزرنے لگا تو میں آہستہ آہستہ اپنے خیالوں کے رتھ پر سوار ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا میں ایک بھری پُری کائنات کو پیچھے چھوڑ آیا ہوں، ایک ایسی دُنیا کو جہاں سے اب کبھی میرا گزر نہ ہوگا تنہائی کا زہر ہولے ہولے میری رگوں میں سرایت کرنے لگا۔ اکیلے پن کا ناگ مجھے رہ رہ کر ڈسنے لگا۔ میں نے اپنی نیم وا آنکھیں کھولیں اور دیکھا یہاں نہ ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے ہیں اور نہ پیاسی رُوحوں کو سیراب کرنے والے آبشار ہیں۔ لیکن پھر بھی ایک پُر معنی سی خاموشی ہے، ایک پُر سکون سی چُپ ہے، پہاڑی ڈھلوانوں پر زینہ نما کھیت دیکھ کر محسوس ہوا جیسے پربتوں کو زبان مل گئی ہو اور ان کھیتوں سے لوٹتی ہوئی عورتوں کا ہجوم قطار اندر قطار ایسے نظر آنے لگا جیسے چاند میں نظر نہ آنے والی پریاں دھرتی کی طرف خراماں خراماں قدم اُٹھا رہی ہوں اور جب میرے قدموں نے لداخ کی دھرتی کو چھوا اور میں نے بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر تین سو برس پُرانی نو منزلہ حویلی کے آنگن میں اپنے تنہا ویران قدموں کی چاپ سُنی تو میرے خیالوں کو ایک بار پھر تقویت مل گئی کہ انسان ازل ازل سے تنہا ہے، اکیلا ہے۔ تنہائیوں کا فاصلہ ناپتے ہوئے جب میں نے نویں منزل کے ایک کشادہ کمرے میں قدم رکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے یہ سب ایک خواب ہی تو ہے [illegible] ـــ فرش پر تبتی اور یارقندی قالین بچھے تھے۔ دیواروں پر رنگ و روغن تھا اور ایک قدِ آدم آئینہ دیوار کے ساتھ نصب تھا۔ کرسیاں اور صوفے تھے۔ ایک میز پر چند انگریزی کتابیں تھیں ـــــ اور پھر نرم و نازک سی مٹھاس سے بھرپور ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی ـــــ

"جولے" (آداب)

میرے من مندر کی گھنٹیاں بج سی اُٹھیں اور میرے کانوں میں قطرہ قطرہ شہد ٹپکنے لگا۔ میں نے اپنی پلکوں کو جُنبش دی ـــــ رانی رُوپ متی تھی؟!

"آداب" میں نے کہا۔ میری آنکھوں کی جوت جگمگائی اور تنہائی کا پھنکارتا ہوا ناگ بے موت مر گیا۔ میں نے رانی رُوپ متی کا سراپا اپنی آنکھوں میں جذب کر لیا۔ اُس کی چال میں ایک تمکنت تھی اور اُس کے چہرے پر وقار تھا۔

نہ جانے کیوں اُس کے چہرے کے نقوش میں ڈوب کر مجھے محسوس ہوا یہ عورت اپنے اندر ایک طوفان سا پال رہی ہے۔ اپنے دل کے گوشوں میں تہہ در تہہ راز چھپائے ہوئے ہے۔ مجھے بھرپور لیکن حیران حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے مخاطب ہوئی۔۔

"تم؟"

"سرکاری ملازم ہوں اور سرکاری کام کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔"
"لیکن مجھے تو . . ."
"جی ہاں میں وہ نہیں ہوں جس کا آپ کو انتظار تھا!"
"تم اُسے جانتے ہو؟"
"وہ میرے ساتھی ہیں۔ انھیں کو یہاں آنا تھا لیکن وہ کسی اور کام سے رُک گئے اور مجھے آنا پڑا۔ میں تو اُن کے کہنے پر ہی یہاں . . ."
اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا: "جی ہاں انھیں ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی کام یہاں آنے سے روک لیتا ہے۔"
"شاید ــــــ" میں نے دبے لہجے میں کہا۔
اُس نے قدِ آدم آئینہ میں جھانکا۔ پھر میری طرف دیکھا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں نے اپنی بے قرار نگاہیں کمرے کی ہر ہر شے پر مرکوز کر دیں اور مجھے محسوس ہوا جیسے میں لداخ میں نہیں ہوں۔ تین سو برس پُرانی نو منزلہ حویلی میں نہیں ہوں، کسی سرکاری ریسٹ ہاؤس کے وی۔آئی۔پی رُوم میں غلطی سے گھس آیا ہوں۔ میز پر انگریزی کی جو چند ایک کتابیں تھیں وہ سب سیکس سے متعلق تھیں۔ میں اُن کتابوں کے اوراق اُلٹنے لگا۔ کتنی دیر تک اُلٹتا رہا۔ دفعتاً قدموں کی آواز سُنائی دی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے پر لٹکا ہوا سپید ریشم کا پردہ ذرا سرکا اور دس بارہ سال کی ایک چھوٹی لڑکی اندر آئی۔ اُس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔
"گیا لموے مُبدک"
"میں تمھاری بھاشا نہیں سمجھتا لڑکی!"
اُس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا ــــــ "رانی صاحبہ بُلاتی ہیں۔"
وہ کمرے سے باہر جانے لگی اور میں اُس کے قدموں کا تعاقب کرنے لگا۔ بے شمار سیڑھیاں اُترتے ہوئے وہ دوسری منزل کے ایک کمرے کے سامنے کھڑی ہو گئی اور مجھے اندر جانے کے لئے اشارہ کیا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ادھ کھلا دروازہ کھول دیا۔ اندر کمرے میں اندھیرا تھا۔
"رانی صاحبہ!" میں نے آہستہ سے کہا۔
"میں یہاں ہوں ــــــ ادھر!"
میں آواز کی طرف پلٹا۔ نیم تاریکی میں مجھے کوئی شے حرکت کرتی نظر آئی۔ میں نے جھٹ سامنے کی کھڑکی کھول دی اور ــــــ اور مجھے محسوس ہوا جیسے میں کسی آسیب زدہ کمرے میں ہوں۔ یہ رانی صاحبہ کی خوابگاہ تھی شاید یہاں کی ہر شے بے ترتیب تھی۔ کوئی بھی چیز سلیقے سے نہیں رکھی ہوئی تھی۔ اُلجھاؤ ہی اُلجھاؤ تھے۔ در و دیوار سوگ کی چادر تانے نہ جانے اپنے سینوں میں کتنے راز چھپائے اُونگھ رہے تھے۔
"کھڑکی بند کر دو۔"
میں نے کھڑکی بند نہیں کی۔ رانی صاحبہ کے نزدیک آیا۔ یہ کیسی وہ رانی نہ تھی جس سے میں کچھ دیر پہلے ملا تھا۔ سُرخ سُرخ چہرہ جیسے انار کا رس نچوڑ کر گالوں پر ڈال دیا گیا ہو۔ آنکھیں جیسے شراب سے بھر پور جام چھلکنے کو بالکل تیار۔ اُس نے پی رکھی تھی۔ میں ایک قدم ہٹ آیا اور سوچنے لگا یہ کیسی عورت ہے، ایک دم انبارمل؟!
"کھڑکی بند کر دو!"
"لیکن یہاں اندھیرا ہے اور اندھیرا مجھے پسند نہیں۔"
"تمھاری پسند ناپسند سے میرا کیا تعلق۔ یہاں میرا حکم چلتا ہے؟"
"لیکن ــــــ"
"بند کر دو ــــــ تم نہیں جانتے کہ اِس کمرے میں میرے دو شوہر قتل ہو چکے ہیں!"
میں بے ساختہ کھڑکی کی طرف لپکا اور میں نے دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کے پٹ زور سے بند کر دیئے۔
"میں اچھی عورت نہیں ہوں!"
میں خاموش اندھیرے کو تکتا رہا۔
"پیتا چھن موں مینا سکس کھیوں" (پیتا صاحب کے لئے شراب لاؤ)
باہر ایک بار پھر قدموں کی چاپ سُنائی دی اور وہی لڑکی ایک ٹرے میں دو مٹی کے گلاس اور دو بوتلیں لے کر اندر آئی۔ دروازہ کھلا رہنے سے کمرے میں ذرا روشنی ہوئی۔ لڑکی نے رانی صاحبہ کے سامنے ٹرے رکھ دی اور باہر چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہی رہ گیا۔
"یہاں آؤ!" میں رانی صاحبہ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔
"یہ چھنگ ہے لداخ کی شراب اور یہ . . ." اُس نے قہقہہ لگایا۔
"انگریزی شراب ہے۔"
لفظ انگریزی پر زور ڈالتے ہوئے اُس نے کہا۔
"جی ہاں۔"
"کیا لو گے؟"
"انگریزی" میں نے اُسی لہجے میں جواب دیا۔
اُس نے خود جام بھرا اور میری طرف بڑھانے سے پہلے اُسے اپنے

ہونٹوں سے چھوتے ہوئے کہا۔

"تمہارے نام؟"

"شہپر ہم دونوں کے نام" میں نے کہا۔

میں نے ایک ہی گھونٹ میں سارا گلاس خالی کیا اور رانی صاحبہ کے چہرے میں چھپی کہانی کو تلاش کرنے لگا جو اس کے دو شوہروں کے قتل سے وابستہ تھی۔ لیکن اس کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی شراب پی کر میں سب کچھ بھول بیٹھا اور اب اس کی آنکھوں سے اس کہانی کا سراغ پا سکنے کی بجائے اس کے جسم کے قیامت خیز زاویوں میں کھو گیا۔

"کیوں بیٹھی ہیں آپ؟"

"باتیں کرنے کے لئے ترستی ہوں اور پھر کہ لیجئے آپ سے باتیں کر لیتی ہوں۔"

"آپ کے علاوہ یہاں کون رہتا ہے؟"

"میں اور حویلی کے نوکر ـــــ میرا مطلب نوکرانیوں سے ہے۔"

"کیا یہاں کوئی مرد نہیں؟"

"نہیں۔"

"کوئی خاص بات؟"

"میں مردوں سے نفرت کرتی ہوں۔" اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے دباتے ہوئے کہا ـــــ "اور تم پہلے مرد ہو جو میرے دو شوہروں کے قتل کے بعد یہاں آئے ہو۔"

"اور میرا ساتھی؟"

"وہ بزدل ہے کمبخت۔"

"ایک بات پوچھوں ـــــ آپ کو اس کا انتظار کیوں تھا کیا آپ اس سے محبت کرتی ہیں؟"

اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور مجھے محسوس ہوا جیسے اس کے مقتول شوہروں کی روحیں کمرے میں گھوم رہی ہیں۔

"محبت اور محبت کیا ہوتی ہے بھلا میں نہیں جانتی میں نے نہ پہلے شوہر سے محبت کی اور نہ دوسرے سے ـــــ"

"پھر آپ کو اس کا انتظار کیوں تھا؟"

"میں نے اسے تیسرا شوہر بنانا چاہا تھا۔"

---

دوسرے دن مجھے ادھر سے کچھ دور سرکاری کام کے سلسلے میں جانا پڑا۔

پنڈت گوپی ناتھ امن دہلی سے

سنائیں کس کو محبت کی داستاں اے امن
یہاں تو جو ہے وہ خنجر بہ کف ہے تیغ بدست

ہے ایک عالمِ وحشت کہ الاماں کہیے
کہ ذہن تنگ ہیں چھوٹے ہیں دل نگاہیں پست

وفا کا نام جو لے لو تو تیوریاں چڑھ جائیں
کہ اہرمن سے عقیدت ہے اور دیو پرست

جو مسکراؤ ملاقات میں تو سمجھیں ریا
کرو سلام تو سمجھیں وہ اعترافِ شکست

خلوص نام کی اک شے کبھی رہی ہوگی
مگر ہے آج تو مکر و ریا کا بندوبست

الجھ کے اپنے مسائل میں رہ گیا ہر شخص
کہیں صدا ہے نہ آمین کی نہ ذکرِ الست

جو مصلحت سے گزر کر مصالحت کی ہو سبیل
خدا کرے کہ اک ایسی ہو رہبروں کی نشست

امن

میں کام میں اتنا مصروف رہا کہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو گیا لیکن رانی روپ متی کے دو شوہروں کی داستان میرے ذہن سے چپک کر رہ گئی اور جس دن میں کام سے فارغ ہو کر [illegible] رانی روپ متی کی صورت بار بار نظروں کے سامنے پھر رہی تھی۔ اندھیرے میں بھی تو اس کی خواب گاہ، اس کے شوہروں کے قتل کی داستان بار بار ابھر رہی تھی ـــــ میں نے

حویلی کا رُخ [illegible] لوٹ کر گھر کا رُخ کیا۔ لداخ میں چھنگ عام طور سے پکتا ہے۔ چھنگ کے گلاس پینے کے بعد میں نے گھر کے مالک ترگیس سے ملاق روپ مستی کی بات چھیڑی۔

"بابو جی میں کیا بتا سکتا ہوں۔ کہتے ہیں بڑی سخت عورت ہے۔ کوئی مرد اس سے زیادہ کر ہی نہیں سکتا۔ بڑی گرم اور غصیلی عورت ہے۔ بہت چھنگ پیتی ہے (وہ جیسے امرت پی رہا تھا) کہتے ہیں بابو جی مرد کو مرد نہیں سمجھتی!"

روپ مستی کے بارے میں مجھے اس بوڑھے کا خلق جانکر کچھ ٹھیک معلوم ہوا۔ جتنی ہی اتبار مل عورت ہے تب تو ... میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ شاید یہ بھی ہو کہ اس کے دونوں شوہر قتل نہ ہوئے ہوں۔ انھوں نے خودکشی کی ہو۔ لیکن خودکشی کی وجہ ——؟

میں حویلی کے آنگن کے دروازے سے لوٹ آیا۔ ساری رات روپ مستی کا سراپا نگاہوں میں لہراتا رہا۔ ڈھلتی جوانی میں شاید ہی کوئی عورت اپنے جسم کے دل آویز خطوط اس طرح قائم رکھنے میں کامیاب ہو۔ اس کے چہرے پر جلال ضرور تھا مگر اپنی آنکھوں کی بے قراری چھپانے میں وہ ناکام تھی۔ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے ہی تصور کی آخری حد پھلانگ لی اور ... پھر جذبات و احساسات کی گرمی اونچے پربتوں کی ٹھنڈی یخ بستہ برف میں تبدیل ہو گئی —— قتل؟ دو مردوں کا قتل! میں کیا اور میری بساط کیا! میری نگاہوں کے سامنے میرا اپنا ڈھانچہ بے طرح گھوم گیا!

---

کئی راتوں کی کشمکش کے بعد میں نے ایک شام اپنے آپ کو اس کے سامنے پایا۔ وہ اپنی خواب گاہ میں تھی۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو اس نے تیوریاں چڑھا لیں مگر دوسرے لمحے اس کا چہرہ نرم پڑ گیا۔

"تم پھر آئے —— بیٹھ جاؤ۔"

"بیٹھ جاؤں گا رانی مگر ایک شرط پر!" میں نے اپنی ساری طاقت کو یکجا کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے تمھاری شرط ——؟"

"میں جاننا چاہتا ہوں آخر ایسی کون سی بات ہے جس نے آپ کی زندگی اتنی تلخ کر دی ہے اور جسے آپ اور تلخ کرنے پر بضد ہیں۔"

"تمھیں بیٹھنے کی اجازت ضرور ہے۔ مگر پوچھنے کی اجازت ہرگز نہیں! جو بات میں اپنے آپ سے چھپائے پھر رہی ہوں۔ اسے کسی دوسرے اور اجنبی کے ساتھ کیسے کہہ سکتی ہوں۔"

میں نے دیکھا اس کے لہجے میں سارے جہان کا درد اور کرب سمٹ کر آ رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے گلاس ہماری طرف بڑھایا، ہم ساتھ ساتھ پیتے رہے۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ عورت اتنی شراب پینے کے بعد بھی ہوش میں ہے۔ اس کی زبان میں ایک ذرا سی لکنت بھی نہیں۔ صرف آنکھوں کے پپوٹے بھاری اور بوجھل سے ہو رہے ہیں۔

"سنو ——" وہ دفعتاً بولی۔

"کیا؟"

"جو آدمی اپنی بیوی کو اس کے عورت پن کے احساس سے محروم رکھے اس کے ساتھ کیسا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟"

"وہ —— وہ آدمی نہیں۔ میرا بس چلے تو اُسے گولی سے اُڑا دوں۔"

یکایک میری زبان سے نکل گیا۔

"تو سنو میرے دوست —— میں نے یہی کیا —— میں نے اپنے شوہر کو گولی سے اُڑا دیا۔" یہ بات سن کر میرا سر گھوم گیا اور میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔

"اور سنو ——" اس نے شراب کا آخری گھونٹ بھرا۔ "جو آدمی اپنی بیوی کو اپنی بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے افسر کی بیوی بھی بنانا چاہے اس لئے کہ اس کے کیریئر کا سوال ہے، ایسے آدمی کے متعلق تمھارے کیسے وچار ہیں؟"

"میرا بس چلے تو میں ایسے آدمی کا سر قلم کر دوں!"

"تو سنو، میں اپنے دوسرے شوہر کا سر قلم تو نہ کر سکی مگر میں نے اس کی کھوپڑی میں پستول ضرور خالی کر دیا —— اب بتاؤ میرا کیا قصور ہے؟ میں نے چیخ چیخ کر کہا میں نے اپنے دونوں شوہروں کا قتل کیا ہے۔ لیکن سبھی لوگ سمجھتے رہے کہ انھوں نے خودکشی کر لی ہے ——" وہ رونے لگی۔ زور زور سے بلکنے لگی۔

اور میں نے ایک عورت اور اس کی پُر درد داستان کو پا لیا۔

"سنئے" میں اس کے قریب سرک آیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھ دئے۔

"کیا ہے؟" اس نے پہلی بار میری آنکھوں سے آنکھیں ملائیں۔

"آپ میرا ساتھ اپنا لیجئے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں صحیح معنوں میں تیسرا شوہر ثابت ہوں گا ——!"

اس نے روتے روتے سسکتے ہوئے اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا!!

---

"میں [illegible] کبھی اشتہاروں کا پسند [illegible]
[illegible]

افسانہ

# فاصلے

شاہدہ حسن ایم۔ اے

سی ۱۰۹ن۔ نفیس ٹاؤن۔ آئی۔ آئی۔ ٹی۔ کھڑگپور (مغربی بنگال)

محترم بھائی! آداب

ایک تازہ افسانہ پیشِ خدمت ہے۔ اگر کسی قابل ہو تو شریکِ اشاعت کرلیں ـــــ میں اُن تمام بھائی بہنوں کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے اس بزم سے میری کچھ دنوں کی غیر حاضری کو بہت محسوس کیا اور مجھے بے حد پُرخلوص خطوط لکھے۔ بیسویں صدی کے باذوق قارئین کے خلوص کا بھلا کون منکر ہوسکتا ہے! ـــــ آپ کی گراں قدر رائے کی منتظر رہوں گی . . .

خلوص آگیں ـــــ شاہدہ حسن

★

. . . اور شام کا طلسم ٹوٹ گیا۔

ماحول کی رقاصہ کے قدم تھرتھرا کر رُک گئے گنگناتی ہوئی فضائیں خاموش ہوگئیں، چمن زاروں کا حُسن پھیکا پڑ گیا۔

میں خاموش سر جھکائے تمھاری کوٹھی سے نکل آیا۔ سب کچھ تو وہی تھا، وہی شاہراہ، وہی لوگوں کا ہجوم، وہی زندگی کے ہنگامے لیکن اب میرے لئے اِن میں کوئی دلکشی باقی نہ تھی۔ میری حدِ نظر تک صرف دھندلکے تھے جن میں میری منزلیں گم ہوگئیں ـــــ تمھاری آواز میرا پیچھا کرتی رہی۔

". . . جذبات کا غلام بننا اچھا نہیں۔ اندھی محبت شادی میں تبدیل ہوکر بڑے بھیانک نتائج دکھاتی ہے . . ."

پھر میں نے کچھ بھی نہ سُنا۔ اب رہ بھی کیا گیا تھا سُننے کو؟ آج معلوم ہوا کہ الفاظ کے پتھر دل کے آبگینے کو کیسے ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں!

میرے تھکے تھکے سے قدم گھر کے دروازے پر رُک گئے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ امّاں کھانے کی میز پر ناشتہ اور چائے رکھے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ میں دبے قدموں چھوٹے دالان سے ہوتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ آج میں نے انھیں پکارا بھی نہیں۔ اُن کی مامتا بھری نظریں میرے چہرے پر پڑنے کے بعد اُداسی کا سبب پوچھ بیٹھیں تو؟ میں نڈھال سا اپنے بستر پر گر گیا۔ میں نے اپنے کپڑے بھی نہیں بدلے، جُوتے بھی نہ کھولے۔

". . . تمھاری دُنیا میں دُکھ، درد اور اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں . . ."

تمھارے الفاظ کی بازگشت پھر میرے کانوں سے ٹکرائی اور احساسات پر انگارے برس پڑے۔

ہاں شبانہ! میری دُنیا میں دُکھ ہے، درد ہے، تاریکیاں بھی ہیں اور گھٹن بھی ـــــ تمھاری دُنیا جیسی چمک، رنگینیاں اور رعنائیاں کہاں سے لاؤں؟ میری زندگی تو کسی مفلس کی قبا ہے، جس میں ہر پل درد کے ایک نئے پیوند کا اضافہ ہوجاتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں کتنی ہی چنچل آرزوؤں کو خودداری لوریاں سُنا سُنا کر محرومی کی آغوش میں آہستہ سے سُلا دیتی ہے ـــــ زندگی کے تقاضے ہر گھڑی دل کے دروازے پر دستک دیا کرتے ہیں اور کتنی ہی ضرورتیں سامنے کھڑی مُنہ تکا کرتی ہیں۔ اِن سب سے میرا حال بھی بوجھل ہے اور شاید مستقبل بھی! لیکن تمھیں تو یہ سب معلوم تھا۔ میں نے اپنے حالات کی پردہ داری تو نہیں کی تھی؟ پھر تم اِن ناہموار پگڈنڈیوں پر میرے پاس کیوں آگئی تھیں؟ بالکل قریب ـــــ رگِ جاں کے پاس! بتاؤ شبانہ! تم نے پیار کا یہ حریری آنچل

# پردہ

مُنہ چھپاتا تھا تمہیں پہلے ہی سوز
اب کیا پردہ تو کیا پردہ کیا ——— واسطی

دل میں آجاؤ کہ ہے یہ گھر تو پردے کا محل
ہم نے آنکھیں بند کرلیں، آؤ پردہ ہوگیا ——— [illegible]

اب نہ کر پردہ کہ اے پردہ نشیں دیکھ لیا
تو جہاں جا کے چھپا ہم نے وہیں دیکھ لیا ——— [illegible] شاہ

او پردہ دار اب تو نکل آ کہ حشر ہے
دُنیا کھڑی ہوئی ہے ترے انتظار میں ——— سیماب اکبرآبادی

لکھا ہُوا تھا یہ اُس مہ جبیں کے پردے پر
نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردے پر ——— ذوق

میری تپتی زندگی کے سر پر کیوں ڈالا؟ میرے خوابوں کے جھروکوں کو کیوں سجایا، دل کی خاموش وادیوں میں محبت کے راگ کیوں چھیڑے؟

کیا ملا تمہیں میری زندگی کے ساتھ اتنا بڑا مذاق کرکے؟ کیا تمہیں یہ معلوم نہ تھا کہ جب خوابوں کے فانوس ٹوٹتے ہیں تو دل پہ کیا گزرتی ہے اور وہ باتیں جو تم عورتوں کے لئے محض وقتی تفریح کی حیثیت رکھتی ہیں کسی کے جی جان کا روگ بن جاتی ہیں۔

اس سے پہلے تو مجھے کوئی خاص غم نہ تھا، نہ اپنی ذمہ داریوں کا بار محسوس ہوا نہ کم مائیگی کا خیال آیا۔ اپنی چھوٹی سی جنت میں کھیل کود کر روتے ہنستے بڑا ہوا۔ کبھی اماں کی پیار بھری ڈانٹ ملی، کبھی ابا کی نصیحت آمیز گھڑکیاں، کبھی بھائی بہنوں سے ٹھن گئی۔ کتنی لذت تھی اِن سب میں ——— کتنا رس تھا اُس جیون میں ——— جہاں باپ کی شفقت کا نور تھا، ماں تا کی چاندنی تھی اور بھائی بہنوں کے پیار کی مہک تھی، مستقبل کے حسین خواب تھے اور میں تھا!

جب گرمیوں کی سُہانی رات میں اماں کے ہاتھوں پروان چڑھی رات کی رانی مسکراتی بیلے کی خوشبو چُپکے سے میرے پاس آتی، کسی شاخ پہ کوئی کلی چٹکتی تو میں خود بخود مسکرا اُٹھتا۔ ان دیکھے تبسم کے پھول بکھر جاتے تصورات کے دریچوں میں رنگین آنچل لہرانے لگتے اور کوئی ماہ پارہ چپکے سے دھنک کے رنگ چُرائے، پلکوں کی چلمن گرائے میرے قریب آجاتا اور ہم دونوں بہار رنگ و نکہت میں نہا اُٹھتے۔

پھر وہ شام آئی . . . وہ شام جب اچانک تم سے ملاقات ہوئی اور میں چونک پڑا ——— ایسا محسوس ہوا جیسے میں تمہیں برسوں سے جانتا ہوں! وہی چہرہ، وہی سراپا، وہی آنچل، وہی خوشبو جن سے میرے خوابوں کی دُنیا آباد تھی۔ نہ جانے میں نے تمہیں کن نظروں سے دیکھا! تم آہستہ آہستہ میرے قریب آتی گئیں اور پھر اتنی قریب . . . کہ دلوں کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہوگئیں اور مجھے تمہاری سانسوں پر اپنی سانسوں کا گمان ہونے لگا۔

میں اپنا پیریڈ ختم کرکے کلاس سے نکل رہا تھا کہ تم پہ نظر پڑی، تم بے حد خوبصورت کار سے اتریں۔ میری طرف بہت شوخ اور پیار بھری مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور اپنے کلاس کی طرف مُڑ گئیں۔ اُس دن مجھے معلوم ہوا کہ تم ایک بڑے باپ کی بیٹی ہو، خاندانی رئیس! تب مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ خیال آیا ہم دونوں کی منزلیں الگ ہیں چلتے چلتے کسی موڑ پر پہنچ کر راستے بھی الگ ہوجائیں گے۔ تو پھر کیوں نہ ابھی سے اجنبی بن جائیں ——— کاش ہم اُسی وقت اجنبی ہوگئے ہوتے!! میں نے تمہارے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنا چاہا، لیکن تم میرے ساتھ ساتھ چلتی ہی رہیں ——— "یہ دولت . . . اور امیری غریبی کی بات کیا لے بیٹھے؟ ایک لڑکی کو پیار کے امرت کے سوا اور کیا چاہئے؟ ویسے میں تمہیں پسند نہیں تو اور بات ہے . . . جانے دو . . ." تم بڑی ادا سے رُوٹھ گئیں اور میں فرطِ جذبات میں تمہاری بانہوں کو تھامے آنکھوں کی جھیل میں ڈوبتا چلا گیا۔

اُس دن میں نے سوچا اب اماں سے کہہ دوں گا "ہاں اماں اب تمہاری چاند سی بہو آجائے گی۔ چاند سے بھی اچھی! چاند تو رضیہ ہے نا؟ اُس سے بھی اچھی!" اماں کو رضیہ بہت پسند ہے۔ اُس کی تعریف کرتے اُن کی زبان نہیں تھکتی۔ اکثر رات میں اپنے سب کاموں سے فراغت پاکر وہ میرے سرہانے بیٹھتیں۔ بہت پیار سے میرے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتیں اور پھر گھر میں چاند سی بہو لانے کا تذکرہ چھیڑ دیتیں۔

"میں نے ماسٹر صاحب کے ہاں زبان دے دی ہے۔ رضیہ لاکھوں میں ایک ہے! اپنا ماحول، اپنے طور طریقے، سیدھی سادی، سلیقہ مند، صورت سیرت میں یکتا۔ پھر اِس سال بی۔ اے بھی کرلے گی۔ اب میں تیری "ہاں، نا" نہ سُنوں گی"

"اماں آپ بھی ۔۔۔ اتنی جلدی کیا ہے؟"

"جب بہت بوڑھا ہو جائے گا تب شادی رچائے گا کیا؟"

میں انھیں کوئی جواب نہ دیتا۔ دھیرے سے آنکھیں بند کر لیتا۔ وہ مجھے سوتا دیکھ کر چلی جاتیں۔ اس دن میں نے ارادہ کر لیا کہ بہت جلد تمھیں اماں سے ملاؤں گا اور جب تم اپنے حُسن کا نُور پھیلاتے میرے گھر کے آنگن میں آؤ گی تو اماں حیرت و مسرت سے تمھیں دیکھتی ہی رہ جائیں گی۔ اس وقت وہ رضیہ کو بھی بھول جائیں گی۔ میری سیدھی سادی معصوم سی اماں، گھر کی محدود چار دیواری میں رہنے والی اماں کیا جانیں کہ باہر کی دُنیا کتنی وسیع اور حسین و دلکش ہے!

پھر کئی دنوں تک تم یونیورسٹی میں نظر نہ آئیں۔ میری بیتاب نگاہیں تمھیں تلاش کر کے مایوس ہو گئیں۔ اس دن موسم بے حد حسین تھا اور شام بہت دلربا ——— میرے قدم بے اختیار تمھاری کوٹھی کی طرف اٹھنے لگے۔ گیٹ ہی سے میری نظر تم پر پڑی اور رُوح گنگنا اٹھی۔ بوگن بلا کے پھولوں سے دہکتے ہوئے برآمدے میں ایزی چیئر پر نیم دراز تم کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ میں چپ چاپ لان سے ہوتا ہوا برآمدے میں آ گیا تمھارے بالکل قریب۔ تمھیں میری آہٹ بھی نہ ملی۔ میں نے تمھاری آنکھیں مُوند لیں۔ تم نے چونک کر اپنے نازک ہاتھوں سے میرے ہاتھوں کو ہٹایا۔

"اوہ! تم ——— آؤ بیٹھو!"

"کئی دنوں سے یونیورسٹی سے کیوں غائب ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بس یونہی ۔۔۔ کچھ موڈ نہیں بنا۔ بمبئی سے کچھ لوگ آ گئے تھے۔ گپ شپ اور سیر و تفریح میں رہ گئی۔"

"کوئی بہت خاص مہمان تھے کیا؟"

"خاص ہی سمجھو! ممی ڈیڈی نے میری شادی طے کر دی ہے۔"

"شادی؟" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ میں نے گھبرا کر تمھاری طرف دیکھا۔

"ہاں طالب! میں نے تو کچھ اور ہی سوچا تھا۔ لیکن ممی نے سمجھایا کہ زندگی کا سب سے اہم فیصلہ جذبات کی رَو میں نہیں کیا جاتا۔۔ ہم دونوں کی دُنیا کے درمیان بہت فاصلہ ہے، بہت دُوری ۔۔ تمھاری دُنیا میں دُکھ درد اور اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں ۔۔۔ ممی نے دُنیا دیکھی ہے نا! اُن کے فیصلے بہرحال مجھ سے بہتر ہوں گے ۔۔۔ آئی ہوپ یو ڈونٹ مائنڈ!"

اس سے زیادہ میں سُن نہ سکا۔ رگ و پے میں کانٹے سے ٹوٹنے لگے۔

## حوصلہ

حوصلہ تجھ کو نہ تھا مجھ سے جُدا ہونے کا<br>ورنہ کاجل تری آنکھوں میں نہ پھیلا ہوتا ——— انور کریم خان

کرتے تھے کبھی حوصلۂ ترکِ محبت<br>اب صدمۂ دُوری بھی اُٹھایا نہیں جاتا ——— حسرت موہانی

تم بھی دُعا کرو کہ خدا دِل کو صبر دے<br>یا موت دے کہ صبر کا اب حوصلہ نہیں ——— منور کیا شالی

یہ کس مقام پہ تنہائی سونپتے ہو مجھے<br>کہ اب تو ترکِ تمنا کا حوصلہ بھی نہیں ——— شمیم چودھری

دل کو ہو حوصلۂ عرضِ تمنا کیونکر<br>اُس نظر میں کوئی مبہم سا اشارا بھی نہیں ——— نامعلوم

مرسلہ: یو۔ ڈی۔ حسین۔ ایم۔ اے سا قین

ایکدم سے سُورج ڈُوب گیا ۔۔۔ اور شام کا طلسم ٹوٹ گیا۔

مجھے معلوم ہے شبانہ! تمھاری ممی نے کیا کیا کہا ہوگا، ایک کلرک کا بیٹا، اور خود بھی معمولی سا لکچرر جس کے سامنے فرائض اور پریشانیوں کے پہاڑوں کا سلسلہ ہے ——— تم دونوں کے درمیان ہزاروں دیواریں ہیں جنھیں توڑتے توڑتے ساری عمر گزر جائے گی۔ پھر تم نئی زندگی کی تشکیل کب کرو گی؟ موت کے پنجوں میں سسکتی زندگی گزارنے سے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ جذبات کی آندھیوں کو روک دو، کھڑکیاں بند کر دو۔ نہیں تو اِن صوفوں کی چمک گرد کی تہوں میں ڈُوب جائے گی، یہ قالین میلے ہو جائیں گے، ڈرائنگ روم کا گلیمر ماند پڑ جائے گا۔ اور پھر تم نے بھی سوچا ہوگا ممی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ شاید ۔۔ شاید ٹھیک ہی کہتی ہوں۔ چلو جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا، تمھارے خوابوں کی کہکشاں تک میری رسائی ناممکن تھی، تمھارے ارمانوں کا بار اُٹھانے کے میں قابل نہ تھا۔ بس بے خیالی میں بہت آگے بڑھ آیا۔ اتنا آگے کہ اپنی منزل، اپنے راستے بھول بیٹھا ۔۔۔ وہ تفریق و تضاد جو تمھاری مسحور کُن آنکھوں نے بھلا دیا تھا آج پھر تمھارے ہی الفاظ نے یاد دلایا ہے۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبا لیا۔ درد شدید ہو گیا تھا۔

قریب ہی اماں کے قدموں کی مانوس سی آہٹ سنائی دی۔ وہ مجھے خاموش بیٹھا دیکھ کر گھبرا اٹھیں۔

"ارے! چہرہ کیسا اترا ہے... کب آگیا؟ میں کب سے راہ دیکھ رہی تھی؟"

"کچھ نہیں بس ذرا تھک گیا ہوں۔" وہ چائے بنا کر میرے کمرے ہی میں لے آئیں اور میرا دل بہلانے کے لئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔ گھریلو کاموں کی تفصیلات، رشتہ داروں کے خطوط، خاندان بھر کی شادیوں کے تذکرے — مجھے خیال آیا کہ اب اماں اپنے محبوب موضوع کی طرف آرہی ہیں۔ یہ سب باتیں غالباً رضیہ کی شان میں کہے گئے قصیدے کی تمہید و تشبیب ہیں۔ جلد ہی اماں گریز پر آجائیں گی۔

"رضو جس گھر میں جائے گی وہ گھر جنت بن جائے گا..." بلکہ اس بار میں اماں کو ٹوکوں گا نہیں اور لب دوکوں بھی کس لئے؟ میری محبت کا آفتاب تو ڈوب ہی چکا۔ اب ان گھٹا ٹوپ اندھیروں کو دور کرنے کے لئے نئے چراغ تو جل سکتے ہیں۔ انھیں حیرت ہوگی۔ وہ پوچھیں گی۔

"آج اتنا چپ چپ کیوں ہے؟ کچھ بولتا کیوں نہیں؟"

"مجھے شرم آرہی ہے!" وہ ہنس پڑیں گی

"چل ہٹ! بے حیا!"

اور پھر میں بہت سنجیدگی سے کہوں گا۔ آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں اماں! وہ خوش نصیب ہے جسے رضیہ جیسی شریکِ زندگی ملے... آپ کی پسند میری پسند ہے، اماں کھل اٹھیں گی۔ ان کی روح سرشار ہو جائے گی اور وہ بہت پیار سے مجھے اپنی آغوش میں چھپا لیں گی۔ تب دھیرے دھیرے میرا دل آج کہے گا، اماں! رضیہ تو اپنی ہی دنیا کی باسی ہے۔ بہت سیدھی سادی، معصوم سی، ہنس مکھ سی — جو ہمارے دکھ سکھ سے مانوس ہے۔ جسے مہینے کی آخری تاریخوں کی کشمکش کا حال معلوم ہے، جو دکھ درد کی پتھریلی زمینوں پر خوشیوں کے ننھے ننھے پودے لگانے کا ہنر جانتی ہے، جو...!

"آج ماسٹر صاحب کی بیوی آئی تھیں۔"

"اچھا!!" میں نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا۔ آج تو آپ بہت جلد اپنے محبوب موضوع پر آگئیں!" میری مضمحل سی مسکراہٹ نے انھیں چھیڑا۔

"رضیہ کی شادی کہیں اور طے ہوگئی ہے... اس نے خود یہاں شادی سے انکار کر دیا۔"

"انکار؟" میرے ہاتھ سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی۔

"ہاں! اس کی کسی سہیلی نے اس سے کہہ دیا کہ رضیہ تمھارے بھیا تم جیسی لڑکی کو پسند کرتے ہیں۔ بس رضیہ نے ماں سے صاف صاف کہہ دیا کہ زندگی کا ساتھ اگر اُسے پسند نہیں، تو وہ کسی پر ملازمہ بننے کا رجحان رکھتی ہے۔ چل اچھا ہی ہوا۔ اب تو مجھے بھی معلوم ہو گیا میں کل ہی وہاں جاؤں گی۔ اب تو اس کا نام بتا دے!" وہ ہنس پڑیں۔

میں نے کروٹ بدل لی ہے۔ درد اور شدید ہو گیا ہے۔

"شبانہ! اب تم ہی اس کا نام بتا دو نا!!"

---

# غزل

ابر احسنی گنوری

کیا خاک مطمئن ہوں مآل سفر سے ہم
جب گمرہی خرید چکے راہبر سے ہم

چمکائیں بزم تابشِ داغِ جگر سے ہم
پیدا کریں اِک اور سحر اِس سحر سے ہم

پھر پوچھ لیں گے موج و تلاطم کا بھی مزاج
پہلے نکال تو لیں سفینہ بھنور سے ہم

اب بھی تمہارا حُسن بہت خوب ہے مگر
چمکائیں گے کچھ اور اِسے اپنی نظر سے ہم

جلتے ہیں آشیانے بہار آئے یا نہ آئے
چپ باغباں ہیں، اُلجھے ہیں برق و شرر سے ہم

تفریح کا ہماری تم اب رُخ بدل بھی دو
کھیلا کریں گے کیا یونہیں دردِ جگر سے ہم؟

بری نظر کی کھائی ہے جن دن سے دل پہ چوٹ
رنے لگے ہیں دوست خود اپنی نظر سے ہم

بازو کے حوصلے تو شکستہ نہیں ہوئے
محروم ہو گئے ہیں اگر بال و پر سے ہم

د کوئی باغباں تو ذرا سا جواب دے
ب تک چمن بچائیں گے برق و شرر سے ہم؟

تعمیر کا جمال ہمارے جنوں میں ہے
صحرا میں پھول اُگائیں گے نکلے جو گھر سے ہم

خود اہلِ قافلہ نے بھی لوٹے ہیں قافلے
کیا ابرؔ مطمئن ہوں کسی ہم سفر سے ہم

ابر احسنی گنوری

# غزل

سید حامد ترمذی

دو حرفِ مدعا مرے لب سے نکل گئے
اِتنی سی بات پر ترے تیور بدل گئے

سب سے قدم قدم پہ ہوئیں لغزشیں مگر
تم نے جنھیں سنبھال لیا وہ سنبھل گئے

اب تک نہ حُسن و عشق کی فطرت بدل سکی
کہنے کو زندگی کے تقاضے بدل گئے

رندانِ تشنہ کام کی بے تابیاں نہ پوچھ
ساقی کے آتے آتے کئی دور چل گئے

میری نگاہِ شوق کا اعجاز دیکھنا
سرتا قدم وہ نور کے سانچے میں ڈھل گئے

بیمارِ غم کا کوئی سہارا نہیں رہا
بالیں پہ آ کے معتکفِ افسوس مل گئے

کچھ دُور تک جب اُن کا مرا ساتھ ہو گیا
لاکھوں چراغ راہِ محبت میں جل گئے

اب تک نگاہ حُسن ہے پابندِ صد حجاب
ہم حدِ شوق سے کہیں آگے نکل گئے

ہر گوشۂ جہانِ محبت اُجڑ گیا
دُنیا بدل گئی مری، وہ کیا بدل گئے

طوفانِ اضطراب ہے دن رات موجزن
تم تو دلِ حباب کی دُنیا بدل گئے

# اُردو سے اِنٹرویو

محمد بدیع الزماں

ڈپٹی مجسٹریٹ۔ کریم گنج گیا

مکرمی خوشتر صاحب تسلیم

ایک مضمون "اُردو سے انٹرویو" بغرض اشاعت ارسال خدمت ہے۔ اُمید کہ از راہِ کرم اسے شائع کرکے مجھے ممنون فرمائیں گے۔ اِس مضمون کا محرک شاید یہ شعر ہے ؎

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

اُردو کے لئے آپ کی گراں بہا خدمات ہمیشہ قابلِ تحسین رہی ہیں خصوصاً "تیر و نشتر" اور "سرگوشیاں" میں آپ کا چھوٹا سا چبھتا ہوا فقرہ یا جملہ بہت سے طویل مقالات اور طویل تقریروں پر بھاری ہوتا ہے۔ خدا آپ کو اور "بیسویں صدی" کو اُردو کی خدمت کا زیادہ سے زیادہ موقع دے۔ آمین! اِسی لئے میں نے یہ انٹرویو "بیسویں صدی" ہی میں شائع کرانا زیادہ مناسب سمجھا۔ شاید پسند آئے . . .

نیاز کیش ——— م ب زماں

★

اُردو کی حالت کے متعلق مختلف افواہیں گرم تھیں۔ کوئی کہتا اب تُو بلعت ہے کہیں سے آواز آتی اب عالمِ نزع میں ہے۔ کوئی کہتا طبیبوں نے کچھ دن نرسنگ ہوم میں پڑے رہنے کا مشورہ دیا ہے ——— اُردو سے میری عقیدت مندی دیرینہ ہے۔ اِس لئے خیال ہوا کیوں نہ اُردو سے ملاقات ہی کرکے اصل حالات معلوم کئے جائیں۔ اِس لئے میری درخواست پر اُردو نے از راہِ کرم مجھے انٹرویو کا شرف بخشا۔

جب میں اُردو کی قیام گاہ پر پہنچا تو دیکھا ہر طرف سبزہ لہلہا رہے ہیں۔ پھولوں کی کیاریوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہیں۔ ہر طرف شادابی ہی شادابی ہے۔ خیال ہوا اُردو کی صحت کے متعلق جو خبریں آ رہی ہیں وہ صرف افترا انگیزی معلوم ہوتی ہیں۔ وقتِ مقررہ پر مجھے ایک آراستہ کمرے میں لے جایا گیا۔ تعارف اور رسمی باتوں کے بعد میں نے سب سے پہلے صحت کے متعلق استفسارات کئے۔ اُردو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہوا کے تند و تیز جھونکوں سے اکثر درختوں کے پتے گر جاتے ہیں مگر اِس کا یہ مطلب نہیں کہ درخت کی تازگی میں کوئی کمی آ جاتی ہے۔ اُن کی جگہ نئے کونپل پھوٹتی ہیں۔ یہی حال میری صحت کا ہے۔ آپ مطمئن رہیں اور سراسیمہ نہ ہوں۔"

کچھ اور رسمی گفتگو کے بعد اُردو نے مجھ سے یہ سوال کیا۔

"آپ مجھ سے انٹرویو لے کر کیا کریں گے؟"

میں نے برجستہ جواب دیا۔

"میں اسے ایسے صحیفہ میں شائع کروں گا جس کا ہر شمارہ ہندوستان کے کمپوزٹ کلچر کی نمائندگی کرتا ہے اور وہ ہے اِسی دہلی سے شائع ہونے والا اُردو ماہنامہ "بیسویں صدی" تاکہ اُردو کے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں اُن کا ازالہ ہو سکے۔"

اُردو نے اِس کے جواب میں کہا۔

"اگر میں عالمِ نزع میں ہوتی تو وہ اُردو صحیفہ جس کی آپ نمائندگی

سالنامہ

قریب ہی اماں کے قدموں کی مانوس سی آہٹ سنائی دی۔ وہ مجھے خاموش لیٹا دیکھ کر گھبرا اٹھیں۔

"ارے! چہرہ کیسا اترا ہے... کب آگیا؟ میں کب سے راہ دیکھ رہی تھی!"

"کچھ نہیں بس ذرا تھک گیا ہوں" وہ چائے بنا کر میرے کمرے ہی میں لے آئیں اور میرا دل بہلانے کے لئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں، گھریلو کاموں کی تفصیلات، رشتہ داروں کے خطوط، خاندان بھر کی شادیوں کے تذکرے ——— مجھے خیال آیا کہ اب اماں اپنے محبوب موضوع کی طرف آرہی ہیں۔ یہ سب باتیں غالباً رضیہ کی شان میں کہے گئے قصیدے کی تمہید و تشبیب ہیں۔ جلد ہی اماں گریز پر آجائیں گی۔

"رضو جس گھر میں جائے گی وہ گھر جنت بن جائے گا.." لیکن اس بار میں اماں کو ٹوکوں گا نہیں اور اب روکوں بھی کس لئے؟ میری محبت کا آفتاب تو ڈوب ہی چکا۔ اب اِن گھٹا ٹوپ اندھیروں کو دور کرنے کے لئے نئے چراغ تو جل سکتے ہیں۔ انھیں حیرت ہوگی۔ وہ پوچھیں گی۔

"آج اِتنا چپ چپ کیوں ہے؟ کچھ بولتا کیوں نہیں؟"

"مجھے شرم آرہی ہے!" وہ ہنس پڑیں گی

"چل ہٹ! بے حیا!"

اور پھر میں بہت سنجیدگی سے کہوں گا۔ آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں اماں! وہ خوش نصیب ہے جسے رضیہ جیسی شریکِ زندگی ملے... آپ کی پسند میری پسند ہے، اماں کھل اٹھیں گی۔ ان کی روح سرشار ہو جائے گی اور وہ بہت پیار سے مجھے اپنی آغوش میں چھپالیں گی تب دھیرے دھیرے میرا دل ان سے کہے گا، اماں! رضیہ تو اپنی ہی دنیا کی باسی ہے۔ بہت سیدھی سادی معصوم سی ہنس مکھ سی ——— جو ہمارے دکھ سکھ سے مانوس ہے۔ جسے مہینے کی آخری تاریخوں کی کشمکش کا حال معلوم ہے، جو دکھ درد کی پتھریلی زمینوں پر خوشیوں کے ننھے ننھے پودے لگانے کا ہنر جانتی ہے، جو...!

"آج ماسٹر صاحب کی بیوی آئی تھیں"

"اچھا!!" میں نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا: "آج تو آپ بہت جلد اپنے محبوب موضوع پر آگئیں!" میری مضمحل سی مسکراہٹ نے انھیں چھیڑا۔

"رضیہ کی شادی کہیں اور طے ہو گئی ہے... اس نے خود یہاں شادی سے انکار کر دیا"

"انکار؟" میرے ہاتھ سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی۔

"ہاں! اس کی کسی سہیلی نے اس سے کہہ دیا کہ یونیورسٹی میں تم کسی لڑکی کو پسند کرتے ہو۔ بس رضیہ نے ماں سے صاف صاف کہہ دیا کہ زبردستی کا سودا اسے پسند نہیں، نہ وہ کسی پر بارِ ساہ بندھن کا بوجھ بننا چاہتی ہے۔ چل اچھا ہی ہوا۔ اب تو مجھے بھی معلوم ہو گیا۔ میں کل ہی وہاں جاؤں گی۔ بس تو اس کا نام بتا دے!" وہ ہنس پڑیں۔

میں نے کروٹ بدل لی ہے۔ درد اور شدید ہو گیا ہے۔

"شبانہ! اب تم ہی اس کا نام بتا دو نا!!"

## غزل

ابرؔ احسنی گنوری

...ہوں مآلِ سفر سے ہم
...راہبر سے ہم

چمکائیں بزمِ تابشِ داغِ جگر سے ہم
پیدا کریں اِک اور سحر اس سحر سے ہم

...وج وتلاطم کا بھی مزاج
...سفینہ بھنور سے ہم

اب بھی تمہارا حسن بہت خوب ہے مگر
چمکائیں گے کچھ اور اسے اپنی نظر سے ہم

...بہار آئے یا نہ آئے
...الجھے ہیں برق و شرر سے ہم

تفریح کا ہماری تم اب رُخ بدل بھی دو
کھیلا کریں گے کیا یونہیں دردِ جگر سے ہم؟

...ہے جبیں سے دل پہ چوٹ
...ت خود اپنی نظر سے ہم

بازو کے حوصلے تو شکستہ نہیں ہوئے
محروم ہو گئے ہیں اگر بال و پر سے ہم

...را سا جواب دے
...یں گے برق و شرر سے ہم؟

تعمیر کا جمال ہمارے جنوں میں ہے
صحرا میں پھول اگائیں گے نکلے جو گھر سے ہم

...اہلِ قافلہ نے بھی لوٹے ہیں قافلے
...ابرؔ مطمئن ہوں کسی ہم سفر سے ہم

## غزل

سید حبابؔ ترمذی

دو حرفِ مدعا مرے لب سے نکل گئے
اتنی سی بات پر ترے تیور بدل گئے

سب سے قدم قدم پہ ہوئیں لغزشیں مگر
تم نے جنہیں سنبھال لیا وہ سنبھل گئے

اب تک نہ حسن و عشق کی فطرت بدل سکی
کہنے کو زندگی کے تقاضے بدل گئے

رندانِ تشنہ کام کی بے تابیاں نہ پوچھ
ساقی کے آتے آتے کئی دور چل گئے

میری نگاہِ شوق کا اعجاز دیکھنا
سر تا قدم وہ نور کے سانچے میں ڈھل گئے

بیمارِ غم کا کوئی سہارا نہیں رہا
بالیں پہ آ کے وہ کفِ افسوس مل گئے

کچھ دور تک جب ان کا مرا ساتھ ہو گیا
لاکھوں چراغ راہِ محبت میں جل گئے

اب تک نگاہِ حسن ہے پابندِ صد حجاب
ہم حدِ شوق سے کہیں آگے نکل گئے

ہر گوشۂ جہانِ محبت اجڑ گیا
دنیا بدل گئی مری، وہ کیا بدل گئے

طوفانِ اضطراب ہے دن رات موجزن
تم تو دلِ حبابؔ کی دنیا بدل گئے

# بہاری لال کے سپنے
# پورے ہو گئے
# ایل آئی سی کی مدد سے

بہاری لال کی چھوٹی موٹی کھیتی باڑی تھی معمولی آمدنی ہونے پر بھی وہ کچھ نہ کچھ رقم بچاتا تھا۔ فصل نکلنے کے زمانے میں ایک بیمہ ایجنٹ سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ ایجنٹ کی باتوں سے متاثر ہوا اور اس نے ۵۰۰۰ روپیوں کی ایک میعادی بیمہ پالیسی لی۔ اب اس کی میعاد ختم ہونے والی ہے۔ اس رقم سے وہ اپنے کھیت میں پانی کا پمپ لگانا چاہتا ہے اور باقی رقم سے کھیتی باڑی کا دوسرا سامان خریدنا چاہتا ہے۔ خاندان کی سلامتی کے ساتھ ساتھ بہاری کے سپنے بھی پورے ہو گئے۔

آپ بھی بہاری لال کی طرح سمجھداری سے کام لیجیے اور اب کی فصل پر بیمہ پالیسی لے لیجیے۔ آج ہی بیمہ ایجنٹ سے ملئے۔ آپ کی ضروریات کے مطابق وہ بیمہ کا پلان بتلائیں گے۔

**بیمہ زندگی سلامتی کے لئے بے مثال ہے!**

# اُردو سے اِنٹرویو

محمد بدیع الزماں

ڈپٹی مجسٹریٹ۔ کریم گنج۔ گیا

مکرمی خوشتر صاحب تسلیم

ایک مضمون "اُردو سے اِنٹرویو" بغرضِ اشاعت ارسالِ خدمت ہے۔ اُمید کہ ازراہِ کرم اِسے شائع کرکے مجھے ممنون فرمائیں گے۔ اِس مضمون کا محرک شاید یہ شعر ہے ؎

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

اُردو کے لئے آپ کی گراں بہا خدمات ہمیشہ قابلِ تحسین رہی ہیں خصوصاً "تیر و نشتر" اور "سرگوشیاں" میں آپ کا چھوٹا سا چبھتا ہوا فقرہ یا جملہ بہت سے طویل مقالات اور طویل تقریروں پر بھاری ہوتا ہے۔ خدا آپ کو اور "بیسویں صدی" کو اُردو کی خدمت کا زیادہ سے زیادہ موقع دے۔ آمین! اِسی لئے میں نے "اِنٹرویو" "بیسویں صدی" ہی میں شائع کرانا زیادہ مناسب سمجھا۔ شاید پسند آئے۔۔۔

نیاز کیش ــــــــــ م ب ز

★

اُردو کی حالت کے متعلق مختلف افواہیں گرم تھیں۔ کوئی کہتا اب زود بعصت ہے، کہیں سے آواز آتی اب عالمِ نزع میں ہے۔ کوئی کہتا طبیبوں نے کچھ دن نرسنگ ہوم میں پڑے رہنے کا مشورہ دیا ہے ــــــ اُردو سے میری عقیدتمندی دیرینہ ہے۔ اِس لئے خیال ہوا کہ کیوں نہ اُردو سے ملاقات ہی کرکے اصل حالات معلوم کئے جائیں۔ اِس لئے میری درخواست پر اُردو نے ازراہِ کرم مجھے اِنٹرویو کا شرف بخشا۔

جب میں اُردو کی قیامگاہ پر پہنچا تو دیکھا، ہر طرف سبزے لہلہا رہے ہیں۔ پھولوں کی کیاریوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہیں۔ ہر طرف شادابی ہی شادابی ہے۔ خیال ہوا اُردو کی صحت کے متعلق جو خبریں آ رہی ہیں وہ صرف افترا انگیزی معلوم ہوتی ہیں۔ وقتِ مقررہ پر مجھے ایک آراستہ کمرے میں لے جایا گیا۔ تعارف اور رسمی باتوں کے بعد میں نے سب سے پہلے صحت کے متعلق استفسارات کئے۔ اُردو نے سرد آہیں بھرتے ہوئے کہا۔

"ہوا کے تند و تیز جھونکوں سے اکثر درختوں کے پتے گر جاتے ہیں لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ درخت کی تازگی میں کوئی کمی آ جاتی ہے۔ اُن کی جگہ نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ یہی حال میری صحت کا ہے۔ آپ مطمئن رہیں اور سراسیمہ نہ ہوں۔"

کچھ اور رسمی گفتگو کے بعد اُردو نے مجھ سے یہ سوال کیا۔

"آپ مجھ سے اِنٹرویو لے کر کیا کریں گے؟"

میں نے برجستہ جواب دیا۔

"میں اِسے ایسے صحیفہ میں شائع کروں گا جس کا ہر شمارہ ہندوستان کے کمپوزٹ کلچر کی نمائندگی کرتا ہے اور وہ ہے اِسی دہلی سے شائع ہونے والا اُردو ماہنامہ "بیسویں صدی"۔ تاکہ اُردو کے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں اُن کا ازالہ ہو سکے۔"

اُردو نے اِس کے جواب میں کہا۔

"اگر میں عالمِ نزع میں ہوتی تو وہ اُردو صحیفہ جس کی آپ نمائندگی

[illegible] کا دفن ہو چکا ہوتا۔ اُس کی مقبولیت اِس حقیقت کی شاہد ہے کہ
میں [illegible] ہوں۔"

صحت کے متعلق اطمینان ہو جانے پر جب میں نے اُردو سے یہ درخواست
کی کہ وہ اپنی پچھلی زندگی پر کچھ روشنی ڈالنے کی تکلیف گوارا کرے تو اُردو نے کہا۔
"میری زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔ اِس برِّ صغیر کا ہر فرد میری حقیقت
سے پوری طرح واقف ہے۔ بے شمار محققوں نے اِس پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ
مُصر ہیں تو میں یاددہانی کے لئے صرف چند نامور اہلِ قلم حضرات کے الفاظ میں
اپنی گزشتہ زندگی پر روشنی ڈالنا پسند کروں گی۔ میں کس طرح پروان چڑھی۔
میری اداؤں نے کس طرح سب کے دلوں کو موہ لیا ـــــ اِس کی ہلکی سی
ایک جھلک آپ کو خواجہ محمد شفیع دہلوی کے ایک مضمون میں ملے گی جس کے کچھ
اقتباسات یہ ہیں۔

"کہنے کو کہہ لیجئے کہ اُردو کے معنی لشکر کے ہیں۔ اُردو زبان
لشکری ہے تاہم بہ ادب شرط منہ نہ کھلوائیں۔ منہ پر آئی بات
رہتی نہیں۔ آرزو نے تنقید دودھ پانی الگ الگ کر دیتی ہے۔ دیدور
بھید پا جاتے ہیں۔ . . دراز دست کوتاہ آستیں دوسروں کے
اندوختہ پر چیرہ دستیاں کرتی رہی۔ اپنا گھر بھرتی رہی اور اُن کو
پتہ بھی نہ چلا ـــــ گاہ بھاشا پر چھاپہ مارا، گاہ ہندی کا گھر لوٹا۔
اِدھر فارسی سے ترک تازیاں کیں، تو اُدھر مال عربی سے لے آئی۔
حتیٰ کہ دانایانِ فرنگ کی بھی جیب کتری . . . بہر نوع و بہر طور
اِس حرافۂ نے زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔ اِس چتر نار نے
زمین کی تنگی آسمان سے جا لگائی۔ سب کو موہا سب کو لوٹا اور
اپنی بزم سجائی:"

اور پھر اُس آراستہ کمرہ کی جہاں ہم بیٹھے تھے اُسی مضمون میں خواجہ
صاحب نے جو تصویر کشی کی ہے اُردو نے وہ بھی سُنائی۔ جو یوں ہے۔
"طبعِ شاعر کی طرح رنگین بوقلموں ایرانی قالین از صحن تا بہ
طاق بچھے ہیں۔ ایک جانب ولایتی شمعیں تو دوسری طرف عرب
کے زیریں چراغ فروزاں۔ در و دیوار پر مانی و بہزاد کی مرقع کاریاں
کے دوش بدوش یاقوت قلم و زمرّد رقم کے خطوط شجری و طغرا
اپنا سکہ جما رہے ہیں۔ شیرازی خدمت میں حاضر تو ہندی
لونڈیاں پور پور چھلے پہنے چاکری کرتی نظر آ رہی ہیں۔
صدر میں صاحبِ خانہ بہ ہزاراں انداز و ادا گاؤ تکیہ سے

لگی فرکش ہیں۔ بیمار دو بانکی ہیں۔ چشمِ بد دُور۔ عجب نظر فریب حُسن
پایا ہے۔ صانعِ قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے ؎

دیکھ کر صانعِ قدرت نے کہا واہ رے میں
اور تصویر پکار اُٹھی کہ اللہ رے میں

واہ رے بارہ ابرن سولہ سنگار۔ بفنِ مشاطگی بلائیں لے
رہا ہے۔ آنکھوں میں عربی انداز کا کوہ طور کا حل کردہ دُنبالہ دار
سُرمہ۔ گلِ رُخسار پر گلِ گشتِ مصلےٰ کے پھولوں کا غازہ۔ لبِ لعلیں
پر لالہ مالوا کی دھڑی۔ دُرِ دنداں پہ ہلکی ہلکی ہندی مِسّی۔ جیسے
ابر میں سے چاند کی کرن دمکے۔ دستِ نازک میں خونِ بلبلِ ہندی کی
مہندی ؎

بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را"

(بحوالہ ماہنامہ "سیارہ" لاہور نومبر ۱۹۶۲ء)

میرے اِس سوال پر کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں اپنائی گئی
پالیسیوں پر اُن کا کیا ردِ عمل رہا ہے، اُردو نے کہا۔
"زبان کے مسئلے کا سامنا ہر ملک کو ہوا ہے۔ مختلف ممالک نے
مختلف طریقوں سے حل کیا۔ کینیڈا، سوئٹزرلینڈ، روس یہ سب لسانی اقلی[illegible]
کے ممالک ہیں جہاں اِس مسئلے کو خاطر خواہ طریقے پر سُلجھایا گیا۔ بات اصل [illegible]
ایسے معاملات میں 'زندہ رہو اور زندہ رہنے دو' کی روادارانہ پالیس[illegible]
کار آمد ثابت ہوتی ہے۔ آزادی ملنے کے بعد ہمارے وزیرِ اعظم پنڈت [illegible]
ایک مضمون میں زبان کے مسئلے پر اپنے خیالات واضح کئے تھے جن میں اِ[illegible]
رہو اور زندہ رہنے دو' کی پالیسی پر عمل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اُنھ[illegible]
لکھا تھا۔

"میں یہ مضمون وزیرِ اعظم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مصنف
کی حیثیت سے اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں جسے
زبان کے مسئلے سے دلچسپی ہے۔ میری یہ دلچسپی مسئلے کے سیاسی او[illegible]
بدقسمتی سے فرقہ وارانہ پہلوؤں کی وجہ سے ہے۔ لیکن اِس مسئلے
کے وسیع تر تمدنی پہلو مذکورہ پہلوؤں سے کہیں زیادہ اہمیت
رکھتے ہیں۔

ہمیں اِس اہم مسئلہ پر غور کرتے وقت چند بنیادی
باتوں کو ضرور پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ ہم جب اِس مسئلہ پر غور کر[illegible]
تو اِس کے بارے میں ہمیں کوئی فیصلہ عجلت کے ساتھ وقتی اثر[illegible]

# سالنامہ

جذبات کے تحت نہ کرنا چاہئے۔ ورنہ وہ بہت مُضر اور خطرناک ثابت ہوگا۔ اِس فیصلے پر آئندہ عمارت تعمیر کی جائے گی۔ اِس لئے اگر بُنیاد رکھنے میں کوئی غلطی ہوئی تو اِس کا اثر صرف زبان ہی پر نہ پڑے گا بلکہ ترقی و تمدّن بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا دُکھ ہوتا ہے کہ زبان کے مسئلے پر ہمارے یہاں جب کوئی بحث ہوتی ہے تو اُس میں نہ عالمانہ شان ہوتی ہے، نہ تمدّنی احساس اور نہ دُور اندیشی کی جھلک . . . زبان کو زیادہ سے زیادہ تنگ اور محدود بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور ہر وہ اقدام جو اُسے وسیع بنانے کے لئے کیا جاتا ہے اُسے قوم پروری کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔"

زبان کے مسئلے کے بُنیادی پہلوؤں پر اِن خیالات کے اظہار کے بعد وزیرِ اعظم نے فارسی کے تمدّنی اثرات سے متعلق اِسی مضمون میں کہا تھا۔

"پچھلی چند صدیوں میں ہماری کچھ صوبائی زبانوں خصوصاً ہندوستانی زبان کے بنانے میں فارسی نے اہم حصّہ لیا ہے اور ایک حد تک ہماری طرزِ فکر پر بھی اثر انداز ہوئی ہے جس سے ہمیں فائدہ پہنچا ہے اور ہمارا لسانی خزانہ زیادہ مالا مال ہوگیا ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ فارسی سے زیادہ کوئی زبان سنسکرت سے قریب نہیں ہے . . . اِس لئے دونوں کی ملاوٹ آسان ہے اور کسی طرح ہمارے لسانی اور نسلی جوہر کے خلاف نہیں ہے . . . اِس تاریخی اثر کو مٹانے کی کوشش کرنا نا سمجھی کی بات ہے۔ ثقافتی نقطۂ نظر سے اِس کو ختم کرکے پھر پیچھے لوٹنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنے آپ کو اُس ثقافتی دولت سے محروم کرلیں جو ہماری ملکیت تھی اور اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم خود ہی اپنے آپ کو نادار بناتے ہیں۔ ہمیں اُن تمام اثرات کو قبول کرنا چاہئے جو ہمارے ثقافتی سرمائے میں اضافہ کرسکیں۔ اِس لئے ہم نے جو کچھ ابھی تک اپنی زبان میں ضم کرلیا ہے اُس کو خارج کرنے کی کوشش ہر پہلو سے غلط ہوگی۔"

نئی لسانی پالیسی کے متعلق وزیرِ اعظم نے مشورہ دیا۔

"پُورے ہندوستان کی زبان جو ہم بنانا چاہتے ہیں اُس میں کافی وسعت اور گنجائش ہونی چاہئے جو اُن تمام تمدّنی خصوصیات کو قبول کرکے برقرار رکھ سکے جو اِس نے پُرانے زمانہ میں حاصل کی ہیں۔ اُس زبان کو لازمی طور پر پڑھے لکھے آدمیوں کے

چھوٹے سے حلقے کی زبان نہیں بلکہ عوام کی زبان ہونا چاہئے۔ اُس کو باوقار اور زوردار ہونا چاہئے اور یہ کوشش کرنی چاہئے کہ اُس میں تصنّع اور ادچھا پن نہ ہو۔"

اِن دنوں اکثر یہ بھی تجویز پیش کی جاتی ہے کہ اُردو کو دیو ناگری رسم الخط میں لکھا جائے۔ اِس کے متعلق وزیرِ اعظم نے اِسی مضمون میں آگے چل کر کہا تھا۔

"جہاں تک رسم الخط کا تعلق ہے یہ بالکل واضح ہے کہ ناگری رسم الخط حاوی ہوگا۔ لیکن چونکہ میں تمدّنی اور سیاسی نقطۂ نظر سے تخریبی پالیسی کو غلط سمجھتا ہوں اِس لئے میری رائے ہے کہ اُردو رسم الخط کی جہاں ضرورت ہو اُسے تسلیم کیا جائے اور اُسے سکھایا بھی جائے۔ ہمیں اُردو رسم الخط کو تسلیم کرنا چاہئے خصوصاً جہاں تک دستاویزات اور دوسرے کاغذات کے پیش کرنے کا تعلق ہے۔ اِس کے علاوہ ہمیں اُردو رسم الخط کے سکھانے کا بھی اُن اسکولوں میں انتظام کرنا چاہئے جہاں کافی طلبا اُس کے سیکھنے کے خواہش مند ہوں۔"

(بحوالہ ماہنامہ "معاصر" پٹنہ جولائی ۱۹۴۹ء)

میں دوسرا سوال پوچھنے ہی والا تھا کہ اُردو نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"وزیرِ اعظم نے اُردو زبان سے اپنی عقیدت بھری اکثر و بیشتر بیشتر تقریروں اور بیانات میں ظاہر کی۔ چنانچہ اُن کی ایک تقریر کا حوالہ دینا چاہوں گی۔ ۱۵/ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو وگیان بھون دہلی میں محکمۂ نشریات و اطلاعات کے تحت اُردو اخبارات اور کتابوں کی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"اُردو ہندوستان کی یک جہتی کا نمونہ ہے اور یہ نمونہ محض زبان ہی کا نہیں بلکہ طرزِ فکر، ادب اور تہذیب کا بھی۔ اُردو حقیقتاً ہندوستانی زبان ہے۔ اِس کو اجنبی زبان سمجھنا جہالت ہے۔ ہمیں حقیقت کو پہچاننا چاہئے اور اِس زبان کو ترقی دینا چاہیے۔"

اپنی اِس ہر دلعزیزی کا ذکر کرتے ہوئے اُردو نے مزید کہا۔

"میری اِس ہر دلعزیزی پر ہندوستان کے ایک ممتاز مورخ ڈاکٹر تارا چند کے فرمودات بھی ملاحظہ فرمائیے۔ دہلی میں ۱۷/۱۵ جنوری ۱۹۵۸ء کو کُل ہند اُردو کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔ اُس کا افتتاح پنڈت نہرو نے فرمایا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اُس جلسہ میں اپنی آخری تقریر کی۔ اُس جلسہ کے صدر ڈاکٹر صاحب موصوف تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا۔

"پھر اُردو تو اصل میں ہندوستان کی زبان ہے۔ اِس کا ماضی اور حال ہندوستان سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اِس کی تاریخ ہندو مسلمانوں کی کہانی ہے۔ اِس میں ہندو اور مسلمان سنتوں نے اُپدیش دیا۔ سادھو درویشوں نے ایشور پریم کا سندیش دیا۔ شاعروں نے اِس وطن کے شہیدوں کے لئے آنسو گرائے۔ دیش بھگتی کے دلوں کو ہلا دینے والے گیت گائے۔ انسان کے دل کی گہرائی کی کھوج کی اور روح کی اُڑان کا اندازہ لگایا۔"

(بحوالہ ماہنامہ "آجکل" دہلی نظم نمبر، اپریل ۱۹۵۸ء)

اُردو کے چہرے پر اِن سب حوالوں سے میں نے بڑی شادمانی دیکھی مگر میں نے جب فوراً یہ سوال کر دیا "اِن سب حقائق کے بعد ایسا کیوں ہے کہ اکثر اُردو زبان پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ غیر مُلکی زبان ہے یا یہ کہ یہ ایک خاص فرقہ، مذہب یا ملت کی زبان ہے؟" تو اُردو جو ابھی شادماں بیٹھی تھی یکایک تیور بدل گئے اور ذرا برہمی سے بولی۔

"اِن سب افترا انگیزیوں کا جواب بار دیا جا چکا ہے۔ یہ کوئی نیا الزام نہیں۔

بقولِ غالب ؎

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

اگر بات ایسی ہوتی کہ اُردو کسی خاص فرقہ، مذہب یا ملت کی زبان ہوتی تو نہ آپ کے ٹرسٹر صاحب ہوتے اور نہ آپ کا فور گھیت۔ میں یہاں خود اِس حقیقت کا شاہد ہے کہ اِس کے لکھنے والے ہر مذہب و ملت کے لوگ ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہندوستان ایک آزاد جمہوری مُلک ہے۔ یہاں کہنے اور لکھنے کی آزادی ہے۔ ایسی افترا انگیزیوں کا جواب خود بہت سے صاحب الرّائے اور ذمہ دار حلقوں سے دیا جا چکا ہے۔ پھر بھی اِس الزام کی تردید میں ایک ایسے شخص کی تقریر کا حوالہ دینا بھی زیادہ مناسب سمجھتی ہوں جن کی رحلت شاید ابھی ہندوستانیوں کے آنسو بھی خشک نہیں ہوئے ہیں اور جنھیں ہر ایک عظیم شخصیت کہا گیا ہے کہ وہ ہندوستان کے کمپوزٹ کلچر کی نمائندگی کرتے تھے اور وہ شخصیت ہے ڈاکٹر ذاکر حسین کی۔ اگر وہ عظیم انسان تھے اور وہ واقعی عظیم تھے تو کیا اُن کے ایسے ارشادات جو کسی خاص طبقہ اور مسلک کو پسند نہیں اِس لائق ہیں کہ انھیں نذرِ آتش کر دیا جائے؟ اگر ایسا ہے تو ڈاکر صاحب کی عظمت کے معاملے میں اُردو کو یہ صاف کہا جا رہا ہے Hands [illegible] [illegible] Love. پنڈت آنند نرائن مُلّا نے ۵ مئی ۱۹۶۹ء کو پارلیمنٹ میں اُن کی موت پر ہوئی تعزیتی بیٹھک میں جو مرثیہ پڑھا اُس کا یہ شعر شاید اِسی خطرے کی طرف اشارہ کر رہا ہے ؎

ذن ہو جائے نہ خوشبو بھی کہیں پھول کے ساتھ
یہی خوشبو تو ہے اِس بزم کا حاصل ساقی

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اُتر پردیش میں منعقدہ اُردو کانفرنس میں بتاریخ ۲۶ جولائی ۱۹۵۳ء کو اِس الزام کی اِن پُر زور الفاظ میں تردید کی۔

"لوگ ہمارے مطالبے کی تہ کو نہیں پہنچے اور اِس کی من مانی تعبیریں کرتے ہیں۔ یہ میں نے خیالِ آکل سے نہیں کہا ہے۔ یہ سب باتیں کہی گئی ہیں اور کہی جا رہی ہیں۔ کوئی کُھلم کُھلا تیز اور کڑوے انداز میں کہتا ہے کوئی ذرا دبی زبان سے۔ مگر بار بار کہا گیا ہے کہ اُردو کو علاقائی زبان بنانے کی کوشش فرقہ وارانہ کوشش ہے۔ اِس میں مذہبی فرقہ پرستی کا دخل ہے۔ چھپی ہوئی ذہنیت کا اظہار ہے۔ کیا ستم ہے کہ اُردو پر اور اُردو کے حامیوں پر کوئی فرقہ پرستی کا الزام لگائے۔ اُردو کسی فرقہ کی زبان نہیں ہے۔

...ذہب کی زبان نہیں ہے کسی خاص حیثیت سے مسزی طور پر
...ولی زبان نہیں ہے یہ تو زندگی کی ایک پہلو میں انسانوں کے
...ول کا پھل ہے۔"

"... سلمانوں کی تبلیغ مسلمانوں کی زبان چلا کر اور
... تعصبات کی ہوا سے کر نفرت کی آگ بھڑکا دی گئی۔ تعدادات
... نا ہم ہوئے تو اسے اگر جان بوجھ کر ظلم نہیں تو کیسی بے سر
... بے تکی بات ہے اور اگر بد دیانتی نہیں تو کیسی نادانی ہے۔ پھر
... تعصب سے پورا کام نہ چلے تو سیاسی تعصب بھڑکایا جاتا ہے۔
... یکر اُردو دیسی زبان ہے لیکن کیا کیجئے کہ تاریخی اور ادبی شواہد
... اڑ کر کہتے ہیں کہ یہ نہ ہندوؤں کی زبان ہے نہ بدیسی زبان ہے۔"

"... پھر کہنے والوں نے کہا کہ اُردو کو اس کا جائز حق دلانے کی
ہندوستانی قومیت میں تفرقہ ڈالنے کی تحریک ہے۔ اس کا
... یاد دو؟ ... اپنے شہریوں کے جائز حقوق کو پورا کرنے سے،
جذبات کا احترام کرنے سے، ان کے لئے سہولتیں بہم پہنچانے
... کی عزیز اور محبوب چیزوں کی حفاظت اور ترقی میں ان کی
... نے سے وحدتِ قومی پیدا ہوتی ہے۔ جذبۂ قومی ایک زندہ
جذبہ بنتا ہے۔ وفاداری ایک ذہنی وابستگی اور روحانی
... گی بن جاتی ہے۔ اس کے مطالبے نہیں کئے جاتے۔ یا اس کے
... ہیں مانگے جاتے۔"

(بحوالہ ماہنامہ صبحِ نو، پٹنہ اگست و ستمبر ۱۹۶۹ء)

... ے اس سوال پر کہ ان واضح تردیدوں کے باوجود اُردو داں حلقوں
... ر بے اطمینانی کیوں نظر آتی ہے۔ اُردو نے کہا۔
... رکاری اعداد و شمار شاہد ہیں کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں
... لے رسائل، اخبارات اور کتابوں میں اُردو کا درجہ انگریزی اور
... نمبر پر آتا ہے۔ آپ رجسٹرار آف نیوز پیپرس کی سالانہ
... سے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ اُردو کی مقبولیت کا تو یہ عالم ہے کہ
... مختلف صوبائی اسمبلیوں، پارلیمنٹ، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے
... اور سیاسی اور سماجی نشستوں میں غیر شعوری طور پر دورانِ تقریر
... پڑھے جاتے ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ زیادہ تر ایسے اشعار ان کی
... زبان سے جاتے ہیں جن کی نہ تو مادری زبان اُردو ہے اور نہ وہ اُردو
... واقف ہیں۔ مگر اس زبان نے ان کے ذہنوں کو کچھ ایسا گھیر

**نسیم شاہجہاں پوری**

غم ہر اک دل میں نہاں ہو یہ ضروری تو نہیں
ہر گلستاں میں خزاں ہو یہ ضروری تو نہیں

حالِ دل رُخ سے عیاں ہو یہ ضروری تو نہیں
عشق رسوائے جہاں ہو یہ ضروری تو نہیں

لب پہ جس بات کو لاتے ہوئے جی ڈرتا ہے
دل پہ وہ بات گراں ہو یہ ضروری تو نہیں

محفلِ حسن میں اظہارِ غمِ دل کے لئے
حاجتِ لفظ و بیاں ہو یہ ضروری تو نہیں

جب کبھی جلتا ہے کوئی گھر تو دھواں اُٹھتا ہے
دل جلے جب تو دھواں ہو یہ ضروری تو نہیں

پسِ پردہ مرے میخانہ کی بربادی میں
سازشِ پیرِ مغاں ہو یہ ضروری تو نہیں

رہ نوردانِ رہِ عشق کو دنیا میں نسیم
ہر قدم سنگِ نشاں ہو یہ ضروری تو نہیں

ے رکھا ہے کہ دانستہ اور غیر شعوری طور پر ان کا ذہن اپنے خیالات کے
اظہار کے لئے انھیں اُردو کی مدد لینے پر مجبور کرتا ہے۔ اس مقبولیت کے
پیشِ نظر سراسیمگی اور بے اطمینانی کی کوئی وجہ نہیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں
خود اعتمادی کی کمی ہے۔

اُردو کی مقبولیت کا ایک اور بین ثبوت ہندوستانی فلمیں ہیں۔

کہنے کو تو وہ ہندی فلمیں ہیں مگر آج بھی اُن کے سارے مکالمے، گیت اور گانے تو فیصدی سلیس اُردو میں ہوتے ہیں۔ گیتوں اور گانوں کے عروض و قوافی تک اُردو غزل سے مستعار ہیں۔ کسی دوسری زبان کے الفاظ لائے جائیں تو نہ وہ کانوں کو اچھے لگیں گے اور نہ دلوں کو۔ میں تو ہندوستانی فلمسازوں کی ممنون ہوں کہ مجھے مُلک گیر مقبولیت بخشنے میں اُنھوں نے بڑی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ شوکت تھانوی کے نام سے تو ہر شخص واقف ہے۔ مزاح ہی کے طور پر سہی مگر اُن کے ایک خط سے جو لتا منگیشکر کے نام ہے کچھ اقتباسات خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔

"بھارت کی سب سے بڑی مولانا عبدالحق لتا منگیشکر ہے جس کے گانے اِس ہندوستان کے گوشے گوشے میں رچے ہوئے ہیں . . . یہ واقعہ ہے کہ جتنی تبلیغ غیر ارادی طور پر آپ نے کی ہے اردو کے کسی مبلغ یا اُردو کے کسی تبلیغی ادارے سے ممکن نہ ہو سکی . . . اُردو کی جو نشر و اشاعت آپ کی حسین آواز کے ساتھ ہوئی ہے اُس نے اُردو کو ہندوستان میں امر بنا دیا ہے... مانگی جا رہی تھی اُردو کے لئے علاقائی حیثیت مگر آپ کے گانوں نے اُس کو مُلک گیر حیثیت خود بخود دے دی!"

(بحوالہ "بادِ خاطر" صفحہ ۱۰۵)

اُردو نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں صورتِ حال سے غیر مطمئن نہیں ہوں اِس لئے کہ میرا جھگڑا کسی زبان سے نہیں ہے۔ خصوصاً ہندی تو مُلک کی سرکاری زبان ہے۔ ہر آزاد مُلک کے لئے جیسے ایک قومی جھنڈا یا قومی ترانہ کا ہونا ضروری ہے اسی طرح ایک سرکاری زبان کا ہونا بھی ضروری ہے۔ میں اِس سرکاری زبان کے پھلنے پھولنے کی متمنی ہوں۔ رہا میرا سوال تو آپ اگر مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی اُن لاتعداد ہدایات کو جو پچھلے بیس برسوں میں اُردو کے متعلق اُردو کے جائز حقوق دیئے جانے کے لئے جاری کی گئی ہیں مطالعہ کریں تو یاد رکرنا ہوگا کہ سرکار نے ہر ممکن کوشش اِس سراسیمگی کو دُور کرنے کے لئے کی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ احکام کا نفاذ خاطر خواہ نہ ہوا۔"

میں نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا۔ "تو پھر اِن ہدایات کے باوجود اِن پر عمل کیوں نہیں کیا گیا؟"

اُردو نے اِس کا جواب صرف اِتنا دیا۔

چھوٹا ہو یا بڑا
جوان ہو یا بوڑھا
سب کی برابر سیوا ہے ہمارا بیڑا

بھارتی ڈاک تار

میں ایسے بھارت کے لیے کام کروں گا جس میں
غریب ترین شخص یہ محسوس کرے گا کہ یہ اُس کا ملک ہے....
ایسے بھارت کے لئے جس میں اعلیٰ و ادنیٰ کا کوئی
فرق نہیں ہوگا.... ایسے بھارت کے لئے جس میں سبھی
فرقوں کے لوگ مل جل کر رہیں گے....

بھارتی ڈاک تار کے لئے یہ فخر کی بات ہے کہ
بھارت بھر میں ڈاک و تار گھروں کا جال بچھا کر
گاندھی جی کے اُس خواب کو پورا کرنے کے لئے
انکساری کے ساتھ اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔

# یہ تھا خواب گاندھی جی کا
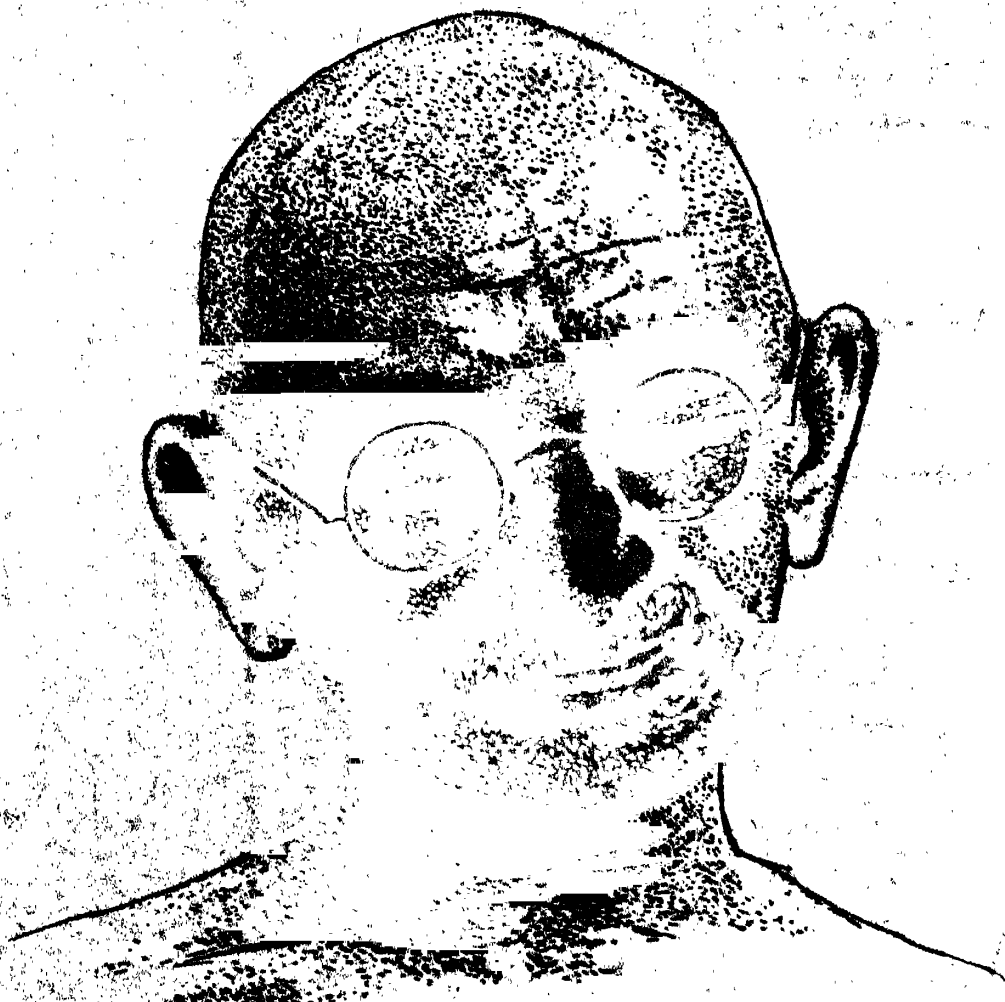
# ہم زندگی میں پھر کوئی ارمان نہ کر سکے

رضیہ دستگیر ایم۔ اے

ظل ولا بلڈنگ ۱۱۰۔ کیڈل روڈ۔ ماہم بمبئی نمبر ۱۶

محترم نوشتر گرامی صاحب! تسلیم و نیاز

"خوبصورت موڑ" کی اشاعت کے فوراً بعد میں نے ایک نامۂ ممنونیت ارسال کیا تھا۔ امید ہے آپ تک رسائی ہوئی ہوگی۔ ملک اور بیرونِ ملک سے بہت سے خطوط آئے اور اب تک آ رہے ہیں۔ فرداً فرداً جواب نہ دے سکی تو خیال آیا کہ "بیسویں صدی" سے زیادہ بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں ہے۔ ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور ایک کہانی "ہم زندگی میں پھر کوئی ارمان نہ کر سکے" ارسال کر رہی ہوں۔ ساحر کا یہ پیارا پیارا شعر نہ جانے کیوں میرے دماغ میں گھوم رہا تھا۔

کچھ اتنے دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارمان نہ کر سکے

میں نے اسی شعر کو کہانی کا موضوع بنا لیا۔ یقین ہے یہ افسانہ بھی شرفِ قبولیت حاصل کرے گا۔ آپ کی گرانقدر رائے اور پُرخلوص مشورہ کی منتظر رہوں گی۔۔

آپ کی چھوٹی بہن ــــــــ رضیہ

★

"کشو باجی مبارک ہو"

خوشی سے اچھلتا ہوا گیٹ کے دروازے کو پھلانگ کر وہ اندر آ گیا۔

گلاب کے رنگا رنگ مسکراتے پھولوں نے اس کا دامن بھر دیا۔ کچھ دیر کے لیے وہ ان پھولوں میں کھو گئی۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اس کے دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ آنکھیں بند کر کے پھولوں پر اپنا چہرہ رکھ کر وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئی۔ کلک۔۔ آواز کے ساتھ وہ چونک پڑی پھولوں کو زمین پر پھینک کر غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کیمرہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تم نے میری تصویر کیوں کھینچی؟"

"اوہ باجی آپ تو خفا ہو گئیں۔ اپنے ہلو کو معاف نہ کریں گی؟"

وہ تقریباً روہانسا ہو کر بولا۔ کشور نے کوئی جواب نہ دیا۔ سنا تھا پھولوں میں ملائمت ہوتی ہے، کومل ہوتی ہے، ٹھنڈک ہوتی ہے۔ بجلی کی کڑک نہیں ہوتی۔

"لیکن۔۔" وہ اب بھی غصے میں پھولے بیٹھی رہی۔

"باجی پھولوں کی تصویر اتارنا تو کوئی جرم نہیں ہے"

"میرے ساتھ جرم ہے!"

"آپ بھی تو کھلتا ہوا۔۔" وہ جملہ پورا نہ کر سکا۔

"ہلو بدتمیزی نہیں کرتے۔ بڑوں سے مذاق اچھا نہیں۔ کوئی دیکھ لیتا تو؟"

"مجھے معلوم ہے آج گھر میں کوئی نہیں ہے۔ کل ہی نصرت نے بتایا تھا کہ وہ سب رات ہی سے خالہ جان کے گھر جا رہے ہیں۔ صرف کشور باجی گھر میں رہیں گی۔ کل نتیجہ ہے اور ساری رات وظیفہ کرتی رہیں گی۔ اللہ میاں کو رشوت پیش کریں گی"

"ہو شریر کہیں کے!"

## سالگرہ

[illegible] کب تک [illegible] رہی ہیں اپنے
[illegible] دیکھ سکتے وہ ایک نئی
[illegible] کی دنیا تھی خوشبوؤں کی دنیا تھی۔ اس کے
[illegible] وجود [illegible] آگ
[illegible] آنکھیں [illegible] آواز میں کہتی تھی۔
[illegible] گرفت [illegible] رہی ہوں۔

"جاوید! حقیقت کو [illegible] مجھ سے [illegible] تم سے میں چار
سال بڑی ہوں۔ [illegible] سال کا فرق [illegible] ہے؟"

"پھر فرق کیا ہے [illegible] لیلیٰ کو [illegible] پچاس ساٹھ سال
[illegible] آٹھ [illegible] سال کی [illegible] ہوں گی؟"

"ہمارا سماج یہ گوارا کر سکتا ہے کہ ساٹھ سالہ کھوسٹ کے پیچھے سولہ
سالہ دوشیزہ اپنی تمام رعنائیوں، جوانیوں اور امنگوں کا خون کر کے اپنے
وجود کو گھسیٹتی پھرے۔ لیکن اس سماج میں تمہارے اس حسین خواب کی کوئی
تعبیر نہیں ہے۔۔۔ پھر تمہارے لیڈر کی بات اور ہے۔ وہ شہر کے
مقتدر رئیس کے بیٹے ہیں۔ ہمت ہے کسی کی انگلی اٹھانے؟"

اس نے فوراً کہا: "لیکن میں آپ سے چھوٹا نظر آتا ہوں۔ خوب
صحت مند ہوں۔ آئندہ سال ایف ایس سی کر لوں گا۔ پھر کالج بھی جاؤں گا اور
ابا کے کاروبار میں سرگرمی سے ہاتھ بٹاؤں گا۔ وہ خوش ہو جائیں گے مجھ سے،
اور پھر میں جو چاہوں گا کر سکوں گا۔"

"لیکن سماج۔۔۔" یہ آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اس کا بدن کسی
انجانے خوف سے لرزنے لگا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

"محبت کا جذبہ فطری ہوتا ہے۔ سماج کے تقاضوں کا محتاج نہیں۔
سماج کی تشکیل ضروریات کے پیش نظر انسان نے کی ہے۔ سماج نے انسان کی
تخلیق نہیں کی ہے۔ اس لئے انسان اپنے انفرادی وجود اور منفرد ضروریات
کو ختم یا پامال نہیں کر سکتا۔"

"جاوید! [illegible] خود غرض ہو گی۔ صرف اپنی ذات کی [illegible]
[illegible] تنہا
[illegible] آدم خاکی
[illegible] کوششوں کا
[illegible]
[illegible] زندگی کی تسکین

میں تو مانتی نہیں۔ خوبصورت چیزوں کو پانے کی خواہش تو ہر دل میں اٹھتی
ہے۔ یہ ایک فطری رجحان ہے، ایک قدرتی جذبہ ہے جس نے امیر مصر
کی بیوی زلیخا کے وقار اور شان پر بھی فوقیت حاصل کر لی تھی اور زلیخا کو
حسن یوسف کے آگے جھکنے پر مجبور کیا تھا! پھر فطرت نے بھی اس کی آرزو
پوری کر دی تھی۔"

"مگر زمانے نے انھیں کب معاف کیا تھا؟"

"یہی عشق زلیخا کی معراج تھی!"

"جاوید مجھے ان خاردار جھاڑیوں میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کرو۔
شاید میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں۔"

وہ پرجوش لہجے میں کہنے لگا: "کشو! آج تم یہ بزدلی کی باتیں کیوں
کر رہی ہو؟ یاد ہے اقبال پڑھاتے وقت تم نے مجھے بزدلی سے نفرت دلائی تھی۔

تھے مجھے اقبال کا مردِ مومن اور شاہین بننے کی تلقین کی تھی۔ حالات کا مقابلہ کرنا سکھایا تھا۔ حالات کا شکار ہو جانا تو بزدلی ہے۔ پھر آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" وہ خاموش ہی رہی۔ وہ پھر کہنے لگا: "جب میں شاہین بن کر محبت کی رفعتوں کو چھونا چاہا تو تم نے میرے پَر کاٹ ڈالے۔۔۔ اب میں جی نہیں سکتا۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم ہی میرے درد کا درماں ہو۔"

وہ جوش میں کہتا رہا اور کشور بھی اس بہتے ہوئے دھارے کے ساتھ بہہ نکلی۔ جاوید نے اس کے جذبات کی جھیل میں خلوص و محبت کے کنکر پھینک کر ایک تلاطم بپا کر دیا۔ جاوید کے عزم کے آگے اسے سر جھکانا پڑا۔ جنوں کے آگے ہوش نے شکست کھائی۔

---

کچھ عرصہ تک دونوں خاموش رہے۔ امتحانات نے دونوں کو مشغول رکھا۔ امتحانات کے بعد وہ پھر ملتے رہے اور جب اس کی امی پر اس راز کا انکشاف ہوا تو وہ اس پر برس پڑیں۔ خاندان کی عزت، باپ کے وقار کا واسطہ دلایا۔ جاوید کی امارت کا خاکہ کھینچا۔ سن و سال کے تفاوت کا احساس دلایا۔ بھک بھسال اور بچوں کے مستقبل کی تاریکی کا نقشہ کھینچا لیکن سب بیکار۔ کشور دیوانگی کی حد تک آگے بڑھ چکی تھی۔ وہ بہت فاصلے طے کر چکی تھی کہ پیچھے لوٹ جانے کا تصور بھی مشکل تھا۔ امی کے بعد اسے تعلیم ترک کرنے پر مجبور کیا گیا۔ ملاقاتوں پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ لیکن موقع پا کر وہ جاوید سے برابر ملتی رہی۔

ایک دن۔۔۔ کاش وہ دن اس کی زندگی میں نہ آتا۔ وہ جاوید کے اصرار پر اس کے گھر گئی۔ شاندار دو منزلہ عمارت میں اس کا خوبصورت فلیٹ تھا جس کے ذرّے ذرّے سے امارت ٹپکتی تھی۔ لیکن وہاں جا کر اسے کیا ملا؟ احساسِ کمتری اور احساسِ گناہ! جاوید کے گھر والوں کے غرور نے اس کے پندارِ خودی کو ٹھیس پہنچائی۔ وہ دل شکستہ واپس آگئی۔ لیکن جاوید کی تسلیوں نے اس کے ڈوبتے دل کو سہارا دیا۔ ایک بار پھر اس کے دل میں ایک نیا عزم پیدا ہوا۔ وہ اپنی قسمت پر ناز کرنے لگی۔ لیکن اب وہ زیادہ تر خاموش ہی رہتی۔ اُداس اُداس سی، کھوئی کھوئی سی۔ زندگی کی دلچسپیاں اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ گئیں۔ اس کی صحت گرتی گئی۔ اس کے ابّو اس کی اس ضد اور خاموش احتجاج کے آگے جھک گئے۔ خاندانی

...ر ملاقات رکھ کر وہ خود جاوید کے والد سے ملاقات کرنے
...دولت کے نشے میں چُور دولت رام نے اُن کی تضحیک کی۔ اُن
...اُڑایا۔ اُن کے بزرگوار رہ گئے۔ بیٹوں کی نا ...
...دار ہونا پڑا۔

...دوسرے ہی دن جاوید احساسِ پشیمانی و احساسِ ندامت میں
...کشور سے اپنے والد کے سلوک کی معافی مانگ رہا تھا۔ اُسے اپنی
...تھی دلا رہا تھا۔ اپنی محبت کا جواب مانگ رہا تھا لیکن اب کشور
...محبت مر گئی تھی۔ اُس کے تمام احساسات مر چکے تھے۔ اُس نے
...کہ وہ ایسے بزدل شخص پر اعتماد نہیں کر سکتی جس کے سامنے اُس کی
...گردی گئی۔ اُس کے شیشۂ خودی کو دولت کی جھنکار سے توڑ دیا
...خودداری پر کاری ضرب لگائی گئی اور وہ ایک تماشائی کی طرح
...لیا اور آج صفائی پیش کرنے آیا ہے۔ نفرت کا لاوا اُس کے دل میں
...ا۔

...کشور! تمھیں اُن لوگوں سے کیا سروکار ہے؟ تم یقین رکھو میں تمھارا
...ہے غموں کا مداوا تم ہو اور صرف تم! تمھارے بغیر میں جینے کا
...نہیں کر سکتا۔ میں تمھیں اپنی بنا کے لے جاؤں گا اور اُس گھر میں
...دلاؤں گا...."

...کشور نے بڑی طمانیت اور وقار سے کہا: "نہیں جاوید یہ نہیں
...میں اِس بات کی قائل ہوں ؎

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض
نہیں دیتے شعلہ شرر کے عوض

...محبت کی چنگاری اب بھی میرے وجود میں سُلگ رہی ہے جو میرے
...سا سکتی ہے۔ لیکن میں اُسے کبھی اِتنا بڑھنے نہ دوں گی کہ وہ
...اور خودداری کو جلا کر خاک کر دے۔ ویسے مالی اعتبار سے
...سے بڑے نہیں ہیں۔ گو یہ حقیقت ہے کہ میرے ابّو جان پر کبھی
...بار ہے اور وہ مجھے اِتنا نہیں دے سکتے جتنا تمھارے والد
...کو مطلوب ہے۔ ہمارے پاس اِتنا پیسہ ہے کہ ہم باعزّت زندگی
...۔ دولت ہمارے لئے ایک ذریعہ ہے، منزل نہیں۔ زندگی کا سہارا
...لیکن ایمان نہیں۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ مجھے بھلا دینے کی
...یہ"

...کی آنکھوں کے کنول آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ انھیں

- جب تک تمھارا دل صاف نہ ہو تم پاک و صاف کہلانے کے حقدار نہیں خواہ تمھارا جسم کیسا ہی آراستہ اور کپڑے کیسے ہی اُجلے کیوں نہ ہوں۔
- عالم ہونا بڑی خوبی کی بات ہے۔ علم تمھاری عزّت ہے۔ لیکن اگر تم خوش اخلاقی کی دولت سے محروم ہو تو تمھارا علم کسی کام کا نہیں۔
- ہمیشہ خدا کا شکر ادا کرتے رہو۔ عزّت، دولت، مرتبہ سب اُسی کی دی ہوئی نعمتیں ہیں۔ اگر وہ اپنی بخشش کا ہاتھ روک لے تو شہنشاہوں کو گداگر بنا دے۔ تخت و تاج تو کجا انھیں مانگے بھیک بھی نہ ملے۔
- ہاتھ، پاؤں اور جسم کی صفائی پانی سے کی جاتی ہے۔ کپڑے میلے اور ناپاک ہو جائیں تو انھیں صابن سے دھو لیا جاتا ہے۔ اِسی طرح اگر دل کا آئینہ میلا ہو جائے تو خدا کی عبادت سے اُس پر دوبارہ جلا آ جاتی ہے۔
- شیریں کلامی اور انکسار، یہ دو صفات بہت سی انسانی خوبیوں کا نچوڑ ہیں۔

(گورو نانک دیو جی)

پی جانا چاہتی تھی۔ اُس کا دل چاہتا تھا خوب رو دے۔ لیکن جاوید کے سامنے اپنی کمزوری کا اعتراف کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جاوید اُٹھ کر جانے لگا—— اشکبار آنکھوں سے وہ اُسے دیکھ رہی تھی۔ سر جھکائے، غم سے نڈھال، بوجھل قدموں سے وہ جا رہا تھا۔

اِس حادثہ کے بعد کشور کا دل بُجھ گیا—— وہ تنہائی میں سرد آہ بھر کر اکثر گُنگناتی ہے ؎

کچھ اتنے دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

# ...ائمکس

**معراج انور**

مکان ۴-۲-۶۵۴ /۱۷، یاقوت پورہ، حیدرآباد ۲۳ (آندھرا پردیش)

محترمی! تسلیمات

.. "بیسویں صدی" کے مطالعے نے آپ سے بے پایاں محبت پیدا کر دی ہے۔ دل چاہتا ہے آپ کو خوب صورت Love Letters لکھوں لیکن آپ کو کہاں فرصت جو انھیں پڑھیں۔ پھر بھی دل نہیں مانا، دوسروں کے Love Letters لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ ہمارے معاشرہ میں لَو لیٹر لکھنے والوں کی کمی نہیں لیکن ان لیٹرز کا کلائمکس سب سے جُدا ہے۔ اُمید ہے آپ کو پسند آئے گا اور قارئین کو بھی۔ اس افسانہ کا عنوان "رشتہ" بھی سوچا تھا اور "شاہکار" بھی ——— میں اُمید کرتا ہوں آپ اور قارئین "بیسویں صدی" مجھے ضرور Love Letters لکھیں گے!

مخلص ——— معراج انور

میرے خوابوں کی شہزادی انجم! اسلام شوق

خط لکھنے سے پہلے ضروری ہے کہ اپنے بارے میں کچھ لکھوں، لیکن ...ے بارے میں میں نے کیسے جانا ——— ؟ یہ لکھنا میں سمجھتا ہوں ضروری بھی اور دلچسپ بھی! بات یہ ہوئی تھی کہ کچھ دن پہلے میں نے تمھاری ذرا سی ... دروازے میں سے دیکھی تھی، میں کچھ اور قریب آتا، تم نے دروازہ بند ... اور پھر پلٹنے میں تمھیں کسی نے اندر سے پکارا ——— "انجم!" اور تم "جی آئی!" ... اندر چلی گئیں ——— تو انجم! میں نے تمھارا نام اس طرح سے جانا۔ بس ... دن سے تم میرے خیالوں پر چھائی ہو۔ ایک بار ایک جھلک دیکھی اور اب ... چاہتا ہے تمھیں پھر دیکھوں، تمھیں ہمیشہ دیکھتا ہی رہوں! لیکن تم ہو ... دروازے پر نظر ہی نہیں آ رہی ہو۔ بہت مشکل سے تمھاری ... کو آج اس بات پر راضی کیا ہے کہ تمھیں یہ خط لے جا کر دے دے۔ تمھاری ... بہت ہوشیار ہے۔ اس نے تمھارے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں ... سے تمھارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ تم ضرور ... گی۔ بس اب ختم کرتا ہوں۔ جواب کا انتظار کروں گا۔ جواب خادمہ کے ہاتھ ...

تمھارا ——— جمال

---

پیارے جمال! خلوص و محبت

تمھارا خط ملا ——— کیا بتاؤں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے میں برسوں سے تمھارا ہی انتظار کر رہی تھی! مجھے تمھاری ہی آرزو تھی! سچ پوچھو تو میں نے تمھیں اُس دن (شاید اُسی دن کی بات ہے جس کا ذکر تم نے خط میں کیا ہے) دیکھا اور اپنا دل دے بیٹھی۔ بس یوں سمجھو ———

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی!

شکر ہے کہ تم نے مجھے یہ خط لکھا ——— نہیں تو میں اپنے خوابوں کے شہزادے کو بس دل ہی میں سجائے بیٹھی رہتی۔ حالِ دل کس طرح سُنا سکتی؟ اپنے بارے میں کیا لکھوں؟ بس ایسی ہوں کہ تمھیں ضرور پسند آؤں گی (تمھاری پسند اس کی شاہد ہے) تعلیم پوچھو گے، تو اتنی کم بھی نہیں کہ ———

نامۂ محبت میں حالِ دل سُنا نہ سکوں!

والد صاحب اور بھائی جان کے بارے میں تو تم دروازے پر نام کی پلیٹ دیکھ کر جان سکتے ہو۔ پھر بھی عرض ہے والد صاحب وظیفہ یاب ہیں اور ایک بھائی ہیں جو سی۔ کی۔ ڈی میں ملازم ہیں۔ تم نے انھیں ضرور دیکھا ہوگا۔

جمال! دل تو چاہتا ہے بس تمھیں لکھتی ہی رہوں، چاہت اور محبت کی باتیں، پیار کی باتیں، اقرار کی باتیں! پر کیا کروں تمھارے پاس یہ خط جلد سے جلد پہنچانے کے لئے بھی تو دل بے قرار ہے اس لئے خط بند کرتی ہوں۔

تمھاری ——— انجم

---

جانِ من انجم! ہدیۂ محبت قبول کرو

یہ میرا تیسرا خط ہے! تمھیں حیرت ہوگی، تمھیں تو ایک ہی خط ملا تھا۔ یہ تیسرا خط کیسے ہو گیا ——؟ دوسرا خط کہاں گیا ——؟ بات یہ ہوئی انجم کہ میں نے دوسرا خط تمھارے پہلے خط کے جواب میں لکھا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ خط تمھیں خود اپنے ہاتھوں سے دوں۔ اس طرح تمھارا دیدار بھی ہو جاتا۔ اس خیال سے تمھارے گھر کے کئی چکر لگائے۔ لیکن تم دروازے پر نظر نہ آئیں۔ تمھارے بھائی ضرور نظر آتے۔ اور ہاں ——— انجم! تمھارے بھائی مجھے ذرا شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے، کیا انھیں ہمارے نامہ و پیام کا پتہ چل گیا (خدا نہ کرے) ہم ضرور ملیں گے۔ انجم! ہماری محبت کامیاب ہوگی۔ مجھے امید ہے تمھارے بھائی ہماری محبت میں حائل نہ ہوں گے۔ بس ہماری محبت سچی محبت ہو۔ تمھاری خادمہ کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ خط تمھیں کو لے جا کر دے۔

آگے پھر لکھوں گا۔ تم ذرا جلدی سے میرا وہ شک (خدا کرے شک ہی ہو) دور کرنے کی کوشش کرو۔

بس تمھارا ہی ——— جمال

---

میرے جمال!

دل و جان سے اپنی انجم کا سلام قبول کرو

دل تو چاہتا ہے تمھیں صفحات کے صفحات لکھ ڈالوں۔ لیکن تم نے جلدی سے اس "شک" کے بارے میں پوچھا ہے۔ ہاں میرے جمال! وہ تمھارا شک ہی ہے۔ تم نے میرے بھائی کو ضرور دیکھا۔ لیکن اُن کا دل نہیں دیکھا۔ تم نہیں جانتے وہ مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ اگر انھیں معلوم بھی ہو گیا تو میں سمجھتی ہوں وہ کچھ نہ کریں گے، کچھ نہ کہیں گے۔ میری پسند اُن کی پسند ہوگی۔ وہ جتنے بڑے ہیں اُن کا دل بھی اُتنا ہی بڑا ہے۔ ایک بار پھر کہتی ہوں کہ اُن کی فکر نہ کرو میرے جمال! دل چاہتا ہے اِس خط کے بجائے میں ہی تمھارے پاس آ جاؤں! ایسا ہوگا ضرور ایک دن ——— اچھا خط ختم کرتی ہوں تمھارا شک ——— دور کرنے کی جلدی بھی تو ہے۔

تمھاری اپنی ——— انجم

---

پیاری انجم! سلام شوق و خلوص

تمھارا خط ملا۔ بس کچھ نہ پوچھو کتنی خوشی ہوئی یہ پڑھ کر کہ میرا شک شک ہی تھا۔ شکر ہے خدا کا!

تمھارا دل چاہتا ہے میرے پاس آؤ ——— انجم ضرور آؤ! میری آنکھیں تمھیں دیکھنے کو ترس رہی ہیں۔ میں تو چاہتا ہوں ہر وقت تمھیں دیکھا کروں تمھاری ہی قربت نصیب رہے۔ میں نے سوچا ہے انجم کہ تمھارے گھر اپنی بہن کو بھیجوں، تم اُس سے مل کر ضرور خوش ہوگی۔ اِس طرح ہم دونوں کے گھر آنا جانا ہو جائے گا اور میں تمھیں دیکھ بھی سکوں گا، تم سے مل سکوں گا۔ لیکن تمھیں ایک بات کرنی ہوگی، میری بہن کو اپنی سہیلی ظاہر کرنا۔ ذرا ہوشیاری کا کام ہے تم سوچ کر کوئی پلاٹ تیار کرو اور مجھے اطلاع دو۔ میں اپنی بہن کو سمجھا دوں گا میری بہن کا نام ثریا پروین ہے۔

باقی دوسرے خط میں ———!

تمھارا اپنا ——— جمال

---

میرے محبوب جمال!

تمھاری انجم آداب بجا لاتی ہے

تمھارا خیال بہت اچھا ہے۔ تم خط میں لکھ بھیجو کہ کب تک ثریا کو بھیج رہے ہو۔ ویسے میں نے ابھی سے گھر میں اُن کے آنے کا ذکر شروع کر دیا ہے کہ ویسے کہ چند روز میں میری بہت ہی پیاری سہیلی ثریا پروین آنے والی ہیں تعلیم کے زمانے کی بہت ہی پُرخلوص دوست ہیں۔ اُن کے آنے کی اطلاع جلد دینا۔ اب رخصت ہوتی ہوں۔ میرا سلام ثریا سے ضرور کہنا۔

تمھاری ——— انجم

---

میری اپنی انجم! محبت بھرا سلام

پرسوں ثریا کو تمھارے گھر بھیج رہا ہوں۔ شام کے چار پانچ بجے

انتظار کرنا۔ پھر میں ـــــ اپنی جان، اپنے دل کی دھڑکن کو دیکھنے کے لئے انتظار کی گھڑیاں گنوں گا۔ ثریا کو اپنے آنے کی تاریخ ضرور بتا دیجئے تاکہ انتظار کی شدت کم ہو جائے۔ خدا حافظ!

تمہارا منتظر ـــــ جمال

---

جناب جمال صاحب السلام علیکم

پرسوں آپ کی بہن آئی تھیں۔ لیکن انھیں انجم نہ مل سکیں۔ وہ گھر میں نہیں تھیں (شاید آپ کی بہن نے یہ بات بتادی ہوگی) لیکن سچ پوچھو تو کوئی انجم ہمارے گھر میں ہے ہی نہیں ـــــ شاید میں نے کچھ غلط بھی لکھ دیا۔ آپ نے جس انجم کو دیکھا تھا اور جن کا نام سنا تھا وہ ضرور تھیں، وہ میری سب سے چھوٹی خالہ تھیں جو اسی دن اپنے شوہر کے گھر چلی گئیں، جس دن آپ کا پہلا خط ملا تھا اور اس ڈرامہ کی ہیروئن "انجم" میں ہی ہوں! ارے!! اتنا ہی پڑھ کر آپ کی جبیں عرق آلود ہو گئی؟ اصل خط تو اب شروع ہو رہا ہے

ہاں تو جناب جمال صاحب! پرسوں آپ کی بہن میرے گھر آئی تھیں۔ امی سے ملیں اور انھوں نے امی کو کافی متاثر کیا۔ واقعی آپ کی بہن صورت و سیرت، خوش گفتاری، بلند کرداری کے اعتبار سے مثالی لڑکی ہیں۔ امی کے کہنے پر میں نے انھیں جھانک کر دیکھ لیا تھا (آپ بھی تو اپنی "خیالی انجم" کو دیکھنا چاہتے تھے) بس اسی وقت سے میں نے اور امی نے سوچا ہے کہ اگر آپ کے والدین، آپ اور ثریا بھی پسند کریں تو اس رشتہ کے لئے مجھے قبول فرمائیں ـــــ کیا اپنے تعارف کے لئے مجھے کچھ لکھنا ہوگا

سب کی رائے کا منتظر ـــــ اقبال صدیقی

---

محترم بھائی اقبال صاحب اسلام خلوص

آپ کا خط ملا۔ میں اپنی نادانی کے لئے شرمندہ ہوں۔ معافی چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کے بارے میں والد صاحب اور امی کو بتایا۔ انھیں یہ رشتہ بدل و جان منظور ہے ـــــ ثریا بھی راضی ہوگئی۔ اس سلسلے میں اور باتوں کے لئے آپ خود والد صاحب کو خط لکھ سکتے ہیں اور مل سکتے ہیں۔

آپ کا اپنا بھائی ـــــ جمال

---

پیارے بھائی اسلامِ شوق و محبت

میں نے بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ آپ نے بھی پڑھے ہوں گے تنقید نگاروں

پروفیسر حسن مجتبیٰ ایم۔ اے

وابستہ جس قدر بھی رہے سرخوشی سے ہم
اُتنے ہی اب دوچار ہیں افسردگی سے ہم

جب ہو سکا نہیں ہے نہ اِس کا کوئی علاج
پھر اپنے دردِ دل کی کہیں کیوں کسی سے ہم

بے اختیار روٹھ گیا ہم سے جب کوئی
بے اختیار روٹھ گئے ہر کسی سے ہم

ہر سمت چھا گئی ہے جہالت کی تیرگی
ہر سُو گھرے ہوئے ہیں "نئی روشنی" سے ہم

ترکِ خلوص، ترکِ وفا، ترکِ دوستی
طے کر گئے ہیں مرحلے کِن سادگی سے ہم

کیا ایک رات ہی میں خدا بن گیا ہے وہ؟
کل شام ہمکلام تھے جس آدمی سے ہم

مجھی آ نصیبِ غیر ہیں اب اُن کی قربتیں
ہیں ہمکنارِ لذتِ پہلو تہی سے ہم

ن۔ ن۔ مجی

کی رائے میں ان میں کئی شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں لیکن میری اپنی نظر میں میرا یہ افسانہ، میری زندگی کی یہ کہانی، جس کا میں خود ہیرو بھی ہوں اور ہیروئن بھی۔ میرے سارے افسانوں میں سب سے بلند پایہ شاہکار ہے!! اس کا کلائمکس کتنا خوبصورت ہے!

قبلہ والد صاحب اور والدہ صاحبہ کی خدمت میں میرا اسلامِ نیاز پیش کیجئے ـــــ آئندہ جمعہ کو خود بھی قدم بوسی کے لئے حاضر ہو رہا ہوں!

آپ کا بھائی ـــــ اقبال صدیقی

کیٹو ۹٫۵۰

پے بیٹ ۱۸٫۹۵۔۱۳٫۹۵

# پیدل چلنے کے رواج کو پھر سے رواج دینے کیلئے

جونہی آپ باٹا کے جوتے پہن کر چلتے ہیں آپ آرام اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ہلکے پیروں سے خوشگوار طور پر چلنے کے لئے بھروسے کے قابل ہلکا اور لچکدار جوتا آپ صرف باٹا انجینئرنگ کے ذریعے پاسکتے ہیں پھر اس پر مزہ یہ کہ آپ ان جوتوں میں جدید طرز کے فیشن ایبل لباس کے ساتھ بھی جچتے ہیں۔ مضبوط خوبصورت اور پائیدار ڈیزائنوں میں خاص طور پر بہترین سامان فن کے ذریعہ بنے ہوئے یہ جوتے آپ کو صحیح انتخاب کا یقین دلا سکتے ہیں۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ باٹا کے جوتے پیدل چلنے کے لئے ہی بنائے جاتے ہیں۔ چلئے میلوں چلئے روزانہ چلئے۔

پلوما ۱۴٫۵۰

ڈی آئی بی واک ماسٹر ۳۶٫۹۵

**Bata**

ایکزیکیٹیو ۵۳٫۹۵

ریتو ۱۶٫۹۵

# تم کہاں ہو؟

شعیب ردولوی ایم۔ اے

انفارمیشن ڈویژن سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ رڑکی۔ یو۔ پی

محترم خوشتر بھائی! تسلیم

گذشتہ دنوں جب ایک طویل وقفہ کے بعد میری کئی کہانیاں یکے بعد دیگرے شائع ہوئیں تو لوگوں نے سمجھا کہ میں اسی رفتار سے لکھتا رہوں گا۔ لیکن گذشتہ بار جب میں افسانہ نمبر میں شامل نہ ہو سکا تو لوگوں نے یہی سوال کیا ——— میری غیر موجودگی کی وجہ؟ میں نے بہت سارے عذر بھی پیش کئے لیکن دل ہی دل میں شرمندہ تھا اور طے کیا تھا کہ کوشش کروں گا آئندہ ایسا تساہل نہ ہونے پائے۔ بعض لوگوں نے تو وہ تیر و نشتر بھی جو آپ ہی سے سیکھے ہیں، میری طرف اچھال دیتے تھے اور شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ میں راہ راست پر آگیا! ——— "تم کہاں ہو؟" سالنامہ کے لئے بھیج رہا ہوں۔ اس کے متعلق میں اپنی رائے کیا دوں، مجھے تو آپ کی رائے چاہئے۔ یوں مجھے اُمید ہے کہ آپ کو بھی حسبِ سابق میری یہ کہانی بھی پسند آئے گی ——— سالنامہ کے لئے نیک خواہشات! اُمید

نیازمند ——— شعیب ردولوی

"اسما! تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟" شکیب میرا سراپا دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں کیا کروں۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا۔" دل کی آگ ہونٹوں پر سے ہو کر گزر گئی۔

"سمجھ بوجھ تو اُس وقت آسکتا ہے جب تم سمجھ داری سے کام لو۔ خدا کے لئے اتنی جذباتی نہ بنو۔ میں نے تم پر بہت ناز کیا ہے، میرے لئے تمھاری قربت اور تمھاری دوستی باعثِ فخر رہی ہے۔ میں نے نہ جانے کتنی بار اپنے دوستوں سے تمھاری سمجھ داری اور سنجیدگی کے دعوے کئے ہیں۔ وہ سب کیا کہیں گے میرے اور تمھارے بارے میں، کیا سوچیں گے۔ کچھ تو غور کرو اسما! کبھی کبھی انسان کو بہت کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے بہت سخت امتحان سے، ایسے نازک موقعوں پر یہ لازم ہے کہ ہوشمندی اور سمجھ داری سے کام لیا جائے۔ یہ وقت ہماری آزمائش کا ہے۔ ہمت اور حوصلہ سے کام لو اسما!" شکیب کی آواز میں ارتعاش پیدا ہوا اور وہ چند لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔ میں اُس کا چہرہ تک رہی تھی۔

کتنی دلکش ہے اُس کی شخصیت! کتنا باوقار ہے وہ! مجھے جب بھی اُس کی قربت ملتی میری رُوح مطمئن ہو جاتی۔ نہ جانے کتنی بار ذہن نے اِس خیال کو تقویت دی کہ اگر مجھے اُس کی پناہ مل گئی تو زندگی میں رنج و غم کبھی میری طرف رُخ کرنے کی ہمت نہ کرسکیں گے ——— "شکیب! خدا کے لئے میرے ہم خیال ہو جاؤ۔" دل کی آواز دل ہی میں رہ گئی۔

"اِس وقت میں تمھارا ہم خیال کیسے ہو سکتا ہوں اسما!" اُس نے میرے دل کی آواز سن لی تھی۔ اِسی کو تو کہتے ہیں دلی تعلق، رُوحانی لگاؤ ——— "جہاں تک سوال ہے شادی کرنے کا، اِس میں کسی طرح کی کوئی دُشواری نہیں۔ ہم تم ابھی اور اِسی وقت کورٹ چل سکتے ہیں۔ ہماری مرضی اور خواہش کے درمیان نہ سماج حائل ہو سکتا ہے اور نہ زمانہ ——— لیکن یہ قدم اُٹھانے سے پہلے حالات کا جائزہ لو۔ اِن واقعات کو عقل و دانش کی روشنی میں پرکھو اور اگر اُس کے بعد بھی تم یہ سمجھتی ہو کہ ہمارے اوپر جبر کیا جا رہا ہے اور تمھارا یہ خیال ہے کہ ہماری چاہت اور قربت کے درمیان لوگ صرف اِس لئے حائل ہو رہے ہیں کہ

ہم نے ایک دوسرے کو بغیر کسی کی اجازت کے چاہا ہے اور اگر تمہارا یہ نظریہ ہے کہ ... وہ لوگ تم سے صرف اس لئے بدظن ہیں کہ تم میرے قریب آگئی ہو تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی بھی مجھ سے تمہیں نہیں چھین سکتا۔" شکیب مردانہ وجاہت کا باوقار نمونہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے دلکش چہرے سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

"میں کیا سوچوں شکیب! میرا دماغ تو ماؤف ہوگیا ہے، فیصلہ کرنے کی قوت جیسے کسی نے سلب کرلی ہو۔" دل میں دہکتے ہوئے انگاروں کو میں نے اس کی طرف اچھال دیا۔

"دیکھو اسماء! اگر ہم حالات کا جائزہ ایمانداری سے لیں تو سارے کے سارے لوگ بے قصور نظر آتے ہیں۔ جب تمہارے والدین نے تمہاری شادی

---

- کسی سے ناپسندیدہ بات نہ کرو۔ (قرآن پاک)
- ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ (قرآن پاک)
- جس کام میں اللہ کی نافرمانی ہو اس میں کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- بہتر وہ لوگ ہیں جو قرض کو خوش دلی سے ادا کرتے ہیں۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- جب عقل کامل ہوتی ہے تو گویائی کم ہو جاتی ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- اپنے ظاہر اور باطن کو یکساں رکھو۔ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ)

---

کی ذمہ داری ظفر کو سونپ دی تھی اور اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اپنی چھوٹی بہن کی شادی تمہی کو کرنی ہے۔ کوئی مناسب لڑکا ملتا ہے تو رشتہ طے کر دینا، ہم لوگوں کے صلاح مشورہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تو اب تم خود ہی بتاؤ کہ تم اپنے بڑے بھائی کو کس طرح موردِ الزام قرار دے سکتی ہو، تمہارے والدین بھی اس لئے بے قصور ہیں کہ یہ ذمہ داری انھوں نے ظفر کو چار سال پہلے سونپی تھی اور اس وقت میں تم اور سب سے بہت دور تھا۔ ہمارا تمہارا ساتھ صرف اس لئے ہو گیا کہ ہمارا مضمون ایم۔ اے میں ایک ہو گیا ورنہ یونیورسٹی میں ہم ایک وقت میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے نہ مل پاتے اور یہ بات بہت افسوسناک ہوتی۔"

"مگر اس سے زیادہ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے ملنے کے بعد، ایک دوسرے کو پرکھنے اور چاہنے کے بعد بھی ایک دوسرے کو حاصل نہیں کر پا رہے ہیں، کیا یہ کم افسوسناک بات ہے؟" میں نے زہر میں بجھا ہوا نشتر اس کی طرف پھینک دیا۔

"یہ بات یقیناً تکلیف دہ ہے لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہوتی اگر ہم خاموشی سے شادی کر لیں۔ جب تم خود ہی کہہ رہی ہو کہ ظفر نے تمہارا رشتہ طے کرنے سے پہلے تمہارے والدین کو لڑکے کے مکمل حالات سے مطلع کر دیا تھا اور اس کے بعد تمہاری نسبت طے کی تھی تو پھر اس نے جرم کیا کیا؟ سچ بات تو یہ ہے کہ جیسے ہی اس کے خطوط آنے لگے تھے تمہیں میرے متعلق اپنے گھر والوں کو بتا دینا چاہئے تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم اپنے والدین کے سامنے زبان نہ کھول سکتی تھیں۔ لیکن دوسروں کے ذریعہ یہ بات ان کے گوش گذار کی جا سکتی تھی کہ تمہارا رجحان کسی اور کی طرف ہے۔" وہ مجھ سے شکایت کر رہا تھا۔

"خدا کے لئے سمجھنے کی کوشش کرو شکیب! مجھے تو کچھ بھی علم نہ تھا۔ اس بار جب میں تعطیلات میں گھر پہنچی تو سارے حالات معلوم ہوئے۔ ظفر کے خطوط بھی مجھے اتفاق سے مل گئے جو اباجان کی الماری میں تھے ورنہ مجھے تو کچھ بھی علم نہ ہوتا ــــــ لیکن شکیب! مجھ سے میری مرضی تو پوچھی جاتی، مجھ سے دریافت تو کیا جاتا۔ کیا تم اسے زیادتی نہ کہو گے؟" میں اس کے منہ سے فیصلہ سننا چاہتی تھی۔

"تم سے اس معاملہ میں دریافت نہ کرنے کی کئی وجوہ ہیں۔ ہمارا معاشرہ ابھی تک پرانی قدروں پر کاربند ہے جہاں لڑکیوں سے ایسی باتیں دریافت کرنا معیوب سمجھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تمہارے بھائی اور تمہارے والدین کو تم پر پورا اعتماد ہے کہ تم کبھی کوئی ایسا قدم نہ اٹھاؤ گی جو بدنامی کا باعث ہو۔ اسی بھروسہ پر تمہیں یہاں پڑھنے کے لئے بھیج دیا۔ آخر کوئی بات تو تھی کہ تم پر اتنا اعتبار کر لیا اور تم تن تنہا علی گڑھ پڑھنے چلی آئیں۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ تم سے دریافت کئے بغیر تمہاری نسبت طے کر دی۔ یہ ساری باتیں اعتماد اور بھروسہ کی ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ تم ان کے فیصلہ کو مان لو گی۔ گذشتہ بائیس سال سے وہ تمہیں پرکھتے آئے ہیں اور یقیناً تم ہر بار ان کے پیمانہ پر پوری اتری ہو۔ اس کے بعد ہی انھوں نے یہ فیصلہ کیا ہے ــــــ اب جہاں تک سوال ہے میرا، انھیں کیا معلوم کہ تم مجھے پسند کرتی ہو۔ تمہارے یہاں آج تک میرے جانے کا اتفاق نہ ہوا، تم نے میرے بارے میں اپنے والدین اور اپنے بھائی سے کوئی تذکرہ نہ کیا۔ ظاہر ہے ان سے ایسی باتیں کرنے کا کیا سوال، اب تم ہی بتاؤ اسماء!

انھیں الہام تو ہونے سے رہا۔ تم یقین کرو اگر انھیں میرے متعلق پتہ چل جاتا تو ایک بار تم سے ضرور پوچھتے تم سے راستے ضرور لیتے، اسما! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

میری اشکبار آنکھیں اُس کے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔ چشمہ کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کتنی گہرائی ہے۔ میں جانتی ہوں اِس کے اندر ایک ہیجان بپا ہوگا، دل میں آتش فشاں اُبل رہا ہوگا۔ لیکن کیسے صبر و ضبط سے کام لے رہا ہے۔ کون ہو سکتا ہے اتنا بلند انسان! اتنی عظیم شخصیت کا مالک۔

"ملاقات کرنے اور قریب آنے سے پہلے دوسرے کے بارے میں کوئی رائے قائم کر لینا دانشمندی نہیں ہے اسما!" شکیب میرے دل کی آواز سُن کر بولا۔ "مجھے یقین ہے انور تمہیں وہ سب کچھ دے سکے گا جس کے تم نے اب تک خواب دیکھے ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ ہے، مہذّب بھی ہوگا۔ سمجھداری اور سنجیدگی اُس کی سرشت میں داخل ہوگی۔ ہم تم دوست کی طرح ملتے رہیں گے۔ مجھے اُس پر اعتماد ہے کہ ہماری دوستی میں رخنہ نہ ڈالے گا۔ بشرطیکہ تمہارا جوش و خروش اِسی طرح برقرار رہے۔"

"شکیب ـــــ خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ!" میرے اندر کی دہکتی ہوئی آگ آنکھوں سے نکلنے لگی۔

اور پھر میں ایسے بھیانک دَور سے گزری کہ مدت تک اپنا ہوش نہ رہا۔ شکیب سے بچھڑ جانے کا غم اِتنا گہرا تھا کہ زندگی میں چاروں طرف سناٹا محسوس ہونے لگا، ویرانی سے جب میں مانوس ہو چلی تھی کہ تنہائیاں میرے سارے وجود کو پارہ پارہ کر گئیں۔ شکیب مجھے تمام تر دلکشی کے ساتھ پھر یاد آیا اور اُس کی کہی ہوئی یہ بات بھی ـــــ "کبھی کبھی انسان کو بہت کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، بہت بڑے امتحان سے! ایسے نازک موقعوں پر لازم ہے کہ ہوشمندی اور سمجھداری سے کام لیا جائے۔" مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ایسے امتحانات میرا مقدر بن گئے ہیں۔ مجھے حوصلہ دے میرے اللہ!

جس لمحے سے میں گھبرا رہی تھی وہ بھی سر سے گزر گیا۔ میں دُلہن بنی، میری شادی ہو گئی اور میں انور کے ہاں آ گئی۔ انور میرا بہت خیال رکھتے تھے، مجھے ہر وقت مسرت میں جھومتی دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ بہت پیاری اور دلکش باتیں کرتے تھے۔ نئی زندگی کے بارے میں بہت سارے پلان بنا رکھے تھے۔ انھوں نے اور ہر بات میں میری رائے اور مشورہ لیتے۔ جب میں اُن کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہو گئی تو میں نے ایک شام شکیب کے بارے میں بتایا کہ میرا بہت اچھا کلاس فیلو رہ چکا ہے اور آج کل ریزرو بینک آف انڈیا کی کلکتہ برانچ میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہے۔ انور نے اُس سے رابطہ قائم کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ شکیب سے خط و کتابت ہوتی رہی، وہ بہت ہی دلکش خطوط لکھتا تھا اِس کی تائید و تعریف انور بھی کر چکے تھے۔ میں نے اُسے بار بار دہلی آنے کی دعوت دی۔ ہر بار اُس نے یہی جواب دیا کہ وہ خود بھی مجھ سے ملنے کا بہت مشتاق ہے لیکن مصروفیات ابھی اجازت نہیں دے رہی ہیں۔

میری ازدواجی زندگی میں مصروفیات اور ذمہ داریاں بڑھتی گئیں اور شکیب سے یہ کاغذی تعلق آہستہ آہستہ ختم سا ہو گیا۔ شکیب کو ترقی مل گئی تھی اور وہ اب لکھنؤ آ گیا تھا۔ اِس دَوران ہماری حیات کے چمن میں دو شگفتہ غنچے مسکرا اُٹھے تھے جو میری تمام تر توجہ اور محبت کا مرکز بن گئے تھے۔

---

- ماضی کی یاد اور مستقبل کے خواب میں کھوئے رہنے سے کہیں اچھا ہے، تم اپنے حال کی تعمیر کرو۔ (سوامی ویویکانند)
- بُرائی کے خلاف لڑنا انسان کا سب سے بہتر عمل ہے۔ (گورونانک جی)
- گرتے کو اُٹھاؤ، بے سہارے کو سہارا دو، کسی کی بگڑی بناؤ، کسی کے درد کا درماں بن جاؤ، ایشور تم سے خوش ہوگا۔ (سوامی ویویکانند)
- جتنی زیادہ حرص ہوتی ہے اُتنا ہی ایشور پر وشواس کم ہوتا ہے۔ (مہابھارت)

---

میں اور شکیب اپنی اپنی مصروفیات کی بِنا پر تقریباً چھ سال تک ایک دوسرے سے بے تعلق سے رہے کہ ایک شام دفتر کی واپسی پر انور نے بتایا کہ اُسے ایک میٹنگ کے سلسلے میں لکھنؤ جانا ہے، میرا دل شکیب سے ملنے کے لئے بے اختیار تڑپ اُٹھا۔ انور سے میں نے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ بہت خندہ پیشانی سے بولا ـــــ "ضرور چلو! میری بھی تو اُس ہستی سے ملاقات کراؤ جسے تم مونس و محسن سمجھتی ہو۔"

میں نے شکیب کو اطلاع نہ دی۔ سوچا اُسے خوشگوار حیرت میں ڈال دیا جائے، ایک بار پھر وہ مجھے پوری شدت سے یاد آنے لگا۔ لکھنؤ اسٹیشن سے ہم نے اُس کی کوٹھی کا رُخ کیا۔ وہ میڈیکل کالج کے آخری سرے پر "آشیان" نام کی کوٹھی میں رہتا تھا۔ اُس نے ایک بار مجھے لکھا تھا ـــــ "اسما! جس کو کہیں کے

فلیٹ میں میں رہتا ہوں اس کا نام آشیاں ہے۔ نام خوبصورت ضرور ہے لیکن موزوں نہیں۔ کیونکہ ایک بار میں نے آشیاں تعمیر کرنے کی کوشش کی تھی اور ابھی چند تنکے ہی جمع کر سکا تھا کہ برق گر پڑی۔ اس وقت سے اب تک آشیاں کا خواب دیکھتا چلا آ رہا ہوں۔ میں نے اسی لئے اس کوٹھی کا نام خوابِ آشیاں رکھ دیا ہے، تم اپنے خط کے پتہ پر یہی لکھنا۔"

ایک بار میں نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ شادی کر لے، آشیاں بن جائے گا، خواب کی تعبیر مل جائے گی۔ اس نے جواب میں صرف ایک جملہ لکھا تھا ــــــ

"میاں بیوی دراصل وہ ہوتے ہیں جو ذہنی طور پر ایک دوسرے سے بندھے ہوں۔" اور اس جملہ کو پڑھ کر میں کانپ گئی تھی۔

جب ہم "آشیاں" کا گیٹ کھول کر اندر داخل ہو رہے تھے، میری نظر سامنے بالکونی پر پڑی جہاں ایک عورت بال سنوار رہی تھی ــــ شکیب نے شادی کر لی؟ یہ خیال میرے ذہن پر بجلی بن کر ٹوٹا۔ اس نے مجھے اطلاع بھی نہ دی اور اس کے خطوط کا ایک ایک جملہ میرے ذہن میں زہر ٹپکاتا رہا۔

"تمہارے علاوہ بھی اور بہت سارے کرم فرماؤں نے مجھے شادی کے لئے زور دیا لیکن اسما! شادی کیسے کر لوں، کوئی ایسی لڑکی ہی نظر نہ آئی جس سے مل کر میری روح کو سکون مل جاتا۔"

"اسما! مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے، میری زندگی کے ریگزاروں میں اگر تمہاری شخصیت نہ آئی ہوتی تو زندگی تشنہ محسوس ہوتی۔"

میری ساری ہمدردیاں جو اس کے لئے تھیں یکایک ختم ہو گئیں۔ میں دل ہی دل میں سوچتی رہی کہ شکیب نے جو کچھ کہا تھا سب غلط! اس کے سارے دعوے جھوٹے! ساری باتیں کھوکھلی! میری یادیں اتنی کاغذی اور اتنی سطحی ہوں گی، میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ میں اسے آج تک پوجتی آئی تھی، اسے فرشتہ سمجھتی تھی، لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ سب ایک ڈھونگ ہے ــــــ وہ اتنی جلدی مجھے بھلا بیٹھے گا، میں نے اس کا تصور بھی نہ کیا تھا۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب وہی عورت ڈرائنگ روم میں آئی۔

"ہمیں شکیب صاحب سے ملنا ہے۔" انور نے اسے مخاطب کیا۔

"اندر آ جائیے۔ آپ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں؟" اس نے مسکرا کر ہمارا استقبال کیا اور میرا دل چاہا اس کے منہ پر طمانچہ مار دوں۔

"دہلی سے ــــ" انور نے حسبِ عادت اختصار سے کام لیا۔

"کیا آپ ہی اسما ہیں؟" اس چڑیل نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔

"جی ہاں ــــ" میں بمشکل تمام بول سکی۔

"آپ کو شکیب صاحب بہت یاد کرتے ہیں، کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب آپ کا ذکر نہ کریں۔ وہ آج کل بہت پریشان ہیں۔ وہ دل کے عارضے سے پریشان رہتے ہیں۔ یہاں میڈیکل کالج میں بہت علاج کرایا لیکن کوئی افاقہ نہ ہو سکا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا ہے کہ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں جا کر دکھائیں۔ کل رات ہی کو وہ یہاں سے روانہ ہوئے ہیں اور وہ آپ کے ہاں ٹھہرنے کو کہہ رہے تھے۔"

"آپ بیگم شکیب ہیں ــــ؟" مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔

"جی نہیں" وہ گھبرا سی گئی "شکیب بھائی میرے شوہر کے بہت اچھے دوست ہیں۔ ہم لوگ پچھلے ہی سال یہاں پٹنہ سے آئے ہیں۔ مکان کی دشواری ہر جگہ ہوتی ہے۔ شکیب بھائی کا اصرار تھا کہ ہم یہاں آ جائیں۔"

میری شرمندگی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میں نے شکیب کو کتنا غلط سمجھا! میں ندامت کے پہاڑ کے نیچے جیسے دب سی گئی۔ میں نے انور سے کہا: "مجھے دہلی فوراً پہنچنا ہے ورنہ شکیب واپس چلا آئے گا۔ یہ اس کی صحت کا سوال ہے اور میں ذرا سی بھی غفلت نہیں کر سکتی۔"

میں بذریعہ ہوائی جہاز لکھنؤ سے دہلی واپس آ گئی۔ تمام راستے میں صرف یہ دعا مانگتی رہی کہ وہ مل جائے۔ میں اس کا اچھے سے اچھا علاج کراؤں گی، اس کی خدمت کروں گی، مجھے یقین تھا کہ میری قربت ہی اسے صحت مند کر دے گی۔ ٹیکسی جیسے ہی میرے فلیٹ کے سامنے رکی، میں دیوانہ وار اندر کی طرف بھاگی۔ میں اس سے ملنے کے لئے اتنی بیقرار تھی کہ ایک لمحہ بھی ضائع کرنا نہ چاہتی تھی۔ کوئی مقناطیسی کشش مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ برآمدے میں ہاشم ملا، میرا نوکر، وہ بھی پریشانی میں پڑ گیا۔ اس نے بتایا کہ آج صبح ایک مہمان آئے ہیں جو برابر والے کمرے میں سو رہے ہیں۔ میں تڑپ کر اس کمرہ میں داخل ہوئی۔ وہ سو رہا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچی اور مجھے چکر آ گیا۔

مجھے یاد آیا کہ ایک بار میرے اصرار پر اس نے لکھا تھا ــــ "اسما! میں وعدہ کرتا ہوں تم سے ملنے ضرور آؤں گا، زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر تم سے ملاقات ضرور ہو گی! اگر ایسا بھی نہ ہو سکا تو مرنے سے پہلے تمہارے آستاں پر جبیں سائی ضرور کروں گا!"

اس کے چہرے پر روشنی تھی، اطمینان تھا جیسے اس کی روح مطمئن ہو کر اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا!!

## ضیا فتح آبادی ایم۔ اے

ایک پل کو سہی، پردہ تو اُٹھا
حاصلِ عمر یہ پل ہو جائے

عشق گردن زدنی ہے، دیکھو
بازوئے حسن نہ شل ہو جائے

ترجمانِ دلِ پروردۂ غم
میرا ہر شعر غزل ہو جائے

کیوں نہ یہ کیفِ نگاہِ ساقی
آبِ انگور میں حل ہو جائے

اِک نگاہِ غلط انداز اِدھر
تاکہ تکمیلِ غزل ہو جائے

گرم ہے اُن کے کل آنے کی خبر
آج ہی کاش وہ کل ہو جائے

وعدے کرتے رہیں، گو روز ضیاؔ
کل سے آج، آج سے کل ہو جائے

ضیا فتح آبادی

## عزیز وارثی

نظر ملانے گئے تھے نظر ملا نہ سکے
قریب جا کے بھی موسیٰ قریب جا نہ سکے

نگاہِ شوق پہ ہم اختیار پا نہ سکے
چھپائی لاکھ محبت مگر چھپا نہ سکے

رہینِ زُلف تو برسوں سے جا اسیر ہوں
شعورِ عشق کی سرمستیوں کو پا نہ سکے

کوئی بتائے کہ اب اُن کی آبرو کیا ہے
وہ خار جو مری وحشت کے کام آ نہ سکے

جسے کبھی تری فرقت بھی راس آ نہ سکی
یہ کیا عجب تری قربت بھی راس آ نہ سکے

فریب کا زمانے میں عمر گزری ہے
مگر یہ غم ہے کسی سے فریب کھا نہ سکے

متاعِ جن کا ذکر ہر اِک شعر میں اُنھیں کے حضور
عزیزؔ وارثی اپنی غزل سُنا نہ سکے

عزیز وارثی

## حقی حزیں ایم۔ اے

کیوں نہ اپنی انتہا کی اِبتدا کرتے چلیں
یعنی دل سے دُور فکرِ ما سوا کرتے چلیں

اِضطراراً یونہی طے راہِ وفا کرتے چلیں
ہر قدم پر اپنے اِک سجدہ ادا کرتے چلیں

کیا خبر اوروں کو بھی اتنی خدا توفیق دے
راہِ غم میں ثبت اپنے نقشِ پا کرتے چلیں

سر بسجدہ ہو کے راہِ منزلِ تسلیم میں
پیرویِ شیوۂ اہلِ وفا کرتے چلیں

سوچ کر جس کو ہمارے یاد آ جائے اُنہیں
جاتے جاتے ایک ایسی بھی خطا کرتے چلیں

کیوں سلامت لیکے جائیں اُن کو نذر ہے
اُن پہ قرباں یہ بھی جنسِ بے بہا کرتے چلیں

ہم کو جب چلنا ہی ٹھہرا راہِ اُلفت میں حزیںؔ
کیوں نہ پھر دشواریوں کا سامنا کرتے چلیں

حقی حزیں ایم۔ اے

# میری بھارت یاترا

فکر تونسوی

مجھے بھارت کے انسانوں اور جانوروں دونوں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے دیکھا دونوں نے ایک دوسرے کے کردار پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ یعنی جانوروں میں انسانیت آگئی ہے اور انسانوں میں حیوانیت ——— یونیورسٹی میں فلسفے کے ایک ہندوستانی پروفیسر نے اس کی تشریح کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ اسے ہم ہندوستان کا مِلا جُلا کلچر کہتے ہیں۔ یعنی اِس کلچر میں انسانوں اور جانوروں دونوں کی سبھی خوبیاں اور خرابیاں سمائی ہوئی ہیں۔

اُس پروفیسر نے اپنی پہلی بیوی کو گھر سے نکال کر وِدھوا آشرم میں داخل کروا دیا تھا اور دوسری بیوی گھر میں لے آیا تھا۔ لیکن رات کی گہری تنہائی میں پہلی بیوی کو یاد کر کر کے رویا کرتا تھا اور اس کے پُرانے جمپر سے اپنے آنسو پونچھا کرتا تھا۔

یہ مِلا جُلا کلچر بھارت کی زندگی کے ہر پہلو سے جھلکتا ہے۔ مثلاً میں نے ہندوستان کے ہر شہر اور قصبے میں ایک بورڈ لٹکا ہوا ضرور دیکھا ہے۔ جس پر بھارت کے ایک بہت بڑے لیڈر کی قدِ آدم تصویر بنی ہوئی ہے اور تصویر کے نیچے یہ لکھا ہوا ہے۔ -

"ہم امن چاہتے ہیں لیکن جنگ کے لئے بھی تیار ہیں!"

ہندوستانی لوگ امن کے زمانے میں جنگ کی تیاریاں کرتے ہیں اور جنگ کے زمانے میں امن کی اپیلیں کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کی تہذیب امن کے گہوارے میں پل کر جوان ہوئی ہے۔ (بلکہ اب تو بوڑھی بھی ہوگئی ہے) بنیادی طور پر ہم عدم تشدد کے قائل ہیں۔ لیکن اگر کوئی ہم پر تشدد کرے تو اپنی عدم تشدد سے گوندھی ہوئی تہذیب کی حفاظت کے لئے قتلِ عام بھی کر دیتے ہیں۔ بلکہ کئی بار تو جب اُن کی تہذیب کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا، جب بھی قتلِ عام کر دیتے ہیں۔ ایک بار میں نے ایک ہندوستانی کسان سے پوچھا کہ تم نے اپنے پڑوسی کسان کو لاٹھی مار کر موت کے گھاٹ کیوں اُتار دیا؟ تو وہ بولا۔ کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ وہ میرے کھیت میں سے گنّا توڑ لے گا۔"

"اگر گنّا توڑنے کے بعد اُسے قتل کرتے تو کیا بہتر نہ رہتا؟"

وہ بولا "ہاں، بہتر تو یہی رہتا۔ لیکن اِسے آپ میری ریہرسل سمجھ لیجئے۔"

یعنی اِس خوف سے کہ کہیں اُن کے اندر تشدد کی عادت ختم نہ ہو جائے وہ گاہے گاہے تشدد کی ریہرسل کرتے رہتے ہیں۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ بہت دُور اندیش لوگ ہیں۔ کیونکہ یہ مرنے سے پہلے اپنا مقبرہ تعمیر کر لیتے ہیں۔ شادی ہونے سے پہلے اپنے بچّے کے لئے جھُولنا لے آتے ہیں۔ عشق کرنے سے پہلے اپنی محبوبہ کی ایک تصویر دل میں بنا لیتے ہیں۔ یہاں تک ——— کہ کئی دل پھینک تو محبوبہ حاصل کرنے سے پہلے شاعری شروع کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں زندگی بھر محبوبہ نہیں ملتی اور ساری زندگی شاعری ہی کرتے رہتے ہیں!

لکھنؤ کے کافی ہاؤس میں بیٹھنے والے ایک شاعر نے صرف اِس لئے خودکشی کر لی کیونکہ حسین لڑکیاں صرف اُس کی شاعری کو پسند کرتی تھیں۔ لیکن اُس کی محبوبہ بننا پسند نہیں کرتی تھیں۔ اِس غم میں اُس نے محبوبہ اور شاعری دونوں سے نجات حاصل کر لی۔

بہرکیف ہندوستانی کلچر ایک مِلا جُلا کلچر ہے۔ عدم تشدد کے جسم میں تشدد کی رُوح گھُسی ہوئی ہے اور ہندوستانی اُسے باہر نکالنا پاپ سمجھتے ہیں اور تشدد کی بھٹی میں عدم تشدد کو جھونک دیا جاتا ہے اور اسے بُرا نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اِس بھٹی میں سے عدم تشدد کُندن بننے کے لئے تپایا جا رہا ہے!

---

میں بھارت دیش میں جہاں بھی گیا۔ ایک فقرہ ہر جگہ اور ہر زبان سے سُنا ——— ہندوستان ایک غریب مُلک ہے۔ یہاں تک کہ ایک کروڑ پتی سیٹھ جو میرے دیکھتے دیکھتے ایک کلو بھُونی ہوئی مچھلی ڈکار گیا۔ ٹھنڈی آہ

ہیں کر مجھ سے کہنے لگا۔

"صاحب! ہمارے دیش کو غریبی دیمک بن کر چاٹ گئی۔ اگر ہم دولت مند ہوتے تو دُنیا کی عظیم ترین قوم کہلاتے۔ ہمارے تن پر نہ کپڑا ہے نہ پاؤں میں جُوتی!"

اور سچ مچ جنوبی ہند کے کئی علاقوں میں گھومتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ ننگے پاؤں گھومتے ہیں۔ عورتیں اتنا مختصر کپڑا اپنے تن پر پہنتی ہیں کہ اُن کے اندر عُریانی کا احساس تک مر گیا ہے۔ میں نے ایک آدمی سے پُوچھا۔

"آپ جُوتا کیوں نہیں خرید لیتے۔ آپ کے پاس تو کافی بینک بیلنس ہے!"

اُس نے میری طرف ترس بھری نظر وں سے دیکھا جیسے مجھے کوئی بے وقوف اجنبی سمجھ رہا ہو اور بولا "جُوتے کا بینک بیلنس سے کوئی تعلق نہیں۔ ننگے پاؤں رہنا ہمارا دھرم ہے، ہماری سنسکرتی ہے۔ اس سے ہمارے اندر تپسّیا کی خصلت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم اپنے جسم پر ظلم ڈھا کر سہن شکتی پیدا کرتے ہیں (اے بے وقوف اجنبی!)"

ایک بار بنارس شہر میں ایک دھارمک لیڈر سے ملاقات ہوئی، جس کا چہرہ سُرخ سیب کی طرح دمکتا تھا اور زربفت اور سلک کے کپڑے اُس نے زیب تن کر رکھے تھے۔ وہ ایک امیر دکبیر کارخانہ دار کے یہاں مہمان کے طور پر آیا ہوا تھا۔ وہی کارخانہ دار میرا بھی میزبان تھا۔ ہندوستان کے امیر دکبیر لوگوں میں یہ خاصیت ہے کہ وہ خُدا سے بھی ڈرتے ہیں اور غریبوں سے بھی۔ اِس خوف سے بچنے کے لئے وہ دو طریقے استعمال کرتے ہیں۔ ایک تو وہ اپنے آپ کو بھی غریب کہتے ہیں۔ آپ اُن سے جب بھی پُوچھیں وہ بہت عاجزی سے یہی جواب دیں گے "اجی، بس دال روٹی کھا رہے ہیں"

اور دوسری طرف وہ ایشور کو مطمئن کرنے کے لئے اُس کی پُوجا پاٹھ کرتے ہیں۔ بلکہ لاؤڈ سپیکر لگا کر کرتے ہیں۔ مندر بنواتے ہیں۔ اُس میں بھگوان کی سونے کی مُورتی رکھتے ہیں اور اُس مُورتی کے چرنوں میں انگور، سیب، بادام اور اخروٹ کی بھینٹ رکھ دیتے ہیں اور گھی کا چراغ، چاندی کی تھالی میں رکھ کر، آنکھیں بند کر کے، بہت عقیدت سے آرتی اُتارتے ہیں اور بھگوان سے کہتے ہیں "اے پربھو! میں تیرا ایک تُچھ اور غریب بندہ ہوں، تم غریب نواز ہو، دین بندھو ہو، اناتھوں کے ناتھ ہو، ہماری تُچھ بھینٹ سُویکار کرو اور ہمیں دھرم کے راستے پر چلنے کی شکتی دو!"

جس دھارمک لیڈر کا میں نے ذِکر کیا ہے اُس کا نام مہاتما بیکنٹھ نارائن تھا۔ کارخانہ دار نے مجھے بتایا کہ یہ اُن کے رُوحانی گُرو ہیں۔ اُن کی آشیرواد اور اَپار کرپا سے میرا یہ دھن دولت کا کاروبار چل رہا ہے۔ اُن کی آگیا پر میں ہر سال ایک ہزار یتیموں، بھکاریوں اور غریبوں کو بھوجن کھلاتا ہوں اور ہر سال ایک سو ایک گایوں کے سینگ دودھ سے دھوتا ہوں"

میں نے اُن مہاتما جی سے پُوچھا "کیوں جی! آپ کے خیال میں ہندوستان کی غریبی دُور نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں ہو سکتی اور نہ ہونی چاہئے۔ کیونکہ غریبی تو بھگوان کی دین ہے۔ انسان جتنا زیادہ غریب ہو گا، اُتنا زیادہ بھگوان کی بھگتی کرے گا۔ اگر آج اِس دیش کے سبھی آدمی امیر ہو جائیں تو بھگوان اِس دیش سے نِکل جائے گا"

میں نے پُوچھا "آپ کا میزبان بہت امیر ہے۔ اُس کے گھر سے تو بھگوان نہیں نِکلا بلکہ زیادہ اُسی کے گھر میں رہتا ہے"

مہاتما بیکنٹھ نارائن میری نالائقی پر مُسکرایا اور ایک سالم انداز میں نِکلتے ہوئے بولا "گُپتا جی بڑے سجّن پُرش ہیں۔ بہت اونچے دھارمک وِچار رکھتے ہیں، غریبوں کو بھوجن کھلاتے ہیں، اپنے ہاتھ سے غریبوں کے جُوٹھے برتن اُٹھاتے ہیں۔ اُن میں

امیروں والا غرور نام کو بھی نہیں ہے۔ اِسی لئے بھگوان ہر وقت اِن کے گھر رہتے ہیں۔"

میں نے سوچا، یہاں کے امیر لوگ بھی بڑی عجیب و غریب مخلوق ہیں۔ غریبوں کا لہو چوستے ہیں اور پھر اُس لہو میں کچھ روٹیاں گوندھ کر اُنھیں غریبوں کو بھوجن کھلا دیتے ہیں اور اِس ایکشن کو وہ دھارمک وچار کا نام دیتے ہیں اور یہاں کے غریب بھی اپنے لہو کا بھوجن کھا کر بھگوان کا شکر ادا کرتے ہیں۔ جو امیروں کے من میں دَیا اور شفقت پیدا کر دیتا ہے ——— مجھے تو ہندوستان کا نہ بھگوان سمجھ میں آیا نہ ہندوستان کے امیر نہ ہندوستان کے غریب۔ اِس ملے جلے کلچر کو الگ الگ کر کے دیکھنا انتہائی مشکل ہے۔ دھرم کے سائے تلے دولت پرورش پاتی ہے، دھرم کے سائے تلے مہاتماؤں کے چہرے سُرخ سیب کی طرح دمکتے ہیں اور دھرم ہی کے سائے میں غریبوں کی غریبی قائم رکھی جاتی ہے۔ بھارت ہی کے ایک شاعر کا یہ شعر ہندوستانیوں میں بے حد مقبول ہے ؎

رُوکھی سُوکھی کھائے کے ٹھنڈا پانی پی
نہ دیکھ پرائی چپڑی، نہ ترسائیں جی

غرض ہندوستانی سبھیتا مندرجہ ذیل تین نعروں پر بڑی مضبوطی سے جمی کھڑی ہے ———

۱- ہم امن چاہتے ہیں لیکن جنگ کے لئے بھی تیار ہیں!
۲- ہم غریب رہنا چاہتے ہیں، لیکن امیر بننے میں بھی بُرائی نہیں سمجھتے۔
۳- ہم خدا کی پرستش اور بھگوان کی پُوجا کرتے ہیں لیکن ضرورت پڑے تو خدا اور بھگوان کو بیچ بھی کھاتے ہیں۔

ملے جلے کلچر کے یہ وہ نظارے ہیں جو تاریخی مقامات کی طرح قابلِ دید ہیں!

---

لیکن اِس ملے جلے کلچر کے مناظر ایک اور میدان میں بہت عبرتناک ہو گئے ہیں اور وہ میدان ہے پالٹیکس

دھرم کے بعد ہندوستانیوں کی محبوب غذا پالٹیکس ہے۔ ہر ہندوستانی صبح کیکر کا داتن کرتے کرتے یا مندر کا رُخ کرتا ہے اور یا میونسپل پارک کی طرف بھاگتا ہے۔ تاکہ وہاں تازہ ترین پولٹیکل حالات پر دوسروں سے بحث کرے۔ ہندوستان میں پولٹیکل لیڈر خود رَو پودوں کی طرح پھوٹتے رہتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ہر پانچ آدمیوں کے بعد ایک پولٹیکل لیڈر ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ جو عورت بانجھ ہوتی ہے، وہ کسی نہ کسی پولٹیکل لیڈر کو گود لے لیتی ہے۔ ہندوستانی مائیں جب اپنے بچے کی بلائیں لیتی ہیں تو وہ یہ ضرور کہتی ہیں: "میرا بیٹا بڑا ہو کر پنڈت نہرو بنے گا!" کوئی عورت یہ نہیں کہتی کہ میرا لڑکا بڑا ہو کر ریلوے اسٹیشن پر قُلی بنے گا!

لیکن اِس کے باوجود ہندوستانی بچے بڑے ہو کر قُلی بن جاتے ہیں، کلرک بن جاتے ہیں، مزدور بن جاتے ہیں، کبھی زیادہ آزاد خیال لڑکے جیب کترے بھی بن جاتے ہیں اور پھر اُن کی اصلاح اور خوشحالی کے لئے پولٹیکل لیڈر بڑے بڑے آندولن شروع کرتے ہیں اور سیاسی جلسوں کے اسٹیج پر بیک وقت گلے تان تان کر اور آنسو بہا بہا کر کہتے ہیں: "میں ہندوستان کی غریبی کا گلا گھونٹ دوں گا! ہندوستان بھر کے غریبو! ایک ہو جاؤ اور میرے جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ!"

ہندوستان سچ مچ ایک عجیب و غریب مُلک ہے۔ یہاں ایک طرف دھارمک لیڈر ہیں جو ہندوستانیوں کو غریب رہنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں دوسری طرف سیاسی لیڈر ہیں جو غریبی کے خلاف طوفان اُٹھاتے رہتے ہیں اور ہندوستان کا غریب اِن دو پاٹوں کے بیچ میں خوشی خوشی پِسا جا رہا ہے۔ غریبی دونوں کا من بھاتا کھاجا ہے۔ دونوں غریبوں کے نام پر اپنی توندیں اور بنک بیلنس بڑھائے جا رہے ہیں۔ اگرچہ دھرم اور پالٹیکس دونوں ایک دوسرے کے متوازی چلتے ہیں اور غریبوں سے کہتے ہیں کہ ہم دونوں کبھی آپس میں نہ ملیں گے۔ کیونکہ دونوں الگ الگ راستوں پر چل رہے ہیں۔ لیکن ایک بار دہلی شہر میں، ایک عجیب نظارہ میں نے دیکھا۔ ایک بہت بڑے دھارمک سمیلن میں ایک بہت بڑا سیاسی لیڈر تقریر کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا، سیاست ایک جسم ہے، دھرم اُس کی رُوح ہے۔ دونوں الگ الگ ہونے کے باوجود ایک ہیں، دونوں ایک ہونے کے باوجود الگ الگ ہیں۔

اور اُسی اسٹیج پر ایک بیسویں قسم کا دھارمک مہاتما اُپدیش دے رہا تھا۔

"راج نیتی انسان کو دغابازی سکھاتی ہے، من میں کولاہل پیدا کرتی ہے۔ اِس کولاہل کا ایک ہی علاج ہے کہ بھگوان کی شرن میں آجاؤ، جس کے چرنوں میں امیر غریب کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ راج نیتی کے بغیر جنتا کا گزارا نہیں لیکن راج نیتی کے گناہوں میں لتھڑے ہوئے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اِن گناہوں سے نجات پانے کے لئے دھرم کے دربار میں آجایا کریں۔ اِسی میں اُن کا کلیان ہے۔"

اور پھر میں نے دیکھا، دونوں لیڈروں کی تقریروں پر عوام نے داد و تحسین کی تالیاں بجائیں۔

اور پھر میں نے دیکھا، دونوں لیڈر ایک ہی کار میں بیٹھ کر ایک سیٹھ کے بنگلے پر ڈنر کھانے چلے گئے۔ دھرم، سیاست اور سرمایہ ——— تینوں کے ملے جلے کلچر کے گھونٹے سے ہندوستانی عوام بندھے ہوئے ہیں!!

---

افسانہ

# نیا موڑ

ابواللیث جاوید بی کام

سرکل انسپکٹر، پوسٹ آفس لیسلی گنج، ضلع پالامو (بہار)

محترمی و معظمی خوشتر گرامی صاحب اسلام عقیدت

جی تو چاہتا تھا معظمی اُردو گرامی صاحب لکھوں مگر پھر خیال ہوا ایسا لکھ کر میں کوئی نئی بات تو نہ کہہ سکوں گا۔ "بیسویں صدی" اُردو اور خوشتر گرامی تو بالترتیب جسم، رُوح اور زندگی ہیں جسے ساری ادبی دُنیا جانتی ہے ——— "بیسویں صدی" کی بزم میں، حقیر سا تحفہ، اپنا تازہ ترین افسانہ لے کر پہلی بار شامل ہونے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اِس کے متعلق صرف اِتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ حقیقت سے اتنا ہی قریب ہے جتنا "بیسویں صدی" سے خوشتر گرامی! اگر آپ نے اِسے کسی قابل سمجھا اور "بیسویں صدی" میں جگہ دی تو سمجھوں گا میری محنت کا صلہ مجھے مل گیا۔ آپ کی رائے میرے لئے مشعلِ راہ ہوگی جس کا میں شدت سے انتظار کروں گا . . .

آپ ہی کا ——— ابواللیث جاوید

راج ٹرانسپورٹ کی میگھ دوت، نرالے بانکپن، اچھوتی دلکشی اور مٹک خرامی سے سڑک کی چوڑی کالی چھاتی پر پھسلتی جا رہی تھی۔ بارش ابھی ابھی تھمی تھی اور فضا میں قدرے نمی سمو گئی تھی۔ رانچی کا شہری علاقہ ابھی ختم نہ ہو پایا تھا۔ اونچی اونچی عمارتیں، آکاش وانی، سرکاری کوارٹرز سب ہی بارش میں نہا چکے تھے۔ 'میگھ دوت' کا اندرونی ماحول بہت ہی خوشگوار و پُرسکون تھا۔ سیٹوں کے مطابق ہی مسافروں کی تعداد تھی۔

وہ بس میں جیسے ہی داخل ہوئی اندرونی ماحول میں کھلبلی سی مچ گئی۔ سبھی لوگوں کی نگاہیں اُس پر مرکوز ہو گئیں۔ اُس کا بوٹا سا قد، گلابی رنگت، شرابی آنکھیں، ناگن سی بل کھاتی ہوئی زلفیں، چست مہرئیوں والی شلوار، گولھوں کو نمایاں کرتا ہوا چست جمپر، نوکدار نیا گرہ، گردن میں لپٹا ہوا مختصر سا دوپٹہ، ماتھے پر پھیلے ہوئے بالوں کی جھالر سب مل کر قیامت برپا کرنے کے لئے کافی تھے۔ وہ جیسے ہی بس میں داخل ہوئی سارا ماحول معطر بیز ہو گیا۔ سبھی مسافر ایک دوسرے کی نظر بچا کر اُسے دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اداسے بے نیازی سے بڑھتی گئی اور جس جس سیٹ سے گزری وہاں بیٹھے ہوئے مسافر نے اُسے دعوتی نگاہوں سے دیکھا۔ بڑھتے بڑھتے وہ لیڈیز سیٹ سے بھی آگے نکل گئی اور سب سے اگلی سیٹ تک پہنچ گئی جو ابھی تک خالی پڑی تھی۔ اپنی اٹیچی اُس نے سیٹ کے نیچے رکھ دی اور بہت اطمینان سے سارے ماحول کا طائرانہ جائزہ لے کر سیٹ کے کوشین میں دھنس سی گئی۔

بس جو تھوڑے وقفہ کے لئے تھمی تھی سرک پڑی۔ وہ بہت دیر تک کوشین میں دھنسی رہی۔ میگھ دوت کی رفتار سے جو ہلکا ہلکا جھٹکا اُس کے سارے وجود پر لگ رہا تھا اُسے بہت ہی خوشگوار اور کیف آور معلوم ہوا اور اُس نے اپنے کسکتے ہوئے جسم میں ایک گدگدی محسوس کی۔ وہ بہت دیر تک آنکھیں موندے جھٹکوں سے لُطف لیتی رہی۔ جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو باہر بارش ہو رہی تھی۔ بارش کی رم جھم میں وہ کھو سی گئی۔

یادوں کے آئینے میں عکس اُبھرنے لگے۔

ایسی ہی رم جھم کرتی ہوئی شام کو جب وہ گیا اسٹیشن پر پی۔ جی سے اُتری تھی، وہ دِکرم سے جا ٹکرائی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں تھاما ہوا بیگ چھوٹ گیا تھا اور وہ پلیٹ فارم پر اپنے بکھرے ہوئے تولیہ، پاؤڈر کیس، کریم کی کاریاں، لپ اسٹک،

شیمپو کا اشارہ ڈائری نکتا ہیں اور خطوط اکٹھا کرنے میں منہمک ہو گئی تھی۔ وِکرم سکتے کے عالم میں خاموش کھڑا اُسے تکتا رہا۔ اُس کا ملکوتی حُسن بارش کے قطروں میں دُھل کر شبنمی ہو گیا تھا۔ جب اُس نے اپنی شربتی آنکھیں اوپر اُٹھائیں تو وِکرم صرف اِتنا کہہ سکا۔

"معاف کریں گی ——— !غلطی میری نہیں تھی ——— !!"

اور وہ جواب دیے بغیر شان بے نیازی سے اپنی زُلفیں جھٹکتی پلیٹ فارم کی بھیڑ بھاڑ میں گُم ہو گئی۔ وِکرم دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ خواب و خیال کی دُنیا سے یکایک دھرتی پر گر پڑا ہو۔

وہ لپکا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا اُس کے قریب پہنچ ہی گیا۔ وہ ریلوے برج کی آخری سیڑھیاں طے کر رہی تھی۔ وِکرم نے پیش قدمی کی اور بہت

---

- ایمان کی حقیقت سے اُس وقت تک آگہی حاصل نہیں ہوتی جب تک فقر کو غنا سے زیادہ عزیز نہ رکھا جائے۔
(حضرت عثمان غنیؓ)
- تقویٰ اور نیکی سب سے بہترین زادِ راہ ہیں۔ (حضرت امام حسینؓ)
- جو زبان کو اپنے قابو میں نہ رکھے گا وہ پشیمان ہوگا۔
(حضرت امام جعفر صادقؓ)
- نیک نصیحت ماننے کی طرف مائل نہ ہونا اور اپنی باتوں کی تردید سے رنجیدہ ہونا کبر ہے۔ عُجب و کبر اور فخر نہایت مہلک بیماریاں ہیں۔ (حضرت امام غزالیؒ)

---

بے تکلفانہ انداز میں بولا ——— "آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی ——— ؟"

"جی نہیں" اُس نے بہت بے باکی سے جواب دیا اور زیرِ لب مُسکرا دی۔

وِکرم نے اُس کے مزاج کی نرمی بھانپ لی اور شگفتگی کی خوشبو سُونگھ لی اور پھر بولا۔

"آپ کا کوئی ہم سفر بھی ہے ——— ؟"

"میرے ہم سفر تو چاند ستارے ہیں ——— !سارے نظارے ہیں!!"

وہ خالص فلمی انداز میں بولی۔

وِکرم سے نہ رہا گیا اُس نے فوراً کہا ——— "گویا چاند کا ہم سفر چاند ——— !"

"باتیں تو بہت خوبصورت کرتے ہیں آپ!"

"خوبصورت کے قریب آ کر ہر چیز خوبصورت ہو جاتی ہے!"

وہ جواب میں صرف ادائے دلبری سے مُسکرا دی۔ گیٹ سے باہر تک دونوں خاموش رہے۔ جب وِکرم رکشا پر سوار ہو گیا تو ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی وہ جاتے ہوئے رکشا کو دُور تک تکتی رہی جس میں وِکرم کا لہراتا ہوا ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ ششما نے ایک عجیب سی کسک محسوس کی ——— !عجیب سی خلش! عجیب سی چُبھن ——— نہ جانے کیوں ——— !!!

میگھ دُوت، ایک جھٹکے کے ساتھ پہاڑی راستے طے کرتی ہوئی رُکی اور اُس کی یادوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ رام گڑھ کول مائنس کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور دیکھتے دیکھتے کنٹونمنٹ کے خوبصورت کوارٹرز، پریڈ گراؤنڈ، ریلوے کوارٹرز اور بازار کی بلند عمارتیں یکے بعد دیگرے نکل گئیں، میگھ دُوت، جب پڑاؤ پر رُکی تو موسم بہت ہی خوشگوار ہو چکا تھا۔ اُس کا جی چاہا نیچے اُتر کر تھوڑی دیر چہل قدمی کرے مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔ اُسے یاد آیا جب وِکرم اور وہ کشمیر گئے تھے تب امرناتھ جاتے ہوئے بس کے پہاڑی سفر میں ایک جگہ دونوں بس سے اُترے تھے۔ وہ جگہ کتنی خوبصورت تھی۔ پہاڑی ڈھلوانوں پر پیچ و خم کھاتی ہوئی سڑک، چیڑ، ساگوان اور یوکلپٹس کے لمبے لمبے درخت، پھولوں سے بھری وادیاں، پہاڑوں سے اُبلتے بل کھاتے صاف و شفاف پانی کے چشمے، دُور تک پھیلی ہوئی ہریالی میں کتنا حُسن تھا، کتنی رعنائی تھی۔ وِکرم نوراً کی سرائے میں کافی، انڈے اور کھانے کا دوسرا سامان لیتا رہا اور وہ اُن نظاروں میں بالکل کھو سی گئی تھی۔ جب وِکرم سارا سامان لے کر باہر آیا تو ششما غائب تھی۔ وہ کتنا پریشان تھا، کتنا مضطرب تھا۔ جب ششما پر نگاہ پڑی تو وہ چپکے چپکے اُس کے قریب آیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اُس کی آنکھیں مُوند لیں۔ ششما سمجھ گئی وِکرم ہے۔ جب وِکرم نے آنکھوں سے اپنے ہاتھ ہٹائے تب اُس نے بے اختیار وِکرم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

سانسوں کی گرمی، آنکھوں کی روشنی اور دل کی دھڑکنوں میں وِکرم سرایت کر چکا تھا۔ خوابوں کی ویران سی محفلوں میں وِکرم نغمہ سرائی کر رہا تھا۔ سنگیت کی مدھر راگنی جاگ اُٹھی تھی جس کی مدھر لے پر ششما کی زندگی ناچ اُٹھی تھی۔ ششما نے اپنے من مندر کے دیوتا کے قدموں میں اپنی پھول سی کومل زندگی کے ہار کو ارپن کر دیا تھا۔ خوابوں کی حسین دُنیا مہک اُٹھی تھی!

دونوں نے اُس حسین رات کے دلنواز لمحات وہیں گزارے، جہاں اُن کی سانسیں ہم آہنگ ہوئی تھیں۔ وہ رات ——— زندگی کی اہم ترین رات ———

ایک یادگار رات بن گئی تھی ـــــ! جب وہ لوٹے تو کشمیر وکرم کی آنکھوں میں بسا رہا اور سُشما کی آنکھوں میں صرف اُسی رات کا سپنا جھلملاتا رہا اور خیالوں میں اُس رات کی کہکشاں اُس کی مانگ میں سیندور سجاتی رہی، تارے افشاں پاشی کرتے رہے اور دُور بہت آسمان پر چمکتا دمکتا سا چاند ماتھے پر جھومر سجاتا رہا اور ساری فضا شادیانے بجاتی محسوس ہوتی رہی۔ سُشما لجاتی شرماتی دُلہن سی بنی کسی اجنبی کے قدموں کی چاپ پر لرز اُٹھنے کے لئے بیقرار سمٹی سمٹائی بیٹھی رہی۔ دل کی یہ کیفیت قدرتی تھی جو ہر عورت کی سب سے حسین خواہش کی عکاس ہوتی ہے۔

"بیگم دُوت" بس جھٹکے کے ساتھ تیز رفتاری سے رُکی تو سُشما کے خیالات کا تسلسل منتشر ہو گیا۔ ہزاری باغ کا ہارن گنج، سینٹ کولمبس کالج، چرچ، جی پی او، سول کورٹ پھر بازار دیکھتے دیکھتے سرکتے گئے۔ بس اسٹاپ پر تھوڑے وقفہ کے لئے رُکی۔ ہزاری باغ کی صاف ستھری سڑکیں، قرینے کی عمارتیں، آراستہ بازار اور پرسکون شہری ماحول نے سُشما کے دل و دماغ کو فرحت سی بخشی۔ اُسے شہر کی مشغول ترین زندگی، گہماگہمی، شور شرابہ اور ہنگامہ خیزیوں سے عجیب سی گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ اُس کا ذہن اب اُس سے فرار چاہتا تھا۔ اُسے ذہنی سکون کی تلاش تھی۔ اسی سکون کی جستجو میں وہ شہر در شہر گھومتی رہی۔ وکرم نے اُس کی ہر خواہش پر اپنی فراخ دلی کا پورا پورا ثبوت دیا۔ الورا اور اجنتا کی گپھاؤں میں پہنچ کر وہ ماحول کی مدھر راگنی میں گم ہو گئی۔ ہواؤں میں تحلیل صدیوں صدیوں کی کہانیاں، حُسن و عشق کی تابندگی سے لبریز پتھروں کے گیت اور پتھروں کے سینے میں دھڑکتے، جیتے، جاگتے دلوں کی دھڑکنیں اُسے صاف سُنائی دے رہی تھیں۔ خیام کی رباعیوں کا تقدس، شیلی اور کیٹس کی نظموں کا حُسن، غالب اور اقبال کی غزلوں کی لطافت تمام پتھروں کے لبوں پر جیسے مچل رہی تھی۔ اُن پتھروں پر پھیلے تمام نقوش پر زندگی کی گہری چھاپ دائم و قائم تھی۔ وہ اِس درجہ انہماک سے اُن پتھروں کی دُنیا میں کھو گئی کہ اُسے محسوس ہوا جیسے وہ بھی اجنتا کی کوئی اپسرا ہو جو گوشت پوست کی جیتی جاگتی عورت بن کر باہر چلی آئی ہو۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے بدن میں پر لگ گئے ہوں۔ وہ سارے ماحول پر اُڑتی رہی خوبصورت رنگ برنگی تتلی کی طرح اور وکرم اُسے پکڑنے کے لئے چھوٹے بچے کی طرح مچلتا رہا۔ دھیرے دھیرے، دبے دبے قدموں سے وہ وہاں پہنچ جاتا جہاں جہاں یہ تتلی پتھر کے کسی پھول پر ایک لمحہ کے لئے بیٹھتی لیکن جیسے ہی بچہ اپنی اُنگلیوں کا جال بنائے تتلی کو پکڑنا چاہتا وہ اُڑ چکی ہوتی۔ وہ پھر مچل جاتا۔ مگر اُس کی متجسس نگاہیں اُسے ڈھونڈ ہی لیتیں۔ تتلی کو اُس بچے پر بہت ہی پیار آ گیا اور وہ دانستہ طور پر ایک مقام پر رُک گئی۔ جب بچے نے اُسے پکڑ کر خوشی سے شور مچایا تو تتلی کا جیسے خواب ٹوٹ گیا۔ سُشما کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے اور وکرم نے اُسے اپنی گود میں اُٹھا لیا اور گپھا سے باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ سُشما کے بڑھتے قدموں کو اگر وکرم اِس طرح روک نہ لیتا تو وہ ایک زہریلے سانپ کے اُٹھے ہوئے پھن سے جا ٹکراتے، پھر کیا ہوتا خدا جانے ـــــ!

'وکرم! تجھے کچھ ہو جاتا تو ـــــ؟' سُشما نے اپنی گھنیری زُلفیں وکرم کے شانے پر پریشان کرتے ہوئے پوچھا۔

'شش ـــ ش ـــ ش ـــ' وکرم نے اپنا ہاتھ سُشما کے گلابی لبوں کی پنکھڑیوں پر رکھ دیا اور بہت ہی رازدارانہ انداز میں کہا ـــــ

---

- حُسن ایک جال ہے جس سے قُدرت عقلوں کا شکار کرتی ہے۔ (ریگس)
- عزت اور بزرگی کا ہر کوئی طالب ہے لیکن انھیں حاصل کرنے کی رغبت کم لوگ رکھتے ہیں۔ (جالینوس)
- میں اِس لئے رنجیدہ اور غمگین نہیں ہوتا کہ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جس کے تلف ہونے کا مجھے غم ہو۔ (سقراط)
- تیرے ساتھ کوئی بدی کرے یا تو کسی کے ساتھ نیکی کرے، دونوں فراموش کر دے۔ (ارسطو)
- سب سے بہتر دولت جو آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑی جا سکتی ہے وہ اچھا چال چلن ہے۔ (دنتھروپ)

---

"ایسی باتیں نہیں کیا کرتے ـــــ!" وہ سرگوشیوں کے انداز میں کہہ رہا تھا۔

'اجنتا کے نقوش نے ہمیشہ پیار کو نئی زندگی دی ہے، لی نہیں ہے!'

وکرم کے سینے سے لگی وہ آنکھیں موندے پیار کے آسمان کی وُسعتوں میں ہچکولے کھاتی رہی۔ وکرم کے دل میں اُس کے لئے کتنا پیار تھا۔ اُس پیار کے تصوّر ہی سے اُس کی زندگی جھوم جھوم اُٹھتی۔

سفر کے آخری لمحات میں جب تاج کے حُسن کو اُس کی نگاہیں چُوم رہی تھیں اور دل بارگاہِ عشق میں سجدہ ریز ہو رہا تھا سُشما نے محبت کی اِس عظیم یادگار کے آگے اپنی محبت کا حلف من ہی من میں لیا اور وکرم کی طرف انجانے میں دیکھا۔ وہ بھی اُس کی طرف دیکھ کر مُسکرا یا جیسے دل ہی دل میں حلف لیتے وقت اُس کی چوری پکڑی گئی ہو! اور دونوں ایک بار پھر اپنی

سرتوں کے جہان میں کھوسے گئے۔ ششما کے خیالات کی آنکھوں نے دیکھا مغل شہنشاہ شاہجہاں کسی غم کے سمندر کی عمیق گہرائیوں میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ یہ غم تھا جدائی کا۔ اپنی ملکہ کی جدائی کا! لڑکھڑاتے قدم، تمتماتا چہرہ اور بے تاب کیفیتِ دل اسی عظیم غم کی غماز تھی۔ سارا عالم سوگوار اور ماتمی ہو رہا تھا۔ محبت کی آنکھوں سے خونِ جگر کے آنسو ٹپک رہے تھے۔ موتیوں کا ڈھیر سا لگ گیا تھا جن کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ زمانہ کے دامن میں یہ موتی اکٹھے ہوتے رہے اور کسی خوبصورت سے لمحے میں ان موتیوں نے محل کی شکل اختیار کرلی جس کے در و دیوار سے محبت کی خوشبو آنے لگی ——!! اور یہی خوشبو سارے عالم میں پھیل کر ایک شہنشاہ کی محبت کی عظمت کہلائی۔ وہی محبت جس پر تاج محل تو کیا ساری دنیا کی تخلیق کا خیال وجود میں آیا ہوگا!

میگھ دوت جب شیر گھاٹی کے ڈھلوانوں پر تیز رفتار ہوئی تو کھڑکیوں سے آتی بارش کی بوندوں نے ششما کو چونکا دیا۔ اُس کے خیالات کا شیش محل زمین بوس ہوگیا۔ سفر کی تکان سے سارا بدن چور سا ہو رہا تھا۔ ششما کُشن پر دراز ہوگئی مگر اُس کے مضمحل دل و دماغ کو سکون نصیب نہ ہوا۔ یہ ذہنی کیفیت وِکرم کے ایک خط کا نتیجہ بھی تھی جو اُس نے ششما کو کلکتہ سے لکھا تھا۔ بالکل غیر متوقع طور پر —— اُس نے لکھا تھا ——

ششما!

جوانی بہتی دریا ہے۔ آج اِدھر تو کل اُدھر! تم نے بھی اسے اِسی زاویۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔ یہ وسیع النظری سچ پوچھو تو ہمارے ماڈرن ٹائمز (Modern Times) کی دین ہے، اُس کی بلندی ہے۔ میں اگر کہوں کہ میں یہاں engage ہوگیا ہوں تو شاید تم بُرا نہ مانوگی۔ جہیز کی بھاری رقم بھی تو آخر کوئی چیز ہوتی ہے؟

اچھا بائی بائی ——!

تمھارا اب نہیں

وِکرم

ششما پر جیسے بجلی گر پڑی تھی۔ وہ اِس غم کی تاب نہ لا سکی تھی۔ ہو سکتا تھا وہ کچھ کر بیٹھتی مگر جدید تہذیب کی بلندیوں نے اُس کی مسیحائی کی۔ اُس نے سوچنے کا انداز یکسر بدل ڈالا۔ اُس نے سمجھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ وقت کے مرہم نے بھی اُس کے زخموں کو مُندمل کر دیا تھا۔

جب میگھ دوت گیا پہنچی تو ششما اُتر چکی تھی مگر اُس کا خوبصورت

کوثر جہاں کوثر ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ

دل کی دنیا بسا گئے آنسو
درد بن کر سما گئے آنسو

بخش دی روشنی نگاہوں کو
شمعِ غم کی جلا گئے آنسو

نکہتِ گل میں، سوزِ نغمہ میں
روح بن کر سما گئے آنسو

آپ دیکھیں نہ اِس طرح مڑ کے
یونہی آنکھوں میں آ گئے آنسو

کوششِ ضبطِ غم تو کی کوثر
پھر بھی پلکوں تک آ گئے آنسو

کوثر جہاں کوثر

بھی سیٹ کے نیچے چھوٹ گیا تھا۔ کنڈکٹر نے جب یہ بات مسافروں پر ظاہر کی تو دو نوجوان مسافروں نے اُسے اپنا بتایا۔ معاملہ کوتوالی تک پہنچا دیا گیا۔ دونوں دعوے داروں سے اٹیچی کے اندر بند سامان کی فہرست مانگی گئی۔ دونوں نے فہرستیں داخل کیں۔ کوتوال کی نگرانی میں جب اٹیچی کھولی گئی تو سبھی حاضرین کی حیرت کی کوئی اِنتہا نہ رہی۔ اٹیچی سے ایک نوزائیدہ بچّے کی لاش برآمد ہوئی۔ دونوں نوجوانوں کو گرفتار کر لیا گیا!

کون جانے یہ ماڈرن ٹائمز کی بلندی تھی یا پستی ——! اُس کی فتح تھی یا شکست ——!!

زندگی کے نئے موڑ پر ششما اِس طرح مطمئن تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو!!

## ۳• روزہ طب اور سائنس کی روشنی میں

تو دنیا کے ہر مذہب و ملت میں روزہ کی ضرورت و اہمیت تسلیم کی گئی ہے اور دنیا کے ہر مذہب و ملت میں روزے رکھنے کا رواج ہے ــــــ روزہ مذہبی احکام کا ایک اہم جز نہیں، طبی اعتبار سے بھی روزے رکھنا بے حد مفید اور بے حد ضروری ہے۔

پیرس کے مشہور ڈاکٹر پروفیسر ڈیچز کی تحقیق ہے کہ قبض، میعادی بخار، ہیضہ اور مختلف بیماریوں کا اصل سبب پیٹ کی خرابی نہ ہو لیکن ایک بڑا سبب ضرور ہے۔ معدہ کی خرابی کی وجہ سے قوتِ دافعہ کمزور ہو جاتی ہے اور امراض کے جراثیم بہت جلد اثر کرتے ہیں۔ اعضا کا عمل زیادہ تر اُن کی ساخت کے موافق ہوتا ہے اور ہر حصۂ جسم کا انحصار اس پر رہتا ہے کہ اسے اس کی قوتِ نمو سے کتنا حاصل ہوا ہے۔ اگر کھانا نہایت ہی کم کھایا جائے تو اس سے اعضاء کمزور ہو جاتے ہیں۔ لیکن کھانے کی زیادتی کی وجہ سے پٹھوں میں ایک سمی مادّہ پیدا ہو جاتا ہے، جس سے اعضاء کی ساخت میں کمزوری اور خرابی واقع ہو جاتی ہے۔ جن غذاؤں میں سمیت ہوتی ہے وہ جسم میں سمیت پیدا کر دیتی ہیں اور یہ بات آنتوں اور معدہ میں کھانے کی زیادتی سے ہوتی ہے۔ بہت سے لوگوں کو اُن کی لاعلمی میں سوءِ ہضم کی شکایت ہو جاتی ہے ــــــ دردِ سر، پیٹ کا درد، جگر کی خرابی، گردہ اور مثانہ کی خرابی، بے خوابی، کمزوری، سستی، دیوانگی، اختناق الرحم وغیرہ بیماریاں اکثر ہاضمہ کی خرابی ہی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اگرچہ مریض کو بظاہر کوئی وجہ نہ معلوم ہوتی ہو۔ ہر دیرینہ مرض میں معدہ کی اچھی طرح نگہداشت کرنی چاہیے۔ زیادہ کھانے اور بار بار کھانے سے بے شمار بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے خون کا دباؤ بھی بڑھ جاتا ہے اور خون کے دباؤ سے اکثر و بیشتر امراض پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی فالج کا اثر بھی ہو جاتا ہے۔

جو شخص روزہ رکھتا ہے، وہ اِن سارے امراض سے بہت حد تک محفوظ رہتا ہے۔ روزے سے صرف فاسد مادّے ہی نہیں جل جاتے، اعضاء میں نئی توانائی بھی آجاتی ہے۔ بعض اعضاء میں ضعف ضرور پیدا ہو جاتا ہے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں قوتِ رفتہ کا اعادہ ہو جاتا ہے۔ کھوئی ہوئی طاقت لوٹ آتی ہے۔

روزہ انسان کو کامل یا جزوی طور پر جسمانی مشقت سے نہیں روک سکتا۔ ڈاکٹر مارگولیس نے لکھا ہے ــــــ "بہت سے شریانی امراض کے لئے روزہ بہترین علاج ہے۔ ذیابیطس کے مرض میں روزہ رکھنے کے مفید اثرات کو اہلِ طب عرصے سے مانتے چلے آئے ہیں۔"

## ۴• لہسن بطورِ غذا اور دوا

لہسن مصالحہ ہی کا خاص جز نہیں ہے۔ دوائی اعتبار سے بھی بہت سے اوصاف و خواص رکھتا ہے ــــــ جرمنی کے مشہور ڈاکٹر اسٹرلینفنڈ نے لکھا ہے ــــــ "لہسن خدائی نعمت ہے۔ لہسن کھانے سے دل و دماغ اور جسم کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے خون پیدا ہوتا ہے۔ مضرِ صحت جراثیم کو ہلاک کرنے کی قوت بڑھتی ہے۔"

لہسن مقوّیِ بدن، مقوّیِ باہ اور مصفّیِ خون ہے۔ حافظہ کو تیز کرتا اور دماغ کو طاقت دیتا ہے۔ بصارت کو تیز کرتا ہے۔ موتیا بند میں بہت مفید ہے۔

لہسن کا مزاج گرم و خشک ہے۔ اس لئے گرم مزاج والوں کے لئے اس کا زیادہ استعمال مُضر ہے۔ پیاس لگاتا ہے۔ مُنہ اور معدے میں خشکی پیدا کرتا ہے۔ سرد اور بلغمی مزاج والوں کے لئے بہت مفید ہے۔ بواسیر اور پیچش کے مریضوں کے لئے بھی مُضر ہے۔

لہسن کو چھیل کر بھون لیں۔ اس کے بعد اس کے ہموزن شہد ملائیں۔ ایک تولہ صبح و شام کھانا فالج اور لقوہ کے لئے مفید ہے۔

لہسن کے چند جوؤں کو گھی میں بھون کر کھانا، آواز اور حلق کو صاف کرتا ہے۔ پُرانی کھانسی اور سردی سے سینہ میں درد ہو تو اُس

کے لئے مفید ہے۔ سینے کے بلغم کو صاف کرتا ہے۔

لہسن کو جلا کر اس میں شہد ملا کر بہق اور برص کے داغوں پر لگانا مفید ہے۔ سر کے گنج کے مقام پر بھی اس کا لیپ کرنا فائدہ بخش ہے اس سے بال نکل آتے ہیں۔

سرکہ سے تیار کیا ہوا لہسن کا اچار معدہ کی تقویت کے لئے بے حد مفید ہے۔ ریاح کو تحلیل کرتا ہے۔ لہسن بلغمی اور ریاحی امراض میں بہت مفید ہے۔ ریاح کو خارج کر کے معدے کی اصلاح کرتا ہے۔ معدے کے جراثیم کو ہلاک کرنے کی اس میں بہت زبردست طاقت ہے۔ معدہ کی رطوبت کو دفع کرتا ہے۔ بھوک بڑھاتا ہے۔ پیٹ اور گردوں کی بہت سی بیماریوں کو دُور کرتا ہے۔ چونکہ اس میں گندھک بہت زیادہ مقدار میں ہے اس لئے جلدی امراض کو دُور کرتا ہے۔ قبض کشا ہے اور پیشاب کھول کر لاتا ہے۔

دمہ، نمی کھانسی، دل کی کمزوری، گٹھیا، جوڑوں کے درد، پھیپھڑوں کے زخم، تپ دق اور پرانے بخار میں بہت مفید ہے۔ ایک جرمن ڈاکٹر نے کیمیاوی تحقیق کے بعد لکھا ہے ـــــ "جب تک دُنیا میں لہسن کا وجود ہے، دق کے مریضوں کو مایوس نہ ہونا چاہیئے"

لہسن خون پیدا کرتا ہے اور خون کی روانی میں اضافہ کرتا ہے۔

## ۵ • اگر آپ صحتمند رہنا چاہتے ہیں

اگر آپ صحت مند رہنا چاہتے ہیں تو سادہ زندگی گزاریں۔ سادہ غذا کھائیں۔ آپ جتنی روٹی، چاول، گوشت، مچھلی اور انڈے کھائیں اُس سے دو گنا زیادہ پھل کھایا کریں۔ پھلوں سے مطلب صرف سیب، انگور اور انار ہی نہیں۔ ہر سبز ترکاری میں پھلوں کے خواص بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر گاجر، مُولی، ٹماٹر، چقندر، شلغم کو لیجیئے۔ ان میں وہ سارے قوت بخش اجزا پائے جاتے ہیں جو جسمانی نشو و نما کے لئے ضروری ہیں۔

کھانے کے ساتھ پانی نہ پیجیئے، غذا کو پانی بنا کر حلق سے اُتاریئے۔ اگر بہت پیاس محسوس ہو تو کھانے کے بعد تھوڑا پانی پی لیجیئے۔ کھانا کھا کر بہت زیادہ پانی پینے سے کھانا اچھی طرح ہضم نہیں ہوتا۔ کھانے کے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد پانی پینے کی عادت ڈالیئے۔ کچھ ہی دنوں میں آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کا ہاضمہ کتنا اچھا ہو گیا ہے۔

## ٦ • قابلِ توجہ بیماری

بظاہر تعصّب کوئی بیماری نہیں، لیکن درحقیقت بے حد قابلِ توجہ بیماری ہے۔ مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــ "تعصّب ایسی بیماری ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان بہت سی اچھی اور پسندیدہ چیزوں سے نفرت کرنے لگتا ہے، اور بہت سی غلط اور بیکار چیزوں سے عقیدت رکھنے لگتا ہے۔ جو شخص تعصّب سے پاک ہے وہ ایک بہتر انسان ہو سکتا ہے۔ وہ سب کا دوست اور رفیق بن سکتا ہے۔ وہ آپس میں لڑنے جھگڑنے اور بحث و تکرار کرنے کی بجائے پُورے صبر و سکون سے دوسرے لوگوں کے نقطۂ نظر کو سمجھ سکتا ہے اور اس طرح وہ جہالت سے دُور رہتا ہے اور علم کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے"

## ۷ • زندگی سے کبھی شکست قبول نہ کیجیئے

زندگی ایسا سفر ہے جس میں بہت سے موڑ آتے ہیں۔ بہت سی مشکلات آتی ہیں۔ اگر آپ منزل سے ہمکنار ہونا چاہتے ہیں تو مشکلات سے دوچار ہونے پر حوصلہ نہ ہاریئے۔ نامساعد حالات سے شکست قبول نہ کیجیئے۔ جو لوگ راہ کی مشکلات سے حوصلہ نہیں ہارتے اُن کے لئے کانٹے پھول بن جاتے ہیں۔

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــ "وہ لوگ جو اپنے آپ کو غربت، فاقہ کشی اور دوسری مصیبتوں سے نکالنا چاہتے ہیں وہ یقیناً اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے اور جنھوں نے زندگی سے شکست قبول کر لی ہے وہ کبھی زندگی سے فاقہ کشی اور غربت کے سوا کچھ اور حاصل نہیں کر سکتے"

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی معاشی تمدنی علمی ادبی سوالات کے جوابات دئے جاتے ہیں۔ قلیل اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

## سوال و جواب

### سید مبارک حسین۔ عادل آباد۔ دکن

س۔ غالبؔ کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ نہ سنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

س۔ ہندوستان سے نکلنے والے اُردو رسالوں کی تعداد کیا ہے؟

ج۔ اتنی زیادہ کہ سُن کر اُردو کے دشمنوں کو حیرت ہوگی!

س۔ کس خطا پر اُردو کو اس کا صحیح مقام نہیں دیا جا رہا ہے؟

ج۔ اِس کی یہی خطا ہے کہ کوئی خطا نہیں!

---

### نصیر احمد خاں پربھنی

س۔ کوشش کرنے کے بعد کوشش ناکام ہو جائے تو انسان کو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ بددل نہ ہو جانا چاہئے۔ اِس یقین کے ساتھ جدوجہد جاری رکھنی چاہئے کہ جدوجہد کبھی رائگاں نہیں جاتی ———
یقین و عزم مسلسل میں رازِ ہستی ہے!

س۔ دوست کی تعریف کیجئے۔

ج۔ دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

س۔ غالبؔ کا کوئی شعر سُنائیے۔

ج۔ بہت دِنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اِک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

---

### اسلم جاوید گیاوی

س۔ حُسن اور عشق میں کس کا مقام بلند ہے؟

ج۔ حُسن کا۔ حُسن ہی سے عشق کا وجود ہے۔

س۔ فلم دیکھنا بُرا کیوں ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ بیشتر فلمیں اخلاق کو تباہ کرنے والی ہوتی ہیں۔

س۔ غالبؔ اور اقبالؔ میں کس کا مقام بلند ہے؟

ج۔ غالبؔ کا۔ غالبؔ خدائے سُخن تھے۔ اقبالؔ نے بھی غالبؔ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

---

### مُسلم آزاد رمضان پوری

س۔ جیون ساتھی نہ مل سکے تو؟

ج۔ جو بندہ یابندہ ——— تلاش کرنے والے خدا کو بھی پالیتے ہیں! آپ بھی یقیناً جیون ساتھی پا سکتے ہیں۔

س۔ نریش کمار شاد ———؟

ج۔ جس نے اپنے بارے میں کہا ہے ؎
درد کو ڈھالتے ہیں نغموں میں
سوز کو ساز میں بدلتے ہیں
داد دے ہم کو اے غمِ دُنیا
زخم کھا کر بھی پھول اُگلتے ہیں

س۔ بھارت اور بیکاری؟

ج۔ جیسے لازم و ملزوم بن گئے ہیں!

---

### محمد وجیہہ الدین سلیم۔ حیدر آباد

س۔ بھائی جان! ادیب اور معالج دونوں میں کون انسان کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کرتا ہے؟

ج۔ ادیب زیادہ قریب سے انسان کی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے۔ معالج انسان کے جسم ہی کا معائنہ کرتا ہے۔ ادیب انسان کی رُوح، انسان کے دل کا مطالعہ کرتا ہے۔

---

### ذوالقرنین آزاد چمپارنی

س۔ کیا انسان چاند پر اُتر جائے گا؟

ج۔ بندہ نواز! آپ کس عالم میں رہتے ہیں، انسان چاند پر اُتر بھی گیا! اور اب تو چاند پر بود و باش اختیار کرنے کے منصوبے بھی بنا رہا ہے لیکن ہم تو اُن سے کہتے ہیں ؎

چاند پر تم جو گئے بھی تو ملا کیا ہم کو
فردہ امن لئے اہلِ جہاں تک آ ؤ!

س۔ جمہوری مُلک کسے کہتے ہیں؟

ج۔ ہندوستان کو! جو آئین کے اعتبار سے غیر مذہبی ملک ہے، لیکن جہاں مذہب کے نام پر آئے دن فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں!

---

### محمد مستعمر علی شفیع۔ نلگنڈہ۔ دکن

س۔ تلنگانہ کے علیٰحدہ ہونے سے تلنگانہ کے عوام کو کیا فائدہ پہنچے گا؟

ج۔ عوام پر خاک پڑ ڈالئے، تلنگانہ کے خواص کو تو فائدہ پہنچے گا!

س۔ شاد صاحب کے بارے میں کچھ بتائیے۔

ج۔ شاد صاحب جتنے اچھے فنکار تھے، اتنے ہی اچھے انسان بھی تھے۔

س۔ کیا جاسوسی کتابیں پڑھنا گناہ ہے؟ اچھے ناول پڑھنے پر بھی لوگ اعتراض کیوں کرتے ہیں؟

ج۔ جاسوسی کتابیں پڑھنا گناہ نہیں، لیکن تضیعِ اوقات ضرور ہے۔ بیشتر لوگ جنھیں اچھے ناول سمجھتے ہیں، وہ اچھے نہیں ہوتے۔

---

### محمد پرویز عالم آرزوی۔ سہسرام

س۔ عورت کا سب سے بڑا جوہر کیا ہے؟

ج۔ مہر و وفا ــــ عفت و عصمت!

س۔ کیا پردہ مسلمانوں کی شان اور عزت ہے؟

ج۔ پردہ سماجی اور معاشرتی ضرورت ہے۔ پردہ مسلمانوں ہی کی شان اور عزت نہیں ہے، ضروری پردہ سب کی شان اور عزت ہے۔

---

### محمد احمد۔ پٹیل روڈ۔ شاد نگر

س۔ خوشتر بھیا! غالب کا ایک خوبصورت شعر سُنائیے۔

ج۔ ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

س۔ خواب میں دھواں دکھائی دے تو اُس خواب کی تعبیر کیا ہوگی؟

ج۔ کہتے ہیں خواب کی تعبیر اُلٹی ہوتی ہے۔

س۔ عزت؟

ج۔ کبھی لوگ عزت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتے تھے۔ اب کچھ پانے کے لئے عزت قربان کر دیتے ہیں!

---

### محمد اصغر علی نواب۔ دھنباد (بہار)

س۔ کیا انسان کی آخری منزل موت ہے؟

ج۔ جی نہیں ؎

موت اِک ماندگی کا وقفہ ہے
اور آگے چلیں گے دَم لے کر

س۔ انسان اپنے آپ کو کب بدقسمت سمجھنے لگتا ہے؟

ج۔ جب حالات سے شکست کھا جاتا ہے۔

س۔ وقت پر اپنے بھی پرائے ہو جائیں تو کیا اُن سے ہمیشہ کے لئے مُنہ موڑ لینا چاہیے؟

ج۔ نہیں، انھیں پھر اپنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

---

### مِس ذاکرہ۔ علی گڑھ

س۔ بھائی جان! اسلوب کس زبان کا لفظ ہے۔ عربی یا فارسی زبان کا؟

ج۔ اسلوب عربی زبان کا لفظ ہے۔

---

### رضیہ جمیل۔ لائل پور

س۔ بھائی جان! یہ حسین شعر کس کا ہے ؎

شفق، دھنک، مہتاب، گھٹائیں، تارے، نغمے، بجلی، پھول
اُس دامن میں کیا کیا کچھ ہے، وہ دامن ہاتھ میں آئے تو

ج۔ یہ شعر ڈاکٹر عندلیب شادانی کا ہے۔

---

### ایم۔ جے۔ احمد بھٹکلی۔ گنتور

س۔ ہندوستان کی معاشی حالت کب سدھرے گی؟

ج۔ جب یہ آس لئے ہم، آپ اور بہت سے دُنیا سے سدھار جائیں گے!

س۔ ہندوستان کا مستقبل جاپان کے مقابلے میں؟

ج۔ ہندوستان کے اربابِ حل و عقد کہتے ہیں کہ جاپان ہو یا چین ہندوستان کا مستقبل سب سے زیادہ روشن ہے!

---

### محمد مصطفیٰ۔ ہوڑہ

س۔ والدین نے میری شادی کر دی لیکن شریکِ حیات موزوں نہیں۔ بتائیے کیا کروں؟

ج۔ اُسے موزوں بنانے کی کوشش کیجئے۔ جلد ہی اپنی کامیابی پر آپ کو حیرت ہوگی اور حیرت سے زیادہ مسرت ہوگی۔

س۔ میں اچھا کھاتا پیتا انسان ہوں، فیملی بھی خوش حال ہے، پھر بھی مجھے اطمینان و سکون نہیں ہے۔

ج۔ حالات سے سمجھوتہ کر لیجئے۔ جلد ہی اطمینان و سکون حاصل ہو جائے گا۔

س۔ ہندوستان کا مستقبل؟

ج۔ اتنا تاریک نہیں ہے جتنا تاریک کچھ لوگ سمجھتے ہیں۔

---

**محمد الطاف کریم ہتر مد سیٹ شیخوپوری**

س۔ ایک حسین دوشیزہ اپنے آپ کو شیشے میں دیکھ کر کیا خیال کرتی ہے؟

ج۔ اپنے آپ سے شرماتی ہے! اس کے صبیح رخسار شفق گوں ہو جاتے ہیں۔

س۔ عورت پھول ہے یا کانٹا؟

ج۔ پھول سمجھنے والوں کے لئے پھول، کانٹا سمجھنے والوں کے لئے کانٹا!

---

**شاکر ناظمی مظفر پور**

س۔ غمزہ صحیح ہے یا غُمزہ؟

ج۔ غَمزہ۔

س۔ عرب کا مستقبل؟

ج۔ عربوں کے عزم و حوصلہ اور اتحاد و اتفاق پر موقوف ہے۔

---

**سیّد محمود پیران۔ اورنگ آباد دکن**

س۔ مرد زیادہ ظالم ہوتا ہے یا عورت؟

ج۔ غریب عورت ہر دور میں مظلوم رہی ہے۔ عورت کہاں ظالم ہوتی ہے۔ چنگیز، ہلاکو، ہٹلر، چاؤ ماؤ ـــــ یہ سب عورتوں ہی کے نام ہیں؟

---

**سیّد محفوظ الرحمٰن۔ اُناؤ**

س۔ بھائی جان! انسان کو سچی خوشی کب میسر ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے یا شادی کے بعد؟

ج۔ شادی کے بعد۔ ہاں! جو لوگ اپنی بے راہ روی سے شادی کو بربادی بنا دیتے ہیں اُنھیں شادی سچی خوشی تو کیا جھوٹی خوشی بھی نہیں دیتی۔

س۔ ہندوستان کا سب سے خوبصورت شہر کون سا ہے؟

ج۔ بمبئی! بمبئی کو عروس البلاد کہتے ہیں۔

---

**ہدایت علی ساحل تعمیر ی نلیب**

س۔ آج کل کے طالب علم اپنا پڑھنا چھوڑ کر سیاست کے میدان میں کیوں کود پڑتے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ آج کل کی تعلیم گاہوں میں طلباء کو صرف تعلیم دی جاتی ہے۔ اُن کی تربیت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

س۔ ہر دلعزیز بننے کے لئے انسان کو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ اچھا انسان بننا چاہئے۔ دوسروں کے دُکھ درد کو اپنا دُکھ درد سمجھنا چاہئے۔

س۔ دل کی خواہشیں کب پوری ہوتی ہیں؟

ج۔ جب ان کی تکمیل کے لئے جدوجہد کی جاتی ہے

---

**قیصر صدیقی۔ کٹیہار۔ بہار**

س۔ میں نے سنا ہے کرشن چندر ایشیا کے عظیم افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں۔ کیا یہ حقیقت ہے؟

ج۔ یہ سو فیصدی سچ ہے۔ کرشن چندر کی عظمت سے کوئی صاحب نظر انکار نہیں کر سکتا۔

س۔ آج کا انسان تنگ دل، تنگ نظر، تنگ خیال کیوں ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ آج کا انسان انسان نہ رہا!

---

**اقبال احمد عبدالرزاق شیخ۔ تارا پور۔ تھانہ**

س۔ عورت؟

ج۔ عورت مرد کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اموی نے کہا ہے ـــــ "عورت مرد کا نصف ایمان ہے"۔ ہیلن نے کہا ہے ـــــ "عورت زندگی کی کٹھن منزل کے لئے رہبر کامل ہے"۔

---

**فضل رب نرکٹوری۔ بہار**

س۔ شہر اور دیہات کی زندگی میں کیا فرق ہے؟ آپ کس زندگی کو زیادہ مہذب اور باسلیقہ سمجھتے ہیں؟

ج۔ شہر اور دیہات کی زندگی میں بہت فرق ہے مہذّب اور باسلیقہ شہر کی زندگی ہوتی ہے لیکن دل کا سکون اور دل کا سکھ دیہات کی زندگی میں ہے۔ ہم نے دونوں زندگیوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ گاؤں کی فضاؤں میں جو خلوص ہے، شہروں میں اُس کا شائبہ بھی نہیں۔

س۔ بیکاری کا انجام کیا ہے؟

ج۔ تنگ دستی و فاقہ مستی!

س۔ دن بہ دن لوگوں کے لباس تنگ ـــــ ہوتے جا رہے ہیں۔ آخر اِس کا کیا انجام ہوگا؟

ج۔ ایک دن لوگ لباس کی قید سے آزاد ہو جائیں گے!

---

**محمد اصغر علی نواب۔ دھنباد**

س۔ دوستی غریب کی اچھی ہوتی ہے یا امیر کی؟

ج۔ کبھی غریب کی دوستی اچھی ہوتی تھی اب امیر کی دوستی اچھی سمجھی جاتی ہے۔

س۔ خوشتر بھیّا! قسمت ساتھ نہ دے تو؟

ج۔ آپ حوصلہ کا دامن نہ چھوڑیں۔

س۔ کون سی ٹھوکر کھا کر انسان ہنستا ہے؟

ج۔ کوئی حسین ٹھوکر!

---

# 30 لاکھ عورتیں غلط نہیں ہو سکتیں

پچھلے چار برسوں میں 30 لاکھ عورتوں نے اپنی مرضی سے لوپ لگوائے۔ انہیں معلوم ہے کہ لوپ مؤثر ہے۔ یہ حمل روکنے کا سب سے زیادہ قابلِ اعتماد طریقہ ہے۔

**یہ سادہ ہے**۔ لیڈی ڈاکٹر اسے چند ہی منٹوں میں لگا دیتی ہے۔

**یہ نکلوایا جا سکتا ہے**۔ جب آپ چاہیں کہ آپ کے دوسرا بچہ ہو تو آپ لوپ نکلوا سکتی ہیں۔

**یہ کار آمد ہے**۔ اگر لوپ آپ کو راس ہے، تو آپ کو کسی اور طریقہ کی ضرورت نہیں۔ لوپ آپ کی جنسی مسرت میں دخل انداز نہیں ہوتا۔

**یہ بے ضرر ہے**۔ اس سے کوئی بیماری نہیں ہوتی۔ تکلیف ہو بھی جائے تو اسے آسانی سے دور کیا جا سکتا ہے۔

محتاط مطالعہ اور مشاہدے کے بعد ڈاکٹروں نے رائے دی ہے کہ لوپ عورتوں کے لئے موافق ہے۔ جن عورتوں کو لوپ راس نہیں وہ دوسرے طریقوں سے اپنے بچوں کی پیدائش میں وقفہ رکھ سکتی ہیں۔ وہ بچوں کی تعداد بھی اپنے اختیار میں رکھ سکتی ہیں۔

مزید جانکاری اپنے قریب ترین فیملی پلاننگ سینٹر سے حاصل کریں۔

فیملی پلاننگ سے متعلق مشورہ اور خدمت مفت ہے۔

**افواہ کا اعتبار نہ کریں**

**لیڈی ڈاکٹر کا اعتبار کریں**

برج نرائن سنہا۔ الہ آباد

س۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کو کب نوبل پرائز ملا تھا؟

ج۔ ۱۹۱۳ء میں۔

س۔ اب تک کتنے ہندوستانیوں کو نوبل پرائز ملا ہے؟

ج۔ تین کو ۔۔۔ ڈاکٹر ٹیگور کو، ڈاکٹر سی۔ وی۔ رمن کو اور ڈاکٹر ہرگوبند کھورانہ کو ۔۔۔ اب حالات نے ڈاکٹر کھورانہ کو امریکی شہری بنا دیا ہے۔

---

س۔ رحمن کلکتہ

س۔ بیسویں صدی کے لئے کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوئے افسانے بھیجے جائیں یا دونوں طرف؟

ج۔ ایک طرف لکھا جائے تو بہتر ہوگا

س۔ میرا افسانہ بیسویں صدی کے معیار کے مطابق ہو تو بیسویں صدی میں جگہ دیں گے؟

ج۔ بیسویں صدی کے معیار کے مطابق ہوگا تو ضرور شریک اشاعت ہوگا۔

س۔ افسانے ٹائپ کئے ہوئے ہونے چاہئیں یا قلم سے لکھے ہوئے؟

ج۔ قلم سے خوشخط لکھے ہوئے۔

---

سعیدہ جمیل۔ لاہور

س۔ بھائی جان! کچھ نصیحت کی باتیں بتلائیے۔ مجھے اچھی باتیں جاننے اور یاد رکھنے کا بہت شوق ہے۔

ج۔ یہ بہت مبارک شوق ہے۔ اچھی باتوں پر عمل کرنا اور بھی مبارک ہے ۔۔۔ سنیئے کچھ اچھی باتیں سنئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ارشاد فرمایا ہے ۔۔۔ حسد کے ساتھ راحت نہیں، انتقام کے ساتھ سرداری نہیں، بے ادبی کے ساتھ بزرگی نہیں، نافرمانی کے ساتھ فلاح نہیں، حضرت امام غزالی نے ارشاد فرمایا ہے۔ ۔ بھوک سے پہلے کھانا مکروہ بھی ہے مذموم بھی، حضرت شیخ ابوبکر وراق نے ارشاد فرمایا ہے ۔۔۔ بُرے اخلاق سے اسی طرح بچو جیسے تم حرام سے بچتے ہو۔

---

محمد ارمغان ساحل سہرامی سہسرام

س۔ زندگی میں کب بہار آتی ہے؟

ج۔ جب تمناؤں کی کلیاں مسکراتی ہیں۔

س۔ خوشتر بھائی، میں اپنی ایک غزل بھیجوں تو آپ شائع کریں گے؟

ج۔ ابھی کسی استاد کا دامن پکڑ کر مشقِ سخن کیجیے۔ آپ کے لئے ہمارا یہی پرخلوص مشورہ ہے۔

---

فیاض احمد آرزو ڈیسرگڑھ۔ بردوان

س۔ بھیا! آپ موت سے ڈرتے ہیں یا زندگی سے؟

ج۔ بھائی جان! ہم زندگی کے نقیب ہیں، ہمارا نعرہ ہے ؎

اجل کی زندگی پر دسترس کیا
اجل خود کانپتی ہے زندگی سے

س۔ دنیا میں عورت کا کیا مقام ہے؟

ج۔ دنیا آپ کے سامنے ہے ۔۔۔ عورت آپ کے سامنے ہے! اگر آپ یہ پوچھیں عورت کا کیا مقام ہونا چاہئے؟ تو ہم کہیں گے، بہت بلند!

س۔ عورت کا پہلا فرض کیا ہے؟

ج۔ عورت کا پہلا اور آخری فرض ہے مرد کی غلامی! آپ یہی سننا چاہتے ہیں نا؟

---

سید مبارک حسین۔ عادل آباد۔ دکن

س۔ کیا خواب کبھی کبھی حقیقت بنتے ہیں؟

ج۔ خواب کو حقیقت بنانے کے لئے جدوجہد کی جائے تو خواب حقیقت بن جاتے ہیں۔ جیسے اپالو ۱۱ کا خواب حقیقت بن گیا۔

س۔ اردو جاننے والوں کی تعداد کیا ہے؟

ج۔ بین الاقوامی محکمۂ اعداد و شمار کی لسانیاتی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ۳۵ کروڑ لوگ اردو بولتے اور لکھتے پڑھتے ہیں ۔۔۔ لیکن درحقیقت اردو بولنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ مزدور، دکاندار، کاروباری لوگ، خریدار ۔۔۔ سبھی اردو بولتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسٹیج پر ہندی میں اردو کی مخالفت کرنے والے بھی اپنے گھروں میں اردو بولتے ہیں!

---

محمد ایاز۔ جنگاؤں

س۔ خدا بندوں پر کب مہربان ہوتا ہے؟

ج۔ خدا اپنے بندوں پر ہر وقت مہربان رہتا ہے۔

س۔ بتائیے چین کی پوری آبادی کتنی ہے؟

ج۔ چین کی آبادی کچھ عرصہ پہلے ۵۸ کروڑ ۲۰ لاکھ تھی۔ بعض ماہرین کا بیان ہے کہ چین کی آبادی پہلے ۸۰ کروڑ سمجھی جاتی تھی، نئی مردم شماری کی رو سے ۷۰ کروڑ ہے۔

س۔ بیسویں صدی جاری ہوئے کتنے سال ہوئے؟

ج۔ ۴۴ سال

---

جی ایم۔ ایم حق لکھیم پور (آسام)

س۔ آزاد ہندوستان کے کانگریسی رہنماؤں کا مستقبل؟

ج۔ ہے حسرت ناک ہے ۔۔۔ ان سرفروش مجاہدوں کا حال تاریک ہے تو مستقبل کا کیا ذکر؟

س۔ رنج پیہم کے بعد اطمینان کی زندگی؟

ج۔ رنج پیہم کے بعد اطمینان کی زندگی بھی بلیغ ہے ۔۔۔ رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج!

محمد فصیح الدین ثاقب۔ صاحب گنج چھپرہ

س۔ پروانہ شمع کا عاشق ہے یا تاریکی کا؟

ج۔ پروانہ شمع کا عاشق ہے نہ تاریکی کا ۔

پرائی آگ میں جلتا ہے کون دنیا میں
پتنگے آگ میں اپنی بنام شمع جلے

س۔ تقدیر کے مذاق پر ہنسنا چاہئے یا رونا؟

ج۔ بلند حوصلہ تقدیر کے مذاق پر ہنستے ہیں، روتے نہیں۔

رام لعل۔ کانپور

س۔ دنیا کا غریب ترین ملک؟

ج۔ ہندوستان کے ارباب حکومت کے بیان کے مطابق ہندوستان نہیں ہے۔

محمد عبد السلیم قریشی۔ حیدر آباد دکن

س۔ "بیسویں صدی" دنیا کے کن کن ملکوں میں جاتا ہے؟

ج۔ تقریباً سارے ملکوں میں۔

س۔ یہ شعر کس کا ہے ۔

تعلیم عورتوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ج۔ یہ شعر حضرت اکبر الہ آبادی کا ہے۔

س۔ آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا شہر کون سا ہے؟

ج۔ ایک اخباری بیان کے مطابق ٹوکیو ساری دنیا میں سب سے زیادہ آبادی کا شہر ہے۔ اس کی آبادی ایک کروڑ دس لاکھ ہے۔

محمد شرف الدین حیدر۔ کلکتہ

س۔ دنیا میں مسلمانوں کی کل آبادی کتنی ہے؟

ج۔ تقریباً ۵۵ کروڑ۔

س۔ علامہ اقبال کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو

س۔ ہندوستان کا سب سے بڑا کون سا شہر ہے؟

ج۔ رقبہ اور آبادی کے اعتبار سے کلکتہ ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔

خورشید گیلانی۔ کریم گنج۔ گیا

س۔ آج کل ہندوستانی سیاست ایک مذاق بن گئی ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟

ج۔ بہت حد تک اس حالت کی ذمہ دار خود غرضی کی ذہنیت ہے۔

س۔ کیا ڈیموکریسی اسی کا نام ہے جو ہمارے ملک میں جاری ہے؟

ج۔ جی ہاں یقین نہ ہو تو فرقہ پرستی کی آگ کو ہوا دینے والے فرقہ پرستوں سے پوچھ لیجئے!



ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی ۔۔۔ مطبوعہ ۔۔۔ پرنٹنگ ورکس دہلی ۔۔۔ شائع کیا ۔۔۔ دہلی

Registered with the Registrar of ...

BISWIN SADI

24th YEARS OF PUBLICATION

Telephones   Office, 271637   Residence, 619927

# RADIUM TONIC PILLS

## کمزوری کا زبردست علاج
## ریڈیم ٹانک پلز

نیا خون کثرت پیدا کر کے نہ صرف کمزوری دور کرتی ہیں بلکہ جسم میں زبردست طاقت بڑھاتی ہیں۔ وزن اور خون کئی پونڈ بڑھ جاتا ہے کھوئی ہوئی طاقت اور صحت واپس لانے کیلئے ملک کے کونے کونے میں مشہور و مقبول ہیں اور لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ کمزوری خواہ کسی وجہ سے ہو کمزور سے کمزور انسان کو بھی نئی طاقت حاصل ہوتی ہے تندرست نوجوان ریڈیم ٹانک پلز کے علاج سے اپنی طاقت کئی گنا بڑھا سکتے ہیں۔ قیمت مکمل علاج صرف چھ روپے محصول ڈاک علاوہ۔

کلکتہ ایجنٹ
این اینڈ اسمٰعیل پرائیویٹ لمیٹڈ
نمبر ۱٨ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۱

فروری

Rs.1-25

**Biswin Sadi**

**DELHI**

یاد آجاتی ہے جب تیرے تبسّم کی ہمیں
دیر تک دِل میں چراغاں کا سماں رہتا ہے ——— نریش کمار شاد

فوٹو: سورج این. شرما۔ جے پور

مکرانہ (راجستھان) کے ایک مشاعرے میں اُردو کے نامور شاعر جناب مخمور سعیدی غزل سنا رہے ہیں۔

تجھ سے بچھڑے تو کہیں اپنا نشاں بھی نہ ملا — مُدتوں ہم کو سراغِ دل و جاں بھی نہ ملا

عشق کی موت کو دُنیا نے کہا عینِ حیات — مرنے والوں کو، کوئی مرثیہ خواں بھی نہ ملا

تھا سبک سیر بہت، دورِ نشاطِ رفتہ — جادۂ وقت پہ قدموں کا نشاں بھی نہ ملا

دیدنی، محفلِ شب کا تھا چراغاں لیکن — صبحدم کُشتہ چراغوں کا دُھواں بھی نہ ملا

صنم آبادِ تمنّا سے بھی مایوس چلے — ہم جسے ڈھونڈنے آئے تھے، یہاں بھی نہ ملا

عمرِ بربادِ تمنّا کے شب و روز، نہ پوچھ — دل کو اک لمحۂ احساسِ زیاں بھی نہ ملا

اپنی بستی کی زمیں بھی نہ رہی زیرِ قدم — شہرِ غربت میں ستاروں کا جہاں بھی نہ ملا

مسجدیں ہی نہیں اِس دورِ خرد میں سنسان — کوئی ہنگامہ سرِ کوئے بُتاں بھی نہ ملا

میکدے سے بھی تم اُٹھ آئے جو چُپ چُپ مخمورؔ
کیا علاجِ غمِ دل تم کو وہاں بھی نہ ملا؟

ہندوستان میں عیدالفطر بہت جوش وخروش سے منائی گئی۔ کئی جگہ ہندو مسلم اور سکھ اصحاب جمع ہوکر مسلم برادران کی اس خوشی میں شریک ہوئے ۔۔۔ عید اپنے دامن میں خوشی و شادمانی کا پیغام لے کر آتی ہے۔ اس میں میل ملاپ اور بھائی چارے کی روح کارفرما ہوتی ہے۔ خوشی کے اس موقع پر ہم ذاتی اختلافات کو بھول کر ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں محبت، دوستی اور بھائی چارہ کے نغموں سے فضا گونج اٹھتی ہے ۔۔۔ حلقۂ احباب کی طرف سے غالب اکیڈیمی نظام الدین نئی دلی میں جشنِ عید کے سلسلہ میں ایک عظیم الشان تقریب منائی گئی۔ صدارت کے فرائض جناب پروفیسر محمد مجیب نے اور اسٹیج سیکرٹری کے فرائض جناب کنور مہندر سنگھ بیدی نے نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دئے۔ جناب آئی۔ کے گجرال منسٹر آف اسٹیٹ وزارتِ اطلاعات ونشریات، مہمان خصوصی تھے۔ گجرال صاحب نے عید کی مبارک باد پیش کرتے ہوئے حلقۂ احباب کی اس قابلِ تعریف کوشش کو بہت سراہا۔ کلچرل پروگرام کے بعد تین سو سے زائد اصحاب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا جن میں ہندو مسلم سکھ اور عیسائی ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے ؛

جلسے کے آغاز میں جناب سلیم احمد جائنٹ سیکرٹری 'حلقۂ احباب' نے ایک مُرصّع استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ——— "ہندوستان مختلف تہذیبوں اور مذہبوں کا گہوارہ ہے۔ تہذیبوں کے بے شمار قافلے اِس کی وادی میں خیمہ زن ہوئے۔ دُنیا کے کئی ممتاز مذاہب نے اِس کی گود میں آنکھیں کھولیں۔ اِس سرزمین پر اگر ایک طرف مہاتما بُدھ۔ سوامی مہابیر۔ رام و کرشن نے جنم لیا تو دوسری طرف حضرت معین الدین چشتیؒ۔ نظام الدین اولیاء۔ گورونانک اور بیتہ بیمہ کے عرفان و بھگتی کے رُوح پرور نغمے اِس کی فضاؤں میں گونج اُٹھے۔ موجودہ ہندوستانی تہذیب ہم سب کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ یہ ایک ایسی ندی کی طرح ہے جس میں بہت سے چشموں کا پانی آکر شامل ہوگیا ہے۔ ایسا نغمہ ہے جو بہت سے سُروں سے مل کر پیدا ہوا ہے ——— کتنا اچھا ہو اگر ہمارا ہر مذہبی تہوار ایک قومی تہوار بن جائے۔ عید ہو یا دیوالی۔ گورونانک کا جنم دن ہو یا حضرت محمد صلعم کی پیدائش کا دن۔ محرم ہو یا دسہرہ ——— ہندو۔ مسلمان سکھ عیسائی اِن تہواروں کو مُشترکہ طور پر منائیں۔"

یسر من موہن سنگھ نے برجستہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہندو مسلم اتحاد انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخ کو پڑھا کر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اِس کے لئے ہمیں نئی تاریخ لکھنا ہوگی"۔
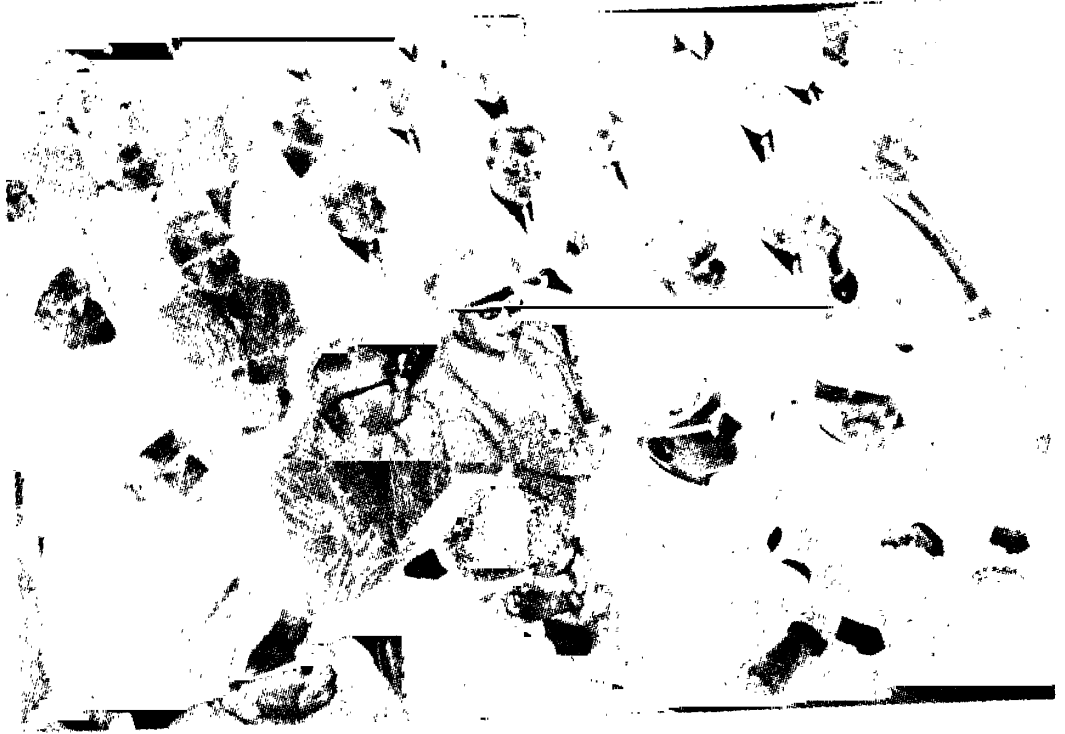
نِ عید کی محفل میں ہندو مسلم سکھ عیسائی بلالحاظِ مذہب و ملت شریک ہوئے۔ قومی اتحاد اور رواداری کی فضا پیدا کرنے کے لئے یہ ایک نیک فال ہے۔

ایڈیٹر: خوشتر گرامی

جلد ۳۲ — شمارہ ۳

# و نشتر

خوشتر گرامی

ایک گاندھی زندہ باد، دوسری گاندھی مردہ باد —— یہ ہیں بہروپئے۔

"طلبا کو کسانوں کی غربت دور کرنے کے لئے کام کرنا ہے" بادشاہ
۔ لیڈر بن کر قوم سے فراڈ نہیں کرنا۔

"اپوزیشن کانگریس کے ایک اور جھوٹ کی قلعی کھل گئی" ایک عنوان
۔ وہ ایک اور جھوٹ بول کر پھر قلعی کر لیں گے۔

"اندرا گاندھی کانگریس کو تباہ کرنا چاہتی ہیں" کامراج کا الزام
آئینے کے روبرو تو نہیں ہو۔ کیا اپنا چہرہ نظر آرہا ہے؟

"کانگریس پارٹی میں پھوٹ کا خیر مقدم" ایک عنوان ——
وستان کا خاص پھل ہے۔ سب نے مزے لے کر کھایا ہے اور
رہ گئے۔

"لڑکوں سے چھیڑ خانی پر دلی میں دس لڑکیاں گرفتار" ایک خبر
ں پر بھی نہ آسمان ٹوٹا اور نہ زمین پھٹی۔

"ہریانہ میں سنڈیکیٹ کا کوئی اثر نہیں ہے" ایک خبر ——
وہاں بھی زیادہ دن نہیں رہے گا۔

"بمبئی میں سنڈیکیٹ کو دفن کر دیا گیا" ایک عنوان ——
رتہ کفن پھاڑ کر نہ نکل سکے۔

"کانگریس کے کرائسس کی ذمہ داری اندرا گاندھی پر ہے" مرار جی
ن —— کیا خوب "چھاج بولے سو بولے چھلنی بھی بولے
چھید۔"

خوشتر گرامی

ایک گاندھی زندہ باد، دوسری گاندھی مردہ باد ——— یہ ہیں بہروپیے۔

• "طلبا کو کسانوں کی غربت دُور کرنے کے لئے کام کرنا ہے" بلو شاہ صاحب

——— لیڈر بن کر قوم سے فراڈ نہیں کرنا۔

• "اپوزیشن کانگریس نے ایک اور جھوٹ کی قلعی کھائی گئی" ایک عنوان

——— وہ ایک اور جھوٹ بول کر پھر قلعی کر لیں گے۔

• "اندرا گاندھی کانگریس کو تباہ کرنا چاہتی ہیں" کامراج کا الزام

——— آئینے کے رُوبرو تو نہیں ہو۔ کیا اپنا چہرہ نظر آرہا ہے؟

• "کانگریس پارٹی میں پھوٹ کا خیر مقدم" ایک عنوان ———

پھوٹ ہندوستان کا خاص پھل ہے۔ سب نے مزے لے کر کھایا ہے اور ہونٹ چاٹتے رہ گئے۔

• "لڑکوں سے چھیڑ خانی پر دہلی میں دس لڑکیاں گرفتار" ایک خبر

——— اس پر بھی نہ آسمان ٹوٹا اور نہ زمین پھٹی۔

• "ہریانہ میں سنڈیکیٹ کا کوئی اثر نہیں ہے" ایک خبر ———

اور جہاں ہے وہاں بھی زیادہ دن نہیں رہے گا۔

• "بمبئی میں سنڈیکیٹ کو دفن کر دیا گیا" ایک عنوان ———

اور ایسا کہ پھر مردہ کفن پھاڑ کر نہ نکل سکے۔

• "کانگریس کے کرائسس کی ذمہ داری اندرا گاندھی پر ہے" مرارجی ڈیسائی کا بیان ——— کیا خوب "چھاج بولے سو بولے چھلنی بھی بولے جس میں ۷۲ سو چھید"۔

مدآباد پہنچنے پر نجلنگپا کا استقبال۔

---

• میں نے اندرا گاندھی کو وزیرِ اعظم بنوا کر سخت غلطی کی" کامراج کا بیان ——— کامراج کا بیان نہیں، شیخ چلی کی بڑ۔

• "دلی میں فلم فیسٹیول ختم" ایک خبر ——— ع

لیک بعد از خرابی بسیار

۱۔ جنسی بے راہ روی پیدا کر کے
۲۔ آوارگی کا پرچار کر کے
۳۔ شرمناک عُریاں مناظر دِکھا کر
۴۔ قومی اخلاق بگاڑ کر
۵۔ نوجوانوں کو غنڈہ ازم کی تعلیم دے کر
۶۔ شرم و حیا کا دیوالہ نکال کر

• "فسادات پر دھائش پیر جاری کیا جائے" ایک عنوان ——— تاکہ یہ اور جن سنگھ دونوں ننگے ہو سکیں۔

• مرارجی ڈیسائی جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی کے ساتھ کولیشن بنانے کے لئے راستہ ہموار کر رہے ہیں" ایک عنوان ——— راستہ ہموار ہونے سے پہلے ہی اُن کے لیفٹننٹ سی۔ بی گپتا نے جن سنگھ سے ساز باز کر لیا۔

• "ابوہر کے یگیہ شالہ میں شرارتی طلبا نے پیشاب کر دیا اور لڑکیوں کے سامنے ننگے ناچتے رہے" ایک خبر ——— چوتھے فلمی میلے کے شاندار اثرات۔

• "جن سنگھ اور کمیونسٹ دونوں جمہوریت کش۔ کانگرس درمیانہ راستہ قائم کرے گی" چوہان کی تقریر ——— یعنی بادشاہت کا، ڈکٹیٹرشپ اور جمہوریت کے درمیان کا راستہ۔

• "لوک سبھا میں گھونسے چل گئے" ایک خبر ——— پارلیمنٹ میں نئی روایت کا آغاز۔

احمد آباد اور بمبئی کے اجلاس ایک نظر میں۔

"ایشور نوجوانوں کو دیش سیوا کا جذبہ دے" راج گوپال آچاریہ
——— مگر آپ کے سائے سے محفوظ رکھے۔

"سنڈیکیٹ کانگریس نے سیاسی میدان میں ناکامی کی تمام ذمہ داری وزیر اعظم پر ڈال دی" ایک بیان ——— کالک ہے، اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔

"کیرالہ کے مختلف علاقوں میں امتحان کی فیس ختم کرانے کے لئے مظاہرے" ایک خبر ——— بڑے احمق لوگ ہیں۔ انھیں امتحان ہی ختم کرانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

"ممبر پارلیمنٹ کے گھر چوری" ایک خبر ——— لا اینڈ آرڈر کی حالت سے باخبر کرنے کے لئے۔

"مارچ میں درمیانی انتخابات کے لئے تیار ہو جاؤ" مرارجی ڈیسائی ——— اور اس میں آپ سب کے بخئے اُدھیڑے جائیں گے۔

"اندرا گاندھی نے ملک کو روس کی گود میں دھکیل دیا ہے" نجلنگپا ——— سفید جھوٹ، اور آپ کا جن سنگھ کی گود میں جانا خود آپ ہی کے بیانات سے ثابت۔

"طلبا ڈگریوں کے پیچھے نہ پڑیں" بادشاہ خاں ——— آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر۔ انھیں ہڑتالوں، مظاہروں، توڑ پھوڑ کے لئے مزید وقت مل جائے۔

"نجلنگپا کا جن سنگھ سے گٹھ جوڑ" ایک خبر ——— ع
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

"روس اور چین کے سرحدی تنازعات پر بات چیت ٹوٹ گئی" ایک خبر ——— چین کے سرپھروں کی خودسری کی بدولت۔

نجلنگپا: کی صدارت میں ایک سال کی مزید توسیع۔

---

• "میں اب کانگریس میں اتحاد کی کوشش نہیں کروں گا" نجلنگپا کا بیان ــــــ اِس لئے کہ ؎
کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو

---

• "چینی فوجوں کو روس کے ایٹمی حملے کے خلاف تیار رہنے کا حکم"
چینی اخبار کا اداریہ ــــــ یعنی چیونٹی کو ہاتھی سے ٹکرانے کے لئے تیار رہنے کا حکم ــــــ چہ پِدّی چہ پِدّی کا شوربہ!

---

• "اندرا گاندھی ڈکٹیٹر شِپ کے راستے پر چل رہی ہیں" سی۔بی گپتا ــــــ اِس لئے کہ انھوں نے کانگرس میں آپ کے سنڈیکیٹ کا خاتمہ کر دیا ہے۔

---

• "ایک بنیادی کمزوری" ایک عنوان ــــــ یہ ہے کہ ہم نے زرپرستوں کو پھولنے پھلنے دیا۔

---

• "فسادات پر قابو پانے والی پولیس فورس کا قیام" ایک خبر ــــــ سینکڑوں فسادات کے بعد ؎
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ

---

• "کم عرصے میں زیادہ تعلیم" برطانیہ میں ایک دلچسپ تجربہ ــــــ اور ہمارے دیش میں زیادہ عرصے میں کم تعلیم۔

---

• "کامراج کا نیا پلان" ــــــ زندگی سے بےزاری اور احساسِ شکست خوردگی کے باعث سیاست سے کنارہ کشی۔

---

• "کامراج کا وار" ــــــ نہایت اوچھا۔

---

• "یحییٰ خاں صدارت سے بیزار" ایک خبر ــــــ کانٹوں کا تاج جو ہوا۔

---

• ملک میں شائع ہونے والے اُردو اخبارات کی تعداد تیسرے نمبر پر ہے" شری جمنا داس جی اختر کی تقریر ——— اور خود اُردو زبان چھٹے نمبر پر۔

• ڈکیتی میں گرفتار شدہ ملزم کا کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں ہے" ایک خبر ——— اونچا آدمی ہے گھٹیا لوگوں سے "سمبندھ" نہیں رکھتا۔

• انقلاب کے ایک علمبردار کی حالتِ زار" ایک عنوان ——— اور انقلاب دشمن خوش حال اور فارغ البال۔

• اُردو کو ہندوستان میں قومی زبان کا درجہ دیا جائے گا" بمبئی میں اندرا گاندھی کا اعلان ——— اس لئے کہ یہ اُس کا پیدائشی حق ہے۔

• اندرا گاندھی پر حملے" ایک عنوان ——— بیٹی سے یہ سلوک، کمینہ پن ہے۔

• یہ ہے آل انڈیا ریڈیو" ——— جس سے نجلنگپا اینڈ کمپنی کی اندرا گاندھی کو گالیاں نشر ہوتی ہیں۔

• دس لاکھ کا جھوٹ" ——— اور سچ ایک پیسے میں کہیں نہیں ملتا۔

• سنت فتح سنگھ کا خودسوزی کا فیصلہ" ایک خبر ——— سیاست میں ناکامی کا نتیجہ۔

• کتوں کے مالکوں نے ہنگامہ برپا کر دیا" ایک خبر ——— خود کتے کرتے تو کیا کرتے۔

"سی۔ بی گپتا نے وزارت کی حمایت کے لئے ہماری شرائط منظور کرلی ہیں" جن سنگھی لیڈروں کا بیان۔

# شری جگجیون رام

خوشتر گرامی

گول چہرہ، پختہ رنگ شعور کی پختگی پر دلالت۔ بڑی بڑی جھیل سی آنکھیں، اونچی ناک جس نے ہریجنوں کو اونچا کیا۔ گداز رخسار، بھاری جسم "حصہ بقدر جثہ" ــــ یہ ہیں کانگریس کے نئے صدر ــــ

شری جگجیون رام

سراپا کھدر دھاری۔ مگر نئے نہیں، گاندھی یگ کے، جنہوں نے کھدر کی عظمت کو سمجھا اور اپنی عظمت بنائی۔ ملک اور قوم میں کبھی نہ مٹنے والا نام پیدا کیا ــــ سیاست کے پرانے کھلاڑی۔ حکومت میں سب سے پہلے بلکہ روزِ ازل سے کرسی نشین۔ ایک بار کامراج پلان میں کام نہ آگئے ہوتے تو گدی نشینی کا بے مثال ریکارڈ قائم کرتے۔ کامراج نے جھانسہ دیا اور کہا کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے ــــ مختلف وزارتوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ آج کل ہمارے ان داتا ہیں۔ رفیع احمد قدوائی کے بعد آپ دوسرے وزیرِ خوراک ہیں کہ آپ کی بدولت ملک کو کھانے پینے میں فراغت نصیب ہوئی ورنہ خود کفیل ہونے کے کھوکھلے نعرے تھے ــــ ساتھیوں نے ان کے لئے جمہوریۂ ہند کی صدارت کا ٹکٹ مانگا تھا مگر لاٹری کھلی تو کانگریس کی صدارت نکلی۔ جن کے کندھوں پر رکھ کر سنڈیکیٹ کے خلاف بندوق چھوڑی گئی وہ جگجیون رام اور فخر الدین علی احمد ہی کے کندھے ہیں ــــ متحدہ قومیت، سیکولر سماج اور مشترک کلچر کے علمبردار اور جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ صوفیوں اور بزرگوں کی درگاہوں کے بڑے عقیدت مند ہیں۔ وہاں جانے کے لئے وقت ضرور نکالتے ہیں ــــ مترنم سُروں میں مگر بڑی موثر تقریر کرتے ہیں۔ فصیح اور صاف شستہ اردو بولتے ہیں۔ اردو کے بڑے ہمدرد اور حامی ہیں۔ اب تک جن سنگھیوں اور سنڈیکیٹیوں میں گھرے تھے۔ لیکن اب کانگریس ان سے پاک ہو چکی ہے اس لئے خوشتر گرامی اردو کے لئے امید بھری نظروں سے اُن کی طرف دیکھتا ہے اور کانگریسیوں کے حق میں دعا کرتے ہوئے آپ سے کہتا ہے ؎

وہ اُن کو سبق خود شناسی خود نگری کا

# مرغولے

پروفیسر ڈاکٹر حامدی کاشمیری ایم۔اے پی ایچ۔ڈی

۲۹۲- جواہر نگر- سری نگر (کشمیر)

برادرِ محترم! آداب

ایک مختصر افسانہ "مرغولے" ارسال کر رہا ہوں، امید ہے آپ کو اور قارئین کو پسند آئے گا ـــــ سردیوں کا موسم آرہا ہے، اور آپ سے ملنے کی خواہش تیز ہو رہی ہے! . . .

آپ کا ـــــــ حامدی کاشمیری

پردیپ کی وحشی آنکھیں سیاہ گڑھوں میں بے چین تھیں۔

اُس کے چہرے کی اُلجھی ہوئی داڑھی ایک کالے غبار کی طرح پھیل رہی تھی۔

وہ آدھ گھنٹے سے باتیں کر رہا تھا، بے ترتیب باتیں، گھناونی، زہر آلود! اور میں بیٹھا وِہسکی کے گھونٹ لیتا ہوا اُس کی باتوں کو سننے میں کوئی زحمت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ وقت تو گزارنا تھا ہی۔

"انسان چوراہے پر ننگا ہو رہا ہے، اور پردہ؟ ـــــ پردہ کون کرے، کس سے کرے، یہ صدیوں کی تہذیب سب فریب ہے، سب بکواس، ایک دم فراڈ!"

اُس کے کالے بالوں سے ڈھکے ہاتھ میں چمکتا ہوا گلاس کانپ رہا تھا۔

"مجھے دیکھو، میں بیس سال سے شعر کہہ رہا ہوں، میرے پانچ مجموعے چھپ چکے ہیں، لیکن پڑھاتا فزکس ہوں، میری ریسرچ پر ہارورڈ یونیورسٹی سے ڈی۔لٹ کی ڈگری ـــــ"

میں نے اُس کی گہری متلاطم آنکھوں سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ لہروں کے تھپیڑوں سے میرا جسم دکھ رہا تھا نیم تاریک، نیم روشن سایوں میں پتھروں کے لوگ ـــ کان لگائے ہمارے گرد جمع ہو گئے تھے، وہ قریب آگئے تھے، بہت قریب۔ لوگوں کا ہجوم، خوابوں کی پُراسرار مخلوق، خاموش، نیندوں میں چلنے والی، کسی جادوگر کے اشارے کی منتظر!

باہر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

گھٹن!

میں نے دیکھا دائیں جانب تکونی شیڈ کے مدھم لیمپ کے نیچے مرمر کے ٹیبل پر ایک خوبصورت عورت بیٹھی تھی، وہ ـــــ میں نے اُسے فوراً پہچان لیا، مسز اشوک!

ـــ یہاں؟

وہ نیم باز آنکھوں سے بہت اطمینان اور سکون کے ساتھ سگریٹ کے کش لے رہی تھی، اور دھوئیں کے سنہرے مرغولے اٹھ رہے تھے، اور پہاڑوں میں گم ہو رہے تھے۔ اُس کے مقابل بیٹھا ہوا فربہ اندام آدمی سیاہ چشمہ آنکھوں پر چڑھائے، فراغ اندازکھا رہا تھا۔

پتھریلے جسم حرکت میں آگئے تھے، اُن کے پاؤں میں جان پڑ گئی تھی۔ نسوانی پاؤں کی نیلی رگیں اُبھر آئی تھیں، بدن کے خم اور قوس، ہونٹوں کے زاویے، کولھوں کی حرکت ـــــ خوابوں کی نیلی دھند میں بجلیاں کوند رہی تھیں اور کومل مدماتے جسم کالے آہنی ہاتھوں کی گرفت میں کسے جا رہے تھے، وحشیانہ ڈھول پیٹے جا رہے تھے۔

"آج سے پچیس سال پہلے میں نے پہلا عشق کیا ایک بنگالی لڑکی سے۔ میری بے وقوفی دیکھو، میں اُس سانولی لڑکی سے برابر دس سال تک پیار کرتا رہا، دس سال! اس مختصر سی زندگی میں دس سال گئے تو پھر باقی کیا رہا؟" اُس کا چہرہ تاریک تھا۔ "اُس کی سوتیلی ماں ہماری شادی کے راستے میں دیوار بن کر کھڑی رہی اور میں انتظار کرتا رہا، کڑھتا رہا، روتا رہا۔ نیلما کی حالت تو مجھ سے گئی گزری تھی، اور جب دس سال کے جان لیوا انتظار کے بعد نیلما کی سوتیلی ماں مر گئی تو ہماری شادی ہوئی۔ اِدھر

شاداں ہوئی اُدھر پیار کا بھوت سر سے اُتر گیا۔ میں ہلکا سا محسوس کرنے لگا۔ گھر نیلما کے گلے کا ہار ہوا، اور میں ہوا کی طرح آزاد، اور پھر میں برابر پرستش کرتا رہا۔ عورت تو عشق کرنے کے لئے پیدا ہوتی ہے، لیکن ــــ"

وہ میری توجہ کا مرکز بن چکی تھی۔ میرے جسم کی رگیں پھڑپھڑا رہی تھیں، اور پردیپ کی باتیں پہاڑوں کی دُھند بن کر اُڑ رہی تھیں۔

اُس مہینے مسز اشوک سے میں تیسری بار ملنے جا رہا تھا۔

پہلی بار ہم ایک اِکزیبیشن میں ملے۔ جگمگاتی رات تھی، اور جب تماشائی ایک ایک کر کے چلے گئے تو ہم پورے ہال میں تنہا رہ گئے۔ اونچے قد کی صحت مند عورت متناسب خد و خال، اور غازے کی گلابی تہیں، نیلے رنگ کی ریشمی ساڑی میں وہ بے حد دلکش معلوم ہو رہی تھی۔ میں دیر تک اُس سے ماڈرن فکشن پر گفتگو کرتا رہا۔

اُس کے وسیع مطالعے، شُستہ انگریزی اور لہجے کی کھنک سے میں سحر زدہ ہو گیا تھا۔ میں اُس کے ساتھ ٹیکسی سٹینڈ تک گیا۔

"وہ اینگلو انڈین تھی۔ اُس کی بھولی صورت میرے دل میں اُتر گئی تھی۔ وہ مجھ سے جب بھی ملتی، اُس کے ہونٹوں پر ایک اُجلی سی مُسکراہٹ دوڑ جاتی، اور جب اتوار کو وہ مجھے اپنے گھر لے گئی تو گھر کی نفاست دیکھ کر میں حیران رہ گیا! اور پھر اُس کی ممی ــــ وہ تو بیٹی کی جسمانی کشش کو بھی مات کر گئی۔ بھرا بھرا جسم، ہر عضو دہکتا ہوا شعلہ، فارن سینٹ، اور پھر ہم دونوں روزی سے چھپ کر ملنے لگے، لیکن روزی بھی ایک فتنہ ثابت ہوئی۔ وہ پاگلوں کی طرح میرا پیچھا کرتی رہی ــــ ہا ہا، ماں بیٹی کی یہ دوڑ ــــ"

ہماری دوسری ملاقات کافی ہاؤس میں ہوئی

باتیں ہوتی رہیں، اور میں اُس کے روپہلی مچھلی جیسے بازوؤں، اُس کے گُلگوتھنے سینے اور سفید دانتوں کو دیکھتا رہا۔ وہ میری دُنیا پر چھا رہی تھی۔

"میں ایک پرائیویٹ سکول میں کام کرتی ہوں" وہ اعتماد سے بول رہی تھی۔ "یہ کام مجھے پسند نہیں، لیکن گھر میں پڑے رہ کر بھی کیا کرے، گھر میں بڑی بوریت ہوتی ہے ــــ"

اور میں سوچ رہا تھا اِس چلتی پھرتی قیامت کو کہیں قید تو رہنا ہی چاہیے۔

اُس رات میرے اصرار پر اُس نے میرے ساتھ انگریزی فلم بھی دیکھی اور ہال کی تاریکی میں ہم ایک دوسرے کی دھڑکنیں سُنتے رہے۔ رقص ختم ہو چکا تھا۔ عورتوں کے مدماتے جسم ہم رقصوں کے قُرب میں سکون پا رہے تھے۔

اور پھر ماڈرن کالونی میں رات کے گھُپ اندھیرے میں رخصت ہوتے ہوتے اُس نے کہا وہ اتوار کو پھر ملے گی۔

لیکن وہ دوسرے ہی دن ڈیلی ایکسپریس کے دفتر کے باہر ملی تھی۔ دو روز کے لئے اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا، آنکھیں ویران تھیں اور بال بکھرے ہوئے تھے ہوئے۔ وہ ایک پُرانی ساڑی میں ملبوس تھی۔

"کیا بات ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں لیکن شِشا بیمار ہے ــــ" اُس کی آواز میں

"وہ دو دن سے بخار میں پھنک رہی ہے۔ میں کل سے سکول بھی نہ جا سکی"

"ڈاکٹر کو بُلایا؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

"پیسے نہیں تھے" اُس کی آنکھیں جھک گئیں اور میں نے بلا تامل دس دس کے نوٹ اُس کے ہاتھ میں تھما دئے۔

اتوار تک انتظار کرنا میرے بس میں نہ تھا۔

میں اتوار سے پہلے ہی اُس سے ملنے جا رہا تھا ــــ

وہ نہایت اطمینان اور وقار کے ساتھ سگریٹ کے کش لے رہی تھی۔

ٹیبلوں پر ہونٹ ہل رہے تھے، سرگوشیوں کے سائے بکھر رہے تھے۔

میں نے دل پر قابو پا لیا، اور دروازے کی کُنڈی ہلائی۔

دروازہ کُھل گیا، اور وہ میرے سامنے تھی۔

"آپ؟"

"جی"

"اندر آ جائیے"

میں دروازے کے اندر آیا، اور اُس نے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی

اُس کے چہرے پر فوری حیرانی کا تاثر اُبھر کے غائب ہو چکا تھا اور کسی جذباتی اُچھل کے بغیر وہ دھیمی سی مُسکراہٹ کے ساتھ اندر کے کمرے میں چلی گئی

اُس کے کھلے سیاہ بال شانوں کو ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ معمولی سی [illegible] ساڑی میں ملبوس تھی۔ بلاؤز پُرانا اور پھٹا ہوا تھا۔ کمرے کے اندر داخل ہو کر اُس نے صوفے پر بٹھایا۔ یہ پُرانی وضع کا بوسیدہ سا صوفہ تھا۔ صوفے کے علاوہ کمرے اور کوئی فرنیچر نہ تھا۔ سامنے تپائی تھی جس پر [illegible] الماری میں چند کتابیں تھیں اور پاس ہی [illegible] کا سفید پلاستر کئی جگہ سے اُکھڑ گیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر نکلی۔

"معاف کیجیے، اندر کام تھا۔ اب تھوڑا سا رہ گیا ہے۔ ابھی آتی ہوں —"

وہ پھر اندر کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔

تھوڑی دیر تک اندر سے کوئی باہر نہ آیا۔

تین کمروں پر مشتمل یہ چھوٹا سا فلیٹ، یہ چھوٹے سے کمرے ——

تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر آئی۔

اُس نے ساڑی بدل لی تھی، مُنہ ہاتھ دھو لیا تھا اور بال دو لہراتی چوٹیوں میں گوندھ لیے تھے۔

اُس کے چہرے پر دلکشی آگئی تھی۔

وہ آئی، اور میرے سامنے صوفہ پر بیٹھی۔ کمرہ خوشبو سے بھر گیا۔

"انسان اور حیوان میں فرق ہی کون سا ہے؟ یہ دو ٹانگوں پر چلتا پھرتا جانور —— ہر لمحے مرنے مارنے پر آمادہ، چھینا جھپٹی اس کی فطرت، حسد، نفرت —— میں کہتا ہوں یہ اپنے اصلی رنگ میں آ رہا ہے۔ اس کی فطرت صدیوں سے تہذیب کے بوجھ تلے دب چکی تھی ——" پردیپ نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔

وہ سگریٹ پی رہی تھی، اور میرا وجود دسرمئی مرغولوں میں تحلیل ہو رہا تھا۔

"مسٹر اشوک پانچ سال تک بیکار رہے، اب اُنھیں بمبئی میں ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت مل چکی ہے۔ وہ سال میں دو تین بار چلے آتے ہیں، اور میں گڈی اور ششما یہاں اکیلے پڑے رہتے ہیں، خیر —— دونوں کو میں اندر ابھی ابھی بستر پر لٹا کے آئی ہوں"

"ششما کیسی ہے اب؟"

"ٹھیک ہے، شکریہ، سکول جا رہی ہے" وہ رُک کر پھر بولی: "وہ مشکل ہی سے وہاں اپنا گزارہ چلاتے ہیں، اور میں یہاں سکول میں کام کرتی ہوں، لیکن دو بچوں کی پڑھائی، مکان کا کرایہ، چیزوں کی مہنگائی، کپڑے لتّے —— زندگی مصیبت ہو گئی ہے۔ سانس لینا مشکل ہے، لیکن یہ وہ زمانہ نہیں کہ انسان دوسروں سے اپنی مصیبتوں کا رونا روئے۔ اپنی عزت کسے پیاری نہیں؟ ہر آدمی آج کل ظاہر کو دیکھتا ہے، ظاہری رنگ روپ کو ——"

رات کافی بیت چلی تھی۔

پتھر کی مورتیاں پھر اپنی اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی تھیں۔ ساکت و جامد!

اور جادوگر غائب ہو چکا تھا۔

پردیپ کے لہجے سے زہر ٹپک رہا تھا۔

"میں نے اپنے سبجیکٹ میں ڈی۔ لٹ کی ڈگری لی اور تمام عمر آرٹ اور شاعری کی خدمت کرتے گزاری۔ میں پچھلے تیس سال سے شعر کہہ رہا ہوں لیکن میرا نام کون لے رہا ہے، میری پروموشن کا کسے خیال آیا؟ یونیورسٹی سیاست کا اکھاڑہ بن چکی ہے، اور سیاست سے مجھے الرجی ہوتی ہے۔ اب ریٹائرڈ ہونے میں دو سال رہ گئے ہیں، اور پھر —— ایک دن میری ارتھی اُٹھے گی اور میرا جسم آگ کے شعلوں میں بھسم ہو جائے گا، اور پھر ماتمی جلسے ہوں گے، لوگ میری تعریفوں کے پُل باندھیں گے۔ کیا کیا نہ ہوگا ——؟" اُس کا لہجہ مدھم ہو رہا تھا۔

میں بہت بور ہونے لگا تھا، لیکن گھر کا خیال آتے ہی میری بے چینی بڑھ گئی۔ میں نے ضبط سے کام لیا اور پھر پردیپ کی طرف متوجہ ہوا، لیکن —— لیکن اُس کی خالی خولی باتوں میں کیا رکھا ہے؟ ایڈیٹ! —— اور مسز اشوک؟ میں صرف اُس کے لئے بیٹھا تھا، اور وہ بھی میرے لئے —— اُس نے مصلحتاً میری طرف توجہ نہیں کی۔ ایک —— بار بھی میری طرف نہ دیکھا، جیسے میں وہاں تھا ہی نہیں۔

وہ یہاں کیوں آگئی تھی؟

اور اُس کے ساتھ ——؟ اُس کا خاوند؟ —— نہیں تو —— میں سب کچھ جاننا چاہتا تھا، لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔

معاً فربہ اندام آدمی نے بل ادا کیا، اور اپنے سونے کے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اُٹھا۔

مسز اشوک بھی اُٹھی۔

ہال میں گہری خاموشی تھی، وِہسکی کی خوشبو، سائے، سرگوشیاں، چھچوں کی ٹن ٹن، شرمائی شرمائی مسکراہٹیں، اور میں غیر اختیاری طور پر اُن کے پیچھے پیچھے چلا۔

ہم سبھی ہوٹل سے باہر آگئے تھے۔

باہر ایک اور ہی عالم تھا۔

دن کی ڈھلتی روشنی، شور، بھاگم بھاگ، ہنگامہ، بھیڑ ——

میری آنکھیں چُندھیا گئیں۔

میں مسز اشوک سے ملنے کے لئے آگے بڑھا۔

وہ دونوں فٹ پاتھ سے نیچے اُترے۔

میں دَوڑ کر اُس کا ہاتھ پکڑنا چاہتا تھا۔ آج ایک مہینے کے بعد میں نے اُسے دیکھا تھا۔ وہ اِتنے دنوں کہاں رہی؟ دو بار میں اُس کے فلیٹ پر گیا۔ لیکن وہاں دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ میں بے چینی سے پاگل ہوا جا رہا تھا، اور جب تنہائی میں، میں اُسے اپنا حال سُناؤں گا، وہ —— وہ میرے پاگل پن کا مذاق اُڑائے گی۔

فٹ پاتھ سے اُترتے ہی فربہ اندام آدمی کار میں بیٹھا، اور دوسرے

اس نے کار کا دروازہ کھولا اور وہ ـــــ وہ جھٹ سے کار کے اندر چلی گئی۔

کار سٹارٹ ہو چکی تھی اور میں پُرشور بھیڑ میں بے بسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا ۔۔۔ جاتے گیا؟

پردیپ نے ایک اور گلاس خالی کیا۔ اس کے جسم کا نشہ بڑھ چکا تھا۔

اس کی آنکھیں پتھر بن چکی تھیں۔ دائیں جانب جمیل ابھی تک خالی تھا اور میں وہسکی کی آگ رگوں میں اُتار رہا تھا۔

دھوئیں کے مرغولے پہاڑوں کے غاروں میں غائب ہو رہے تھے !!

---

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کیلئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ بھیجیے ورنہ گم شدہ مضامین کی نقل اپنے پاس رکھیے۔ ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر بیسویں صدی)

---

## غزل

شباب للت ایم۔ اے

...پ جو کچھ ہیں، ہمیں معلوم ہے

...پ کی تو شہر بھر میں دھوم ہے

حُسن ہے بے داغ بیشک آپ کا

عشق میرا بھی بہت معصوم ہے

...ل ہمارے حال سے بے خبر

...اِک اِک کا جسے معلوم ہے

میرے آنسو بھی غزل کے شعر ہیں

اِن میں دِل کی داستاں منظوم ہے

...ق خود چھل بل سکھاتا ہے اِسے

...ن ورنہ فطرتاً معصوم ہے

کس لئے رہتا ہوں مَیں ہر دم اُداس

آپ کو اِس کا سبب معلوم ہے!

کاشش اُن کا دل بھی ایسا ہو شباب

اُن کی صورت تو بڑی معصوم ہے

## غزل

پروفیسر سراج الحسن سراج ادیب ایم۔ اے

سینے میں وہ سوزِ غمِ نہاں ہے
ہر سانس مری شرر فشاں ہے

لب پر مرے محشرِ فغاں ہے
ناکامیِ عشق کا بیاں ہے

کو پوچھئے تو مری خموشی
میرے غمِ دل کی ترجماں ہے

ملتے ہیں وہ اب بھی ہم سے لیکن
اگلا سا تپاک اب کہاں ہے

بے مہریِ دہر کا ہے شکوہ
رُودادِ جفائے آسماں ہے

اُس محفلِ ناز میں ہمارا
ہمدم ہے کوئی نہ ہم زباں ہے

ہوں کب سے خرابِ شوقِ منزل
منزل کا پتہ نہیں کہاں ہے

یارانِ سفر بچھڑ چکے ہیں
اوجھل نظروں سے کارواں ہے

کیا بات ہوئی سراج آخر
کیوں ہم سے زمانہ بدگماں ہے

افسانہ

# مجھے چاہو

عظیم اقبال ایم۔ اے

گنج ملا، بتیا (بہار)

میرے محترم! آداب و نیاز

. . . تخلیقی کاموں کے لئے ذہنی سکون کی ضرورت ہوتی ہے اور آج کل تو دو لمحہ کے لئے بھی ذہنی سکون ناپید ہے میرے لئے۔ کسی نہ کسی طور سے یہ کہانی مکمل کر پایا ہوں۔ لیجئے پڑھئے اور کھو جایئے۔ یہ ہے "مجھے چاہو" ـــــ Self Recognition میرا موضوع ہے۔ جمالیاتی حس کے پیچھے یہی جذبہ ہمیشہ کارفرما رہا ہے۔ زندگی کی قدریں بدل سکتی ہیں، انسان کا معیار بدل سکتا ہے، لیکن اس کے اس رجحان میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی ـــــ رنگوں کے Juxta Position میں ایک جگہ فیض سے میں نے استفادہ کیا ہے . . .

نیاز کیش ـــــ عظیم اقبال

پیلے، سُرخ، سبز اور سپید سفید بھی ـــــ اتنے سارے قمقموں کی چکاچوند کے باوجود اسے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے ساری روشنیاں ہر سُو تاریکی ہی تاریکی ہو، مُہیب اندھیرے ہوں۔ یہ بکھرے بکھرے اُجالے تاریک گوشوں کو کوئی ہلکی سی کرن بھی نہیں بخش رہے تھے۔

بکھری ہوئی تمام شاہراہیں روشن تھیں ـــــ نیون لائٹس، ٹیوب نظریں ہیڈ لائٹس کے جھپاکے ایسی ہی تیزی سے آتے اور گزر جاتے جیسے تاروں کی محفل سے کوئی تارا ٹوٹے۔ کُرۂ ارض کی کشش میں آئے اور ئے! اچھلی ہوئی روشنی کے ان رنگوں میں زندگی اور کائنات کے مل تھے ـــــ راحتِ دیدار کا رنگ، ساعتِ بیزار کا رنگ، زرد پتوں بلک، سُرخ پھولوں کا، دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ، زہر کا رنگ ـــــ، لہو رکا رنگ!!

منیوں کے یہ نقطے، یہ ٹمٹماتے ستارے، یہ درخشاں، یہ منور نظارے چلے گئے تھے ـــــ تاریکیاں تو صرف اس کے اندر رینگ رہی تھیں۔ میں کوئی چھو سکے، محسوس بھی کر سکے ـــــ کبھی کبھی تو اس کے اندر تاریکی تھیں۔ ایسے ہی جیسے سمندر میں پانی کی موجیں اٹھتی ہیں۔ ساحل سے ٹکراتی ہیں اور پاش پاش ہو کر اپنا وجود کھو دیتی ہیں۔ وہ سامنے کوئی موج اٹھی۔ اِدھر درد کی کوئی لہر پھیل گئی۔ اُس سمت کوئی چھناکا ہوا، اِدھر ٹیس نے انگڑائی لی . . .

انھیں شاہراہوں پر، انھیں کوچوں میں، انھیں گلیوں میں اُس نے زندگی کی کتنی ڈوبتی، اُبھرتی پرچھائیاں دیکھی تھیں ـــــ نازک اندام سے، کسے کسے، جیلے، لچکیلے پیکر، آنچلوں کی دھنک، سرسراتے، لہکتے جسموں سے اٹھتی ہوئی شمیم مُشک و عنبر، چوڑیوں کی مدھم، دلنواز کھنک، اُبلتے ہوئے ولولے قہقہے۔ گلابی ہونٹوں کی شگفتگی، تازگی، سُرخ و سپید رخساروں کی جگ مگ چمک، متلاطم ساگر جیسی آنکھوں کی گہرائی، گیرائی، اُڑتی ہوئی زلفوں کی سانولی سلونی گھٹائیں، ذہن پر چھا جانے والی سانسوں کی عطر بیز خوشبو، دل میں اُتر جانے والی مورتیں، ادائیں، دھڑکنیں تیز تر کر دینے والی، دبی دبی سی مسکراہٹیں۔

شاخ در شاخ پھیلی ہوئی اِن شاہراہوں کا راجیش کی زندگی سے بہت گہرا رشتہ تھا۔ یہاں، وہاں اُس کے قدم بڑھتے جاتے۔ وہ بھٹکتا پھرتا، چاہتا اِدھر کھو جائے، اُدھر گم ہو جائے ـــــ کبھی کاک ٹیل کے سُرور میں، کبھی حُسن کے قرب میں، کبھی لینا کے بازوؤں میں، کبھی ریکھا کی باہوں میں، کبھی شاذی کی زلفِ گرہ گیر میں . . .

روزری کلب کی مہکتی فضاؤں میں، سن اینڈ شیلڈ کی سرسبز و شاداب روشوں پر گھٹن اس کے کاندھوں سے لگی ہوئی ہنستی مسکراتی۔ مدھم تاریکی میں وہ صرف دو سایوں کی طرح نظر آتے۔

"مائی ڈارلنگ! مائی سویٹ ہارٹ!!"

"اوں۔۔۔ ہوں۔۔۔!" محبوبانہ ادا سے وہ ہونٹوں کو سکوڑ لیتی۔

"تمہاری بانہیں میری جنت ہیں! تمہارے قرب میں کتنا سکون ہے — جی چاہتا ہے یونہی تھرکتے رہیں، ہنستے رہیں، یونہی جیتے رہیں، یونہی مرتے رہیں"

"صرف جئیں۔۔۔ جئیں ڈیر! صرف جینے کی تمنا کریں۔ مرنے کا ارادہ کیوں؟۔۔۔ مائی برائٹ ایکس پی۔۔۔ کین یو کن لیپس!"

۔۔۔ کوئی منطق ہو یا نہ ہو۔ بس یونہی اکثر اسے لینا کے نرم گداز جسم اور اپنی امپالا کی آخری پناہوں میں بہت مناسبت، بڑی مطابقت نظر آتی — شہر کے اس گوشے سے اس گوشے تک لینا اور امپالا دونوں کا ساتھ رہتا — یہ عجائب گھر ہے، وہ چڑیا گھر، یہ نہرو پارک، وہ گاندھی میموریل، یہ کرکیٹ اسٹیڈیم ہے۔

"ناگرہ نے اپنی پہلی سنچری یہیں بنائی تھی — سوبرس کو انجو مہندرو نے یہیں دل دیا تھا — اے پور فیلو!"

وہ آرٹ گیلری ہے۔

"آج ایم۔ ایف حسین کی تصویروں کی نمائش ہو رہی ہے"

یہ نرتیہ کلا مندر ہے۔

"شب میں اندرانی رحمٰن پرفورمینس دے رہی ہیں"

یہاں سے یونیورسٹی کیمپس شروع ہوتا ہے۔

"تم نے ٹیگور کو پڑھا ہے؟ — ٹالسٹائی کو، شیکسپیر کو، شوپن ہاور کو، حافظ کو، عمر خیام کو۔۔۔؟"

اس میدان کے بعد اس موڑ پر اسمبلی ہاؤس ہے۔ وہ ایروڈرم ہے۔ وہ ملٹری کینٹ۔

"تیسری عالمگیر جنگ اگر چھڑ جائے تو انسانیت کہاں پناہ لے گی —؟"

وہاں۔۔۔ ڈھلتا ہوا سورج انھیں پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہوتا ہے اور وہ سامنے جو درختوں کا لامتناہی سلسلہ ہے، وہیں سے ہر صبح طلوع ہوتا ہے۔

"تم نے ڈوبتے ہوئے سورج کا عکس سطحِ آب پر کبھی دیکھا ہے —؟

وھاٹ اے فائن پیس آف نیچرل آرٹ! حسین کا فن بھی کم تر ہے —"

۔۔۔ سحر کی، شام کی، مجوسی کلیوں کی، کھلتے گلابوں کی خوشبو سے کہیں زیادہ شاذی کی زلفیں مہکتی تھیں۔ یہ جوہی کی خوشبو تھی نہ چنبیلی کی، نہ بیلے کی نہ چمپاکی۔ یہ رات کی رانی تھی، نہ حنا، نہ موتیا، نہ ہار سنگھار، نہ شمامہ تھی نہ گل نہ نرگس — شاید یہ خمار کی خوشبو تھی یا شباب کی!! جب شاذی کی زلفیں اس کے شانوں پر بکھر جاتیں تو اپنے اندر اسے بے حد خنکی کا احساس ہوتا۔ جیسے نینی تال کی پہاڑیوں پر رکی کے گالوں کی مانند بادلوں کے درمیان وہ گھر گیا ہو، بادل کے کھلنڈرے ٹکڑوں کو مٹھی میں بھر لینے کی کوشش میں ہو اور ننھے ننھے قطرے ٹپک کر اُسے سرشار کر رہے ہوں!!

اکثر اُسے محسوس ہوتا جیسے ریکھا کی خوبصورت گردن فردوسِ نظر ہو۔ ریکھا کی بند پلکیں، اُلجھی اُلجھی سانسیں، خوبصورت ہاتھ، کسمساتی انگلیاں، اُس کی پناہیں جو کسی انجانی مضراب کے لمس سے اس کے دل کے تار جھنجھنا اُٹھتے — کس کی تلاش تھی اسے۔ کس منزل کی، کس مقام کی، کس رہ گزر کی؟؟ اس کے اندر ایک ہلچل مچی ہوتی، ایک ہیجان ہوتا — گرم گرم سیال سی شے حلق سے اُتر کر اس کی رگوں میں پھیل جاتی — کچھ سنی، کچھ ان سنی آوازوں کی بازگشت اس کا پیچھا کرتی — یہ کافکا کی آواز تھی، نہ بیتھوون کی، نہ بیٹلس کی — یہ شاید اس کی اپنی ہی آواز تھی — "مجھے چاہو۔۔۔ مجھے چاہو!!"

## غزل

نافع [illegible] ایم اے۔ بی ایڈ۔ ایل ایل۔ بی

رم کیجئے یا ستم کیجئے محبت کی عظمت نہ کم کیجئے

لاروں کی گلیاں بھی کچھ کم نہیں کہاں تک طوافِ حرم کیجئے

یہاں قیس و فرہاد کا ذکر ہو ہماری حکایت رقم کیجئے

یں کب تک یونہی تارے گنتا رہوں بہت ہو چکا اب کرم کیجئے

نضا سے برسنے لگے گی شراب ذرا اپنے ابرو تو خم کیجئے

کبھی اپنے نافع پہ بھی اک نظر

کبھی خاک کو جامِ جم کیجئے

## غزل

نعیم محمد صبا ایم اے۔ بی۔ ایڈ

عشق ناکام نہیں حُسن بھی بد نام نہیں

اِن دِنوں پہلی سی وہ گردشِ ایام نہیں

آپ کے بعد ہوا حال یہ دیوانوں کا

کوئی تکلیف نہیں اب کوئی آرام نہیں

دردِ دل بڑھتا گیا بڑھتا گیا آخر کار

درد ہی درد ہے اب دل کا کہیں نام نہیں

آپ پر بھی تو محبت میں کچھ الزام آئے

میں اکیلا ہی فقط موردِ الزام نہیں

عام دُنیا میں صبا یوں تو بہت باتیں ہیں

رسمِ انصاف مگر آج یہاں عام نہیں

## غزل

حباب ہاشمی ایم اے۔ بی۔ ایڈ

دِل کو تسکیں بہت دی شبِ غم مگر آنسوؤں کے دیئے جھلملاتے رہے

ہم نے اُن کو بھلانے کی کوشش تو کی وہ مگر دمبدم یاد آتے رہے

رات چلتی رہی غم کی پُروائیاں، درد لیتا تھا رہ رہ کے انگڑائیاں

سُنتے سُنتے سِتاروں کو نیند آگئی اپنی رُودادِ غم ہم سناتے رہے

اُف! تخیل کی وہ کارفرمائیاں، اُف! تصور کی وہ بزم آرائیاں!

یوں تو ملنے پہ تھیں لاکھ پابندیاں، وہ بھی آتے رہے ہم بھی جاتے رہے

ہم پہ پل بھر نہ طاری ہوئی بے حِسی، دِل پہ چھایا نہ احساسِ درماندگی

راہ میں تھک کے جب سو گیا کارواں منزلوں کے نشاں جگمگاتے رہے

اے حباب اپنی زندہ دلی ہے وہی، گو کہ راس آئی ہم کو نہ یہ زندگی

مرحلے سخت تھے راہ میں پھر بھی ہم گنگناتے رہے، گیت گاتے رہے

چھبیلی
ساڑیاں
چھبیلی
ساڑیاں
البیلی
ساڑیاں
مَردوں کو متوجّہ کرنے کیلئے
کئی قِسم کی ساڑیوں کی
ضرورت ہوتی ہے
اپنی پسند سے انتخاب کیجئے
بامبے ڈائینگ کے عظیم الشان ساڑیوں کے ذخیرے کی رنگارنگ اور نت نئے
ڈیزائن والی ساڑیوں سے اپنے محبوب کو اپنی طرف متوجہ کیجئے۔
آپ کی اپنے اسٹائیل کی ساڑیوں سے میل کھانے کے لئے
رنگ برنگی چولیوں کے ڈوبیا کے ۶۰ دلنواز اور
دلفریب شیڈس 'ٹیری ین'/کاٹن کے ۴۰ شیڈس
اور پیچی کوٹ کے لئے پاپلن اور
ساٹین کے ۱۲۰ شیڈس موجود ہیں۔
بامبے ڈائینگ
SD-61

# کھوئی ہوئی منزل

ابراہیم شفیق بی۔ ایس۔ سی

مکان نمبر ۱-۵-۵۲۱ -بنگلہ بسی حیدر آباد نمبر ۴۴ (اے۔پی)

حضرت خوشتر گرامی صاحب قبلہ! آداب و نیاز

اپنے افسانہ "خواب نو میرے ہیں" کے بعد سے بزم "بیسویں صدی" سے غیر حاضر ہوں۔ اس عرصہ میں کہانیاں تو بہت سی لکھیں لیکن پرانے تقاضوں کی تکمیل کرتا رہا۔ "بیسویں صدی" تو میرا اپنا پرچہ ہے یہی خیال وجہ تاخیر ہوا —— آپ تو اِن دنوں سالنامے کی دُلہن کو سنوارنے میں بے حد مصروف ہوں گے۔ گرامی نامہ عرصہ سے نہیں ملا۔ لیجئے دُلہن کی مانگ کے لئے میں بھی افشاں بھیج رہا ہوں —— "کھوئی ہوئی منزل" میری معرکتہ الآرا کہانی ہے۔ اِس کہانی کے ذریعے آج کے لکھنے والوں کو جدید ترین موضوع دے رہا ہوں —— سائنس اور ٹکنالوجی کی تیز رفتار ترقی کی بدولت انسان فضائے بسیط پر کمندیں پھینک رہا ہے۔ آج اُس نے چاند کو تسخیر کرلیا ہے۔ کل اِس کی رسائی نظامِ شمسی کے دوسرے سیاروں تک ہو جائے گی —— لیکن آج کا انسان سمجھتا ہے کہ سائنس کی اِن عظیم منزلوں کے آگے روایات کے پرانے راستے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہی بات اُسے دن پر دن روایات شکنی پر مجبور کر رہی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے آج وہ ذہنی افراتفری میں مبتلا ہو کر سکون کی تلاش میں لذت پرستی کا شکار بن گیا ہے۔ مادی ترقی کی دھن میں وہ اپنے رُوحانی وجود سے ہٹ چکا ہے اور ذاتی لذت و سکون کے نت نئے انداز اختیار کر رہا ہے —— لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ پھر اپنے رُوحانی وجود کی طرف لوٹے گا —— اور —— آج نہیں تو کل اُسے اپنی کھوئی ہوئی منزل مِلے گی —— دیکھئے اِتنی رُومانی کہانی میں اِن ساری باتوں کی طرف میں نے کیسے ہلکے اشارے کئے ہیں۔ آپ کی گراں قدر رائے کے علاوہ اپنے پڑھنے والوں کی رائے کا بھی منتظر رہوں گا۔

آپ کا —— ابراہیم شفیق

رات کے دس بجے میں اپنی ڈیوٹی ختم کرکے ہسپتال سے لوٹ رہی ہوں۔

کار میں میرے ساتھ مس نوشین بھی بیٹھی ہیں جو یہاں کی سینئر ڈاکٹر ہیں۔

میں کچھ گھبرائی ہوئی اور پریشان سی ہوں۔ ابھی تک میرے کانوں میں مریضوں کی دردانگیز چیخیں گونج رہی ہیں۔ موت اور زندگی کے درمیان جھولتے ہوئے مریضوں کے بیمار چہرے جیسے میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ہر مریض کی زبان الگ تھی لیکن درد کی زبان تو ایک ہی ہے۔ صدیوں سے انسان درد کی زبان سمجھنے کی کوشش کرتا آیا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ پوری طرح اُسے سمجھ نہیں پاتا۔ لوگ مجھے ڈاکٹر سمجھتے ہیں لیکن میں اپنی نظروں میں مریض ہوں۔ میرے درد سے کوئی واقف نہیں!

میری بغل میں بیٹھی ہوئی مس نوشین جو روز مجھے ملتی ہیں میرے اندر چھپے ہوئے درد سے واقف نہیں! اور واقف ہو کر بھی وہ کیا کرسکتی ہیں۔ میرے پرس میں رکھی ہوئی میری میڈیکل رپورٹ کا خیال مجھ میں درد کی ویسی ہی ٹیس پیدا کر رہا ہے جو میں نے اِن مریضوں کے چہروں پر پڑھی ہے۔ اُن کی آنکھوں میں دیکھی ہے اور اُن کی کراہوں میں سُنی ہے —— اسٹیرنگ گھماتے ہوئے میں سوچ رہی تھی۔

"خدا اِن مریضوں کی دُعائیں کیوں نہیں سُنتا؟" میں نے اپنے آپ سے مخاطب

ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا مریض دعا سے اچھے ہوتے ہیں؟ معلوم ہوتا ہے تم بہت گھبرا گئی ہو مہوش! تم ابھی نئی نئی ہو۔ آگے چل کر عادی ہو جاؤ گی۔" مس نوشیں نے میری بات کا جواب دیا۔

اُن کے لہجے میں سنجیدگی، پختگی اور تجربہ کی جھلک تھی۔ اپنی آٹھ سال کی سروس میں اُنھوں نے سینکڑوں مریض دیکھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مریضوں کی چیخ پکار پر زیادہ توجہ نہ دیتی تھیں۔ اُن کے کانوں پر ان آوازوں کا جیسے کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اُن کے چہرے پر اضطراب اور تردد کی کوئی شکن نہ اُبھرتی تھی۔ مس نوشیں بہری اور گونگی بنی اپنا کام اطمینان سے انجام دیتی رہتیں۔

میں نے مس نوشیں کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں انھیں جواب دے کر اپنی بات کی مزید تردید سُننا نہیں چاہتی تھی۔ یہ میری اپنی سوچ تھی۔ اپنی آواز تھی . . .

مس نوشیں تیس برس کی خوبصورت خاتون تھیں اور اپنے میک اپ اور بھرے بھرے خوبصورت جسم کی وجہ سے بے حد پُرکشش معلوم ہوتی تھیں۔

میرے جذبات کی طرح سُنسان سڑک پر ایک میری ہی کار دیوانے کی طرح بھاگ رہی تھی۔ سڑکوں پر دو رویہ کھڑے ہوئے بجلی کے کھمبے جیسے کسی سوچ میں گُم تھے۔

وائی۔ایم۔سی چوراہے پر مس نوشیں کو اُن کے مکان پر چھوڑ کر میں اب بہت دُور نکل چکی تھی ——— اور ——— اب مجھے اپنے مکان کے پھاٹک پر جلنے والا سُرخ بلب صاف دکھائی دے رہا تھا۔

خوبصورت مکان کا پُر فضا ماحول، آنگن سے آتی ہوئی رات کی رانی کی لپٹیں، ریشمی پردوں کی سرسراہٹ، تنہائیاں، بیڈ روم کی ہلکی سبز روشنی اور نرم بستر کا گُداز کسی نے بھی میرے جذبات کے تلاطم کو ٹھنڈک نہ بخشی تھی۔

بستر پر لیٹی تو میں نے سوچا، کبھی میں بھی کسی دواخانے کے بیڈ پر مریضوں کی طرح لیٹوں گی۔ بیماری اور موت کے بے رحم پنجے میری طرف بھی بڑھیں گے۔ کہیں دُور ——— میں نے اپنی چیخ دواخانے کے کسی ہال میں گونجتی ہوئی سُنی ——— میں کانپ اُٹھی۔

نہیں نہیں ——— مجھے زندگی چاہیئے! . . . زندگی چاہیئے!!

اُلجھن کے اِس عالم میں ایک پرچھائیں اُبھر اُبھر کر جیسے مجھے سکون بخش رہی تھی۔ ایک نام کہیں گونج گونج کر مجھے سُرور بخش رہا تھا۔ وہ ایک نام ——— جو میری زندگی تھا۔ میرے اندھیروں کا اُجالا تھا۔

"سُہیل"۔ کتنا سکون ہے اِس نام میں! اِس ایک ہستی نے مجھے ایسے لمحوں کی جلن میں ٹھنڈک بخشی تھی۔ انٹر میڈیٹ کے بعد ہم بچھڑ گئے۔ میں نے میڈیکل میں داخلہ لے لیا اور وہ شہر چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے بعد زندگی کے ہنگاموں میں سُہیل نہ جانے کہاں گُم ہو گیا ——— میں نے اُسے کہاں کہاں نہ ڈھونڈا۔ کتنی محفلوں اور کتنی تنہائیوں میں تلاش کیا۔ لیکن مجھے سُہیل نہ ملا۔ شفق کے رنگوں، شب کی خوشبو، صبح کے اُجالے اور سنگیسر کی بانہوں نے ہمیشہ مجھے اُس کا ادھورا پتہ بتایا۔ وہ ہر طرف تھا لیکن کسی جگہ نہیں ———!

---

دوسرے دن، رات کو مس نوشیں نو بجے میرے وارڈ میں آگئیں۔

اُس دن میری نائٹ ڈیوٹی تھی۔ لیکن مس نوشیں نے میری جگہ پر ایک دوسری لیڈی ڈاکٹر کو متعین کر دیا اور مجھے ساتھ لے کر پورٹیکو میں آگئیں۔

"تفریح سے موڈ بدلتا ہے۔ چلو آج تمھیں کچھ تفریح کراؤں!" یہ کہہ کر مس نوشیں نے خود اسٹیرنگ سنبھال لیا اور میں اُن کی بغل میں چپکے سے بیٹھ گئی۔

ہماری کار شہر کی مصروف شاہراہوں پر چلی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم الگزینڈر روڈ پر تھے جہاں ٹریفک بہت کم ہوتی ہے۔ اُنھوں نے کار کو "لیڈو" کے سامنے روکا۔ شاید وہ کوئی ہوٹل تھا۔ کچھ سیڑھیاں چڑھ کر جب ہم ہوٹل کے روف گارڈن پر پہنچے تو وہاں ایک گوشے میں الیکٹرک گٹار، کم سیپٹمبر کی مشہور دُھن بجا رہا تھا۔ روف گارڈن پر چاروں طرف رنگ برنگی روشنیوں کے چھوٹے چھوٹے بلب روشن تھے اور اِدھر اُدھر صوفوں کی قطاریں تھیں جہاں نوجوان جوڑے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے یا پیگ پر پیگ اُڑا رہے تھے۔ اِس ماحول سے مجھے گھٹن سی ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ بھی کوئی تفریح کی جگہ ہے؟ اتنے میں روف گارڈن کے فلور پر ایک نوجوان جوڑا گٹار کی دُھن پر رقص کرنے لگا۔ دُھنیں بدلتی گئیں اور رقص کے انداز بھی بدلتے گئے۔ کچھ ہی دیر میں فلور پر دو تین جوڑے اور رقص کرنے لگے۔ اِدھر جام ٹکرا رہے تھے اور اُدھر جسم۔ اِس ماحول اور منظر سے وہاں بیٹھے ہوئے لوگ بھی سُرور حاصل کر رہے تھے۔ سُرور کا وہ عجیب انداز تھا۔ جذبات میں ہیجان کا نرالا ڈھنگ تھا۔ میں ایک لمحہ میں اِس سارے ماحول سے بے تعلق سی ہو گئی۔ اتنے میں ابھی ابھی آتے ہوئے ایک نوجوان لڑکے نے مس نوشیں سے رقص کی درخواست کی۔ وہ پہلے مُسکرائیں اور پھر فوراً اُٹھ کر اُس کا ہاتھ تھامے ہوئے فلور پر بے تکلّفی سے چلی گئیں۔ موسیقی کی تیز دُھنوں میں مس نوشیں کے جسم کا ایک ایک عضو متحرک رہا تھا۔ میری آنکھوں کے

یقین نہ آرہا تھا کہ فلور پر اتنا ہیجان انگیز رقص کرنے والی مس نوشیں ہی ہیں جو بظاہر سنجیدہ اور خشک نظر آتی ہیں۔ میں بے چین ہوکر پہلو بدلنے لگی۔ انھوں نے دور سے دیکھ کر میری بیزاری کو تاڑ لیا اور رقص چھوڑ کر میرے قریب آئیں۔

"چلیے اب رات زیادہ ہو رہی ہے!" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ چلیں گے۔ آؤ تمھیں اپنے دوست سے ملاؤں" یہ کہہ کر وہ اپنے ساتھ رقص کرنے والے لڑکے کو لے آئیں جس نے نیلا سوٹ پہن رکھا تھا۔

"یہ ہیں مسٹر سالومن۔ اسے وری سوشل بولئے۔ میرا ایک اچھا دوست اور کلب کا بیسٹ ڈانسر۔ کبھی تفصیل سے ملاقات کرا دوں گی" مس نوشیں نے اس کا تعارف کرایا۔

میں نے اسے نظریں اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ البتہ اس کا نیلا سوٹ بار بار میرے ذہن میں کچھ کریدتا رہا۔ مس نوشیں نے اپنے دوست کو خدا حافظ کہا اور ہم نیچے اترنے لگے۔ ہوٹل کی سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے اُن سے کوئی بات نہیں کی۔

"لذت ہی زندگی ہے" انھوں نے کہا۔

"ہوگی" میں نے رُوکھا سا جواب دیا۔

"جانتی ہو یہ کیوں ضروری ہے؟" انھوں نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

"کیوں؟" میں نے طنز سے پوچھا۔

"زندگی کی حرارت کے لئے" مس نوشیں بولیں۔

یہ جملہ کہہ کر مس نوشیں میری نظروں میں اُنھیں سیڑھیوں پر بہت نیچے گر گئی تھیں۔ اُن کی سنجیدگی، متانت اور بُردباری کے پردے جیسے سب کے سب ایک لمحہ میں چاک ہو گئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ درد اور بیماری کے ظالم ہاتھ اگر ہسپتال میں مریضوں پر غالب آتے ہیں تو مس نوشیں کو کیف و لذت کے کمزور بازو چت کرتے ہیں۔

مس نوشیں ابھی تک میری طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

"ہوں" میں نے ٹالنے کے سے انداز میں کہا۔ میں اُن کی بات کا جواب اپنے خیالات کی روشنی میں دے کر انھیں مزید اپنے اوپر مسلط نہ کرنا چاہتی تھی۔

وہ میرے موڈ کو سمجھ گئی تھیں۔ کار چلاتے ہوئے انھوں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ لیکن اُن کی باتوں سے بے پروا میں اپنے ہی خیالوں میں کھوئی تھی۔

میرے نظریات کے ننھے شیشے پر کسی نے ایک بڑا سا پتھر مارا تھا۔ میں ذہن میں اُن ٹکڑوں کو جوڑ رہی تھی، سمیٹ رہی تھی۔ اُن ٹکڑوں میں میرے ماضی کی کہانیاں تھیں۔ میرے جذبات، سوچ اور فکر کی تصویریں تھیں۔ کبھی سہیل کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے میں نے بھی سرور حاصل کیا تھا۔ لیکن میرا وہ سرور کتنا شرم اور کتنا بے زبان تھا۔

زندگی ہے تو کیف و سرور بھی ہے۔ لیکن لذت تو زندگی نہیں۔ موجیں دریا کی سطح پر ہی اُبھرتی ہیں، لیکن موج تو دریا نہیں . . . گو سہیل میرا ہمراز تھا لیکن میرے جلوے تو عام نہ تھے . . . راستہ چلتے ہوئے میری سوچ کے دائرے پھیلتے سکڑتے گئے۔

ہماری کار خاموش سڑک پر دھیرے دھیرے دوڑ رہی تھی۔ رات بڑھ گئی تھی اور راستے سُنسان ہو گئے تھے۔ کار کے ونڈ اسکرین پر دھی پرچھائیں سی اُبھرنے لگی تھی۔ میں خیالوں ہی خیالوں میں سُہیل کو دیکھ رہی تھی۔ اگر زندگی میں کہیں گم ہو جانا تھا تو سُہیل نے برسوں پہلے کیوں میری رُوح میں محبت کا پودا لگایا تھا۔ اب تو اُس کی جڑیں میرے وجود میں بہت دُور تک پھیل چکی ہیں۔ اپنی بیماری کو تو میں اکثر بھول جاتی ہوں۔ لیکن سُہیل کو بھولنا جیسے میرے بس کی بات نہیں۔ میری آنکھوں کے کونے بھیگ سے گئے۔

"تم آج بہت اُداس معلوم ہوتی ہو۔ شاید تمھیں اپنی پُرانی محبت یاد آرہی ہے" مس نوشیں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ گھٹن کے کسی لمحہ میں ایک بار میں نے انھیں اپنی محبت کی کہانی باتوں باتوں میں سُنائی تھی۔ سُہیل کا ذکر کیا تھا۔

میں نے نفی میں سر اس طرح ہلایا جس میں لاشعوری طور پر اثبات کی جھلک تھی۔

"یہ ایٹمی زمانہ ہے صبوحی! چاند کے لئے تڑپنے والا چکور نہ جانے کہاں تھک ہار کر بیٹھا ہے۔ نئے اپالو اسے بہت پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ اُن کا استقبال کرو" مس نوشیں نے پھر مجھے اپنے رنگ میں تسکین دی۔

"جی!" میرے ہونٹ جبراً وا ہوئے۔

اتنے میں اُن کا گھر آگیا۔ وہ میرا شکریہ ادا کر کے اندر چلی گئیں اور میں ہمیشہ کی طرح تہی دل اور تہی دامن اپنی خالی کار لئے تنہا گھر کو لوٹ آئی۔

---

ایک دن میں ہسپتال کی دوسری منزل پر فیمیل وارڈ میں مریضوں کو دیکھ رہی تھی کہ وہاں مس نوشیں بہت تیز تیز قدموں سے میری طرف آتی دکھائی دیں خلاف معمول وہ مسکرا رہی تھیں۔ گزشتہ چند دنوں میں انھوں نے مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھنا تک چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ میرے بہت قریب آگئی تھیں۔

"ڈاکٹر صاحبہ تمھیں کچھ خبر بھی ہے۔ نئے سپرنٹنڈنٹ صاحب آگئے ہیں۔ اُن سے ملنے نہ چلوگی؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ چلئے" میں نے کہا۔

"یہ تو یہاں کا معمول ہے۔ کتنے لوگ یہاں آتے ہیں، کتنے جاتے ہیں۔ کوئی گھر کی طرف واپس جاتا ہے تو کوئی موت کی طرف۔ ہم آنے والوں کی خدمت کرتے ہیں اور جانے والوں کو کبھی مُسکراہٹوں سے اور کبھی آہوں سے الوداع کہتے ہیں۔" میں سیڑھیاں اُترتے اُترتے سوچ رہی تھی۔ میرے سامنے مِس نوشیں چل رہی تھیں نئے ڈاکٹر صاحب کے کمرے سے اسٹاف کے دوسرے لوگ مل کر نکل چکے تھے۔ اب شاید میرا ہی تعارف باقی تھا۔ کمرے میں پہلے مِس نوشیں داخل ہوئیں ——— اور پھر میں۔

نیلا سُوٹ . . . چھریرا بدن . . . چوڑی پیشانی . . . جُڑواں ابرُو . . .

س . . . ہ . . . ے . . . ل . . . !

"مہو . . . جی . . . !!" ڈاکٹر صاحب کے مُنہ سے ہلکی سی آواز نکلی جو حیرت اور استعجاب میں ڈوبی ہوئی تھی۔

وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"سُہیل!"

"مہو جی!!"

سُہیل . . . مہو جی . . . سُہیل . . . مہو جی . . . سُہیل . . . ناموں کے اِس ارتعاش نے ایک پل میں کِتنے زمانے یاد دِلائے، کِتنے افسانے دُہرائے!

مِس نوشیں ہم دونوں کا مُنہ تکتی کھڑی تھیں۔

"مہو جی . . . تم یہاں ڈاکٹر ہو۔ اب پہچانی بھی تو نہیں جاتیں۔ کتنی سنجیدہ اور کیسی باوقار بن گئی ہو . . ." سُہیل نے اپنے وہی کالج والے اسٹائل میں کہا۔

مِس نوشیں نے اب میرا تعارف کرانا مناسب نہ سمجھا اور اجازت لے کر باہر چلی گئیں۔

"اور تم اِتنے دِنوں تک کہاں تھے؟" اِنٹرمیڈیٹ میں مینڈک کو چیرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ اب ڈاکٹر کیسے بن گئے؟ کیا یہ بھی سائنس کا کوئی کرشمہ ہے؟" میں نے بے تکلّفی سے کہا۔

"سائنس کا کرشمہ نہیں، محبت کا کرشمہ سمجھو اِسے! مجھے معلوم تھا کہ تم نے میڈیسن میں داخلہ لے لیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اگر تم سے زندگی میں کبھی مِلوں تو مریض نہیں ڈاکٹر بن کر مِلوں . . ."

"لیکن میں تو ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی مریض ہوں!" میرے مُنہ سے اچانک نکل گیا۔

"میرے سوا تمہارا مرض اور کون جانتا ہے۔ میرے پاس ہر مرض کی دوا ہے۔" سُہیل نے ایک قہقہہ مار کر کہا۔

وہ زور زور سے قہقہے لگاتا گیا۔ قہقہے . . . جن کی گُونج میں ماضی کے پل، گھڑیاں، ماہ و سال سب کے سب خوبصورت قالینوں کی طرح ایک ایک کرکے کھل رہے تھے . . .

"کیا گھر نہیں بتاؤ گی؟" سُہیل نے نہایت بھولے پن سے سوال کیا۔

"آج ہی آؤ نا شام کو میرے ہاں۔ میرا پتہ یہ ہے۔" میں نے سُہیل کے سامنے اپنا وزیٹنگ کارڈ رکھ دیا اور کمرے سے باہر نکلنے لگی۔

"سُنو . . . میں چائے والے نہ پیوں گا۔" سُہیل نے مجھے ٹوکا۔

"کیوں نہیں کیا بات ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"میں وہ اسنو پڈنگ کھاؤں گا . . . برسوں سے نہیں کھائی ہے۔" سُہیل نے بچّوں کی طرح کہا۔

میں بھی بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی ——— مجھے بھی اِس طرح ہنستے ہوئے کِتنے سال ہو گئے تھے۔

---

وہ شام ———

شام کہاں تھی . . . وہ تو میری زندگی کی نئی صبح تھی۔

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میرے ڈرائنگ رُوم کے صوفے پر سُہیل بیٹھا ہے! میرے کمرے کی تنہائیاں اُس کے مانوس قہقہوں سے گُونج رہی ہیں۔ برسوں بعد آج میرے مکان کا پُرفضا ماحول، آنگن سے آتی ہوئی رات کی رانی کی لپٹیں، ریشمی پردوں کی سرسراہٹ اور تنہائیاں سب کے سب مجھے میرے خوابوں کے جزیرے کی یاد دِلا رہے تھے۔

"ارے یہاں تو اب بچّوں کی کوئی تصویر نظر نہیں آتی۔ تم تو بہت بدل گئی ہو۔" سُہیل نے کہا۔

میں جواب میں مُسکرا دی۔

"کل میں لے آؤں گا ایک بچّے کی تصویر۔ بمبئی میں تو اپنی دُلہن کا کمرہ بچّوں اور پھولوں کی تصویروں سے سجاؤں گا۔" سُہیل نے اسنو پڈنگ کھاتے ہوئے کہا۔

اُس وقت میں نے محسوس کیا جیسے برف کے ہلکے ہلکے گالے میری تھپی ہوئی تمنّاؤں کی پژمُردہ شاخوں پر گر رہے ہیں۔

"تم نے اب تک شادی نہیں کی؟" میں نے پُوچھا۔

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر اب تک کیا کرتے رہے؟" میں نے سوال کیا۔

"چھوٹی بہنوں کی شادیاں اور بیماروں کی خدمت۔" اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

"تو گویا تم نے اپنا وقت، اپنا سکون سب کچھ لٹا دیا۔" میں نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

"صبوحی! کھونے میں جو لذت ہے وہ پانے میں نہیں۔ زندگی کے جام سے اپنے لئے دو گھونٹ چرا لینا بہت سہل ہے۔ لیکن اس میں اپنے حصہ کی بھی شیرینی ملا دینا بہت ہی مشکل کام ہے۔" سہیل نے نہایت سنجیدگی اور بے حد اطمینان سے جواب دیا۔

میں صرف اس کی آنکھوں ہی دیکھتی ڈوبتی رہ گئی۔ کتنی پاکیزگی تھی ابھی تک اس کے مزاج میں۔

---

دوسری ہی شام کو ہم کار میں بیٹھے ہوئے تفریح کے لئے کہیں دور جا رہے تھے۔ میں کار چلا رہی تھی اور وہ میرے ساتھ چپ چاپ بیٹھا تھا۔

"زندگی کے جام سے دو گھونٹ چرا لینا بہت سہل ہے۔ . ." سہیل کے جسم سے آتی ہوئی خوشبو کہہ رہی تھی۔

"صبوحی!"

"ہوں"

"میں تمھیں اپنی جیون ساتھی بنانا چاہتا ہوں" سہیل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ایک لمحہ کے لئے میں لرز گئی۔ اسٹیرنگ کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ بہت دنوں سے جس پھانس کو میں بھول چکی تھی وہ پھر سے دل میں چبھنے لگی . . . درد کی ایک ٹیس میرے سینے سے نکل کر سارے جسم میں پھیل گئی۔

"میں . . . میں . . . میرا ابھی شادی کا خیال نہیں ہے" میرے ہونٹ کانپنے لگے۔

"کیوں؟"

"بس یوں ہی"

"لیکن میرا خیال ابھی شادی کرنے کا ہے" سہیل نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم شادی کر لو" میں نے اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں تو تم سے شادی کروں گا" سہیل نے پھر اصرار کیا۔

"لیکن میں . . . میں نہیں کر سکتی" میری آواز بھرا گئی۔

"کیوں؟ کیوں نہیں؟؟ . . . بولو تم مجھے نہیں چاہتی ہو۔ مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ میں ابھی اسی وقت تمھاری کار سے اتر جاؤں گا اور پھر کبھی تمھارے گھر کا رخ نہ کروں گا۔ بولو ـــــ جواب دو!"

مجھ میں اب کار چلانے کی تاب نہ تھی۔ گاڑی خود بخود ایک میدان کے کنارے پر رک گئی۔

"نہیں نہیں سہیل۔ میں مجبور ہوں . ." میں نے اسٹیرنگ پر سر پٹک دیا۔ میرے گال بھیگ چکے تھے۔

"آخر بات کیا ہے؟ صاف بتاؤ!" سہیل نے پُر زور لہجے میں کہا۔

"مجھے . . . مجھے کینسر ہو گیا ہے!" میرے کانپتے لبوں نے کہا۔

سہیل کو اس وقت جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

"تمھیں کینسر ہے؟؟؟" اس نے انتہائی غم اور پریشانی کے عالم میں کہا۔

"ہاں" میں نے کہا۔

"گھبراؤ مت . . تم اچھی ہو جاؤ گی ـــــ میں نے کینسر کا کامیاب علاج دریافت کر لیا ہے" اس نے ایک نئے عزم اور یقین سے کہا اور اٹھ کر خود اسٹیرنگ سنبھال لیا۔

میری کار واپس گھر کی طرف خوشیوں میں چور بھاگ رہی تھی۔

---

دوسرے دن ہسپتال پہنچتے ہی میں یہ خوش خبری مس نوشیں کو سنانے ان کے کمرے میں گھس گئی۔ وہاں خلافِ معمول مس نوشیں سر جھکائے نہایت مضمحل اور اداس بیٹھی تھیں۔ کبھی میں نے انھیں اتنی بجھی ہوئی نہ دیکھا تھا۔ انھوں نے مجھے قریب بلا کر بہت دکھ سے کہا۔

"صبوحی! میں لٹ گئی ہوں . . . سالومن نے میرے ساتھ رہنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے ٹھکرا دیا ہے۔ تم معصوم ہو . . . میرے سکون کے لئے خدا سے دعا کرو۔ شاید میری دعا اب قبول بھی نہ ہو" مس نوشیں کے لب کانپ رہے تھے۔

"جی!" میں نے مودب شاگرد کی طرح کہا اور اپنی بات کہے بغیر کمرے سے نکل گئی ـــــ باہر لابی میں سہیل میری طرف آ رہا تھا۔

اس وقت میں نے محسوس کیا کہ میرا آپالو کتنا بلند ہے۔ اس نے مجھے اپنا کر روحانی دنیا میں لامتناہی فاصلے طے کئے ہیں . . . !!

---

# پاس آتے رہو!

بابو کرشن گوپال مغموم بی۔اے

میرے خوابوں میں تشریف لاتے رہو
میرے جذبات کو گدگداتے رہو
میرے دل کو یونہی جگمگاتے رہو
میرے سپنوں کو رنگیں بناتے رہو
دور رہ کر بھی یوں پاس آتے رہو!

لانبی لانبی سی پلکیں جھکائے ہوئے
اپنے بالوں میں کلیاں سجائے ہوئے
عطرِ گل میں سرا سر نہائے ہوئے
سازِ دل پہ غزل گنگناتے رہو
دور رہ کر بھی یوں پاس آتے رہو!

چاند سے بھی حسیں روئے تاباں لئے
روئے تاباں پہ زلفِ پریشاں لئے
اپنے آنچل میں صبحِ گلستاں لئے
تا بہ حدِ نظر مسکراتے رہو
دور رہ کر بھی یوں پاس آتے رہو!

اپنی بیخود خرامی دکھاتے ہوئے
اپنا آنچل ہوا میں اڑاتے ہوئے
لالہ و گل کو جھولا جھلاتے ہوئے
برق اداؤں کی مجھ پہ گراتے رہو
دور رہ کر بھی یوں پاس آتے رہو!

اپنے ماتھے پہ ضو بار جھومر لئے
اپنے جھمکوں میں انوارِ گوہر لئے
دستِ نازک میں شاخِ گلِ تر لئے
اپنا دیوانہ مجھکو بناتے رہو
دور رہ کر بھی یوں پاس آتے رہو!

آتشِ ہجر کو اور سوزاں کئے
مقتلِ دل میں صد خونِ ارماں کئے
میرے جذبات کو شعلہ افشاں کئے
میری غزلوں میں دیپک جلاتے رہو
دور رہ کر بھی یوں پاس آتے رہو!

طنزیہ

# سُلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ

پرنسپل کنہیالال کپور ایم۔ اے

دیانند متھرا داس کالج۔ موگا (پنجاب)

ڈیر مولانا خوشتر گرامی صاحب!

"بیسویں صدی" آپ کے الطاف و اکرام کا سلسلہ جاری ہے۔ یعنی خط پر خط اور تار پر تار آرہے ہیں مضمون بھجوایئے، اپنی پہلی فرصت میں، آپ شاید نہیں جانتے۔ اور کبھی غم ہیں زمانے میں مضامین کے سوا ۔۔۔ اور سب سے بڑا غم یہ ہے کہ اگر طلبا کا رویہ یہی رہا جو اب ہے تو کالج اور یونیورسٹیاں کب تک سلامت رہ سکیں گی۔ اکبر الٰہ آبادی کی طرح آپ کو اس انقلاب دہر کا غم نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ بیسویں صدی کے ابھی اکتیس سال باقی ہیں اور اس کے بعد آپ اکیسویں صدی نکال ہی دیں گے ۔۔۔ سالنامہ کے لئے ایک مضمون ۔۔۔ سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ ۔۔۔ بھجوا رہا ہوں۔ بہتر ہوگا اگر اسے کارٹونوں کے ساتھ شائع کیا جائے۔ "بیسویں صدی" کے کارٹونسٹ سے بات کر لیجئے۔ شاید وہ مان ہی جائے ۔۔۔ اور کہیئے موگا کب آرہے ہیں؟ لاہور کب جارہے ہیں؟ دہلی یا دنیا کب چھوڑ رہے ہیں ۔۔۔؟

آپ کا ۔۔۔۔۔۔ کنہیالال کپور

"دھرنوں کا موسم تھا۔ جگہ جگہ لوگ دھرنا دے کر بیٹھے تھے۔ ایک برات نے جو شکارپور سے آئی تھی سیٹھ لکشمی چندر کی کوٹھی کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ سیٹھ صاحب اپنی خوبصورت اور اکلوتی بیٹی کی شادی اس دولہا کے ساتھ کر دیں جو برات لے کر آیا تھا۔ سیٹھ صاحب کا کہنا تھا کہ وہ دولہا کو بالکل نہیں جانتے۔ انہیں اس کے حسب نسب کا مطلقاً علم نہیں اور نہ ہی کبھی انہوں نے اس کے ساتھ اپنی بیٹی کا بیاہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس پر ستم یہ کہ دولہا نہایت بدصورت تھا۔ کالا بھجنگ چیچک رو اور لم ڈھنگو لیکن برات کی رائے میں یہ سب باتیں خارج از بحث تھیں۔ اصل بات تو یہ تھی کہ برات نے دھرنا دیا تھا۔ اور دھرنا عموماً کسی بے ہودہ مطالبے کو منوانے کے لئے ہی دیا جاتا ہے۔ سیٹھ صاحب نے پولیس کو برات کے ارادے سے مطلع کیا۔ لیکن پولیس نے ایک خالص ذاتی معاملے میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھا۔ انہوں نے کمشنر سے رجوع کیا جس نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ برات کا مطالبہ منظور کر لیں ورنہ شہر میں گڑبڑ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ سیٹھ صاحب کمشنر کا ردِ عمل دیکھ کر بہت سٹپٹائے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس قسم کا غیر معقول مطالبہ کس طرح منظور کر سکتے ہیں۔ ادھر کمشنر صاحب انہیں سمجھا رہے تھے کہ دھرنے اور موت کے آگے کسی کی پیش نہیں جاتی۔ اس لئے وہ خواہ مخواہ ضد نہ کریں۔

"ضد میں کر رہا ہوں یا براتی؟" سیٹھ صاحب نے تلملا کر پوچھا۔

"اگر آپ کا اس سے پہلے کبھی دھرنے سے پالا پڑا ہوتا تو آپ ایسا کبھی نہ کہتے۔"

"اس کا مطلب ہے مجھے اپنی مرضی کے خلاف اپنی بیٹی کی شادی اس نامعقول سے کرنا پڑے گی؟"

"اور چارۂ کار بھی کیا ہے۔"

"یہ عجیب بے بسی ہے"

"جب سے دھرنا ایجاد ہوا ہے بے بسی تو ایک عام سی چیز ہو گئی ہے۔ یقیناً آپ اپنے کو بے بس محسوس کرنے میں اکیلے نہیں ہیں۔"

"لیکن حکومت دھرنوں کا انسداد کرنے کے لئے کیا کر رہی ہے؟"

وہ بھی کسی آدمی کی طرح بے لبس ہے"

"اس کا مطلب ہے جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔"

"جی ہاں بشرطیکہ وہ لاٹھی دھرنا ہو"

یونیورسٹی کیمپس پر پانچ سو فیل شدہ طلبا نے وائس چانسلر کی کوٹھی پہ دھرنا دیا تھا۔ اُن کا مطالبہ سیدھا سا تھا یعنی اُنہیں پاس کر دیا جائے اور جن ممتحنوں نے اُنہیں فیل قرار دیا ہے، اُنہیں قرار واقعی سزا دی جائے۔ وائس چانسلر فرما رہے تھے "یہ کسی طرح ممکن نہیں۔" طلبا اُنہیں یقین دلا رہے تھے کہ جب تک اُن کی بات مانی نہیں جاتی وہ اپنا دھرنا جاری رکھیں گے۔ وائس چانسلر صاحب عجیب کشمکش میں مبتلا تھے۔ جب اُنہوں نے ساتویں بار طلبا کو بتایا کہ آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا۔ تو اُنہوں نے کہا "آپ اُس زمانے کی بات کر رہے ہیں جب دھرنا ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اِن دنوں ہر ایک چیز ممکن ہے یہاں تک کہ اگر طلبا ملک الموت کے سامنے دھرنا دیکر بیٹھ جائیں تو اُسے بھی اُس رُوح کو واپس کرنا پڑیگا۔ جو اُس نے قبض کی ہے۔"

آخر وائس چانسلر نے محض جان چھڑانے کے لئے کہا "مجھے کچھ مہلت دیجئے۔ میں جلد ہی سنڈیکیٹ کا ایک اجلاس طلب کروں گا۔ جس میں تمہارے مطالبہ پر ہمدردانہ غور کیا جائیگا۔" لیکن طلبا بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ اُنہوں نے اِس تجویز کو فوراً رد کرنے کے بعد الٹی میٹم دے دیا۔ اگر آج دوپہر تک اُن کا مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا تو وُہ یونیورسٹی ہال کے علاوہ وائس چانسلر کی کوٹھی کو بھی آگ لگا دیں گے۔

---

ایک بہت بڑے بینک کے ملازموں نے اپنے منیجر کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ کام کے اوقات میں پچاس فیصد تخفیف کی جائے نیز ایک ہفتے میں ایک اتوار کی بجائے دو اتوار ہونے چاہئیں۔ منیجر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "یہ دونوں باتیں میرے اختیارات سے باہر ہیں۔ آپ جنرل منیجر کے پاس ڈیپوٹیشن لے جائیں۔" لیکن ملازمین بضد تھے کہ وُہ اپنے مطالبے اُسی سے منوا کر دم لیں گے۔ منیجر نے اُن سے دست بستہ درخواست کی "خدا کے لئے مجھے گھر جانے کی اجازت دیجئے میری بیوی سخت بیمار ہے اور گھر میں بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں"۔ ملازموں نے چنگھاڑ کر کہا "تمہاری بیوی مرے یا بچے۔ تمہارے بچوں کو کھانا ملے یا وُہ بھوکے رہیں۔ ہم تو اپنے مطالبے منوانے کے بعد ہی تمہیں یہاں سے اُٹھنے کی اجازت دیں گے۔"

---

ایک چوراہے میں ایک شخص آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا۔ اُس کے دائیں اور بائیں پٹرول اور مٹی کے تیل کے کنستر رکھے ہوئے تھے۔ اُس کا مطالبہ تھا کہ جو نوبل پرائز آئرلینڈ کے ادیب سیموئیل بیکٹ کو اِس سال دیا گیا اُس کا اصل میں حقدار مَیں ہوں۔ یہ انعام بیکٹ سے واپس لیا جائے اور مجھے دیا جائے۔ اگر ایک ہفتے کے اندر ایسا نہ کیا گیا تو میں اپنے کپڑوں پر پٹرول یا مٹی کا تیل چھڑک کر اُنہیں آگ لگا دوں گا اور زندہ جل مروں گا۔

اُس سے جب پوچھا گیا "تم اپنے کو کس اعتبار سے سیموئیل بیکٹ سے بہتر ادیب سمجھتے ہو" تو اُس نے جواب دیا "جس ڈرامے پر بیکٹ کو انعام دیا گیا اُس کی ضخامت اسی صفحے ہے اور اُس میں صرف چار کردار ہیں۔ جو ڈرامہ میں نے لکھا ہے اس کی ضخامت دو سو چالیس صفحے ہے اور اُس میں چوبیس کردار ہیں۔"

---

اِس شخص کے قریب ہی ایک پیپل کے درخت کے نیچے ایک شخص نے بھوک ہڑتال کر رکھی تھی۔ اُس کا مطالبہ تھا جب تک دہلی کی بجائے بنگلور کو ہندوستان کا دارالخلافہ نہیں بنایا جاتا۔ وُہ بھوک ہڑتال جاری رکھیگا۔

کسی نے اُس سے سوال کیا "دہلی میں کیا قباحت ہے؟" اُس نے جواب دیا "مجھے دہلی بالکل پسند نہیں۔ دہلی میں رہنے کو مکان ملتا ہے نہ سوار ہونے کے لئے بس۔ کبھی ہندوستان کا دارالخلافہ کلکتہ تھا جو کہ مشرقی ہندوستان میں واقع ہے۔ پھر یہ شمالی ہندوستان میں منتقل کیا گیا۔ اب جنوبی ہندوستان کو موقع ملنا چاہیئے۔"

---

ایک چھوٹے سے اسٹیشن کے نزدیک تین سو افراد ریلوے لائن پہ لیٹے ہوئے تھے۔ اُن کا مطالبہ تھا جب تک ریلوے کے اعلیٰ حکام یہ حکم صادر نہیں کرتے کہ آئندہ ہر میل اور ایکسپریس گاڑی اُن کے اسٹیشن پر بھی ٹھہرا کریگی وُہ کسی گاڑی کو آگے نہیں جانے دینگے۔ اُن سے سوال کیا گیا "اگر میل یا ایکسپریس ہر چھوٹے اسٹیشن پر ٹھہرے گی تو پھر وُہ میل یا ایکسپریس کیسے رہیگی" اُنہوں نے بڑی بے رُخی کے ساتھ جواب دیا "ہم کب کہتے ہیں کہ وہ ہر چھوٹے اسٹیشن پہ ٹھہرے۔ ہم تو اُسے صرف اپنے اسٹیشن پر ٹھہرنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔"

---

ایک محلے میں بیویوں نے شوہروں کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ آئندہ شام کا کھانا شوہروں کو تیار کرنا پڑیگا۔ بیویاں کلب یا سینما جایا کریں گی۔ اور رات گئے گھر لوٹیں گی۔

کچھ بیویوں نے جو حد سے زیادہ ماڈرن واقع ہوئی تھیں یہ تجویز بھی پیش کی کہ بچے پیدا کرنے کی ذمہ داری بھی شوہروں کو سونپ دی جائے۔ لیکن اکثریت کا یہ خیال تھا کہ یہ مطالبہ ناجائز ہے۔ اس کے لئے تو قدرت کے خلاف مورچہ لگانا پڑے گا۔

---

ایک مشہور اخبار کے خاص نمائندہ نے یہ تمام دھرنے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اس نے سوچا "سبحان اللہ! یہ دھرنا بھی کیا دلچسپ ایجاد ہے۔ جس کی بدولت ہر مُراد بر آتی ہے۔ روٹھوں کو منانا ہو تو دھرنا۔ سنگدل سے سنگدل محبوب کو راہ پر لانا ہو تو دھرنا۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانا ہو تو دھرنا۔ دھرنا کیا ہے اچھا خاصہ الہ دین کا چراغ ہے۔ معاً اسے خیال آیا کیوں نہ وہ بھی اخبار کے مالک کو الٹی میٹم دے دے کہ اگر اسے دو ایک دن میں چیف ایڈیٹر نہ بنایا گیا تو وہ اخبار کے دفتر کی ۔۔ منزلہ عمارت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرے گا۔

---

**ابر احسنی گنوری**

حال اپنا دیکھتے ہی نہیں ہر نظر سے ہم — ناخوش ہیں اور زمانے سے کبھی ادھر سے ہم

آگاہ کر تو سکتے ہیں دوروجہاں سے ہم — دیکھو گے پھر خجل انہیں کس کی نظر سے ہم

ہر شیخ کو فرشتہ بنا شوق سے مگر — یارب نکل نہ جائیں حدودِ بشر سے ہم

دیکھو جہاں بلندی و پستی کا ہے فساد — ہموار اس زمیں کو کریں بھی کدھر سے ہم

جو گرمِ نالہ ہائے شبِ غم سے دے نجات — لیں خواب دائمی وہ ہوائے سحر سے ہم

بارِ وفا سے ہوں گے سبکدوش کس طرح — بارِ حیات اُتار سکے جب نہ سر سے ہم

دل ایک طرف ہے زد میں جگر دوسری طرف — اُن کی نظر کا وار بچائیں کدھر سے ہم

مانا زباں پہ قفل لگا دو گے تم مگر — لینے لگے جو کام زباں کا نظر سے ہم

گو نام مختلف ہیں مگر کام ایک ہے — رہزن کے داؤں پوچھ نہ لیں راہبر سے ہم

جیسے سحر جب آئی تو راس آ ہی جائے گی — خوش ہیں شبِ الم میں خیالِ سحر سے ہم

ڈوبے ہیں نا خداؤں کی سازش سے جس قدر
واپس وہ آبرو لیں گے سفینے بھنور سے ہم

**سید حباب ترمذی**

اس قدر شکستہ ردا تو نہیں — آدمی ہی تو ہے خدا تو نہیں

ڈگمگانے لگے ابھی سے قدم — ابتدا ہے یہ انتہا تو نہیں

آپ کا انتخاب کر کے ہیں — اپنے معیار سے گرا تو نہیں

سوچتا ہوں کہ اس سے پہلے بھی — میں کہیں آپ سے ملا تو نہیں

اس ادا سے نہ دیکھئے مجھ کو — دیکھئے کوئی دیکھتا تو نہیں

دل سے طوفانِ غم اُٹھے لیکن — کوئی اشک آنکھ سے گرا تو نہیں

آپ دل توڑ کر اُداس نہ ہوں — دل مرا ہے یہ غیر کا تو نہیں

اور جو چاہئے وہ کہہ لیجے — خیر میں دشمنِ وفا تو نہیں

دوستو! مجھ سے کیوں گریزاں ہو — کچھ کبھی تم سے مانگتا تو نہیں

ہے یہ شاید حباب کی آواز
دیکھنا وہ غزل سرا تو نہیں

[illegible] بے بس ہے"

"اس کا مطلب ہے جس کی لاٹھی اُس کی بھینس"

"جی ہاں بشرطیکہ وُہ لاٹھی دھرنا ہو"

یونیورسٹی کیمپس پر پانچ سو فیل شدہ طلبا نے وائس چانسلر کی کوٹھی پر دھرنا دیا تھا۔ اُن کا مطالبہ سیدھا سادا تھا۔ یعنی اُنہیں پاس کر دیا جائے اور جن ممتحنوں نے اُنہیں فیل قرار دیا ہے، اُنہیں قرار واقعی سزا دی جائے۔ وائس چانسلر فرما رہے تھے "یہ کسی طرح ممکن نہیں۔" طلبا اُنہیں مطلع فرما رہے تھے کہ جب تک اُن کی بات مانی نہیں جاتی وُہ اپنا دھرنا جاری رکھیں گے۔ وائس چانسلر صاحب عجیب کشمکش میں مبتلا تھے۔ جب اُنہوں نے ساتویں بار طلبا کو بتایا کہ آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا۔ تو اُنہوں نے کہا "آپ اُس زمانے کی بات کر رہے ہیں جب دھرنا ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اِن دنوں ہر ایک چیز ممکن ہے یہاں تک کہ اگر طلبا ملک الموت کے سامنے دھرنا دیکر بیٹھ جائیں تو اُسے بھی اُس روح کو واپس کرنا پڑیگا۔ جو اُس نے قبض کی ہے۔"

آخر وائس چانسلر نے محض جان چھڑانے کے لئے کہا "مجھے کچھ مہلت دیجئے۔ میں جلد ہی سنڈیکیٹ کا ایک اجلاس طلب کروں گا۔ جس میں تمہارے مطالبہ پر ہمدردانہ غور کیا جائیگا۔" لیکن طلبا بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ اُنہوں نے اِس تجویز کو فوراً رد کرنے کے بعد الٹی میٹم دے دیا۔ اگر آج دوپہر تک اُن کا مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا تو وُہ یونیورسٹی ہال کے علاوہ وائس چانسلر کی کوٹھی کو بھی آگ لگا دیں گے۔

---

ایک بہت بڑے بینک کے ملازموں نے اپنے منیجر کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ کام کے اوقات میں پچاس فیصد تخفیف کی جائے نیز ایک ہفتے میں ایک اتوار کی بجائے دو اتوار ہونے چاہئیں۔ منیجر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "یہ دونوں باتیں میرے اختیارات سے باہر ہیں۔ آپ جنرل منیجر کے پاس ڈیپوٹیشن لے جائیں۔" لیکن ملازمین بضد تھے کہ وُہ اپنے مطالبے اُسی سے منوا کر دم لیں گے۔ منیجر نے اُن سے دست بستہ درخواست کی "خدا کے لئے مجھے گھر جانے کی اجازت دیجئے میری بیوی سخت بیمار ہے اور گھر میں بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔" ملازموں نے چنگھاڑ کر کہا۔ "تمہاری بیوی مرے یا بچے تمہارے بچوں کو کھانا ملے یا وُہ بھوکے رہیں۔ ہم تو اپنے مطالبے منوانے کے بعد ہی تمہیں یہاں سے اُٹھنے کی اجازت دیں گے۔"

---

[illegible] ایک شخص ہاتھ میں ماچس [illegible] تھا۔ اُس نے [illegible] بائیں پٹرول اور مٹی کے تیل کے کنستر لے رکھے تھے۔ اُس کا مطالبہ تھا کہ جو نوبل پرائز آئرلینڈ کے ادیب سیموئیل بیکٹ کو اس سال دیا گیا اُس کا [illegible] نہیں ہے یہ انعام بیکٹ سے واپس لے لیا جائے اور مجھے دیا جائے [illegible] اگر ایسا نہ کیا گیا تو میں اپنے کپڑوں پر پٹرول یا مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دوں گا اور زندہ جل مروں گا۔

اُس سے جب پوچھا گیا "تم اپنے کو کس اعتبار سے سیموئیل بیکٹ سے بہتر ادیب سمجھتے ہو" تو اُس نے جواب دیا "جس ڈرامے پر بیکٹ کو انعام دیا گیا اُس کی ضخامت اسّی صفحے ہے اور اُس میں صرف چار کردار ہیں۔ جو ڈرامہ میں نے لکھا ہے اس کی ضخامت دو سو چالیس صفحے ہے اور اُس میں چوبیس کردار ہیں۔"

---

اِس شخص کے قریب ہی ایک پیپل کے درخت کے نیچے ایک شخص نے بھوک ہڑتال کر رکھی تھی۔ اُس کا مطالبہ تھا جب تک دہلی کی بجائے بنگلور کو ہندوستان کا دارالخلافہ نہیں بنایا جاتا۔ وُہ بھوک ہڑتال جاری رکھیگا۔

کسی نے اُس سے سوال کیا "دہلی میں کیا قباحت ہے؟" اُس نے جواب دیا "دہلی مجھے بالکل پسند نہیں۔ دہلی میں رہنے کو مکان ملتا ہے نہ سونے کے لئے بس۔ کبھی ہندوستان کا دارالخلافہ کلکتہ تھا جو کہ مشرقی ہندوستان میں واقع ہے۔ پھر یہ شمالی ہندوستان میں منتقل کیا گیا۔ اب جنوبی ہندوستان کو موقع ملنا چاہیئے۔"

---

ایک چھوٹے سے اسٹیشن کے نزدیک تین سو افراد ریلوے لائن پر لیٹے ہوئے تھے۔ اُن کا مطالبہ تھا جب تک ریلوے کے اعلےٰ حکام یہ حکم صادر نہیں کرتے کہ آئندہ ہر میل اور ایکسپریس ٹرین اُن کے اسٹیشن پر بھی ٹھہرا کریگی وہ کسی گاڑی کو آگے نہیں جانے دیں گے۔ اُن سے سوال کیا گیا۔ "اگر میل یا ایکسپریس ہر چھوٹے اسٹیشن پر ٹھہرنے لگی تو پھر وُہ میل یا ایکسپریس کیسے رہیگی۔" اُنہوں نے بڑی بے رُخی کے ساتھ جواب دیا "ہم کب کہتے ہیں کہ وہ ہر چھوٹے اسٹیشن پر ٹھہرے۔ ہم تو اُسے صرف اپنے اسٹیشن پر ٹھہرنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔"

---

ایک محلے میں بیویوں نے شوہروں کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ آئندہ شام کا کھانا شوہروں کو تیار کرنا پڑیگا۔ بیویاں کلب یا سینما جایا کریں گی۔ اور رات گئے گھر لوٹیں گی۔

یویوں نے جو فرصت سے زیادہ تاش کا قیمتی وقت ضائع ہوتی تھیں یہ تجویز بھی پیش کی کہ
پیدا کرنے کی ذمہ داری بھی شوہروں کو سونپ دی جائے۔ لیکن اکثریت
خیال تھا کہ یہ مطالبہ ناجائز ہے۔ اس کے لئے تو قدرت کے خلاف مورچہ
اپڑے گا۔

---

ایک مشہور اخبار کے خاص نمائندے نے یہ تمام دھرنے اپنی آنکھوں
دیکھے اور اُس نے سوچا "سبحان اللہ! یہ دھرنا بھی کیا دلچسپ ایجاد

ہے۔ جس کی بدولت ہر مُراد بر آتی ہے۔ روٹھوں کو منانا ہو تو دھرنا۔ سنگدل سے
سنگدل محبوب کو راہ پہ لانا ہو تو دھرنا۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانا ہو تو دھرنا۔ دھرنا
کیا ہے اچھا خاصہ الہ دین کا چراغ ہے۔ معاً اُسے خیال آیا کیوں نہ وہ بھی اخبار
کے مالک کو الٹی میٹم دے دے کہ اگر اُسے دو ایک دن میں چیف ایڈیٹر
نہ بنایا گیا تو وہ اخبار کے دفتر کی سہ منزلہ عمارت سے چھلانگ لگا کر خودکشی
کر لے گا۔

---

# غزلیں

## احسن گنوری

...ابھی دیکھنے ہی نہیں جو نظر سے ہم — ناخوش ہیں اہلِ زر ہیں کہ بھی اہلِ ہنر سے ہم
...تو سکتے ہیں در جگر سے ہم — دیکھیں گے پھر خجل انہیں کس کی نظر سے ہم
...کو فرشتہ بنا شوق سے مگر — یارب تحمل نہ جائیں حدودِ بشر سے ہم
...جہاں بلندی و پستی کا ہے فساد — ہموار اس زمیں کو کریں بھی کدھر سے ہم
...تا لہائے شبِ غم سے دے نجات — لیں خواب دائمی وہ ہوائے سحر سے ہم
...ہو گئے سبکدوش کس طرح — بارِ حیات اُتار سکے جب نہ سر سے ہم
...طرف ہے دل میں جگر دوسری طرف — اُن کی نظر کا وار بچائیں کدھر سے ہم
...یاں پہ قفل لگا دو گے تم مگر — لینے لگے جو کام زباں کا نظر سے ہم
...مختلف ہیں مگر کام ایک ہے — رہزن کے داؤں پوچھ نہ لیں راہبر سے ہم
...جب آئی تو راس آہی جائے گی — خوش ہیں شبِ الم میں خیالِ سحر سے ہم

ڈوبے ہیں نا خداؤں کی سازش سے حسنؔ
واپس وہ آ بھی لیں گے سفینے بھنور سے ہم

## سیّد حبابؔ ترمذی

اس قدر تمکنت روا تو نہیں — آدمی ہی تو ہے خدا تو نہیں
ڈگمگانے لگے ابھی سے قدم — ابتدا ہے یہ انتہا تو نہیں
آپ کا انتخاب کر کے میں — اپنے معیار سے گرا تو نہیں
سوچتا ہوں کہ اس سے پہلے بھی — میں کہیں آپ سے ملا تو نہیں
اس ادا سے نہ دیکھئے مجھ کو — دیکھئے کوئی دیکھتا تو نہیں
دل سے طوفانِ غم اُٹھے لیکن — کوئی آنسو آنکھ سے گرا تو نہیں
آپ دل توڑ کر اُداس نہ ہوں — دل مرا ہے یہ غیر کا تو نہیں
اور جو چاہئے وہ کہہ لیجے — خیر میں دشمنِ وفا تو نہیں
دوستو! مجھ سے کیوں گریزاں ہو — کچھ کبھی تم سے مانگتا تو نہیں

ہے یہ شاید حبابؔ کی آواز
دیکھنا وہ غزل سرا تو نہیں

# بزمِ یاراں

شاہدہ حسن ایم۔ اے

سی ون۔ فضیلٹ نائن ٹی۔ آئی۔ ٹی کھڑگپور (مغربی بنگال)

محترم بھائی! تسلیمات

۔۔۔ اب "بیسویں صدی" میں ایکشی ڈیٹی پر مختصر افسانے بہت نظر آ رہے ہیں۔ لیجئے ایک لائٹ سا مختصر افسانہ حاضر ہے۔ شاید پسند آ جائے! ——— بہترین دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ۔

——— شاہدہ حسن

آج پھر وہ بزمِ یاراں میں گم تھا۔

بزمِ یاراں اُس کے البم کا نام تھا۔ اس میں اُس کے دوستوں کی تصویریں تھیں۔ کچھ بچپن کے ساتھی تھے، کچھ اسکول کالج کے اور کچھ یونیورسٹی کے۔ یہ سب اُسے بے حد عزیز تھے۔ قیوم کو وہ بہت احمق معلوم ہوتے جنھیں اپنے دوستوں سے شکایت ہوتی ہے۔ دوست احباب کوئی ماں باپ، بھائی بہن یا رشتہ دار تو نہیں جن سے سماجی ضابطوں کے تحت دامن باندھ دیئے جاتے ہیں اور انسان بے بس رہتا ہے ——— ہزار ناپسندیدگی کے باوجود جنھیں نبھانا ہی پڑتا ہے۔ دوست تو انسان اپنی پسند سے بناتا ہے۔ انتخاب کے بعد وہ وجود میں آتے ہیں۔ پھر ان سے گلہ کیوں؟ شکایت کیسی!

اُس کی آنکھیں البم کے اوراق پر مرکوز تھیں۔ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا اور ذہن ماضی کی وادیوں میں یادوں کے حسین پھول چن رہا تھا۔

"ارے! آج آپ کس دنیا میں ہیں؟" رُوبی اُس کے شانوں پر جھک گئی۔

"بزمِ یاراں میں۔۔۔ آؤ تم بھی آؤ!" اُس نے روبی کو کھینچ کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور پھر ایک ایک کر کے اپنے دوستوں کا تعارف کرانے لگا۔ [illegible] شرارتیں اور شوق، روبی اُس کے بازو [illegible] [illegible] [illegible] بتا رہا تھا۔

"یہ دیکھو! یہ ہے میرا سب سے پیارا دوست آفتاب ——— بی۔ اے تک ہم ایک ہی کالج میں تھے۔ جتنا خوبصورت ہے اتنا ہی ذہین۔ ہزاروں دل والیاں اس کے آگے پیچھے ناچا کرتیں لیکن کمبخت کسی کو لفٹ ہی نہ دیتا۔"

روبی نے تصویر کو پھر جھک کے دیکھا اور اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، آنکھوں میں نفرت بھر گئی۔

"ہوں! تو یہ حضرت بھی آپ کے دوستوں میں ہیں! حیرت ہے آپ کی دوستی اور ان سے؟"

"حیرت!۔۔۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ مجھے تو اس دوستی پر فخر ہے۔"

"بس جناب بس! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسے لچے لفنگے سے آپ کی دوستی ہوگی۔"

"لُچا لفنگا!" قیوم کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

"لُچا لفنگا اور یہ۔۔۔ ارے اسے تو ان لفظوں کی ہجے بھی نہیں معلوم!"

اُس کے قہقہے سارے کمرے میں گونج اُٹھے۔ روبی کا چہرہ غصہ سے تپ کر سرخ ہو گیا اور وہ پیر پٹختی کمرے سے بالکونی میں آ گئی۔

"خوبصورت۔۔۔ ذہین! اس حسین غلاف میں کتنا گھناؤنا اور گندہ کردار چھپا ہے، کاش میں تمہیں بتا سکتی؟" وہ اپنے بڑبڑاتی اور پیتے ہوئے

# بزمِ یاراں

شاہدہ حسن ایم۔ اے

سی ون۔ فیضی ٹاؤن ۔ آئی آئی ٹی کھڑکپور (مغربی بنگال)

محترم بھائی! تسلیمات

.... اب "بیسویں صدی" میں ایکٹی وٹی پر مختصر افسانے بہت نظر آ رہے ہیں۔ لیجئے ایک سلائیڈ ساختصر افسانہ حاضر ہے۔ شاید پسند آجائے! ——— بہترین دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ۔

——— شاہدہ حسن

آج پھر وہ بزمِ یاراں میں گم تھا۔

بزمِ یاراں اُس کے البم کا نام تھا۔ اِس میں اُس کے دوستوں کی تصویریں تھیں۔ کچھ بچپن کے ساتھی تھے، کچھ اسکول کالج کے اور کچھ یونیورسٹی کے۔ یہ سب اُسے بے حد عزیز تھے۔ قیوم کو وہ بہت احمق معلوم ہوتے جنھیں اپنے دوستوں سے شکایت ہوتی ہے۔ دوست احباب کوئی ماں باپ، بھائی بہن یا رشتہ دار تو نہیں جن سے سماجی ضابطوں کے تحت دامن باندھ دئے جاتے ہیں اور انسان بے بس رہتا ہے ——— ہزار ناپسندیدگی کے باوجود جنھیں نبھانا ہی پڑتا ہے۔ دوست تو انسان اپنی پسند سے بناتا ہے۔ انتخاب کے بعد وہ وجود میں آتے ہیں۔ پھر اُن سے گلہ کیوں، شکایت کیسی!

اُس کی آنکھیں البم کے اوراق پر مرکوز تھیں۔ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا اور ذہن ماضی کی وادیوں میں یادوں کے حسین پھول چن رہا تھا۔

"ارے! آج آپ کس دنیا میں ہیں؟" روبی اُس کے شانوں پر جھک گئی۔

"بزمِ یاراں میں .... آؤ تم بھی آؤ!" اُس نے روبی کو کھینچ کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور پھر ایک ایک کر کے اپنے دوستوں کا تعارف کرانے لگا۔ اُن کی پسند ناپسند، عادتیں، شرارتیں اور شوق، روبی اُس کے بازوؤں میں اُلجھی بہت انہماک سے تصویریں دیکھتی رہی۔ اکثر وہ کوئی چھوٹا سا ریمارک کر دیتی اور پھر دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑتے۔ ایک صفحے پر وہ یکایک چونک پڑی۔ قیوم بتا رہا تھا۔

"یہ دیکھو! یہ ہے میرا سب سے پیارا دوست آفتاب .... بی۔ اے تک ہم ایک ہی کالج میں تھے۔ جتنا خوبصورت ہے اتنا ہی ذہین۔ ہزاروں لڑکیاں اِس کے آگے پیچھے ناچا کرتیں لیکن کمبخت کسی کو لفٹ ہی نہ دیتا۔"

روبی نے تصویر کو پھر جھک کے دیکھا اور اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا! آنکھوں میں نفرت بھر گئی۔

"ہوں! تو یہ حضرت بھی آپ کے دوستوں میں ہیں! حیرت ہے آپ کی دوستی اور ان سے؟"

"حیرت! .... اِس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ مجھے تو اِس دوستی پر فخر ہے۔"

"بس جناب بس! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسے لُچے لفنگے سے آپ کی دوستی ہوگی۔"

"لُچا لفنگا!" قیوم کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

"لُچا لفنگا! اور یہ .... ارے اِسے تو اِن لفظوں کی ہجّے بھی نہیں معلوم!" اُس کے قہقہے سارے کمرے میں گونج اُٹھے۔ روبی کا چہرہ غصہ سے تپ کر سُرخ ہو گیا اور وہ پیر پٹختی کمرے سے بالکونی میں آگئی۔

"خوبصورت .... ذہین! اِس حسین غلاف میں کتنا گھناؤنا اور گندہ کردار چھپا ہے، کاش میں تمہیں بتا سکتی!" وہ اپنے سے بڑبڑائی اور جیتے ہوئے

دنوں کی پرچھائیاں آ آکر اُس کے سامنے آنکھ مچولی کھیلنے لگیں۔

وہ اُن دنوں ایم۔ اے فائنل میں تھی۔ آفتاب نیا نیا یونیورسٹی میں آیا تھا۔ وہ ریسرچ اسکالر تھا۔ لانبا چوڑا، چاق و چوبند، گندمی رنگ، چوڑی پیشانی پر اُلجھے اُلجھے سیاہ بال اور گہری گہری آنکھیں جن سے ہر وقت ذہانت جھلکتی رہتی۔ بے حد خوش مذاق اور خوش ذوق۔ جلد ہی وہ خاصہ مقبول ہوگیا۔

"واٹ اے چارمنگ پرسنلٹی"!! کتنے ہی لب لعلیں سے ایسے جملے پھسل جاتے اگنت۔ جلوے اُس کے لئے بیتاب ہوئے، کتنی نگہ سُرمگیں میں انتظار جاگا لیکن وہ سب سے بے نیاز و بے پرواہ اپنا زیادہ وقت لائبریری میں گذارتا رہا۔ ایک دن نسرین نے آفتاب سے اُس کا تعارف کرایا۔ پھر تو اکثر ملاقات ہوتی رہی اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ دونوں پہروں کسی موضوع پر بحث و مباحثہ کرتے رہے۔ نہ جانے کیوں روبی کو محسوس ہونے لگا کہ اُن گہری گہری آنکھوں میں کوئی مبہم سی تحریر اور کچھ بے نام سے پیغام ہیں اور وہ اُسے سمجھنے کی آرزو میں بے اختیار اُس سے قریب ہوتی گئی۔ اب تو دونوں کا زیادہ وقت ساتھ گذرنے لگا، کبھی لائبریری میں، کبھی کینٹین میں، کبھی کسی فنکشن میں اور کبھی سارے ہنگاموں سے دور کسی پُرسکون گوشے میں۔

اُن دنوں وہ بہت حسین خواب بُنا کرتی۔ ایسے میں قیوم کی نگاہوں کا لمس بھی اُسے بہت بُرا معلوم ہوتا۔ قیوم اُس کا خالہ زاد بھائی تھا۔ وہ اُسے شدت سے چاہتا تھا۔ اُس کے گھر والوں کی نظرِ انتخاب بھی قیوم ہی پر تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ کبھی اُس کے لئے اپنے دل میں کوئی کسک، کوئی تڑپ نہ محسوس کرسکی۔ ن کا دل اُس کیفیت سے ناآشنا تھا جسے محبت کہتے ہیں۔ ویسے اُسے قیوم سے نفرت بھی نہ تھی۔ نفرت تو کوئی بھی اپنے چاہنے والے سے نہیں کرپاتا۔ جہاں آفتاب نے ایک نامعلوم سا درد اُسے بخشا تھا وہاں قیوم کے لئے بیزاری کا جذبہ بھی عنایت کردیا۔ وہ بے اختیار تیزی سے اُس کی طرف بڑھتی جارہی تھی کہ ایکدم سے ٹھوکر لگی ـــــ سامنے پیڑ کے گھنے سائے میں آفتاب، یونیورسٹی کی سب سے بدنام لڑکی کاظمی کے ساتھ کھڑا تھا۔ آفتاب نے اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے رکھے تھے اور دونوں زور زور سے ہنس رہے تھے۔ روبی کی نگاہیں جھک گئیں۔ وہ دل میں غم و غصہ کا طوفان دبائے تیزی سے لائبریری کی طرف چلی گئی۔ پھر تو وہ اکثر آفتاب کو کتنی ہی لڑکیوں کے ساتھ دیکھتی اور ایک نئی لڑکی تو سایہ کی طرح ہر وقت اُس کے ساتھ ساتھ رہتی۔ پھر ایک دن نسرین نے ایسے ایسے واقعات سُنائے کہ وہ کانپ اُٹھی۔ یا خدا! اُس کی شخصیت کا بہروپ کیوں اس کی نگاہوں سے چھپا رہا۔ یہ بھی کتنی نادان تھی کہ سونا سمجھ کر تانبا ہاتھ میں رکھ دیئے اور روشنی کے دھوکے میں اندھیروں کی چاہ کر بیٹھی۔ اب وہ اُس کے سائے سے بھی کترانے لگی۔ ایک دن اچانک کینٹین پر اُس کا سامنا ہوگیا۔ آفتاب نے دھیرے سے سیٹی بجائی۔

"ہلو روبی.... آؤ" مُسکراتی ہوئی آنکھوں نے اُس کا جائزہ لیا۔

وہ مُنہ پھیر کر آگے بڑھ گئی۔ "اِن اداؤں سے مجھے نہیں رجھا سکتے" اُس نے دل میں کہا اور قدم تیز کردیئے۔ دل کی وہ دھرتی جہاں پیار کے نرم نرم شگوفے پھوٹے تھے، اب نفرت کے طوفانوں میں گھر گئی....

"روبی!.... روبی! کیا آج چائے بھی نہ ملے گی؟" اُس نے چونک کر دیکھا قیوم اُس کے پیچھے کھڑا مُسکرا رہا تھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ اچانک تمہارا موڈ کیوں بگڑ گیا.... کچھ تو ہے....؟"

"بھلا کسے پسند ہوگا کہ اُس کے شوہر کی ایسے گرے ہوئے لوگوں سے دوستی ہو؟"

"ہائے میرا معصوم دوست...." قیوم پر پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

"بس بس.... رہنے دیجئے یہ قصیدہ خوانی۔ اگر علم نہیں جناب کے کارناموں کا تو یونیورسٹی میں کسی سے بھی پوچھ کے دیکھئے۔"

اُس کا چہرہ غصّے سے اور سُرخ ہوگیا۔

"سچ روبی! تم غصّے میں اور زیادہ حسین ہوجاتی ہو۔ اچھا بھئی میں نے مان لیا وہ بُرا ہے، لوفر ہے۔ اب تو کل پرسوں تک وہ یہاں آہی رہا ہے۔ اُسی سے سُن لیں گے اُس کے کارنامے۔"

"کیا؟" روبی نے پلٹ کے قیوم کی طرف دیکھا۔ وہ اُسی طرح مسکرا رہا تھا۔

"کیا ملتا ہے مجھے ستانے میں!" وہ روہانسی ہوگئی۔

"سچ کہہ رہا ہوں۔ اگر یقین نہیں تو دیکھو یہ خط آج ہی تو آیا ہے۔"

اُس نے جیب سے خط نکال کر روبی کے ہاتھوں میں تھما دیا اور مجاز کا ایک شعر گنگناتے ہوئے "آکر پھر بزمِ یاراں" میں گم ہوگیا۔

روبی نے ایک اُچٹتی سی نگاہ خط پر ڈالی، جانی پہچانی سی تحریر تھی۔

".... میں امریکہ جارہا ہوں۔ اِسی ہفتے تم لوگوں سے ملنے آؤں گا لیکن یار! ڈر معلوم ہو رہا ہے کہیں اُترتے ہی مرمت نہ ہوجائے۔ اس لئے بہتر ہے روبی بھابی سے میری صلح صفائی کرادو۔ وہ دن یاد کرکے بے ساختہ ہنسی آتی ہے جب ایک مدت بعد اچانک تم سے ملاقات ہوگئی تھی۔ تم کیسی روتی صورت بنائے پریشان حال میرے آگے آگے چلے جارہے تھے۔ میں نے تو قسم

بڑھا کر تمہارے بیٹے پر ایک ہاتھ جڑ دیا۔ کیا آج پھر آفس میں کسی سے جھڑپ ہو گئی؟
میں نے پوچھا تھا اور تم نے بہت خوش ہو کر کہا نہیں یار! آج تو اپنی قسمت
ہی بدقسمتی ہوئی ہے اور تب مجھے معلوم ہوا کہ تمہاری قسمت بدلی ہے! اور
ہاں وہ رعونت تو ابھی تک ویسی ہی ہے جس کا تم نے وعدہ کیا تھا!
پلیز! اب تو بھابی سے کہہ دو وہ بیوی رشتی میں جو کچھ اُنھوں نے سُنا
اور دیکھا وہ سب صرف ایک ڈرامہ تھا ــــ اب میں اتنا بُرا بھی نہیں...؟
خط رُوبی کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا! اور بھری بھری
آنکھیں ایک دم چھلک پڑیں ــــ نہ جانے یہ آنسو کیسے تھے۔؟
خوشی کے، غم کے، محبت کے، یا ندامت کے؟!!

---

## غزل

### نسیم شاہجہانپوری

عشق میں خاموشیوں سے کام لینا چاہیے
آنکھوں آنکھوں میں ہر اک پیغام لینا چاہیے

جرأتِ بیباک سے اب کام لینا چاہیے
خود ہی بڑھ کر اُن کا دامن تھام لینا چاہیے

عشق میں رُسوائیاں بھی آبرو سے کم نہیں
اپنے سر خوش ہو کے ہر الزام لینا چاہیے

میکدے میں پاسِ خودداری ہے شرطِ اولیں
جب کوئی خود جام دے تب جام لینا چاہیے

انتقاماً بے رُخی بے وضعداری کے خلاف
بھولنے والے کا ہم کو نام لینا چاہیے

اُن کی محفل میں بیانِ درد و غم کے واسطے
کچھ زباں سے، کچھ نظر سے کام لینا چاہیے

وقت کے حالات کا اب یہ تقاضا ہے نسیم
آدمی کو مصلحت سے کام لینا چاہیے

## غزل

### عزیز وارثی

جب تک ہم اہلِ دل تھے شہیدِ نظر نہ تھے
غم ہائے روزگار غمِ معتبر نہ تھے

کس نے حریمِ ناز سے پردے اُٹھا دیئے
اتنے حسین و شوخ تو یہ بام و در نہ تھے

اے چارہ ساز اتنی ندامت ہے کس لئے
درمانِ طلب ہمارے ہی زخمِ جگر نہ تھے

ہم بھی حدودِ ہوش کے پابند کیوں رہیں
گمنام ہو گئے ہیں جو شوریدہ سر نہ تھے

مرنا ہمارا آج کوئی سانحہ نہیں
دستورِ بزمِ حسن سے ہم بے خبر نہ تھے

میں نے ہی خودکشی کا بھی اقرار کر لیا
الزام کیسے کیسے بھلا آپ پر نہ تھے

شعر و شراب و حسن کی محفل میں تم عزیز
بدنام تھے ضرور مگر اس قدر نہ تھے

# زندہ لاش

ش۔ نذیر الدین

معرفت غوث محی الدین صاحب، مکان نمبر 39/3، طیب لینڈ روڈ ۲ جبلی (ضلع دھارواڑ)

محترم بھائی آداب و نیاز

ایک مدت کے بعد یہ کہانی "زندہ لاش" ارسال کر رہا ہوں۔ میں نے اس کہانی کو بیسویں صدی کے معیار و مزاج کے مطابق ڈھالنے کی پوری کوشش کی ہے۔ یہ فیصلہ تو آپ کو اور قارئین بیسویں صدی کو کرنا ہے کہ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ کہانی آپ کو اور قارئین کو پسند آگئی تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی ۔ ۔ ۔

خیر اندیش ——— ش۔ نذیر الدین

وہ پوسٹ مارٹم روم کے برآمدے میں بنی بنچ کے گوشے پر سر جھکائے گم صم سی بیٹھی تھی۔ پوسٹ مارٹم روم کی طرف بڑھتے ہوئے جب میں اُسے دیکھ کر اس کے سامنے رکا تو اس نے اپنا چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اُس لمحہ اس کی خاموش آنکھوں میں غم اور جذبات کے دھارے تڑپ اُٹھے، لب کپکپائے اور آنسوؤں کے چند قطرے پلکوں کے گوشوں پر تھرتھرا کر بہہ نکلے۔ زندگی میں پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ کچھ دیر یہاں اور رکا تو میں اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکوں گا اور میرے بھی آنسو نکل پڑیں گے۔ میں نے جلدی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس سے کچھ کہے بغیر آگے بڑھ کر پوسٹ مارٹم روم میں داخل ہو گیا۔ سامنے سیمنٹ کے لمبے چبوترے پر اس کے بیٹے کی برہنہ لاش پڑی تھی۔ جس کا پوسٹ مارٹم کرنا تھا۔

میں یہاں کی میڈیکل کالج کے پوسٹ مارٹم سیکشن پر تعینات ہوں۔ میرے پاس پوسٹ مارٹم کے لئے تین طرح کی لاشیں آتی ہیں۔ ایک مرڈر کیس، دوسرا سوسائیڈ (Suicide) کیس اور تیسرا ایکسیڈنٹ کیس۔ اپنی اس پندرہ سالہ سروس میں، میں نے سینکڑوں لاشیں چیر پھاڑ کر رکھ دی ہیں۔ اپنے اس پیشہ کی وجہ سے لوگ مجھے پتھر دل، بے رحم اور جلاد کے القاب سے نوازتے ہیں اور یہ بالکل سچ بھی ہے۔ کیونکہ انسانی فطرت پر ماحول کے ساتھ ہی ساتھ اس کے پیشے کا بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑتا ہے۔ جب میں کسی پوسٹ مارٹم کرتا ہوں تو انسانی لاش کو ایک قصائی کی طرح تھوڑی ہی دیر میں کاٹ چھانٹ کر چیر دیتا ہوں۔ اس وقت میرے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ہوتا۔ میرے دل میں کسی بھی طرح کا جذبہ نہیں ہوتا۔ میں ایک قصائی کی طرح لاش کو اُدھیڑتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی میرے اپنے گرد کھڑے ہوئے میڈیکل اسٹوڈنٹس کو انسانی اعضاء اور پوسٹ مارٹم کے طور طریقے سے متعلق لیکچر بھی دیتا رہتا ہوں۔ چنانچہ کمرے کے باہر لاش کے عزیزوں کی آہ و زاری، ان کی چیخ و پکار اور ان کے بہتے ہوئے آنسو مجھ پر کچھ بھی اثر نہیں کرتے ۔ ۔ ۔ لیکن آج زندگی میں پہلی بار انجنا کے آنسو دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ ویسے عورت کے آنسو مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہوتے ہیں۔ لیکن مجھ جیسے سخت دل انسان کے آگے عورت کے آنسوؤں کی کچھ وقعت نہیں ہے۔ میرا دل تو ان واقعات سے متاثر ہوا ہے۔ جو اس حادثے سے متعلق کہانی سے تعلق رکھتے ہیں۔

انجنا کو میں تین سال سے جانتا ہوں۔ تین سال پہلے اُس نے یہاں میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تھا۔ وہ یہیں گرلز ہاسٹل میں رہتی ہے۔ وہ میری اسٹوڈنٹ ہے اور بہت ہی ذہین اور حسین ہے۔ ایک سال پہلے وہ بہت ہی ماڈرن اور فارورڈ تھی۔ ویسے آجکل کی لڑکیوں کے متعلق لفظ ماڈرن اور فارورڈ کہنا بے جا ہے کیونکہ یہاں کی ساری تہذیب ہی مغربی رنگ میں رنگ گئی ہے۔ جب ساری تہذیب ہی ماڈرن ہو تو پھر کسی ایک کو ماڈرن کہنا درست نہیں۔ لیکن میں انجنا کو ماڈرن ہی کہوں گا کیونکہ کالج کی ساری لڑکیوں میں وہ بہت فارورڈ تھی۔ دُبلی پتلی سی یہ نازک اندام لڑکی نت نئے فیشن اپنانے میں ماہر تھی۔ وہ اپنی لانبی لانبی سیاہ زلفوں کو لپیٹ لپیٹ کر طرح طرح کے ڈیزائن بناتی، اپنے بدن کو سڈول اور جاذبِ نظر ظاہر کرنے کے لئے

# نازونیاز

ہم نشین پوچھ نہ اُس بزم کی کیفیتِ ناز
دیکھ کر آیا ہوں بندے کا خدا ہو جانا ——— سیماب (؟)

اے جذبِ عشق دیکھ یہ ہوتا ہے نازِ حسن
یوں آ گئے ہیں وہ جیسے ارادہ کئے بغیر ——— نامعلوم

نیازِ عشق پہ تھی منحصر نوازشِ حسن
وہ بندگی نہ رہی بندہ پروری نہ رہی ——— نامعلوم

وہ کیوں نہ اپنی فقیری پہ فخر و ناز کرے
وہ بے نیاز جسے سب سے بے نیاز کرے ——— یاس

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
نیازِ عشق کے بدلے نہ لوں نازِ خداوندی ——— اقبال

مرسلہ:- ایس۔ ایس۔ جنگالی، ایم۔ اے۔ آگرہ

چست سے چست لباس زیبِ تن کرتی۔ کالج کے رنگین مزاج طلباء ہمیشہ اُس کے گرد منڈلاتے رہتے۔ لیکن وہ کسی کو لفٹ نہ دیتی تھی۔ کالج کے احاطے میں ہمیشہ اُس کے حسن اور اُس کی فیشن پرستی کے چرچے ہوا کرتے تھے۔ کالج کے فنکشن میں وہ سب سے زیادہ سرگرمی سے حصہ لیتی تھی۔ اُس کی طبیعت ایک ایسی الہڑ ندی کی سی تھی جو پہاڑیوں کے درمیان سے اچھلتی کودتی، گنگناتی ہوئی بہتی رہتی ہے۔ لیکن ایک سال بعد اچانک اُس کی طبیعت میں انقلاب آگیا۔ اُس دن میں پہلی بار اُسے ہندوستانی لباس میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وائٹ کلر کی ساری میں وہ کچھ دھلی دھلی سی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کا حسن اس نئے روپ میں کچھ اور نکھر آیا تھا۔ اب وہ ایک الہڑ ندی کی بجائے ایک پُرسکون جھیل کی طرح نظر آتی تھی۔ اُس کے اس نئے روپ کو دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ اس انقلاب کے پیچھے کوئی راز ضرور ہے۔ میری متجسس طبیعت نے اس راز کو جاننے کی بہت کوشش کی۔ مگر کچھ دنوں تک مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن چند ہی دنوں بعد یہاں کالج کے احاطے میں پھر سرگوشیاں ہونے لگیں کہ انجنا آجکل گرلز ہاسٹل کے پہرے دار دھن بہادر سے رومان لڑا رہی ہے اور اسی لئے وہ اپنے آپ کو اپنے محبوب کے مزاج کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جتنے منہ تھے اُتنی ہی باتیں تھیں۔ میں نے اُسے طلباء کا اسکینڈل سمجھ کر اس طرف زیادہ دھیان نہ دیا۔

ایک دن میں اپنے آفس روم میں بیٹھا ایک ایکسیڈنٹ کیس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ تیار کر رہا تھا کہ گرلز ہاسٹل کا پہرے دار دھن بہادر مجھ سے اجازت لے کر اندر آگیا۔ یہ پہرے دار ایک گورکھا تھا۔ میں اس کے متعلق اتنا جانتا تھا کہ وہ ۵ یا ۶ سال پہلے نیپال میں تھا۔ اب یہاں پہرے دار کی نوکری کر رہا ہے۔ گورا سا، لمبا اونچا یہ نوجوان گورکھا بہت ایماندار تھا۔ اپنی ڈیوٹی بہت ہی خوش اسلوبی سے انجام دیتا تھا۔ میری ہی سفارش پر اُسے یہ نوکری ملی تھی۔ اسی لئے وہ میری بہت عزت کرتا تھا ——— وہ اندر آکر خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت پریشان پریشان سا معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے بہادر! تم کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہو؟"

"ہاں، ڈاکٹر صاحب۔ آج کل میں بہت پریشان ہوں۔"

"کیوں؟"

"وہ لڑکی . . ." وہ ہکلانے لگا۔

"کون لڑکی؟"

اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "انجنا!"

انجنا کے نام پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے پوچھا "کیا شکایت ہے تمھیں اُس سے؟"

"وہ لڑکی مجھے بہت پریشان کرتی ہے ڈاکٹر صاحب۔ وہ کہتی ہے کہ . . . وہ مجھ سے پیار کرتی ہے۔ اس لئے مجھی سے بیاہ کرے گی۔ ہر روز صبح شام وہ مجھ سے یہی کہتی رہتی ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میری پریشانی آپ ہی دور کر سکتے ہیں۔ آپ اُسے سمجھائیے صاحب ورنہ وہ مجھے پاگل کر دے گی . . . مجھے عورت نہیں چاہئے۔ کیونکہ مجھے عورت سے نفرت ہے"! ——— اتنا کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ کچھ دیر تک میں مبہوت سا بیٹھا رہا۔ یہ لڑکی مجھے کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی تھی۔ بھلا اُس کا اور اس غریب گورکھے کا کیا میل؟ کیا جوڑ۔ پتہ نہیں وہ اس غریب کے جذبات سے کیوں کھیلنا چاہتی ہے؟

میں نے چپراسی کے ذریعہ انجنا کو بلا بھیجا۔ کچھ دیر بعد وہ آگئی۔ میں نے اشارے سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔

"ابھی کچھ دیر ہوئی تمھارے ہاسٹل کا پہرے دار بہادر یہاں آیا تھا۔ اُس نے تمھارے بارے میں مجھ سے بہت کچھ کہا ——— کیا وہ سچ کہتا ہے؟" اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر سر جھکا لیا۔

"ہاں۔"

"اس طرح اُس بیچارے کو پریشان کرنے سے تمھیں کیا ملتا ہے؟" اُس نے

نگاہیں اُٹھاکر میری طرف دیکھا۔

"میں نے اُسے پریشان نہیں کیا، صرف اپنے دل کی بات بتادی۔" اس کے اس جواب پر مجھے غصہ آگیا۔ میں نے برہم ہوتے ہوئے کہا۔

"تم میں اور اس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ ایک نیک اور غریب انسان ہے۔ کسی غریب کے جذبات سے کھیلنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے!" وہ مسکرا پڑی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن میں اُسے اپنانا چاہتی ہوں۔ اُسے آدمی بنانا چاہتی ہوں۔ اُسے عورت سے سخت نفرت ہے۔ میں اُسے بتانا چاہتی ہوں کہ عورت کیا ہے؟ میں آپ کو پوری کہانی سُناؤں گی۔ ورنہ آپ کچھ بھی نہ سمجھ پائیں گے۔" وہ ایک لمحہ کے لئے رُکی پھر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا: "آپ مصروف تو نہیں ہیں نا؟"

"نہیں تم اطمینان سے کہو۔" وہ کہنے لگی۔

"میرے پاس بے شمار دولت ہے۔ میں روپیہ کمانے کے لئے ڈاکٹر بننا نہیں چاہتی۔ میرے پتا ایک بزنس مین ہیں۔ اُن کا بیشتر وقت نیپال میں گزرتا ہے۔ ڈاکٹری کرنے کے بعد میرا ارادہ بھی نیپال جانے کا تھا۔ اس لئے میں چاہتی تھی کہ وہاں جانے سے پہلے نیپالی زبان سیکھ لوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ دھن بہادر پڑھا لکھا ہے۔ اس لئے ایک دن میں نے دھن بہادر سے نیپالی زبان سیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے نفرت سے مُنہ موڑ لیا اور کہا اگر یہی خواہش کوئی مرد بیان کرتا تو وہ بہ خوشی اسے قبول کر لیتا۔ لیکن ایک عورت کے لئے وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے پوچھا کیوں؟ تو اس نے کہا کہ اُسے عورت سے سخت نفرت ہے۔ وہ اس کے سائے سے بھی دُور رہنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ بات سُن کر میں اس کے پاس سے چلی آئی۔ لیکن اُس کی یہ بات ہمیشہ میرے دل میں کھٹکتی رہی۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ عورت سے اتنی نفرت کرنے کا سبب کیا ہے؟ میں ہر روز رات کو اُسے ہاسٹل کے برآمدے میں بیٹھے اپنی ڈائری لکھتے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔ ایک دن میں نے موقع پاکر اس کی ڈائری اُڑا لی۔ . . ڈائری کے ذریعہ مجھے اس کی پچھلی زندگی معلوم ہوئی۔ ڈائری انگریزی میں لکھی ہوئی تھی۔ وہ تعلیم یافتہ ہے اور پانچ سال پہلے نیپال میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اس کا بچپن بہت ہی دُکھ میں بیتا کیونکہ وہ اپنی ماں کے گناہ کی نشانی تھا۔ اس کی ماں اسے جنم دیتے ہی مر گئی تھی۔ اسے اس کے عزیزوں نے پالا۔ بچپن سے جوانی تک وہ لوگوں کے طعنے سُنتا رہا۔ جب جوان ہوا تو اسے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی۔ اس نے اس لڑکی سے شادی کر لی۔ اس کی بیوی بہت ہی خوبصورت تھی۔ وہ اپنی بیوی کو بے انتہا چاہتا تھا۔ لیکن شادی کے کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ اس کی بیوی آوارہ ہے۔ وہ کسی غیر مرد سے بھی ملتی رہتی ہے۔ ایک دن اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی بیوی کو اس غیر مرد کے پاس

# تمنّا

جو تمنّا دل میں تھی وہ دل میں گھٹ کر رہ گئی
اُس نے پوچھا بھی نہیں ہم نے بتایا بھی نہیں ——— سراج لکھنوی

مایوسِ آرزو بھی ہوں مانوسِ یاس بھی
دل میں جگہ نہیں ہے تمنّا کے واسطے ——— محمود رجوہ

تمنّائے دل کے لئے جان دی
سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے ——— میر تقی میر

کیا خبر تھی کہ کبھی تیری تمنّا اے دوست
اشک بن کر مری پلکوں پہ اُبھر آئے گی ——— کیفی

گذر رہی ہے وہ اب موت کی تمنّا میں
جو زندگی تھی کسی دن تری تمنّائی ——— محمود سیدلوی

مُرسلہ :۔ شاہد ہاشمی، ہزاری باغ (بہار)

دیکھ لیا۔ اس کا خون کھول اُٹھا اور عورت کی اس بے وفائی نے اسے قاتل بنا دیا! وہ —— وہ اپنی بیوی کا قتل کرنے کے بعد قانون کی نگاہوں سے بچ کر وہاں سے بھاگ نکلا اور اب وہ یہاں گرلز ہاسٹل کا پہرے دار بنا ہوا ہے ——— اسے دُنیا کی ساری عورتوں سے نفرت ہوگئی ہے۔ وہ اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ اگر میرا بس چلے تو میں دُنیا کی ساری عورتوں کا قتلِ عام شروع کر دوں! میری ماں نے مجھے جنم دیا لیکن میں اس کے گناہ کی نشانی ہوں۔ وہ اگر زندہ ہوتی تو میں اُسے بھی قتل کر دیتا . . ."

اتنا کہہ کر انجنا خاموش ہوگئی۔ کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہی پھر اس نے نگاہیں اُٹھاکر میری طرف دیکھا۔

"اس نے صرف ایک عورت دیکھی اور اس کی بے وفائی سے عورت کی ذات ہی سے متنفر ہوگیا۔ اس نے شوہر کی چتا پر ستی ہوتی ہوئی عورتوں کو نہیں دیکھا۔ اس کے ان خیالوں سے میری انا کو ٹھیس پہنچی۔ اس میں اس بے چارے کا قصور بھی نہیں ہے۔ حالات نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ وہ نیم پاگل سا ہوگیا ہے۔ میں اسے آدمی بنانا چاہتی ہوں۔ میں اسے دکھانا چاہتی ہوں کہ عورت کیا ہے اور اس کی وفا کیسی ہوتی ہے۔ دُنیا کا کوئی ماہرِ نفسیات اس نیم پاگل کا علاج نہیں کر سکتا سوائے عورت کے! اور . . . میں ایک عورت ہوں!"

وہ جا چکی تھی۔ لیکن اس کے الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔

مصمم ارادہ کر لیتی ہے تو اس کے ارادے کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں بدل سکتی۔
بہادر کر چکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ بہادر کے دل سے نفرت کے اس جذبہ
پھینک دے گی۔

اس کے بعد ایک ماہ تک مجھے انجنا اور بہادر کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔
ایک روز کی چھٹی پر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پہاڑ پر چلا گیا تھا۔ کل رات
آیا اور آج صبح ڈیوٹی پر حاضر ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ کل رات بہادر نے خودکشی
کر کے میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ پولیس انسپکٹر شرما نے مجھے بہادر کا وہ خط بھی
جو اس نے مرنے سے پہلے لکھا تھا۔ اس نے خط میں لکھا تھا۔

"میری موت کا کوئی ذمہ دار نہیں۔ میں اپنی مرضی سے مر رہا ہوں۔
ایک قاتل تھا۔ میرے گناہ کی سزا مجھے قانون تو نہ دے سکا لیکن قدرت
مجھے اس کی بہت بڑی سزا دے دی۔ مجھے عورت سے سخت نفرت تھی۔
مرنے سے پہلے میرے دل میں عورت کے لئے بے انتہا پیار ہے۔ میں اپنا
سارا پیار انجنا کو دیتا ہوں کیونکہ یہی وہ عورت ہے جس نے نفرت کے
جذبے کو میرے دل سے نکال پھینکا۔ وہ مجھے اپنانا چاہتی تھی۔ لیکن میں
آپ کو اس کے قابل نہیں سمجھتا اس لئے میں نے موت کو آواز دی۔ میرا
اپنا یہاں انجنا کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس لئے میری لاش کو انجنا کے حوالے
کر دیا جائے۔۔؟"

میں دھن بہادر کی لاش کا پوسٹ مارٹم کر چکا ہوں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ فارم
کے تمام کالم میں نے بھر دیئے ہیں صرف Cause of Death کا ایک کالم باقی رہ
گیا ہے۔ پوسٹ مارٹم کی جانچ کے مطابق مجھے اس کالم میں صرف یہ لکھنا ہے کہ اس کی
موت دم گھٹنے کی وجہ سے ہوئی ہے ——— لیکن کچھ موتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں
انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ ایک زندہ لاش کی طرح! اس کی ایک کی موت
تو اسی وقت ہو گئی تھی جب اس نے اپنی بیوی کی بے وفائی پر اسے قتل کیا تھا اور یہ
لڑکی انجنا جو باہر برآمدے میں بیٹھی اس کی ڈیڈ باڈی (Dead Body) کا
انتظار کر رہی ہے یہ بھی تو مر چکی ہے! یہ بھی تو زندہ لاش ہے!!

---



---

## مسعودی حیات ایم اے بی ٹی

اُن کی نگاہِ ناز میں رنگِ کشیدگی تو ہے　　گر نہیں ہم سے دوستی شکوۂ دوستی تو ہے

عیش و خوشی نصیب میں گر نہیں عشق کے تو کیا　　رنج و الم سے کھیلنا شیوۂ عاشقی تو ہے

وقت کے ہاتھوں بجھ گیا دل کی خوشی کا ہر چراغ　　پھر بھی ترے خیال کی رُوح میں روشنی تو ہے

ترکِ وفا کا ہو خیال اہلِ وفا کو کس لئے　　اُس نے جفا کے روپ میں داد وفا کی دی تو ہے

فصلِ بہار میں بھی کیوں غنچہ و گُل ہیں مضمحل　　تیرے چمن میں باغباں! آج بھی کچھ کمی تو ہے

زیست کے ہر فریب کو کیوں نہ گلے لگائیں ہم　　حاصلِ بزمِ کائنات اک یہی زندگی تو ہے

چشمِ چمن پرست ہی وا نہ رہی کوئی حیاتؔ
کلیوں میں تازگی تو ہے پھولوں میں دلکشی تو ہے

## ایاز جھانسوی

عجیب حادثہ گزرا یہ ہوش میں آ کر　　ہم اپنے آپ سے روٹھے رہے تجھے پا کر

خوشی سے دور ہی رہنے دو میرے ہر غم کو　　اندھیرے اور نہ بڑھ جائیں روشنی پا کر

مزاج اِن دنوں رسماً بھی پوچھ لیتے ہیں　　مزاج پوچھنے والوں سے کچھ نہ پوچھا کر

کچھ ایسا گُم ہوں کہ اپنا پتہ نہیں ملتا　　خدا کرے مجھے پہچان لے کوئی آ کر

میں زندگی سے کوئی عہد کرنے والا تھا　　یہ کس خیال نے چونکا دیا مجھے آ کر

ایازؔ کہہ تو دیا غم سدا نہیں رہتے
بُرا نہ مان اکیلے میں کچھ نہ سوچا کر

## خزاں چند تبسم

وہی حسرتیں، وہی رنج و غم، وہی بے کسی کا مُعاملہ　　اُسی مرحلے پہ ہے آج بھی مری زندگی کا مُعاملہ

تُو وفا کرے کہ جفا کرے مگر اک نظر کبھی دیکھ لے　　تری اِک نظر پہ ہے منحصر مری زندگی کا مُعاملہ

ترا دم بھرے بھی تو کیا بھرے، تری کس ادا پہ کوئی مرے　　کبھی دوستی کا معاملہ، کبھی دشمنی کا مُعاملہ

تجھے شوق جور و جفا کا ہے، مجھے پاس عہدِ وفا کا ہے　　وہ تری خوشی کا معاملہ، یہ مری خوشی کا مُعاملہ

نہیں اس سخن میں کلام کچھ، مری ہر غزل ہے ترا بیاں　　مرے شعر شعر میں لطف ہے ترے حُسن ہی کا مُعاملہ

تجھے آپ اپنی خبر نہیں، ترا علم بھی ہے تو نارسا
مگر اے تبسمؔ تلاشِ حق ہے خود آگہی کا معاملہ

# ایک ہی بات

مس عابدہ بشیر روحی

معرفت محمد یاور الدین مکان نمبر ۱۰، رنگ محل حیدرآباد اے۔ پی

محترم بھائی جان! تسلیمات عقیدت

اپنا ایک تازہ افسانہ "ایک ہی بات" ارسال کر رہی ہوں۔ خدا کرے پسند آجائے ——— "سہرے کے پھول" کی پسندیدگی کے بارے میں مجھے قارئین کے بے شمار خطوط مل رہے ہیں۔ میں انہیں فرداً فرداً جواب نہیں دے سکتی۔ اس لئے "بیسویں صدی" کے حسن توسط سے ان تمام کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔

آپ کی دعا کی طلبگار آپ کی بھتیجی ——— عابدہ بشیر روحی

افروز اس فرم کے آفس میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتی تھی سیدھی سادی خاموش طبع سی لڑکی ——— اپنی اسی لئے وہ ابھی تک سب سے الگ تھلگ رہنے میں کامیاب رہی تھی۔ تھی تو جوان خوبصورت۔ گورا گورا رنگ، سیاہ چمکیلے بال، اوسط قد و قامت، گداز اور بھرا بھرا سا جسم۔ لیکن کبھی میک اپ نہیں کیا تھا، کوئی ریشمی باریک لباس نہیں پہنا تھا اور نہ شوخ رنگ استعمال کئے تھے۔ آفس کے نوجوان مرد ساتھیوں نے شاید اسی لئے کبھی اُسے خصوصیت سے دیکھنے کی زحمت ہی نہ کی تھی، کیونکہ وہ آفس کی دوسری لڑکیوں کی طرح شوخ طبع نہ تھی۔ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی کے پیچھے بھلا کون اپنا وقت ضائع کرے گا۔

ادھیڑ عمر کے رحمٰن صاحب البتہ اپنی سنجیدہ شخصیت کے باوجود افروز کو دیکھ کر کھو جاتے۔ ان کی تجربہ کار نگاہیں جیسے افروز کی حقیقت کو پا گئی تھیں۔ وہ اُس کے باس تھے اُنہوں نے ابھی تک شادی نہ کی تھی فرم کی اُس وسیع بلڈنگ میں چار برانچیں تھیں۔ ہر برانچ کا ایک منیجر تھا۔ رحمٰن صاحب پرچیز ( Purchase ) برانچ کے منیجر تھے۔ افروز اُن کی شخصیت سے صرف اس حد تک متاثر تھی کہ وہ اُس کے باس تھے۔ سنجیدہ طبیعت اور ہمدرد آدمی تھے اور وہ ان کا بہت احترام کرتی تھی۔ بس اس سے آگے وہ کچھ نہ جانتی تھی۔

---

دوپہر کا وقت تھا افروز نے محسوس کیا کہ اُس کی میز کے آگے کوئی کھڑا ہے۔

اُس نے اپنی نگاہیں اُٹھا کر دیکھا اور کچھ دیر تک دیکھتی رہ گئی۔ وہ ایک اجنبی نوجوان تھا خوب رُو، پُرکشش شخصیت، دُبلا پتلا سا، افروز کو نہ جانے کیوں، وہ بھلا معلوم ہوا۔ سفید ٹیری لین شرٹ اور سیاہ پتلون میں وہ بہت ہی اسمارٹ معلوم ہو رہا تھا۔ چہرے پر دل موہ لینے والی مُسکراہٹ تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"سُنا ہے آپ ہی پرچیز پالیسی ڈیل کر رہی ہیں۔"

افروز جو چند لمحات تک گم سی ہو گئی تھی۔ اچانک ہی سنبھل بھی گئی۔ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

"میں.... آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"مجھے اس کی دس کاپیاں چاہئیں۔ کیا آپ عنایت کر سکتی ہیں؟"

"وہ آج شام تک پرنٹ ہو کر آجائیں گی۔ آپ کل کسی وقت لے لیجئے۔"

"تھینک یُو۔ میں کل اسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔"

وہ جانے لگا تو افروز دُور تک اُسے دیکھتی رہی۔ وہ نوجوان افروز کو پہلی ہی نظر میں بہت متاثر کر گیا تھا۔ اُس کے دل میں پہلے ایک سوال اُبھرا ——— وہ کیوں اتنی متاثر ہو گئی تھی؟ اُس کی نظروں نے تو آج تک کتنے ہی خوب رُو، خوش شکل نوجوان دیکھے تھے۔ لیکن وہ اس طرح کبھی خیالوں میں نہ کھوئی تھی اور آج ایسا کیوں ہوا تھا؟ افروز کے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا۔

دوسرے دن افروز بے چینی سے دوپہر کا انتظار کر رہی تھی۔ بار بار

اُس کی نظریں آفس لابی کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اُس نوجوان کا انتظار کر رہی تھی۔ کل اُس نے کہا تھا وہ آج اِسی وقت آئے گا۔ یعنی ٹھیک ڈھائی بجے۔ پتہ نہیں یہ ڈھائی کب بجیں گے؟ انٹرکوم کا بزر (Buzzer) گنگنانے لگا۔ رحمٰن صاحب کہہ رہے تھے۔

"مس افروز! ٹنڈر کے کاغذات بھیج دیجئے۔"

"جی ڈھائی بجنے میں کافی وقت ہے۔" اُس کے منہ سے نکل گیا۔

"کیا ــــــ ٹنڈر کے کاغذات سے ڈھائی بجے کا کیا تعلق ہے؟"

"اوہ! معاف کیجئے جناب! نہ جانے میں کیا سوچ رہی تھی۔ معافی چاہتی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ اگر طبیعت ٹھیک نہ ہو تو تم گھر چلی جاؤ۔"

"جی نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

افروز پسینہ پسینہ ہوگئی تھی۔ وہ اپنی اِس کیفیت پر شرمندہ بھی تھی۔ اُس نے ٹنڈر کے کاغذات فوراً ہی اندر بھیج دئے۔ لیکن اُس کے بعد بھی وہ کسی کام کی طرف متوجہ نہ ہوسکی اور ڈھائی بجے تک اُس کا یہی حال رہا۔ وہ نوجوان ٹھیک ڈھائی بجے اُس کی میز کے سامنے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ٹھیک وقت پر پہنچنے کے لئے کہیں آس پاس ہی وقت گذار رہا تھا اور پھر ڈھائی بجنے کے ساتھ ہی آموجود ہوا تھا۔

"تشریف رکھئے" وہ اُس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

افروز اُس سے نگاہیں ملانے میں کچھ دُشواری سی محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے جان بوجھ کر دیر کی تاکہ وہ کچھ دیر اور بیٹھا رہے اور پھر اِس طرح کاغذات نکال کر دئے جیسے وہ اُنہیں رکھ کر کہیں بھول گئی تھی۔

"شکریہ! آپ کو بہت زحمت ہوئی۔"

"کوئی بات نہیں۔"

رحمٰن صاحب خلافِ معمول اُسی وقت اپنے آفس سے اُٹھ کر اُس کی میز کے آگے سے نکلتے چلے گئے۔ افروز کو شک ہوا کہیں رحمٰن صاحب جان بوجھ کر تو باہر نہیں نکلے تھے۔ لیکن افروز نے زیادہ نہیں سوچا۔ اِس لئے کہ رحمٰن صاحب رُکے بغیر چلے گئے تھے اور پھر واپس آفس نہیں آئے تھے۔ اُس نوجوان کے جانے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک خیالوں میں کھوئی رہی تھی۔ اُس کا جی چاہتا تھا وہ کچھ دیر اور بیٹھا رہتا۔ لیکن کوئی وجہ بھی تو نہ تھی۔

پھر افروز دو ہی دن میں بدل چکی تھی۔ اُس کا بھی جی چاہا سنگھار کرے، رنگین لباس زیبِ تن کرے اور اُس نے اب اپنی ہر شے بدل دی اور جب اُس نے آفس جاتے ہوئے خود کو آئینے میں دیکھا تو پہچان ہی نہ سکی۔ اِس میں ایک اب شگفتہ ہوئی سی افروز تھی۔ کنول کے پھول کی طرح کھلی کھلی سی تھی۔ شبنم کے موتی سے نکھر گئی تھی اور پھر اُس کا یہ نکھار سب سے پہلے اُسی نوجوان نے دیکھا تھا۔ لفٹ میں وہ اُس سے پہلے موجود تھا۔ افروز حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔ وہ اُسے دیکھ کر مُسکرا دیا تھا۔

"ہیلو" افروز نے بھی ہیلو کہا تھا۔

لفٹ میں وہ دونوں ہی موجود تھے۔ دونوں کی منزل بھی ایک ثابت ہوئی نور تھ فلور۔ افروز کو حیرت تھی اِس اتفاق پر! افروز نے سوچا شاید وہ کسی موڑ پر جُدا ہو جائیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ اُس کے ساتھ ہی آرہا تھا۔ افروز گھبرانے لگی تھی۔ آج ہی تو اُس نے خود کو نکھارا تھا اور آج ہی وہ اُس کے ساتھ نہایت بے تکلفی سے چل رہا تھا۔ افروز نے چاہا اُسے منع کر دے۔ لیکن وہ منع نہ کر سکی۔ وہ اُس کے میز تک ساتھ ہی آیا۔ آفس کے دوسرے لوگ حیرت سے افروز کی نئی شخصیت کو دم بخود ہو کر دیکھ رہے تھے۔ وہ سیدھی اپنی میز پر چلی آئی تھی۔ یہاں سے وہ نوجوان منیجر کے روم میں داخل ہو گیا تھا۔ افروز جس کے بدن میں اندر ہی اندر پسینہ پھوٹ رہا تھا، نوجوان کے جانے کے بعد اُس نے کچھ اطمینان کی سانس لی۔ لیکن آفس کے دوسرے تمام کلرکوں کی ہوسناک نگاہیں اُس کے جسم کو چھید رہی تھیں۔ اِس لئے کہ وہ اچانک بدل گئی تھی۔

انٹرکوم کے بزر (Buzzer) نے اُس کی توجہ اپنی طرف کرلی۔ دوسری طرف سے رحمٰن صاحب کہہ رہے تھے۔

"کیا تم ایک منٹ کے لئے میرے آفس میں آسکتی ہو؟"

"بہتر ہے۔"

وہ ہمیشہ اُسے اِنہی الفاظ میں بلایا کرتے تھے۔ لیکن آج وہ جاتے ہوئے کچھ جھجک رہی تھی۔ اِس لئے کہ وہ آج خود بھی اپنی حیرت انگیز تبدیلی پر حجاب کر رہی تھی۔ اِس کے علاوہ وہ نوجوان رحمٰن صاحب کے کمرے میں موجود ہوگا۔ وہ ڈر رہی تھی۔ پتہ نہیں رحمٰن صاحب کیا ریمارک پاس کردیں یا اُس نوجوان کی موجودگی میں خود اِس سے کوئی ایسی حرکت ہو جائے جو شک کا باعث ہو۔ اِنہی خیالوں میں وہ کمرے میں داخل ہوگئی۔ رحمٰن صاحب مُسکرا رہے تھے۔ اچانک افروز کا سراپا دیکھ کر مُسکرانا بھول گئے۔ ان کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی لیکن تبسم غائب ہوگیا تھا۔ انسان تھے بہت ذہین۔ فوراً ہی سنبھل بھی گئے اور مُسکراہٹ کو وسیع کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

"آؤ مس افروز! میں تمہیں اُن سے ملانا چاہتا تھا۔ یہ آج ہی سے ہمارے بیڈ آفس میں کام کریں گے۔ میں نے افروز ان کے یہاں تبادلہ کے لئے جنرل مینجر سے کہا تھا۔ آپ مسٹر شجاع ہیں، اور یہ ہیں مس افروز!"

شجاع مسکرا کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو وش کیا۔ پھر رحمٰن صاحب نے افروز سے کہا کہ وہ شجاع کو اُس کا نیا کام سمجھا دے۔

اِس طرح افروز کی وہ خواہش پوری ہو گئی تھی اور شجاع کا تمام تر وقت اُس کے ساتھ گذر رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ بات بھی مشہور ہوتی گئی کہ شجاع اور افروز ایک دوسرے سے گہری محبت کرتے ہیں! یہ حقیقت بھی تھی۔ شجاع کی شخصیت محبت کے مراحل طے کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوئی تھی۔ افروز جس کی آواز کل تک اُس کے ساتھی کلرک سُننے کے لئے ترستے تھے اب اُس کے کھنکتے قہقہے سُن لیتے تھے۔ افروز اب زندگی کے پیچھے دوڑ رہی تھی، وہی افروز جو کل تک زندگی سے اُکتائے ہوئے انداز میں نباہ کرتی تھی۔

---

شجاع افروز کی خوبصورت آنکھوں کی راہ سے اُس کے دل میں سما گیا تھا۔ افروز اب ایک نئی زندگی کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ شجاع اور وہ ہر تعطیل کو ایک ساتھ گھومتے اور تفریح کرتے تھے۔ افروز اِن ملاقاتوں میں آئندہ زندگی کی باتیں کرتی شجاع کھو جاتا اور افروز کو جھنجھلانا پڑتا۔

افروز ایک دن بہت بے چین ہوئی جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ شجاع فرم کی طرف سے دوسرے شہر ٹور پر جا رہا ہے۔ اُسے نہ جانے کیوں ڈر سا محسوس ہونے لگا۔ اِس پر شجاع نے ہنس کر کہا تھا۔

"ارے بھئی میں ٹور ہی پر جا رہا ہوں اور آٹھ ہی دن کی بات ہے۔"

"میرا دل گھبرا رہا ہے۔ نہ جانے کیوں!"

"دل کا تو کام ہے گھبراتے رہنا، دھڑکتے رہنا۔ اگر یہ سب نہ ہو گا تو زندگی میں باقی کیا رہے گا؟"

شجاع نے ہنس کر اُسے بہلانے کی سعی کی تھی اور وہ جانے تک بہلاتا رہا تھا۔ پھر وہ چلا گیا، صرف آٹھ دن کے لئے! اور یہی آٹھ دن تو اُس کے لئے قیامت بن کے آئے تھے!

---

ایک دن شجاع کے نام ٹیلیگرام آیا۔ شجاع کو ٹور پر گئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ افروز نے ٹیلیگرام وصول کر لیا اور لفافہ چاک کر کے ٹیلیگرام کا مضمون دیکھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے سارا آفس گھومنے لگا ہو، ہر شے گھومنے لگی ہو اور وہ چکرا کر گر ہی جاتی مگر اُس نے میز کا سہارا لے لیا ہوتا۔ ٹیلیگرام اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر گرا ہوا تھا اور وہ اُسے خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اُسی لمحے انٹرکوم کا بزر بجنے لگا۔ اُس نے ریسیور اُٹھا لیا۔

"مس افروز کیسی ہو؟" افروز کی نظریں ابھی تک ٹیلیگرام کی طرف تھیں اور اُس کے الفاظ واضح نظر آ رہے تھے۔ اُس نے وہی الفاظ دہرا دئے۔

"چھوٹے لڑکے کی طبیعت بہت خراب ہے!"

"کیا ——— !" رحمٰن صاحب اپنے کمرے میں اُچھل پڑے ہوں گے۔ اِدھر افروز بھی جاگ گئی تھی۔ وہ معافی چاہ رہی تھی۔ لیکن شاید دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو چکا تھا کیونکہ رحمٰن صاحب خود اُس کے سامنے موجود تھے۔ اُنہوں نے آگے بڑھ کر وہ ٹیلیگرام اُٹھا لیا اور پڑھنے کے بعد افروز سے کہا۔

"میں اپنے آفس میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ پھر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ افروز کچھ دیر بعد سنبھل کر اندر گئی۔ وہ بے چینی سے اپنے آفس میں ٹہل رہے تھے۔ شجاع کے نام آیا ہوا ٹیلیگرام اُن کے ہاتھ میں تھا۔ افروز کو دیکھ کر وہ رُک گئے اور کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔ مجھے افسوس ہے شجاع نے تمہیں بھی دھوکے میں رکھا۔ بہرحال حقیقت تمہارے سامنے ہے۔ غلطی میری بھی ہے۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا اور اسی لئے میں نے شجاع کو دوسری برانچ سے اِدھر تبدیل کروایا تاکہ تم ڈھائی بجنے کے انتظار میں ہر شے کو نہ بھول جاؤ!"

وہ چونک گئی۔ افروز کو پہلے دن کا واقعہ یاد آ گیا اور وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ رحمٰن صاحب کہہ رہے تھے۔

"تمہاری اور میری عمر میں تقریباً پندرہ سال کا فرق ہے۔ تمہیں آج ایک شادی شدہ نوجوان نے دھوکہ دیا اور اپنا یہ بھی راز چھپائے رکھا اور مجھے دس سال پہلے ایک لڑکی نے دھوکہ دیا جو شادی شدہ تھی۔ وہ مجھ سے اِس لئے چھپائے رکھنا چاہتی تھی کیونکہ یہ راز کوئی نہ جانتا تھا۔ ہم دونوں نے ایک جیسا دھوکا کھایا ہے۔ ہماری زندگیاں ملتی جُلتی ہیں۔"

پھر وہ خاموش ہو گئے۔ افروز بھی عجیب نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ وہ دونوں ہی کچھ کہنا چاہتے تھے۔ شاید ایک ہی بات!

---

مدیر بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

**محمد فیاض الدین احمد خاں فیاض گوالیاری بی۔ اے**

اُلٹی سیدھی باتیں مجھ کو بیٹھ گئے سمجھانے لوگ

مجبوری کی خاموشی کو، کیا سمجھ کیا جانے لوگ

ایک نظر کے ایک ادا کے گرد لیں گے افسانے لوگ

خوش بخت تیرے ہی دل ہی دل میں بن کے ناز باز لوگ

جنسِ گراں کا سودا کرنا ان کے بس کا روگ نہیں

دیوانے کی قدر نہ سمجھے ازانے فرزانے لوگ

انسانوں کی بات نہ پوچھو، ہم نے وہ عالم دیکھا ہے

مہتار با خون انسانوں کا پینے رہے پیمانے لوگ!

دل بھی زخمی، جان بھی زخمی، بزم کہاں فیاض کہاں

کھینچ بلایا، کھینچ ہی لائے کب سمجھ کب مانے لوگ

**صغیر احمد صوفی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی**

شب کے سناٹے کو آنکھوں میں بسانا کیوں ہے

تو ستاروں کے چراغوں کو بجھاتا کیوں ہے

تیرا ایمان ہی جب ترکِ تعلق ٹھہرا

ایک بجھتی ہوئی قندیل جلاتا کیوں ہے

میں ترا راز بھی، دمساز بھی، غماز بھی ہوں

اپنی محفل سے مجھے آج اٹھاتا کیوں ہے

پھونک دے خرمنِ ہستی کو بہ یک شعلۂ غم

موم بتی کی طرح مجھ کو جلاتا کیوں ہے

تو نے اِک در پہ نہ جانے کی قسم کھائی تھی

لیکن اِک گھر کا پتہ سب کو بتاتا کیوں ہے

چھپ کے صوفی نے کیا ہے کہیں پیمانِ وفا

ورنہ پھر خطۂ کشمیر بلاتا کیوں ہے

**مس فرزانہ اشفاق شاہجہانپوری**

مسکرا کر وہ محبت کی سزا دیتے ہیں

زہر میں تھوڑا سا امرت بھی ملا دیتے ہیں

ذکر جب آپ کے دیوانے کا آجاتا ہے

انگلیاں میری طرف لوگ اٹھا دیتے ہیں

دل پگھلتا رہا آنکھوں میں نہ آنسو آئے

تجھ کو اے جذبۂ خوددار دعا دیتے ہیں

اب تو خاموش بھی رہتے ہوئے جی ڈرتا ہے

لوگ ہر بات کو افسانہ بنا دیتے ہیں

کسی مجبور پہ وہ کر کے عنایت، بخدا

زندگی اور بھی دشوار بنا دیتے ہیں

کتنے مجرم ہیں فرزانہ فلک کے بندے

بے خطا کو بھی خطاکار بنا دیتے ہیں

# ذرا کچھ اور...

شاکر کریمی

محلہ گنج مٹ۔ بتیا (چمپارن) بہار

محترم المقام اسلام نیاز

"ذرا کچھ اور..." حاضر ہے۔ کہانی مختصر اور ہلکی پھلکی ہے۔ لیکن وہ بات سنگین ہے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں اس کا اندازہ تو آپ ہی کر سکتے ہیں —— کہتے ہیں صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔ انجنا لوٹ آئی ہے۔ لیکن... سماج میں اُسے کون سا مقام حاصل ہو؟ اس کا فیصلہ "بیسویں صدی" کے بلند خیال قارئین پر چھوڑتا ہوں —— "بیسویں صدی" کے نومبر کے شمارہ میں آنے والی میری کہانی "معصوم سی" کی پسندیدگی کے متعلق بہت سارے خطوط آئے اور آ رہے ہیں۔ حقیقتاً "بیسویں صدی" شہرت کا زینہ ہے اور ذرّے کو آفتاب بنانا آپ ہی کا کام ہے۔ کئی ایک خطوط میں آپ سے عقیدت کا اظہار کچھ اس طرح کیا گیا ہے جیسے آپ "بیسویں صدی" کے مدیر ہونے کے علاوہ پیر و مُرشد بھی ہوں۔ یہ باتیں آپ کے عظیم ہونے کی واضح دلیل ہیں —— خدا کرے آپ لکھنے اور پڑھنے والوں کے لئے تا دیر سلامت رہیں...

نیاز کیش —— شاکر کریمی

دولت کی فراوانی ہو، عیش و عشرت کے تمام لوازمات بہ افراط میسر ہوں، ازدواجی زندگی کی پابندیاں حلقۂ احباب کے وسیع سے وسیع تر ہو جانے پر اثر انداز نہ ہوں، دولت کی ہوس شوہر کو شہر سے دُور بہت دُور لے گئی ہو تو پھر مکمل آزادی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بزنس لال اگروال کی چہیتی چھتیس سالہ بیوی چندانی اگروال اپنی بائیسویں سالگرہ سابقہ روایات سے بڑھ چڑھ کر کیوں نہ مناتی!

یوں تو پوری عمارت خاص توجہ سے آراستہ کی گئی تھی لیکن اندرونی وسیع ہال کی آرائش کچھ اس انداز سے کی گئی تھی کہ پورا ہال فردوسِ ارضی ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ نرم برقی قمقموں میں آنے والوں کے چہرے اس طرح دمک رہے تھے جیسے دُنیا کی ساری خوشیوں اور مسرتوں کی یہی جولاں گاہ ہوں۔

چندانی اگروال آج بے حد خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ بالوں کی ایک بلیک لٹ کو اس طرح ڈھیلا کر دیا گیا تھا جیسے دُوج کا چاند۔ سیاہ گھنی پلکوں کے نیچے خُشک آنکھوں میں کانوں کی لووں کو چھوتی ہوئی کاجل کی پتلی لکیریں، روز کریم اور پاؤڈر کی مرہونِ منّت رخساروں کی سُرخی یوں معلوم ہو رہی تھی جیسے جاتی ہوئی بہار کو ہنس کر رخصت کرنے کے لئے سر نگوں شاخ پر بہار کا آخری گُلاب کھِل اُٹھا ہو، پژمُردہ ہونٹوں پر لپ اسٹک کی گاڑھی تہہ —— اور جسم پر نائلن کی سُرخ ساڑی۔ آج اُس نے اپنے آپ پر اتنی محنت کی تھی کہ بائیس ہی سال کی معلوم ہو رہی تھی۔

چندانی اگروال نے پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آج وہ مہمان نوازی کی ایک مثال قائم کر دے گی اور اسی خیال سے اُس نے اپنے مہمانوں کی پسند اور خواہش کا پُورا پُورا خیال رکھا تھا۔ جہاں ہر ایک کی پسند کی شرابیں بہم پہنچائی گئی تھیں وہاں تنہا آنے والوں کو اکیلے پن کے احساس سے آشنا نہ ہونے دینے کے لئے دعوتِ عیش و طرب دینے میں جھجک محسوس نہ کرنے والی بڑے گھرانوں کی مہذب لڑکیوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

مَردا!
صِرف پانچ پیسوں میں اپنے کُنبے کو
چھوٹا رکھنے کا اختیار
حاصل کر سکتے ہیں
28 برسوں میں بھارت کی آبادی دوگنی ہو جائیگی.
لیکن وسائل اِس تناسب سے نہیں
بڑھ پائیں گے۔ اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ
ہر کسی کے حصے میں ہر شے کم آئے گی۔ اُسے
رہنے کے لئے کم جگہ ملے گی۔ تعلیم کے مواقع
کم حاصل ہوں گے۔ کھانے اور پینے کو
کم ملے گا۔ اِس خطرے کو ٹالا جا سکتا ہے۔
برتھ کنٹرول کر کے۔ کُنبے کی منصوبہ بندی کر کے۔
اور یہی وہ مرحلہ ہے، جہاں آپ مدد کر سکتے ہیں۔
فوراً عمل کیجئے۔ اپنے کُنبے کو چھوٹا رکھیئے
اب بچے کا جنم روکنا آپکے بس میں ہے
NIRODH
ودھ استعمال کیجئے
بلی پلاننگ کے لِئے
ب مُلک میں ہر جگہ دستیاب ہیں
مَردوں کے استعمال کے لئے اعلیٰ کوالٹی کا ربڑ کنڈوم
3 کے لئے 15 پیسے
(سرکار کی طرف سے رعایتی قیمت)
davp 69/

عرشؔ صہبائی

دکھائی سبز دل جب بھی گلستاں کی بہاروں نے
ہمیں اپنا لیا خندہ دلی سے خارزاروں نے

کرتے تشنہ کامی میں بھی اکثر جھوم جھوم اٹھے
بھرم ساقی کا یوں بھی رکھ لیا ہے بادہ خواروں نے

یقیناً ان میں شامل ہے تری آواز کا جادو
فضاؤں میں بکھیرے ہیں جو نغمے آبشاروں نے

لرز کر رہ گیا ہے دل تلاطم خیز موجوں کا
یہ کس حسرت سے دیکھا میری کشتی کو کناروں نے

زمانہ کو ٹھکراتا ہے ہم دل فگاروں کو
زمانے کو اگر ٹھکرا دیا ہم دل فگاروں نے؟

مری تنہا خرامی پر یہ جیسے طنز کرتی ہوں
کچھ اس انداز سے دیکھا ہے مجھ کو رہگذاروں نے

کہاں خود اعتمادی کا وہ جذبہ عرشؔ اب باقی ہیں
نکمّا بے سہارا کر دیا ہم کو سہاروں نے

غزل

چندر پرکاش جوہر بجنوری

بہار بزم کہاں کھو گئی خدا جانے
سحر ہوئی تو نہ پھر شمع تھی نہ پروانے

وہ شوق کیا کہ جو شرح و بیاں کا ہو محتاج
وہ عشق کیا جسے تیری نظر نہ پہچانے

اگر سنے تو اجل کا بھی رخ بدل جائے
ابھی حیات نے چھیڑے نہیں وہ افسانے

وہ تیری گرمیِ محفل کہاں گئی ساقی
پڑے ہوئے ہیں جو سنسان آج میخانے

بہت ہی سہل ہوئی جا رہی ہے راہ جنوں
یہ کون راہبر عشق ہے خدا جانے

کچھ ایسے اب بھی ہیں رندانِ تشنہ لب جوہرؔ
جدھر نگاہ اٹھا دیں، جھکا دیں میخانے

غزل

اختر واجدی

غم تبسم کے سانچے میں ڈھلنے لگے
آرزوؤں کے عنواں بدلنے لگے

عرض غم کر کے ہم کو ندامت ہوئی
اُن کی آنکھوں سے جب اشک ڈھلنے لگے

ایک اُن کا بدلنا ستم ہو گیا
لوگ طرزِ تکلم بدلنے لگے

جب اندھیرا سر بزم بڑھنے لگا
اہلِ دل شمع کی طرح جلنے لگے

اُن کی مرضی پہ ایمان لانا پڑا
جب بھی حالات کروٹ بدلنے لگے

گم ہوئے کارواں اخترؔ واجدی
رہنما جب ارادے بدلنے لگے

# قابلِ مطالعہ منتخب شعری مجموعے

| کتاب | شاعر | قیمت |
|---|---|---|
| آتش گل | جگر مرادآبادی | پانچ روپے |
| کلیاتِ اقبال | ڈاکٹر اقبال | چھ روپے |
| جنون و ہوش | جوش ملسیانی | چار روپے |
| ہفت رنگ | جوش ملسیانی | تین روپے |
| آہنگِ حجاز | [illegible] | ایک روپیہ |
| سحرِ غزل | ساحر ہوشیارپوری | تین روپے |
| دستک | نریش کمار شاد | دو روپے ۲۵ پیسے |
| پھوار | 〃 | دو روپے ۵۰ پیسے |
| للکار | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| قاشیں | 〃 | تین روپے |
| آیاتِ جنون | 〃 | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |
| سنگم | 〃 | تین روپے |
| سموم و صبا | جوش ملیح آبادی | آٹھ روپے |
| شکوہ جوابِ شکوہ | ڈاکٹر اقبال | پچیس پیسے |
| بالِ جبریل | 〃 | تین روپے ۵۰ پیسے |
| ابھیندن گرنتھ | جوش ملسیانی | دس روپے |
| شکنتلا | ساغر نظامی | بارہ روپے |
| نگاہِ ناز | کرشن موہن | ایک روپیہ |
| آہنگِ وطن | 〃 | ایک روپیہ |
| کلیاتِ اکبر الہ آبادی (اول) | اکبر الہ آبادی | پانچ روپے |
| حصہ دوم | 〃 | چھ روپے |
| کلیاتِ اختر شیرانی | اختر شیرانی | آٹھ روپے |
| رعنائیاں | شکیل بدایونی | تین روپے |
| صنم و حرم | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| نخلِ رعنا | جگن رعنا | تین روپے ۵۰ پیسے |
| شبنم تبسم | کرشن موہن | پانچ روپے |
| دلِ نادان | | چھ روپے |

| کتاب | شاعر | قیمت |
|---|---|---|
| خرافات | عبدالحمید عدم | چار روپے |
| رمِ آہو | 〃 | چار روپے |
| گلنار | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| قول و قرار | 〃 | تین روپے ۵۰ پیسے |
| گردشِ جام | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| ہٹے | 〃 | دو روپے ۲۵ پیسے |
| گجر | قتیل شفائی | تین روپے |
| رسالت مآب | رئیس احمد جعفری | چھ روپے |
| اسلام اور عورت | مولانا مظہر الدین | تین روپے |
| نماز کیا ہے | مولانا محمد علی | دو روپے ۲۵ پیسے |
| نیا نو دن | راشد سہسوانی | پانچ روپے ۷۰ پیسے |
| غم دئے مستقل | انیس مرزا | چار روپے ۵۰ پیسے |
| شرارت | جمیل انجم | تین روپے |
| عشق اور خون | رائیڈن ہگرڈ | سات روپے |
| سوکھا ساون | انیس مرزا | دو روپے ۵۰ پیسے |
| محبت اور جرم | انور کمال حسینی | دو روپے ۷۵ پیسے |
| فن اور تنقید | 〃 | چار روپے ۵۰ پیسے |
| نوائے دل | منشاء الرحمٰن خان منشاء | دو روپے ۵۰ پیسے |
| شاہنامۂ اسلام | حفیظ جالندھری | نو روپے نو روپے |
| تلامذۂ غالب | مالک رام | سات روپے ۷۵ پیسے |
| یادیں | اختر الایمان | چھ روپے |
| مضراب | شباب للت | تین روپے |
| تماشائی | کرشن موہن | ایک روپیہ |
| دھوپ رس (ہندی رسم الخط میں) | 〃 | ایک روپیہ |
| نگاہِ ناز | 〃 | ایک روپیہ |
| تبسم غم | وسیم بریلوی | دو روپے ۵۰ پیسے |
| دیوانِ مصحفی | مرتبہ: نور نقوی | بارہ روپے |

| کتاب | شاعر | قیمت |
|---|---|---|
| طلوع | ضیا فتح آبادی | [illegible] |
| نئی صبح | 〃 | ایک روپیہ [illegible] |
| نورِ مشرق | 〃 | ایک روپیہ ۵۰ پیسے |

**آئینۂ اصلاح** — ابو الفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات [illegible] کلام پر مستند تبصرہ اس کتاب میں درج ہیں [illegible] مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے [illegible] قیمت پانچ روپے

**شاہنامۂ اسلام** — جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام چار حصوں میں جس میں تیرہ سو سالہ اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے ہر حصہ قریباً تین سو صفحات کا ہے [illegible] کے بعد چھپا ہے قیمتی سوا روپے اب صرف نو روپے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ محصول ڈاک ایک روپیہ ۵۰ پیسے الگ ہوگا۔

**مضراب** — شباب للت کے ایک ایک شعر میں آپ کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور ان دھڑکنوں میں آپ نے سارے جہان کے دُکھ درد سمیٹ لیے ہیں۔ قیمت تین روپے۔

**گردِ راہ** — ضیا فتح آبادی کا چوتھا مجموعۂ کلام... ایک صاحبِ طرز شاعر ہیں۔ ان کے انداز بیان اور لب و لہجہ میں انفرادیت و ندرت ہے قیمت تین روپے پچاس پیسے۔

**آوازیں** — اُبھرتے ہوئے جواں سال شاعر [illegible] کا پُرجوش گیتوں اور نظموں کا منفرد مجموعہ جس میں [illegible] کی چاشنی کے ساتھ ساتھ آپ کی اپنی آواز بھی ہے قیمت [illegible]

**چاندنی اساڑھ کی** — راکا نریش راز کی نظموں کا مجموعہ۔ لوک گیتوں کی سی سادگی [illegible] تازگی اور شگفتگی۔ ان میں ایک نئے انداز کی [illegible] بھی ہے [illegible] اعلیٰ۔ قیمت صرف تین روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر [illegible]

# مسیحا

خالد شیخ ایم۔ اے

۱۲۷ مولانا آزاد روڈ۔ نمبر ۴۳۶ ۔ بمبئی نمبر ۸

محترمی خوشتر گرامی صاحب تسلیم

... "بیسویں صدی" کے لئے اپنی تخلیق ارسال کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ "مسیحا" ایثار و محبت اور ہمدردی کے موضوع پر ایک المیہ کہانی ہے۔ اپنی طرف سے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ کہانی "بیسویں صدی" کے معیار کی ہو۔ صحیح پرکھ آپ کی قدر شناس نظریں ہی کر سکتی ہیں ؎

گر قبول افتد زہے عز و شرف

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ یوں بھی آپ کو بہت دنوں تک جینا ہے۔ اردو کو بقائے دوام بخشنے کے لئے!۔

نیاز مند ـــــــ خالد شیخ

جنگ ختم ہو چکی تھی۔ لیکن ہمارے لئے اس کا آغاز اب ہوا تھا۔ یہ وہ جنگ تھی جس میں ہم اپنے محافظ اور اپنے ہی دشمن تھے! یہ اعصاب و احساسات کی جنگ تھی جو سرحدوں پر نہیں لڑی جاتی، ہسپتالوں کی بوجھل فضا میں لڑی جاتی ہے اور ہم سب اس جنگ میں نبرد آزما تھے۔

میں جس وارڈ میں تھا اس میں پندرہ جوان اور تھے۔ ہم میں سے کسی کی ٹانگ زخمی تھی تو کسی کا بازو اور کسی کا چہرہ اور ہم سب ایک اعصابی جنگ میں مبتلا تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ سرحد پر زورِ شجاعت دکھانے والا سپاہی یہاں اپنے آپ سے لپٹ رہا تھا۔ ہمارے دن بہت بور گزر رہے تھے۔ ہماری واحد مصروفیت گزرے ہوئے دنوں کی خوشگوار یاد اور مستقبل کا خوف تھا۔

انہی دنوں ہسپتال میں ایک مسیحا آیا۔ یہ رادھا تھی جس کا تبادلہ ایک دوسرے ہسپتال سے ہمارے یہاں ہوا تھا۔ اوروں کے لئے رادھا ایک نرس تھی۔ لیکن ہمارے لئے وہ ایک شفیق ڈاکٹر اور حیات بخش مسیحا تھی جس دن اس کی ڈیوٹی ہمارے وارڈ میں ہوتی ایسا محسوس ہوتا زندگی اپنی تمام رعنائیوں اور رنگینیوں کے ساتھ وارڈ میں لوٹ آئی ہے۔ پژمردہ چہرے کھل اٹھتے اور وہ پورا دن بہت اچھا گزرتا۔ رادھا خوبصورت تھی، خوش مزاج تھی اور اس کے ہونٹوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ اس کا سب سے بڑا حسن تھا۔ سفید لباس میں وہ معصوم فرشتہ معلوم ہوتی۔ اس نے ہمیں زندگی سے بہت قریب کر دیا تھا۔ اس زندگی سے جو ہم سے بہت دور بھاگ چکی تھی۔ ہم سب اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور اس محبت میں بڑی آفاقیت تھی۔ جب تک وہ وارڈ میں ہوتی اس کی یہی کوشش رہتی کہ ہمیں کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچے۔ وہ اتنی مستعد تھی کہ ادھر کسی کے منہ سے کراہ نکلی، ادھر وہ سب کام چھوڑ اس کی خدمت کے لئے حاضر! ڈیوٹی شروع ہونے سے ڈیوٹی ختم ہونے تک وہ ایک مشین کی طرح اپنے فرائض انجام دیتی۔ کبھی وہ باورچیوں پر ہمارے کھانے کے لئے بگڑتی، کبھی وارڈ بوائز کو ان کی بے پروائی پر جھڑکتی اور کبھی ہمیں دواؤں کی اہمیت پر لمبا چوڑا لکچر دیتی۔ فرصت کے اوقات میں وہ ہم میں سے کسی کے پاس جا بیٹھتی اور پھر متنوع موضوعات پر گفتگو کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ہم دنیا بھر کے موضوعات پر گفتگو کرتے۔ اس کی معلومات حیرت انگیز حد تک وسیع تھیں۔

لیکن ان ساری باتوں کے باوجود کبھی کبھی وہ اچانک اُداس ہو جاتی۔ اس کے مسکراتے ہوئے چہرے سے شدید کرب جھلکنے لگتا اور وہ خود بھی ایک ایسی مریض نظر آنے لگتی جسے اپنے مسیحا کا انتظار ہو۔ لیکن یہ تبدیلی وقتی ہوتی تھوڑی ہی

دیر میں اُس کی خوش [illegible] اور وہ پھر پہلے جیسی رادھا ہو جاتی مستعد، مستعد، خوش مزاج!

---

ایک دن گفتگو کے دوران میں نے محسوس کیا کہ جس طرح بعض پہاڑوں کی خوبصورت چوٹیاں دہکتے ہوئے لاووں کا مسکن ہوتی ہیں، اُسی طرح رادھا کی بظاہر مُسکراتی ہوئی پُرسکون زندگی بھی اپنے اندر ایک لاوے سے دوچار ہے۔ اُس کا شوہر جو ہماری طرح ایک فوجی تھا جنگ کے بعد پُراسرار طور پر لاپتہ تھا اور یہ وہ دُکھ تھا جسے وہ دل کی گہرائیوں میں چھپائے ہوئے تھی۔ اُس کی بشاشت، اُس کے ہونٹوں پر کھیلنے والی دلکش مُسکراہٹ، شاید اُسی کرب سے فرار کا ایک ذریعہ تھی۔

---

- وہ ہم میں سے نہیں جس نے بڑوں کی عزت نہ کی اور چھوٹوں پر رحم نہ کیا۔
  (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- دو خصلتوں سے بچنے والا سلامت رہے گا۔ جھوٹ، غیبت۔
  (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- تواضع کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ کوئی شخص اپنی قوت اور دولت کا ناروا استعمال نہ کرے۔ (حضرتِ امام شافعیؒ)
- مال پر غرور کرنے والا اپنے نفس کا فریب خوردہ ہے۔
  (حضرتِ عبداللہ بن مُبارکؒ)
- علم وہی حاصل کرو جو نافع ہو، سُودمند ہو۔ (حضرتِ عبداللہ بن مُبارکؒ)

---

اُس دن رادھا مجھے بہت عظیم معلوم ہوئی۔ اپنے دُکھ کو بھول کر دوسروں کے دُکھ بانٹنا، اپنے آنسو پی کر دوسروں کے دامن میں خوشیاں بھرنا، بہت بڑا [illegible] ہے۔ اُس دن رادھا کے دُکھ کے آگے میں اپنی تکلیف بھول گیا۔ پہلی بار مجھے [illegible] ہوا کہ یہ نازک اندام عورت کتنی قوی ہے، کتنی باہمت ہے!

پھر کچھ دنوں کے لئے مجھے دوسرے ہسپتال میں بھیج دیا گیا۔ جہاں میں [illegible] تین ہفتے زیرِ علاج رہا۔ جب میں اپنے پُرانے وارڈ میں واپس آیا تو میرے [illegible] سے ساتھی صحت یاب ہو کر رخصت ہو چکے تھے اور اُن کی جگہ بہت سے [illegible] چہروں نے لے لی تھی۔ میرے پڑوس میں بھی ایک نیا چہرہ تھا۔ رمیش، جس کی [illegible] ہیئت انسانوں سے زیادہ مِصری ممی سے مشابہ تھی۔ پیٹ سے لے کر سر تک [illegible] سارا جسم پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ ایک پائلٹ آفیسر تھا۔ میدانِ جنگ میں دشمنوں کے کئی طیارے مار گرانے کے بعد جب وہ لینڈنگ کر رہا تھا تو اُس کے اپنے طیارے نے اُسے دھوکا دیا۔ اُس میں اچانک آگ لگ گئی جس سے اُس کا سینہ اور چہرہ بُری طرح جُھلس گیا۔ پلکیں، بھنویں، سر کے بال کچھ نہ بچ سکا صرف آنکھوں کی پُتلیاں بچ گئیں۔ جن کا بچ جانا معجزے سے کم نہ تھا۔ لیکن ابھی تک وہ کچھ دیکھ نہ سکتا تھا۔ اُس کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور اُن پر دبیز عینک چڑھی ہوئی تھی تاکہ باہر کی روشنی پُتلیوں پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ اُس کے مُنہ کا حصّہ کھلا ہوا تھا اور یہ وہ واحد سہارا تھا جو اُس کے اور دُنیا کے مابین تعلق قائم کئے ہوئے تھا۔ لیکن بیشتر اوقات اُس کی باتوں کو سمجھنا دُشوار ہوتا تھا۔ تکلیف کی وجہ سے وہ پُورا مُنہ نہ کھول سکتا تھا اور تنہا اور تاریک زندگی کا احساس اُسے چین نہ لینے دیتا تھا۔ وہ بے تحاشا باتیں کرتا تھا۔ اپنی، اپنے گھر والوں کی، جنگ کی ہولناکیوں کی اور انسانی کارناموں کی۔ گفتگو کرتے ہوئے جب اُس کے زخموں سے ٹیس اُٹھتی تو وہ ایک ہلکی کراہ کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے چُپ ہو جاتا اور پھر باتیں شروع کر دیتا۔

ایک ہی دن میں ہم دونوں بہت اچھے دوست بن چکے تھے اور یہ وہ جذبہ رفاقت تھا جو عام طور پر میدانِ جنگ یا ہسپتال کے محدود ماحول ہی میں میسّر آتا ہے۔

دوسرے دن میری آنکھ سویرے کُھل گئی۔ سُورج طلوع نہیں ہوا تھا اور پُورا ماحول پُرسکون تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک کونے سے کسی مریض کے کراہنے کی آواز آئی۔ میرا ذہن بے اختیار رادھا کی طرف چلا گیا۔ میری نظریں دروازوں پر لگ گئیں اور میں اُس مسیحا کا انتظار کرنے لگا جس کے ہاتھوں کا لمس بھی موت کے تکلیف دہ احساس سے نکال کر زندگی کا حوصلہ عطا کرتا تھا۔ پانچ منٹ گزر گئے جب رادھا نمودار نہ ہوئی تو مجھے خیال آیا کہ آج شاید سوزی کی ڈیوٹی ہو۔ سوزی ادھیڑ عمر کی تھکے ہوئے چہرے والی گوارا سی عورت تھی۔ رات میں اُس کا محبوب مشغلہ کچن رُوم میں کرسی سے ٹیک لگا کے سو جانا تھا۔ پھر مریض لاکھ چیخے چلّائے اُس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں بستر چھوڑ کر باہر جانے کے لئے اُٹھا تو میرے بغل کے مریض نے مجھے آواز دی اور پینے کے لئے پانی مانگا۔ میں نے سوچا کر شاید یہ خدمت میں بہتر طریقے پر انجام دے سکوں نرس کو آواز دینی چاہی۔ لیکن اُس نے مجھے روک دیا۔ مجبوراً مجھے پانی پلانا پڑا اور احتیاط کے باوجود پانی کے کچھ قطرے پٹیوں سے رِستے ہوئے اُس کے زخم تک پہنچ گئے۔ میں نے [illegible] مسکرا کر کہا: تم [illegible] [illegible]

وہ ہوتی تو تم دیکھتے۔"

یہ "وہ" کا لفظ میرے لئے اجنبی تھا۔ میں نے وضاحت چاہی تو اس نے بتایا کہ وہ اس کی ہونے والی دلہن ہے جو اسی ہسپتال میں نرس ہے! اور پھر میرے کان محبت اور رومان کی ایک عجیب و غریب داستان سے آشنا ہوتے۔ رمیش مجھے ایک ایسی عورت کے بارے میں بتا رہا تھا جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ اس کے نام سے بھی ناواقف تھا لیکن پیار سے اسے روز کہتا تھا کیونکہ اسے گلاب بہت پسند تھے۔

میں نے سوچا ہو نہ ہو یہ رادھا ہوگی۔ کیونکہ نرسوں میں کوئی دوسرا ایسا نہ تھا جو اپنے برتاؤ سے اتنی جلد کسی کا دل موہ لے۔

رمیش نے مجھے بتایا کہ جب وہ اس ہسپتال میں لایا گیا تو اس میں جینے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ موقع پا کر وہ اپنے آپ کو ختم کر دینا چاہتا تھا پھر روز اس کی زندگی میں آگئی اور موت محبت سے ہار گئی۔

"آج جو حوصلہ میں اپنے اندر پاتا ہوں وہ محض روز کی وجہ سے ہے۔ تمہیں نہیں معلوم ہم ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں۔ گھنٹوں باتیں کی ہیں ہم نے۔ اپنے ماضی کی، حال کی، مستقبل کی۔ ایک دن روز نے مجھ سے کہا کہ اسے میرے جھلسے ہوئے چہرے کی کوئی پروا نہیں۔ اسے میرے چہرے سے نہیں مجھ سے محبت ہے۔ میں نے روز کو نہیں دیکھا ہے۔ پھر بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بہت خوبصورت ہے۔ اس کے ملائم بال، گول چہرہ، ستواں ناک . . ." وہ کچھ اس تفصیل سے رادھا کا خاکہ کھینچ رہا تھا کہ میں حیران رہ گیا۔ محبت کی اس تخیلی قوت سے میں ابھی تک ناواقف تھا۔

"تم نے تو اسے دیکھا ہوگا۔ بتاؤ کیسی ہے میری روز؟"

"بہت خوبصورت اور بہت اچھی! میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"روز بھی میری طرح تنہا ہے اور مجھ سے زیادہ دکھی۔ اس کا شوہر جنگ میں مارا گیا۔ میں اس کے دکھ کو سمجھتا ہوں۔ میں نے تو محض اپنا چہرہ کھویا ہے۔ لیکن وہ ایک ایسی ہستی سے محروم ہوگئی ہے جو اس کا سب کچھ تھا۔ روز کا پیار میرے پیار سے زیادہ عظیم اور اچھوتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے آنسو نکل آتے ہیں۔"

پھر تھوڑی دیر تک گہری خاموشی رہی۔ میں رادھا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ میری نظروں میں کچھ اور بلند ہوگئی۔ لیکن میں ایک مخمصے میں گرفتار تھا۔ اسے اپنے شوہر سے بے حد پیار تھا۔ پھر یہ پیار؟ کیا یہ محبت سچی تھی یا محض ہمدردی و ترحم کا جذبہ جس نے پیار کی شکل اختیار کر لی۔

"کل کا دن میرے لئے فیصلہ کن دن ہے۔ ڈاکٹر نائک نے مجھ سے کہا ہے کہ کل وہ میری آنکھوں کی پٹیاں کھول دیں گے۔ ہو سکتا ہے میں دنیا کی رنگینیوں سے پھر لطف اندوز ہو سکوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیشہ کے لئے بینائی سے محروم ہو جاؤں۔ نہ جانے کل کا دن میرے لئے کیا لائے!"

وہ دن اسی طرح باتیں کرتے گزر گیا۔

---

اگلی صبح میں دیر سے جاگا۔ وارڈ میں حسب معمول ہنگامہ برپا تھا۔ نرسیں تبدیل ہو چکی تھیں۔ میری نظریں رادھا کو ڈھونڈنے لگیں لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ مایوس ہو کر میں رمیش کی طرف پلٹا اور اس کی حالت دریافت کی۔

"میں بہت اچھا ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے روز آئی تھی زخم دھونے کی اطلاع دینے کے لئے۔ اُف! میں اس خیال سے کانپ اٹھتا ہوں کہ آج میں روز کو دیکھ سکوں گا!"

---

- نخوت کا پاؤں آسمان پر نہ رکھ، اخلاص کا سر زمین پر رکھ۔ (شیخ سعدیؒ)
- سب سے دلکش حسن نیک خیالات ہیں۔ (شیکسپیر)
- جو آدمی ایک ساتھ دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑتا ہے وہ ایک کو بھی نہیں پکڑ پاتا۔ (فرینکلن)
- علم کی طلب میں شرم کو دخل نہ دو۔ جہالت بے شرمی سے بدتر ہے۔ (افلاطون)
- دنیا میں ہر آدمی اپنی روزی کھاتا ہے۔ وہ تمہارے دسترخوان پر کھائے یا اپنے دسترخوان پر۔ (ابن یمین خراسانی)

---

"گھبراؤ مت رمیش۔ مجھے امید ہے تم ضرور دیکھ سکو گے۔ اسے۔ تب تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ تمہارے تصورات سے کہیں اچھی ہے۔"

"سچ؟" اور پھر ہم رادھا کے ذکر میں کھو گئے۔ ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ کسی کے قدموں کی چاپ سن کر وہ خاموش ہو گیا۔

"وہ آ رہی ہے!" میں نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ سوزی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے دوست کو اس کی غلطی کا احساس دلاتا سوزی ہمارے قریب پہنچ چکی تھی۔

"ہیلو روز . . ." اور میں چونک کر کبھی سوزی اور کبھی رمیش کو دیکھنے لگا۔

"کیسے ہو رمیش! لاؤ میں تمہارے زخم دھو دوں۔"

رمیش نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا دیا اور سوزی کمال محبت سے اسے اپنے ہاتھوں میں لے کر پٹیاں کھولنے لگی۔ جب تک سوزی اس کے زخم دھوتی رہی مجھے ایسا

دن ہو جیسے دھند کی چادر تھم گئی ہے اور فضا میں ہر طرف محبت کے نغمے گونج رہے ہیں۔ اس وقت سوزی مجھے بہت حسین معلوم ہوئی۔ اس کا تھکا ہوا سپاٹ چہرہ جیسے کندن سے تھما اُٹھا تھا۔ اس چہرے پر حُسن بھی تھا اور ممتا بھی۔ زخم دھوتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آپ ہی آپ آنسو نکل پڑے۔ اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا لیکن رمیش کو شاید اس کا احساس ہو چلا تھا۔ "کیا ہوا روز؟"

"کچھ نہیں" سوزی نے انتہائی محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "میں بالکل اچھی ہوں تمہیں تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے؟" پھر سوزی اپنی دلچسپ باتوں سے رمیش کو ہنسانے لگی۔ اس کے ہونٹ خوشیاں بکھیر رہے تھے لیکن دل دُکھی تھا۔ آنسو پھر بہنے لگے۔ مجھے رادھا یاد آگئی۔ میں نے سوچا عورت ظاہری طور پر کتنی ہی مختلف ہو اس کا باطن عموماً یکساں ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد سوزی کی نظریں دروازے کی طرف مڑ گئیں اور ان میں ایک یاس انگیز کرب اتر آیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وارڈ بوائز اسٹریچر لا رہے تھے۔ انھوں نے اس پر رمیش کو لٹا دیا اور آپریشن روم کی طرف بڑھنے لگے۔ سوزی اس کا ہاتھ تھامے اس کے ساتھ ساتھ تھی اور میں ان دونوں کے پیچھے۔ آپریشن روم کے قریب پہنچ کر سوزی کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے رمیش کا ہاتھ چھوڑ دیا اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیگ گیا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"ہمت سے کام لو سوزی!"

"ڈاکٹر تانک۔۔۔" وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔

"مجھے معلوم ہے اور مجھے اُمید ہے کہ رمیش پھر دیکھنے لگے گا۔"

"ہاں اور پھر وہ مجھے دیکھے گا اور ڈاکٹر کو کوسے گا جس نے اس کی بینائی لوٹائی۔ کیسے کیسے خواب دیکھے ہیں اس نے میرے بارے میں۔ کتنا خوبصورت سمجھا ہے اس نے مجھے اور میں۔۔۔ میں خوبصورت کیسے ہو سکتی ہوں۔ کیسے خوبصورت ہو سکتی ہوں میں" وہ تقریباً چیخ اُٹھی۔ "میں اس کے سامنے نہ آؤں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کے خوابوں کا محل ڈھیر ہو جائے اور جینے کی جو آرزو اس میں پیدا ہوئی ہے سرد پڑ جائے۔ اوہ! خدایا میں کیا کروں؟"

سوزی روتی رہی اور میں بے بس کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اتنے میں ڈاکٹر تانک کی آواز گونجی "مبارک ہو رمیش، اب تم دیکھ سکتے ہو!"

اور پھر میں نے دیکھا سوزی ایک سہمے ہوئے پرندے کی طرح پلٹی اور برآمدے سے ہوتی ہوئی سیڑھی کی طرف چلی گئی۔ اس کے بعد اسے کسی نے نہ دیکھا!!

---

# غزل

متین بدایونی

دل میں اِک سیلِ رواں تھام لیا ہے میں نے
ضبطِ غم تجھ سے بڑا کام لیا ہے میں نے

سو فسانے اُبھر آئے ہیں کتابِ دل پر
جب کبھی گھبرا کے ترا نام لیا ہے میں نے

اُڑ گیا ہوں کبھی گردوں پہ قفس کو لے کر
کبھی آرام تہِ دام لیا ہے میں نے

عشق نے جب کبھی اُٹھائے ہیں حجاباتِ دوئی
ہر نفس سے ترا پیغام لیا ہے میں نے

زندگی مہر و محبت سے ہے تعبیر متینؔ
زندگی سے یہی پیغام لیا ہے میں نے

# غزل

عمم کرنولی

تمہاری راہ میں چھوڑے جو سجدوں کے نشاں میں نے
زمیں پر کھینچ ڈالا ایک خطِ کہکشاں میں نے

چمن پر جب کبھی کالی گھٹائیں چھا گئیں ہمدم
بنایا برق کو اپنا چراغِ آشیاں میں نے

گیا اُٹھ کر کوئی جو میری آغوشِ تصور سے
تو گُل کر دیں شبستانِ طرب کی بتیاں میں نے

میں اب تک جستجو سے دل میں سرگرداں ہوں اے ہمدم!
نہ جانے چیز یہ بھولے سے رکھ دی ہے کہاں میں نے

کسی کا پنجۂ بیداد شانہ جگیا ہے عمم!
جو اپنے سر پہ کچھ محسوس کی ہیں اُنگلیاں میں نے

# دو تصویریں ایک رُوپ

ہربھجن سنگھ ساگر

ایجوکیشن سیکریٹریٹ، حکومت جموں و کشمیر۔ سرینگر نمبر ۱

محترم جناب خوشتر صاحب! آداب

ایک افسانہ "دو تصویریں ایک روپ" ارسالِ خدمت ہے۔ اگر آپ کی نظرِ عنایت ہوئی تو بزمِ "بیسویں صدی" میں مجھے بھی شرکت کا شرف حاصل ہوگا، جو میری دیرینہ خواہش ہے۔ پچھلے سال جب آپ سرینگر آئے تھے تو جناب ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے ذریعے آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ گو میں اس بات کا قائل نہیں کہ ایک فنکار کو اس کی صورت یا نام سے پہچانا جائے۔ بہتر یہ ہے کہ اپنے فن ہی سے پہچانا جائے ـــــ کہانی کا آغاز پری محل کے کھنڈروں سے کیا گیا ہے۔ یہ کھنڈر چشمہ شاہی کے بہت قریب، پہاڑ کے دامن سے ذرا اوپر، ڈل کے کنارے ہیں۔ یہ محل مغل شہزادے داراشکوہ نے بنوایا تھا۔ اُمید ہے آپ کہانی کا پلاٹ اور اندازِ تحریر دونوں ہی پسند کریں گے اور اسے "بیسویں صدی" میں ضرور جگہ دیں گے . . .

آپ کا ـــــ ہربھجن سنگھ ساگر

اس پہاڑ کے دامن سے ذرا اوپر، کھلی فضا میں واقع وہ کھنڈر ـــــ ہاں! وہ پری محل ہی کے کھنڈر ہیں ـــــ گزرے ہوئے زمانے کی یادگار، تاریخ کا ایک ورق!

اور میرا نام شاردا ہے۔

میرا اِن کھنڈروں سے بہت پرانا تعلق ہے۔ کیونکہ میں بھی ایک کھنڈر ہوں ـــــ میری جوانی ایک کھنڈر ہے! میں ہر اتوار کو یہاں آتی ہوں اور اِن کھنڈروں سے باتیں کرتی ہوں ـــــ ہاں! اِنہی کھنڈروں سے۔ کچھ اپنی سُناتی ہوں اور کچھ اِن کی سُنتی ہوں ـــــ پھر یہ کھنڈر کہتے ہیں "بہن! وقت کے ساتھ ساتھ ہمارا حُسن و شباب بھی ڈھلنے لگا، رنگ پھیکا پڑنے لگا، اینٹیں سرکنے لگیں، اور دیوار گرنے لگے، ستون اُکھڑنے لگے اور ـــــ اور آہستہ آہستہ میں اِن کھنڈروں میں تبدیل ہو گیا۔" ـــــ سوچتی ہوں میری کہانی تو اِن کھنڈروں سے بھی زیادہ دردبھری ہے۔ جوانی کا ایک پل بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ رنگ، حُسن و شباب دیکھتے دیکھتے ہی ڈھل گئے۔

یہ پری محل کے کھنڈر!

میرے پُرانے ساتھی!!

اور یہیں میری پہلی ملاقات پُورن سے ہوئی تھی، مشہور آرٹسٹ پُورن!

اُس دن میں اِن کھنڈروں کی چہار دیواری سے نکل کر پہاڑی کے اوپر چڑھنے لگی تاکہ دیکھ سکوں اِن کھنڈروں کا عکس ڈل کے نیلے گہرے پانی میں کیسا معلوم ہوتا ہے۔ میں ابھی تھوڑی ہی اوپر چڑھی تھی کہ رُک گئی۔ میں نے دیکھا کوئی ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر کاغذ پر پنسل سے آڑے ترچھے خطوط کھینچ رہا ہے۔ میں نے سوچا کوئی آرٹسٹ ہے۔ شاید چار چناری کبوتر خانہ یا نہرو پارک کی تصویر بنا رہا ہو۔ کیونکہ ڈل کے نیلگوں پانی میں اِن کے فطری حسین مناظر بہت دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ میں اس کے قریب گئی۔ وہ تصویر بنانے میں اِتنا محو تھا کہ میرے آنے کا اُسے کچھ پتہ نہ چلا۔ میں نے دیکھا، وہ تو کسی محل کی تصویر بنا رہا تھا۔ محل کا ایک خاکہ۔ لیکن وہاں تو کوئی محل نہیں۔ وہی پہاڑ۔ پہاڑ کے دامن میں دُور تک پھیلی ہوئی جھیل۔ لیکن ـــــ لیکن اِس خاکہ میں نہ کہیں گری ہوئی دیواریں ہیں، نہ ٹوٹی ہوئی سیڑھیاں، نہ بے رنگ در و طاق اور نہ گری ہوئی دیواروں پر اُگی ہوئی جھاڑیاں ـــــ یہ تو ایک عالیشان محل کا خاکہ ہے۔ میں سمجھ نہ سکی۔

معاف کرنا! ان کھنڈروں کے بجائے ایک عالیشان محل میں . . . میں
مجھ نہیں رہتی ہوں" میں اُس آرٹسٹ سے مخاطب ہوئی۔ اُس نے کچھ اس انداز
سے میری طرف دیکھا جیسے نیند سے اچانک بیدار ہوا ہو ـــــ اور پھر دیکھتا ہی رہا
ں جھنجلا سی گئی۔

"جی! میرا نام شاردا ہے اور اسی شہر میں رہتی ہوں"

"ہوں ـــــ!" وہ مسکراتے ہوئے بولا "بیٹھئے" اور میں بیٹھ گئی "ویسے
بھی آپ کا نام آپ کے حُسن کے ساتھ یوں میل کھاتا ہے جیسے کنول کے خوبصورت پھول کا
نام کنول!" میں نے سوچا، یہ کوئی بے وقوف سا آدمی ہے، جو شاید مجھے اکیلی سمجھ کر
ٹ پٹانگ باتیں کرنے لگا ہے۔ پھر میں نے دیکھا چند سیاح ان کھنڈروں میں گھوم پھر
رہے تھے۔ میری ہمت بندھ گئی۔

"معاف کرنا! شاید آپ میری باتوں کا بُرا مان گئیں" اُس نے میری طرف
بھری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا "میں آرٹسٹ ہوں۔ میرا نام پُورن ہے۔ کبھی کوئی خوبصورت
چیز دیکھتا ہوں تو میری زبان سے واہ نکل جاتی ہے۔ اُمید ہے آپ بُرا نہ مانیں گی" میں
اس کی بات سن کر مسکرائی۔

"میں نے آپ سے اس تصویر کے بارے میں پُوچھا تھا"

"ہاں! آپ نے ٹھیک پُوچھا ہے" اُس نے اِن کھنڈروں کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا "مغل شہزادے دارا شکوہ نے اِس محل کے لئے کتنی خوبصورت جگہ چُنی
تھی۔ جیسے [illegible] حُسن تھا ـــــ [illegible] ـــــ لیکن [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
سینکڑوں سال پہلے دارا شکوہ نے تعمیر کروایا تھا، آج سینکڑوں سال بعد اسی محل کی
تصویر پُورن بنا رہا تھا! میں پُورن کے فن کی قدر دان ہو گئی۔ چند ملاقاتوں
نے مجھے اُس کے بہت قریب کر دیا۔

پھر ایک دن میں نے پُورن کے اسٹوڈیو میں وہی تصویر مکمل پائی ـــــ ایک
خوبصورت تصویر ـــــ [illegible] ـــــ اور یہ [illegible] کے
کھنڈر! [illegible]

اب اکثر ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ہوٹلوں میں، کلبوں میں، سینماؤں میں،
باغوں اور بازاروں میں، اور ہم پہروں باتوں میں کھوئے رہتے۔

"شاردا!" ایک دن اُس نے پیار بھرے انداز سے کہا "تم بہت [illegible]
میں مسکرانے لگی۔

"شاردا! میں تمہارے حُسن کو امر بنا دینا چاہتا ہوں!"

"وہ کیسے؟" میں نے حیرت سے پُوچھا۔

"تمہاری ایک خوبصورت تصویر بنا کر!" اور میں خاموش ہو گئی لیکن میری
آنکھوں کے سامنے پری محل کی ایک خوبصورت تصویر گھومنے لگی ـــــ جیسے [illegible]
کوئی نگینہ جڑا ہو!

"شاردا! تمہارے بے پناہ حُسن کو تصویر کا رُوپ دینے کے لئے ایک
فنکار کے ہاتھوں میں برش بہت بیتابی سے مچل رہا ہے ـــــ تڑپ رہا ہے!" [illegible]
محسوس کیا جیسے پُورن سچ مچ تڑپ رہا ہو اور دُور کھڑا میرا حُسن مسکرا رہا ہو!

"شاردا! وقت کبھی نہیں ٹھہرتا۔ جو وقت کے ساتھ نہ چلے، وقت اُسے پیچھے
چھوڑ جاتا ہے۔ وقت کو ہاتھوں سے نہ جانے دو شاردا!" ـــــ اور نہ جانے کیوں
میں اُس کی باتوں پر زور زور سے ہنسنے لگتی۔ اُس کی سنجیدگی اور تڑپ پر مجھے ہنسی
آجاتی۔

لیکن ایک فنکار کا برش میرے حُسن کا لمس محسوس کر سکا ہے [illegible]
[illegible] وقت بیت گیا [illegible] پُورن [illegible]
[illegible] ـــــ [illegible] ـــــ میرا [illegible] ـــــ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
پتھر کی طرح! [illegible]
کہہ دیا "وہ خوبصورت شاردا مر گئی؟"

میرا حُسن لُٹ چکا تھا اور وقت [illegible]

میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا کہ دنیا کی پرچھائیں، رنگینی اور چہل پہل میرے لئے
اجنبی ہو گئی۔ میں ان ہنگاموں سے دور رہنے لگی۔ لیکن ایک دن میں بازار سے
خاموش گزر رہی تھی کہ میری نظر پُورن پر پڑی۔ میں اسے دیکھ کر بوکھلا گئی اور نظر
بچا کر بھاگ جانا چاہا۔ میں تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ لیکن جلد ہی میں نے ایک جانی پہچانی
آواز سُنی۔ وہاں مجھے پُورن پکار رہا تھا۔ لیکن میں نہ رکی اور پھر اچانک کسی نے میرا
ہاتھ تھام لیا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا۔ وہ پُورن تھا۔ "آپ؟" میں نے جان بوجھ کر حیرت کا
اظہار کیا اور وہ مُسکرا دیا۔

"آپ نے مجھے اتنی جلدی کیسے پہچان لیا؟" میں نے پوچھا وہ پھر مُسکرا دیا۔
میں نے سوچا اس نے صدیوں پرانے کھنڈروں میں ایک خوبصورت محل دیکھا تھا۔
بھلا مجھے کیسے وہ پہچان لیتا —— میں بھی تو ایک کھنڈر ہوں —— اپنے حُسن و
شباب کا اُجڑا ہوا مجھے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ وہاں ہم نے ساتھ ہی چائے پی۔
دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر اس نے مجھے کچھ ایسی تصویریں دکھائیں جو اُس نے
میری عدم موجودگی میں بنائی تھیں۔ لیکن میری آنکھوں کے سامنے وہ لمحات تھے،
جب وہ میری تصویر بنانے پر بضد تھا اور اُس کی تمنا پُوری نہ ہو سکی تھی —— اور
میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ میری بھیگی بھیگی آنکھوں کے سامنے پری محل
کی تصویر گھوم رہی تھی۔

"میں آپ سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں۔"

"مانگو شاردا! جو مانگنا چاہتی ہو۔" اُس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"صرف پری محل کی تصویر!"

"شاردا!" اُس نے میری طرف دیکھا۔ "میرے پاس پری محل کی دو
تصویریں ہیں۔ تم دونوں ہی لے لو۔" وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور دیوار پر لٹکی ہوئی ایک
تصویر اُتار کر میری طرف بڑھائی۔

"اور دوسری؟" میں نے پری محل کی وہ تصویر پکڑتے ہوئے پوچھا۔ اُس نے
جھٹ میز کی دراز سے دوسری تصویر نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تصویر
میں نے تمہارے جانے کے بعد بنائی تھی۔" میں نے تصویر دیکھی —— اور
تصویر کی ... —— میرے ہاتھ کانپنے لگے، میرا سارا جسم کانپنے لگا



اور میری نگاہوں میں میرا اپنا شباب گھومنے لگا۔ پھر میں پاگلوں کی طرح چیخ اُٹھی۔
"پُورن . . . ! یہ میری تصویر —— یہ میرا حُسن!"

"ہاں شاردا! یہ تمہارا حُسن ہے۔ جسے میں نے امر کر دیا ہے! —— کبھی نہ ختم ہونے
والا حُسن! شاردا! چہرہ تو صرف ایک آئینہ ہوتا ہے۔ تمہارا حُسن تو اِس تصویر میں ہے۔ تمہاری یہ
تصویر جہاں میں نے وقت کی رفتار روک دی ہے۔ مت رو شاردا! مت رو۔" لیکن
میں روتی رہی اور گھنٹوں روتی رہی۔ پھر میں خود بخود خاموش ہو گئی۔

"کیا آپ جانتے تھے کہ میرا حُسن اتنی جلدی ڈھل جائے گا؟" میں نے
اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"شاردا!" اُس نے دونوں تصویریں پیک کیں اور میری طرف بڑھاتے
ہوئے کہا —— "کیا تم نہیں جانتی ہو کہ ایک خوبصورت کِھلا ہوا پھول چند ہی
دنوں کا مہمان ہوتا ہے؟"

ایک چھوٹی سی بات —— لیکن کتنا وزن ہے اس چھوٹی سی بات میں! ...
... تصویریں ... —— وہ کھنڈروں کی تصویریں!!

معاف کرنا! ان کھنڈروں کے بجائے ایک عالیشان محل میں۔۔۔ میں کچھ سمجھ نہیں رہی ہوں۔" میں اس آرٹسٹ سے مخاطب ہوئی۔ اس نے کچھ اس انداز سے میری طرف دیکھا جیسے نیند سے اچانک بیدار ہوا ہو ــــ اور پھر دیکھتا ہی رہا۔ میں جھنجلا سی گئی۔

"جی! میرا نام شاردا ہے اور اسی شہر میں رہتی ہوں۔"

"ہوں ــــ!" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "بیٹھئے۔" اور میں بیٹھ گئی۔ "ویسے بھی آپ کا نام آپ کے حسن کے ساتھ یوں میل کھاتا ہے جیسے کنول کے خوبصورت پھولوں کا نام کنول!" میں نے سوچا، یہ کوئی بے وقوف سا آدمی ہے، جو شاید مجھے اکیلی سمجھ کر اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگا ہے۔ پھر میں نے دیکھا چند سیاح ان کھنڈروں میں گھوم پھر رہے تھے۔ میری ہمت بندھ گئی۔

"معاف کرنا! شاید آپ میری باتوں کا برا مان گئیں۔" اس نے میری طرف گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں آرٹسٹ ہوں۔ میرا نام پورن ہے۔ کبھی کوئی خوبصورت چیز دیکھتا ہوں تو میری زبان سے 'واہ' نکل جاتی ہے۔ امید ہے آپ برا نہ مانیں گی۔" میں اس کی بات سن کر مسکرائی۔

"میں نے آپ سے اس تصویر کے بارے میں پوچھا تھا۔"

"ہاں! آپ نے ٹھیک پوچھا ہے۔" اس نے ان کھنڈروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مغل شہزادے داراشکوہ نے اس محل کے لئے کتنی خوبصورت جگہ چنی تھی۔ جہاں حسن ہی حسن تھا ــــ منہ بولتا حسن! ــــ لیکن پھر بھی تنہائی ہے۔ ایک پُرسکون تنہائی! پھر میں نے سوچا، کیوں نہ اس محل ہی کی تصویر بناؤں۔ اب کچھ ان کھنڈروں کی مدد سے اور کچھ اپنے زورِ تخیل سے اس محل کی تصویر بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

پری محل اور ایک مغل شہزادہ داراشکوہ!

پری محل اور ایک آرٹسٹ پورن!

ان آرٹسٹ لوگوں کے تخیل کی پرواز بھی کتنی بلند ہوتی ہے! جو محل آج سے سینکڑوں سال پہلے داراشکوہ نے تعمیر کروایا تھا، آج سینکڑوں سال بعد اُسی محل کی ہو بہو تصویر پورن بنا رہا تھا! میں پورن کے فن کی قدردان بن گئی۔ چند ملاقاتوں نے مجھے اس کے بہت قریب کر دیا۔

پھر ایک دن میں نے پورن کے اسٹوڈیو میں وہی تصویر مکمل پائی ــــ ایک خوبصورت تصویر ــــ عہدِ رفتہ کا پری محل ــــ اور ــــ اور یہ پری محل کے کھنڈر! میرے سامنے تصویر کے دونوں پہلو تھے۔

اب اکثر ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ہوٹلوں میں، کلبوں میں، سنیماؤں میں، باغوں اور بازاروں میں اور ہم پہروں باتوں میں کھوئے رہتے۔

"شاردا!" ایک دن اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "[illegible]" اور میں مسکرانے لگی۔

"شاردا! میں تمہارے حسن کو امر بنا دینا چاہتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہاری ایک خوبصورت تصویر بنا کر!" اور میں [illegible] آنکھوں کے سامنے پری محل کی ایک خوبصورت تصویر گھومنے لگی ــــ [illegible] کوئی نگینہ جڑا ہو!

"شاردا! تمہارے بے پناہ حسن کو تصویر کا روپ دینے کے لئے ایک فنکار کے ہاتھوں میں برش بہت بیتابی سے مچل رہا ہے ــــ تڑپ رہا ہے!" مجھے ایسا محسوس کیا جیسے پورن سچ مچ تڑپ رہا ہو اور دور کھڑا میرا حسن مسکرا رہا ہو!

"شاردا! وقت کبھی نہیں ٹھہرتا۔ جو وقت کے ساتھ نہ چلے، وقت اُسے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ وقت کو ہاتھوں سے نہ جانے دو شاردا!" ــــ اور نہ جانے کیوں میں اس کی باتوں پر زور زور سے ہنسنے لگتی۔ اس کی سنجیدگی اور تڑپ پر مجھے ہنسی آ جاتی۔

لیکن ایک فنکار کا برش میرے حسن کا لمس محسوس نہ کر سکا، اسے چھو نہ سکا۔ اپنے رنگوں میں سمو نہ سکا۔ وقت بیت گیا۔ اب میرے اور پورن کے درمیان ایک دیوار تھی ــــ کیپٹن راجیش ــــ میرا منگیتر ــــ ایک رنگین مزاج کا آدمی جس کا ہر وقت کھاتے رہو، پیتے رہو اور ہنستے رہو۔ وہ مجھے بہت اچھا آدمی معلوم ہوا اور بہت جلد میں اس کے ساتھ گھل مل گئی۔ پھر ایک دن میں نے محسوس کیا جیسے پری محل اور ایک فنکار زندگی کے سفر میں مجھ سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور میں اپنے ہونے والے جیون ساتھی کے ساتھ بہت آگے نکل آئی ہوں۔

ہاں! یہ میری آپ بیتی ہے۔

داراشکوہ نے پری محل تعمیر کروایا تو وہ بیکاریک کسی بھونچال کے جھٹکے سے نہیں گرا، بلکہ زمانے کے رنگ دیکھتے دیکھتے اپنا رنگ کھو بیٹھا ــــ اور کھنڈروں کی صورت اختیار کر لی۔ لیکن ــــ لیکن میں نے زمانے کے رنگ نہیں دیکھے، آگ کا ایک شعلہ تھا ــــ جو بھڑکا اور میرے چہرے پر گرا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے میرا تمام حسن لُٹ کر راکھ ہو گیا! میں بہت روئی، چیخی اور تڑپی اور پھر خاموش ہو گئی۔ ایک بُت کی طرح ایک پتھر کی طرح! پھر مجھے کوئی نہ پہچان سکا۔ راجیش بھی نہیں۔ اس نے تو یہ کہہ دیا۔ "وہ خوبصورت شاردا مر گئی!"

میرا حسن لُٹ چکا تھا اور وقت میرے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔

میرا دل رک سے اُٹھ گیا۔ دُنیا کی پُرجوشی، رنگینی اور چہل پہل میرے لئے بے معنی ہو گئی۔ میں ان ہنگاموں سے دور دور رہنے لگی۔ لیکن ایک دن میں بازار سے جا رہی تھی کہ میری نظر تم پر پڑی۔ میں تمہیں دیکھ کر بوکھلا گئی اور نظر بچا کر بھاگ جانا چاہا۔ میں تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ لیکن جلد ہی میں نے ایک جانی پہچانی آواز سنی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔ لیکن میں نہ رکی اور پھر اچانک کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ پورن تھا۔ "آپ؟" میں نے جان بوجھ کر حیرت کا اظہار کیا اور وہ مسکرا دیا۔

"آپ نے مجھے اتنی جلدی کیسے پہچان لیا؟" میں نے پوچھا۔ وہ پھر مسکرا دیا۔ میں نے سوچا اس نے صدیوں پرانے کھنڈروں میں ایک خوبصورت محل دیکھا تھا۔ بھلا مجھے کیسے نہ پہچان لیتا ——— میں بھی تو ایک کھنڈر ہوں ——— اپنے حُسن و شباب کا! پھر وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ وہاں ہم نے ساتھ ہی چائے پی۔ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر اس نے مجھے کچھ ایسی تصویریں دکھائیں جو اس نے میری عدم موجودگی میں بنائی تھیں۔ لیکن میری آنکھوں کے سامنے وہ لمحات تھے، جب وہ میری تصویر بنانے پر بضد تھا اور اس کی تمنا پوری نہ ہو سکی تھی ——— اور میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ میری بھیگی بھیگی آنکھوں کے سامنے پری محل کی تصویر گھوم رہی تھی۔

"میں آپ سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں۔"

"مانگو شاردا! جو مانگنا چاہتی ہو۔" اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"صرف پری محل کی تصویر!"

"شاردا!" اس نے میری طرف دیکھا۔ "میرے پاس پری محل کی دو تصویریں ہیں۔ تم دونوں ہی لے لو۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دیوار پر لٹکی ہوئی ایک تصویر اُتار کر میری طرف بڑھائی۔

"اور دوسری؟" میں نے پری محل کی وہ تصویر پکڑتے ہوئے پوچھا۔ اس نے جلد میز کی دراز سے دوسری تصویر نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تصویر میں نے تمہاری غیر حاضری میں بنائی ہے۔" میں نے تصویر دیکھی ——— اور ——— اور پھر دیکھتی ہی رہ گئی ——— پھر میرے ہاتھ کانپنے لگے، میرا سارا جسم کانپنے لگا اور میری نگاہوں میں میرا اپنا شباب گھومنے لگا۔ پھر میں پاگلوں کی طرح چیخ اٹھی۔

"پورن ... یہ میری تصویر ——— یہ میرا حُسن!"

"ہاں شاردا! یہ تمہارا حُسن ہے۔ جسے میں نے امر کر دیا ہے! ——— کبھی ختم ہونے والا حُسن! شاردا! چہرہ تو صرف ایک آئینہ ہوتا ہے۔ تمہارا حُسن تو اس تصویر میں ہے۔ تمہاری یہ تصویر جہاں میں نے وقت کی رفتار روک دی ہے۔ مت رو شاردا! مت رو۔" لیکن میں روتی رہی اور گھنٹوں روتی رہی۔ پھر میں خود بخود خاموش ہو گئی۔

"کیا آپ جانتے تھے کہ میرا حُسن اتنی جلدی ڈھل جائے گا!" میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"شاردا!" اس نے دونوں تصویریں پیک کیں اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ——— "کیا تم نہیں جانتی ہو کہ ایک خوبصورت کھلا ہوا پھول چند ہی دنوں کا مہمان ہوتا ہے؟"

ایک چھوٹی سی بات ——— لیکن کتنا وزن ہے اس چھوٹی سی بات میں! پھر میں دونوں تصویریں لے کر خاموش لوٹ آئی ——— دو کھنڈروں کی تصویریں!!

... اس بار بھی "بیسویں صدی" کا سالنامہ معیار، انتخاب اور حُسنِ ترتیب کے اعتبار سے تمام تر روایتی اور رنگا رنگ دلچسپیوں کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس شمارہ کے مطالعہ سے محترم خوشتر گرامی کی اُردو زبان اور اُردو ادب کے ساتھ محبت و خلوص اور اُن کی فنی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے ——— زیرِ نظر شمارہ میں ابتدائی صفحات جو مصور ہیں مخصوص فنکاروں کے لئے وقف کئے گئے ہیں جن میں ان فنکاروں سے اپنی زبان سے خود کو متعارف کرایا ہے اور اس طرح "بیسویں صدی" نے ملک کے کئی مشاہیر کو اُردو سے براہِ راست تعارف کا موقع فراہم کیا ہے ——— حسبِ روایت زیرِ نظر شمارہ میں بھی ہندوستان کے سرکردہ افسانہ نگاروں کی کاوشوں کو شریکِ اشاعت کیا گیا ہے ——— خوشتر گرامی کے تیر و نشتر، فکر تونسوی کا طنزیہ "میری بھارت یاترا" قارئین کے ذہنوں کو کبھی آسودگی بخشتے ہیں تو کبھی تشنگی ...

بہار برنی رُکن ادارۂ تحریر "الجمعیۃ" دہلی

یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا اپنے یونٹ ہولڈروں کے لئے ملک کی بڑھتی ہوئی خوشحالی میں معقول حصہ کماتا ہے۔

یونٹوں کے باعث ملک کی خوشحالی آپ کی خوشحالی ہے۔ آپ یونٹ خرید کر ملک کی صنعتی اور زرعی ترقی میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اس طرح لگے ہوئے سرمایہ سے خوب منافع کا مطلب ہے کہ آپ کو اپنے یونٹوں پر ہر برس منافع ملے گا۔

- یونٹ کسی بھی ڈاک گھر، بینک اور سند یافتہ ایجنٹوں اور دلالوں سے مل سکتے ہیں۔
- محفوظ سرمایہ، معقول منافع
- 1000 روپے تک آمدنی ٹیکس سے بری
- یونٹ آسانی سے بھنائے جا سکتے ہیں۔

69/442

# غزلیں

سید نظر رضوی ایم اے

وابستہ اک فریب محبت میں کھا لیا
خود ہم نے زندگی کو تماشا بنا لیا

رنج و خوشی کا اب کوئی احساس ہی نہیں
آخر رضائے دوست کا مقصود پا لیا

کیا رہ گیا ہے اُس کو اُجالوں سے واسطہ
جس نے خود اپنے گھر کا دیا تک بجھا لیا

اُس کی ستم طرازی کا انداز دیکھئے
ہم سے جفا کے بدلے میں عہدِ وفا لیا

ہم نے خوشی کی چاہ کو اب چھوڑ کر نظرؔ
سارے جہاں کے درد کو اپنا بنا لیا

پروفیسر ایم۔ اے حفیظ ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ

احترامِ وقت کرنا چاہیئے
وقت سے آگے بھی دیکھا چاہیئے

کوئی ارماں، کوئی حسرت، کوئی غم
اور جینے کے لئے کیا چاہیئے؟

اشتیاقِ دید ہی کافی نہیں!
دیکھنے کو چشمِ بینا چاہیئے

ہر قدم اِک حشر کا سامان ہے
وقت کی رفتار دیکھا چاہیئے

باغ کی رنگینیوں کو کیا ہوا
باغبانوں سے یہ پوچھا چاہیئے

سعادت نظیر ایم۔ اے

ترے چمن سے گزرنے کو دم بہ دم گزرے
مگر بہ رنگِ صبا بے قرار ہم گزرے

تری جفاؤں کا خوگر ہوں کیا بتاؤں یہ
کہ میرے دل پہ گراں کیوں ترے کرم گزرے

دیارِ دوست میں غم آشنا کوئی نہ ملا
کہوں تو کس سے کہوں؟ دل پہ کیا ستم گزرے

میں جیسے بھول گیا اُلجھنیں مقدر کی
نظر سے کیا تری زلفوں کے پیچ و خم گزرے

خیال اب اُنھیں آیا ہے اپنے وعدوں کا
جب اعتبار کی حد سے نظیرؔ ہم گزرے

---

نصر قریشی ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی

کس کی خوشبو تے قبا موجِ صبا لائی ہے
کیف میں ڈوبی ہوئی، کیوں مری تنہائی ہے

دشتِ تنہائی سے گھبرا کے ترے کوچے میں
چاندنی رات دبے پاؤں چلی آئی ہے

کوئی دمساز نہیں راہِ طلب میں دل کا
زندگی جیسے کہ شمعِ شبِ تنہائی ہے

ہر خوشی چار گھڑی ساتھ رہی، روٹھ گئی
اک تری یاد ہی ہر گام پہ ساتھ آئی ہے

# ہمسفر تھکے تھکے...

دلشاد علی خاں ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

ڈسٹرکٹ ایمپلائمنٹ ایکسچینج، علی گڑھ (یو۔ پی)

خوش رہیں بھیا! آداب

"پیار کی پرچھائیاں" کے بعد "ہمسفر تھکے تھکے" پھر آپ کے خلوص کی چھاؤں تلے دم لینے کے لئے آگے بڑھ لئے ہیں ـــــ لوگ کہتے ہیں عورت کی محبت اور وفاداری حالات کے ساتھ سایوں کی طرح گھٹتی بڑھتی رہتی ہے اور ـــــ تاریکیوں میں اکثر ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے پھر بھی میں اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ وہ تہمت ہے جو ہمیشہ سچ نہ ہوتی ہوگی۔ میری "سُنیتا" کا کردار اسی الزام کی تردید ہے . . .

خیر اندیش ـــــــــ دلشاد

ندی کے کنارے کھڑی ہوئی زمیندار صاحب کی حویلی پر جگمگاتی ہوئی بے شمار روشنیوں نے رات کے تاریک چہرے پر روشنی کے دھبّوں کو بہت دُور تک پھیلا دیا۔ زمیندار صاحب کی اکلوتی بیٹی سُنیتا کی شادی کی خوشیوں کے رنگ بستی کے چپّے چپّے پر نمایاں طور سے بکھرے نظر آنے لگے۔ غریبی اور مفلسی کو پناہ دینے والے گلی کوچوں میں پہلی بار دولت کے اُجالوں میں تنہائی رات کی تاریکیاں اس طرح مدھم پڑ گئیں جیسے سہاگن ہونے کا خیال کسی نوعمر بیوہ کے ذہن سے اچانک وقتی طور سے تنہائی اور بے بسی کے احساس کو چُرا لے گیا ہو لیکن ندی کا پانی ـــــ ان تمام ہنگاموں اور روشنیوں کے احساس سے بے نیاز اپنے روایتی سکوت کو برقرار رکھے بہتا رہا۔ کیونکہ اس میں تو حویلی سے کہیں زیادہ بلندیوں پر جگمگانے والے چاند ستارے برسوں سے آنکھ مچولی کھیلتے آ رہے تھے۔ حویلی کی روشنیاں تو ایک لہر کی مانند تھیں جو وقتی طور سے ارتعاش پیدا کر کے کنارے سے ٹکرا کر کھو جاتی ہیں۔

دُلہن کی طرح سجی دھجی حویلی کے ایک کمرے میں آنے والے خوبصورت لمحات کے تصوّر میں کھوئی ہوئی سُنیتا تنہا قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی خود کو گھورتی رہی۔ وہ بھرپور طور سے اپنے کنوارے جسم کا جائزہ لے رہی تھی۔ کبھی اپنی گوری گوری سڈول بانہوں کو دیکھتی، کبھی اس کی نگاہیں اپنی سیاہ آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوب جاتیں اور ـــــ کبھی اس کا ذہن اپنی زلفوں کے پیچ و خم میں اُلجھ کر رہ جاتا۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے موتی جیسے صاف شفاف دانت اور چہرے پر بکھری ہوئی معصومیت ـــــ اس نے خود پر بے ساختہ اتنا پیار آیا کہ بے خودی میں خود اپنے چہرے کو آئینے میں چوم لیا اور پھر اس کے شانوں سے ڈھلک کر دوپٹہ اس کی بانہوں پر آ رہا۔ خود اپنے شباب کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیا سے جھک گئیں۔ وہ اس طرح شرمائی جیسے آئینے نے اس کے اُبھرے ہوئے سینے میں دل کی دھڑکنوں کو چھو کر دیکھ لیا ہو۔ پھر اس نے سُرخ دوپٹے سے اپنے چہرے کو چھپا کر کانپتے ہاتھوں سے گھونگھٹ اُٹھا کر دیکھا۔ لطیف احساس کی شدّت سے اس کی خوبصورت آنکھوں پر گھنی پلکوں کی چلمن گر بھی نہ پائی تھی کہ اس کے ذہن کو ایک دم جھٹکا سا لگا۔ ماضی کی یادوں نے بے چینی سے ذہن کے تاریک گوشوں میں انگڑائی لے کر کروٹ بدلی۔ بھولے بسرے خیالات دل میں سر اُٹھانے لگے۔ وہ سوچنے لگی ـــــ جب راجو کے ساتھ بیٹھ کر وہ مستقبل کے خوابوں کو سجایا کرتی تو راجو اس کے چہرے پر دوپٹہ کھینچ کر گھونگھٹ نکال کر اس کے چہرے کو دیکھا کرتا۔ سُنیتا کے کانوں میں راجو کی آواز رس گھولنے لگی۔ وہ کہا کرتا "سُنیتا تمہارا گھونگھٹ اُٹھا کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ہاتھوں نے حُسن کے خزانوں کو بے نقاب کر دیا ہو" اور پھر ـــــ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے راجو کی پلکوں نے پھر اس کے رُخساروں کو چھو لیا ہو۔ وہ ایکدم چونک پڑی۔ لیکن ماضی کے تصوّر میں اتنا نشہ تھا کہ وہ یادوں کی

دنیا میں کھوئی ہوئی بے اختیار پوچھ اٹھی: "بتاؤ راجو! کیسی لگ رہی ہوں میں؟" پھر اس کی آنکھیں آئینے پر جم کر پتھرا سی گئیں۔

"میرے پاس آؤ سنیتا۔ مجھے اپنا ہاتھ دو۔ میں بتاؤں گا کیسی لگ رہی ہو تم!"

راجو اس کے سامنے کھڑا تھا۔

سنیتا نے لرزتے ہوئے اپنے مہندی رچے ہاتھ راجو کی طرف بڑھا دیئے۔ مستقبل کا ہاتھ ماضی کے حوالے کرکے اُسے بے پناہ سکون ملا اور ایک جانی پہچانی لذت کے احساس نے اس کی آنکھوں پر گھنی پلکوں کے پردے گرا دیئے۔ وہ یادوں کے گہرے سمندر میں ڈوب گئی۔

"تمھیں یاد ہے سنیتا؟" راجو نے پوچھا: "بچپن میں ہم دونوں ایک ساتھ اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔"

"ہاں۔ ہاں! مجھے یاد آرہا ہے راجو! تم کہے جاؤ میں سن رہی ہوں۔" اور وہ راجو کا ہاتھ تھامے ماضی کی طرف دوڑتی چلی گئی۔ راجو کہتا رہا اور سنیتا سنتی رہی ــــ

"تم اسکول میں ہمیشہ چپ چپ رہا کرتیں، سب سے الگ الگ اور میں ــــ ہر وقت شرارت کیا کرتا۔ دن بھر شور مچاتا، کبھی کسی سے لڑتا کبھی کسی سے جھگڑتا۔ اپنے ساتھیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے پر اکثر پٹائی ہوا کرتی۔ مجھے پٹتے ہوئے دیکھ کر سب ساتھی خوش ہوا کرتے۔ لیکن تمھارے معصوم چہرے پر اُداسی کے رنگ گہرے ہو جاتے اور ایک دن جب میں نے بورڈ پر پنڈت جی کی بھونڈی سی تصویر بنا دی تو وہ غصے سے پاگل ہو گئے۔ مجھے دیوانہ وار مارنے لگے۔ میرے ہاتھوں پر وہ بید مارتے رہے۔ میں چلاتا رہا، تلملاتا رہا، چیخ چیخ کر کہتا رہا 'پنڈت جی! مجھے معاف کر دیجئے، میں اب کبھی ایسا نہ کروں گا!' لیکن انھوں نے میری ایک نہ سنی۔

اچانک تم زور زور سے رونے لگیں تو تمھاری آواز نے ایک دم جیسے پنڈت جی کے ہاتھوں کی جان کھینچ لی۔ ان کے ہاتھ رُک گئے اور وہ گھبرا کر کلاس سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد تم نے کتنے بھولے پن سے کہا تھا: 'بھگوان کرے مر جائے یہ پنڈت کا بچہ!' اور پھر تم نے بہت پیار سے اپنے ننھے منے ہاتھوں سے میرے ہاتھ پر چوٹ کے سرخ نشانوں کو مٹانے کی کوشش کی۔ تم میرے ہاتھوں پر اپنے ہاتھوں کو زور زور سے رگڑتی رہیں۔ اس کے بعد ــــ اس کے بعد سنیتا تم میرا ہاتھ پکڑے پکڑے گھر تک چھوڑنے گئیں۔ تم تمام راستے پنڈت جی کو بُرا بھلا کہتی رہیں۔

پھر ہم ہر وقت ساتھ رہنے لگے۔ ساتھ آتے، ساتھ جاتے، ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ اسکول جاتے وقت میں تمھارا انتظار کیا کرتا اور تم روز تالاب کے دوسرے کنارے سے مجھے زور سے پکارتیں۔ 'راجو ــــ آیا سنیتا!' میں چلاتا ہوا بھاگا چلا جاتا تمھارے پاس! اور پھر ہم ہنستے، کھیلتے کودتے اسکول چلے جاتے۔

یاد ہے سنیتا تمھیں؟ ایک دن تم مجھے آواز دیئے بغیر ہی اسکول چلی گئی تھیں۔ میں تمھارا انتظار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دن ڈھل گیا اور شام ہو گئی۔ جب تم لوٹ کر آئیں تو میں نے بڑے غصے سے کہا تھا، 'او سنیتا کی بچی! آج کیوں چلی گئی تھیں اکیلی تم مجھے؟'

'میں کوئی تمھاری نوکر تھوڑی ہوں جو روز روز تمھاری راہ تکا کروں مجھے کیسی! تم بھی اکڑ کر بولیں اور پھر ــــ پھر سنیتا میں نے تمھارے منہ پر بہت زور سے طمانچہ مار دیا۔ تمھاری آنکھوں میں آنسو چھلک آئے لیکن تم اس طرح خاموش رہیں جیسے تمھیں مار کر میں نے اپنے کسی جائز حق کا استعمال کیا ہو۔ تمھاری خاموشی پر نہ جانے کیوں مجھے پنڈت جی کے اپنے اوپر اٹھتے ہوئے ہاتھ یاد آ گئے، تمھاری سسکیاں میرے کانوں میں گونج اٹھیں۔ اتنی تکلیف کے احساس سے میں پھر بلبلا اٹھا، میں نے اپنے ہاتھوں سے تمھارے گالوں کی سرخی مٹانے کی کوشش کی اور تم سب کچھ بھلا کر ہنس دیں۔ اس کے بعد ہم کبھی نہ لڑے۔ کھیلتا کودتا بچپن جوانی کی حدود میں داخل ہو گیا تو تمھارے باپو نے تمھیں اسکول سے اٹھا لیا۔ منشی جی اور پنڈت جی تمھیں گھر پر پڑھانے آنے لگے۔ تالاب کے کنارے تمھاری آواز کو ترس گئے، اسکول کے راستے اُداس اُداس سے ہو گئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا وہ پوچھ رہے ہیں راجو تمھاری سنیتا کہاں گئی؟ تم اکیلے کیوں آتے ہو؟ لیکن تم میرا ساتھ دیتی رہیں۔ تم حویلی کی چھت پر کھڑے ہو کر میرے اسکول جانے کے وقت ہاتھ کا اشارہ کیا کرتیں اور میں ــــ میں تمھارے خاموش اشاروں کو دیکھتا دیکھتا بہت دور نکل جاتا۔ فاصلوں کے بڑھنے پر تم دھندلاہٹ میں کھو جاتیں۔

اسکول سے واپس آکر میں روز تمھارے گھر آیا کرتا۔ ہم بہت دیر دیر تک تنہائی میں باتیں کرتے رہتے۔ ایک دن جب کسی بات پر میں نے ہلکے سے تمھارے گال پر تھپکی دی تو تمھاری ممو نے کہا: 'راجو! سنیتا کو نہ چھوا کرو۔ اب تم دونوں بڑے ہو گئے ہو۔'

ممو کے اس جملے نے پہلی بار یہ احساس دلایا کہ اب ہم جوان ہو گئے ہیں۔ اس دن سے ہمارے سوچنے کا انداز اچانک بدل گیا۔ تم میں نہ جانے کہاں سے ایکدم اتنی تبدیلیاں آ گئیں کہ تم بات بات پر شرمانے لگیں۔ تمھاری نگاہوں نے شرم سے جھکنا سیکھ لیا۔ باتیں کرنے میں تمھارا نچلا ہونٹ اکثر دانتوں کی گرفت میں آجاتا۔ تم بار بار اپنا دوپٹہ سنبھالنے لگتیں۔

یاد ہے سنیتا، ایک رات تم چھت پر لیٹی ہوئی آسمان کی بیکراں وسعت میں بکھرے ہوئے ستاروں اور چاند کی دنیا میں کھوئی نہ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ میں دبے دبے پاؤں تمھارے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر تم ایکدم بیٹھ گئیں۔ میں نے چاند کی طرف اشارہ کرکے کہا: 'دیکھو راجو! وہ چاند کتنا خوبصورت نظر آرہا ہے؟'

'بہت پگلی! وہ دھنیہ تھوڑی ہے۔'

'تو کیا ہے وہ؟' تم نے بہت حیرت سے پوچھا۔

'وہ تو چکوری ہے جو ہر رات چاند کو چھونے کے لئے آسمان کی طرف اڑتی ہے اور۔ ۔' تم نے میری بات کاٹ دی: 'وہ پہنچ جاتی ہے کیا چاند تک؟'

'نہیں سُنیتا! وہ بہت اونچائی تک چلی جاتی ہے۔ لیکن فاصلے طے ہی نہیں ہو پاتے کہ چاند چھپ جاتا ہے اور وہ بیچاری تھک کر زمین پر گر جاتی ہے۔'

تم ۔۔۔۔ نہ جانے کس سوچ میں کھو کر چاند اور چکوری کو گھورتی رہیں۔

'کیا سوچ رہی ہو سُنیتا؟'

'کچھ نہیں۔' تم نے میری طرف دیکھ کر کہا: 'راجو! میرا من بہت گھبراتا ہے۔'

تم پھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

'کیوں؟'

'تم جو نہیں ہوتے ہو میرے پاس!' اور تمھاری آنکھیں چاند سے ہٹ کر زمین پر گڑ گئیں۔ میرے کانوں میں ایکدم سیٹیاں سی بج اُٹھیں۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ تمھارے منہ سے پہلی بار محبت کا ادھورا اعتراف سُن کر میرے سارے جسم سے آگ سی نکلنے لگی اور سُنیتا ۔۔۔۔ اُسی چاند کی چاندنی میں میرے تمھارے سائے سمٹ کر پہلی بار یکجا ہو گئے۔ ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ہم یونہی خاموش کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ چاند تمھاری حویلی سے ہوتا ہوا دُور مندر کی چوٹی کے پیچھے جا کر ڈوب گیا۔ پورب سے روشنی کی ہلکی ہلکی کرنیں پھوٹ نکلیں۔

پھر ہم اسی طرح چوری چھپے ملنے لگے۔ تم حویلی کے دروازے پر کھڑی میرا انتظار کیا کرتیں۔ جب ساری بستی رات کی سیاہ چادر میں لپٹی چین کی نیند سوتی تب خوف اور خوشی کے مِلے جُلے تاثرات سے زور زور سے دھڑکتے ہوئے دلوں کو اپنے سینے میں چھپائے ہم ساری ساری رات باتیں کیا کرتے۔

پھر تمھاری فطرت میں آنے والی تبدیلیوں نے، تمھاری بے چینیوں اور گھبراہٹ نے، تمھارے ہر آہٹ پر چونک جانے نے سب کچھ کہہ دیا۔ محبت کی رنگین تصویر کے نقوش تمھارے چہرے پر صاف صاف اُبھر آئے۔ تمھاری تنہائیاں تم سے چھن گئیں، گھر کے افراد کی نگاہیں ہر وقت تمھارا تعاقب کرنے لگیں، حویلی کی کارگزاری پر بدنامی کے منڈلاتے ہوئے سایوں کے خوف سے سورج ڈوبتے ہی دروازے بند ہونے لگے۔ تم سے مِلنا دُشوار ہو گیا لیکن سُنیتا ۔۔۔۔ جب محبت کے شعلے دلوں میں بھڑک اُٹھتے ہیں تو انھیں پابندیاں دبا پاتی ہیں نہ قید و بند! تم ہر چیز کو ٹھکرا کر، ہر زنجیر کو توڑ کر جب بھی موقع مِلتا مجھ سے ملنے آ جاتیں۔

تمھیں یاد ہے سُنیتا! برسات کی وہ اندھیری رات جب تالاب کے پاس میرے کاندھے پر سر رکھے تم نہ جانے کیا کیا باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے ہنس کر پوچھا تھا 'سُنیتا! اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا کہو گی تم؟'

'کہہ دوں گی میرا راجو ہے۔ اِس کے پاس بیٹھی ہوں کسی کو کیا!'

'سچ کہہ رہی ہو سُنیتا؟' میں نے تمھاری آنکھوں میں جھانک کر پوچھا تو تم بولیں: 'اچھا۔ تو کیا تمھیں بھی وِشواس دلانا پڑے گا؟' اور پھر میں نے تمھاری طرف دیکھا، تمھارا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا ۔۔۔۔ دھک، دھک، دھک، تمھارا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

دفعتاً آسمان پر گہرے بادلوں کے پیچھے سے چاند نے جھانکا۔ اندھیری رات کے سنّاٹے میں شور برپا کرنے والی مینڈکوں اور جھینگروں کی آوازیں ایکدم تھم گئیں۔ اچانک طاری ہو جانے والی اس خاموشی نے ماحول کو بے حد بھیانک

بار بار [illegible] گئیں۔

[illegible] صاحب [illegible] کھڑے تھے۔

[illegible] صاحب ایکدم خاموش ہوگئے: "گھر چلو سُنیتا! بس رات اکھر کرو..."

[illegible] اور [illegible] شعوری طور پر ہمارے قدم حویلی کی طرف اُٹھنے لگے۔ چاند پھر بادلوں میں چھپ گیا۔

پھر ایک طوفان آیا۔ انقلاب برپا ہوگیا۔ لیکن حویلی کے در و دیوار جنھوں نے دولت اور شراب کی رنگین محفلوں میں کتنی ہی بے بس اور مجبور عصمتوں کو پامال ہوتے دیکھا تھا، خود اپنے وقار کے ڈگمگانے پر بھی یونہی خاموشی سے ہر راز کو اپنے اندر چھپائے رہے۔ مگر محبت کے مقدس سایوں کا حویلی پر اتنا خوف ضرور طاری ہوا کہ اس کے بعد رات کی تاریکیوں میں منہ چھپائے کسی مفلس کی لٹتی ہوئی آبرو ڈگمگاتے قدموں سے اُدھر سے نہ گزری۔

پھر سُنیتا ——— ایک رات کو تم گھبرائی ہوئی آئیں میرے پاس۔ تم نے میرا ہاتھ تھاما اور دوڑتی چلی گئیں بھگوان کے مندر کی طرف۔ میں حیرانی سے پوچھتا رہا۔ "سُنیتا بتاؤ تو سہی کیا بات ہے؟" لیکن تم بس یہی کہتی رہیں: "راجو بھگوان کے لئے میری لاج رکھ لو۔ مجھے پاپ کے اندھیروں میں مت دھکیلو!" تمھاری گھبراہٹ دیکھ کر میں یہی سمجھا کہ تم پاگل ہوگئی ہو۔ پریم نے تمھارے ذہن سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں چھین لی ہیں۔

ہم مندر پہنچ گئے۔ تم نے بھگوان کی مورتی کے سامنے کھڑے ہوکر مجھ سے وچن مانگا: "راجو میرا ہاتھ تھام کر وچن دو کہ تم ہمیشہ میرے رہوگے!" تم کہتی رہیں۔ "عورت جیون میں ایک ہی بار کسی کی ہوتی ہے۔ جو اس کے ہاتھ کو پہلی بار چھوتے وہی اُس کا دیوتا ہوتا ہے۔ اُسی کے چرنوں میں جیون بِتانا عورت کا دھرم ہے؟" اور سُنیتا ——— پھر بھگوان کے سامنے کھڑے ہوکر ہم نے قسم کھائی اور وچن دیا کہ آج کے بعد ہم جیون ساتھی بن گئے۔ بھگوان کو ساکشی مان کر میرے کانپتے ہوئے ہاتھوں نے تمھاری مانگ میں سہاگ کا سیندور بھر دیا۔ مندر کے گھنٹے بج اُٹھے۔ اُن کی آواز رات کے سکوت کا سینہ چیرتی ہوئی ہمارے ذہن میں بسے جدائی کے خوف کی طرح فضاؤں میں تحلیل ہوتی رہی۔ ہمیں سکون مل گیا۔

لیکن سُنیتا ——— سماج کی نظروں میں وہ بھگوان بھی جھوٹا ہے جس نے [illegible] جس کے سامنے [illegible]

[illegible]

ہو جاتے، سماج کے سامنے اگنی کے گرد سات پھیرے [illegible] ایک بھولی لڑکی تھیں، بالآخر مان ہی گئیں کہ بھگوان بھی بھگوان بنتا ہوگا ——— [illegible] دولت کے ٹھیکیداری دھرم کے بارے میں اپنا سیاہ چہرہ چھپا کر اُس کے [illegible] اپنی جھولی بھرلیں۔ مندروں میں بیٹھے بھگوان تو اندھے بہرے [illegible] مورت پتھر کے بُت ہوتے ہوں گے جو نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ سُن سکتے ہیں، [illegible] اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ دنیا میں بھگوان سے بڑا انسان ہے، دھرم سے بڑی دولت ہے۔ محبت ایک لغزش ہے جو عمر کے ایک موڑ پر ہر ایک سے ہو جاتی ہے۔ تم نے سب کے سامنے میرے آگے یہ کہہ دیا۔ "مجھے بھلا دو۔ میرا تمھارا کوئی سمبندھ نہیں ہے۔ مجھ سے ایک بھول ہوگئی تھی!" اس کے بعد تم نے کیا کیا کہا ——— میں نے کچھ نہیں سُنا۔ میرے کانوں میں تمھاری آواز چیخ چیخ کر دہی [illegible] رہی تھی: "راجو بھگوان کے لئے میری لاج رکھ لو۔ مجھے پاپ کے اندھیروں میں مت دھکیلو۔ عورت جیون میں ایک ہی بار کسی کی ہوتی ہے۔ جو اُس کے ہاتھ کو پہلی بار چھوتے وہی اُس کا دیوتا ہوتا ہے، اُسی کے چرنوں میں جیون بِتانا عورت کا دھرم ہے!"

میں تمھاری نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بہت دُور چلا گیا۔ تم یہ [illegible]

میرا پیار جھوٹا تھا۔ میں بھول گیا تھیں۔ میں نے تمھاری کنی پوری کرنے کے لئے کسی اور کو جیون ساتھی بنا لیا ہوگا۔ نہیں سُنیتا ایسا تمھارے اپنے ضمیر کی آواز ہے۔ میں وہی راجو ہوں جس نے ہمیشہ ساتھ دینے کا وچن دیا تھا۔ ہاں البتہ تم ——— تم پریم اور بلیدان کی وہ جھوٹی پجارن نکلیں جس نے خود اپنے ہاتھوں سے محبت کا گلا گھونٹا تم نے پریم اور پوترتا کی خاطر سماج کے سارے بندھن توڑ دئے۔ لیکن ——— جب عزت اور آبرو کی سڑی ہوئی لاش کی خاطر تمھیں محبت کو ٹھکرانے پر مجبور کیا گیا تو تم نے پیار کے تقاضوں کو کچل کر رکھ دیا۔ تم دیوانی ہو گئیں تم نے توڑ دیا انھیں دیوتاؤں کو جن کی تم نے پوجا کی تھی۔ تم بھاگ گئیں اپنے بھگوان کے اس مندر سے جس میں تم نے عورت کے تقدس کی خاطر محبت کے چند مقدس بول شن کر ہی ساتھ جیون بتانے کا وچن دیا تھا۔ بھگوان دیکھ رہا ہے سُنیتا تم خود کو دھوکا دے رہی ہو۔

---

سُنیتا کے کانوں میں مندر کے گھنٹوں کی آوازیں گونج اٹھیں۔ اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ——— راجو کا تصور دُھندلا ہوتا گیا۔ وُہ رات کی تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ لیکن کانوں میں اُس کی آواز سرگوشیاں کرتی رہی ———

تمھیں یاد ہے سُنیتا؟ ایک دن تمھاری حویلی کے پیچھے ندی میں ایک لاش بہی تھی؟ اور غیر شعوری طور پر وہ چلّا اٹھی۔ ہاں راجو مجھے یاد ہے۔ کون تھا وہ؟'

وہ جیسے ایکدم ایک ڈراؤنے خواب سے چونک کر جاگ اٹھی ہو۔ وہ سکتے کے عالم میں تھوڑی دیر بُت بنی آئینے میں گھورتی رہی۔ اُس کی آنکھیں کچھ ڈھونڈنے لگیں۔ اُس نے اپنے ہاتھوں کی مہندی دیکھی، سُرخ جوڑے پر نظر ڈالی۔ اُسے اپنا پُورا جسم خون میں نہایا ہوا نظر آیا۔

'نہیں راجو! نہیں! تمھیں میرے دیوتا ہو، تمھیں میرے بھگوان ہو۔ میں تمھارا ساتھ نہ چھوڑوں گی!' وہ پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی حویلی کی چھت پر چڑھتی چلی گئی۔

ندی کے پانی میں ارتعاش پیدا ہوا۔ لہریں کناروں سے ٹکرائیں اور کھو گئیں۔

حویلی کی روشنیوں پہ اندھیرے مسلّط ہو گئے!!

---

**صحت و زندگی** اِس مفید کتاب کا مطالعہ آپ کے لئے اتنا مفید ثابت ہوگا کہ آپ اسے خود پڑھنے کے بعد اپنے عزیز دوستوں اور رشتہ داروں کو پڑھنے کی ہدایت کریں گے جن کی صحت آپ کو عزیز ہے۔ انسانی جسم کے پیچیدہ سے پیچیدہ اور پوشیدہ سے پوشیدہ امراض کو بلا دوا دُور کرنے کے ایسے آسان طریقے تدابیر اور علاج درج کئے گئے ہیں جن پر عمل کرنے سے آپ بہت سی بیماریوں سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ غذا صحت و شباب اور تندرستی کے متعلق تمام باتیں تفصیل سے لکھی گئی ہیں۔ جن کا جاننا ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ قیمت تین روپے

**فردوسِ گوش** حضرت جوش ملسیانی داغ مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ایسے صاحبِ فن اور صاحبِ فکر کا یہ تیسرا مجموعۂ کلام اپنی مثال آپ ہے۔ یہ کتاب اِس سال کا بہترین ادبی تحفہ ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب، کاغذ عمدہ۔ قیمت صرف چھ روپے

**حرفِ اندیشہ** جناب صغیر احمد صوفی کا دوسرا مجموعۂ کلام۔ ان کی شاعری احساس کی شاعری ہے۔ احساس جو لطیف بھی ہے اور شدید بھی۔ صوفی صاحب نے اپنے ہی سفر میں جو کچھ محسوس کیا شعر کے خوبصورت سانچے میں ڈھال دیا۔ صوفی صاحب کی شاعری یقیناً فکر و خیال اور اسلوب بیان دونوں اعتبار سے تازہ دم ہے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ، خوبصورت جلد، قیمت پانچ روپے

**شرارِ سنگ** ہندوستان کے مقبول و ممتاز شاعر حضرت عرش ملسیانی کا تیسرا مجموعۂ کلام۔ صدر جمہوریۂ ہند جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اِس مجموعے کو بہت پسند فرمایا ہے۔ قیمت آٹھ روپے

**نغمۂ سرمد** شہید سرمد کی فارسی رباعیوں کا ترجمہ اُردو رباعیوں میں۔ از عرش ملسیانی۔ سرمد کے سوانح بھی کتاب میں درج ہیں۔ پہلے اصل رباعی ہے اُس کے نیچے اُردو ترجمہ۔ اُردو اور فارسی ادب اور تصوّف کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نادر تحفہ۔ قیمت پانچ روپے

**تصنیفات جناب محروم**

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| بیکراں | ۲/۵۰ | ابوالکلام آزاد | ۰/۲۵ | | |
| کاروانِ وطن | ۷/۵۰ | ستاروں کے ذروں تک | ۲/۷۵ | رفیع صاحب کے مزار پر | ۰/۲۵ |
| بہارِ طفلی | ۳/۵۰ | وطن میں اجنبی | ۲/۵۰ | | |
| نیرنگِ معانی | ۵/۰۰ | نوائے پریشاں | ۲/۵۰ | ماتمِ سالک | ۰/۲۵ |
| شعلۂ نوا | ۶/۵۰ | اقبال اور اُس کا عہد | ۳/۰۰ | شاعر کی آواز | ۰/۲۵ |
| بچوں کی دنیا | ۴/۰۰ | میرے گزشتہ شب و روز | ۱/۲۵ | انتخابِ کلامِ آزاد | ۱/۰۰ |
| انتخابِ کلامِ محروم | ۱/۰۰ | ماتمِ نہرو | ۰/۷۵ | افکارِ محروم ملک رام | ۵/۰۰ |

**تصنیفات جناب جگن ناتھ آزاد**

| | | | |
|---|---|---|---|
| اجنتا | ۰/۷۵ | رموزِ کلیات فراق | ۲/۵۰ |
| دلّی کی جامع مسجد | ۰/۲۵ | جگن ناتھ آزاد [illegible] کی شاعری، حمید سلطان | ۵/۰۰ |
| تلوک چند محروم | ۴/۰۰ | | |
| اُردو | ۱/۲۵ | | |

# غزلیں

یکپ ایم۔ اے (علیگ)

ں دل میں، جگر میں آگ سی محسوس کرتا ہوں
پھاور ساقی! تشنگی محسوس کرتا ہوں

گزرتا جا رہا ہوں زندگی کی راہ سے، لیکن
میں ہر اک موڑ پر تیری کمی محسوس کرتا ہوں

نہ پھر مسکرائے، پھر پیام شوق دے مجھکو
دلِ آرزو میں کچھ کمی محسوس کرتا ہوں

زمانہ ہو گیا ترکِ تعلق کو مگر اب تک
جو عالم تھا محبت کا وہی محسوس کرتا ہوں

مری ہستی ہی کیا ہے بس سراپا سوز ہوں دیپک
میں جلنے ہی میں اپنی زندگی محسوس کرتا ہوں

کنور سین حسرت ایم۔ اے

دار و رسن کو دیکھ کے جو شخص ڈر گیا
کم ظرف اپنی موت سے پہلے ہی مر گیا

بے آب و رنگ تھا مرے احساس کا جمال
گرمی شرارِ عشق کی پا کر نکھر گیا

فرصت ملی ہی تھی غمِ دوراں سے یک بیک
دل میں کسی کی یاد کا نشتر اتر گیا

کیسی بہار آئی گلستانِ زیست میں
دامن طلب کا یاس کے کانٹوں سے بھر گیا

اُس رہ گزر کی خاک کی سرگشتگی تو دیکھ
جس پر سے ہو کے قافلۂ غم گذر گیا

دل کے تقی بی شوقی

جستجو اپنی جہاں کل تھی وہاں آج بھی ہے
کارواں شوق کا بے نام و نشاں آج بھی ہے

مصلحت مانع اظہار و بیاں ہے ورنہ
راز تیرا مرے سینے میں تپاں آج بھی ہے

اہلِ ہمت ہی کی رندوں میں کمی ہے ورنہ
وہی شانِ کرمِ پیرِ مغاں آج بھی ہے

شورشِ عرصہ گہِ کون و مکاں کم نہ ہوئی
امن کے نام پہ تخریب جہاں آج بھی ہے

دل تو کہتا ہے چلو ساتھ زمانے کے مگر
وہی بے رہبری اہلِ رواں آج بھی ہے

کشمیری کہانی

# گنجا

از صوفی غلام محمد

مترجم نور شاہ

ہسپتال روڈ۔ درگہ جن۔ سرینگر (کشمیر)

برادرِ محترم جناب خوشتر گرامی صاحب! آداب

.... صوفی غلام محمد کی کشمیری کہانی کا اُردو رُوپ "گنجا" بھجوا رہا ہوں۔ اِس کہانی کا عنوان جتنا بدصورت ہے یہ کہانی اتنی ہی خوبصورت ہے۔ کشمیری فنکاروں اور کاریگروں کو کیسے EXPLOIT کیا جاتا ہے، اس کی ایک جھلک اِس میں نمایاں ہے۔ کشمیر کی دستکاری دنیا کے گوشے گوشے میں مقبول ہے۔ لیکن آج بھی کشمیری فنکار اور کاریگر گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ـــــ صوفی غلام محمد "سرینگر ٹائمز" کے مدیر ہیں....

آپ کا بھائی ـــــ نور شاہ

تقدیر کی شوخی ـــــ اِس گنجے کو بھی جیسے کوئی اور جگہ نہ ملی تھی۔

جونہی میم صاحب کی نظریں اُس کے تانبے کی طرح چمکتے سر پر پڑیں اُسے ابکائیاں سی آنے لگیں۔ پانی میں تھوکتے ہوئے وہ نیم وا آنکھوں سے ہاؤس بوٹ کے اندر گھس گئی۔ اُس کا سارا جسم لرز رہا تھا، کانپ رہا تھا۔ اندر صبورا ناشتے کے لئے میز لگا رہا تھا اور صاحب نرم گداز ریشمی لحاف اوڑھے گہری نیند سو یا نہ جانے کن خوابوں میں کھویا ہوا تھا!

"صبورا!" میم صاحب نے گھبراہٹ کے عالم میں پکارا۔

صبورا کے ہاتھ سے وہ پیالی گر گئی جسے وہ میز پر سجانے جا رہا تھا۔

"کیا بات ہے میم صاحب؟"

"دیکھ لو اُدھر اُس گنجے کو ـــــ میں اُسے ہر صبح اپنے گنج پر بے تحاشا ہاتھ پھیرتے دیکھتی ہوں۔ مجھے اِس سے نفرت ہے۔ اُسے دیکھ کر مجھے قے سی ہونے لگتی ہے۔ میرا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ سنو! اگر یہ آدمی پھر یہاں نظر آیا تو ہم تمہارا ہاؤس بوٹ خالی کر دیں گے!"

"میم صاحب ـــــ میں.... میں اُس کا نام و نشان مٹا دوں گا!"

صبورا نے ہاتھ ملتے ہوئے کچھ اِس انداز سے کہا جیسے وہ گنجے کو واقعی کچا چبا جائے گا۔ دوسرے لمحے اُس نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ گنجا نہا رہا تھا

اُس کا سر پانی کی سطح پر اُبھرتا ڈوبتا نظر آتا تھا۔ صبورا کو غصہ آیا۔ اُس نے سوچا ایک پتھر اُس کے گنجے سر پر مار کر اُس کی کھوپڑی کھول کر رکھ دے۔ اُسے لہو لہان کر دے۔ وہ ہاؤس بوٹ کے آخری سرے پر آیا اور گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا ـــــ "اِس سیزن کے پہلے خریدار تھے، میم اور صاحب.... ولایتی میم اور صاحب! انگریز جو بے تحاشا روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ میرے ہاں جل پری آئی ہے۔ جل پری! اور میں کیا اُسے جانے دوں گا۔ نہیں ہرگز نہیں!"

وہ چلا اُٹھا!!

"او گنجے چلے جاؤ یہاں سے نہیں تو دریا برد کروں گا!"

گنجے نے سُنا لیکن خاموش رہا۔ اُس کی خاموشی کو دیکھ کر صبورا کو تاؤ آیا اور وہ گالیاں دینے لگا۔ آس پاس بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ انھیں دیکھ کر وہ موٹی موٹی گالیوں پر اُتر آیا اور ہاؤس بوٹ سے شکارے میں آ گیا۔ گنجا پانی سے کنارے پر آیا۔ لوگ اُسے نیم عریاں دیکھ کر بھاگ گئے۔

صبورا کا شور سُن کر اب صاحب بھی جاگ پڑا تھا۔

میم صاحب اور صاحب کو صبورا کے ہاؤس بوٹ میں آتے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے۔ یہ دونوں میاں بیوی جگہ جگہ گھوم پھر کر اب کشمیر

ے تھے اور صبورا کے ہاؤس بوٹ "ڈل کوئن" میں ٹھہرے تھے جو ڈل کے ایک کنارے
دلہن کی طرح سجا سنورا کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ چھوٹا سا شاداب باغیچہ تھا، جس
رنگ رنگ کے پھول کھلے تھے۔ ایک طرف سفیدے کے درخت جھکے
سے میں بیٹھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے زخموں پر مرہم رکھ دیا ہو۔
جھیل کے پانیوں سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی بادِ نسیم، سونے ایسی کرنیں
بکھیرتا ہوا سورج، قطار اندر قطار تیرتے ہوئے ہنس، بلندی سے گرتی ہوئی
ں کی دھار ـــــ ایک دلچسپ سماں، دل کو لبھانے والا! اور پھر سامنے
سلیمان کے دامن میں بلوارڈ روڈ پر صبح و شام موٹروں کی آمد و رفت۔
س سڑک کے ذرا آگے وہ محلّہ، وہ اَن گنت مکان اور اِن میں رہنے والے
ل، ایک عجیب زندگی، بے حد مصروف۔ دُور پہاڑوں کا طویل سلسلہ اور
ن کے اوپر بادلوں کا سفر، ندی نالے، آبشار، یہ حسن، یہ شباب ـــــ یہ سب کچھ
یکھ کر دل مچل مچل جاتا۔ اِن دلفریب نظاروں اور ہاؤس بوٹ "ڈل کوئن" میں
ڑی گہری وابستگی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے اکثر سیاح جب دوسرے ہاؤس
ٹوں کی طرف دیکھنے لگتے تو اُن کی نظریں صبورا کے ہاؤس بوٹ پر پہنچتے ہی رُک
سی جاتیں، ایک لمحے کے لئے ٹھٹک سی جاتیں۔ انگریز سیاح تو صبورا کے ہاؤس
بوٹ پر جیسے فریفتہ ہو گئے تھے۔

صبورا کے ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے ہوئے ولایتی میم اور صاحب
کو ابھی ایک مہینہ گزرا تھا اور صبورا کے لئے یہ ایک مہینہ ایک سال کے برابر تھا۔
اِس ایک مہینے کی آمدنی سے وہ ایک سال کا خرچ چلا سکتا تھا ـــــ لیکن یہ گنجا!!

میم صاحب کو یہ گنجا پہلے ہی دن نظر آیا تھا۔ وہ دُور پہاڑی
نظاروں کا جائزہ لے رہی تھی اور یہ سب کچھ اُسے بہت اچھا معلوم ہوا تھا۔
انوکھا پیارا۔ دفعتاً اُس کی نظروں سے ایک عجیب انسانی صورت ٹکرائی تھی۔
وہ پانی میں ڈبکیاں لگا رہا تھا اور بار بار اپنے تیز ناخنوں سے اپنے سر کو کھرچ
رہا تھا۔ میم صاحب کو یہ سب کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا اور اُسے متلی سی
ہونے لگی تھی۔ اُس کے ملک میں اگر کسی کتے کی بھی ایسی حالت ہوتی تو اُس کا
سارا جسم صابن سے دھویا جاتا اور ٹیکوں کے ذریعہ اُس کے جسم سے یہ زہر
باہر نکالا جاتا ـــــ لیکن یہ ملک . . . . یہاں یہ گنجا پانی میں نہا کر سارے
پانی کو گندہ کرتا ہے۔ اِس کے جراثیم پانی میں پھیل جاتے ہیں اور اسی پانی کی
سطح پر یہ ہاؤس بوٹ کھڑا ہے۔

"میرے خدا! یہ میں کہاں آ گئی؟ یہاں شاید انسان نہیں رہتے جنگلی
جانور رہتے ہیں!" اُسے ہاؤس بوٹ سے نفرت ہو گئی۔ ہاؤس بوٹ میں بچھے
قیمتی قالینوں سے نفرت ہو گئی۔ رنگ رنگ کے پھولوں سے نفرت ہو گئی۔ آس
پاس کی ساری چیزوں سے نفرت ہو گئی۔ یہ پہاڑ اُسے جن اور بھوت نظر آنے
لگے۔ پانی میں اُچھلتی مچھلیاں اُسے سانپ دکھائی دینے لگیں۔

وہ یہ سب کچھ چار دنوں سے برابر دیکھ رہی تھی۔ پہلے دن اُس نے
سوچا تھا اب شاید وہ گنجا نظر نہیں آئے گا۔ لیکن جب دوسرے دن وہ جھیل
کا فوٹو لینے لگی تو اُس کا سر پانی سے اُبھر آیا۔ میم صاحب کو بہت خوف محسوس
ہوا۔ اُسے ہر سمت اُسی کی صورت نظر آنے لگی۔ گنجے کی آنکھیں اندر کو
دھنس گئی تھیں، چہرے پر ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔

اور آج گنجے کو دیکھ کر میم صاحب دبے دبے سے لہجے میں چیخ رہی
تھی!!

صبورا نے گنجے کو بھگا دیا تھا۔ لیکن اب بھی اس کی صورت میم
صاحب کی نظروں کے سامنے گھوم جاتی تھی اور اُس کا جسم تھر تھر کانپنے لگتا
تھا۔

دونوں میاں بیوی اُس دن شاپنگ کے سلسلے میں بڑے بازار کی
طرف نکل پڑے۔ اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد وہ ایک "ووڈ کارونگ" دکان میں گھس
گئے۔ وہ بہت شوق سے کاریگروں کو کام کرتے دیکھتے رہے۔ کام دیکھ کر وہ حیران
رہ گئے ـــــ مہاتما بدھ کا مجسمہ، لیمپ، ہنس، کمپوش، چنار کا پتہ . . . . . جیسے
سب کچھ زندۂ جاوید ہو!!

"واہ کتنا خوبصورت ہے یہ فن! یہ آرٹ! یہ کاریگری!!"
میم صاحب نے صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــــ "ایک
ایک بٹھ کر اخروٹ کی لکڑی کے بنے ہوئے یہ پھول یہ پتے . . . کیا یہ سب
چیزیں اِنہی لوگوں نے بنائی ہیں۔ شاید نہیں، یہ کمزور انسان، یہ بدصورت اور
بے حِس انسان اِن چیزوں کی کیسے تخلیق کر سکتے ہیں! اِن میں ایسا احساس
کہاں ہو سکتا ہے۔ یہ فن تو زندۂ جاوید ہے۔ یہ اِن کا بنایا ہوا نہیں معلوم ہوتا!"

وہ ایک "ایمبرائڈری" کی دکان میں آ گئے۔ سوئی اور دھاگا ـــــ
معمولی چیزیں لیکن اِس کے ساتھ انسانی اُنگلیوں کا کمال۔ سپید فن پر کڑھا
ہوا یہ کام ـــــ پھولوں کا یہ شاداب چمن سپید کپڑے پر کس نے بکھیر دیا ہے۔
اِس میں یہ رنگ کس نے بھرے ہیں؟ کون ہو سکتا ہے؟ کس کے ہاتھ ہیں
یہ؟ کس کی اُنگلیاں ـــــ میم صاحب نے اپنی نرم و نازک اُنگلیاں اُس پر
پھیر دیں۔ صاحب ایک جیکٹ دیکھنے لگا۔ ایک سبز رنگ کا جیکٹ۔ جس کے
دونوں کندھوں پر پھولوں کی کیاریاں بہت خوبصورتی سے کاڑھی گئی تھیں۔

اس جیکٹ کا دامن پھلوں سے بھرا ہوا تھا۔ صاحب نے جنگ سے جیکٹ اتار اور پہن لیا۔ جیکٹ پہن کر صاحب کا چہرا ایسا نظر آنے لگا جیسے سرسبز پتوں میں گلاب کا پھول دکھائی دیتا ہے!!

اس سے آگے ایک اور دوکان تھی۔ اس دوکان کے باہر بورڈ لگا تھا اور اُس پر لکھا تھا ۔۔۔ پیپر ماشی شال ۔۔۔ میم صاحب جب اس دوکان کے اندر گئے تو انھیں محسوس ہوا جیسے وہ کسی طلسمی محل میں آگئے ہوں۔ جہاں جادو کے زور سے سب کچھ بن جاتا ہے۔ انھیں بالکل یقین نہ آیا کہ یہ چیزیں کسی انسان نے بنائی ہوں گی۔ دوکان سامان سے بھری پڑی تھی۔ دائیں بائیں اوپر نیچے ہر طرف ایک طلسمی دنیا تھی۔ پیپر ماشی کی چیزیں، ایسی چیزیں جنہیں دیکھ کر انسان حیران ہو جائے اور سوچنے لگے کہ کیا یہ واقعی انسانی ذہن اور ہاتھو کا کرشمہ ہے؟

یہ انسان نہیں ہو سکتا۔ یہ کوئی اور طاقت ہے۔ یہ فن، یہ آرٹ ....

کیا کاریگری اس حد کو بھی چھو سکتی ہے ۔۔۔ یہ سنگار کیس، صابن دانی، پھول دان، سگریٹ کیس، قلمدان، تصویروں کا فریم ۔۔۔ یہ کس کا کمال ہے؟

میم صاحب نے اپنے لئے بہت سی چیزیں پسند کیں۔ وہ کیا خریدیں اور کیا نہ خریدیں؟ یہ سوچ سوچ کر وہ حیران ہو رہے تھے۔ ہر چیز بے مثال تھی خوبصورت تھی جاذبِ نظر تھی!!!

"کیسا عظیم ہوگا یہ فنکار جس نے رنگوں سے بے جان زندگی میں حسن بھر دیا ہے! ہمیں اس فن کی قدر کرنی چاہیئے۔ ان فنکاروں کی پرستش کرنی چاہیئے" صاحب نے کہا۔

"میں اس فنکار کو دیکھنا چاہتی ہوں جو اس آرٹ کا خالق ہے" میم صاحب نے کہا۔

صاحب نے دوکاندار کی طرف دیکھا۔

یہ چیزیں بنانے والے فنکار دوکان کے ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے تھے، جس کی ایک کھڑکی بازار کی طرف کھلتی تھی۔ اس کھڑکی سے روشنی آتی تھی اور اسی روشنی میں وہ کام کرتے تھے۔ کمرے میں بہت سی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ کمرے کی دیواریں کالی سیاہ ہو گئی تھیں۔ ان دیواروں پر مختلف رنگوں کے داغ پڑ گئے تھے۔ اس کمرے کی طرف کبھی کبھار ہی کوئی سیاح آتا۔ سیاحوں کو فنکاروں سے کیا واسطہ؟ وہ فن خریدتے تھے۔ اس کمرے میں جتنی بھی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ اُن کے نمونے شوروم میں سجے ہوئے تھے۔ اس فن میں حسن پیدا کرنے کے لئے کاریگروں کو اپنا خون جگر شامل کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے

سالنامہ نظر نواز ہوا ۔۔۔ دیکھ رہا ہوں اور محوِ حیرت ہوں! ان نامساعد حالات میں اتنی عظیم پیشکش! آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ تو!! ۔۔۔ اُردو کے مستقبل کو تاریک سمجھنے والے، تاریک کہنے والے اُردو کے دشمن آئیں اور اُردو کے اُفق سے طلوع ہونے والے اِس درخشاں آفتاب کو دیکھیں!!

آسی رام نگری (مغل سرائے۔ بنارس)

کمزور جسموں کی قوت، اپنی آنکھوں کی بینائی اور اپنی انگلیوں کی خوبصورتی ختم کر کے ان ساری چیزوں کو زندگی بخشتے ہیں ۔۔۔ ہرن، جنگلوں میں اُچھلتے کودتے ہرن، گلاب کی شاخ پر مسکراتی بلبل، دامنِ کوہ میں ناچتا مور ۔۔۔ یہ کاریگر ایسی ایسی کتنی چیزیں بناتے ہیں۔ لوگ خریدتے ہیں اور دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دیتے ہیں۔ ان کی تعریفیں ہر کوئی کرتا ہے۔ لیکن وہ کاریگر، فنکار اور آرٹسٹ جو یہ سب چیزیں بناتا ہے اور سب کے سامنے رکھتا ہے، اُسے کوئی بھی نہیں جانتا۔ اُس کے بارے میں کوئی پوچھتا تک نہیں!

وہ گمنام ہے!!

آج ایک ولایتی میم اور صاحب ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اُس کمرے میں گمنام آرٹسٹ کی تلاش میں آئے تھے۔ دوکان کا مالک اُن کے ساتھ تھا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی میم صاحب اپنی آنکھیں ملنے لگی۔ باہر روشنی تھی اور اندر تاریکی ۔۔۔ کچھ دیر انھیں کچھ بھی نظر نہ آیا۔

اور اب میم صاحب کھڑکی کے قریب تھی۔ ایک گوشے میں چار آدمی بیٹھے تھے۔ اُن کے ارد گرد رنگ کے ڈبے اور دوسرا سامان پڑا تھا۔

دوکاندار نے ایک کاریگر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میم صاحب! یہ ہمارا آرٹسٹ ہے، ہمارا فنکار، کاریگر!"

میم صاحب کی نظریں جب اُس پر پڑیں تو وہ پھر اپنی آنکھیں ملنے لگی۔ اور پھر گھور گھور کر دیکھنے لگی ۔۔۔ ایک دبی دبی سی چیخ اُبھری ۔۔۔ "گنجا .... گنجا!!" صاحب نے میم صاحب کو تھام لیا ۔۔۔ "یہ وہی ہے جو صبح سویرے ہمارے ہاؤس بوٹ کے سامنے نہایا کرتا ہے"

گنجا ۔۔۔ !!

وہی گنجا جسے دیکھ کر اُسے متلی ہونے لگی تھی ۔۔۔ اب ایک عظیم فنکار کی حیثیت میں اُس کے سامنے تھا!!!

---

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن ہی منی آرڈر پر ضرور تحریر فرمائیے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرتے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۲ لکھنا کافی ہے۔ منیجر

ین روپے بنائیں
اپنے کھیتوں کی مٹی کی جانچ کروائیں اور بہترین نتائج کے لئے نائٹروجن، فاسفورس اور پوٹاشیم متوازن مقدار میں استعمال کریں۔
استعمال شدہ کیمیائی کھاد سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لئے فصلوں کے بچاؤ کے اقدامات کریں۔
کیمیائی کھاد کب، کیوں اور کیسے استعمال کی جائے، یہ جاننے کے لئے گرام سیوک یا ایکس ٹینشن آفیسر سے مشورہ کریں۔
اگر پاس ہے ایک روپیہ
یہ آسان ہے!
کیمیائی کھاد استعمال کریں

# میری بھارت یاترا

فکر تونسوی

میں بھارت دیش کے مختلف حصوں میں گھوما ـــ یہ عجیب بات ہے کہ صرف بدیشی سیاح ہی بھارت کے مختلف حصوں میں گھومتے ہیں۔ بھارت واسی نہیں گھومتے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کاہل ہیں۔ ان کی کاہلی کی ایک ـــ مثال مجھے ایک یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے بڑے فخر اور انبساط کے ساتھ سنائی کہ ایک ہندوستانی بیری کے درخت کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ اس کے ایک گز کے فاصلے پر ایک بیر ٹپکا ہوا پڑا تھا جس کی طرف وہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک دوسرا ہندوستانی ادھر سے گزرا۔ پہلے ہندوستانی نے اُسے آواز دی اور کہا بھائی! ازراہِ انسانیت ذرا یہ بیر اٹھا کر میرے منہ میں ڈال دو ـــ دوسرے ہندوستانی نے انسانیت کی پکار سنی تو قریب آ کر رک گیا۔ (ہندوستانیوں کو انسانیت اور کاہلی ورثے میں ملی ہے) اور بولا اے بیوقوف! اگر مجھ میں ہمت ہوتی تو اٹھا کر اپنے منہ میں نہ ڈال لیتا! ـــ یہ کہہ کر وہ آگے چلا گیا۔

اور دوسری وجہ ان کی بے پناہ مصروفیت ہے۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں لگے رہتے ہیں۔ [illegible] تاش کھیل رہے ہیں، چوسر کھیل رہے ہیں، سستا رہے ہیں، [illegible] جلسوں میں جا رہے ہیں، کیرم کھیل رہے ہیں، نقب لگانے میں مصروف ہیں، عدالتوں میں [illegible] کر رہے ہیں، کسی سے گنے کے بھاؤ یا لڑکے لڑکی کی شادی کی بات کر رہے ہیں اور ان مصروفیات سے جب کبھی انہیں چھٹی ملتی ہے [illegible] رہتے ہیں۔ ایک صاحب کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ وہ ایک دن [illegible] ایک دوست نے جب پوچھا کہ حضرت کل کہاں تھے؟ تو [illegible] کہنے لگے [illegible] بہت سے کام اکٹھے پڑ گئے تھے۔ کل [illegible] اور پھر [illegible] آفت [illegible] کیا تھا۔

[illegible] ہندوستانی [illegible] مصروف ترین اور کاہل ترین قوم ہیں۔ وہ [illegible] وہ اپنے ہی شہر [illegible] میں گھومتے رہتے ہیں۔ مدت ہوئی ہم دہلی میں آئے مگر اس دائرے سے باہر نہیں نکلے۔ ایک جنرل مرچنٹ مسٹر اشوک چند نے مجھے بتایا کہ وہ گزشتہ گیارہ برس سے دہلی میں رہ رہے ہیں لیکن آج تک قطب مینار دیکھنے کے لئے [illegible] جا سکے [illegible] صاحب کیا کریں ـــ

ہندوستان کے ہر تاریخی مقام پر آپ کو یہ بورڈ لکھا ہوا نظر آئے گا ـــ "ہم بدیشی سیاحوں کو خوش آمدید کہتے ہیں" کیونکہ ان کے تاریخی مقامات صرف بدیشی سیاح ہی دیکھتے ہیں۔ ہندوستانیوں کو ان تاریخی مقامات کے متعلق جتنی معلومات حاصل ہوتی ہیں، وہ بدیشی سیاحوں کے لکھے ہوئے سفرناموں ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ ایک بار میں نے بمبئی کے ایک بہت بڑے فلم فنانسر سے کہا کہ میں ہندوستان کے صوبہ اڑیسہ کے آدی باسی قبائل کے کلچر پر ایک کتاب لکھوں گا تو اس نے خوش ہو کر میری جیب میں سو روپے کا ایک نوٹ ڈال دیا اور کہا ـــ جب آپ کی یہ کتاب لندن میں چھپ جائے تو ایک کاپی مجھے ضرور بھیجئے گا۔ اس کتاب کی مدد سے میں آدی باسی قبائل پر ایک فلم تیار کروں گا۔

---

میں بدیشی سیاح تھا۔ اس لئے ہندوستانیوں کو ہندوستان کے متعلق معلومات بہم پہنچانا میرا اخلاقی فرض تھا۔ اس فرض کی تکمیل کے لئے میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گھوما اور میں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقے کے لوگوں کے متعلق بہت کم جانتے ہیں۔ ہندوستان کے صرف ایک فی صدی لوگ ایسے ہیں جو ہندوستان کے مختلف علاقوں کی معاشرت سے آگاہ ہیں۔ ایسے خوش نصیب لوگوں کی اقسام یہ ہیں۔

۱۔ پھیری والے ـــ یہ حضرات چھوٹے موٹے بزنس مین ہوتے ہیں جو گھوم پھر کر ایک علاقے کا مال دوسرے علاقے میں بیچتے رہتے ہیں۔ علاقہ ہریانہ کی چادریں اور کھیس آسام میں جا کر بیچتے ہیں اور بنگال کا زلف دراز [illegible] ہماچل میں بیچتے ہیں۔ صرف انہیں حضرات کو یہ علم ہوتا ہے کہ مدراس کے بیڑے اگر بمبئی میں جا کر بیچے جائیں تو کتنے فی صدی منافع ہوتا ہے اور اڑیسہ میں جا کر بیچے جائیں تو وہاں کی غریب

اُجلے لوگوں کا نشان...

سن لائٹ کی اُجلی شان

سن لائٹ کی دُھلائی چمکتی اُجلی ہو!

سن لائٹ دوسرے صابنوں سے

# صحت و زندگی

## ۱ • امرود ـــــ ایک مفید پھل

امرود موسم سرما کا مفید پھل ہے۔ اس کا مزاج سرد تر ہے۔ دل و دماغ کو تقویت و فرحت بخشتا ہے۔ معدے کو طاقت دیتا ہے، ہاضمہ کو درست کرتا ہے۔ پھیپھڑوں کو طاقتور بنانے کی خاص صلاحیت رکھتا ہے۔

امرود کے پتّے دست اور زخم کے لئے مفید ہیں۔ پیٹ کے درد کی شکایت میں امرود کی کونپل نمک کے ساتھ دینے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔

بچّوں کے دانت نکلتے وقت ہونے والی قے دست میں امرود کی کونپل کا استعمال بے حد مفید ہوتا ہے۔

امرود کھانے کا بہتر وقت کھانا کھانے سے پہلے ہے۔ کھانا کھانے سے پہلے امرود کھانے سے بھوک میں اضافہ ہوتا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد امرود نہ کھانا چاہئے۔ اس سے قبض ہو جاتا ہے۔

امرود خونی بواسیر میں نافع ہے۔ جن کے مزاج میں سردی زیادہ ہو یا معدے میں رطوبت ہو انہیں نقصان دیتا ہے اور ریاح پیدا کرتا ہے۔ نمک اور سیاہ مرچ کے ساتھ کھائیں تو مضرت کم ہے۔

## ۲ • زندگی زندہ دلی کا نام ہے

ایک مشہور ڈاکٹر کا قول ہے ـــــ بہت دنوں تک زندہ رہنا چاہتے ہو تو خوب ہنسا کرو۔ ایک اور ڈاکٹر جیمز لیوائس نے لکھا ہے ـــــ ہنسنا بہت ہی صحت بخش ورزش ہے۔ ڈاکٹر موصوف کی اس رائے کو ہم ان الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں ـــــ ہنسنا بہت ہی حیات بخش عمل ہے۔

دنیا کے طبیبوں کا اس حقیقت پر اتفاق ہے کہ رنج و غم، غصہ زیادہ اعصاب کو کمزور اور انسان کو بے حس بنا دینے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر آپ اپنا مزاج ہنس مکھ بنا لیں کہ اعصاب پر ہنسی کھیلتے اور رنج و غم، غصہ اور فکر و تشویش کو کبھی پاس نہ آنے دیں تو، اس طرح آپ کے اعصاب اور غدودوں میں ایک تعجب خیز تحریک پہنچ جائیں گے اور دل کی خوشی آپ کو ہمیشہ صحت مند رکھے گی اور آپ بالکل جوان نہیں تو اپنی موجودہ عمر سے کم سے کم دس سال چھوٹے ہو جائیں گے۔

ماہرین حیات کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جوان رہنے اور زیادہ دنوں تک زندہ رہنے کے لئے زندہ دل رہنا بے حد ضروری ہے۔ اس لئے اگر آپ طویل عمر پانے کے متمنی ہیں تو ہر حال میں خوش رہنے کی عادت ڈالئے ـــــ زندہ دلی ہی زندگی ہے ـــــ زندگی زندہ دلی کا نام ہے!

## ۳ • آپ کی زندگی

گزارنے کے لئے سبھی لوگ زندگی گزارتے ہیں لیکن ایسی زندگی بہت کم لوگ گزارتے ہیں جیسی گزارنی چاہئے۔ اگر لوگ ایسی زندگی گزاریں جیسی گزارنی چاہئے تو ان کی زندگیاں مسرتوں سے معمور ہو جائیں۔

مشہور مفکر سی۔ جی۔ ڈنکان نے لکھا ہے ـــــ جس طرح گھاس کی پتّی یا پھول کی زندگی ہوتی ہے، ایسی ہی زندگی آپ بھی گزاریے۔ گھاس کی پتّی یا پھول کچھ پروا نہیں کرتے کہ اس سے بڑی گھاس کی پتّی یا اچھے پھول بھی اس مرغزار یا گلزار میں موجود ہیں۔ وہ اپنے آپ سے مطمئن رہتے ہیں اور فطرت بھی ان سے خوش رہتی ہے ـــــ آپ بھی انہیں کی طرح اپنی زندگی گزاریں تو آپ کی زندگی مسرتوں سے معمور ہو جائے گی۔

## ۴ • ایک سنہرا اصول

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــ اگر آپ زندگی میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو معاوضہ سے بے نیاز ہو کر کام کرنے کی عادت ڈالئے۔ خواہ آپ کہیں کام کرتے ہوں، کوئی کام کرتے ہوں۔ یہ اصول ہر جگہ، ہر حال میں آپ کے لئے کامیابی و کامرانی کے دروازے کھول دے گا۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے، لیکن

گزارنے کے لئے پڑھتے ہیں۔ وہ ان کتابوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ زندگی کی منزلوں سے ہمکنار ہونے کے لئے روشنی نہیں حاصل کرتے ـــــ اگر آپ بھی ایسا کرتے ہیں تو ایسے مطالعے سے کچھ حاصل نہیں۔ ایسے مطالعہ کو تضیعِ اوقات کہنا غلط نہ ہوگا۔

مشہور مفکر سی۔ جی۔ کولوکان نے لکھا ہے ـــــ کتابوں کو صرف مطالعہ اور وقت گزارنے کے لئے نہ پڑھئے، ان سے اپنی زندگی سنوارنے میں مدد حاصل کیجئے۔ ایسی زندگی جو تجربات سے گزرنے کے بعد کامرانی اور مسرتوں سے معمور ہو!

## ۸۔ اپنے بچوں کو ٹماٹر کھلائیے

ٹماٹر بچوں کے لئے صحت بخش غذا ہے۔ اس میں وہ تمام حیات بخش اجزا پائے جاتے ہیں جو بچوں کی صحت اور جسمانی نشوونما کے لئے ضروری ہیں۔ ٹماٹر کا رس پلانے سے بچوں کے دانت آسانی سے نکل آتے ہیں۔ ہڈیوں میں قوت اور مضبوطی آتی ہے۔ خون بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ وہ بچے جو دانت نکلنے کے دنوں میں کمزور ہو گئے ہوں۔ ٹماٹر کا رس پلانے سے تندرست اور صحت مند ہو جاتے ہیں۔ ماں کے دودھ پر پلنے والے چھوٹے بچوں کو ٹماٹر کا رس دودھ کے ساتھ ملا کر دیا جائے تو وہ اور بھی مضبوط اور صحت مند ہو جاتے ہیں۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ بڑے ہو کر آپ کے بچے مضبوط اور قد آور جوان بنیں تو انھیں ٹماٹر کھلائیے۔ کثرت سے ٹماٹر کھانے والی قوموں کے بیشتر افراد لمبے قد کے اور صحت مند ہوتے ہیں۔ ٹماٹر کے وٹامن ہڈیوں کو مضبوط بناتے ہیں نیز ٹیڑھی ہڈیوں کو سیدھی کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کی ہڈیاں کسی اندرونی بیماری کی وجہ سے ٹیڑھی ہو جاتی ہیں، ان ہڈیوں کو سیدھی کرنے میں ٹماٹر میں پائے جانے والے اجزاء سے بہت مدد ملتی ہے۔

ٹماٹر سنترہ کا بدل ہے۔ ٹماٹر کو بچوں کے لئے آبِ حیات کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔

## ۹۔ انسان حالات کا غلام نہیں

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان حالات کا اسیر، حالات کا غلام ہے۔ حالات ہی اسے خوش حال اور بدحال بناتے ہیں۔ حالات ہی اسے کامیاب اور ناکام بناتے ہیں ـــــ لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔

مشہور مفکر [illegible] نے لکھا ہے ـــــ انسان کو اپنے حالات کو قابو میں رکھنے کی بڑی حد تک قدرت عطا کی گئی ہے۔ انسان حالات کا غلام نہیں، حالات انسان کے غلام ہیں۔ ہو سکتا ہے انسان کو اس کے حالات کچھ دیر کے لئے بدحال بنا دیں لیکن وہ ان حالات کو بہت خوبصورتی سے بدل سکتا ہے۔

اگر انسان کے حالات ایسی ناخوشگوار صورت اختیار کر گئے ہیں جس میں وہ اپنی زندگی گزارنا پسند نہیں کرتا تو وہ اپنا اندازِ فکر بدل کر ان حالات کو بدل سکتا ہے ـــــ انسان حالات کا غلام نہیں، حالات انسان کے غلام ہیں۔

اس عنوان کے تحت قارئین کے مختلف اور دلچسپ سیاسی
سماجی، تہذیبی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات شائع کئے [illegible]
تہذیب کے ... [illegible] سوالات شائع ... [illegible]
کئے جاتے ہیں ... [illegible]
... [illegible]
... [illegible]
... [illegible]

## سوال و جواب

**نجمہ پرویز علی گڑھ**

س۔ بھائی جان! میری ایک سہیلی کہتی ہے آلو سے صرف پیٹ بھرا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی غذائیت نہیں ہوتی۔ آپ کی رائے میں آلو کیسی سبزی ہے؟

ج۔ آلو میں غذائیت بہت ہے۔ محققین کی رائے میں آلو بہترین غذاؤں میں سے ہے۔ اس میں فولاد، کیلسیم، پوٹاشیم اور فاسفورس کی مقدار بہت ہے۔ اس کے علاوہ میگنیشیم، سوڈیم، گندھک، کلورین، آیوڈین اور تانبا وغیرہ بھی پائے جاتے ہیں۔
آلو میں وٹامنز اے، بی اور سی کافی مقدار میں ہوتے ہیں۔ اس میں اجزائے لحمیہ کم ہیں، لیکن نشاستہ بہت ہے جو جسم کے لئے طاقت بخش ہے۔

**افضل لاری والا۔ بمبئی**

س۔ انسان اپنی یادداشت کب کھو بیٹھتا ہے؟

ج۔ الیکشن میں کامیاب ہو جانے کے بعد ـــــ عوام سے کئے ہوئے وعدے قطعی یاد نہیں رہتے۔ حکومت سیاسی مصلحتوں کی بنا پر عوام سے کئے ہوئے وعدوں کو فراموش کر دیتی ہے جیسے ہماری سرکار نے اُردو کو اس کے حقوق دینے کے وعدے فراموش کر دیئے۔

س۔ آج کی دنیا انسان کو کیا سکھاتی ہے؟

ج۔ انسانیت سے عناد، ظلم و بربریت سے محبت!

**تلک راج کپور۔ جموں توی**

س۔ آج کل بیکاروں کے لئے ہماری قومی حکومت کیا سوچ رہی ہے؟

ج۔ حسین و خوش آئند بیانات!

س۔ ایک حسین عورت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ قدرت کا حسین شاہکار!

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ جب مصیبت آتی ہے تو تنہا نہیں آتی؟

ج۔ جی ہاں، اپنے جلو میں بہت کچھ لئے ہوئے آتی ہے۔

**ایم یوسف وانی۔ سرینگر کشمیر**

س۔ جب انسان حقیقت کا دامن تھام لیتا ہے تو نتیجہ کیا نکلتا ہے؟

ج۔ مخالف پرست کہتی ہے!

س۔ وقت کب بے وفا ہوتا ہے؟

ج۔ جب انسان وقت سے بے وفائی کرتا ہے۔

س۔ ایک پتھر دل انسان کب روتا ہے؟

ج۔ جب خود اس پر مصیبت پڑتی ہے!

**مس شاکرہ حسین۔ کلکتہ**

س۔ بھائی جان! کیا زندگی ایک عبادت ہے؟

ج۔ صحیح زندگی کو عبادت کہنا بجا ہے۔

س۔ کیا یہ صحیح ہے کہ حقیقی محبت صرف والدین اور بھائی بہن سے ہوتی ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ ماں باپ اور بھائی بہن کی محبت کا جواب نہیں۔

س۔ بھائی جان! سب سے بڑی حماقت؟

ج۔ خود کو سب سے بڑا عقل مند سمجھنا!

حسن امام جعفری۔ آسام

س۔ شمس ایک جال ہے جس سے قسمت کم عقلوں کا شکار کرتی ہے ۔۔۔ آپ کے خیال میں یہ کہاں تک درست ہے؟

ج۔ قسمت کم عقلوں کا شکار نہیں کرتی، کم عقل خود شکار ہوتے ہیں۔

س۔ غالب، اقبال اور دوسرے بڑے شعراء پیدا ہوئے، لیکن انھیں نوبل پرائز نہیں ملا۔ ایسا کیوں؟ کیا ان شعراء کے مقدر میں نوبل پرائز نہیں تھا؟

ج۔ نوبل پرائز دینے والوں کے سامنے بھی کچھ مصلحتیں، کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اپنی فکر و نظر کی بات بھی ہے، ان کی نظر غالب اور اقبال کی بلندی تک نہ پہنچی ہوگی۔

اور یہ بھی کہ جہاں اُردو نے جنم لے کر قابلِ رشک فروغ و قابلِ رشک قبولِ عام حاصل کیا، وہاں اُسے علاقائی زبان بھی نہیں تسلیم کیا جارہا ہے، اپنی قومی حکومت اُسے اُس کا جائز حق بھی نہیں دے رہی ہے تو غیروں سے اقبال اور غالب کو نوبل پرائز نہ دینے کا کیسا گلہ، کیسی حیرت؟

س۔ دُنیا جتنی ترقی کر رہی ہے اتنی ہی عُریانیت بڑھتی جارہی ہے۔ کیا عُریانیت ہی کا نام ترقی ہے؟

ج۔ ترقی پسند تو یہی سمجھتے ہیں!

---

جمیلہ خاتون۔ کلکتہ

س۔ بھائی جان! پالک مجھے بہت مرغوب ہے۔ پالک کے فوائد پر کچھ روشنی ڈالیے۔

ج۔ یہ بہت ہی مفید سبزی ہے۔ ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ پالک میں فولاد اور کیلسیم (چونا) وافر مقدار میں ہوتا ہے۔ فولاد خون کو بڑھاتا اور جگر کو تقویت دیتا ہے۔ طبیبوں کا کہنا ہے کہ فولاد کھانے سے خون اتنا نہیں بڑھ سکتا جتنا پالک کھانے سے بڑھتا ہے۔ چونا ہڈیوں کی ساخت کو مضبوط، سخت اور پائیدار بناتا ہے۔ مقوی، زود ہضم اور قبض کشا ہے۔ پتھری، یرقان، مالیخولیا اور گرمی کے بخاروں میں بھی مفید ہے۔

---

سہیل الدین جیشکل نیلگری

س۔ وہ کون سی منزل ہے جہاں پہنچ کر انسان شکر اور چین کی زندگی بسر کرتا ہے؟

ج۔ نیکی اور نیکوکاری کی منزل۔

س۔ انسانیت کی سب سے بڑی خدمت کیا ہے؟

ج۔ امن اور انسانیت کے تحفظ کے نام پر ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنانا!

س۔ کسی مقصد میں ناکامی کے بعد انسان کو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لئے جدّ و جہد جاری رکھنی چاہئے۔

---

ہدایت علی ساحل۔ جھمری تلیا

س۔ پہلے زمانے کی بیویاں شوہر کے لئے اپنی جان تک دے دیتی تھیں لیکن آج کل کی بیویاں شوہر کی معمولی خدمت تک سے گریز کرتی ہیں۔ ایسا کیوں؟

ج۔ شوہر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر خود کو دیکھیں۔ کہیں ایسا نہ ہو ۔۔۔ انھیں الزام دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا!

س۔ زندگی میں خواہشات کی تکمیل نہ ہو تو؟

ج۔ اس [illegible] جو خواہشات کی [illegible] جاری رکھنی چاہئے۔

---

احمد حسین [illegible] گنج

س۔ شادی کیسی لڑکی سے کرنی چاہئے؟

ج۔ شادی کے لئے لڑکی کے [illegible] سے زیادہ سیرت کو اہمیت دینی چاہئے۔

س۔ محبت کیا ہے؟ کیا محبت میں شادی ضروری ہے؟

ج۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا! محبت میں شادی ضروری ہو یا نہ ہو [illegible] ضروری ہے!

---

شکیلہ اختر [illegible] ناسک

س۔ سوالات کا جواب دینے میں آپ بڑی [illegible] کرتے ہیں ۔۔۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں انسان کے سر پر کتنے بال ہوتے ہیں؟

ج۔ ہمیں کبھی ہمہ دانی کا دعویٰ نہیں رہا۔ آپ [illegible] کسی سہیلی کے سر کے بال گن کر دیکھ لیں اور ہمیں بھی بتائیں۔ ویسے ماہرین کا اندازہ ہے کہ انسان کے سر پر کم و بیش ایک لاکھ چالیس ہزار بال ہوتے ہیں۔

---

واجد منصوری۔ رامپور

س۔ بھائی جان! یہ قول کس کا ہے ۔۔۔ [illegible] تقدیس و تعظیم کے لئے پیدا کی گئی ہے؟

ج۔ یہ قول ہے برنارڈ شا کا۔

س۔ بھائی جان! عورت آپ کی نظر میں؟

ج۔ ہم بھی برنارڈ شا کے ہم خیال ہیں۔

---

[illegible]
س۔ [illegible] عورت؟
ج۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
س۔ زندگی خوبصورت کب معلوم ہوتی ہے؟
ج۔ جب زندگی کو خوبصورت بنانے والی باتوں سے زندگی کا دامن بھر کر زندگی کو حسن و خوبصورتی بخشنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

---

شیخ عثمان آزاد۔ نصیر آباد
س۔ زندگی میں اچھا وقت کم، برا وقت زیادہ کیوں آتا ہے؟
ج۔ زندگی میں اچھا وقت زیادہ برا وقت کم آتا ہے ۔۔۔ ایک دن، ایک ہفتہ، ایک مہینہ پر نظر ڈالئے۔ آپ زیادہ ہنستے ہیں یا زیادہ روتے ہیں؟ ایک مفکر نے لکھا ہے ۔۔۔ تم اپنے آنسو گن سکتے ہو، اپنے قہقہے نہیں گن سکتے۔
س۔ ہمیشہ غلطی کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟
ج۔ ناکامی و نامرادی!
س۔ اس دور میں برے کام کرنے والا خوش حال کیوں رہتا ہے؟
ج۔ عارضی زندگی میں خوش حالی کوئی خوش حالی نہیں۔ عارضی زندگی میں خوش حال رہنے والے ابدی زندگی میں بدحال رہیں گے۔

---

دیا شنکر۔ کان پور
س۔ کوئی نصیحت کی بات بتائیے۔
ج۔ خواتین انٹرنیشنل نے ایڈریس دیا ہے ۔۔۔ خدا کا نیک بندہ وہی ہے جو اس کے بندوں سے پیار کرتا ہے۔ جو خدا کے بندوں سے پیار نہیں کرتا وہ خدا کا بندہ نہیں اور نہ خدا اُسے محبوب رکھتا ہے۔

---

رخسانہ۔ سہارنپور
س۔ روسی شاعر کس انداز کے اشعار کہتے ہیں؟ رومانی یا محنت کشوں اور مزدوروں کی ترجمانی کرنے والے؟ یا اخلاق کی تعلیم اور محنت اور مشقت کا درس دینے والے اشعار؟
ج۔ روسی شاعر ہر طرح کے اشعار کہتے ہیں، لیکن اپنی شاعری میں محنت کشوں کی ترجمانی اور مساوات کی تبلیغ اُن کا محبوب ترین موضوع ہے۔
س۔ زُلیش کمار شاد کے مجموعۂ کلام "سنگم" کے علاوہ اُن کے کلام کا کوئی اور مجموعہ شائع ہوا ہے یا نہیں۔ اگر شائع ہوا ہے تو ملنے کا پتہ بتائیے۔
ج۔ "سنگم" کے علاوہ اُن کے کلام کے کئی اور مجموعے شائع ہو چکے ہیں: "قاشیں" "ویرانے" "میرا منتخب کلام" "میرا کلام نو بہ نو" ۔۔۔ شاد مرحوم کی یہ ساری کتابیں آپ ادارہ "بیسویں صدی" سے طلب فرما سکتی ہیں۔

---

ہردیال بھاشیہ۔ دہلی
س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ایٹم بم کس نے بنایا؟
ج۔ اٹو ہان نے۔
س۔ میرا ایک دوست کہتا ہے "ٹینک" بریکٹ نے بنایا۔ میں کہتا ہوں ٹینک سوئنٹن نے بنایا ہے۔ آپ کی رائے میں صحیح کیا ہے؟
ج۔ ٹینک سوئنٹن نے بنایا ہے۔ بریکٹ نے ہیلی کو بنایا ہے۔

---

مس نکہت آرا علیگ۔ بھوپال
س۔ زُلیش کمار شاد کا کوئی قطعہ سنائیے۔
ج۔ اثر اندازیٔ نشاط و الم
حسب افتادِ طبع ہوتی ہے
کچھ دماغوں میں غم بھی ہنستے ہیں
کچھ دلوں میں خوشی بھی روتی ہے

---

شاہانہ سکینہ۔ دہلی
س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں دنیا میں اَن پڑھ لوگوں کی تعداد کتنی ہے؟
ج۔ ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد ستر کروڑ سے زیادہ ہے۔
س۔ آپ کی مادری زبان اُردو ہے یا ہندی؟
ج۔ ہماری مادری زبان پنجابی ہے، لیکن ہمیں اُردو سے عشق ہے۔

---

ایس۔ این۔ دلشاد۔ پٹنہ
س۔ بھائی جان! بیکن نے کہا ہے ۔۔۔ علم سے انسان کے دل کی وحشت دور ہوتی ہے لیکن آج گنگا اُلٹی بہہ رہی ہے! ایسا کیوں؟
ج۔ یہ نئی روشنی اور جدید تہذیب کی دین ہے۔
س۔ اپنی پسند کا کوئی خوبصورت شعر سنائیے۔
ج۔ سنیئے ۔۔۔
کتنے طوفانِ حوادث تھے کہ سر سے گزرے
ہم مگر خندہ بہ لب گزرے جدھر سے گزرے

---

**Biswin Sadi**
**DELHI**

Rs. 1-25

نازک سی ہتھیلیوں میں چہرے کو لیے   وا، قصرِ تصور کے دریچوں کو کیے

بیٹھی ہے اک اپسرا سرِ شام اُداس   آنکھوں میں جلائے ہوئے یادوں کے دیے

مخمور سعیدی ——— فوٹو: سورج این شرما۔ جے پور

پنجاب کے نامور شاعر جنابِ نوبہار صابر کے مجموعۂ کلام "کارواں خیالوں کے" کا افتتاحی جشن بہت دھوم دھام سے پٹیالہ میں منعقد ہوا جس میں برگزیدہ شعرانے حصہ لیا۔ جنابِ رشی پٹیالوی غزل سرا ہیں ؎

غمِ دل کی تاثیر بدلی ہوئی ہے — زمانے کی تصویر بدلی ہوئی ہے

خوشا بخت زنجیر بدلی ہوئی ہے — اسیروں کی تقدیر بدلی ہوئی ہے

مقدر تو بدلا نہیں غم زدوں کا — مقدر کی تحریر بدلی ہوئی ہے

تمہاری نظر ہی نہیں بدلی بدلی — ہماری ہی تقدیر بدلی ہوئی ہے

اثر ہے شبِ غم کی تاریکیوں کا — ستاروں کی تنویر بدلی ہوئی ہے

وہی کہنہ تنظیم ہے آشیاں کی — فقط طرزِ تعمیر بدلی ہوئی ہے

یہ بیداریاں بھی تو خواب گراں ہیں — فقط اُن کی تعبیر بدلی ہوئی ہے

نوازا ہے شاید تمہاری جفا نے — محبت کی تفسیر بدلی ہوئی ہے

رشی جب سے دیکھی ہے تصویر اُن کی
نگاہوں کی تقدیر بدلی ہوئی ہے
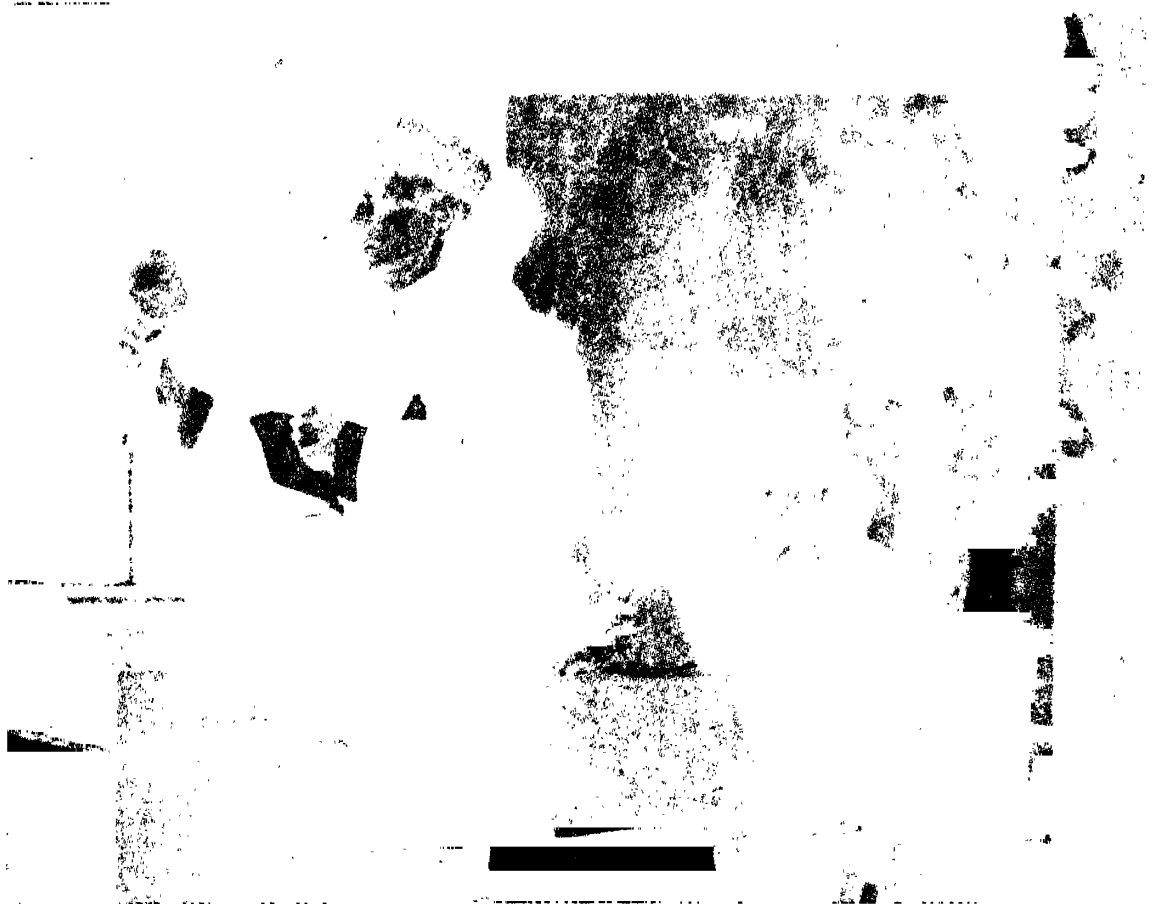
پٹیالہ کے مشاعرہ میں جنابِ ساحر ہوشیارپوری "عالمِ جلال میں" غزل سرا ہیں ؂

| | |
|---|---|
| ہم کو مستی و خواری آئی | تم کو دُنیا داری آئی |
| دِل جُوئی، دل داری آئی | تم کو بھی یہ عیّاری آئی! |
| پھُول کو ہم نے جب بھی چھُوا ہے | ہاتھ میں اِک چنگاری آئی |
| ساقی گُم، مَے خانہ خالی | کیسی یہ بادِ بہاری آئی |
| حُسن وہی ہے حُسن کہ جس کو | سادگی و پُرکاری آئی |
| مقتل میں اک شور بپا ہے | آئی، میری باری آئی |
| حُسن کی ہر معصوم نظر سے | دل پر ضربِ کاری آئی |

صُبح سے دِل مسرور ہے ساحرؔ
رات یہ ہم پر بھاری آئی
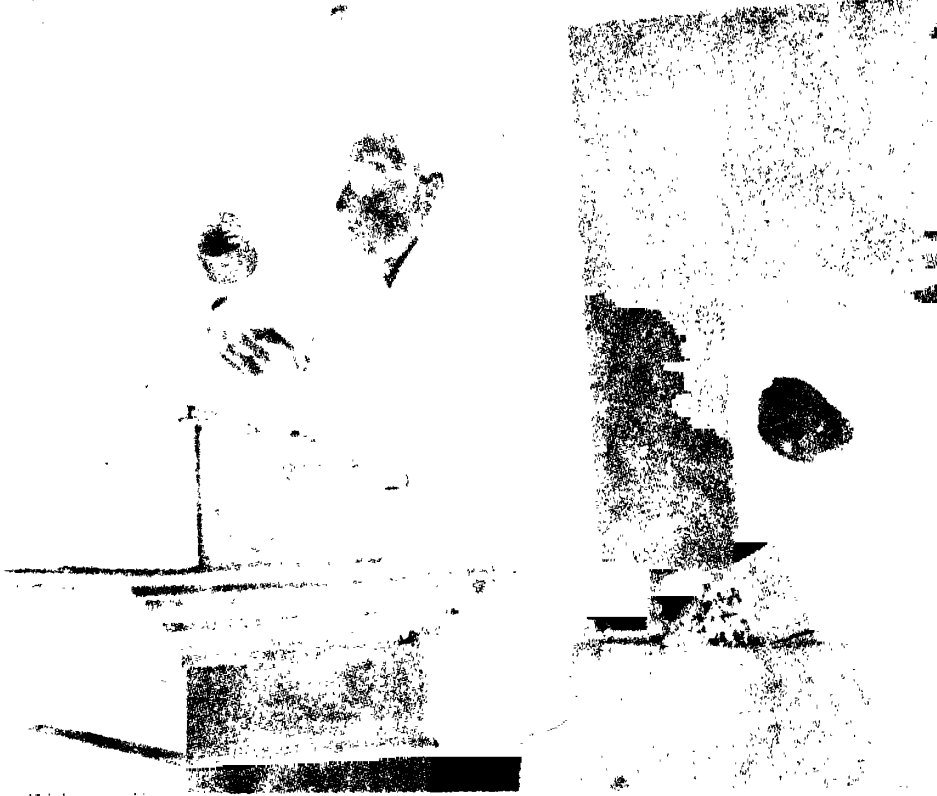
"کارواں خیالوں کے" کے مصنف جنابِ نوبہار صابر اپنا کلام سُنا رہے ہیں

آج تو موج میں جی ہو جیسے　　غم غلط کرنے کو پی ہو جیسے

دِل بہت خوش ہے ترا غم پاکر　　حاصلِ زیست یہی ہو جیسے

اُن کی خوش پیرہنی کیا کہئے　　شاخ پھولوں سے لدی ہو جیسے

کیسے شرمائے ہوئے بیٹھے ہیں　　آج ہی آنکھ ملی ہو جیسے

شبِ غم وقت کی رفتار نہ پوچھ　　ہر گھڑی ایک صدی ہو جیسے

رات یوں دِل میں تری یاد آئی　　شمع مرگھٹ میں جلی ہو جیسے

صبح صابر کی عجب حالت تھی
رات آنکھوں میں کٹی ہو جیسے

زمہ ساحرہ بیگم قزلباش زمزمہ خواں ہیں سہ

مُطمئن ہو گئے ہیں اب غم سے زِندگی کیا ہے پوچھئے ہم سے

ہم نے اِک داستاں سُنائی تھی آپ کِس واسطے ہیں برہم سے

سب نے دیکھی ہے میرے لب پہ ہنسی کوئی واقف نہیں مرے غم سے

پھُول ہی کانٹوں کے پاس ملتے ہیں ہر مسرت قریب ہے غم سے

ہم نے ہونٹوں کو سی لیا تھا مگر کھُل گیا راز چشمِ پُرنم سے

ساحرہ کِس قدر ہوئی مانوس

اپنی تقدیر زُلفِ برہم سے

ٹیلیفون ۶۱۹۹۳۷

"میرے مخالف مجھے ہٹلر، مسولینی، اسٹالن اور جارج سوئم کے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں وہ ایک سیمنار بلاکر طے کرلیں کہ میں کیا ہوں" مسز اندرا گاندھی کی تقـ

---

"برما کی چین کو وارننگ" ایک خبر —— کہ یہاں ہندی چینی بھائی بھائی کی تاریخ نہیں دُہرانے دی جائے گی۔

---

"اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ سے ہندوستان کو تین کروڑ وٹامن کیپسول کا تحفہ" ایک خبر —— ۵۲ کروڑ کے ملک کے لئے صرف تین کروڑ گولیاں —— یعنی اونٹ کے مُنہ میں زیرہ۔

---

"ہم وزارت میں نہیں رہنا چاہتے" بنگلہ کانگرس کے تین وزیروں کا اعلان —— بہت اچھا۔ بائی، بائی —— اور بہت سے تیار ہیں۔

---

"عورتیں اور طلبا نشہ بندی مہم کو کامیاب بنائیں" صدرِ جمہوریہ کی تقریر —— یعنی خم پر خم لنڈھائیں۔ جہاں ملے پی جائیں تاکہ نہ بچے نہ نشہ بندی ہو۔

---

"اناج کی قیمت گرانے کے لئے" ایک عنوان —— سرکار کو دھکا دے گی۔

---

"کانپور میں اعلیٰ ذات کے ہندو بھنگی بھرتی ہو رہے ہیں" —— ہری جنوں کی اجارہ داری ختم کرنے کے لئے۔

---

"یو۔ پی سرکار اندرا کو گرفتار کرنے کی مجاز ہے" راج نرائن کا بیان —— نہیں بڑ۔

---

"یو۔ پی اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے کے پہلے دن ہی کچھ خاتمہ یقینی" ایک خبر —— ہم سب سے پہلے تعزیتی ریزولیوشن پیش

---

"انڈو فرنشی عورت کے پیٹ کا بچہ سوالات کا جواب دے" ایک خبر —— شری نجلنگپا اپنی قسمت کا حال معلوم کریں۔

---

ڈاکٹر گوکل ٹرسٹ جانے کے لئے ہندوستان جا لوں گا۔ بیکانیر میں خان بادشاہ کی تقریر —— دوسرا مصرع بھی اہم ہے۔ ناہم عرض کئے دیتے ہیں کہ

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

---

جنگ آزادی کے مجاہدین کو پنشن۔ حکومت ہند نے اسکیم میں توسیع کر دی ہے —— اِن بیچاروں کو وزارتیں نہیں تو پنشن ہی سہی۔

---

"راجستھان سرکار جھک گئی" ایک عنوان —— لیکن گر نہیں گئی۔

---

"شہری جائدادوں کی حد مقرر کی جائے" ایک خبر —— اور جو لوگ اِس سے بچنا چاہیں وہ گاؤں میں جا بسیں۔

---

"گپتا لوٹے کی نیند حرام" ایک خبر —— کبھی آنکھ لگتی بھی ہے تو ترپاٹھی اور چرن سنگھ بھوت بن کر نظر آتے ہیں۔

---

"ایس ایس پی میں پھوٹ" ایک خبر —— "نئی" اور "پرانی" ایس ایس پی بننے کا امکان۔

---

"راجے مہاراجے گورنمنٹ سے ٹکر لینے کے موڈ میں" ایک خبر —— یہ بھی سنڈیکیٹ کے شانے سے شانہ ملائیں گے۔

---

"ملک میں جلد غریبی ختم نہ کی گئی تو انقلاب ناگزیر ہوگا" شریمتی اندرا گاندھی کی وارننگ —— اور سنڈیکیٹ کی دھجیاں اڑ جائیں گی۔

---

"روس ہند اور پاکستان کو ایک پلڑے میں تولنے کی پالیسی پر تل پڑا" ایک عنوان —— اِس لئے اب ہمارا نعرہ ہوگا —— روسی ہندی پاکستانی بھائی بھائی۔

---
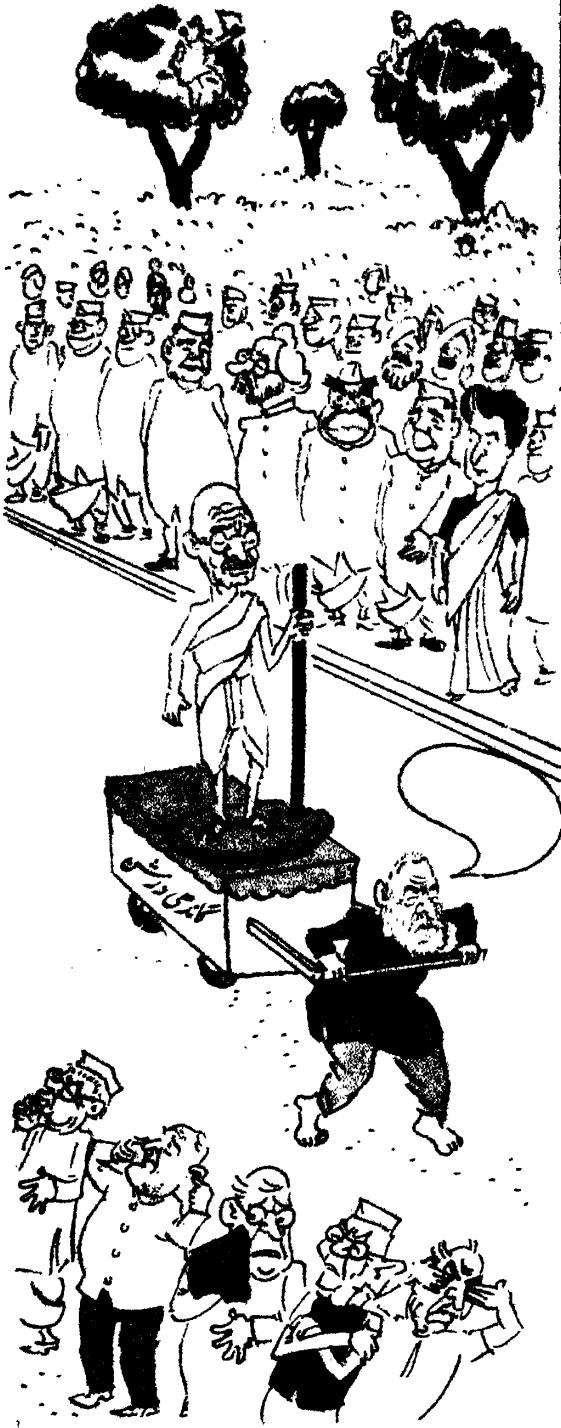
"ہندوستان نے گاندھی جی کو بھلا دیا ہے" خان عبد الغفار خاں۔

# مسز تارکیشوری سنہا ———

## خوشتر گرامی

کتابی چہرہ، سنڈیکیٹ کی شرانگیزیوں اور رُسوائیوں کی کھلی کتاب۔ بیل کے سے دیدے۔ بڑی بوڑھیوں کی زبان میں دیدے پھٹ۔ لمبی اونچی ناک جو مدت ہوئی کٹ چکی ہے۔ کشادہ دہن دریدہ دہنی میں بے باک۔ قد و قامت میں قیامت کے فتنے۔ تن گورا، من کالا۔ بگلے کا سا بھیس ——— یہ ہیں ———

مسز تارکیشوری سنہا

پنڈت نہرو کی غلطی سے ایک بار وزیر بن گئی تھیں۔ اس کے بعد سے دوبارہ بننے کی تڑپ ہے۔ جس نے راتوں کی نیند دن کا آرام حرام کر دیا ہے ——— چند روزہ وزارت ہی میں ساری کرپشن کے داغ دھبوں سے آلودہ ہو گئی۔ پنڈت نہرو نے انکوائری کرائی اور وزارت کرپشن کی نذر ہو گئی۔ لیکن پارلیمنٹ کی ممبری سادہ لوح ووٹروں کے باعث آج تک قائم ہے ——— مسز گاندھی کے سر پر وزارتِ عظمیٰ کا تاج رکھا گیا تو بغض و حسد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ چار سال سے محرومی و ناکامی کی آگ میں جل رہی ہیں ——— یہ حادثہ اتنا سخت تھا کہ دماغی توازن بھی کھو بیٹھیں۔ اندرا حکومت بھوت بن کر سر پر سوار ہے۔ زبان بے لگام ہو گئی۔ جلسوں میں جب وہ چلتی ہے تو سامعین کی طرف سے جوتے، چپل، اینٹ پتھر چلنے شروع ہو جاتے ہیں اور نجلنگپا کا گڑھ میسور ہو یا گپتا کا اتر پردیش۔ جدھر رُخ کرتی ہیں سیاہ جھنڈے [illegible] سے استقبال ہوتا ہے ——— خود جن سنگھ کی نقیب اور خطیب ہیں۔ بادشاہ خان کو جناح کی بولی بولنے کا طعنہ دیتی ہیں جو [illegible] کا کوئی پاگل بھی شاید نہیں دے سکتا ——— مختصر یہ کہ یہ خانہ سنڈیکیٹ کی خانہ ویرانی کو کافی ہے۔ یعنی بقول

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

کشمیری لال ذاکر ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

۱۲۶۔ سیکٹر ۱۹، چنڈی گڑھ

برادر گرامی! تسلیم

چند روز ہوئے صدیقی صاحب منیجر "بیسویں صدی" کا خط ملا جس میں انھوں نے آپ کی بیماری کی اطلاع دی تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ ڈاکٹر نے آپ کو لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا ہے۔ لمحہ بھر کے لئے تو سکتے میں آگیا۔ خدا کرے آپ جلد ٹھیک ہو جائیں۔ ڈاکٹر کا لکھنے پڑھنے سے منع کر دینا تو بڑے ظلم کی بات ہے۔ بہت رنج ہوا ہے اس سے۔ براہ کرم تفصیل سے لکھیں (بلکہ کسی سے لکھوا ہی دیں) کہ یہ سب کیا ہے؟ —— صدیقی صاحب پریشان ہیں کہ آئندہ پرچے کے مضامین فراہم کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں دشواری نہ ہو اور انھوں نے فرمایا ہے کہ کوئی کہانی بھیج دوں۔ "بیسویں صدی" کو مضامین کے سلسلہ میں کوئی دشواری کبھی پیش آسکتی ہے؟ اس کا مجھے یقین نہیں۔ بہرحال صدیقی صاحب کا ارشاد آپ ہی کا ارشاد ہے۔ میں ایک مختصر سی کہانی "تقسیم" بھیج رہا ہوں۔ میری طرف سے یہی خدمت سہی —— میری اور میرے ساتھ میرے تمام دوستوں کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں!

نیاز کیش —— کشمیری لال ذاکر

ایک نہایت ہی حسین عورت سے نہایت ہی گہرا عشق کرنے کے بعد اگر
ـے ہی چھوڑ دینا پڑے اور پھر آپ ایسی سچویشن میں پھینک دیے جائیں کہ
ـے نہایت ہی بدصورت عورت سے محبت کرنے پر مجبور ہونا پڑے تو آپ
ـکی کیا کیفیت ہوگی؟ بس یہی ایک سوال ہے جو آج کل میرے وقت کا ہر لمحہ
ـز چتا رہتا ہے۔ تو پھر سارے لمحوں نے سوالوں کا ایک انبار میرے سامنے
ـہے اور میرے پاس کسی بھی سوال کا جواب نہیں۔ میرے ہونٹ سِلے ہوئے
ـیے زخموں پر پہرا ہے۔ لیکن زخموں کی زبان کون سمجھتا ہے۔ سبھی ہونٹوں
ـہوئے الفاظ پر مرتے ہیں۔ زخم سے نکلتی ہوئی ٹیسیں کی گونج کیسے سنائی
ـدے؟

چنڈی گڑھ چھوڑنے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے مجھ میں کسی خوبصورت
ـہتا اور اس پر قربان ہو جانے کی صلاحیت ہی ختم ہو گئی ہے اور اب میں

ایک ایسے شہر میں ہوں جو بڑا تاریخی شہر ہے اور جس کی ہر گلی اور ہر مکان میں تاریخ کے واقعات دفن ہیں۔ یہ شہر ایک ایسی کتاب ہے جس میں کاغذ کی جگہ بھوج پتر استعمال کیا گیا ہے اور وہ اتنا پرانا ہے کہ ہاتھ لگانے سے بھی جھڑنے لگتا ہے۔ اس شہر کے ہر مکان کی ہر دیوار بھوج پتر کی بنی ہوئی ہے۔ لگتا ہے جھکڑ کے ایک ہی زوردار ریلے سے سارے مکان اُڑنے لگیں گے اور ان میں رہنے والے فضاؤں میں معلق ہو جائیں گے۔

اور ان دنوں میں اسی شہر کی ایک تنگ سی گلی میں ایک تنگ سے پرانے مکان کی اوپر والی منزل میں ایک صاف کمرے میں رہتا ہوں۔ یوں تو یہ عمارت بھی بھوج پتر کی ہی بنی ہوئی ہے لیکن اس کی بنیادیں مضبوط ہیں۔ کیونکہ ان میں ایک دوست کی محبت کا جاندار مسالہ بھرا ہے۔ اس لئے کسی بھی جھکڑ کے ریلے اسے نہیں اُڑا سکیں گے اور وہ منظر بھی کتنا عجیب ہوگا جب تمام شہر کی عمارتیں

طوفان کی زد میں آ کر فضا میں جھول رہی ہوں گی اور لوگ اپنے لرزتے ہوئے
گھروں کی کھڑکیوں سے خوفزدہ ہو کر نیچے جھانک رہے ہوں گے اور ایک
دوسرے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں گے اور اِدھر میں اور میرا
دوست اپنے اِس چھوٹے سے خوبصورت کمرے میں بیٹھے فضا میں جھولتے ہوئے
تمام شہر کو اور اُس کی تمام تواریخ کو دیکھ کر محظوظ ہو رہے ہوں گے اور سوچتے
ہوں گے کہ ہر تاریخ کا یہی حشر ہوتا ہے اور ہر تاریخ کبھی نہ کبھی اپنے آپ کو
دُہراتی ہے۔

بس کچھ اِسی قسم کے آوارہ سے خیالات آج کل میرے ذہن میں جنم لیتے
رہتے ہیں۔

میرا دوست اگرچہ کوئی امیر آدمی نہیں۔ لیکن یہ مکان اُس کا اپنا ہے۔
اپنا اِس لحاظ سے کہ اُس کے والد کو پاکستان میں چھوڑی ہوئی جائداد کے عوض جو
کچھ مِلا ہے اُس میں یہ مکان بھی شامل ہے۔ اُس نے اپنی ضرورت کے مطابق اِس
پُرانی عمارت میں کچھ ردّ و بدل کر کے اُسے اچھا خاصا قابلِ رہائش بنا لیا ہے۔
اوپر کی منزل میں میرا دوست اور اُس کے بچّے رہتے ہیں اور نچلے حصّے میں کرایہ دار۔
جس کمرے میں میں رہتا ہوں اُس کی سامنے کی دیوار میں ایک مستطیل قسم کا آئینہ
جڑا ہے۔ میں شیو وغیرہ کرنے کے لئے یہی آئینہ استعمال میں لاتا ہوں۔ میں جب
بھی اِس آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں، جانے کیوں مجھے احساس ہونے لگتا ہے کہ
آئینے کے اندر سے کئی چہرے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ کئی آنکھیں مجھ پر جمی ہیں
اور کئی ہونٹ کچھ کہنے کو بے تاب ہیں۔ کبھی کبھی ایک خوبصورت عورت کا چہرہ
سارے آئینے پر چھا جاتا ہے اور مجھے محسوس ہونے لگتا ہے جیسے کوئی سرگوشی کے
انداز میں کہہ رہا ہو۔

'میں رُدھی ہوں۔ میں اِسی کمرے میں سویا کرتی تھی۔ میں جب بیاہ کر لائی
گئی تھی تو اِسی کمرے میں میں نے پہلی بار اپنے شوہر کو دیکھا تھا۔ اِسی کمرے میں
میرا پہلا لڑکا پیدا ہوا تھا اور پھر یہیں میرے دوسرے دو لڑکے اور دو لڑکیاں
پیدا ہوئی تھیں اور پھر مجھے یہ شہر چھوڑنا پڑا تھا۔۔۔'

اور اِس سرگوشی کے ساتھ آئینے کی سطح سے پانچ چھوٹے خوبصورت بچے
اُبھرنے لگتے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں جیسے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے گلابی ہونٹ
اپنی معصوم اور دلنواز مسکراہٹوں سے آئینے میں دیوالی کے چراغ روشن
کر رہے ہوں اور میرا کمرہ ایکدم روشنی کے تلاطم میں ڈوب جاتا ہے اور مجھے
لگتا ہے جیسے یہ معصوم مسکراہٹیں امن اور شانتی اور بھائی چارے کی روشنی ہیں
جو ایک نہ ایک دن ساری دُنیا کو نور میں نہلا دے گی اور ہر آئینے میں انسان اپنے
مستقبل کو سنورتا اور نکھرتا ہوا دیکھے گا۔

اور مجھے ایکدم یاد آ جاتی ہے نوشیرو کی سطح مرتفع پر بنی ایک حویلی جس کے
ایک حصّے میں بٹوارے سے پہلے میں رہا کرتا تھا۔ سونے والے کمرے میں ایک الماری تھی
جس میں قدِ آدم ایک آئینہ لگا ہوا تھا۔ میں اِس آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے آپ کو
کئی پہلوؤں سے دیکھا کرتا تھا۔ میں نے شاید اپنے سارے ہی پہلو دیکھ لئے تھے اور اِسی کے سامنے
ہی میں نے انسان کے بھی سبھی پہلو دیکھے تھے اور اُن پر سوچا بھی تھا لیکن ایک پہلو سدا ہی میری
آنکھوں سے دُور رہا اور وہ انسان کے کردار کا وہ پہلو تھا جو اُسے خوبصورت ہونٹوں کی معصوم
مسکراہٹوں کو چھین لینے پر بھی اکساتا ہے۔ بسے ہوئے گھروں کو جلانے پر بھی آمادہ کرتا ہے اور
اپنی شرافت اور انسانیت کو اُبلتے ہوئے خون کے دریا میں غرق کر دینے پر بھی
مجبور کرتا ہے۔ یہی وہ پہلو تھا جس نے ایک روز رات کے گہرے اندھیرے میں
مجھے وہ حویلی چھوڑ کر تمام رات کھیتوں میں گزارنے پر مجبور کیا تھا کیونکہ اُس
رات اُس حویلی میں آگ لگا دی گئی تھی اور میرا سامان اور میری کتابیں اور میرے
مسودے اور میری کہانیاں اور نظمیں اور میری قدریں اور میرے وہ پہلو جنہیں
میں آئینے کی مدد سے سنوارا کرتا تھا، جلا کر راکھ کر دئے گئے تھے اور جب
اُس حویلی کے اوپر والے کمرے سے آگ کے شعلے لپک کر آسمان کو چھونے لگے تو
میرے ذہن میں ایک بہت زور کا دھماکہ ہوا جیسے میرا دماغ پھٹ گیا ہو۔ شاید
اُسی لمحہ میرے کمرے کا قدِ آدم آئینہ آگ کی تپش سے تڑاخ سے ٹوٹ گیا تھا
اور اِس کے ساتھ ہی اُس شہر سے میری تمام وابستگیاں ٹوٹ گئی تھیں۔
سارے رشتے منقطع ہو گئے تھے، سارے سمبندھ ختم ہو گئے تھے۔ میرا اُس
شہر اور اُس شہر کی گلیوں سے اب کیا رشتہ رہ گیا تھا؟ کچھ بھی تو نہیں اور
میں اگلی صبح اُس بڑے سے آئینے کی دھوئیں سے کالی سیاہ ہوئی کرچیاں
اپنے دامن میں سنبھالے ایک ایسی راہ پر چل پڑا جو اُس راستے سے مختلف تھی
جس پر میں اب تک چلتا آیا تھا اور اب جو راہ میرے سامنے ہے اُس پر ہزاروں
سنگِ میل ہیں۔ لیکن منزل کہیں نہیں۔ اگر کہیں ہے تو نظر نہیں آتی۔ شاید فیض
کو بھی وہ منزل ابھی نظر نہیں آئی۔ جبھی تو اُس نے کہا ہے ؎

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
بڑھے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اور اب دھوئیں میں لتھڑی وہ کالی سیاہ کرچیاں ہی میری دولت ہیں
میرا سرمایہ، میری پونجی۔ میں اِنھیں یوں سنبھال رہا ہوں جیسے کوئی بھکاری اپنی
دن بھر کی بھیک کی کمائی کو سنبھال رہا ہو۔

کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ اُس آئینے پر ایک کہانی لکھوں جو

...ں دیار میں چاند کی طرح چمکتا رہتا ہے اور ننھے چہروں کے ... بالعموم جو دن رات اس کی شکستہ ہوئی سطح کے نیچے سے مجھے پیار بھری ...ے دیکھتے رہتے ہیں۔ زندگی کے تختے پر بکھری ہوئی ذلت کی کہانی کہوں ...یسی کہ جس نے پہلی بار ایک پاکیزہ محبت سے ایک کنگال مرد کو مالا مال کر دیا ...اس کے بانکے بچوں کی معصوم مسکراہٹوں کا ذکر کروں جو اپنی مسکراہٹوں کے نور سے انسان کے حسین مستقبل کی گواہی دیتے ہیں۔ بس یہی تھیم ہوگا میری اگلی کہانی کا!!

---

غیر مطبوعہ مضامین واپس منگوانے کیلئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے۔ بصورت دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے۔ ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

---

# ...زل

سید علی سرکار جعفری ایم۔ اے

...ش، فصلِ خزاں، جو بھی ہو خوش دل رہیئے
...موسم ہو، ہر اک رنگ میں کامل رہیئے

موج و گرداب و تلاطم کا تقاضا ہے کچھ اور
رہیئے محتاط تو بس تا لبِ ساحل رہیئے

...ہ رہیئے کہ ہو جائے نہ کم شانِ جنوں
...ین کے خود اپنے ہی مقابل رہیئے

اُن کی نظروں کے سوا سب کی نگاہیں اُٹھیں
محفلِ یار میں بھی زینتِ محفل رہیئے

...ہر حال میں ہے صحبتِ ناجنس حرام
... صد حیف کہ ناجنسوں میں شامل رہیئے

داغ سینے کا دہکتا رہے، جلتا رہے دل
جب تلک رات ہے باقی مہِ کامل رہیئے

عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش ہے میاں
وجہ شائستگیِ خنجرِ قاتل رہیئے

# غزل

پرکاش ناتھ پرویز ایم۔ اے

گزرا مرے قریب سے اک پیکرِ جمیل
تارِ نظر کو سلسلہ جنباں کئے ہوئے

پھر ہو رہا ہوں راہِ محبت پہ گامزن
ہر مشکلِ حیات کو آساں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں اک بتِ کافر کو دیکھنا
اپنی نگاہِ شوق سے پنہاں کئے ہوئے

دیوانے کس مقامِ جنوں پر ہیں اِن دنوں؟
خود اپنی کائنات کو زنداں کئے ہوئے

دیکھا ہے میری چشمِ گنہگار نے انہیں
شانوں پہ گیسوؤں کو پریشاں کئے ہوئے

آنکھیں ملا رہے ہیں غمِ دو جہاں سے ہم
تازہ روایتِ غمِ جاناں کئے ہوئے

کاٹی ہے اضطرابِ محبت میں ہم نے زیست
تارِ نفس کو شعلۂ لرزاں کئے ہوئے

میرا مشاہدہ ہے کہ ہے عزمِ زندگی
ہر قطرۂ حقیر کو طوفاں کئے ہوئے

پرویزؔ کہہ رہا ہوں محبت کی داستاں
حسنِ نظر نواز کو عنواں کئے ہوئے

طاقت
بڑھاتا ہے
بھوک لاتا ہے
کام کرنیکی قوّت
پیدا کرتا ہے
جسم کی قوّت مدافعت
بڑھاتا ہے
جی ہاں!
سارے خاندان کی صحت کے
لئے فاسفومن
فاسفومن... پھلوں کے ذائقہ والا گہرے رنگ کا وٹامن ٹانک جس میں
وٹامن بی کامپلیکس اور کئی طرح کے گلیسرو
SQUIBB
Phosfomin
VITAMINS ELIXIR
ای۔آر۔ اسکوئب
رجسٹرڈ ٹریڈ مارک
SQUIBB
SARABHAI CHEMICALS

# جال

جگدیش بمل

راجپال ہاؤس، نفشینتھ روڈ، کھار۔ بمبئی نمبر۵۲

محترم بھائی!

عرصہ دراز کے بعد جال لے کر حاضرِ خدمت ہو رہا ہوں۔ یہ ایک ایسا جال ہے جس کے کچے دھاگوں میں بڑی بڑی ہستیاں بندھ جاتی ہیں ــــ پچھلے دنوں حیدرآباد سے واپسی پر مجھے معلوم ہوا کہ آپ بمبئی آکے چلے گئے۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ میں بمبئی میں موجود نہ تھا۔ خالد سے معلوم ہوا کہ آپ بہت اُداس رہتے ہیں، وجہ جاننے کے لئے خود دہلی حاضر ہو رہا ہوں . . .

آپ ہی کا ــــــ بمل

★

وہ آمدِ بہار کی ایک سہانی صبح تھی۔ مشرق میں اُجالا پھیل رہا تھا۔ شفق کی نئی نویلی دلہن ہوا کی مدھم مدھم چاپ کے ساتھ روشن کرنوں کے بازوؤں میں شرمائی لجائی، سمٹتی جا رہی تھی ــــ راجن جب جیم خانہ پہنچا اُس وقت آفتاب نے اپنی روشن کرنوں کا جال چاروں طرف پھیلا دیا تھا۔ بیڈمنٹن کورٹ کے باہر گھاس پر رکھی ہوئی بید کی کرسی پر بیٹھ کر اُس نے معمول کی طرح بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے کھلاڑیوں کی طرف نگاہ دوڑائی۔ اُسی لمحہ کامنی پر اُس کی نگاہ پڑی۔ کامنی کے چہرے پر دلکشی اور نزاکت کے ساتھ ساتھ ایک ایسی نرم نرم آنچ تھی جس نے راجن کے منجمد دل کو پگھلا دیا۔ وہ تیس برس پہلے ایک مفلس گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ حالات نے اُس سے ماں باپ کا پیار، بہن بھائیوں کا ساتھ سبھی کچھ چھین لیا تھا۔ افلاس کی تاریکیاں دُور کرتے کرتے وہ ایک ایسے شاہراہ پر آکھڑا ہوگیا جہاں اُس کے آس پاس اُس کا خیال رکھنے والے لوگ تو بہت تھے لیکن کوئی ایسا نہ تھا جسے وہ اپنا کہہ سکتا۔ زندگی کی تگ و دو نے اُس کی تجوریاں بے انتہا دولت سے بھر دیں لیکن اُس کا دل کا دامن بالکل خالی ہوگیا ــــ اپنی تنہائیوں سے تنگ آکر اُس نے مطالعے کی عادت ڈال لی اور کاروبار کی مصروفیات سے وقت نکال کر کتابوں کی وسیع دُنیا سے وہ اپنے دل کے خالی حصّوں کو پُر کرنے لگا ــــ مطالعے نے اُس کی حیرت انگیز مدد کی۔ اُس کا کاروبار اور بھی وسیع ہوگیا اور اس میدان میں اُسے ایسی ایسی کامیابیاں نصیب ہوئیں کہ اچھے اچھے کھلاڑی مات کھا گئے۔ پچھلی زندگی نے ہر آدمی سے ایک فاصلے پر رہنے کی عادت سی ڈال دی تھی۔ لیکن مطالعے نے اُسے سوشل ہونا سکھا دیا اور سوسائٹی کے ہر طبقے میں وہ ہر دلعزیز ہوگیا۔ لڑکیوں کے معاملے میں اُس کی پچھلی زندگی کے ساتھ ساتھ نئی عادتوں کا گٹھ جوڑ اور روپے کی فراوانی اُس کے بہت کام آئی۔ اُس کا خیال تھا، لڑکیوں سے ایک فاصلے پر رہا جائے تو لڑکیاں خود بخود پاس چلی آتی ہیں اور اگر اُن کے پیچھے پیچھے بھاگا جائے تو خوشبو بن کر وہ ہواؤں میں تحلیل ہو جاتی ہیں اور صرف خوشبوؤں سے کیا فائدہ ــــ جیسے بغیر جسم کے دل نہیں دھڑک سکتا، اُسی طرح بغیر پھول کے خوشبو کا کوئی فائدہ نہیں ــــ ایسا بھی نہ تھا کہ وہ روحانیت کو نہ مانتا تھا لیکن وہ زندگی کے نشیب و فراز کی سمجھ بوجھ رکھنے والا ایک باعمل انسان تھا۔ وہ سوچتا، جسم روح سے جُڑا ہوا ہے۔ روح کا پھول کتنا ہی مقدس اور پاکیزہ سہی لیکن جسم کے بغیر وہ کیسے مہک سکتا ہے۔

زندگی کی اُس منزل پر جہاں راجن کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کسی شے میں اُس کا دل نہیں لگ رہا تھا، اُس نے کامنی سے دل لگا لیا۔ کامنی ایک ــــ اور خوبصورت جسم کی مالک تھی۔ اُسے دیکھ کر اُسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے خدا بہت اچھا آرٹسٹ ہے۔ بہت ہی دلکش اور خوبصورت زاویوں سے اُس نے کامنی کے جسم کو حُسن و رعنائی بخش کر بہت ہی پیاری روح کو اس میں بند

[illegible] دلآویز جسم کو دیکھ کر راجن کی رگوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا اور پہلی بار اُسے محسوس ہوا کہ زندہ رہنا [illegible] ہے۔ جب کھیل سے فراغت پا کر کامنی اُس کے قریب ہی آکر کھڑی ہو گئی تو نہ جانے کیوں راجن کو ایسا محسوس ہوا جیسے دُنیا کا کاروبار بے حد ترتیب اور خوش اسلوبی سے چل رہا ہے —— کامنی اُس کی کرسی کے پاس ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ رومال سے اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے اُس نے ایک بار راجن کی طرف دیکھا۔

خود بخود راجن کے مُنہ سے نکل گیا: "ٹائیرڈ (Tired)؟"

"اوہ نو! (Oh no)" اُس نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ بہت اچھا کھیلتی ہیں" بات بڑھاتے ہوئے راجن نے اپنے ہونٹوں پر سوشل مُسکراہٹ چسپاں کر لی۔

"تھینک یو!"

"میں نے آپ کو پہلی بار کلب میں دیکھا ہے۔ آپ ——"

"جی ہاں! میں پہلی بار آئی ہوں۔ مسز دھیرج لعل کی مہمان ہوں۔"

راجن کو بعد میں معلوم ہوا کہ کامنی مسز دھیرج لعل کی چھوٹی بہن ہے اور بنگلور سے کچھ عرصہ کے لئے اپنی بہن کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کے لئے آئی ہے کلب میں ہمیشہ اُس کے گرد نوجوانوں کا جمگھٹا رہنے لگا۔ جن کی عمر زیادہ ہو چلی تھی وہ ایک طرف بیٹھے اُسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہتے۔ راجن کو شروع ہی سے مجمع سے چڑ تھی اِس لئے بہت چاہنے پر بھی وہ اُس کے آس پاس کے دائروں کو توڑ کر اُس کی قُربت کی حدود میں داخل نہ ہو سکا۔

---

ایک سانولی سلونی شام کو وہ کلب کے برآمدے میں کین کی کرسی پر بیٹھا تاریکی میں ڈوبتے ہوئے آسمان کی طرف بے مقصد دیکھ رہا تھا —— اُس شام مشرقی اُفق سے اُبھرتے ہوئے بادل آسمان پر چھا رہے تھے اور تاریکی سے پہلے ہی آفتاب کی روشنی بُجھ گئی تھی۔ راجن نے محسوس کیا کہ اُس کے قریب آکر کوئی کھڑا ہو گیا ہے۔ پلٹ کر اُس نے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ کامنی کو اپنے قریب ہونٹوں پر دلکش مُسکراہٹ لئے، کھڑا پا کر اُس کے دل کا چاند چمک اُٹھا۔ وہ کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ ——!"

کامنی نے ایک کرسی کھینچ لی اور راجن کے سامنے بیٹھ گئی۔

"آسمان کی وسعتوں میں کیا تلاش کر رہے تھے آپ؟"

راجن بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اپنے آپ کو اُس نے سنبھال لیا۔

"حیران تھا کہ چاند کہاں گیا؟" وہ ہنس دیا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ پھر بولا: "اپنی چیزوں کی تلاش میں کبھی کبھی انسان وقت اور فاصلوں میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہتا ہے۔ پھر ایک دن کسی درخت کے نیچے اُسے روشنی سی دکھائی دے جاتی ہے اور اُسے گیان مل جاتا ہے کہ شے اُس کے قریب ہی ہے، قریب ہی نہیں اُس کے اندر ہی موجود ہے؟"

کامنی کے چہرے پر اُلجھی اُلجھی لکیریں کھنچ گئیں۔ شاید وہ راجن کی بات کا مطلب نہ سمجھی تھی۔ راجن نے پھر کہا۔

"دیکھئے نا! میں چاند کی تلاش میں آسمان کی ویرانیوں اور خلاؤں میں اپنی آنکھوں کی روشنی ضائع کر رہا تھا اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ چاند آج میرے نزدیک، بالکل میرے پاس ہی چمکنے والا ہے!"

کامنی کے کانوں کی لویں سُرخ ہو گئیں۔ شرمائی شرمائی سی نرم مُسکراہٹ اُس کے گلابی ہونٹوں پر کھیل گئی اور اُس کے موتیوں جیسے دانت چمک اُٹھے۔ راجن کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے دل کے اندھیروں میں اُجالا ہو گیا ہے۔

"آپ کو اکثر تنہا دیکھتی تھی —— اب سمجھی کہ آپ شاعر ہیں۔"

راجن اُسی طرح ہنستا رہا۔

"میں شاعر تو نہیں، ہاں آپ سے یونہی ملتا رہا تو شاعری کرنے لگوں گا۔ شاعر بن جاؤں گا!"

"لیکن مجھے شاعروں سے [illegible]ت ہے۔"

جاننے کی سبھی طاقتوں کو مجتمع کر کے راجن نے اپنی نگاہوں میں بھر لیا۔ لیکن کامنی کے چہرے پر کسی ایسی خاص بات کی جھلک اُسے نہ ملی جس سے وہ چوکنا ہو جاتا۔ کامنی کی آنکھوں میں تو پہلے ہی کی طرح شراب اُبلی پڑ رہی تھی اور گالوں کے گلاب کھلے ہوئے تھے۔ اُس کے نیم وا ہونٹوں کی قاشوں سے اُسی طرح حلاوت اور شیرینی آواز بن کر بہنے کے لئے بیقرار سی نظر آ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں اور اُس کے چہرے کو اِس طرح دیکھتے دیکھتے راجن کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا دل ہزاروں زخمی پرندوں کا نشیمن ہے۔

کامنی نے شرماتے ہوئے لہجے میں پوچھا: "کیا دیکھ رہے ہیں؟"

راجن کے دل کے نشیمن سے سارے زخمی پرندے اُڑ گئے۔ وہ گھبرا کر بولا۔

"کچھ نہیں —— میں نے آپ کی بات ہی نہیں سُنی تھی۔"

"اوہ! میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا، صرف یہی کہ مجھے شاعروں سے

نفرت ہے"

"تو کیا ہوا؟ میں شاعر ہوتا تو بڑی محبت سے آپ کی نفرت کو بھی قبول کر لیتا۔"

اُس کا گلابی چہرہ اور بھی سُرخ ہو گیا ــــــ راجن نے پھر کہا۔

"میں بدقسمت ہوں، خدا نے مجھے شاعر نہیں بنایا۔"

"کیوں؟"

"اِس لئے کہ میں شاعر ہوتا تو آپ کی نفرت پانے کے اِس لمحہ کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔"

"آپ نفرت پانے کے لئے بہت بے قرار نظر آتے ہیں۔"

"آپ اُس دل کی کیفیت سے واقف نہیں جو پانے اور کھونے کی دُنیا سے بالکل الگ ساری زندگی بالکل تنہا اور اکیلا رہا ہو ــــــ آپ شاید نہیں جانتیں، کسی کی نفرت یا بے رُخی کو بھی قبول کر لینے کے بعد انسان کی تنہائیوں کے زخم بھر جاتے ہیں۔"

اُسی وقت اُن کی کرسیوں کے پاس کوئی آ گیا۔

"مِس کامنی، آپ کو مسز لعل بُلا رہی ہیں۔"

"اوہ ڈونٹ ڈسٹرب!" اُس نے آنے والے کی طرف دیکھا پھر راجن کی طرف دیکھ کر بولی: "میں آپ کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں۔"

"سَم ادر ٹائم (Some other time)! اِس وقت آپ کو مسز لعل بُلا رہی ہیں۔"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا ہاتھ راجن کی طرف بڑھا کر بولی۔

"یہ ایک بہت ہی رسمی بات ہے، پھر بھی اگر یہ نہ کہوں کہ مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی، تو یہ اپنے آپ پر ظلم ہوگا۔"

راجن نے ہاتھ بڑھا کر اُس کا خوبصورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"آپ کل میرے گھر پر ڈِنر کے لئے کیوں نہیں آتیں۔ ہم بیٹھ کر خوب باتیں کریں گے۔"

"اوہ نو! ــــــ مجھے کسی کے گھر جانا پسند نہیں۔ ہم کل یہیں ملیں گے۔"

اپنا ہاتھ چھڑا کر وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی اور راجن کے دل پر پھر وہی اندھیرا چھا گیا۔

---

کلب کی اُس ملاقات کے بعد راجن نے وہاں جانا چھوڑ دیا۔ آفس سے سیدھا گھر آ جاتا اور کوئی کتاب سامنے کھول کر پھیلے ہوئے حروف کی طرف دیکھتا رہتا۔ ایک عجیب سا احساس اُس کے ذہن پر بادلوں کی طرح تیرتا رہتا۔ ایک طرف اُٹھتی ہوئی رنگینی اور رُومان پرور ترنگوں کا پُرمسرت احساس تھا تو دوسری طرف انجانی سی محرومی سے دل اندر ہی اندر دھڑکتا رہتا۔ تنہا تو وہ پہلے ہی تھا۔ کامنی کے خیالوں نے اُسے زندگی کی آسائشوں اور آس پاس کی خوبصورت زندگی کے درمیان اور بھی تنہا کر دیا۔

ایک شام جب دن کا اُجالا تھک ہار کر اپنے تاریک آشیانے میں لَوٹ گیا اور مغرب سے ہَوا کے جھونکے اپنے دامن میں ٹھنڈی آہیں بھر کر چلنے لگے، راجن کے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ بے دلی سے راجن نے ریسیور اُٹھا کر کان سے لگا لیا: "ہیلو!"

"ہیلو! کیا میں مسٹر راجن سے مخاطب ہوں؟"

راجن کے اندر گھنٹیاں بج اُٹھیں۔ حیرت اور مسرت سے اُس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"ہاں ــــــ آں ــــــ یس یس!!"

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

راجن نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

"کیا میں اپنے ہمدرد کا نام پُوچھ سکتا ہوں؟" انجان بنتے ہوئے راجن نے کہا۔

"ہاں ہاں ضرور پُوچھ سکتے ہیں۔" کامنی کی شوخ آواز دوسری طرف سے آئی۔

"تو بتائیے اِتنی میٹھی اور سُریلی آواز کے جادُو کو قید رکھنے والا یہ کون سا جادُوگر ہے؟"

دوسری طرف سے ہلکے سے قہقہے کی آواز آئی۔

"گیس (Guess)!"

"اوہ! تو آپ ہیں ــــــ قہقہے کی زبان تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے آپ کو پہچان لیا!"

"تو بتائیے۔" کامنی اُسی طرح سے ہنستی رہی۔

"اچھا اگر شاعری میں آپ کی تعریف میں کچھ کہہ دوں تو آپ بُرا تو نہ مانیں گی؟"

"اوہ! نو آئی وِل بی فلیٹرڈ (Oh no I will be flattered) لیکن خیال رہے میں شاعروں سے نفرت کرتی ہوں!"

راجن زور سے ہنس دیا۔

"آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟" کامنی نے پوچھا۔

راجن کی ہنسی رنگ رہی تھی: "ایسے ہی ۔۔۔"

"پھر بھی ۔۔۔ آئی ڈونٹ تھنک، آئی ٹاکڈ فنی" (I Don't Think I Talked funny)

"آپ نے اپنی ہیٹ (Hate) کی بات دُہرا کر خود ہی بتا دیا کہ آپ کون ہیں، میرے گیس (Guess) کرنے والی اب کوئی بات ہی نہیں رہی۔"

"اوہ!" کامنی بھی ہنسنے لگی۔

"پھر بھی میں آپ کی شاعری سننا پسند کروں گی۔"

"کسی کو فلیٹر (Flatter) کرنا مجھے پسند نہیں۔ اور پھر آپ تو شاعروں سے نفرت کرتی ہیں۔"

"ہاں شاعروں سے تو کرتی ہوں لیکن شاعری سے نہیں اور اپنی تعریف تو خدا کو بھی اچھی لگتی ہے۔"

"تو پھر یونہی سمجھ لیجئے کہ میں نے اپنے خدا کو فوراً ہی پہچان لیا تھا!"

دونوں ہی ہنس دیئے۔ پھر کامنی نے کہا۔

"آپ بہت دنوں سے کلب نہیں آ رہے، میں نے سوچا شاید آپ کی طبیعت اچھی نہ ہو۔"

"کوئی خاص بات تو نہیں۔ وہاں ۔۔۔ ایسا ہی سمجھ لیں وہاں دل نہیں لگتا۔"

"دل بھی کوئی لگانے والی شے ہے؟ اِس کا کام تو صرف دھڑکنا ہے۔"

"خدا کرے آپ کا کہیں دل لگ جائے، پھر آپ کو پتہ چلے کہ دل کا کام صرف دھڑکنا نہیں۔"

"ایسی بد دُعا نہ دیں ۔۔۔ میں دل لگانے میں بلیو (Believe) نہیں کرتی۔"

"کیوں؟"

"اِس لئے کہ ہر آدمی عورت کے معاملے میں جانور ہے۔ کبھی تو دُم ہلاتے ہوئے اُس کے آس پاس گھومتا ہے اور کبھی ایک درندے اور وحشی کی طرح اُس سے سلوک کرتا ہے۔ انسانی تاریخ اِس سے بھری پڑی ہے۔ آپ ہی بتلایئے کیوں نہ کوئی جانور پال لیا جائے اور اُس سے پیار کیا جائے بہ نسبت آدمی کے جو نہ تو مکمل جانور ہے اور نہ ہی آج تک آدمی ہی بن سکا ہے۔"

ٹیلی فون کی اِس گفتگو کے بعد راجن نے کامنی کے بارے میں بہت سوچا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کامنی ایک قابل بیوقوف لڑکی ہے جس نے زندگی کے خوبصورت جسم اور آداب و لحاظ کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ پھر بھی جو چیز کامنی سے راجن کی دلچسپی نہ ہٹا سکی۔ مطالعے نے تلاش اور جستجو کی جو عادت اُسے ڈال دی تھی اُس کی وجہ سے پوری رات وہ کامنی کی اُس زندگی کی گتھی میں جاننے کی کوشش کرتا رہا اور کار و بار نے ہر شے کو جیت لینے کی جو لگن اور ہوس اُس کے ذہن میں پال رکھی تھی اُس نے کامنی کو جیت لینے کی خواہش کو اور بھی تیز کر دیا۔ اگلی صبح اُس نے ایک سیٹ پروگرام بنا لیا۔ کامنی کے گرد ایک خوبصورت جال بُننے کا پروگرام!

دوسرے دن شام کو اُس نے کلب میں ٹیلی فون کیا۔ کامنی وہاں موجود تھی۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" کامنی نے پوچھا۔

"بہت بُری۔"

"کیا بات ہے؟"

"پچھلی رات سوتے سمے مکان کے ایک کمرے کی چھت نیچے گر گئی اور میں زخمی ہو گیا ہوں۔"

"اوہ نو!" کامنی کی آواز میں حیرت کے ساتھ ساتھ دُکھ بھی تھا۔

"میں آپ سے ملنے کے لئے ابھی آتی ہوں۔"

"میں گاڑی بھجوا دیتا ہوں، ڈرائیور آپ کو لے آئے گا۔"

کامنی نے ڈرائنگ روم میں جب قدم رکھا تو وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ راجن کو مُسکراتے دیکھ کر اُس نے عجیب نظروں سے چھت کی طرف دیکھا۔

"آپ بہت جھوٹے ہیں!" وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"جی نہیں، پچھلی رات میں سویا نہیں۔ آپ نے ٹیلی فون پر کل جو گفتگو کی اُس سے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آسمان مجھ پر ٹوٹ پڑا ہے اور آسمان کو شکست کر اِس کمرے میں داخل ہونے کے لئے اِس چھت کو گرا کر ہی آنا پڑا ہو گا۔ اِسی لئے چھت گرنے کی بات کہی تھی اور آپ ہی بتائیں اپنی نفرت کی وجہ سے آپ نے ہر آدمی کو اپنی نظر سے گرا دیا ہے، یہ جان کر کون خود دار آدمی ہو گا جو زخمی نہ ہو گا ۔۔۔ میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔"

"پھر آپ نے مجھے بُلایا کیوں ہے؟"

راجن ہنس پڑا: "یہاں آنے کی خواہش تو آپ ہی نے ظاہر کی تھی۔"

راجن نے اپنے جال کی پہلی ڈور سے کامنی کو نرمی سے جھٹکا دیا ۔۔۔ کامنی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی: "تو مجھے چلے جانا چاہیئے۔" وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

"آپ کے اصولوں نے آپ کو بہت زیادہ محتاط بنا دیا ہے اور اتنا محتاط انسان بزدل اور ڈرپوک ہونے کے ساتھ ساتھ خود غرض اور تنہا بھی ہوتا ہے۔ میں آپ کو اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا کیونکہ آپ جیسی لڑکیوں کی محبت اور خوشی اتنی خود غرض ہوتی ہے کہ کوئی اُسے بانٹنے کی ہمت ہی کہاں کر سکتا ہے۔"

کامنی ایک لمحہ کھڑی راجن کو دیکھتی رہی۔ اُس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا اور زبان پر جیسے کسی نے تالے لگا دیے۔

راجن بہت تیزی سے کامنی کے گرد جال بُنتا جا رہا تھا۔ اپنے چہرے سے سختی اور سنجیدگی کے آثار اُس نے دُور کیے پھر آگے بڑھ کر کامنی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جایئے۔" راجن کے چہرے پر نرم مُسکراہٹ کی روشنی پھیل گئی۔

کامنی اس طرح صوفے پر بیٹھ گئی جیسے اُس کے جسم میں جان نہ ہو۔

اُس دن رات گئے تک وہ وہاں بیٹھی رہی۔ اُس نے راجن کی لائبریری دیکھی، مختلف موضوعات پر اُس سے باتیں کیں۔ دُکھ کی، سُکھ کی، رنگینیوں اور مسرّتوں کی، موت اور زندگی کی۔ راجن اپنی شخصیت کا جتنا اثر اُس پر ڈال سکتا تھا اُس نے ڈال دیا۔ کامنی واقعی اُس رات سحر زدہ سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت اور محبت کی روشنی جھلک رہی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد دوسری شام ملنے کا وعدہ کر کے جب کامنی جانے کے لئے تیار ہوئی تو راجن نے کہا۔

"آپ سے ایک چیز مانگوں، انکار تو نہ کریں گی؟" اُس کے لہجے میں شوخی اور شرارت تھی۔

کامنی نے راجن کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھتی رہی۔

"یہ نظریں پیار سے بھری ہوئی بھیگی بھیگی آنکھیں یہیں چھوڑ جایئں۔"

کامنی کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"آپ چاہتے ہیں میں اندھی ہو جاؤں؟"

"ہاں۔" راجن نے اپنی آنکھوں کو نیم بند کر کے اپنا سر ہلا دیا۔ "محبت اندھی ہوتی ہے نا۔ اِسی جذبے سے آپ کو سرشار کر دینا چاہتا ہوں، اِسی لئے ———"

کامنی کی آنکھیں جُھک گئیں۔

دوسری شام وہ جھیل کے کنارے سن رائز ریسٹورنٹ میں بیٹھے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پالتو جانوروں کی بات چل نکلی تو راجن نے کہا۔

"انسانی زندگی حادثات سے پُر ہے۔ کسی وجہ سے مایوس ہو کر اپنی زندگی کو سخت اصولوں کے احاطے میں بند کر لینا خودکشی کے برابر ہے ——— پالتو جانوروں، درباروں اور بُتوں کی محبت میں پناہ ڈھونڈنے والے انسان کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ایسے انسان کا ذہن اپنے سے برتر انسان کو گوارہ نہیں کر سکتا۔ اِسی لئے وہ انسان کی محبت سے آنکھیں چُرانے لگتا ہے۔ وہ محبت کے بدلے میں اُسے اپنے سے بھی شاندار اور خوبصورت محبت ملنے کا خطرہ لگا رہتا ہے ——— ایسے انسان محبت تو کر سکتے ہیں لیکن اپنے آپ کو کسی کی محبت کا مرکز بنتے ہوئے دیکھنا پسند نہیں کرتے حالانکہ مرکز بننے میں جو خوشیاں اور رُوحانی مسرّتیں ملتی ہیں وہ تسخیری محبت میں نہیں ملتیں۔ محبت کی دُنیا میں فتح کے بجائے مطیع ہو جانے میں زیادہ خوشی ہے۔"

راجن جتنی دیر باتیں کرتا رہا کامنی محبت سے اُسے دیکھتی رہی۔ راجن نے اپنی بات ختم کی تو کامنی نے ایک لمحہ کے لئے اپنا سر جُھکا لیا پھر اچانک ہی بولی۔

"آپ کو پچھلے وقتوں کی اُن کہانیوں پر یقین ہے جب کوئی پہنچا ہوا رِشی مُنی غصّے میں کسی کو شراپ دے دیتا تھا؟"

"کیوں؟" راجن نے کامنی کی بات نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے مجھے۔ یاد ہے اُس دن ———" کامنی کی آنکھیں بھر گئیں۔

راجن حیرت سے کامنی کو دیکھتا رہ گیا۔ کامنی مُسکرا دی۔

"اُس دن آپ نے مجھے بد دُعا دی تھی نا؟"

"میں نے؟" راجن پھر بھی بات کو نہ سمجھ سکا۔

"ہاں! آپ نے کہا تھا، خدا کرے آپ کا بھی کہیں دل لگ جائے پھر پتہ چلے کہ دل کا کام صرف دھڑکنا ہی نہیں۔"

اُس نے اپنا سر جُھکا لیا۔ کامنی کی بات سمجھ کر راجن کا دل زور سے دھڑک اُٹھا۔

"کامنی ———" راجن نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

"میں اپنی بد دُعا کی بات پُوری ہوتے دیکھ کر خوشی کا اظہار کروں یا افسوس کا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔"

کامنی نے سر اُٹھا کر راجن کی طرف دیکھا۔

"میں آپ کو کیا لوٹا دوں۔ وقت نے مجھے ایسی جگہ لا کھڑا کیا ہے جہاں خوشی اور افسوس کے بارے میں سوچنے کی مجھے فرصت ہی نہیں مل رہی ہے۔ یہ کیسی ادھوری، بکھری دھرتی ہے جو پتھریلی ہے پھر بھی جس کی کوکھ خوبصورت پھولوں سے بھری ہوئی ہے۔"

راجن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"آپ بھی شاعری کرنے لگی ہیں۔ اب اپنے آپ سے حفاظت کیسے کریں گی؟"

کامنی نے اپنا سر جھکا لیا۔

"میرا اپنا آپ، میرا اپنا آپ کہاں رہا ہے!"

شام ڈھل گئی۔ جوہو کے پانیوں میں آفتاب اپنی پوری سرخی کے ساتھ بہہ گیا۔ ٹھنڈی ہواؤں نے اپنے بادبان کھول دئے اور تاریکی بڑے ہی پُراسرار طریقے سے سارے ماحول پر چھا گئی۔

کامنی نے اپنی بھیگی آنکھوں کے کونے پونچھ لئے۔ افق پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔

"تم نے پہلے کبھی اس طرح رات کو اپنا جادو جگاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ دن یاد ہے ناتمھیں راج! جب ایسی ہی ایک تاریک شام کو کلب میں بیٹھے ہوئے تم آسمان کی وسعتوں میں نہ جانے کیا تلاش کر رہے تھے، میں تمھارے پاس ہی آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں سوچتی ہوں میری زندگی میں وہ لمحہ نہ آتا تو آج زندگی کیسی ہوتی؟"

کامنی کے الفاظ جب دل کی وادیوں سے نکلے تو راجن 'راج' میں بدل گیا اور 'آپ' 'آپ' سے 'تم' میں تبدیل ہو گیا۔ راجن نے سوچا کامنی میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آگئی؟

جوہو سے اٹھ کر وہ گھر چلے آئے ـــــ ساری رات راجن سو نہ سکا۔

رات کے آخری پہر اس نے اپنے دل کو سمجھا لیا۔ اس نے تو صرف جال پھینکا تھا۔ یہ ایک کھیل تھا جس میں اس کی جیت ہوئی ہے۔ اس کھیل کو کھیل ہی کے روپ میں رہنا چاہئے۔

---

اگلے دن صبح کامنی کو بنگلور واپس چلا جانا تھا۔

دھندلی دھندلی صبح کو جب وہ ایرپورٹ پہنچا تو کامنی پسنجرز لونج میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں باہر کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ راجن کو دیکھتے ہی اس کی اُداس آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی ـــــ جہاز چلنے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ راجن اُسے لے کر ریسٹورنٹ میں آگیا۔ خلافِ معمول وہ کامنی سے بہت ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ کامنی بے حد خاموش اور اُداس تھی۔ اس سے رہا نہ گیا۔

"کیا بات ہے، بہت خوش نظر آرہے ہو؟"

راجن ایک لمحہ اُسے دیکھتا رہا۔

"کبھی کبھی انسان اپنی اُداسیوں کو اس طرح بھی چھپاتا ہے۔"

کامنی کی اُداس آنکھوں کے چشمے بہہ نکلے۔ اپنی ساڑی کے آنچل سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"راج! تم نے میرے دل کو جو وسعتیں، جو روشنی بخشی ہے اس کے لئے میں تمھاری شکر گزار ہوں۔ تمھارے لئے میں ایسی لڑکی تو نہیں جسے تم اپنے دل کے کسی خانے میں رکھ سکو پھر بھی اگر میں تمھیں یاد رہ گئی تو مجھ جیسی خوش قسمت ـــــ"

وفورِ جذبات سے اس کی آواز کپکپا گئی۔ پھر جیسے ندی کا بند ٹوٹ گیا۔ راجن کچھ کہہ نہ سکا۔ اس کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

"کیا پاگل ہو گئی ہو؟"

کامنی نے پھر اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔

"تمھارے ساتھ میں نے جتنے دن گزارے وہ میری زندگی کے سب سے پیارے دن تھے۔ تم نے میرے اندر مسرت کے جو دیئے جلائے ہیں ان کی روشنی سے سدا میرا دل روشن رہے گا۔"

راجن کے منہ سے آپ ہی آپ الفاظ بہنے لگے۔

"کامنی تم اپنے آپ کو اتنا چھوٹا کر کے نہ دیکھو اور اپنی نظر میں مجھے اتنا عظیم مت بناؤ ورنہ ہمارے درمیان اتنا فاصلہ ہو جائے گا کہ ہم اس فاصلے کو طے نہ کر سکیں گے۔ اور دیکھو ـــــ"

وہ یکایک خاموش ہو گیا۔ کامنی نے سر اٹھا کر راجن کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ میں تمھارے لئے پالتو جانور بن گیا ہوں۔"

کامنی روتے روتے ہنس پڑی۔

"ہاں!"

"لیکن تم اس جانور کو بے دام نہ خرید سکو گی!"

"بزنس مین ہو نا اسی لئے شاید ہر شے کی قیمت چاہتے ہو۔"

کامنی کی شوخی لوٹ آئی۔ راجن اس کے بدلتے موڈ سے خوش ہو گیا۔

اُسی وقت اناؤنسمنٹ ہوئی بنگلور جانے والا جہاز جانے کے لئے تیار تھا۔ چائے اُسی طرح ٹیبل پر پڑی ہوئی تھی۔ دونوں ٹیبل سے اُٹھ کر آگئے۔ کامنی نے اپنا خوبصورت ہاتھ راج کے ہاتھ میں دے دیا۔

"اچھا! میں تمھیں خط لکھوں تو جواب دوگے؟"

"نہیں ـــــ خط لکھنے میں میں کچھ اتنا اچھا نہیں۔ تمھارے خط کے جواب میں سر کے بل چل کر خود تمھارے پاس پہنچ جاؤں گا!"

کامنی ہنس دی۔

"ویری گڈ! بس اسی طرح ہم ہنستے ہوئے جُدا ہوں گے اور جُدا ہوں گے پھر ملنے کے لئے!"

کامنی نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ راجن نے کہا: "اُداس نہ ہونا۔"

کامنی نے کچھ کہا نہیں۔ پلٹ کر جلدی سے چلی گئی۔

تین دن کے بعد کامنی کا خط راجن کو ملا ـــــ

"جب میں پلین میں بیٹھ گئی اور کھڑکی سے باہر اُس ریلنگ کی طرف دیکھا جہاں تم کھڑے تھے تو تمھارے چہرے پر فتحمندی کی مُسکراہٹ دیکھ کر مجھے پھر اُن پہنچے ہوئے رِشی مُنیوں کا خیال آگیا۔ اُن کی زبان سے نکلی ہوئی بد دُعائیں جب سچی ہو جاتی ہوں گی تو کچھ ایسی ہی چمک اُن کے چہرے پر بھی آجاتی ہوگی۔

تم نے مجھ سے پُوچھا تھا: اپنی بد دُعا پُوری ہونے پر خوشی کا اظہار کروں یا افسوس کا؟ میں تو ایک ایسی وادی میں آنکلی ہوں راج جہاں دُکھ سُکھ نہیں، جہاں انسان خوشی اور افسوس کے چکر سے پرے نکل جاتا ہے۔ تم ہی سوچو جس کا دل محبت کے جذبوں سے بھر گیا ہو وہاں خوشی اور افسوس، دُکھ اور سُکھ کے لئے کوئی جگہ رہتی ہے؟

پھر جب جہاز نے اُڑان لی تو مجھے یاد آیا۔ تم نے کہا تھا۔

'محبت کی دُنیا میں فتح کے بجائے مطیع ہو جانے میں زیادہ خوشی ہے!'

تمھارے چہرے پر جیت کی چمک آجانا ایک فطری بات تھی اس لئے کہ تم نے فتح حاصل کی تھی اور اس نشے میں تم اس بات کا اندازہ کہاں لگا سکتے تھے کہ اُس لمحہ اس دُنیا میں تم سے زیادہ مسرور اور محبت کے نشے میں سرشار انسان بھی موجود ہے۔ تم نے مجھے فتح کیا ہے راج اور میں تو مطیع ہوئی ہوں۔

اپنی جیت کی بات پڑھ کر تم چونکو نہیں راج۔ میں تمھارے دل کو جانتی ہوں ـــــ اُس دن کو بھی جانتی ہوں جس دن میری باتوں سے زخمی ہو کر تم نے پلان کر کے مجھے اپنے گھر بُلایا تھا۔ میں جانتی تھی تم میرے گرد ایک جال بُن رہے ہو لیکن عجیب بات تو یہ تھی کہ میں بھی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تمھارے جال میں پھنستی جا رہی تھی۔ کلب میں تمھارے نزدیک آکر کھڑا ہو جانا، تمھیں گھر پر فون کرنے میں پہل کرنا، کبھی کبھی، کبھی میٹھی باتیں کر کے تمھیں اُلجھانا اور سب سے بڑی بات یہ کہ تم سے اپنے اصولوں کی بات کہنا، پھر خود ہی اُن اصولوں کو توڑ دینا، یہ سب ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا ـــــ مجھ سے کہا گیا تھا کہ تم سوشل کی چڑیا ہو، تمھارے پاس بے انتہا سرمایہ ہے اور تم بالکل اکیلے ہو ـــــ میرا بھی اِس دُنیا میں ڈیڈی کے سوا اور کوئی نہیں ـــــ ڈیڈی، جس نے اسی طرح کے منصوبوں کے ذریعے دھیرج لعل جی سے شادی کی ہے اور آج مجھے زندگی کی سبھی آسائشیں اور لوازمات میسّر ہیں۔ تمھاری طرف میرا بڑھنا اور تمھیں حاصل کرنا اس کے پیچھے ڈیڈی کا دماغ تھا۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس خط کو لکھ کر میں تمھیں سدا کے لئے کھو دوں گی، تمھیں یہ سب لکھنے کی جُرأت کر رہی ہوں۔ اب یہ ساری باتیں مجھے لکھنی ہی تھیں اِس لئے کہ میرے دل کی کائنات میں سچائی کا سورج طلوع ہو گیا ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ دل کا کام صرف دھڑکنا ہی نہیں ـــــ دل تو ایک بہت بڑی کائنات ہے اور اس کائنات کی وہی سیر کر سکتا ہے جو محبت کرتا ہے اور جو محبت میں کسی کا مطیع ہو جاتا ہے۔

تمھیں پانا ہی اب میری زندگی کا مقصد نہیں رہا۔ تمھاری محبت نے جس سچائی کو میرے اندر جنم دیا ہے، مجھے اُس کی بھی حفاظت کرنی ہے اور تم ہی سوچو جس دل میں تمھاری محبت ہو، جہاں سچائی کا آفتاب چمک اُٹھا ہو وہاں اُداسیوں، دُکھوں اور غموں کے ڈر کے اندھیرے کیسے رہ سکتے ہیں۔ وہاں فریب، ریاکاری اور جھوٹ کے پاؤں کہاں ٹِکے رہتے ہیں۔

ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا راج!

تم نے مجھے کہا تھا: اُداس نہ ہونا، لو میں وعدہ کرتی ہوں، کبھی اُداس نہ ہوں گی۔

تم بھی کبھی اُداس نہ ہونا، میرے لئے پریشان نہ رہنا ـــــ وعدہ کرتے ہو نا؟

لو اب رخصت ہوتی ہوں ـــــ تم سے جُدا ہوتی ہوں، شاید پھر کبھی نہ ملنے کے لئے!

تمھاری ہی

کامنی

اُسی شام راجن نے کامنی کو تار دیا ـــــ

"میرے مکان کی چھت گر گئی ہے اور میں بُری طرح سے زخمی ہوا ہوں۔ میرا گھر بسانے کے لئے جلد از جلد پہنچو!

سدا تمھارا ـــــ راج"

---

مدیرِ "بیسویں صدی" کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

سید حباب ترمذی

خلوص عشق کو ٹھکرا رہا ہے — زمانہ کس طرف کو جا رہا ہے

کرم پر اُن کے دل اِترا رہا ہے — یہ پھر کم بخت دھوکا کھا رہا ہے

صبا کے دوش پر کون آ رہا ہے — چمن کا رنگ نکھرا جا رہا ہے

خیال اک بے وفا کا آ رہا ہے — ہجومِ غم سے دل گھبرا رہا ہے

غضب ہے ہنس رہے ہیں اہلِ ساحل — سفینہ اپنا ڈوبا جا رہا ہے

وہ میرا حال مجھ سے پوچھتے ہیں — میں چپ ہوں جیسے کچھ یاد آ رہا ہے

اُٹھاتا ہوں قدم راہِ طلب میں — مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے

مری جانب وہ نظریں اُٹھ رہی ہیں — بڑا نازک زمانہ آ رہا ہے

کسی بے مہر کا اندازِ پرسش — قیامت پر قیامت ڈھا رہا ہے

دلِ بیتاب ہے مجرم وفا کا — سزا جرمِ وفا کی پا رہا ہے

سناؤں کیا محبت کا فسانہ — نہ بھولا ہوں نہ کچھ یاد آ رہا ہے

شبِ وعدہ مہ و انجم سے پہلے — دلِ ناکام ڈوبا جا رہا ہے

گلستاں میں تبسم ریز ہو کر — کوئی رنگینیاں برسا رہا ہے

نظر میں برق، ہونٹوں پر تبسم — یہ کس کو آزمایا جا رہا ہے

وفاؤں کا حباب افسانہ سن کر
جفاؤں کو پسینہ آ رہا ہے

# اُونچی اُڑان

شاکر کریمی

گنج ۱ - بتیا (چمپارن) بہار

برادرم! سلام و نیاز

سالنامہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی اور ساتھ ہی افسوس بھی۔ افسوس اس لئے کہ میں اس سالنامے میں شریک نہ ہو سکا۔ پھر بھی یہ سوچ کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آج نہیں تو کل سہی! اور پھر عام شمارے بھی تو خاص نمبروں سے کم نہیں ہوتے۔ اتنا خوبصورت، عظیم الشان اور یادگار سالنامہ پیش کرنے پر دلی مبارکباد قبول فرمایئے ——— "اُونچی اُڑان" مارچ ۶۹ء میں بھیجی تھی جس کی اشاعت کے سلسلے میں آپ کا خط بھی مجھے مل گیا تھا۔ لیکن اب تک یہ کہانی کسی شمارے میں نہ آئی! ممکن ہے اِدھر اُدھر ہو گئی ہو۔ اس لئے پھر بھیج رہا ہوں ——— یہ ایک ہلکی پھلکی تفریحی کہانی ہے۔ لیکن حقیقت سے بالکل قریب ——— آپ کو پسند آگئی تو قارئین "بیسویں صدی" کو بھی پسند آجائے گی۔ آپ کی رائے کا انتظار رہے گا . . .

آپ کا اپنا ہی ——— شاکر کریمی

★

"اور یہی کالج، لڑکی ہے یا قیامت!" چلتے چلتے پرکاش کے قدم رک گئے۔

"چلتے رہو" کمار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"دیکھو تو سہی گلابی ساڑی اور گلابی بلاؤز میں اس کا گلابی چہرہ جیسے شگفتہ اور شاداب گلاب ہو"

"بیکار ہو بیسہ، بہت اونچی اُڑان ہے اس کی، تمہاری پرواز کی حد سے آگے بہت آگے"

"کون ہے یہ؟"

"سیما ... خوبصورت لیکن مغرور۔ [illegible]"

[illegible]

[illegible]

[illegible] تھا۔

[illegible]

[illegible] میں ایک ملہاری رقاصہ کے رقص کا پروگرام تھا۔ اس کی متجسس نگاہیں لوگوں کے ہجوم میں سیما کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ دفعتاً اس کی نگاہیں سیما پر پڑیں جو ابھی ابھی ہال میں داخل ہوئی تھی۔ کئی حریص نگاہیں اس پر پڑیں ——— ان گنت ہونٹ اسے دیکھ کر مسکرائے، کئی ایک نے اسے اپنے قریب بیٹھنے کی پیشکش کی، کتنوں نے ہیلو سیما کہہ کر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے زہر شکن حسن و شباب کا خراج وصول کرتی آگے بڑھتی رہی اور وہ ہال کے آخری جنوبی کنارے پر ہجوم اور ہنگامے سے الگ بیٹھ گئی۔ پرکاش کے لئے یہ موقع غنیمت تھا۔ وہ چاروں طرف اچٹتی نظر ڈالتا آگے بڑھتا گیا جیسے اپنے لئے کسی مناسب جگہ کا انتخاب کر رہا ہو اور وہ سیما کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] اور اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ ایوننگ ان پیرس کے ایک تیز جھونکے نے اس کے دماغ کو معطر کر دیا۔

سید حباب ترمذی

خلوصِ عشق کو ٹھکرا رہا ہے
زمانہ کس طرف کو جا رہا ہے

کرم پیماں کے دل اِترا رہا ہے
یہ پھر کم بخت دھوکا کھا رہا ہے

صبا کے دوش پر کون آ رہا ہے
چمن کا رنگ نکھرا جا رہا ہے

خیال اک بے وفا کا آ رہا ہے
ہجومِ غم سے دل گھبرا رہا ہے

غضب ہے ہنس رہے ہیں اہلِ ساحل
سفینہ اپنا ڈوبا جا رہا ہے

وہ میرا حال مجھ سے پوچھتے ہیں
میں چپ ہوں جیسے کچھ یاد آ رہا ہے

اُٹھاتا ہوں قدم راہِ طلب میں
مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے

مری جانب وہ نظریں اُٹھ رہی ہیں
بڑا نازک زمانہ آ رہا ہے

کسی بے مہر کا اندازِ پُرسش
قیامت پر قیامت ڈھا رہا ہے

دلِ بیتاب ہے مجرمِ وفا کا
سزا جُرمِ وفا کی پا رہا ہے

سناؤں کیا محبت کا فسانہ
نہ بھولا ہوں نہ کچھ یاد آ رہا ہے

شبِ وعدہ مہ و انجم سے پہلے
دلِ ناکام ڈوبا جا رہا ہے

گلستاں میں تبسم ریز ہو کر
کوئی رنگینیاں برسا رہا ہے

نظر میں برق، ہونٹوں پر تبسم
یہ کس کو آزمایا جا رہا ہے

وفاؤں کا حباب افسانہ سُن کر
جفاؤں کو پسینہ آ رہا ہے

# اُونچی اُڑان

شاکر کریمی

گنج ما۔ بتیہ (چمپارن) بہار

برادرم! سلام و نیاز

سالنامہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی اور ساتھ ہی افسوس بھی۔ افسوس اس لئے کہ میں اس سالنامے میں شریک نہ ہو سکا۔ پھر بھی یہ سوچ کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آج نہیں تو کل سہی اور پھر عام شمارے بھی تو خاص نمبروں سے کم نہیں ہوتے۔ اتنا خوبصورت، عظیم الشان اور یادگار سالنامہ پیش کرنے پر دلی مبارکباد قبول فرمایئے ——— "اونچی اڑان" مارچ ۶۹ء میں بھیجی تھی جس کی اشاعت کے سلسلے میں آپ کا خط بھی مجھے مل گیا تھا۔ لیکن اب تک یہ کہانی کسی شمارے میں نہ آئی! ممکن ہے اِدھر اُدھر ہو گئی ہو۔ اس لئے پھر بھیج رہا ہوں ——— یہ ایک ہلکی پھلکی تفریحی کہانی ہے۔ لیکن حقیقت سے بالکل قریب ——— آپ کو پسند آ گئی تو قارئینِ "بیسویں صدی" کو بھی پسند آ جائے گی۔ آپ کی رائے کا انتظار رہے گا . . .

آپ کا اپنا ہی ——— شاکر کریمی

"او مائی گاڈ، لڑکی ہے یا قیامت!" چلتے چلتے پرکاش کے قدم رک گئے۔

"چلتے رہو" کمار نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"دیکھو تو سہی گلابی ساڑی اور گلابی بلاؤز میں اُس کا گلابی چہرہ جیسے شگفتہ اور شاداب گلاب ہو؟"

"بیکار ہو پیارے، بہت اونچی اڑان ہے اُس کی، تمہاری پرواز کی حد سے آگے، بہت آگے!"

"کون ہے؟"

"سیما . . خوبصورت لیکن بد مزاج۔ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتی!"

"بمبئی میں اس کی کتنی ہی لڑکیوں کی میں نے ناک پکڑ لی ہے؟"

. . اور وہ اُس کے گرد منڈلانے لگا۔ لیکن اُسے سیما پر اپنا رنگ جمانے کا کوئی مناسب موقع نہیں مل رہا تھا۔

ایک شام ———

ہوٹل لاسٹ کلب میں ایک ملائی رقاصہ کے رقص کا پروگرام تھا۔ اُس کی متجسس نگاہیں لوگوں کے ہجوم میں سیما کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ دفعتاً اُس کی نگاہیں سیما پر پڑیں جو ابھی ابھی ہال میں داخل ہوئی تھی۔ کئی حریص نگاہیں اُس پر پڑیں ——— ان گنت ہونٹ اُسے دیکھ کر مسکرائے، کئی ایک نے اُسے اپنے قریب بیٹھنے کی پیشکش کی۔ کتنوں نے "ہیلو سیما" کہہ کر اُس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنے زہر شکن حسن و شباب کا خراج وصول کرتی آگے بڑھتی رہی اور وسیع ہال کے آخری جنوبی کنارے پر ہجوم اور ہنگامے سے الگ بیٹھ گئی۔ پرکاش کے لئے یہ موقع غنیمت تھا۔ وہ چاروں طرف اچٹتی نظریں ڈالتا آگے بڑھتا گیا جیسے اپنے لئے کسی مناسب جگہ کا انتخاب کر رہا ہو اور وہ سیما کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

"میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" وہ مؤدبانہ لہجہ میں سیما سے مخاطب ہوا۔

"بیٹھئے!" سو مرے پلکوں تک پرکاش کو گھورتی ہوئی بے دلی سے بولی۔

"شکریہ!" پرکاش نے بچھ جانے والے انداز میں جھک کر شکریہ ادا کیا اور اُس کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ ایوننگ اِن پیرس کے ایک تیز جھونکے نے اُس کے دماغ کو معطر کر دیا۔

... سگریٹ سلگایا ہی تھا کہ ویٹر نے مخاطب کیا۔
"آپ کے لئے کیا منگاؤں؟" پرکاش نے ویٹر کی طرف دیکھے بغیر سیما سے اس طرح پوچھا جیسے وہ اُس کی دیرینہ ملاقاتی ہو۔
"جی... جی... جی!" وہ ہکلا کر رہ گئی۔
"میں آپ ہی سے مخاطب ہوں، کیا منگاؤں آپ کے لئے؟"
"میں اپنے لئے خود ہی آرڈر دوں گی!" وہ خشمگیں نگاہوں سے پرکاش کو گھورنے لگی۔
"آپ آرڈر دیں یا میں، بات ایک ہی ہے!"
"نہیں، مجھے جو چاہئے خود ہی منگالوں گی!"
"آپ ہی سوچئیے، ایک ٹیبل پر دو آرڈر، اچھا معلوم ہوگا؟"
"کچھ بھی ہو!" سیما نے تیکھے پن سے کہا۔
"تو پھر ایک کام کیجئے!"
"کیا؟"
"آرڈر آپ ہی دیجئے، بل کے آدھے پیسے میں دے دوں گا!"
"آپ کے لئے بھی؟"
"ظاہر ہے میں ایک ہی آرڈر کا خواہش مند ہوں!"
سیما نے بات بڑھانا مناسب نہ سمجھا اور ویٹر کو صرف کافی لانے کو کہا۔
"بس، صرف کافی؟" پرکاش نے حیرت ظاہر کی۔
"آپ میرے مہمان نہیں جو میں آپ کی پسند اور خواہش کا خیال رکھوں؟"
"دوسرے ملکوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ لندن اور نیویارک کے بڑے سے بڑے ہوٹلوں اور کلبوں میں کسی بھی انجان لڑکی کو میں آسانی سے اپنا شریک کر لیا کرتا تھا۔ بہت فراخدل ہوتی ہیں وہاں کی لڑکیاں!"
وہ خاموش رہی۔
"چند لمحوں کے لئے زندگی کے ہنگاموں اور آلام سے نجات پانے کے لئے ہم یہاں آجاتے ہیں تو پھر کیوں نہ ان لمحوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے خوشگوار ماحول میں گفتگو کریں؟"
"کیا مطلب؟" وہ تنک کر بولی۔
"مطلب یہ کہ آپ ذرا نرم ہو جائیں، ویسے میں شریف آدمی ہوں!"
"آپ خواہ مخواہ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہے ہیں!"
"سچ پوچھئے تو میں تکلف کا قائل بھی نہیں، کیونکہ تکلف کی وجہ سے کبھی کبھی اذیت اُٹھانی پڑتی ہے!"

"اُفوہ! آپ چاہتے کیا ہیں؟" اُس کے لہجے سے بیزاری ظاہر تھی۔
"فی الحال صرف اتنا کہ آپ مجھے دوست سمجھیں۔ آپ مجھے نہیں جانتیں لیکن مس سیما! میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں!"
"دیکھئے مسٹر بور نہ کیجئے!"
"میرا نام مسٹر بور نہیں، پرکاش ہے۔ رہنے والا تو اسی شہر کا ہوں لیکن زیادہ تر بمبئی رہتا ہوں۔ بہت بڑا کاروبار ہے میرا بمبئی میں۔ کپڑوں کی دس ملیں، تین پٹرول پمپ اور فلموں کا بزنس بھی ہے!" اُس نے اپنی دولت کا دھونس جمانے کی بھرپور کوشش کی۔
"فلموں کا بزنس؟" اُس نے اس طرح پوچھا جیسے پرکاش کوئی انہونی بات کہہ گیا ہو۔
"جی ہاں، میں فلمیں پروڈیوس کرتا ہوں!"
"میں بھی آپ ہیرو کا رول کرتے ہیں!" ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔
"مجھے پردے پر آنے کا شوق نہیں۔ ہاں، اگر آپ چاہیں تو ہیروئن بن سکتی ہیں۔ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے!" اُس نے سیما کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔
"بس، بس، رہنے دیجئے، میں ہیروئن نہیں بننا چاہتی!"
"آپ سب کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتی ہیں کیا؟"
"کیا؟" وہ چونکی۔
"کچھ نہیں، کافی پیجئے!"
ویٹر اُن کے سامنے کافی کی ٹرے رکھ چکا تھا۔
اناؤنسر نے ڈانس کے آغاز کا اعلان کیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد رقاصہ اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ ڈانسنگ فلور پر نمودار ہوئی۔
رقاصہ کے سینے پر لپٹا ہوا مختصر سرخ باریک کپڑا اُس کے شباب کا نگہبان تھا اور ناف سے بہت نیچے سرخ رنگ کی چست پینٹ اُس کی شرم و حیا کی ناکام محافظ...
آرکسٹرا کی ناقابلِ فہم دھنوں نے فنِ موسیقی پر یلغار کر دی۔ رقص شروع ہوا۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے رقاصہ رقص کے بجائے اپنے جوان گداز جسم کے خدوخال اور اُتار چڑھاؤ کی نمائش کر رہی ہو۔ لوگوں کی حریص و ہوسناک نگاہیں اُس کے جسم کے نشیب و فراز میں گردش کرنے لگیں۔
پرکاش رقاصہ کے حسن و شباب کی نیرنگیوں سے بے خبر اپنے مقابل بیٹھی سیما کو تک رہا تھا۔ پرکاش کی نگاہیں اپنے چہرے پر محسوس کر کے سیما خفگی سے بولی۔

"میری طرف کیا دیکھ رہے ہیں، آپ تو ڈانس دیکھئے؟"

"جسم کی نمائش کے ساتھ فن کا مظاہرہ بھی لازمی ہے، اور اس رقص کے متعلق صرف اِتنا کہا جا سکتا ہے کہ ایک نیم عُریاں عورت مضحکہ خیز اُچھل کود کر رہی ہے؟"

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں!" وہ خلافِ توقع سنجیدہ نظر آنے لگی۔ سیما کی اِس اچانک تبدیلی پر اُسے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔ اُس نے سوچا تیر نشانے پر لگ گیا، بات بن گئی۔

"خود تو کہئے، کیا ایسا رقص عورت ذات کی تذلیل نہیں ہے؟"

"عورت کو اِس طرح عریاں کر دینے میں آپ فلم پروڈیوسروں کا بھی تو ہاتھ ہے!"

"کیا کریں، کچھ ایسی مجبوری ہے کہ ہمیں فلم بینوں کی پسند کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے!"

چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد وہ میز پر کہنیاں ٹیکتی ہوئی کچھ آگے جُھک کر بولی۔

"تو آپ واقعی فلم پروڈیوسر ہیں؟"

"تو کیا میرے فلم پروڈیوسر ہونے میں آپ کو شک ہے؟"

"میں سمجھی تھی آپ مجھے ڈاج دے رہے ہیں!" ایک لطیف مُسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"میری کئی ایک فلمیں جوبلی منا چکی ہیں!" اُس نے سیما کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"سُنتی ہوں نئے لوگوں کو فلموں میں جلدی چانس نہیں مِلتا؟"

"ٹھیک ہی سنا ہے آپ نے لیکن چانس دینے کے معاملے میں پروڈیوسروں کی مرضی کو کافی دخل ہے۔ وہ جسے چاہیں ہیرو بنا دیں، جسے چاہیں ہیروئن! اِسی لئے تو میں نے کہا تھا کہ آپ ہیروئن بن سکتی ہیں!"

"پہلے میں مذاق سمجھی تھی۔ کیا یہ ممکن ہے؟"

"سو فیصدی ممکن ہے، لیکن پہلے آپ مُسکرائیں تو سہی!"

اور وہ رفتہ رفتہ اُس سے بے تکلف ہوتی گئی۔

پرکاش خوش تھا کہ ایک اچھی چیز بھاگ دوڑ کئے بغیر آسانی سے ہاتھ آ رہی ہے۔

چند ہی ملاقاتوں میں دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

لیکن پرکاش کے دل میں ایک تڑپ، ایک کسک باقی تھی۔ وہ سیما کی سانسوں کی خوشبو سے مدہوش ہو جانا چاہتا تھا اور . . . اور کیف و سُرور اُس کی گہرائیوں میں ڈوب جانا چاہتا تھا۔

---

اور ایک رات!

دس بج چکے تھے، وہ پہلی بار اپنی کار میں سیما کو چھوڑنے اُس کے گ
اور جب کار سیما کے خوبصورت فلیٹ کے سامنے رُکی تو سیما نے کہا۔

"اب جب آ گئے ہو تو آؤ۔ آج ایک ہی ساتھ کھانا کھائیں گے!"

وہ جھوم اُٹھا۔ سیما کے اِس خلافِ توقع التفات پر اُمنگوں نے انگڑا
لی۔

"لیکن تمھارے گھر والے؟" وہ جھجکا۔

"گھبراؤ نہیں، صرف ایک ماں ہے اور کوئی نہیں!"

اور سیما اُس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔ وہ سوچ رہا تھا، آج سیما بہ
مہربان ہے اور بہت خوش، اور . . . اور آج . . .

"یہ میرا بیڈ رُوم ہے!"

"بڑے ٹھاٹ ہیں تمھارے!" اُس نے سلیقے سے سجے ہوئے بیڈ رُ
جائزہ لیا۔

"پسند آیا؟" سیما نے داد طلب نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"وَنڈرفُل! جسٹ لائک پیراڈائز!" اُس نے سیما کو خوش کرنا چاہا۔

"شُکریہ!"

"جب مکیں خوبصورت ہے تو مکان کیوں نہ خوبصورت ہو!"

"شریر!" وہ اِٹھلائی۔

"اب تو یہیں رہنے کو جی چاہتا ہے!"

"تو پھر یہیں بیٹھو، میں ابھی آئی!" اور وہ دِلربا انداز سے لچکتی
کھاتی بیڈ رُوم سے باہر نکل گئی۔

سیما کے حُسن و شباب کے تصور نے اُس پر نشہ کی سی کیفیت طاری کر د
اُس نے دو قدم آگے بڑھ کر خود کو پلنگ پر گِرا دیا —— دوسرے ہی لمحہ اُس
نظر ایک لفافے پر پڑی جو تکیہ کے گوشہ سے جھانک رہا تھا۔

غیر ارادی طور پر اُس نے لفافہ اُٹھا لیا اور اُس میں سے خط نکال کر پڑھنے ل

سیما ڈارلنگ!

جب سے بمبئی آیا ہوں اُداسیاں تقدیر بن گئی ہیں۔ یہاں کی پُر رونق چہل پہل میں دَم گھٹنے لگا ہے۔ ہر لمحہ تمھارا خیال، تمھارا تصور!!

تمھارے بغیر ایک پل بھی گزارنا دشوار ہے، لیکن کاروبار کی مصروفیت دو ہفتوں سے پہلے مجھے چھوڑنے دے گی اور تم سے دُور دو ہفتے دو صدیوں سے کم نہیں ——— اِس لئے تم خود چلی آؤ۔ دو ہزار کا چیک بھیج رہا ہوں کیش ہوتے ہی ہوائی جہاز کا ٹکٹ بُک کر لینا۔

تمھارا اور صرف تمھارا
جگدیش کھنہ
سویٹ ہوم، میرین ڈرائیو، بمبئی نمبر ۱

خط پڑھنے کے بعد جب [illegible] کی نگاہیں خط لکھنے والے کے دستخط پر پہنچیں تو اچانک اُس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ خط ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔
اور حیرت و استعجاب کے عالم میں اُس کی زبان سے نکلا "کہاں؟"
اور دوسرے لمحہ اُس کی کار ہوا سے باتیں کر رہی تھی [illegible]
دُور بہت دُور اور اُس کے لاشعور میں ایک آواز گونج رہی تھی ———
"بہت اونچی اُڑان ہے اِس کی۔ تمھاری حدِ پرواز سے کہیں بہت آگے ؟!!"

---

## غزل

خمار انصاری ایم۔ اے

دل اِک بجھے ہوئے شرر کے سوا کچھ اور نہیں
بدن جلے ہوئے گھر کے سوا کچھ اور نہیں

ہمیں خبر ہے کہ منزل رسی کے لمحے تک
عذابِ راہِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

گلہ نہیں ہے حریفوں کی کم نگاہی کا
کہ یہ بھی دادِ ہنر کے سوا کچھ اور نہیں

جمال، ذوقِ نظر ہی کا اِک کرشمہ ہے!
جمال، ذوقِ نظر کے سوا کچھ اور نہیں

تمام صورتِ ہستی، تمام نقشِ وجود
فریبِ شام و سحر کے سوا کچھ اور نہیں

یہ جان کر بھی اُسے پیار کر رہا ہوں خمار
کہ عاشقی میں ضرر کے سوا کچھ اور نہیں

## غزل

رئیس رامپوری

خوبیِ بخت سے تدبیر جو بن آئی ہے
پھر وہی میں، وہی کوچہ، وہی رسوائی ہے

ہم نے وحشت میں زمانے کو ہنسایا ہی نہیں
اپنی حالت پہ ہمیں خود بھی ہنسی آئی ہے

چاہیئے کوئی تو جینے کا بہانہ ورنہ
جانتے ہیں کہ محبت کسے راس آئی ہے

اختیار اپنا نہ ہنسنے پہ نہ رونے پہ کوئی
زندگی پائی ہے یارب کہ سزا پائی ہے

یہی کہہ لیجے کہ اپنے سے نہیں ہوں واقف
ورنہ ہونے کو زمانے سے شناسائی ہے

کھو گیا ہے کسی بستی میں کچھ ایسا کہ رئیس
ڈھونڈتا پھرتا ہے خود کو یہ خبر آئی ہے

# شیش محل کے کھنڈر

محمد جمیل احسن ایم ایس سی (علیگ)
ریسرچ اسکالر شعبۂ ریاضی و اسٹیٹسٹکس، وارڈن مرحوم کاشمیر ہاؤس، سلیمان ہال، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محترمی! تسلیم

"بیسویں صدی" ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہے۔ یہی سوچ کر ایک افسانہ "شیش محل کے کھنڈر" ارسال کر رہا ہوں۔ اگر قبول ہو گیا تو یہ میرے لئے عزّ و شرف ہوگا۔ افسانہ کیسا ہے اس کا فیصلہ تو آپ کریں گے۔ میری بدقسمتی سے اگر افسانہ "بیسویں صدی" کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو جب بھی اپنی قیمتی رائے سے نوازیں، ممنون ہوں گا۔
افسانے کے متعلق اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ صرف افسانہ ہے حقیقت نہیں۔ اب اگر کوئی اپنی داڑھی میں تنکا ڈھونڈے تو وہ اُس کا کارنامہ ہوگا!

احقر ــــــــــ محمد جمیل احسن

سورج کی آخری کرنیں درختوں کی چوٹیوں سے دُنیا کو الوداعی سلام کہہ رہی تھیں۔ سرما کی یخ بستہ شب دبے پاؤں بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ دھوپ ختم ہو جانے سے فضا میں خُنکی بکھر گئی تھی۔ لڑکیاں جو لان میں دھوپ کا لطف اٹھا رہی تھیں، اپنے اپنے کمروں کو واپس جا چکی تھیں لیکن شاہینہ ابھی تک نیو ہاسٹل کی چھت پر دُنیا و مافیہا سے بے خبر تنہا بیٹھی خیالوں میں غرق تھی۔ بیٹھے بیٹھے اس نے خیالوں کی لڑیوں میں نہ جانے کتنے میٹھے میٹھے کنوارے سپنے گوندھ ڈالے تھے۔ اس کے خیالوں کا مرکز تھا جاوید، جو ایم۔ اے فائنل انگلش کا طالب علم تھا۔ ایک اچھا طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھا مقرر بھی تھا۔ شاہینہ نے پہلی بار اُسے ایک تقریری مقابلے میں دیکھا تھا۔

یکایک کسی کے قدموں کی چاپ سے اس کے خیالوں کا سلسلہ منتشر ہو گیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو شہلا تھی۔ ہاسٹل کی سب سے شریر لڑکی! جس سے سارا ہاسٹل پناہ مانگتا تھا۔ شہلا نے آتے ہی اس کی پیٹھ پر ایک دھپ لگایا اور بولی۔

"شہزادی صاحبہ یہاں بیٹھی ہیں، وہاں میں سارے ہاسٹل کو چھان کر آ رہی ہوں۔ جلدی چلئے حضور!

بیٹھی ہاتھ میں ہولیں گنتی ہیں وارڈن آپ کو بلاتی ہیں
رُخ پر گیسو ہوا سے ہلتے ہیں چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں"

شاہینہ ہنستے ہوئے اٹھی اور شہلا کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر نیچے جانے کے لئے زینہ طے کرنے لگی۔

---

ویمنس کالج کا "کالج ویک" منایا جا رہا تھا۔ آج انگریزی تقریروں کا مقابلہ تھا۔ عنوان تھا "انگریزی شاعری میں عورت کا تصور" ایک کے بعد ایک لڑکے لڑکیاں آتے رہے۔ لیکن کوئی بھی ججوں کو مطمئن نہ کر سکا۔ ویسے اب تک ہونے والی تقریروں میں ویمنس کالج کی ایک طالبہ پروین کی تقریر سب سے بہتر تھی اور اُمید تھی کہ اوّل انعام وہی لے جائے گی۔ لڑکوں کے مُنہ لٹک گئے تھے اور وہ بے دلی سے تقریریں سن رہے تھے۔ سبھی کے چہرے پر مایوسی رقص کر رہی تھی کہ آج لڑکیوں نے بازی مار لی۔

مائک پر اناؤنسر کی آواز گونجی ــــــ
"اب اس مقابلے کے آخری مقرر جناب جاوید رضا سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ تشریف لائیں۔"

جاوید بڑے اعتماد اور بھروسے کے ساتھ آیا۔ پہلے تو کچھ جھجکا۔ لیکن پھر آ

یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے خیالات، معلومات اور احساسات کا ایک سمندر ہے جو اُمڈا چلا آ رہا ہے۔ پروفیسر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ لڑکوں کے چہرے خوشی سے دمک اُٹھے۔ جاوید لڑکیوں کا محبوب تھا لیکن لڑکیاں ہوٹنگ کرنا بھول کر خاموشی سے تقریر سُن رہی تھیں۔ تالیوں کی گونج میں جاوید اپنی تقریر ختم کر کے واپس آیا۔

ہال میں بالکل سناٹا تھا۔ لوگ دم بخود ہو کر ججوں کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر کار شعبۂ انگریزی کے پروفیسر نے اُٹھ کر اعلان کیا کہ اتفاق رائے سے اِس مقابلے کا پہلا انعام جاوید رضا کو اور دوسرا انعام پروین صاحبہ کو دیا جاتا ہے۔ لڑکوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر ہال سر پر اُٹھا لیا اور اُن تالیاں پیٹنے والوں میں شاہینہ بھی تھی جو غیر ارادی طور پر تالیاں بجا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اُس کی برابر والی لڑکی نے اُسے گھور کر دیکھا اور شاہینہ نے ہاتھ روک لئے۔

اُس رات جب شاہینہ سونے کے لئے لیٹی تو نیند کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اُس کے سامنے جاوید کا خوبصورت سراپا تھا اور کانوں میں اُس کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اُس کے بعد تو جاوید کے بارے میں سوچنا اُس کا معمول ہو گیا۔

---

سمسٹر کے امتحانوں سے ڈیڑھ ماہ پہلے شاہینہ بخار میں پڑ گئی۔ اِس لئے کلاسز اٹینڈ نہ کر سکی۔ جن میں انگریزی ادب کی چند بہت اہم کلاسز بھی تھیں۔ انگریزی کی لکچرر نے مشورہ دیا کہ تم امتحانوں تک کے لئے انگریزی کا ٹیوشن پڑھ ڈالو۔

اگلے جمعہ کو ملاقات کے گھنٹوں میں جب وہ اپنے بھائی سلیم سے ملنے گئی تو اُس نے ٹیوشن کا تذکرہ کیا۔ سلیم نے کہا میرے ایک دوست جاوید رضا انگلش میں ایم۔ اے کر رہے ہیں اُن سے کہوں گا شاید وہ تیار ہو جائیں۔ اُس دن اُس نے ساری رات جاگ کر دُعائیں مانگی تھیں کہ "یا اللہ جاوید مجھے پڑھانے کو تیار ہو جائیں!" اور جب دوسرے دن سلیم نے اُسے بُلا کر جاوید سے متعارف کرایا اور کہا جاوید نے بطور ٹیوشن نہیں محض میری خاطر تمہیں مدد دینے کا وعدہ کر لیا ہے تو وفورِ مسرت میں وہ جاوید کا شکریہ ادا کرنا بھول گئی۔

جاوید روز شام کو اُسے پڑھانے آنے لگا۔ جب وہ اپنے دلنشیں انداز میں بائرن اور کیٹس کے اشعار کی وضاحت کرتا تو شاہینہ کے دل کی دھڑکنیں کئی گنا بڑھ جاتیں۔ دلی جذبات سے تپ کر چہرے کا گلابی رنگ گلے میں پڑے ہوئے سُرخ دوپٹے جیسا ہو جاتا اور اُس کا جی چاہتا جاوید کے کاندھے پر سر رکھ کر دُور بہت دُور اپنے خوابوں کی دُنیا میں چلی جائے۔ جہاں ہوائیں پیڑوں کی ٹہنیوں سے اُلجھتی ہوئی سحر آفریں نغمے سُناتی چلتی ہوں۔ آبشاروں کے شور سے محبت کے سرمدی گیت پھوٹتے ہوں۔ جہاں چاندنی سکون و طمانیت کا پیغام لے کر آتی ہو۔ ایسی دُنیا جو ورڈز ورتھ کے شعروں میں نظر آتی ہے۔ جہاں صرف وہ ہو اور اُس کے خوابوں کا شہزادہ اور تیسرا کوئی نہ ہو۔ . .

"کہئے کچھ سمجھ میں آیا؟" جاوید کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکراتی اور وہ خوابوں کی دُنیا سے پروفیسر کے ٹیوشن روم میں واپس آ جاتی۔

---

سمسٹر کے امتحانات ہوئے۔ شاہینہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گئی۔ لیکن اب وہ ایک دوسرے امتحان سے گزر رہی تھی۔ جاوید سے اکثر اُس کی ملاقات ہوتی رہتی تھی اور ہر ملاقات اُس کے جذبات پر ایک تازیانہ ثابت ہوتی۔ وہ یونیورسٹی میں کہیں بھی جاتی اُس کی نظریں جاوید کو تلاش کرتی رہتیں۔ کینیڈی ہاؤس کے پروگراموں میں۔ آرٹس فیکلٹی کے مباحثوں میں۔ مولانا آزاد لائبریری میں ہر جگہ وہ جاوید کو ڈھونڈ لیتی اور اِس حُسنِ اتفاق پر دل ہی دل میں خوش ہوتی۔ اُس نے بارہا سوچا کہ جاوید کو اِس سوزِ نہاں سے آگاہ کر دے جو اندر ہی اندر اُس کے وجود کو جھلس رہا تھا اور جس کی تپش اب اُس کی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ لیکن ہر بار نسائیت کی انا اُس کے آڑے آتی اور اُس کے لب سِل کر رہ جاتے۔

وہ رو رو کر دُعائیں مانگتی کہ کاش کوئی معجزہ جاوید کو اُس کے دلی جذبات سے آگاہ کر دے۔ اُسے یقین تھا کہ جاوید اُسے نظر انداز نہ کر سکے گا۔ گھنٹوں وہ آئینے میں مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو دیکھا کرتی اور آپ ہی آپ شرما کر وہاں سے ہٹ جاتی۔

لیکن جاوید ایک پتھر کے بت کی طرح اُس کی پُوجا سے بے خبر تھا۔ جب بھی شاہینہ سے ملاقات ہوئی، دو چار رسمی باتوں کے سوا اُس نے کبھی شاہینہ کے شوق کی پذیرائی نہیں کی۔ لیکن اِدھر کئی دنوں سے جاوید کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا۔ یہ بات شاہینہ نے بھی محسوس کی تھی۔ اُس کے پُوچھنے پر جاوید ہنس کر اُسے ٹال گیا تھا۔ شاہینہ نے اِسے اپنی کامیابی کی پہلی منزل تصور کیا۔ کئی بار شاہینہ کو محسوس ہوا کہ جاوید اُس سے کوئی بات کہتے کہتے رُک گیا ہے۔ اُسے یقین ہو گیا کہ پُوجا رنگ لا رہی ہے اور کوئی دم میں دیوتا خود اُس کے قدموں میں ہو گا۔

---

آج کئی دنوں بعد آزاد لائبریری میں جاوید سے ملاقات ہو گئی۔ حسبِ معمول وہ کچھ بُجھا بُجھا سا تھا۔ شاہینہ کو دیکھتے ہی اُس کے چہرے پر رنگ دوڑ گیا۔ جیسے اُسے اپنی اُلجھن کا حل مل گیا ہو۔ رسمی مزاج پُرسی کے بعد جاوید نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"مِس شاہینہ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے"

"فرمایئے" دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پا کر شاہینہ نے کہا۔

"یہاں نہیں آیئے کینٹین میں بیٹھیں"

دونوں لائبریری کینٹین کی طرف چل پڑے۔ شاہینہ کے قدم جیسے ایک ایک من کے ہو گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا دل جیسے پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ وہ بار بار سر سے ڈھلک جاتا تھا۔ جاوید بھی کچھ کم بے چین نہ تھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں گہری مایوسی تھی۔ جس میں ایک موہوم سی اُمید کی چمک بھی صاف جھلک رہی تھی۔ شاہینہ کا جی چاہا جاوید کے سینے سے لگ جائے اور کہے۔

"میں جانتی ہوں تم کیوں پریشان ہو میرے شہزادے! اسی دن کے انتظار میں تو میں زندہ تھی کہ جب تم میری بارگاہِ حسن میں سوالی بن کر آؤ گے تو میں تمہاری جھولی میں اپنے پیار کے ساتھ ساتھ خود کو بھی ڈال دوں گی۔"

لائبریری کینٹین پہنچ کر جاوید نے ایک کنارے کی میز منتخب کی۔ بیرا چائے کا آرڈر لے کر جا چکا تھا۔

"مس شاہینہ آج میں اپنی زندگی کے ایک اہم معاملے میں آپ کا تعاون چاہتا ہوں۔" جاوید نے اُمید و بیم کے لہجے میں کہا۔

"جاوید صاحب اگر میری جان بھی آپ کے کسی کام آ سکے تو میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی!" شاہینہ کی آواز جذبات سے کانپ رہی تھی۔

جاوید نے ایک لمحے کے لئے چونک کر سر اُٹھایا اور شاہینہ کی شکل دیکھی۔ پھر آہستہ سے مسکرا کر بولا "آپ کی جان بہت قیمتی ہے مس شاہینہ! اسے اتنی ارزاں نہ کیجیے، میرا کام تو بہت معمولی سا ہے۔"

بیرے کے آجانے سے باتوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ چائے کی ٹرے اپنی طرف کھینچتے ہوئے شاہینہ نے کہا۔

"فرمایئے جاوید صاحب میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟"

"مس شاہینہ!" جاوید نے ہچکچاتے ہوئے ایک گلابی رنگ کا لفافہ جیب سے نکالا۔

"مس شاہینہ! اس لفافے میں میرے دل کی دھڑکنیں بند ہیں۔ میں آپ کو ان کا امین بناتا ہوں!"

شاہینہ کا یہ عالم تھا جیسے ہوا کے دوش پر اُڑ رہی ہو۔ آج اُسے اپنے خوابوں کی تعبیر مل رہی تھی۔ جاوید کی آواز اُسے دُور کسی ویرانے سے آتے ہوئے مدھم نغمے کی مانند معلوم ہو رہی تھی جو اُس کے کانوں سے ہوتا ہوا دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سر جھکائے دوپٹے کو اپنی اُنگلیوں پر لپیٹ رہی تھی۔

جاوید نے لفافہ اُس کی گود میں ڈال دیا اور بولا۔

"مجھے احساس ہے کہ میں ایک معیوب فعل کا مرتکب ہو رہا ہوں لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری امانت کی بہترین امین ثابت ہوں گی اور نہایت احتیاط کے ساتھ پروین صاحبہ تک پہنچا دیں گی۔"

شاہینہ کو یوں محسوس ہوا جیسے ٹیبل کے اوپر چلتا ہوا برقی پنکھا چھت سے اُکھڑ کر اُس کے سر پر گر پڑا ہو اور اُس کا دماغ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا ہو۔

جب اُسے ہوش آیا تو جاوید جا چکا تھا۔ اُس کی گود میں پڑا ہوا لفافہ جس پر پروین کا نام لکھا تھا اُس کے رنگین خوابوں کا منہ چڑا رہا تھا۔

اُس کی آرزوؤں کا شیش محل بے رحم حقیقت کی ٹھوس چٹانوں سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو چکا تھا اور اُن ریزوں کو چُنتے چُنتے اُس کا سارا وجود زخمی ہوا جا رہا تھا!!

---

# غزلیں

**علی احمد جلیلی ایم۔ اے**

تری نگاہ کا انداز کوئی کیا سمجھے
گری تھی طور پہ جو برق یہ وہی تو نہیں

تری ہنسی ہو مبارک تجھے گلے دوست
جو میرے لب پہ کبھی تھی یہ وہ ہنسی تو نہیں!

تجلیوں کے تلاطم میں جو کو کیا ڈھونڈوں
یہ دیکھتا ہوں نظر میری کھو گئی تو نہیں

قفس سے دُور نظر آ رہے ہیں کچھ شعلے
الٰہی خیر ہو بجلی کہیں گری تو نہیں

عجب کیف میں طے ہو رہی ہے راہ علی
کسے یہ ہوش کہ منزل گزر گئی تو نہیں

**پروفیسر آزاد گلاٹی ایم۔ اے**

ہم اگر اُن سے جُدا ہو جائیں
ایک گم گشتہ صدا ہو جائیں

منزلیں بڑھ کے قدم لیں خود ہی
آپ اگر راہ نما ہو جائیں

جو بھی آہیں مرے دل سے نکلیں
آپ کے حق میں دُعا ہو جائیں

زندگی نام ہوا اس کا شاید
عشق میں، آؤ، فنا ہو جائیں

وہ جو پتھر کے صنم ہیں آزاد
ہم جو پوجیں تو خُدا ہو جائیں

**شکیل احمد عاصم بریلوی ایم کام بی ٹی**

پناہ دے نہ سکیں شادمانیاں مجھ کو
ملی تو سایۂ غم میں ملی اماں مجھ کو

وفا کے بدلے جفا سے نوازنے والے!
رہیں گی یاد تری مہربانیاں مجھ کو

کہاں بناؤں گلستاں میں آشیاں اپنا
کہ چار سُو نظر آتی ہیں بجلیاں مجھ کو

شبِ فراق ہے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہیں
کسی کی یاد سُناتی ہے لوریاں مجھ کو

نثار اُن پہ دو عالم کی لذّتیں عاصم
رہِ وفا میں ملی ہیں جو تلخیاں مجھ کو

---

**مہندر پرتاپ چاند ایم۔ اے**

رَنج و غم سے جو ہم کنار ہُوئی
زیست کچھ اور خُوش گوار ہُوئی

جس کو تیری نظر نے چُوم لیا
وُہ کلی حاصلِ بہار ہُوئی

ایسے لمحے بھی ہم پہ گزُرے ہیں
جب محبت بھی دل پہ بار ہُوئی

کس کی خُوشبُو بسی خیالوں میں؟
میری ہر سانس عِطر بار ہُوئی

# مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| افسانہ لکھ رہی ہوں | خوش باش ایم اے | دو روپے |
| اندھیرے | اختر عادل روپ | دو روپے |
| آگ اور دھواں | سوم راجندر ایم اے | دو روپے ۵۰ نئے پیسے |
| اندھیرے اجالے | عادل رشید | تین روپے |
| اندھیری راتیں | ریوتی سرن شرما | تین روپے ۹۵ نئے پیسے |
| ایک پیار ایک دھوکا | رام سرن شرما | تین روپے ۷۵ نئے پیسے |
| بیگم صاحبہ | شوکت تھانوی | تین روپے ۵۰ نئے پیسے |
| دلدار | " | دو روپے ۵۰ نئے پیسے |
| بجلی | " | تین روپے ۵۰ نئے پیسے |
| بے غیرت | مضطر ہاشمی | چار روپے ۲۵ " |
| بارن تپے | کرشن چندر ایم اے | پانچ روپے ۹۵ " |
| پہلی لڑکی | رازدان ایم اے | دو روپے ۹۵ نئے پیسے |
| انور | فیاض علی | آٹھ روپے ۵۰ " |
| برہمن | کرشن گوپال عابد | چار روپے ۵۰ " |
| ستم | " | چار روپے ۵۰ " |
| گھائل | " | تین روپے ۹۵ " |
| ظالم | سعید لعرت | دو روپے ۵۰ " |
| جانے والے | اختر عادل روپ | تین روپے ۵۰ " |
| جاتی ہوئی بہار | وحشی محمود آبادی | چار روپے |
| چوٹ | دت بھارتی | تین روپے ۵۰ نئے پیسے |
| گناہ | " | دو روپے ۹۵ نئے پیسے |
| حالِ دل | بیگم توقیر ولایت حسین | تین روپے ۵۰ " |
| خاتون | انتصار حسین | تین روپے |
| حاجی مراد | قیسی رامپوری | چار روپے |
| پاگل | رئیس احمد جعفری | چھ روپے |
| خم ابرو (نظم) | عبدالحمید عدم | دو روپے ۵۰ نئے پیسے |

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| دو پھول | عادل رشید | تین روپے ۹۵ " |
| دو سال پہلے دو سال بعد | زبیدہ خاتون | چھ روپے |
| فریب مسلسل | شفیق بانو | دو روپے |
| زہر | ذکی انور | چھ روپے |
| برجیس | قیسی رامپوری | چار روپے |
| اچھی صورت بری نگاہ | ریاض ارشد | تین روپے |
| کانٹے | رضیہ سجاد ظہیر | تین روپے ۹۵ نئے پیسے |
| مجھے تم سے محبت ہے | نقی نور | تین روپے ۵۰ " |
| نئے قدم | ماجدہ نازلی | چار روپے ۵۰ " |
| ننگی جوانی | سعید لعرت | دو روپے |
| رہ گذر | انیس مرزا | چار روپے ۵، نئے پیسے |
| خوفناک محبت | عبدالحلیم شرر | تین روپے |
| شاہدہ | انتصار حسین | تین روپے |
| کرنیں | شفیق الرحمٰن | تین روپے |
| ناظم کی آپ بیتی | ایم اسلم | تین روپے |
| ایک دل ہزار غم | عزیز بدایونی | دو روپے ۵، نئے پیسے |
| زرینہ | رئیس احمد جعفری | چھ روپے ۵۰ نئے پیسے |
| ننگا شہر | احمد شجاع | پانچ روپے |
| دردانہ | نادرہ خاتون | پانچ روپے |
| چندر کلا | جمنا داس اختر | دو روپے ۵۰ نئے پیسے |
| جلن | " | دو روپے ۵۰ " |
| رادھا الزبتھ | " | دو روپے ۵۰ " |
| پاپی | " | چار روپے |
| سوناگاچھی | " | چار روپے ۵۰ " |
| طوفانوں کی کہانی | " | چار روپے ۵۰ " |
| جوار بھاٹا | " | چار روپے ۵۰ " |

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| قیامت | ذکی انور | دو روپے [illegible] |
| سازش | " | دو روپے ۵۰ " |
| کانٹوں کی سیج | رشید اختر ندوی | پانچ روپے |
| گھرانہ | قیسی رام پوری | چار روپے [illegible] |
| ناگ دیوتا | مخمور جالندھری | دو روپے ۵۰ " |
| خون کے چھینٹے | " | دو روپے ۵۰ " |
| خوابگاہ میں | " | تین روپے ۵۰ " |
| فراق | رنگین بھارتی | تین روپے ۵۰ " |
| پیاسا | " | تین روپے ۵۰ " |
| پراسرار قاصد | " | دو روپے |
| پراسرار قاتل | " | دو روپے |
| پیاس | کے۔ ایل تراز بی اے | تین روپے ۵۰ " |
| محبت روتی ہے | غلام عباس | دو روپے |
| مالوا | میکسم گورکی ترجمہ، نریش کمار شاد | ایک روپیہ ۷۵ " |
| کھیت میں لہو | تاجور سامری | ایک روپیہ ۲۵ " |
| جی ہاں پٹے ہیں | شوکت تھانوی | تین روپے ۲۵ " |
| پردے کے پیچھے | منٹو | دو روپے ۵۰ " |
| ملکۂ صحرا | اوم پرکاش ناہی | دو روپے ۵۰ " |
| خاموش نغمہ | " | چار روپے |
| آتشِ گل (مجموعہ کلام) | جگر مرادآبادی | پانچ روپے |
| باقیات اقبال " | ڈاکٹر اقبال | تین روپے |
| تلخیاں (کلاں) " | ساحر | چھ روپے |
| تلخیاں (خورد) " | ساحر | تین روپے ۵۰ نئے پیسے |
| پرچھائیاں " | ساحر | ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے |
| انسانیت موت کے دروازے پر (مولانا آزاد) | | تین روپے ۵۰ " |
| کیٹلاگ سازی | حاجی محمد زبیر | تین روپے ۵۰ پیسے |

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۷

# پچیس سال بعد

پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی ایم۔ اے

۱۷۰۵ پہاڑی بھوجلہ، دِلّی

ڈیر خوشتر!

پھر! احمد آباد میں سنڈیکیٹیوں کا دنگل دیکھنے تم نہیں گئے۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں دوسرا احمد آباد برپا کرنے کی توفیق عطا کرے۔ اچھا یہ مضمون لو اور اپنے نام نہاد سنڈیکیٹی کانگریسی دوستوں سے کہہ دو کہ وہ اس مضمون کے آئینہ میں اپنے خوبصورت مستقبل کی زیارت فرمالیں۔ اور اس کے بعد میرے جتنے مضامین غالبیات سے متعلق بیسویں صدی اور دوسرے پرچوں میں چھپے ہیں اُنہیں "غالب شکست کے بعد" کے عنوان سے جو میرا نیا مجموعہ نکل رہا ہے اس میں پڑھ لیں۔ یہ مجموعہ شاہراہ بکڈپو دلّی سے شائع ہو رہا ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر سنڈیکیٹیوں کو چاہئے کہ وہ اپنے جملہ ساتھیوں کو داد دیں جنھوں نے اپنی سیاسی سوجھ بوجھ سے فائدہ اُٹھا کر اور غالب کے کندھے پر بندوق چلا کر یو۔ پی کے اُردو داں طبقے کے ووٹ حاصل کر کے یو۔ پی کا الکشن جیت لیا۔ اب ان سے کہو کہ ۷۲ء کے الکشن کے لئے غالب سے بڑے کسی شاعر کی میت کو کسی قبرستان سے نکال کر اُردو زبان کے خون کا انجکشن لیں۔ ابھی اُردو کے بہت سے شاعر اپنی اپنی قبروں میں اُٹھا بیٹھی کر رہے ہیں اور اس سوچ میں پڑے ہیں کہ دیکھئے ان کا نمبر کب آتا ہے؟ میری دانست میں آئندہ کے لئے ذوق ان معنوں میں اچھے رہیں گے کہ وہ پنج سالہ منصوبہ کے شاعر تھے اُنہوں نے کہا تھا ؎

پُل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

اور ہاں۔ ایک پانچ فل اسکیپ صفحات کا خط بھی پڑھتے چلو جو "غالب کے استعمال" والا مضمون پڑھ کر میرے ایک کرمفرما نے مجھے لکھا ہے۔ اس سے زبان کا ذائقہ بھی بدلے گا اور چہرہ پر بشاشت بھی آئے گی۔ یہ ایک شریف مفلس اور انتقال زدہ کانگریسی کا خط ہے جو بیچارہ مرحوم کانگریس کی تحریکِ آزادی کے سلسلہ میں ہندوستان کی مختلف جیلوں کا ذائقہ چکھنے اور آخر میں نظر بندی کے عالم میں لال قلعہ کی دیواریں سونگھ کر انگریزوں کی گولیوں کے نشان جسم پہ لئے اِس اُمید پر قیدِ حیات لال قلعہ سے نکلا کہ شاید اس کی قربانیوں کا کوئی صلہ یا کوئی نام اس کو بھی ملے مگر آزادی کے بعد ؎

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا!

کانگریس وہ کانگریس نہ رہی جس کا نصب العین ایثار، قربانی اور مساوات تھا۔ یہ ہے شعر سُنو ؎

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا　　نہ شاخ تھی نہ چمن تھا نہ آشیانہ تھا

یہ شعر میری دانست میں اسی اسیرِ برگشتہ تقدیر کے لئے کہا گیا تھا ——— لیلیٰ کے جور و تغافل نے جب قیس کو مجنوں بنا دیا تو بھی وہ اما لیلیٰ کہنے سے باز نہ آیا۔ یہی حال ان بے چارے کا ہے کہ اتنے تلخ تجربوں کے بعد بھی اِن کا انا کانگریس کہنا اِس بات کی دلیل ہے کہ مجنوں ابھی زندہ ہے اور عشق حقیقی کو کبھی موت نہیں آتی۔ میرے بارے میں اُنہوں نے اپنے جن لطیف

خیالات کا اظہار کیا ہے اُس کے لئے میں اُن کا بے حد ممنون ہوں ؎

ناروا کہئے نا سزا کہئے — کہئے کہئے مجھے بُرا کہئے

لیکن اُن کے خط کے مندرجہ ذیل فقرے ضرور ہیرے اور جواہرات میں تولنے کے قابل ہیں کاش اُنہوں نے اِنہیں کسی جوہری کو لکھ کر بھیجا ہوتا ——

"مسلمان نے انگریز کا پڑھایا سبق آجتک غلط نہیں مانا اور اپنے کو ایک الگ قوم کا فرد تصور کرتا ہے اور خدا الگتی کہو ہی دوں کہ جب تک دلّی کا لال قلعہ، جامع مسجد آگرہ کا تاج محل کھڑے ہیں مسلمانوں کے دماغ سے یہ خیال ہرگز نہیں جا سکتا کہ ہمارے آباواجداد نے اِن کافروں پر حکومت کی ہے۔"

اِس کے بعد بہت سی نوازشوں اور میرے مرحوم اُستاد حضرت آرزو لکھنوی پر لعن طعن کے بعد ارشاد ہوتا ہے ——

"اُردو زبان کی فارسی لپی نے ایک طرح سے ایسا روڑہ اٹکایا کہ جس کا علاج ہی نہیں ہے اُردو کا طالب علم بچہ ہو کہ بالغ اُردو کے الف۔ بے۔ ی، سب سیکھ لے گا۔ الف بے۔ ی لکھنے لگے گا لیکن جوں ہی ان حروف کو ملا کر لکھنے کی نوبت آئے بھاگ جائے گا۔ اُردو لکھنا بہت مشکل ہے۔"

اور آخر میں فرماتے ہیں ——

"یہ لپی ہی دھیرے دھیرے اُردو کا گلا گھونٹ دے گی۔"

موصوف کا یہ سب کچھ فرمانا بہر صورت موجودہ حالات میں جبکہ مسلمانوں پر سے احمد آباد تک گزر چکا ہے بجا ہے۔ مگر میں پھر اُن سے گذارش کروں گا کہ آپ ذرا الگ کر اپنا علاج کریں اللہ بڑا رحیم و کریم ہے وہ آپ کو ضرور صحتِ کُلّی عطا کرے گا اور اُردو کی لپی کی تباہی اور تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد کا مسمار ہونا اور مغل دور کی دوسری قدیم عمارتوں کا حرفِ غلط کی طرح مٹتے دیکھنا آپ کو نصیب ہوگا۔ اللہ آپ اور آپ کے ساتھی گرو گولوالکر اور مدھوک جی کو عمرِ خضر عطا کرے۔ آپ جیسے محسنِ ادب اور محسنِ قوم روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ آپ کو زندہ و سلامت رکھے۔

مخلص —— غلام احمد فرقت کاکوروی

★

ملک کو آزاد ہوئے پچاس سال گذر چکے ہیں اور ملک کی مجموعی آبادی نوّے کروڑ کے لگ بھگ پہنچ چکی ہے جسمیں بالغ رائے دہندگان کی تعداد پینتالیس کروڑ ہے۔ سیاسی سوجھ بوجھ کا اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ ملک میں اِس وقت چالیس سیاسی جماعتیں ہیں جنہوں نے اپنے اپنے لائحۂ عمل میں چالیس جُداجُدا پنچسالہ منصوبے شامل کر رکھے ہیں غلّہ، روپیہ کا دو چھٹانک ملتا ہے۔ جنتا کو راشن میں چھوٹی چھوٹی طاقت کی گولیاں کھانے کو ملتی ہیں۔ ہر سال درمیانی مدّت کے آٹھ الکشن ہوتے رہتے ہیں سارے ملک میں ووٹروں کے بڑے بڑے بازار اور سپر مارکٹ قائم ہو گئے ہیں اِن بازاروں کے علاوہ تمام شہروں اور قصبوں میں جنتا نے محلّہ وار ووٹروں کی دوکانیں کھول لی ہیں۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں نے بھی ووٹروں کی لمیٹڈ کمپنیاں قائم کر لی ہیں۔ بعض کمپنیاں ٹھیکوں پر الکشن لڑواتی ہیں۔ آزاد اُمیدواروں کی سہولت کے لئے تھوک اور ریٹیل پر ووٹوں کا کاروبار ہوتا ہے۔ راجدھانی میں ایک عالیشان ووٹر مارکٹ قائم ہے جہاں ملک کے ہر شہر ہر صوبے کے ووٹ آل انڈیا پیمانہ پر فروخت ہوتے ہیں۔ ملک میں ڈھائی سَو صوبے ہیں اور ہر صوبہ میں جو چھوٹے چھوٹے شہر ہیں اُن کی طرف سے بھی مطالبات ہو رہے ہیں کہ انھیں بھی صوبوں کی شکل دیدی جائے۔ گاؤں کے مکھیا کو وہ تمام اختیارات حاصل ہیں جو کسی زمانہ میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو حاصل تھے۔ اگرچہ ملک میں مخلوط انتخابات رائج ہیں لیکن ووٹ جُداگانہ بنیادوں پر فروخت ہوتے ہیں۔ اِسی لئے ہر فرقے اور ہر مذہب والے نے فرقہ وارانہ بنیادوں پر دوکانیں کھول رکھی ہیں۔

# گلاب کی پنکھڑی

معراج انور

مکان نمبر ۱۷-۳-۶۵۳، یاقوت پورہ، حیدرآباد ۲۳ (آندھرا پردیش)

محترمی! تسلیم

. . . میرے افسانہ "نیہڈ" کو "بیسویں صدی" میں جگہ دے کر آپ نے یہ ظاہر کر دیا کہ آپ تخلیق دیکھتے ہیں نہ کہ فنکار کا نام اور ڈگریاں۔ آپ کی اس غیر جانبداری پر آپ کو کیا پیش کروں؟ ۔۔۔ انسانیت کے علمبردار کے لئے میرے پاس گلاب کی پنکھڑی کے سوا اور کیا ہے ؎

گر قبول افتد زہے عز و شرف

مخلص ۔۔۔ معراج انور

نوکر نے جب اندر آکر اطلاع دی کہ باہر کوئی شکیل احمد آئے ہیں تو اختر کو یقین ہی نہ آیا۔ وہ سوچنے لگا کیا یہ اس کا وہی اسکول کے زمانے کا دوست شکیل ہوگا؟ ۔۔۔ اس شکیل کا خیال آتے ہی اس کی بہن کا بھی خیال آگیا۔

اس کے دل نے آہستہ سے کہا ۔۔۔ گلاب کی پنکھڑی؟

وہ ناشتہ سے اٹھ کر سوچنے لگا، اس کا اپنا ہی شکیل ہوگا؟ اسے وہ بات یاد آگئی، کھانے کے وقت دوست ہی آتے ہیں، اور جیسے ہی اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا، اسے اس کا دوست شکیل نظر آیا۔ فرطِ مسرت سے وہ اس سے لپٹ گیا۔ اسے بھینچ بھینچ کر دبانے سے اس کا دل کچھ ہلکا ہوا تو اس نے گلہ شروع کر دیا "یار! تم غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اتنے دنوں کہاں رہے؟"

"کچھ نہ پوچھو [illegible] یہاں ہی سے لی! کبھی اس شہر کا دانہ پانی تو کبھی اس شہر کا [illegible] پر تبادلے ہوتے رہے اور ہمیشہ تم سے دور ہوتا گیا؟"

"اب [illegible] کتنے سال کے بعد مل رہے ہیں ۔۔۔" اختر نے کہا۔

"ہاں! آٹھ سال کے بعد جب میری بہن [illegible] سال کی تھی۔"

[illegible] آنکھوں میں گلاب کی پنکھڑی آگئی ۔۔۔ گلابی رخسار، سرخ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح ہونٹ، غزالی آنکھیں اور [illegible] نازک سی، کومل سی ۔۔۔ اس کے دل میں آیا شکیل سے پوچھ بیٹھے گلاب کی پنکھڑی اب تو پھول بن گئی ہوگی ۔۔۔ لیکن اس نے صرف اتنا کہا ۔۔۔ "پانچ سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا نہ جانے کون کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔"

"ہاں وہ بھی تو بہت بڑی ہوگئی ہے۔ تمہیں تو یاد ہوگا، میں جب اس کے لئے اسکول سے آتے وقت چاکلیٹ خریدتا تو تم بھی اس میں اپنی طرف سے ایک چاکلیٹ کا اضافہ کر دیتے تھے۔ وہ یہاں سے جاکر بھی اکثر تمہارے چاکلیٹوں کو یاد کرتی رہی ہے۔" اور اس نے سوچا اختر بھی کہے "کیا اب مجھے یاد نہیں کرتی ۔۔۔؟" تب وہ اپنے دل کی بات اس سے کہے لیکن اختر خاموش رہا۔ تب شکیل نے گفتگو کو دوسرا موڑ دے دیا "اور کہو! شادی وادی کب کر رہے ہو؟"

شادی کی بات پر اختر کو ممتاز یاد آگئی۔ اس کے خوابوں کے تاج محل کی ممتاز، اس کی قلمی دوست ممتاز جس کی تصویریں دیکھ کر وہ اس پر فریفتہ ہوگیا تھا۔ اس کے اندازِ تحریر سے مسحور ہو گیا تھا۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شادی ۔۔۔ بوقت تاج محل کی بہت تعریف کرتے ہیں اور مجھے ممتاز پسند ہے۔"

"ممتاز [illegible] ہوں تو تاج محل ہی کیوں بنتا؟"

اختر پھر اپنی ممتاز کو یاد کرکے مسکرا پڑا۔

"[illegible]" شکیل بولا — "میں تمھیں اپنی سب سے قیمتی چیز دینے آیا ہوں لیکن وعدہ کرو کہ تم کچھ اور نہ مانگو گے تو میں دینے کو تیار ہوں۔"

"یار اختر کیا کہہ رہے ہو — ؟ تم اپنی سب سے قیمتی چیز دے رہے ہو، بھلا اس کے بعد کچھ اور مانگوں گا؟"

شکیل سوچنے لگا کہ اس کا دوست ابھی تک ویسا ہی مخلص ہے جیسا پہلے تھا۔ اُسے یقین ہو رہا تھا کہ وہ اس سے کچھ نہ مانگے گا، اس کی مجبوریوں کو سمجھے گا، اس کی پُرخلوص پیشکش کو ضرور پسند کرے گا۔ تب اس نے آہستہ سے کہا — "اختر! مجھے پوری اُمید ہے کہ تم میری بات کو مانو گے اور میں تمھیں اپنی جو قیمتی چیز دینے آیا ہوں اُسے ضرور پسند کرو گے۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو دوست! تم مٹی بھی دو تو میں اُسے سونا سمجھ کر رکھ لوں —"

شکیل سوچ رہا تھا، اُسے اپنے دوست سے ایسی ہی اُمید تھی۔ تب اس نے مسکراتے ہوئے کہا: "میرے دوست! میرے بھائی! میں تمھیں مٹی نہیں سونے کا اردو دے رہا ہوں! جس میں قابلیت کے ہیرے اور شرافت کے موتی جڑے ہیں!"

"میرے دوست یہ پہیلیاں کب تک بجھاؤ گے؟ اصل بات کہو —" اختر بے چین ہو رہا تھا۔

"ابھی تم نے ممتاز کا ذکر کیا تھا بس سمجھ لو تمھیں ممتاز ہی دینے آیا ہوں، جو تمھیں بہت پسند ہے۔"

"سچ! یعنی وہی ممتاز، ممتاز پروین —؟" اختر دیوانہ ہو چلا تھا۔

"نہیں! ممتاز پروین نہیں، ممتاز جہاں!"

اب اختر کو یاد آیا شکیل ہی کی بہن کا نام ممتاز جہاں ہے۔ جسے وہ اپنے دل میں ہمیشہ گلاب کی پنکھڑی کے نام سے یاد کرتا رہا ہے۔ وہ کشمکش میں پڑ گیا۔ ابھی اس نے وعدہ کیا تھا کہ شکیل جو کچھ بھی دے گا وہ اُسے قبول کرے گا۔ مٹی بھی دے گا تو سونا بنے گا۔ اُف! ایک طرف دوست تھا، دوسری طرف محبت! ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں ممتاز کی تصویر اور گلاب کی پنکھڑی کا خیال آ گیا اور اُسے دونوں میں وہی فرق معلوم ہوا جو پھول اور کلی میں ہوتا ہے، اور اس نے کلی کو مسل ڈالا۔

"شکیل! تم نے مجھے اس قابل سمجھا، یہ تمھاری مہربانی ہے۔ لیکن . . ." اُسے الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ آگے کس طرح کہے۔

"اختر! میں نے بہت سوچ کر تمھارا انتخاب کیا ہے۔ تم قابل ہی نہیں میرے دوست بھی ہو۔ میری مجبوریوں کو سمجھو گے اور وہ نہ مانگو گے، وہ تنہا ہو گے جو آج کل کے نوجوان چاہتے ہیں۔ تم تو جانتے ہو ابا کے انتقال کے بعد مجھ پر بہت ساری ذمہ داریاں ہیں —"

"لیکن شکیل! میں نے کسی اور کا انتخاب کر لیا ہے —" [illegible] مجھ کہہ رہا تھا اور شکیل کا وہ خواب [illegible] دیکھا تھا کہ وہ اور اس کی بہن ایک [illegible] رہے ہیں، اس پار ایک خوبصورت باغ میں اختر کھڑا ہے اور وہ اس کی بہن کا ہاتھ تھامے [illegible] اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اختر نے انھیں بیچ پل پر ہی چھوڑ دیا ہو اور پل [illegible] سے ٹوٹ جانے کو ہے۔

"سچ اختر! آخر وہ کون ہے —؟" شکیل کی زبان سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے پھر بھی وہ پوچھ بیٹھا۔

"میری ایک قلمی دوست —"

"تمھاری قلمی دوست —؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے اُسے دیکھا نہیں ہے۔ بس خطوط ہی سے پسند کر لیا؟"

"بس کچھ یوں ہی سمجھ لو — اس کے خطوط اور تصویر کے سوا میں نے کچھ اور نہیں دیکھا —"

"خوب! آخر ہم بھی تو دیکھیں آخر وہ کون سی حور ہیں ___" شکیل بدستور مسکرا رہا تھا۔

اختر تصویر لانے اندر چلا گیا۔ شکیل پھر اپنی بہن کی بات سوچنے لگا ___ نہ جانے اس کی قسمت کب کھلتی ہے۔ وہ جانتے ہیں اس کی شادی کرنے کے قابل کب ہوتا ہوں۔ اسے دور دور تک اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا ___ تھوڑی دیر کے بعد اختر جب باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک رسالہ اور چند خطوط تھے۔

"دیکھو ___ یہ ہے میرے خوابوں کی ممتاز! ممتاز پروین! تمہاری ممتاز جہاں سے کتنی ملتی ہوئی! جیسے ممتاز جہاں ہی ہو!" اختر نے تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

"اوہو!" شکیل کے منہ سے ایک دم نکلا۔

"اور یہ ہیں اس کے خطوط جو اس نے مجھے لکھے تھے" خطوں کو وہ شکیل کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

"خوب! لیکن تم نے ان کا پتہ کس طرح حاصل کیا؟"

"اس کالج کے میگزین سے۔ اس میگزین میں ممتاز کا ایک افسانہ بھی ہے، فوٹو بھی ہے اور پتہ بھی۔ پتہ کیا بس کالج کے پتہ پر دوستی چل رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ خط و کتابت کا علم ہم دونوں کے سوا تیسرے کو نہیں ___"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ ممتاز تم سے محبت کرتی ہے ___؟" شکیل نے پوچھا۔

"یہ تو کہنا مشکل ہے۔ لیکن میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ضرور میری طرف مائل ہے۔ بس کسی کے ذریعہ اس کے گھر بات بھیجنے کی ضرورت ہے۔"

"وہ تو ہو جائے گا، لیکن تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر وہ میری طرح غریب ہوں، تمہیں کچھ نہ دے سکیں تب ___؟" شکیل نے کہا۔

"میں نے کب کہا کہ میں تمہاری بہن کو اس لئے نہیں چاہتا کہ تم کچھ دے نہیں سکتے۔ میں تو ممتاز پروین سے محبت کرتا ہوں، وہ غریب ہے تو میری ہے۔ جیسی بھی ہو میری ہے۔"

"سچے عاشق معلوم ہوتے ہو۔ قیس سے تمہارا کوئی رشتہ تو نہیں ___؟"

"یہی سمجھ لو ___ بس اب تو چاہتا ہوں کسی طرح بات آگے بڑھے اور میں کسی طرح ممتاز کو پا لوں۔"

"اچھا یہ کام ہم کئے دیتے ہیں لیکن جہیز کا تو سوال ہے ہمارا ___" شکیل مسکرایا۔

"اُدھار کیا یار! چھوڑ لے لو! بس مجھے ممتاز چاہئے۔ لیکن تم کیا کر سکتے ہو ___؟" اس نے شکیل سے پوچھا۔

"شاید تمہیں نہیں معلوم میری بہن بھی اسی کالج میں پڑھتی ہے۔"

"مگر ___" اختر اچھل پڑا ___ "اب تو کام بن گیا یار جلدی کرنا میرے متعلق پوری معلومات ان کے گھر پہنچا دینا۔ لیکن مجھے افسوس ہے . . ."

"کوئی بات نہیں دوست!" شکیل نے اسے آگے کہنے سے روک دیا۔ "تمہیں ممتاز مل رہی ہے۔ چاہے کوئی ممتاز ہو۔ تمہاری خوشی میری خوشی ہے! اچھا ___ اب چلوں" شکیل اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے چائے تو پیتے جاؤ . . ."

"چائے پر ٹال رہے ہو ___ ہم سے تو بہت کچھ کھانا ہے!" شکیل نے مسکراتے ہوئے کہا اور رخصت ہو گیا۔

---

چند دنوں کے بعد اختر کو شکیل کا خط ملا۔ جس میں اس نے ممتاز کے بارے میں مبہم سی معلومات دیں اور لکھا کہ ممتاز کے گھر والے شادی کے لئے تیار ہیں۔ یہ پڑھ کر اختر کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسے دنیا کی سب سے قیمتی چیز مل گئی! لیکن دوسرے ہی لمحہ نہ جانے کیوں اس کے ذہن کے پردے پر گلاب کی پنکھڑی، ممتاز جہاں ابھر آئی۔ وہ دیر تک اس کے خیالوں میں کھویا رہا۔

اپنے دل میں مسرتوں کی ایک دنیا لئے ہوئے اختر شادی کے دن کا انتظار کرتا رہا۔ جوں جوں شادی کا دن قریب آتا گیا اس کی حالت عجیب ہوتی گئی۔ تنہائی میں اس کے ذہن کے پردے پر اس کے خوابوں کی ممتاز ___ ممتاز پروین ابھر آتی ___ کبھی اس کے عنفوانِ شباب کی محبت، گلاب کی پنکھڑی، ممتاز جہاں ابھر آتی!!

---

دن جاتے دیر نہیں لگتی ___ آخر شبِ عروسی بھی آ گئی ___ اختر دل میں مسرتوں کی ایک دنیا لئے ہوئے حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو اس کی حیرت و مسرت کی انتہا نہ رہی ___ اس کے سامنے گلاب کی پنکھڑی، ممتاز جہاں ___ اس کی قلمی دوست ممتاز پروین تھی!!

---

قارئین کے مسلسل اصرار پر، ان کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے ہم یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ادارہ 'بیسویں صدی' دہلی کا 'بیسویں صدی' لاہور سے کوئی تعلق نہیں سوائے اس کے کہ وہ ہمارے جملہ مضامین بلا حوالہ نقل کر لیتے ہیں اور ہمارے 'تیر و نشتر' اور 'صحت و زندگی' کے مضامین بھی اپنے نام سے شائع کر لیتے ہیں اور پڑھنے والوں کو مغالطہ میں رکھنے کے لئے ہمارے سرورق کا ہو بہو چربہ بھی چھاپ لیتے ہیں۔ منیجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶

ریکٹ اینڈ کولمین آف انڈیا لمیٹڈ

## غزل

پروفیسر محسن بہاری ایم اے

کچھ [illegible] ہوئی ہے
ہر شاخ چمن آج کملائی ہوئی ہے

کیا زلف یہ شانوں پہ لہرائی ہوئی ہے
لگتا ہے کہ ساون کی گھٹا چھائی ہوئی ہے

جب تجھ سے خیالوں میں تو دنیا سے اسے کیا
دنیا ترے دیوانے نے ٹھکرائی ہوئی ہے

یا شکِ محبت ہی یا نہیں پوچھو ورنہ
دنیا نہ کہے عشق کی رسوائی ہوئی ہے

اب شیشہ و ساغر کے چلیں دور نہ محسن
حالات کے ماتھے پہ شکن آئی ہوئی ہے

## غزل

عرش صہبائی

ڈس گئی دل کو ادا سے دلربائی آپ کی
جب کبھی تنہائیوں میں یاد آئی آپ کی

بارہا ہم چلتے چلتے راہ میں یوں رک گئے
جس طرح کچھ دور سے آواز آئی آپ کی

خوبیٔ قسمت پہ اپنی کیوں نہ اس کو ناز ہو
جس کو حاصل ہو جہاں میں ہم نوائی آپ کی

شیخ صاحب میکدے میں روز اب آنے لگے
ہو گئی ہے نذرِ صہبا پارسائی آپ کی

عرش صاحب کچھ ہمارے حال پر بھی ہو نظر
یہ سنا ہے میکدے تک ہے رسائی آپ کی

## غزل

کنور سین حسرت ایم اے

سرِ محفل وفورِ شوق میں مستانہ آ پہنچا
قریبِ منزلِ دیوانگی دیوانہ آ پہنچا

نیاز و ناز کے ربطِ حسیں کا کیا کہنا
فروغِ شمع پر مٹنے کو جب پروانہ آ

کسی سے بھی غمِ دل کا مداوا جب نہ ہو پایا
میں اپنی بے کسی لے کر سرِ میخانہ آ پہنچا

کوئی بے مصلحت [illegible]
سو دیوانگی میں کس لیے فرزانہ آ

قدم رکھ کر یہ مہر و مہ پہ حسرت سوچتا ہوں میں
مجھے کس اوج پہ لے کر دلِ دیوانہ آ پہنچا

## غزل

پروفیسر عنوان چشتی ایم اے

یادوں کے دریچوں سے [illegible]    اک شخص سے پیمانِ وفا ٹوٹ نہ جائے

مجھ کو تشنگی طرزِ ادا بھی ہے ضروری    ہونٹوں پہ کوئی حرفِ دعا ٹوٹ نہ جائے

بڑھتی رہے احساس کی لو دل سے لبوں تک    یہ سلسلۂ نور ذرا ٹوٹ نہ جائے

عنوان نہ لب پھینکئے الفاظ کے پتھر
یہ آئینۂ صوت و صدا ٹوٹ نہ جائے

# قومی یک جہتی کو خطرہ

اس وقت ہمارے ملک کو سب سے زیادہ خطرہ فرقہ پرستی سے ہے۔ دوسرے بڑے خطرے مذہب پرستی اور علاقہ پرستی کے ہیں جن کے لئے وہی جذبات ذمہ دار ہیں جو فرقہ پرستی کو ہوا دیتے ہیں۔

قومی یک جہتی کو ایک شدید خطرہ عدم مساوات کی موجودگی سے ہے جو غالباً اور بھی کئی خطروں کا باعث ہے۔

زبان کا سوال بھی ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہمارے اتحاد کا بھی باعث ہو سکتا ہے اور جس سے تفرقہ پیدا ہونے کا بھی شدید احتمال ہے۔

آج کے دور میں زندہ رہنے کے لئے قومی یک جہتی ازبس ضروری ہے۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی

کا سرینگر میں

(قومی یک جہتی کونسل سے خطاب)

جاری کردہ۔ محکمہ تعلقات عامہ ہریانہ

# محبت

محبت دو نگاہوں کے تصادم کا نتیجہ ہے
یہ آتش خود بھڑک اٹھتی ہے بھڑکائی نہیں جاتی ——— آغر شیرانی

محبت کے لئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا ——— مخمور دہلوی

کچھ اتنے دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے ——— ساحر

محبت کے اقرار سے شرم کب تک
کبھی سامنا ہو تو مجبور کر دوں ——— اختر شیرانی

محبت کے نقشے تمنا کے خاکے
بنائے چلا جا، مٹائے چلا جا ——— مجاز

مرسلہ: سید لیاقت علی۔ ایم۔ اے اورنگ آباد

چلتی تھیں جیسے دنیائے حسن کی شہنشاہیت تمہیں دے دی گئی ہو اور یہ سچ بھی تھا لیکن مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ حسن کا یہ مجسمہ میری تقدیر کا قمر بن جائے گا۔ سچ انو! میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں۔ دنیا کی حسین ترین لڑکی جس کی شریک حیات بننے والی ہو وہ خوش نصیب ہی تو ہوگا۔ دنیا کی تمام کلفتوں اور صعوبتوں سے بچ کر جب وہ گھر کے دروازے میں داخل ہو اور ایک خوبصورت پیکر بڑھ کر مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کرے اس سے بڑھ کر تقدیر کی رعنائی اور کیا ہو سکتی ہے ——— انو!

لیکن میری آواز آج تم تک کیسے پہنچے گی انو! میں جیسے خلاؤں میں اُڑ رہا ہوں اور تم جیسے نیچے بہت نیچے فضاؤں کی گود میں ہمک رہی ہو۔ شاید تم اپنے نرم مخملی بستر پہ دراز ہو گی ——— بڑی بڑی پلکیں آبدیدہ ہوں گی مری جدائی میں تم زرد چاندنی جیسی ہو گی اور مجھ سے تمہاری یہ حالت دیکھی نہ جائے گی۔ میرا بس چلے تو میں اپنی انو کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں۔

پہلی بار تمہیں میں نے اپنے دوست کی سالگرہ پارٹی میں دیکھا تھا۔ سب سے دُور ——— سب سے قریب ——— تم اپنے ہی ناز و غرور میں یوں بیٹھی ہوئی تھیں جیسے لمحہ بھر بعد چپکے سے آسمانوں کی طرف اُڑ جاؤ گی۔ اسی لمحہ میرا دل اس حور کو مقید کرنے کے لئے تڑپ اُٹھا جس کا پیکر تم میں ڈھل گیا تھا۔

"یہ ہیں ——— مس اعجاز نجم الدین ——— سائنس کالج حیدرآباد کی طالبہ"

رابعہ کا اشارہ تمہاری طرف تھا۔ میں مسکرا پڑا۔

"اور انو! یہ ہیں عباس ایک اچھے ڈاکٹر جلد ہی لندن جانے والے ہیں"

تم نے آہستگی سے اپنی پلکیں اٹھائیں۔ اپنے ایک ابرو کو خم دے کر گردن کی ہلکی سی جنبش سے مجھے دیکھا اور پھر اپنے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا کر جیسے ایک نغمہ ہواؤں کی نذر کر دیا ہو۔

"اچھا ——— ڈاکٹر عباس ہیں!"

"مس! مس نجم الدین ——— " میں سنا اپنے سر کو آہستہ سے جھکا رہا تھا تو کبھی کا جھک گیا تھا۔

"ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے!" تم نے ایک ادا سے کہا اور آگے بڑھ گئیں۔

——— اور پھر ایک دن رابعہ نے انوائیٹ کیا تھا۔ اس کے کالج میں کوئی فنکشن تھا میں نے معذرت چاہی۔ اس نے جیسے مجھے راغب کرنے کے لئے کہنا شروع کیا ———

"دیکھئے عباس! نہ آئیے گا تو پچھتائیے گا، ہم نے اس فنکشن کے لئے بہت [illegible] ہے اور پھر انو تو جیسے ہر آئٹم کی جان ہے!"

"آئیے گا نا! پلیز!؟"

"[illegible] رابی! میں مصروف رہتا ہوں اچھا! وعدہ نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا!" رابی سے اس وعدے کے پیچھے اس کا وہ جملہ کام کر رہا تھا "اور پھر انو تو جیسے ہر آئٹم کی جان ہے!"

انو! تم تو ہر حسن کے مجسمے کی جان ہو شفق نے لالی تم سے چرائی ہے۔ آسمانوں نے گھٹاؤں کے انداز تم سے لئے ہیں، چاند نے تابانی تمہارے چہرے سے پائی ہے ستاروں نے چمک تمہاری آنکھوں سے لی ہے، لہروں نے نزاکت تم سے لی ہے شاخوں نے لچک تم سے چرائی ہے اور تم حوروں کا تقدس، فرشتوں کا غرور، مریم کی معصومیت سیتا کی پاکیزگی سمیٹ لائی ہو جیسے قدرت نے تمہیں ماڈل بنا کر ہر شے میں تمہاری عکاسی کی ہے!

رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ پنڈال خالی ہو رہا تھا۔ نیم تاریک گوشے میں میں نے تمہیں پا لیا۔

"انو! مبارک ہو!" میں نے تمہاری ہتھیلی کی پشت پہ بے ساختہ اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

"عباس!" تم کپکپا سی گئیں۔ لیکن نہ جانے کیوں تمہارے جسم کے روئیں روئیں کی اس کپکپاہٹ سے میں تپ اُٹھا۔ میں نے یکایک تمہارا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"میرے ساتھ چلو گی؟"

"اوں ..... ، تم نے نیچی نگاہیں اوپر اٹھائیں، جن میں شاید میرے پیار کا اظہار ڈھونڈ لیا گیا تھا۔

کسی نے آواز دی اور ہم نے اپنی راہیں بدل لیں۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین اب ہم ....؟"

ایر ہوسٹس کی آواز گونجی، میں چونک پڑا۔

میرے ہاتھوں میں ٹیلیگرام تھا۔ میں نے لاشعوری طور پر کھول کر پڑھا پھر ایک بار یہ سوال میرے ذہن سے اُبل پڑا۔

"تم نے کیوں بلوایا ہے انو! تم پر کوئی آفت تو نہیں آئی؟ کوئی بجلی تو نہیں کوئی کوئی بادل تو نہیں گر جاؤ؟ کیا ہو گیا ہے آخر؟

کتنی جلد ہمارے والدین نے ہمارے بیاہ کی بات مان لی تھی اگر ابھی تم تیار نہ تھیں۔ ابھی مجھے لندن سے واپس ہونا تھا۔ ہم نے شادی تو نہیں کی لیکن دنیا جانتی تھی کہ انو اور عا ایک ہی ہیں!

جس دن مجھے لندن کے لئے روانہ ہونا تھا، تم کتنی اُداس تھیں انو! اور ... تمہارے حسن کا یوں غم زدہ ہونا دیکھا نہ جاتا تھا۔ کون انسان پسند ... کرے گا کہ کھلتی ہوئی ایک کومل سی کلی کو آتشدان میں ڈال کر اُسے جلتے ہوئے دیکھتا رہے اور تم غم کے آتشدان میں جھلستی رہیں جلتی رہیں۔ یہاں تک کہ ہوائی جہاز اُڑ گیا اور تم میرے لئے زمین کی بسیط فضاؤں میں کھو گئیں۔ اور آج اسی دیس کی اُس زمین پر میں اُترنے والا تھا۔ میرے قدم زمین پر پڑتے ہی تم ہی اُس دن تم نے مجھے پھولوں کے ہاروں سے ڈھانک دیا۔ تم پھول پہناتی رہیں اور میں تمہیں غور سے دیکھتا رہا تھا کہ تم صحیح و سلامت ہو یا نہیں؟

"تم اچھی تو ہو نا!" میرے لبوں سے نکلا۔

"اوہ! ڈارلنگ چلو نا! میں بہت، بہت اچھی ہوں!"

تم نے اپنے آنچل کو سمیٹا اور چلنے لگیں۔ لیکن تم پر مجھ پہ لمحہ لمحہ جھلملاتی اور غائب ہوتی روشنی نے مجھے احساس دلایا کہ شاید ہماری تصویریں لی جا رہی ہوں۔ میں ہنس پڑا۔ اوہ! انو! ہم نے کون سا تیر مار لیا جو دوست و احباب ہمیں یوں اُچھال رہے ہیں" "تم نے نہ سہی میں نے تو مار ہی لیا"——— تم کار کی طرف بڑھیں۔

"میں سمجھا نہیں ....." میں نے کار کا دروازہ کھول دیا۔

"سمجھ جاؤ گے ڈیر! آؤ نا!" میں تمہارے برابر بیٹھ گیا۔ تم نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

# آدابِ محبت

یہ بھی آدابِ محبت نے گوارا نہ کیا
اُن کی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی نہ گئی ——— حسرت موہانی

اللہ رے مجبوریِ آدابِ محبت
گلشن میں رہے اور گلستاں نہیں دیکھا ——— جگر مرادآبادی

سکھا دیئے ہیں کچھ آدابِ جذبِ اُلفت نے
میں رو رہا ہوں مگر آنکھ تر نہیں رکھتا ——— سلیم احمد آبادی

دل ہوتا اگر واقفِ آدابِ محبت
کرتا نہ کبھی تیری جفاؤں کی شکایت ——— لذت فریدی

ناواقفِ آدابِ محبت ہوں الٰہی
کس طرح کیا جاتا ہے اظہارِ تمنا ——— نامعلوم

مرسلہ:- کشور سلطانہ، بستی کرت پور، بجنور

"تمہاری انو نے تو جیسے ہندوستان فتح کر لیا ہے؟"

"آئی .... سی .... ہم بھی تو تمہیں میری سکندر!"

"چلو سکندر ہی سہی، اُس نے اپنی طاقت کے بل پر فتح حاصل کی ہوگی، ہم نے اپنے حسن سے جیت لیا ہے!" تم ونڈ اسکرین سے کہیں دور دیکھ رہی تھیں۔

"تمہارے حسن کی بات نہ پوچھو ڈیر! اس آگ میں تو ساری دُنیا جل کر رہ گئی ہے!"

"نہیں سرکار! جل تو نہیں گئی، مگر اب جل جائے گی جب انو مس ورلڈ کہلائے گی"

"مس ورلڈ! اوہ!" میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور پھر کہنے لگا۔

"اچھا اب پہیلیاں چھوڑو۔ بتاؤ تم نے مجھے کس لئے بلوایا ہے؟"

"سنو گے تو فخر سے سینہ تان لو گے۔" اُس نے کار کا رُخ گھر کی طرف کر لیا۔

"تمہارا ساتھ ہی میرے لئے سب سے بڑا فخر ہے میری انو!"

"یہی تو کہہ رہی ہوں، تمہاری انو، تمہاری ساتھی ہی نہیں مس انڈیا بھی ہے!"

"کیا مطلب؟" میرے جسم کے رُونگیں رونگیں نے تڑپ کر انکار کر دیا۔

"مجھے معلوم تھا تم یقین نہ کرو گے" "تم ہمارے اُتر پڑیں" مگر دوست تمہارے جانے کے بعد میں نے مقابلۂ حُسن میں شرکت کی تھی۔ بڑا شور رہا بڑی دھوم رہی۔ مجھے اپنے جسم کے Measurement پر یقین تھا اور میں کیا بتاؤں، تمام رات مصروف رہی۔ دوسری صبح فیصلہ جو تھا ——— اور جب صبح ہوئی تو میں اپنے ساتھ اپنی شہرت، عزت کے ساتھ ساتھ مس انڈیا تھی....

"انو!" ہزار ضبط کے باوجود میں چیخ پڑا۔

"تم مقابلۂ حُسن میں گئیں؟ تم جو ایک شریف و معصوم لڑکی تھیں اور اُس رات اُن مردوں نے تمہارے جسم کو پسند کیا اور پھر دوسری صبح تم اپنی عزت و آبرو کو مٹا کر اپنے ماتھے پر مس انڈیا کا کلنک لگا لائیں۔ نہیں انو! — میں اُس بربط کو اپنے سینے سے نہیں لگا سکتا جس کے تاروں کو ہزاروں انگلیاں چھیڑ چکی ہوں ——— تم میرے لئے مجسم داغ ہو انو!

ہو سکے تو بھول جاؤ ——— میں جا رہا ہوں"

اور آج میں ایرپورٹ پر کھڑا ہوں وسیع، چٹیل میدان کی طرح میری زندگی میرے سامنے پڑی ہے۔ جہاز اڑنے لگا ہے۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے، عجیب کیفی میرے ساتھ ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے پہلی بار میں نے جہاز میں قدم رکھے ہوں۔ بے چین ہو کر میں نے اپنا چہرہ کھڑکی کی طرف کر لیا ہے۔ نیچے تمہارے وجود کا نقطہ اپنی جگہ پتھر کا ستون بنا ہوا ہے جیسے دھیرا مجسمہ — !

---



---

# غزلیں

### ضیا حیدری بی۔ اے

راہِ وفا میں چلتے چلتے موڑ کچھ ایسے آ گئے تھے
صرف جہاں تک ہم تھے اکیلے یا یادوں کے سائے تھے

دیدۂ حیراں میں جب اُن کے اشکِ ندامت آئے تھے
چھیڑ کے اُن سے ذکرِ تغافل ہم کیا کیا پچھتائے تھے

اپنوں نے بھی پرسشِ حالِ دل کی کب زحمت کی ہے
غیروں سے کیا اس کا شکوہ وہ تو خیر پرائے تھے

کیا بتلائیں کس عالم میں چھوڑ گئی گلشن کو بہار
پتہ پتہ سوکھ چلا تھا غنچہ و گُل مرجھائے تھے

اور قیامت کا عالم تھا رات کے ڈھلتے ڈھلتے ضیاؔ
درد بھی دل میں شِشتر پر تھا وہ بھی بہت یاد آئے تھے

### نازؔ قادری ایم۔ اے

جب سے پلکوں پہ تری جشنِ چراغاں دیکھا
دل کے ہر داغ کو رشکِ مہِ تاباں دیکھا

لے کے آئی تھی صبا باغ میں پیغامِ بہار
لالہ و گُل کو مگر چاک گریباں دیکھا

زندگی درد کی دیواروں میں محبوس رہی
دل کی بستی کو مگر شہرِ نگاراں دیکھا

گوشۂ دل میں تمناؤں نے دم توڑ دیا
غمِ دوراں کو حریفِ غمِ جاناں دیکھا

مرحبا سوزِ تمنا کہ بہ فیضِ غمِ دل
آج بھی نازؔ کو محفل میں غزل خواں دیکھا

### بشیر فاروقی بی۔ اے

فریب کھا کے اُن آنکھوں سے ہم چلے آئے
بھرم ہے یہ کہ کسی کو شکست دے آئے

کسے کسے میں کروں شیشۂ غزل میں اسیر
ہزار رنگ میں تم میرے سامنے آئے

خفا نہ ہو تری رسوائی کا گماں بھی نہ تھا
یہ جی اُداس ہُوا تھا تو ہم چلے آئے

ملی تھی پہلے وفا اُن حسین آنکھوں میں
پھر اُس کے بعد زمانے کے سلسلے آئے

ہماری آنکھ بھر آئی تمہارا دل دھڑکا
جہاں سے بچھڑیں گے ہم تم وہ مرحلے آئے

دونوں ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے اپنے باپ سے بڑھ کر پیارا دنیا میں اور کوئی نہیں۔ اور باپ کے لئے بچی ہی سب کچھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی بچی کی خوشیوں اور مسرتوں کے لئے آج اور مستقبل میں اس کی شادی کے لئے کافی رقم جمع کر رکھی ہے ——— بیمہ زندگی کی صورت میں۔

آپکی شفقت میں آپکی بچی کا یقین آپ سے کچھ چاہتا ہے۔ اور آپ بیمہ زندگی کی صورت میں اسکی خواہش پوری کر سکتے ہیں۔ بس ایک شادی کی بیمہ پالیسی لے لیجئے۔ اور اس میں الٹا بھی کیا ہے! خدا نہ کرے آپکو کچھ ہو جائے! ایسی حالت میں میعاد پوری ہونے پہ اسے بیمے کی پوری رقم مل جائیگی۔ اس بات کا سوال ہی نہیں کہ آپ نے پریمیم کی کتنی قسطیں ادا کی تھیں۔

اگر آپ اپنی بچی کو زندگی بھر شادماں دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے بیمہ زندگی کا تحفظ دیجئے۔

## آپ بیمہ زندگی پر بھروسہ کر سکتے ہیں

# چاہ باپ کی
# چاہ بیٹی کی
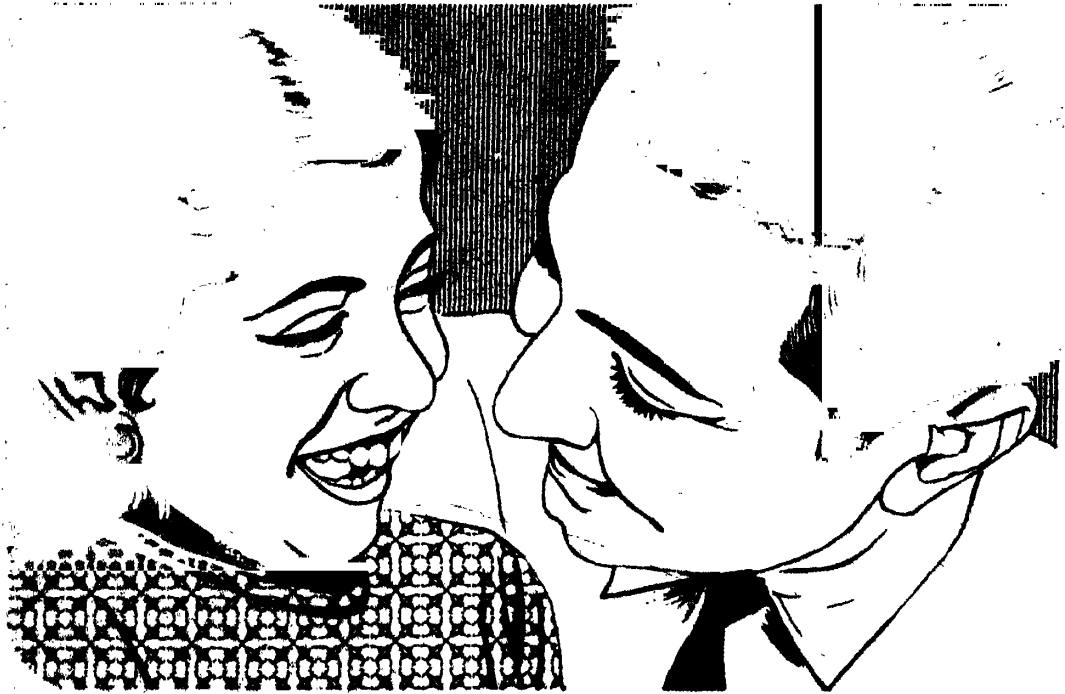
**لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا**

PNB/LIC-54 69-URDU

# سپنوں کا تاج محل

ساگر کاشمیری

> شعبۂ اردو، جموں و کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل، سرینگر (کشمیر)
>
> برادرم خوشتر صاحب! آداب
>
> اگر ہندوستان کے ایک کونے سے میرے کسی مدراسی بھائی نے سپنوں کے سوداگر کے تخیلی پیکر کو ایک وجود بخشا ہے اور جس نے سارے ملک میں بے شمار پیسے فروخت کئے تو میں ہندوستان کے دوسرے کونے کشمیر سے سپنوں کا تاج محل لے کر بزمِ بیسویں صدی میں کیوں نہیں آسکتا ——— "سپنوں کا سوداگر" اور "سپنوں کا تاج محل" میں بہت نمایاں اور واضح فرق ہے۔ میری تخلیق میں ہمدردی کا مستحق کون ہے راج یا شبنم یا دونوں ——— یہ آپ کی بلند ذوقی اور باشعور قارئین ہی معلوم کر سکتے ہیں۔۔۔
>
> نیاز آہنگ ——— ساگر کاشمیری

ہر طرف خاموشی تھی، گہرا سکوت اور سنّاٹا تھا۔ ایسی گہری خاموشی تھی کہ وہ اپنے دل کی دھڑکن کو بخوبی سُن رہا تھا۔ باہر دودھیا چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور درختوں کے سائے پھیلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے اور یہ پھیلتے اور سمٹتے ہوئے سائے بھی خاموش تھے۔ کوئی آواز نہ تھی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے اور کلاس نوٹس اُس کے سامنے بکھرے پڑے تھے۔ وہ کرسی پر چُپ چاپ بیٹھا شبنم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اچانک اُس کی نظر سامنے نوٹس پر پڑی اور نگاہ میر کے اِس شعر پہ جا کر رُک گئی ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

میر نے اپنے جنوں میں چاند کو اپنا مرکز بنا لیا تھا اِسی لئے جب اُس کا جنوں شدّت اختیار کر گیا تھا تو اُس نے اپنے محبوب کو چاند ہی میں ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن پھر بھی میر کو اپنے جنوں سے خطرہ محسوس ہوا تھا۔ میر کی طرح اُس کا جنوں بھی شدّت اختیار کر چکا تھا۔ اگر اپنے جنوں میں اُسے مرکز نہ ملا تو دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں یقیناً کوئی فاصلہ باقی نہ رہے گا۔ اُس کا بھی ایک مرکز تھا، ایک طور تھا، ایک منزل تھی اور وہ تھی شبنم ——— لیکن شبنم، بالکل رات کی طرح خاموش تھی۔ وہی رات کا سا گہرا سکوت اور سنّاٹا اُس کی شخصیت میں بھی تھا۔ خاموش، متین، پُروقار ——— دلکشی اور رعنائی کا خوبصورت لیکن سوگوار پیکر شبنم اُس کا مرکز تھی، اُس کی منزل تھی۔ وہ منزل جس تک پہنچنے اور جسے پالینے کی تمنا میں اُس کے پیار نے اُسے جنوں کی سرحد تک پہنچا دیا تھا۔ اُس نے کئی بار اپنے درد کا، اپنے غم کا، اپنی چاہت کا اظہار کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ہر بار اُسے اپنے ارادوں میں شکست ہوئی تھی۔ لاوا اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ جذبے اور ارمان اندر ہی اندر پلتے رہے، پیدا ہوتے رہے اور مرتے رہے۔ انھیں دل کی خاموش وادیوں سے باہر آنے کا موقع ہی نصیب نہ ہوا۔ چاہت کے اِس احساس نے اب جنوں کی صورت اختیار کر لی تھی اور گریباں کے چاک ہونے میں تھوڑا سا ہی فاصلہ رہ گیا تھا اور اُدھر شبنم کے سوگوارانہ انداز میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح خاموش تھی، کھوئی ہوئی۔ اُس کے حُسن پر روز بروز سوگواری کی تہیں گہری ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ اُسے شبنم سے پہلی ملاقات کا دن اچھی طرح یاد تھا، بالکل اِس طرح جیسے کل ہی کی بات ہو!

یونیورسٹی میں داخلے ہو رہے تھے۔ ہر روز نئی لڑکیوں اور نئے لڑکوں کی بھیڑ ڈیپارٹمنٹ کے باہر لگی رہتی۔ وہ فائنل ایئر میں تھا اور اُس دن اُن کے سارے پیریڈ خالی تھے۔ لکچرروں سے لے کر ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تک نئے ایڈمیشنز کے سلسلے میں مصروف تھے۔ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے لان میں ٹہل رہا تھا۔ اِرد گرد نیلے پیلے، سُرخ، سفید، کالے اور زرد آنچل اور ساڑیاں لہرا رہی تھیں، نقرئی قہقہے گونج رہے تھے، ریمارکس پاس کئے جا رہے تھے۔ مِلی جُلی آوازوں کا ایک بے ہنگم شور تھا۔ دلکش اور دلآویز خطوط اور زاویوں کو اور نمایاں کیا جا رہا تھا۔ کچھ بجلیاں چمک رہی تھیں، کچھ گرنے کے لئے پر تول رہی تھیں۔ لیکن اُس نے کبھی کسی زُلف یا آنچل کے سائے میں پناہ نہیں لی تھی۔ وہ زُلفوں کی مہک اور آنچلوں کے سائے

سے بچپار رہا تھا اور اس روز وہ اس ہجوم شور و غل میں خود کو بُری طرح تنہا محسوس کر رہا تھا اور بدحواس سا اور بے کیف سا لان میں ٹہل رہا تھا۔

"سُنئے ——" موسیقی کی لہروں کی طرح یہ مترنم لفظ اُس کے کانوں سے اُس کے دل میں اُترتا چلا گیا۔ اُس نے گھوم کر دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ حُسن و شباب کا ایک دلکش پیکر۔ جیسے فطرت کی تمام تر رنگینیاں، رعنائیاں، شگفتگی، شادابی، حُسن اور جمال اُسی ایک پیکر میں ڈھل گیا ہو، سمٹ آیا ہو۔ اُس کے حُسن میں نزاکتیں اور صباحتیں تھیں۔ وقار تھا اور عظمت تھی لیکن ساتھ ہی اُس بے پناہ حُسن پر حُزن و ملال، رنج و الم اور سوز و گداز کی پرچھائیاں پھیلی ہوئی صاف نظر آ رہی تھیں اور اُسے اپنے دل میں ایک پھانس سی چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک لمحہ کا جادو اپنا کام کر گیا۔ وہ بہت مشکل سے کہہ سکا۔

"فرمایئے ——"

"اُردو ڈپارٹمنٹ [illegible] سوگوار تھکی ہوئی [illegible] آواز پھر اُس کے دل کی گہرائیوں کو [illegible] بتا دیا تھا کیونکہ الفاظ اُس کے گلے میں اٹک گئے تھے۔ وہ سحر زدہ ہستی کی طرح چپ چاپ کھڑا اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ تیر چل چکا تھا اور دل میں پیوست ہو گیا تھا۔

پھر وہ اُسے روز دیکھتا رہا [illegible] جنوں اور دیوانگی میں اضافہ ہوتا رہا۔ کبھی لائبریری میں، کبھی میٹنگ میں، کبھی کیفے میں اور کبھی [illegible] —— وہ اُسے ایک خاموش تمنائی کی طرح دیکھتا رہا۔ لیکن شبنم تو جیسے پتھر کا کوئی بُت تھی [illegible] کم بولتی تھی۔ اُس پر خاموشی اور سکوت کی گہری چھاپ تھی۔ اُس نے [illegible] اُس خاموشی اور سکوت کو توڑنا چاہا، چیخنا اور چلّانا چاہا لیکن [illegible] الفاظ اُس کے سامنے گم ہوتے رہے۔ دل کی خاموش اور گہری وادی میں سوتے رہے، خوابیدہ ہوتے رہے [illegible] سکے۔ پھانس چبھتی رہی، درد میں اضافہ ہوتا رہا، چاہت شدّت اختیار کرتی رہی۔ لیکن اُس الم پرور اور سوگوار سی شبنم کا دل موم نہ ہو سکا۔ وہ پتھر کی پتھر ہی رہی۔ کبھی اُس کی سنجیدہ آنکھوں میں ہلکی سی شوخی بھی نہ لہرائی، مُرجھائے ہوئے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم نہ پھیلا۔ وہ یک طرفہ محبت کی ہلکی ہلکی آنچ میں پگھلتا رہا، سلگتا رہا۔ آنچ میں تیزی اور گرمی آتی رہی لیکن اُس سنگِ خارا پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس لئے اُس نے رات کی اُس تنہائی، خاموشی [illegible] ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ کل اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کرے گا۔ شبنم سے سب کچھ کہہ دے گا۔ اپنے دل کی ہر گرہ کو کھولے گا۔

دوسرے دن —— اس سے پہلے کہ وہ اپنے فیصلے پر عمل کرتا شبنم نے اُسے ایک لفافہ تھما دیا۔ اُس نے بے صبری اور بے تابی سے لفافہ چاک کیا اور خط نکال کر پڑھنے لگا۔ لکھا تھا ——

راج صاحب!

میں ایک ایسا ستار ہوں جس کے سب تار ٹوٹ چکے ہیں۔ اب ان ٹوٹے ہوئے تاروں سے کوئی نغمہ نہیں نکل سکتا، کوئی گیت جنم نہیں لے سکتا۔ میں آپ کے درد سے بے خبر نہیں ہوں۔ آپ کی حالت پر افسوس بھی ہوتا ہے۔ لیکن میرے دل کے دروازوں پر اب دستک کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ میری زندگی میں ایک بار —— ایک [illegible] دل کی خاموش راہوں پر چلا تھا، میرے دل کے دروازوں پر دستک دی تھی اور دل نے اپنی راہیں کھول دی تھیں۔ محبت کے سوتے اُبل پڑے تھے۔ دل نے اپنی چاہت، پیار و محبت کے خزانے اُس پر نچھاور کر دیئے تھے۔ پھر وہ کہیں چلا گیا [illegible] سب تار ٹوٹ گئے [illegible] انتظار [illegible] ہوں۔ مجھے یقین ہے ایک بار [illegible] [illegible]

سپنوں کا تاج محل [illegible]

[illegible]

[illegible] اور اُس روز وہ اِس ہجومِ شور و غُل میں خود کو بُری طرح تنہا محسوس [illegible] بدحواس سا اور بے کیف سا لان میں ٹہل رہا تھا۔

"شبنم ـــــ" موسیقی کی لہروں کی طرح یہ مترنّم لفظ اُس کے کانوں سے اُس کے [illegible] میں اُترتا چلا گیا۔ اُس نے گھوم کر دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ حُسن و شباب کا ایک دلکش پیکر۔ جیسے فطرت کی تمام تر رنگینیاں، رعنائیاں، شگفتگی، شادابی، حُسن اور جمال اُسی ایک پیکر میں ڈھل گیا ہو، سمٹ آیا ہو۔ اُس کے حُسن میں نزاکتیں اور صباحتیں تھیں۔ وقار تھا اور عظمت تھی۔ لیکن ساتھ ہی اُس بے پناہ حُسن پر حزن و ملال، رنج و الم اور سوز و گداز کی پرچھائیاں پھیلی ہوئی صاف نظر آ رہی تھیں اور اُسے اپنے دل میں ایک پھانس سی چُبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک لمحہ کا جادو اپنا کام کر گیا۔ وہ بہت مشکل سے کہہ سکا۔

"فرمایئے ـــــ"

"اُردو ڈیپارٹمنٹ کہاں ہے؟" ایک غمگین، سوگوار، تھکی ہوئی سی لیکن ترنّم ریز آواز پھر اُس کے دل کی گہرائیوں کو ناپنے لگی۔ اُس نے اُنگلی کے اشارے ہی سے بتا دیا تھا کیونکہ الفاظ اُس کے گلے میں اٹک گئے تھے۔ وہ سحر زدہ سی کی طرح چُپ چاپ کھڑا اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ تیر چل چکا تھا اور دل میں پیوست ہو گیا تھا۔

پھر وہ اُسے روز دیکھتا رہا۔ اُس کی چاہت، جنوں اور دیوانگی میں اضافہ ہوتا رہا۔ کبھی لائبریری میں، کبھی میٹنگ میں، کبھی کیفے میں، اور کبھی بس میں ـــــ وہ اُسے ایک خاموش تمنائی کی طرح دیکھتا رہا۔ لیکن شبنم تو جیسے پتھر کا کوئی بُت تھی۔ بہت کم بولتی تھی۔ اُس پر خاموشی اور سکوت کی گہری چھاپ تھی۔ اُس نے کئی بار اُس خاموشی اور سکوت کو توڑنا چاہا، چیخنا اور چلّانا چاہا۔ لیکن ہر بار الفاظ اُس کے سامنے گُم ہوتے رہے، دل کی خاموش اور گہری وادی میں سوتے رہے، خوابیدہ ہوتے رہے۔ باہر نکل ہی نہ سکے۔ پھانس چُبھتی رہی، درد میں اضافہ ہوتا رہا، چاہت شدّت اختیار کرتی رہی۔ لیکن اُس الم پرور اور سوگوار سی شبنم کا دل موم نہ ہو سکا۔ وہ پتھر کی پتھر ہی بنی رہی۔ کبھی اُس کی سنجیدہ آنکھوں میں ہلکی سی شوخی بھی نہ لہرائی۔ مُرجھائے ہوئے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسّم نہ پھیلا۔ وہ یک طرفہ محبت کی ہلکی ہلکی آنچ میں پگھلتا رہا، سُلگتا رہا۔ اُس تپش میں تیزی اور گرمی آتی رہی لیکن اُس سنگِ خارا پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اِس لئے اُس نے رات کی اُس تنہائی، خاموشی، سکوت اور سنّاٹے میں ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ کل اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کرے گا۔ شبنم سے سب کچھ کہہ دے گا۔ اپنے دل کی ہر گرہ کو کھولے گا۔

دوسرے دن ـــــ اِس سے پہلے کہ وہ اپنے فیصلے پر عمل کرتا شبنم نے اُسے ایک لفافہ تھما دیا۔ اُس نے بے صبری اور بے تابی سے لفافہ چاک کیا اور خط نکال کر پڑھنے لگا۔ لکھا تھا ـــــ

راج صاحب!

میں ایک ایسا ستار ہوں جس کے سب تار ٹوٹ چکے ہیں [illegible] تاروں سے کوئی نغمہ نہیں نکل سکتا، کوئی گیت جنم نہیں لے سکتا۔ میں آپ کی [illegible] نہیں ہوں۔ آپ کی حالت پر افسوس بھی ہوتا ہے۔ لیکن میرے دل کے دروازے پر [illegible] دستک کی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ میری زندگی میں ایک بار ـــــ ایک [illegible] راہوں پر چلا تھا۔ میرے دل کے دروازوں پر دستک دی تھی اور دل نے [illegible] دی تھیں۔ محبت کے سوتے اُبلے تھے۔ دل نے اپنی چاہت، پیار اور محبت کے [illegible] اُس پر نچھاور کر دئے تھے۔ پھر وہ کہیں چلا گیا۔ میرے ستار کے سب تار ٹوٹ گئے۔ میں [illegible] انتظار کر رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے ایک بار پھر وہ اِن بند دریچوں کو آ کر کھولے گا۔ میں اپنی ساری زندگی اُسی کے انتظار میں گزار دوں گی۔ اُمید ہے اب آپ میری تپسیا اور میرے تیاگ کے راستے میں نہ آئیں گے۔

شبنم

سپنوں کا تاج محل اچانک گر گیا، ٹوٹ گیا، ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور خط کے بکھرے ہوئے پُرزوں کی طرح تیز ہوا اُن ٹکڑوں کو دُور، دُور پھینک رہی تھی!!

# غزل

مقصود نظمی بی۔اے

جب بھی پائی ہے تری چشمِ کرم دل کی طرف
اس نے دیکھا ہے تہی دامنِ سائل کی طرف

شہرِ جاناں میں ذرا اور چراغاں کر دو
رکھ دو جلتے ہوئے زخموں کے دیئے دل کی طرف

اک تلاطم کی تمنا میں ہے خاموش فضا
آؤ پھیر موڑ دو طوفان کو ساحل کی طرف

کوئی قاتل نہ بچے گا کہ شہیدوں کا لہو
آپ ہوتا ہے رواں دامنِ قاتل کی طرف

شور رہبر کا ہو یا فتنہ رہزن نظمی
ہم ہیں راہی تو بڑھے جائیں گے منزل کی طرف

# غزل

رضا امروہوی

ہنوز زخمِ دلِ داغ دار باقی ہے
خزاں کے روپ میں رنگِ بہار باقی ہے

غمِ فراق سے فرصت ملی تو کیا حاصل
وہی ہجومِ غمِ روزگار باقی ہے

ہزار گیسوئے جاناں سلجھ گئے لیکن
مزاجِ دل میں وہی انتشار باقی ہے

نکھر گئی سحرِ نو، رہی نہ ظلمتِ جاں
گزر گئی شبِ غم، انتظار باقی ہے

شکستِ ربط و تعلق کے باوجود ابتک
ادھر خلوص، ادھر اعتبار باقی ہے

رضا خزاں میں امیدِ بہار کیوں شاید
ہماری خاک میں کوئی شرار باقی ہے

# غزل

علی افسر

آنکھوں آنکھوں میں بات ہو کے رہی
اک حسیں واردات ہو کے رہی

آ گیا دل کسی پہ آنا تھا
ہونے والی تھی بات ہو کے رہی

جذبِ دل اپنا رنگ لا کے رہا
بے رخی التفات ہو کے رہی

ہر ادا اُن کی خود نمائی کی
رونقِ کائنات ہو کے رہی

جیت اُسی کی ہے اصل میں افسر
عشق میں جس کو مات ہو کے رہی

# غزل

ادیب ہاشمی ایم۔اے، بی۔ایڈ

کیسی ہے یہ صبحِ بہاراں پھول ہیں خنداں، شبنم گریاں
تم آئے تو دُور ہوئے سب کیسا غم کیا رنج و حرماں؟

آج نہ جانے ہم کیوں روئے
کس نے پوچھا حالِ پریشاں

مردا!
صرف 5 پیسے
خرچ کر کے
آپ اپنے کنبے کو
محدود رکھنے کی
طاقت حاصل کر سکتے ہیں
NIRODH
نرودھ استعمال کیجیے۔ محفوظ، آسان طریقہ۔
اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ کنڈوم اب
ملک بھر میں بازار میں عام ملتے ہیں۔
بچے کی پیدائش روکیے اور
منصوبہ بند کنبے کی خوشی کا لطف اٹھائیے۔
بچے کی پیدائش کو روکنا آپ
کے اختیار میں ہے
نرودھ
اب
ملک بھر میں
دستیاب
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے
رعایتی دام
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
فیملی پلاننگ کے لئے
پرویژن اسٹور، پرچون فروش، دوا فروش
جنرل مرچنٹ اور سگریٹ فروش وغیرہ بیچتے ہیں۔

# بکھرے ہوئے رنگ

خالد سعید

مکان نمبر ۳۴۳- ۶ نزد نیشنل ہائی اسکول، موہن پورہ، گھبرہ

محترمہ شبانہ جان! سلام مسنون

"بکھرے ہوئے رنگ" کے ساتھ "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہونے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اس اُمید پر کہ آپ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ دیکھوں میری کوشش کہاں تک کامیاب ہوتی ہے۔ کہانی کے بارے میں بس اتنا ہی کہوں گا نئے انداز سے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہی محبت کا جذبہ ہے۔ اگر یہ محبت کا جذبہ ختم ہو جائے تو دُنیا میں کچھ نہ رہے! ـــــ بے حد انتظار رہے گا آپ کے جواب کا! . . .

ـــــ خالد سعید

"بہت حسین ہے شاذیہ!"

"مت کہو، ظالم لُوٹ لیتی ہے سب کو!"

"کاش وہ میرا مُقدّر ہو جائے!" راکیش نے ایش ٹرے میں سگریٹ مسلتے ہوئے کہا۔

"لڑکی! لڑکی!! لڑکی!!! ہر وقت لڑکی! کبھی تو کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کیا کرو۔" سراج اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"تم آدمی ہو یا بھوسے کا تھیلا۔ کوئی حس ہی نہیں۔" راکیش کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔ "سمجھ میں نہیں آتا تم کیسے آرٹسٹ بن گئے ہو۔ تمھیں تو حُسن پرست ہونا چاہئے تھا۔ تمھیں چاہئے تھا کہ نیچر سے پیار کرو، اس کے بجائے نفرت کرتے ہو، اور شاذیہ تو خدا کی قسم، جیسے کسی شاعر کی غزل ہو یا مصور کا تخیل!"

"سب بکواس! میں بھی حُسن پرست ہوں۔ میں بھی نیچر کو پسند کرتا ہوں۔ لیکن تمھاری طرح چھچھورا پن نہیں کرتا۔"

"یار! ابھی تم نے شاذیہ کو دیکھا نہیں۔ اسی لئے کہہ رہے ہو۔ جب دیکھو گے تو بُرش توڑ دوگے۔"

"ہوگی خوبصورت۔ لیکن میں کہتا ہوں تخیل سے زیادہ حسین کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"بہت خوبصورت ہے سراج!"

"جی تو یہی چاہتا ہے اُس کے چوڑے چکلے سینے پر سر رکھ کر سسکیاں بھر لیں۔ کیوں شبّی؟" ریحانہ نے کہا۔

"سراج! سراج!! سراج!!! ہر وقت سراج! اُس میں کیا ہے جو ہر وقت دیوانی بنی رہتی ہو اُس کی۔" شاذیہ نے جھلا کر ایڈگر ایلن پو کی کتاب میز پر پھینکی۔

"ابھی تم نے اُسے دیکھا نہیں ہے۔ ورنہ تم یوں نہ کہتیں، سمجھیں؟" شبانہ نے کہا۔

"وہ یوسفِ ثانی تھوڑی ہے۔ کسی افسانے یا ناول کے ہیرو جیسا تھوڑے ہی ہوگا۔ کیونکہ فنکار اپنے کردار کو تخلیق کرنے کے لئے اپنے قلم کا سارا زور صرف کرتا ہے۔ سارے مشاہدے کو دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ اپنے تخیل کے پروں کی مدد سے ساری کائنات پر پرواز کرکے ہر خوبصورت شے کو مجتمع کرتا ہے اور اُس ساری خوبصورتی سے ایک کردار کو جنم دیتا ہے۔"

"ویسا ہی ہے!" ریحانہ نے کہا۔ "بالکل جیسے کسی ناول کا ہیرو! پُروقار جسم، سانولا رنگ، یونانی دیوتاؤں جیسا چہرہ۔ اکثر سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں، کشادہ پیشانی پر بالوں کا گُچھا جھولتا ہوا۔"

"سچ کہتی ہو! پھر تو اپنے افسانے میں اُسے ہیرو بناؤ۔ کیسی رائیٹر ہو

کبھی نہیں آئے۔ شبانہ اُسے چھیڑنے لگی۔

---

"سراج! میری قسم اُس کی ایک تصویر بنا دے۔ کہو تو اُس کی تصویر لا دوں یا تُو بھی اُس کی ایک جھلک دیکھ لے۔ وہ ہے ہی ایسی ایک بار دیکھ لیں تو ہمیشہ کو دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔" کہتے کہتے راکیش نے آنکھیں بند کر لیں۔

"جی نہیں چاہتے اُس کی تصویر اور نہ میں اُس کی تصویر بناؤں گا!" سراج کھڑا ہو گیا۔

---

"ہرگز نہیں! کبھی میں اُسے اپنے افسانے کا ہیرو نہ بناؤں گی!" شاذیہ کے لہجے میں نفرت تھی۔

---

- اُن محتاجوں کو چہروں سے پہچان کر خیرات دو جو غیرت کی وجہ سے سوال نہیں کرتے۔ (قرآنِ پاک)
- جفاکشی سیکھو۔ (قرآنِ پاک)
- اخلاق کا اچھا ہونا محبتِ الٰہی کی علامت ہے۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار ہو جاؤ۔ (قرآنِ پاک)
- پرہیزگار سے بڑھ کر کوئی باعزت نہیں۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

---

"اُوہ! آخر تم اتنا چڑتی کیوں ہو اُس سے۔ بغیر دیکھے یہ نفرت کیسی؟" شبانہ نے پوچھا۔

"نفرت؟ تم ہی لوگوں نے بار بار اُس کا نام لے کر چڑ سی پیدا کر دی ہے۔" وہ جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔

---

سراج بی۔ اے کا اسٹوڈنٹ تھا۔ بچپن ہی سے اُسے آرٹ سے بے حد لگاؤ تھا۔ یہ فن اُسے ورثہ میں ملا تھا۔ اُس کا باپ بھی مشہور آرٹسٹ تھا لیکن ہمارے دیس میں کسی فنکار کی قدر نہیں ہوتی۔ جس طرح کسی مداری کے گرد لوگ کچھ دیر کے لئے جمع ہوتے ہیں، تماشہ دیکھتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، اسی طرح فنکار کے فن سے محظوظ ہوتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور وہ تو اُن لوگوں کی مسکراہٹ کو اپنا انعام سمجھتا اپنی محنت کا صلہ سمجھتا تھا۔ حقیقت بھی یہی ہے کسی بھی فنکار کی تخلیق کو کوئی سراہے اُسے پُرتحسین نظروں سے دیکھے تو سمجھو اُسے کاوش کا صلہ مل گیا۔ اِسی شوق میں معاشی حالت کمزور ہونے لگی۔ گھر کی چیزیں ایک ایک کر کے بکنے لگیں۔ آرٹسٹ گھلنے لگا۔ مر گیا۔ بیوی اور چھوٹے سے بچے کو چھوڑ کر۔ ننھے بچے کے ہاتھ میں پھر برش اور ڈِش تھما کر۔ سراج کو بھی بے حد شوق تھا باپ کی طرح آرٹسٹ بننے کا لیکن ماں کے آنسوؤں نے روکا۔ کوئی ماں اپنے بیٹے کا مستقبل تاریک دیکھنا نہیں چاہتی۔ اُس نے سراج کو قسمیں دیں۔ تکلیفیں اُٹھا کر سراج کو پڑھایا تاکہ اُس کا بیٹا اُس کے شوہر کی طرح ایڑیاں گِھس کر نہ مرے۔

شاذیہ متوسط گھرانے کی لڑکی تھی۔ ماں باپ بے حد پیار کرتے تھے اکلوتی تھی نا۔ شروع ہی سے ادب سے دلچسپی تھی۔ ادبی ماحول کے اثر اور لکھنے کے شوق نے اُسے بہترین فنکار بنا دیا۔ رُومانی افسانوں کو پسند کرتی تھی۔ اُس کے افسانے بڑے بڑے رسائل میں چھپتے تھے۔ کالج میگزین تو ہمیشہ اُس کے افسانے شائع کرتا تھا۔

سراج آنکھیں میں برش کو سگریٹ کی طرح پکڑے ہوئے تھا۔ برش کا آخری سرا اُس کے دانتوں میں دبا ہوا تھا۔ نظریں سامنے ایزل پر لگے ہوئے کینوس پر جمی ہوئی تھیں۔ کالج آرٹس ایگزیبیشن کے لئے تصویر بنائی تھی اُس نے تصویر کیا تھی نادرہ شاہکار! جیسے کسی لڑکی نے اپنے وجود کو پھول کی طرح ہلکا کر دیا ہو اور تب آ کر اس کینوس پر ٹھہر گئی ہو۔ جامنی، نیلگوں دُھند کے درمیان کھڑی تھی۔ اُس دُھند میں مدھم مدھم سے لیکن واضح خط و خال دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے اُس نے دُھند سے جنم لیا ہو۔ ہاتھ میں کھلی کتاب۔ جیسے پڑھتے پڑھتے شرما گئی ہو اور شرماتے شرماتے کہیں دُور کھو گئی ہو۔ وہ شرمائی ہوئی سر جھکائے کھڑی تھی۔ تصویر کو ہر نگاہ سے دیکھا۔ مطمئن ہونے کے بعد برش دھونے لگا۔ لیکن نگاہیں تو تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔ یکایک اُسے شاذیہ یاد آئی "شاذیہ!" وہ بڑبڑایا: "اونہہ! میری تصویر سے زیادہ حسین نہیں ہو سکتی!"

کچھ سُجھائی نہیں دے رہا تھا شاذیہ کو۔ بہت دیر سے بیٹھی تھی۔ کالج میگزین کے لئے افسانہ لکھنا تھا۔ ایڈیٹر نے کئی بار اصرار کیا تھا۔ تب اُس نے لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا، لیکن پھر بھی ایک لفظ لکھ نہ سکی۔ بہت کوشش کی۔ آخر تھک کر اپنی ہمجولیوں کے بارے میں سوچنے لگی اور پھر اُن سب کے بیچ سراج کا نام یاد آیا۔ سراج! ہونہہ نفرت سی تھی اُس سے اُسے۔ نفرت، نفرت، نفرت! کاش مل جائے وہ ایسا دھتکاروں اُسے، ایسی بے عزتی کروں اُس کی کہ یاد رکھے . . . معاً اُس کا چہرہ روشن ہو گیا۔ جھٹ سے اُس نے قلم سنبھالا کوئی تین گھنٹے بعد اپنے افسانے پر آخری نظر ڈال رہی تھی۔ آنکھیں نیند سے سُرخ ہو چکی تھیں۔ جیسے کی

"اوئی مری!" شازیہ اچھل پڑی کیونکہ شبانہ کی چٹکی بہت تکلیف دہ تھی۔

"تو ادائی اس سے محبت کرتی تھی اور کہتی تھی ہم سے کہ اس میں دکھا کیا ہے؟" ریکھا نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا محبت؟ کس سے محبت؟" شازیہ چونک پڑی۔

"سراج سے میری بنو اور کس سے! بہت معصوم بنتی ہو میری دادی!" شبانہ کے لہجے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

"اس لوفر سے محبت؟" وہ دیوانہ وار قہقہے لگانے لگی۔

"بہت غضب کی ایکٹرس ہے یہ تو!" ریکھا نے چبھتے لہجے میں کہا "تو پھر تُو نے اپنے افسانے کا ہیرو کیوں بنایا؟"

"ہیرو؟" وہ پھر ہنسی "دیکھا نہیں کیسی بے عزتی کی میں نے"

---

- تنگ حال وہ نہیں جو مال و دولت نہیں رکھتا۔ تنگ حال وہ ہے جس کے پاس علم نہ ہو۔ (برہم لین سوامی سرویانند جی)
- حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو۔ (سوامی سارشید لنند جی)
- دولت کی چنچل چھایا اور رُوپ رنگ کے جل ترنگ میں کھویا انسان موت کی گونج نہیں سنتا۔ (چاندر گیہ کوشلر)
- جس رشتہ کی بنیاد محبت و الفت، ہمدردی اور خلوص پر نہیں وہ ناپائیدار ہے۔ (ما تاریمان جی)
- سستی ساری بُری عادتوں کی بنیاد ہے۔ (جواہر لال)

---

"تاکہ دوسروں کے سامنے یہ ثابت کر سکے کہ تجھے سراج سے نفرت ہے۔ کہتے ہیں نا کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ آخر اس نے ظاہر کر دیا تیری تصویر بنا کر!"

"میری تصویر؟" وہ چونکی۔

"نہیں تو کیا میری تصویر؟ ہاں تیری تصویر! اور آرٹ ایگزیبیشن میں اوّل درجہ پر آئی ہے!"

وہ سب تصویر کے سامنے جمع تھیں۔ شازیہ کینوس پر اپنے عکس کو دیکھ کر پہلے تو گھبرائی، شرمائی پھر لجائی۔ پھر موم کی طرح پگھل گئی۔

"ارے کیا سوچ رہی ہے؟" ریکھا نے ٹہوکا دیا۔

"وہ دیکھو، اُس کونے میں!" شبانہ شازیہ کو دکھانے لگی جہاں سراج کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ پھلجڑی کی طرح سلگنے لگی۔

سرد ہوائیں اُس کے ماتھے پر گری کاکلوں مہکی لٹوں کو جھلا رہی تھیں۔ چہرہ کلیوں کی طرح چٹکنے لگا۔ ساری تھکاوٹ کو اُس نے اپنی انگڑائی سے زائل کر دیا۔ اپنے بدن کو اُس نے یوں چھوڑا جیسے کوئی ہیرں سے لدی ہوئی ڈال کو جھکا کر جھٹکے سے چھوڑ دے۔

اس کی تصویر آرٹس ایگزیبیشن میں اوّل درجہ پر آئی۔ بہت سراہا گیا اُس تصویر کو جس کا عنوان تھا "تخیل" مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ لیکن اُن کی نظروں میں ایک چبھن تھی، رشک تھا۔ دھپ سے کسی نے کاندھے پر ہاتھ مارا۔ مُڑ کر دیکھا تو راکیش کھڑا تھا۔ راکیش نے سگریٹ کا سارا دھواں اُس کے چہرے پر پھینکا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے!" سراج دھوئیں کو ہاتھ سے ہٹانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ راکیش نے اُس کی کلائی تھامی اور اُسے گھسیٹتا ہوا ہال کے اُس کونے میں لے گیا جہاں تنہائی تھی، خاموشی تھی۔

"تم تو چھپے رستم نکلے میرے یار!" راکیش نے ایک اور دھپ جمائی۔

"ارے کمبخت کیا مارنے کا ارادہ ہے؟"

"بیٹا مر تو پہلے ہی گئے۔ کیا بھولے بنتے تھے۔ بغل میں چھری منہ میں رام رام والی بات تھی؟"

"کیا بک رہا ہے کہیں بھنگ تو نہیں پی گیا؟"

"واہ میرے شیر! خود تو محبت کے نشے میں ڈوبے ہوئے ہو اور دوسروں کو بھنگ پلاتے ہو!"

"محبت!" سراج خالی خالی نگاہوں سے دیکھنے لگا "تم تو جانتے ہو راکیش میں ایسے الفاظ پر یقین نہیں رکھتا۔"

"تو وہ تصویر کس کی بنائی ہے تُو نے؟" راکیش نے معصوم بنتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تصویر تو میں نے خود کو کھو کر بنائی ہے۔"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ شازیہ کو ماڈل بنایا تھا۔"

"شازیہ!" وہ اُچھل پڑا۔

"نہیں تو کیا وہ تیری..." راکیش نے جل کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ "لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس نے ایسا کیوں لکھا؟"

"کیا؟"

"لے پڑھ لے!" راکیش نے شازیہ کا میگزین میں چھپا ہوا افسانہ پیش کیا۔ راکیش سراج کو پڑھتے ہوئے چھوڑ کر چلا گیا۔

---

سراج افسانہ پڑھنے میں منہمک تھا۔ اس نے قریب کھڑی ہوئی شاذیہ کو بھی نہ دیکھا۔ وہ افسانے میں چھپے ہوئے اشارے کو سمجھ گیا تھا۔ اس افسانے کا ہیرو ایک آرٹسٹ تھا۔ جس کا کردار بہت پست ظاہر کیا گیا تھا۔ پیسہ کا لالچی ہے اُسے۔ بھونڈا ہے جو ہر گلی پر منڈلاتا ہے۔ اس کے فن پر کالج کی ایک لڑکی مرمٹتی ہے۔ دیوانی ہو جاتی ہے اس کے فن کی۔ وہ اس پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتی ہے اور وہ لڑکی کو ٹھکرا دیتا ہے۔ آخر لڑکی کسی نہ کسی طرح سے ایک بوڑھے امیر سے شادی کر لیتی ہے۔ چند دن بعد وہ بوڑھا مر جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی ساری جائداد کی مالک وہی لڑکی ہے۔ اب وہ دولت کے ذریعہ اس آرٹسٹ سے انتقام لیتی ہے۔ اُس آرٹسٹ کو خطرناک نشے استعمال کروانے لگتی ہے۔ وہ آرٹسٹ پیسوں کی خاطر سب کچھ کرتا ہے۔ آخر کار نشہ کی چیزیں نہ ملنے پر وہ آرٹسٹ کتوں سے بھی بدتر زندگی گزارتا ہے۔ تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے!

اس نے سرد آہ بھر کر گردن اُٹھائی۔ سامنے شاذیہ کھڑی تھی۔ وہ بوکھلا گیا۔

"آ... آپ؟"

"جی میں!" شاذیہ کا لہجہ پُرسکون تھا: "آپ نے میری تصویر کیوں بنائی۔ جانتے ہیں آپ ایک لڑکی کی عزت پارہ کی طرح ہوتی ہے۔ اگر ایک بار گر کر بکھر جائے تو کبھی جم نہیں سکتی۔ آپ کی تصویر کی وجہ سے سارے کالج میں میری بدنامی ہوئی۔"

"جی میں نے آج تک آپ کو دیکھا نہیں تھا نہ آپ کی میں نے تصویر دیکھی۔ میں نے تو صرف اپنے تخیل کی مدد سے وہ تصویر بنائی۔ اگر مجھے پہلے ہی معلوم ہو جاتا کہ تصویر ہو بہو آپ جیسی ہے تو جلا ڈالتا۔ لیجئے آپ ہی کے سامنے اسے برباد کرتا ہوں!"

سراج ایزل کی طرف بڑھنے لگا۔ شاذیہ اُسے دیکھنے لگی: "عورت کی عزت فنکار کے فن اور اس کے شاہکار سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے!" سراج نے تصویر پھاڑتے ہوئے کہا۔ شاذیہ نظروں سے پرکھنے لگی۔ کیونکہ فنکار کی نظریں بہت تیز ہوتی ہیں معمولی سے واقعہ، پہلی نظر اور کبھی تو ایک لفظ سے کہنے والے کی شخصیت تک پہنچ جاتا ہے۔

"میں معافی چاہتی ہوں" اس کے لہجے میں ہلکی سی ندامت تھی۔

"آپ معافی چاہتی ہیں؟ معافی تو مجھے مانگنی چاہیئے"

"میں نے اپنے افسانے میں آپ کے کردار پر حملہ کیا ہے۔ عورت بہت جذباتی ہوتی ہے نا" شرم سے اس کی گردن جھک گئی۔ اس پوز میں سراج کو اپنا شاہکار "تخیل" یاد آگیا۔ تھوڑی دیر بعد شاذیہ نے گردن اُٹھائی۔ دونوں کی نظریں ملیں پھر جھک گئیں۔ دونوں کچھ گھبرائے سے تھے، کچھ پشیمان سے تھے۔ جھینپے جھینپے سے تھے۔ پھر دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں ہنس پڑے۔ ان کے زندگی سے بھرپور قہقہے سارے ہال میں گونج رہے تھے۔ جیسے سارا ہال ہنس رہا ہو، ساری تصویریں ہنس رہی ہوں، سارا زمانہ ان کے ساتھ ہنس رہا ہو۔ کلیاں چٹک رہی ہوں۔ فضا مہک رہی ہو۔ آئینے کا جیسے کوئی ٹکڑا چمک رہا ہو۔ بھرے دل ملتے ہیں ساری فضا مہکتی ہے۔ ساری کائنات جھوم اُٹھتی ہے۔

دونوں ہاتھوں میں ہاتھ تھامے کھڑے تھے۔ سراج اس خالی جگہ کو دیکھ رہا تھا جہاں کچھ دیر پہلے اس کی بنائی ہوئی تصویر لٹک رہی تھی۔ لیکن اب اس کے ٹکڑے سارے ہال میں پھیلے ہوئے تھے۔ جیسے تصویر کے سارے رنگ بکھر گئے ہوں، جیسے ساری کائنات رنگین ہو گئی ہو اور وہ رنگ مل کر شاذیہ کی شکل میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑے ہوں۔ اس نے شاذیہ کو دیکھا اور مُسکرا دیا!!

---

## غزل

آزاد گورداسپوری بی۔ اے

آہ کرتے ہیں تو سے بیمار اُٹھتے بیٹھتے
دردِ دل کا کرتے ہیں اظہار اُٹھتے بیٹھتے

جلوہ ارزانی کی زحمت آپ فرماتے اگر
ہم بھی کرتے آپ کا دیدار اُٹھتے بیٹھتے

حسبِ وعدہ آج تک وہ بام پر آئے نہیں
عمر گزری ہے پسِ دیوار اُٹھتے بیٹھتے

دَور کیا بدلا کہ ساقی نے نگاہیں پھیر لیں
شکوہ کرتے ہیں یہی میخوار اُٹھتے بیٹھتے

گو مخالف تھے مگر اب حضرتِ آزاد بھی
گنگناتے ہیں مرے اشعار اُٹھتے بیٹھتے

## غزل

چندر پرکاش جوہر بجنوری

جنوں کا راز، سمجھانے سے پہلے
سمجھ لے کوئی دیوانے سے پہلے

مکمل تھا محبت کا فسانہ
زمانے کے ہر افسانے سے پہلے

شعورِ بادہ نوشی بھی ہے لازم
کسی میخانے میں جانے سے پہلے

بہت روکا کئے شیخ و برہمن
تمہاری بزم تک آنے سے پہلے

بہت سادہ تھی جوہر زندگانی
فریبِ آرزو کھانے سے پہلے

## غزل

بلونت کور بی. پی

تمہارے در کے سوا کوئی سنگِ در نہ ملا
بچھڑ کے تم سے کہیں چین عمر بھر نہ ملا

نہ راس آئی مسرت تو کچھ ملال نہیں
خوشی یہ ہے کہ ترا غم تو مختصر نہ ملا

کسی کو اپنے مقدر سے مل گیا ہوگا
وفا کی راہ میں مجھ کو تو ہم سفر نہ ملا

رہِ حیات میں ہمت کو ہارنے والے
فنا کے بعد بھی تجھ کو سکوں اگر نہ ملا

رضائے دوست نہ معلوم کیا ہے میں خوش ہوں
مری دعا کو جو اے پارسا اثر نہ ملا

## غزل

ڈاکٹر حسین احمد فغاں

اُن کا خیال ہے نہ کچھ اپنی خبر مجھے
پہنچا دیا ہے عشق نے کس موڑ پر مجھے

کیوں ایک بے وفا سے وفا کی اُمید کی؟
اکثر ملال ہوتا ہے یہ سوچ کر مجھے

کرنا پڑے گا اب تو محبت سے اجتناب
تیرا سلوک، تیری نظر دیکھ کر مجھے

رسم و رہِ جہاں سے میں اب بے خبر نہیں
کیا کچھ سکھا گئی ہے کسی کی نظر مجھے

# میری بھارت یاترا

فکر تونسوی

میں بھارت سے رخصت ہو رہا ہوں۔ میں نے ہوائی جہاز کے ٹکٹ کی سفید و سیاہ دونوں قیمتیں ادا کر دی ہیں۔ جس ایجنٹ کی معرفت میں نے بلیک کا ٹکٹ خریدنے کا اہتمام کیا، وہ ایک سفید ریش حاجی ہے اور ہر سال زائرینِ حج کے لئے اِسی سفید و سیاہ فارمولے کی بنا پر ٹکٹوں کا انتظام کرتا ہے۔ اُس نے مجھے زائرینِ حج کے کئی تعریفی سرٹیفکیٹ دِکھائے جن میں لکھا گیا تھا کہ حاجی . . . صاحب نے ہم سے کبھی جعلسازی نہیں کی۔ پبلک کی رقم لے کر وہ فرار نہیں ہو جاتا۔ بلکہ واقعی ٹکٹ مہیا کرا کے ہوائی جہاز پر "سی اوف" کرنے کے لئے بھی آجاتا ہے ——— بلیک کرنا اُس کی ہابی ہے، ایمان نہیں ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ ہندوستان میں ایسے لوگ اب خال خال رہ گئے ہیں جو بے ایمانی میں بھی اپنا ایمان قائم رکھتے ہیں۔

کل صبح کے ہوائی جہاز سے میں لندن واپس جا رہا ہوں۔ روانگی سے پہلے میں نے کچھ شاپنگ کی ہے۔ میں بنارس گیا تھا۔ جہاں کے ٹھگ اور ساڑیاں مشہور ہیں۔ میں نے کچھ ساڑیاں خریدیں اور پھر سوچا کسی ٹھگ سے بھی ملاقات کی جائے۔ لیکن بنارس کے ایک شاعر نے مجھے بتایا کہ آپ ایک ٹھگ سے ملاقات کر چکے ہیں۔ یعنی جس دُکاندار سے آپ نے ساڑیاں خریدی ہیں، وہ ایک ٹھگ تھا۔ کیونکہ اُس نے آپ کو اصلی بنارسی ساڑیوں کی بجائے مصنوعی بنارسی ساڑیاں دے دی ہیں۔

میں مطمئن ہو گیا اور کسی دوسرے ٹھگ سے ملنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

میں نے اُس بنارسی شاعر کا شکریہ ادا کیا۔ جس نے ٹھگ اور دُکاندار کو ایک سطح پر کھڑا کر کے مجھے دکھا دیا اور اِس طرح میری معلومات میں اضافہ ہو گیا۔ اُس شاعر نے بطور میزبان مجھے چائے پلائی اور میں نے اُسے بطور میزبان وِہسکی پلائی ۔ یہ وِہسکی ہم نے مقدس دریائے جمنا کے کنارے ایک مندر کے پیچھے پڑے ہوئے ایک بڑے سے چوکور پتھر پر بیٹھ کر نوش کی۔ یہ وِہسکی ہمیں اُس مندر کے پجاری نے بازار سے پچیس فیصدی رعایت پر سپلائی کی تھی اور اُس نے وِہسکی کی قیمت جیب میں ڈالتے وقت فخریہ لہجے میں بتایا کہ ہمارے عظیم اور مرحوم لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو نے ہم بھارتیوں کو تلقین کی تھی کہ غیر ملکی سیاح ہمارے معزز مہمان ہیں۔ ہمیں اُن کے ساتھ رواداری، عزت اور شرافت کے ساتھ پیش آنا چاہئے۔

جب ہم وہ دھرم سے کشید کی ہوئی وِہسکی نوش کر رہے تھے تو مجھے احساس ہوا کہ میرے اعصاب پر الکحل کے صرف پچیس فیصدی اثرات ہیں اور پچھتر فی صدی وِہسکی میں جمنا جل کی ملاوٹ کی گئی ہے۔ اُس نے ہمیں جو پچیس فیصدی رعایت دی تھی۔ وہ الکحل کی ہی تھی۔ پانی کی نہیں تھی۔

میں نے اُس بنارسی شاعر سے پوچھا: "آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

وہ بولا: "ایک چھاپے خانے میں پروف ریڈری کرتا ہوں۔"

"تو پھر پروف ریڈری کرو، شاعری کیوں کرتے ہو؟"

وہ ہنس پڑا۔ اُس کی ہنسی میں وہی کرب تھا جو کڑوی دوائی پینے سے بچوں کے چہروں پر نمودار ہو جاتا ہے۔ وہ کہنے لگا: "بھارت کے شاعر اگر صرف شاعری کریں تو انھیں صرف داد و تحسین ملتی ہے، سگریٹ، سیب، ڈبل روٹی نہیں ملتی۔ اِس لئے وہ ڈبل روٹی پانے کے لئے پروف ریڈری کرتا ہے اور بھوک کے خلاف غصہ نکالنے کے لئے شاعری کرتا ہے۔ یہاں کے شاعر ذہنی خوراک شاعری سے حاصل کرتے ہیں، پیٹ کی خوراک پروف ریڈری سے حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے ذہن الگ ہیں، پیٹ الگ ہیں۔ ذہن اور پیٹ دونوں متوازی چلتے ہیں۔ صرف موت ہی دونوں کو متحد کر کے دونوں کا قلع قمع کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں شاعر کے انتقال کے بعد اُس کے بال بچوں کی امداد کے لئے چندے فراہم کئے جاتے ہیں۔ امدادی فنڈ کی اپیلیں کی جاتی ہیں۔"

اور پھر میں نے دیکھا کہ پچیس فیصدی الکحل کے نشے میں بھی وہ بنارسی شاعر بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔ اُس نے مجھے اپنی چند نظمیں سنائیں۔ جن میں سے کچھ افلاس کے خلاف تھیں، کچھ اُس محبوبہ کے خلاف تھیں جو شاعر سے نفرت [illegible] کے ایک سوداگر کی محبوبہ بن گئی تھی اور کچھ اُن انگریز سامراجی حاکموں کے خلاف تھیں، جنھوں نے ہندوستان کو ایک صدی تک پیچھے اور مجبور [illegible]

اور پھر میں بنارس سے دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ دہلی اسٹیشن پر اُترتے وقت مجھے معلوم ہوا کہ اُس بنارسی شاعر نے میری جیب میں ایک پُرزہ لکھ کر ڈال دیا ہے جس پر لکھا تھا "پیارے غیر مُلکی سیاح! خوبصورت عورتوں کی تصویروں کا جو البم تمہارے بیگ میں تھا وہ میں نے چُرا لیا ہے۔ بنارس کی آب و ہوا میں پرورش پانے کے باعث میری فطرت میں بھی چوری اور ٹھگی گھس گئی ہے میں ان تصویروں کو بیچ کر اپنے بال بچوں کے لئے پنسلیں اور قمیصیں اور پنسلیں اور کاپیاں خریدوں گا۔ میں نے انگریز سامراج سے ہلکا سا انتقام لے لیا ہے جو ہمیں ایک صدی تک ٹھگتے رہے۔"

اور میں نے دہلی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر سے اس مسئلہ پر گفتگو کی۔ یہ پروفیسر گنجا تھا اور ترقی پسند تھا اور کلب میں اپنے ایک دولت مند سٹوڈنٹ کے پیسے سے وِسکی پی رہا تھا اور اسے بتا رہا تھا کہ میں نے لندن کے سکول آف اکنامکس میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اس لئے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان میں سوشلزم کبھی نہیں آسکتا!

پروفیسر نے مجھے الوداعی دعوت پر اُس کلب میں مدعو کیا تھا لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ اس دعوت کا بل وہ دولت مند سٹوڈنٹ ادا کر رہا ہے تو مجھے بطور مہمان سخت ندامت ہوئی (میزبان کو ندامت نہیں ہو رہی تھی، ہندوستانی میزبان بھی عجیب مٹی کے بنے ہوتے ہیں) میں نے اُس پروفیسر سے بنارسی شاعر کا ذکر کیا تو پروفیسر نے حقارت انگیز لہجے میں کہا "بکواس کرتا ہے وہ شاعر — انگریز سامراج سے بہتر اور معیاری سامراج ہندوستان کو کبھی مل ہی نہیں سکتا۔ وہ انگریزوں سے انتقام لینے کی آڑ میں تصویروں کے البم چُراتے ہیں اور اُسے پنسلوں اور کاپیوں پر خرچ کر کے ہندوستان کے سارے اقتصادی سسٹم کو بگاڑ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مُلک میں کوئی عظیم شاعر پیدا نہیں ہوا۔ ہمارے شاعر صرف پان فروش ہیں، جو اِدھر اُدھر سے خیالات چُرا کر اپنی نظم میں اکٹھے کر لیتے ہیں اور پھر اُسے ایک پان کی طرح گاہکوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ جس سے گاہکوں کے ہونٹ لال ہو جاتے ہیں۔"

اور پھر اُس پروفیسر نے مجھے اپنی ایک نظم سُنائی جو ایک فرنچ شاعر کی نظم کا ہو بہو ترجمہ تھی۔ میں نے اُس کی جی بھر کر داد دے دی اور اُسے یہ نہیں بتایا کہ میں فرانسیسی زبان بھی جانتا ہوں۔ مجھے ہندوستان میں کچھ عرصے رہنے سے ہندوستانی سوسائٹی کے کچھ آداب آگئے تھے کہ جس کا کھاؤ، اُسی کا گاؤ۔ جس تھالی میں کھاؤ اُسی میں چھید نہ کرو۔ کسی کا دل مت دُکھاؤ چاہے وہ سوشلسٹ خیالات کا پروفیسر ہو، چاہے ایک سرمایہ دار کا سٹوڈنٹ لڑکا جو کالج میں سوشلسٹ اقتصادیات کی تعلیم پاتا ہے اور کلب میں ایک اشتراکی کو وِسکی پلا کر اُس کا ضمیر خرید لیتا ہے۔

میں نے ہندوستان کے پڑھے لکھے لوگوں میں ایک عجیب رجحان دیکھا ہے کہ وہ جب تک اَن پڑھ رہتے ہیں، بھارت دیش کے گُن گاتے ہیں۔ اُس کی مٹی کو پیشانی پر لگا کر شہید تک ہو جاتے ہیں لیکن جب یورپ اور امریکہ اور روس سے آئی ہوئی کتابیں پڑھ لیتے ہیں تو دیش بھگتی کھو بیٹھتے ہیں اور اپنے ہی ہندوستانی بھائیوں کو حقارت سے دیکھنے لگتے ہیں، اُن کے لباس کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ اُن کی گفتگو، رہن سہن، برتاؤ کے پول کھولتے ہیں اور انگریزی فلمیں دیکھتے ہیں اور انگریزی ڈانس کرتے اور میوزک سُنتے ہیں۔ ہندوستانی زبان میں بات کرتے ہوئے شرماتے ہیں اور پھر انگریزی ہی میں ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہتے ہیں "کاش میں یورپ میں پیدا ہوتا تو میری قدر و منزلت سو گنا بڑھ جاتی۔"

اِس لئے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ یہاں تعلیم قطعی طور پر بند کر دی جائے۔ صرف اَن پڑھ ہندوستانی ہی اِس مُلک کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ ورنہ یہ پھر کسی نہ کسی سامراج کے پنجے میں گرفتار ہو جائے گا۔

---

اِس کے علاوہ میں نے ہندوستانی سیاحت کے بعد کچھ اور نتیجے بھی نکالے ہیں۔

۱۔ ہندوستان دُنیا کے نقشے پر ہمیشہ قائم رہے گا کیونکہ دوسرے ممالک بھی اِس نقشے پر قائم چلے آرہے ہیں۔ اِس لئے جب تک یہ دُنیا نیست و نابود نہ ہو جائے گی،

اس وقت تک ہندوستان نیست و نابود نہیں ہو سکتا۔ اسی خیال کو ایک ہندوستانی شاعر نے بڑے فخر سے کہا تھا۔

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
باقی مگر ہے اب تک نام و نشاں ہمارا

ان اشعار میں شاعر نے صرف دو جھوٹ بولے تھے۔ ایک تو یہ کہ اس مُلک کا کوئی بھی دشمن نہیں رہا، صرف ہندوستانی ہی ہندوستان کے دشمن رہے ہیں ——— اور دوسرا جھوٹ یہ ہے کہ یونان کی ریاستیں اور مصر اور روم آج بھی دُنیا میں موجود ہیں۔ ابھی تک نہیں مٹے اور جس وجہ سے وہ مُلک نہیں مٹے، ہندوستان بھی نہیں مٹا۔ ہندوستانی شاعر جھوٹ بولنے کو شاعری کی ایک خاص صفت سمجھتے ہیں اور تاریخ اور جغرافیہ سے لاعلمی کو وہ شاعرانہ مبالغے میں چھپا لیتے ہیں۔

۲۔ ہندوستانی لوگ صرف اُس وقت ترقّی کرتے ہیں جب دوسرے مُلک بھی ترقّی کر رہے ہوں۔ دوسروں کی ترقّی دیکھ دیکھ کر انھیں غصّہ آجاتا ہے اور وہ بھی ترقّی کرنے لگتے ہیں۔

۳۔ ہندوستانی ذہن اوریجنل نہیں ہے۔ وہ دوسروں کی نقل کرتا ہے۔ سچ بولنے میں بھی اور جھوٹ بولنے میں بھی ——— اور جب انھیں کہا جائے کہ تم صرف نقلچی ہو تو وہ اپنی الماری میں سے ایک پُرانی کتاب نکال لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارا دھرم شاستر ہے، اس میں وہ سب کچھ لکھا ہوا ہے، جسے پڑھ کر دوسرے ممالک نت نئی ایجادیں کر رہے ہیں ——— ایک ہندوستانی نے مجھے بتایا کہ چاند کے متعلق جو معلومات امریکہ نے اربوں روپے خرچ کر کے حاصل کی ہیں وہ ہمارے ہاں تین روپے کی کتاب خرید کر حاصل کی جا سکتی تھیں۔ ہندوستانی لوگ اپنی یہ کتابیں صرف اُس وقت نکالتے ہیں، جب دوسرے ممالک نئی ایجادیں کر لیتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ یہ کتابیں نہ کھولتے ہیں، نہ پڑھتے ہیں اور نہ انھیں سمجھ پاتے ہیں۔

۴۔ ہندوستان میں کئی قومیں بستی ہیں۔ ہر قوم کا الگ کلچر ہے، الگ زبان اور الگ رہن سہن اور اسی علیحدگی پسندی کی وجہ سے وہ آپس میں ہمیشہ لڑتے رہتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اپنے آپ کو ایک قوم کہتے ہیں۔

۵۔ ہندوستان کو صرف مذہب نے ایک کر رکھا ہے۔ ہر ہندوستانی چاہے وہ دہریہ ہی کیوں نہ ہو، اللہ سے ڈرتا ہے اور اللہ کا ذکر ہر مذہب میں آیا ہے۔ اس لئے وہ اللہ اور مذہب دونوں سے ڈرتے ہیں۔ مزاج اور طبع کے طور پر ہر ہندوستانی مذہب پرست ہے۔

۶۔ اللہ کے ڈر کی وجہ سے وہ جتنے گناہ کرتے ہیں اتنے ہی ثواب بھی کر ڈالتے ہیں۔ تاکہ گناہ و ثواب میں توازن قائم رہے اور جب وہ اللہ کے سامنے پیش ہوں تو خدا پریشان ہو جائے کہ انھیں سزا دے یا جزا؟ کیونکہ ان کے ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہیں ——— یعنی ہندوستانی لوگ بنیادی طور پر ڈاکو اور حاجی ہیں۔ صبح کو ڈنڈی مارتے ہیں، شام کو عبادت گاہ میں چڑھاوا چڑھا آتے ہیں۔

آخری نوٹ:۔ میں ہندوستان سے کچھ خالص ہندوستانی مصنوعات لے جا رہا ہوں تاکہ اپنے احباب کو ہندوستانی تحفے کے طور پر پیش کر سکوں۔ یہ تحفے ایک ایمپوریم سے خریدے تھے۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ان میں سے کسی چیز پر جاپان کی مُہر لگی ہوئی تھی، کسی پر امریکہ کی، کسی پر جرمنی کی ——— میں نے ایمپوریم کے منیجر سے کہا: "صاحب! مجھے تو خالص ہندوستانی مال چاہئے۔ یہ غیر مُلکی چیزیں نہیں۔"

ایمپوریم کا منیجر مجھے ایک کونے میں لے گیا اور سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگا: "گھبرائیے نہیں۔ یہ دراصل ہندوستانی ہی مال ہے۔ صرف ہندوستانی گاہکوں کو دھوکا دینے کے لئے ان پر غیر مُلکی مہریں لگائی گئی ہیں۔"

وہ منیجر پہلا ہندوستانی تھا جس کی بات پر مجھے اعتبار آگیا!!

---

فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا پونہ

# نوٹس داخلہ

برائے اکیڈمی سال جس کا اجرا یکم جولائی 1970ء کو ہوگا مندرجہ ذیل ریگولر کورسز

کے پہلے سال میں داخلے کے لئے مجوزہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

**(1) فلم ڈائرکشن (تین سال)** | کم سے کم تعلیمی قابلیت آرٹ یا سائنس میں یونیورسٹی ڈگری یا اس کے مساوی۔

عمر: مورخہ یکم جولائی 1970ء کو 19 اور 30 سال کے درمیان ہونی چاہئے۔

**(2) سکرین پلے رائیٹنگ (تین سال)** | کم سے کم تعلیمی قابلیت: آرٹ یا سائنس میں یونیورسٹی ڈگری یا اس کے مساوی۔

عمر: مورخہ یکم جولائی 1970ء کو 19 اور 30 سال کے درمیان ہونی چاہئے۔

**(3) موشن پکچر فوٹوگرافی (تین سال)** | کم سے کم تعلیمی قابلیت: انٹرمیڈیٹ یا تین سالہ ڈگری کورس کا فرسٹ ایر معہ فزکس اور کیمسٹری یا اس کے مساوی یا فائن آرٹس (پینٹنگ) میں ڈگری ڈپلومہ کسی یونیورسٹی سے یا سٹیٹ کے منظور شدہ انسٹی ٹیوٹ سے لیا ہو۔ میٹرکولیشن کے بعد ڈپلومہ کورس کی میعاد کم از کم دو سال ہونی چاہئے۔

عمر: مورخہ یکم جولائی 1970ء کو 17 اور 30 سال کے درمیان ہونی چاہئے۔

**(4) ساؤنڈ ریکارڈنگ اینڈ ساؤنڈ انجینئرنگ (تین سال)** | کم سے کم تعلیمی قابلیتیں: انٹرمیڈیٹ یا تین سالہ ڈگری کورس کا فرسٹ ایر معہ فزکس، کیمسٹری اور میتھمیٹکس یا اس کے مساوی۔

عمر: مورخہ یکم جولائی 1970ء کو 17 اور 30 سال کے درمیان ہونی چاہئے۔

**(5) فلم ایڈیٹنگ (دو سال)** | کم سے کم تعلیمی قابلیتیں: انٹرمیڈیٹ یا تین سالہ ڈگری کورس کا فرسٹ ایر آرٹس یا سائنس میں یا اس کے مساوی۔

عمر: مورخہ یکم جولائی 1970ء کو 17 اور 30 سال کے درمیان ہونی چاہئے۔

**(6) فلم ایکٹنگ (دو سال)** | کم سے کم تعلیمی قابلیت: میٹرکولیشن یا اس کے مساوی معہ انگلش بطور ایک مضمون۔ ہندی اور اردو میں کام چلاؤ علم ہونا چاہئے۔ مستحق لڑکی امیدواروں کو قابلیت میں رعایت دی جائے گی۔

عمر: مورخہ یکم جولائی 1970ء کو لڑکیوں کی صورت میں 16 اور 25 سال اور لڑکوں کی صورت میں 18 اور 25 سال کے درمیان ہونی چاہئے۔

2۔ جو امیدوار لڑکا/لڑکی اپنے کوالیفائینگ یونیورسٹی/بورڈ ایگزیمینیشن میں اپریل/مئی یا جون 1970ء میں شامل ہوا ہے یا ہو رہا ہے اور درخواستیں بھیجتے وقت اس کا نتیجہ نہیں نکلا ہے وہ انسٹی ٹیوٹ کے انٹرنس ایگزیمینیشن (امتحان) میں شامل ہونے کا اہل ہے بشرطیکہ اس لڑکے/لڑکی کی درخواست کے ہمراہ سرٹیفکیٹ جاری کردہ پرنسپل/ہیڈ ماسٹر لڑکے/لڑکی کے کالج/سکول کا بدیں مطلب شامل ہو۔ اگر انٹرنس ایگزیمینیشن میں اسے منتخب کر لیا گیا تو اس لڑکے/لڑکی کو عارضی داخلہ اس شرط پر مل سکے گا کہ اس لڑکے/لڑکی کو مطلوبہ یونیورسٹی/بورڈ امتحان پاس کر لینے کے متعلق دستاویزی ثبوت 31 جولائی 1970ء تک پیش کرنا ہوگا۔ ثبوت نہ پیش کرنے کی صورت میں لڑکا/لڑکی کا عارضی داخلہ از خود منسوخ ہو جائے گا اور ادا شدہ فیس واپس بھر انہیں کی جائے گی۔

3۔ متذکرہ کورسوں میں داخلہ انٹرنس ایگزیمینیشن کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ فلم ڈائرکشن، سکرین پلے رائیٹنگ، موشن پکچر فوٹوگرافی، ساؤنڈ ریکارڈنگ اور ساؤنڈ انجینئرنگ اور فلم ایڈیٹنگ کے کورسوں کے امتحان میں تحریری ٹیسٹ اور زبانی امتحان شامل ہیں۔ تحریری ٹیسٹ الہ آباد، بمبئی، کلکتہ، دہلی، مدراس اور رانچی میں اتوار 10 مئی 1970ء کو منعقد ہوگا۔ وہ تمام امیدوار جو انٹرنس ایگزیمینیشن کے تحریری ٹیسٹ میں کوالیفائنگ مارکس حاصل کریں گے انہیں زبانی امتحان میں شامل ہونا پڑے گا جو انسٹی ٹیوٹ واقع پونا میں مورخہ 22 جون 1970ء کو منعقد ہوگا۔

4۔ ... میں کورس کے لئے انٹرنس امتحان میں کمپی ٹیٹو اوڈیشن / سکرین ٹیسٹ شامل ہیں۔ یہ ٹیسٹ بمبئی، کلکتہ، دہلی اور مدراس میں مئی 1970ء میں منعقد ہوں گے۔ ان ٹیسٹوں کی صحیح تاریخ کی اطلاع اُمیدواروں کو عین وقت پر بھیج دی جائے گی۔

5۔ جو اُمیدوار جداگانہ کورسوں میں خاص رجحان رکھتے ہیں اور اس کے لئے اطمینان بخش ثبوت پیش کر سکتے ہیں اُن پر خصوصی لحاظ سے غور کیا جائے گا۔ مرکزی حکومت، گورنمنٹ آف آندھرا پردیش، آسام، بہار، گجرات، کیرالا، مہاراشٹر، میسور، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، پنجاب، ویسٹ بنگال اور تامل ناڈو، سنگمتا ناٹکا سنگم اور یونین ٹریٹری آف پانڈیچری نے مستحق طلبا کو ایوارڈ کرنے کے لئے کافی تعداد میں وظائف جاری کئے ہیں۔ ایکٹنگ کورسز میں زائد وظائف ہیں۔ جن کے نام ہیں ہندوستان لیور سکالرشپ برائے گرل سٹوڈنٹ -/250 روپے ماہوار اور گرو دت میموریل سکالرشپ -/150 روپے ماہوار برائے مستحق طالب علم ترجیحاً گرل سٹوڈنٹ۔ انسٹی چیوٹ ہذا کی جانب سے لڑکوں اور لڑکیوں کے واسطے الگ الگ ہوسٹل قائم کئے گئے ہیں۔

6۔ پراسپکٹس بشمولہ درخواست فارم، تفصیلات متعلقہ کورسز، انٹرنس امتحان، سکالرشپ (وظائف) جو دستیاب ہیں وغیرہ وغیرہ پرنسپل، فلم انسٹی چیوٹ آف انڈیا، پونا سے تحریری درخواست دے کر اس کے ساتھ کراسڈ پوسٹل آرڈر برائے ایک روپیہ قابلِ ادائیگی پرنسپل فلم انسٹی چیوٹ آف انڈیا پونا نمبر 4 ایک لفافہ سائز 25 سینٹی میٹر × 18 سینٹی میٹر (7" × 10") پر اُمیدوار کا پورا پتہ درج کرکے اور اس پر ڈاک ٹکٹ مالیتی 45 پیسے چسپاں کرکے بھیج کر حاصل کرسکتے ہیں۔ جن درخواستوں کے ہمراہ پوسٹل آرڈر مالیتی ایک روپیہ اور لفافہ جس پر اُمیدوار کا پتہ درج ہو شامل نہیں ہوں گے اُن کی تعمیل نہیں ہوسکے گی۔ روپیہ بصورت نقد، بذریعہ منی آرڈر یا چیک قبول نہیں کیا جائے گا۔

داخلہ کے لئے ہر پہلو سے مکمل درخواستیں انسٹی چیوٹ ہذا میں مورخہ یکم اپریل 1970ء تک پہنچ جانی چاہئیں۔ درخواستوں کے ہمراہ -/5 روپے کا کراسڈ پوسٹل آرڈر جو پراسپکٹس میں درج ہے بھی شامل ہونا چاہیئے۔

DAVP 571(42) 69

# فردوسِ گوش

تقی حسین خسرو

بگر (اکلپا) اے۔ پی رائزنگ بورڈ، مکرم جاہی روڈ۔ حیدر آباد (اے پی)

قبلہ محترم جناب خوشتر گرامی صاحب! تسلیم

فیض نے کبھی کہا تھا "کوشش کتنی ہی حقیر سہی فرار سے بہتر ہوتی ہے" زیر نظر افسانہ "فردوسِ گوش" ایک ایسی ہی کوشش ہے۔ اگر آپ نے اس افسانہ کو "بیسویں صدی" کے قابل سمجھا تو وہ میری اس حقیر کوشش کا انعام ہوگا ـــــ "انتساب" کی قبولیت پر تہہ دل سے ممنون ہوں ـــــ زیر نظر افسانہ کے متعلق آپ کے فیصلے کا منتظر رہوں گا . . .

عقیدت مند ـــــ تقی حسین خسرو

راشد کے مکان کے پاس ہی ریلوے اسٹیشن تھا۔ صبح شام اس کے مکان کے در و دیوار آنے جانے والی ریل گاڑیوں کی آواز سے گونجتے رہتے۔ جب کوئی مال گاڑی گزرتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کے مکان کی بنیادیں تک ہل رہی ہوں۔ وہ ریل گاڑیوں کی اس مسلسل گڑگڑاہٹ سے کبھی اُکتا سا جاتا اور اُس وقت اُس کا جی چاہتا وہ اپنے مکان کو اٹھا کر کہیں دُور لے جائے، ایسی جگہ جہاں ریلوے اسٹیشن پاس نہ ہو۔ وہ اُس وقت سوچنے لگتا وہ وقت کب آئے گا جب ہمارے ملک میں بھی یورپ اور امریکہ جیسے چلتے پھرتے مکان بننے لگیں گے۔

لیکن ریلوے اسٹیشن مکان کے پاس ہی ہونے سے اُسے ایک سہولت ضرور حاصل تھی اور اُس سہولت کا حاصل رہنا اُس کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھنے لگا تھا۔

اپنے ہی جیسے لاکھوں مظلوم انسانوں کی طرح اُس کی زندگی بھی گھر اور دفتر میں قید سی ہو کر رہ گئی تھی لیکن اُس کی قید کا دفتر میں گزرنے والا حصّہ اُس پر نسبتاً زیادہ اثر انداز تھا۔ وہ گھر میں رہ کر بھی دفتر کے فائلوں کو نہ بھول سکتا تھا۔ دفتر کے موٹے موٹے فائل اُس کے ذہن پر، اُس کے اعصاب پر بری طرح سوار رہتے۔ رات خواب میں بھی اُسے فائل ہی فائل نظر آتے کبھی کبھی تو وہ ایسا محسوس کرتا جیسے نہ وہ دفتر جاتا ہے اور نہ دفتر سے واپس ہی آتا ہے۔ بس جیسے دفتر ہی میں رہتا ہے۔ وہ اِس چکّر کو توڑنا چاہتا تھا۔ اُس کے سامنے اپنے اُن ساتھیوں کی مثال موجود تھی جو وظیفہ پا لینے کے بعد بھی دفتر کے چکّر کاٹتے تھے جنھیں کوئی اپنے پاس بٹھانے سے بھی گریز کرتا تھا۔ جنھیں ماحول نے تو جھٹک دیا تھا لیکن جو ماحول کے دامن سے زبردستی چمٹے ہوئے تھے۔ وہ مستقبل میں اپنے آپ کو اُن کی جگہ دیکھ کر کانپ سا جاتا۔ اُس کے لئے یہ خیال بھی تکلیف دہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو اُس ماحول پر مسلّط کرنے کی کوشش کرے جس میں اُس کے لئے جگہ نہ رہی ہو۔ اُسے اپنے اُن ساتھیوں کو دیکھ کر وہ پنچھی یاد آجاتا جسے مسلسل قید رہنے سے پنجرے سے محبت سی ہو جاتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ پنچھی اپنی طاقتِ پرواز کھو بیٹھتا ہے۔ پنجرے کا پٹ کھول دیا جاتا ہے لیکن وہ پنجرے کو چھوڑ کر اُڑ نہیں پاتا۔ راشد اپنی طاقتِ پرواز کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا تاکہ جب اُس کے پنجرے کا پٹ کھلے تو وہ اُڑتا ہوا آسمان کی بے کراں وسعتوں میں گم ہو جائے۔

وہ کبھی کبھی دفتر کے وقت پر، دفتر جانے کی بجائے ریلوے اسٹیشن چلا جاتا۔ اِس طرح وہ اپنی دانست میں اپنے معمول کو توڑ دیتا تھا۔ زندگی کے اُس بے رحم مشینی چکّر کو اُلٹا گھما دیتا تھا جس کی ہر گردش اُسے اپنے مجبور اور بے بس ہونے کا احساس دلاتی تھی۔ وہ کسی انجانے اسٹیشن کا ٹکٹ خرید کر ریل گاڑی میں بیٹھ جاتا اور پھر وہاں پہنچ کر اسٹیشن کے ساتھ آباد گاؤں میں گھومتا، کنوئیں کا میٹھا اور

[illegible] کسی کھیت کے کنارے بیٹھ کر اس میں کام کرنے والوں کے انہماک [illegible] سے دیکھتا، کسی گھنیری چھاؤں والے بڑے پیڑ سے لگ کر [illegible] اور غزلیں گاتا اور گاؤں کی کسی سانولی کو گھونگھٹ کاڑھے ہوئے دیکھ کر سوچتا اگر اس سانولی نے گھونگھٹ کھول دیا تو کیا ہوگا؟ شاید وہ جادو ٹوٹ ہی جائے گا جس کی آس، بقولِ فیض، آسمان لگائے بیٹھا ہے ؎

آسماں آس لئے ہے کہ وہ جادو ٹوٹے

چپ کی زنجیر کٹے، وقت کا دامن چھوٹے

دے کوئی سنکھ دہائی، کوئی پائل بولے

کوئی بُت جاگے، کوئی سانولی گھونگھٹ کھولے

اور پھر وہ اُس اسٹیشن سے ملنے والی سب سے آخری گاڑی سے

---

- سو بیوقوف مل کر ایک عقلمند نہیں بن سکتے! (عربی ادب)
- عورت کا وجود اِس بات کی دلیل ہے کہ خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ (ہندی ادب)
- دانشمند کی ایک بات بیوقوفوں کی بہت سی باتوں سے بہتر ہوتی ہے۔ (انگریزی ادب)
- اُستاد کی سختی باپ کی مہر و اُلفت سے بہتر ہے۔ (فارسی ادب)
- انسان کی سب سے بڑی قوت قوتِ ارادی ہے۔ (اُردو ادب)
- جو مفسد ہیں اُن کے ساتھ سخاوت گناہ ہے۔ (فارسی ادب)
- ایک پرہیز بہت سے علاجوں سے بہتر ہے۔ (محوِ شترگرامی)

---

لوٹ آتا۔

آج راشد نے دفتر جانے کی بجائے ریلوے اسٹیشن پہنچ کر جس اسٹیشن کا ٹکٹ خریدا تھا اُس کا نام جلال پور تھا۔ وہ اِس سے پہلے کبھی جلال پور نہ گیا تھا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد وہ جلال پور پہنچ گیا۔ اُس اسٹیشن پر اُس کے سوا کوئی اور نہ اُترا تھا۔ عجیب ویران سا اسٹیشن تھا وہ! سفید بے داغ وردی میں ملبوس پاس ہی کھڑے اسٹیشن ماسٹر نے، جو صورت ہی سے خوش اخلاق معلوم ہوتا تھا، اُس سے پوچھا: آپ شاید پہلی بار یہاں آئے ہیں؟ وہ جواب میں صرف 'جی ہاں' کہہ سکا۔ اُس پر اسٹیشن کا ویرانہ پن جیسے چھا کر رہ گیا تھا۔ پھر اسٹیشن ماسٹر ہی نے پہل کی تھی۔ 'آپ شاید آثارِ قدیمہ کی کھدائی کے سلسلے میں آئے ہیں۔ ابھی آپ کو دس میل اور آگے جانا پڑے گا، اُس طرف'، اسٹیشن ماسٹر نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا تھا۔

'پچھلے چھ مہینے سے کھدائی ہو رہی ہے لیکن ابھی تک کوئی اہم [illegible] برآمد نہیں ہوئے۔'

راشد اب سنبھل گیا تھا: 'جی نہیں مجھے گاؤں جانا ہے۔'

'گاؤں!' اسٹیشن ماسٹر نے حیرت سے پوچھا: 'آپ کو شاید معلوم نہیں کہ گاؤں کو غیر آباد ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں۔ اب گاؤں میں کوئی نہیں رہتا کیونکہ یہاں بہت سخت قحط پڑا تھا۔ کئی سال تک بارش نہیں ہوئی تھی اور لوگ گاؤں چھوڑ کر چلے گئے۔'

یہ کہہ کر اسٹیشن ماسٹر نے اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر اُس نے راشد سے کہا۔

'آئیے بیٹھ کر کچھ باتیں کریں۔ بھلے آدمیوں کی صورت کے لئے بھی ترس گیا ہوں۔ میں نے کئی بار لکھ بھیجا ہے کہ یہاں اسٹیشن کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن کون سنتا ہے۔'

راشد اسٹیشن ماسٹر کے ساتھ اُس کے آفس میں آ کر بیٹھ گیا۔ اُس کا سارا پروگرام اَپ سیٹ ہو گیا تھا۔ وہ سب سے پہلی گاڑی سے واپس ہو جانا چاہتا تھا۔ لیکن جب اُسے اسٹیشن ماسٹر نے بتایا کہ واپسی کے لئے پہلی اور آخری گاڑی شام کو چھ بج کر ۵ منٹ پر ہے تو اُس نے اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دیا۔ اُس کی گھڑی میں اُس وقت دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اِس طرح اُسے پہاڑ جیسے سات گھنٹے اِس ویران اسٹیشن پر گزارنے تھے۔ وہ کرسی پر تھوڑا سا آگے کی طرف کھسک کر بیٹھ گیا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اسٹیشن ماسٹر کو پیش کیا۔ اپنے لئے بھی ایک سگریٹ نکالا اور اپنے اور اسٹیشن ماسٹر کے سگریٹ جلائے۔ دونوں خاموشی سے سگریٹ پیتے رہے۔ پھر اسٹیشن ماسٹر ہی نے پہل کی تھی۔

'میرا نام پرکاش ہے۔ حیدر آباد میں نام پلی میں رہتا ہوں۔ اِس اسٹیشن پر ایک سال سے کام کر رہا ہوں۔ وہ تو خیر ہوئی کہ مجھے شروع ہی سے مطالعہ کا شوق ہے۔ ورنہ میں اِس اسٹیشن کے ویرانے پن سے کبھی کا اُکتا جاتا۔'

اب راشد کی باری تھی۔ اُس نے بھی اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ اُس کے جلال پور آنے کی وجہ محض ماحول کی تبدیلی ہے۔ شہر کی ہاؤ ہو سے دور گاؤں کی حیات پرور فضا میں چند گھنٹے سانس لے کر وہ تازہ دم ہو جاتا ہے۔ اِتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ پرکاش نے سامنے ہی میز پر رکھے ہوئے ٹیلیفون کا ریسیور اُٹھا لیا۔ وہ بہت دیر تک کسی سے باتیں کرتا رہا۔ ایک کاغذ پر کچھ نوٹ بھی کرتا جاتا تھا اور راشد بیٹھا منہ پھاڑ پھاڑ کر جمائیاں لیتا رہا اور سوچتا رہا

پرکاش کتنا شریف آدمی ہے۔ اگر پرکاش کی بجائے کوئی غیر شریف آدمی یہاں کا اسٹیشن ماسٹر ہوتا تو وہ اس ویران اسٹیشن پر ٹھہر کر واپسی کے لئے گاڑی کا انتظار کرنے پر یہاں سے کہیں دور لگانے کو ترجیح دیتا! پھر وہ سوچنے لگا اس غیر آباد گاؤں کا نام جلال پور کیسے پڑگیا ہوگا؟ ہوسکتا ہے پرکاش کو اس کی وجہ تسمیہ معلوم ہو۔ پرکاش کے ٹیلیفون پر گفتگو ختم کرتے ہی راشد نے اُس سے پوچھا۔

"مسٹر پرکاش کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس غیر آباد گاؤں کا نام جلال پور کیسے پڑگیا۔ میرا مطلب ہے اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟"

راشد نے محسوس کیا کہ اس کے اس سوال پر پرکاش نے کسی قدر گرمجوشی کا اظہار کیا تھا۔ اس نے کہا۔

"بہت اچھی بات پوچھی مسٹر راشد آپ نے۔ اس اسٹیشن پر ایک بہت بوڑھا خلاصی کام کرتا ہے۔ وہ کبھی اسی غیر آباد گاؤں میں رہتا تھا۔ اس نے اس تعلق سے مجھے ایک۔ بہت ہی دلچسپ کہانی سنائی تھی۔ اُسے کہانی نہیں واقعہ کہنا چاہیئے۔ میں نے اس بوڑھے خلاصی سے اس واقعے کو کئی بار سُنا تھا۔ اس واقعے میں جس لڑکی کا ذکر ہے میں اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔"

پرکاش کے ایسا کہنے سے راشد میں اس واقعے سے شدید دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس نے کہا۔

"مسٹر پرکاش! وہ واقعہ آپ کو یقیناً یاد ہوگا۔ اب آپ وہ واقعہ مہربانی کر کے مجھے بھی سُنایئے۔"

پرکاش نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا اور پھر کہنے لگا۔

"اس بوڑھے خلاصی نے بتایا تھا کہ اس وقت یہ علاقہ ایک بہت بڑی جاگیر میں شامل تھا۔ جاگیردار کو شہر کی بھیڑ بھاڑ سے نفرت تھی۔ اُس نے اپنی ساری جاگیر میں اپنے رہنے کے لئے اسی مقام کو پسند کیا اور یہاں ایک عالیشان مکان بنا کر رہنے لگا۔ جاگیردار کی دیکھا دیکھی اُس کی رعیت نے بھی اس کے مکان کے ارد گرد اپنے چھوٹے چھوٹے مکان بنائے، جھونپڑیاں ڈالیں۔ اس طرح یہاں گاؤں کی ابتدا ہوئی۔ اس وقت گاؤں کا نام جاگیردار پیٹ پڑگیا تھا۔

شمزہ جاگیردار کی اکلوتی بیٹی تھی۔"

"شمزہ! کتنا خوبصورت نام ہے! ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس میں شامل حروف کی آوازوں میں کسی نے رنگ گھول دیا ہو!"

راشد کی زبان سے غیر اختیاری طور پر یہ نکل گیا۔ پرکاش نے کہا۔

"جی ہاں آپ نے بہت صحیح تعریف کی۔ مجھے بھی یہ نام بہت پسند ہے۔"

پھر پرکاش کہنے لگا۔

"شمزہ جاگیردار کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا قرار تھی۔ وہ جلال کو بھی بہت عزیز رکھتا تھا۔ جلال اس کے بھائی کا لڑکا تھا۔ بھائی اور بھابی طاعون کا شکار ہو چکے تھے۔ شمزہ اور جلال ہم عمر تھے۔ شمزہ بہت ہی خوبصورت اور حسین لڑکی تھی اور جلال اُلجھے اُلجھے بالوں والا ایک جفاکش نوجوان۔ شمزہ کی آنکھیں خصوصیت سے بہت ہی خوبصورت تھیں، بڑی بڑی کھوئی کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں، لیکن ان آنکھوں میں روشنی نہ تھی۔ شمزہ جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی تھی، اس کی آنکھوں کی روشنی کم ہوتی گئی تھی۔ جب وہ پندرہ سال کی ہوئی تو وہ روشنی پوری طرح بجھ چکی تھی۔ جاگیردار نے زمین اور آسمان کو

---

- ادھورا علم خطرے کا موجب ہوتا ہے۔ علم کے چشمہ کا پانی سیر ہو کر پیو یا پھر اُس سے الگ ہی رہو چند گھونٹ پینے سے انسان مدہوش ہو جاتا ہے۔ سیر ہو کر پینے سے دل و دماغ روشن ہو جاتے ہیں۔ (پوپ الگزانڈر)
- زمین کے ٹکڑے پر حکومت کرنے والے سے وہ کہیں بلند ہے جو دلوں پر حکومت کرتا ہے۔ (حضرت سلیمانؑ)
- جس راز کو تم دشمن سے چُھپانا چاہتے ہو اُسے دوست سے بھی چُھپاؤ۔ (فیثاغورث)
- انسان کے کمال کا معیار یہ ہے کہ تعریف و توصیف سے مسرور اور ملامت سے مغموم نہ ہو۔ (سقراط)

---

ایک کر دیا تھا۔ ہزاروں روپے خرچ کر ڈالے تھے۔ لیکن شمزہ کی آنکھوں کو روشنی سے محروم ہونا تھا اور وہ روشنی سے محروم ہو چکی تھیں۔ جتنی خوبصورت شمزہ تھی اتنا ہی خوبصورت اُس کا دل بھی تھا۔ اس نے کبھی آنکھوں کی روشنی سے محروم ہونے کا شکوہ نہ کیا۔ وہ بے حد حساس اور خود دار لڑکی تھی۔ اُسے یہ بھی پسند نہ تھا کہ وہ چلنے میں لاٹھی کا سہارا لے۔ انہی دنوں ایک دن جلال اپنے ہوش کھو بیٹھا۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ اس کے پاگل پن کی وجہ کیا ہے۔ بس ایک دن وہ سو کر اُٹھا تو اپنے ہوش کھو چکا تھا۔ وہ دن رات اپنے کمرے میں بند پڑا رہتا تھا۔

جاگیردار کو موسیقی سے دلچسپی تھی۔ گھر میں بہت سے ساز موجود تھے۔ شمزہ اپنے شب و روز کی گرانباری کو ہلکا کرنے کے لئے ستار کے تاروں کو چھیڑنے لگی۔ اس نے کبھی ستار بجانا نہیں سیکھا تھا لیکن اس کی انگلیوں میں جیسے

سر چھپے بیٹھے تھے۔ جیسے ستار اس کے خوبصورت ہاتھوں کی خوبصورت انگلیوں ہی کے لئے ایجاد ہوا تھا۔ وہ جب ستار بجاتی تو چلتے قدم رُک جاتے، روتے بچے ہنس جاتے اور پاگل جلال کو ہوش آجاتا۔ شمزہ کے ستار کی جھنکار جلال کے حق میں مسیحا کا کام کرنے لگی۔ اس کے ستار کی جھنکار جب تک جلال کے کانوں میں گونجتی رہتی، وہ ہوش میں رہتا۔ شمزہ کو جیسے اس کا ستار سننے والا مل گیا تھا۔ وہ جلال کو ہوش میں رکھنے کے لئے مسلسل ستار بجاتی۔ اس کی زخمی انگلیاں بھی اُسے ستار بجانے سے باز نہ رکھ سکتی تھیں۔ شمزہ کی فگار انگلیاں ستار کے تاروں پر دوڑتیں تو جلال کے ذہن کے تاریک گوشے روشن ہو جاتے۔ شمزہ کی فگار انگلیوں سے خون کی بوندیں زمین پر گرتیں تو جلال اُن بوندوں کو اپنی پلکوں سے اُٹھاتا۔ اِس طرح شمزہ کی تاریک دُنیا کو روشنی اور جلال کی بے کیف زندگی کو رنگ مل گیا تھا۔

پرکاش یہاں تک پہنچ کر رُک گیا کیونکہ اسی وقت اسٹیشن پر کام کرنے والا ایک آدمی ایک کشتی میں چائے کے دو بڑے بڑے پیالے اور بسکٹوں کی پلیٹ لئے داخل ہوا۔ راشد کو اُس کا آنا بہت گراں گزرا تھا۔ وہ اِس واقعہ میں ڈوب گیا تھا۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ بس وہ جیسے اپنے آپ کو سمیٹے ہوئے ہمہ تن گوش بنا بیٹھا تھا۔ بیٹھا رہا اور سوچتا رہا یہ اسٹیشن ماسٹر پرکاش بھی کمال کا آدمی ہے کتنے خوبصورت الفاظ میں واقعہ سنا رہا ہے۔ کرداروں میں کیا [illegible] رنگ بھرے ہیں اس نے۔ یقیناً یہ سب کچھ پرکاش ہی کا کمال ہے ورنہ [illegible] نے سب کچھ کتنے بھونڈے الفاظ میں کہا ہوگا۔ وہ آدمی چائے کے پیالے اور بسکٹوں کی پلیٹ میز پر رکھ کر چلا گیا۔ دونوں نے خاموشی سے بسکٹ کھائے اور چائے پی۔ راشد نے اپنے اور پرکاش کے سگریٹ سلگائے۔ پرکاش سگریٹ کے گہرے گہرے کشوں کے درمیان کہنے لگا۔

شمزہ پر فطرت کو آخر رحم آ ہی گیا۔ ایک دن اچانک اُسے اُس کی آنکھوں کی روشنی واپس مل گئی۔ اُس کی بے نور دُنیا پُر نور ہو گئی۔ وہ پھر فطرت کے سب سے زیادہ قابلِ قدر انعام سے مالامال ہو گئی۔ لیکن جلال پھر پاگل ہو گیا۔ شمزہ کو آنکھوں کی روشنی ملی تو اُس کی انگلیوں سے سُر چھن گئے۔ وہ ستار بجانا تو دُور اُس کے تاروں کو چھیڑنا بھی بھول گئی۔ جلال پھر اپنی اُس بے کیف دُنیا میں واپس چلا گیا۔ شمزہ کو فطرت نے آنکھوں کی روشنی تو واپس دے دی تھی لیکن اُس سے اُس کے جلال کو چھین لیا تھا! لیکن شمزہ جلال کو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اُسے اپنی بینائی سے زیادہ جلال کی ہوشمندی پیاری تھی۔ اُس نے دُعا کی۔ اُس نے

کچھ اتنے خلوص سے دعا کی کہ اُس کی دعا قبول ہو گئی۔ وہ پھر نابینا ہو گئی۔ اُس کی آنکھیوں کے کھوئے ہوئے سُر واپس آگئے اور اُسے اُس کا جلال پھر مل گیا۔"

یہاں پرکاش نے تھوڑا سا توقف کر کے کہا۔

"بوڑھے خلاصی نے بتایا تھا کہ جلال نے شمزہ سے زیادہ عُمر پائی۔ وہ شمزہ کے بعد بھی کئی برس زندہ رہا۔ لیکن اُس نے اپنی باقی زندگی شمزہ کی قبر پر گزار دی۔ اُن دنوں جلال کی کافی شہرت ہو گئی تھی۔ گاؤں والے اُسے برگزیدہ اور مجذوب سمجھنے لگے تھے۔ آس پاس کے گاؤں سے لوگ اُس کے دیدار کے لئے آنے لگے تھے۔ اُس کی شہرت اِتنی زیادہ بڑھ گئی کہ اُس کے نام پر گاؤں کا نام پڑ گیا۔ لوگ گاؤں کو جاگیردار پیٹ کی بجائے جلال پور کہنے لگے۔ ایک صبح جلال شمزہ کی قبر پر مُردہ پایا گیا اور گاؤں والوں نے اُسے بہت عقیدت اور احترام کے ساتھ شمزہ کی قبر کے پہلو ہی میں دفن کر دیا۔"

راشد نے محسوس کیا کہ پرکاش اُسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ اپنے سُنائے ہوئے واقعے پر اُس کے ردِ عمل کو جاننا چاہتا ہو۔ پھر اُس نے اسٹیشن کے پیچھے کی طرف کھلنے والی ایک بڑی کھڑکی سے باہر کی طرف اِشارہ کیا۔

"وہ دیکھئے دُور وہ جو بہت بڑا گھنا جھاڑ نظر آ رہا ہے، اُسی جھاڑ کے نیچے شمزہ اور جلال کی قبریں ہیں۔"

راشد نے گھڑی دیکھی۔ ڈھائی بج رہے تھے۔ گاڑی کے لئے ابھی بہت وقت تھا۔ اُس نے پرکاش سے اجازت لے کر اُس بڑے اور گھنے جھاڑ کا رُخ کیا۔ جس کے نیچے پرکاش نے بتایا تھا کہ شمزہ اور جلال کی قبریں ہیں۔ وہ اُن محبتوں کے مزاروں کی زیارت کرنا چاہتا تھا۔ اُس جھاڑ کے نیچے صرف دو ہی قبریں تھیں۔ قبریں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ اُس نے جیب سے رُومال نِکال کر قبروں سے خشک پتے اور گرد صاف کی اور پھر وہ اُس گھنے پیڑ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اُسے عجیب سکون مل رہا تھا وہاں! اُس پیڑ کی چھاؤں میں عجیب لافانی کیفیت تھی! جیسے وقت کے ہمیشہ چلنے والے قدم وہاں پہنچ کر رُک گئے ہوں۔ تھوڑی ہی دیر میں اُس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ پھر راشد نے کہیں دُور سِتار کے تاروں کی جھنکار سُنی اور پھر وہ جھنکار آہستہ آہستہ واضح ہوتی گئی اور اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کوئی اُس کے پاس ہی بیٹھا سِتار بجا رہا ہو۔ راشد نے بڑے بڑے اُستادوں کو سِتار بجاتے سُنا تھا۔ لیکن اِتنا خوبصورت سِتار اُس نے کبھی نہ سُنا تھا۔ وہ کوئی جادوانی راگ تھا۔ راشد کا وجود اُس کے آتار چڑھاؤ میں ڈُوب کر رہ گیا تھا۔ ایک عجیب لُطف آ رہا تھا اُسے۔ سِتار کی آواز اُس کے لئے 'فردوسِ گوش' بنی ہوئی تھی۔ نہیں معلوم وہ کب تک اُس پیڑ سے ٹیک لگائے بیٹھا اِس 'فردوسِ گوش' نغمے کو سُنتا رہا تب کسی نے اُسے جھنجھوڑا تھا۔ وہ اسٹیشن پر کام کرنے والا آدمی تھا۔ اُس نے راشد سے کہا "آپ کو اسٹیشن ماسٹر نے بُلایا ہے۔ گاڑی کا وقت قریب ہے۔" راشد اُس آدمی کے ساتھ تیزی سے اسٹیشن پہنچا۔ گاڑی آ چکی تھی اور اب نِکلا ہی چاہتی تھی۔ راشد نے پرکاش سے رخصتی مصافحہ کیا اور کہا۔

"شہر آیئے تو مجھ سے مِلنا نہ بھولئے۔ ویسے میں یہاں پھر آؤں گا۔ شمزہ کا سِتار سُننے کے لئے۔ شمزہ جس کے سِتار کی آواز فردوسِ گوش ہے!"

وہ پرکاش کو حیرت زدہ ہی چھوڑ کر، لپک کر رینگتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گیا!!

# غزلیں

## عشرت ذکی ثروت نہٹوری

زندگی جب غم و آلام سے گھبرائی ہے
تری یادوں کی دھنک سوں میں چلی آئی ہے

مجھ کو گلشن کی تباہی کا خیال آیا ہے
برق آ آ کے نشیمن پہ جو لہرائی ہے

ہم سے کیا کچھ نہ کہا آپ کی خاموشی نے
کیوں یہ تکلیفِ سخن آپ نے فرمائی ہے

لاکھ ارمانوں نے تاریکی میں دم توڑا ہے
بجھ گئے کتنے دیے جب یہ سحر آئی ہے

اب تو دل بزمِ چراغاں میں بہلتا ہی نہیں
بات کیا غم کے اندھیروں میں نظر آئی ہے

## سیدہ زہرہ دیولالوی

ہو جن میں نورِ عمل مطلعِ سحر کی طرح
وہ حوصلے بھی تو ہوتے ہیں راہبر کی طرح

جنہیں ذرا بھی ہو احساس آبلہ پائی
ہمارے ساتھ نہ آئیں وہ ہم سفر کی طرح

ہر ایک سمت ہے اک خوفناک سناٹا
ہر اک نظر میں اداسی ہے میرے گھر کی طرح

لہو میں جن کے حرارت رہی، نہ جوشِ عمل
پڑے ہیں راہ میں وہ سنگِ رہ گزر کی طرح

نہ جانے کون سے سجدے کی آرزو لے کر
خموش بیٹھے ہیں ہم آج سنگِ در کی طرح

ترے لبوں پہ ہے چپ سی لگی ہوئی زہرہ
تری نظر بھی ہے اجڑے ہوئے نگر کی طرح

## محبوب عالم

حسن کی توہین کر جاتے ہیں لوگ
عشق میں حد سے گزر جاتے ہیں لوگ

میں نے دانستہ بدل دی اپنی
دیکھتا ہوں اب کدھر جاتے ہیں

زندگی ہے یا کوئی آسیب ہے
اپنے سائے سے بھی ڈر جاتے ہیں لوگ

پیار جیسی سیدھی سادی بات
کیسے کیسے رنگ بھر جاتے ہیں

میں نہیں تقلید کا راہی اسیر
کیوں ادھر جاؤں جدھر جاتے ہیں لوگ

---

## کوثر سیوانی

ہر گوشۂ حیات کو پُر نور کر گئی
پرچھائیں کس کی تھی کہ جو دل سے گزر گئی

سینے میں انتقام کا جذبہ پگھل گیا
جب آنکھ ان کی اشکِ ندامت سے بھر گئی

اس نے نظر اٹھا کے جھکا لی نہ ہو کہیں
یہ کیا ہوا کہ گردشِ دوراں ٹھہر گئی

کوثر وہ مجھ سے اور بھی رہنے لگے خفا
دنیا میں جب سے ان کے ستم کی خبر گئی

# دِلّی کا خط لندن کے نام

خوشتر گرامی

مائی ڈیر لندن!

حکیم الامت علامہ ڈاکٹر اقبال کے یہ الفاظ سونے کے حروف میں لکھنے کے قابل ہیں اور برسوں بعد بھی ان کی تازگی اور معنویت میں فرق نہیں آیا۔ فرماتے ہیں ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی میں سوزِ دروں

اور اس کا وجود اب تو کائنات کی رنگا رنگی میں روز بروز اضافہ کر رہا ہے —— سماجی اور سیاسی زندگی میں عورت کی اہمیت تو اب بہت بڑھ گئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ اخباروں کی سرخیوں کی تخلیق کا سامان فراہم کرتی رہتی ہے اور میرے اور آپ کے یہاں تو "عورت ذات" کے درمیان مقابلہ آرائی کی سی صورت نظر آتی ہے۔

آپ کے یہاں عورت آئینی سربراہِ مملکت تھی۔ میرے یہاں بھی سربراہِ حکومت ہیں —— اگرچہ پارلیمانی نظام کے معاملے میں میں آپ کی نقال ہوں۔ لیکن اس نظام میں عورت میرے یہاں قابلِ رشک طور پر پھولی پھلی ہے۔ یہاں عورت دفتر کی رونق، اسٹینوگرافر، سیلز مین، استانی یا نرس ہی نہیں ہے بلکہ لیجسلیچروں میں بھی اسے نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ صوبائی وزارتوں، سفارتوں اور گورنری پر عورتیں فائز رہ چکی ہیں —— ہاں خوب یاد آیا۔ میری ایک بیٹی ہماری موجودہ وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی پھوپی تو مجلسِ اقوامِ متحدہ کی صدارت بھی فرما چکی ہیں۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ آج تو میرا ارادہ سیاست میں گھسنے کا نہیں تھا۔ میں تو ایک دوسری قسم کے کمپٹیشن کا ذکر کرنا چاہتی تھی جو بغیر کسی اعلان کے چل رہا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے اتفاقاتِ زمانہ سمجھوں یا پھر وہ مقابلہ جو بغیر اعلان کے ہو رہا ہے۔ آج صبح میں نے اخبارات میں یہ خبر پڑھی کہ سنگاپور کی ایک طالبہ نے آپ کے یہاں دس پونڈ کی مالیت کے کچھ کپڑے ایک دوکان سے پار کئے۔

لیکن جب اس کمسن حسین چور کو عدالت میں پیش کیا گیا تو اس نے مجسٹریٹ کو بتایا کہ یہ چوری نہیں بلکہ محض ایک تجربہ تھا۔ میں عملاً یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ برطانیہ میں انصاف کس طرح کیا جاتا ہے اور قانون کس طرح حرکت میں آتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ میں حد سے قدرے تجاوز کر گئی۔ مجھے اس کا گمان بھی نہیں تھا کہ میں مجرم بھی بن جاؤں گی اور مجھے اس طرح عدالت کے روبرو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا —— مجھ سے یہ حرکت ضرور سرزد ہوئی ہے گو در حقیقت میرا چوری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

مجسٹریٹ نے سوال کیا کہ "تم نے اس عملی تجربہ میں کیا حاصل کیا؟"

لڑکی نے برجستہ جواب دیا "میں نے بہت کچھ سیکھا ہے"

مجسٹریٹ نے اس حسین عذر اور معصومانہ انداز کو تسلیم کر لیا اور اسے مشروط رہائی دے دی —— یعنی اس اعترافِ جرم کے بعد وہ پھر چوری نہ کرے تو معاف سمجھا جائے۔

اسی شام کو اتفاق سے ریڈیو کا سوئچ گھماتی ہوں تو معلوم ہوا —— بھارت کی بیٹیاں بھی پیچھے نہیں ہیں۔ ریڈیو پولیس سے ملنے والی خبریں سنا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ —— قرول باغ میں تین عورتیں ساڑیوں کی ایک دوکان پر پہنچیں اور بہت دیر تک ساڑیاں دیکھتی رہیں اور آخر کچھ خرید کئے بغیر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد جب دوکاندار نے ساڑیاں تہہ کیں تو یہ راز کھلا کہ —— "خواتینِ محترم" کئی ساڑیاں پار کر گئی ہیں —— اور مزے کی بات یہ ہے کہ انہوں نے تادمِ تحریر عدالت میں جلوہ افروز ہو کر اقبالِ جرم نہیں کیا اور کسی تجربہ کا اعتراف بھی نہیں کیا۔

آپ کے یہاں کے اس حسین جرم پر مجھے اپنے یہاں کی ایک حسین سزا کا واقعہ یاد آ گیا ہے۔ آپ کے ہاں عدالت نے کمسن حسین ملزمہ کو مشروط طور پر چھوڑ دیا تھا مگر یہاں ایک حسین ملزمہ نے قانون کے محافظ کو سزا دینے کا فرض خود انجام دے ڈالا ہے۔ بمبئی میں پچھلے دنوں ایک کانسٹبل کو ہسپتال میں داخل کرا

اس کے چہرے پر کاٹنے کا زخم تھا۔ سانپ یا بچھو کے کاٹنے کا زخم نہیں۔ سانپ اور بچھو کے کاٹنے کا تو پھر بھی منتر مل جاتا ہے۔ یہ ایسی ناگن نے کاٹا تھا جس کا کوئی منتر اور کوئی اُتار نہیں ——— شاید زندگی بھر یہ داغ بے چارے کانسٹبل کے سر پر چڑھ کر بولتا رہے۔

یہ جنسِ لطیف کا کارنامہ ہے جس نے اس سپاہی کو داغ دار بنا دیا۔ یہ بے چارہ سپاہی اُس پارٹی میں شامل تھا جو پٹریوں پر سامان بیچنے والوں کو اٹھانے گئی تھی۔ جب پولیس والے انھیں پولیس گاڑیوں میں بھرنے لگے تو ایک کیلا فروش عورت نے انتقامی اقدام کیا اور سپاہی کے چہرے پر ایک نازک مہر ثبت کر کے اُسے زندگی بھر کے لئے داغ دار کر دیا۔

شاید علامہ اقبال نے اسی لئے پیشگوئی کی تھی ؎

اِس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش

مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خرد مند

یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اب ذرا جگر تھام کے بیٹھو اور اس سے بھی آگے کی بات سنو اور گنگناتے جاؤ ؏

محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

نئی دلّی کے ایک سنیما ہال کے سامنے پچھلے دنوں سنسنی پھیل گئی۔ جب ایک شخص نے شور مچایا "اس لڑکی کو پکڑنا ——— پکڑنا ——— بھاگنے نہ پائے"

اِس پر اِدھر اُدھر سے لوگوں نے دوڑنا شروع کیا اور کچھ لوگ اُس لڑکی کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے اور اُسے پولیس کے حوالے کیا گیا ——— بعد ازاں اُس شخص نے انکشاف کیا کہ پولیس نے اس لڑکی کو کسی مقدمہ میں گرفتار کیا تھا اور میں نے اس کی ضمانت دی تھی۔ لیکن اب چونکہ یہ عدالت میں حاضر نہیں ہو رہی ہے اِس لئے عدالت نے میرے خلاف کارروائی کے لئے وجہ بتاؤ نوٹس بھیجا ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ لڑکی کو حاضرِ عدالت کرو ورنہ تمھارے خلاف کارروائی کی جائے گی۔

بعد ازاں انکشاف در انکشاف یہ ہوا کہ دِلّی اور نئی دِلّی کی عدالتوں میں ایک درجن سے زیادہ لڑکیوں کے خلاف مقدمات چل رہے ہیں ——— معلوم ہے اُن کا کیا جرم ہے؟

سُننے اِن لیلیٰ کی بہنوں اور شیریں کی خالاؤں پر مردوں کو چھیڑنے کا الزام ہے۔ اِن سوہنیوں کو شارعِ عام پر مردوں کے ساتھ فحش مذاق کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔

اِس خبر کی تصدیق جب ایک منچلے اخبار نویس نے ایک پولیس افسر سے کرنا چاہی تو اُس نے جواب دیا "یہ کلجگ ہے کلجگ" لڑکوں کی طرف سے لڑکیوں کو چھیڑ چھاڑ کی باتیں تو اب داستانِ پارینہ بن گئی ہیں اور انھیں "بازخواہی" کی ضرورت نہیں۔ اب اُلٹی گنگا بہتی ہے۔ لڑکیاں لڑکوں سے اب شارعِ عام پر مذاق کرتی ہوئی پکڑی جاتی ہیں ——— اُس نے پھبتی کسی ؏

نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

یہ پُرانا بلکہ فرسودہ تخیل ہے۔ اب تو اِس میں کچھ اِس طرح ترمیم کر کے پڑھنے کی ضرورت ہے ؏

مردانگیِ مرد کی حافظ ہے فقط زن

آپ کے یہاں عورت اگرچہ اِس میدان میں بہت آگے ہے مگر اِدھر کچھ دنوں سے میں نے ایسی کوئی خبر نہیں سُنی۔

ہاں ——— خوب یاد آیا۔ ایک اور میدان میں آپ کے یہاں کی عورت نے میرے یہاں کی عورتوں کو "ڈفیٹ" دے دی ہے۔ یہاں پچھلے دنوں جمنا نگر میں ایک عورت نے بیک وقت چار بچوں کو جنم دیا تھا۔ لیکن آپ کے یہاں حال ہی میں ایک عورت نے چھ بچے پیدا کئے۔ اِن میں سے ایک بچہ مُردہ تھا۔ ۲۳ سالہ زچہ مسز روزمیری خوش و خرم ہے۔ پانچ زندہ بچوں میں چار لڑکیاں ہیں۔ یہ بچے وقت سے دو ماہ قبل پیدا ہوئے ہیں اور اِن کے لئے آپریشن کرنا پڑا تھا۔

اب فرمایئے ٹھیک ہے نا ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

اسی کے ساز سے ہے زندگی میں سوزِ دروں

اچھا خدا حافظ ——— اب اجازت دیجئے۔

میں ہوں آپ کی

دِلّی

("ایشیا" ویکلی برمنگھم لندن کے شکریہ کے ساتھ)

---

**قاشیں** جناب نریش کمار شادؔ مرحوم کے تازہ کلام کا حسین و جمیل مجموعہ۔ ترمیم و اضافہ کے بعد۔ قیمت صرف چار روپے

**شادؔ اور اُس کی شاعری** جناب شادؔ مرحوم کی مسلسل جدّ وجہد اور کشمکش کی داستان مع مکمل سوانح حیات اور اُن کی شاعری پر تنقید۔ قیمت صرف تین روپے۔ اِن دونوں کتابوں کی سیل کا پُورا منافع مرحوم کی تنگدست بیوہ کو ملے گا۔

رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

# صحت و زندگی

## ۱۔ سنترہ ــــ ایک حیات بخش غذا

سنترہ خوش ذائقہ فرحت بخش پھل ہی نہیں، صحت بخش بلکہ حیات بخش غذا بھی ہے۔ امریکہ کے ایک نامور ڈاکٹر کی رائے ہے کہ سنترے کا عرق دودھ پینے والے بچّوں کے لئے آبِ حیات ہے۔ جدید طبی تحقیقات کی رُو سے سنترے میں ایسے اجزاء پائے جاتے ہیں جو انسانی نشو و نما کے لئے بہت ضروری ہیں۔

سنترے کے رس کا کیمیاوی تجزیہ کرنے پر اس میں شکر کافی مقدار میں پائی گئی ہے۔ معدنی نمکیات خصوصاً کیلسیم (چُونا) اور دوسرے قلوی (الکلائن) جوہر بھی ملتے ہیں۔ سنترے میں تھوڑی مقدار میں اجزائے ملحمہ (پروٹینز) بھی ہیں۔ وٹامنز اے، بی، سی بھی کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ اِن اجزاء کی موجودگی میں سنترے کا رس غذائیت کے اعتبار سے ایسا حیات بخش مشروب ہے جو معدے پر کسی طرح کا دباؤ ڈالے بغیر دوسری غذا سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

بخار کے مریضوں میں جب بدن کا درجۂ حرارت بڑھا ہوتا ہے اور اُس کی وجہ سے معدے کی ہاضم رطوبت کا رِسنا موقوف ہو جاتا ہے اور معدہ میں کسی ٹھوس غذا کے ہضم کرنے کی استعداد باقی نہیں رہتی، سنترے کا رس جسم کو لطیف غذا بہم پہنچاتا ہے اور جسم کے تحلیل شُدہ اجزاء کا بدل بنتا ہے۔

میعادی بخار (ٹائیفائڈ) کے مریضوں کی جب غذا بند کر دی جاتی ہے، اُن کا معدہ کسی بھی غذا کا متحمل نہیں ہو سکتا، اُن کی قوّت برقرار رکھنے کے لئے معالج کو جب کسی ایسی غذا کی تلاش ہوتی ہے جسے مریض شوق سے کھا سکے اور اُس کا معدہ بھی اُس کا خیر مقدم کرے، وہ سنترے کا رس ہے۔

سنترے کا رس بہترین لطیف غذا ہے۔ یہاں تک کہ دودھ جیسی لطیف غذا کے مقابلہ میں بھی یہ بہت ہی لطافت رکھتا ہے۔ دودھ کو ہضم کرنے میں معدہ کو کچھ کام کرنا پڑتا ہے لیکن سنترے کا رس معدے کے لئے کبھی بار نہیں ہوتا۔ نہایت آسانی سے ہضم ہو کر بدن کے تغذیہ میں صرف ہوتا ہے۔

سنترے کے اِنہیں اوصاف و خواص کی بنا پر ماہرینِ حیات سنترے کی غذائی اہمیت و افادیت کے معترف و مدّاح ہیں۔

## ۲۔ صحت کے لئے فولاد کی اہمیت

صحت کی بقا کے لئے خون میں فولاد کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ فولاد خون کو بڑھاتا اور جگر کو تقویت دیتا ہے۔ خون میں فولاد کی کمی ہوتی ہے تو خلیات میں کافی آکسیجن نہیں پہنچ سکتی۔ اِس سے خون کی کمی کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے اور مشہور مرض انیما لاحق ہو جاتا ہے۔ اِس مرض کا مریض تھکا ہوا، سست اور کمزور ہوتا ہے۔ جسم میں قوتِ برداشت نہیں رہتی اور رنگ اُڑ جاتا ہے۔ ذہن کُند ہو جاتا ہے۔ خون کی کمی کے دوسرے اسباب کے علاوہ سب سے اہم سبب غذا میں فولاد کی کمی ہوتا ہے۔ اِن غذاؤں میں فولاد کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔

سبز ترکاریاں، چقندر، پالک، ٹماٹر، گاجر، شلغم، سبز کیلا، بادام، اخروٹ، مونگ پھلی، کھجور خشک، انڈے، کلیجی، آلو بخارا، کشمش، آم، امرود، انجیر، لیموں اور ناشپاتی۔

ایک بالغ مرد کے لئے روزانہ ۱۵ ملی گرام اور بالغ عورت کے لئے تقریباً ۱۷ ملی گرام فولاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ حاملہ عورتوں کو ۲۰ ملی گرام روزانہ فولاد چاہیئے۔

غذا میں جتنا فولاد ہوتا ہے وہ سارا ہی خون میں نہیں مل جاتا۔ اِس کا صرف آدھا حصّہ ہاضمہ کے دوران ہضم ہوتا ہے اور خون میں شامل ہو جاتا ہے۔ اِس لئے خون اور ہڈیوں میں فولاد نہ پہنچے تو غذا میں فولاد کافی مقدار میں موجود ہونے کے باوجود خون کی کمی کی شکایت پیدا ہو سکتی ہے۔ انیما کا مرض لاحق ہو سکتا ہے۔ اِس لئے غذا میں فولاد کی موجودگی اِتنی اہمیت نہیں رکھتی

ہمیشہ اُس کا خون میں جذب ہونا اہمیت رکھتا ہے۔

اینیما (خون کی کمی) دُور کرنے میں بادام کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ مونگ پھلی، اِملی، گاجر، ٹماٹر، پالک وغیرہ کا فولاد بھی خون میں اچھی طرح مل جاتا ہے۔ سویابین میں کافی مقدار میں فولاد ہوتا ہے۔ اُس کا اسّی فی صدی حصہ خون میں مل جاتا ہے۔

کلیجی میں بھی وافر مقدار میں فولاد ہوتا ہے۔ کلیجی میں ساری غذاؤں سے زیادہ خون میں سُرخ ذرّے پیدا کرنے کی خاصیت ہوتی ہے۔

## ۳ • انسان کا بیش قیمت سرمایہ

مال و دولت، زمین و جائداد اور ایوان و محل کو ہم اپنا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ لیکن انسان صحت سے محروم ہو تو اُس کے لئے یہ سب بے معنی ہیں۔ انسان کا اصل سرمایہ، سب سے بیش قیمت سرمایہ صحت ہے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ——— "دُنیا کی بڑی بڑی نعمتیں اُس شخص کے نصیب میں ہیں جس کا جسم توانا، جس کے پھیپھڑے قوی اور جس کی جسمانی قوت بہت زیادہ ہو۔ اُس کے مقابلے میں نہ خاندانی وجاہت ٹھہر سکتی ہے، نہ قابلیت، نہ تعلیم، نہ تربیت۔ ذاتی طاقت اور توانائی کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کر سکتی اور ذاتی طاقت کا انحصار ہے زبردست اور قوی قوتِ حیات پر۔ جو چیز تمھاری تندرستی اور صحت میں اضافہ کر سکے وہی تمھارا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہے!"

## ۴ • ٹماٹر ——— وِٹامنز کا خزانہ

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ٹماٹر خوش ذائقہ پھل بھی ہے اور قوت بخش سبزی بھی۔ ٹماٹر اِتنی مفید سبزی ہے ساتھ ہی اِتنی ارزاں کہ کوئی ترکاری اِس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اِس میں وِٹامن اے، بی، سی کے ساتھ فولاد کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ فولاد انسانی خون کا بہت بڑا جُز ہے۔ خون کو سُرخ اور دماغ کو چست کرتا ہے۔ خون میں فولاد کی کمی ہوتی ہے تو خلیات میں کافی آکسیجن نہیں پہنچ سکتی۔ اینیما سے خون کی کمی کی شکایت ہو جاتی ہے۔ اِس مرض کا مریض تھکا ہوا، سُست اور کمزور رہتا ہے۔ جسم میں قوتِ برداشت نہیں ہوتی، چہرے کا رنگ اُڑ جاتا ہے، ذہن کُند ہو جاتا ہے۔ خون کی کمی کے دوسرے اسباب کے علاوہ اہم ترین سبب غذا میں فولاد کی کمی ہوتا ہے۔

ٹماٹر میں فولاد کے ساتھ معدنی نمکیات اور پروٹین، کاربوہائیڈریٹس، کیلسیم، پوٹاش، چونا اور میگنیشیا کی کافی مقدار رہتی ہے۔ اِس میں سب طرح کے تیزابی رس ہوتے ہیں جو سیب، سنترا اور انگور تینوں میں ملا کر پائے جاتے ہیں۔

ٹماٹر جوانوں اور بوڑھوں کے علاوہ بچوں کے لئے بھی صحت بخش غذا ہے۔ کیونکہ اِس میں وہ تمام حیات بخش اجزا پائے جاتے ہیں جو بچوں کی صحت اور جسمانی نشوونما کے لئے ضروری ہیں۔ ٹماٹر کا رس پلانے سے بچوں کے دانت آسانی سے نکل آتے ہیں۔ ہڈیوں میں قوت اور مضبوطی آتی ہے۔ اور بکثرت خون پیدا ہوتا ہے۔ وہ بچے جو دانت نکلنے کے دَوران کمزور ہو گئے ہوں ٹماٹر کے استعمال سے تندرست اور صحت مند ہو جاتے ہیں۔ ننھے بچوں کے لئے ٹماٹر بہت ہی مفید بلکہ نعمت ہے۔ بچوں کو ٹماٹر کھلانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُنھیں ایک کچا اور اچھی طرح پکا ہوا ٹماٹر چوسنے کے لئے دے دیا جائے اور وہ آہستہ آہستہ اُس کا رس چوستے رہیں۔ ہر روز صبح کے وقت کچھ کھانے سے پہلے دو تین ٹماٹر کھانے سے صرف طاقت ہی حاصل نہیں ہوگی آپ بہت سی بیماریوں سے بھی محفوظ رہیں گے۔ ٹماٹر قبض کُشا ہے۔ اِسے کھانے سے قبض کی شکایت رفع ہو جاتی ہے اور آنتوں کو بہت فائدہ پہنچتا ہے اور جسم میں امراض کا مقابلہ کرنے کی قوت بڑھتی ہے۔

دودھ پلانے والی خواتین کو خاص طور پر کچے ٹماٹر کھانے چاہئیں۔ اِس سے دودھ بڑھتا ہے۔

ٹماٹر میں تُرشی بھی ہوتی ہے اِس لئے جن لوگوں کو کھانسی، نزلہ اور زکام کی شکایت ہو اُنھیں ٹماٹر نہ کھانا چاہئے۔

## ۵ • زندگی کی شاہراہ پر

زندگی کی شاہراہ پر چلتے ہوئے بہت سے لوگ اِس طرح ٹھوکریں کھاتے چلتے ہیں جیسے اندھیرے میں چل رہے ہوں۔ اُنھیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں؟ اُن کی منزل کہاں ہے؟ ہو سکتا ہے اُن لوگوں میں آپ بھی ہوں۔ اگر آپ کامیابی کی منزل سے ہمکنار ہونا چاہتے ہیں تو زندگی کا ایک واضح نقشہ، ایک واضح خاکہ بنا لیجئے۔ ایسا کرنے سے یہی نہیں ہوگا کہ اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے آپ کو اندھیرے میں بھٹکنا نہ پڑے گا۔ اِس طرح آپ میں کام کرنے، آگے بڑھنے کی صلاحیت بڑھ جائے گی۔

مشہور مفکر سی۔ جی ڈوکان نے لکھا ہے ——— اِس طرح کا خاکہ آپ میں کام کرنے کی صلاحیت کو بڑھا دیتا ہے۔ یہ آپ میں اعتماد پیدا کرتا ہے۔

یہ آپ کی کوششوں میں اضافہ کر دیتا ہے۔ یہ آپ میں عمل کی تحریک کا باعث بنتا ہے۔ یہ آپ کو غلط راہ پر چلنے سے روکتا ہے۔ یہ آپ کی تخلیقی قوتوں کو بکھرنے سے روک کر انھیں ایک سمت موڑ دیتا ہے۔"

## ۶● خود کو پہچانیے

اگر آپ زندگی کی بازی گاہ میں کامیاب و کامراں ہونا چاہتے ہیں تو خود کو پہچانیے۔ آپ بھی ایورسٹ کو فتح کر سکتے ہیں۔ آپ بھی آسمان سے ستارے توڑ سکتے ہیں! کامیابی و کامرانی کا اصل راز خود شناسی ہے۔

مشہور مفکر سی۔ جی ڈوکان نے لکھا ہے ــــ "میں اپنی زندگی میں بہت سے امیر، باوقار اور کامیاب لوگوں سے ملا ہوں، ہر طرح کے اور ہر طبقے کے لوگوں سے ملا ہوں۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ ان میں سے گنتی کے چند لوگوں نے صحیح معنوں میں زندگی سے اور اپنے آپ سے فائدہ اٹھایا تھا۔

ایسا کیوں ہے؟ ــــ اس کا جواب دولت، شہرت، برتری اور اسی طرح کی دوسری چیزوں میں ڈھونڈنے سے نہیں مل سکتا۔ ان کی ناکامی کا راز ان کی اپنی نامکمل اور ادھوری شخصیت میں مضمر ہوتا ہے۔ وہ اپنی فطرت سے خود نباہ کرنا نہیں جانتے۔ وہ اپنے صحیح مقام کو پہچاننے سے قاصر رہتے ہیں۔"

## ۷● خود کو فریب نہ دیجیے

مشہور مفکر ڈوگلس لرٹن نے لکھا ہے ــــ "اگر آپ کسی امارت پسند انسان کو اپنی دولت، رسوخ اور قابلیت کی ڈینگیں مارتے ہوئے دیکھیں تو آنکھ بند کر کے یقین کر لیجیے کہ وہ آدمی بے حد کھوکھلا اور کمتر ہے ــــ جو آدمی اپنے آپ کو اپنی حیثیت اور اپنی حقیقت سے زیادہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اس جیسا احمق کوئی نہیں"۔ ــــ ہیچیگان کے مشہور ماہر نفسیات ہنری فاسٹر آدم نے لکھا ہے ــــ "ایسا آدمی اپنے آپ کو اور دوسروں کو فریب دے کر یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ بہت بڑا آدمی ہے، اس کی قابلیت و صلاحیت بے پناہ ہے۔ لیکن درحقیقت وہ عام طور پر معمولی سطح کا بھی انسان نہیں ہوتا۔"

## ۸● اپنی زندگی کا ایک واضح نقشہ بنائیے

اگر آپ چاہتے ہیں کہ شاہراہِ حیات پر چلتے ہوئے اندھیرے میں بھٹکتے نہ پھریں تو اپنی زندگی کا ایک واضح نقشہ بنا لیجیے۔

مشہور مفکر سی۔ جی ڈوکان نے لکھا ہے ــــ "دنیا کے کامیاب و کامراں انسانوں کے سوانحِ حیات پر نظر ڈالیے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے سامنے زندگی کا ایک واضح نقشہ تھا۔ وہ اپنی جوانی ہی کے دنوں میں زندگی کا خاکہ تیار کر کے اس پر عمل پیرا ہو گئے تھے۔ وہ اپنی دُھن کے پکے تھے۔ وہ اپنے ارادوں کو متزلزل نہیں ہونے دیتے تھے۔ مصائب میں کبھی نہیں گھبراتے تھے۔ آپ بھی زندگی کی بازی گاہ میں کامیاب و کامراں ہونا چاہتے ہیں تو زندگی کا ایک نقشہ بنا لیجیے۔ واضح نقشہ!"

## ۹● آپ بھی عظیم بن سکتے ہیں

عظمت کسی کی میراث نہیں، آپ بھی عظیم بن سکتے ہیں۔ مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے عظمت کا راز ان الفاظ میں بتایا ہے ــــ "زندگی میں مایوسی و ناکامی، مشکلات و مصائب سے جدّوجہد نہ کرنی پڑے تو زندگی کا سفر کتنا آسان، کتنا آرام دہ بن جائے۔ لیکن زندگی کی عظمت اسی میں ہے کہ طوفانوں میں سے گزرتے ہوئے، مشکلات کو عبور کرتے ہوئے زندگی کے عظیم خوابوں کو حقیقت بنایا جائے۔

وہ انسان عظیم ہے جس نے زندگی کے طوفانوں کا ہنستے ہنستے مقابلہ کر کے ناکامیوں اور مشکلوں سے گھبرانے کے بجائے انھیں اپنی کامیابی کا ذریعہ بنایا۔"

## ۱۰● ایک اہم سبق

ایک مشہور مفکر نے لکھا ہے ــــ "وہ سب سے غریب ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو۔" ایک دوسرے مفکر نے لکھا ہے ــــ "پُرمسرت زندگی گزارنا چاہتے ہو تو اپنا ایک جاں نثار دوست ضرور بناؤ۔" ــــ اس سلسلے میں ایک اہم نقطہ، ایک اہم سبق یہ ہے ــــ

مشہور مفکر ڈوگلس لرٹن نے لکھا ہے ــــ "بچوں کو اور غالباً والدین کو یہ سکھانے کی ضرورت ہے کہ دوست بنانے کا راز چند سادہ اصولوں یا کرتب میں پوشیدہ نہیں، اس کے لیے بہت سی قابلیتیں اور مضبوط و مستحکم شخصی اوصاف پیدا کرنے ہوں گے۔ کوئی شخص اس وقت تک دوست بنانے میں کامیاب نہ ہوگا جب تک وہ جماعت میں یہ احساس نہ پیدا کر دے کہ وہ جو کام کر رہا ہے وہ عام فلاح و بہبود کے لیے ہے۔ میرے خیال میں یہ سبق والدین، اساتذہ اور ہر انسان کے لیے بے حد اہم ہے جن کے دل میں قوم اور ملک کی فلاح کا جذبہ ہے۔"

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

## سوال و جواب

**حمید کریم نگری۔ کریم نگر**

س۔ ادیب کی زندگی ———؟

ج۔ کسی ادیب نے اپنی زندگی کی عکاسی یوں کی ہے۔

پھونک کر اپنے آشیانے کو
روشنی بخش دی زمانے کو

س۔ سچے دوست کی پہچان؟

ج۔ دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

س۔ کیا انسان کو تقدیر کا قائل ہونا ضروری ہے؟

ج۔ ہاں لیکن یہ بھی حقیقت ہے ——— تدبیر کے نتیجے کا تقدیر نام ہے۔

---

**جہانگیر احمد صدیقی۔ شمس پور۔ گیا**

س۔ مسلمان اپنے مذہب سے منکر کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا یہ قربِ قیامت کی نشانی ہے؟

ج۔ بے شک قربِ قیامت کی نشانی ہے۔

س۔ عورتیں زیوروں کی بہت دلدادہ ہوتی ہیں۔ آپ بتائیں عورت کا حقیقی زیور کیا ہوتا ہے؟

ج۔ حجاب و حیا!

س۔ شوہر اور بیوی میں کس کا رتبہ بلند ہے؟

ج۔ دونوں کا درجہ برابر ہے۔ قرآن پاک میں شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔

---

**محمد لیئق اختر۔ بریسرا**

س۔ کوئی آدمی زندگی میں کب ترقی کرتا ہے؟

ج۔ جب عزم و عمل کا دامن پکڑ کر ترقی کرنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔

س۔ خوبصورت لڑکی اپنی صورت سے کب نفرت کرتی ہے؟

ج۔ جب حالات اس کی خوبصورتی کو اس کے لئے وبالِ جان بنا دیتے ہیں۔

---

**سید محمد اکرام اللہ۔ نظام پور۔ گیا**

س۔ بیسویں صدی کے پہلے صفحہ پر ہمیشہ عورت کی تصویر نظر آتی ہے۔ ایسا کیوں؟

ج۔ اس لئے کہ ہم نے ہمیشہ عورت کو بلند درجہ دیا ہے۔

س۔ خوشتر بھیا یہ کہاں تک سچ ہے کہ عورت ہی مرد کی زندگی کو جہنم یا جنت بنا دیتی ہے؟

ج۔ عورت مرد کی زندگی کو بے شک جنت بنا دیتی ہے لیکن اپنی زندگی کو جہنم مرد بنا لیتا ہے۔

س۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ ناکامی کا دوسرا نام قسمت ہے؟

ج۔ لوگوں نے ناکامی کا دوسرا نام قسمت رکھ دیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت نہیں۔ ناکامی یا کامیابی کسی کا مقدر نہیں بلکہ اپنے عزم و عمل پر موقوف ہے۔

---

**شاہدہ (مہاڑ)**

س۔ کامیاب زندگی کا راز؟

ج۔ کامیاب انسانوں کے نقشِ قدم پر چلنا!

س۔ انسانیت کی معراج؟

ج۔ غم کے ماروں کی غم خواری
ہے انسانیت کی معراج

---

قاضی سعید الدین۔ بدنیرہ۔ گنگاتی

س۔ کیا مسکراہٹ زندگی کی علامت ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ ایک مفکر نے کہا ہے ـــــ اگر تم اپنی زندگی کو طویل بنانا چاہتے ہو تو زیادہ سے زیادہ مسکرایا کرو۔

س۔ خوش رہنا بہتر ہے یا دوسروں کو خوش رکھنا اچھا ہے؟

ج۔ دوسروں کو خوش رکھنا خود خوش رہنے سے بہتر ہے۔

س۔ زندگی بذاتِ خود حادثہ ہے یا حادثات کے مجموعہ کا نام زندگی ہے؟

ج۔ حادثات کے مجموعہ کا نام زندگی ہے۔

---

صغیر احمد حسرت۔ جھنگروا۔ نیپال

س۔ رواداری کو بزدلی اور خودداری کو خود پرستی اور خودنمائی سمجھنے والے کو کیا کہیں گے؟

ج۔ حقیقت ناشناس!

س۔ بیٹا آنکھوں کی ٹھنڈک اور بیٹی؟

ج۔ بیٹی بھی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے۔ جبھی اگلے وقتوں میں بیٹی کو خط لکھتے ہوئے نورِ چشمی لکھتے تھے۔

س۔ بھیا! مجھے نیند میں ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں۔ اس سے بچنے کے لئے کوئی صورت بتائیں۔

ج۔ سونے سے پہلے اچھی باتیں کیا کیجئے اور سونے کے وقت برے خیالات کو اپنے ذہن میں نہ آنے دیا کیجئے۔

---

اے۔ سلطان۔ مارکاپور

س۔ زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر موت کی آرزو کرنا کہاں تک صحیح ہے؟

ج۔ بالکل غیر صحیح ہے۔ ایسے لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے ـــــ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

س۔ دُنیا اچھوں کو بُرا کیوں کہتی ہے؟

ج۔ اس لئے کہ بُروں کو اچھے بُرے نظر آتے ہیں۔

س۔ مجبانہ کے دونوں شعروں میں کون سا صحیح ہے ـــــ

عشق کا ذوقِ نظارہ مفت میں بدنام ہے
حُسن خود بدنام ہے جلوہ دکھانے کے لئے

•

عشق کا ذوقِ نظارہ مفت میں بدنام ہے
حُسن خود بیتاب ہے جلوہ دکھانے کے لئے

ج۔ دوسرا شعر صحیح ہے۔

---

نور الحسین۔ دانتی۔ پورنیہ

س۔ انسان کے لئے سب سے بڑا نقصان کیا ہے؟

ج۔ انسانیت سے محروم ہونا۔

س۔ پھول بھونرے کو دیکھ کر کیوں مسکراتا ہے؟

ج۔ پھول بھونرے کو نہیں دیکھتا جب بھی مسکراتا ہے۔

س۔ آج کل کی لڑکیاں اتنا چست لباس کیوں پہنتی ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ ان کے گھروں کے مرد چست لباس پسند کرتے ہیں۔

---

مسز بدر الانوار۔ علی گڑھ

س۔ چچا جان! شادی کے بعد کیا نئے سرے سے زندگی شروع ہوتی ہے؟

ج۔ جی ہاں، شادی کے بعد زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔

س۔ عورت کی زندگی شادی سے پہلے بہتر ہوتی ہے یا شادی کے بعد؟

ج۔ جیون ساتھی اچھا مل جائے تو شادی کے بعد!

س۔ شادی شدہ زندگی کیسے خوشگوار [illegible] ہے؟

ج۔ شوہر اور بیوی [illegible] درجہ دیں [illegible] کے دامن پر کبھی بدگمانی کا سایہ نہ [illegible]

---

محمد حسین حالی، کلکتہ

س۔ گاندھی جی کی قوم نے اہنسا اور امن [illegible] اہنسا کے اوتار اپنے رہنما کو اس کی صد سالہ تقریب پر جو خراج عقیدت پیش کیا ہے کیا پہلے بھی کسی قوم نے اپنے رہنما کو [illegible] عقیدت پیش کیا ہے؟

ج۔ جی نہیں، کسی قوم نے نہیں! تاریخ [illegible] پیش کرنے سے قاصر ہے! [illegible] کو جاننا گاندھی کی روح کبھی معاف نہ کرے گی!

---

محمد عبدالحیٔ ہاشمی، ظہیر آباد (دکن)

س۔ تنگ نظر فرقہ پرست لیڈروں کا انجام!

ج۔ عبرت ناک ہوگا!

س۔ آج کل دُنیا میں کون سی شے سستی ہے؟

ج۔ بیر، بُرائی، فتنہ و فساد!

س۔ آج کل کی لڑکیاں تعلیم حاصل کر کے چراغِ خانہ کے بجائے شمعِ محفل بن رہی ہیں۔ کیا یہ [illegible] سے بن رہی ہیں یا اس میں مردوں کا [illegible] ہے؟

ج۔ اس میں سراسر مردوں کا ہاتھ ہے۔

---

ضیاء الرحمٰن، بھوپال

س۔ اچھا کس زبان کا لفظ ہے؟

ج۔ ترکی زبان کا۔

---

کمال احمد صابر۔ اورنگ آباد۔ گیا

س۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انھیں کی یاد میری زندگی ہے

س۔ ہندوستانی فلموں میں بوسہ بازی دکھائی جانی چاہیئے یا نہیں؟

ج۔ ہندوستانی فلموں میں جو کچھ دکھایا جا رہا ہے یہی کیا کم ہے جو اس اضافہ کو مستحسن سمجھا جائے۔

---

اعجاز احمد۔ لہرپور۔ سیتاپور

س۔ غالب کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

س۔ اگر دنیا میں عورت نہ ہوتی؟

ج۔ دنیا سنسان وادی ہوتی —— وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ!

---

محمد زکی۔ گینتکل

س۔ غالب کا کوئی حیات افروز شعر سنایئے۔

ج۔ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

س۔ انسان شراب کیوں پیتا ہے؟

ج۔ اس غلط فہمی میں کہ شراب پینے سے غم غلط ہو جاتا ہے۔

---

جوگندر سنگھ پٹیالوی۔ انبالہ

س۔ کچھ اچھی باتیں بتایئے۔

ج۔ گورونانک جی نے فرمایا ہے —— جس نے خدا کی اطاعت کی، نانک اسے کیا کمی ہے۔ جو مانگا سو پایا —— مہاتما بدھ نے فرمایا ہے —— بدھ اُن تحفوں کی قدر نہیں کرتا جو اُسے دیئے جاتے ہیں، بلکہ اُن کی قدر کرتا ہے جو غریبوں میں تقسیم ہوں!

---

بلراج بسمل۔ رائے پور

س۔ گورونانک دیو جی پر علامہ اقبال نے کون سا شعر کہا ہے؟

ج۔ علامہ اقبال نے "نانک" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی
بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

---

محمد اصغر علی نواب۔ دھنباد

س۔ خوشتر صاحب! ایک صاحب مجھ سے بحث کے دوران کہہ رہے تھے کہ ساری دنیا میں ۳۳ ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟

ج۔ جی ہاں، یہ درست ہے۔

س۔ یہ کہاں تک سچ ہے کہ اپنے بھی اپنے نہیں ہوتے؟

ج۔ اس زمانہ میں یہ بہت حد تک صحیح ہے۔

س۔ توبہ کا دروازہ کب بند ہو جاتا ہے؟

ج۔ جب انسان مر جاتا ہے، یا مرنے سے پہلے ہی اس کی زبان بند ہو جاتی ہے، اسی وقت اس کے لئے توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

---

جاوید حسین۔ چھپرہ

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ دولت سے ضمیر کی آواز کو دبایا جا سکتا ہے؟

ج۔ جی ہاں، دولت سے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے

س۔ عورت کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے

ج۔ خود کو کمزور سمجھنا!

س۔ منظر پہ غالب کا ایک شعر سنایئے۔

ج۔ بہ شکلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شب ہا
سرِ تارِ نظر ہے رشتۂ تسبیحِ کوکب ہا

---

شمیم سہسرامی۔ سہسرام

س۔ حقیقت کہانی کب بنتی ہے؟

ج۔ جب بنانے والے بناتے ہیں۔

س۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ لڑکیاں شاعروں سے محبت کرتی ہیں؟

ج۔ یہ ہوائی کسی احمق نے اڑائی ہوگی۔

---

بلال عباسی۔ شیخوپورہ۔ پاکستان

س۔ موت کو ہنستے ہوئے گلے سے کون لوگ لگاتے ہیں؟

ج۔ جو لوگ موت کو زندگی سمجھتے ہیں!

س۔ کیا صبر کا پھل ہر حال میں میٹھا ہوتا ہے؟

ج۔ جی ہاں۔

---

عائشہ ساحل۔ جھمری تلیا

س۔ ملک میں کون سی جماعت فرقہ پرست ہے؟

ج۔ جو حقیقت اظہر من الشمس ہے، اُسے ہم سے کیا پوچھتی ہیں؟

س۔ مسلمانوں میں دین سے غفلت کیوں پیدا ہوتی جا رہی ہے؟

ج۔ تاکہ کچھ دنوں میں یہ پیش گوئی حقیقت بن جائے —— مسلماں در گور مسلمانی در کتاب!

---

**محمد یوسف [illegible]**

س۔ احمد آباد گجرات کے حالیہ فسادات میں فرقہ [illegible] کی ذمہ داری کس پر ہے؟

ج۔ حکومت کے فرض ناشناس حکام پر!

س۔ [illegible] ہے جو اخبار ایشیا نکلتا ہے کس زبان میں نکلتا ہے؟ کیا اس کے ایڈیٹر جناب بشیر ریاض آپ کے دوست ہیں؟

ج۔ اُردو زبان میں۔ جی ہاں بشیر بھائی ہمارے دل کے بہت قریب ہیں۔

---

**سعیدہ اختر زبیدہ بیگم۔ مراد آباد**

س۔ بھائی جان! غم میں ڈوبا ہوا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ ایک قطعہ سُنئے ؎

جانے کیوں سیم پوش راتوں میں
ایسا محسوس مجھ کو ہوتا ہے
میرے مغموم دل کا سناٹا
چاندنی سے لپٹ کے روتا ہے

س۔ رشی کمار شاد کس مذہب سے تعلق رکھتے تھے؟

ج۔ مذہبِ انسانیت سے۔

س۔ کچھ ایسی باتیں بتائیے جن سے دل کو سکون ہو۔

ج۔ اچھی باتیں سُننے اور پڑھنے سے دل کو سکون ہوتا ہے۔ کچھ اچھی باتیں سُنئے —— سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے —— کاموں کی بہتری اعتدال میں ہے۔ اعمال میں میانہ روی اختیار کرو اور ایسی روش ترک کر دو جو تمہارے لئے دشواری کا باعث ہو۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے —— جہالت اور بے عملی سب سے بڑی برائیاں

ہیں۔

---

**اقبال ناطق۔ گریڈیہہ**

س۔ ایک مفاد پرست انسان؟

ج۔ انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔

س۔ کوئی روح افزا شعر سنائیے۔

ج۔ اُس زندگی کے حُسن کی تابندگی نہ پوچھ
جو حادثوں کی دھوپ میں تپ کر نکھر گئی

---

**محمد شمیم سیسباڑی**

س۔ خوشتر بھائی! زندگی پر نامرادی اور غم کے بھیانک اندھیرے گھر جائیں تو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ حوصلہ نہ کھونا چاہئے۔ یہ یقین رکھنا چاہئے کہ ——
صبح پھوٹے گی اِس رات کی تاریکی سے!

---

**محمد فصیح الدین ذاکر۔ ارمور۔ نظام آباد (دکن)**

س۔ کانگریس کا مستقبل؟

ج۔ کانگریس کا حال اس کے مستقبل کا آئینہ ہے!

س۔ ہندوستان میں بڑھتی ہوئی بیکاری عوام کو کہاں لے جائے گی؟

ج۔ دُکھ درد کے اندھیرے غار میں!

---

**جسونت سنگھ نرالا۔ انبالہ**

س۔ بھائی صاحب! کوئی مزاحیہ شعر سنائیے۔

ج۔ اس میں دولت اس میں عزت اس میں شہرت اس میں عیش
ہے جہاں میں سب سے بہتر کاروبارِ لیڈری!

س۔ کیا میں شاعر بن سکتا ہوں؟

ج۔ کیوں نہیں، بشرطیکہ آپ اچھا گا سکتے ہوں، اشعار کے توڑ جوڑ کے ماہر ہوں!

---

**رضا جمیل۔ لاہور**

س۔ بھائی جان! یہ خوبصورت اشعار کس کے ہیں

جب دکھاتی ہے سحر عارضِ رنگیں اپنا
کھول دیتی ہے کلی سینۂ زرّیں اپنا
جلوۂ شام ہے صبح کے میخانے میں
زندگی اس کی ہے خورشید کے پیمانے میں

ج۔ یہ اشعار علامہ اقبال کے ہیں۔

س۔ بھائی جان! اپنی بیاض میں اچھے اشعار جمع کرنے کا مجھے بے حد شوق ہے۔ آپ بھی کوئی خوبصورت شعر سنائیے۔

ج۔ علامہ اقبال ہی کی ایک نظم عورت سے دو اشعار سُنئے ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اِسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُرِ مکنوں

---

**کملا چکرورتی۔ مدراس**

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں شیخ عبداللہ کو نظر بند رکھنے پر ہماری سرکار نے کتنے روپے خرچ کئے؟

ج۔ ایک سوال کے جواب میں وزیرِ داخلہ شری چوان نے بتایا کہ شیخ عبداللہ کی نظر بندی کے سلسلے میں سرکار کے ۲۲ لاکھ ۲۰ ہزار روپے خرچ ہوئے۔

---

**مہر النساء قمر۔ گرکھلا چھپرہ**

س۔ کیا عورت شراب کی خالی بوتل کی طرح پھینک دینے والی شے ہے؟

ج۔ کوئی احمق یہ کہتا ہوگا۔

س۔ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں لیکن گھر کی اُلجھنوں نے مجھے گھیر رکھا ہے۔ بتائیے کیا کروں؟

ج۔ گھر کے حالات سے بغاوت کرنا اچھا نہ ہوگا۔

رضیہ جمیل۔ کراچی

س۔ بھائی جان! کیا آپ بتا سکتے ہیں یہ خیال افروز شعر کس کے ہیں ؎

مشکل کے بعد تخلیق کو نکھرنے دو
زمیں بنا اسے بنا کے آسماں کے لئے
غبارِ راہ کو لے جاؤ آسمانوں تک
یہ اہلِ عزم کا تحفہ ہے آسماں کے لئے

ج۔ یہ اشعار عاشق کرنالی کے ہیں جو اسلامیہ کالج ملتان میں پروفیسر ہیں۔

س۔ بھائی جان! مجھے خیال افروز اشعار پڑھنے اور اپنی بیاض میں محفوظ رکھنے کا بہت شوق ہے۔ آپ بھی ایسا ہی کوئی شعر سنائیں۔

ج۔ لیجئے، ایک نہیں دو شعر سنئے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے!
جہاں پلتے فکرِ آدم کا گزر تھا غیر ممکن
تگ و تازِ آدمی ہے اب اس آسماں سے آگے!

---

مس زرینہ۔ بحرین

س۔ بھائی جان! اخباروں میں غازہ کا ذکر اکثر آتا ہے۔ غازہ کہاں ہے؟

ج۔ غازہ، مصر اور اسرائیل کے درمیان زمین کی ایک پتلی سی پٹی ہے۔

س۔ اور یہ بھی بتائیں "ناگاساکی" کہاں ہے؟

ج۔ اب کہاں ہے، کبھی تھا۔ جاپان کا یہ دوسرا شہر تھا جو دوسری جنگِ عظیم میں ایٹم بم سے جل کر راکھ ہو گیا۔

---

محمد نجم الدین۔ حیدرآباد۔ دکن

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں، انسان کی ہتھیلی پر بال کیوں نہیں ہوتے؟

ج۔ بال کی کھال آپ ہی نکالیں۔

س۔ کیا چاند میں چین کا حصہ ہے؟

ج۔ جب چین کا ہر جگہ حصہ ہے تو چاند پر کیوں نہ ہوگا۔ کون جانے سارا چاند چین کا ہو!

---

شہاب زیدی۔ علی گڑھ

س۔ دلاور فگار کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ کوئی ہنگامہ گلستاں میں نہ ہونے دینا
تم کو آدابِ گلستاں کی قسم ہے یارو!

س۔ اکبر الہ آبادی کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

---

ایم عظیم اللہ عظیم۔ مظفرپور

س۔ خوشتر بھائی! "بیسویں صدی" میں آپ افسانہ نگاروں کے خطوط شائع کرتے ہیں کیا شعرائے کرام آپ کو خطوط نہیں لکھتے؟

ج۔ کیوں نہیں لکھتے۔ لیکن اُن خطوط میں افسانہ نگاروں کے خطوط کی طرح اُن کی تخلیقات پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہوتی۔ نیز یہ کہ ساری تخلیقات کے ساتھ خطوط شائع کیے جائیں تو ہر شمارہ "خطوط نمبر" بن جائے!

س۔ بھائی جان! غموں کے پہاڑوں سے سر ٹکرانے کو جی چاہتا ہے۔ بتلایئے کیا کروں؟

ج۔ آفریں باد بریں ہمتِ مردانہ تو! ـــــ ضرور ٹکرا جایئے!

س۔ شیخ عبداللہ کے نام میں "شیخ" کا لفظ لقب ہے یا خطاب؟

ج۔ اُن کے نام کے ساتھ لفظ "شیخ" اُن کا لقب ہے نہ خطاب۔ اُن کی قومیت کا نشان ہے۔

س۔ دل مغموم ہے کوئی پُر کیف شعر سنایئے۔

ج۔ یہ دو خیال افروز شعر سنئے ؎

ہے بڑی چیز انبساط مگر
غم نہ ہو تو حیات کچھ بھی نہیں
ہو درد سکوں ہے اگر احساس
زندہ ہو اگر دل تو بڑی چیز ہے غم بھی

---

غلام خالد۔ عمری کلاں۔ مرادآباد

س۔ خوشتر صاحب! آپ کی تعلیم؟

ج۔ اتنی جس پر ہمیں فخر ہے نہ ناز!

س۔ ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کب تک ہوتے رہیں گے؟

ج۔ جب تک حکومت کے حکام فرض شناس نہ بن جائیں گے۔

---

ثروت حسین۔ سرینگر۔ کشمیر

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں، پہلی کرکٹ کا موجد کون ہے؟

ج۔ بریکٹ۔

MARCH 1970
Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 630/57

BISWIN SADI

AB

... YEARS OF PUBLICATION

Telephones Office, 271637 Residence, 619927

اپریل

Rs. 1.25

Bisvin Sadi
DELHI

نہ کرلیں وہ جب تک کہ سیرِ گلستاں
چمن سے نہ جائیں، بہاروں سے کہہ دو ——— فرید ٹونکی۔

فوٹو: سورج این شرما۔ جے پور

پچھلے دنوں دلّی میں غالبؔ صدی کی اختتامی تقریبات کا آغاز مزارِ غالبؔ پر گلپاشی او فاتحہ خوانی سے ہوا۔ جس میں ممتاز ادیب، شاعر، صحافی اور غالبؔ کے پرستار شریک ہوئے۔

نائب صدر جمہوریۂ ہند جناب جی۔ ایس پاٹھک نے فرمایا کہ غالبؔ اور غالبؔ کی زبان اُردو ہمیشہ زندہ رہیں

ب بہار برنی نے انجمن ترقیٔ اُردو کی طرف سے نائب صدر جمہوریۂ ہند کی
یف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے غالبؔ کے فنی کمالات کو خراجِ تحسین پیش کیا ؛

ی رسم کے بعد جنابِ بہار برنی نے حضرتِ جگرؔ مرادآبادی مرحوم کی ایک
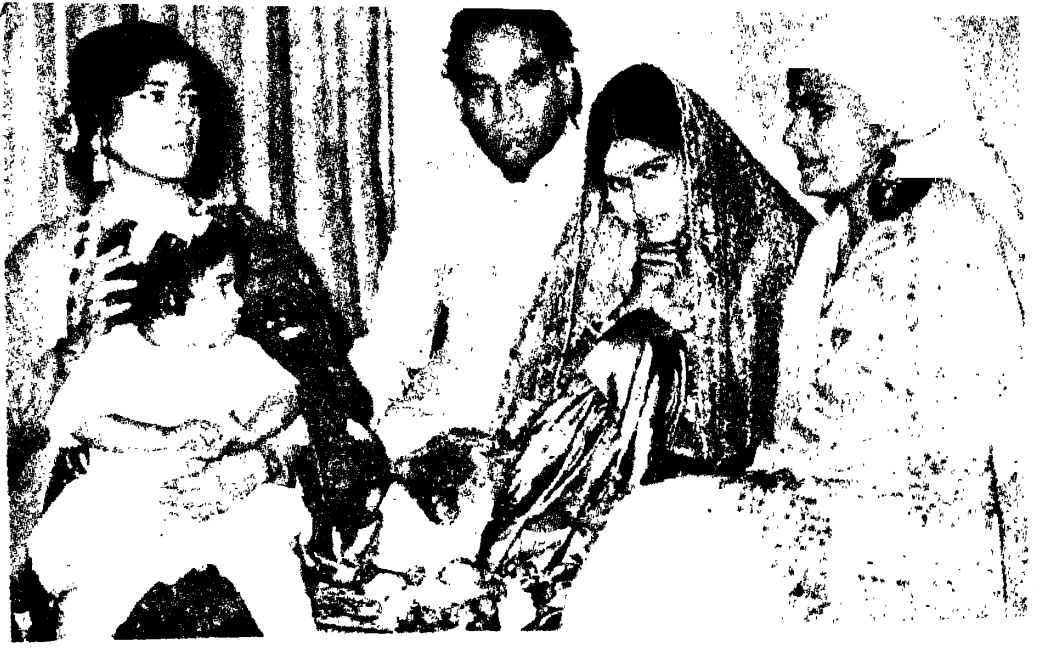
پچھلے دنوں اُردو کے مقبول شاعر عزیزی صغیر احمد صوفی کی شادی خانہ آبادی علی گڑھ میں تُزک و احتشام سے ہوئی۔ شاید اس موقع ہی کے لئے صوفی صاحب نے کہا تھا ؎

پھرتے ہیں اپنے آپ سے انجان ان دِنوں  
کِس اجنبی کا قُرب میسّر ہوا کہ ہم

جناب صغیر احمد صوفی علی گڑھ یونیورسٹی کے پُرانے طالب علم ہیں۔ اب زندگی کے ایک نئے امتحان کے موقع پر جناب ڈاکٹر عبد العلیم وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی اُنھیں درسِ حیات دے رہے ہیں۔ دائیں طرف جناب رام لعل اور بائیں جانب جناب خلیل الرحمٰن اعظمی بیٹھے ہیں

عزیزی صغیر احمد صوفی کے نکاح کی مبارک رسوم ادا ہوئیں اور جناب زبیر رضوی نے پُرخلوص ہدیہ تہنیت پیش کیا جسے سن کر سب کھل اُٹھے۔

اس تقریب سعید میں پُرخلوص احباب کے علاوہ ہندوستان کے نامور شاعر و ادیب شریک ہوئے۔ دائیں سے بائیں بیٹھے ہیں۔ کرشن موہن، رفعت سروش، پریم ناتھ در، صوفی صاحب، رام لعل اور ڈاکٹر علیم مسرور۔ کھڑے ہوئے حضرات میں (دائیں سے بائیں) راج نرائن راز، بلراج کومل، زبیر رضوی، سردانہ، پروفیسر مسعود علی ذوقی، محمود ہاشمی، حسن نعیم، سبھروال اور عتیق حنفی۔

# بیسویں صدی

ٹیلیفون دفتر ——— ۲۶۱۹۳۲
ٹیلیفون رہائش ——— ۴۱۹۹۲۷

اپریل ۱۹۷۰ء

# تیرو نشتر

• بیلوں کی جوڑی صرف ہماری ہے" حکمراں کانگریس کا دعویٰ ——— نجلنگپا اینڈ کمپنی دیگ میں حصہ دار بن سکتی ہے۔

---

• وزیر نے بچاسی کی زمین بھائی اور بھاوج کو الاٹ کر دی" ——— جیسے والد بزرگوار نے ورثے میں چھوڑی تھی۔

---

• بے روزگاری خطرناک ہے" ایک عنوان ——— اس لئے کر پھر سیاسی لیڈروں کی تعداد بڑھتی ہے اور وہ لوٹ کھسوٹ مچاتے ہیں۔

---

• کانگریس میں پھوٹ کا ذمہ دار کون؟" ایک عنوان۔ ——— نجلنگپا اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔

---

• اندرا گاندھی کے بیٹے سنجے نے پٹرول پمپ کے لئے درخواست دی" ایک خبر ——— حالانکہ اُسے مرارجی بھائی کے بیٹے کانتی سے سبق لے کر بڑی بڑی کمپنیوں میں حصہ دار بن کر لاکھوں کے وارے نیارے کرنے چاہئے تھے۔

---

• گلزاری لال نندہ وزیر ریلویز مقرر ہو گئے" ——— سادھوؤں کو مژدہ۔ ریلوں میں فری سفر کی سہولتیں بن جائیں گی۔

---

• کارکنوں میں قومی یک جہتی کو فروغ دینے کے لئے کیمپ" ایک خبر ——— پہلے لیڈروں میں قومی یک جہتی پیدا کرو۔ جو دن رات ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے ہیں۔

---

• فرقہ وارانہ جماعتوں پر پابندی لگانے کا مطالبہ" ایک عنوان ——— جو آج تک پورا نہ ہوا۔

---

مسز اندرا گاندھی نے دِلّی میں ایوانِ غالب کا افتتاح کیا۔

"اندرا گاندھی دیش کی کشتیا ڈبو رہی ہیں" شملہ میں نجلنگپا کی تقریر

"جیون ساتھی کی ضرورت" ایک جن سنگھی اخبار میں اشتہار
— نجلنگپا کانگریس سے رجوع کیجئے۔

---

"دلی کارپوریشن کا بجٹ" ایک عنوان — مار پیٹ،
دست پیزار اور گالی گلوچ کے اخراجات۔

---

"شہنشاہ بادشاہ کا دورہ ختم" سیاستدانوں نے اطمینان کا
سانس لیا — بڑھا ان کے پیچھے ہی پڑ گیا تھا۔

---

"ملک کی جمہوری طاقتوں کو اب متحد ہو جانا چاہئے" سوتنترانی
ترکی دیوی کی تقریر — کیونکہ اب غریب عوام راجوں پر جھپٹ پڑے ہیں۔
کے جیب خرچ (پریوی پرس) کی حفاظت کرنی

---

"گندم کے بھاؤ گر گئے" — دیکھنا کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔

---

"میرے بیانات غلط رنگ میں پیش کئے جا رہے ہیں" شریمتی
اندرا گاندھی کا شکوہ — یعنی ہماری ریت کے مطابق ان میں ملاوٹ
کی جاتی ہے۔

---

"کانگریس کی پھوٹ میں روس کا ہاتھ" شری نجلنگپا کا
انکشاف — ع
اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی

---

"دلی کارپوریشن میں جوتم پیزار۔ اجلاس برخاست" میئر اور
ایوان کا لیڈر بے بس — یوں کہئے دلی کارپوریشن ہال فری اسٹائل
اکھاڑے میں بدل گیا۔

---

"غالب کا ادب ملک کا سرمایہ ہے" اندرا گاندھی — البتہ
غالب کی زبان اردو کے لئے اس ملک میں کوئی جگہ نہیں۔

---

گلزاری لال نندہ کا سوشلسٹ ریلوے بجٹ۔ کرایہ اور بھاڑے دونوں میں اضافہ

"پنجاب کی اکالی سیاست" ایک عنوان ——— تین وزارتوں میں جن [illegible] پڑ لیا۔

---

"سیاست اور کیریکٹر" ایک عنوان ——— [illegible]

چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک

---

"ناپاک [illegible]" ایک عنوان ——— [illegible] جن [illegible] کے درمیان

---

"اندرا گاندھی میسور اور گجرات کے گورنروں کا تختہ اُلٹنے کے درپے" نجلنگپا کا خدشہ ——— خدشہ نہیں دل کا چور بول رہا ہے۔

---

"چین اور روس میں جنگ چھڑنے کا امکان" ایک خبر ——— گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ ماؤ کی موت آئی ہے تو روس سے جھگڑنے کے بہانے ڈھونڈ رہا ہے۔

---

"دھنباد کے نزدیک ڈاکوؤں کا اُدھم" ایک خبر ——— حالانکہ اس کے لئے صحیح جگہ اُودھم پور ہے۔

---

"محکمہ ڈاک و تار کی فرض شناسی" ایک خبر ——— کہ تار خطوں سے بھی لیٹ پہنچتے ہیں۔

---

"طریقہ امتحان میں اصلاح کرنے پر تبادلہ خیال" ایک خبر ——— امتحان ختم کر دینے اور سندیں تقسیم کر دینے کا سلسلہ شروع ہو جائے تو بہت مقبول ہو۔

---

"عالمی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے یہودی اپنے گھروں کو آگ لگاتے ہیں" ایک خبر ———

اِس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

---

تامل ناڈو (مدراس) کے چیف منسٹر نے ڈی۔ ایم۔ کے اکالی دل اتحاد کی تجویز پر کہا کہ "ملک کی ایکتا کے لئے داڑھی والی عورت سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔"

---

• "پروفیسروں کا خاموش جلوس" ایک خبر —— اِس لئے کہ بازی طلبا کا حصہ ہے۔

---

• "پنجاب کی اکالی سیاست" ایک خبر —— فاضلکا دے کر چنڈی گڑھ حاصل کیا۔

---

• "ہندی کو مسلّط کرنا بند کرو۔ ڈی ایم کے کا مطالبہ" —— یہ اُردو والے نہیں ہیں جو محض عرضداشتوں سے کام لیتے ہیں۔

---

• "بلند شہر میں لڑکوں کے اغوا کے واقعات سے تشویش" ایک خبر —— اِس میں بلند اقبال لڑکیوں کا ہاتھ ہوگا۔

---

• "یہ دھکّے شاہی کب تک؟" ایک عنوان —— جب تک دھکّے کھانے کے لئے آپ کی کمر میں جان ہے۔

---

• "املاک کا حق کوئی قطعی حق نہیں" ایک عنوان —— اِس لئے کہ املاک آنی جانی ہے۔

---

• "مونگیر کے پاس گنگا کے پانی میں تیل کی آمیزش" ایک خبر —— ہندوستان میں ملاوٹ کے کاروبار کی شاندار مثال۔

---

• "چنے کے بھاؤ میں مندہ" ایک خبر —— تب تو دشمن بھی سستا ہو گیا ہوگا۔

---

• "افریقہ کے غمگین ملاحوں کو رعایت" ایک خبر —— وہ اپنے آنسوؤں کے سمندر سے بنا لائسنس مچھلیاں پکڑ سکتے ہیں۔

---

• "اِس گھر کو آگ کس نے لگائی" ایک عنوان —— گھر کے چراغ نے۔

---

• دہلی میونسپل کارپوریشن میں اُردو دشمنی کا بدترین مظاہرہ۔ اندرا نواز کانگریسیوں کا واک آؤٹ ـــــــ اور نجلنگپا گروپ والے جن سنگھیوں کے ساتھ بیٹھے رہے۔

• آزاد نگر کے پلاٹ ۔ ایک عنوان ـــــــ ہر شخص کو حاصل کرنے کی آزادی۔

• جن سنگھ کی حکمتِ عملی ۔ ایک عنوان ـــــــ دیکھنے کی نہ سمجھانے کی۔

• ریل کے بھاری دھڑا دھڑ ہیں لگا رہے ۔ ایک خبر ـــــــ اس لئے کہ ریلوے میں زنجیر کھینچنے کا طریقہ معلوم ہے۔

• دو سال میں اڑھائی ارب کی چاندی باہر سمگل کی گئی ۔ ایک خبر ـــــــ اور ہمارے ایکسائز والے اور کسٹم والے چپ چاپ سوتے رہے۔

• جن سنگھ نے نجلنگپا کانگریس کو حمایت کا پتہ نہیں کٹ کر دیا ۔ باہمی ـــــــ بلکہ نجلنگپا کانگریس، جن سنگھ کے حق میں پتہ کٹ کر دینے کو بے چین ہے۔

• امیر کسانوں پر ٹیکس لگایا جائے گا ۔ ایک خبر ـــــــ اور اس سے سماج میں اُن کی عزت دوبالا ہوگی کہ وہ انکم ٹیکس گزار ہیں اور صاحبِ حیثیت ہیں۔

• دہلی کے دیہات میں صفائی کی مہم ۔ ایک خبر ـــــــ حالانکہ گندے سیاستداں شہر میں رہتے ہیں اور انھوں نے جو گندگی پھیلائی ہے اُسے صاف کرنے کی ضرورت ہے۔

• جن سنگھ کس قسم کی پلاننگ چاہتا ہے ۔ ایک عنوان ـــــــ فیملی پلاننگ۔

روس کے خلاف چین کی اشتعال انگیزیاں۔ چہ پِدّی چہ پِدّی کا شوربہ۔

# ایک اُجلا اُداس چہرہ

رام لعل

آر ۲۹/II ملٹی اسٹوری، چار باغ، لکھنؤ نمبر

برادرم خورشید اکبر صاحب! آداب

اِدھر آپ کو محبت بھرا نئے سال کا کارڈ ملا، اُدھر پیچھے پیچھے آپ کے منیجر جناب صدیقی کا خط ملا کہ آپ پہلے فلو کا شکار ہوئے اُس کے بعد نمونیہ کا۔ خدا کرے یہ خط پہنچتے وقت آپ بالکل صحت یاب ہو چکے ہوں! نیا سال اُردو کے لئے کڑی آزمائش کا سال ہے۔ ملک کی پروگریسو فورسز کے لئے بھی یہ سال بہت سخت ہے۔ دُکھی ہوں کہ افسوس اور صد افسوس وعدوں کے باوجود اُردو کے لئے کچھ نہ ہو سکا۔ اب یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ اِس طرح کی ساری کوششیں "RED TAPEISM" کا شکار ہو جاتی ہیں۔ تعلیمی ادارے سا نچلا طبقہ ہی سب سے بڑی رکاوٹ بن رہا ہے۔ اِس لئے میں سمجھتا ہوں اب اُسی سطح پر اُردو پڑھنے والے طلبا کے سرپرست کئی گروپوں میں جگہ جگہ سے ہائی کورٹوں میں رِٹ دائر کریں۔ یہ طریقہ کار کسی بھی صوبائی چیف منسٹر یا وزیر تعلیم کو اب محض زبانی وعدے نہیں کرنے دے گا بلکہ اُسے عملی طور پر اُردو تعلیم کا انتظام کرنے کے لئے مجبور کرے گا۔ آپ نے اُردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ کاش آپ ہی اِس طرح کی کوئی مہم چلا کر اُردو زبان کو اُس کا حق دلوا سکیں!

آپ کا مخلص ——— رام لعل

سالینا ایڈورڈ کئی ہفتوں کے بعد آج کلب میں پھر آئی ہے۔ اُس کے ڈیڈی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی لوگ اُس کے گرد جمع ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ غالباً پہلی بار تعزیت کر رہے ہیں۔ اُن کی باتیں میرے کانوں تک پہنچ رہی ہیں۔ وہی پرانے رٹے رٹائے رسمی جملے! لیکن مجھے کوئی چیز محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ اُن لوگوں سے ذرا فاصلے پر ایک الگ تھلگ میز پر بیٹھا بیئر پی رہا ہوں۔ ابھی تک میں بھی تعزیت پیش کرنے نہ جا سکا۔ اِس وقت بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ نہ جانے کیوں ایسا کرنا مشکل معلوم ہو رہا ہے۔

میں نے اپنا پائپ نکالا۔ پاؤچ بھی۔ دھیرے دھیرے تمباکو بھرنے لگا۔ پائپ سلگا لیا۔ دُھوئیں کے کئی مرغولے اُٹھے۔ میرے سامنے ایک بادل سا تن گیا۔ کاسنی سا بادل۔ جس کے پیچھے اُن سب کے چہرے دُھندلا گئے ہیں۔

انڈیا ٹائیمز کا ملکانی اور اُس کی نیپالی بیوی سُلیکھا، سکارونیشن گڈس والا اُدے شنت، بھارتی کرانتی دل کا ذیل بدلو مظفر، جنتا ریڈیوز والا خوشونت سنگھ اور اُس کی مسز، میسرز دھیان سنگھ گیان سنگھ ٹرانسپورٹ کمپنی کا اکاؤنٹنٹ لانبہ اور اُس کی آرٹسٹ بہنیں شیلم اور اُرو دھا!

ہال کے مغربی حصے میں بلیرڈ کے ٹیبل پر شور ہو رہا ہے۔ مردوں کے قہقہے بہت خوفناک ہیں، عورتوں کی چیخیں سُریلی۔ میں بیرے سے ایک اور بیئر لے آنے کے لئے کہہ دیتا ہوں اُسی لمحے اچانک سالینا بھیڑ میں سے نکلتی ہوئی نظر آئی۔ سب سے معذرت سی کرتی ہوئی۔ میرے قریب سے گذری تو مجھے دیکھ کر ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ سر اُٹھا کر میں نے بھی دیکھا۔ اُس کے چہرے پر گزشتہ کئی ہفتوں کے کرب کی گہری چھاپ تھی۔ جو بہت نفاست سے کئے ہوئے میک اَپ سے بھی نہیں چھپائی جا سکی تھی۔ میں اُس کی طرف دیکھتا سا رہ گیا۔ کچھ لمحے ایک دوسرے کی طرف اسی طرح دیکھتے ہوئے گذر گئے۔ حیرانی میں، تاسف میں ہمدردی میں بھی!

پھر وہ اپنے آپ ہی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ خاموش۔ سوچتی ہوئی سی۔ میں بھی چُپ تھا۔ سوچ رہا تھا۔ چاہتا تھا مناسب الفاظ میں اُس سے

اُس کے بعد مسکرا کر اُس نے مناسب الفاظ لئے نہیں۔ محسوس ہوا جو کچھ بھی کہوں گا اُس میں بناوٹ زیادہ ہوگی!

تب وہ خود ہی بول اُٹھی ——— "کیسے ہو ڈِکی؟" سیدھے میری آنکھوں میں دیکھا۔

"فائن! حسبِ معمول!" میں نے بھی آنکھیں چُرانے کی کوشش نہ کی۔

"کب آئے؟"

"چند ہفتے پہلے۔"

"چُھٹی پہ ہو؟"

"ہاں!"

اُس نے مجھ پر سے نظریں ہٹا لیں۔ میز پر پڑے میرے تمباکو کے پوچ کے ساتھ کھیلنے لگی۔ اُسے کبھی کھولتی کبھی بند کرتی۔

"تمہیں معلوم ہے میرے ڈیڈی کی ڈیتھ ہو گئی ہے!"

"ہاں معلوم ہے۔ ایک لوکل اخبار میں اُن کی تصویر بھی چھپی تھی۔"

"آئے نہیں؟ میں انتظار کرتی رہی۔ ایک دن ممی بھی پوچھ رہی تھیں۔"

"آئی ایم سوری سالینا!"

اِشارے سے میں نے بیرے کو بُلایا۔ سالینا سے کہا۔ "کچھ منگوا اپنے لئے۔"

اُس نے کوکا کولا لے آنے کے لئے کہا۔ اب میں نے قدرے سکون محسوس کیا۔ چاہا مسکراؤں۔ وہ بھی مُنہ لٹکائے ہوئے نہیں بیٹھی تھی۔ کئی روز کی افسردگی کے بعد مُسکرانا چاہ رہی تھی۔ میں نے اُسے یاد دلایا ——— "تمہارے ڈیڈی مجھ سے کتنی نفرت کرتے تھے۔ آج تک بھول نہیں سکا ہوں!"

"لیکن اب تو وہ رہے بھی نہیں!"

"میں ابھی تک اندر سے کھولتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔"

"کوئی اور بات کرو ڈِکی! کتنی مُدّت کے بعد تو ہم ملے ہیں۔ یاد ہے دو سال کے بعد!"

"آخری بار ہم تمہارے برتھ ڈے پر ساتھ تھے۔ مجھے یاد ہے۔"

"میارے برتھ ڈے سے پچھلے ہفتے تھا۔ اُف اُس دن ہم کتنے اُداس تھے ڈِکی، تصور کر سکتے ہو! ممی اور میں دونوں روتی رہیں!"

"اپنے ڈیڈی کو یاد کر کے نا؟"

"آف کورس! لیکن تم بھی یاد آتے رہے! یقین نہیں آتا؟"

"لیکن تم نے تو ہمیشہ اپنے ڈیڈی پر زیادہ یقین کیا ہے!"

"اُس کے باوجود تمہیں بھی ہمیشہ پسند کیا ہے ڈِکی!" اُس کے لہجے میں ایک مسرت بھری بر رہی تھی۔

"لیکن سالینا! جو کچھ وہ تم سے کہتے رہتے تھے اُسے تم [illegible]"

"اگر ایسا ہے بھی تو کیا ہوا؟ میں نے تمہاری کمزوریوں کو کبھی [illegible] کیونکہ مجھے معلوم ہے تم پھر بھی بہت اچھے آدمی ہو!"

"مجھے اِسی بات کا زیادہ دُکھ ہے سالینا! تم مجھ سے نفرت کیوں نہیں [illegible] جبکہ اِس کلب کے بیشتر لوگ جو اِس وقت بھی موجود ہیں تمہارے ڈیڈی کی وجہ سے مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ اب بھی!"

"لیکن میں اُن کی موجودگی میں تمہارے پاس بیٹھی ہوں! تم اِس بات کی داد کیوں نہیں دیتے؟"

میں کچھ دیر کے لئے چُپ ہو گیا۔ گھونٹ گھونٹ بیئر پیتا رہا۔ اُس کی طرف بھی دیکھتا رہا۔ وہ مُسکراتی رہی۔ اِس اعتماد کے ساتھ کہ اُس کی باتوں میں حقیقت اور منطق تھی۔

میں نے کہا ——— "تم جانتی ہو میں بہت صاف گو ہوں۔ دل میں آئی ہوئی بات کبھی چھپا کر نہیں رکھتا۔ جس دن تمہارے ڈیڈی کی ڈیتھ کی خبر پڑھی مجھے ایک دوسری ہی طرح کی تکلیف پہنچی۔ وہ بیمار ہو کر مرے۔ کاش اُن کا قتل میرے ہاتھوں سے ہوا ہوتا!"

"ڈِکی! اتنے ظالم مت بنو! میں تم سے ہمدردی کی توقع رکھتی ہوں۔ اور سب لوگوں سے کہیں زیادہ!"

"لیکن یہ سب سچ ہے جو میں نے کہا ہے۔ میں ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔"

"بیئر تمہارے سر پر چڑھ رہی ہے اور مت منگانا۔ چلو باہر چلیں اُٹھو ڈِکی! تمہارے پاس جیپ ہے نا! ایک لمبی ڈرائیو کیوں نہ کریں آج؟"

چاہا معذرت کر دوں۔ وہ میرے قریب تر رہنا چاہتی ہے لیکن اپنے باپ کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سُننا چاہتی۔ لیکن میں بل ادا کر کے اُس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ شام کا دُھندلکا غائب ہو چکا تھا۔ بجلی کی روشنی اور زیادہ چمکیلی ہو گئی تھی۔ وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کر کے پوچھا۔ "کس طرف چلیں؟"

"جدھر چاہو! لیکن خدا کے لئے کچھ اور بھی باتیں کرو۔ تمہارے مُنہ سے بہت کچھ سُننا چاہتی ہوں۔ آرمی میں تم کہاں کہاں رہے ہو؟ مجھے معلوم ہے تم نے اچانک کمیشن کیوں لے لیا تھا! تمہیں ہمیشہ ایک [illegible] ہے۔ اپنے مُلک کے دشمنوں کے بھی ساتھ [illegible] کے بھی ساتھ اور دونوں محاذوں پر [illegible]

میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا۔ جیب کو گلی میں سے نکال کر ایک کشادہ سڑک پہ ڈال دیا۔ سڑک پہ شفتالو کے پتے بچھے ہوئے تھے۔ ہوا نہیں تھی ورنہ وہ انہیں اِدھر اُدھر اُڑا لے گئی ہوتی۔ جیپ کی تیز رفتار سے وہ ذرا دیر کے لئے اپنی جگہ سے اچھل کر کنارے جا لگتے تھے۔ لیکن پہیوں کے نیچے آ کر اُن کے پسنے اور چٹخنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کہا —— "سالینا! میری جیب میں سے پائپ اور پوچ نکال لو۔ پلیز۔ ذرا تمباکو بھر کے بھی دیدو تھینکس!"

وہ ہنستی ہوئی بولی —— "منو! میں تم کتنی لڑکیوں سے ملے ہو؟ سچ سچ بتانا مجھ سے انتقام لینے کے لئے کبھی کسی سے پیار کیا؟"

میں نے اُس کے ہاتھ سے بھرا ہوا پائپ لے کر دانتوں کے درمیان دبا لیا۔ اُس نے سلگانے میں میری مدد کی۔ ایسا کرتے وقت وہ میری طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ مجھے احساس ہوا۔ لیکن میری نظر سامنے جمی ہوئی تھی۔ آگے لمبی ہوتی سڑک پر جس کے ختم ہونے کی فی الحال کوئی امید نہ تھی۔ کم سے کم ایک دو گھنٹے تک۔

اُس نے بجھی ہوئی سلائی انگلیوں کے درمیان گھماتے ہوئے کہا —— "اُدھر میں نے بہت باقاعدگی سے ڈائری لکھی تھی۔ تمہارے بارے میں جو کچھ بھی سوچتی تھی —! کبھی نفرت سے، کبھی محرومی کے احساس سے! پڑھو گے؟ کبھی گھر آؤ۔ تمہاری طرح میں بھی ہنگ بول سکتی ہوں ڈکی!"

میں نے رفتار اور بڑھا دی تو وہ میرے کندھے سے لگ گئی۔ بولی "کتنا اچھا معلوم ہو رہا ہے اس طرح ڈرائیو کرنا! اور تیز چلاؤ ذرا!"

چند میل —— بہت خاموشی سے گذر گئے۔ ویران سڑک پر بہت دیر کے بعد کوئی ٹرک سامنے سے آتا ہوا نظر آتا اور زن سے پاس سے گذر جاتا۔ میرا خیال ہے اُس نے میرے کندھے پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اچانک ایک موڑ کاٹ کر میں نے واپس آنے کے لئے گاڑی گھمائی تو وہ بولی —— "ایک جگہ میں نے لکھا ہے۔ ڈکی مجھے اِس شہر کی سب سے خوبصورت لڑکی کہتا تھا۔ یقین نہیں آتا میں واقعی ایسی ہوں! اگر کبھی ملے گا تو اُس کے منہ سے پھر یہی سننا چاہوں گی!"

اُس نے میرے کندھے سے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ہوا کے تیز جھونکے اُس کے ترشے ہوئے بھورے بال اُس کے چہرے پر اُڑا رہے تھے۔ میں آہستہ سے ہنس پڑا اور گاڑی روک لی۔

سالینا نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کچھ پریشان ہو کر کہا —— "گاڑی یہاں کیوں روک لی؟ یہ تو قبرستان ہے۔ جانتے ہو ڈیڈی اسی قبرستان میں دفن ہیں!"

میں نے سر گھما کر قبرستان کی طرف دیکھا۔ گاڑی کو پھر اسٹارٹ کرنا چاہا تو اُس نے مجھے روک دیا۔ کہا "میرے ساتھ اندر چلو گے؟ صرف چند منٹ کے لئے آ ہی گئے ہیں تو!"

میں گاڑی کو قبرستان کے گیٹ تک لے گیا۔ پھر اُس کے ساتھ اندر چلا گیا۔ گھنے پیڑوں سے گھری ہوئی روشوں پر چلتے چلتے دائیں بائیں بے شمار قبروں کی طرف دیکھا۔ رات کی خاموشی میں کتنی ہی سفید سفید مملیں ہماری چاپ سُن کر جیسے چونک اُٹھیں تھیں۔ سالینا نے اپنا بازو میرے بازو میں ڈال لیا تھا۔

اچانک وہ ایک کچی قبر کے سامنے رُک گئی۔ مٹی سوکھ چکی تھی۔ کچھ لمحوں تک وہ میرے ساتھ لگی ہوئی کھڑی رہی۔ پھر میرے سامنے ہو کر بولی "میں اپنے اندر کی ساری نفرت یہیں چھوڑ کر جانا چاہتی ہوں۔ اپنے ڈیڈی کی قبر کے پاس اُن کی قبر پر کھڑی ہو کر عہد کرتی ہوں میں پُوری زندگی تمہاری خدمت کے لئے وقف کر دوں گی۔ کیا تم بھی ڈکی ایسا وعدہ کر سکتے ہو؟"

میں نے اِنکار میں سر ہلا دیا۔ کہا کچھ نہیں۔ یہ دیکھ کر اُس کے آنسو نکل پڑے۔ سسک کر بولی "ڈکی تم اتنے کٹھور کیوں ہو؟ وعدہ کرو تا تم پچھلی ساری باتیں بھول جاؤ گے!"

میں نے کہا —— "کاش ایسا کر سکتا!"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے ڈکی!"

"آؤ چلیں" میں نے کہا اور اُسے باہر لے آیا۔

اب ہماری گاڑی بہت دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ راستے میں کوئی بھی نہ بولا۔ اسٹیشن روڈ پر ایک پرائیویٹ کلینک کے سامنے میں نے گاڑی روک لی۔ سالینا سے کہا "چند منٹ کے لئے میں یہاں رُکوں گا۔ اُس کے بعد تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا۔"

اُسے جیپ ہی میں چھوڑ کر میں کلینک کے اندر چلا گیا۔ ڈاکٹر سعیدہ عالم مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بولی —— "آج بہت دیر کر دی آنے میں؟ شوبھا کئی بار پوچھ چکی ہے۔"

ایک چھوٹے سے کمرے تک وہ میرے ساتھ ساتھ گئی۔ وہاں پلنگ پر ایک نوجوان لڑکی نیم دراز تھی۔ مجھے دیکھ کر مُسکرا دی۔ اُس کے پاس ایک الگ پنگوڑے میں ایک ننھا سا بچہ سو رہا تھا۔ میں پہلے بچے کی طرف گیا۔ پھر شوبھا کے پاس بیٹھ کر پوچھا "کھانا کھا لیا!"

اُس نے اثبات میں سر ہلا کر پوچھا —— "آپ نے؟"

"ابھی جا کر کھاؤں گا۔"

اُس نے اور کچھ نہ پوچھا۔ ڈاکٹر ہی نے اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میں نے اچانک سر گھمایا تو دروازے میں سالینا کو کھڑی دیکھا۔ حیران اور خاموش۔ میں اُس کے پاس چلا گیا۔ پلنگ کی طرف اشارہ کر کے کہا —— "یہ شوبھا ہے!"

وہ باہر چلی گئی۔ باہر اچانک ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ برآمدے میں
جا کر ہم کھڑے ہو گئے۔ سالینا سے کہا —— "اب پوچھو۔ شوبھا کون ہے؟"
لیکن وہ اُسی طرح چُپ رہی۔ میں نے بتایا۔ "یہاں میں نے اپنا نام شوبھا
کے بچے کے باپ کے طور پر درج کرا رکھا ہے۔ لیکن وہ میرا بچہ نہیں ہے۔ تمہیں
یاد ہے جنگ کے زمانے میں ایک مہم ڈیفنس فنڈ جمع کرنے کے لئے چل پڑی
تھی۔ ہم فوجیوں کی امداد کے لئے۔ شاید تم نے بھی کہیں کام کیا ہوگا! مجھے
معلوم نہیں کہاں! اس لڑکی نے بھی بڑے جوش و خروش سے خدمت کی تھی۔
مجھے یہی بتایا ہے۔ کسی سے محبت بھی کرتی تھی۔ دونوں کو اُسی مہم کی وجہ سے
ایک دوسرے سے بہت قریب رہنے کا موقع ملا تھا۔ اُنہیں زیادہ سے زیادہ
موقع فراہم کرنے والا کوئی فرنیچر کا سوداگر بھی تھا۔ اپنے محلے کا وہی لیڈر تھا۔
شوبھا کہتی ہے بہت بھلا آدمی تھا۔ سب کچھ جانتا تھا۔ اُنہیں پروٹیکٹ
بھی کرتا رہا۔ لیکن اُسی مہم میں ایک اور شخص بھی شامل ہو گیا۔ مسٹر ایڈورڈ!
کیا تم اب سب کچھ یاد کر سکتی ہو؟ شوبھا مجھے ملی تو ماں بننے والی تھی کہتی ہے
اُس کی زندگی میں کرائسس لانے والا ایڈورڈ تھا۔ تمہارا فادر! اُس کا بوائے
فرینڈ تو بڑا احمق تھا۔ بالکل ایڈیٹ۔ شوبھا کی بپتا سنتے ہی اُسے چھوڑ کر چل دیا۔ مجھے
کیا معلوم تھا یہاں چھٹی پہ واپس آؤں گا تو تمہارے ہی باپ کی ایسی اولاد کا باپ
بننا پڑے گا۔"

سالینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب وہ [illegible]
سڑک پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔ بھیگی ہوئی سڑک پہ [illegible]
پھر بولی۔ "لیکن تم اس سے محبت نہیں کرتے! مجھے یقین ہے"
"تو کیا ہوا۔ دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو ساتھ رہ کر بھی ایک
دوسرے سے محبت کبھی نہیں کرتے" میں نے بہت کوشش سے آنکھوں میں آنسو
نہ آنے دیئے۔ لیکن اُس نے میری تھرتھراتی ہوئی آواز سے بھانپ لیا۔ میری طرف
دیکھا۔ پھر اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ جانے کے لئے قدم بڑھایا تو میں نے کہا ——
"تمہیں چھوڑ آتا ہوں"
"نہیں۔ تھینک یو۔ چلی جاؤں گی۔ تم شوبھا کے پاس ٹھہرو"
یہ کہہ کر وہ جلدی سے سڑک کی طرف بڑھ گئی۔ میں وہیں کھڑا اُسے جاتے ہوئے
دیکھتا رہا۔ بھیگی ہوئی سڑک پر سر جھکائے!
سالینا چلی گئی، لیکن اُس کا آنسوؤں سے بھیگا اُجلا اُجلا عکس بہت دیر تک
میرے سامنے ڈوبتا رہا —— اُبھرتا رہا۔

---

غیر مطبوعہ مضامین واپس منگوانے کیلئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے ورنہ [illegible]
اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھیئے۔ ہم واپسی سے معذور ہیں گے۔ (ایڈیٹر [illegible])

---

# غزل

[illegible]

میں عبث تجھ کو ڈھونڈتا تو نہیں — تو مجھی میں کہیں چھپا تو نہیں
تو ہی در پردہ بولتا تو نہیں — دل کی دھڑکن تری صدا تو نہیں
کیوں ابھی سے ہے دل پہ رعب جمال — پردۂ مدعا ابھی اُٹھا تو نہیں
نگۂ شوق یہ بھی سوچا ہے — دیکھنا اُن کا ناروا تو نہیں
آپ نے سن لیا، یہ بات ہے اور — آپ سے ہم نے کچھ کہا تو نہیں
اک زمانہ جو ہم سے برہم ہے — آپ ہم سے کہیں خفا تو نہیں
مجھ کو یہ وہم ہے کہ اب بھی مجھے — کوئی چھپ چھپ کے دیکھتا تو نہیں
کس سے اب ماجرائے درد کہیں — اب کوئی درد آشنا تو نہیں
حسرت عرض تمنا ہے مگر کیا — جرأت عرض مدعا تو نہیں
روز و شب کی اذیتیں [illegible] — [illegible]

کیا [illegible] کر جاب
[illegible] پاس تو نہیں

# احساس

—— اظہر عباس زیدی ایم۔ اے (علیگ)

۲۴۔ ڈائی۔ ایم۔ سی۔ اے، وولز ہوسٹل، نئی دہلی نمبر ا

محترمی گرامی صاحب! آداب

ایک نئی کہانی بغرضِ خدمت ہے۔ "چار آنسو" (اپریل ۹۷۰ء) کے بعد کچھ نہ بھیج سکا، اس کے لئے افسوس ہے۔ وجہ، تعلیمی مصروفیات تھیں۔ اُس کہانی کی اشاعت کے بعد مجھے ملک اور بیرونِ ملک سے بے شمار خطوط موصول ہوئے۔ میں اُن تمام قارئین کا ممنون ہوں جنھوں نے اپنی پسند سے نوازا۔ جن لوگوں کو جواب نہ دے سکا اُن سے معذرت خواہ ہوں —— یہ کہانی یونیورسٹی میں پڑھنے والی ایک لڑکی کے 'احساس' کی کہانی ہے۔ اُمید ہے آپ کو اور قارئین کو پسند آئے گی۔ اِس میں میں نے ذہنی رَو کی تکنیک استعمال کی ہے —— ۷ اکتوبر کو 'گے ٹائم' ریسوران میں آپ سے مختصر ملاقات اکثر یاد آتی ہے۔ اُسی دن میں نے آپ کو بتایا تھا کہ دہلی کی ایک فرم میں جونیئر ایگزیکٹیو ہوگیا ہوں —— علی گڑھ یونیورسٹی کے نوجوان ادیبوں کی انجمن 'ہم راہی' نے اپنے ممبران کی تخلیقات کا مجموعہ 'آوازیں' شائع کیا ہے جسے میں نے ترتیب دیا ہے، آپ کی خدمت میں ارسال ہے۔

آپ ہی کا —— اظہر عباس زیدی

ستمبر کی وہ شام حسبِ معمول نم تھی۔ بادل شام ہی سے چھائے ہوئے تھے۔ لیکن بارش دس بجے کے بعد شروع ہوئی۔ ہوا بھی کچھ تیز تھی۔

گرلس ہاسٹل کے زیادہ تر کمروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ بارش شروع ہوتے ہی لڑکیاں کورس کی کتابیں چھوڑ کر کچھ 'لائٹ' چیزیں لے کر بستروں میں گھس گئیں —— کسی ملک کے کسی رومانی ناول یا فلمی رسائل میں کھوئی کھوئی آہستہ آہستہ نیند کی طرف بڑھنے لگیں۔ گیارہ بجے تک زیادہ تر کمروں کی لائٹ بند ہو گئی۔

کمرے میں ابھی تک روشنی ہو رہی تھی۔ شالی نے ناول ختم کر کے تکیے کے نیچے کھسکا دیا، بستر سے اٹھ کر وہ کھڑکی کے پاس آئی —— اب ہلکی ہلکی بوندیں گر رہی تھیں۔ [illegible] اُس کے چہرے پر پڑیں۔ اُسے عجیب سا [illegible] کا احساس ہوا اور وہ بستر کی طرف واپس [illegible] سو رہی تھی۔

[illegible]

"ڈرتی ہے تو ایسی کتابیں کیوں پڑھتی ہے؟" وہ آہستہ سے بڑبڑائی —— اور اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

چھوٹی ٹائم پیس میں صرف ایک ہی سوئی نظر آ رہی تھی۔ شاید بارہ بجے تھے۔ دُور کالج کے گیٹ کا گھنٹہ بھی بج رہا تھا لیکن نیند کا کہیں نام نہ تھا۔ روز وہ سوچتی جلد سو جائے تاکہ صبح جلد اُٹھ سکے۔ سات بجے سے کلاس شروع ہوتے تھے۔ زیادہ تر لڑکیاں چار اور پانچ کے بیچ اُٹھ جاتیں تاکہ اچھی طرح تیار ہو کر کلاس پہنچ سکیں لیکن اُسے تیاری کے لئے ہمیشہ ایک ہی گھنٹہ مل پاتا۔ روز وہ سوچتی چھ بجے سے پہلے اُٹھے گی لیکن ہمیشہ رات کو دیر سے سوتی —— "کل سے میں بھی جلد سویا کروں گی" —— ایک گھنٹہ میں [illegible] ناشتہ اور تیاری ناممکن ہے۔ جلدی میں کتنے ہی دِنوں سے وہ سیدھے ہی [illegible] کلاس جاری تھی [illegible] کا فیشن [illegible]

[illegible] کل میں بھی جلد سو جاؤں گی [illegible]

سنا [illegible] ہے، رات کو کافی پی لو تو نیند نہیں آتی۔ لیکن میں نے تو کبھی رات کو کافی نہیں پی۔۔۔۔۔ اور وہ کمبخت عارف اُس دن کلاس میں کسی لڑکے سے کہہ رہا تھا، اگر کسی سے محبت ہو جائے تو رات میں نیند نہیں آتی۔

دیپ نے پھر کروٹ بدلی۔ تکیہ تھوڑا سا کھسکا۔ نیچے سے ایک تصویر جھانکنے لگی۔۔۔۔۔ راکیش کی تصویر۔۔۔۔۔ راکیش دیپ کا منگیتر!

کمبخت ہمیشہ تکیہ کے نیچے رکھ کر سوتی ہے۔۔۔۔۔ اب تک کئی تصویریں خراب کر چکی ہے۔

باہر بارش تیز ہو چکی تھی۔ ہوا کا رُخ بھی بدل گیا تھا۔ پانی کے چھینٹے کمرے میں آ رہے تھے۔ اُس نے اُٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔

"گُڈ نائٹ"۔۔۔۔۔ اُس کی نظر تکیہ کے غلاف پر پڑی۔ نہ جانے کیوں لوگ غلاف پر گُڈ نائٹ لکھواتے ہیں۔ اپنی ایک دوست کے کاڑھے ہوئے غلاف کو اُس نے اُلٹا کر دیا۔ نیند کا اب بھی کہیں نام نہ تھا۔ کاش جلد سو جاؤں تو صبح جلد اُٹھ سکوں۔ لیکن کیوں؟ شیمپو، اونچے بال، لپ اسٹک! پرنسپل کیا کہے گی۔ دیپ تو خاصی ٹپ ٹپ (pulling up) کرے گی۔ کلاس جانے سے پہلے ہی برق کا آشیانہ لُوٹ چکے گی۔۔۔۔۔ آشیانہ میں وہ رات بہت تاریک تھی۔ کوٹھی میں مالکن جو اب اپنی ہی کوٹھی کے ایک حصہ میں کرایہ دار ہو گئی تھی، آرام سے سو رہی تھی۔ بے بی اور انجی ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے پاس ہی لیٹے تھے۔۔۔۔۔ انجی کے ہاتھ سے سوتے میں کتاب چھوٹ کر پاس ہی گر گئی تھی۔

"معلوم نہیں بے بی اور انجی کی فیس گئی یا نہیں۔۔۔۔۔ کرایہ دار ہر ماہ نہ جانے کیوں وقت پر کرایہ نہیں دیتے۔۔۔۔۔ یہاں تو فیس ہم سے ہر ماہ لے لی جاتی ہے۔ اِس مہینہ تو کھانے کے چارجیز بھی بڑھ گئے۔ بندو دھوبی نے دُھلائی بڑھا دی۔ انجی کی فیس معلوم نہیں معاف ہوتی یا نہیں۔ ممی نے منی آرڈر ابھی تک نہیں بھیجا۔ آج چھ تاریخ ہو گئی۔۔۔۔۔ کلینڈر پہ ابھی گزرا ہی مہینہ لگا ہوا تھا۔۔۔۔۔ کل یہ صفحہ اُکھڑ جائے گا اور چار ماہ بعد یہ کلینڈر کتنا پرانا ہو جائے گا۔ دیوار پر لٹکانے کے لائق بھی نہیں۔۔۔۔۔ لٹکایا گیا جب بھی کوئی گناہ نہیں اُتار گیا جب بھی بے گناہ۔۔۔۔۔ زندگی کی صلیب پر میں کیوں لٹکی ہوں۔۔۔۔۔ کوئی گناہ؟ عیسیٰ کو تو شاید اپنا گناہ معلوم تھا۔۔۔۔۔ اور شاید کلینڈر کا وجود لٹکنے اور اُترنے کے لئے ہی ہے۔۔۔۔۔ لیکن ہم کیوں لٹکے ہیں زندگی کی صلیب پہ۔۔۔۔۔ کل چرچ میں روزی کا پرس چوری ہو گیا۔ کرایہ یقیناً مجمدار نے نہ دیا ہو گا۔ ریس کورس بھی تو ضروری ہے۔ آٹھ سو روپے پاتا ہے۔ ریس، کھانا، شراب، پچاس روپیہ مکان کا کرایہ اور سو روپیہ مجمدار کو بنگال کے کسی گاؤں میں منی آرڈر۔۔۔۔۔ ٹیگور کتنا بڑا شاعر تھا!"

شالی سوچتی رہی، بستر احساس کی چٹان بن گیا۔ [illegible] نے مکان کی ایک کرایہ دار کرسچن لڑکی سے شادی رچالی اور [illegible] اور ماں کو چھوڑ گیا۔۔۔۔۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ کھڑکی کی جالی پر ایک [illegible] اچانک ایک چپکلی لپکی اور روشنی اندھیرے کے غار میں غائب ہو گئی۔

اندھیرا! ہاں اندھیرا کتنا اچھا ہے! کاش دنیا میں ہر وقت اندھیرا [illegible] رہے تو یہ اونچے بال نہ بنانے پڑیں، ساڑی نہ رفو کرنا پڑے۔ ایسا اندھیرا جو چھا جاتی اُس کے وجود پر چھپالیں ان سارے زخموں کو گناہوں اور [illegible] چہروں کو، پُر فریب مسکراہٹوں کو جو صدیوں سے مہذب انسان کا [illegible] ایسا نہیں ہو سکتا۔ روشنی انسان کی سب سے بڑی میراث ہے سب سے بڑی دولت۔ روشنی خدا ہے، پیغمبر اور دیوتا ہے۔ لیکن اندھیرے سے زیادہ خطرناک پھیلے ہوئے ہاتھ دیکھتی ہے، پھٹے ہوئے دامن دیکھتی ہے، مکر و فریب سے [illegible] ربر کے چہرے دیکھتی ہے۔۔۔۔۔ ہمیں ایسے ایوانوں میں لا کھڑا کرتی ہے جہاں آداب اور القاب کے دریا بہتے ہیں، پہلے آپ اور لیڈیز فرسٹ کی صدائیں [illegible] ہیں۔۔۔۔۔ اور روشنیاں بند کمروں کی طرف مُڑ جاتی ہیں۔۔۔۔۔ پھر اندھیرے چھا جاتے ہیں۔۔۔۔۔ دیپ اندھیرے میں ڈرتی کیوں ہے۔۔۔۔۔ اُس کا منگیتر دو ہزار روپے رشوت دے کر ایک پرائیویٹ فرم میں نوکر ہو گیا۔ دیپ اُس سے اور زیادہ محبت کرنے لگی۔

معلوم نہیں مجمدار کرایہ کیوں نہیں دیتا۔ بے بی اور انجی کے گرم کپڑے کیسے بنیں گے۔۔۔۔۔ شالی کا ذہن اُلجھتا رہا۔ چھوٹی ٹائم پیس کا دل دھڑکتا رہا۔ اب دو بج چکے تھے۔ اُسے نیند کیوں نہیں آتی! صبح کلاس جانا ہے اور میک اپ بھی کرنا ہے۔ ورنہ پرلیس کے لڑکے بور سمجھیں گے۔ لیکن پھٹی ہوئی [illegible] وہ نیلی ساڑی!

"ویری گُڈ! شالی۔۔۔۔۔ ہاؤ سمارٹ یو آر ٹائم ہوں [illegible]"

"شاہد! کیا تم چاہتے ہو میں تمہارے سوٹ کی تعریف کروں؟"

"بھئی تعریف تو اُس خدا کی جس نے تمہیں اور اس نیلی ساڑی کو بنایا [illegible]"

وہ میرے رومال لائیں۔۔۔۔۔ ارے یہ دو (S) [illegible]

نام تو شاہد کلیم ہے۔ یعنی "S-K"

"نہ جانے کیوں ایسے تم کل [illegible] شالی [illegible]"

"او شالی! ابھی [illegible]

پھر دیکھنا۔ بس ذرا اُنکل کو آجانے دو [illegible]

میں ایسا [illegible]"

سر میں درد چاہے جس وجہ سے ہو
ایک ہی
سیریڈون سے
غائب!
ایک ہی سیریڈون سے درد جلد دور ہو جاتا ہے
اس کے علاوہ سیریڈون میں موجود خاص اجزا کی
بدولت نہ صرف سر کے درد، بدن کے درد
یا دانت کے درد سے پیدا ہونے والی تکلیف
دور ہو جاتی ہے بلکہ آپ میں ایک نئی چستی اور
پھرتی بھی آجاتی ہے۔ یہی تو ہے سیریڈون کی خاصیت!
سیریڈون
روش
شور وغل کی وجہ سے
سر میں درد
زیادہ کام کرنے یا عام تھکان کی وجہ سے
سر میں درد
آپکو پست اور بدحال رکھنے والے دنوں کی وجہ سے
سر میں درد
شدید دھوپ اور گرمی کی وجہ سے
سر میں درد
ناک بند ہونے اور سخت سردی زکام کی وجہ سے
سر میں درد
آنکھوں پر بار پڑنے اور زیادہ پڑھنے لکھنے کی وجہ سے
سر میں درد
روش کا تیارکردہ
سول ڈسٹری بیوٹرز : وولٹاس لمیٹڈ

"ہرپشں! یہ بتاؤ کہ یہ ریکھا دیوی کون ہے؟ لیکن میری بات یاد رکھو ایسی لڑکیوں میں زہر بھرا رہتا ہے۔" وہ کافی کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولے۔

میں ایکدم بھڑک اُٹھا۔

"آپ تو کہتے تھے کہ آپ نے وہ خط نہیں پڑھے؟"

جواب میں پانڈے جی نے زور کا قہقہہ لگایا۔ کافی اُن کے نتھنوں سے نکل کر یم تشتر دھار کر مونچھوں پر پھیل گئی جسے وہ کھدر کے رومال سے صاف کرتے ہوئے بولے۔

"میں نے پڑھا کب ہے۔ اگر خوشبودار کھلا خط سامنے رکھا ہو تو میں میں کیسے بند کر سکتا ہوں۔ دوستوں کے راز دوستوں سے چھپے کب رہتے ہیں۔ کوئی چِنتا نہ کرو۔" وہ ہاتھ سے میری پیٹھ سہلانے لگے۔

"رہنے دیجئے پانڈے جی۔" میں نے سر ہلا کر اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

"چھوڑنے کی بات کہاں ہے؟ میں تو پوچھ رہا ہوں کہ یہ کیا ماجرا ہے؟"

پانڈے جی کے گرہ لگانے پر مجھے ہنسی آگئی اور میں نے مختصراً بتا ہی دیا۔

"پانڈے جی خط ایک لڑکی کا ضرور ہے۔ لیکن کسی لڑکی کا خط کوئی قابلِ عتراض بات نہیں ہو سکتی۔ میں نے ایک نظم لکھی تھی۔ وہ اس لڑکی نے کہیں پڑھ لی۔ سے پسند آئی اور اس نے اپنے جذبات کا اظہار کچھ کھلے الفاظ میں کر دیا۔ آپ کی ہوں نے یہی الفاظ دیکھے تھے نا ——

'جی چاہتا ہے لکھنے والی اُنگلیاں چوم لوں!'

"ہاں۔ ہاں۔ میں قابلِ اعتراض کب کہتا ہوں —— ہاں اُنگلیوں سے ازا اچھا ہے۔"

میں پانڈے جی کے طنز پر کٹ گیا اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ بول اُٹھے۔

"ہرپشں خالی کافی پینے میں تو کچھ مزہ نہیں آیا۔ کچھ ساتھ بھی ہونا چاہئے!" ر اُنھوں نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ایک پلیٹ پکوڑا اور رسگلوں کا آرڈر ے دیا۔

رسگلے بہت لذیذ تھے۔ مُنہ میں رکھتے ہوئے دانت تلے اُنگلی آگئی۔ ایک نسی سی سارے جسم میں پھیل گئی۔ پانڈے جی بمشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولے

"اِن اُنگلیوں سے ذرا احتیاط سے کام لیا کرو۔ لوگوں کو بہت پسند ہیں۔" نھوں نے مجھے پھر چھیڑنا چاہا۔

"پانڈے جی! ایسی خط و کتابت تو ادبی دُنیا میں ہوتی ہی رہتی ہے۔" ں نے پھر اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا۔

"ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن میں کہتا ہوں بات اُنگلیوں سے کچھ آگے بھی بڑھی ہے یا نہیں۔ ملاقات تو تین ماہ پہلے کی تھی۔"

میں ہر گیا۔ پانڈے جی بات اُن سے نکلوا کر ہی [illegible] رہیں گے۔ اِس لئے اِن سے چھپانا بیکار ہے۔

"ہاں فون پر ملاقات ہوئی تھی۔"

"کیا اُن کے ہاں فون ہے؟"

"کیوں نہیں۔ کالج میں لکچرر ہے۔ کہنے لگی کسی دن گھر تشریف لائیں۔ فون پر تو کھل کر بات نہیں ہو سکتی۔"

"تو تم گئے؟ کیسی نکلی؟" اور تیسرا ایک پلیٹ پکوڑے اور [illegible] پانڈے جی ۔ کے پاس سے گزرتے ہوئے بیرے کو آستین سے پکڑ کر ٹھہراتے ہوئے آرڈر دے دیا اور خود پھر میرے بیان میں ڈوب گئے۔

"میں نے ریکھا سے کہا کہ مجھے تو دفتر سے فرصت کم ملتی ہے۔ آپ ہی کسی دن تشریف لے آئیں، تو وہ کہنے لگی۔ کیا کسی اجنبی عورت کا اس طرح کسی دوسرے شخص کے گھر جانا زیب دیتا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ کسی اجنبی آدمی کا کسی عورت کے گھر جانا کیسے زیب دے سکتا ہے؟"

"بہت اچھا جواب دیا۔ شاباش! تو ملاقات کہاں ہوئی؟"

"میں نے کہا آپ شالیمار کافی ہاؤس میں آجائیے کافی پئیں گے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی "کافی بھی کوئی پینے کی چیز ہے؟ میں نے کہا پینے کی ایک اور چیز خونِ جگر ہے!" اور وہ زور سے ہنستے ہوئے بولی "کافی اور خونِ جگر کے درمیان اور بھی بہت سی چیزیں پینے کی ہیں!" میں اُس کے ذوق کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔"

"تو کیا وہ پی بھی لیتی ہے؟" میں نے کہا "ہو نا ہرپشں کچھ لڑکیاں ایسی نہیں ویسی کتنیاں ہی ہوتی ہیں۔ خیریت تو ہے؟ کیا گئے تھے؟ میرے خیال میں ایک ایک کافی اور منگوا لی جائے۔ بھوک کچھ چمک اُٹھی ہے۔ پھر کیا ہوا؟"

"وہ کہنے لگی آپ ہمارے ہاں تشریف لے آئیں۔ تب پھر جو چاہیں گے آپ کو پلاؤں گی۔ سکاچ، وہسکی، وائن، برانڈی، رم، کوکا۔ . . مگر آپ کیا پیتے ہیں؟ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا جواب میں وہ کھل کھلا کر ہنسی اور کہنے لگی "ہم سارے وہ سرینگر میں ٹھیکیدار ہیں۔ لیکن گھبراتے کیوں ہیں۔ آپ ادبی بات چیت کے لئے آ رہے ہیں یا چوری کے لئے؟" وہ ہنسی اور مجھ پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔"

میں نے دیکھا پانڈے جی کا سگریٹ بجھ گیا تھا۔ پیالے میں کافی ٹھنڈی ہو گئی تھی اور وہ ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے میری طرف یوں دیکھے جا رہے تھے جیسے میں چاند کی مخلوق ہوں!

---

اس دفتر میں برسوں کی رفاقت کے دوران پانڈے جی مجھ پر چائے کافی، سگریٹ اور شعر و ادب سے بھری باتیں ہی بکھیرتے رہے۔ لیکن اب جب بھی موقع ملتا وہ میرے قریب سے گزرتے ہوئے پوچھتے:

"ہریش! چائے منگواؤں۔ چائے پیئے چلو گے؟"

یا وہ پھر یوں ہی کہہ جاتے:

"ہریش بابو! پانڈے جی کی چائے آگئی ہے۔ وہ یاد کرتے ہیں۔"

چائے پیتے پیتے مجھے دل ہی دل میں خوب ہنسی آتی۔ کچھ دیر تو پانڈے جی خاموش بیٹھے رہتے لیکن کسی نہ کسی بہانے ماہ وشِ لڑکیوں کے جلوؤں کا ذکر چھڑ ہی جاتا اور بات یہاں پر آکر ختم ہوتی کہ وہ انگلیاں چوم لینے کا کیا ہوا؟ میں بھی ہر بار دل کے مدفن سے ریکھا کا قالب کھڑا کرتا، اُسے حریری لباس پہناتا، رنگ روغن سے سجاتا اور پیش کر دیتا۔

"پانڈے جی! ریکھا لاجواب لڑکی ہے۔ باتیں ایسی کرتی ہے کہ انسان جھوم اٹھتا ہے۔"

"لیکن اُس آگ سے اپنا دامن بچائے رکھنا!"

"پانڈے جی! بے تکلف گفتگو میں تو کئی بار جسم سے شعلے نکلنے لگتے ہیں۔ پھر ایک شاعر کی بساط ہی کیا ہے؟ اِس آگ کے بعد کے اثرات سے بچنا آسان کام نہیں ہے پانڈے جی!"

"بات سولہ آنے سچ کہتے ہو ہریش۔ لیکن وہ تو کہتی تھی کہ وہ ٹھیکیدار ہے . . . چلو کینٹین چلیں۔ دفتر میں آتے آتے تو چائے ٹھنڈی، بے مزہ اور پھیکی ہو جاتی ہے۔"

اب پانڈے جی چائے کے ساتھ میٹھا اور نمکین ضرور منگواتے تھے ورنہ چائے کا خالی پیالہ تو بہت جلد ختم ہو جاتا تھا۔

"کبھی ٹھیکیدار سے بھی ملاقات ہوئی؟" پانڈے جی بات درمیان سے شروع کر دیتے۔

"وہ سری نگر میں ٹھیکیدار ہے پانڈے جی۔ لیکن مجھے اُس سے کیا واسطہ۔ اپنا تو لڑکی سے رابطہ ہے۔ لیکن کیا بتاؤں پانڈے جی لڑکی خوب ہے۔ کشادہ آنکھوں کی طرح کیا کشادہ مزاج پایا ہے۔ یہ آج کل کی لڑکیاں بھی پوری امریکن ہیں ایسے ایسے غضب کے اشارے کر جاتی ہیں اور فقرے کہہ جاتی ہیں کہ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔"

"مثال کے طور پر؟ اور کیا کھاؤ گے؟" پانڈے جی نے ذو معنی فقرہ کہنا چاہا۔

"مثلاً" میں نے ذہن پر زور دے کر سلسلہ ملایا۔ "مثلاً ایک دن ہم بیئر میں کوکا کولا ملا کر پی رہے تھے۔ وہ کہنے لگی۔ شاعر لوگ کہتے ہیں اگر کوئی حسین لڑکی جام بنا کر پیش کرے تو تخیل آسمانوں کو چھونے لگتا ہے۔ غزل کے دھاگے میں شعر سچے موتیوں کی طرح اترنے لگتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟" میں نے کہا: "میرا نظریہ تو یہ ہے کہ جب غزل خود جام میں چھلک رہی ہو تو وہاں لوح و قلم یک قلم موقوف ہو جاتے ہیں۔" وہ اُٹھ کر میرے بغل میں صوفے پر آبیٹھی اور کہنے لگی۔ "آپ بڑے وہ ہیں۔ میں تو ایک اصولی بات کر رہی ہوں۔" "لیکن میں کب بے اصولی بات کرتا ہوں۔ آپ جام بناتے ہوئے آئینہ دیکھئے اور بتلایئے کہ کہیں شعر و شاعر کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ جس طرح آئینے کی آنکھ اِس عکس سے حیران ہو جاتی ہے اُسی طرح شاعر کی زبان بھی گنگ ہو جاتی ہے۔"

"کیا ایسی باتوں کے دوران کوئی آ نہیں جاتا؟" پانڈے جی میری باتیں سنتے سنتے ایکدم چونک اٹھے۔

"پانڈے جی نئے دور کی آزادی اِسی چیز کا تو نام ہے۔ خود کماتی ہیں خود پھونک دیتی ہیں۔ کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ پھر اُس کے وہ تو ٹھیکیدار ہیں۔"

میں نے ہنستے ہوئے گھڑی دیکھی۔ دفتر بند ہونے کا وقت ہو رہا تھا اور ہم اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے آئے

---

ایک دن شام کو پانڈے جی کام کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ اُٹھ کر آنکھیں بند کئے ٹہل رہے تھے۔ میرے پاس سے گزرے تو کہنے لگے۔

"ہریش! آج تو کام کرتے کرتے دماغ کا بھرتہ بن گیا ہے۔ چلو ایک پیالہ کافی پی آئیں۔"

کینٹین میں میں نے کوپن خریدنے کے لئے بٹوہ کھولا تو پانڈے جی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنا بٹوہ نکالا اور ڈھیر سارے کوپن خرید لئے۔

"آج کینٹین والوں نے یہ گلاب جامن بہت عمدہ بنائے ہیں اور یہ قلاقند تو بہت ہی لذیذ ہے!" میں نے چکھتے ہوئے کہا۔

"ہریش! تمہیں اب ان چیزوں میں کیا لطف آتا ہوگا۔ اُن انگلیوں کا لطیف لمس، اُن ہونٹوں کے مد بھرے بول، وہ جام، وہ آزادی۔ سنا ہے سال ختم ہو رہا ہے، ہاتھ کی ریکھائیں کچھ اُبھری ہیں یا نہیں؟"

پانڈے جی کا اشارہ واضح طور پر ریکھا سے میری دوستی کے بارے میں تھا۔ لیکن میں تو ریکھا کو بہت دن سے جیسے بھول ہی گیا تھا۔ میز پر رکھے گلاب جامن

بہت لذیذ تھے۔ کافی میں سے گرم گرم بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ میں تخیل کے تانے بانے میں الجھ گیا تھا کہ ایک سر اہاتھ آتے ہی بولا۔

"پانڈے جی بہت دن سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سوچا شاید کم بالکل پاک۔ لیکن کرسمس سے ایک دن پہلے دفتر میں اس کا فون آگیا۔ ایسی بے باک عورت ہے پانڈے جی کہ میں آپ سے کیا بیان کروں۔ نہ جانے کالج میں لڑکیوں کو تعلیم دیتی ہوگی۔ کہنے لگی

'درشن دو گھنشام شام موری انکھیاں پیاسی رے'

"مہدتے" پانڈے جی جھوم اُٹھے۔ گو بظاہر وہ منہ میں رسگلا رکھے اُس کے رس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

میں نے ریکھا سے کہا ذرا آہستہ بولو۔ اِدھر تو آپ کے بغیر سب سنسان ہے مگر کوئی سنتا ہے تو سنتا رہے۔ میں نے پوچھا کیا حکم ہے؟ تو کہنے لگی ادرت کی برکھا ہوگی؟ پانڈے جی اُس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے اور نقش و نگار بناتی جاتی ہے۔ میں نے شکوہ کیا کہ تم نے خود ہی فراموش کر دیا تو کہنے لگی کرسمس رات ہماری محفل میں آؤ تو سب شکوے دُور ہو جائیں گے۔ ہم نے رات کے کھانے رقص کا نہایت اچھا پروگرام بنا لیا ہے۔"

"رات میں وہاں گیا۔ پانڈے جی کیا بتاؤں چاروں طرف رنگا رنگ قمقموں روشنی میں پانی کے فواروں نے جنتِ ارضی کا نقشہ باندھ رکھا تھا۔ طرح طرح مشروبات تھے، موسیقی تھی اور اہلِ محفل تھے۔ اُس کی کچھ سہیلیاں اور اُن کے دوست تھے۔ سازندوں نے دھنیں چھیڑیں تو فضا پر نشہ سا چھانے لگا۔ سمندر لہروں کی طرح سب ایک دائرے میں ہچکولے لے رہے تھے اور زندگی کے سب غم رات ان لہروں میں غرق ہو گئے تھے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں رات کے چار کب بجے! وہ کہنے لگی مجھے گھر پہنچا کر آپ چلے جایئے گا۔

میں حُسن کے لپکتے شعلوں کو دیکھ کر ہچکچا رہا تھا۔ میں جلنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ٹیکسی میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

میں اُس کے کمرے میں کچھ دیر ٹھہرا۔ اِس دوران میں وہ کہنے لگی۔ یہ تو دوستی کی ایسی باتیں ہیں کسی اور سے تو نہیں کہہ دیتے؟

میں نے اِنکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ تمہاری دوستی نے مجھے دُنیا سے بیگانہ کر دیا ہے لیکن ابھی اِتنا ہوش باقی ہے۔ ہاں میرے ایک دوست پانڈے جی ..."

"اسے... اسے... رہے... یہ کیا کہہ رہے ہو..." پانڈے جی یوں چیخے جیسے میں نے انہیں انجکشن لگا دیا ہو۔

"کچھ نہیں پانڈے جی میں نے ریکھا کے سامنے آپ کی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ ریکھا اکنامکس ہی کی نہیں انسانی نفسیات کی بھی طالب ہے۔ ہر انسان اُس کے لئے ایک کتاب ہے۔ وہ کہنے لگی ۳۱ دسمبر کی رات اُس کے ہاں کچھ دوست اور سہیلیاں مدعو ہیں نئے سال کا خیر مقدم کرنے کے لئے پارٹی ہوگی آپ پانڈے جی کو ضرور لائیں بہت اچھا شغل رہے گا۔"

"بیرا۔ ایک پلیٹ پکوڑا اور لانا!" پانڈے جی نے آواز لگائی۔

"پانڈے جی! لاجواب موقع ہوگا۔ ہم کس ماحول میں گھس گھس کر مر رہے ہیں یا زندہ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ہم اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں ہم نے ابھی تک روشنی کی کرن نہیں دیکھی، آزادی کا سانس تک نہیں لیا۔ اُس آزاد فضا کا ایک ایک لمس ایک ایک جام کا اثر رکھتا ہے۔ اُسے آپ ذرا محسوس تو کریں۔ کل کام ذرا جلدی نپٹا لیں تو یہیں سے ریکھا کے ہاں چلے جائیں گے۔"

"ہاں میں تمہارے ساتھ ضرور چلوں گا۔ تم جلدی چلے جانا"

پانڈے جی ایک شوگر کیوب منہ میں تیزی سے چبا رہے تھے جیسے کوئی مرچ کھا جانے سے اُن کی زبان جل رہی ہو!!

---

# غزل

پروفیسر ستار سہیل چشتی ایم کام (علیگ)

جن کی باہیں تھیں گلے میں کبھی ہاروں کی طرح
جب پڑا وقت تو چبھنے لگے خاروں کی طرح

آج پھر کوئی تصور میں چلا آیا ہے
مہکی مہکی ہوئی شاداب بہاروں کی طرح

میرے آنسو مرے دامن پہ ٹپک پڑتے ہیں
نیلے آکاش سے ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح

میری جانب بھی بڑھے ہیں کئی دامانِ کرم
جھوٹی اُمید کے کمزور سہاروں کی طرح

میری آغوشِ محبت بھی ہے ویراں اب تک
سُونی سُونی سی کئی راہگزاروں کی طرح

میری راہوں میں تری یاد کے جگنو اب تک
چمک اُٹھتے ہیں ہر گام ستاروں کی طرح

آج بیتاب ہیں جذبات مرے سینے میں
جوشِ طوفاں میں مچلتے ہوئے دھاروں کی طرح

# غزل

ضیا فتح آبادی ایم اے

پتھرا چلیں آنکھیں، وہ آنے نہ سحر آئی
نے عمرِ خضر مجھ کو طُولِ شبِ تنہائی

میرے چمنستاں میں کیا فصلِ بہار آئی
بیگانے ہوئے وہ بھی، تھی جن سے شناسائی

اے ساقیِ میخانہ، کیوں میں ہی رہوں تشنہ
قلقل کی صدا گونجی، گھنگھور گھٹا چھائی

اِک وحشتِ اُلفت نے دونوں کو کیا رُسوا
دیوانہ اگر میں ہوں، تُو بھی تو ہے سودائی

تھا سنگِ درِ جاناں خود سجدہ طلب ورنہ
کب دل کو گوارا تھی تکلیفِ جبیں سائی

چھیڑا مرا سازِ دل انگشتِ حنائی نے
احساس کی رگ رگ میں بجنے لگی شہنائی

اِک تازہ غزل کہہ کر بھیجی ہے ضیا اُن کو
اُمید بر آنے کی صورت تو نکل آئی

# غزل

اشرف قادری - بی اے آنرز ایل ایل بی۔

شبِ غم کس کو نیند آتی ہے غم میں کون سوتا ہے
کسی کی یاد ہوتی ہے کسی کا ذکر ہوتا ہے

کبھی جب بر تقاضائے محبت یہ بھی ہوتا
میں ہنس دیتا ہوں جب دل اپنی ناکامی پہ رو

تحیر کی حدوں میں کھو گیا ہے ان کا دیوانہ
نشاط و غم سے بے پروا، نہ ہنستا ہے نہ روتا ہے

تلاشِ دوست کیا ہے آپ کو دل سے بھلا
وہی اِک روز پا لیتا ہے کچھ جو خود کو کھوتا

اُبھر آتے ہیں دل پر نقش تیری بے وفائی کے
جب آغازِ محبت کا زمانہ یاد ہوتا ہے

بہاتے تھے جو کل اہلِ زمانہ کے لئے آنسو
زمانہ آج اشرف بے کسی پر اُن کی روتا ہے

دیو
کی
کامیابی
کا
راز


دیو کو پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا


مگر آخر کیوں؟ مجھ میں صلاحیت ہے


کو تو واقعی چیری بلاسم سے چمکانے کی ضرورت ہے


بہت بہت مبارک ہو!


بس یہ راز؟

## غزل

عروج زیدی

فکرِ منزل نہ جوششِ جادہ ہے
فاصلوں کا اک ارادہ ہے

ستم دوستاں کی عمر دراز
دامنِ دل بڑا کشادہ ہے

اور رنگینیاں نثار اس پر
[illegible] سادہ ہے

منزلِ شوق دیر ہے نہ حرم
یہ بھی جادہ ہے وہ بھی جادہ ہے

[illegible] میں رنگ بھرے
[illegible] حیات سادہ ہے

موت پر اختتامِ زیست نہیں
موت بھی زندگی کا جادہ ہے

[illegible] عروج
[illegible]

## غزل

کیف مرادآبادی

کسی نے ایسے دل سے یوں کبھی کی ہے گفتگو برسوں
کہ جیسے آئینہ دیکھے کوئی آئینہ رو برسوں

بہت پردے اٹھائے ہیں بہت پردے اٹھانے ہیں
ابھی کم نہ ہو انساں کا ذوقِ جستجو برسوں

محبت کی زباں کو کوئی سمجھے بھی تو کیا سمجھے
اشاروں سے بھی ہوتی ہے یہاں تو گفتگو برسوں

مجھے دل سے عزیز ایک ایک شے ہے جہانِ [illegible]
اسی دنیا میں کی ہے میں نے ان کی جستجو برسوں

کسی کی یاد میں یوں خونِ دل آنکھوں سے ٹپکا ہے
مرے دامن میں کھیلی ہے بہارِ رنگ و بو برسوں

حقیقت میں محبت جستجوئے دوست ہے لیکن
سمجھ میں ہی نہیں آتا طریقِ جستجو برسوں

عمل کر کیف اظہارِ عمل سے یہ تعلق ہے
جنونِ آرزو کی [illegible] آرزو برسوں

## غزل

نعیمہ پرویز

ترے خیال کی جب دل نے روشنی پائی
رہِ حیات میں ہم نے نہ تیرگی پائی

سنانے بیٹھ گئے اس کو حالِ دل اپنا
ذرا سی جس کے رویے میں دلدہی پائی

تمہارے جرم میں اس دن سے آنا چھوڑ دیا
تمہاری بات میں جس دن سے بےرخی پائی

ترے جمال سما پر تو جو پڑ گیا اس پر
عجب طرح کی خزاں نے بھی دلکشی پائی

یہ گرم و سرد زمانے کے ناگزیر سے ہیں
کبھی تو دھوپ کبھی ہم نے چاندنی پائی

خرد کے بدلے میں دیوانگی خریدی ہے
حواس کھوئے تو ہم نے یہ بےخودی پائی

رموزِ زندگی اب تک نہاں جو تھے پردہ میں
[illegible] سے بھی آگہی پائی

فاسفومن طاقت
بڑھاتا ہے
بھوک لاتا
کام کرنے کی قوت
پیدا کرتا
جسم کی قوت مدا
بڑھاتا
TTT
SQUIBB
Phosfomin
VITAMINS ELIXIR
جی ہاں!
سارے خاندان کی صحت کے
لئے فاسفومن
فاسفومن... پھلوں کے ذائقہ والا ہرے رنگ کا وٹامن ٹانک جس میں
وٹامن بی کامپلیکس اور کئی طرح کے گلیسرو فاسفیٹس بھی ہیں۔
ای۔آر۔ اسکوئب اینڈ سنز انکارپوریٹیڈ کا
رجسٹرڈ ٹریڈ مارک ہے جس کے استعمال کا لائسنس
SQUIBB TTT
SARABHAI CHEMICALS
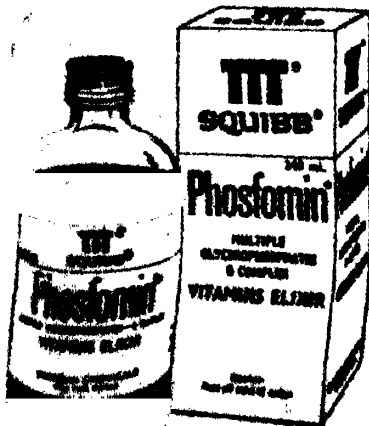
# شمع ہر رنگ میں جلتی ہے!

مسز فریدہ زرین ایم۔ اے

کیر آف محمد زین العابدین سعید ایڈووکیٹ بھونگیر ضلع نلگنڈہ

محترم بھیا! سلام احترام

بیسویں صدی کی بزم میں ایک افسانہ "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے" لے کر شریک ہو رہی ہوں۔ سالنامہ بے حد کامیاب رہا۔ بہرحال اپنی رائے سے نواز کر ممنون فرمائیں . . .

خلوص کار ــــــ مسز فریدہ زرین

نصرت کاٹیج، الہ آباد

ڈیر رخشی! خوش رہو

طویل مدت کے بعد تم سے مخاطب ہوں۔ نہ جانے تم نے کیا سوچا ہوگا۔ کتنی بے وفا نکلی تمھاری ترنم! شاید وہ میری شادی کی دوسری سالگرہ تھی جب تم اچانک اپنے شوہر کے ساتھ الہ آباد چلی آئیں۔ میں بھی وہیں تھی اور اتفاق کی بات کہ الیاس اور اشفاق بھیا دوست نکلے۔ سالگرہ کی دعوت الیاس نے اشفاق بھیا کو دی تھی۔ شام کو تم اور بھیا ساتھ ہی آئے۔ میں تمھیں دیکھ کر حیران ہو گئی۔ تم بھی کتنی پریشان ہوئی تھیں مجھے دیکھ کر۔ تم شادی میں نہیں آئی تھیں نا! اس لئے الیاس کو نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ میں نے تمھیں کئی دن پہلے اطلاع دی تھی لیکن تم اپنی مجبوریوں کا رونا لے بیٹھی تھیں۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی، وہ میری شادی کی دوسری سالگرہ تھی اور آج بھی میری شادی کی آٹھویں سالگرہ ہے، لیکن تمھیں معلوم ہے الیاس میرے پاس نہیں۔ وہ تو شاید دارجلنگ میں روبینہ کے ساتھ گھوم رہے ہوں گے اور میں بستر مرگ پر پڑی تمھیں خط لکھ رہی ہوں۔

ہاں رخشی! قسمت نے مجھے موت کے قریب لا کھڑا کیا ہے۔ تم اکثر کہا کرتی تھیں "ترنم! تجھے کیا ہے عزت، دولت، تعلیم اور حسن، خدا نے سب کچھ تو دے دیا ہے۔ تو تو رانی بن کر رہے گی!" لیکن جانتی ہو آج میں کتنی کس مپرسی کے عالم میں زندگی کے آخری لمحات پورے کر رہی ہوں؟

سالگرہ کے دن تم نے مجھ سے سوال کیا تھا ــــ "ترنم! آخر کیا بات ہے دولھا بھائی کو پاکر بھی تو کچھ کھوئی کھوئی سی ہے!"

"چل پگلی! تو نے مجھے کئی دن بعد دیکھا ہے نا!" میں نے ہنس کر بات ٹال دی۔ تم اس رات مجھ سے کرید کرید کر سوال کرتی رہیں کہ میری شادی الیاس سے کیسے ہو گئی؟ میں خاموش رہی اور یہ کہہ کر ٹالتی رہی کہ وقت آنے پر بتا دوں گی۔ وقت اب آچکا ہے اور اگر اس وقت میں نے تم سے چھپایا تو میری روح زخمی رہے گی۔ تمھیں یاد ہے رخشی! ایک بار کالج میں تم نے مسکراتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تھا ــــ

"تو نے کبھی کسی سے محبت کی ہے ترنم!"

"محبت ــــ نہیں تو!" میں نے حقیقت چھپائی تھی۔

رخشی! میرے لئے ہر لمحہ بوجھ ہے۔ سانس کی دیوار گرنے کو ہے۔ سینہ زخموں سے چور چور ہو گیا ہے۔ کالج میں بیتے ہوئے ایک ایک دن کی یاد میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ جب تنہائی ہوتی ہے تو اس یاد کو ذہن کے دریچے سے نکالتی ہوں اور تصور کے پردے میں اس کا عکس دیکھنے لگتی ہوں۔ جب تھک جاتی ہوں تو آنکھیں موند لیتی ہوں۔ لیکن رخشی! مجھے سکون نہیں ملتا۔ ہائے اللہ! کتنے کربناک لمحے میری زندگی میں آئے! کتنے حادثات نے مجھے ستایا۔

اچھی رخشی! تمھیں یاد ہے اردو کے پیریڈ میں ایک بار غالب کی غزل سمجھاتے سمجھاتے جب مسز ممتاز رک گئیں تو میں نے بے اختیار ان سے سوال کیا۔

اور تم جانتی ہو کہ گل تاک جینے والا یہ معنوں میں جیتا ہے اور اس وقت تک جیتا ہے جب تک موت چارہ گر بن کر اس کے غموں کا مداوا نہ کرے۔'

مجھے محسوس ہوا جیسے اس کے خیالات اپنی اس کے مطابق ہیں۔ یہ سب سن کر حیران رہ گئی۔ جیسے وہ خود کو فریب کے پردوں میں پنہاں رکھتا ہے۔ میں نے بے اختیار سوال کیا۔

'آپ کے خیال میں شمع کی طرح جلنے والے مرد ہوتے ہیں یا عورت؟'

'یہ اپنے اپنے کردار کی بات ہے ترنم! صلاحیتوں کا سوال ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ شمع کی طرح جلنا عورت کے حصے میں زیادہ آیا ہے۔ مرد اس معاملے میں کچھ بے صبر واقع ہوا ہے۔' اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ میں بھی خاموش رہی اور سوچنے لگی کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟ کیا یہی حقیقت ہے؟

اس دن کے بعد میں نے محسوس کیا، والہانہ طور پر میں اس کے قریب پہنچ گئی ہوں اور ایک دن نہ جانے کس جذبے کے تحت میں نے اپنے دل کو کاغذ کے صفحے پر پیش کر دیا۔ میرا خط پڑھ کر وہ چپ ہو گیا۔ میں جواب طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

'اس کا جواب جلد ہی دوں گا۔' اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور پھر میں بے تابی سے اس دن کا انتظار کرنے لگی۔ میں نے محسوس کیا، ندیم کے بغیر میری زندگی سونی رہے گی۔ اس کے بغیر سانس لینا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ لیکن خاندانی رسم و رواج کا خیال کر کے میں چپ رہی۔ اسی انتظار میں ایک سال گزر گیا۔ ندیم نے بی کام کر لیا اور ایک کمپنی میں ملازم بھی ہو گیا۔ میں بھی بی۔ اے کر چکی تھی اور اسی خوشی میں پاپا نے ایک شاندار پارٹی دی تھی۔ پاپا کے کئی دوست پارٹی میں مدعو تھے۔ سب نے مجھے تحفے دیے اور پھر اچانک میں چونک اٹھی جب پاپا نے میرا تعارف الیاس سے کرایا۔

'ترنم! ان سے ملو۔ یہ ہیں تمھارے چچا فخر احمد کے لڑکے الیاس احمد۔ فوج میں میجر ہیں۔'

میں نے دیکھا الیاس کافی اسمارٹ ہیں لیکن رخشی! مجھے پتہ نہ تھا کہ میری تقدیر پاپا نے ان کے ساتھ منسوب کی ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی ندیم کی بات! اس روز سب کے ساتھ تحفے دینے ندیم بھی میرے قریب آیا اور ایک خوبصورت فریم میرے حوالے کیا۔ میں نے دیکھا یہ ایک تصویر تھی جس میں شمع کو پگھلتے ہوئے دکھایا گیا تھا اور نیچے غالب کا وہی شعر تھا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔

'یہ کیا ہے ۔۔۔؟' میں بے اختیار کہہ اٹھی۔

## رخسار

پردہ نہ اٹھایا کبھی رخسار سے اس نے
تا زیست مجھے حسرتِ دیدار میں رکھا ——— مصحفی

کون گلزار سے اے بادِ صبا جاتا ہے
رنگ رخسار سے پھولوں کے اڑا جاتا ہے ——— صفی لکھنوی

تمتماتے ہیں سلگتے ہوئے رخسار ترے
آنکھ بھر کر کوئی دیکھے گا تو جل جائے گا ——— احمد ندیم قاسمی

چمن میں آتشِ رخسارِ گل سے آگ لگی
نہ آشیانۂ بلبل بچا نہ دام رہا ——— امرناتھ ساحر

کچھ تو ہے دیدۂ پُر نم لبِ رخسار کی بات
اور کچھ خونِ جگر ہم بھی ملا دیتے ہیں ——— آل احمد سرور

مرسلہ: شاہد عابد عباسی پنڈت نگر لکھنؤ

'تمھارے خط کا یہی جواب ہے ترنم!' اتنا کہا اور واپس چلا گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا اور جب کچھ سمجھنے کے قابل ہوئی تو میرا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ میری زندگی کا امین الیاس کو بنا دیا گیا۔ میں نے ممی سے کہا ۔۔۔ 'یہ رشتہ مجھ سے پوچھے بغیر آپ نے کیوں طے کر دیا؟'

'تمھیں تعلیم دلانے کا یہ مقصد نہیں کہ ماں باپ کو ہر معاملے میں تمھاری رائے لینی پڑے۔ جو کچھ ہم نے کیا تمھارے بھلے کے لئے کیا۔ الیاس ہر لحاظ سے تمھارے قابل ہے۔ اگر اس فیصلے سے تمھیں انکار ہے تو پھر تمھیں ماں باپ کی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا کیونکہ ہمارے نزدیک عزت اور خاندانی وقار سے بڑھ کر اپنی جان نہیں!' یہ تھا پاپا کا وہ حکم جس کے آگے میں نے سرِ تسلیم جھکا دیا۔

تم ہی کہو رخشی! میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ ایک طرف ماں باپ دوسری طرف ندیم! ایک طرف فرض اور دوسری طرف محبت! اس ٹکراؤ نے مجھے ہمیشہ کے لئے زخمی کر دیا۔ میں جب بھی کچھ کہنا چاہتی ندیم کی نظریں مجھے یاد آجاتیں اور یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کہہ رہا ہو ۔۔۔ 'عورت شمع ہے وہ ہر حال میں جلتی ہے!'

آخر وہی ہوا۔ میں زمانے کے رسم و رواج، خاندانی وقار، ماں باپ کی عزت کے آگے بک گئی۔ میں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ رخصت کے وقت اور دن

کی طرح ندیم میرے پاس آیا اور لوگوں کی نظریں بچا کر میری آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو رومال میں جذب کرکے کہا۔

"ترنم! ان آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ اِن میں اُمید، ہمت اور استقلال کے چراغ جلتے ہیں۔ یہ بندھن ہر لڑکی کے لئے ہے کوئی خوشیوں کے دھاگے میں اسے باندھتا ہے تو کوئی آنسوؤں کی لڑیاں اپنے گلے میں ڈالتا ہے۔ تم عورت ہو، زمانے کی وہ قابلِ فخر ہستی جس نے کائنات کو جِلا بخشی۔ جس کے وجود سے پھول میں خوشبو، چمن میں بہار، سورج میں دمک، چاند میں چمک پیدا ہوئی ہے۔ جس نے ہر زمانے میں سیتا اور مریم کا روپ دھارا قسمت کا فیصلہ اٹل ہے۔ تم یا ہم اس سے ٹکرا نہیں سکتے۔ میری نیک تمنائیں قدم قدم پر تمہارے ساتھ رہیں گی۔ جیو تو اُس شمع کی طرح جو خود جل کر دوسروں کو روشنی بخشتی ہے!"

اور رخشی! اِن الفاظ کو میں نے اپنے گلے میں پڑے ہوئے ان روایتی کالے موتیوں کے ساتھ باندھ لیا اور پھر یقین جانو قدم قدم پر ندیم کے الفاظ مجھے راہ دکھاتے رہے۔ الیاس مجھے چاہتے تھے لیکن اُن کی محبت میں مجھے تسکین نہ مِل سکی کیونکہ وہ مصروف ترین آدمی تھے۔ بیوی سے زیادہ اُن کے نزدیک فرض کی اہمیت تھی۔ شراب سے انھیں پیار تھا۔ میں شکوہ لب پر لائے بغیر اُن کا ساتھ دیتی رہی لیکن نتیجہ برعکس ہوا۔ تین سال بعد وہ بھی بدلے اور اُن کا طرزِ تکلم بھی۔ میں نے کبھی دل کا زخم ظاہر نہ ہونے دیا۔ ماں باپ نے سمجھا بیٹی خوش ہے۔ انھوں نے دل سے نکلتے ہوئے اُس دھوئیں کو نہیں دیکھا جس میں میرا وجود گھر کر رہ گیا تھا۔ صرف اِتنی سی خطا پر کہ میں انھیں اولاد نہ دے سکی، وہ مجھ سے رُوٹھ گئے۔ میں نے اُن کی خوشی کے لئے دوسری شادی کی بات کی تو وہ راضی ہوگئے۔ روبینہ دُلہن بن کر آگئی۔ اُسی گھر میں جہاں کبھی میں نے شہنائیوں کی مدھر گونج میں قدم رکھا تھا۔ پپّا کو جب معلوم ہوا تو وہ تاب نہ لاسکے اور کچھ کہے بغیر ہمیشہ کے لئے ہم سب سے دُور چلے گئے۔ اُس وقت ممی کو ندیم سنبھال رہا تھا جو مُردوں سے بدتر ہو چکی تھیں۔ ندیم! جو مجھے شمع کی طرح جلنے کی نصیحت کرتا تھا وہ خود اپنی آگ میں جل رہا تھا۔ اب تم ہی کہو، رخشی! صبر عورت کرتی ہے یا مرد؟

ارے میں تو کہنا ہی بھول گئی۔ سنو — ! جب ندیم کو الیاس کے رویّے کی اِطلاع ملی تو وہ میرے پاس آیا۔

"ترنم! میں نے سُنا ہے الیاس کا رویّہ تمھارے ساتھ ٹھیک نہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"آپ سے کس نے کہا، یہ تو بالکل غلط ہے" میں مسکراتی ہوئی بولی۔

"ترنم! خود کو فریب کے پردوں میں نہ رکھو۔ اپنی شخصیت کو ایسا آئینہ نہ بناؤ جس میں تمھاری دوسری شبیہہ اُبھرے۔ میں جانتا ہوں تم آگ میں جلنے لگی ہو" ندیم نے کہا۔

"نہیں نہیں — نہیں!" میں چیخ اُٹھی۔ میرے منہ سے خون بہہ نکلا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرا غم کسی پر عیاں ہو کیونکہ ایسا ہونے میں میرے جذبات، میرے احساسات، میرے خیالات کی توہین تھی۔ میں ندیم کے کہے ہوئے الفاظ کو اپنی زندگی کے ہر سانچے میں بٹھانا چاہتی تھی۔ مجھے یاد نہیں رخشی! کہ اُس کے بعد کیا ہوا۔ صرف اِتنا یاد رہ گیا کہ مجھے چکر سا آنے لگا اور ندیم نے مجھے سنبھال لیا۔

اُس روز جب میری آنکھ کھلی تو وہ شاید ساتواں دن تھا۔ ندیم میرے سامنے تھا۔ ڈاکٹر کہہ چکے ہیں کہ کینسر نے بُری طرح میرے سینے کو جکڑ لیا ہے اور ندیم کو اِس بات کا غم تھا کہ اب تک میں نے ایسے مہلک مرض کو کیوں پناہ دی؟ جس کے جواب میں میں نے اُسے وہ تصویر دکھائی جو اُس نے مجھے دی تھی۔ ندیم سہم کر رہ گیا۔

"ترنم! میں نے یہ تو نہ کہا تھا کہ تم شمع کی طرح جلو۔ خدایا یہ تو میں نے تمھیں اپنی تصویر دکھائی تھی۔ لیکن — لیکن یہ تم نے کیا کر دیا؟" ندیم میرے آگے پھوٹ کر رو پڑا۔ بالکل اُس بچّے کی طرح جو اپنے کھلونے کو کسی اور کے ہاتھ سے ٹوٹتا دیکھ کر بلک پڑتا ہے۔

رخشی! آخری بات اور سن لو۔ کل میرا آپریشن ہے لیکن جانتی ہو ڈاکٹروں نے کیا کہا ہے؟ وہ کل ندیم سے کہہ رہے تھے کہ آپریشن میرے لئے جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے! کیونکہ سانس کی نالی پوری طرح متاثر ہو چکی ہے۔ لیکن ندیم ڈاکٹروں کی منت سماجت کر رہا ہے۔ اُسے کیا پتہ کہ میری زندگی کی شام آچکی ہے۔ اور موت کی صبح میرا انتظار دیکھ رہی ہے۔ رخشی! مجھے اِس بات کی خوشی ہے کہ میں نے شمع کی طرح جینا سیکھا اور اُس وقت تک جیتی رہی جب تک موت کی سحر مجھے سُلا نہ دے۔ اب فیصلہ تم پر ہے۔ تم ہی کہو شمع کی طرح جلنا عورت کے حصے میں آیا ہے یا پھر مرد کے!

اچھا اب رخصت!

الم نصیب — ترنم

---

مشہور افسانہ نگار حضرت آسی رامنگری مناسب حق محنت پر اصلاح کا کام بھی کرتے ہیں۔ ضرورت مند اصحاب خصوصاً نئے لکھنے والے اپنے مضامین، افسانوں اور کتابوں پر اصلاح کے لئے ایک مستند ادیب کی خدمات سے مستفید ہوسکتے ہیں۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ یا ٹکٹ بھیجیے۔ پتہ: حضرت آسی رامنگری، مغلسرائے۔ یو، پی

## غزل

### ابرؔ احسنی گنوری

ایک ایک اپنا عیب بدل لیں ہنر سے ہم
دیکھیں عمل جو اپنے پرائی نظر سے ہم

منزل سے ہوتے جاتے ہیں کچھ دور تر سے ہم
کیا کھا گئے فریب کوئی راہبر سے ہم

اتنے تھکے ہیں شامِ الم کے سفر سے ہم
آگے نہ بڑھ سکیں گے حدودِ سحر سے ہم

روشن کریں گے دہر کو داغِ جگر سے ہم
نکلے ہیں یہ چراغ لئے اپنے گھر سے ہم

یہ کچھ پتا نہیں ہے نکل جائے کس جگہ
مطلق نہیں ہیں خود اپنی نظر سے ہم

دیکھیں گے کیسے منظرِ ویرانیِ حیات
سودا نکال دیں جو ترا اپنے سر سے ہم

قائم ہے اتحاد چرند و پرند میں
بیزار ہو رہے ہیں بشر کو بشر سے ہم

ممکن ہے ہم سفر کوئی اس کو بھی لوٹ لے
ہوتے نہیں یونہی تو جدا راہبر سے ہم

ظلمت کو کیوں نہ ڈھال دیں سانچے میں نور کے
یہ کیا کہ بھیک نور کی مانگیں سحر سے ہم

تیری ہی تو خبر تھی ہمارے لباس میں
وہ زندگی کہ جس سے رہے بے خبر سے ہم

در اُن کا چھوڑنے کی یہ تذلیل کُن سزا
ٹکرا رہے ہیں سر کو ہر اک سنگِ در سے ہم

وحشت میں بن گئی ہے ہر اک چیز اجنبی
ڈرنے لگے ہیں ابرؔ اپنے ہی دیوار و در سے ہم

### جلیسؔ نجیب آبادی

راہِ وفا کچھ سہل نہیں ہر گام پہ ٹھوکر کھاؤ گے
اِک آوارہ پردیسی کا کب تک ساتھ نبھاؤ گے

راہ میں پل دو پل کو ٹھٹک کر پاؤں کے کانٹے بھی نہ چُنو
اک لمحہ بھی بیت گیا تو تم پیچھے رہ جاؤ گے

آؤ مل کر سوچیں کیوں کر رہ گئی دوشیزہ گُل
کب تک کاغذ کے پھولوں سے سقف و بام سجاؤ گے

غنچے غنچے کے سینے میں آگ چھپی ہے اب کے برس
پھولوں کے بدلے دامن میں انگارے کچھ پاؤ گے

رہزن ہر سو گھات میں ہیں اور کوئی ٹھکانہ ہے نہ پڑاؤ
بد قسمت بنجارو کس جنگل میں رین بتاؤ گے!

آج مرے نغمو اِک جاؤ دادکے کھوٹے سکّوں میں
پھر اِک دن تنقید کی سولی پر لٹکائے جاؤ گے

اُترا چہرہ پیاسی آنکھیں کھول رہی ہیں سارے بھید
کب تک پھیکی مسکانوں میں دل کے زخم چھپاؤ گے

برہ کے اشکوں سے من کی پیاس نہیں بجھ پائے گی
کب تک کورے کورے نینوں کی گاگر چھلکاؤ گے

یاد میں اس کی راتوں کو کیوں اٹھ اٹھ کر روتے ہو جلیسؔ
کچھ دن یہ عالم گذرا تو دیوانے ہو جاؤ گے

کیا آپ نے سُنا — خالص، مُلائم لکس کے بارے میں
دُنیا بھر کے خوبصورت فِلمی ستارے کیا کہہ رہے ہیں؟
فِلمسٹار نندا کہتی ہیں
"میرا رنگ رُوپ ایسا صاف اور مُلائم ہے
تو صرف لکس کی بدولت"
آپ بھی تو کسی کی نگاہوں کا ستارا ہیں
— اپنے رنگ روپ کی دیکھ بھال لکس ہی سے کیجیے
LUX

افسانہ
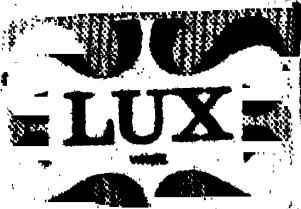
# گرتے گرتے

ابواللیث جاوید بی کام

سرکل انسپکٹر، پوسٹ آفس لیسلی گنج، ضلع پالاموؤ (بہار)

مکرمی و محترمی خوشتر گرامی صاحب! آداب و نیاز

"نیا موڑ" کی اشاعت پر نامۂ ممنونیت اور سالنامہ ۷۰ء کی کامیابی پر نامۂ مبارکباد ارسال کر چکا ہوں۔ آپ کی شفقتیں ہر ماہ "بیسویں صدی" کے روپ میں بڑی پابندی سے مل رہی ہیں جس کا بدلہ میں کسی بھی صورت ادا نہیں کر سکتا۔ آپ کا یہی جذبۂ خلوص و شفقت ہزاروں دوست کو آپ کا اور "بیسویں صدی" کا فریفتہ بنا دیتا ہے اور شاید آپ کے اسی جذبے نے ہندوستان میں سسکتی ہوئی اردو کے جسم میں نئی زندگی کی لہریں دوڑا دی ہیں ------ اس بار "گرتے گرتے" لے کر حاضرِ خدمت ہو رہا ہوں۔ میں نے اس افسانہ میں صفیہ کے کردار کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے جو امید ہے آپ کو ضرور پسند آئے گا ------ "نیا موڑ" کے سلسلہ میں بے شمار خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ کچھ قارئین نے اسے نسوانیت کی تضحیک سمجھ لیا ہے اور مجھے بہت ہی حوصلہ شکن خطوط لکھے ہیں۔ میں فرداً فرداً جواب دینے سے قاصر ہوں۔ "بیسویں صدی" کے توسط سے میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا یہ منشا ہرگز نہیں۔ مریم کے تقدس، زلیخا کی عظمت اور میرا کی پاکیزگی کا جہاں میں احترام کرتا ہوں، وہاں کرسٹین کیلر، میرلین منرو اور سلوا جیسی ہستیوں کی بھی قدر ہی کرتا ہوں . . . !

آپ کا ------ ابواللیث جاوید

اپنے جیون کے سونے پن کا احساس مجھے گدگداتی سی اُس شام کو ہوا ہے جس شام رضیہ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُس کی ہنسی کی دبی دبی سی آواز پر میرے قدم خود بخود رک گئے تھے اور کان کمرے کے اندر سے آتی ہوئی سرگوشی سننے کے لئے بے تاب ہو گئے تھے۔ میں سانس روکے دیر تک کھڑی رہی۔ لیکن کوئی بات واضح سنائی نہ دی۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور پورے جسم میں کپکپی سی ہو رہی تھی۔ رضیہ کی چوڑیاں بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں میرے دل میں گدگدی سی ہو رہی تھی، نہ جانے کیوں ------ لیکن یکایک مجھے اپنی اخلاقی پستی کا خیال آ گیا۔ کوئی دیکھ لیتا تو کیا کہتا ------!؟

مجھا پنے چھوٹے بہن کے کمرے کی آہٹ سننے کے لئے اُس کے سامنے اس طرح کھڑی ہو جانا چاہیے تھا جبکہ میں یہ جان رہی تھی کہ اُس کا نیا نویلا دولہا کمرے میں موجود ہے۔ مجھے خود بخود بے حد خجالت ہوئی اور میں فوراً اپنے کمرے کی طرف بھاگی اور اپنے بستر پر گر کر بری طرح ہانپنے لگی اور دیر تک اپنی بکھری ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میری زندگی کتنی ویران، کتنی بے کیف اور کتنی خشک ہے۔ میں دیر تک سوچ کے گہرے سمندر میں ڈوبی رہی ہوں۔ میرے کنوارے ارمان یکبارگی جاگ اُٹھے ہیں اور سپنوں کی رہگزر پر کسی ہم سفر کی چاہت کی کلیاں شگفتہ ہو اٹھی ہیں۔ میرے ذہن میں پیار کے ایک شہزادے کا جو خاکہ بن چکا تھا وہ مچل اُٹھا ہے۔ مجھے ایک چاہنے والے کی، ایک رازدار کی کمی محسوس ہونے لگی ہے۔ میں سوچتی چلی گئی ہوں ------ بابل کے گیت اور شہنائیوں کی تان کے درمیان جب رضیہ کی ڈولی اٹھی تھی تو اُس دن بھی میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی اور اُس

دفعتاً ایک عجیب سی حسرت نے میرے دل کے نہاں خانوں میں سر اُبھارا تھا نہایت مایوس کن اور سسکتی ہوئی سی حسرت نے ۔۔۔ کاش میری بھی شادی ہو جاتی ۔۔۔؟ اور میں یہ سوچ سوچ کر بہت روئی تھی۔ میں سوچتی ہی چلی گئی تھی ۔۔۔ رضیہ کی شادی آخر کیوں ہو گئی ۔۔۔؟ اور میں یونہی بیٹھی کی بیٹھی کیوں رہ گئی ۔۔۔؟! ماں باپ کے سر پر ایک بوجھ بن کر ۔۔۔ ہمسایوں کے لئے گفتگو کا ایک موضوع بن کر ۔۔۔ آخر کیوں ۔۔۔؟ میں رضیہ سے بڑی تھی۔ شادی تو پہلے میری ہونی چاہئے تھی ۔۔۔ آخر اُس میں کون سے سُرخاب کے پَر لگے تھے ۔۔۔؟!

اُس دن میں خوب خوب روئی تھی۔ دیکھنے والوں نے سمجھا ہو گا چھوٹی بہن کی جدائی میں میں نے اِس طرح جان ہلکان کی ہو گی۔ میں اکیلی رہ گئی تھی۔ گھر کا آنگن سُونا سُونا ہو گیا ہو گا، گڑیوں کا کھیل پھیکا پڑ گیا ہو گا، آپس کی نوک جھونک ۔۔۔ اب

---

- حکمت اور دانائی کی بات جہاں کہیں بھی پاؤ قبول کرو۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- غریب کا ایک روپیہ جو وہ خیرات کرتا ہے، امیر کے سو روپوں کی خیرات سے زیادہ ہے۔ (حضرت عثمان غنیؓ)
- کلام کی خوبی انسان کی عقل پر دلالت کرتی ہے اور افعال کی عمدگی شرافت کی مظہر ہوتی ہے۔ (حضرت عثمان غنیؓ)
- جو شخص حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتا وہ خوشگوار زندگی سے ہمکنار رہتا ہے۔ (حضرت ابو بکر صدیقؓ)
- ظالم کو معاف نہ کر کیونکہ یہ مظلوموں پر ظلم ہو گا۔ (حضرت عمر فاروقؓ)

---

کون کہے گا ہر بات پہ مجھے رضیہ کی ضد یاد آتی ہو گی ۔۔۔ لیکن میرے دل میں اُٹھتے ہوئے جوالا مکھی کو کسی نے نہ دیکھا۔ میرے اندر جو ایک قیامت برپا تھی اُسے کسی نے محسوس نہیں کیا تھا۔

مجھے خوشی ہے کہ رضیہ کی شادی ہو گئی ہے۔ اُس کی مانگ میں تارے جگمگا اُٹھے ہیں۔ لبوں کے گلاب کی پنکھڑیاں کھِل اٹھی ہیں۔ اُس کے بہاروں کے سپنے مہک اُٹھے ہیں۔ زندگی کی طویل دُشوار گزار راہوں کا ایک خوبصورت ساتھی مِل گیا ہے۔ اُس کے دامن میں خوبصورت پھول کھِلیں اور کلیاں مُسکرائیں!

لیکن مجھ میں احساسِ کمتری شدید ہو گیا ہے۔ سب کی نظریں مجھے چبھتی چبھتی محسوس ہونے لگی ہیں۔ محلّہ کی عورتیں جب فرصت کے لمحات میں یکجا ہوتی ہیں تو اُن کی گفتگو کا موضوع اکثر میں ہی ہوا کرتی ہوں ۔۔۔ رضیہ کی ماں نے بڑی غلطی کی پہلے رضیہ کو بیاہ دیتی۔ یہ کون سا ڈھنگ ہے کہ بڑی کو بٹھائے رکھیں اور رضیہ کی شادی کر دی، ریحانہ کی ماں بولتیں۔

راحت بُوا کہتیں ۔۔۔ ”تم کیا جانو گی۔ ارے بابا جب لڑکے والوں کے یہاں کی عورتیں لڑکی دیکھنے آئی تھیں نا جب ہی سب عورتوں نے رضیہ کو پسند کیا تھا صفیہ میں کوئی عیب نہیں نکالا لیکن خدا جانے کیوں رضیہ ہی پسند آئی ۔۔۔؟“

نجمہ بھابی بولتیں ۔۔۔ ”چلو ہٹو ۔۔۔ میں یہ سب صفیہ کی ماں ہی کا قصور کہوں گی۔ لڑکے والوں نے اگر پسند بھی کر لیا تھا تو صفیہ کی ماں کو صاف صاف کہہ دینا چاہئے تھا کہ پہلے بڑی بچی کی شادی کرنی ہے۔“

”ہاں ہاں ۔۔۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اُس بے چاری نے سوچا ہو گا جہاں دو لڑکیوں کی شادی کا سوال ہے ایک کا مرحلہ تو ہو جائے۔ اب بے چاری وہ اِس دن کو تھوڑے ہی سمجھتی ہوں گی کہ کوئی لڑکے والے اب اِدھر کا رُخ ہی نہ کریں گے“، سکینہ چچی کہتیں۔

”دیکھو اُس کی قسمت میں کیا ہے۔ صفیہ کے ہاتھ پیلے ہو جائیں تو بہت ہی اچھا ہو تا“، زینب خالہ کہتیں۔

”لڑکے والے تو کئی ایک آئے۔ لیکن جیسے ہی انھیں معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹی بہن بیاہ دی گئی ہے سب بِدک جاتے ہیں۔ نہ جانے کیا کیا شک کرتے ہیں سب ۔۔۔!“ کلثوم دادی بول اُٹھتیں۔

یہ سب سُنتے سُنتے میرے کان پک گئے ہیں۔ مجھے اپنی قسمت ہی پھوٹی نظر آنے لگی ہے۔ میری ساری اُمنگیں، سارے ارمان، سارے ولولے اب سرد پڑنے لگے ہیں۔ میری اُمنگوں کی نازک نازک کلیاں بِن کِھلے مُرجھانے کیوں لگی ہیں؟ یہ کیسی خزاں ہے ۔۔۔؟ یہ کیسی مایوسیوں کا ہجوم ہے ۔۔۔؟ میرے اندر یہ کیسی ہلچل ہے۔ میرے خوابوں کے جزیرے غم اور مایوسیوں کے سیلاب میں کیوں غرق ہونے لگے ہیں۔ میری قسمت کا سورج گہنانے کیوں لگا ہے۔ یہ کیسی تاریکی پھیلنے لگی ہے۔ سارا عالم تاریک ہوا چاہتا ہے۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ ارے کوئی ہے جو مجھے اِس تاریکی کے غار سے نکالے ۔۔۔ کسی کی آواز نہیں آتی ۔۔۔ کوئی نہیں بولتا ۔۔۔ سب کے سب گُم صُم کیوں ہیں ۔۔۔؟ میرے اللہ یہ کیا ہو رہا ہے ۔۔۔؟ میں پاگل ہو جاؤں گی ۔۔۔ ہاں پاگل ۔۔۔!!

امّی نے میرے دل کی کیفیت بھانپ لی ہے۔ وہ میری بہت دلجوئی کرنے لگی ہیں۔ میرے کھانے پینے کا خوب خیال رکھتی ہیں۔ مجھے تنہا نہیں رہنے دیتی ہیں۔ میں جب کبھی اُداس رہتی ہوں انھیں بڑا صدمہ ہوتا ہے۔ مجھے بہلانے رکھنا چاہتی ہیں۔ یہ جھوٹے بہلاوے ہیں کب تک مجھے دلاسہ دیتے رہیں گے ۔۔۔

غریب ـــــ باجی کبھی شاہدہ کو بلا لاتی ہیں اور کبھی نوشابہ کو تاکہ میں اپنی سہیلیوں میں بہلی رہوں۔ شاہدہ مجھے اُداس دیکھ کر خود بھی اُداس ہو جاتی ہے۔ اُس نے مجھے بہلانے رکھنے کے بہت جتن کئے ہیں۔ شرلاک ہومز کی کتابیں، کیرم اور نہ جانے کیا کیا اُٹھا لاتی ہے۔ دل و دماغ میں پریشانیوں کے اُلجھتے دھاگے سُلجھنے لگتے ہیں۔

جس دن شاہدہ مجھے پڑوس کے نئے کرایہ دار انور صاحب کے یہاں لے گئی اُس دن مجھے بہت سکون ملا۔ اِس لئے نہیں کہ مسز انور بہت خلیق، بہت ملنسار اور بے حد بے تکلف ہیں بلکہ اِس لئے کہ اُن کے یہاں کے ماحول میں مجھے بہت ہی اپنا پن محسوس ہوا۔ میز پر دونوں کی ایک ساتھ مُسکراتی ہوئی تصویر، ہنگر پر ٹنگے ہوئے انور صاحب کے کوٹ کی گردن میں جھولتی مسز انور کا دوپٹہ، شیلف کے فٹ بورڈ پر انور صاحب کے جوتوں کے درمیان مسز انور کی سینڈل، پلنگ پر رکھے ہوئے دو خوبصورت نقش و نگار والے تکیے سے اُن دونوں کی گہری محبت کی خوشبو آتی ہے اور اُنھیں دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں بہت ہی تسکین ملتی ہے۔ اُن کی دو پیاری پیاری پھول جیسی بچیوں نے تو میرا دل ہی موہ لیا ہے۔ دونوں میرے پاس اِس طرح کھیلتی رہتی ہیں جیسے وہ کب کی میری آشنا ہوں اور پھر مسز انور کی باتوں میں وہ پیار، وہ خلوص اور وہ ہمدردی ہے کہ میں اُن کی گرویدہ ہو گئی ہوں اور میں اپنے سارے غم بھولتی جا رہی ہوں۔

میں اُنھیں باجی کہنے لگی ہوں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ اُن سے جُدا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ نہ جانے کون سا جادو کر دیا ہے باجی نے۔ انور صاحب کو جس دن میں نے دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ کتنے خوبصورت ہیں وہ! بالکل فلمی ہیرو جیسے! اُن کا مُسکراتا مُسکراتا سا چہرہ، بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں اور خوبصورت بال مجھے بہت ہی اچھے معلوم ہوئے۔ اُنھیں دیکھ کر میرے خوابوں کا شہزادہ مجھے یاد آگیا جس کے خیالی خاکے میرے ذہن میں کب سے محفوظ تھے۔ کتنی غضب کی مشابہت تھی! اُنھیں دیکھ کر میرے جسم کا رُواں رُواں جاگ اُٹھا ہے۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی ہیں۔ مجھے بے کلی سی ہونے لگی ہے۔ میرے سوئے ہوئے سارے سپنے مہک اُٹھے ہیں۔ میرے ذہن سے اُداسیوں کے دبیز کالے بادل چھٹنے لگے ہیں اور خوشیوں کا روشن سورج طلوع ہونے لگا ہے۔ مجھے اپنی خوشیوں کی جنّت سجا لینے کی تمنا بیدار ہوتی نظر آنے لگی ہے۔

---

ایک شام جب دریچوں سے مکمل اندھیرا نکلنے چل رہا تھا میں باجی کے پاس بیٹھی باتوں میں مگن تھی کہ اچانک کمرے میں انور چلے آئے۔ میں اُنھیں دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اُنھوں نے آہستہ سے کہا۔

"ہیلو صوفیہ لارین ـــــ؟"

میں اُن کے اِس تخاطب سے اندر ہی اندر مچل سی گئی اور صوفیہ لارین کی سُنہری زُلفیں، کتابی گورا چٹا سا چہرہ اور متناسب قد میری نگاہوں میں ایک لمحے کے لئے گھوم گیا اور میں جواب میں صرف مُسکرا دی۔ باجی نے اُنھیں تیکھی نظروں سے دیکھا۔ وہ اُن کی نظروں کا مفہوم سمجھ گئے اور گھبراتے ہوئے باہر چلے گئے۔ باجی میری طرف دیکھ کر مُسکرائیں اور کہنے لگیں ـــــ "تم مجھے باجی کہتی ہونا ـــــ یہ بات اُنھیں آج ہی معلوم ہوئی ہے۔ اِس لئے تم سے مذاق کرنے کے موڈ میں تھے۔ تم بُرا نہ ماننا ـــــ"

انور صاحب کے اِس ریمارک نے میرے اندر جیسے سیکڑوں تیز بلب روشن کر دیئے تھے اور میں شرخ شرخ سی کچھ عجیب تذبذب کے عالم میں بہت دیر تک

---

- اے من! پاپ کرنا چاہے تو ایسی جگہ ڈھونڈ جہاں ایشور نہ دیکھے۔ ورنہ پاپ نہ کر۔ (سوامی وویکانند)
- کسی کا دل دُکھانا سب سے بڑا گناہ ہے۔ (مہاتما گوتم بُدھ)
- زندگی پرمیشور کی امانت ہے۔ اسے بُرے کاموں میں لگانا، امانت میں خیانت کرنا ہے۔ (تُلسی داس)
- میں تقریر یا تحریر کے الفاظ کی طاقت سے بڑھ کر قوتِ خیال میں یقین رکھتا ہوں۔ (مہاتما گاندھی)
- نڈر بنو، بے دھڑک اپنی بات کہو اور بے خوفی سے اپنے راستے پر چلتے رہو۔ (جواہر لال نہرو)

---

بیٹھی اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ مجھے ایسا احساس ہوتا رہا کہ نہ جانے کس لمحہ میرے اندر خوشیوں کی چھوٹتی ہوئی پھلجھڑیاں یکایک باہر اُبل پڑیں۔ میرا انگ انگ مُسکرا رہا تھا۔ میرے دل میں ایک خلش سی ہونے لگی تھی۔ انور کی ہر ادا مجھے بھانے لگی۔ جس دن اُنھیں نہ دیکھتی دل عجیب سی بے کلی میں مبتلا رہتا۔ اپنی امی کی نظریں بچا کر میں صبح صبح باجی کے یہاں جا پہنچتی تاکہ اُنھیں دفتر جانے سے پہلے ایک نظر دیکھ سکوں۔ میرے دل کی ایسی کیفیت پہلے تو کبھی نہ تھی۔ شاید اِسی کیفیت کو پیار کہتے ہیں۔ میں ڈرنے لگی ہوں کہ انور سے مجھے کہیں پیار تو نہیں ہو گیا ـــــ ہائے اللہ ـــــ اگر پیار ہی ہوا تو میں کیا کروں گی ـــــ؟ میں یہ سوچ سوچ کر خود بخود شرمانے لگی ہوں۔ میرے اندر ایک ہلچل سی مچ گئی ہے۔ اگر باجی جان گئیں تو وہ مجھے ہرگز معاف نہ کریں گی۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل

نہ رہ جاؤں گی۔ لیکن میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

دوسرے ہی دن مجھے تیز بخار نے آدبوچا اور میں آٹھ دنوں تک بخار کے آگ میں جلتی رہی۔ بخار اُترا تو دوسری ہی شہانی شام کو باجی کے یہاں دیکھو جگر اور بے چین نظریں لگ گئیں تاکہ دیدار کی راحت سے دل کی دھڑکنوں کو سکون میسر ہو سکے۔ باجی کا گھر سونا سونا سا معلوم ہوا۔ انور اپنے کمرے میں بیٹھے ریڈیو بجا رہے تھے۔ میری آہٹ پر چونکے۔ مجھے دیکھا تو ایکدم کھل اُٹھے۔

"ارے تم ــــ صوفیہ لارین ــــ ابھی آؤ تو سہی ــــ" یہ کہہ کر مسکراتے ہوئے اُٹھے اور بالکل میرے قریب آگئے۔ میرا دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔ میرے کانوں میں ہزاروں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ آنکھوں میں خوابوں کے ہنڈولے نظروں سے ڈولنے لگے ــــ میں تو ان کے دامن پر اُچھلا تی ــــ کبھی بلندیوں پر ہوتی اور کبھی یکبارگی زمین پر آجاتی۔ ایک کمرے کے گوشے میں میں دیر تک بھٹکتی رہی ــــ انور نے مسکراتے ہوئے کہا ــــ "تمہاری باجی گئی ہیں۔ ایک ہفتہ بعد آئیں گی ــــ"

میں دھڑکتا دل لئے ہوئے واپس آگئی اور اپنے بستر پر گری دیر تک سوچتی رہی ــــ اُف اللہ میں گرتے گرتے سنبھل گئی!!

---

ہمیں صد رنج ہو رہا ہے کہ ہمیں اشتہارات کا پلندہ نہیں ملا [illegible] اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے جن کا مقصد خریداروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا ہوتا ہے۔ مدیر

---

# غزل

سید نظر برنی ایم۔ اے

حسن کو بے نقاب ہونے دو
عشق کو کامیاب ہونے دو

غم کو غرقِ شراب ہونے دو
ہر حقیقت کو خواب ہونے دو

دیکھنا ہے ابھی حیات کو جشن
اک نیا انقلاب ہونے دو

میں بلا نوش و بادہ خوار سہی
میری ہستی خراب ہونے دو

آج کی شب تو اُن کی محفل میں
عشق کو باریاب ہونے دو

ملتفت کوئی ہو رہا ہے نظر
دل کی دنیا خراب ہونے دو

# غزل

چندر پرکاش جوہر بجنوری

معجزے ہیں یہ تمہارے نام کے
پھر گئے رُخ گردشِ ایام کے

جُراتِ پرواز ہونی چاہئے
آپ کھل جائیں گے حلقے دام کے

آشیاں پر برق نے سجدے کئے
چار تنکے نکلے کتنے کام کے

بخش دے جو لذتِ سوزِ دوام
منتظر ہیں ہم تو اُس پیغام کے

چشمِ ساقی سے برستی ہے شراب
دور چلتے ہیں مئے بے نام کے

لذتِ راہِ طلب جوہر نہ پوچھ
لُطف ہیں آغاز میں انجام کے

# آپ کے آنے سے پہلے
# آپ کے جانے کے بعد

پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی ایم اے

۵۰۰ پہاڑی بھوجپور، پٹنہ

ذریعہ خوشترگرامی!

اُردو کے حامی تو بڑے بنتے ہو۔ لیکن جب اُس کی ترویج اور ترقی کے راستے بتانے اور رستے دکھانے کا وقت آتا ہے تو بیمار پڑ جاتے ہو۔ غضب خدا کا بمبئی میں اُردو کے حامیوں کا اتنا عظیم الشان کنونشن ہو گیا جس میں ہندوستان بھر کے نمائندے اپنے اپنے پاجامے، پینٹ اور دھوتیاں گھڑس گھڑس کر اُردو زبان کو اُس کا جائز حق دلانے پہنچ گئے۔ لیکن تمہارے قدم گھر سے نہ نکلنا تھے نہ نکلے اور اُس پر دعویٰ یہ کہ ہم اُردو کو ہندوستان کی ثانوی زبان بنوا کے رہیں گے۔!

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

یقین مانو صرف ایک آنچ کی کسر باقی رہ گئی۔ ورنہ دریائے گنگا بلکہ مشرقی پنجاب سے راس کماری تک اُردو ہی اُردو ہوتی! تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارے دیش کی وزیر اعظم صاحبہ نے بمبئی کے کنونشن میں پورے تین منٹ تک اُردو کی قصیدہ خوانی کی ہے اور اُردو کے راستے میں جو ہفت خواں حائل ہیں اُن کی اسی تین منٹ کے بھاری بھرکم عرصہ میں ترجمانی بھی کی ہے۔ آپ کو کچھ خبر ہے کہ آپ ابھی تک اُردو کو ثانوی زبان تسلیم کرانے میں کتنی زبردست تاریکی میں ہاتھ پیر مار رہے تھے اور وزیر اعظم صاحبہ نے تین منٹ کے عرصہ میں اتنا سیدھا اور آسان راستہ بتا دیا کہ اُردو کے کسی ادیب یا دانشور کی نگاہ وہاں تک نہیں پہنچ سکی۔ آپ جب اِس آسان راستے کی تفصیل سنیں گے تو عش عش کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور ساری زندگی اپنی کوتاہ عقلی اور کج فہمی پہ ماتم کرتے رہیں گے۔ آپ پہلے اُس راستے کو سمجھئے جو اُردو زبان کو ثانوی زبان تسلیم کرانے کی منزل تک سیدھا چلا گیا ہے اور پھر اس کا اعتراف کیجیے کہ واقعی

راستہ سیدھی سڑک ہے جس پہ کچھ کھٹکا نہیں کوئی رہرو آج تک اِس راہ میں بھٹکا نہیں

اور آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہماری وزیر اعظم صاحبہ جو اپنی کانگریس کے لئے دو بیلوں کی جوڑی کا نشان طلب کر رہی ہیں وہ کوئی اپنے لئے نہیں مانگ رہی ہیں بلکہ اِس غرض سے مانگ رہی ہیں کہ اُردو کی ترقی کے لئے آپ آسانی سے دو جوڑی والے بیل کے مالکوں تک پہنچ جائیں اور دیہاتوں میں جا کر اُردو کی تحریک بیل کے مالکوں کے گھروں سے شروع کریں اور سب سے پہلے اُردو زبان کی اہمیت سے کسانوں کو آگاہ کریں۔ اُنھیں اُردو لکھنا پڑھنا سکھائیں اور اگر ہو سکے تو اُردو پڑھانے کا کام کسانوں کے بجائے بیلوں سے شروع کریں اور جب بیل اچھی طرح اُردو پڑھ جائیں تو اُس کے بعد اُن کے مالکوں اور اُن کے بچوں کو اُردو پڑھائیں اور اگر ہو سکے تو اُنھیں اُردو میں ہل چلانا، بیلوں کی دم مروڑنا، زمین کو اُردو میں زرخیز بنانا بتائیں تاکہ آپ کی اُردو تحریک کے ساتھ کم سے کم کچھ بیل اور کچھ کسان تو ہوں جنکے بل بوتے پہ آپ اپنی تحریک کو دیہاتوں سے شہروں

تک لاسکیں۔ اس کے بعد آپ شہریوں کو یہ کہہ کر اُردو پڑھنے کے لئے غیرت دلائیں کہ دیکھئے کسانوں اور دیہاتیوں تک کو اُردو آتی ہے اور وہ اُردو پڑھنا ہی نہیں اُردو میں بات تک چلا جاتے ہیں اور آپ کیسے شہری ہیں جو اُردو سے بیگانگی اور اگر زحمت نہ ہو تو ہندوستان کے سارے دیہاتوں میں انسانوں اور بیلوں کو اُردو داں بنانے کے بعد آپ اطمینان سے بیٹھ کر آپ شہروں شہروں جائیں اور شہری باشندوں کو اُردو پڑھنے کی تلقین کریں اور جب تمام شہروں میں اُردو پڑھنے والوں کی تعداد خاصی ہو جائے تب آپ حکومت سے اُسے ثانوی زبان بنانے کا مطالبہ کریں تاکہ حکومت کو معلوم ہو کہ اُردو ملک کی ایک طاقتور زبان ہے اور اپنے میں ہندوستان کے کروڑوں بیلوں اور کسانوں کی طاقت رکھتی ہے۔ اُس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ خود بخود حکومت آپ کی طرف جھکے گی آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ طاقت ہی ایک ایسی چیز ہے جو اپنی ہر بات منوا سکتی ہے اب چاہے وہ پنجابی صوبہ ہو یا ہندی زبان۔ اصل چیز طاقت ہے جو بڑے سے بڑے اور ٹھوس سے ٹھوس آئین میں ترمیم کرا لیتی ہے۔ اس جمہوری دور میں ہاتھ پیروں میں طاقت کھانے پینے سے نہیں آتی۔ کیونکہ کھانے پینے کی چیزوں میں تو آجکل روپیہ میں سترہ آنے کھپ میل ہوتا ہے لیکن عوام کی طاقت خالص طاقت ہوتی ہے جس سے آپ اشوک کی لاٹ تک کو جھکا سکتے ہیں جو خالص فولاد کی بنی ہوئی ہے! ——— خوشتر گرامی صاحب! آپکو معلوم ہے کہ اُردو پر ہاتھ دھرنا کوئی معمولی بات جو کھم کا کام نہیں ہے۔ اسے پنجابی یا ہندی جیسی چھوٹی زبان نہ سمجھئے جن کے مان لینے میں کوئی زحمت نہیں تھی۔ اُردو اُن دونوں زبانوں سے کہیں بڑی زبان ہے اس لئے اُس کے مطالبات تسلیم کرنے میں خطرات بھی بڑے ہیں۔ اب دیکھئے نا رانچی کے مسئلہ پر رانچی میں کتنا بڑا فساد ہو گیا۔ جیسا کہ فخرالدین علی احمد صاحب نے بھی کہا کہ حکومت بیچاری کہیں اُسے دبا سکی آپ سمجھتے ہیں کہ جمہوری حکومت کے وزیروں کو کتنا ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا پڑتا ہے۔ حضور والا! وہ ثاند جس پر جمہوریت کا قبضہ ہو اُس میں نتھ ڈالنا اور ڈالے رہنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آپ لوہے کو لوہے ہی سے کاٹ سکتے ہیں۔ اس لئے اگر آپ کو اُردو کی ترقی و ترقی منظور ہے اور آپ اسے زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو پہلے عوام کی پشت پناہی حاصل کیجئے اور اس کی بھی پرواہ کیجئے کہ ———

تا تو بمن می رسی من بخدا می رسم

آپ اگر یہ سمجھتے ہوں کہ اُردو اس جنم میں مر جائے گی تو آپ اُس کے دوسرے جنم سے اتنے مایوس کیوں ہیں۔ ہماری حکومت ایک سیکولر اسٹیٹ ہے ہم آواگون پر ایمان رکھتے ہیں پھر خطرہ کس بات کا ہے۔ آواگون کا اصول ہے کہ اگر پہلے جنم میں کوئی سبب نیک عمل کا اُٹھاتا ہے تو دوسرے جنم میں وہ پہلے سے زیادہ بہتر شکل میں آتا ہے اس لئے کیا عجب ہے جو دوسرے جنم میں آپ کی اُردو ہندی کی شکل میں آئے۔ جسے ماشاءاللہ ہر طرح کا سکون اور اطمینان حاصل ہے اور جس کی ترقی کے لئے ہماری سرکار ہر سال لاکھوں کروڑ روپیہ صرف کرتی رہتی ہے ——— لہٰذا خوشتر میاں! اب آپ صحتیاب ہو کر جلدی سے وزیر اعظم صاحب کے بتائے ہوئے راستہ پر گامزن ہو جائیے۔ بلکہ میری ناقص رائے تو یہ ہے کہ دلی کے بجائے آپ کسی دیہات سے "بیسویں صدی" نکالنا شروع کر دیں ——— ہماری کانگریس کے بعض مخالفین کہتے ہیں کہ رانچی میں زبان کے مسئلہ پر جو فساد ہوا اُسے دبانے میں کانگریس نے غفلت اور کوتاہی برتی اور غالباً یہ اعتراض وہی لوگ کرتے ہیں جو بے اولاد ہیں اور جنہیں یہ نہیں معلوم کہ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے۔ اولاد کو بری ہو پھر بھی اولاد ہے۔ رانچی کا فساد اگر کوئی غیر کرتا تب تو کسی حد تک یہ اعتراض قابل قبول ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ فساد تو کانگریس کے سے بالکل ایسا تھا جیسے باپ کے جیتے جی اس کی اولاد کسی کو ستائے۔ اعتراض کرنے والوں کو کون بتائے کہ جب اولاد جوان ہو جاتی ہے تو اُس پر ہاتھ اُٹھانا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں کانگریس یہ کہے کہ ——— ولی صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے تو کیا ہوا ہے۔

قلم ——— [illegible]

ملک کے تمام اقلیتی فرقوں کی طرف سے ایک مشترکہ اعلان کیا گیا کہ وہ
ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کو اُس کے لسانی حقوق دلانے میں کوئی
کوشش اور کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں۔ چنانچہ جو فرقہ انگوچھا باندھتا تھا اُس نے
انگوچھا کمر سے باندھ لیا، جو فرقہ لنگوٹ کا عادی تھا اس نے اپنا لنگوٹ درست کر لیا، جو
تہمد والے تھے انہوں نے اپنی اپنی تہمدوں پر تین تین چار چار گرہوں کا اضافہ
کر لیا اور کچھ نے دھوتیوں کو زنار بند کی شکل دے کر اپنی اپنی کمروں سے کس لیا
اور سب کے سب ایک مشترکہ عزم و ذہنیت سے مسلح ہو کر ایک عظیم اسٹیج
پنڈال میں اپنی اپنی زبانوں میں انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے جمع
ہو گئے۔ ہر اقلیتی فرقہ کے نمائندہ کو یقین کامل تھا کہ اب اردو کو بھی وہی حقوق حاصل
ہو جائیں گے جو ملک کی دوسری اقلیتی زبانوں کو حکومت کی طرف سے دیے گئے
ہیں۔ پنڈال کے باہر تک ہندوستان کی تمام اقلیتوں کے نمائندوں کا ایک ٹھاٹھیں
مارتا سمندر نظر آنے لگا اور ہر فرد کی باچھیں مارے خوشی کے کانوں کی لووں سے
جا ملیں۔ پنڈال میں ہر شخص اپنی اپنی بغلیں بجا بجا کر سارے گاما، پادا، نی سا کی
دُھن پر نئی نئی دُھنوں میں اُردو کے نغمے الاپنے لگا۔ جلسہ شروع ہونے والا
ہے اور ہر زبان کے نمائندے اپنی اپنی ٹولیاں بنائے اور دانت نکالے ایک دوسرے
سے مخاطب اُردو کے درخشاں مستقبل پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ ایک جگہ ایک
میر صاحب اپنے ایک دوست خانصاحب سے فرما رہے ہیں۔

میر صاحب: "ہاں خانصاحب! بھلا ہمارے آپ کے وہم و گمان میں بھی تھا
کہ اُردو کا مقدر اس طرح اچانک جاگ اُٹھے گا اور اس گئی گزری زبان
کو جسے مردہ زبان کے لقب سے یاد کیا جانے لگا ہے۔ اُس کے فدائی
اِس طرح ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو کر اپنی اپنی ہمدردی اور
محبت کا اظہار کرنے جمع ہو جائیں گے۔"

خانصاحب: "میر صاحب! میں تو شروع ہی سے کہتا تھا کہ ایک دن وہ
آئے گا جس دن کیا اپنا اور کیا بیگانہ ہماری زبان کا کلمہ پڑھتا دکھائی
دے گا۔ بارہ برس کے بعد گھورے کے دن پھرتے ہیں اور اِس کا
مقدر تو پورے بائیس سال بعد جاگا ہے۔ اب دیکھیے یہ بائیس
سال کا خمیر بائیس برس بعد کس کس عنوان سے پھولتا ہے تو سہی
جو یہ زبان برصغیر کی سرکاری زبان نہ بن جائے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ
اُس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اب تو کہنا چاہیے کہ آنکھوں کی
سوئیاں باقی رہ گئی ہیں صرف وزیر اعظم صاحبہ جناب جواہر لال
کی لاڈلی بیٹی ہیں جو اُنھوں نے اُردو کو ملک کی علاقائی زبان
تسلیم کیا اُدھر بچے بچے کی زبان پر اسی کا طوطی بولے گا!"

میر صاحب: "بھئی خانصاحب! یہ تو ماننا پڑے گا کہ جواہر لال کی بیٹی جواہر لال
کی بیٹی ہے اور خداوند کریم نے اُسے ایسی جرأت اور ہمت بخش دی
ہے کہ بڑے بڑے سنڈی کیٹوں کی سٹی گم ہے؟"

خانصاحب: "میر صاحب! اب آپ دیکھیے کیسے کیسے ازیل کو ایک دھوبی
پاٹے کے داؤں میں اُس نے چت کر کے خاک سونگھنے پر مجبور کر دیا
اور ایک مہرے کو ذرا سی اِدھر سے اُدھر حرکت دے کر وہ شہ مار دی
ہے کہ جناب ڈیسائی کو جو وزیر اعظم بننے کے خواب دیکھ رہے تھے
دن میں تارے نظر آ رہے ہیں اور سارے سنڈی کیٹیے اِدھر سے
اُدھر بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔"

میر صاحب: "مگر خانصاحب! تریا ہٹ بچپن سے سنتے چلے آ رہے تھے پر دیکھنے
کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا سو وہ ساری دنیا نے دیکھ لی۔ اماں! خدا نہ
کرے جو عورت میں انتقام کا جذبہ پیدا ہو، پھر وہ بڑے سے بڑے
دیو کے کلّے چیر کر رکھ دیتی ہے!"

خانصاحب: "واللہ میر صاحب! تم نے منہ کی بات چھین لی ہے! میں بھی
یہی کہنے والا تھا۔ اللہ اسے زندہ رکھے کیسے کیسے دیو پیکروں کو
زیر کیا ہے۔ بھلا کامراج جیسا دیو پیکر انسان جس کا ایک زمانہ میں
جناب نہرو آنجہانی بھی لوہا مانے ہوئے تھے آج وہ اِس کی سیاست
کے سامنے پانی بھرتا دکھائی دے رہا ہے۔"

میر صاحب: "اجی۔ یہ بینکوں کو قومیا کر تو اندرا نے ایسی جادو کی لکڑی گھمائی ہے
کہ وہ سب جنہیں اپنی اپنی سیاست دانی پر ناز تھا ننگی ناچ نلچتے
نظر آ رہے ہیں۔ اماں! اللہ نظر بد سے بچائے اگر دس بیس سال یہ مسندِ
وزارت پر اور رہ گئی تو سنڈی کیٹیے اور یہ سب سالے چوہار گوں
اور میدانوں میں لگتے پر بم روکتے دکھائی دیتے ہیں ملک میں ڈھونڈے کو
بھی میسر نہ آئیں گے۔"

خانصاحب: "واللہ ابھی تو اک ذرا سی لگام کھینچی ہے جس پر یہ تھوتھنیوں سے جھاگ
بہنے لگا ہے۔ اس کے بعد اگر بڑی بڑی جائیدادوں اور کارخانوں
کی سیلنگ کر دی تب تو بقول شخصے اگاڑی پچھاڑی بند ہو جائے گی
اور ساری ہنہناہٹ دُم کے رستے نکل جائے گی!"

میر صاحب: "بھئی خانصاحب اشراف پھر اشراف ہے جس کا دادا موتی لال
نہرو جیسا مرد مجاہد ہو اُس کی پوتی ایسی نہ نکلے گی تو پھر کیسی نکلے گی۔"

خانصاحب: "اے کیا یاد نہیں موتی لال نہرو صاحب کی پوتی ہی جنہوں نے
سنا ہے کہ ایک بار لارڈ ولنگڈن یا نہ جانے کس بڑے انگریز کے عہد
میں ایسا کس کے چانٹا مار دیا تھا کہ سالے کی گھگھی بندھ گئی تھی؟"
میر صاحب: "جی ہاں یہ انہیں کی پوتی ہیں۔ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا اگر بہت نہیں تو تھوڑا
تھوڑا۔ خانصاحب! یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ ہمارے نانا جان اور
ان کے دادا دونوں ایک ہی مکتب میں پڑھتے تھے اور دونوں میں وہ
دانت کاٹی روٹی تھی کہ ایک دوسرے کے بغیر چین نہ تھا اور جہاں تک
اُردو کا تعلق ہے وہ تو ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ دلی میں پرانے
وقتوں میں ایک خوش نویس میر پنجہ کش گزرے ہیں جو آخری تاجدار مغلیہ
کے خوش نویسی میں اُستاد تھے اب یہ سمجھ لیجئے کہ ہمارے نانا اور ان کے
دادا کا خط بالکل اُن کے خط سے ملتا جلتا تھا اور بھئی کیوں نہ ہوتا کیونکہ
وہ کوئی ہمارے آپ کی طرح جاہل تھوڑے تھے دونوں عربی اور فارسی کے
منشی۔ ہمیشہ سے درجہ میں ہمارے نانا اور ان کے دادا کا پڑھنے میں مقابلہ
رہتا تھا کبھی دو نمبر ان کے نانا کے تو کبھی اُن کے۔"
خانصاحب: "اے جب ہی تو پنڈت نہرو آنجہانی ایسی اُردو بولتے تھے کہ الفاظ
کیا منہ سے پھول جھڑتے تھے اور کیا مجال جو کوئی لفظ غلط مخارج
سے ادا ہو جائے۔ ہے ہے مر گئے! اگر وہ ایک سال اور جی جاتے
تو اُردو کے ساتھ کیا کچھ نہ کر جاتے۔ نہ جانے کون کہتا تھا کہ پنڈت جی
مرتے وقت وصیت کر گئے تھے کہ میری سمادھی پر کتبہ اُردو زبان
میں لکھا جائے جو میری مادری اور قومی زبان ہے لیکن مرنے کے
بعد اُن کی وصیت کا کبھی خیال نہ کیا گیا۔ مگر واللہ مرتے مرتے مر گئے
مگر کبھی ہندی میں تقریر نہ کرنا تھی نہ کی۔ کسی نے سچ کہا ہے ——

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

میر صاحب: "اے خانصاحب! آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جناب نہرو انگلینڈ
سے جب اُدھر سے بیرسٹری پاس کر کے آئے ہیں تو یوں تو انگریزی کے
خوب واقف کار تھے اور انگریزی بول بھی لیتے تھے۔ مگر صاحب
جب کسی انگریز کی عدالت میں ان کا مقدمہ لگتا تھا تو ہمیشہ جان
بوجھ کر محض انگریزوں کو تپانے کے لئے مقدمہ کی پیروی اُردو
ہی زبان میں کرتے تھے۔ بلکہ ایک بار جب لندن کی پارلیمنٹ میں
تقریر کرنے گئے ہیں تو مہاتما جی اور پنڈت جی دونوں نے اُردو ہی
زبان میں انگریزی بولی۔ بلکہ مشہور تو یہاں تک ہے کہ جب پنڈت جی
تقریر کر کے [illegible] انگریز [illegible] نے
پوچھا [illegible]
آپ نے تقریر کس بولی میں کی ہے ہم انگریز [illegible] ہیں؟"
خانصاحب: "اُردو زبان میں یہ تو آپ ہی جانیں کہ اس [illegible] زبان میں
بڑے بڑے انگریز جان دیتے تھے۔"
میر صاحب: "اے آپ جان دینے کو کہتے ہیں، ہمارے دادا جان [illegible]
دربار میں شریک تھے جس میں لندن کی ملکہ وکٹوریہ بھی آئی تھیں۔ دادا
جان کہتے تھے کہ یہاں آنے سے پہلے انہوں نے اُردو اس قدر
اچھی پڑھ رکھی تھی کہ جب انہوں نے ملکہ کے دربار میں [illegible]
مقرر اُردو میں تقریر کی تو واہ واہ سے سارا ہال گونج گیا اور جب
دادا جان سے نہ رہا گیا اور تقریر کے بعد دادا جان نے انہیں مبارکباد
پیش کی تو انہوں نے دادا جان کا شکریہ ادا کیا اس پر دادا جان نے
اپنی ڈبیہ سے پان کی ایک گلوری نذر کرتے ہوئے کہا یہ دست
ایک گلوری پیش کرتا ہوں۔

برگ سبز است تحفۂ درویش

اس پر ملکہ نے چلتے وقت دادا جان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

بھول جانا نہیں یاد ہماری رکھنا!

والشان کے منہ سے اُردو کا یہ برمحل مصرعہ سن کر دادا جان عش
عش کر گئے اور جب انہوں نے جزاک اللہ کہہ کر ملکہ معظمہ کی تعریف کی
تو تسلیم بجا لاتے ہوئے فرمانے لگیں —— "یہ سب آپ کی
جوتیوں کا صدقہ ہے ورنہ بندی کس قابل ہے —— ہے ہے
کیا آداب تھے اس قوم کے!"
خانصاحب: "میر صاحب اُردو کے بارے میں تو یہاں تک سننے میں آیا ہے کہ حضرت
آدم سے لے کر جناب عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک جتنے پیغمبر
آئے اُن سب کی زبان اُردو ہی تھی اور اسی سبب ہمارے کسی
محقق نے حال میں جو تحقیق کی ہے تو اس نے ثابت کر دیا ہے کہ
انگریزی زبان اُردو ہی زبان سے نکلی ہے۔"
میر صاحب: "اے اُس میں تحقیق کی کیا ضرورت تھی۔ اب دیکھئے نا ہماری
زبان کے سارے کے سارے لفظ انگریزی زبان میں موجود
ہیں۔ مثلاً اسٹیشن، بوتل، ریل، پرنسپل، ماسٹر، سیڈم
کیتلی، ٹی کپ، گلاس اے کون سا ایسا لفظ ہے جو اُس نے

ہم سے نہیں لیا۔ بلکہ اگر تحقیق کی جائے تو عجب نہیں جو یہ ثابت ہو جائے کہ
دنیا کی ساری زبانیں اسی اُردو زبان کی خوشہ چیں ہیں۔ اور فارسی
عربی تو اس کی زندہ مثال ہے۔"

**خانصاحب:** "کہیں چاند پہ خاک ڈالنے سے خاک اُڑتی ہے۔ اِس مری حالت میں
بھی دنیا کی ساری زبانوں میں ماشاءاللہ تیسرا نمبر اُردو کا ہی ہے۔"

**پیرصاحب:** "اُردو زبان کے سلسلہ میں ابھی حال ہی ایک ایسا واقعہ پیش آیا
کہ اب میں کیا عرض کروں۔ اگرچہ بات کہنے والی نہیں ہے لیکن کہے بغیر بھی
نہیں بنتی۔ ابھی چار دن کی بات ہے جب میں اسی اُردو کنونشن میں
شرکت کی تیاری کر رہا تھا تو میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا
جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عالمِ ارواح تک اِس کے اثرات پہنچ چکے
ہیں۔"

**خانصاحب:** "یہ کیسے؟"

**پیرصاحب:** "یہ ایسے کہ ابھی چار روز ہوئے جب میں سو رہا تھا تو میں نے سوتے میں خواب
میں کیا دیکھتا ہوں کہ دادا جان تشریف لائے ہیں اور ہاتھ میں خوشتر گرامی
کا رسالہ "بیسویں صدی" لئے ہوئے ہیں۔ میں نے حیرت سے پوچھا
کہ یہ رسالہ آپ کو کہاں سے ملا؟ تو فرمانے لگے کہ عالمِ برزخ میں جو لائبریری
ہے اُن میں کیا ہندوستان اور کیا پاکستان دونوں ملکوں کے سب ہی
اُردو رسالے آتے ہیں اور اب ہندوستان کی آزادی کے بعد سے جب سے
ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا زور بڑھا ہے اور کثیر تعداد میں
اُردو داں آنے لگے ہیں۔ اُس وقت سے تو عالمِ برزخ کے ہر گلی کوچے
میں لائبریریاں کھل گئی ہیں اور اُردو کی ایسی مانگ بڑھی ہے کہ شاید ہی
پاکستان اور ہندوستان کا کوئی رسالہ یا اخبار ہو جو یہاں نہ آتا ہو اور جب سے
تمہارے یہاں احمد آباد کا فساد ہوا ہے اُس وقت سے تو کئی کئی دیگر
اُردو کے رسائل اور اخبارات یومیہ آتے ہیں۔ پہلے یہاں عربی زبان کا
زور تھا کیونکہ ملائکہ کی مادری زبان عربی تھی۔ لیکن اب ملائکہ بھی اُردو
زبان بڑے جوش و خروش سے سیکھنے لگے ہیں۔ اور اُردو دانوں کی طرف
سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اُردو زبان کو عالمِ برزخ کی قومی زبان بنا دیا
جائے کیونکہ ہندوستان سے اُردو داں حضرات کی آمد کا سلسلہ اگر اسی
طرح جاری رہا تو شاید ہی کوئی اُردو بولنے والا ہندوستان میں رہ جائے۔
پھر ستم یہ ہے کہ تمہارا ہندوستان اُن کی آمد پر کوئی پابندی بھی نہیں لگاتا
اور ہزاروں اُردو داں تو بغیر بلائے پہنچ رہے ہیں۔ اِس پر میں نے عرض کی
کہ اب عنقریب ان کی پرسش کم ہو جائے گی کیوں کہ ہندوستان کی تمام
اقلیتوں کے دانشوروں کا ایک کنونشن بمبئی کے اُردو ادیبوں اور
دانشوروں نے طلب کیا ہے جس میں ملک کی وزیر اعظم اندرا گاندھی اور
وزیر داخلہ جناب چوہان بھی شریک ہو رہے ہیں اور یہ فیصلہ کر کے
آ رہے ہیں کہ اُردو کو ہندوستان کی ثانوی زبان بنا دیا جائے۔ ورنہ
ہندوستان اس میٹھی اور شیریں آواز بولنے والوں سے خالی ہو جائیگا۔
اس پر دادا جان نے پوچھا کہ یہ اندرا کون ہیں تو میں نے کہا وہی پنڈت
موتی لال نہرو جن کی آپ سے بڑی دانت کاٹی روٹی تھی اور جو آپ کے
ہم مکتب بھی رہ چکے ہیں۔ اُن کی پوتی ہیں۔ دادا جان نے کہا کہ عالمِ برزخ
میں اُن کے بارے میں تو برابر یہ شکایتیں پہنچ رہی ہیں کہ انہیں کی غفلت
سے ہندوستان بھر میں فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے ہیں وہ ہندی کی
عادی ہیں اور انہیں اُردو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ بلکہ آکاش وانی سے
اُن کی دو چار تقریریں میں نے بھی سُنی ہیں۔ وہ تو خالص ہندی میں
تھیں جسے عالمِ برزخ والے بھی نہ سمجھ پائے اِس لئے اُن سے یہ توقع
رکھنا بے سود ہے کہ وہ اُردو کے لئے کچھ کریں گی۔ بلکہ دو ایک بار
ایک آدھ فرشتے نے اُن کے باپ اور دادا دونوں کو ٹوکا بھی کہ یہ
آپ کی پوتی صاحبہ کون سی زبان بولتی ہیں جو عام لوگوں کی سمجھ سے
باہر ہے؟ اُس پر اُس کے باپ اور دادا دونوں نے خجل ہو کر کہا کہ
آزادی کے بعد ملک کی آب و ہوا کچھ اس درجہ خراب ہوئی ہے کہ اچھا
بھلا آدمی ہوش و حواس کھوئے ہوئے ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ
مگر ابھی حال ہی میں جب سے کہ کانگریس کے اندر سے اِن جن سنگھی سنڈی
کیشوں کو نکالا گیا ہے اُس وقت سے اندرا کو اندازہ ہوا ہے کہ ملک کے
اندر جتنے بھی فرقہ وارانہ فسادات آزادی کے بعد سے ابتک ہوئے
ہیں وہ انہیں کے کرائے ہوئے تھے۔ کانگریس سے نکلنے کے بعد
یہ جگہ جگہ تالیاں ٹھونکتے اور نوٹنکی کا ناچ دکھاتے پھر رہے ہیں۔
اِس پر دادا جان نے فرمایا کہ جب احمد آباد کے آئے ہوئے مہاجرین
مہاتما جی اور پنڈت نہرو سے عالمِ برزخ میں ملے اور انہوں نے
شکایت کی کہ آپ کی صاحبزادی کے عہد میں یہ سب کچھ ہوا ہے تو مہاتما جی
اور پنڈت نہرو دونوں نے اپنی تقریروں میں کہا کہ اب اگر زبان کے
معاملہ میں کانگریس کی طرف سے اُردو داں طبقہ کو کوئی شکایت
ہو تو اُسے چاہیئے وہ کتے ہی کو ووٹ دے دے۔ لیکن ہرگز ہرگز

خانصاحب: "اے کیا پوچھتے ہیں موتی لال نہرو صاحب کی بابت بھی ہم نے
سُنا ہے کہ ایک بار لارڈ ولنگڈن یا نہ جانے کس بڑے انگریز کے منہ
میں ایسا کس کے جا تھپڑ مارا تھا کہ سالے کی گھگھی بندھ گئی تھی۔"

میر صاحب: "جی ہاں یہ اُنہیں کی پرتی ہیں۔ باپ پوت پتا پر گھوڑا کم نہیں تو تھوڑی
تھوڑا۔ خانصاحب! یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ ہمارے نانا جان اور
ان کے دادا دونوں ایک ہی مکتب میں پڑھتے تھے اور دونوں میں
دانت کاٹی روٹی تھی کہ ایک دوسرے کے بغیر چین نہ تھا اور جہاں تک
اُردو کا تعلق ہے وہ تو یہ پوچھیے کہ گھر کی لونڈی ہے۔ وہ آپ نے
دو قتوں میں ایک خوش نویس میر پنجہ کش گزرے ہیں جو آخری تاجدار مغلیہ
کے خوش نویسی میں اُستاد تھے۔ اب یہ سمجھ لیجیے کہ ہمارے نانا اور ان کے
دادا کا خط بالکل اُن کے خط سے ملتا جلتا تھا اور ہیں کیوں نہ ہوتا کیونکہ
دونوں ہمارے آپ کی طرح جاہل تھوڑے تھے دونوں عربی اور فارسی کے
منشی۔ ہمیشہ سے درجہ میں ہمارے نانا وہ ان کے دادا کا پڑھنے میں مقابلہ
رہتا تھا کبھی وہ نمبر ان کے زائد تو کبھی اُن کے۔"

خانصاحب: "اے جب ہی تو پنڈت نہرو آنجہانی ایسی اُردو بولتے تھے کہ الفاظ
کیا منہ سے پھول جھڑتے تھے اور کیا مجال جو کوئی لفظ غلط مخارج
سے ادا ہو جائے۔ ہے ہے مر گئے! اگر وہ ایک سال اور جی جاتے
تو اُردو کے ساتھ کیا کچھ نہ کر جاتے۔ نہ جانے کون کہتا تھا کہ پنڈت جی
مرتے وقت وصیت کر گئے تھے کہ میری سمادھی پر کتبہ اُردو زبان
میں لکھا جائے جو میری مادری اور قومی زبان ہے لیکن مرنے کے
بعد اُن کی وصیت کا کبھی خیال نہ کیا گیا۔ مگر واللہ مرتے مرتے مر گئے
مگر کبھی ہندی میں تقریر نہ کرنا تھی نہ کی۔ کسی نے سچ کہا ہے ——

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

میر صاحب: "اے خانصاحب! آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جناب نہرو انگلینڈ
سے جب اُردو میں بیرسٹری پاس کر کے آئے ہیں تو یوں تو انگریزی کے
بڑے واقف کار تھے اور انگریزی بول بھی لیتے تھے۔ مگر صاحب
جب کسی انگریز کی عدالت میں ان کا مقدمہ لگتا تھا تو ہمیشہ جان
بوجھ کر محض انگریزوں کو تپانے کے لئے مقدمہ کی پیروی اُردو
ہی زبان میں کرتے تھے۔ بلکہ ایک بار جب لندن کی پارلیمنٹ میں
تقریر کرنے گئے ہیں تو مہاتما جی اور پنڈت جی دونوں نے اُردو ہی
زبان میں انگریزی بولی۔ بلکہ مشہور تو یہاں تک ہے کہ جب پنڈت جی
تقریر کر کے ایوان سے [illegible]
بھرے [illegible]
آپ نے تقریر کی ہے [illegible]

خانصاحب: "اُردو زبان میں ہے ہی ایسی [illegible] کہ اس پر انگریز [illegible]
بڑے بڑے انگریز جان دیتے تھے۔"

میر صاحب: "اے آپ جان دینے کو کہتے ہیں۔ [illegible]
دربار میں انگریز [illegible] تھے [illegible]
جان کہتے تھے کہ یہاں [illegible]
ایسی [illegible] تھی کہ جب انہوں نے [illegible] کے دربار میں [illegible]
مقرر اُردو میں تقریر کی تو واہ واہ [illegible]
دادا جان سے [illegible] رہ گیا اور تقریر کے بعد دادا جان نے [illegible]
پیش کی تو انہوں نے دادا جان کا شکریہ ادا کیا اس پر دادا جان نے
اپنی ڈبیہ سے پان کی ایک گلوری نذر کرتے ہوئے کہا میں [illegible]
ایک گلوری پیش کرتا ہوں۔

برگ سبز است تحفۂ درویش

اس پر مسٹر [illegible] نے چلتے وقت دادا جان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا

بھول جانا نہیں یاد ہماری رکھنا!

واللہ ان کے منہ سے اُردو کا یہ برمحل مصرعہ سن کر دادا جان عش عش
کر گئے اور جب اُنہوں نے جزاک اللہ کہہ کر مصرعہ کی تعریف کی
تو تسلیم بجا لاتے ہوئے فرمانے لگیں —— "یہ سب آپ کی
جوتیوں کا صدقہ ہے ورنہ بندی کس قابل تھا —— ہے ہے
کیا آداب تھے اس قوم کے!"

خانصاحب: "میر صاحب اُردو کے بارے میں تو یہاں تک سننے میں آیا ہے کہ حضرت
آدم سے لے کر جناب عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک جتنے پیغمبر
آئے ان سب کی زبان اُردو ہی تھی اور اسی سبب سے ہمارے کسی
محقق نے حال میں جو تحقیق کی ہے تو اس نے ثابت کر دیا ہے کہ
انگریزی زبان اُردو ہی زبان سے نکلی ہے۔"

میر صاحب: "اے اس میں تحقیق کی کیا ضرورت تھی۔ اب دیکھئے نا ہماری
زبان کے سارے کے سارے الفاظ انگریزی زبان میں موجود
ہیں۔ مثلاً اسٹیشن، بوتل، لالٹین، پرنسپل، ماسٹر، سیشن
کیتلی، ٹی کپ، گلاس اے کون سا ایسا لفظ ہے جو انہوں نے

ہم سے نہیں لیا۔ بلکہ اگر تحقیق کی جائے تو عجب نہیں جو یہ ثابت ہو جائے کہ
دنیا کی ساری زبانیں اسی اُردو زبان کی خوشہ چیں ہیں ... سارے
عربی تو اُس کی زندہ مثال ہے۔"

...صاحب: "کہیں چاند پہ خاک ڈالنے سے خاک پڑتی ہے۔ اِس مری حالت میں
بھی دنیا کی ساری زبانوں میں ماشاءاللہ تیسرا نمبر اُردو کا ہی ہے۔"

...صاحب: "اُردو زبان کے سلسلے میں ابھی حال ہی میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا
کہ اب میں کیا عرض کروں۔ اگرچہ بات کہنے والی نہیں ہے لیکن کہے بغیر بھی
نہیں بنتی۔ ابھی چار دن کی بات ہے جب میں اسی اُردو کنونشن میں
تقریر کی تیاری کر رہا تھا تو میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا
جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عالم ارواح تک اِس کے اثرات پہنچ چکے
ہیں۔"

...صاحب: "یہ کیسے؟"

...صاحب: "یہ ایسے کہ ابھی چار روز ہوئے جب میں سو رہا تھا تو میں نے سرِ شب خواب
میں کیا دیکھتا ہوں کہ دادا جان تشریف لائے ہیں اور ہاتھ میں خوشنما ماہی
کا رسالہ "بیسویں صدی" لئے ہوئے ہیں۔ میں نے حیرت سے پوچھا
کہ یہ رسالہ آپ کو کہاں سے ملا؟ تو فرمانے لگے کہ عالم برزخ میں جو لائبریریاں
ہیں اُن میں کیا ہندوستان اور کیا پاکستان دونوں ملکوں کے سب ہی
اُردو رسالے آتے ہیں اور اب ہندوستان کی آزادی کے بعد سے جب سے
ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا زور بڑھا ہے اور کثیر تعداد میں
اُردو داں آنے لگے ہیں۔ اُس وقت سے تو عالم برزخ کے ہر گلی کوچے
میں لائبریریاں کھل گئی ہیں اور اُردو کی ایسی مانگ بڑھی ہے کہ شاید ہی
پاکستان اور ہندوستان کا کوئی رسالہ یا اخبار ہو جو یہاں نہ آتا ہو اور جب سے
تمہارے یہاں احمد آباد کا فساد ہوا ہے اُس وقت سے تو کئی کئی درجن
اُردو کے رسائل اور اخبارات یومیہ آتے ہیں۔ پہلے یہاں عربی زبان کا
زور تھا کیونکہ ملائکہ کی مادری زبان عربی تھی لیکن اب ملائکہ بھی اُردو
زبان بڑے جوش و خروش سے سیکھنے لگے ہیں۔ اور اُردو دانوں کی طرف
سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ اُردو زبان کو عالم برزخ کی قومی زبان بنا دیا
جائے کیونکہ ہندوستان سے اُردو داں حضرات کی آمد کا سلسلہ اگر اسی
طرح جاری رہا تو شاید ہی کوئی اُردو بولنے والا ہندوستان میں رہ جائے۔
پھر ستم یہ ہے کہ تمہارا ہندوستان اُن کی آمد پہ کوئی پابندی بھی نہیں لگاتا
اور ہزاروں اُردو داں تو بغیر بلائے پہنچ رہے ہیں۔ اِس پر میں نے عرض کی

کہ اب عنقریب ان کی پورش کم ہو جائے گی کیونکہ ہندوستان کی تمام
اقلیتوں کے دانشوروں کا ایک کنونشن بمبئی کے اُردو ادیبوں اور
دانشوروں نے طلب کیا ہے جس میں ملک کی وزیر اعظم اندرا گاندھی اور
وزیر داخلہ جناب چوہان کو یہ تحریک ہو رہی ہے اور یہ فیصلہ کر کے
آ رہے ہیں کہ اُردو کو ہندوستان کی قانونی زبان بنا دیا جائے۔ ورنہ
ہندوستان اِس میٹھی اور شیریں زبان بولنے والوں سے خالی ہو جائیگا۔
اس پہ دادا جان نے پوچھا کہ یہ اندرا کون ہیں تو میں نے کہا وہی پنڈت
موتی لال نہرو جی کی آپ سے بڑی دانت کاٹی روٹی تھی اور جو آپ کے
ہم مکتب بھی رہ چکے ہیں۔ اُن کی پوتی ہیں۔ دادا جان نے کہا کہ عالم برزخ
میں اُن کے بارے میں تو برابر یہ شکایتیں پہنچ رہی ہیں کہ اُنہیں کی غفلت
سے ہندوستان بھر میں فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے ہیں وہ ہندی کی
عادی ہیں اور اُنہیں اُردو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ بلکہ آکاش وانی سے
اُن کی دو چار تقریریں میں نے بھی سنی ہیں۔ وہ تو خالص ہندی میں
تھیں جسے عالم برزخ والے بھی نہ سمجھ پائے اِس لئے اُن سے یہ توقع
رکھنا بے سود ہے کہ وہ اُردو کے لئے کچھ کریں گی۔ بلکہ دو ایک بار
ایک آدھ فرشتے نے اُن کے باپ اور دادا دونوں کو ٹوکا بھی کہ یہ
آپ کی پوتی صاحبہ کون سی زبان بولتی ہیں جو عام لوگوں کی سمجھ سے
باہر ہے؟ اُس پر اس کے باپ اور دادا دونوں نے خجل ہو کر کہا کہ
آزادی کے بعد ملک کی آب و ہوا کچھ اِس درجہ خراب ہوئی ہے کہ اچھا
بھلا آدمی ہوش و حواس کھوئے ہوئے ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ
مگر ابھی حال ہی میں جب سے کہ کانگریس کے اندر سے ان جن سنگھی سنڈی
کیٹوں کو نکالا گیا ہے اُس وقت سے اندرا کو اندازہ ہوا ہے کہ ملک کے
اندر جتنے بھی فرقہ وارانہ فسادات آزادی کے بعد سے ابتک ہوئے
ہیں وہ انہیں کے کرائے ہوئے تھے۔ کانگریس سے نکلنے کے بعد
یہ جگہ جگہ تالیاں ٹھونکتے اور نوٹنکی کا ناچ دکھاتے پھر رہے ہیں۔
اِس پر دادا جان نے فرمایا کہ جب احمد آباد کے تئے ہوئے مہاجرین
مہاتما جی اور پنڈت نہرو سے عالم برزخ میں ملے اور اُنہوں نے
شکایت کی کہ آپ کی صاحبزادی کے عہد میں یہ سب کچھ ہوا ہے تو مہاتما جی
اور پنڈت نہرو دونوں نے اپنی تقریروں میں کہا کہ اب اگر زبان کے
معاملہ میں کانگریس کی طرف سے اُردو داں طبقہ کو کوئی شکایت
ہو تو اُسے چاہیئے وہ کتے بلی کو ووٹ دے دے۔ لیکن ہرگز ہرگز

کانگریس کو نہ دے۔ اِس پر میں نے دادا جان سے کان میں کہا کہ صاحب ایسا کرنا تو بہت آسان ہے لیکن کچھ کانگریس کے دل چلے مولوی ایسے ہیں جن کے پاس سویرے سے شام تک کوئی کام نہیں ہے دن بھر گھروں پر پڑے پڑے ڈرائی سلیکنگ کیا کرتے ہیں اور جہاں جہاں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں وہاں کے لوگوں کے نام پر چندے جمع کر کے اپنا اُلو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔ اِس پر دادا جان نے کہا کہ اگر ان کو راہِ راست پر لانا آپ لوگوں کے بس سے باہر ہے تو انہیں اگر کانگریس بھیجنے کو تیار نہ ہو تو آپ لوگ یہاں پر بھیج دیجئے تاکہ اُنہیں سمجھایا بجھایا جا سکے۔ اِس کے بعد اُنہوں نے ایک ایسی بات کہی کہ واللہ خانصاحب سُنوگے تو اپنی اور ہماری دونوں کی بخشش کے قائل ہو جاؤ گے!"

خانصاحب: "ہاں وہ کون سی بات ہے جس سے گویا کہ ہم سیاکارانِ ازلی کی بخشش بھی ہو جائے گی؟"

میر صاحب: "اُنہوں نے میرے کان کے پاس اپنا مُنہ لا کر کہا کہ دیکھو مرتے وقت اب تم لوگوں کو زبان کے سلسلہ میں پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کیونکہ اب آئندہ سے آپ لوگوں کی قبروں میں مُنکر نکیر جو سوالات کریں گے وہ سب اُردو میں ہوں گے اور اُن سوالات کے جواب بجائے مذہبی نقطۂ نظر کے ادبی کسوٹی پر کسے جائیں گے اور جن لوگوں کے جوابات میں زبان کی چاشنی ہوگی اُن کی بخشش تو گویا روپے میں سترہ آنے بھر یقینی ہے۔ اِسی لئے اب یو۔پی کے اُردو داں طبقہ کی بخشش کی طرف سے اطمینان ہے اور ایک نہیں لاکھ ہا سکولوں اور کالجوں میں ہندی پڑھائی جائے مسلمان اپنے گھروں میں جو زبان بولتے ہیں اُس میں بہر صورت اِس گئی حالت میں بھی کچھ نہ کچھ تو ادبی چاشنی ضرور ہوتی ہے تو صاحب یو پی اور بالخصوص لکھنؤ کے اُردو داں طبقہ کو اپنی عاقبت کی طرف سے اطمینان کر لینا چاہیئے اور خانصاحب سچ پوچھو تو دنیا میں انسان کو صرف اپنی عاقبت کی فکر ہوتی ہے۔ ورنہ اِس دنیا میں رکھا کیا ہے؟"

خانصاحب: "تو بھئی میر صاحب اِن حالات کی روشنی میں ریڈیو پر خبریں نشر کرنے والوں اور ہندی بولنے والوں کا کیا حشر ہوگا؟"

میر صاحب: "ارے صاحب! ہم کیا بتائیں۔ وہ جانیں اور اُن کا کام ہم کسی کے پھٹے میں بلاسبب پیر کیوں ڈالیں؟"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک دم ہر طرف سے "انقلاب زندہ باد" کے نعرے ہونے لگے اور "اندرا گاندھی اور اُردو زندہ باد" کے نعروں سے پنڈال کی فضا گونج گئی۔

خانصاحب: "بھئی میر صاحب! اب رونما فطار کرنے کے لئے تیار ہو جائیے جن کا انتظار تھا وہ تشریف لے آئیں!"

میر صاحب: "ہاں خانصاحب! یہ وزیرِ اعظم صاحب کے پیچھے پیچھے دوسری ٹوپی کی ڈگیاں کون ہیں؟"

خانصاحب: "بھئی میر صاحب! غضب کرتے ہو ارے صاحب آگے آگے جو چاکلیٹ رنگ کی ساری میں ملبوس ہیں اور اپنے کو ٹھیک کرتی ہوئی تیز تیز قدم اُٹھاتی جا رہی ہیں۔ وہ تو ہمارے ملک کی محبوب وزیرِ اعظم اندرا گاندھی ہیں!"

میر صاحب: "ارے صاحب! اُنہیں تو میں پہچانتا ہوں۔ لیکن اُن کے پیچھے والی مخلوق کے بارے میں پوچھ رہا ہوں؟"

خانصاحب: "ہاں اُن کے پیچھے ایک تو فخر الدین علی احمد صاحب ہیں دوسرے کشمیر کے وزیرِ اعلیٰ جناب صادق صاحب ہیں۔ اور اُن کے پیچھے گجرال صاحب وزیرِ نشر و اشاعت ہیں۔ اور ان کے بعد جسٹس آنند نرائن ملا اور کرشن چندر ہیں۔"

میر صاحب: "تو اب سنو پہلے کرشن چندر صاحب کا اُردو کا مقدمہ۔"

(خطبہ سُننے کے بعد) میر صاحب: "بھئی یہ ہمارے ہندی اُردو کے فدائی خدمتگار جناب کرشن چندر صاحب نے مقدمہ تو اِس انداز میں پیش کیا ہے جس طرح یو۔پی کی عدالت میں جناب سید غلام حسنین نقوی صاحب نے شمیم رحمانی کا مقدمہ پیش کیا تھا۔"

خانصاحب: "بھئی میر صاحب آپ کیا کل جیتے جی کی باتیں کر رہے ہو ہاں مقدمہ تو جناب حسنین نے بڑی خوبی سے پیش کیا تھا مگر اُس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا؟"

میر صاحب: "ہاں اِس میں کل جیتے جی کی کیا بات ہے۔ میں نے تو ایک بات کہی۔"

خانصاحب: "قسم قرآن کی! کیا ایمان پرور اور روح فرسا مقدمہ پیش کیا ہے،... ہے.... ہے! زبان کے ساتھ ساتھ اُردو کی مظلومیت کو کس خوبی سے پیش کیا ہے اور کس کس انداز میں گزشتہ بائیس سال میں جس جس نے اُردو کے سلسلہ میں جیسے جیسے وعدے وعید کئے تھے اُن کو تاریخ وار گنوایا ہے۔ بھئی جیتے رہو میاں کرشن چندر۔ خدا تمہیں اِس کا اجر ... دس کا نوبل پرائز عطا کرے۔ صاحب اگر اُردو زبان ہندوستان سے

سلسلہ کبھی ہو جائے تو بھی واللہ عالم نہ ہوگا کیونکہ یہ خطبہ اُردو زبان کی زندگی کا نچوڑ ہے!"

میر صاحب: "ہاں خانصاحب! یہ بات تو تم ٹھیک کہتے ہو لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ کے کی دم سیدھی کرنے کے بعد بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہے۔ کیونکہ شمیم حنفی کے مقدمے کی روداد سُننے کے بعد ہر شخص یہ سمجھے ہوئے تھا کہ جناب نقوی نے شمیم رحمانی کے مقدمے میں سرکاری وکیل کو ایسا پھندیت کیا ہے کہ اب بیچارے میں ذیلی فٹ کرنے کے سوا اُس کے پاس کوئی چارہ نہیں۔ لیکن آخر میں نتیجہ وہی ہوا جس کی اس ذرر بیں توقع تھی؟"

خانصاحب: "اچھا لو اب کرشن چندر صاحب کے بعد مُلّا صاحب کی سُنو وہ کیا فرماتے ہیں۔

مُلّا صاحب کی تقریر سُننے کے بعد

میر صاحب: "بھئی مُلّا صاحب نے بھی اُردو کی حمایت میں پونے ٹیک دئے ہیں اور ایسی بات کہی ہے کہ قسم جناب عباس کی اُس کا جواب دینا مشکل ہے!"

خانصاحب: "اچھا! لو اب اندراجی کی تقریر سُنو۔ قسم قرآن کی ہم نے آج تک ایسی عظمت کسی عورت کے چہرے پر برستی نہیں دیکھی جو اِس وقت محترمہ کے چہرے پر برس رہی ہے! اے لیجئے "کانگریس زندہ باد" کے نعروں میں وہ تقریر کرنے کھڑی ہو گئیں اور اِس کے بعد مجمع کی طرف دیکھ کر فرما رہی ہیں ——————

"اُردو کے مسئلہ کو جو اہمیت ہے وہ میں جانتی ہوں۔ مجھے یہ بتانے کی ہرگز ضرورت نہیں ہم نے اپنے طور پر پوری کوشش کی کہ اِس زبان کو اُس کا جائز حق دیا جائے لیکن ہم کامیاب نہ ہوئے!"

یہ سُن کر پُورے مجمع پر بڑے بڑے قبرستان برسنے لگے۔ اِس کے بعد موصوفہ نے فرمایا۔

"اُردو کا مسئلہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اِس کی راہ میں جو مشکلات ہیں وہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتی ہوں۔ میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔ اِس لئے کہ مجھے یقین نہیں کہ میں اُسے پُورا کر سکوں گی!"

اِس پر پورے مجمع پر یتیم خانے برسنے لگے اور کانفرنس کے ارباب حل و عقد کی صورتیں اتنی تیزی سے مسخ ہونے لگیں کہ اگر آپ پیسے دیکر بھی مسخ کراتے تو اتنی تیزی سے مسخ نہ ہو پاتیں۔ اِس کے بعد موصوفہ نے فرمایا ——————

"اگر اُردو کے لئے کچھ کیا جائے تو خدشہ ہے کہ اِس کا نتیجہ کہیں ایسا خوفناک نہ نکل آئے کہ آپ کو اسکولوں میں اُردو پڑھنا بھی مشکل ہو جائے!"

یہ سُن کر خانصاحب اور میر صاحب دونوں خوف سے اپنی اپنی کھالیں پھڑپھڑانے لگے اور ایک نے دوسرے کی طرف اِس طرح پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا جیسے اُن پر دو ایک احمد آباد برسنے والے ہیں۔

موصوفہ نے جب یہ کہا ——————

"بہرحال یہ ماحول ہے۔ ہمیں اسے بدلنا پڑے گا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم اِس میں کامیاب ہوں گے یا نہیں۔ ایسے ایسے کونفرنس ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ہونے چاہئیں۔ ادیبوں اور شاعروں کے دستخط کافی نہیں ہیں۔ ایک عوامی جدوجہد کی ضرورت ہے ورکرس اور کسانوں کی طرف سے بھی مانگ اٹھے تب کچھ بات بنے۔ اُردو ہندوستان کی زبان ہے۔ اِس نے ہندوستان کی تہذیب کو مالا مال کیا ہے۔ یہ ایک خوبصورت زبان ہے اور ہمارا مشترکہ ورثہ ہے۔ ہمیں ایسی خوبصورت چیز کو نہیں کھونا چاہیئے!"

تو یہ سُن کر خانصاحب اور میر صاحب کے مُنہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور اُن کی آنکھیں اپنے پپوٹوں سے باہر نکل کر کسی طرف بھاگنے پر کمربستہ نظر آنے لگیں۔ پھر جب فخرالدین علی احمد صاحب نے اپنی تقریر میں زبان کے سلسلہ میں ۱۹۶۱ء کے رانچی کے فسادکا حوالہ دیا تو خانصاحب اور میر صاحب دونوں کی گھگھیاں بندھ گئیں اور دونوں سوالیہ جملہ کا نشان بن کر رہ گئے اور جس طرح دھوبی کا گدھا اپنے آقا کے ہاتھوں مار کھانے کے بعد دل ہی دل میں زبان سے بدبدا بدبدا کر کہتا ہے مار تجھے خدا مارے! اسی طرح یہ دونوں حضرات بھی بدبدا بدبدا کر نہ جانے دل ہی دل میں کیا کہنے لگے۔

اسٹیج پر منتظمین میں کئی ادیب اور دانشور اندراجی کی صاف گوئی اور بے بسی سے اتنے متاثر ہوئے کہ بے ہوش ہو گئے اور اُن کو لخلخہ سونگھایا جانے لگا۔ جن سنگھی اخباروں کے دو تین رپورٹر جو اُس کانفرنس کی روداد لکھنے آئے تھے مارے خوشی کے اسٹیج پر سے پھاند پڑے۔ تین چار موٹے موٹے ادیبوں نے تقریر سُن کر پہلے تو اپنی کھال پھڑپھڑائی۔ اُس کے بعد حاضرین سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہنے لگے کہ ہمیں کسی کی پیٹھ پر لاد کر گھر پہنچا دیا جائے کیونکہ فخرالدین علی احمد اور اندراجی دونوں کی تقریریں ہم لوگوں کے دماغ سے ٹخنوں تک اُتر گئی ہیں، جس کے سبب ہم لوگ

بھاری پن محسوس کر رہے ہیں کہ دونوں ٹانگوں کا ہلانا دشوار ہے۔ سامعین میں کچھ اپنی ٹانگوں کو تھپکیاں دیتے پنڈال کے باہر نکل رہے ہیں۔ دُور سے ایک شخص رہا ہے "تماشہ ختم پیسہ ہضم"!

میر صاحب جب پندرہ بیس منٹ کے بعد اپنے ہوش میں آئے تو بولے۔

رِصاحب: "ارے بھئی خانصاحب! کہو! اندرا جی نے جو اردو کی ترقّی کا تیر بہدف نسخہ بتایا ہے تمہیں کیسا معلوم ہوا۔ چلو بھائی اب تو ستُو باندھ کر کسانوں اور دیہاتوں میں چل کر اردو کو مستی جوشش کر کے مضبوط کیا جائے اور اُس کے بعد اندرا جی سے کہا جائے کہ تمام کسان اور مزدور مع اپنے بیلچوں اور بیل بدھیوں کے اُردو بولنے کو تیار ہیں اور وہ بیل جوتتے ہیں انھوں نے اُردو بولنا بھی شروع کر دیا ہے اور اب وہ اردو ہی میں کھیت جوتتے ہیں"۔

نصاحب: "ہاں! نسخہ تو انھوں نے بڑا تیر بہدف قسم کا بتایا ہے۔ میر صاحب اِس سلسلہ میں ایک واقعہ سنتے چلو پُرانے زمانے میں ایک قبیلہ تھا جس کی چارپائیوں میں کھٹمل پڑ گئے تھے جس کے سبب اُس قبیلہ کا ہر فرد بے حد پریشان تھا۔ اتنے میں اِن قبیلے والوں میں سے کسی شخص کو ایک خانصاحب مل گئے اور بولے کہ بھائی کھٹمل مار ڈالنے کا میرے پاس ایک تیر بہدف علاج ہے۔ لیکن میں اُس کا نسخہ اُس وقت بتاؤں گا جب تم ایک کنونشن بُلا کر اُس میں طرح طرح کے لوگوں کو جمع کر لو۔ قبیلے والے راضی ہو گئے اور انہوں نے ایک کنونشن بلا کر لاکھوں آدمی اکٹھا کر کے خانصاحب سے کہا۔ چلو خانصاحب تمہاری شرط پوری کر دی۔ اب چل کر بتاؤ۔ اس پر خانصاحب نے کہا کہ ایک لاؤڈ اسپیکر بھی فٹ کر دو تاکہ میں مجمع کے سامنے کھڑے ہو کر سب کو ایک ساتھ بتا سکوں۔ قبیلے والوں نے خانصاحب کی اِس شرط کو بھی منظور کر لیا۔ اُس کے بعد خانصاحب نے کہا کہ بتا تو دوں گا لیکن پہلے اس کا وعدہ کرو کہ اگر کبھی مجھے ووٹوں کی ضرورت پڑے گی تو تم سب کے سب مجھی کو ووٹ دو گے"۔ قبیلے والوں نے خانصاحب کی یہ شرط بھی منظور کر لی۔ اُس کے بعد خانصاحب کو بڑے جوش و خروش اور بڑے احترام کے ساتھ مائیکروفون کے سامنے لا کر کھڑا کیا گیا۔ اِس پر ہر طرف سے تالیاں بجنے لگیں اور خانصاحب نے تالیوں کی گونج میں چلا کر کہا۔ "بھائیو! کھٹملوں کے مارنے کا تیر بہدف علاج صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ پکڑو اور مار ڈالو!"

### نسیم شاہجہانپوری

ہوئیں دل میں اُن کی یاد اُس کو دل نہیں کہتے
ہو لے وہ جس میں شاداں ہم اُسے محفل نہیں کہتے

ابھی واقف نہیں شاید وہ آدابِ محبت سے
دل کی بیقراری کو سکونِ دل نہیں کہتے

م رنج و غم میں مُسکرانا جن کو آ جائے
دنیا میں کسی مشکل کو بھی مشکل نہیں کہتے

محبت میں تو ناکامی بھی شاید کامیابی ہے
ہم اپنی سعیِ لاحاصل کو لاحاصل نہیں کہتے

ں وہ آشنائے لذتِ طوفاں نہیں شاید
بحرِ عشق کی ہر موج کو ساحل نہیں کہتے

محبت میں نسیم اُن کا تغافل بھی توجہ ہے
اُنھیں ہم اپنے حالِ زار سے غافل نہیں کہتے

### متین بدایونی ایم۔ اے

رکھتے ہیں ترے جور کا اے دوست بھرم ہم
عادت ہے ستم سہنے کی سہتے ہیں ستم ہم

دنیا ہمیں کہتی ہے کہ ہیں اہلِ قلم ہم
لب کبھی نالہ کبھی صہبا کبھی سم ہم

اپنا جنھیں سمجھا تھا پرائے وہی نکلے
رکھیں گے بھلا اُس سے پھر اُمیدِ کرم ہم

ہم اہلِ جنوں واقفِ اسرارِ خودی ہیں
صحرا میں بھی رہتے ہیں بصد جاہ و حشم ہم

پوچھے گا خدا حشر میں، ہے کون گنہگار؟
رحمت کی قسم کھا کے پکاریں گے کہ ہم ہم

ہے زیرِ قدم ، متین آج یہ کیسی!
خود چومتے ہیں شوق میں اپنے ہی قدم ہم

### کنور سین حسرت ایم۔ اے

تُو نے رہِ حیات کو یوں جگمگا دیا
یکسر نشانِ تیرگیِ غم مٹا دیا

آ کر ترے خیال نے جادو جگا دیا
ہر کنجِ دل کو گوشۂ جنت بنا دیا

وہ آج زیرِ لب جو ذرا مُسکرا دیا
ہر سمت رنگ و نور کا دریا بہا دیا

غنچے چٹک گئے کلیاں مہک اُٹھیں
تیری ہنسی نے گلشنِ ہستی سجا دیا

ایوانِ دل میں کچھ بھی بجز تیرگی نہ تھا
تُو نے مگر چراغِ تمنا جلا دیا

مستی میں جھوم جھوم اُٹھی کائناتِ دل
حسرت یہ تو نے کون سا نغمہ سُنا دیا

---

### سیدہ زہرہ دہلوی

شام ہوتے ہی میرے کانوں میں — تیرے قدموں کی چاپ آتی ہے

دلِ غم آشنا میں یاد تری — یوں دبے پاؤں روز آتی ہے

چاندنی کی اُداس پرچھائیں
جیسے تالاب میں نہاتی ہے

بیسویں صدی دہلی اپریل ۱۹۷۰ء

افسانہ

# دامن میرا تر ہے

م صبوحی طارق

معرفت طارق ندیم (Med. Rep.) نیو تیواری چینک روڈ، رانچی (بہار)

محترمی!

... جون کے شمارہ میں شائع ہونے والی میری کہانی "درد کا گیت" پڑھنے کے بعد میرے پڑھنے والوں نے مجھ سے اور طارق سے جس ہمدردی کا اظہار کیا ہے اس کے لئے ممنون ہوں۔ اتنا ضرور کہوں گی کہ طارق کی محبت کا احاطہ میرے لئے آج بھی اتنا ہی وسیع ہے جتنا روز ازل تھا اور حقیقت صرف اتنی ہے کہ میں اپنی اس زندگی میں مغموم بھی ہوں، مسرور بھی ہوں! ...

ادب و احترام کے ساتھ
(م) صبوحی طارق

کہتے ہیں عورت دیوی ہوتی ہے، غرور و عظمت، فخر و انبساط کے خمیر سے بنی ہوتی ہے۔ اس میں فرشتوں کی پاکیزگی اور تقدس ہوتا ہے۔ وہ تیاگ اور بلیدان کی مجسم مورتی ہوتی ہے۔ رحم اور ہمدردی کی ساری وسعتوں کو سمیٹے سب کا ساتھ دیتی ہے، سب کے ساتھ چلتی ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں میں یہ سب سچ نہیں مانتی۔ شاید صرف اس لئے کہ میری نظروں کے سامنے وہ ہستی ہے جو عورت نہیں، جس کے نام کے ساتھ دنیا نے کبھی ان اوصاف کا لیبل نہیں لگایا۔ لیکن درحقیقت جس نے ہر دکھ اور درد سے متاثر ہو کر میری روتی آنکھوں کو شبنمی مسکراہٹ بخشی ہے۔ آپ ہی کہئے ـــــ اگر کوئی آپ سے کچھ نہ مانگے، پیار کا ایک لمحہ، خوشی کی ایک ساعت، سکھ کا ایک ثانیہ، مسرت کا ایک پل، کچھ نہ چاہے۔ لیکن گہری خاموشی کے ساتھ چپکے سے دریاؤں کی سی ہنگامہ خیز و پرجوش زندگی سے آپ کو ہم آغوش کر دے اس لمحہ ـــــ اس لمحہ کیا آپ کا دل نہ چاہے گا کہ اس کے دامن پر سجدہ کریں؟ پھر میں اگر کہتی ہوں تو غلط تو نہیں کہتی، میں سجدہ کرتی ہوں تو غلط تو نہیں کرتی۔

میں نے اپنی زندگی میں سب کچھ گنوا دیا ہے۔ کوئی شے میری اپنی نہ رہی اس کے سوا کہ یہ جسم و جان میرا کہا جا سکے، یا پھر لوگ یہ جان سکیں کہ میں زندہ ہوں۔ اس ناکارہ وجود کے باوجود میں کھل کھلا کر ہنستی ہوں میرے انگ انگ سے خوشیوں کے نغمے پھوٹتے ہیں اور میں سرور میں ڈوب کر گنگنانے لگتی ہوں...

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے

میں نے دیکھا ہے۔ ہزارہا انسانوں کو روتے تڑپتے سسکتے اور خودکشی کرتے! مجاز سے شاد تک، سقراط سے مارٹن لوتھر تک کسی سے بھی زندگی نے وفا نہ کی یا یہ زندگی کا زہر نہ پی سکے۔ کتنے بدنصیب تھے یہ انسان! جنھیں کوئی بچا نہ سکا۔ یہ انگاروں پر ناچتے رہے۔ دکھ کے کوڑوں کی ضرب سے جب رواں رواں دکھنے لگا تب انھوں نے خود کو موت کے حوالے کر دیا۔ کیسی بدبختی ہے یہ ان کی! سوچتی ہوں انھیں کیا کوئی ایسی ہستی نہ ملی جو ہر انگارے کو اپنے ہاتھوں سے مسل ڈالتی، جو ہر کوڑے کی ضرب کو اپنی پیٹھ پر سہہ کر انھیں بچا لیتی؟ میرے خدا! کیا ہر انسان وہ دامن نہیں پا سکتا جس پر سجدہ کیا جا سکے۔ کیا میں ہی وہ خوش نصیب ہوں جسے تو نے دکھ درد میں ساتھ دینے والا رفیق سفر بخشا ہے؟

مجھے یاد ہے اس بھیانک شام کو میں نے چیخ چیخ کر کہا تھا ـــــ

"نہیں ـــــ نہیں، میں جینا نہیں چاہتی مجھے مرجانے دو ـــ مجھے مرجانے دو!"

اور پھر میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ ماتھے پر گہرا زخم آجانے سے کافی خون بہہ چکا تھا۔ لوگ کہتے ہیں وہ دبلا پتلا سا نوجوان کمزور و نحیف ہونے کے باوجود مجھے

ہار ادے کر ہسپتال کی بلند و بالا سیڑھیاں چڑھتا ہوا ایمرجنسی وارڈ میں لے
تھا۔ ڈاکٹروں نے ہدایت دی تھی کہ مجھے گہری نیند سو جانے دیں۔ لیکن وہ
بہت بے چین سا تھا۔ سسک سسک کر وہ صرف یہی کہتا رہا تھا کہ ——

"میرے جسم کا آخری قطرہ نہ سہی، وہ خون ضرور تمہاری ڈوبتی رگوں میں
گردش کر رہا ہے جس میں میرے پیار، میری محبت کی سُرخی شامل ہے۔ پھر میری
زندگی کو اس طرح غمناک کیوں کر رہی ہو۔ مجھے اس طرح اکیلا نہ چھوڑو!"

لیکن میں ان سب باتوں سے بے نیاز تھی۔ ہسپتال والے تو مجھ سے
ان کی محبت کا اندازہ کر ہی چکے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں کی بے جان
چیزیں بھی اس کی تڑپ اور کرب پر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں! اس نے
دریچے سے ٹیک لگائے لگائے ہی وہ رات گزار دی تھی۔ اونچی نیچی پہاڑیاں
جیسے مُنہ پھاڑے کھڑی تھیں۔ وادیوں کے دل سسک رہے تھے۔ مہیب
اندھیروں میں جیسے کوئی درد اُونگھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے نیند، صبر و سکون
سب کچھ غائب ہو گیا تھا اور وہ اپنے آپ کو یقین دلاتا رہا تھا کہ ابھی ابھی دُور
اُفق پار بدلیوں میں سفیدی جھلملائے گی، چاند نکلے گا، اندھیرے مٹ جائیں گے۔
لیکن میں اس کی اس حالت سے ناآشنا رات کی ساری خاموشیوں کو سمیٹے سو رہی
تھی۔ نحیف و ناتواں!

مجھے یاد ہے شادی کے چھ ماہ بعد پہلی بار وہ میرے ساتھ جا رہا تھا۔ جیسے
ہی ٹرین نے وِسل دی میں چونک پڑی اور سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔
میرے کپکپاتے لب کانپ رہے تھے۔ جیسے کسی گھٹن نے میری آواز کا گلا گھونٹ
دیا ہو۔ میں کچھ نہ کہہ سکی اور دُور دریچے کی طرف ہٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ ویسے ہی
چُپ چاپ بیٹھا کھڑکی سے پار دَوڑتی، مچلتی ہر چیز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ یہ کیسی
مجبوری ہے! میرے ہونٹ کُھل کیوں نہیں پاتے۔ میں اُس سے کہہ کیوں نہیں دیتی،
کیا میری ہر سوچ، ہر آواز کو زمانے نے ڈر اور خوف کے کفن میں سی دیا ہے ——
اُف! میں تھک سی گئی۔ میں نے تو اُسے ہمیشہ یہی احساس دلایا ہے کہ وہ میری
زندگی کے ہر پہلو سے واقف ہے اور پھر آج یہ کلبلاتا درد؟ یہ کیسی آگ ہے
جس سے میرا انگ انگ تپ رہا ہے اور وہ انجان ہے۔ یہ کیسی رازداری ہے؟
یہ کیسی دُوری ہے؟ ٹرین کی رفتار دھیمی ہوتی جا رہی تھی اور میں نے اپنی
تھکتی سانسوں سے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس سے سب کچھ کہہ دوں گی۔ اُسے سُننا
اور برداشت کرنا پڑے گا۔ آخر وہ اس طرح بے نیاز بن کر کب تک گزر کر سکے
گا۔ مجھے یقین ہے ایک بار وہ میری تشنگیوں کا، میرے زخموں کا احساس کر لے
تو پھر اپنے پیار کے اَن گنت چراغ جلاوے گا اور کہنے لگے گا ——

"پاگل کہیں کی! اتنے سارے دن اس ناسور کو اپنے سینے میں پالتی رہی اور
مجھ پر بھروسہ نہ کر سکی؟ میں آخر کو تیرا ہوں نا! سوچ تو سہی اس اتنی بڑی دُنیا میں
کوئی ہے جو تیری طرح مجھ سے یوں قریب ہو؟"

لیکن دوسرے ہی لمحے میں پسینے سے بھیگ گئی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کہے تو؟ ——
تو میں کیا کروں گی۔ نہیں، نہیں، میں نہ کہوں گی۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ میں نے ٹھیک ہی
کیا جو شادی کی پہلی ہی رات اُس سے کہہ دیا تھا ——

"سچ تو یہ ہے کہ تم نے میری زندگی کی امانت کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے،
لیکن میرے امین! میں چاہتی ہوں، تم میرے ایسے نگہبان بنے رہو جو کسی عمارت
کی باہر سے تو نگہبانی کر سکتا ہے۔ لیکن اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف اس لئے
کہہ رہی ہوں کہ مجھے زمانے کی کوئی خوشی، کوئی رونق، کوئی تنویر راس نہیں آ سکتی۔
میں خاموش سناٹوں میں چُپ چاپ جینا چاہتی ہوں جیسے میرے ٹوٹتے ہوئے
خواب خمار آلود نیند لے رہے ہوں۔ کسی کی قربت و رفاقت سے میرا دم گھٹنے
لگتا ہے۔ مجھے اس نیند سے کبھی نہ جگانا۔ میں تم سے بھیک مانگتی ہوں۔"

میری آواز رُندھ گئی تھی۔ مجھے یاد ہے اُس نے بے پناہ ضبط کے بعد
ریشمی لحاف کو اپنی مٹھیوں میں جکڑتے ہوئے بہت دیر بعد پتھر کی سی سختی سنبھالے

———

میں تب سے اس حد تک محبت کرتا ہوں کہ تمہارے لئے اپنے خون کا
قطرہ قطرہ دے سکتا ہوں۔ پھر بھی تم جانتی ہو میں پتھر کا دیوتا نہیں انسان
ہوں، خواہشات و جذبات کا پیکر؟'

اُس لمحہ میرا دل کیکپا اٹھا تھا۔ میں لرز کر رہ گئی تھی لیکن وہ کہہ رہا تھا۔
'تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے تمام عمر تمہاری اِس خمار آلود
نگاہوں پہ وار دے سکتا ہوں۔ اِس امید پر کہ شاید تم کبھی جاگ جاؤ اور مجھے
لے لو۔۔'

ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی تھی۔ کسی چائے بیچنے والے لڑکے نے کڑک
آواز لگائی اور چلا گیا۔ میری نظریں کپارٹمنٹ سے باہر بھٹکتی رہیں۔ دور دھیا
دلہ اپنی روشنی دھیرے دھیرے پھینک رہا تھا۔ کیا منجمد و ساکت چیزیں
بہوتی ہیں کہ سب سے بے نیاز اپنی زندگی کو جلاتی رہیں؟ میری نظریں
پیار اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔

'تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم اتنی بے چین کیوں ہو؟ اِن گذرے ہوئے
برسوں میں میں نے کبھی تمہیں اتنی مضطرب نہ دیکھا تھا!'

وہ میرے پاس بیٹھا مجھ سے پوچھ رہا تھا اور میں نے اپنی بے چینیوں کے
پھیلے ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ مجھے خوف ہونے لگا تھا کہ کہیں میرے چہرے کا
نقش چیخ چیخ کر میری زندگی کا حال سنا نہ دے۔ میں سسک پڑی تھی
میرے سامنے کھڑا تھا۔ چاہتے ہوئے بھی میرے چہرے کو ڈھکے ہوئے اُن
کو ہٹا نہ سکا تھا۔ جن ہاتھوں کو تھام کر چھ ماہ پہلے اس نے ساری زندگی
بسانے کا وعدہ کیا تھا۔ دُنیا اور سماج کو گواہ بنا کر مقدس الفاظ میں یہ
تھی۔ لیکن یہ کیسا موڑ آ گیا تھا کہ سب کچھ تیز رفتار پنچھی کی طرح اڑتا ہوا نکل
اُڑتی ہوئی گرد و غبار میں ہم دونوں کھڑے رہ گئے جیسے پوچھ رہے ہوں،
طاقت پرواز کس نے سلب کر لی؟ اُس نے تڑپتے ہوئے برتھ کے ڈنڈے کا
لیا اور پھر میرے ہی سامنے دو زانو بیٹھ کر پوچھنے لگا ———

'تمہیں کیا غم ہے؟ مجھ سے نہ کہو گی؟'

اُس کے اِس سوال پر میں گھبرا سی گئی تھی۔ بے چین بے چین سی اِدھر اُدھر
دیکھنے لگی جیسے مجھے کسی شے کی تلاش ہو اور پھر میری زبان سے نکلا تھا۔

'بہت پیاس لگی ہے، پانی پلا دو!'

اور جب اُس نے سبز شیشے کے گلاس میں پانی بھر دیا، اُس وقت میرا
جی چاہا اس گلاس کو توڑ کر پھینک دوں۔ ہر طرف سبز سبز شیشے کے
ٹکڑے بکھر جائیں اور پھر یہ ٹکڑے سبزہ زار میں بدل جائیں۔ میں اُس سبزہ زار میں
پھولوں کی حسین ڈالی بن کر مہک مہک جاؤں۔ اُف! کتنی خشک اور پیاسی
زندگی ہے۔ جیسے تپتا ہوا صحرا! میں نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔
لیکن وہ تو مجھ سے پوچھ رہا تھا ———

'مجھ سے کوئی دُکھ پہنچا ہے کیا؟ کہو نا! تمہیں اُداس اور بے چین دیکھتا
ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے انجانے میں میں نے تمہیں کچھ کہہ دیا ہے۔ کوئی
نامناسب بات!'

لیکن میں کیا کہتی؟ کیسے کہتی کہ جس کے دُکھ کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہو اُس
میں اور دُکھ برداشت کرنے کی طاقت کہاں؟ جس کا خیال جس کے احساس کا
ہر پرتو، جس کی نگاہوں کی ہر چمک، جس کے لبوں کی ایک ایک مسکراہٹ جھلس کر
رہ گئی ہو وہ اُس معصوم سے انسان سے کیسے کہتی کہ کس درد کے آبلوں نے اُسے
یوں مجسم درد بنا دیا ہے۔

'کہتی کیوں نہیں ہو؟ مجھ میں اتنی صلاحیت ہے کہ تمہارے ہر درد کو
دُور کر سکوں، ہر غم کا مداوا کر سکوں۔ مجھ سے کہہ دو نا!'

اُس کا لہجہ بہت نرم اور محبت سے پُر تھا۔

'اوہ!۔۔' میں ہنس پڑی تھی۔ عجیب سی ہنسی۔ جیسے کوئی کوک کر بلند
آواز سے رو دے اور پھر کہنے لگی تھی ———

'میرا درد بہت بڑا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے یہ درد اگر زمین میں ہو
تو زمین شق ہو جائے۔ آسمان میں ہو تو بجلیاں گر پڑیں۔ ستاروں میں بس جائے
تو ستارے ٹوٹ کر بکھر جائیں۔ لیکن نہ جانے مجھ میں اتنی قوت کہاں سے آ گئی
ہے کہ میں جیتی جا رہی ہوں۔'

'کیا مطلب میں سمجھا نہیں!'

اُس کے چہرے پر سیاہی سی بکھر گئی اور پھر سنبھل کر وہ کہنے لگا۔

'ستارے، زمین، آسمان، پہاڑ، اُن کی بھی کوئی ہستی ہے؟ یہ انسان تو
نہیں کہ درد برداشت کر لیں۔ تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ دُنیا میں شوہر اور بیوی
سے زیادہ دُکھ درد کو بانٹ لینے والا کوئی دوسرا رشتہ نہیں ہو تا۔ یوں اُداس
نہ رہا کرو۔ مجھ سے کہہ دو پلیز!'

میں نے ایک لمحہ کے لئے اُس کی طرف دیکھا اور پھر نہ جانے کس
وحشت سے کپکپا کر رہ گئی۔

'نہیں، نہیں، میں کچھ کہنا نہیں چاہتی، کچھ نہیں چاہتی!'

اور پھر میں کسی احساس سے تڑپ اُٹھی۔ میری سانسیں آدمی کے جھگڑے کی

بے چلنے لگیں، مضطرب سی ہچکیاں سی لینے لگیں ——

"میں بہت کمزور ہوں تم نہیں جانتے اپنی کمزوری کا احساس مجھے آج سے پہلے اس دن ہوا تھا جب میرے ماں باپ بھائی کے درمیان سے چند درندوں نے اُن ویرانوں میں لا پھینکا تھا، جن میں پھر کبھی بہار نہیں آتی۔ جہاں آجانے کے بعد دامن کے داغ کبھی نہیں دُھلتے۔ اُس فساد کی آگ میں نہ جانے کتنی بیٹیوں کا کنوارپن جل گیا، کتنی مریموں کی آبرو لُٹ گئی، کتنی سیتاؤں کا دامن درندوں نے تار تار کر دیا! اور جب میں گھر واپس آئی میری ماں پر لوگوں کی طنز بھری نظریں اُٹھ رہی تھیں اور میرے باپ کا دل غیرت و حمیت کی آگ میں جل رہا تھا۔ مجھے ایسا احساس ہو رہا تھا جیسے میرے وجود کے کسی زخم میں کیڑے کلبلا رہے ہوں۔ ماں باپ کا بوجھ کب تک بنی رہتی! میں تو اُن کے دلوں میں ایک ایسی پھانس بن کر کھٹک رہی تھی جسے زمانہ لمحہ بہ لمحہ کُرید تا جا رہا تھا اور پھر مجھ جیسی لڑکی کا بیاہ انجانے میں تم سے کر دیا گیا۔ جس عورت سے جو مرد اپنے وجدان سے پیار کرتا ہو اُس کے پیار کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ میں اب اور برداشت نہیں کر سکتی۔ تم مجھے بھول جاؤ، میرے اس زخم خوردہ وجود کو اپنے پیار کی چادر سے ڈھانکنے کی کوشش نہ کرو۔ میرے اس مُردہ وجود کو اپنے وجود سے وابستہ نہ کرو۔ کاش! تم مجھ سے کسی طور، کسی انداز سے بے وفائی کرتے اور میں جی سکتی۔ مجھے —— مجھے مرجانے دو —— مرجانے دو! . . ."

ٹرین دھواں اُڑاتی اندھیری سُرنگ پار کر رہی تھی اور میں نہیں چاہتی تھی کہ اپنے دل و دماغ کے اُن اندھیروں کو اُس کے چہرے پر نفرت کے رُوپ میں دیکھوں۔ اِس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا میں ٹرین سے چھلانگ لگا چکی تھی۔ مجھے اِتنا یاد ہے، میرے پیچھے وہ بھی ٹرین سے کُود پڑا تھا۔ میرے خون آلود سر کو اپنے ہاتھوں میں تھامے مجھ سے پُوچھ رہا تھا ——

"کیا تمھارے خون سے رنگی ہوئی یہ زمین تمھاری آبرو لوٹا سکتی ہے؟ تمھاری یہ موت تمھیں وہ آبرو دے سکتی ہے؟ پھر تم نے مجھ پر بھروسہ کیوں کیا؟ تم نے مجھے اپنی زندگی کا امین سمجھا تھا نا؟ پھر انجانے میں کیسے اپنی یہ امانت مجھ سے چھین رہی ہو؟ جاگ جاؤ۔ اب آنکھیں کھول دو —— ابھی تو میں زندہ ہوں، ہر دَور میں زندہ رہوں گا۔ اُس وقت تک جیتا رہوں گا جب تک عورت کے اندر وفاداری اور اپنی آبرو کا پاس اور احساس باقی ہے ——"

لوگ کہتے ہیں، آج میرا قُرب اُن سے اُن کے غم چھین لیتا ہے۔ میرا وجود اُن سے زندگی کی ساری اُداسیاں یوں دُور کر دیتا ہے جیسے مست ہواؤں کا کوئی جھونکا پھولوں کو کھلا کر رکھ دے۔ میں اُن لوگوں کو کیا جواب دوں جو مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں نے بہاروں میں جھومتی شاخوں کی یہ لچک، ساونوں میں مدہوش کوئل کی یہ میٹھی کُوک، شبنم آلود پھولوں کی پنکھڑیوں پر سورج کی کرنوں کا سا خمار کیسے پایا ہے؟ کہاں سے پایا ہے؟ اور میں اپنے آپ سے پوچھتی رہ جاتی ہوں کہ مجھے مرجانا چاہیے تھا اور اِس سے پہلے کہ میں اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتی وہ میرے سامنے ہوتا۔ مسکراتا گنگناتا!

وہ مجھ سے کہتا —— "نہیں میری جان! جب تک میں زندہ ہوں دُنیا کی کوئی آنچ تم پر نہیں آسکتی!"

ذرا سوچیے تو یوں بھی کوئی لُٹ کر آباد ہوا ہے، یوں بھی کسی نے اَنگ کے سیندُور کی حفاظت کی ہے، یوں بھی کسی نے کسی کو چاہا ہے؟؟

---

## اُردو کی مزاحیہ شاعری

مرتبہ جناب عرش ملسیانی۔ میر سے لے کر دورِ حاضر تک کے مزاحیہ اور طنزیہ کلام کا بے نظیر انتخاب۔ اِس قسم کی کوئی کتاب اُردو ادب میں موجود نہیں۔ پڑھیے اور لُطف اُٹھائیے۔ پُرانے شعراء کے ساتھ ساتھ سیّد محمد جعفری، مجید لاہوری، راجہ مہدی علی خاں، دِلاور فگار، واہی، شاد عارفی اور بیسیوں شعراء کا کلام اِس میں درج ہے۔ اعلیٰ وارفع مزاح۔ ابتذال نام کو نہیں۔ مبسوط مقدمہ۔ کتاب نہایت دلچسپ بھی ہے اور تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اُردو ادب میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ قیمت محض آٹھ روپے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

## شرارِ سنگ

ہندوستان کے مقبول و ممتاز شاعر حضرت عرش ملسیانی کا تیسرا مجموعۂ کلام۔ صدرِ جمہوریۂ ہند جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اِس مجموعے کو بہت پسند فرمایا ہے۔ قیمت آٹھ روپے

## شعلہ زار

جناب دوار کا داس شعلہ کا قابلِ قدر، بلند پایہ مجموعۂ کلام۔ جسے پڑھ کر دل و دماغ پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ بہت نفیس۔ قیمت فی جلد صرف چھ روپے۔

## گرمیِ اندیشہ

جناب صغیر احمد صوفی کا دوسرا مجموعۂ کلام۔ ان کی شاعری احساس کی شاعری ہے۔ احساس جو لطیف بھی ہے اور شدید بھی۔ صوفی صاحب نے اپنے ذہنی سفر میں جو کچھ محسوس کیا، شعر کے خوبصورت ساز میں ڈھال دیا۔ صوفی صاحب کی شاعری یقیناً فکر و خیال اور اسلوبِ بیان دونوں اعتبار سے تازہ دم ہے۔ کتابت، طباعت اعلیٰ۔ خوبصورت جلد۔ قیمت پانچ روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

# غزل

ارشد صدیقی ایم۔ اے

نظارہ ماضی کے جام چھلکانے نہیں آئے
تمہاری بزم میں ہم دل کو بہلانے نہیں آئے

کوئی تا عمر کو جا کر کوچہ جاناں میں دیکھ آئے
کسی دن سے یہ حضرت ہم کو سمجھانے نہیں آئے

رخِ ایماں پہ شانِ دلبری آنے نہیں پائی
حرم کی راہ میں جب تک صنم خانے نہیں آئے

جہاں پاں شوخ پلکوں پہ ستارے جاگ اٹھتے ہیں
زبانِ شوق پر اب تک وہ افسانے نہیں آئے

بہارِ زندگی کی ان سے کیا امید ہو ارشد
کبھی جو خواب میں بھی پھول برسانے نہیں آئے

# یادیں

سلام کیفی بی۔ اے

جن کے سینے میں اتر جاتی ہیں نشتر یادیں
کتنی بے باک ہیں کس درجہ ہیں خودسر یادیں

ساتھ وہ غنچہ دہن ہے نہ وہ گلگشتِ چمن
گلشنِ دل میں پریشاں ہیں معطر یادیں

کس طرح میں تری یادوں سے بچاؤں دامن
بن گئیں میرے لئے میرا مقدر یادیں

تو کہ ہر لحظہ نگاہوں میں بسی رہتی ہے
باوفا کیوں نہ کہوں تجھ سے ہیں بہتر یادیں

دل کی دنیا ہے پھر دم تہہ و بالا کیفی
دل میں ہر آن اٹھا دیتی ہیں محشر یادیں

# غزل

مہندر پرتاپ چاند

ستم پہ کیا دلِ محزوں پہ ڈھا رہے ہو تم؟
کہ بار بار جو اب یاد آ رہے ہو تم؟

خیال و خواب و نظر میں سما رہے ہو تم
تمام تر مری ہستی پہ چھا رہے ہو تم

شگفتہ کیوں نہ رہے میری آرزو کی کلی؟
کہ دل کے باغ میں مثلِ صبا رہے ہو تم

یہ راہِ عشق ہے پہلے ہی کون سہی ہموار
قدم قدم پہ جو کانٹے بچھا رہے ہو تم

تمہیں نگاہوں سے جس نے گرا دیا اے چاند!
اسی کی راہ میں آنکھیں بچھا رہے ہو تم!

# غزل

نصیر صمدانی ایم۔ اے

حاملِ عکسِ جلوہ ہوا آئینہ
آئینہ میں ہوا رونما آئینہ

بکھری زلفوں کا سایہ ڈالا کرو
دیکھو وحشت زدہ ہو گیا آئینہ

سجدۂ شوق نے یہ دکھایا اثر
بن گیا آپ کا نقشِ پا آئینہ

تابشِ جلوۂ رخ کے اعجاز سے
دل مرا ہو گیا پر ضیا آئینہ

عکس کوئی بھی سالم نہیں ہے نصیر
میرا دل ہے کہ ٹوٹا ہوا آئینہ

سپر سرف سے ایک بار دھل
کپڑے جتنے سفید ہوتے ہیں
دوسرے پاؤڈروں سے
دھل کر بھی نہیں ہوتے!


NEW SUPER
Surf

# دو ہاتھ، ایک لکیر

یوسف ہستی

۴-۴-۲۹۰، مشیر آباد، حیدرآباد نمبر ۲۰ (اے۔پی)

مکرمی! تسلیمات

ایک طویل غیر حاضری کے بعد ایک افسانہ "دو ہاتھ، ایک لکیر" پیشِ خدمت ہے ــــ اُمید ہے کہانی کا مرکزی خیال آپ اور ہزاروں قارئین بیسویں صدی کے نازک و حساس دل و دماغ کو چھیڑنے کا واسطہ بنے گا...

خلوص آگیں ــــ یوسف ہستی

★

اور ــــ اب جو ذرا بے تکلفی بڑھی تو دونوں کھل کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھانکنے لگے۔ محبت بھری نگاہوں کے جائزے استوار ہوتے چلے گئے اور ــــ وہ ماحول سے بے خبر بنتے گئے۔

کتاب دیدہ زیب ہو تو یوں بھی قاری کو ورق گردانی کی خواہش سی ہوتی ہے، پھر وہ تو سروری تھی! ماڈرن، بے باک، نازک نازک انگلیوں والی! چکنے رخسار پر تل! یوں محسوس ہوتا جیسے قدرت نے گوندھتے ہوئے میدے سے بنے جسم پر تازہ گلاب رکھ دیتے ہوں اور ــــ ایک گلاب کے کنارے پر ایک سیاہ چیونٹی اپنے آپ کو سمیٹے ہوئے گلاب کا چوری چوری رس پی رہی ہو اور ــــ سروری کو جیسے کچھ محسوس ہوتا ہی نہیں!

ــــ تو مرزا بھی اگر اس پر ریجھ گئے ہوں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ ایک سہ پہر جب کہ سیکشن میں کوئی بھی نہ تھا مرزا نے سروری سے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"جانتی ہو تمہارے سیدھے جانب جو تل ہوتا ہے وہ کس بات کا پتہ دیتا ہے؟"

[illegible] سروری نے بے باکی سے کہا۔

[illegible]

اِتنا کہہ کر مرزا اپنے آپ مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور ــــ سروری جو خود پامسٹری میں تھوڑا بہت دخل رکھتی تھی غور کرنے لگی ــــ

'یہ بات تو پامسٹری کی کسی کتاب میں نظر نہ آئی۔ ہاں! فیس ریڈنگ (Face Reading) کے سلسلے میں ہو تو ہو! البتہ محبت کی وہ لکیر جو ہتھیلی میں ابھرتی ہے، ابھرنے اور ڈوبنے والی محبت کا پتہ دیتی ہے خدا نہ کرے میری محبت ڈوبے! ــــ میں نے خود ان دنوں کئی بار دیکھا ہے کہ محبت کی لکیر طلوعِ آفتاب کی طرح چڑھ رہی ہے! نہ جانے کیوں؟ کل جب مرزا ہنس رہے تھے تو میں نے غور سے دیکھا اُن کے نچلے ہونٹ کے سرے پر ایک گہرا تل ہے، جس کے بارے میں کتابوں میں پڑھا ہے کہ ــــ یہ جذباتی انسانوں کی علامت ہے ــــ خدا جانے یہ کہاں تک درست ہے؟!

آج صبح سے اس طرح بارش ہو رہی تھی جیسے آسمان سے پانی کی بوندیں نہیں، بھاری بھاری شہتیر گر رہے ہوں! مرزا جو کسی نہ کسی طرح دفتر پہنچ چکے تھے سیکشن میں اکیلے بیٹھے بارش سے لطف اندوز ہوتے ہوئے تصور میں سروری کا سہانا ہوا تل دیکھ رہے تھے کہ اچانک سروری وارد ہوئی۔ پہلے تو وہ حیران ہوئے پھر ان نگاہوں سے دیکھنے لگے جن میں مصنوعی حیرانی بھی تھی اور [illegible] ایک [illegible] سا [illegible] جاتا، دروازے [illegible] کی آمد کی توقع نہ [illegible] خیال کی ایک کڑی تھا جس میں چاہنے والا صرف اپنی محبوبہ کو

دیکھنے کا آرزومند ہوتا ہے!

"ارے آپ اتنی تیز بارش میں بھی دفتر نہ بھولیں؟!" مرزا نے اداکارانہ انداز میں حیرت کا اظہار کیا۔

"بس آگئی! خیال تھا تنہا رہوں گی اور —— کچھ پڑا ہوا کام سمیٹ لوں گی، یہ جانتے ہوئے کہ طوفانی بارش ہے، کون آئے گا چلی آئی!"

"اچھا —— !تو کام کی یاد آئی...؟"

"بس یہی سمجھئے —— !"

"میں تو تنہائی سے بور ہو رہا تھا۔ دیکھئے نا —— بدھوؤں کی طرح آسمان کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو دیکھ رہا تھا! اب آپ کے ساتھ دیکھوں تو یہ آنسو چمکتے ہوئے موتی نظر آئیں!" مرزا نے شاعری کی۔

"دیکھئے تو —— !اس پانی میں بجلی کس طرح چمک رہی ہے؟!" سروری نے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بجلی —— !اس کا کام ہی چمکنا اور گرنا ہے! ایسے کیا پتہ کہ —— اس کی کڑک، یہ چمک اتنی دوری کے باوجود زمین والوں پر کیا کیا غضب ڈھاتی ہے؟!" مرزا نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"کڑ —— کڑ —— کڑ —— کڑ"

سروری سہم سی گئی اور اپنی کرسی چھوڑ کر مرزا کے قریب دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟" مرزا نے رازدارانہ لہجہ میں کہا۔

"بُرا ماننے والی بات ہوگی تو ضرور بُرا مانوں گی!" سروری نے دوپٹے کی سلوٹیں درست کرتے ہوئے جواب دیا۔

"لائیے —— !میں ذرا آپ کے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھوں، شاید اس طرح کچھ وقت بھی اچھا کٹے اور..."

مرزا نے یہ کہہ کر سروری کی طرف اُن نگاہوں سے دیکھا جن میں بھرپور آس ہوتی ہے۔

"لیجئے! لیجئے! مجھے آج معلوم ہوا کہ آپ تیلی راجہ بھی ہیں!" سروری نے مُسکراتے ہوئے اپنا بایاں ہاتھ مرزا کے سامنے پھیلا دیا۔

مرزا بہت دیر تک سروری کے ہاتھ کی نازک نازک لکیروں کو گھورتا رہا اور مطلب نکالتا رہا ایسے جیسے کوئی بچہ حرفوں کو جوڑ جوڑ کر ہجے کرنے کی مشق کر رہا ہو۔ ہتھیلی کے دونوں طرف کے اُبھار، اُنگلیوں کی خوبصورت تراش، اُن کی نرم نرم، اُبھری اُبھری پوریں اور —— نہ جانے کیا کیا دیکھتا رہا —— خود ہی مُسکراتا رہا لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ شاید وہ اُنگلیوں کے حُسن میں کھو کر دُور نکل گیا تھا۔

سروری، مرزا کا چہرہ، بھیگے ہونٹ کا تِل اور دائیں ہاتھ کی لکیروں کو غور سے پڑھ رہی تھی جو اُس کے آگے بے خیالی میں رکھ دیا گیا تھا۔

"آپ تو کچھ کہتے ہی نہیں، کہیں میرے ہاتھ کی لکیریں گڑبڑ تو نہیں؟" سروری نے مرزا کی خاموشی پر طنز کیا۔

"میں نو آموز ہوں! بس سمجھئے کہ اسٹڈی کر رہا ہوں! —— مشق کے دوران کوئی اپنا فن کہیں کسی کے آگے پیش کرتا ہے؟" مرزا نے سلیقے سے اپنی جہالت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"تو یوں کہیے کہ مجھے ہی تختۂ مشق بنایا گیا؟!" سروری نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"ارے غضب کرتی ہیں آپ! آپ کا ہاتھ بے حد خوبصورت ہے!" مرزا نے سروری کے ہاتھ کا سہارا لیتے ہوئے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"میں لکیروں کی خوبصورتی کی بات کر رہی ہوں، ہاتھ کی خوبصورتی کی نہیں۔ آخر یہ کتنی خوبصورت نکلیں؟"

"یہ لکیریں بھی ہاتھ کی طرح حسین ہیں۔ خوبصورت..." مرزا نے اتنا کہا ہی تھا کہ ——

"کون حسین ہے؟ کون خوبصورت؟" کہتے ہوئے حسینی کمرے میں داخل ہوا اور سروری پر بے پروائی سے نظر ڈالتے ہوئے اپنا واٹر پروف اُتارنے لگا۔

سروری یوں ٹھٹھر گئی جیسے تیز ہوا کا ایک سرد جھونکا اُسے چھو کر گزر گیا ہو!

حسینی نے اپنی کُرسی مرزا کے برابر لے کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کون خوبصورت ہے؟ تو کہیں؟"

"وقت —— !" مرزا نے کہا۔

اور دونوں کھِل کھِلا کر ہنس پڑے اور سروری کی مُسکراہٹ تھمی ہوئی بارش کی طرح اُس کے ہونٹوں پہ رُک سی گئی۔

---

مرزا اپنے گھر آکر خیالوں کی دُنیا میں پہنچ گیا ——

"کتنی شاندار لکیریں ہیں سروری کی؟ ہزاروں ہاتھ دیکھ ڈالے مگر —— یہ بات کہاں؟ دولت اور محبت کی لکیریں اس طرح چڑھ رہی ہیں جیسے چڑھتی

ندگی! یہ حاصل ہو جائے تو گھر جنّت بن جائے! وہ گھر ہی کیا، جس میں محبت اور دولت نہ ہو!

لکیروں سے تو پتہ چلتا ہے کہ اُس کے دل میں بھی محبت رینگ رہی ہے۔ بلکہ دوڑ رہی ہے! اب میرے سوا کس کی طرف بھاگ رہی ہو گی؟ کون ہو سکتا ہے میرے مقابل؟ میرے سوا اس نے کسی کو بھی سیکشن میں لفٹ ہی نہیں دی اور دوسرے جلتے ہیں، جلا کریں۔ میں کب سے جل رہا ہوں اُن فاصلوں کی آگ میں جو میرے اور سروری کے درمیان بھڑک رہے ہیں! کون جانتا ہے؟

چہرے کبھی کبھی گونگے ہو جاتے ہیں۔ ہر چہرہ دل کا حال نہیں کہتا! میرا کوئی دوست بھی تو نہیں سروری کے سوا ––– اور یہی تو اب میری غمخوار ہے اُسی تجھ سے بھی زیادہ جو برسوں پہلے میرے پلّے باندھ دی گئی تھی اور اب ––– دور بیٹھے صرف سی آرڈر کا انتظار کرتی ہے!'

'کتنی مجبور کی ہوتی ہے عورت، روپیہ پیسہ کی –––؟'

مرزا کو اُس کی پچھلی زندگی کی یادوں نے اُداس کر دیا ––– نہ جانے کب اُسے نیند آ گئی اور خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

سروری اپنے گھر میں بستر پر لیٹی اپنا ہاتھ دیکھتی رہی جیسے یہ ہاتھ اُس کا نہ ہو، کسی اور کا ہو۔ کیا عجب مرزا ہی کا ہو!

'اُف کتنا عظیم ہاتھ ہے؟ دولت، عزّت اور شہرت اِس کے غلام ہیں! لیکن وہ خود عورت کا غلام ہے! لیکن اِس میں بُرائی کیا ہے؟

مُرید زن ہونا مرد کے لئے ہو تو ہو لیکن عورت کے لئے تو حکمرانی کی اَن مِٹ نشانی ہے! ––– کون عورت نہیں چاہتی کہ اُس کا محبوب یا شوہر صرف اُس کے لئے مر مِٹ جائے؟ بہت پیاری قسمت ہے اُس کی!

اِتنی نمایاں اور گہری لکیریں تو میں نے آج تک کسی کے ہاتھ میں نہیں دیکھیں! اگر اُس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ جائے تو کیسا رہے؟...؟'

اُس کے ذہن میں یہ سوال یوں پیدا ہوا جیسے انجانے میں کسی نے پتھر مار دیا ہو ایک چھوٹی سی جھیل میں! وہ دیر تک رنگین خیالوں میں کھوئی رہی۔

صبح جب سروری بیدار ہوئی تو اُس کے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے ––– وہ چاہتی تھی کہ یہ ہاتھ یونہی جُڑے رہیں!

---

اِس طرح کی "اسٹیڈیز" نے محبت کو پروان چڑھایا اور ––– دونوں نے اندازہ کر لیا کہ ––– اب اُن کا الگ الگ رہنا مشکل ہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی ہاتھ کی لکیروں کو پوری طرح پڑھ چکے ہیں اور کچھ نتیجہ نکال چکے ہیں اور ––– شاید وہی منشا و مقصد حقیقتاً اُن لکیروں میں بھی پوشیدہ ہو! لوگ اِن باتوں کو کہاں سمجھ سکتے ہیں؟ علم علم ہوتا ہے اور نظر نظر ہی!

مرزا کے ہاتھ کی لکیریں اور نچلے ہونٹ کا تِل تیزی سے نمایاں ہونے لگے اور ثابت کر دکھایا کہ وہ جذباتی ہے!

ماحول کو بدلنے میں کیا دیر لگتی ہے؟ دونوں پڑھے لکھے تھے اور اچھا کماتے تھے۔ خوشگوار زندگی گزر رہی تھی اور دونوں اپنی پُربہار و مسرت بکنار زندگی کے خواب دیکھ رہے تھے۔

جب مرزا اور سروری نے ایک دوسرے کو جذباتی اور ذہنی طور پر پوری طرح پڑھ لیا ––– دونوں نے شادی رچا ڈالی۔

زندگی پورے شباب پر آئی اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ مرزا دوہرے ہی ہوتے جا رہے ہیں جیسے ہر آنے والی گھڑی گوشت یا چربی کی ایک تہہ اُن پر چڑھاتی ہی جا رہی ہے اور ––– سروری کا تِل جیسے اور بلندی پر چڑھتا جا رہا ہو!

شادی رچانے کے چار مہینے بعد، مرزا نے سروری کی سالگرہ بہت دھوم دھام سے منانے کا پروگرام بنایا۔ خوب صورت دعوت نامے تقسیم کئے گئے۔

سالگرہ سے دو گھنٹے پہلے حسینی، مرزا کے گھر پہنچنے کے لئے نکلا۔ مرزا نے اُسے کچھ پہلے ہی آ جانے کو کہا تھا۔ وہ ابھی گھر کی دہلیز پر قدم رکھ ہی رہا تھا کہ مرزا کی گرجدار آوازوں نے اُس کے قدموں کو منجمد کر دیا۔

"میں پھر کہتا ہوں سروری، میں نے تمھیں کوئی دھوکا نہیں دیا۔ نجمہ ––– نجمہ تو ہے ہی مگر ––– اُس کا میرا اب اُتنا ہی تعلق ہے، جتنا کبھی ––– خود تمھارا حسینی سے رہا!"

حسینی اپنے ماتھے کا پسینہ رومال میں جذب کرتا ہوا، بوجھل بوجھل قدموں سے لوٹ گیا اور ––– اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کا دل سالگرہ کے کیک کی طرح کاٹ دیا گیا ہو!!

---

### شکیل احمد عاصم بریلوی ایم کام، بی۔ٹی

پھر آج بنا ہے تصویرِ انتظار مجھے
پھر آگیا ترے وعدے پہ اعتبار مجھے

مجھے نگاہِ حقارت سے دیکھنے والے
تجھی نے پیار سے دیکھا تھا ایک بار مجھے

عجیب ہے یہ دلوں کا معاملہ جس پر
نہ اختیار تجھے ہے نہ اختیار مجھے

شبِ فراق میں آیا تسلیاں دینے
ترے خیال نے پایا جو سوگوار مجھے

خدا ہی خیر کرے دامن و گریباں کی
کہ آزمانے کو آئی ہے پھر بہار مجھے

انہیں کو آج بھی شک ہے مری وفاؤں پر
جو آزما چکے عاصم ہزار بار مجھے

### مسعود حیات، ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

وہ ہم سے فاصلے جتنے بڑھائے جاتے ہیں
نگاہ و دل کے قریب اور آئے جاتے ہیں

کچھ ایسے غم ہیں کہ دل خون ہو کے رہ جائے
ہم اہلِ درد مگر مسکرائے جاتے ہیں

ہے ذرّے ذرّے میں عریاں کسی کا حسن مگر
نگاہِ شوق سے جلوے چھپائے جاتے ہیں

شبِ فراق کی تابانیاں بڑھانے کو
سرشکِ غم مری پلکوں پہ آئے جاتے ہیں

قریب ہیں تری منزل سے آج ہم شاید
رہِ طلب میں قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

کسی کا وعدۂ رنگیں ہے اعتبارِ حیات
ہم انتظار کی محفل سجائے جاتے ہیں

### بال کرشن گوپال مغموم بی۔ اے

غیر ممکن تھی ان تک رسائی
دل نہ کرتا اگر رہنمائی

زندگی میں بہت کام آئی
میری فطرت کی غم آشنائی

فصلِ گل کتنی صبر آزما ہے
بڑھ گیا اور دردِ جدائی

یوں بھی جاتا ہے کوئی بچھڑ کر
جب سے بچھڑے، خبر تک نہ آئی

دل کے تاروں کو چھوتی ہے کیا کیا
میری آتش نفس غم نوائی

کیا بری شے محبت ہے مغموم
ہو گئی ایک دنیا پرائی

---

### زاہد اعظمی

تری بے رخی کو میں دیکھ کر ترے آستاں سے گذر گیا
مجھے راس آئی نہ بوئے گل تو میں گلستاں سے گذر گیا

ترے غم سے پیار نہ کیوں کروں، ترا غم ہے مایۂ زندگی
ترے غم کا پا کے میں آسرا غمِ دو جہاں سے گذر گیا

مری راہ کتنی تھی پُر خطر مرے آس پاس تھے غم ہی غم
میں بڑے سکون سے اس حصار کے درمیاں سے گذر گیا

کوئی مجھ سے پوچھے تو کیا کہوں کہ کہاں ہے زاہدِ خستہ جاں
کسی سنگ دل پہ لٹا کے دل وہ غریب جاں سے گذر گیا

# ایک خط — ایک کہانی

معراج انور

مکان ۳-۳-۱۵۴، یاقوت پورہ، حیدرآباد ۲۳، آندھرا پردیش

محترمی! تسلیم

آپ کے گھر چوری ہو گئی اور میرا پاکٹ اٹھا لیا گیا!! آپ کے گھر چوری کی اطلاع "بیسویں صدی" کے ذریعہ معلوم ہوئی تھی اور میرا حادثہ بھی "بیسویں صدی" کے ذریعہ ہی دوسروں کو معلوم ہوگا، اس سے دونوں کا پتہ چلے گا: میرا پاکٹ مجھے ملے گا — صرف پڑھنے والوں کے تسلی بخش خطوں کی اُمید رکھتا ہوں —— سالنامہ میں میری کہانی "کلائمکس" پڑھ کر بہت سے دوستوں نے فرمائش کی کہ کوئی اور کہانی خطوط پر مبنی لکھوں —— اگر "ایک خط —— ایک کہانی" شائع کر دیں تو شاید "بیسویں صدی" کے بھائیوں کی فرمائش پوری ہو جائے . . .

آپ کا اپنا —— معراج انور

ڈیئر غزالہ! سلامِ خلوص

تم نے لکھا ہے اپنی کوئی نئی کہانی بھیجو —— تمہارا حکم سر آنکھوں پر! تمہاری فرمائش آئی اور ہر بار میرے قلم کو تمہاری خواہش پوری کرنی ہی پڑی، اور پھر —— ایک کہانی وجود میں آ گئی —— لیکن اس بار تمہاری فرمائش پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔

تمہاری فرمائش پر جب بھی کہانی لکھنے کے لئے دماغ پہ زور دیتا ہوں، کہانی کا کوئی پلاٹ، کوئی خیال ذہن میں نہیں آتا۔ صرف کسی کا دیا ہوا پلاٹ دماغ میں بار بار گھوم جاتا ہے اور تم جانتی ہو میں سُنے ہوئے پلاٹ یا کسی کے دیئے ہوئے پلاٹ پہ کہانی نہیں لکھتا، لیکن اب مجبور ہو گیا ہوں۔ شاید دماغ سے جب تک وہ پلاٹ کاغذ پہ نہ آ جائے میرے ذہن کو سکون نہ ملے گا۔ کوئی نئی کہانی وجود میں نہ آئے گی! ہاں تو ایک خوبصورت حادثہ سُنو —— یہ حادثہ ایک خوب صورت کہانی ہے —— یہ حادثہ ایک خوب صورت لڑکی کا عطیہ ہے۔ خوب صورت لڑکیاں خوبصورت حادثوں کو جنم دیتی ہیں، اُن سے خوب صورت کہانیاں وجود میں آتی ہیں!

حیدرآباد آنے کے لئے لکھنؤ سے پوری ایکسپریس میں سوار ہوا۔ میری سیٹ ریزرو تھی۔ میں اکیلا ہی تھا۔ کمپارٹ مینٹ میں جو ساتھی سفر کر رہے تھے، وہ مجھے کچھ 'بور قسم' کے دکھائی دیئے۔

'اتنا طویل سفر کیسے طے ہوگا —— ؟' میں سوچنے لگا۔

الہ آباد اسٹیشن پر گاڑی رُکی۔ یہاں کوئی اچھا ساتھی ملنے کی اُمید تھی لیکن یہاں بھی کوئی نہ آیا اور گاڑی چل پڑی، پھر —— یکایک ایک لڑکی چلتی گاڑی میں سوار ہو گئی۔

خوب صورت جوان لڑکی! گلابی رنگ اور اُسی سے ملتا ہوا اسکرٹ پہنے ہوئے، گھنے سیاہ ریشمی بال، جو ترشے ہوئے تھے اور بار بار اُڑ کر چہرے پر آ رہے تھے۔ وہ اُنہیں ایک اسٹائل سے پیچھے پھینک دیتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے شریر بادل چاند سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔ کبھی چاند پورا نظر آتا اور کبھی اُسے بادل گھیر لیتے۔ آنکھوں پر خوب صورت سیاہ عینک تھی۔ وہ دروازے ہی پر کھڑی رہی، قدرت کے نظارے دیکھتی ہوئی۔ لیکن ڈبہ کا ہر شخص قدرت کے دوسرے مناظر دیکھنا بھول کر قدرت کے اس حسین شاہکار کو دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دروازے سے ہٹ گئی اور ہماری طرف دیکھنے لگی۔ اُس نے اپنی سیاہ عینک اُتار لی تھی۔ اُف! اُس کی غزالی آنکھیں، بلا کا جادو تھا! اُس کی غزالی آنکھیں دیکھ کر نہ جانے کیوں تم یاد آ گئیں! تمہاری اَن دیکھی تصویر ذہن کے پردے پر اُبھر آئی۔ حسین خوب صورت تصویر!

میں اُس حسین تصویر کی دلکشی اور حسن و رعنائی میں کھویا ہوا تھا کہ دل نے کہا۔

دوست کی خوب صورتی نہیں، دوستی دیکھی جاتی ہے ——

میں شرمندہ ہو گیا ——

ایک حسین خیال سے نگاہیں ہٹی تھیں کہ دوسرا خوب صورت پیکر سامنے تھا —— وہ بیر پلک جھپکائے اپنی خوبصورت آنکھوں سے مجھے ہی دیکھے جا رہی تھی۔ میری آنکھیں کبھی کبھی خود بخود اُس کے سامنے جھک جاتیں جیسے کسی مقدس مورتی کے سامنے پجاری کی آنکھیں عقیدت سے جھک جاتی ہیں!

کیا ہر عورت پرستش کے قابل ہوتی ہے غزالہ ——؟

پھر وہ حسین پیکر اپنی جگہ سے ہٹا اور ہماری طرف بڑھا —— نہ جانے کیوں میں نے ذرا سرک کر اُس کے لئے جگہ بنا دی اور وہ آکر بیٹھ گئی۔ میری زندگی میں وہ پہلی لڑکی تھی جو مجھ سے اتنا قریب بیٹھی تھی۔ اُس کا گداز جسم میرے جسم سے چھو رہا تھا —— میرے سارے جسم سے پسینہ چھوٹنے لگا۔ میں رُومال نکال کر چہرہ صاف کرنے لگا۔ لیکن میں نے دیکھا وہ رُومال نہیں میرا پیسوں کا پاکٹ تھا۔ میں نے جھٹ پاکٹ جیب میں رکھ لیا اور رُومال نکال کر پسینہ پونچھنے لگا۔ اپنی بوکھلاہٹ کو چھپانے کے لئے میں نے بیگ سے "بیسویں صدی" نکال لیا اور اُس کے اوراق اُلٹنے لگا۔ وہ بھی بغل میں بیٹھی دیکھتی رہی —— پھر ستار کے تار بج اُٹھے، گلاب کی دو پنکھڑیاں ہلیں، وہ بولی —— ——

"بیسویں صدی" ہے؟"

"جی نہیں —— جی ہاں جی ہاں ——!!" میری زبان لڑکھڑا گئی۔

"بہت اچھا میگزین ہے!" پھر ستار کے تار بج اُٹھے ——

"آپ اُردو جانتی ہیں ——؟" میں اپنے پر قابو پا چکا تھا۔

"ہاں کچھ کچھ —— اُردو بہت بیوٹی فل لینگویج ہے!" وہ بولی۔

"آپ نے سچ کہا —— سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے ——!"

"کیا میں آپ کا نام جان سکتی ہوں ——؟" اُس نے اُردو کی تعریف کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

"مجھے معراج انور کہتے ہیں —— اور آپ ——؟" میں نے کہا۔

"روشنی ——!"

"روشنی ——!" میرے منہ سے ایک دم نکل گیا، پھر میں نے کہا۔

"آپ [illegible] بہت [illegible] ——!"

[illegible]

[illegible] پوچھا۔

"کچھ دُور نہیں —— وجے واڑہ تک —— اور آپ ——؟"

"میں حیدر آباد جا رہا ہوں ——!"

"آپ کا شغل ——؟" اُس نے پوچھا۔

"شغل سے مطلب ہے نوکری —— تو جی۔ ایس۔ آئی میں ملازم ہوں اور شغل سے مطلب صرف شغل ہے —— تو کبھی کبھی کسی کی فرمائش پہ کہانیاں لکھ لیتا ہوں ——!" میں نے کہا۔

"اوہ! یو آر رائیٹر ——؟" وہ حیرت سے بولی جیسے اُسے میری صورت دیکھ کر یقین نہ آیا ہو۔

"بس کچھ یوں ہی لکھ لیتا ہوں ——!" میں نے انکساری سے کام لیا۔

"کوئی نئی اسٹوری لکھی ہے ——؟" اُس نے پوچھا۔

"آج کل ذہن میں کوئی پلاٹ نہیں ہے۔"

"کیا میں کوئی پلاٹ دے سکتی ہوں ——؟" اُس نے کہا۔

"شکریہ! لیکن —— میں لکھنے سے مجبور ہوں —— کسی کے دیئے ہوئے پلاٹ پر میں کہانیاں نہیں لکھتا!"

"خیر آپ کی مرضی —— پلاٹ بہت خوب صورت ہے!"

"آپ بُرا نہ مانیں —— میں اپنی عادت سے مجبور ہوں ——" میں نے بات صاف کرنی چاہی۔

"اچھا —— ذرا میں لیواٹری ہو آؤں ——!" وہ اُٹھ کر چلی گئی۔

پندرہ منٹ بعد آئی ——

اتنی دیر میں میں نے کئی سُنہرے خواب دیکھ لئے تھے!!

"آپ وجے واڑہ میں کہاں رہتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ففٹین گاندھی لین ——"

"کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے ——؟" یہ سوال میرے منہ سے نکل گیا جو کسی لڑکی سے نہ کرنا چاہیئے، لیکن وہ برہم نہ ہوئی اور مُسکرا کر بولی ——

"جی نہیں ـــــ اور آپ کی ـــــ ؟"

"جی ابھی نہیں ـــــ !" میں نے بھی مُسکراکر جواب دیا۔

میں اُس سے بہت کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن دہنے واڑہ کا اسٹیشن آ گیا۔ وہ مجھ سے بہت خوش اخلاقی سے ملی۔ میں اُسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ اُترتے وقت اُس نے بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور مُسکراتی ہوئی چلی گئی۔ میں بہت دیر تک اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا ـــــ ٹرین نے سیٹی دی ـــــ میں چونک پڑا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں خواب دیکھ رہا تھا۔ ایک خوبصورت خواب! ایک ادھورا خواب ـــــ !!

مجھے کمپارٹمنٹ سُونا سُونا معلوم ہونے لگا۔ دل اُداس ہو گیا۔ سارا سفر اونگھتے اور سوتے ہی گزرا۔

حیدرآباد کا نامپلی اسٹیشن آ گیا۔ قلیوں نے سارا سامان نکالا اور میں ٹیکسی کی طرف چل پڑا ـــ دل بے چین تھا کب گھر پہنچوں ـــ ایک انجانی خوشی دل میں پیدا ہو رہی تھی۔

قلیوں نے سامان ٹیکسی میں رکھا۔ اُنھیں پیسے دینے کے لئے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن ـــــ پاکٹ غائب تھا ـــــ ! پھر ایک بار جیب میں اچھی طرح دیکھا لیکن اُس میں سے صرف ایک کاغذ نکلا۔ کاغذ ـــــ !

'یہ کیسا کاغذ جیب میں آ گیا ـــــ ؟' میں نے سوچا۔ پھر کھول کر اُسے دیکھا انگریزی میں لکھا تھا ـــــ

"ڈیر معراج انور!

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو اُردو میں خط نہیں لکھ سکتی۔ میں اُردو نہیں جانتی ـــــ 'بیسویں صدی' کا نام تو میں نے میگزین کے پیچھے دیکھ کر پڑھ لیا تھا۔ جو انگلش میں لکھا تھا۔ البتہ اُردو بات سمجھ لیتی ہوں۔ کیوں نہ سمجھوں گی اُردو بھی تو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔

یہ خط آپ کی جیب میں رکھ رہی ہوں اور آپ کا پاکٹ اپنی جیب میں رکھ چکی ہوں!

میں نے کہانی کا پلاٹ سُنانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ لیکن آپ نے نہ سُنا خیر اِس خوبصورت 'ٹریجڈی' کا پلاٹ آپ کو دے رہی ہوں،

میرے دیئے ہوئے پتہ پر میرے گھر آنے کی کوشش نہ کیجئے۔ بہت سے لوگوں کی طرح آپ بھی میرے گھر نہ پہنچ سکیں گے ـــــ !

اچھا ـــــ بائی بائی!

ـــــ روزی

خط پڑھ کر میں چکرا گیا۔ اُف! یہ حسین فریب!! ٹیکسی ڈرائیور سے پیسے لے کر ادا کر دیئے۔ دیکھنے والوں نے اِس حقیقت کو حقیقت سمجھا یا ایک فرضی کہانی! یہ وہی جانیں ـــــ کمزور نے میرے پرس کی چوری کو میرا فراڈ ہی سمجھا ہوگا۔

غزالہ! کہو، یہ حقیقت کیسی کہانی ہے ؟ ـــــ میں یہ کہانی 'بیسویں صدی' کی نذر کروں گا! اِس لئے کہ اُس میں زندگی آموز اور حیات افروز کہانیاں اچھی جگہ پاتی ہیں۔

روز کی دنیا ہوتی یہ کہانی زندگی آموز ہے اور حیات افروز بھی! اِسے پڑھنے والے کسی حسین لڑکی سے ایسا حسین فریب نہ کھائیں گے، محتاط رہیں گے۔

اوہ! خط بہت طویل ہو گیا! اب اور دوسرے خط میں ـــــ !!

تمہارا ـــــ انور

---

میں اُس حسین تصویر کی دلکشی اور حسن و رعنائی میں کھویا ہوا تھا کہ دل نے کہا۔
...تنی خوب صورتی نہیں، دوستی دیکھی جاتی ہے ——
میں شرمندہ ہو گیا ——

ایک حسین خیال سے نگاہیں ہٹی تھیں کہ دوسرا خوب صورت پیکر سامنے
—— وہ بنا پلک جھپکائے اپنی خوبصورت آنکھوں سے مجھے ہی دیکھے جارہی
میری آنکھیں بھی کبھی خود بخود اُس کے سامنے جھک جائیں جیسے کسی مقدس
...تی کے سامنے پجاری کی آنکھیں عقیدت سے جھک جاتی ہیں!
کیا ہر عورت پرستش کے قابل ہوتی ہے؟ سوال ——؟

پھر وہ حسین پیکر اپنی جگہ سے ہٹا اور ہماری طرف بڑھا —— نہ جانے
...میں نے ذرا سرک کر اُس کے لئے جگہ بنا دی اور وہ آکر بیٹھ گئی۔ میری زندگی
...وہ پہلی لڑکی تھی جو مجھ سے اتنا قریب بیٹھی تھی۔ اُس کا گداز جسم میرے جسم سے
...رہا تھا —— میرے سارے جسم سے پسینہ چھوٹنے لگا۔ میں رومال نکال کر
...صاف کرنے لگا لیکن میں نے دیکھا وہ رومال نہیں میرا سیزرس کا پاکٹ تھا۔
...میں نے جھٹ پاکٹ جیب میں رکھ لیا اور رومال نکال کر پسینہ پونچھنے لگا۔ اپنی
...گھبراہٹ کو چھپانے کے لئے میں نے بیگ سے "بیسویں صدی" نکال لیا اور
...اس کے اوراق اُلٹنے لگا۔ وہ بھی بغل میں بیٹھی دیکھتی رہی —— پھر ستار کے
...ترنم اُٹھے، گلاب کی دو پنکھڑیاں ہلیں، وہ بولی ——

"بیسویں صدی ہے؟"
"جی نہیں —— جی ہاں، جی ہاں ——!!" میری زبان لڑکھڑا گئی۔
"بہت اچھا میگزین ہے!" پھر ستار کے ترنم اُٹھے ——
"آپ اُردو جانتی ہیں ——؟" میں اپنے پہ قابو پا چکا تھا۔
"ہاں کچھ کچھ —— اُردو بہت بیوٹی فل لینگویج ہے!" وہ بولی۔
"آپ نے سچ کہا —— سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے ——"
"کیا میں آپ کا نام جان سکتی ہوں ——؟" اُس نے اُردو کی تعریف کو نظر انداز کر کے پوچھا۔
"مجھے معراج انور کہتے ہیں —— اور آپ ——؟" میں نے کہا۔
"روزی ——!"
"سچ مچ روز ——!" میرے منہ سے ایک دم نکل گیا، پھر میں نے کہا۔
"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ——!"
"ایسا ہی کچھ میں بھی محسوس کرتی ہوں!" وہ مسکرائی ——
"آپ کہاں جارہی ہیں ——؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ دُور نہیں —— وجے واڑہ تک —— اور آپ ——؟"
"میں حیدر آباد جارہا ہوں ——!"
"آپ کا شغل ——؟" اُس نے پوچھا۔
"شغل سے مطلب ہے نوکری —— تو جی۔ ایس۔ آئی میں ملازم ہوں اور شغل سے مطلب صرف شغل ہے —— تو کبھی کبھی کسی کی فرمائش پر کہانیاں لکھ لیتا ہوں ——!" میں نے کہا۔
"اوہ! یو آر رائیٹر ——؟" وہ حیرت سے بولی جیسے اُسے میری صورت دیکھ کر یقین نہ آیا ہو۔
"بس کچھ یوں ہی لکھ لیتا ہوں ——!" میں نے انکساری سے کام لیا۔
"کوئی نئی اسٹوری لکھی ہے ——؟" اُس نے پوچھا۔
"آج کل ذہن میں کوئی پلاٹ نہیں ہے۔"
"کیا میں کوئی پلاٹ دے سکتی ہوں ——؟" اُس نے کہا۔
"شکریہ! لیکن —— میں لکھنے سے مجبور ہوں —— کسی کے دیئے ہوئے پلاٹ پر میں کہانیاں نہیں لکھتا!"
"خیر آپ کی مرضی —— پلاٹ بہت خوب صورت ہے!"
"آپ بُرا نہ مانیں —— میں اپنی عادت سے مجبور ہوں ——" میں نے بات صاف کرنی چاہی۔
"اچھا —— ذرا میں لیواٹری ہو آؤں ——!" وہ اُٹھ کر چلی گئی۔
پندرہ منٹ بعد آئی ——
اتنی دیر میں میں نے کئی سنہرے خواب دیکھ لئے تھے!!
"آپ وجے واڑہ میں کہاں رہتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"ففٹین گاندھی لین ——"
"کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے ——؟" یہ سوال میرے منہ سے نکل گیا جو کسی لڑکی سے نہ کرنا چاہیئے، لیکن وہ برہم نہ ہوئی اور مسکرا کر بولی ——

"جی نہیں ــــ اور آپ کی ــــ؟"

"جی ابھی نہیں ــــ" میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

میں اس سے بہت کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن منچے واڑہ کا اسٹیشن آ گیا۔ مجھ سے بہت خوش اخلاقی سے ملی۔ میں اسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ اترتے وقت اس نے بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ میں بہت دیر تک اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا ــــ ٹرین نے سیٹی دی ــــ میں چونک پڑا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں خواب دیکھ رہا تھا ــــ ایک خوبصورت سا ایک ادھورا خواب ــــ!!

مجھے کمپارٹمنٹ سونا سونا معلوم ہونے لگا۔ دل اداس ہو گیا۔ سارا سفر اونگھتے اور سوتے ہی گزرا۔

حیدرآباد کا نامپلی اسٹیشن آ گیا۔ قلیوں نے سارا سامان نکالا۔ ہم ٹیکسی کی طرف چل پڑے۔ دل بے چین تھا کب گھر پہنچوں ــــ ایک انجانی خوشی دل میں پیدا ہو رہی تھی۔

قلیوں نے سامان ٹیکسی میں رکھا۔ انہیں پیسے دینے کے لئے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن ــــ پاکٹ غائب تھا ــــ!! پھر ایک بار جیب میں اچھی طرح دیکھا۔ لیکن اس میں سے صرف ایک کاغذ نکلا۔ کاغذ ــــ!

"یہ کیسا کاغذ جیب میں آ گیا ــــ!" میں نے سوچا۔ پھر کھول کر اسے دیکھا۔ انگریزی میں لکھا تھا ــــ

"ڈیر معراج انور!

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو اردو میں خط نہیں لکھ سکتی۔ میں اردو نہیں جانتی ــــ 'بیسویں صدی' کا نام تو میں نے میگزین کے پیچھے دیکھ کر پڑھ لیا تھا۔ جو انگلش میں لکھا تھا۔ البتہ اردو بات سمجھ لیتی ہوں۔ کیوں نہ سمجھوں گی اردو ہی تو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔

یہ خط آپ کی جیب میں رکھ رہی ہوں اور آپ کا پاکٹ اپنی جیب میں رکھ چکی ہوں!

میں نے کہانی کا پلاٹ سنانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ لیکن آپ نے نہ سنا خیر اس خوب صورت 'ٹریجڈی' کا پلاٹ آپ کو دے رہی ہوں،

میرے دیئے ہوئے پتہ پر میرے گھر آنے کی کوشش نہ کیجئے۔ بہت سے لوگوں کی طرح آپ بھی اس سے گھر نہ پہنچ سکیں گے ــــ!

اچھا ــــ بائی بائی!

ــــ روزی

خط پڑھتے ہی میں چکرا گیا۔ اف یہ حسین فریب!! ٹیکسی ڈرائیور سے پیسے لے کر قلیوں کو دیئے۔ دیکھنے والوں نے اس حقیقت کو حقیقت سمجھا یا ایک فرضی کہانی! اب دیکھئے جانے ــــ کتنوں نے میرے پرس کی چوری کو افسانہ ہی سمجھا ہوگا۔

غزالہ! کہو یہ حقیقت کیسی کہانی ہے؟ ــــ میں یہ کہانی بیسویں صدی کی نذر کروں گا، اس لئے کہ اس میں زندگی آموز اور حیات افروز کہانیاں اچھی جگہ پاتی ہیں۔

تم کہتی ہو نا یہ کہانی زندگی آموز ہے اور حیات افروز بھی! اسے پڑھنے والے کسی حسین لڑکی سے ایسا حسین فریب نہ کھائیں گے، محتاط رہیں گے۔

اور خط بہت طویل ہو گیا! اب اور دوسرے خط میں ــــ!!

تمہارا ــــ انور

---

## غزل

**...خزاں چند نسیم**

...سوز اگر شمع کے انداز رہے
...سے پتنگے بھی کہاں باز رہے

دنیا میں وہی لوگ سرافراز رہے
جو شام و سحر محوِ تگ و تاز رہے

...ے، پہ اٹھیں تری نظریں سرِ بزم
...شوخ ہمیں کیوں نظر انداز رہے

آزردۂ صدا اپنی خموشی ہی بنی
ہم جس کے لئے گوش بر آواز رہے

...ا اپنا ہی دل جب نہ مرے ساتھ رہا
...اس کو پڑی ہے وہ ہم ساز رہے

دنیا کو نسیم اس پہ تعجب ہے کہ ہم
آفات میں بھی زمزمہ پرداز رہے

## غزل

**سیدہ مجیدہ بی۔ اے عثمانیہ**

صورتِ ابرِ رواں، اشک فشاں ہم بھی ہیں
صفتِ بادِ صبا نوحہ کناں ہم بھی ہیں

کاش یہ صبحِ بہاراں کو خبر ہو جائے
ایک مدت سے تہہِ تیغِ خزاں ہم بھی ہیں

کشتۂ غم ہیں، اسیرِ شبِ زنداں ہیں مگر
تیری جانب مہِ تاباں نگراں ہم بھی ہیں

قافلے والو! یہ اندازِ تغافل کیسا؟
رہزنِ وقت کے تیروں کا نشاں ہم بھی ہیں

وہ فسانے جنہیں رو رو کے بھلانا چاہا
وہی کہتے ہیں قریبِ رگِ جاں ہم بھی ہیں

رخ و دل تیرہ و تاریک ہیں، پیکر روشن
نئی تہذیب ترے مرثیہ خواں ہم بھی ہیں

## غزل

**سید آفتاب احمد جعفری امروہوی**

دل کو الفت نہ حرم سے ہے نہ بتخانے سے
کام ہے ہم کو ترا نام لئے جانے سے

یہ وہ رونا نہیں تھم جائے جو سمجھانے سے
ناصحا! چھیڑ نہ کر عشق کے دیوانے سے

ساقیا! مست نگاہوں سے پلانے والے
بھر گیا دل ترے شیشے سے، پیمانے سے

کہنا آساں ہے مگر جان کا دینا مشکل
جان دینا کوئی سیکھے کسی پروانے سے

عیش میں سب ہیں مصیبت کا نہیں کوئی شریک
سب بدل جاتے ہیں حالات بدل جانے سے

آفتاب آؤ چلیں، ایسے ٹھکانوں کو سلام
اپنے کہلاتے ہیں اور رہتے ہیں بیگانے سے

## غزل

**نظمی صدیقی سلونوی**

اک انداز پہ چلتی ہے کوئی بات کہیں
یہ تو دنیا ہے، یہاں دن ہے کہیں رات کہیں

میکشو! آ تو گئے ہم درِ میخانہ تک
اور جو ہو گئی واعظ سے ملاقات کہیں

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں کچھ لوگ ابھی
جیسے کھلنے کو ہے قفلِ درِ خیرات کہیں

کیا ٹھکانے کی کوئی بات کریں گے نظمی
دل کہیں، ذہن کہیں اور خیالات کہیں

طنزیہ

ڈائری سیریز

# ایک لیڈر کی ڈائری

فکر تونسوی

نوشتہ صاحب دی گریٹ!

خوش قسمتی سے مجھے کچھ پرائیویٹ ڈائریاں ملی ہیں، ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ بھارت یاترا کے بعد نیا کیا لکھا جائے ... —— اس کیس میں شکر دوست قارئین کرام ہیں ... —— یہ سند الفاظ نہ حقیقت ... میرا مطلب ہے بہ اشاعت کے لئے نہیں ہیں۔ فکر تونسوی

---

یہ نہیں ایک نئی ڈائری —— ڈائریوں کا یہ سلسلہ صرف تفریح طبع کے لئے لکھ رہا ہوں۔ انھیں پڑھ کر سنجیدہ ہو جانے والے حضرات سے مجھے صرف ہمدردی ہو سکتی ہے۔

---

**نوٹ:** میری یہ ذاتی ڈائری میرے انتقال کے پانچ سال بعد شائع کی جائے۔

۲ اکتوبر ——

کل میرا جنم دن تھا۔ کہتے ہیں جو لوگ اکتوبر میں پیدا ہوتے ہیں وہ راج گدی پر بیٹھتے ہیں۔ میرا رسوئیا رام دھن بھی اکتوبر میں پیدا ہوا تھا لیکن وہ راج گدی کے جوٹھے برتن دھوتا ہے۔ رام دھن نے اپنا جنم دن کبھی نہ منایا۔ کیونکہ کانسٹی ٹیوشن کی رو سے ہر آزاد شہری کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنا جنم دن منائے یا نہ منائے۔ (ہمارا کانسٹی ٹیوشن بھی کتنا لغو ہے)

میں نے اخباروں میں یہ مجاہدانہ اعلان شائع کروایا تھا کہ میں اپنا جنم دن نہایت خاموشی اور سادہ طریقے سے مناؤں گا لیکن صبح صبح مبارکباد دینے والوں کا یوں تانتا بندھ گیا جیسے گڑ کی بھیلی پر مکھیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ مجھے ہاروں اور تحفوں سے لاد دیا گیا۔ ایک پریس رپورٹر نے مجھ سے پوچھا "کیا آپ اپنے پہلے بیان کی تردید کرنا پسند کریں گے؟ کہ آپ کے جنم دن میں گاندھی جی کی سی سادگی ہوگی!"

لیکن میری بجائے میرے خرانٹ سکریٹری نے جواب دیا: "اس کا جواب عوام سے پوچھئے۔ کیونکہ لیڈر صاحب کا یہ جنم دن عوام خود منا رہے ہیں۔ یعنی عوام نے اپنے لیڈر کے ہاتھ سے باگ ڈور چھین لی ہے۔ عوام کا محبوب رہنما عوام کے اس جذبے کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ چاہے اسے اپنے بیان اور اپنی خواہش کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔"

میرا سکریٹری جھوٹ بول رہا تھا کیونکہ ہار اور تحفے لانے والے عوام بالکل نہیں تھے۔ ان میں کچھ وزیر تھے، کچھ بڑے بڑے کارخانہ دار تھے، کچھ میرے ٹٹ پونجیے سیاسی لیفٹیننٹ تھے، کچھ میری بیوی کی تھل تھل کرتے جسموں والی سہیلیاں تھیں جن کے ہونٹوں پر چپکی ہوئی لپ اسٹک کی کئی تہیں چڑھی ہوئی تھیں اور ان ہونٹوں پر جب مبارکباد کی مصنوعی مسکراہٹ ابھرتی تھی تو مجھے گھن آ جاتی تھی —— لیکن میں اس گھن کا جواب بھی مصنوعی مسکراہٹ سے دیتا تھا۔ میرے ہونٹوں پر بھی تصنع کی لپ اسٹک تھپ گئی تھی۔ میرے پاس اپنا کچھ بھی نہ تھا۔ جو کچھ تھا، میرے مداحوں کا دیا ہوا تصنع تھا۔ (اور میری یہ بے بسی بلکہ بزدلی شرمناک تھی)

میرے جنم دن کی خوشی میں رات کو عوام نے یعنی جواسے ہوٹل کے مالک سیٹھ شیدنگا پرساد نے عوام یعنی سیٹھوں، وزیروں، منگروں اور دھارمک

نیتاؤں کو ایک سادہ اور خاموش ڈنر دیا۔ جس میں سلکی پردے کے پیچھے وہسکی اور پردے کے باہر مونگ کی دال اور مرغ مسلم شامل تھے ـــــ سیٹھ ٹھینگا پرساد کے ہوٹل کی بے ضوابطیوں کے خلاف جب دو سال پہلے میں نے ایک عوامی اندولن شروع کیا تھا اُس وقت سے وہ میرا مداح بن گیا تھا۔ ڈنر کے بعد میں نے سیٹھ ٹھینگا پرساد کے ساتھ فوٹو کھنچوایا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اِس فوٹو کی بدولت اپنے معزز گاہکوں کو بلیک میل کرے گا۔

میں اُس بلیک میلر کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتا تھا لیکن اندولن کے دوران اُس کی تیسری بیوی میرے پاس سمجھوتے کا فارمولا لے کر آئی تھی۔ میں کیا کرتا، وہ کم بخت بے حد خوبصورت تھی۔ کسی عورت کو اتنا بھی خوبصورت نہ ہونا چاہیئے، کہ پورے کا پورا سوشلزم اُس کے سامنے سربسجدہ ہو جائے!

اُس ڈنر کے وقت بھی وہ ستمگر موجود تھی ـــــ بجلی کی طرح کوندتا ہوا اُس کا تبسم! اور وہ اُس کا اپسراؤں کی سی لطیف اور معطر آواز میں یہ کہنا "نیتا جی، ہرتھ ڈے ٹو یو" ـــــ میں تو بجلی کی چکا چوند روشنی میں ہی لُوٹ لیا گیا۔

ڈنر کے بعد میرے سکریٹری نے اعلان کیا کہ عوام کے محبوب نیتا شری لیاڑیا جی کو جو سادہ تحفے موصول ہوتے ہیں وہ جھگی جھونپڑی والوں کی بہبودی پر خرچ کئے جائیں گے۔

ایسا اعلان میرے گذشتہ جنم دن پر بھی کیا گیا تھا۔ ہر دوسرے اعلان کا حشر پہلے اعلان کا سا ہوتا ہے۔ جھگی جھونپڑی والوں کے کالے کلوٹے ادھ ننگے بچوں کے نصیب میں تو دو دو لڈو لکھے تھے۔ حالانکہ اُن میں سے کئی بچے اکتوبر مہینے میں بھی پیدا ہوئے تھے۔

۱۴ نومبر ـــــ

شاید یہی چودہ نومبر کا دن تھا۔ آج سے چودہ برس پہلے میں نے اپنے پھٹے ہوئے جوتے اور پھٹے ہوئے پاجامے کے ساتھ ایک جلسے میں اخبار "دین بندھو" کی چودہ کاپیوں کو آگ لگائی تھی اور اُسی رات کو اخبار "دین بندھو" کا توندیل مالک لالہ بھگتی چند اپنی چمکیلی کار پر میرے تنگ و تاریک کوارٹر میں یوں آیا تھا جیسے کرشن بھگوان سُداما کے گھر آتے ہوں! اور ایک ہزار روپے کے کرنسی نوٹ اُس نے میرے میلے کچیلے تکیہ پر رکھتے ہوئے کہا تھا "پہلیا جی! آپ سچ مچ ایک آتش بیان مقرر ہیں۔ لیکن افسوس! کہ اِس ابھاگے دیش میں جوہر قابل کی قدر نہیں ہے۔ آپ دین ہیں اور ہمارا اخبار "دین بندھو" ہے۔ یہ ایک ہزار روپے کی تچھ بھینٹ "دین بندھو" کی طرف سے قبول فرمایئے اور اپنے لئے نئے پاجامے سلوا لیجئے۔"

"تم مجھے رشوت دے کر میرا ضمیر خریدنا چاہتے ہو؟" میں نے گرج کر کہا تھا۔ (اُن دنوں میں کتنا احمق تھا)

لیکن لالہ بھگتی چند جو ضمیروں کا گھاگ بیوپاری تھا، میری جاہل انقلابی ضمیر کے بلند بانگ دعوے سے دل برداشتہ نہیں ہوا۔ بلکہ میری پیٹھ پر مشفقانہ تھپکی دیتے ہوئے مسکرا کر بولا "نوجوان انقلابی! دیش کے کروڑوں مفلس تمہاری رہنمائی کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر دیش کا افلاس دُور کرنے سے پہلے اپنا افلاس دُور کرو۔ ورنہ دو چار سال بعد تمہاری یہ بھوک اور تاریکی اور غلاظت تمہاری ہڈیاں چاٹ جائے گی۔ تم ٹی۔ بی کا شکار ہو جاؤ گے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ دیش کا افلاس دُور کرنے سے پہلے تمہاری ہڈیاں اِس ملک کے گدھ اور چیلیں کھا جائیں۔ اپنی ہڈیوں کو مضبوط بنانے کے لئے تمہیں وٹامن اے۔ بی۔ سی۔ ڈی کی سخت ضرورت ہے۔ اِس ایک ہزار روپے کو تم ملٹی پرپز وٹامنز کی گولیاں تصوّر کر کے قبول کر لو اور مجھے اپنا ایک خادم ڈاکٹر سمجھو۔"

یہ کہہ کر لالہ بھگتی چند اپنی کار سٹارٹ کر کے چلا گیا۔ وٹامنز کی گولیاں میرے غلیظ سرہانے کے اندر گھٹتے ہوئے ٹی۔ بی کے جراثیم کو مارنے کے لئے پڑی رہ گئیں۔ میرے ایمان کی مضبوط دیوار کی پہلی اینٹ گر چکی تھی۔ غصّے اور بے بسی کے ملے جلے تاثرات ساری رات بھوتوں کی طرح میرے

خوابوں میں وحشیانہ رقص کرتے رہے۔ لیکن جب دوسری صبح میں بیدار ہوا تو اخبار "دین بندھو" کا تازہ پرچہ میرے سامنے پڑا تھا۔ جس پر جلی عنوان کے ساتھ یہ خبر درج تھی:-

"عوام کے محبوب رہنما شری لپاڑیا کی گرفتاری آج متوقع ——

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ کل جنتا کلاتھ ملز کے اندر عوام کے محبوب ترین رہنما شری لپاڑیا نے ریشمی کپڑوں کی ایک گانٹھ کو جو آگ لگائی تھی، اُس سلسلے میں سرکار کی طرف سے اُن کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کئے جا چکے ہیں اور آج کسی وقت بھی اُن کی گرفتاری متوقع ہے۔ مل ورکرز میں اُن کی گرفتاری کے بعد کتنا غیض و غضب پھیل سکتا ہے؟ اِس کے متعلق سارے شہر میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ مل کے اردگرد دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی ہے۔"

گویا لالہ بھگتی چند نے میری شہرت اور میری لیڈری کا شاندار آغاز کر دیا تھا۔ میرا سر ما سنہ احسان کے اخبار "دین بندھو" کے اوپر جھک گیا اور مجھے زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ اخباروں کی آزادی صرف ایک پُر فریب جمہوری طلسم ہے اور یہ دنیا ضمیروں کی خرید و فروخت کی ایک بہت بڑی منڈی ہے اور میں بھی اُس منڈی کی ایک جنس ہوں۔ مجھے لالہ بھگتی چند نے رات کی تاریکی میں اپنے روپے اور اخبار کی زنجیروں سے بُری طرح جکڑ لیا تھا اور غلام کو اپنے آقا سے ایک ناقابلِ فہم محبت ہو گئی تھی۔

آج چودہ برس بعد لالہ بھگتی چند میرا لنگوٹیا دوست بن چکا ہے اور آج جب بھی ہم دونوں اُس واقعہ کو یاد کرتے ہیں تو ہم دونوں کے خوشی کے آنسو نکل آتے ہیں۔

ہاں، آج چودہ نومبر ہے اور میں اپنی ڈائری میں یہ چند الفاظ خوشی کے آنسوؤں کی طرح بہا رہا ہوں اور اپنے اُس پھٹے ہوئے پاجامے کو الماری سے نکال کر سوچ رہا ہوں —— یہ پاجامہ آج بھی ہندوستان میں موجود ہے، افلاس آج بھی ہندوستان میں زندہ ہے۔ اگر چودہ نومبر کو میں اخبار "دین بندھو" کے پرچوں کو آگ نہ لگاتا تو اِس پاجامے کو ٹی۔ بی کے جراثیم چاٹ چکے ہوتے۔ چودہ نومبر زندہ باد! افلاس کے پاجامے پائندہ باد!!"

۲ر دسمبر ——

کچھ دنوں سے زندگی بہت ڈل ہو رہی تھی، نہ کوئی ہنگامہ تھا نہ شور و شر۔ سیٹھ ٹھینگا پرساد کی حسین ترین بیوی بھی پیرس کے سیر سپاٹے پر چلی گئی تھی اور مجھے عارضی داغِ جدائی دے گئی تھی۔ غلطی میری اپنی تھی۔ میں نے ہی اُسے ہندوستانی سنگیت کاروں کے ڈیلی گیشن میں شامل کرا دیا تھا۔

حالانکہ وہ علمِ موسیقی میں پرائمری پاس بھی نہ تھی۔ لیکن میرے من کے تاروں کو کبھی کبھار چھیڑ دیا کرتی تھی۔ اِس لئے اُس کے سنگیت کار ہونے میں کوئی شک نہ تھا۔

وہ چلی گئی اور مجھے سرکاری کاموں کے بیابان میں تنہا چھوڑ گئی۔ میں نے اپنی تنہائی اور اُداسی اور جدائی کا غم دُور کرنے کے لئے ایک نیا شوشہ کھڑا کر دیا۔ شہر کے ایک ویران ٹیلے پر ایک ذلیل سا چھوٹا سا مندر بنا ہوا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُس مندر میں بھگوان رہتا ہے۔ میں نے اپنے ایک جنونی ورکر کے ہاتھوں اُسے گروا دیا اور بھگوان کا بھگوان منہدم ہو کر نیچے گر پڑا۔ بھگوان کی یہ بے بسی مجھے بہت پسند آئی۔

مندر گرنے کی خبر سے بھگوان کے ہزاروں بھگت پاگل ہو گئے۔ منہ سے جھاگ بہانے لگے۔ اُنھوں نے جوش اور غصّے میں دوسرے ہی دن مندر کی تعمیر پھر شروع کر دی۔ (بھگوان کا ایک موٹا تازہ بھگت میرا ہی بھگت تھا۔ میرا ایک اشارہ اُس کے لئے بھگوان کا حکم رکھتا تھا) دوسری طرف سے خدا کے پرستاروں نے بھی خدا کی حفاظت کے لئے جھنڈے اُٹھا لئے۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ اِس مندر کے نیچے ایک پرانی مسجد دبی پڑی ہے اور کہ ہم اُس مسجد میں دبے ہوئے خدا کو باہر نکالیں گے۔ میرا اشارہ اُن کے لئے بھی "بسم اللہ" کا حکم رکھتا تھا۔ دونوں طرف سے حقوق کی جنگ شروع ہو گئی۔ صبح کو مندر کی دیوار کھڑی ہو جاتی، دوپہر تک مسجد کی دیوار اور شام تک پھر مندر اُبھرنے لگتا۔ بھگوان اور خدا آپس میں گتھم گتھا ہونے لگے۔ میری اُداس اور ڈل زندگی میں ایک ہنگامہ، ایک رونق پیدا ہو گئی۔ میری پیرس میں گئی ہوئی حسین محبوبہ کا عارضی نعم البدل مجھے مل گیا تھا۔

جب صورتِ حالات نازک ہونے لگی (اُسے تو نازک ہونا ہی تھا) تو میں نے تین فوری اقدامات کئے۔ (۱) فریقین کے نام صُلح اور آشتی کی دردناک اپیل جاری کر دی۔ (۲) دونوں اطراف کے ورکروں کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ (۳) پیرس میں اپنی حسین محبوبہ کو ٹیلی گرام بھیج دیا: "ڈارلنگ! سارا شہر فساد کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ دن بھر بھاگ دوڑ کرتا ہوں۔ تم لوٹ آؤ تو اِس تھکا دینے والے ہنگامے میں سکون اور سرور کے چند لمحے میسر آ جائیں اور پھر شاید فساد بھی بند ہو جائیں۔ بھگوان اور خدا تمھارے ہجر میں پاگل ہو کر لڑ رہے ہیں۔ اِن دونوں کو آگر شانت کر دو، اِن دونوں کو امرت عطا کر دو۔"

میری امن کی اپیل اور ٹیلی گرام دونوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ تناؤ اپنے عروج پر ہے۔ خدا اور بھگوان دونوں خاموش تماشائی ہیں۔ لاٹھیاں اور گولیاں چلائی

# ہمسفر

## اختر عابد نوگانوی

گھیر شاف۔ امروہہ (یو۔پی)

محترم خوشتر صاحب! آداب

... "بیسویں صدی" کی بزم سے اپنی غیر حاضری کو شدت سے محسوس کرتا رہا ہوں اور کر رہا ہوں۔
اب پھر نئے سال کے آغاز پر ایک نیا افسانہ "ہمسفر" اپنے قلم کی زندگی کے ثبوت میں حاضر خدمت
کر رہا ہوں۔ یقین ہے کہ پسند آئے گا۔ میرے قارئین مجھے اب تک نہیں بھولے ہیں یقین ہے آپ نے
بھی فراموش نہ کیا ہوگا ــــ آپ کی خلوص بھری دعاؤں کا ہمیشہ تمنائی ...

خلوص کار ــــ عابد

بمبئی سے دہلی کے لئے صبح سات بج کر پچیس منٹ پر چھوٹنے والی دہرہ دون
ایکسپریس کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی میری نظریں اس لڑکی پر
اچانک ٹھہر گئیں جو اپنے تھرماس سے چائے نکال رہی تھی۔ چند لمحوں تک میں اُسے
اسی انداز میں دیکھتا رہا۔ پرکشش چہرہ، شرمائی ہوئی سی آنکھیں اور وہ سب کچھ
[illegible] لڑکی میں ہونا چاہئے۔

[illegible] ــــ ایک سوال میرے ذہن میں جاگا۔

[illegible] میری آمد سے بے خبر تھی جب میں اپنی مخصوص سیٹ پر بیٹھا
[illegible] میں نے کوئی غلط کام کرتے ہوئے دیکھ لیا ہو
[illegible] سے مجھے دیکھا۔

[illegible] ــــ میری نظروں نے جواب دیا۔

[illegible] گھونٹ حلق سے اُتارا میں نے محسوس کیا کہ وہ
[illegible] پہلے والی نظر کرنے لگی ہے۔

"یہ زنانہ کمپارٹمنٹ تو نہیں ہے؟" میرے ذہن میں سوال اُبھرا۔ میں نے
احتیاطاً اپنی سیٹ کا نمبر دوبارہ دیکھا۔ ٹھیک تھا۔ میں مطمئن ہو گیا۔

"چائے پیجئے گا؟" اچانک اس نے رس بھری آواز میں کہا۔

اس پیشکش پر میں نے اُسے حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔

دوسرے لمحہ وہ میری ہاں نا کا انتظار کئے بغیر چائے کی پیالی میری
طرف بڑھا رہی تھی۔

"شکریہ ــــ" میں نے چائے کی پیالی لیتے ہوئے کہا اور میری پھیکی
مسکراہٹ کے ساتھ وہ بھی مسکرا دی جس کی مجھے قطعی توقع نہ تھی۔ چائے کا
گھونٹ حلق سے اُتارتے ہوئے جب میں نے بے ساختہ منہ بنایا تو اس نے میری
کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"میں کم شکر پسند کرتی ہوں ــــ"

"لیکن اس میں آپ کے خلوص کی مٹھاس بھی تو ہے ــــ" میں نے کہا
اس کا گورا چہرہ گلابی ہو گیا۔

"بندہ نوازی کا شکریہ!" اس نے جواب میں کہا۔ اب وہ مجھ سے
بالکل مطمئن نظر آرہی تھی۔ جو خدشہ میری موجودگی سے اس کے ذہن میں پیدا
ہوا تھا وہ دور ہو چکا تھا۔ چائے پینے کے بعد میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔
تھوڑے فاصلے پر کچھ لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے ٹرین کے چلنے کا انتظار کر رہے
تھے۔ لیکن ہمارے اور دوسرے لوگوں کے درمیان دیواریں حائل تھیں۔

"نہ جانے ٹرین کتنی دیر میں چلے گی ــــ" اس نے رسٹ واچ دیکھی۔

"پانچ منٹ لیٹ ہو چکی ہے۔" میں نے بھی اپنی گھڑی دیکھی۔

پڑگئی ہیں۔ کل سے سارا شہر ہڑتال پر ہے۔ اگلے دن بھر میں نے ہڑتال زدہ شہر کا دورہ کیا۔ ایک امن کمیٹی بنادی گئی ہے۔ جس میں فریقین کے فسادی رہنما شامل ہیں۔ دونوں طرف کے فسادی رہنما میرے عقیدت مند ہیں۔ میں نے ایک انکوائری کمیٹی بنا کر اُسے متنازعہ جگہ کی تاریخی ریسرچ کرنے کا حکم جاری کردیا ہے۔

فیصلہ کرنا دشوار نہیں ہے۔ مگر میں ابھی پیرس سے ٹیلی گرام کے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔

۱۰ دسمبر ——

پیرس سے ٹیلی گرام آگیا ہے —— (مایوسی)
انکوائری کمیٹی کی رپورٹ بھی آگئی ہے —— (یکطرفہ ہے)

اس دوران میں فسادی فریقین کے پانچ آدمی ہلاک ہوچکے ہیں یہ سرکاری اطلاع ہے۔ غیر سرکاری اطلاع میں ہمیشہ مرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ نہ جانے سرکاری طور پر آدمی زیادہ کیوں نہیں مرتے؟

سنگدل محبوبہ نے واپس آنے کی بجائے مجھے پیرس آنے کی دعوت دی ہے۔ اُس نے حکم دیا ہے کہ مندر اور مسجد کا فیصلہ فوراً کردو۔ سیاسی فیصلے حسیناؤں کے حکم سے کئے جاتے ہیں۔ عجیب دُنیا ہے، عجیب سیاست ہے۔

لیکن میں ابھی تک اُلجھن میں ہوں۔ میرے کچھ مخالف لیڈر انکوائری کمیٹی کی رپورٹ شائع کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ کل مظاہرین کا ایک ہجوم اپوزیشن لیڈر گورکھ ناتھ جی کی قیادت میں میری کوٹھی کے باہر نعرے لگاتا رہا اور میں اندر بیٹھا اطمینان سے ٹیلی ویژن دیکھتا رہا۔ آج رات میں شری گورکھ ناتھ کو ڈنر پر بُلا رہا ہوں۔ اُسے مچھلی کے پکوڑے بہت پسند ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتا ہے، مچھلی کے پکوڑے عوام کے گوشت پوست سے زیادہ لذیذ ہوتے ہیں۔

میرا خیال ہے ڈنر کی مستی میں ہم مسجد اور مندر دونوں کا فیصلہ کرلیں گے۔

۱۲ دسمبر ——

گورکھ ناتھ کے ساتھ میرا سمجھوتہ نہیں ہوسکا۔ وہ کم بخت اِس معاملے کو طول دینا چاہتا ہے۔ کچھ اور زخمی، کچھ اور گرفتاریاں، کچھ اور قتل، کچھ اور بے وقوفیاں جو عوام کی طرف سے سرزد ہوں اور وہ اُن بے وقوفیوں کے بل بوتے پر میرے سر سے تاج اُتار لے اور خود پہن لے۔

کیوں نہ میں وزارت سے استعفیٰ دے دوں اور اعلان کردوں کہ اِس زمین پر مندر کا حق ہے اور میں مندر کی دیواروں میں اپنی ہڈیاں چُنوا دوں گا۔ میرا لہو اور میرا گوشت مندر کی تعمیر میں لگا دیا جائے۔ اِس سے دو فائدے ہوں گے۔ (۱) گورکھ ناتھ کی تقدیر پھوٹ جائے گی۔ کیونکہ وہ بھی مندر کے حق میں شور وغل مچاتا پھرتا ہے۔ میرے میدان میں آتے ہی لوگ گورکھ ناتھ کو بھول جائیں گے۔ (۲) مندر کی حفاظت کے لئے جو دو لاکھ روپیہ چندہ جمع ہوچکا ہے، وہ میری تحویل میں آجائے گا۔

لیکن مسجد بچاؤ کمیٹی کا کیا ردِ عمل ہوگا۔ کیونکہ اِس کمیٹی کا صدر بھی میرا ہی فرشتہ ہے اور وہ اب تک مجھ سے پچیس ہزار روپے لے چکا ہے اور پھر وہ میرا ازلی وفادار ہے۔

بڑی اُلجھن ہے اور نازنین قسم کی اُلجھن ہے۔ ابھی مجھے کچھ اور سوچنا چاہئے، کچھ اور انتظار کرنا چاہئے۔

۱۶ دسمبر ——

کامیابی —— مسرت —— فراغت!

متنازعہ جگہ کا حل تلاش کرلیا گیا ہے۔ ریسرچ کمیٹی کی رپورٹ میں ایک سنسنی خیز تبدیلی کرلی گئی ہے کہ یہاں مندر اور مسجد سے پہلے ایک گئوشالہ تھا۔ اِس لئے اِس جگہ پر گائیوں کی پرورش و پرداخت کی جائے گی اور عوام کو خالص، پاکیزہ دودھ بازار سے پچیس فی صدی رعایتی قیمت پر سپلائی کیا جائے گا۔ ریسرچ کمیٹی کے پانچ معزز ممبروں نے پانچ پانچ ہزار روپے لے کر تسلیم کرلیا ہے کہ شری لپاڑیا ہم سے زیادہ بہتر مورّخ ہیں۔ اُنھوں نے تو رپورٹ میں یہ ترمیم بھی منظور کرلی ہے کہ اِس جگہ کی کھدائی کے دوران ایک گائے کا سینگ بھی ملا ہے اور دودھ دوہنے والا برتن بھی۔

آج شام کو عوام کا ایک بھاری جلوس نکل رہا ہے جو گئوشالہ بنانے کے حق میں ہوگا۔ عوام کو مہنگے خدا کی ضرورت نہیں، سستے دودھ کی زیادہ ضرورت ہے!

کل صبح سرکار کی طرف سے ایک فراخدلانہ پیش کش کی جائے گی کہ مندر اور مسجد کی تقدیس کو برقرار رکھنے کے لئے گئوشالہ کے دائیں اور بائیں طرف کی زمین الاٹ کردی جائے گی اور تعمیر کا سارا خرچ سرکار ادا کرے گی۔

فریقین کے دو بڑے رہنما میرے ہاتھوں سے جوس کے گلاس پی کر کل صبح اپنی بھوک ہڑتال ختم کر رہے ہیں۔ اپنے ہی عزیز ہیں۔ بڑے فرمانبردار ہیں۔ میں کل صبح ہوائی جہاز سے پیرس کی طرف پرواز کر رہا ہوں۔ اِس اندولن کی تکان مٹانے کے لئے محبوبہ کی آغوش بہت ضروری ہے۔ اگرچہ سرکاری طور پر میں فرانس میں بندروں کی ایکسپورٹ کے سلسلے میں گفتگو کرنے جارہا ہوں۔

---

# ہمسفر

اختر عابد نوگانوی

گھیر مناف۔ امروہہ (یوپی)

محب محترم خوشتر صاحب! آداب

... "بیسویں صدی" کی بزم سے اپنی غیر حاضری کو شدت سے محسوس کرتا رہا ہوں اور کر رہا ہوں۔
اب پھر نئے سال کے آغاز پر ایک نیا افسانہ "ہمسفر" اپنے قلم کی زندگی کے ثبوت میں حاضرِ خدمت کر رہا ہوں۔ یقین ہے کہ پسند آئے گا۔ میرے قارئین مجھے اب تک نہیں بھولے ہیں۔ یقین ہے آپ نے بھی فراموش نہ کیا ہوگا ــــــ آپ کی خلوص بھری دعاؤں کا ہمیشہ تمنائی ...

خلوص کار ــــــ عابد

بمبئی سے دہلی کے لئے صبح سات بج کر پچیس منٹ پر چھوٹنے والی دہرہ دون ایکسپریس کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی میری نظریں اس لڑکی پر اچانک ٹھہر گئیں جو اپنے تھرماس سے چائے نکال رہی تھی۔ چند لمحوں تک میں اُسے اسی انداز میں دیکھتا رہا۔ پُرکشش چہرہ، شرمائی ہوئی سی آنکھیں اور وہ سب کچھ جو ایک جوان لڑکی میں ہونا چاہیئے۔

'یہ لڑکی؟ ــــــ' ایک سوال میرے ذہن میں جاگا۔

وہ شاید میری آمد سے بے خبر تھی۔ جب میں اپنی ریزرو سیٹ پر بیٹھا تو وہ اس طرح چونک گئی جیسے میں نے اُسے کوئی غلط کام کرتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ پھر اس نے بھی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

'میں بھی مسافر ہوں ــــــ' میری نظروں نے جواب دیا۔

اس نے چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اُتارا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میری موجودگی سے کچھ پریشان سی نظر آنے لگی ہے۔

'یہ زنانہ کمپارٹمنٹ تو نہیں؟' میرے ذہن میں سوال اُبھرا۔ میں نے احتیاطاً اپنی سیٹ کا نمبر دوبارہ دیکھا۔ ٹھیک تھا۔ میں مطمئن ہو گیا۔

"چائے پیجئے گا؟" اچانک اس نے رس بھری آواز میں کہا۔

اس پیشکش پر میں نے اُسے حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔

دوسرے لمحہ وہ میری ہاں نا کا انتظار کئے بغیر چائے کی پیالی میری طرف بڑھا رہی تھی۔

"شکریہ ــــــ" میں نے چائے کی پیالی لیتے ہوئے کہا اور میری ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بھی مسکرا دی جس کی مجھے قطعی توقع نہ تھی۔ چائے کا گھونٹ حلق سے اُتارتے ہوئے جب میں نے بے ساختہ مُنہ بنایا تو اس نے میری کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"میں کچھ تلخ چائے پیتی ہوں ــــــ"

"لیکن اس میں آپ کے خلوص کی مٹھاس بھی تو ہے ــــــ" میں نے کہا۔

اس کا گورا چہرہ گلابی ہو گیا۔

"بندہ نوازی کا شکریہ!" اس نے جواب میں کہا۔ اب وہ مجھ سے بالکل مطمئن نظر آ رہی تھی۔ جو خدشہ میری موجودگی سے اس کے ذہن میں پیدا ہوا تھا وہ دُور ہو چکا تھا۔ چائے پینے کے بعد میں نے اِرد گِرد کا جائزہ لیا۔ تھوڑے فاصلے پر کچھ لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے ٹرین کے چلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن ہمارے اور دوسرے لوگوں کے درمیان دیواریں حائل تھیں۔

"نہ جانے ٹرین کتنی دیر میں چلے گی ــــــ" اس نے رسٹ واچ دیکھی۔

"پانچ منٹ لیٹ ہو چکی ہے ..." میں نے بھی اپنی گھڑی دیکھی۔

اچانک اس کی نظریں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔

"آپ کو کسی کا انتظار ہے ؟" میں نے پوچھا۔

"نا۔۔۔ نہیں۔۔۔" اس نے کچھ گھبرائے انداز میں کہا۔

"کہاں جائیں گی آپ۔۔۔؟"

"دہلی"

"مجھے بھی اپنا ہمسفر سمجھیے"

"اوہ بہت خوشی کی بات ہے۔ سفر میں کوئی اچھا ساتھی مشکل ہی سے ملتا ہے"

میں جواب میں مسکرا دیا اور وہ اپنے قریب رکھی ہوئی اٹیچی پر جھک گئی۔

---

- ہزار دوستیاں ایک عداوت کے بدلے نہ خریدو۔ (خواجہ حسن بصریؒ)
- دولت کسی کو شریف نہیں بنا سکتی اور نہ افلاس کے باعث کوئی کمینہ بن جاتا ہے۔ (احمد کبیرؒ)
- خلقِ عظیم یہ ہے کہ نہ تیری کسی سے دشمنی ہو اور نہ کوئی تیرا دشمن ہو۔ (ابوبکر واسطیؒ)
- بخیل ہونا اتنا مذموم نہیں جتنا یہ کہ بخیل کے آگے ہاتھ پھیلایا جائے۔ (حضرت ابوالاسود دروئیؒ)
- مرد میں چار باتوں سے کمال پیدا ہوتا ہے ـــــ کم کھانا، کم بولنا، خلق سے کم راہ و رسم رکھنا اور کم سونا۔ (حضرتِ نظام الدین اولیاؒ)

---

ابھی ٹرین چلی نہ تھی کہ ایک شخص بہت بے تکلفی سے میرے قریب آکر بیٹھ گیا۔ اس کا اس طرح میرے قریب بیٹھ جانا مجھے ہی نہیں شاید میری ہمسفر کو بھی گراں گزر رہا تھا۔

"شاید بھولے سے اس کمپارٹمنٹ میں آگیا ہے"، میں نے سوچا۔

"یہ فرسٹ کلاس ہے" پھر میں نے اسے جتایا۔

"میں ہمیشہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتا ہوں ـــــ" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں خاموش ہوگیا ـــــ لیکن وہ میرے لئے آہنی دیوار بنا بیٹھا رہا۔ اگرچہ مجھے یقین نہ تھا کہ وہ فرسٹ کلاس کا مسافر ہے۔ اس کی سرخ آنکھیں۔۔۔ بچھو کے ڈنک کی طرح ابھری ہوئی مونچھیں، چیچک کے داغوں سے بدنما کالا چہرہ کسی آنے والے خطرے کی جانب بار بار اشارہ کر رہا تھا کیونکہ اس کی نگاہیں میری ہمسفر اور اس کی خوبصورت اٹیچی کو بار بار گھور رہی تھیں۔ اس کی موجودگی سے میں تو پریشان تھا ہی، وہ بھی خوفزدہ سی نظر آ رہی تھی۔ اس وقت میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ ہم دونوں کے درمیان کوئی تیسرا حائل ہو اور وہ بھی ایسا انسان جس کا ہر انداز بُرا معلوم ہو رہا ہو اور جس کے بھونڈے چہرے کو دیکھ دیکھ کر بے وجہ غصہ آنے لگا ہو۔ لیکن وہ جیسے کسی خاص مقصد کے تحت آیا تھا۔

ٹرین نے وِسل دی۔ وہ بیٹھا رہا۔

ٹرین چلنے لگی ـــــ پھر چھوٹے بڑے کئی اسٹیشن گزر گئے۔ لیکن وہ کا نشانہ نکلا۔

لڑکی نے بیگ سے ایک میگزین نکالا اور اسے دیکھنے لگی۔

"دوسرا میگزین مجھے دے دو۔۔۔" میں نے کہا۔

میں بھی میگزین کے صفحات کو یوں ہی الٹنے پلٹنے لگا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ بھی میگزین کے صفحات کو میری طرح یوں ہی الٹ پلٹ رہی تھی۔ جو الجھن مجھے تھی وہی اسے بھی معلوم ہو رہی تھی۔

"آپ کہاں جائیں گی۔۔۔؟" اچانک وہ اپنی بھونڈی آواز میں لڑکی سے مخاطب ہوا۔

"آپ کون سے اسٹیشن پر اتریں گے ؟" اس نے چڑتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"کسی بھی اسٹیشن پر اتر سکتا ہوں"

"جی ـــــ!" وہ چونک گئی اور اسے خائف نظروں سے دیکھنے لگی۔

"شاید میرا یہاں بیٹھنا آپ کو اچھا نہیں معلوم ہو رہا ہے"

"شاید آپ کا خیال درست ہے"

"شاید نہیں یقیناً کہیے!"

"ایسا ہی سمجھ لیجیے!"

"یہ سیٹس ریزرو معلوم ہوتی ہیں"

"جی ـــــ"

"تو مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی!"

"آپ کا خیال درست ہے"

"شاید آپ ہنی مون منا کر آ رہے ہیں" اس نے پھر کہا۔

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ ہاں۔۔۔ لیکن تمھیں ہمارے نجی معاملات سے کیا

تعلق ہے؟"

اس بات پر وہ قہقہے لگانے لگا جس نے میرے لئے اس کی شخصیت کو اور پُراسرار بنا دیا۔

ٹرین ایک اسٹیشن پر ٹھہر گئی اور وہ اُتر گیا۔ چند لمحوں کے لئے ایسا محسوس ہوا ایک آنت سی ٹوٹ گئی ہو ۔۔۔۔ لیکن ٹرین چلتے ہی پھر آجانے کا میری آنکھیں اس کا انتظار کرنے لگیں۔

"عجیب تو ہی ہے ۔۔۔"

"بالکل عجیب سا ۔۔۔ اگر آپ نہ ہوتے تو . . ." وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

"آپ کچھ کہنا چاہتی تھیں؟"

"آپ اُس پر یہ ظاہر نہ ہونے دیں کہ ہم دونوں میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ بلکہ آپ کا میرا وہی تعلق ہے جو وہ سمجھ چکا ہے ۔۔۔" یہ کہتے ہوئے اُس کا صبیح چہرہ شفق رنگ ہو گیا۔

اس بات پر میں نے اُس کی شرم و حیا سے بھری آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے نظریں چرالیں ۔۔۔ اور شام گزر گئی۔

اور اب رات کا سینہ چیرتی ہوئی ٹرین اپنی منزل کی طرف دوڑ رہی تھی ۔۔۔ سب سے بڑی خوشی اس بات کی تھی کہ وہ آدمی سوار نہیں ہوا تھا۔ شاید اُس کی منزل وہیں تک تھی جہاں وہ اُتر گیا تھا۔ ہم دونوں اپنی جگہ مطمئن تھے۔ لیکن اجنبیت کی دیوار اب بھی ہمارے درمیان حائل تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ میرے بارے میں مجھ سے بہت کچھ معلوم کرنا چاہتی ہے۔ اور میں بھی یہی چاہتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں دیر سے ہم دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔

"ہم ایک دوسرے کے قریب ہونے کے باوجود اجنبی ہیں۔ کیا آپ کا نام جاننے کی جرأت کر سکتی ہوں ۔۔۔؟" اچانک اُس نے سکوت توڑا۔

"سنیے . . ."

"میرا نام وینا ہے ۔۔۔ سفر میں کوئی مخلص ساتھی مل جاتا ہے تو سفر کا احساس کم ہو جاتا ہے۔" اس نے کہا۔

"آپ نے مجھے مخلص کیسے سمجھ لیا؟"

"آپ کے سنجیدہ چہرے اور میٹھی بول چال سے ۔۔۔"

"میں آپ کی یہ قیمتی اٹیچی لے کر فرار بھی تو ہو سکتا ہوں۔"

"مجھے یقین ہے آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ اگرچہ میری اٹیچی میں تقریباً پچاس ہزار کا قیمتی زیور موجود ہے۔"

"پچاس ہزار کا زیور . . .!" میں ایک لمحے کے لئے چونکا ۔۔۔ "آپ کو اتنے قیمتی زیور کے ساتھ تنہا سفر نہ کرنا چاہئے تھا۔ پچھلے دنوں کئی حادثے ہو چکے ہیں۔"

"لیکن آپ کے ہوتے ہوئے کیا ڈر ہے؟" اُس کے لبوں کے گلاب کھل گئے۔

"شاید آپ کو نیند آرہی ہے ۔۔۔" میں نے اُس کی بوجھل سی آنکھوں میں جھانکا۔

"جی ہاں . . . مگر ۔۔۔"

"سفر میں نہ جانے کیوں مجھے بہت کم نیند آتی ہے۔ آپ اطمینان سے سو سکتی ہیں۔"

---

- ہنسو گے تو دُنیا تمہارا ساتھ دے گی۔ روؤ گے تو تمہیں اکیلے رونا پڑے گا۔ (بیکن)
- مغرور دوستوں سے محروم رہتا ہے کیونکہ دوستی میں مساوات ضروری ہے اور مغرور اسے پسند نہیں کرتا۔ وہ نصیحت سے بھی محروم ہے، کیونکہ وہ کسی کی فوقیت اور برتری کو تسلیم نہیں کرتا۔ (شیکسپیر)
- پُرخوری سے بیمار ہونے والوں کا اوسط بھی وہی ہے جو فاقہ کشی سے بیمار ہونے والوں کا۔ (شیکسپیر)
- ایک دیانتدار انسان خدا کی بہترین مخلوق ہے۔ (پوپ الگزانڈر)

---

وہ جیسے اِن لفظوں کی منتظر تھی ۔۔۔ کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں سانسیں لینے لگی اور میں اُس کے لئے شدت سے سوچنے لگا ۔۔۔ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ دو اجنبی کتنی جلدی ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے ہیں! اور یہ ٹرین ۔۔۔ یہ کتنوں کو جُدا کر دیتی ہے اور کتنوں کو ملا دیتی ہے۔ کتنے فاصلے حائل ہو جاتے ہیں اور کتنی قربتیں بڑھ جاتی ہیں ۔۔۔ پھر وینا کے لئے میرے ذہن میں خیالات کا ایک جال سا پھیل گیا جس میں میں خود اُلجھ کر رہ گیا۔ اور نہ جانے کب مجھ پر بھی نیند کا غلبہ ہو گیا۔

اور ٹرین آنے والے ہر اسٹیشن کو اپنے سفر کا پیغام سناتی ہوئی دوڑتی رہی۔

"میری اٹیچی ۔۔۔؟!" اچانک وینا کی بھرائی ہوئی آواز سے میں

چونک کر اٹھ بیٹھا۔ دن کا اُجالا پھیل گیا تھا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ داشی اٹیچی غائب تھی! میں خود حیرت سا بن گیا۔

"پچاس ہزار کے زیور ــــــــ ہا!" میرے دل کو دھچکا سا لگا اور اُس شخص کی بھونڈی تصویر میرے سامنے آگئی جو بمبئی سے ہمارے ساتھ سوار ہوا تھا۔

وینا کی بھی عجیب حالت تھی۔ اُس کا بس نہ تھا کہ چلتی ٹرین سے چھلانگ لگا دے۔

"گھبرایئے مت ہم اگلے اسٹیشن پر رپورٹ کر دیں گے۔ میں اُس کمینے کو خوب پہچانتا ہوں!" میں نے وینا کو مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن اُس کا موڈ بگڑا رہا۔

کچھ دیر بعد ایک اسٹیشن پر ٹرین ٹھہر گئی تو میں رپورٹ کرانے کے لئے جانے کو تیار ہو گیا۔

"رہنے دیجئے مسٹر سنجے! میں اِس کیس کی رپورٹ دہلی پہنچ کر کراؤں گی۔" اُس نے مجھے روک لیا۔ اُس کے لہجے میں رُوکھا پن تھا۔

"پچاس ہزار کا معاملہ ہے۔ آپ کو خاموش نہ رہنا چاہیئے" میں نے اُسے پھر متوجہ کیا۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا"

"عجیب لڑکی ہے!" میں نے زیرِ لب کہا اور اُس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے میں کھو سا گیا۔

---

تقریباً تین گھنٹے کا گھُٹا گھُٹا سفر طے کرنے کے بعد ٹرین دہلی اسٹیشن پر مسافروں کے ہنگامے میں گھر کر خاموش کھڑی ہو گئی۔ میں تھکے ہوئے جسم کے ساتھ کمپارٹمنٹ سے اُتر کر باہر کھُلی فضا میں سانس لینے لگا۔ وینا بھی اپنے مختصر سامان کے ساتھ باہر آگئی اور اُس کی نگاہیں بے قراری کے ساتھ اِدھر اُدھر کسی کو تلاش کرنے لگیں۔ شاید اپنے ریسیو کرنے والے کو تلاش کر رہی ہو گی۔ میں نے سوچا۔ پھر دوسرے ہی لمحہ اُس کی آنکھوں میں اُجالا سا پھیل گیا اور اُس کے قدم تیزی سے اُٹھنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھیڑ میں کھو سی گئی۔ اُس کے اس طرح پُر اسرار طور پر غائب ہو جانے سے میں حیرت میں ڈوب گیا اور اپنے سامان کے ساتھ اُس کے سامان کی بھی نگرانی کرنے لگا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ اِتنے بڑے نقصان کو کیسے برداشت کر گئی؟ اُس سے زیادہ تو میں خود کو اُس نقصان سے متاثر پا رہا تھا۔ میں وینا سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اُس سے بہت کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ جو آرزو اُس کی قربت نے اچانک میرے دل میں جگا دی تھی اُس کا

اظہار کرنا چاہتا تھا ——— میں تو اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکا تھا کہ وہ دہلی میں کس جگہ رہتی ہے، شادی ہو گئی یا نہیں، اگر نہیں ہوئی تو اس بارے میں کیا خیال ہے؟ اسی مسئلے پر طویل بحث کی اس سے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اچانک جیسے ایک سیلاب سے تھا اور کسی نے فوراً ہی بند لگا دیا۔

"ہیلو مسٹر ———" میں سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تم! ———" میں چونک گیا۔ وہی کالا کلوٹا شخص میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"اٹیچی کہاں ہے؟" میں نے فوراً ہی اس کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے غصے سے کہا۔

"ریسٹورنٹ میں ———" اس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔

"پولیس . . . !"

"اس کی ضرورت نہیں ———" اس نے میرے لبوں پر انگلیاں جما دیں۔

"آدھے مال کے شریک تم بھی ہو ——— میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں اور تمہارا حق دینے بھی!"

"کیا بکتے ہو؟ بدمعاش! میں تمہیں پہلی نظر میں پہچان گیا تھا!"

"غصہ نہ کرو ڈیر!"

میں اور بپھر گیا۔

"آدمی شریف معلوم ہوتے ہو!"

میرا دل چاہا کہ اس کے منہ پر اتنے گھونسے ماروں کہ بتیسی باہر آ جائے۔

"وینا ———" اسی درمیان وینا بھی آ گئی۔

"میں آپ کو ریسٹورنٹ میں دیکھ آئی اور آپ یہاں مسٹر سنجے کے پاس کھڑے ہیں!"

وینا غیر متوقع طور پر اس سے مخاطب ہوئی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور میں ان دونوں کو کسی پاگل کی طرح گھورنے لگا ——— وینا اب بھی اُن سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی ———

"اٹیچی کسی نے صاف کر دی ——— !"

"فکر نہ کرو۔ اٹیچی ریسٹورنٹ میں ہے۔ لیکن سفر میں اتنی گہری نیند نہ سونا چاہئے تھا اور نہ اپنے ہمسفر پر بھروسہ کرنا چاہئے تھا۔"

"تو آپ مجرموں کو پکڑنے کی کوشش میں خود بھی مجرم بن بیٹھے! مسٹر سنجے آپ کی رپورٹ ضرور کرائیں گے!"

یہ سن کر مجھے اپنے دماغی توازن پر شک ہونے لگا ——— پھر وینا مجھ سے مخاطب ہو کر بولی ———

"مسٹر سنجے! آپ سے ملئے۔ یہ ہیں میرے ہسبینڈ مسٹر سوشیل کمار!"

"یہ آپ کے ہسبینڈ ——— ؟" میں نے حیرت سے کہا اور اُسے پھر گھورنے لگا۔ میرے خیال میں جیسے وہ فرسٹ کلاس کا مسافر نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح وینا جیسی خوبصورت لڑکی کا شوہر بھی نہیں ہو سکتا تھا!

"مسٹر سنجے آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ اپنی اپنی پسند ہے ———" وینا نے میرے چہرے کے بدلے ہوئے رنگ کو دیکھتے ہوئے کہا اور اپنی بات جاری رکھی ——— "مجھے افسوس ہے کہ مجبوراً آپ کے ساتھ ہمیں یہ ناٹک کرنا پڑا۔ یہ سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر ہیں۔ مجھے بھی ان کے پیشے سے کچھ دلچسپی ہو گئی ہے۔ آج کل ایک کیس کی وجہ سے ان کی بمبئی سے دہلی تک کی سروس چل رہی ہے۔ آپ پر نہ جانے کیوں انہیں شک ہو گیا تھا۔ اس لئے آپ کے کمپارٹمنٹ میں آنے سے پہلے ہی انہوں نے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ ہاں اٹیچی میں چند جوڑے کپڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا جس کا مجھے پورا یقین ہو گیا تھا کسی نے صاف کر دی ہے۔ یقین ہے آپ محسوس نہ کریں گے۔ یہ ہمارا بمبئی کا ایڈریس کارڈ ہے کبھی ضرور ملئے گا۔ دہلی کے لئے ہم مہمان ہیں!"

"اچھا مسٹر سنجے پھر کبھی ملاقات ہوگی" اس بار اس شخص نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

اور جواب میں غیر ارادی ہی طور پر میرا ہاتھ بھی ایک مجرم کے ہاتھ کی طرح اس کی طرف بڑھ گیا!!

---

# غزل

محمد مہدی پرتابگڑھی

اُن کی محفل میں تماشائے دل و جاں کھو آئے
پھر بھی ہم خوش ہیں، غمِ سود و زیاں کھو آئے

دولتِ ذوقِ نظر ملتی تھی جس محفل میں
ہم تو آسودگیِ فکر وہاں کھو آئے

جستجو لے کے تری نکلے تھے کچھ فرزانے
وہ کو کیا پاتے خود اپنا بھی نشاں کھو آئے

دیر سے ڈھونڈ رہے ہیں دلِ گم گشتہ کو ہم
کس سے پوچھیں کہ اُسے آج کہاں کھو آئے

شکر ہے مجھ پہ جو ہنستے تھے کبھی اے مہدی
دل خود اپنا بھی وہ بالغ نظراں کھو آئے

# غزل

آزاد گوہر اسیوری بی۔ اے

کی جفا کے خوگر نے عشق میں وفا کیسی
ہو گئی رسا میری آہِ نارسا کیسی

تن سے تا رگِ جاں تک اِس کا سلسلہ یکساں
غم کی ابتدا کیسی غم کی انتہا کیسی

ولولے ہیں افسردہ دل خزاں کا مرکز ہے
گلستانِ اُلفت میں یہ چلی ہوا کیسی

حسرتوں میں جان آئی باغِ دل مہک اُٹھا
آئی اُس کے دامن سے بوئے جانفزا کیسی

اُس کی بے وفائی کا کچھ گلا نہیں آزاد
آپ کی طبیعت ہے صبر آشنا کیسی

# غزل

ماہ افروز بی۔ اے۔ بی ایڈ

کسی بہار کی آمد کا انتظار رہا
ہمیں جنونِ محبت کا اعتبار رہا

عجیب طرح کے ہیں مرحلے محبت کے
نہ بیقرار رہے ہم نہ کچھ قرار رہا

وہی جو بادِ خزاں میں کبھی نہ کمہلایا
وہی نگاہ میں سارے چمن کی خار رہا

وہ آ کے بیٹھ گئے یوں کہ رک گئی دھڑکن
سنبھل کے حال سنانا تو درکنار رہا

کسی سے کیجئے نہ افروز دردِ دل کا گلا
کسی کا آج نہ کوئی بھی غم گسار رہا

# غزل

محمد اشرف اشرف

کبھی خاکِ کوئے بتاں رہا کبھی کہکشاں سے گزر گیا
مجھے خود بھی اِس کی خبر نہیں میں کہاں کہاں سے گزر گیا

مجھے لے چلا تھا مرا جنوں تری جستجو میں کشاں کشاں
مگر اتنا ہوش ہی کب رہا کہ کہاں کہاں سے گزر گیا

جو تری نظر میں نہ آ سکا یہ مرے نصیب کی بات تھی
کئی بار بن کے میں اجنبی ترے آستاں سے گزر گیا

مرا دل جو خوگرِ ضبط تھا مجھے اُس سے کوئی گلہ نہ تھا
کہ خوشی سے اشرفِ خوشنوا میں ہر امتحاں سے گزر گیا

# نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| شکست کے بعد | کرشن چندر | چار روپیہ پچاس پیسے |
| طوفان کی کلیاں | " | چار روپے |
| گرجے کی واپسی | " | تین روپے |
| الٹا درخت | " | دو روپے پچھتر پیسے |
| وریزرو | " | دو روپے پچیس پیسے |
| سسرال | شوکت تھانوی | دو روپے |
| سترہ ۵ | " | تین روپے پچاس پیسے |
| بقراط | " | دو روپے پچاس پیسے |
| جی ہاں چھپتے ہیں | " | تین روپے پچیس پیسے |
| جوڑ توڑ | " | پانچ روپے |
| داماد | " | دو روپیہ پچیس پیسے |
| گوشۂ عافیت | پریم چند | پانچ روپے |
| چوگان ہستی مکمل | " | گیارہ روپے |
| دودھ کی قیمت | " | تین روپے |
| خاک پروانہ | " | تین روپے |
| صبح زندگی | راشد الخیری | دو روپے |
| شب زندگی | " | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| شام زندگی | " | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| ستارہ کی بیٹی | رازق الخیری | تین روپے |
| سمن پوش | مجنوں گورکھپوری | ایک روپیہ پچاس پیسے |
| اقبال | " | چار روپے |
| گرد کارواں | کنھیا لال کپور | تین روپے |
| سنگ وخشت | " | دو روپیہ پچاس پیسے |
| سونا گاچھی | جمنا داس اختر | چار روپے پچاس پیسے |
| شعلۂ سنگ | کوثر چاندپوری | تین روپے پچاس پیسے |
| شمع | اے آر خاتون | پانچ روپے |
| چشمہ | " | دس روپے پچھتر پیسے |
| شکیلہ | مسعود ہمایوں | چار روپے پچیس پیسے |

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| شکست ظلمت | مخمور جالندھری | ایک روپیہ پچھتر پیسے |
| آرزو کی کلیاں | " | ایک روپیہ پچھتر پیسے |
| پہلی محبت | " | ایک روپیہ پچیس پیسے |
| خواب مجبوں | " | تین روپے پچاس پیسے |
| دنیا کے مشہور سائنسداں | " | دو روپے پچیس پیسے |
| شائستہ | نادرہ خاتون | چار روپے پچاس پیسے |
| ظالم | سعید امرت | دو روپے پچاس پیسے |
| فتح خیبر | صادق حسین | چار روپے |
| مقابلہ | خان محبوب طرزی | تین روپے |
| نیلوفر | " | تین روپے |
| آہنی دروازہ | " | چار روپے |
| دوشیزۂ روم | " | تین روپے |
| دیوانہ | " | تین روپے |
| دو دیوانے | " | دو روپے پچاس پیسے |
| سیلاب | " | تین روپے |
| گناہ | دت بھارتی | دو روپے پچاس پیسے |
| اندھیرے اجالے | عادل رشید | تین روپے |
| بہار آنے تک | " | تین روپے پچاس پیسے |
| دو پھول | " | تین روپے پچھتر پیسے |
| مغرور | رئیس احمد جعفری | چار روپے پچاس پیسے |
| قیامت | ذکی انور | دو روپے پچاس پیسے |
| سازش | " | دو روپے پچاس پیسے |
| گورا | ٹیگور | چار روپے پچاس پیسے |
| لٹ گئی بہار | ضیا عظیم آبادی | تین روپے پچاس پیسے |
| دل ہی تو ہے | " | چار روپے پچیس پیسے |
| ممتاز | ایم اسلم | آٹھ روپے |
| آخری رات | " | پانچ روپے |
| ریحانہ | " | سات روپے |

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| درہ | مسعود ناتھ | چار روپے پچھتر پیسے |
| گلی گلی | رام لعل | چار روپے |
| فردوس گوش | حضرت جوش ملسیانی | پانچ روپے |
| کفر و ایمان | ہری چند اختر | چار روپے |
| وسکی کی بوتل | [illegible] | دو روپے |
| لنکن کے شب | مسعود کاشمیری | تین روپے |
| موٹر میکنیک گائڈ | شیوناتھ تسکین | چار روپے |
| گلی گلی | رام لعل | چار روپے |
| آواز تو پہچانو | " | تین روپے |
| چراغوں کا سفر | " | چار روپے پچاس پیسے |
| انتظار کے قیدی | " | دو روپے |
| کل کی باتیں | " | پانچ روپے |
| اجالے سے پہلے | ابراہیم جلیس | دو روپے پچاس |
| ابھرتے جوبن | اظہر اثر | دو روپے |
| آندھی میں چراغ | غلام السبطین | سات روپے پچاس |
| اقوال زریں | مصطفےٰ احسن زبیری | پچاس |
| انارکلی | امتیاز علی تاج | دو روپے پچاس |
| آشا دیپ بجھے نا | ست پرکاش سنگر | دو روپے |
| ابراہیم لنکن | چندر موہن لانبہ | ایک روپیہ پچیس |
| ادا ہست موت کے دروازے پر | مولانا ابوالکلام آزاد | تین روپیہ |
| اصلی مکمل باورچی خانہ | بے سی داس ماجد | تین روپے پچاس |
| جینے کے لیے | ستیہ پال آنند | دو روپیہ پچاس |
| پچیس سال بعد | امرتا پریتم | ایک روپیہ پچیس |
| حادثہ | قیسی رامپوری | پانچ روپے پچاس |
| خون | شہزادہ تبسم | چار روپے |
| رضیہ کا شاہی دسترخوان | رضیہ سلطانہ | دو روپے پچاس |
| رسیلی | شہزادہ تبسم | دو روپے پچاس |
| زمین کے اجالے | آزاد ملیح آبادی | تین روپے پچاس |

طلب کا پتہ:- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۲۳۴۳، دہلی

# دِلّی کا خط لندن کے نام

خوشتر گرامی

مائی ڈیر لندن!

آج شکایت کے موڈ میں خط لکھ رہی ہوں ——— میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتی کہ جو انسان آدمی آدمی میں امتیاز، اس بیسویں صدی میں برتے اور دوسرے کے رہن سہن، کھانے پینے اور اوڑھنے بچھونے پر اعتراض کرے وہ اس صدی کی پیداوار اور اس عہدی کا انسان نہیں ہے ———

میاں نظیر اکبر آبادی، خدا بخشے۔ کیا خوب کہہ گئے ہیں ؎

کالا بھی آدمی ہے کہ الٹا ہے جوں توا
گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند کا

اور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے، مشرق ہو یا مغرب، شمال ہو یا جنوب، ایشیا ہو یا یورپ، امریکہ ہو یا افریقہ، روس ہو یا چین۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آدمی آدمی برابر ہیں۔ پھر ایسے امتیازی سوالات کیوں اُٹھائے جاتے ہیں اور آپ کی سرزمین پر تو یہ بات یوں بھی اچھی نہیں معلوم ہوتی کیوں کہ آپ کے یہاں سوشلسٹ اور ترقی پسند حکومت ہے۔ کنزرویٹو دورِ حکومت ہوتا تو یہ بات سمجھ میں آجاتی کہ کبھی داڑھی پر اعتراض ہے تو کبھی پگڑی پر ——— اور اب عورت ذات کی حکومت میں عورت کے لباس پر قدغن لگا دی ہے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

شیفیلڈ سے پچھلے دنوں یہ خبر آئی تھی کہ کنگز ہل پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے اسکول میں شلوار پہننے کی ممانعت کر دی ہے۔ اُس کی رائے ہے کہ شلوار اسکول کی یونیفارم میں شامل نہیں اور دوسری طرف پاکستانی لڑکیاں شلوار اس لئے پہننے پر مُصر ہیں کہ اسکول یونیفارم جو گھٹنوں سے اوپر تک ہوتی ہے قابلِ اعتراض ہے اور یہ لباس اُن کی مذہبی تعلیمات کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے مطالبہ کیا کہ شلوار پہننے کی اجازت دی جائے جو ٹخنوں تک ہوتی ہے۔ یہ مطالبہ منظور نہ ہونے پر بہت سے مسلمانوں نے اپنی بچیوں کو اسکول بھیجنا بند کر دیا ——— اُنھوں نے کہا کہ وہ اپنی بچیوں کو ایسا لباس پہنا کر اسکول نہیں بھیجیں گے جس میں اُن کی پنڈلیاں اور رانیں دعوتِ نظارہ دیں۔

اسکول کی تعلیمی کمیٹی نے اس مطالبہ پر غور کیا اور ٹیچروں کی کونسل کے ممبروں اور ماہرینِ تعلیم کا تین گھنٹہ تک اجلاس جاری رہا اور آخر میں فیصلہ ہوا کہ پرنالہ وہیں گرے گا ——— یعنی شلوار کی اجازت نہ ہوگی۔ اس کی بجائے مسلمان لڑکیاں پینٹ پہنیں جس کا ڈیزائن اسکول کمیٹی کی طرف سے تیار ہوگا۔

شلوار کی مخالفت میں اُنھوں نے ایک عجیب دلیل دی۔ جس طرح نکٹوں نے ناک والوں کو آتا دیکھ کر پہلے ہی انھیں "نکو" "نکو" کہہ کر پکارنا شروع کر دیا تھا۔ اُنھوں نے یہ کہہ کر شلوار کی مذمت کی کہ نسلی امتیاز کی علامت ہے ——— اکبر مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر
تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا

اِس دفعہ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک چھوٹا سا مقابلہ ہوا ہے۔ مگر مجھے اعتراف ہے کہ میں مات کھا گئی ہوں ——— لندن کے میٹرنٹی ہسپتال سے ایک برطانوی عورت کے ایک ساتھ چھ بچوں کو جنم دینے کی اطلاع موصول ہوئی تھی۔ اس کے جواب میں میرے یہاں بھی ایک عورت نے کوشش کی۔ مگر وہ تین سے آگے چھلانگ نہ لگا سکی۔ شاید وہ فیملی پلاننگ والوں کے اس نعرے کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ ——— "دو یا تین، بس" لیکن اگر اس نے تین تین کی باؤنڈری لگا کر بس کی تو تین "تیا نو" ہو جائیں گے۔

بچوں کی پیدائش کا ذکر چلا ہے تو یاد آیا کہ آپ کے یہاں اسقاط کی بہت سہولتیں ہیں۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو بلاشبہ جلد ہی ارضِ لندن

عشاق کی خواہاں خواتین کے لئے "پناہ گاہ" یا "جنت" بن جائے گی۔

امریکہ کے لوگوں نے بھی اس طرف توجہ دی ہے اور ابتدا بھی کر دی ہے ——— اور بعض حاملہ کے لئے ایک باقاعدہ ایجنسی قائم کر دی ہے جس کے ذریعہ عورتوں کے ایک گروپ نے لندن میں قدم رنجہ فرمایا ہے اور علانیہ اور بے جھجک کہا ہے کہ وہ "اسقاط" کے لئے آئی ہیں۔

امریکہ کے ایک وکیل نے اس مقصد کے لئے ایک ایجنسی قائم کی ہے جو دس ہزار روپے میں ایک عورت کو اسقاط کے لئے لندن لانے لے جانے کا کام کرے گی۔ اس میں سفر کا خرچ، لندن میں قیام، کھانے اور آپریشن وغیرہ کے جملہ اخراجات شامل ہیں ——— مگر ڈیر! اس میدان میں شاید تمھاری اجارہ داری قائم نہ رہ سکے گی اور تم شاید پچھڑ جاؤ ——— کیونکہ حال ہی میں سٹاک ہالم میں "اسقاط" کے سلسلہ میں کچھ تجربات کئے گئے ہیں۔ وہاں یہ کام بہت ہی آسان ہو گیا ہے ——— بس ایک انجکشن لینے سے عورت "سبکدوش" ہو جاتی ہے۔ جونہی اس تجربے کی تکمیل ہوئی اور ڈاکٹروں نے اس پر صاد کیا تو یہ اسقاط . . . کے "ٹورسٹ" ناروے کی طرف دوڑیں گے۔

"اسقاط" کی اس خرافات کے ساتھ مجھے وضع حمل کا ایک دلچسپ واقعہ بھی یاد آگیا ——— اس کا تعلق بھی اسی ملک کی سرزمین سے ہے۔ پچھلے دنوں ایک پالتو بندریا نے اس سلسلہ میں ایک حیرت انگیز کارنامہ دکھایا اور "مڈوائف" کے فرائض بھی انجام دئے۔

آسام ٹربیون نے کریم گنج کی ایک اطلاع کے حوالے سے لکھا ہے کہ کچھار ضلع کے موضع امارہ نگر میں جب ایک عورت دردِ زہ میں مبتلا ہوئی اور تکلیف بڑھتی گئی۔ لیکن ولادت نہ ہوئی تو گھر کی پالتو بندریا جو یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی فوراً جنگل کی طرف دوڑی اور تھوڑی ہی دیر میں ایک درخت کی جڑ لئے واپس لوٹی۔ اس نے اپنی مالک کے سامنے بیٹھ کر یہ جڑ چبائی اور کچھ اس کو دی۔ جیسے ہی حاملہ عورت نے اسے چبایا، فوراً نہایت آسانی سے بچہ پیدا ہو گیا۔

پیارے لندن!

آپ کو یاد ہوگا میں نے فلموں میں بوسہ بازی کے سلسلہ میں چھڑی ہوئی بحث کا ذکر کیا تھا ——— بوسہ بازی کے حامیوں کو گورنر بنگال نے ایسا دندان شکن جواب دیا ہے کہ وہ منہ دیکھتے رہ گئے ہوں گے۔

گورنر بنگال مسٹر ایس ایس دھون نے پچھلے دنوں فلمی میلے کا افتتاح
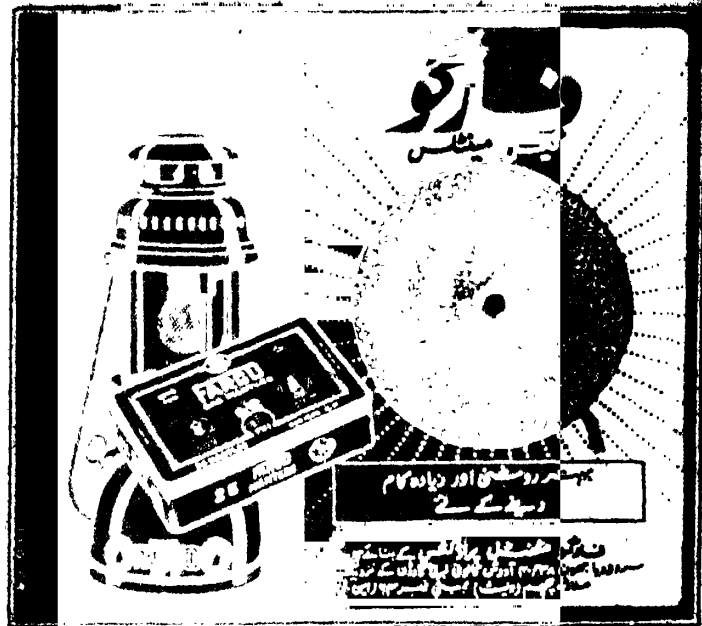
کرتے ہوئے ہندوستانی فلموں میں بوسہ بازی کی حمایت کرنے والوں کو چیلنج کیا کہ جو لوگ ہندوستانی فلموں میں بوسہ بازی چاہتے ہیں پہلے وہ اس کی ابتدا Charity Begins at Home کے مصداق اپنے گھر سے کریں ــــــ وہ برسرِ عام اپنی بیویوں کو چوم کر دکھائیں۔

مسٹر دھون نے بتایا کہ بوسہ بازی ایک آرٹ نہیں بلکہ فلموں کو کامیاب بنانے کا ایک غلط حربہ ہے۔ مشرق و مغرب کی فلمسازی کے درمیان ایک خط کھینچتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مغربی فلم ساز اگر فلموں میں بوسہ بازی دکھاتے ہوئے ہچکچاتے نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب میں فلم کی صنعت جاہلیں ایک کاروبار ہے۔ ہندوستانی فلموں میں بوسہ بازی ہندوستان کے کلچر اور سماجی رواجوں کے خلاف ہوگی ــــــ انھوں نے اپنے نقطۂ نظر پر زور دینے کے لئے کہا کہ دُنیا کے ادب میں محبت کے عظیم ترین مناظر سنسکرت ڈراموں میں ملتے ہیں۔ لیکن آپ ان میں بوسہ بازی کا ایک بھی منظر نہیں پائیں گے۔

انھوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ آج کی دُنیا میں بیرونی ممالک اور گرد و پیش کے ماحول سے محفوظ رہنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس لئے انھوں نے کہا کہ دوسروں کے کلچر کی جو اچھی باتیں ہیں صرف وہی اختیار کی جائیں ــــــ یعنی بیرونی ممالک کی اندھی تقلید نہیں ہونی چاہیے۔

مائی ڈیر لندن!

مسٹر دھون نے سنسکرت ڈراموں میں محبت کے مناظر کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس سرزمین سے وابستہ حُسن و عشق کی کتنی داستانوں میں محبت کی ایک ابدی یادگار بھی ہے۔ اگرچہ ہمارے ایک ترقی پسند شاعر حضرت ساحر لدھیانوی نے اس پر طنز کیا ہے ؎

اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق
میرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

میں تاج محل کا ذکر کر رہی ہوں۔ محبت کی دُنیا میں تاج محل کی عظمت مسلّم ہے۔ پچھلے دنوں شاہجہاں کی بنوائی ہوئی اپنی محبوب ملکہ کی یادگار کا ذکر امریکی اخبارات میں بڑے دلچسپ انداز میں آیا ہے۔ وہاں ایک امریکی شہری نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ مستقبل قریب میں اپنی شادی تاج محل آگرہ کی سیڑھیوں پر کرنا چاہتا ہے ــــــ اسی مناسبت سے وہ اپنے آپ کو شاہجہاں سمجھتا اور بخیالِ خود شہنشاہِ محبت سمجھ کر دستخط کرتا ہے۔ اس نے شکاگو کے ایک روزنامے میں اس بات پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ وہ اب تک ایک "ممتاز محل" تلاش کرنے میں ناکام رہا ہے۔

اُس نے اپنی تلاش ترک نہیں کی ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ وہ جلد ہی "ارضِ تاج" میں اپنے محبوب کو پالے گا۔ اِس اُمید کے پیشِ نظر اُس نے اپنا پتہ اخبار میں دیا ہے ــــــ "شاہجہاں۔ پوسٹ بکس نمبر 4700 شکاگو، 60000 ایسانور (یو۔ ایس۔ اے)"

یہ ہے اِس امریکن شاہجہاں کا قصّہ جو اپنی نامعلوم، نادیدہ ناشنیدہ ممتاز محل کے انتظار میں زندگی کے دن گزار رہا ہے۔ اسی کو تو کہتے ہیں ؎

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

اچھا ڈیر! آپ کا بہت وقت لے چکی ہوں۔ اجازت دیجئے۔ خدا حافظ! پھر ہمکلام ہوں گے اگر خدا کو منظور ہوا۔

بائی بائی!

آپ کی
دِلّی

("ایشیا" ویکلی برمنگھم لندن کے شکریہ کے ساتھ)

# صحت و زندگی

## ۱• پپیتہ ـــــ ایک مفید پھل

اس کا مزاج گرم و تر ہے۔ نہایت مفید اور خوش ذائقہ پھل ہے۔ اور نسبتاً ارزاں بھی ہے۔ یہ کچا اور پکا دونوں طرح کھایا جاتا ہے۔ کچے کی سبزی بنا کر کھاتے ہیں۔ پختہ پھل مصفّیٰ خون، مقوّیٔ معدہ اور ہاضم ہوتا ہے۔ قبض کشا ہے۔ جگر اور آنتوں کو طاقت بخشتا ہے۔ تلّی دور کرتا ہے اور کلائی طحال کے لئے مفید ہے۔ مزمن اسہال میں فائدہ بخش ہے۔

پپیتہ برابر کھایا جائے تو دائمی قبض، خونی بواسیر اور سوءِ ہضم میں بہت مفید ہے۔

پپیتہ کا کچا پھل بطور سبزی کھایا جاتا ہے۔ کچے پھل کا شوربہ پینے سے عورتوں کا دودھ بڑھ جاتا ہے۔ کچے پھل میں دودھ جیسا جو رس ہوتا ہے، وہ دیسی اور مغربی دونوں طبوں میں اپنے مفید اثرات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ آنتوں کے گول کیچوؤں کے لئے کرم کُش (جراثیم کُش) اثر رکھتا ہے۔ اس مقصد کے لئے بالغ مریض کو تازہ رس اور شہد دونوں کا ایک ایک بڑا چمچہ، چار چمچے کے برابر کھولتے ہوئے پانی میں ملا کر پلانا چاہئے۔ اس کے دو گھنٹے بعد ارنڈی کا تیل پلانا چاہئے۔ بچوں کے لئے عمر کے لحاظ سے مناسب مقدار میں دیا جا سکتا ہے۔

پپیتہ کے بیجوں کا رس ہضم کی خرابی، خونی بواسیر اور جگر کے امراض میں دیا جاتا ہے۔ پپیتہ کے پتّے دافعِ کرم اور دافعِ بخار ہیں۔ بیری بیری کے مرض میں بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ عورت کی چھاتیوں پر گرم پتّے باندھنے سے دودھ بڑھ جاتا ہے۔ جوڑوں کے دردوں کے لئے بھی پپیتہ کے گرم پتّے مادرِ دن جتنے پر لگائے جاتے ہیں۔

## ۲• عمل کے بغیر علم بے سود ہے

دنیا میں بیشتر ایسے لوگ ہیں جو تعلیم کی بڑی بڑی ڈگریاں لے کر یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں کامیابی کی کلید مل گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اندر جب تک عمل کا جذبہ نہ ہو زیادہ سے زیادہ تعلیم بھی بے سود ہے۔

مشہور مفکّر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــ "کوئی شخص اتنا علم حاصل کر لے کہ وہ چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا بن جائے۔ لیکن وہ اس علم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ علم اس وقت ہمارے لئے مفید ہو سکتا ہے بلکہ بہت بڑی قوت بن جاتا ہے جب اسے کسی مقصد کے لئے منظم طریقے سے حاصل کریں اور اس پر عمل کریں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اپنے علم کی دولت کو ذہن کی الماری میں لئے بیٹھے رہتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جن کا مبلغ علم زیادہ نہیں وہ اپنے معمولی علم کو کام میں لا کر دنیا میں آگے بڑھ جاتے ہیں"۔

## ۳• صحت مند رہنے کے لئے

دنیا میں کون ایسا ہوگا جو یہ نہ چاہتا ہو کہ وہ صحت مند رہے۔ لیکن ایسے بہت کم لوگ ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ صحت مند کس طرح رہا جا سکتا ہے۔

صحت مند رہنے کے لئے متوازن غذاؤں کا استعمال ضروری ہے۔ متوازن غذائیں وہ ہیں جن میں وہ تمام اجزاء موجود ہوں جو بدن کی پرورش کرنے، اس میں قوت و حرارت پیدا کرنے اور خون کو حالتِ اعتدال میں رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جدید تحقیقات کے مطابق ان میں وہ لطیف غذائی اجزاء بھی ہونے چاہئیں جنھیں وٹامنز کہتے ہیں۔

اس اصول کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ہمیں انڈے، گوشت، مچھلی، دودھ، دہی، مکھن اور نباتاتی غذائیں مثلاً گیہوں، جو، چنا، مٹر، ماش، لوبیا، مونگ، ارہر کی دال وغیرہ اجناس کھانے کی ضرورت ہے۔ نیز شکر اور تازہ موسمی پھل بھی کھانے چاہئیں۔ اس قسم کی ملی جلی غذائیں کھانے سے ہم اپنے بدن کی پرورش کر سکتے ہیں اور صحت مند رہ سکتے ہیں۔

صحت مند رہنے کے لئے اُن غذاؤں اور اُن عادات سے پرہیز بھی نہایت ضروری ہے جو صحت کو تباہ کرتی ہیں ــــ اگر آپ اِن مشوروں پر عمل کریں تو ہمیشہ صحت مند رہ سکتے ہیں۔ آپ کی صحت قابلِ رشک بن سکتی ہے۔

## ۴ • کامیابی کا راز

"دُنیا میں کون ہوگا جو کامیابی کی محبوبہ سے ہمکنار ہونا نہ چاہتا ہو۔ ہم آپ سبھی کامیابی کا خواب دیکھتے ہیں۔ لیکن بہت کم لوگوں کے خواب تعبیر آشنا ہوتے ہیں۔ کامیابی کی محبوبہ بہت کم لوگوں پر ریجھتی ہے۔

مشہور مفکّر ڈاکٹر نپولین ہل نے کامیابی کا راز اِن الفاظ میں بتایا ہے ــــ "اگر ہم دُنیا کے کامیاب انسانوں کی زندگی کا جائزہ لیں تو ہم پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ انھوں نے کسی نہ کسی طرح دانستہ یا نادانستہ طور پر دوسرے دماغوں سے اتحاد کیا جس نے اُن کے لئے عقل و حکمت کے سمندر کے دروازے کھول دیئے ــــ یہی اُن کی کامیابی کا راز ہے!"

## ۵ • تمباکو نوشی ــــ ایک مہلک عادت

تمباکو دل، دماغ اور پھیپھڑے کو نقصان پہنچاتا، ہاضمے کو کمزور کرتا اور معدے کی قوت کو گھٹا دیتا ہے۔ اِس لئے ضعفِ معدہ لاحق ہوتا ہے۔ رعشہ، بے خوابی، چڑچڑا پن اور بد مزاجی بھی تمباکو کے عام اثرات ہیں۔

امریکن ماہرین کی تازہ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ سگریٹ پینے والوں میں پھیپھڑوں کے سرطان سے بھی زیادہ امراضِ قلب میں مُبتلا ہو جانے والوں میں آخری نتیجہ ہلاکت خیز ہوتا ہے اور دوسرے کئی مہلک امراض و عوارض بھی لاحق ہو سکتے ہیں۔ اِس لئے سگریٹ نوشی کی تباہ کُن عادت سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ اگر یہ عادت دل کے دامن سے لگ ہی گئی ہے، اور آپ سگریٹ پینے کے عادی ہو گئے ہیں تو سگریٹ کا دھواں سانس کے ساتھ اندر نہ کھینچیے۔ تمباکو کا دھواں پھیپھڑے کی ہوائی نالیوں میں خراش پیدا کر دیتا ہے۔ اگر خراش پہلے ہی موجود ہو تو یہ سوزش پیدا کر کے کھانسی میں اضافہ کرتا ہے۔ اِس کے زہریلے اثرات سے پھیپھڑے ماؤف و متاثر ہو کر دِق اور سل بھی ہو سکتی ہے۔ لندن کے ڈاکٹر سی۔ آر۔ ڈولڈ ہل نے متنبّہ کیا ہے کہ چھوٹی عمر میں تمباکو یا سگریٹ پینا دِق کا ایک عام سبب ہے۔

چند سال پہلے امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس میں اہم ترین مسئلہ "تمباکو نوشی کے دُور رس خطرات" تھا۔ اُن ڈاکٹروں کو یہ سُن کر سخت حیرت ہوئی کہ پھیپھڑوں کا سرطان تمباکو سے پیدا ہونے والے عوارض میں محض ایک ادنیٰ ترین عارضہ ہے!

امریکن کینسر سوسائٹی کے ماہرِ اعداد و شمار ڈاکٹر ایڈورڈ ہیمنڈ نے یہ رپورٹ پیش کی کہ ــــ "تمباکو نوشی سے لاحق ہونے والا پھیپھڑوں کا کینسر تمباکو نوشی کی پیدا کردہ دوسری مضرتوں کے مقابلے میں کم اہمانی حیثیت رکھتا ہے۔"

تمباکو نوشی کے بارے میں امریکہ اور برطانیہ میں جو تجربات ہوئے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ پائپ اور سِگار، سگریٹ کے مقابلے میں کم مضرت رساں ہیں۔

## ۶ • مکمّل زندگی

ہر چلتا پھرتا، بولتا باتیں کرتا آدمی خود کو زندہ سمجھتا ہے۔ دوسرے لوگ بھی اُسے زندہ سمجھتے ہیں لیکن درحقیقت اُن میں بیشتر لوگ حقیقی معنوں میں زندہ نہیں ہوتے۔ اُن کی زندگی زندگی نہیں ہوتی۔

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ــــ "کسی نہ کسی طرح زندگی گزار لینا کافی نہیں ہے۔ ہمیں مکمّل طور پر، شاندار طریقے پر بہتر سے بہتر زندگی گزارنی چاہیئے۔ ہمارے جسم کا ہر حصّہ اور ہر حصّے کا ہر رگ و ریشہ زندگی سے کامل طور پر بھرپور ہونا چاہیئے۔

ہمیں چاہیئے کہ ہم زیادہ سے زیادہ زندہ دل، ہلکے پھلکے، سرگرمی اور جوش سے بھرپور رہیں۔ ہماری گرمجوشی کی انتہا نہ ہو ــــ صحیح معنوں میں اُسی زندگی کا نام زندگی ہے۔"

## ۷ • ہم ناکام کیوں ہوتے ہیں؟

"دُنیا میں کون ایسا ہے جو زندگی کی بازی گاہ میں کامیاب نہیں ہونا چاہتا۔ آیئے بتائیں آپ ناکام کیوں ہوتے ہیں؟

ایک مفکّر نے لکھا ہے ــــ "ہماری ناکامی کا واحد سبب ہم میں خود اعتمادی کی کمی ہے۔ بے شمار لوگ خود اعتمادی کی کمی کے باعث اپنی زندگیاں برباد کر لیتے ہیں ــــ خود اعتمادی کے بغیر ہم کبھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہماری کامیابی ہمارے یقین سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ جہاں تک ہم

خیالات کی حدود میں منڈلاتے رہتے ہیں اور جب تک انھیں عبور کر کے یقین کی سلطنت میں قدم نہیں رکھتے، کامیابی کے خواب کو حقیقت نہیں بنا پاتے۔"

## ۸• زکام ــــــ ایک مہلک مرض

"زکام کو ایک معمولی شکایت سمجھ کر بیشتر لوگ اسے نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زکام کو لوگ جتنی معمولی شکایت سمجھتے ہیں یہ اتنا ہی مہلک مرض ہے۔ اس کی طرف سے غفلت اور بے پروائی برتنے سے انسان متعدد امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاج سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ اس سے بچنے کے لئے احتیاط۔

"زکام کا زور گرمی کی بہ نسبت موسم سرما میں زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن تجربات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موسم اور زکام میں کوئی گہرا تعلق نہیں ہے۔

زکام متعدی مرض ہے جو لوگ قطب شمالی کے سرد اور برفانی خطے میں آباد ہیں اور دنیا کی دوسری آبادی سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں، وہ زکام اور نزلے میں کبھی مبتلا نہیں ہوتے۔ اتفاق سے اگر اس دنیا کا کوئی آدمی وہاں جا پہنچتا ہے اور ان سے ملتا ہے تو جو لوگ اب تک اس مرض سے ناواقف تھے وہ اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ تجربہ اس تحقیقاتی مشن کا بھی ہے جو کچھ سال پہلے گرین لینڈ کے مغربی ساحل تک گیا تھا۔

کپڑوں میں زکام کے جراثیم ہوتے ہیں۔ مشہور سیاح ایڈمرل بائرڈ کا بیان ہے کہ میرے جہاز کے ملاح سال بھر تک زکام میں مبتلا نہ ہوئے تھے۔ لیکن ایک دن صندوق کھولا گیا جس میں ہماری سوسائٹی کے کپڑے بھرے ہوئے تھے، یہ صندوق کھلا اور ہماری پارٹی میں زکام پھیل گیا۔

جہاں زیادہ آبادی ہوتی ہے وہاں نزلے اور زکام کی شکایت ایک سے دوسرے کو لگ جاتی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس آبادی کا ہر شخص اس مرض میں مبتلا ہو جائے۔ بہت سے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنھیں زکام نہیں ہوتا۔ زکام کے زہریلے جراثیم کو جب کوئی شکار نہیں ملتا تو وہ خود بخود ہلاک ہو جاتے ہیں۔ زکام کے جراثیم انسانی جسم کے باہر زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتے۔

تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ زکام کا جرثومہ نہایت ہلکا اور بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے۔ وہ ہوا میں ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ وقت تک اڑ سکتا ہے اور سانس کے ساتھ انسان کے جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ بعض ان چیزوں سے بھی انسان کے جسم تک پہنچ جاتا ہے جنھیں وہ چھوتا ہے۔ ڈاکٹر سی۔ اے۔ اینڈریوز نے لکھا ہے ــــ "آپ کو یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ زکام کے جراثیم ہمیشہ ایک شخص سے دوسرے شخص میں منتقل ہوتے رہتے ہیں، لیکن ان کا شدید اثر ہر شخص پر ظاہر نہیں ہوتا۔ اس سے وہی لوگ متاثر ہوتے ہیں جن کے جسموں میں قوتِ مدافعت ان جراثیم کے حملے کے وقت نہایت کمزور ہو چکی ہو۔ ان مریضوں سے یہ جراثیم کثیر تعداد میں پھیلتے ہیں۔ اگر ان مریضوں سے بچا جائے تو یہ جراثیم فنا ہو جائیں گے۔"

ڈاکٹر موصوف کے اس اشارہ پر عمل کیا جائے تو بہت حد تک لوگ اس موذی مرض سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

## ۹• آپ کے پاس سب کچھ ہے!

آپ اپنی بے مائیگی اور تہی دامنی سے افسردہ کیوں رہتے ہیں۔ دولت ہی حقیقی مسرت نہیں بخشتی۔ آپ کے پاس دولت نہیں ہے جب بھی آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ آپ چاہیں تو اپنی زندگی کو خوشگوار و مسرت بخش بنا سکتے ہیں۔

ایک مفکر نے لکھا ہے ــــ "آپ کو یہ بات نظرانداز نہ کرنی چاہئے کہ آپ کے جسم میں دوڑتا ہوا خون اور آپ کے پاس دماغ ہے۔ اگر آپ صرف اپنے دماغ سے کام لے کر اپنی زندگی خوشگوار بنانا چاہیں تو آپ کو کوئی نہیں روک سکتا۔ غذا، خوبصورتی، کام، کھیل کود اور دوسری چیزوں کے لئے اپنے دل میں گہرا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کیجئے۔ اگر آپ میں یہ جذبہ، یہ خواہش پیدا ہو گی تو آپ اس کی تسکین بھی کرنا چاہیں گے۔ خوبصورت مناظر کو نظر بھر کر دیکھئے اور ان کی خوبصورتی پر غور کیجئے۔ جب کام کا وقت ہو تو دل لگا کر کام کیجئے۔ حقیقت میں آپ کے لئے مسرت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ آپ کے پاس سب کچھ ہے اور سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔"

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سوالنامہ
شائع [illegible] کے جواب [illegible] ثقافت۔
تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش یا عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں
کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ
تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد
جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات
بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات
میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

## سوال و جواب

**محمد اسرائیل انصاری۔ راج گنج۔ ہوڑہ**

س۔ سرسید احمد خاں اور اکبر الہ آبادی کا خیال مغربی تہذیب کے بارے میں کیا تھا اور کس کا خیال درست تھا؟

ج۔ سرسید احمد خاں مغربی تہذیب کے حامی تھے۔ اکبر الہ آبادی مغربی تہذیب کے مخالف تھے اور انھیں کا خیال درست تھا کسی نے بالکل صحیح کہا ہے ———

مشرق نورِ سحر کی وادی
مغرب ظلمتِ شب کا جنگل

س۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو کس سیاسی پارٹی میں شامل ہونا چاہیئے؟ یا اپنی الگ کوئی پارٹی بنانی چاہیئے؟ یا سیاست سے الگ رہنا چاہیئے؟

ج۔ جس کانگریس کی قیادت اندرا گاندھی کر رہی ہیں مسلمانوں کو اسی کی تائید کرنی چاہیئے۔ اسی میں شامل رہنا چاہیئے۔ علیحدگی پسندی کی راہ تباہ کن ہے۔ سیاست سے الگ رہ کر کوئی قوم اپنے حقوق حاصل کر سکتی ہے نہ اپنے حقوق کی حفاظت کر سکتی ہے۔

س۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین میں کس قسم کی مشابہت یا فرق ہے اور دونوں میں کیا کوئی رشتہ تھا؟

ج۔ یہ دونوں بزرگ عظیم رہنما اور عظیم انسان تھے۔ پھر بھی ڈاکٹر ذاکر حسین مولانا آزاد کی عظمت کے معترف و مداح تھے۔ ان دونوں عظیم رہنماؤں کی ایک ہی منزل، ایک ہی مطمحِ نظر تھا۔ اس لئے ان میں باہم گہرا ربط اور رشتہ تھا۔

---

**شیخ غلام حسین سلیمان**

س۔ میں ہر ماہ اردو زبان کے دو معیاری ماہنامے پڑھنا چاہتا ہوں۔ ایک "بیسویں صدی" اور دوسرے کا نام براہِ کرم آپ تجویز کیجئے۔

ج۔ "شاعر" بمبئی ایک بلند پایہ صحیفہ ہے جسے پڑھ کر آپ یقیناً مطمئن ہوں گے۔

س۔ مراٹھی زبان کے بلند پایہ افسانوں کو اردو کا روپ دے کر بھیجوں تو کیا آپ "بیسویں صدی" میں شائع کریں گے اور کیا اس کے لئے صاحب افسانہ کی تحریری اجازت لینا ضروری ہے؟

ج۔ افسانے اچھے ہوں گے تو "بیسویں صدی" میں یقیناً جگہ پائیں گے۔ ان افسانوں کا ترجمہ کرنے کے لئے اصل مصنف سے اجازت لینا ضروری ہے۔ مگر اب زیادہ تر تراجم بلا اجازت ہو رہے ہیں۔

---

**محمد عبد العلیم الامین۔ بنگلور**

س۔ دنیا میں کس طرح امن قائم ہو سکتا ہے؟

ج۔ جب لوگ ملک گیری کی ہوس سے بلند ہو کر جنگ سے نفرت کرنے لگیں۔

س۔ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کو ختم کر کے بھائی چارہ باہم قائم کرنے کا سہل ترین نسخہ کیا ہے؟

ج۔ ہندوستان کی ساری سیاسی جماعتیں سیاسی مصلحت کوشیوں سے بلند ہو جائیں ——— ہندوستان کے اربابِ حکومت سیاسی مصلحت اندیشیوں سے بلند ہو جائیں!

---

**محمد اصغر علی۔ دھنباد**

س۔ خوش قسمتی سے ہمارا مشہور شاعر فراق گورکھپوری مسلمان ہیں یا غیر مسلم؟

ج۔ حضرت فراق گورکھپوری انسان ہیں!

س۔ غلطی انسان کو کیا سبق سکھاتی ہے؟

ج۔ انسان محتاط رہے۔ پھر غلطی نہ کرے۔

---

**عبدالقیوم خاں۔ بھاگلپور**

س۔ جہاں فرقہ وارانہ فساد عام طور پر ہو وہاں اقلیت اپنے تحفظ کے لئے کیا کرے؟

ج۔ مایوس و بددل نہ ہو۔ باہم متحد و متفق ہو کر حالات کا مقابلہ کرے۔

س۔ ہندوستان کی حکومت آپ کی نظر میں؟

ج۔ شرپسندوں کی سرزنش میں ناکام نظر آرہی ہے۔

س۔ تکیہ پر کوئی حسین شعر سنایئے۔

ج۔ دل میں اُتر رہے ہیں دل کو لُبھا رہے ہیں
سوتے میں آپ کیا کیا جادو جگا رہے ہیں

---

**انعام نبی صدیقی۔ گریڈیہہ**

س۔ کامیابی پر انسان کو کس حد تک خوش ہونا چاہیئے؟

ج۔ کامیابی پر انسان کو اتنا خوش ہونا چاہیئے کہ دوسروں کی ناخوشی کا باعث نہ بن جائے۔

س۔ چاند ایک بدنما اور بنجر سیارہ ہے پھر بھی انسان چاند پر جانے کے لئے بیتاب کیوں ہے؟

ج۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ جو چیز اُس کی دسترس سے دور ہوتی ہے اُسے پانے کے لئے بیتاب و بیقرار رہتا ہے۔

---

**تنویر جہاں رعنا چھپرہ۔ سارن**

س۔ چچا جان! آپ کی نظر میں عورت کانٹا ہے یا پھول؟

ج۔ پھول! جسے حالات کبھی کبھی کانٹا بن جانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

س۔ لڑکیوں کی تعلیم کیسی ہونی چاہیئے؟

ج۔ جو انھیں چراغِ خانہ سے شمعِ محفل نہ بنا دے!

---

**بسنت رام گکڑ۔ کابل۔ افغانستان**

س۔ کیا ہندوستان کے کسی حصّہ میں فارسی بولی جاتی ہے؟

ج۔ جہاں اُردو کو غیر مُلکی زبان کہا جاتا ہے، وہاں فارسی بولنے کا کیا ذکر؟

س۔ اگر میں فارسی زبان میں لکھا ہوا افسانہ بھیجوں تو آپ "بیسویں صدی" میں شائع کریں گے؟

ج۔ "بیسویں صدی" اُردو زبان کا صحیفہ ہے۔ آپ فارسی زبان کے افسانہ کا اُردو ترجمہ بھیجیں تو شکریہ کے ساتھ شریکِ اشاعت کیا جائے گا۔

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہندوستان میں اُردو شاعروں کی تعداد کتنی ہے؟

ج۔ یہ بتانا بہت مشکل ہے، اس لئے کہ ہر تُک بند جو کسی شاعر کا شعر صحیح پڑھ بھی نہیں سکتا، خود کو شاعرِ اعظم سمجھتا ہے!

---

**مسز فیروزہ۔ مبلطی اسٹیٹ**

س۔ بھائی جان! ماں، باپ، بھائی، بہن کے بعد سچی محبت کس سے مل سکتی ہے؟

ج۔ لڑکی یا عورت کو پُرخلوص سہیلی سے، مرد کو پُرخلوص دوست سے۔

س۔ اِس دور میں لڑکیوں سے شادی کے عین نکاح کے وقت اجازت لی جاتی [illegible] کیوں؟

ج۔ اسی قدر میں تو یہ ابتدا ہی سے [illegible] آرہا ہے۔

---

**جلیل مرادآبادی۔ کانپور**

س۔ جگر کا کوئی مزاحیہ شعر سنایئے۔

ج۔ جگر مزاح گو نہ تھے۔ اُن کا ایک سنجیدہ شعر سُنئے ؎

غم میں بھی جن کو اک سرور نہیں
زندگی کا انھیں شعور نہیں

س۔ سچّے دوست کی پہچان؟

ج۔ سچا دوست سُکھ، دُکھ ہر حال میں دوست رہتا ہے۔ اُس کے سلوک میں غرض کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔

---

**زاہد، سبزی منڈی۔ سپلی بھیت**

س۔ آدمی اور انسان میں کیا فرق ہے؟ میرے ایک دوست کہتے ہیں آدمی اور انسان میں کوئی فرق نہیں۔ میں کہتا ہوں آدمی اور انسان میں فرق ہے، لیکن میں سمجھا نہیں پاتا کہ کس طرح فرق ہے؟ آپ ہی بتائیں انھیں کیسے سمجھاؤں؟

ج۔ یہ تو بہت واضح حقیقت ہے۔ ہر آدمی انسان نہیں ہوتا۔ انسانیت دشمن انسان نہیں ہوتا ؎

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا!

س۔ انسان کو کب ناامید ہونا چاہیئے؟

ج۔ کسی حالت میں نہیں!

س۔ کوئی گناہ کرنے کے بعد انسان کو کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ سچّے دل سے توبہ کرنی چاہیئے۔ سچّے دل سے گناہ نہ کرنے کا عہد کرنا چاہیئے۔

---

**مس روشن جبیں۔ کلکتہ**

س۔ ماں کی محبت؟
ج۔ ماں کی محبت کا کوئی بدل نہیں۔
س۔ زندگی حسین ہے یا موت؟
ج۔ موت کا زندگی سے کیا مقابلہ؟
س۔ امید مایوسی میں بدل جائے تو؟
ج۔ دل کے حریم میں پھر امید کی شمع روشن کر لینی چاہئیے۔

---

**سعید انور۔ لاہور**

س۔ حضرت مجید لاہوری مرحوم کا کوئی شعر سنائیے۔
ج۔ سنئے ؎

بن چکے ڈاکٹر بھی، ستمگر بھی ہیں کالے چور بھی
لیڈری فرما رہے ہیں کیسے خونخوار آدمی

---

**حسن غازی۔ بمبئی**

س۔ بھائی جان! آپ کی آنکھوں کی چمک، چہرے کی تازگی اور ہونٹوں کی جاندار مسکراہٹ پر آپ کی عمر نے کوئی اثر نہیں ڈالا؟ اس کا راز کیا ہے؟
ج۔ اس کا راز ہے ـــ حفظانِ صحت کے اصولوں پر سختی سے کاربند رہنا۔ زندگی آموز اور حیات افروز لٹریچر پڑھنا اور اس پر عمل کرنا۔ اپنے دل کے دامن پر کبھی مایوسی کا سایہ بھی نہ پڑنے دینا۔
س۔ میں ہنسنا ـــ نہیں نہیں قہقہہ لگانا چاہتا ہوں۔ کوئی پھڑکتا ہوا شعر سنا دیجئے۔
ج۔ ہنسنا، قہقہہ لگانا تو آپ کی طبیعت پر موقوف ہے۔ حضرت اکبر الہ آبادی کا ایک قہقہہ بار شعر سنئے ؎

بھیڑ؟ اس نے بتایا میں نے اِک مضموں لکھا
ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا!

س۔ اپنا بھی کوئی شعر سنائیے۔
ج۔ ہم اپنا کوئی شعر کیا سنائیں۔ اب تو اپنا یہ حال ہے ؎

جب آیا ہوا اپنا ہی جینا اجل
کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

---

**محمد مشتاق خاں۔ بریاتو۔ رانچی**

س۔ ایک انسان دوسرے انسان کو تنگ نظری سے کیوں دیکھتا ہے؟
ج۔ فراخ دل انسان تنگ نظر نہیں ہوتا۔
س۔ مذہب کے نام پر آج لڑائی کیوں ہو رہی ہے؟
ج۔ اس لئے کہ لوگ مذہب سے دور ہو گئے ہیں ؎
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
س۔ غم، افسوس، عشق میں کیا لگاؤ ہے؟
ج۔ عشق درد و غم اور رنج و تاسف کا دوسرا نام ہے۔

---

**ایم۔ اسلم کاظمی۔ سعودی عربین**

س۔ سچی محبت گونگی ہوتی ہے۔ محبت کی آنکھ ہوتی ہے نہ زبان۔ وہ ایک آگ ہے جو کبھی نہیں بجھتی، ایک کانٹا ہے جو دل میں ہمیشہ کھٹکتا رہتا ہے، ایک درد جو کبھی نہیں جاتا، ایک سُرور آمیز نشہ، ایک دلچسپ جنون، ایک پیاری سی غلطی اور ایک پاکیزہ گناہ! یہ جانتے ہوئے بھی لوگ جذبات کی آسودگی کے لئے محبت کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے بھائی جان؟
ج۔ یہ ڈھونگی انسانوں کا من بھاتا کھیل ہے۔

س۔ اس دنیا میں لاکھوں انسانوں کی ان گنت خواہشیں ہیں۔ ہر آدمی کی آرزو پوری نہیں ہوتی۔ ہر کلی پھول نہیں بنتی۔ اگر سبھی میں پھولوں کو موت آ جائے تو تمناؤں کا خون ہو جاتا ہے اور جب تمناؤں کا خون ہو جائے تو انسان...؟
ج۔ پست حوصلہ انسان بددل ہو جاتا ہے۔ بلند حوصلہ انسان اپنی تمناؤں کی تکمیل کے لئے اور جوش اور امنگ سے جدوجہد جاری رکھتا ہے۔
س۔ آخر میں آپ سے ایک اہم مشورہ لینا چاہتا ہوں۔ میں "بیسویں صدی" کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ سالانہ فیس کتنی ہے؟
ج۔ بائیس شلنگ بذریعہ پوسٹل آرڈر بھیج دیجئے۔ رسالہ ہر ماہ باقاعدگی سے پہنچتا رہے گا۔

---

**مس شہناز۔ بھوپال**

س۔ حضرت جگر مراد آبادی کا ایک شعر سنائیے۔
ج۔ سنئے ؎

نچوڑتا ہے لہو غریبوں کا دستِ سرمایہ دار اب بھی
جوتے غلامانہ زندگی میں وہی ہیں بیل و نہار اب بھی

---

**شاہدہ، زاہدہ اور زبیدہ۔ دانم باڑی**

س۔ بھیا! ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کو سب سے پہلے کس نے دریافت کیا تھا؟
ج۔ بانو! ہندوستان کھویا کب تھا جو اسے کوئی دریافت کرتا؟

---

**شیخ مسعود۔ سرینگر۔ کشمیر**

س۔ ذوق بڑے شاعر ہیں یا مومن؟
ج۔ دونوں بڑے شاعر ہیں۔

پیاری سلطانہ وجے واڑہ

س۔ بھائی جان! کوئی ایسی تدبیر بتائیں جس سے ہر وقت میرے دل کو خوشی ہو اور میرا غم اور فکر کم ہو جائے۔

ج۔ آپ ہر وقت خوش رہنا چاہتی ہیں۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کا غم مٹ جائے تو غم کو خوشی بنا لیجئے۔

س۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ پیار اور محبت سے رہتی ہوں، اُن کا خیال رکھتی ہوں، اُنھیں خوش رکھتی ہوں پھر بھی وہ چین کے چاؤ بن جاتے ہیں۔ آج کل کے انسان کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟

ج۔ ہم بھی —— محو حیرت ہیں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

س۔ "بیسویں صدی" کا سالنامہ سال میں کتنی بار نکلتا ہے؟ میری ایک سہیلی کہتی ہے سالنامہ صرف جنوری میں نکلتا ہے۔ ہم دونوں میں کس کی بات سچ ہے؟

ج۔ آپ کی بات بھی سچ ہے اور آپ کی سہیلی کی بھی! "بیسویں صدی" سال میں دو خاص نمبر پیش کرتا ہے۔ ایک سالنامہ، ایک افسانہ نمبر۔

---

محمد شوکت۔ سکنڈ لانسر

س۔ ہندوستان میں کتنے مسلمان ہیں؟

ج۔ پانچ چھ کروڑ کے درمیان۔ پاکستان ریڈیو کے بیان کے مطابق ۸ کروڑ۔

س۔ کیا یہ سچ ہے دُشمن دوست سے اچھا ہوتا ہے؟

ج۔ دانا دُشمن نادان دوست سے اچھا ہوتا ہے۔

---

جواہر لال۔ ناگپور

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ساری دُنیا میں سب سے زیادہ آبادی کس شہر کی ہے؟

ج۔ ٹوکیو کی۔ اس کی آبادی ایک کروڑ دو لاکھ [illegible] ہے۔ جس میں مردوں کی تعداد ۵۰ لاکھ اور عورتوں کی تعداد ۵۲ لاکھ ہے۔

---

یونس انور موسیٰ بن مائنس

س۔ شک کا مادہ عورتوں میں زیادہ ہوتا ہے یا مردوں میں؟

ج۔ دونوں میں۔

س۔ عورت کی سب سے بڑی خواہش؟

ج۔ ماں بننا!

---

**سلیم رضا۔ بحرین**

س۔ بندہ نواز! سنا ہے آپ بال کی کھال نکالتے ہیں۔ بتائیے آسمان پر کتنے ستارے ہیں؟

ج۔ ہم نے کبھی ہمہ دانی کا دعویٰ نہیں کیا۔ آسمان آپ کے سامنے ہے۔ آپ خود ہی گن لیں آسمان پر کتنے ستارے ہیں۔ ہمیں بھی بتائیں۔

---

**شیخ اسماعیل عبداللہ۔ دانڈیلی**

س۔ لوگ کسی زندگی کا سورج غروب ہونے پر دکھی کیوں ہوتے ہیں؟

ج۔ لوگ ہر زندگی کا سورج غروب ہونے پر دکھی نہیں ہوتے ـــــ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی زندگی کا سورج غروب ہونے پر نئی سحر نمودار ہوتی ہے۔

---

**کرشنا کماری۔ دہلی**

س۔ بجلی کو پہلے کس نے اور کب ایجاد کیا؟

ج۔ برکیٹ نے ۱۹۰۹ء میں ایجاد کیا۔

س۔ کیا یہ بھی بتا سکتے ہیں ٹینک کس نے ایجاد کیا؟

ج۔ سونٹسن نے۔

---

**حاکم چند سیٹھی۔ گوتم نگر۔ نئی دہلی**

س۔ خوشتر صاحب! زندگی کی وہ کون سی منزل ہے جہاں سانسوں میں پھولوں کی مہک اور آنکھوں میں سپنوں کے رنگ ہوتے ہیں؟

ج۔ جوانی!

س۔ کیا یہ درست ہے کہ عورت وہ چاند ہے جس میں کوئی داغ نہیں، وہ سورج ہے جس میں آگ نہیں، وہ سمندر ہے جس میں کھاراپن نہیں۔ عورت وہ پھول ہے جس میں خار نہیں اور وہ پہیلی ہے جس کا کوئی حل نہیں؟

ج۔ جی ہاں۔

---

**وحید حیدرآبادی۔ نظام آباد**

س۔ یہ شعر کس کا ہے ؎

عزت و دولت آنی جانی
ہل مل جائے جیون جیون جاسے

ج۔ یہ شعر حفیظ میرٹھی کا ہے۔

---

**محمد سالم حسین کوثر۔ بانسپیڑیا۔ بنگال**

س۔ "بیسویں صدی" کے مکتبہ میں فنِ شاعری کی کوئی مستند کتاب ہو تو از راہِ کرم بتائیے۔ کیا قیمت ہے؟

ج۔ حضرت جوش ملسیانی کی تصنیف "آئینۂ اصلاح" فنِ شاعری پر قابلِ قدر کتاب ہے۔ یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی۔ اس کی قیمت پانچ روپے ہے اور ادارۂ "بیسویں صدی" سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

س۔ اکبر الٰہ آبادی کا کوئی مذہب پر شعر سنائیے۔

ج۔ برسوں فلاسفہ کی چناں و چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی!

---

**محمد اکبر۔ بحرین**

س۔ کیا بنک ڈرافٹ ارسال کرنے پر آپ انڈیا میں میرے گھر "بیسویں صدی" ارسال کر دیا کریں گے؟

ج۔ تعمیلِ ارشاد یقیناً ہوگی۔ آپ سالانہ قیمت بذریعہ پوسٹل آرڈر بھی بھیج سکتے ہیں۔

---

س۔ آپ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے جد و جہد کر کے میں نے کامیابی حاصل کی ہے۔ اس خوشی پر آپ کے لئے بہترین تحفہ کیا لاؤں؟

ج۔ آپ کی کامیابی ہمارے لئے سب سے بڑا تحفہ ہے!

س۔ آپ عورت کو بے وفا کہتے ہیں میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ لیکن ایک صاحب ایسے بھی ہیں جو روپے سے روپیہ کماتے ہیں اور عورت ہی کو بے وفا کہتے ہیں۔ ایسے انسان کو آپ کیا کہیں گے؟

ج۔ ننگِ انسان!

---

**کامریڈ جمیل الدین۔ نئی دہلی**

س۔ یہ شعر کس کا ہے ؎

دردِ اس دور کی تقدیر ہے لیکن اے دوست
صرف یک معرکۂ محنت و زر ہونے تک!

ج۔ یہ شعر محمد علی تاج کا ہے۔

---

**جمیل احمد۔ اعظم گڈھ**

س۔ غالب کب اور کہاں پیدا ہوئے تھے؟

ج۔ ۱۷۹۵ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔

---

**رجسٹریشن آف نیوز پیپر ایکٹ کے مطابق**

بیان بابت ملکیت و دیگر تفصیلات "بیسویں صدی" دہلی

(۱) مقامِ اشاعت :۔ دہلی (۲) وقفۂ اشاعت :۔ ماہوار (۳) پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر :۔ خوشتر گرامی۔ قومیت ہندوستانی پتہ :۔ دریا گنج دہلی (۴) ملکیت :۔ خوشتر گرامی

میں خوشتر گرامی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط خوشتر گرامی پبلشر

مورخہ یکم مارچ ۱۹۷۰ء

Regd. No. D. 100
Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 6[illegible]7


# BISWIN SADI

34th YEARS OF PUBLICATION

Telephones Office. 271637 Residence. 619927

Biswin Sadi
DELHI

اتنی بھی خود پسند نہ بن اے نگاہِ ناز
جیسے تجھے کسی سے کوئی واسطہ نہ ہو —— فارغ لکھنوی

فوٹو:۔ روشن لال وششٹ۔ جے پور

گذشتہ دنوں غالب اکیڈمی نظام الدین نئی دہلی میں شامِ غزل کے عنوان سے ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا۔ صدارت حضرت ساغر نظامی نے فرمائی مشاعرے میں ممتاز شعراء، ادباء اور عمائدینِ شہر شریک ہوئے۔ جنابِ زمین حسن نقوی انچارج غالب اکیڈمی نے غالب اکیڈمی اور شامِ غزل کے پروگرام کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔

غالب اکیڈمی نظام الدین نئی دہلی میں منعقدہ شامِ غزل کا افتتاح کرتے ہوئے جناب سید علی جواد زیدی نے "اردو غزل اور غالب" کے عنوان سے ایک پُر مغز مقالہ پڑھا۔

نامور شاعر حضرتِ عزیز وارثی نے اپنے رومانی کلام سے شامِ غزل کا آغاز کیا اور سامعین سے داد حاصل کی۔ آپ فرما رہے ہیں ؎

کچھ روپ نگر کا ذکر کرو، کچھ رنگ محل کی بات کرو  رنگین فضا ہے محفل کی، رنگین غزل کی بات کرو

ہے صبحِ بنارس روپ اُس کا، تو شامِ اودھ گیسو اُس کے  وہ میری غزل ہے میری غزل، تم میری غزل کی بات کرو

آنکھ مشتاقِ صنم ہو تو غزل ہوتی ہے  دِل کو بس اِک یہی غم ہو تو غزل ہوتی ہے

بے تکلف کبھی اپنے ہی رُخِ زیبا پر  زُلف اُس شوخ کی خم ہو تو غزل ہوتی ہے

حُسن مائل بہ کرم ہو تو سِتم ہوتا ہے  اور مائل بہ سِتم ہو تو غزل ہوتی ہے

شعر کی بزم میں اپنا تو یہ کہنا ہے عزیزؔ
اپنے محبوب کا غم ہو تو غزل ہوتی ہے

محترمہ مسعودہ حیات نے پہلے ایک قطعہ اور پھر ایک غزل پڑھی اور سامعین سے داد حاصل کی ؎

نظریں ملتے ہی یہ احساس ہوا تھا مجھ کو   تم جو مل جاؤ تو دل کا کوئی ارماں نکلے

تم نے بھی دردِ محبت کو نہ سمجھا لیکن   تم بھی اوروں کی طرح زخمِ رگِ جاں نکلے

★

جلوۂ حسن عجب کفر نما ہوتا ہے   آدمی جذبِ محبت میں خدا ہوتا ہے

زندگی عشق کی منزل کے سوا کچھ بھی نہیں   اس سے جو بچ کے نکلتا ہے فنا ہوتا ہے

دل کی رگ رگ میں کھٹکتے ہیں ہزاروں نشتر   بس محبت کا یہی ایک صلا ہوتا ہے

خلوتِ غم سے ہو مانوس نہ کیوں دل اپنا   خلوتِ غم میں کوئی نغمہ سرا ہوتا ہے

اب یہ سوچا ہے سُنا دیں انھیں افسانۂ دل   کچھ نہ کہنے سے تو غم اور سوا ہوتا ہے

یوں بھی ہوتی ہے کبھی پرسشِ احوالِ حیات

بھیگی آنکھوں سے ہر اک حرف ادا ہوتا ہے

جنابِ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ نے پہلے ایک نظم پڑھی پھر سامعین کے اِصرار پر اپنے مخصوص انداز میں یہ غزل سُنائی اور سُننے والوں سے خُوب داد حاصل کی ؎

ہر لحظہ مکیں دِل میں تری یاد رہے گی بستی یہ اُجڑنے پہ بھی آباد رہے گی

ہے ہستیٔ عاشق کا بھی اِتنا ہی فسانہ برباد تھی، برباد ہے، برباد رہے گی

ہر لمحہ نیا رنج ہے، ہر آن نیا درد "دُنیا یہی دُنیا ہے تو کیا یاد رہے گی"

ہے عشق وہ نعمت جو خریدی نہیں جاتی یہ شے ہے خُداداد خُداداد رہے گی

صیّاد کو معلوم نہ تھا راز یہ شاید یہ رُوح قفس میں بھی تو آزاد رہے گی

وہ زُلفِ پریشاں کا سنوارے نہ سنورنا

وہ اُن کے بگڑنے کی ادا یاد رہے گی

جلد — ۳۴
شمارہ — ۵
ٹیلیفون دفتر — ۲۷۱۶۳
ٹیلیفون رہائش — ۶۱۹۹۲

# تیر و نشتر

خوشتر گرامی

"دودھ کا پاؤڈر بنے گا" ایک خبر ——— یعنی جس طرح لوہے کی سیمنٹ کا کام چلتا ہے اسی طرح لوہے کی سیمنٹ سے دودھ بھی بنے گا۔

"ہندو سکھوں کا رشتہ اٹوٹ ہے" ایک عنوان ——— بشرطیکہ ہندو سکھ لیڈر ٹانگ نہ اڑائیں۔

"گجرات کی دستکاریوں کی نمائش" ——— جو پچھلے روز احمد آباد وغیرہ میں ہوئی۔

"چرن سنگھ اور کملا پتی ترپاٹھی میں اختلافات" ایک عنوان ——— کرسیوں کا جھگڑا۔

"چرن سنگھ وزارت مہنگائی روکنے میں ناکام" ایک عنوان ——— اس لئے کہ وزارت مہنگی پڑی ہے۔

"پنجاب — اکالی دل اصلی پارٹی کے نئے لیڈر پرکاش سنگھ بادل" ——— ہر جلسے میں خیر مقدمی ترانہ ہوگا۔ بادل آیا جھوم کے۔

"اندرا گھٹیا طریقے استعمال کر رہی ہے" مرارجی ڈیسائی ——— جی ہاں بہت گھٹیا ——— آپ سے وزارت خزانہ چھین لی۔

"بھارت سیوک سماج کے گھپلے" ایک عنوان ——— گھپلے میں سیر کا پاؤ ڈنگ۔

"دستور ہند نے ریاستوں کو مکمل خود مختاری کے حقوق دے رکھے ہیں" چوہان

• "بیروزگاری الاؤنس دیا جائے" ہندو مہاسبھا کا مطالبہ ــــــ ہم بھی سفارش کرتے ہیں۔ بیچاری ہندو مہاسبھا کے کارکن بیروزگار ہیں۔

---

• "بنگال کی حالت" ــــــ بلکہ حالتِ زار۔

---

• "پنجاب اسٹیٹ لاٹری کا تیرھواں ڈرا" ــــــ گورنام سنگھ وزارت کی شکست۔

---

• "اڑیسہ لنگر لنگوٹے کس رہا ہے" ایک خبر ــــــ اور دنگل شروع ہونے ہی والا ہے۔

---

• "اندرا سماج کی دشمن ہے" ایک عنوان ــــــ اور آپ اس کے ٹھیکیدار ہیں۔

---

• "انٹرمیڈیٹ پاس کئے بغیر بی۔ اے بنو۔ دلی میں نئی تجارت" ــــــ اس سے بھی اچھی تجارت نئی دلی میں ہوتی ہے۔ کچھ بھی نہ پڑھو لکھو اور لیڈر بنو۔

---

• "کراچی کے نائٹ کلب میں پاکستان کے سابق وزیر خارجہ مسٹر بھٹو کی پٹائی" ــــــ آئندہ الیکشن میں پیش آنے والے واقعات کی ریہرسل۔

---

• "دلی کارپوریشن میں جوت پیزار" ایک خبر ــــــ جن سنگھ کی سبھیتا کا شاندار مظاہرہ۔

---

• "کانپور میں کارپوریشن کے کندھوں پر انصاف اور جمہوریت کا جنازہ" ــــــ ایسی ہی ارتھی دلی کارپوریشن کے کندھوں پر بھی ہے۔

---

چھٹے پانچ سالہ پلان کا مسودہ تیار۔

• "دلّی میں خوب کی بڑھتی ہوئی کھپت": ایک خبر —— بڑھتی ہوئی سیاست کے ساتھ ساتھ۔

---

• "ایک سماجی مفسدے پر پابندی ہے" —— اور باہر غنڈہ گردی کی چھوٹ۔

---

• "سرمایہ ہی ساری بُرائیوں کی جڑ ہے": ایک عنوان —— اور سرمایہ جمع کرنے والے سرمایہ داروں کا درخت۔

---

• "اُردو کے لئے رومن رسم الخط اختیار کیا جائے": انجمن ترقی اُردو دہلی کے جلسے میں دانیال لطیفی کا مقالہ —— جو غالب اکیڈمی میں پڑھا گیا اور پڑوس میں مزارِ غالب میں مرزا کی روح تڑپتی رہی۔

---

• "ایک روپے کی کتاب پر ایک روپیہ تیس پیسے محصول ڈاک": ایک عنوان —— ہندوستان میں علم کے فروغ اور ادب کی سرپرستی کا نرالا ڈھنگ۔

---

• "حوضِ خاص میں رہزنی": ایک خبر —— کیا پانی لُٹ گیا؟

---

• "سونی پت میں طلبا کی غنڈہ گردی" —— جو کسی صورت سونی نہیں پڑتی۔

---

• "بھارت میں جمہوریت دم توڑ رہی ہے": جے پرکاش نرائن —— جمہوریت دم نہیں توڑ رہی، جمہوریت کے منہ توڑے جا رہے ہیں۔

---

• "برما میں اذان دینے والی مرغی": ایک خبر —— وہاں کے مرغے انڈا دیتے ہوں گے۔

---

بنگال میں صدر راج کا نفاذ۔

"ریل گاڑیوں کو نقصان پہنچانے والوں کو سزائے موت" ایک خبر ——— اور جن لوگوں کو ریل گاڑیوں سے نقصان پہنچے گا اُن کو بغیر سزا کے موت۔

"طریقۂ تعلیم کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے" ایک عنوان ——— طلبا خود تبدیل کر رہے ہیں۔ کتابیں لے کر گھر سے چلتے ہیں۔ کالج پہنچتے ہیں۔ ہڑتالوں اور جلوسوں میں شریک ہو جاتے ہیں اور پتھراؤ کرتے ہیں۔ اُستادوں کی پگڑیاں اُچھالتے ہیں۔

"ایک گوشت خور قبیلہ جو انڈا کھانا پاپ سمجھتا ہے" ایک خبر ——— یعنی گُڑ کھاتا ہے گلگلوں سے پرہیز کرتا ہے۔

"پبلک سیکٹر کے کارخانے میں چوری" ایک خبر ——— پبلک کے ہاتھوں۔
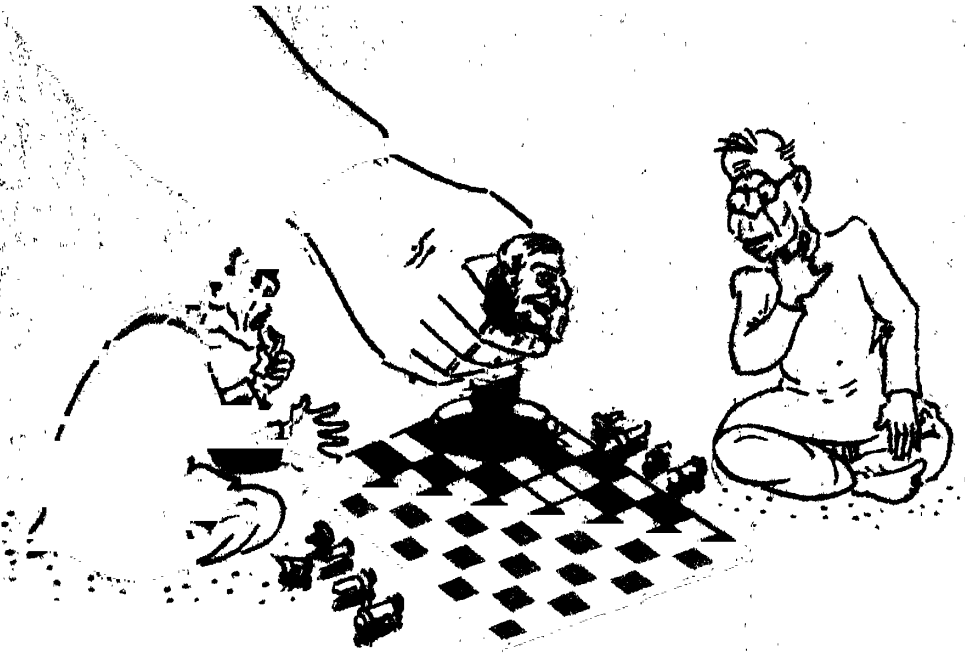
"مہمانوں پر کنٹرول سے متعلقہ آرڈر صرف کاغذ پر" ایک عنوان ——— اچھا ہوا مہمان بھی کاغذ پر ہی آئیں گے جنہیں تو تانتا ہی لگا رہتا۔

"کانگریس جلد اتر پردیش سرکار میں شامل ہو جائے گی" ایک خبر ——— نیک کام میں دیر کیوں۔ ایک درجن کو تو وزارتیں مل ہی جائیں گی۔

"اِندرا کی کوٹھی پر سوورنکاروں کا مظاہرہ" ——— کہ آپ زیور کیوں نہیں پہنتیں۔

"راجستھان اسمبلی میں ہنگامہ" ——— وہ اسمبلی ہی کیا ہے جس میں ہنگامہ نہ ہوتا ہو۔ اب تو
ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

"ٹیکسوں کی وجہ سے دقت" ایک عنوان ——— تو آپ کا خیال تھا کہ ٹیکسوں سے راحت ہوگی؟

---

"نئے ٹیکسوں اور مہنگائی کے خلاف مہم شروع کی جائے گی" جن سنگھ کا اعلان ——— اور اس کا انجام: ٹائیں ٹائیں فش۔

---

"نئی دلّی میں ٹرک ٹائروں میں بلیک" ایک خبر ——— اور چاندنی چوک میں وہ جگہ بتائیں جہاں بلیک نہیں۔

---

"اردو کے لئے دیوناگری رسم الخط" ایک اعلان ——— تاکہ اُردو کا سہارا تیر کرنا بھی ہو جائے۔

---

"دلّی کارپوریشن کے اجلاس میں مکھیوں، مچھروں کے مسئلہ پر بحث" ایک عنوان ——— انسانوں کے تمام مسئلے حل کرنے کے بعد۔

---

"ایک سو دس برس کی عمر میں شادی" ایک خبر ——— اور زبان پر حفیظ جالندھری کا نعرہ

ابھی تو میں جوان ہوں

---

"مرکز اور ریاستوں میں کشمکش" ایک عنوان ——— جمہوریت کے کرشمے ہیں پیارے۔

---

"کرپشن کی انتہا، پانچ پانچ سال کے بچے ٹھیکیدار" ایک خبر ——— اب بچوں کو آواز دو کہ

آؤ بچو تمہیں دکھائیں جھانکی ہندوستان کی

---

دو سرخیاں ———

وناسپتی کی نایابی

پارلیمنٹ کے ایک ممبر کی آپ بیتی

——— آپ بیتی کی کتاب کا نام وناسپتی کی نایابی رکھا ہے۔

---

کیرالا کی حکومت کو گرانے کی مارکسی کوششیں ناکام۔

# سویٹ ہارٹ

کرشن چندر ایم۔ اے

دی لیشن ہیرالڈ - سینٹ فرانسس ایوینیو شانتا کروز ویسٹ بمبئی ۵۴

برادرم! تسلیم و آداب

آپ کے منیجر صاحب کے خط سے آپ کی علالت کا حال معلوم ہو کر باعثِ تشویش ہوا، جب اُس کے ایک عرصہ بعد تک آپ کا خط نہیں ملا۔ پھر آپ کا ٹیلی فون پر ڈکٹیٹ کیا ہوا خط ملا۔ میں اِس عرصے میں گھر بدلنے میں مصروف ہو گیا۔ نیا پتہ نوٹ فرمائیں ——— میری صحت پہلے سے بہتر ہے۔ گو ابھی افسانہ، ناول لکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ابھی کچھ دن اور مزاحیہ سکاحیہ خاکوں اور انشائیوں سے دل بہلاؤں ——— آپ کی مکمل صحت یابی کے خط کا انتظار رہے گا۔

مخلص ——— کرشن چندر

سیر و سیاحت ایک مشغلہ ہے۔ ایک فیشن ہے۔ ایک انڈسٹری ہے۔ ایک ضرورت ہے۔ لیکن جو لوگ سیر و سیاحت کو کہیں نہیں جاتے یا نہیں جا سکتے۔ اُن کے لئے دردِ سر بھی ہے۔ میرا ایک دوست ہے۔ بے تکلف جانی جگری دوست ہے۔ سُکھ بھوشن اُس کا نام ہے۔ سیر و سیاحت اُس کا کام ہے۔ سال میں چار پانچ مہینے وہ پہاڑوں کی سیر و سیاحت میں مشغول رہتا ہے۔ اکیلا آدمی ہے۔ نہ بیوی نہ بچے۔ سگرٹ بنانے والی ایک چھوٹی سی فیکٹری کا مالک ہے۔ نہ کوئی فکر ہے نہ فاقہ۔ اور اپنا یہ حال ہے کہ سال میں ایک ہفتے کی چھٹی بھی لے لیں تو سمجھ میں نہیں آتا وقت کیسے کٹے۔ تاش کا مجھے شوق نہیں۔ پہاڑوں پر بیوی بچوں کو ساتھ لے جانے کے لئے پیسہ نہیں۔ البتہ کبھی کبھی آٹھ دس دنوں کے لئے اپنے گاؤں ہو آتا ہوں۔ جہاں میرے ماں باپ رہتے ہیں۔ بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے جاتا ہوں۔ صاف ہوا ملتی ہے۔ ہرے بھرے کھیتوں کی فضا ملتی ہے۔ قریب کی دھیرا ندی میں جب چاہو نہاؤ۔ جتنا جی چاہے تیرو۔ کوئی منع کرنے والا نہیں۔ بھیڑ بکریوں کے گلّے۔ چرواہوں کی بنسی کی دلدوز پکار۔ مجھے تو اپنے گاؤں جا کر اپنے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کرنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ بیوی بچے کُڑھتے رہتے ہیں کہ میں اُنہیں کسی پہاڑ پر کیوں نہیں لے جاتا۔ لیکن فیملی بجٹ کا معاملہ اُن کی سمجھ میں اب آنے لگا ہے۔ اس لئے وہ بھی اب کُڑھ کُڑھ کر چُپ ہو جاتے ہیں اور دوسرے لوگوں سے پہاڑی مقامات کی رومانی داستانیں سُن سُن کر رشک و حسد سے جلتے رہتے ہیں۔ کُڑھتا تو میں بھی ہوں۔ لیکن کیا کروں۔ میرا گاؤں کسی طرح ہل سٹیشن نہیں کہلا سکتا۔ پہاڑ تو کیا وہاں ایک ٹیلا تک نہیں ہے۔ نہ جھیل۔ نہ فوارہ نہ کوئی آبشار۔ اُس کا نام بھی عجیب سا ہے "کدو بھیڑا" اب کسی سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اب کے چھٹیوں میں کدو بھیڑا گئے تھے۔ کدو بھیڑا کسی ہل سٹیشن کا نام نہیں ہو سکتا۔ نام ہوتے ہیں۔ نینی تال۔ کوڈائی کنال۔ گلمرگ۔ سون مرگ۔ پہلگام۔ شملہ۔ منالی۔ دارجلنگ۔ نام سنتے ہی آنکھوں میں نشہ سا چھانے لگتا ہے۔ روح میں سرور سا آنے لگتا ہے۔ اِس لئے میں کسی سے نہیں کہتا کہ میں چھٹیوں میں کدو بھیڑا گیا تھا۔ بس کہتا ہوں اپنے گاؤں گیا تھا۔ اپنے ماں باپ سے ملنے۔ پھر میں اپنے ہیڈ کلرک سے سوال کرتا ہوں اور آپ کہاں گئے تھے، مسٹر ستیہ پال؟

"نینی تال!" ستیہ پال فخر سے جواب دیتا ہے۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ نینی تال کی تعریف میں صرف ہوتا ہے۔ یاٹ کلب اور سوئیس ہوٹل۔ چائنا پیک۔ جھیل کی سیر۔ ڈانڈی کی سواری۔ پھولوں بھری وادیاں کاٹھگو[illegible]

کی تعطیلوں میں ایک امریکی چھوکری سے میرا تعارف ہوا تھا۔ وہ نینی تال کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہری تھی، ساتھ کے کمرے ہی میں ٹھہرا تھا۔ میں اُسے پُل کے نیچے مندر کی آرتی سُنانے لے گیا۔ شام کا جھٹپٹا۔ شنکھ اور آرتی کی ملی جُلی آوازیں اور قریب کی جھاڑیوں میں چنبیلی کے پھول اُس کے نازک لبوں کے تبسّم کی طرح چمک رہے تھے۔ واپسی میں چڑھائی چڑھتے ہوئے وہ لڑکھڑا سی گئی تھی اور اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میں اُسے سہارا دے کر چڑھائی کے اوپر پُل پر لیتا آیا تھا۔ پُل کے دوسرے کنارے ایک چشمے پہ پہاڑی عورتیں اپنے گھڑے بھرتی ہوئی کوئی پہاڑی گیت گنگنا رہی تھیں اُس دلربا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ اور اُس کی شفاف جھیل ایسی نیلی آنکھوں میں ستارے ناچ رہے تھے۔ رات کو ڈنر کے لئے اُس نے مجھے اپنے کمرے میں آنے کی دعوت دی۔ بیٹلز کے گوگو ریکارڈ کی دُھن پر ہم دونوں ناچتے رہے اور مارٹینی پیتے رہے۔ پیتے رہے اور ایک دوسرے کے قریب آتے رہے۔ رسیلے ہونٹ مُسکراتے رہے ——— باہر چھٹکی ہوئی چاندنی سنہری تھی ——— اور اُس رُومانی فضا سے ہم مسحُور ہوتے گئے ——— اور ....“

ستیہ پال چُپ ہو گیا۔ اور میری سانس گہری ہوتی گئی۔ مُنہ سے پہلے ایک آہ نکلی۔ پھر ایک کراہ نکلی....

”تم نے چھُٹیاں کہاں گزاریں؟“ ستیہ پال مُجھ سے پُوچھنے لگا۔

”میں اپنے گاؤں گیا تھا“ میں نے اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔ تاکہ وہ میری آنکھوں کے آنسو نہ دیکھ سکے۔ میں نے ہولے سے اپنے قریب بیٹھے ہوئے سیکشن آفیسر سے پوچھا ”آپ کہاں گئے تھے؟“

سیکشن آفیسر بولا۔ ”میں منالی گیا تھا۔ وہاں سے کُلو چلا گیا دسہرے کا میلہ دیکھنے کے لئے۔ کُلو کا میلہ دیکھنے کی چیز ہے۔ گُل پوش وادی کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ برف کی ٹوپیاں پہنے ہوئے۔ پہاڑی گوری ڈوگرہ لباس پہنے ہوئے اور غزالی آنکھوں والی، گلاب کی پتّی ایسے رخساروں والی دلرُبا لڑکیوں کا رقص، اور دھیلو شراب۔ خوشبُودار چاول سے کشید کی گئی لوکل شراب جس سے پہاڑی لڑکیوں کے پُرشباب بدن کی خوشبُو آتی ہے اور ڈھائی ہزار سال پُرانے مندروں میں تھالیاں لے کر پھُولوں سے بال سجائے رنگین پُوجا کے لئے جاتی ہوئی، اکیلی دوپہر میں شفاف کہستانی ندّی میں پاؤں کاٹتے مجھے ایک دوشیزہ مل گئی۔ جو اپنی گود میں ایک خوب صورت میمنے کے ریشمی بالوں میں اُنگلیاں پھیر رہی تھی میں نے اُس سے کہا....“

میں نے یکایک اُس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”معاف کیجیے گا۔ مجھے بے ضروری کاغذات لے کر سُپرنٹنڈنٹ کے پاس جانا ہے۔“

میں یونہی ایک غیر ضروری سی فائیل اُٹھا کر باتھ روم میں چلا گیا۔ فائیل ایک طرف رکھ کر میں نے قریب کے واش بیسن کے نل کو کھول کر اپنا چہرہ دھویا اور اپنی آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا۔

یہ لوگ کتنے خُوش قسمت ہیں۔ کتنے لکی ہیں۔ ہر سال سیر کو نکل جاتے ہیں اور اپنی قسمت میں لکھا ہے کُرتو پھیرا!! نہ جانے کس طرح یہ لوگ ہر سال کسی پہاڑ پہ جانے کے لئے اپنی تنخواہ میں سے رقم بچا لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ بھی میری ہی طرح بیوی بچّوں والے ہیں اور ایک میں ہوں اُلّو! جو کبھی نہیں گیا کُلو!

واپسی پہ جی نہیں چاہتا تھا کہ اپنی میز پہ جاؤں۔ اُس سیکشن آفیسر سے مڈبھیڑ ہو گی اور ابھی اُس کی داستان ختم نہیں ہوئی تھی۔ سیکشن آفیسر سے مُنہ پھیر لوں گا تو ستیہ پال نینی تال کے قصّے سُنائے گا۔ اِس لئے میں اُن دونوں سے بچنے کے لئے دوسرے سیکشن میں گھُس گیا۔ وہاں ایک میز پہ مجمع لگا ہوا تھا بہت سے کلرک اور سیکشن آفیسر کھڑے تھے۔ مسٹر داؤد سینئر سپرنٹنڈنٹ سے اُس کے گُل مرگ جانے کی داستان سُن رہے تھے۔ جو بیوی بچّوں کو چھوڑ کر اکیلا گُل مرگ گیا تھا۔

”پہاڑ پہ جانا ہو اور چند دن لُطف سے گزارنے ہوں تو بیوی بچّوں کو ساتھ لے جانا حماقت ہے۔ میں صرف بیس دن کے لئے گُل مرگ گیا تھا اور نیڈوز میں ٹھہرا تھا ———“ داؤد بیان کر رہا تھا۔ اور سب کلرک اور ہیڈ کلرک اور سیکشن آفیسر حیرت زدہ ہو کر اُس کی داستان سُن رہے تھے۔ گُل مرگ کی سرکلر روڈ۔ گُل مرگ کا گاف کلب۔ الپتھر کی جھیل۔ گُل مرگ اور ٹن مرگ کے درمیان دیوداروں کے حسین جنگل! ایک ایک منظر وہ ایسی دلکشی سے بیان کر رہا تھا کہ جی چاہتا تھا اُس کا گلا گھونٹ دوں۔ وہ کہنے لگا ——— پھر نیڈوز میں ایک مصری کیبرے گرل سے مُلاقات ہو گئی۔ اُس کا نام لیلےٰ تھا اور وہ اُس کا مجنوں تھا۔ زیتونی شفاف رنگت۔ ایشیائی نزاکت اور مصری دلربائی آنکھیں ایسی کٹیلی کہ بنگال جینہ کے جادو کو بھی مات کریں۔ دن میں شباب کی شُنہ زور ندی چڑھی تھی اور گُل مرگ کی حرارت پھُولوں سی چھڑی تھی۔ راتیں لیلےٰ کی سُنہری بانہوں کی گداز محبت میں گزرتی تھیں اور دن کو میں ٹن مرگ جاتا تھا۔ جہاں ایک کشمیری حسینہ جس کا نام فیروزہ تھا اخروٹوں کے جُھنڈ تلے میرا انتظار کرتی تھی ایک دن کیا ہوا ———“

میں اِس سے آگے نہ سن سکا۔ اپنی میز پہ واپس آ گیا اور گُل بھوشن کی فائیل دیکھنے لگا۔ جس میں اُس نے سکریٹریٹ کو ٹریننگ جانے کی اجازت طلب کی تھی اور ٹریننگ کی اتھارٹی کے زور پر سرکار سے دولا کر کا قرضہ مانگا تھا۔ میں فوراً

اس کی فائیل پڑھتا رہا۔ ایک بار پڑھی۔ دو بار پڑھی۔ سہ بار پڑھی۔ اتنے میں دفتر سے جانے کا وقت ہو گیا۔ ورنہ چوتھی بار بھی پڑھتا۔ کیونکہ میں کسی طرح نینی تال سنکو اور گل مرگ کے اور قصے سننے کی تاب نہ رکھتا تھا۔

گھر گیا تو کل بھوشن اپنی کار لئے کھڑا تھا۔ وہ اپنی فائیل کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے مجھے شام کی چائے اور کھانے کے لئے "دی بلو ہیون" میں مدعو کر لیا۔ بیوی سے اجازت لے کر میں اس کے ساتھ "دی بلو ہیون" چلا گیا۔ وہاں اس نے مجھ سے سکریٹری کو بڑھانے کے سلسلے میں اور مزید قرضہ لینے کے سلسلے میں چند ضروری سوالات کئے اور جب ان کا تسلی بخش جواب اسے مل گیا، تو اس نے اپنے دارجیلنگ جانے کی داستان چھیڑی —— سفید بادلوں کے مرغولوں سے ابھرتا ہوا کنچن جنگا کی برف پوش چوٹی اور نیچے دھند میں گھری وادیوں کے نیم شفاف سینے اور سہ پہر ڈھلنے کے بعد غروبِ آفتاب کے دل افروز منظر کی ایسی تصویر کھینچی کہ میرا دل اس وقت کنچن جنگا جانے کے لئے بے تاب ہونے لگا۔

وہ کہہ رہا تھا —— "بھوٹیا عورتوں کا حسن۔ بلاشبہ آریائی خد و خال سے مختلف ہوتا ہے۔ لیکن ان کی اپنی شانِ دلربائی ہے۔ کمان کی نوک تک کھنچی ہوئی نیم باز آنکھوں کی گہرائی ہوئی کیفیت دل کو گرویدہ بنا لیتی ہے۔ وہاں مجھے ایک بھوٹیا لڑکی ملی۔ ایک تبتی حسینہ اور پھر ایک بنگالی حسینہ امیتا گھوش جس کے بال اس کے ٹخنوں تک آتے تھے اور جو رویندر سنگیت شام کی حسین تنہائی میں پھولوں کے ایک کنج میں بیٹھے ہوئے ....."

میں دیر تک کل بھوشن کے رومان اور مردانگی کی داستانیں سنتا رہا۔ کوئی ہل اسٹیشن ایسا نہ تھا جہاں وہ گیا نہ تھا۔ جہاں اسے کوئی نہ کوئی حسین لڑکی نہ ملی تھی۔ میں نے اس لئے بھی اس کی باتیں غور سے سنیں کہ اس نے مجھے "دی بلو ہیون" میں کھانے کی دعوت دی تھی۔ جہاں ایک آدمی کا بل پچاس روپے سے کم کا نہیں ہوتا ہے اور پھر اس نے مجھے اپنی فائیل آگے بڑھانے کے لئے تین سو روپے بھی دئے تھے۔ جس سے میرے بڑے لڑکے کے کالج کی فیس دی جا سکتی تھی۔ اس لئے میں غور سے اس کی داستانیں سنتا رہا اور کڑھتا رہا اور جلتا رہا۔

چند دنوں کے بعد میں اپنے دوست پرمیش پکھورا سے ملنے گیا۔ جو سیلز ٹیکس ڈیپارٹمنٹ میں سیکشن آفیسر ہے۔ باتوں باتوں میں میں نے اس سے ذکر کیا۔ "تم کیا کسی ہل اسٹیشن گئے ہو؟"

وہ بولا۔ "ارے کبھی دو وقت کی روٹی اور بچوں کی فیس نکل جائے اس تنخواہ میں سے تو بہت ہے۔ ہل اسٹیشن کا نام لے کر میرا جی برا کیوں کرتے ہو!"

"پھر یہ ستیہ پال اور داؤد صاحب نینی تال اور سنکو اور گل مرگ کیسے ہو آتے ہیں؟"

"کون ستیہ پال؟" پرمیش پکھورا ایک دم بھڑک کر بولا۔ "تمہارے دفتر والا؟"

"ہاں۔ ہاں۔ وہی!"

"گزشتہ چھٹیوں میں وہ تو اپنے گوردھرا میں تھا۔ ہم دونوں نے چھٹیاں ساتھ ساتھ گزاریں، کیونکہ ہم دونوں گوردھرا کے رہنے والے ہیں اور اتفاق سے ہم دونوں نے چند دنوں کے وقفے سے ایک ہی وقت میں چھٹی لی تھی اور داؤد بے چارہ تو ناڈیاد کی تنگ سیلی گلی بدبودار گلیوں میں زندگی گزار رہا تھا۔ کیونکہ مجھے ایک ضروری کام سے گوردھرا سے ناڈیاد جانا پڑا تھا۔ ایک ہفتے کے لئے گیا تھا اور داؤد ہی کے ہاں مہمان ٹھہرا تھا۔"

پرمیش پکھورا زور زور سے ہنسنے لگا۔ یکایک سارا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا۔

دوسرے سال دس دن کے بجائے میں نے ایک ماہ کی چھٹی لی اور بیوی بچوں کو لے کر اپنے گاؤں کھیڑا چلا گیا۔ وہاں آرام سے تیس دن رہ کر جو لوٹ کے دفتر لوٹا تو دفتر میں میری لمبی چھٹی کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں۔ کیونکہ جب سے میں دفتر میں ملازم ہوا تھا۔ میں نے کبھی ہفتے یا دس دن سے زیادہ کی چھٹی نہیں لی تھی۔ اس دوران میں ستیہ پال اوٹاکنڈ سے واپس آ چکا تھا۔ اور داؤد نے تین ہفتے شملے میں گزارے تھے اور میرا جانی جگری دوست کھنہ منڈی تک ہو آیا تھا اور نیپالی حسن کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ مجھے دفتر میں آتے دیکھ کر لوگ میرے گرد جمع ہو گئے۔ "اتنی لمبی چھٹی کیوں لی تم نے؟"

میں نے کہا۔ "میرے چچا کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ لاولد مرے۔ اس لئے کریا کرم مجھے کرنا پڑا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" ایک سیکشن آفیسر بولا۔ "لیکن ایک ماہ کیا کرتے رہے؟"

میں نے آہستہ سے اور مکمل بے پروائی سے جواب دیا۔ "پیرس چلا گیا تھا۔"

"پیرس؟" ایک دم بہت سے کلرک اور سیکشن آفیسر اور دوسرے لوگ چیخ پڑے۔ "تم ایک دم پیرس کیسے پہنچ گئے ——؟"

میں نے کہا۔ "مرتے ہوئے چچا نے اپنی وصیت میں ساری جائیداد میرے نام چھوڑی۔ بینک میں تیس ہزار روپیہ بھی تھا۔ میں اسے نکلوا کے

[illegible] پیرس ہو آگیا" شیبا کو ابھی تک یقین نہ آ رہا تھا۔ وہ مشتبہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"پیرس میں تم نے کیا دیکھا ۔۔۔؟"

اب میرے شروع ہونے کی باری تھی۔ ایک سال سے میں اِس لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ پچھلا ایک ماہ میں نے اپنے گاؤں کندوکمیرا میں کندو کمانے اور پیرس کے متعلق ہر طرح کا لٹریچر پڑھنے اور اُس کی تصویریں دیکھنے میں صرف کیا تھا۔ پیرس کا نقشہ مجھے اپنی ہتھیلی کی طرح نظر آ رہا تھا۔

"سب سے پہلے تو میں نے نالیز برژرے دیکھا" میں کہنے لگا۔

بہترین عریاں کیبرے۔ کیا عورتیں ہیں۔ کیا سجاوٹ ہے کیا جسم ہیں اُن کے جیسے گلابی مخمل! ہاتھ پھیرو تو پھسلتا ہی جائے۔ پھر لیڈو کا نائیٹ کلب دیکھا۔ وہ نالیز برژرے سے بھی زیادہ پسند آیا۔ اور ایفل ٹاور کا تو جواب نہیں ہے اور بے سیل۔ ناتر دیم اور لوور۔ لیڈو میں ایک سپینی حسینہ سے ملاقات ہوئی۔ چاندنی راتوں میں ہم دریائے سین میں کشتی چلاتے تھے۔ پیار کے آداب تو کوئی سپینی حسینائیں ہی جانتی ہیں۔ تیز شراب۔ حدت آفریں جذبے کی گرمی سے لبریز۔ ہاتھ چھونے سے جسم میں بجلی دوڑنے لگتی ہے۔ آہ سوزنا ..... تجھے کبھی بھول نہ سکوں گا....

"کیا وہ پیرس میں رہتی ہے ۔۔۔؟" داؤد نے بیزار ہو کر پوچھا۔

"نہیں میری طرح وہ بھی پیرس کی سیر کرنے آئی تھی۔ دراصل وہ مکمل سپینی نہیں ہے۔ لاطینی اور سپینی حسن کا امتزاج ہے۔ ریو ڈی جینرو میں رہتی ہے۔ اُس کا شوہر کروڑپتی ہے۔ بہت بڑا بزنس ہے اُس کا۔ کافی کے باغات ہیں اور نہ جانے کیا کیا.... مگر وہ مجھ سے بے حد محبت کرنے لگی ہے میری سوزنا۔ سویٹ ہارٹ ......"

میں سینے پہ ہاتھ رکھ کر خاموش ہو گیا۔

"تو کیا وہ ہندوستان آنے والی ہے؟" داؤد نے جل کر پوچھا۔

"نہیں..... اگلے سال میں ریو ڈی جینرو جاؤں گا۔ اُس نے مجھے بلایا ہے.... ریو..... او..... ریو......"

میں خوابوں میں کھو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجمع چھٹ چکا تھا۔ ہر شخص سر جھکائے اپنی ٹیبل پہ کام کر رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ چور نگاہوں سے مجھے دیکھ لیتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے سینے سے ایک آہ نکل جاتی تھی۔

اُس دن کے بعد کسی نے مجھ سے اپنی سیر و سیاحت کا تذکرہ نہیں کیا۔

# غزل

ناظم رضوی ایم۔ اے۔ بی ایڈ۔ ایل ایل بی

وہ غزال آب کبھی اگر اپنے ختن سے آئے — پھر وہی بوئے وفا میرے چمن سے آئے

دشتِ غربت کے اُفق پر اُبھر آئے ہیں نجوم — کئی دلدار سے خط آج وطن سے آئے

اے صبا میرے شبستاں کی طرف بھی آنا — تو جو مل کر کبھی اُس لالہ بدن سے آئے

ہم کو فرصت نہ ملی اپنے ہی غم سے ورنہ — کئی جھونکے تری زلفوں کے چمن سے آئے

فخر آباد کی یہ بزم بہت سونی ہے — پھر کوئی انجمن گنگ و جمن سے آئے

کوئی بے پردہ اُسی طرز سے پھر ہو ناظم

پھر قیامت اُسی اندازِ کہن سے آئے

# غزل

ڈاکٹر زیدی جعفر رضا ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ (علیگ)

ایک مدت پہ ملی ہیں آنکھیں — جانے کیا پوچھ رہی ہیں آنکھیں

کاش سایہ ہی گزرتا کوئی — راہ میں کب سے بچھی ہیں آنکھیں

ڈگمگاتے ہیں نگاہوں کے قدم — نشے میں ڈوب گئی ہیں آنکھیں

فاصلے اتنے زیادہ بھی نہیں — کس لیے بھیگ چلی ہیں آنکھیں

مجھ پہ مائل بہ کرم ہے کوئی — میری جانب بھی اٹھی ہیں آنکھیں

دل ہے اِک شہرِ غزالاں جعفر

دل میں ہر سمت بچھی ہیں آنکھیں

# فاصلے

ڈاکٹر حامدی کاشمیری ایم۔اے پی ایچ ڈی

۲۹۶۔جواہر نگر۔سری نگر کشمیر

محترم بھائی خوشتر صاحب! آداب

اِس بار آپ سے دہلی میں مختصر سی ملاقات رہی۔ آپ علالت کے باعث کمزور نظر آرہے تھے لیکن یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ نقاہت کے باوجود آپ اُردو زبان و ادب کی خدمت کا انتھک جذبہ رکھتے ہیں۔ بمبئی میں اُردو کنونشن کے موقع پر آپ کا بہت انتظار رہا۔ آپ ہوتے تو شاید کچھ ٹھوس اور نتیجہ خیز اقدامات پر توجہ کی جاتی۔ بہرحال، اُردو کنونشن سے محبانِ اُردو کو مایوسی ہوئی ہے۔ ایک عظیم زبان کو اپنے تہذیبی ورثے کے ساتھ موت کے گھاٹ اُتارا جارہا ہے، اِس سے بڑھ کر اِس عہد کا اور کون سا المیہ ہو سکتا ہے؟ —— سری نگر پہنچتے ہی بیٹی صبا بیمار ہوئی۔ اُسے ہائی فیور ہوا۔ اِسی لئے افسانہ میں تاخیر ہوئی۔ اُمید ہے آپ محسوس نہ کریں گے۔ لیجئے افسانہ حاضر ہے، پڑھئے اور اپنی رائے گرامی لکھئے —— بمبئی میں ہم نے بہت اچھا وقت گزارا۔ وہاں کے کاروباری اور مشینی ماحول میں بھی ہمیں جو خلوص اور محبت ملی، اُس سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں —— سری نگر میں ابھی تک خلافِ معمول سردی قابلِ برداشت ہے۔ دیکھئے موسم کا یہ رنگ کب تک رہے۔ آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

آپ کا بھائی —— حامدی کاشمیری

مسز مہیش کو کل شام پہلی بار دیکھ کر مجھے عجیب سا محسوس ہوا۔ وہ قُلی سے چند پیسوں کے لئے تکرار کر رہی تھیں، جو اُن کا مختصر سا سامان —— ایک چھوٹا سا ہولڈال اور ایک چمڑے کا بیگ اُن کے پہلے سے ریزرو کئے برتھ پر رکھ چکا تھا۔ میں سامنے والے مقابل کے برتھ پر مختصر سا بستر بچھائے پاؤں پسارے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ وہ ایک لمبے قد کی عورت تھی، بھرا بھرا صحت مند جسم، سانولی رنگت، بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے، گول چہرے پر نسوانی حیا کا کوئی شائبہ بھی نہ تھا، بیاہتا عورت ہوگی اور عمر تیس سے تجاوز کر چکی ہوگی۔ عورت کا شباب ڈھلنے لگتا ہے تو اُس کے چہرے پر حیا کی آب و تاب ماند پڑتی ہے، اور پھر —— پھر اُس کے پاس کیا رہ جاتا ہے؟ لیکن پھر بھی میرے جسم میں ایک ریشمی سرسراہٹ سی دوڑ گئی۔ دو راتوں اور ایک —— دن کی طویل اور تھکا دینے والی مسافت میں وہ میری ہمسفر تھیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ سارے کمپارٹمنٹ میں خوشبو کی ایک لہر پھیل رہی ہے۔

اور —— اور اِس وقت جبکہ ٹرین تاریکی کے ویرانوں کو چیرتی ہوئی بھاگی جارہی ہے۔ پورے کمپارٹمنٹ پر خاموشی چھاگئی ہے، اور مدھم سی نیلی روشنی میں مسز مہیش کی بوجھل کالی پلکیں جھک گئی ہیں۔ اُن کے گھنے بال کھلے ہیں، بالوں کا سیاہ آبشار تکیے سے پھسلتا جارہا ہے، اُن کے چہرے پر نیند کا سکون ہلکورے لے رہا ہے۔ سانسوں کے زیر و بم سے اُن کے موٹے ہونٹوں پر خفیف سا ارتعاش ہے۔ کتنی پیاری معلوم ہو رہی ہیں وہ!

نیند کی لہروں پر وہ راج ہنس کی طرح بہہ رہی ہیں، لیکن میں —— ٹرین کی چھک چھک، چھک چھک میرے لئے عذابِ جاں سے کم نہیں۔

مجھے نیند کیوں نہیں آرہی ہے؟
میرا بدن کیوں جل رہا ہے الاؤ کی طرح؟
اُن کے چہرے کا سکون گہرا ہو رہا ہے اور زندگی بھر کی تھکن غائب
ہو رہی ہے، اُن کا ذہنی انتشار ——— اُن کی باتیں ———
میرے ذہن میں اُتھل پتھل ہو رہی ہے۔

'کتنی شامیں ہم نے جوہو پر ساتھ گزاری ہیں ——— اُن کا چہرہ بول رہا تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ریت، سمندر کی خنک شریر ہوائیں، ہم دونوں گھنٹوں بیٹھتے اور رات گئے تک روشنیوں کے سائے میں باتیں کرتے، مجھے آنند بہت پسند تھا۔ ملٹری میں پندرہ سال سروس کی، پھر بھی وہ سینے میں شاعر کا دل رکھتا تھا، اور ہمیشہ خواب دیکھتا تھا۔ ہمارا ایک سجا سجایا گھر ہوگا، اور اُچھلتے کودتے شریر بچے ——— اور میں اس کے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ دیتی ——— بھولا سا آدمی۔ اور جب وہ میجر بن کر کشمیر گیا، بہاروں کے دیش میں، تو وہ واپس نہ آیا۔ جاتے ہوئے میرین ڈرائیو میں رات گئے اس نے مجھ سے بے حد پیار سے کہا تھا، وہ مجھے جلد کشمیر بلائے گا، اور پھر وہاں پھولوں کی وادیوں میں ——— لیکن خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں، اور یہ جیتی جاگتی زندگی ——— میں انتظار کرتے کرتے تھک گئی، میرا جسم مُرجھانے لگا ———'

مسز مہیش کے چہرے پر گہرے سائے رینگ رہے تھے اور آواز بھاری ہو رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی پیاری سی، دل کو موہ لینے والی کہانی سن رہا ہوں۔ دادی اماں تھپکیاں دینے والی آواز میں کہانی سنا رہی ہے، بہاروں کے دیس کے شہزادے کی کہانی! اچانک کہانی میں ایک نیا موڑ آگیا ——— شہزادہ کالے پتھر میں تبدیل ہو چکا تھا، اور پری بال بکھرائے جنگل جنگل گھوم رہی تھی۔

'مہیش ہمارے گھر آتا رہتا تھا۔ وہ نیوی میں آفیسر تھا۔ جب بھی ڈیڈی گھر پر پارٹی دیتے تو مہیش کو ضرور بلاتے۔ بڑا گھرانا تھا ہمارا۔ فوجی آفیسر، شاعر، گورنمنٹ منسٹر ہمارے گھر آتے رہتے۔ عجیب رونق رہتی تھی۔ لیکن جب سے ڈیڈی اپنے فیلوز سے کنارہ کش ہوئے، ہمارا گھر شمشان کی طرح خاموش ہے۔ وقت گزرتا ہے اور زندگی کا سارا حسن اور ہنگامہ ختم ہو جاتا ہے ———' اس نے ایک لمبی سانس لی۔ 'مہیش پر کئی لڑکیاں جان چھڑکتی تھیں۔ اس کا گٹھا ہوا جسم، چمکتی ہوئی بے داغ وردی، سڈول اور تیکھے نقوش، اس کی رواں انگریزی اور بیرونی ملکوں کی معلومات ——— وہ ہیرو کی طرح چھا جاتا، لیکن ——— لیکن مجھے مہیش سے ہمیشہ نفرت رہی تھی، نہ جانے کیوں۔ شاید اس کی لمبی لمبی مونچھیں اور گول چہرے میں اندر کو دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی، ہر وقت مسکراتی ہوئی آنکھیں مجھے اچھی نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن مہیش کی کوششیں جاری رہیں۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی بہانے سے مجھ سے بات کرنے کا موقع نکال لیتا، لیکن میں نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔'

'بہت اُداس سی شام تھی وہ ——— مسز مہیش کے [illegible] پسینے کی ننھی سی بوندیں کانپ رہی تھیں۔ 'تنہائی کا اژدہا [illegible] رہا تھا۔ میں تنہائی سے ہمیشہ بھاگتی ہوں۔ اچانک مہیش آگیا اور [illegible] کرسمس کی رات کو پارٹی پر لے گیا۔ میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ ایک نئی دُنیا تھی ——— ڈرنک، ڈانس، گلیمر، قہقہے، چھیڑ چھاڑ ——— نیوی کا ہر آفیسر دُلہن جیسی عورتوں کے جھرمٹ میں اندر راجہ بنا تھا! اور پھر اس رات میں گھر نہ لوٹ سکی۔ میرے قدم ڈگمگا گئے، اور پھر ——— ایک مہینے کے اندر اندر مہیش سے میری شادی ہو گئی ——— اور وہ مجھے دہلی لے گیا ———

'تو کیا وہ دہلی میں رہتا تھا؟'

'جی ہاں۔ اس کا وطن دہلی ہے، وہاں بہت ہی خوبصورت گھر ہے، بے حد خوبصورت! جہاں فارن ملکوں کے نادر اور قیمتی نمونے جمع ہیں۔ آپ گھر آئیں گے، تو ہمارے ڈرائنگ روم کو دیکھ کر حیران ہوں گے ———'

'میں؟'

'ہاں ہاں کیوں نہیں؟ آپ کو دہلی میں صرف ایک ہی دن رُکنا ہے۔ ہمارے گھر ٹھہریں گے، وہ بھی آپ ہی کا گھر ہے ———'

میں ان کے خلوص سے پگھل کر رہ گیا!

ٹرین رُک گئی تھی۔ ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ ساتھ بیٹھے ہوئے سردار صاحب اُونگھتے ہوئے اسٹیشن پر اترے۔ میں نے دو کوکا کولا منگوائے اور ہم دونوں سپ کرتے رہے۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ طویل اور اُکتا دینے والا سفر اتنا پُرلطف کٹ جائے گا۔

مسز مہیش کی شخصیت میں کتنی جاذبیت تھی۔ وہ برابر دھیرے دھیرے بول رہی تھیں، اور میں اُن کی باتوں میں کھو گیا تھا ——— میری زندگی کتنی سپاٹ اور بے رنگ ہے، کوئی ایسا واقعہ نہیں جو میں اُسے مزے لے کر سناتا۔ اتنا تو میں صبح کو ساتھ ہی چائے پیتے ہوئے کہہ چکا تھا کہ بزنس کے سلسلے میں میرا دہلی کے راستے بمبئی آنا جانا رہتا ہے، اور اس بار بمبئی میں کئی [illegible] دُکانداروں سے رقم وصول کرنے گیا تھا۔ یہ لوگ بڑے خود غرض اور [illegible]

مال ہے، لیکن اداسیوں کی فکر نہیں ——— میں کہنا چاہتا تھا کہ میری زندگی ایک مشین بن گئی ہے۔ دن رات کام، فائلوں کے انبار، ماتحتوں سے چک چک۔ انکم ٹیکس کے جھگڑے۔ یہاں تک کہ ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آتا جب ———

'آپ اندازہ نہیں کر سکتے میجر صاحب! میری زندگی کتنی ویران ہے ——— کتنی ویران ——— 'ان کا گلا رندھ گیا اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

'میں نے دو تین بار خودکشی کرنی چاہی، لیکن ——— لیکن میری قسمت ہی پھوٹی ہے، موت بھی میری قسمت میں نہیں ———'

میں حیران تھا، چپ چاپ!

مسز مہیش کے جسم پر تھرتھری سی طاری ہو گئی تھی۔

'زندگی کی ساری آسائشیں مجھے میسر ہیں۔ ایک خوبصورت گھر، نوکر چاکر، بنک بیلنس، لیکن ان چیزوں کو دل کی شانتی سے کیا تعلق ہے؟'

'لیکن مہیش صاحب؟'

'وہ مجھ سے اب بھی پیار کرتا ہے، لیکن ———'

'لیکن کیا؟'

'میں اس سے اب بھی نفرت کرتی ہوں۔'

'نفرت؟'

'ہاں ہاں نفرت! اور جب سے وہ روم گیا ہے، میرے دل کو قدرے سکون ہے ———'

'کب لوٹ رہے ہیں وہ؟'

'مجھے کیا معلوم؟ شاید کبھی نہیں! بھگوان کرے وہ کبھی لوٹ کر نہ آسکے؟'

'ایسا نہ کہیے مسز مہیش!'

وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ ایک پیلی سی بے جان مسکراہٹ!

'دسمبر کی پندرہ تاریخ تھی ——— 'وہ یادوں میں ڈوب کر بولیں۔ 'فضا بے حد سرد تھی اور میں ویٹنگ روم میں مہیش کے انتظار میں بے حال ہو رہی تھی۔ وہ دو سال کے بعد لوٹ رہا تھا، اور میں پھیلے ہوئے بے رحم سمندر کو کوس رہی تھی۔ یہ دو سال میں نے بہت بے چینی میں گزارے تھے، اور جب وہ آیا تو سفید وردی میں اس کا قد اور نکل آیا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا میرے پاس آیا اور آتے ہی اس نے پیار سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے، اور میں شکایتوں کا دفتر کھولنے ہی والی تھی کہ مہیش نے بدلی ہوئی آواز میں کہا ——— ان سے ملو، ورجینیا ———'

ورجینیا ——— ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے جسم کو چیر کر نکل گئی۔ ایک سال پہلے مہیش کے ایک دوست نے کہا تھا کہ اس نے روم میں ایک سیلز گرل ورجینیا سے شادی کر لی ہے، اور جواب میں میں نے صرف ایک قہقہہ لگایا تھا۔

ورجینیا میرے سامنے تھی ——— سگریٹ پیتی شوخ چہکتی ہوئی لڑکی!

مہیش دوستوں کے ہجوم میں گم تھا۔

اور میں ——— ایک کٹی ہوئی شاخ کی طرح خاک میں مل گئی تھی، اور لوگ مجھے پاؤں تلے روندتے ہوئے گزر رہے تھے۔ میں کراہ بھی نہ سکتی تھی۔'

وہ باہر بھاگتے ہوئے خشک ویرانوں کو دیکھ رہی تھیں۔

شام ہو رہی تھی۔

سامنے کے برتھ پر ایک ہپی سولہ گھنٹے سونے کے بعد اب آلتی پالتی مار کر چھوٹے سے ستار پر بے ترتیب سُر بین لگا رہا تھا۔

وہ باتھ روم سے منہ ہاتھ دھو کر آئی تھیں۔ ان کے چہرے پر تازگی آگئی تھی۔ پھول دار ریشمی ساڑی میں ان کے بھرے بھرے جسم کے خطوط نمایاں تھے۔ ان کے بھرے بھرے گداز بازو! ملائم صاف جلد! لمبی انگلیاں ———

ان کے جسم کی کشش میں جادو تھا!

اور اس وقت رات کی خاموشی میں، مدھم سی نیلی روشنی میں بے خبر لیٹے ہوئے ان کے جسم کی کشش دوبالا ہو گئی تھی۔

خمدار ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست، اور ہونٹوں کے اوپر ہلکا سا سبزۂ خط!

کمپارٹمنٹ میں خاموشی تھی، گہری خاموشی ———!

ٹرین مدھم رفتار سے رات کے سینے پر سے سرک رہی تھی۔

میری پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔

چاروں طرف دھند کے پہاڑ کھڑے تھے۔ دور دور کہیں گھنے درختوں میں بجلی کے بلب جھانک رہے تھے، راستہ لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ ٹیکسی فراٹے بھر رہی تھی، ہر طرف سناٹا تھا اور اندھیرا ہی اندھیرا ——— پہاڑوں کا ایک ویران سلسلہ ——— ٹیڑھے میڑھے راستے ——— ہم دونوں چپ تھے!

ٹیکسی رک گئی۔

سامنے ایک خوبصورت بنگلہ تھا۔

اور دوسرے لمحے میں ایک خوبصورت ڈرائنگ روم میں تھا ———

رنگین دیواریں، منقش الماریوں میں آرٹ کے قدیم نادر نمونے، سونے چاندی اور ہاتھی دانت کی قیمتی چیزیں، لیمپ، پھولدان، رنگین شیشے کی آرائشی چیزیں،

پھت سے لٹکتے ہوئے جگمگاتے فانوس، اخروٹ کی لکڑی کے ٹیبل پر مرمر کا
تا ہوا نسوانی مجسمہ ——— اور مسز مہیش مسرور و شاداں، ایک ایک چیز کی
معلومات بیان کر رہی تھیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں کہانیوں کا شہزادہ
ہوں اور شہزادی کے محل میں سحر زدہ کھڑا ہوں۔

تھوڑی دیر میں میں نے گرم پانی سے غسل کیا۔ میری ساری تھکن
دھل گئی، میرا جسم اور دماغ تازہ ہو گیا، اور میں جیسے حقیقی دنیا میں
پہنچ گیا۔

اس کے بعد ڈائننگ ٹیبل پر ہم نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ ایک معمر
ملازم نے ٹیبل پر کھانا چن دیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد میں بیڈ روم میں گیا۔
سبز روشنی میں نہایا ہوا کمرہ آسودگی، نفاست، خواب اور راحت کا گہوارہ
نظر آ رہا تھا۔ کھڑکیوں پر سبز پردے آویزاں تھے۔

میں نے نظر اٹھائی، اور میری حیرانی کی حد نہ رہی۔ سامنے بیڈ پر
مسز مہیش ہلکے نیلے رنگ کے مہین ریشمی نائٹ گاؤن میں لیٹی تھیں۔ دروازہ
بند تھا، اور وہاں کوئی اور نہ تھا ——— وہاں کوئی اور نہ تھا۔ میری
سانسیں رکنے لگیں اور رگ رگ میں آگ دوڑنے لگی۔ میں ان کے سامنے
کھڑا تھا، اور وہ بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔

انھوں نے اپنے عریاں بازو کھول دیے۔

ان کی آنکھوں سے مستی پھوٹ رہی تھی۔

ان کے گلابی ہونٹ کانپ رہے تھے۔

اور پھر ———

ایک جھٹکے کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔

صبح کی خنک روشنی نمودار ہو رہی تھی۔

سرد ہوا برچھی کی طرح جسم کو کاٹ رہی تھی۔ میرے پاؤں سن ہو کر
رہ گئے تھے۔

میں نے دیکھا سامنے کا برتھ خالی تھا ——— ایک دم خالی!

نیچے دو سیٹوں پر دو نئے مسافر کمبل اوڑھے بیٹھے تھے۔

مسز مہیش ———؟

میری سانس گلے میں اٹک گئی۔

میں نے دیکھا میرے سرہانے رکھی اٹیچی، جس میں میرا سارا اثاثہ تھا،
غائب تھی!!

اٹیچی کہاں گئی؟

یہ سب کیا ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

میں ایک پاگل کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

سامنے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے سیاہ فام مریل انسان نے مجھ پر ایک کراہت
آمیز نظر ڈالی، اور پھر سکڑا ہوا منہ کمبل میں چھپا لیا۔

میرا سر تری طرح چکرا رہا تھا، اور شدید [illegible]

## غزل

پروفیسر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء ———

زندگی سازگار بھی تو نہیں
کوئی راہِ فرار بھی تو نہیں

زندگی نے ہمیں جو بخشے ہیں
اُن غموں کا شمار بھی تو نہیں

آگ دل کی بجھے تو کیسے بجھے
چشمِ غم اشکبار بھی تو نہیں

کوئی پھر کس طرح کرم فرماتے
حالِ دل آشکار بھی تو نہیں

گُل سمیٹیں کہاں کہ دامن میں
ایک ہلکا سا تار بھی تو نہیں

اپنے زخموں ہی پر ذرا ہنس لیں
اس قدر اختیار بھی تو نہیں

اعترافِ جفا تو دور رہا
وہ نظر شرمسار بھی تو نہیں

کیا ہو منشاؔ یقینِ فصلِ بہار
روئے گُل پر نکھار بھی تو نہیں

# کھلی آنکھوں کا کرب

ـــــ رام لعل

آر۔۳۹/۳ ملٹی اسٹوریز، چارباغ، لکھنؤ نمبر ۱

مکرمی مدیر صاحب، آداب

امید ہے اب آپ کی صحت پہلے سے بہتر ہوگی۔ آپ کے گذشتہ خط سے اندازہ ہوا کہ آپ کا سلسلہ ہمارے افسانے بھی رک سکتا ہے۔ آپ کی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ایک افسانہ ارسال ہے۔ بعض قارئین "بیسویں صدی" کا کالم ہی مطالعہ رہتا ہے۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتاتا ہم لکھنے والے اگر بیمار پڑ جائیں تو ہمیں اطلاع کیسے ہوگا؟ کبھی کبھی تو کسی قاری کا خط بے حد Sickly ہوتا ہے....

آپ کا مخلص ـــــ رام لعل

اپنی چھوٹی بہن شگفتا کے جس خط کا میں ذکر کرنے والا ہوں، وہ مجھے اس وقت ملا جب میرے یہاں کئی دانشور جمع تھے۔ ایک بہت ہی اہم موضوع پر مباحثہ ہو رہا تھا۔ ریحانہ عظمت اپنا نقطۂ نظر پیش کر چکی تھی۔ اس کی باتوں کو رد کرنے کے لئے میں نے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ لیکن اسی وقت میرے سامنے ڈاک لاکر رکھ دی گئی۔ میں اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں ڈاک کی طرف متوجہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ڈاک کو ایک طرف رکھتے رکھتے میری نظر شگفتا کے خط پر جا پڑی جسے ایک نظر دیکھے بغیر میں نہ رہ سکا۔ مجھے یاد ہے جب میں اس کا خط پڑھ رہا تھا ریحانہ عظمت اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھی۔ شگفتا نے لکھا تھا ـــــ

"بھیا! آج میں لٹ گئی۔ میں نے جو سپنا دیکھا تھا، وہ ٹوٹ گیا۔ میرے اتنا ہی کہہ دینے سے تم پوری بات کا اندازہ نہ کر سکو گے کہ دراصل کیا ہوا! میں ایک لفظ اور بڑھا دوں ـــــ ترپھلڑی! تو کیا تم سمجھ جاؤ گے! میرا خیال ہے تب بھی نہ سمجھ پاؤ گے۔ لیکن اتنا تو ضرور سوچ لو گے کہ کوئی بہت بڑی مصیبت ہم لوگوں پر آپڑی ہے۔ لیکن ہم سب لوگ خیریت سے ہیں۔ یعنی پاپا، ممی، رنجو، منّو، کریمہ اور دھیرو۔ اس ترپھلڑی سے متاثر ہونے والی اکیلی میں ہی ہوں۔ میں اور کنال (جس کا نام بھی لیتے ہوئے کلیجہ منہ کو آ رہا ہے) اب تم سمجھ گئے ہوگے! لیکن تمہیں پوری بات بتاؤں گی، جبھی تم میرے دکھ کا احساس کر سکو گے۔

کل ہم لوگ جھیل پر پکنک منانے گئے تھے۔ کنال کے اور میرے علاوہ کچھ لوگ اور بھی تھے۔ وہ سب جو اکثر ہم دونوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ کچھ کو تو تم بھی جانتے ہو۔ پچھلی بار تم ہمارے کلب میں آئے تھے نا، جب میری درخواست پر تم نے میرے ایک کانفرنس فرینڈ کی پینٹنگز کی نمائش کا اناگوریشن کیا تھا۔ اس موقع پر جتنے لوگ جمع تھے وہ سب ہماری کل کی پکنک میں شامل تھے۔

ہم لوگ سائیکلوں پر روانہ ہوئے۔ دو تین اسکوٹر بھی تھے۔ جھیل پر جاکر پہلے تو ہم نے چائے بنا کر پی۔ پھر میوزک شروع ہو گیا۔ جس میں وہ وہ ہڑبونگ مچی کہ توبہ بھلی۔ یقین تو آپ کو بھی ہوگا! تم سوچ رہے ہوگے میں تو ترپھلڑی کی وجہ سے اتنی اداس ہوں، بوجھ تلے دبی ہوئی ہوں۔ اتنی لمبی کہانی کیوں لے بیٹھی! تم اگر واقعی یہی سوچ رہے ہو تو یہ غلط ہوگا۔ میں اس واقعے کو لکھنے سے اب گھبرا رہی ہوں۔ ادھر ادھر کی باتیں کر کے حقیقت سے فرار حاصل کر رہی ہوں۔ کاش ایسا ہو سکتا کہ وہ واقعہ کبھی نہ لکھتی!

[illegible] ہوش ہی نہ آیا ہوتا۔ کاش! کاش! لیکن یہ [illegible] ہو کر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُنا اور اُسے اپنے اوپر اِس طرح بیتتے ہوئے محسوس کیا جیسے نرم و نازک دھرتی کے سینے پر سے اچانک کئی ٹن وزنی کوئی بھاری ٹرک گزر جائے! ٹرک نہیں کل نذر! اور اُس کے بوجھ سے دھرتی کا سینہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے! بس سمجھ لو میرا وہی حال ہوا ہے! لیکن پھر بھی میں اپنے اوپر قابو پا کر تمھیں اتنی تفصیل سے لکھتی جا رہی ہوں۔

لیکن اپنے اوپر قابو مجھے کل تک بالکل نہ تھا۔ کل تو میں بے اختیار روتی اور چیختی رہی تھی۔ ایک دو بار تو بے ہوش بھی ہو گئی۔ جیسے ہی میں نے سُنا جھیل میں تیرتے ہوئے کنال اچانک ڈوب گیا تو میں اسٹوو کو جلتا ہوا چھوڑ کر جھیل کی طرف بھاگ پڑی۔ لیکن کچھ لوگوں نے مجھے راستے میں ہی پکڑ لیا۔

پھر میں نے کنال کی لاش دیکھی۔ اُسے ریت پر اوندھا لٹا دیا گیا تھا۔ اُس کے منہ، ناک اور کانوں سے پانی نکل رہا تھا۔ اُسے پانی سے باہر نکالنے سے پہلے ہی اُس کی موت کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ یہ رویہ کتنا بے رحمانہ تھا! لیکن ایک گھنٹہ تک پانی کے اندر پڑا رہ کر کون زندہ رہ سکتا تھا! اُس کے گھر والے بھی آ گئے تھے۔ ہمارے پاپا اور ممی بھی۔ اُس کے بعد سے میں کنال کو نہ دیکھ سکی۔ اِس وقت نو بجے ہیں۔ اِس وقت کنال کی لاش چتا پر رکھی جا چکی ہو گی۔ پاپا وہیں گئے ہوئے ہیں۔ میرا دل بے اختیار ڈوب رہا ہے۔ آہ میں کتنی ابھاگی ہوں! ہو سکتا ہے کچھ لوگ مجھے منحوس بھی کہیں! انھیں کون روک سکتا ہے! اور اِس میں جھوٹ ہی کیا ہے! جس کا منگیتر شادی سے پہلے ہی چل بسے، ضرور میرا دوش ہو گا! اُسے میں اتنا کیوں چاہتی تھی! تمھیں یہ سب لکھتے ہوئے میں نے کچھ سکون پانے کی اُمید کی تھی۔ لیکن جی اور بھر آیا ہے۔ جی چاہتا ہے خط لکھنا روک کر رونے بیٹھ جاؤں۔ لیکن کل سے اِتنی بار رو چکی ہوں کہ لگتا ہے میرے پاس اب ایک بھی آنسو نہیں بچا ہے۔ لیکن رونے کو جی چاہتا ہے پھر بھی! کیا تم میری کیفیت کا اندازہ کر رہے ہو کہ میں کتنی دکھی ہوں؟ بھیا میں اِس شہر ہی کو اب چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔ یہاں رہ کر میں زندہ نہ رہ سکوں گی! یہ بالکل ناممکن ہو گا! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم یہاں آ کر مجھے اپنے ساتھ [illegible] میں ممی اور پاپا سے مشورہ کئے بغیر کر رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے وہ میری اِس تجویز پر چونک اٹھیں گے۔ وہ کبھی نہ چاہیں گے کہ میں چنڈی گڑھ چھوڑ کر تمھارے ساتھ رہنے کے لئے لکھنؤ چلی جاؤں۔ جہاں تم بالکل تنہا رہتے ہو اور اپنے ہاتھ سے [illegible] پوری دنیا کے معاملے میں بے پروا ہو۔ کبھی وقت پر گھر نہیں لوٹتے، کبھی وقت پر کھانا نہیں کھاتے۔ ممی اور پاپا کو یہ سب معلوم ہے۔ اِس وجہ سے وہ کبھی نہ چاہیں گے کہ میں تمھارے ساتھ رہنے کے لئے لکھنؤ چلی جاؤں۔ لیکن بھیا میرے سامنے اِس جہنم سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ صرف تم ہی ایک سہارا ہو۔ مجھے آ کر لے جاؤ فوراً!

تمھاری چھوٹی بہن

شکنتلا

میں خط میں اِتنا کھو گیا تھا کہ یاد ہی نہ رہا کہ میرے ارد گرد کتنے سارے لوگ بیٹھے ہیں۔ دانشور۔ مدن ملہوترا، فرید عشرت، فضیل کیانی، ہربنس راج سنگھ، قدوسیہ افتخار، شمسی لسوڑ، کالی چرن گھوش، سنتوش مصرا وغیرہ۔ وہ سب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ریاض عظمت اپنی بات کبھی کی ختم کر چکی تھی۔ میں نے چونک کر اُن سب سے معافی مانگی۔ خط تہہ کر کے ایک طرف رکھ دیا اور خود کچھ بولنے کی بجائے فرید عشرت سے کہا۔

"آپ ہی کچھ کہیے۔"

میٹنگ جلد ہی ختم ہو گئی۔ وہ سب چلے گئے۔ صرف مدن ملہوترا ہی میرے پاس رہ گیا۔ اُسے زیادہ دور نہیں جانا تھا۔ میرے فلیٹ کے قریب ہی ایک اور فلیٹ میں رہتا تھا۔ اُسے واپس جانے کی جلدی نہ تھی۔ اُس دن اُس نے مجھے لنچ پر بھی مدعو کر رکھا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ہی لے کر وہاں سے جاتا۔

میں نے ڈبے سے دو سگار نکالے۔ ایک اُسے دیا، دوسرا خود سُلگایا اور اُس سے اجازت چاہی — "یار مدن، مجھے اجازت دو، خط ایک بار پھر پڑھ لوں۔ شکنتلا کا ہے۔ بہت ہی دلدوز!"

یہ کہتے کہتے مجھے اچانک یاد آیا شکنتلا سے دو تین سال پہلے بہت محبت کرتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ شکنتلا اُس کی طرف مائل نہ تھی۔ پاپا [illegible] نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے شکنتلا کے لئے ایک دوسرے لڑکے کا انتخاب کیا تھا جو [illegible] بزنس کے ساتھ وابستہ تھا، پبلک منیجمنٹ کے ساتھ۔ وہ کنال تھا۔ کنال سے

شگفتہ کی شادی کا سب سے بہتر سپنا تھا لیکن اُس کا مستقبل اب کہاں تھا اس دُنیا میں کہیں کھو گئی ہو۔ ادھر جانے کیوں خط پڑھنے کی بجائے اچانک میں نے ممی کے ہاتھ میں دے دیا — "آپ پڑھیں"

ممی نے خط لے لیا۔ کرسی میں قریب کر کے بیٹھ گیا۔ پڑھتے پڑھتے اپنے اندر ڈوبتا سا چلا گیا۔ میں اُن کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا شگفتہ نے شکالی کی بجائے سری طیوترا کا انتخاب کیا ہوتا تو اب تک اُن کی شادی ہو گئی ہوتی۔ شاید وہ ایک دو بچوں کی ماں بھی بن چکی ہوتی۔ ممی اب پڑھتے پڑھتے گمبھیر تھا۔ ابھی تک اُس نے شادی نہیں کی تھی۔

ممی نے خط پڑھ کر مجھے دے دیا۔ میں گم سُم سا میرے شیلف میں بھری ہوئی کتابوں کی طرف دیکھنے لگا۔

کچھ دیر بعد ہم وہاں سے اٹھ کر اُن کے گھر چلے گئے۔ اُس کی ممی اور دو بہنیں کھانے پر ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ کھانا بہت لذیذ بنا تھا۔ ہم کھانے ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ شگفتہ کے بارے میں وہاں کسی سے بھی کچھ نہ کہا۔ نہ میں نے، نہ ممی ہی نے۔ اُس کی بہنیں کھانے کی تعریفیں سن سن کر چہکتی رہیں۔ زیادہ سے زیادہ کھلانے پر اصرار کرتی رہیں۔ ہمیں بھی بہت لطف آیا۔

میں اگلی روز چنڈی گڑھ کے لئے روانہ ہو گیا۔ شگفتہ کے خط نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں اُس کے پاس فوراً پہنچ جاؤں اور ممکن ہو سکے تو اُسے اپنے ساتھ لے آؤں۔ میری سب بہنوں میں وہی میرے بہت قریب تھی۔ اُسی نے میرے لکھنے اور مطالعے کے شوق میں کافی دلچسپی دکھائی تھی۔ ایسا ایک بار بھی نہ ہوا تھا کہ اُس نے پاپا کی ہمنوائی میں میرے لٹریری کیریئر کا ایک بار بھی مذاق اُڑایا ہو یا مجھ سے بیزاری کا اظہار کیا ہو۔ کرونا میری بڑی بہن تھی۔ مجھ سے دو سال بڑی۔ لیکن ہمیں ایک دوسرے سے کوئی بھی لگاؤ نہ تھا۔ اُس کی شادی ہوئی جب بھی میں چنڈی گڑھ نہیں گیا تھا۔ اب وہ گوا میں ہے اپنے شوہر کے ساتھ۔ اُس نے مجھے کبھی خط نہیں لکھا۔ گھر میں ایسے ہی کئی اور لوگ بھی تھے۔ لیکن شگفتہ کی طرح کوئی بھی نہ تھا۔ اُس نے بہت باقاعدگی سے مجھے خط لکھے تھے۔ میرے تحریر کے بارے میں اپنی رائے دیتی رہتی تھی۔ جہاں کہیں میری کوئی چیز پڑھ لیتی۔ عام طور پر میں صرف اُسی کو اپنی کتابیں بھیجا کرتا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر میں خوش ہوتا رہا کہ وہ میرے ساتھ رہنے لگی تو میرے چھوٹے سے گھر کی دیکھ بھال بھی کیا کرے گی۔ میری کتابیں بہت قرینے سے شیلفوں میں سجا سجا کر رکھا کرے گی۔ مسودے تیار کرنے میں بھی مدد دے سکتی ہے۔ خط و کتابت میں بھی۔ اس معاملے میں میں کتنا کاہل ہوں۔ اُسے یہ سب سکھا دوں گا۔ وہ بہت اچھی سکریٹری ثابت ہو سکتی ہے۔ اُس کا خرچ میں آسانی سے برداشت کر لوں گا۔ وہ کھانا بنانے میں بھی بہت ماہر ہے۔ اُس کی ساری خصوصیات کا مجھے علم ہے۔ جب وہ میرے ساتھ رہنے لگی تو میں گھر واپس آنے کے معاملے میں بھی بہت باقاعدہ ہو جاؤں گا۔ جب میرے گھر میں میری اتنی اچھی بہن ہاؤس کیپر بن کر رہے گی تو میں ٹھیک وقت پر گھر کیوں نہ لوٹوں گا!

یہ وعدہ میں اپنے آپ ہی سے نہیں، عالم خیال میں شگفتہ کے ساتھ بھی کر رہا تھا جب اُس کے سامنے یہ بات نکلے گی کہ دہرہ دون چلو گی تو وہ کتنی خوش ہو اٹھے گی! فوراً میرے ساتھ چل پڑنے کے لئے تیار ہو جائے گی۔ پاپا ممی رضامند نہ ہوں گے جب بھی وہ چلی آئے گی۔ اُن سے لڑ جھگڑ کر! اپنے گھر میں صرف ہم ہی دو ضدی مشہور ہیں۔ ضدی اور باغی!

مجھے انبالہ اسٹیشن پر گاڑی بدلنی تھی۔ پونے تین بجے میں چنڈی گڑھ جانے والی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ٹی اسٹال پر گیا۔ جب چائے پی رہا تھا اچانک میری نظر ویٹنگ روم کے دروازے میں کھڑی ہوئی ایک لڑکی پر پڑی۔ وہ اخبار والے کو بلانے کے لئے باہر نکلی تھی۔ اُسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ یقین نہ آیا وہ شگفتہ کیسے ہو سکتی ہے؟ لیکن وہ وہی تھی۔ سو فیصدی وہی! میں جلدی سے چائے کا پیالہ ادھورا چھوڑ کر کودتا پھاندتا دوسرے پلیٹ فارم پر جا پہنچا جہاں ویٹنگ روم تھا۔ وہ اخبار لے کر اندر جا چکی تھی۔ میں اُس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ مسکرانے لگا۔

مجھے دیکھ کر وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر بولی — "بھیا میں نے خط لکھنے کے بعد تمہیں ایک تار بھی دے دیا تھا کہ میں خود آ رہی ہوں تمہارے پاس۔ شاید وہ تار نہیں ملا تمہیں؟ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو لیکن چنڈی گڑھ میں نہ رہوں گی! میں نے پاپا سے صاف صاف کہہ دیا۔ پہلے تو وہ بہت بگڑے۔ پھر اسٹیشن پر چلی آئی تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آ گئے۔ کچھ روپے بھی دے گئے۔ اگرچہ بہت دُکھی دل سے سی آف کیا۔ لیکن بھیا اب یہیں سے واپس ہو لو۔ چنڈی گڑھ جا کر کیا کرو گے؟ میں واپس جانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ تم جانتے ہو وہاں رہتے ہوئے اب مجھے کتنی گھبراہٹ ہو رہی تھی!"

میں نے اُسے دلاسہ دیا۔ "ہم واپس نہ جائیں گے۔ تم اطمینان رکھو۔ میں تمہیں لے ہی جانے کے لئے آیا ہوں۔ تم یہیں مل گئی ہو تو میں چنڈی گڑھ جا کر کیا کروں گا! لیکن یہاں سے پاپا کو ایک ٹیلیگرام ضرور دے دیں کہ تم مجھے مل گئی ہو تاکہ انہیں بھی اطمینان ہو جائے۔"

شگفتہ کے چہرے پر جذباتی صدمے کی گہری چھاپ تھی۔ چند ہی دنوں

[illegible] آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے [illegible]
[illegible] اور بال بہت سلیقے سے
[illegible] شگفتہ ہی نظر آئی۔

[illegible] کنگال کے بارے میں زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہ دیا۔ کہیں
[illegible] کنگال کو اس نے واقعی جی جان سے چاہا تھا۔ اگرچہ وہ بالکل
مختلف مزاج کا واقع ہوا تھا۔ مجھے یقین ہے شگفتا سے وہ بہت مختلف تھا۔ کبھی
کبھی [illegible] مزاج اور ذوق سے بالکل مختلف آدمی کو بھی شدت سے چاہنے
لگتے ہیں۔ [illegible] پھر کب کسی دوسرے آدمی میں اتنی دلچسپی لے سکے اسے
بھی [illegible] نہیں۔ لیکن میں اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنے کے لئے تیار تھا۔ میری
[illegible] دنیا میں اس کا من بہلانے کے لئے بہت کچھ تھا۔

واپسی کے لئے ہم نے دہلی کا راستہ اختیار کیا۔ انبالے ہمیں صبح سویرے
ایک بس مل گئی جس نے ہمیں تین گھنٹے میں دہلی پہنچا دیا۔ میرا ارادہ تھا دن بھر
دہلی میں گھومیں گے۔ کچھ لوگوں سے ملیں گے۔ اس سے بھی شگفتا کو نارمل ہونے میں
مدد ملے گی۔ لیکن وہ دہلی میں رکنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ بولی۔ "یہاں میں نے
کنگال کے ساتھ بہت جذباتی وقت گزارا تھا۔ جہاں جہاں بھی جاؤں گی وہ مجھے
بے اختیار یاد آئے گا۔ تم نہیں جانتے بھیا ہم گزشتہ چھبیس جنوری کے جشن کے
بہانے آگئے تھے۔ پورا ایک ہفتہ گھومتے ہوئے گزارا تھا۔ اب تم مجھے جلدی
سے لکھنؤ لے چلو۔ یہاں سے دور!"

ہم نے کالکا میل پکڑ لی۔ کانپور ہو کر ہم سات بجے تک لکھنؤ پہنچ سکتے
تھے۔ اگرچہ میں بہت تھکا ہوا تھا۔ گزشتہ ساری رات گاڑی میں جاگتا ہوا آیا تھا۔
شگفتا کی بھی یہی کیفیت تھی۔ گاڑی میں جاتے ہی ہم سو گئے۔ کئی گھنٹے لگاتار سوتے۔
کانپور کے قریب ہی جاگے۔ گہری نیند نے شگفتا کو کافی بشاش بنا دیا تھا۔ اس کے
چہرے پر ایک تازگی دکھائی دینے لگی۔

دوسری گاڑی کے انتظار میں ہم تھوڑی دیر کے لئے ریستوران میں
چلے گئے۔ وہاں ہم نے کافی پی۔ وہیں سے میں نے لکھنؤ فون بھی کیا۔ مدن کو بتا دیا
ہم سات بجے تک وہاں پہنچ جائیں گے۔

جب گاڑی لکھنؤ اسٹیشن پر پہنچی اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔
[illegible] تھا۔ ہال میں [illegible] ہوئے [illegible]
[illegible] پر موجود تھا۔ شگفتا ایک کونے میں [illegible]
[illegible] گئی۔ اسے معلوم نہ تھا وہ لکھنؤ میں [illegible]
اسے کچھ نہ بتایا تھا۔

مدن آگے بڑھ کر اس سے ملا۔ چہرے کا [illegible]
کے گھر چل پڑے۔ پتہ نہیں کیوں اچانک ہی مجھے ایک عجیب سے
احساس نے [illegible] کہ مدن اس سے بہت محبت کرتا تھا اور [illegible]
تھی اگر کوئی بھی بات ہوا تو [illegible] دونوں [illegible]
احساس کی کوئی ایک سرحد نہیں ہے۔ جس کے آگے کوئی جا ہی نہ سکے [illegible]
دل تو اپنے دشمن سے بھی دور رہا۔ کبھی کبھی [illegible]
تک پہنچانے کی خواہش اس کے اندر ایک [illegible] بھی [illegible]

میں کھڑے کھڑے دونوں کو دیکھتا رہا۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے
کھڑے تھے۔ دم بخود، کھلی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ کون کیا
سوچ رہا ہے؟ کون کیا کہنا چاہتا ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ ان میں کسی
ایک کو بھی نہیں! ان کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ بہت دھیرے دھیرے۔ کچھ
دیر بعد مدن اس پر چھاتا تانتے ہوئے اس کے ساتھ باہر کی طرف چل پڑا۔
میں نے انہیں پل کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے دیکھا۔ پھر [illegible] سے باہر
جاتے ہوئے۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تب میں اپنی جگہ سے ہلا۔
دونوں ہاتھوں میں ایک ایک اٹیچی اٹھائے ہوئے۔

باہر پہنچا تو دونوں مدن کی گاڑی میں آگے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے
تھے۔ میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا کسی دن [illegible]
بہن سے کہوں گا، میری ہی غلطی سے میرے دوست کو اپنا جیون ساتھی
بنا لے!

کیا وہ میرا کہا مان لے گی؟؟

---

مدیر بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت انتہائی [illegible] سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے [illegible]
کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

قارئین کے مسلسل اصرار پر، ان کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے ہم یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ادارہ بیسویں صدی [illegible] بیسویں صدی [illegible] سے
کوئی تعلق نہیں سوائے اس کے کہ وہ ہمارے مجلہ مضامین بلا اجازت نقل کر لیتے ہیں اور ہمارے تیر و نشتر اور صحت و زندگی کے مضامین بھی اپنے نام سے شائع
کر لیتے ہیں اور پڑھنے والوں کو مغالطے میں رکھنے کے لئے ہمارے سرورق کا بھی ہو بہو چربہ چھاپ لیتے ہیں۔
مدیر رسالہ بیسویں صدی [illegible]

# اجنبی شہر کے لوگ

نور شاہ

شاردا کالونی، ریزیڈنسی روڈ۔ جموں (توی)

برادرم محترم گرامی صاحب! آداب و خلوص

عنایت نامہ ملا۔ فون سے آپ سے گفتگو بھی ہوئی۔ خدا کرے آپ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں۔ یہ کہانی "اجنبی شہر کے لوگ" ایک خوبصورت سی لڑکی کی زندگی کے دو روپ پیش کرتی ہے۔ ایک روپ بہت معصوم اور پیارا سا ہے اور دوسرا بہت ہی گھناؤنا ــــ دیکھئے قارئین "بیسویں صدی" کو کون سا روپ پسند آتا ہے... آپ کا بھائی ــــ نور شاہ

دفعتاً بتیاں بجھ گئیں، روشنیاں گم ہو گئیں اور پچھلے برس کا آخری لمحہ اندھیرے میں گم ہو گیا اور پھر خاموش اندھیرے کو چیرتا ہوا نئے برس کا پہلا لمحہ ابھرا۔ بتیاں جل اٹھیں، روشنیاں بکھر گئیں۔ ان سب نے نئے برس کے پہلے لمحے کو نئی شراب سے خوش آمدید کہا۔ سوئی سوئی شربتی آنکھوں میں محبت کی نئی جوت جلی۔ مدھر رسیلے ہونٹوں سے نئے نغمے پھوٹے اور بس دیکھتے دیکھتے دھڑکنوں کی مترنم صدا گونجی۔ دل کی بے آواز چنگاریاں نرم گداز رنگ رنگ کے پھولوں کی طرح فروزاں ہو گئیں۔ معطر سانسیں سرسراتی ہوا کی لہروں میں رچ گئیں اور فضا تھرتھرا اٹھی۔ خواب آلود انگڑائیوں کی بے ساختہ حرکتیں ہر سمت پھیل گئیں۔

نیا سال مبارک!

نیا سال مبارک!!

کئی آوازیں ایک دوسرے میں گھل مل گئیں۔ کئی سانسیں ایک دوسرے میں رچ بس گئیں۔ کئی جام ایک دوسرے سے ٹکرائے۔

نیا سال مبارک!!!

میں ان سب سے الگ تھلگ ایک گوشے میں کھڑا رو رہا ہوں۔ پرانے برس کے آخری لمحے کے لئے جو بیت چکا ہے۔ اس ایک لمحے میں میری کلپنا اور میری سوچ کا ایک جگ بیت چکا ہے۔ اس لمحے میں اکیلا تھا۔ کوثر میرے ساتھ تھی۔ میرے پاس تھی۔ میں اس کے دل کی دھڑکنیں گن سکتا تھا۔ میں اس کے گھنے بالوں کی گھٹاؤں میں سو سکتا تھا۔ میں اس کے جسم کی سپید چاندنی میں کھو سکتا تھا۔

وہ لمحہ دور رہ گیا ہے، بہت دور کشمیر میں ــــ میرا اپنا کشمیر جہاں زندگی پہاڑی وادیوں میں جواں ہوتی ہے اور ندی نالوں کے رومان پرور سکوت میں ڈوب جاتی ہے۔ جہاں برف سے ڈھکی چوٹی، بلند بلند چوٹیوں میں شفق کی لالی جذب ہو کر بہار کی آمد آمد کا اعلان کرتی ہے۔ جہاں گھنے گھنے جنگل ہیں، ٹیڑھے میڑھے راستے ہیں۔ اونچی نیچی پگڈنڈیاں ہیں۔ رنگ رنگ کے پھول ہیں۔ چناروں کے پیلے پتے ملتے ہیں اور جہاں ڈل جھیل، ولر جھیل اور نگین جھیل کی مست مست ہوا کے جھونکے لوری سناتے ہیں، لوک گیت گاتے ہیں ــــ انہیں پرسکون اور پربہار فضاؤں میں جب ٹورسٹ سنٹر کے خوشنما لان سنہری دھوپ میں نہا رہے تھے اور جب میں اپنے اسی مخصوص بنچ پر بیٹھا انتظار کر رہا تھا ــــ تو انڈین ایئر لائنز کی وہ جانی پہچانی گاڑی آ کر کھڑی ہو گئی۔ میرا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ میرا کام ہی ایسا ہے جس میں تھکان ہی تھکان ہے۔ میرے دوسرے ساتھی اپنے اپنے کارڈ لے کر گاڑی کی طرف لپکے۔ میں نے بھی بادلِ ناخواستہ اپنا کارڈ نکالا ــــ اور اسی وقت میری نظر اس پر پڑ گئی۔ سرو قد، بھرا بھرا جسم، کتابی چہرہ، گھنی بھاری پلکیں، پمپوش جیسے نرم نرم ہونٹ ــــ بیل بوٹم پتلون میں ملبوس یہ لڑکی کچھ عجیب انداز سے میری طرف دیکھ رہی تھی یا شاید میری تھکان کا اثر تھا کہ مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا یا اس کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی دھند چھائی ہوئی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اپنا کارڈ پیش کیا۔

ایک نئے ماحول میں جا رہے تھے۔ جوش و ولولہ کا ایک جذبہ خود سے [illegible] کر
[illegible] میں [illegible]"
"اور تم؟"
"رہنے دو تم تو مجھے رلا رہی ہو!"
"بہت معصوم ہو۔ مجھے اس زمانے میں محبت نام کی کوئی شے ہے؟"
"تم شاید بہک گئی ہو"
میں جب پاؤں اس ماحول سے باہر نکل آیا ہوں اور جہاں کی [illegible] پر
بے مقصد گھوم رہا ہوں۔ ٹوٹ جانے کے لئے [illegible]۔۔۔ بے تکسیر۔۔۔

آیا تھا۔ میں ذرا دیر سے پہنچا اور وہ جہاز میں بیٹھ چکے تھے۔ میں یونہی لان میں
بیٹھ رہا ——— میرا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرا کام ہی کچھ ایسا ہے۔
بس تھکن ہی تھکن ہے ——— دفعتاً ایک ساتھ کئی پولیس آفیسر جہاز کی طرف
بھاگتے نظر آئے۔ لوگ اپنی اپنی جگہوں پر جم کر رہ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے دیکھا
پولیس آفیسر واپس آ رہے ہیں اور ان کے ساتھ بیل بوٹم پتلون میں ملبوس ایک
لڑکی ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا اٹیچی سنبھالے آ رہی ہے۔ میں نے قریب سے دیکھا اور
قریب سے ——— میں نے فوراً پہچان لیا کیسے نہ پہچانتا ——— وہ کوثر تھی!!
پولیس نے اسے کشمیر سے چرس سمگل کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا!!!

---

وقت کا پہیہ گھومتا رہا!
اور اس روز میں ایک انگریز جوڑے کو واپس بھیجنے کے لئے ایئرپورٹ

---

غیر مطلوبہ مضامین واپس منگوانے کیلئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے بصورت دیگر
اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھیئے۔ ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر جیوتی صدیقی)

---

# غزل

پروفیسر سراج الحسن سراج ادیب ایم اے

زندگی کیا ہے مسلسل ٹھوکریں کھانے کا نام
یا ہجوم آرزو میں گھٹ کے مر جانے کا نام

بے خودی کہتے ہیں جس کو ہے وہ اے جانِ حیا
چشمِ میگوں سے تری پی کر بہک جانے کا نام

اک نگاہ لطف تیری باعث تکمیل عیش
بے رخی تیری مری خوشیوں کے مٹ جانے کا نام

عشق کیا ہے حسن کی عظمت کا دل سے اعتراف
حسن اپنی مہر تری اوروں سے منوانے کا نام

لیت کی تاریکیوں میں جلوۂ ماہِ مبیں
خلوتوں میں ایک مہر وش کے یاد آنے کا نام

چاہ نے تیری اسے مشہورِ عالم کر دیا
جانتا تھا کون ورنہ تیرے دیوانے کا نام

پھر ارادہ جب مرا ناکام ہو جائے سراج
کیوں نہ رکھ لوں خونِ حسرت اپنے افسانے کا نام

---

# غزل

پروفیسر بیتاب پیلی بھیتی ایم۔ کام (علیگ)

دل کو جلوؤں سے وہ جگمگاتے رہے میرے خوابوں کو رنگیں بناتے رہے
پاس آتے رہے دور جاتے رہے دور جاتے رہے پاس آتے رہے

غم کی پرچھائیوں میں دیئے یاد کے جھلملاتے رہے جگمگاتے رہے
لے کے چشمِ تصور میں جلوے ترے نت نئی محفلیں ہم سجاتے رہے

رہ گزارِ محبت بھی پُر خار تھی منزلِ عشق پانا بھی دشوار تھا
پھر بھی عزمِ جواں کا سہارا لئے ہم قدم سوئے منزل بڑھاتے رہے

ان کی جانے بلا کس کا گھر جل گیا کس کی امید کا گلستاں جل گیا
روئے روشن پہ آنچل کا سایا کئے نیچی نظروں سے وہ مسکراتے رہے

موت کا خوف بیتاب پھر ان کو کیا رازِ ہستی سے جو آشنا ہو گئے
یہ سدا سے ہی ریت اس جہاں کی رہی لوگ آتے رہے لوگ جاتے رہے

# رابن بلیو کا خاص کام

کم سے کم خرچ سے
زیادہ سے زیادہ
اُجلے کپڑے

## قدرتی دلکش سفیدی کے لئے — رابن بلیو

[illegible] آنکھوں میں ایک سرور سا چھا جاتا، انگ انگ میں مستی سی
[illegible] اور وہ آنکھیں بند کر کے لمبی سانس چھوڑ کر خیالوں میں کھو جاتی۔
تصور میں کمل ہی نظر آتا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے لگے قدِ آدم آئینے میں،
دیواروں پر لگی پینٹنگ کی شاہکار تصویروں میں، راتوں کی تنہائیوں میں، دن
کے اجالوں میں، خوابوں اور خیالوں میں جیسے کمل کا تصور ہی اُس کی زندگی
کی معراج ہو ——— وہ سوچتی رہتی کمل چاہے میں چکور رہوں، وہ پھول ہے
میں بھونرا ہوں، میں سراپا آرزو ہوں اور وہ حاصلِ آرزو! اور یہ سارے
احساسات اُسے کمل سے قریب پہنچنے کے لئے اُکساتے رہتے اور وہ کمل سے قریب
اور قریب تر ہونے کی کوشش میں اُس کا تعاقب کرتی رہتی ——— ایک طرف
کمل کا تصور اُس کے خیالوں اور خوابوں کو سجاتا رہا اور دوسری طرف وہ خود کو
کمل کے لئے سجاتی اور سنوارتی رہی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر سجی مصنوعات کی بے شمار
معطر اور قیمتی چھوٹی بڑی شیشیاں اُس کے حُسن کو نکھارنے میں، چار چاند
لگانے میں اُس کی معاون و مددگار بنتی رہیں۔ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار
لاکر کپڑوں کا انتخاب کرتی۔ قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر ہر چہار طرف
سے مُڑ مُڑ کر اپنا جائزہ لیتی۔ کہیں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی! اور وہ خود کو ہر طرح
مطمئن کر لینے کے بعد پھولوں سے لدی شاخ کی طرح لچکتی بل کھاتی نکل پڑتی
اپنے مرکزِ خیال کی طرف، اپنے محبوب کمل کی طرف!

"نو، نو، میں تمھاری ایک بھی نہ سنوں گی! آج تو تمھیں میرے ساتھ
پکچر دیکھنی ہی ہوگی!" وہ کسی ضدی بچے کی طرح کمل کے شانے سے جھول جاتی اور
کمل کو اُس کی بات ماننی ہی پڑتی۔

"اوہو، مائی سویٹ فیلو، تمھارے بغیر تو کسی پروگرام میں جی ہی نہیں لگتا۔
تم پکنک پر ساتھ نہ چلوگے تو سارا مزہ ہی کرکرا ہو جائے گا۔ بس اب انکار کیا تو
میں رو دوں گی!" وہ کمل کو اس طرح مجبور کر دیتی کہ اُس سے مزید انکار کرتے
نہ بنتی۔

"بیوٹی فل! سچ کہتی ہوں اس سوٹ میں بہت جچ رہے ہو، بس ایک
کمی ہے سو میں پورا کر دیتی ہوں!" اور وہ جھوڑے کلب میں اپنے جوڑے سے ایک
پھول نکال کر اُس کے کوٹ میں لگا دیتی۔

"پلیز، ذرا یہ رنگ لگا دو!" اور وہ بلاؤز کے کھلے ہوئے ہک کو لگوانے
کے لئے سب کے سامنے کمل کی طرف اپنی پُشت کر کے اس طرح کھڑی ہو جاتی جیسے
کمل اُس کی کوئی سہیلی ہو۔

"کمل ڈیر، آؤ ایک بازی ہو جائے!"
اور وہ بڑے ہی انداز کے ساتھ کمل کے سامنے کھڑی ہو جاتی ——— [illegible]
اپنے خوبصورت جسم کے ہر خط کو نمایاں کرنے کے لئے کبھی [illegible]
کبھی دائیں تو کبھی بائیں۔ پسینے میں کو ہی ادا کمل کو جاتی [illegible]
سے بالکل بے خبر رہتی کہ ٹینس نہیں بلکہ اس کھیل کے دوران [illegible]
والی بجلیوں کے بہانے اس کی اپنی شخصیت میں زیادہ [illegible]
وہ جلد ہی تھک جاتی، پسینے میں شرابور ہو جاتی اور ہار جانے کے بعد [illegible]
لپک کر کمل کو مبارکباد دیتی جیسے ہار کر بھی جیت گئی ہو یا [illegible]
اُس کی جیت ہوا!

"اُف فو! تم سے جیتنا بہت مشکل ہے!"
اور کمل صرف مسکرا کر رہ جاتا۔

آج بھی وہ کمل سے ہار کر چہرے اور گھٹے ہوئے بازوؤں پر بکھرے ہوئے
پسینے کے قطروں کو دوپٹے سے پونچھتی ہال سے باہر نکل رہی تھی کہ اُس کی نظر اُٹھ کر
پریتی پر پڑی جو ایک کنارے کھڑی اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"تم تو سب سے الگ تھلگ اس طرح کھڑی ہو جیسے ساری دُنیا سے ناطہ
توڑ لیا ہو!" وہ اروناکی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

"ایسی بات نہیں، تمھارے ہی بارے میں سوچ رہی ہوں!" ارونا ایک
نظر اُس کے سراپا پر ڈالتی ہوئی بولی۔

"کیا؟"

"یہی کہ اتنی بھی کیا وارفتگی کہ تن بدن کا بھی ہوش نہ رہے!"

"میں سمجھی نہیں؟" وہ اس طرح مسکرائی جیسے سب کچھ سمجھ کر نہ سمجھنے
کی ایکٹنگ کر رہی ہو۔

"کمل کے پیچھے اس طرح بھاگ رہی ہو کہ تمھارے کپڑے پیچھے چھوٹتے
جا رہے ہیں!" ارونا نے آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

اُس کے قہقہے فضا میں بکھر گئے۔

"ارے بھئی میں کمل کو پا کر کوئی گناہ تو نہیں کر رہی ہوں۔ ایک نہ
ایک دن کوئی نہ کوئی تو زندگی میں آئے گا ہی [illegible]
نہیں ساری زندگی کے لئے بہتر [illegible]

"ٹھیک ہے۔ لیکن کسی کو پانے کا یہ مطلب [illegible]
تماشا بن جایا جائے۔ آخر حجاب اور حیا بھی [illegible]
سنجیدگی تھی۔

"یہ بھی خوب رہی، تو اب ہم [illegible]

[illegible]

اُس نے شوخی سے کہا۔

"نہیں، میرا مطلب ہے سراپا سب سے ہٹ کر لوگوں کو دیوانہ کیوں بنا دیا جائے؟"

"اور جب کبھی تمہیں میرے کپڑوں پر اعتراض ہوتا ہے" اُس نے اپنے تنگ اور چُست کپڑوں کا جائزہ لیا۔ "آخر تم کس کس بات پر اعتراض کرتی پھرو گی۔ زمانہ بدل گیا، زندگی کی قدریں بدل گئیں، تہذیبوں میں ردّ و بدل ہو گیا، انسانوں کے خیالات بدل گئے، قدیم فیشن کی جگہ جدید فیشن نے لے لی۔ بدلتے ہوئے وقت کا ساتھ تو دینا ہی پڑے گا؟"

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ ساری تبدیلیاں ہماری تباہی کی پیش خیمہ ہوں؟"

"بالکل دقیانوسی خیالات ہیں تمہارے۔ نئے دور میں پیدا ہو کر بھی نانی اماں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ اب اتنا بھی نہ رکھ کیا کہ زندگی کی لذتوں سے محروم ہو جایا جائے!" اُس کے انداز میں شوخی تھی۔

"حوصلہ ہو تو شرم و حیا کے دائرے میں رہ کر بھی زندگی سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔"

"نا بابا، اس نگوڑی روایتی شرم و حیا کی پابند رہ کر تو بیچاری عورتیں صدیوں قید و بند کی زندگی گزارتی رہی ہیں۔ آزادی کی اس کھلی فضا کی تو وہی منکر ہو جسے آزادی کی فضا میں جینے کا سلیقہ نہ ہو۔ تم خود کو ہی دیکھ لو اچھی بھلی صورت بگاڑے پھرتی ہو۔ نہ بناؤ سنگھار، نہ کپڑوں کے انتخاب کا سلیقہ اور نہ دوستوں میں مکس ہونے کا ڈھنگ! یوں چلی آتی ہو جیسے ابھی سو کر اُٹھی ہو۔"

"خود کو سجانے اور سنوارنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ برائے نام کپڑے پہنے جائیں؟" اندونا کے لہجے کی سنجیدگی اُسی طرح قائم تھی۔

"وقت کے تقاضوں کو تو پورا کرنا ہی پڑے گا اندونا ڈارلنگ! لیکن تم یہ سب نہ سمجھ پاؤ گی۔ حماقت جو تمہارے جسم میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔"

"مریم تم بھی آزادی ہو۔ حالانکہ تم خود ایک مذاق بن کر رہ گئی ہو۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ اپنے جسم کی بھرپور نمائش اور ہزار کوششوں کے بعد بھی تم کمل کو اپنا گرویدہ نہ بنا سکی ہو۔ کیا یہ تمہاری شکست کی واضح دلیل نہیں ہے؟"

"مجھے نیچا دکھانے کی بات تو تم یوں کہہ رہی ہو جیسے کمل ہی نے تم سے کچھ کہا ہو، حالانکہ کمل میرے سوا کسی اور کی طرف دیکھتا بھی نہیں!" اُس کے چہرے پر ایک فخریہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ ایک کامیاب شریکِ حیات کی ساری خوبیاں کمل میں موجود ہیں لیکن میرا خیال تو یہی ہے کہ تم کمل کو سمجھنے میں غلطی کر رہی ہو۔ کمل وہ نہیں جو تم سمجھتی ہو۔ کیا کبھی خود اُس نے تم سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے؟" اندونا نے جواب طلب نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"ہر بات کہی نہیں جاتی۔" وہ اٹھلائی۔ "لیکن اب تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں کہ لتا، سادھنا، شیلو، اور چپا کی طرح تم بھی مجھ سے حسد کرنے لگی ہو۔ اب مجھے کمل کو تمہاری نظروں سے بچا کر رکھنا ہوگا!" اور وہ بل کھاتی ہوئی وہاں سے باہر نکل گئی۔

---

مریم سے طویل بحث کے بعد اُسے اندونا پر بھی شک ہونے لگا تھا۔ وہ اکثر سوچتی کہیں ایسا نہ ہو اُس کی اور سہیلیوں کی طرح اندونا بھی اُس کے اور کمل کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کرے۔ لیکن یہ سوچ کر اُس نے خود کو مطمئن کر لیا کہ ہر ایک سے دامن بچا کر سمٹ سمٹ کر چلنے والی، خواہ مخواہ شرمانے والی، قدم قدم پر شرم و حیا کی پابند، بد سلیقہ، بد ذوق، گنوار اندونا بھلا اُس کے اور کمل کے درمیان کیا آسکے گی ——!

کمل کے خیالوں میں کھوئی خوشبودار جھاگ میں وہ بہت دیر تک کُلبلاتی رہی۔ اُس پر نشہ کی سی کیفیت طاری ہوتی رہی جیسے وہ گردن تک شراب میں ڈوبی ہو۔ خوشبودار جھاگوں کی دبیز تہہ میں چھپا کمل کا تصور آ کر گدگداتا رہا۔ اُس کے مساموں میں ہلچل سی مچ گئی۔ وہ ٹب سے نکل کر جھرنے کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ آنکھیں بند کیے، دم سادھے۔ جھرنے سے گرنے والی بوندیں آ آ کر گدگداتی رہیں اور وہ اُن ٹھنڈی ٹھنڈی بوندوں کے احساس سے بے خبر خیالات و جذبات کی کیف آگیں آنچ میں سُلگتی رہی اور جب آنکھیں کھلیں تو باتھ روم کے قدِ آدم آئینے پر نظر پڑتے ہی چونک سی گئی جیسے آئینے میں اُس کا اپنا عکس نہ ہو۔ ساون کی برستی ہوئی گھنگھور گھٹاؤں کو شرما دینے والے دراز گیسو، شبنم میں دُھلے ہوئے گلاب کی طرح شگفتہ و شاداب چہرہ، بلوریں گردن، مرمریں دوش شانے، صاف و شفاف جھیل میں تیرتے ہوئے ہنسوں کے خوبصورت جوڑے کی طرح بھرپور شباب کی نشاندہی کرنے والی نشانیاں، ہر ہر قدم پر بل کھا جانے والی شاخِ گل کی طرح لچکتی کمر . . .

اور جب وہ دو گھنٹے بعد ڈریسنگ ٹیبل سے اٹھی تو سراپا قیامت بن گئی تھی! سیقوں کی باریک فیروزی رنگ کی ساڑی اور بلاؤز سے اُس کا صندلی جسم یوں جھلک رہا تھا جیسے چاند نیلگوں آسمان میں اُودی اُودی گھٹاؤں کے ساتھ

# خیالوں کے طلسمات

محمد غلام محی الدین حبیبی القادری ساترکلی

یہ صحنِ چمن، مہکی فضا اور یہ جواں رات
یہ بارشِ انوار، یہ نیرنگیِ حالات

یہ چاند کی کرنوں میں نہائی ہوئی دھرتی
یہ اوس میں بھیگے ہوئے نکھرے ہوئے ذرات

یہ زمزمہ خوانی، یہ مسرت کے ترانے
یہ انجمنِ ناز، یہ فردوسِ خیالات

یہ رقص و سرود، اور یہ سانسوں کا ترنم
یہ سینۂ بربط میں مچلتے ہوئے نغمات

یہ مرمریں باہیں، یہ دمکتے ہوئے عارض
یہ سوزِ دل و جاں، یہ سلگتے ہوئے لمحات

یہ ناز و ادا اور یہ اندازِ تبسم
یہ نیم وا آنکھوں سے عیاں دل کی ہر اک بات

یہ ساغر و مینا کی کھنک، شغلِ مئے ناب
یہ ساقیِ فیاض کی رندوں پہ عنایات

یہ حسن کے الطاف، یہ تسکین کے ساماں
یہ وضعِ کرم کوششِ پیہم، یہ مدارات

یہ بہکے قدم عشق کے، یہ رنگِ طبیعت
یہ شوخیِ گفتار، یہ بیتابیِ جذبات

لو ختم ہوئی اب شبِ رنگیں کی کہانی
لو صبح ہوئی ٹوٹے خیالوں کے طلسمات

# غزل

مسترنکودری

ترے سر میں اگر سودا نہیں ہے
تو سجدوں سے بھی کچھ ہوتا نہیں ہے

دیا وہ درد او بے درد! تو نے
کوئی جس درد کا چارا نہیں ہے

ہماری بے خودی کی داد دینا
تمہارا بھی خیال آتا نہیں ہے

ستم کا رنگ بھی شامل ہے اس میں
کرم اُن کا نشاط افزا نہیں ہے

گلہ ہم کیا کریں تیری جفا کا
محبت میں گلا ہوتا نہیں ہے

وہیں دیکھا ہے تجھ کو جلوہ آرا
نظر کا بھی جہاں پردا نہیں ہے

جسے ہے شانِ یکتائی کا دعوے
اُسے کہہ دو کوئی یکتا نہیں ہے

ہمیشہ مست اپنے حال میں ہوں!
مجھے اندیشۂ فردا نہیں ہے

جفا و جور وہ کرتے رہیں تتر
ہمیں اس کا کوئی شکوا نہیں ہے

# آپ کے بچّے کی حفاظت کے لئے ’ڈیٹول‘ کیوں ضروری ہے؟

آپ کے بچے کے دُنیا میں قدم رکھتے ہی ڈاکٹر اُس کو جراثیم سے محفوظ رکھنے کے لئے ڈیٹول استعمال کرتا ہے۔ اس کے بعد بھی اپنے بچے کی حفاظت کے لئے ڈیٹول استعمال کرتے رہیئے۔ اس کی جِلد کو تروتازہ اور پھوڑے پھنسیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کے نہانے کے پانی میں ڈیٹول ملایئے۔ مزید حفاظت کے لئے بچے کے کپڑے بھی تھوڑا سا ڈیٹول ملے ہوئے پانی سے دھویئے۔

ڈیٹول گھر میں اور بھی طرح طرح سے کام آتا ہے۔ کٹی پھٹی یا رگڑ کھائی ہوئی جِلد پر اور داڑھی بنانے کے بعد لگانے کے لئے۔ غرارہ کرنے کے لئے اور عورتوں کی صفائی کی مخصوص ضروریات کے لئے۔ ڈیٹول کی ایک شیشی آج ہی گھر لے جایئے۔

DAC.7 URDU

## حِفظانِ صحت کے مُفت کتابچے

مہربانی فرما کر اپنے کتابچے "ہر گھر کی سلامتی کے لئے ڈیٹول کی ضرورت" "عورتوں کے لئے حفظانِ صحت کے نئے اصول" دونوں کا ایک ایک نسخہ جو مُفت ملتا ہے، میرے نام روانہ فرما دیجئے۔

نام ______________________

پتہ ______________________

خانہ پُری کر کے آج ہی حسبِ ذیل پتہ پر روانہ کر دیجئے۔
جی۔ پی۔ او۔ بکس ۹۲۱ کلکتہ ۱

ہر گھر کی صحت و سلامتی کے لئے

# ڈیٹول

دُنیا کا سب سے بھروسے کے قابل جراثیم کُش

انٹرویو

آئینہ کلام سامنے رکھ کر ——

# فانی بدایونی سے انٹرویو

—— آذر بارہ بنکوی بی اے۔ ایل ایل۔ بی

محلہ کٹرہ ۱۱۶/۱۵۸، بارہ بنکی (یوپی)

فانوس شمع اردو! محترم خوشتر صاحب! خلوص بیکراں

بادِ مخالف کے تند و تیز جھونکے اور شمع اُردو کی تھرتھراتی ہوتی لو۔ ہر آن ہر لمحہ یہی گمان ساہوتا ہے کہ اب بجھی اور تب بجھی —— لیکن شمع بجھنے کے بجائے اس کی لو اور بڑھتی جاتی ہے اس کا اُجالا اور بڑھتا جاتا ہے۔ میرے لئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ آپ جیسی پُر خلوص ہستیوں کی بے لوث ادبی خدمات اُردو کی شمع کے لئے فانوس کا کام انجام دے رہی ہیں۔ یہی نہیں آپ کی مسلسل جدوجہد شمع اُردو کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اس کی روشنی تیز کرتی جارہی ہے۔ لیجئے قارئینِ "بیسویں صدی" کے لئے حضرت فانی بدایونی سے انٹرویو نذر کر رہا ہوں۔ جدید رنگِ تغزل کو نکھارنے میں فانی نے بھی اپنا خونِ دل صرف کیا ہے۔ پھر بھی فانی کے ساتھ اس بے درد دنیا نے جو بے رحمانہ سلوک کیا ہے۔ وُہ کون صاحبِ ذوق نہیں جانتا؟ درد میں ڈوبا ہوا فانی کا کلام خود اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ فانی کے بہت سے اشعار فانی کی زندگی کا مرثیہ ہیں۔ فانی کا پورا کلام ایک ہی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسی لئے فانی کا انٹرویو مرتب کرنے کے لئے بے حد کاوش کرنی پڑی۔ اپنی گرانقدر رائے سے نوازیئے کہ یہ انٹرویو کیسا ہے —— باذوق قارئین "بیسویں صدی" کی رائے تو مجھے ملتی رہتی ہے۔ باذوق قارئین کے بہت سے خطوط آئے جنہوں نے میری کاوشوں کو سراہا۔ خاص طور پر جناب بسنت کمار جگی (ایڈوکیٹ سپریم کورٹ آف انڈیا، نئی دہلی) جو آپ کے بے انتہا معتقد ہیں انہوں نے اپنے پر خلوص خط میں بہت تفصیل سے لکھا ہے کہ مشاہیر سے انٹرویو کا یہ سلسلہ جو شاد (مرحوم) نے شروع کیا تھا انہیں کس قدر پسند آتا ہے۔ جگی صاحب کے خط کے اس حوالے سے یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ خود ستائی کا الزام لوں مقصد صرف "بیسویں صدی" اور شاد (مرحوم) کی غیر معمولی مقبولیت کو ظاہر کرنا ہے....

مخلص —— آذر بارہ بنکوی

★

**آذر:** "قبلہ! میں چند لمحوں کے لئے آپ کی توجہ کا محتاج ہوں۔ آپ کو دیکھتے ہی آپ کی وجیہہ اور پُر وقار شخصیت سے دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ کی شخصیت سے متعارف ہونے کا شرف پہلے کبھی نہ ملا۔ کیا میں آپ کے بارے میں کچھ جاننے کی جرأت کر سکتا ہوں؟"

**فانی:** کچھ لُٹ کے آرام کا سب نشانی ہوں
میں دو طرف پریشاں خاطر [illegible] فانی ہوں

**آذر:** "زہے نصیب! کہ مجھ جیسے کمتر کو آپ جیسے عظیم المرتبت شاعر سے نیاز کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت! میں اپنی اِس بے ادبی پر حقیقتاً بے حد نادم ہوں کہ آپ کو پہچان نہ سکا۔"

**فانی:** "میری نظر بھی اب مجھے پہچانتی نہیں
دل کا بھی انقلاب عجب انقلاب ہے"

**آذر:** "ماشاء اللہ! اب حضور بہت ہی لطف کر ہے آپ کا یہ مسکن۔ کتنا حسین سجا رکھا ہے آپ نے لہلہاتے ہوئے [illegible]

پھول، دلکش روش، ہر شے اپنی جگہ خوش سلیقگی کی آئینہ دار، کتنا دیدہ زیب منظر ہے۔ لیکن قبلہ! نہ جانے کیوں کلیاں کچھ مرجھائی سی نظر آ رہی ہیں؟"

**فانی:**
"میرے دلِ برباد کے دھندلے سے نشاں ہیں
اس باغ میں کلیاں ہیں جو مرجھائی ہوئی سی"

**آذر:** "بجا ہے فانی صاحب! کون اس حقیقت سے واقف نہیں کہ آپ کا درد مند دل کائنات کے ہر غم کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے ہے، لیکن آپ شاید اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے چمن کی نگہداشت نہیں کر پاتے یا اب پھولوں سے آپ کا تعلق ہی کچھ کم ہو گیا ہے؟"

**فانی:**
"پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا
جب ذکرِ بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی"

**آذر:** خیر جناب! کسی نہ کسی طرح یادِ بہار تو باقی ہے؟

**فانی:**
"بوئے خزاں سے مست ہیں یاد نہیں بہار کیا
ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا"

**آذر:** "حضرت! آپ کی چمن پرستی برحق ——— لیکن کیا مسکراتے ہوئے دلفریب، خوش رنگ اور خوشنما پھولوں کے دلنواز تبسم سے بھی آپ محظوظ نہیں ہوتے؟"

**فانی:**
"ہر تبسم کو چمن میں گریہ ساماں دیکھ کر
جی لرز جاتا ہے اِن پھولوں کو خنداں دیکھ کر"

**آذر:** "سبحان اللہ! لیکن فانی صاحب! ایسا کیوں ہے؟ آپ جیسے وسیع النظر انسان کے مزاج پر نرم و نازک پھولوں کا لطیف تبسم بار ہو جاتا ہے، یہ عجیب بات ہے؟ آخر بہار کی اِن دلفریب رعنائیوں میں اور پھولوں کے اِس جانفزا تبسم کے پردے میں آپ کیا دیکھتے ہیں؟"

**فانی:**
"گُل غزاں کے راز کا محرم نظر آیا مجھے
ہر تبسم پردہ دارِ غم نظر آیا مجھے"

**آذر:** سچ ہے قبلہ! آپ کا تجزیۂ کائنات بالکل صحیح ہے اپنی جگہ، مسرت کے مقابلے میں غم کو یقیناً دوام حاصل ہے۔ اچھا اب اجازت ہو تو آج کچھ بھولی بسری پرانی یادیں تازہ کر لی جائیں ——— ہاں تو علیگڑھ کی ادبی صحبتیں اب بھی آپ کو یاد آتی ہوں گی۔ آپ سے اور مولانا حسرت موہانی سے وہیں سے رسم و راہ پیدا ہو گئی تھی نا؟ اور مولانا موصوف کی فرمائش پر قدیم زبان کی پابندی کے ساتھ کوئی غزل کہی تھی آپ نے بھی؟ ممکن ہو تو اُس غزل کے چند منتخب اشعار عنایت فرمائیے؟"

**فانی:**
"جس دلربا سے ہم نے آنکھیں لڑائیاں ہیں
آخر اُسی نے ہم کو آنکھیں دکھائیاں ہیں
شاید فسانۂ غم سچ سمجھے گئے تم
صدقے اِن انکھڑیوں کے یہ کیوں چھلکائیاں ہیں
یاں یاد بھی نہیں دل، اُس کی تلاش کیسی
کیوں دل چُرا کے تم نے آنکھیں چُرائیاں ہیں
تیری ہی اے شبِ غم کچھ کم نہ تھی سیاہی
کیوں بدلیاں یہ کالی گِھر گھر کے آئیاں ہیں
جوشِ جنوں میں اکثر دشمن سے ہم نے فانی
جو دل پہ بیتیاں ہیں، سب کو سنائیاں ہیں"

**آذر:** "سبحان اللہ! فانی صاحب! حالانکہ یہ غزل بالکل ابتدائی دور کی ہے۔ پھر بھی اِس میں بھی آپ کی انفرادیت پوری طرح جھلک رہی ہے، حُسن و عشق کی واردات، محبوب کی حسین انکھڑیوں کے چھلکتے ہوئے پیالے اور شباب کی شوخی سبھی کچھ تو ہے اِس میں، اور کیوں نہ ہو شباب پھر شباب ہے!"

**فانی:**
"ستم ہائے نمایاں سے نوازش ہائے پنہاں تک
شباب آتے ہی ہر آفت گزر جاتی ہے انساں پر"

**آذر:** "اچھا قبلہ! جب شباب کا ذکر چھڑ گیا ہے تو اب اس باب میں کیوں حسرتِ کلام رہ جائے کیونکہ آپ کا دل بھی تو اسیرِ دامِ محبت رہ چکا ہے ——— ہاں! تو یہ فرمائیے کہ آپ کے نزدیک محبت کی تعریف کیا ہے؟"

**فانی:**
"معلوم نہیں کیا ہے محبت لیکن
کانٹا دِل میں کھٹک رہا ہے کوئی"

**آذر:** "پھر تو محبت کی یہ کسک جو کانٹا بن کر آپ کے دل میں کھٹکتی ہے کبھی کبھی تو شدت اختیار کر کے آپ کو خون کے آنسو رُلاتی ہو گی؟"

**فانی:**
"محبت میں مجھے جی کھول کر رونا نہیں آتا
جو چار آنسو ہیں آنکھوں میں تو وہ آنسو بھی جلتے ہیں"

**آذر:** "حضرت! کہا جاتا ہے محبت لاکھ چھپائی جائے لیکن کسی طرح چھپتی نہیں ہے اور تاڑنے والی نظریں بہر حال تاڑ لیتی ہیں۔ کہئے آپ کا رازِ محبت کبھی سرِ بزم افشا تو نہیں ہوا ——— ؟"

فانی: "بعد مُردن بھی اُس نے آنکھیں سادگی تو دیکھیے
بزم میں گویا مری جانب اشارہ کر دیا"

آذر: "اچھا کبھی آپ کی عشق کہ آپ کے محبوب طرحدار نے بھی اپنے نورِ
حُسن سے جگمگایا ــــ اور اگر کبھی ایسا ہوا تو پھر قبلہ ــ گستاخی
معاف! اُس بُتِ کافر نے اپنے رُخِ روشن سے نقاب بھی اُٹھایا
اگر نہیں تو پھر آپ نے اُس جانِ تمنّا کے روئے رنگیں سے
نقاب کیا کہہ کر اُتارا؟"

فانی: "دکھا کے زُلفِ سیہ فام آئینے میں اُنہیں
یہ کہہ کے ہم نے اُتار اک بے نقاب ہیں سانپ"

آذر: "یہ فرمایئے کہ محبت کی پُر خار وادی آپ نے اکیلے طے کی یا اِس
دشتِ غم میں آپ کا محبوب کبھی رفیقِ سفر رہا؟"

فانی: "منزلِ عشق پہ تنہا پہونچے کوئی تمنّا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اِس راہ میں آخر اِک اِک ساتھی چھوٹ گیا"

آذر: "پھر تو فانی صاحب! جس طرح ہر شعبۂ حیات میں آپ کو ناکامیوں کا
سامنا کرنا پڑا اُسی طرح دنیائے محبت میں بھی عروسِ کامرانی نے آپ کو
گلے لگانے سے ہمیشہ اجتناب کیا؟"

فانی: "دیارِ نامُرادی میں مری اِک عمر گزری ہے
ابھی ناواقفِ رسمِ جہانِ کامرانی ہوں"

آذر: "بجا ارشاد! آپ نے تو اپنی زندگی کی مکمل تصویر پیش کر دی قبلہ!
آپ کی سنجیدہ مزاجی اور قنوطی زاویۂ نظر کے باعث پروفیسر
رشید احمد صدیقی نے آپ کو "یاسیات کا امام" کہا ہے اور مجھے یقین
ہے کہ آپ اِس لقب سے قطعی طور پر متفق ہوں گے کیونکہ خطۂ
سخن حضرت میر تقی میر کے بعد سوز و گداز اور یاس و حرماں کی سب سے
زیادہ موثر تصویریں آپ ہی کے کلام میں ملتی ہیں اور آپ کی غمگین
روح تو گویا غم پر فریفتہ ہے"

فانی: "غم اُس کی امانت ہے، انعامِ محبت ہے
بیگانگیٔ غم کو، محرومیٔ غم کہیے"

آذر: "یہ تو سچ ہے لیکن کیا ساری دنیا کی بلائیں اِک آپ ہی کے مغموم
دل کے لئے وقف ہو کر رہ گئیں؟"

فانی: "دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے
دُھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی"

آذر: "فانی صاحب! آپ کا درد مند دل سچ مچ بڑا حوصلہ مند ہے۔ دنیا کا کون سا
غم ہے جس سے اِس غریب کو دوچار نہ ہونا پڑا ــــ؟"

فانی: "دل تو سب کو تری سرکار سے مل جاتے ہیں
درد جب تک نہ ملے دل نہیں ملنے پاتے"

آذر: "جی ہاں فانی صاحب! درد مند دل پانا خوش نصیبی سہی۔ لیکن،
جیسا غم پرست و غم نواز ہونا بھی آسان نہیں ہے۔ پتھر کا کلیجہ ہو تب بھی
آپ کی طرح کوئی دوسرا تابِ غم نہیں لا سکتا"

فانی: "وہ بدگماں کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا"

آذر: "پھر تو حضرت! "عیش" نام کی کوئی شئے آپ کی دنیا میں نہ ہوگی
کیونکہ آپ کی خود دار طبیعت نے چند روزہ زندگی محض آرام سے بسر
کر لینے کی غرض سے کبھی کسی شخص کے آگے سر جھکانا تو کیا، خلافِ
مزاج بات بھی سُننا پسند نہ کی"

فانی: "ہم ہے میری ذات سے سارا نظامِ عیش
لُوٹا ہے میرے عہد میں نیرنگ نامِ عیش"

آذر: "بے شک جناب! ظاہر ہے ایسے ناسازگار حالات میں ارمانوں کے
پورا ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ غم کے اِس ماحول میں ارمان
کیا خاک نکلے ہوں؟"

فانی: "ارماں جو یوں نہیں تو نکلتے ہیں کس طرح
یعنی ہمارے دل سے نکالے ہوئے تو ہیں"

آذر: "ہائے آپ کے پامال ارمان اور لُوٹا ہوا دل! اب یاس و حسرت کے
سوا کیا ہوگا دل میں؟ یا کچلے ہوئے ارمانوں کا ہجوم اب بھی ہے؟"

فانی: "یاس کے آتے ہی ارماں دل سے یہ کہہ کر چلے
ہم نہیں ساتھی تری بگڑی ہوئی تقدیر کے"

آذر: "کہیے بگڑی ہوئی تقدیر کو سنوارنے کی کوئی تدبیر بھی کبھی آپ نے کی؟"

فانی: "فکرِ راحت چھوڑ بیٹھے ہم تو راحت مل گئی
ہم نے قسمت سے لیا جو کام تھا تدبیر کا"

آذر: "فانی صاحب! آپ کی تدبیریں ساری عمر تقدیر کا منہ تکتی رہیں اور
آپ چُپ رہے ـــ بارگاہِ ایزدی میں کبھی آپ نے دستِ دُعا بھی بلند نہ کئے؟"

فانی: "میری تدبیروں کی مشکل اب تو یا رب سہل کر
کیا یہ ساری عمر مُنہ تکتی رہیں تقدیر کا"

"اچھا قبلہ! آپ کے کلام کے بارے میں اگر میں اپنی ذاتی رائے
ظاہر کروں تو چھوٹا منہ بڑی بات والی مثل بالکل صحیح ثابت ہو جائے گی۔
اور میری اپنی رائے بھی کیا — ؟ لیکن مستند اہلِ قلم حضرات کی متفقہ
رائے آپ کے بارے میں یہی ہے کہ غالبؔ کی حکیمانہ بالغ نظری
اور سنجیدہ مزاجی اور میر تقی میرؔ کا سوز و گداز اگر کہیں یکجا ملتا ہے
تو وہ صرف آپ کا کلام ہے۔ مرزا غالبؔ کا مشہور شعر ہے کہ ؎

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

اسی بحر اور قافیہ میں غالباً آپ نے بھی طبع آزمائی فرمائی ہے؟ کیا
یاد ہے وہ شعر اس وقت آپ کو؟"

فانی: "وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو
پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں"

آذر: "اور مرزا غالبؔ کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے —
مری تعمیر میں مضمر ہے اِک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا
فرمائیے کوئی شعر اس قبیلے کا — ؟"

فانی: "تعمیرِ آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق
جب ہم نے کوئی شاخ چُنی شاخ جل گئی"

آذر: "بہت خوب! قبلہ! — اب میرؔ کے رنگ میں بھی چند اشعار
سنانے کی زحمت فرمائیں۔"

فانی: "غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آ کے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہیں سو جاتے ہیں"

---

"گو ہستی تھی خوابِ پریشاں نیند کچھ ایسی گہری تھی
چونک اُٹھے تھے ہم گھبرا کر پھر بھی آنکھ نہ کھلتی تھی"

آذر: "سبحان اللہ! سبحان اللہ! قبلہ! آپ کی ذہانت میں کیسے شک ہو سکتا
ہے۔ لیکن شعر و شاعری اور دوسرے مشاغل کی وجہ سے آپ
وکالت پہ دھیان ہی نہ دیتے تھے۔ اسی لئے آپ کو اس پیشہ
میں ناکامی ہوئی۔ علیگڑھ سے ۱۹۰۸ء میں وکالت کا امتحان
پاس کرنے کے بعد آپ نے اپنے وطن بدایوں کے بجائے لکھنؤ میں
وکالت شروع کی۔ وہ خوش حالی کا دور تھا اور لکھنؤ اس وقت فنونِ
لطیفہ کا مرکز تھا۔ اسی لئے آپ کا دل بھی لکھنؤ میں خوب لگ گیا ہوگا۔
لکھنؤ کی پرکیف صحبتوں کا اور خصوصاً وہاں کی [illegible]
مشاعروں کا؟ کہیئے کبھی یاد آتی ہیں بیتی ہوئی وہ گھڑیاں — ؟"

فانی: "یاد آ جاتے ہیں جب اگلی محبت کے مزے
لوٹتا ہے دلِ مرا دوزخ میں جنت کے مزے"

آذر: بہت خوب! حضور میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ [illegible]
دھیان نہ دینے سے آپ کو اس پیشہ میں ناکامی ہوئی —
بُرا ہو اس سرزمین کا جہاں آپ جیسے عظیم المرتبت شاعر [illegible]
شکار ہونا پڑا۔ تلاشِ معاش میں آپ کو لکھنؤ [illegible]
پھر آپ نے بریلی اور آگرے میں وکالت کی لیکن آپ [illegible]
لکھنؤ اور وہاں کے قریبے قریبے سے [illegible]
لئے ظاہر ہے کہ لکھنؤ کا چھوٹنا [illegible]
ہے کہ آپ نے اس سلسلہ میں کچھ [illegible]

فانی: اے زمینِ لکھنؤ [illegible]

جمع ہیں دونوں [illegible]
اک جہانِ آرزو [illegible]

آذر: "قبلہ! فانیؔ صاحب [illegible]"

آذر: "اچھا قبلہ! آپ کے کلام کے بارے میں اگر میں اپنی ذاتی رائے ظاہر کروں تو چھوٹا منہ بڑی بات والی مثل بالکل سچ ثابت ہو جائے گی۔ اور میری اپنی رائے بھی کیا ۔۔۔؟ لیکن مستند اہلِ قلم حضرات کی متفقہ رائے آپ کے بارے میں یہی ہے کہ غالب کی حکیمانہ بالغ نظری اور سنجیدہ مزاجی اور میر تقی میر کا سوز و گداز اگر کہیں یکجا ملتا ہے تو وہ صرف آپ کا کلام ہے۔ مرزا غالب کا مشہور شعر ہے کہ ؎

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

اسی بحر اور قافیہ میں غالباً آپ نے بھی طبع آزمائی فرمائی ہے۔ کیا یاد ہے وہ شعر اس وقت آپ کو؟"

فانی: "وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو
پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں"

آذر: "اور مرزا غالب کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے ۔۔۔۔۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

فرمایئے کوئی شعر اس قبیلے کا ۔۔۔۔۔؟"

فانی: "تعمیرِ آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق
جب ہم نے کوئی شاخ چُنی شاخ جل گئی"

آذر: "بہت خوب! قبلہ! ۔۔۔۔ اب میر کے رنگ میں بھی چند اشعار سنانے کی زحمت فرمائیں۔"

فانی: "غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آکے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہیں سو جاتے ہیں"

---

"گو ہستی تھی خوابِ پریشاں نیند کچھ ایسی گہری تھی
چونک اُٹھے تھے ہم گھبرا کر پھر بھی آنکھ نہ کھلتی تھی"

آذر: "سبحان اللہ! سبحان اللہ! قبلہ! آپ کی ذہانت میں کسے شک ہو سکتا ہے۔ لیکن شعر و شاعری اور دوسرے مشاغل کی وجہ سے آپ وکالت پر دھیان ہی نہ دیتے تھے۔ اسی لئے آپ کو اُس پیشہ میں ناکامی ہوئی۔ علیگڑھ سے ۱۹۰۸ء میں وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ نے اپنے وطن بدایوں کے بجائے لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ وہ خوش حالی کا زمانہ تھا اور لکھنؤ اس وقت فنونِ لطیفہ کا مرکز تھا۔ اسی لئے آپ کا دل بھی لکھنؤ میں خوب لگ گیا ہوگا۔ لکھنؤ کی پُرکیف صحبتوں کا اور خصوصاً وہاں کی ادبی نشستوں اور مشاعروں کا؟ کہیے کبھی یاد آتی ہیں بیتی ہوئی وہ گھڑیاں ۔۔۔۔؟"

فانی: "یاد آ جاتے ہیں جب اگلی محبت کے مزے
لوٹتا ہے دل مرا دوزخ میں جنت کے مزے"

آذر: بہت خوب! حضور میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ محض وکالت پر دھیان نہ دینے سے آپ کو اس پیشہ میں ناکامی ہوئی ۔۔۔۔ اور بُرا ہو اس سرزمین کا جہاں آپ جیسے عظیم المرتبت شاعر کو تنگدستی کا شکار ہونا پڑا۔ تلاشِ معاش میں آپ کو لکھنؤ کو خیرباد کہنا پڑا اور پھر آپ نے بریلی اور آگرے میں وکالت کی لیکن آپ کو سرزمینِ لکھنؤ اور وہاں کے ذرّے ذرّے سے بے انتہا محبت تھی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ لکھنؤ کا چھوٹنا آپ کو بے حد شاق گذرا ہوگا۔ ۔۔۔؟ ناممکن ہے کہ آپ نے اس سلسلہ میں کچھ نہ کہا ہو ۔۔۔۔؟

فانی: اے زمینِ لکھنؤ، اے آسمانِ لکھنؤ
تجھ سے رخصت ہو رہا ہے میہمانِ لکھنؤ

گرچہ یہ آوارۂ ملک و وطن کچھ بھی نہیں
تھا مگر منجملۂ دلدادگانِ لکھنؤ

الوداع اے سبزہ و فوارہ و حوض و چمن
رخصت اے جوشِ بہارِ بےخزانِ لکھنؤ

داغ ہے دل پر تری آوارگی کا یہ سبب
الوداع اے خاطرِ نامہربانِ لکھنؤ

جمع ہیں دونوں جہاں اپنے دلِ رنجور میں
اک جہانِ آرزو ہے اک جہانِ لکھنؤ

بے مروت یوں تو سب ہی چاہنے والے ترے
کم ہیں فانی کی طرح شیدائیانِ لکھنؤ"

آذر: "قبلہ! فانی صاحب! سرزمینِ لکھنؤ سے اس بے پناہ عقیدت و محبت کو باشندگانِ لکھنؤ ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ لیکن انتہائی صد افسوس کہ لکھنؤ چھوڑ جانے کے باوجود آپ کی بدنصیبی ہر منزل میں دامنگیر رہی اور وہی ہوا کہ بریلی اور آگرے کا ماحول بھی آپ کے لئے مہان ناموزوں ثابت ہوا اور وہاں بھی وکالت کا پیشہ راس نہ آیا۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد کو اپنے جوابِ جمعے میں

جگر سے جنہوں نے آپ کی ناسازیٔ زندگی کی خبر پاکر بصد احترام آپ کو حیدرآباد بلا لیا تھا بے حد خلوص و محبت سے آپ کے ساتھ پیش آئے۔ حیدرآباد میں تو آپ کے دن ضرور پھرے ہوں گے؟"

**فانی:**
"گردش وہی یہاں بھی سپہرِ کہن میں تھی
غربت میں بھی وہی ہے جو قسمت وطن میں تھی"

**آذر:** "سچ ہے قبلہ! قسمت تو ہمیشہ آگے چلتی ہے۔ اسی فکرِ معاش میں در در کی خاک چھانی، وطن سے بے وطن ہوئے، گلستانِ وطن میں چلنے والے نسیم سحر کے پُرکیف، جانفزا اور لطیف جھونکے جنہوں نے بچپن میں لوریاں دیں اور وطن کی وہ خوبصورت گلیاں اور وہ جگمگاتی ہوئی دلکش شاہراہیں، جن میں پڑھے، پلے اور پروان چڑھے، خواب و خیال ہو گئیں —— لیکن ہائے قسمت وائے دنیا! کہ آپ کے دن نہ پھرنا تھے نہ پھرے۔ آسمان کے ظلم نہ گھٹنا تھے نہ گھٹے۔ بلکہ کچھ اور بڑھ گئے۔"

**فانی:**
"فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا"

**آذر:** "جی ہاں! بے شک! ستم بالائے ستم یہ کہ آپ کے محسن اور مربی مہاراجہ کشن پرشاد شاد بھی قیدِ ہستی سے آزاد ہو کر راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے۔ جب وہی نہ رہے تو اُن کی نوازشیں اور مہربانیاں کہاں۔ آپ کی ناسازیٔ زندگی یوں ہی کیا کم سوگوار تھی کہ ناگہاں آپ کی اہلیہ محترمہ بھی آپ کو اس بے درد دنیا میں تنہا چھوڑ کر عازمِ فردوس ہو گئیں۔ اب اُن کے بعد کیا جینا اور کیسا جینا؟"

**فانی:**
"کیا کروں نازک بہت ہے اُن کی مرضی کا سوال
ورنہ فانی اس جیے جانے سے کچھ حاصل نہیں"

**آذر:** حضور! یہ منہ دیکھی بات نہیں، اظہارِ حقیقت ہے کہ تغزل کے جدید رنگ کو نکھارنے میں حسرت، اصغر اور جگر کے ساتھ ساتھ تاریخ ادب آپ کا نام نامی بھی جلی حروف میں لکھے گا۔ کیونکہ آپ کا انفرادی طرزِ بیان رسمی مضامین میں بھی ندرت پیدا کر دیتا ہے۔ جذبات کی مصوری، تخیل کی بلندی اور آپ کا انتہائی دردناک لہجہ آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اور قبلہ —— میرا تو یہ دعویٰ ہے کہ آپ کے بعد آپ کی جگہ پُر نہیں ہو سکتی۔"

**فانی:**
"یہ کوچۂ قاتل ہے آباد ہی رہتا ہے
اِک خاک نشیں اُٹھا اِک خاک نشیں آیا"

پینٹ گھر میں کوئی بھی پہنے...
ہر پینٹ 'سینفورائزڈ'
کی چھاپ دیکھ کر خریدیں

**•SANFORIZED•**
REGD TD MK

سلیکس ہوں یا ٹراؤزر یا بیل باٹم ۔ ڈرین پائپ ہوں یا ڈینمس یا حرم پینٹ یا پھر وہی پرانی طرز کی سادی پتلون ۔ گھر میں کوئی بھی پینٹ پہنے، کوئی بھی خریدے ہر پینٹ پر سینفورائزڈ کی چھاپ ضرور دیکھ لینی چاہئے ۔

شہرۂ آفاق ٹریڈ مارک 'سینفورائزڈ' آپ کے کپڑے نہ سکڑنے کی قابل اعتماد گارنٹی ہے ۔ اس چھاپ والے لباس خواہ وہ سوتی ہوں یا سوت ملے کپڑوں سے بنے ہوں، متعدد بار دھلنے کے باوجود بھی اپنی اصلی فٹنگ کو برقرار رکھیں گے

Brand Name
•SANFORIZED•

[illegible] کی گہری کسوٹی پر پورا اترتا ہے ۔

وحید مشتاق ایم۔ اے

تیرگیِ دلِ ناکام نکھر جانے دو
گیسوئے گردشِ ایام سنور جانے دو

آ گئے موجِ حیات کو تو کچھ دیر رکو
نبضِ بیمارِ محبت کی ٹھہر جانے دو

یونہی کھلتے رہیں ہر گام پہ گل ہائے حسیں
پرتوِ حسن کو تا حدِ نظر جانے دو

آخری وقت علاجِ غمِ دل رہنے دو
یوں نہ منت کشِ درماں کرو مر جانے دو

اس سے انکار نہیں جرمِ الفت ہے متین
ہے تو رودادِ تعزیر مگر جانے دو

## غزل

ارشد صدیقی ایم۔ اے

لے دے کے اک یہی تو رہی ہے متاعِ زیست
دل سے لگائے پھرتا ہوں زخمِ جگر کو میں

ان سے بچھڑ کے پھر نہ ملا کوئی غم گسار
رکھتا ہوں آج تک اسی دامانِ تر کو میں

چشمِ خرد تو دے نہ سکی حسن کا پتہ
ڈھونڈوں گا اب چراغ بجھا کر سحر کو میں

مارا پھروں صبا کی طرح کیوں چمن چمن
کیا جانتا نہیں ہوں تری رہگذر کو میں

ارشد نہ ہوتی خونِ جگر کی اگر کشید
آواز دے کے بیچتا جنسِ ہنر کو میں

عرش صہبائی

کترا رہے ہیں دیکھ کے پرچھائیاں مری
وجہِ خلش تھیں کل جنہیں تنہائیاں مری

پہنچی ہیں ہر مقام پہ مجھ سے بھی پیشتر
کس درجہ تیز گام ہیں رسوائیاں مری

جب سے دل و دماغ پہ چھائے ہوئے ہیں وہ
ڈسنے لگی ہیں اور بھی تنہائیاں مری

میں جانتا ہوں برق پریشاں ہے کس لئے
اس کی نظر میں ہیں چمن آرائیاں مری

ہوتی ہے اس میں ان کی بھی تشہیر دوستو!
ورنہ انہیں عزیز ہیں رسوائیاں مری

اے عرش اپنے دل سے ہوں مصروفِ گفتگو
دیکھے تو کوئی انجمن آرائیاں مری

رابعہ سلطانہ ناشاد

یہ بادل یہ بھیگی راتیں یہ رت یہ پرکیف ہوائیں
کون ہمارا دکھ سمجھے گا کس کو اپنا حال سنائیں

ٹوٹ چکے ہیں زخم کے ٹانکے بہنے لگا ہے خونِ تمنا
آخر کب تک ضبط کریں ہم آخر کب تک درد چھپائیں

اللہ اللہ یہ پاسِ غمِ دل سے ٹپکیں خون کی بوندیں
توبہ توبہ یہ مجبوری آنسو پلکوں تک بھی نہ آئیں

یاد نہ آ اے بھولنے والے ہم تو تجھے اب بھول گئے ہیں
جو تری یادوں میں گذرے کاش وہ دن بھی یاد نہ آئیں

کس سے کہیں ناشاد کہانی کون ہے مونس کون ہے ہمدم
آنسو پی کر چوٹیں سہہ کر وقت گذاریں عمر بتائیں

# پیاسی رُوحیں

ایم۔ ایچ۔ خاں شاہجہانپوری

معرفت محمود خاں صاحب ۲۰۵۔ تارین جلال نگر، شاہجہانپور (یو۔پی)

محترم خوشتر صاحب۔ سلام و نیاز

ایک افسانہ "پیاسی رُوحیں" بھیج رہا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ اس افسانے کا مطالعہ دو طرح فطری میلانات کو آسودگی دے سکتا ہے۔ ایک طرف تو ۔۔۔۔ مر معنیٰ سے دلچسپی رکھنے والے قارئین اس سے لطف اندوز ہوں گے اور دوسری طرف وہی پرانا موضوع جس کے لئے ہر سینے میں گنجائش ہے۔ بلکہ اُس سینے میں جس میں دل ہے اور سینے میں دل نہ ہونا ابھی ممکن نہیں۔ سائنس ہر چند پلاسٹک کے دل فٹ کر رہی ہے۔ لیکن ابھی ایسا عمل ظہور میں نہ آسکا ہے کہ بغیر دل کے بھی کام چل سکے۔ کاش کبھی ایسا بھی ہو! ۔۔۔۔ افسانہ کچھ طویل تو ضرور ہو گیا ہے لیکن اس میں پیدا شدہ تجسس قارئین کو اس کی طوالت سے بور نہ ہونے دے گا۔ ۔ ۔

خیر اندیش ۔۔۔۔۔ ایم۔ ایچ۔ خاں

اُس حویلی کے متعلق لوگوں کے جتنے منہ تھے اُتنی ہی باتیں۔ کوئی کہتا تھا حویلی منحوس اور عجوبی ہے، کسی کا خیال تھا حویلی میں بھوت پریتوں کا ڈیرہ ہے۔ کوئی اُسے آسیب زدہ، کوئی پُراسرار کہا کرتا تھا۔ بہرحال مجموعی طور پر وہ حویلی اُن کے کہنے کے مطابق کسی انسان کے رہنے کے قابل ہرگز نہ تھی۔ جب سے میرا تبادلہ اِس نئی جگہ پر ہوا تھا، رہائش کا مسئلہ میرے سامنے خونخوار درندے کی طرح منہ پھاڑے کھڑا تھا ایڈمنسٹریشن کی عنایات کے تحت میرے نام الاٹ ہونے والا بنگلہ دوسرے کو دے دیا گیا تھا اور اس حکم کے آگے کوئی اپیل نہ تھی ۔۔۔ اور مجھے سر چھپانے کو کوئی دوسری جگہ چاہیئے تھی۔ اسٹاف کے چند لوگوں نے محض مذاقاً میرے رہنے کے لئے اُس عجیب و غریب حویلی کا تذکرہ کیا۔ اور میں اُس میں رہنے کو تیار ہو گیا۔ شاید اُس حویلی کی پُرتجسس روایت نے مجھے اِس خطرناک اقدام کے لئے اور بھی اُکسایا تھا ۔۔۔۔ اور ایک دن چند لوگوں کو لے کر اُس حویلی کو دیکھنے بھی چل دیا۔ وہ سب مقامی باشندے تھے اور اُن کے خیالات بھی حویلی کے متعلق اچھے نہ تھے۔ اُن کا گمان تھا کہ میں حویلی دیکھتے ہی بھاگ آؤں گا اور پھر کبھی اُدھر کا رُخ بھی نہ کروں گا۔

مشہور تھا کہ اب سے تقریباً تین سو سال پہلے ایک راجہ نے شہری کشمکش سے دُور پُرسکوت اور پُرفضا مقام پر اپنی حویلی تعمیر کرائی تھی۔ راجہ کا انتقال چند ہی سال بعد ہو گیا۔ اُس خاندان کا تنہا چشم و چراغ اُس کا اکلوتا لڑکا مہاراج سنگھ اُس کا وارث ہو گیا۔ اُس نے ابھی شادی نہ کی تھی اور اکیلا ہی حویلی میں رہا کرتا تھا۔ چند سال بعد مہاراج سنگھ کا اُس حویلی میں قتل ہو گیا اور یہ کوئی بھی نہ جان سکا کہ مہاراج سنگھ کا قتل کس نے اور کیوں کیا؟ اُس کی لاش سے البتہ قاتل کی سفاکی اور سنگدلی کا رُوح فرسا ثبوت مہیّا ہوتا تھا۔ اُس کے بعد حویلی کا کوئی بھی وارث نہ تھا اور حویلی میدان ہو گئی۔ نوکر چاکر تک ڈر کر بھاگ گئے ۔۔۔۔ اور پھر جو بھی اُس حویلی میں آکر رہا، رہ نہ سکا۔ یا تو قتل کر دیا گیا یا خوفزدہ ہو کر بھاگ گیا لیکن بھاگنے والوں میں یہ کسی نے بھی نہ بتایا کہ وہ وہاں سے کیوں بھاگا۔ حویلی کی داستان کچھ اِس انداز سے اُنھوں نے مجھے سُنائی کہ مجھ میں خوف کے بجائے اُس کے اسرار جاننے کا اشتیاق بیدار ہو گیا اور میں اُس کے بارے میں اِتنا سب کچھ سُننے کے باوجود اُس میں رہنے کو تیار ہو گیا۔

حویلی بستی سے تقریباً پانچ میل دُور ایک بے حد پُرفضا مقام پر واقع تھی

[illegible] سلیم اور شوخیٔ طبع کی دلیل پیش کر رہی تھی۔ حویلی [illegible] کو آسودگی بخشنے والے قدرت کے دلفریب مناظر تھے۔ [illegible] نفاست کے مٹتے ہوئے نقوش اب بھی راجہ کے لطیف اندازِ فکر کے آئینہ دار تھے۔ [illegible] شفاف نیلگوں پانی کی پتلی سی ندی سُبک خرامی سے بہہ رہی تھی۔ حویلی کے آس پاس ببول اور ناگ پھنی کی خاردار جھاڑیاں اُگی تھیں۔ حویلی دو حصّوں میں منقسم تھی اور دونوں حصّوں کے درمیان ایک خوبصورت سا باغیچہ تھا۔ باغیچہ کے وسط میں ایک عورت کا سنگی مجسمہ نصب تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ راجہ کی بیوی کا مجسمہ ہے جو ندی میں ڈوب کر مرگئی تھی اور پھر راجہ نے دوسری شادی نہ کی تھی۔ باغیچہ میں رنگا رنگ پھولوں اور پھلوں کے پودے تھے اور ستونوں پر عشق پیچاں اور انگوروں کی بیلیں چڑھی تھیں۔ باغیچہ کی نگہداشت کے لئے ایک مالی سرکاری طور پر ملازم تھا جو رات کو اپنے گھر چلا جاتا تھا۔

ہم لوگ زنانی حویلی میں داخل ہوئے تو پاروتی نے بتایا کہ یہی وہ خونی جگہ ہے جہاں رہنے کے بعد پھر کوئی واپس نہیں جاتا۔ پاروتی نے اپنے ڈنڈے سے پھر اشارہ کرکے کہا: "یہ وہ کمرہ ہے جہاں مہاراج سنگھ اِس حویلی کے آخری وارث کا قتل ہوا تھا۔ اُسے اگنی تک نصیب نہ ہوئی اور سڑ سڑ کر شریر ختم ہوگیا تھا ——— اور ہڈیوں کا ڈھانچہ آپ دیکھنا چاہیں تو یہ ہے!" پاروتی نے ڈنڈے سے دھکا دے کر کمرے کے کواڑ ایکدم کھول دیئے۔ دوسرے ہی لمحے ایک وحشت ناک منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا اور میرا رُواں رُواں لرز رہا تھا۔ ایک قیمتی چھپرکھٹ پر ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا ہوا انسانی شان اور رعونت کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ کواڑ کھُلتے ہی سارے چمگادڑ پھڑپھڑا کر اُڑ گئے۔ دُور کہیں اُلوؤں کی خوفناک آواز ماحول میں ہیبت طاری کر رہی تھی۔ تعفّن کا بھبکا ناک سے ٹکرا رہا تھا جو ناقابلِ برداشت سا تھا۔

"آیئے بابوجی!" پاروتی چند قدم آگے بڑھ گئی۔ "بابوجی میرا کہا مانئے یہاں نہ رہیئے آپ!"

"تمھارا کیا خیال ہے اس حویلی کے متعلق؟" میں نے یونہی اُس سے پوچھا۔

"میرا کھیال؟" وہ ایک لمحے کو رُکی پھر بولی ——— "میرا کھیال تو یہ ہے کہ یہ حویلی کسی راکھشش کا نِواس استھان بن گئی ہے۔"

"پاروتی!" میں نے کہا۔ "مجھے آسیبوں اور بھوت پریتوں سے ڈر نہیں لگتا۔ میں یہیں رہوں گا۔ مجھے اِن کے وجود پر اعتقاد نہیں۔"

"بابوجی! ہر آنے والا پہلے یہی کہتا ہے۔ لیکن جب اُس کی ارتھی جاتی ہے تو مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے۔" وہ اُداس سی ہوگئی۔

پاروتی پچاس سال کی بوڑھی عورت تھی۔ وہ سرکاری طور پر اس حویلی میں بطور نگہبان ملازم تھی۔ سیاحت کی غرض سے آنے والے لوگوں کے گائڈ کا کام بھی کرتی تھی۔ میں نے اُسے اپنا فیصلہ سُنا دیا کہ میں کل سے اپنا سامان لے کر چلا آؤں گا۔ میرے رہنے کے لئے ایک کمرہ صاف کردیا جائے اور دوسرے دن میں حسبِ وعدہ وہاں پہنچ گیا۔ پاروتی بہت بااخلاق عورت ثابت ہوئی۔ حویلی بستی سے الگ تھی اس لئے میری پریشانی کو مدِ نظر رکھ کر پاروتی نے میرے کھانے کا انتظام اپنے ذمّے لے لیا۔ وہ دونوں وقت بہت مستعدی اور دیانت داری کے ساتھ مجھے کھانا دے جاتی تھی اور مزید پریشانیوں کے بارے میں بھی پوچھتی رہتی تھی۔ وہ حویلی سے آدھ میل دُور رسول پور گاؤں میں رہتی تھی۔ اُس کی موجودگی میرے لئے قدرت کی بہترین نعمت ثابت ہوئی اور اِس پُراخلاق ماحول میں حویلی کے بارے میں سب کچھ بھول سا گیا۔

کئی ماہ میں بے حد سکون سے رہا اور جیسا کہ اُس حویلی کے بارے میں مشہور تھا کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا۔ لیکن ایک رات! حویلی کے مشرقی کونے والے کمرے سے کسی کے رونے کی آواز نے مجھے سوتے میں جگا دیا۔ رات کے سکوت کو توڑتی ہوئی وہ آواز اتنی دل سوز اور پُرتجسّس تھی کہ خوف و دہشت کا خیال دل سے دُور کرکے پسٹل اور ٹارچ ہاتھ میں لیا اور آواز کی سمت چل پڑا۔ ہر طرف گہری تاریکی تھی، خوفناک سکوت تھا۔ میں دیوانہ وار تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اُس خاص کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آواز اُسی انداز سے آرہی تھی لیکن میں جیسے ہی کمرے کے پاس پہنچا آواز بجلی کے کرنٹ کی طرح یکلخت بند ہوگئی۔ میرے قلب کی حرکت بھی بند ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ لیکن میں نے تیزی سے کمرہ کھول دیا ——— اور دوسرے ہی لمحے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ کمرے کا فرش سُرخ سُرخ خون کے دھبّوں سے لالہ زار بنا ہوا تھا۔ میں نے پسٹل کی گرفت مضبوط کی۔ ٹارچ کی روشنی سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ لیکن وہاں تازہ تازہ خون کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ابھی ابھی کسی کو قتل کیا گیا ہے!

"لیکن مقتول کی لاش کہاں ہے؟ ——— قاتل کون ہے؟ ——— ایسا کیونکر ہوا؟" میری سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ ذہن سوالیہ نشان بن کر رہ گیا۔ میں اسی سوچ کے سمندر میں ڈوب رہا تھا کہ پاس کے کمرے سے موسیقی کی سُریلی لہریں اُبھرتی ہوئی کانوں سے ٹکرائیں۔ میں تیزی سے کمرے کے باہر آگیا۔ میرا رُخ آواز والے کمرے کی طرف تھا۔ وہاں پہنچتے پہنچتے ساز بھی ختم ہوگیا۔ کمرے میں طبلہ، سارنگی، ستار اور دوسرے ساز بہت قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ لیکن وہاں کوئی موسیقار نہ تھا۔ البتہ ایسا معلوم ہوتا تھا ساز ابھی ابھی بجا کر رکھے گئے ہیں۔ سارنگی کے

کمرے سے طلب کی جھنجھناہٹ آرہی تھی۔

"بچاؤ — بچاؤ — مرڈالا — بچاؤ" میں نے پی ۹ کی طرف دہشت ایک نسوانی چیخیں کسی دوسرے کمرے سے ابھر رہی تھیں اور میرے شعور پر بری طرح چھا کر رہ گئیں۔ میں نے غور سے سُنا یہ آوازیں میرے خیال میں اُسی کمرے سے آرہی تھیں جہاں مہاراج سنگھ کا خنجر پڑا تھا۔ پھر پستول کو اور مضبوطی سے پکڑ کر میں اُس کمرے کی طرف دوڑ پڑا۔ وہاں پہنچ کر کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر کوئی بھی حرکت نہ ہو رہی تھی — اور کسی دوسرے متنفس کے وجود کا امکان تک نہ تھا۔ مجھے پسینہ آگیا۔ میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ کئی لمحے تک کمرے کو مختلف زاویوں سے گھورتا رہا۔ پھر وہاں کوئی بھی مشتبہ شے نہ پاکر حویلی کی تاریک شاہراہ پر لڑکھڑاتا اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ وہ میری پریشانیوں کا پہلا دن تھا۔

اُس رات ساری رات مجھے نیند نہ آئی۔ طرح طرح کے خیالات اور شکوک ذہن کو دیمک کی طرح کریدتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ساری حویلی میں خون کی ندی بہہ رہی ہے۔ دہشت کی شدت سے ساری رات میرا بدن لرزتا رہا۔ کچھ دن بعد آہستہ آہستہ میں عادی ہوگیا۔ اب روزانہ ہی ایسی آوازیں آتی تھیں۔ کبھی چیخیں، کبھی کراہیں، کبھی رونے، کبھی قہقہہ لگانے کی آوازیں ماحول میں وحشت و خوف تحلیل کرتی رہتی تھیں اور میں قدرے بے پروائی سے روز ہی سُنتا رہتا تھا۔

---

بہت دن گزر گئے۔ ایک دن دفتر سے واپس آیا۔ تالا کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو اندر کا منظر دیکھ کر قوت بینائی جیسے کچھ ساعت کے لئے سلب ہوکر رہ گئی۔ میرے سب بکس کھلے ہوئے تھے، سارے کپڑے بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ ہر چیز اِدھر اُدھر ہوگئی تھی۔ تہہ کرکے رکھا ہوا بستر بے ڈھنگے پن سے مسہری پر پھیلا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا بکسوں کی تلاشی لی گئی ہے۔ بستر پر کوئی لیٹا رہا ہے۔ میں نے اپنا سامان چیک کیا۔ اِدھر اُدھر عقابی نظریں دوڑائیں۔ لیکن سب کچھ بے سود۔ کوئی چیز چوری نہ گئی تھی۔ ہاں! میرے بکس سے میری ڈائری اور تصویر غائب تھی۔ تکیہ پر دو تین لمبے لمبے سیاہ بال چپکے تھے جو کسی عورت کے ہونے کی غمازی کر رہے تھے۔ لیکن کوئی کمرے میں آیا کس طرح — یہ سب کچھ ایک معمے کی طرح میرے ذہن کو پریشان کرتا رہا۔ دروازے پر تالا اسی طرح پڑا رہا۔ کمرے کی دیواریں بھی مشکوک تصور نہ کی جاسکتی تھیں۔ بہت دیر تک مختلف پہلوؤں سے سوچنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن بالکل بے سود!

دوسرے دن پاروتی آئی تو میں نے حیرت و تفکر سے سب کچھ اُسے سُنا دیا۔ لیکن وہ بہت اطمینان سے صرف میرا منہ دیکھ کر رہ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ بہت سادگی سے کہنے لگی۔

"یہاں یہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ ابھی اور نہ جانے کیا کیا ہو سکتا ہے۔ میرا کہا مانئے اور یہاں سے چلے جایئے۔"

اسی طرح کئی ماہ بیت گئے۔ سردی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اُس روز دن میں پانی کے ہلکے ہلکے چھینٹے پڑے تھے۔ دُھلے ہوئے آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ رات بے حد سہانی اور دلکش تھی۔ چاند پہاڑیوں کی اوٹ سے آہستہ آہستہ اوپر آرہا تھا۔ فضا رنگین اور خاموش تھی۔ ماحول خوشگوار تھا۔ لیکن میرا موڈ اُچاٹ تھا۔ چند دن پہلے میری ڈائری مجھے بستر پر رکھی مل گئی تھی اور اُس میں میرے لئے ایک تحریر بھی تھی — "آپ اِس حویلی کو فوراً چھوڑ دیجئے ورنہ —"

اور میں نے بھی ڈائری میں آگے لکھ دیا تھا: "بھگوان جانے یہ دھمکی ہے یا مشورہ! میں جاننا چاہتا ہوں کہ 'ورنہ' کیا ہوگا —؟"

ڈائری میں نے وہیں چھوڑ دی۔ دوسرے دن ڈائری میں، میں نے جواب لکھا ہوا پایا: "ورنہ آپ سے پریم ہو جائے گا!" میں نے پھر ڈائری میں لکھ دیا۔ "حیرت ہے! یہاں تو قتل ہوتے آئے ہیں۔ یہ پریم کا حادثہ کیوں ہونے والا ہے؟" دوسرے دن ڈائری میں پھر لکھا تھا: "مجھے خود حیرت ہے ایسا کیوں ہونے والا ہے۔ آپ نے اِس حویلی کی روایت کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔"

میں نے پھر لکھ دیا: "کتنی عجیب بات ہے میں آپ سے پریم کرتا ہوں گو غائبانہ ہی طور پر سہی۔ آپ کو بھی یقیناً کچھ لگاؤ کا احساس ہوگا لیکن میں آپ کے بارے میں کچھ جانتا نہیں، آپ کو دیکھا تک نہیں۔"

ڈائری میں پھر لکھا پایا: "میرے وجود کو آپ محسوس کر سکتے ہیں دیکھ نہیں سکتے — اور نہ میرے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کریں تو اچھا ہے۔"

یہ سب کچھ تحریری پیام و سلام اُسی انداز میں ہوا جس طرح تالا لگا رہنے پر میرے کمرے کی پُراسرار انداز میں تلاشی لی گئی تھی۔ لیکن پھر میں اِتنا خوفزدہ نہ ہوا جتنا پہلی بار ہوا تھا۔ لیکن میری سمجھ میں پھر بھی کچھ نہ آیا۔ اِس کے بعد پھر ڈائری میں کچھ بھی لکھا نہ پایا۔ روزانہ دفتر سے آکر اشتیاق کے ساتھ ڈائری کی ورق گردانی کرتا۔ لیکن ایک لفظ بھی لکھا نہ پاکر طبیعت بے حد افسردہ ہوتی۔ ایک غائبانہ ہستی نے میرا اشتیاق بڑھا کر احساسات میں انتشار برپا کرکے مدہوش کر دیا۔ اب اِس حویلی کی پُر تجسس روایت سے زیادہ میں اُس غائبانہ کشش کے تجسس میں کھو کر رہ گیا جس میں دھیمی دھیمی لذت شامل تھی، کچھ کسک بھی تھی اور

اُس سب کے پیچھے ایک عجیب لطیف جذبہ انگڑائی لے رہا تھا۔

اُس وقت میں اُسی کے خیال میں غلطاں و پیچاں اپنے کمرے کے آگے دالان میں ٹہل رہا تھا کہ اُسی وقت حویلی کے جنوبی گوشے سے ایک نہایت کیف آگیں گانے کی لہر اُٹھی۔ کوئی عورت سُرور کے عالم میں گاتی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کا لہجہ دیہاتی تھا۔ بولی بھی صاف سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ لیکن اُس کا مفہوم یہ تھا ——— "پردیسی سے پریم نہ کرنا چاہئے!" آواز اتنی پُرکشش اور تاثر انگیز تھی کہ میں سرشار ہو گیا۔ نادانستہ اُس کی طرف کھنچنے سا لگا۔ میں راہداری پار کر کے آواز کی طرف چل دیا۔ دُور اخروٹ کے پیڑ کے نیچے ایک دُھندلا سایہ چہل قدمی کے انداز میں حرکت کر رہا تھا۔ پتّوں سے چھن چھن کر چاندنی اُس پر سیمی دھبّوں کی شکل میں پڑ رہی تھی۔ اُسے صاف پہچانا نہیں جا سکتا تھا لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا تھا کہ وہ عورت ہے۔ اُس کا جسم کالی ساری میں ملبوس معلوم ہو رہا تھا۔

میں اور قریب پہنچا تو شاید اُسے میری موجودگی کا احساس ہو گیا۔ وہ سایہ تیزی سے باغ کی طرف مُڑ گیا۔ میں نے تعاقب کر کے اُس کے پاس پہنچنے کی کوشش کی۔ دیکھتے دیکھتے سایہ پیڑوں کی آڑ میں غائب ہو گیا۔ پھر باغ میں لاکھ ڈھونڈنے پر بھی میں اُسے پا نہ سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا سایہ ہوا میں تحلیل ہو گیا، یا زمین نے نِگل لیا۔

---

اِسی کشمکش میں اور چند ماہ گزر گئے۔ ڈائری میں کئی بار لکھ لکھ کر اُس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی لیکن کوئی جواب نہ پایا۔ ایک دن دفتر سے سنیما دیکھنے چلا گیا۔ رات کو گیارہ بجے حویلی میں واپس آیا تو اُسی طرح ہُو کا عالم تھا۔ فضا میں سراسیمگی لئے ہوئے تاریکی ناچ رہی تھی۔ بس کسی پیڑ پر کسی پرندے کے پھڑپھڑانے کی آواز کبھی کبھی اُس سکوت کو توڑ دیتی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو اپنے کمرے کے دروازے کے پاس ایک عکس کو محسوس کیا۔ پہلے تو میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ پھر نہایت احتیاط کے ساتھ کمرے تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ پستول بھی گرفت میں کر لیا اور بالکل پاس پہنچ کر ایکدم ٹارچ جلا کر حرکت کرتے ہوئے سایہ پر روشنی ڈالی۔ سایہ سے گھبراہٹ کا اظہار ہوا۔ میں بالکل اُس کے پاس کھڑا تھا۔ پھر میں نے ہمّت کر کے روشنی کا دائرہ اُس کے منہ پر پھینکا۔ روشنی میں پہچاننے میں دُشواری نہ ہوئی ——— وہ باغ کا مالی تھا۔ میں نے کرخت لہجے میں کہا: "تم یہاں کیسے ہو؟"

اُس نے گھبرا کر ہکلاتے ہوئے کہا: "م ——— میں ——— یوں ——— ہی!" وہ جملہ بھی پورا نہ کر سکا۔

"یونہی کیسے؟" میں نے اور تلخی سے کہا: "تمہارا تو کہنا ہے تم اپنے گاؤں چلے جاتے ہو۔"

"ہاں بابو جی روز ہی گھر چلا جاتا ہوں۔ پر آج کل انگوروں کا سیزن ہے۔ چمگادڑ بڑا نقصان کرتے ہیں۔ میں اِسی لئے رات میں رُک گیا تھا۔"

"لیکن یہ باغ تو نہیں ہے۔ تم یہاں کیسے گھومتے تھے؟"

اُس نے پھر کہا: "بیڑی پینے کا من چلا تھا۔ ماچس ختم ہو گئی تھی۔ سوچا حضور سے مانگ لوں گا۔ اِسی لئے چلا آیا تھا۔"

کئی لمحے تک میں اُسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے محسوس کیا وہ کوئی چیز اپنی دھوتی کی پھینٹ میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو وہ پستول تھا۔ میں نے بھی اپنا پستول کس کے پکڑ لیا اور انتہائی غصّے سے کہا۔ "تمہارے ہاتھ میں پستول کیوں ہے؟"

وہ ایکدم زور سے ہنس پڑا اور بولا: "ارے صاحب آپ بھی مذاق کرتے ہیں۔ ہم غریبوں کے پاس بھلا پستول کہاں؟ یہ تو بالکوں کا کھلونا ہے۔ اِس میں گندھک اور پوٹاس بھر کر چھوڑتا ہوں تو دھماکے سے چمگادڑ بھاگ جاتے ہیں۔"

فوراً ہی اُس نے پستول کا ٹریگر دبا دیا۔ فضا میں دھماکہ ہوا اور چمگادڑ پھڑپھڑا کر اُڑ گئے۔ مالی تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا باغ کی طرف چلا گیا۔ میں دُور تک اُسے دیکھتا رہا۔ وہ ماچس مانگنے آیا تھا اور ماچس مانگے بغیر چلا گیا۔ اُس رات بھی خیالات کی تلاطم خیز موجوں نے مجھے سکون سے سونے نہ دیا ——— اور دوسرے دن باغ میں مالی کی لاش پائی گئی۔ میں نے خود اُسے دیکھا۔ اُسے کسی تیز دھار والے خنجر سے قتل کیا گیا تھا۔ پاروتی نے مجھے بتایا کہ اِس حویلی میں سارے قتل اِسی طرح کے ہوتے ہیں۔ جیسے سارے قتل ایک ہی چیز سے ہوئے ہیں۔ بھگوان جانے کون سفّاک اِس حویلی میں پناہ لینے والے کے خون کا پیاسا تھا۔ میری سمجھ میں ذرا بھی نہ آیا۔ اُس چشم دید حادثے نے میرے حواس باختہ کر دیئے۔ میں کتنے حوصلے سے آیا تھا لیکن مالی کے قتل نے مجھے اتنا ہی سراسیمہ کر دیا کہ میں نے حویلی کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اِس حویلی کے کشش آمیز تجسّس نے مجھے وہاں سے جانے نہ دیا۔ میں دانستہ روح فرسا موت سے کھیل رہا تھا۔

ایک دن سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے احساسات میں عجیب بھینی بھینی خوشبو تیر رہی ہے اور پھر یہ بھی محسوس ہوا کہ کسی کی مُشکبار زُلفیں میرے بہت قریب لہرا رہی ہیں یا میرے تکیے پر بکھری ہوئی ہیں۔ آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں نیم وا کیں تو دہشت سے میرا دل زخمی پرندے کی طرح

پھر بھی اگر رہ گیا۔ واقعی کوئی جوان سی لڑکی اپنی سیاہ گھنیری زلفیں بکھیرے میرے اوپر جھکی تھی۔ لیمپ کی مدھم روشنی میں بھی اُس کا چہرہ دیکھا جا سکتا تھا۔ اُس کے چہرے کے نقوش سے صباحت اور معصومیت جھلک رہی تھی۔ اُس کا رنگ صبح کی تنویر میں پلا سے سنہلتے ہوئے کنول کی طرح اُجلا تھا۔ اُس کے ہونٹ یاقوت کی مانند سرخ تھے۔ آنکھوں کے پیالے ہوش شکن شراب سے لبریز تھے۔ اُس کے بال نیم عریاں گورے بازوؤں پر بے ترتیبی سے بکھرے تھے اور اُن سے بہترین قسم کے سینٹ کی خوشبو اُڑ رہی تھی۔ اُن میں سے بالوں کی کچھ ریشمیں لٹیں میرے چہرے کے اوپر لہرا رہی تھیں۔ اُس کی سانسوں کی گرمی میں محسوس کر رہا تھا۔ میرا جی چاہا اپنے دونوں بازو پھیلا دوں اور اُسے اُن میں سمیٹ لوں۔ اُس کی آنکھوں سے چھلکتی ہوئی شراب پی جاؤں ——— لیکن اُس لمحہ مجھے ڈائری میں لکھے جملے کا خیال آیا ——— "آپ مجھے محسوس کر سکتے ہیں چھو نہیں سکتے!" میں کانپ کر رہ گیا ——— اور اُسی وقت میری پلک جھپک گئی ——— اور وہ برق کی سی تیزی سے سیدھی کھڑی ہو گئی اور بھاگنا چاہا۔ لیکن میں نے بھی بہت پھرتی سے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس نے چھڑانے کی ناکام جد و جہد کی لیکن میری گرفت مضبوط تھی۔ میں نے جھٹکا دیا وہ میرے سینے پر گر پڑی۔ اُسی وقت اُس کے دوسرے ہاتھ میں تھاما ہوا ایک خوشبودار رومال ایکدم میرے منہ پر آ گرا اور ——— پھر مجھے خبر نہیں کیا ہوا؟ اور یہ سب کچھ کیا تھا؟ صبح جب آنکھ کھلی تو کمرہ اندر سے اُسی طرح مقفل تھا۔ لڑکی غائب تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا رات میں نے کوئی حسین خواب دیکھا تھا اور جو کچھ محسوس کیا تھا فریبِ خیال تھا۔ لیکن صبح خواب کے یقین کو جھٹلانے کے لئے ایک ثبوت تھا۔ میرے بستر پر ایک طلائی انگوٹھی پڑی تھی جو شاید میرے ہاتھ کھینچنے پر اُس کی اُنگلی سے نکل گئی ہوگی۔ لیکن وہ کون تھی؟ کدھر سے آئی تھی؟ تالا لگا رہنے کے باوجود کہاں چلی گئی؟" ایک لمحے کو مجھے یقین سا ہونے لگا کہ واقعی حویلی میں روحوں کی حکمرانی ہے اور یہاں کسی انسان کو ہرگز نہ رہنا چاہیے۔

چند دن بعد میری محسنہ میری ہمدرد پاروتی کو بھی کسی ظالم نے بیدردی سے قتل کر دیا۔ جس نے میری رہی سہی ہمت بھی چھین لی۔ پاروتی کو بھی اُسی طرح حویلی کے باغ میں قتل کیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس حویلی میں رہنے والے سے اُنسیت رکھنے والے کو بھی قاتل کی زندگی گوارا نہیں۔ پاروتی کی موت نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ حویلی کے ہر گوشے سے خون ہی خون کا رنگ نظر آتا تھا! ہر طرف خنجر کی چمک محسوس ہوتی تھی! پھر بھی میں حویلی کو چھوڑ نہ سکا۔ ایک غائبانہ کشش نے میرے پیروں میں بیڑیاں سی ڈال دی تھیں۔ میرے اوپر جھکا ہوا اُس لڑکی کا حسین چہرہ اب بھی میرے تحت الشعور میں غیر فانی نقش کی طرح موجود تھا۔ مجھے کبھی کبھی اپنی نادانی پر غصہ بھی آتا تھا کہ یہ کہاں کی محبت ہے! بھگوان جانے وہ انسان ہے یا محض فریبِ خیال! پھر بھی کوشش کے باوجود میں اُسے فراموش نہ کر سکا اور حویلی بھی نہ چھوڑ سکا۔

---

پاروتی کے قتل کو کئی ماہ گزر گئے۔ وہ دھیرے گانے کی دل سوز تان اب بھی کبھی کبھی رات کے سکوت سے اٹکھیلیاں کرتی سنائی دیتی تھی اور میں بے اختیار اُس کی طرف کھنچتا چلا جاتا تھا۔ لیکن میں کبھی اُس کے پاس پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ایک شب ——— "نہیں!" ——— کی آواز چیخ کے سے انداز میں سوتے سوتے میرے کانوں سے ٹکرائی۔ فوراً میری آنکھ کھل گئی۔ میں ششدر سا رہ گیا۔ وہی لڑکی میرے سرہانے کھڑی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چمکدار خنجر تھا۔ وہ تیز تیز سانسیں لے رہی تھی۔ خنجر اب بھی ہاتھ میں لرز رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ اُس کی نظریں میری نظروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ جن میں میں نے محسوس کیا خنجر چلانے کا حوصلہ نہ تھا۔ میں نے پھرتی سے یکدم اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ وہ وحشیانہ انداز میں زور سے چیخ پڑی ——— "نہیں نہیں! میں ایسا نہیں کر سکتی!!"

"کون ہو تم؟" میں نے گرفت اور مضبوط کر کے کہا۔

وہ برجستہ بولی: "میں وہی ہوں! آپ کو قتل کرنے آئی تھی!"

"کیوں ———؟"

"کیونکہ یہ یہاں کی ریت ہے کوئی بھی مرد یہاں نہ رہے۔"

"لیکن سب کچھ کیوں ایسا ہے؟ صاف صاف بتلائیے۔ ذرا میں آپ کی پُراسرار شخصیت کے بارے میں بھی جاننا چاہتا ہوں۔ جب آپ قتل کرنے آئی تھیں تو پھر مجھے قتل کیوں نہ کیا تاکہ قاتل کا عہد جھوٹا نہ ہوتا۔"

وہ بہت دل سوز انداز میں بولی: "میں آپ کو قتل نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ——— کیونکہ مجھے آپ سے پریم ہے ——— اور کوئی عورت اپنے پریمی کو قتل نہیں کر سکتی۔ پریم پُرانی روایتوں کو بدل سکتا ہے، اپنا وچن توڑ سکتا ہے!"

"میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا ہے۔"

"سب کچھ جان جائیں گے آپ۔ اب تو میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپا سکتی ——— لیکن اس راز کو جاننے کے لئے دو وچن دینا ہوں گے۔ کیا آپ تیار ہیں؟"

خود بخود اقرار میں میرا سر ہل گیا۔ وہ پھر بولی "پہلا وچن یہ ہے کہ یہ راز آپ ہمیشہ راز رکھیں گے۔ وعدہ کیجئے!" میں نے وعدہ کر لیا تو وہ بولی۔ "مجھے آپ پر وشواس ہے۔ اب آپ کو سب کچھ بتا دوں گی۔ دوسرا وچن راز جاننے کے بعد دینا ہوگا۔ اگر آپ نے دوسرا وچن نہ دیا تو میں خود زندہ نہ رہوں گی۔ سب کو قتل کرنے والا یہ خنجر میرے سینے میں اتر جائے گا!" یکایک اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔ وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دئے۔ وہ میرے برابر بیٹھ گئی۔ اس نے خنجر دُور پھینک دیا۔ میں نے کہا "آپ اطمینان رکھئے، یقین کیجئے میں ہر ممکن وچن دینے کو تیار ہوں۔ لیکن مجھے یہ اسرار جاننے کا بے حد اشتیاق ہے۔"

اس نے ایک تڑپتی ہوئی نگاہ میرے چہرے پر ڈالی۔ آنکھوں کو پونچھا۔ کچھ دیر کچھ سوچتی رہی پھر کہنے لگی۔

"یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ اب سے تین سو سال پہلے اس حویلی کو راجہ ویر سنگھ نے بنوایا تھا۔ راجہ بڑا سجن اور دھرماتما تھا۔ اس کے زمانے میں رینوپور میں کوئی ایک وقت بھی بھوکا نہ رہتا تھا۔ لیکن راجہ ویر سنگھ جتنا سجن اور دھرماتما تھا اس کا لڑکا مہاراج سنگھ اتنا ہی بدکار اور برا نکلا۔ راجہ ویر سنگھ کی موت کے بعد مہاراج سنگھ کو اپنے شوق پورے کرنے کا اور بھی موقع مل گیا۔ حویلی کا کوئی وارث نہ تھا اس لئے مہاراج سنگھ اکیلا ہی حویلی میں رہتا تھا۔ یہ حویلی جہاں پہلے کیرتن اور پاٹھ کے مشبد گونجا کرتے تھے، پازیب اور گھنگھروؤں کی جھنکار سے گونج اٹھی۔ یہاں زبردستی کنواری، خوبصورت، نوعمر لڑکیوں کو لایا جانے لگا۔ انھیں ناچنے کے لئے مجبور کیا جانے لگا —— حویلی میں اس ظلم کی کوئی اپیل نہ تھی —— اور روزانہ رینوپور کی ایک نوجوان کنواری نوخیز کلی زبردستی مسل ڈالی جاتی تھی۔

ایک دن رینوپور کی ایک خوبصورت لڑکی سُمنا کو بھی زبردستی لے جا کر راجکمار کے حضور پیش کر دیا گیا۔ سُمنا کا بوڑھا باپ زندگی اور موت کی کشمکش میں جاں بلب پڑا تھا۔ لیکن راجکمار کا حکم بھلا کیسے ٹالا جا سکتا تھا —— اور سُمنا کے ساتھ بھی وہی ہوا جو ہوتا آیا تھا —— دوسری صبح جب اسے رینوپور پہنچایا گیا تو اس کا باپ مر چکا تھا۔ جیسے سُمنا کی زندگی اس سے چھن گئی تھی۔ وہ غم و غصہ سے بوکھلا کر رہ گئی۔ انتقام کی آگ نے اسے پاگل کر دیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ جب تک راجکمار کو موت کے گھاٹ نہ اتار دے گی، چین سے نہ بیٹھے گی۔ اس نے یہاں تک فیصلہ کر لیا کہ اس حویلی کو کبھی آباد نہ ہونے دے گی! اس میں رہنے والے ہر مرد کو قتل کر دے گی —— اور اس نے [illegible] اپنے عہد کو پورا کر دیا۔ اس نے راجکمار کے علاوہ بھی اس حویلی میں رہنے والوں کے بے شمار قتل کئے اور مرتے وقت اس نے اپنی لڑکی چمپا کے دل میں اس حویلی میں بسنے والے کے خلاف شدید نفرت بھر کے وچن لیا تھا کہ وہ بھی کبھی اس حویلی کو آباد نہ ہونے دے گی اور یہی وصیت اپنی لڑکی کو بھی کر جائے گی تاکہ انتقام کی کڑی کبھی ٹوٹنے نہ پائے اور انتقام کی کڑی کبھی نہ ٹوٹی۔ چمپا کی لڑکی مادھوری نے ساری زندگی اپنے وچن کو نبھایا اور حویلی کو ہمیشہ ویران رکھا۔ مادھوری نے اپنی لڑکی پاروتی کو بھی ہدایت کر دی کہ حویلی میں اسی طرح بسنے والوں کو قتل کرتی رہے۔"

میں نے بیچ میں ٹوک کر کہا "بڑی لمبی اور کامیاب سازش ہے لیکن یہ سب ہوا کیسے کہ آج تک یہ راز کسی پر نہ کھل سکا؟"

اس نے پھر کہنا شروع کیا "بابو جی! سُمنا نے دن رات شدید محنت کر کے اپنی جھونپڑی سے اس حویلی تک ایک خفیہ سرنگ تیار کر لی تھی جس کے بارے میں آج تک کسی کو نہیں معلوم۔ اس سرنگ کا اس حویلی کے ہر کمرے سے تعلق ہے۔ اس مخصوص جھونپڑی سے حویلی کے ہر کمرے میں پوشیدگی کے ساتھ

آسانی سے جایا جا سکتا ہے۔ کمروں میں فرش کے رنگ کے قالینوں سے چھپے رہتے ہیں۔ اچانک دیکھتے ہی دیکھتے اس نے شمالی گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں فرش پر بچھے ہوئے قالین کا کونا اٹھا ہوا تھا اور اس کے نیچے ایک مربع نما شعلہ سا نشان معلوم ہوتا تھا۔ سرنگ کا ٹکڑا بالکل فرش کے رنگ کا تھا جو کبھی نظر میں پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ میں بنانے والے کی فنکاری پر حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ پھر کہنے لگی ـــــــ

"تمہاری ماں ہمیشہ اس سرنگ کے ذریعہ رات میں آکر آدمی کو سوتے میں اپنے خنجر سے قتل کر دیتی تھی اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوتی تھی!"

"کیا مادھوری کی لڑکی پاروتی وہی پاروتی ہے جس کا ابھی چند ماہ پہلے قتل ہوا ہے؟"

"ہاں!" اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ "لیکن وہ اوروں کی بہ نسبت کم ظالم تھی۔ پہلے وہ یہاں آکر رہنے والے کو ڈرا دھمکا کر بھگانے کی کوشش کرتی۔ پھر بھی کوئی نہ جاتا تھا تو مجبوراً قتل کرتی تھی۔ آپ سے اسے نہ جانے کیوں خاص ہمدردی تھی۔ وہ آپ کو قتل کرنا نہیں چاہتی تھی اور مسلسل کوشش کرتی تھی کہ آپ چلے جائیں۔ جس کے لئے اس نے کیا کیا نہ کیا۔ لیکن آپ نہ گئے۔ رونا، چیخنا، قہقہے لگانا، سنگیت بجانا، اس نے سب کچھ آپ کو خوفزدہ کرنے کے لئے کیا۔ ایک دن اس نے ایک کمرے میں کئی کبوتر کاٹ کر خون ہی خون پھیلا دیا تھا۔ لیکن آپ پھر بھی نہ گئے۔ وہ سب کچھ کر کے ہار گئی تھی۔ اسے ایک دن اپنی ماں کو دئے ہوئے وچن کا شدت سے احساس ہوا اور اس نے مجبوراً آپ کو قتل ہی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اسی کے تحت ایک رات آپ کو قتل کرنے آئی تھی۔ لیکن آپ کمرے میں نہ تھے۔ وہ آپ کا انتظار کرنے کے لئے باغ میں چلی گئی۔ اتفاق سے اس دن باغ کا مالی گھر نہ گیا تھا اور اس نے پاروتی کو دیکھ لیا۔ خنجر پاروتی کے ہاتھ میں تھا۔ ویسے بھی اس وقت باغ میں پاروتی کی موجودگی غیر معمولی بات تھی۔ راز افشا ہونے کے ڈر سے پاروتی نے اس خنجر سے موقع پاکر مالی کو قتل کر دیا کہ یہ راز مالی کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو جائے!"

میں نے حیرت سے بیچ میں ٹوک کر کہا: "اس ساری روداد سے آپ کا کیا تعلق ہے؟ آپ مجھے کیوں قتل کرنا چاہتی تھیں؟"

دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں پھر نم ہو گئیں۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "ذرا دھیرج سے، میں بھی اسی زنجیر کی ایک کڑی ہوں۔ پاروتی میری ماں تھی۔ اس نے مجھے بھی نسلوں سے چلی آنے والی ہدایت کی تھی اور وچن لیا تھا کہ انتقام کی اس روایت کو ہمیشہ پوری کروں گی۔ لیکن جب آپ آئے تو میں اپنی شدھ بدھ آپ کو دیکھ کر بھول گئی۔ ماں کو دیا ہوا وچن ڈگمگا کر رہ گیا۔ آپ نے میرا من جیت لیا ـــــ اور میں آپ سے نفرت کرنے کے بجائے محبت کرنے لگی۔ میں ہر روز آپ کو دیکھنے آتی تھی۔ گھنٹوں آپ کے پاس بیٹھی رہتی تھی لیکن مجھے اپنے وچن کا اتنا پاس ضرور تھا کہ میں کبھی آپ کے سامنے نہ جا سکی۔ پھر میری ماں کو میرے پیار کا پتہ چل گیا۔ وہ غصے سے پاگل سی ہو گئی۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ میں آپ کو اپنے ہاتھ سے قتل کروں۔ میں لرز کے رہ گئی۔ آپ خود سوچئے مجھ سے یہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ ماں کا غصہ اور شدید ہو گیا۔ ایک دن وہ خود آپ کو قتل کرنے چل دی تاکہ پریم کا بندھن خود ہی ٹوٹ جائے۔ وہ آپ کو قتل کرنے جا رہی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھے قتل کرنے والی ہے۔ میں نے اسے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن انتقام کی آگ نے اسے اندھی کر دیا تھا۔ وہ نہ مانی ـــــ اور پھر آپ کے پریم نے مجھے میری ہی ماں کو قتل کرنے کو مجبور کر دیا۔ میں نے پیچھے سے چھرا گھونپ کر اسے ہلاک کر دیا۔ مرتے وقت تڑپ تڑپ کے میری ماں نے مجھ سے کہا تھا ـــــ بیٹی تو نے جو کیا اچھا کیا۔ لیکن اب مجھے وچن دے کہ کبھی اس حویلی میں کسی رہنے والے سے پریم نہ کرے گی اور میری سوگند کھا کے کہ اپنے پریم کو بلیدان کر کے تو وہی کرے گی جو میں کرنے جا رہی تھی۔ تو اس بابو کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے گی!" میں کچھ بھی نہ بول سکی۔ میں ایسے دوراہے پر کھڑی تھی جہاں ایک طرف آپ تھے اور دوسری طرف آخری سانسیں لیتی ہوئی میری ماں! ایک طرف پریم تھا اور دوسری طرف ماں کی آخری آرزو! میرے منہ سے ایک بول بھی نہ نکلا۔ میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ میری ماں کی آنکھیں پتھرائی جا رہی تھیں۔ اس نے پھر بہت مشکل سے کہا تھا: "اگر تو اس بابو کو قتل نہ کرے گی تو تیری نانی، پرنانی اور ماں کی روحیں خون کی پیاس سے تڑپتی رہیں گی!"

اور پھر دم توڑتی ہوئی ماں کو میں نے وچن دے دیا تھا کہ میں قتل کروں گی ـــــ ضرور کروں گی چاہے کچھ بھی ہو!" ماں مر گئی تھی اور میری زندگی ایسے راستوں پر چل رہی تھی جہاں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے تھے۔ ماں کا وچن پورا کرتی تھی جب بھی میری ہار تھی اور نہ کرتی تھی تو خاندان کی آتماؤں کی بے چینی میری شہ رگ کو کاٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ بہت دنوں تک میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ کئی بار فیصلہ کر کے گئی کہ آپ کو قتل کر دوں گی۔ لیکن ہر بار میرا ہاتھ لرز گیا۔ میری ہمت ٹوٹ گئی اور میں واپس آگئی۔ ایک دن ماں کو دیا ہوا وچن میرے کچوکے لگانے لگا اور تب میں نے آنکھ بند کر کے عہد کر لیا کہ

اپنا دامن ضرور چھڑا لوں گی بلا سے پریم کی شاہراہ پر میری شکست ہو جائے۔
اس کے بعد کئی بار بڑے حوصلے سے آپ کو قتل کر دینے کا قصد کر کے آئی تھی۔
لیکن جب آپ کے پاس پہنچی تو لاکھ کوشش کے باوجود میں ایسا نہ کر سکی۔ کہتے
ہیں آنکھیں چار ہوتے ہی پیار آجاتا ہے۔ لیکن آپ کی تو بند آنکھوں میں بھی ایسا
وہ جادو تھا کہ اپنے ہوش و حواس، قوت اور حوصلہ برقرار نہ رکھ سکی۔ کئی بار
خنجر اٹھا ــــ گرا گرا ــــ اٹھا۔ لیکن میرے ہاتھوں کی لرزش نے خنجر
آپ کے سینے میں اتارنے نہ دیا۔ آپ کے چہرے پر ایسی معصومیت اور پریم
تھا کہ میں ہمت ہار گئی ــــ اور میری چیخ نکل گئی ــــ آپ جاگ پڑے۔"

میں حیرت و استعجاب کے سمندر میں غرق اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے
گلابی رخساروں پر خفیف سی حیا کے ڈورے لہرا رہے تھے۔ اُس کی نگاہیں
فرش پر گڑی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے ایک اُچٹتی سی نظر میرے اوپر
ڈالی اور بولی ــــ

"شاید آپ یہ بھی پوچھنا چاہیں گے کہ جس دن آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا
تو دوسرے ہی لمحے آپ بے ہوش کیوں ہو گئے تھے؟"

میں نے پُر اشتیاق نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک لمحہ
رک کر پھر بولی "میں نے آپ کے منہ پر کلوروفارم میں ڈوبا ہوا رومال ڈال
دیا تھا جس نے آپ کو فوراً بے ہوش کر دیا تھا اور میں اُسی راستے سے فوراً
چلی آئی تھی۔"

میں اب بھی اس حویلی کے روایتی اسرار اور پُر تجسس حالات میں کھویا
ہوا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا اُس نے جو کچھ بھی سنایا ہے ایک خواب ــــ
وحشت ناک خواب دکھایا ہے جو آنکھ کھلتے ہی ایک لمحہ میں ختم ہو جائے گا۔
میری نگاہیں بار بار اُس کے چہرے کی طرف اٹھتی تھیں اور یہ ماننے کو جی نہ
چاہتا تھا کہ کسی عورت کا دل بھی اتنا سخت ہو سکتا ہے کہ وہ ساری زندگی
قتل کرتی رہے اور دوسری طرف اِس لڑکی کی طرح بھی کوئی عورت ہو سکتی
ہے جو اپنا دامن تو توڑ دے۔ لیکن پیار نہ توڑے ــــ اور وہ پیار بھی جو
محض تصوراتی ہو!

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" اُس کی آواز سے میں چونک پڑا "شاید
آپ کو یقین نہیں آرہا ہے۔"
اُس کی آواز رندھ گئی۔

"نہیں، نہیں" میں نے جلدی سے اُس کی دلجوئی کے لئے کہا "مجھے
پورا وشواس ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ کا دوسرا دامن کیا ہے جو آپ
مجھ سے لینا چاہتی ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی یہ شرط بھی پوری کروں گا
دامن دینا ہوگا۔"

"کیا یہ بھی مجھے زبان سے ہی بتانا پڑے گا۔ آپ خود نہیں سمجھ سکتے کہ میں
آپ سے کیا دامن چاہتی ہوں!" اُس کی نگاہیں جیسے زمین میں گڑ گئیں۔ اُس کے
لہجے میں حجاب کا طوفان موجزن تھا۔

میں نے آہستہ سے اُسے اپنے قریب کھینچ لیا۔ وہ شرم سے سمٹی
جا رہی تھی۔ اُس کے شفاف کندن جیسے چہرے پر مقدس معصومیت لرزاں تھی۔
میں نے کہا۔

"میں سمجھ گیا۔ میں دامن دیتا ہوں۔ وشواس کرو۔ اب یہ حویلی ویران
نہ رہے گی۔ اب اِس حویلی میں قتل نہ ہوں گے۔"

---

سیریڈون

# صُلح

## ظفر اقبال سہسرامی

کیرآف کیلاش پرشاد جیسوال۔ سرکاری گولہ سہسرام (بہار)

محترم خوشتر صاحب

کوئی بھی رنجور و مغموم انسان ہو۔ اگر اسے ایک زندہ دل اور خوش باش دوست کی رفاقت مل جائے تو وہ اپنے رنج و غم کو بڑی حد تک بھول جاتا ہے۔ مجھے بھی ان دنوں ایک ایسا رفیق ملا ہوا ہے جو بچپن کا دوست تھا۔ وہ ہے حکیم محمد ابراہیم سعید ن! اس کا کہنا ہے کہ وہ سہسرام کی دو چیزوں سے خوب فائدہ اٹھا رہا ہے۔ پہاڑ اور پہاڑی ہوا ــــ اور حقیقت بھی ہے۔ آپ نے بہت سے جنت نظیر مقامات کی سیر کی ہوگی۔ ایک بار آپ برسات کے موسم میں اگر ان پہاڑوں کی سیر کر لیں تو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ پہاڑ کتنے پُربہار ہیں ــــ نہ جانے کتنے سال بعد اِس بار مجھے اس کے ساتھ ان بہاروں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ جی تو چاہتا ہے کہ اس حسین نشیلی فضا میں بیٹھ کے صفحے سیاہ کر ڈالوں۔ لیکن اپنی دُنیا میں واپس آکر کچھ لکھا ہی جاتا نہیں ــــ "صلح" اسی فضا کی ترجمان ہے ــــ مجھے اُمید ہے کہ آپ کو یہ کہانی پسند آئے گی اور جب آپ کو پسند آئے گی تو قارئین "بیسویں صدی" بھی پسند کریں گے . . .

نیاز مند ــــــــ ظفر اقبال

★

سردی کی گلابی دھوپ میں بیٹھی بانو ایک رومال پر پھول کاڑھ رہی تھی۔ اور اس کے قریب ایزی چیئر میں نیم دراز اختر سوچنے کے انداز میں سگریٹ پی رہا تھا۔ سامنے لان سے گزر کر آنے والی ہوا میں شبنم کی نمی کے ساتھ کیاریوں میں لگے ہوئے پھولوں کی مہک تھی۔ بانو پھول کاڑھنے میں منہمک تھی۔ لیکن اختر کی خاموشی کا بھی احساس ہو رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟"

"میں ... بس" اُس نے مفکرانہ انداز میں کہا۔ "سوچ رہا ہوں کہ اتنے خوشگوار موسم میں خودکشی کر لوں؟"

"خیال تو نیک ہے!"

ہونٹوں پر شوخ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اختر نے اس مسکراہٹ کا کوئی اثر نہ لیا۔

"زندگی بے مقصد فضول اور بیکار سی چیز ہے۔ پھر میں تنگ سے خوشگوار کر کے مجھے چاہتے ہو؟"

"اتنی سی بات کے لئے اتنی بڑی تمہید" بانو نے محبوبانہ لہجے میں کہا۔ "ہر خدمت کے لئے تیار ہوں سرکار میرے!"

میز پر گروشیا رکھ کر وہ اٹھی اور پیار سے دیکھتے ہوئے اس کے سنورے ہوئے بالوں کو بکھیر دیا۔

"بانو!" اختر نے روک کر پوچھا۔ "تم مجھ سے کتنا پیار کرتی ہو؟"

"اس دل سے پوچھیے نا!"

بانو نے اپنے مخصوص انداز میں نگاہیں نیچی کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"بانو!"

اس کا لہجہ بدل گیا۔ چوٹ، درد، خلش اور کشمکش۔ وہ بے چین ہو گیا۔

# تغافل

کبھی یک بیک توجہ کبھی دفعتاً تغافل
مجھے آزما رہا ہے کوئی رُخ بدل بدل کر ——— شکیل بدایونی

دیدۂ حیراں میں جب اُن کے اشکِ ندامت آئے تھے
پھر کسی سے ذکرِ تغافل ہم کیا کیا پچھتاتے تھے ——— صبا سعیدی

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک ——— غالب

دل گوارا نہیں کرتا ہے شکستِ اُمید
ہر تغافل پہ نوازش کا گماں ہوتا ہے ——— روش صدیقی

اندیشۂ رُسوائی توجہ میں تو کم ہے
کچھ ایسی تغافل سے خبر اور زیادہ ——— بسمل سعیدی

مرسلہ۔ یو۔ ڈی۔ حسین۔ ایم۔ اے۔ اُجین

بانو نے انجانے میں درد کے ساز کے اِن خاموش تاروں کو چھیڑ دیا جس میں ماضی کا گیت چھپا تھا۔ وہ گیت جو آہوں اور آنسوؤں سے مرتّب تھا۔ جس میں اُس کی آرزوؤں کا لہو اور شکستہ خوابوں کی کرچیاں تھیں۔ بانو نے عجلت میں اُس کے بدلے ہوئے لہجے کا خیال نہیں کیا اور چائے لینے چلی گئی۔ لیکن اختر کے اندر کا اضطراب سیّال مادّہ بن کر پھوٹ پڑا۔ نیم وحشی کیفیت میں شعور کی ہر رگ خوں چکاں ہو رہی تھی۔

وہاں سے اُٹھ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا اور کھڑکی کے قریب کھڑے ہو کر سگریٹ سُلگایا۔ ذہن میں خیالوں کی لہر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ ماضی حال میں سمٹ رہا تھا اور یادوں کے گہرے سائے اُس کے گرد پھیل رہے تھے۔ اُس سے بہت ہی تہہ دار متحرک تصویر اُبھر رہی تھی۔ یہ تصویر اُس کی شوریدہ سری کو بڑھا رہی تھی۔ قریب تھا کہ اِک جنون کے عالم میں وہ پکار اُٹھتا۔ لیکن اُسی وقت اُسے ڈھونڈتی ہوئی بانو چائے لے کر آ گئی۔

"آپ یہاں کیوں آ گئے؟"

بانو کو دیکھ کر اُس نے خود کو سنبھالا۔ حالانکہ اُس کے چہرے پر اندر کی کربناکیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ بڑی بے بس نگاہوں سے اُس نے بانو کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر شادابی اور مُسکراہٹ سے گداز پیدا ہو گیا تھا۔ ایسا ہی شاداب اور مُسکراتا چہرہ۔ آنکھوں کی وہی جادوگری اور آواز میں وہی [illegible] اور جاں سپاری۔ قُدرت نے جیسے مناظرِ فطرت کی ایک ایک [illegible] عورت کا رُوپ دے دیا۔ یہ عورت۔ جذبات کو [illegible] تسکین و ہوش کا رہزن۔ ازل سے مرد کے ساتھ اِس لئے لگا دیا گیا کہ وہ [illegible] میں تنہائی نہ محسوس کرے۔ لیکن ———

"آپ چُپ چُپ میرا مُنہ کیوں تک رہے ہیں؟"

"میں دیکھ رہا ہوں روئے مریم کی خُنکی کتنے زخموں کی جلن [illegible] کر سکتی ہے!"

"چائے پیجئے۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

اختر کے پیار بھرے جملوں نے اُس کے چہرے پر حیا کی ہلکی ہلکی سُرخی پیدا کر دی۔ وہ چائے پینے لگا۔ بانو نے جاتے ہوئے کہا کہ وہ چائے پی کر دھوپ میں آ جائے۔ وہیں باتیں ہوں گی اور رومال پر پھول بھی بن جائے گا۔ بانو کے جاتے ہی وہی خزاں کی ویرانی اور ڈسنے والی تنہائی لوٹ آئی۔ اِس تنہائی میں اُسے سمٹا ہوا ماضی مِلا۔ وہ ماضی جو حال کے کینوس پر ایک واضح اور روشن تصویر بنا چکا تھا۔ یہ تصویر اُس کی رُوح میں گیتوں کا لمس گھولنے لگی اور خوابوں کی نشیلی رُت بہکنے لگی ——— اُس نے دیکھا تھرتھراتے ہوئے پیکرِ سیمیں کو اور بہت دُور سے آتی ہوئی ملکوتی آواز کو سُنا۔ یہ آواز ساز پر چھیڑی ہوئی غزل تھی۔

"دھیرے دھیرے چل اے دلِ بیقرار، کوئی آتا ہے!"

"ماشی! ———"

"اوہ! آپ آ گئے۔"

گُل مہر کے سُرخ پھول اور دہک اُٹھے۔ وہ ذرا قریب بڑھا۔

"ماشی! جب کوئی آتا ہے تو دلِ بیقرار زور زور سے چلتا ہے؟"

"بہت زور زور سے!"

لچکتی ہوئی شاخِ گُل نے اُس کے دل کو گُدگُدایا۔ اُس نے ماشی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"اور جا آنے تو؟"

"چھوڑیئے بھی!"

"پہلے بتاؤ!"

"کوئی دیکھ لے گا ———"

"دیکھنے دو!"

وہ اپنا ہاتھ چھڑا رہی تھی اور اُس کے گُداز بدن کی خوشبو [illegible]

رقص کناں ہوتی ہیں اور لبوں پر ایک نامعلوم سے نام کا افسانہ ہوتا ہے —
لبوں تک ہی کیوں محدود ہے۔ یہ افسانہ تو ہر طرف بکھرا بکھرا مِل رہا تھا۔ چلتے
چلتے اُس نے رُک کر سگریٹ جلایا۔ پہلی شام کے ہلکے سائے گہرے ہو رہے تھے۔
لیکن وہ گھومنے کے موڈ میں تھا۔ بڑھتا ہی گیا اور پھر معاً اُس کے موڈ کو بریک
لگ گئی — اُس نے دیکھا، قریب ہی کی ایک خار دار جھاڑی سے اُس کا دوپٹہ
اُلجھا ہوا تھا اور وہ چھڑا رہی تھی۔ بے اختیار اُس کے قدم اُٹھ گئے۔ دھڑکتے
دل اور کانپتے خیال کے ساتھ وہاں پہنچا۔ اُسے دیکھ کر وہ کچھ جھجکی اور اپنے
دوپٹے سے بے نیاز ہونے کی وجہ سے شرمائی۔ دوپٹہ چھڑانے میں مہندی لگی
ہتھیلیاں کچھ زخمی ہو رہی تھیں۔ اختر کچھ بولے بغیر دوپٹہ چھڑانے لگا۔ وہ
ایک طرف کھڑی رہی۔ دوپٹہ چھڑا کر دیتے کہا۔

"آپ اپنا نام بتا سکتی ہیں؟"

اُس کا لہجہ بے حد متین تھا۔ لیکن آنکھوں کی دیوانگی بڑھی ہوئی تھی۔
وہ خاموش تھی اور وہ دیکھ رہا تھا اپنی فردوسِ گم گشتہ کو جو آسمان سے
زمین تک نُور کے پھیلے ہوئے دھوئیں میں لرز رہی تھی۔

"میں نے آپ کا نام پوچھا ہے؟"

"عائشہ —"

جھکی جھکی حسین پلکوں کے نیچے دو گہری جھیلوں پر ایک چمک سی
اُبھری اور یہی چمک اس کی رُوح میں اُتر گئی۔ وہ اپنا دوپٹہ تولے کر چلی گئی۔
لیکن دل میں چھپے ہوئے ساز کو جگا گئی۔

"عائشہ! —" وہ بڑے سرور میں بولا — "خاموش چٹانوں اپنی
زبان کھولو اور میرے ساتھ کہو۔ عائشہ!"

اور پھر اُسی بہکے ہوئے جذبے میں خار دار جھاڑی پر ہاتھ رکھ دیا۔

"دشمنِ جاں! تم نے میرے دوست کی نرم ہتھیلیوں کو زخمی کر دیا۔
کہو تو تمہارا اگلا گزرنٹ دوں!"

اور جو مُٹھی کسی تو کتنے کانٹے چبھ گئے — چبھن کی تکلیف میں "شرکت
دوست" کا خیال آتے ہی وہ مُسکرا اُٹھا۔

زندگی کا یہ چھوٹا سا طلسم کتنا عظیم الشان معلوم ہو رہا تھا [illegible]
خود رو سفید پہاڑی پھولوں والی وہ فاختہ جو زندگی کو [illegible]
ڈھال کر کنول کے نرم نرم پتوں سے ڈھانک گئی۔ اُسے کس [illegible]
یاد آیا۔ سوئمنگ پول کے نیلگوں کنارے پر خیال آیا جیسے [illegible]
پر کھڑا ہے اور گہرے بھورے بالوں والی حسینہ اپنی دونوں باہیں پھیلائے
اِس طرح کھڑی ہے جیسے اب وہ پرواز کرے گی — لیکن اُس کی فاختہ تو اُڑ
گئی اور وہ تنہا کھڑا ہے۔

رات کے کھانے پر وہ سب ساتھ تھے۔

عاشی اِک کنارے خاموش اُس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس کی ماں نے
جب اُس کی زخمی ہتھیلی کو دیکھا تو قدرے بے چین ہو کر پوچھا۔

"یہ کیا ہوا؟"

"آپ نہیں جانتیں اماں۔ میں نے زندگی سے صلح کر لی ہے"

"میں کچھ سمجھی نہیں . . ."

"میں کہتا ہوں اماں — وہ اِک پہاڑی فاختہ بے حد پیاری سی
کانٹوں والی جھاڑی میں پھنسی ہوئی تھی۔ ننھی سی جان کتنی مصیبت میں تھی اور
جب چھڑایا تو میرے ہاتھوں سے پھر سے اُڑ گئی۔

اُس نے دیکھا — عاشی ہنس رہی تھی اور اماں کہہ رہی تھیں۔

"بھلا! پرندے بھی ہاتھ آتے ہیں!"

"کبھی کبھی!"

اختر نے دھیمے لہجے میں کہا — اور ٹیلوں سے پرے نیلگوں فلک پہ
بڑا سا چاند جیسے جھک کر گرتے ہوئے جھرنوں کو چوم رہا تھا اور دہی جیسا
اُس کے دل میں بہہ رہا تھا۔ فضا میں نشہ سا گھل رہا تھا۔

"عائشہ بہت پیاری لڑکی ہے!"

دل ہی دل میں سوچتے، چبھن کی تکلیف سمیٹے وہ لیٹ گیا — اور
پل پل رات ڈھلتی گئی۔

پہاڑ کی ملاقات دو اجنبی گھروں کے درمیان ایک خوشگوار [illegible]

[illegible] گئی۔
فاصلے سمٹ گئے اور دوریاں ایک نقطے میں سمٹ گئیں۔
ایک دن ــــــ وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے اور اپنی محبت کے جیتا جاگتا
تازہ مہکے خوشرنگ ماحول میں سرشار تھے۔
"اس دن زرد دوپٹہ چھڑانے میں کانٹے تو زیادہ تم کو چبھے تھے اور۔۔"
"زیادہ زخم میری ہتھیلی پر نظر آتے ہیں نا؟" ماشی کی بات کاٹ کر اختر نے کہا۔ "ایک دوست کی تکلیف میں ہاتھ بٹایا تھا ــــــ کبھی گذری میری!"
ماشی کو وہ ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے نظر کے سامنے ہمالیہ اور رنگین وادیاں ہوں!
"سچا ہے ــــــ" ماشی نظروں کی دھیمی دھیمی آنچ میں تپتی ہوئی بولی۔ "اس رات تو میں سوئی نہیں اور آپ سو گئے تھے۔"
"جھوٹ!"
"آپ کو کیا معلوم ــــــ نیند سے چونک کر آپ اُٹھے تھے اور سب کو سویا دیکھ کر سگریٹ جلایا تھا۔"
"ہوں! ــــــ" وہ مسکرایا۔ "میں ایک عجیب سے خواب کی ڈرانے والی کیفیت سے چونکا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا ایک رنگین سی تتلی میرے گرد اُڑ رہی تھی۔ میں اُسے پکڑنا چاہ رہا تھا۔ لیکن جب ہاتھ بڑھاتا وہ دُور نکل جاتی۔ بڑی کوشش کے بعد جب میں نے اُسے پکڑا ٹھیک اسی وقت کسی شکاری کی بندوق سے نکلی ہوئی گولی میرے سینے کے پار ہو گئی ــــــ"
"خواب ہی تو ہے!"
"لیکن اس کا اثر اب تک میرے دل پر ہے ــــــ ماشی! ایسا تو نہیں۔۔"
"دھت! خواب کی باتوں کا زیادہ اثر نہیں لینا چاہئے۔ پھر آپ نے تو زندگی سے صلح کر لی ہے!"
"زندگی نہیں ماشی! موت سے۔"
"کیا بک رہے ہیں آپ؟"
"سچ کہتا ہوں ــــــ ایک عورت سے محبت کرنا ــــــ مرنے ہی کے برابر ہے!"
اختر نے کچھ اس انداز سے کہا کہ ماشی بے اختیار ہنس پڑی۔
ایک صبح اختر اس کے ہاں پہنچا۔
وہ اپنی کشادہ چھت پر زرد دوپٹہ کو پھیلائے کھڑی تھی۔ دونوں ہاتھ اٹھائے آنچل کے دونوں کونے پکڑے۔ جیسی دھوپ، زرد دوپٹہ، اُٹھے ہوئے ہاتھ، لہراتے ہوئے بال ــــــ ایسے میں فرشتے بہک جائیں۔ اختر اگر بہکا تو کیا بہکا ــــــ اس نغمہ خواں سکوت میں وہ دبے پاؤں قریب پہنچا۔
"میں اختر ہوں!"
وہ چونکی اور بہت چھوٹی سی اُف کہہ کر دوپٹہ شانے پر ڈال لیا۔
"بھیگ گیا تھا ــــــ دھوپ میں سکھا رہی تھی!"
"یا قیامت کو آئینہ دکھا رہی تھیں!"
"کس لئے؟"
"شرمانے کے لئے!"
"یہ باتیں بنانا کس سے سیکھا ہے جناب نے؟"
"پہاڑی فاختہ سے!"
"وہ اُڑ گئی نا؟"
"جس دن وہ اُڑ جائے گی اختر تنہا نہ رہے گا!"
اختر نے بڑے اعتماد سے کہا ــــــ ماشی کا چہرہ کچھ اُتر گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے شفاف چہرے پر چمپئی دھوپ کا رنگ بکھر گیا۔
"بیٹھئے! آپ کو چائے پلاؤں۔"
"شراب نہیں؟"
جذبات کے تیور بدلے اور شوخیوں کی رُت جاگی۔ ماشی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
"زندگی تو خود ہی ایک شراب ہے ــــــ پی پی کر تم بہت بہک چکے!"
اختر مسکرایا اور وہ چائے لینے چلی گئی۔
اس طرح ملاقاتیں اور باتیں ہوتی رہیں۔ وقت جتنا تیزی سے سرکتا رہا، دل کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا رہا۔ پھر بھی ایک خیال اس کے ذہن میں سوال بن کر اُبھرتا ــــــ یہ رشتہ لاکھ مضبوط سہی۔ لیکن زمانے کی تلخی اور رسم و رواج کی پابندی انھیں ایک نہیں ہونے دے گی۔ ابا کب یہ گوارا کرنے والے ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے شادی کرے۔ اُن کی قدامت پرستی اس کی آرزوؤں کا خون کر دے گی۔ لیکن وہ اپنی شان اور وقار پر آنچ نہ آنے دیں گے۔ جس لمحے یہ خیال اُبھرتا وہ مایوس اور مضمحل لمحے کی زہرناکی میں کھویا رہتا۔ ماشی کی محبت اُسے ایک ایسے مقام پر کھڑا کر چکی تھی جہاں ترکِ تمنا کا ہلکا سا خیال بھی موت سے کم نہ تھا۔ لیکن ان خیالوں کا اظہار اس نے ماشی سے نہ کیا ــــــ عورت ایک نازک آبگینہ ہے۔ ذرا سی ٹھیس پر ٹوٹ

جائے گا۔ پھر شہزادوں جیسی عاشی کو کھو کر یا تو ٹوٹ کر شکستہ آرزوؤں کا منظر کیسے دیکھے گا۔ اس لئے وہ اپنے آبگینے کو بہت حفاظت سے دل کے دامن میں چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔ خواہشوں سے کہیں تقدیر پھیرا کرتی ہے۔ مخالف ہوا کی زد پہ اگر چراغ جلا لے تو محرومیوں کی گرد کسی چہرے پہ نظر نہ آئے۔

ایک دن گھر میں اُس کی شادی کا تذکرہ کیا نکلا کہ جنگل کی آگ بن گیا۔

یہی آگ تو عاشی کے سارے خوابوں کو جلاتی اُس کے وجود کو پگھلانے لگی۔ جتنی خاموشی سے اُس نے سُنا اُتنی ہی خاموشی سے وہ دامن کھینچنے لگی۔ اُسے تو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اب تک سراب کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ دوڑتے دوڑتے پاؤں میں آبلے پڑ گئے۔ پھر بھی پانی کا چشمہ نظر نہ آیا۔ اُس نے پانی کی آس ہی چھوڑ دی۔ لیکن پیاس کی شدت نے تو اُسے جھنجھوڑ کر بے جان کر دیا۔ اختر سے یہ بات چھپی نہیں رہی۔ وہ جانتا تھا کہ عاشی کو گہرا صدمہ ہے۔ وہ اِس صدمے میں خود کو تباہ کر رہی ہے۔ وہ بھی تو مجبور تھا۔ کیا کرتا۔

"عاشی!"

"کہیے!" وہ حسبِ عادت مُسکرائی۔

"تم مجھ سے کھنچی کھنچی کیوں رہتی ہو؟"

"نہیں تو ــــــ"

"جھوٹ!"

"کیسے یقین دلاؤں!"

کہتے ہوئے اُس کے مزاج کا گداز پگھل پڑا۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔

"ہونٹوں کی مسکراہٹ میں یہ آنسو چھپ نہ سکے؟"

وہ خاموش رہی۔ اختر اُسے دیکھ رہا تھا۔ سِمٹے ہوئے فاصلے بڑھ رہے تھے ــــــ دُوری، اندھیرا اور موت کا زخّار سمندر۔ اختر تڑپ اٹھا۔ اُس نے عاشی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا عاشی۔ کبھی نہیں۔ تم میری ہو!"

عاشی کو یہ آواز دُور سے آتی معلوم ہوئی۔ جو درد کے تاروں سے اُلجھ کر رہ گئی درد ایک دوست کی جُدائی کا دل بن کر دھڑک رہا تھا۔ پھر کوئی تسکین وہاں تک کیسے پہنچتی۔ اِس طاق پر رکھے ہوئے کتنے خواب اور ارمان کھو گئے۔ وہاں ایک خلش تھی، اضطراب تھا اور گہرا سنّاٹا تھا۔

جیسے جیسے اختر کی شادی کے دن قریب آ رہے تھے، اُس کے اندر کا سنّاٹا

بڑھتا جارہا تھا۔ دُور تک ہلکا سا شور بھی نہیں مِل رہا تھا۔ اُداسیوں اور محرومیوں کی ظلمت میں دل کا ہر پہلو سُلگ رہا تھا درد کا ہر گوشہ تپ رہا تھا۔ عاشی نے اِس سے پہلے زندگی کو اتنی بے نُور نہ دیکھا تھا ــــــ اور اختر بھی یہی دیکھ رہا تھا۔ چراغ جل رہا تھا اور اندھیرا اُبھل رہا تھا۔

ایک دن وہ بہت اطمینان سے عاشی کے پاس بیٹھا اُس کی زرد اور اُداس سی صورت دیکھ رہا تھا۔ عاشی نے ٹوکا۔

"آپ خاموش کیوں ہیں؟"

"کس سے باتیں کروں؟"

"کیا میں نہیں ہوں؟"

"تم! ــــ" اُس کے اندر آگ کے لاوے دہک اُٹھے "تم مرنا ہی چاہتی ہو ــــ"

"مرنا تو کوئی بھی نہیں چاہتا ــــ" ہلکے سے تبسم میں عاشی نے کہا۔

"یہ آپ کا خیال ہے!"

"میرا خیال نہیں تمھارا ارادہ ہے" اندر کا سُلگتا دہکتا لاوا اُبل پڑا۔

"حالات سے مایوس ہو کر تم اپنی صحت سے بے نیاز ہو رہی ہو"

"اختر صاحب!" وہ بڑے اعتماد سے بولی "جس کی جھولی میں مسرت کا ایک پھول نہ ہو وہ کس نیاز مندی کے شوق میں جیئے!"

"پھر پہلے مجھے مرنے دو!"

"آپ نے زندگی سے صلح کرلی ہے!"

"وہ زندگی تم ہو ــــ اور میں تمھارے بغیر جی نہیں سکتا۔ اِس لئے۔ ۔"

اُس کی آواز رندھ گئی۔ آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر کہا۔

"میں نے انتظام کر لیا ہے!"

"زہر! ــــ" بڑے پیار سے مُسکراتی ہوئی بولی "میرے جیتے جی تم زہر کھاؤ گے۔ ابھی یہ جان تم پر دینے کے لئے موجود ہے!"

عاشی نے اُس کے ہاتھ سے شیشی چھین لی۔

"جدا ہو کر بھی ہم زندہ رہ سکتے ہیں دوست! میں نے تمھیں چاہا ہے اور تمھاری رہوں گی!

شکوۂ سجدہ نہیں سجدہ مجھ کو تو میرے سجدوں کی لاج رکھنا
یہ سرِ تیرے آستاں سے پہلے کسی کے آگے جھکا نہیں ہے

مجھے تسلی تو نہیں دے رہی ہو؟"

"نہیں!"

کہتی ہوئی عاشی نے اپنے دوپٹے کے دامن سے اُس کے آنسو پونچھے۔ بکھرے ہوئے بالوں اور پیشانی پر پھیلی ہوئی لٹوں کو اُنگلیوں سے سنوارا۔ اختر نے اپنا سگریٹ نکالا اور سُلگانے لگا۔ اِتنی سی دیر میں بڑی تیزی کے ساتھ عاشی نے شیشی کا سارا زہر حلق میں اُنڈیل لیا۔

"عاشی ــــ!!"

وہ اپنی پوری قوت سے چیخ اُٹھا۔

اتنے میں بدحواسی کے ساتھ بانو اندر داخل ہوئی۔ اختر پسینے میں شرابور بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

"یا اللہ! ــــ کیا ہوا آپ کو؟"

بانو بے چین ہو گئی۔ اُسی بے چینی میں اُس نے اختر کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

"کچھ نہیں بانو ــــ کچھ نہیں ــــ میں نے . . ." اُس کے لہجے میں گھر گھراہٹ پیدا ہو گئی "میں نے زندگی سے صلح کر لی ہے!"

اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور چہرہ دُھندلا گیا۔ بانو روتی ہوئی پکار رہی تھی ــــ

"اماں! دیکھئے تو میرے اختر کو کیا ہوا!؟"

---

LIFEBUOY
for health
LIFEBUOY SOAP
لائف بوائے
ہے جہاں
تندرستی
ہے وہاں
لائف بوائے صابن کے ساتھ غسل کے لطف کا
جواب نہیں! اِس سے آپ کو تازگی، فرحت اور
تندرستی حاصل ہوتی ہے۔ لائف بوائے
کِسی اچھے صابن سے کہیں زیادہ کارگر ہے کیونکہ...
لائف بوائے
مَیل میں چھُپے
جراثیم کو دھو ڈالتا ہے
ہندوستان لیور کی ایک اعلیٰ پیشکش

مسعود حیات ایم۔ اے، بی۔ ٹی

اک تیرا تصور ہی اب دل کا سہارا ہے
نظریں ہیں جدھر اٹھتی ہیں تیرا ہی نظارا ہے

اب کچھ بھی کہے دنیا اب کچھ بھی سنے کوئی
ہم کو تو تری خاطر ہر بات گوارا ہے

مانا ترے ملنے کی راہیں تو نہیں آساں
لیکن یہی کیا کم ہے تو دل کا سہارا ہے

جب راہِ محبت میں کچھ تھک کے قدم ٹھہرے
ہم کو تری منزل نے خود آکے پکارا ہے

کیا کم ہے حیات اتنا ہے ساتھ کسی کا غم
درد بھری دنیا میں اب کون ہمارا ہے

## غزل

نسیم شاہجہان پوری

آنکھوں کو تجسس کا صلا کیوں نہیں دیتے
موجود ہو جب تم تو پتا کیوں نہیں دیتے

میں صفحۂ عالم پہ اگر آپ کے نزدیک
اک حرفِ غلط ہوں تو مٹا کیوں نہیں دیتے

قائم ہے محبت کا بھرم تم سے کہ ہم سے
یہ فیصلہ محشر پہ اٹھا کیوں نہیں دیتے

احباب کی ہمدردیِ کامل پہ یقیں ہے
لیکن مجھے مرنے کی دعا کیوں نہیں دیتے

دہراتے ہیں کیوں قصۂ ماضی کو نسیم آپ
گزری ہوئی باتوں کو بھلا کیوں نہیں دیتے

## غزل

امر قیس جالندھری

اک جھلک سی دکھا گیا کوئی
مجھ کو مجھ سے چھپا گیا کوئی

یہ بجھانے سے بھی بھڑکتی ہے
آگ کیسی لگا گیا کوئی

پردہ سرکا کے رُخِ انور سے
اور پردے گرا گیا کوئی

آنکھ لڑ بھی گئی اگر سرِ راہ
صاف نظریں چرا گیا کوئی

نہ کہی کچھ، نہ کچھ سنی اے قیس
کوئی کیا آیا! کیا گیا کوئی!

وہ غم جو تو نے دیئے تھے انہیں بھلا نہ سکے
ہم ایک دن بھی ترے بعد مسکرا نہ سکے

شبِ فراق کا عالم ارے معاذ اللہ
وہ تیرگی تھی، ستارے بھی جگمگا نہ سکے

انہوں نے بھول کے ہم کو کبھی نہ یاد کیا
کہ جن کو بھول کے بھی ہم کبھی بھلا نہ سکے

وہ ایک تم کہ جفاؤں پہ بھی عزیزِ جہاں
وہ ایک ہم کہ جو دادِ وفا بھی پا نہ سکے

شمیم مونس و غمخوار اس کو کیا سمجھیں
ہمارے حال پہ، دو اشک جو بہا نہ سکے

# اے غمِ دل کیا کروں

ابواللیث جاوید بی۔کام

سرکل انسپکٹر، پوسٹ آفس لیسی گنج۔ ضلع پالامو (بہار)

واجب الاحترام حضرت خورشید گرامی صاحب! سلام و نیاز

آپ کی شفقتیں میرے اندر کے فنکار کو نئی نئی تخلیقات کے لئے ہر لمحہ اُبھار رہی ہیں۔ اپنی تمام مصروفیات کے باوجود ایک تازہ ترین تخلیق "اے غمِ دل کیا کروں" حاضرِ خدمت کر رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ اسے پسند فرمائیں گے۔ اِس حقیقت پر ایمان لانا پڑ رہا ہے کہ آپ ذرہ کو آفتاب بنانے کا جوہر رکھتے ہیں۔ ثبوت میں "نیا موڑ" کے سلسلہ میں موصول ہونے والے بے شمار خطوط ہیں جن میں سے اکثر میں آپ کی عظمت کا بہت ہی پُرخلوص انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ آپ کتنے دلوں پر راج کرتے ہیں اِس کا اندازہ لگانا بہت ہی مشکل ہے —— زیرِ نظر افسانہ کے متعلق آپ کی رائے جاننے کا بے حد اشتیاق ہے۔ اگر آپ کا وقت اجازت دے تو کچھ روشنی عنایت فرمائیں۔ بڑا ہی کرم ہوگا...

نیک خواہشات کے ساتھ

خلوص کیش —— ابواللیث جاوید

کہ میں سوچتا ہوں کاش میں تم سے کبھی نہ ملا ہوتا ——!

کہ جدائی کا یہ غم میرے وجود پر تاریکیاں تو نہ بکھیرتا۔ میری رگوں میں ناامیدی اور ناکامیوں کا زہر تو نہ بھرتا۔ یہ وقت جو آج رُک سا گیا ہے، یہ ہوا جو تھم سی گئی ہے، یہ فضا جو غم کے آنسو برسا رہی ہے، یہ بہار جس کی گود میں خزاں مہک رہی ہے اور میری زندگی کی راہوں پر نوکیلے، زہریلے کانٹے بچھا رہی ہے۔ یہ سارا ماحول جو اشکبار سا ہو گیا ہے، میری زندگی میں نہ آتا۔ یہ غموں کے دھبے میرے دامن پر نہ پڑتے۔ میرے دل کا آبگینہ تمہارے پیار کی حقیقت کے سنگ ریزوں سے پاش پاش نہ ہوتا۔ یہ دل کا آئینہ یوں نہ ٹوٹ جاتا۔ اِس آئینہ پر منقش تمہارا عکس [illegible] تو نہ ہوتا۔ میرے ارمانوں کا خزانہ یوں پل بھر میں [illegible] میں یوں تھکا تھکا سا، نیم وحشی سا اپنے وجود کو کھوتا تو نہ جاتا۔ [illegible] کے تودوں پر گرتا تو نہ جاتا۔ یہ پیار کی تصویریں پانی کی سطح پر کھینچی ہوئی لکیروں کی طرح پل بھر میں زائل نہ ہو جاتیں۔ ہمارا پیار کا [illegible] نذرِ آتش تو نہ ہو جاتا۔ تیرے پیار کا ایک ایک رسیلا بول جو میرے کانوں میں شہنائیاں بجایا کرتا تھا آج وہی راگ سوگ سے بھرپور تو نہیں ہوتا۔ خلش سے لبریز تو نہیں ہوتا ——!!

میں کیا کروں اُن دلنواز لمحوں کو جن کی سانسوں میں تمہاری خوشبو رچی بسی ہے۔ میں کہاں بھاگوں اُن حسین شاموں کے تصور سے جن کی دھڑکنوں میں تمہاری آنکھوں کا جادو جاگ رہا ہے۔ میں کیسے دامن بچاؤں اُن چاندنی راتوں کے سحر سے جن میں تمہارے چاندی سے بدن کا لمس گھلا ہوا ہے۔ میں اپنے دل کی دھڑکنوں سے تیرے نام کی تکرار کیسے مٹا دوں۔ میں کیسے بھول جاؤں کہ میں تم سے کبھی ملا تھا!

"ارے یہ تو ارون ہے۔ کالج کا ہیرو۔ اللہ —— ! کتنی حسین پرسنیلٹی ہے!" تم اپنی کسی سہیلی سے کہہ رہی تھیں۔ میرے قدم رُک گئے تھے۔

"آداب عرض ہے —— !" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا اور تم سکتے کے عالم میں مجھے دیر تک دیکھتی رہیں۔ میں نے پھر کہا تھا۔

"میں نے کہا —— آداب عرض ہے ——!" تم جیسے خواب سے چونک

[illegible] طرف تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلی گئی تھیں میں مسکراتا ہوا [illegible] میں [illegible]

اُس [illegible] ملاقات لے جانے تم پر کیا اثر کیا کہ دوسرے ہی دن کالج سے واپسی پر تم نے اپنی کار میرے سامنے روک دی اور دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اشاروں سے مجھے بیٹھ جانے کو کہا۔ تب میں نے جانا تم بہت بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ میں کار میں بیٹھ تو گیا لیکن دیر تک تمھاری دولت اور ثروت سے اپنی ناداری اور بے کسی کا موازنہ کرتا رہا۔ تم نے خاموشی کا طلسم توڑا ——

"چُپ کیوں ہیں —— ؟ کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں —— آج غالب . . ."

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

---

- حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- اصلاحِ ظاہر اصلاحِ باطن کا دیباچہ ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)
- دو چیزیں کمیاب ہیں۔ مل جائیں تو اُن کی قدر کرو، اُن سے فائدہ اُٹھاؤ —— یار وفادار دوست، باوفا شفقت۔ (حضرت حارث محاسبیؒ)
- ترکِ گناہ کے بغیر زبان پر توبہ و استغفار یہ جھوٹوں کا کام ہے۔ (حضرت ذوالنون مصریؒ)
- سب سے بڑی دولت زبانِ ذاکر، دلِ شاکر اور زبانِ فرمانبردار ہے۔ (حضرت امام غزالیؒ)
- خوابِ غفلت سے گراں کوئی خواب نہیں۔ (حضرت شیخ خضرویہؒ)

---

"آج غالب کی غزل سرائی ہی تو ہوگی کیونکہ میرا اِن نیم باز آنکھوں میں ساری مستی . . ."

"اچھا —— اچھا —— !" تم نے میری بات کاٹتے ہوئے اپنی کار کو کسی موڑ پر بہت تیزی سے موڑا۔ میں ہچکولے کھاتا ہوا تمھاری مرمریں بانہوں سے تقریباً ٹکرا سا گیا۔ ایک پل کے لئے میرے دل و دماغ میں بجلی سی کوند گئی تھی اور تمھاری پلکوں کی اُٹھتی گرتی چلمن سے واقعی ساری مستی شراب کی سی چھلک پڑی تھی۔ میں بے خود ہو گیا تھا۔ سنسان سی سڑک پر تمھاری کار تھم چکی تھی۔ تم نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بے حد جذباتی انداز میں کہا تھا۔

"ارون —— ! میں تمھاری ہوں —— !" اور یہ بظاہر ایک سادہ سا جملہ میری تقدیر بن گیا تھا اور میرے منہ سے صرف —— "غزالہ" ہی نکل سکا تھا۔

تمھارا سارا وجود شاخِ گل کی طرح لپکا اور میری آغوش میں [illegible] گیا۔ کیف و سرور کی ایک مسحور کن لہر چلی اور سارے ماحول کو مدہوش کر گئی۔ تمھارے پیار کی مضراب میرے دل کے تاروں پر دھیمے دھیمے [illegible] نغمگی کا رس سانسوں کے ہر تار میں پیوست ہوتا رہا۔ میری زندگی [illegible] شرابی کی طرح جھوم جھوم اٹھی۔ تم کیا ملیں مجھے زندگی مل گئی !

میں تمھاری زلفوں کے پیچ و خم میں کھو تو ضرور گیا لیکن [illegible] کا احساس میرے لئے سوچ کا باعث بنا رہا۔ میں اکثر سوچتا —— میں [illegible] کا باسی آکاش کو کیسے چھو سکوں گا —— ؟!!

میرے جیون کی مالا میں صرف غم کے موتی پروئے ہوئے ہیں —— کشمیر کی گلپوش وادیوں میں جنم ضرور لیا لیکن اپنے دامن میں ہمیشہ کانٹے ہی پائے۔ دکھیاری ماں کے آنسو کبھی خشک نہ ہوئے۔ اُن کے لبوں پر مسکراہٹ کبھی نہ دیکھی۔ جب میں کچھ بڑا ہوا تو ماں نے مجھے وہ سب کچھ بتا دیا جسے جان کر میں بجھ سا گیا۔ میں ابھی دو ہی مہینے کا تھا کہ میرے باپ نے ماں کو طلاق دے دی اور نہ جانے کس جہان میں جا کر اپنا منہ چھپا لیا۔ ماں ایمبائڈری کا کام کر کے وقت کاٹتی رہی۔ میں ماں کی زندگی میں غموں کا پیغام لے کر آیا۔ میں نے جب کچھ ہوش سنبھالا تو مکتب جانے لگا۔ پڑوسی عبدل چاچا کے مجھ پر کافی احسانات ہیں۔ انھوں نے باپ جیسا پیار دیا۔ جو کچھ حوصلے، ولولے مجھے زندگی میں ملے ہیں سب انھیں کی بدولت —— ورنہ باپ کی ذات سے مجھے سخت نفرت سی ہوگئی ہے۔ ماں نے ایک تصویر مجھے دکھائی تھی۔ وہ میرے باپ کی تھی۔ میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا تھا۔ مجھے وہ تصویر بالکل چنگیز خان کی معلوم ہوئی تھی۔ ایک جابر، ظالم اور بے درد انسان —— اور آج بھی اُس تصویر کو دیکھ کر مجھے وحشت سی ہونے لگتی ہے۔

ایک دن میں نے اپنی زندگی کی کتاب تمھارے سامنے کھول کر رکھ دی تھی۔ تمھاری پلکیں نمناک ہو گئیں۔ میں نے سوچا تھا میں اپنے غموں [illegible] کے منحوس سائے تم پر نہ پڑنے دوں۔ پھر یہ بھی خیال آیا تھا کہ تمھاری راہوں سے میری راہیں جدا ہیں۔ راستے میں ایک چھوٹے سے [illegible] پر مل گئے ہیں تو کیا ہوا؟ میں تو ایک انجان سی منزل کا راہی ہوں۔ تمھاری منزل کہیں اور ہے۔ ہم پھر اجنبی بن جاتے تو بہتر تھا۔ لیکن تم نے خفگی میں تنک کر کہا تھا ——

"یہ تم امیری غریبی کا فلسفہ کیا لے بیٹھے ہو۔ پلیز ہمارے درمیان دولت کی دیوار نہ کھڑی کرو۔ ہمیں تمھارے پیار کی جنت کے سوا اور کچھ نہ چاہیے !" اور تم بہت ہی پیاری ادا سے روٹھ گئیں۔ میں دیر تک تمھیں مناتا رہا۔

ایک وہ بھی شام آئی جب تم نے مجھے اپنی ممی اور ڈیڈی سے ملایا۔ میں تمھاری ممی سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اُن کی مسکراہٹوں نے میرا استقبال کیا۔ ماں اپنی مسکراہٹوں میں پیار کی لازوال دولت لئے ہوتی ہے اور قدموں میں جنت! اتنی شفیق، اتنی مہربان جیسی دُنیا میں اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ تمھاری ماں سے مل کر بے ساختہ مجھے اپنی ماں یاد آگئی۔ جب میں تمھارے ڈیڈی سے ملا تو مجھے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اُن سے ملتے ہی اپنی ماں کے پاس رکھی اپنے باپ کی تصویر میرے ذہن میں گھوم گئی۔ کتنی مشابہت، کتنی مطابقت تھی دونوں میں! تصویر کا وہ چنگیز خاں مجھے یاد آگیا اور میں نے بہت بے دلی سے انھیں آداب کیا۔ تم نے دونوں سے میرا تعارف کرایا۔

"یہ ہیں میرے کالج کے ساتھی مسٹر ہارون ——— بڑے ذہین اور خوش طبع"

ارے یہ کیا ——— تم نے مجھے ارون سے ہارون بنا دیا ——— میں کچھ بول نہ سکا۔ تم نے کس مصلحت سے ایسا کیا، میں سمجھا نہیں۔

"اور ہارون ——— یہ ہیں میری ممی، اور یہ ہیں ڈیڈی کرنل پرویز خاں ———"

تم میری طرف مخاطب تھیں۔ میں نے دل میں سوچا یہ پرویز خاں نہیں چنگیز خاں معلوم ہوتے ہیں!

"آپ بزرگوں سے مل کر بہت مسرت ہوئی ———" میں نے خالص رسمی انداز میں کہا لیکن دل تمھارے ڈیڈی سے مل کر نہ جانے کیوں بوجھل بوجھل سا ہو گیا تھا۔

تم چہک چہک کر بہت ساری چیزیں ناشتہ کے لئے لاتی رہیں۔ ہم سب نے مل کر شام کی چائے ایک ساتھ پی۔ تم بہت خوش تھیں۔ تمھیں اس طرح خوش دیکھ کر میرا دل بھی کھل اُٹھا تھا۔ جب میں تمھارے یہاں سے لوٹا تو تمھاری ممی نے بہت شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرے اور بہت ساری دُعائیں دیں۔ تمھارے ڈیڈی بیٹھے پائپ سے دُھواں اُڑاتے رہے۔

"تم نے مجھے ارون سے ہارون کیوں بنا دیا ———؟" میں نے تمھاری چوٹی پیچھے کھینچی۔

"بتاتی ہوں ———" تم نے موٹر کی رفتار سست کر دی اور میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ میں نے چوٹی چھوڑ دی۔

"ارون ہندو کا نام ہے نا ———؟" تم نے اتنا کہا اور موٹر کی رفتار تیز کر دی۔

"تمھارے نام بدلنے سے میں مسلمان تو نہیں ہو گیا ———؟"

"نام میں نے اپنے لئے تھوڑا ہی بدلا تھا ——— وہ تو ڈیڈی کا خوف تھا جو اس معاملہ میں بہت کٹر ہیں!"

"اچھا ——— تو تم اپنے ڈیڈی کو بھی بلف دیتی ہو!" تم ادائے دلبری سے صرف مسکراتی رہیں۔

اُس شام کے بعد میرے دل میں تمھاری اور محبت جاگ اُٹھی۔ میں تمھیں شدت کی گہرائیوں سے چاہنے لگا۔ عہد و پیمان کے رنگین ڈورے بندھے اور میں پیار کے آسمان کی وسعتوں میں گم ہوتا گیا۔ تمھاری آنکھوں کی گہری نیلی پُرسکون جھیل میں میں اپنے آپ کو ڈبوئے رہتا۔ تمھاری ریشمیں زلفوں کی گھنگھور گھٹاؤں سے اُمنڈتی سوندھی پھوار سی خوشبو میرے وجود کو معطر کرتی رہتی اور میں بے سُدھ تمھارے رُخسار کی چاندنی میں نہاتا۔ اُس جبینِ ناز کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا جس سے کرنیں پھوٹ پھوٹ کر میرے دل کی دُنیا کو روشن کرتی ہوتیں۔ میری دُنیا میں کہیں تاریکی نہ تھی۔ میرا سارا جہان منوّر ہو گیا تھا۔

اور ایک دن ———

یہ قطب مینار کی بلندیاں ——— ساری دلّی نظروں کے سامنے ہو!

---

- مسلمان کی مسجد اور ہندو کا مندر دونوں خدا کے گھر ہیں۔ (گورو گوبند سنگھ)
- بہتر ہے کہ ہمارے الفاظ کی جگہ ہماری زندگیاں بولیں۔ (مہاتما گاندھی)
- سچا گورو وہ جو سب انسانوں کو ایک کرے۔ (گورو نانک دیو)
- گھر ایک یونیورسٹی ہے جس میں پڑھانے والے والدین ہیں۔ (مہاتما گاندھی)
- ایشور کے پیارے بننا چاہتے ہو تو اُس کے بندوں سے پیار کرو۔ (سوامی ویویکانند)
- سچے دل سے ڈھونڈنے والے اپنی منزل تو کیا ایشور کو پا لیتے ہیں۔ (سوامی سالشبدانند)

---

ہم میری منزل پر تھے۔ ہوا کا لطیف جھونکا تمھارا دوپٹہ اُڑا رہا تھا۔ اُس سے اُڑتی ہوئی خوشبو میرے دل و دماغ پر چھا رہی تھی ——— میں دلّی کو دیکھ رہا تھا: کتنی عظیم، کتنی بلند!

یہ لال قلعہ کا وقار ——— جیسے شہنشاہ شاہجہاں دربارِ عام میں رونق افروز ہوں ——— یہ عمارت، یہ فن کی لازوال دولت!

واقعی میرے لال قلعہ کا یہ دربارِ حسن کتنا اچھوتا ہے، کتنا بانکا ہے ——— میں خود میں مگن تمھیں دیکھ رہا تھا۔

یہ موتی مسجد کا حُسن ——— یہ سجدہ گاہیں، یہ مرمریں فرش ——— یہ فصیلیں، یہ حصار ——— کتنی دلآویز زندگی ہے اس حُسن میں ——— یہ موتی سے دانت، یہ مرمریں بانہیں، یہ شگفتہ چہرہ! میری نگاہیں تم پر مرکوز تھیں۔ تم نے میرے دل کی

زباں بھولی تھی اور تمہارا چہرہ احساسِ شرم سے اور بھی گلنار ہوتا گیا۔

یہ کناٹ پلیس کی الٹرا ماڈرن فضا ـــــ دیسی اور بدیسی تہذیبوں کا سنگم!
گیسپا ہوٹل کا اندرونی ماحول جیسے بالکل اسٹون ایج ـــــ باہری حسن
جیسے بالکل پیرس! تم میرے ساتھ ساتھ حسن و رعنائی بکھیرتی رہیں۔

راشٹرپتی بھون کی وسیع عمارت ـــــ مغل گارڈن میں پھولوں کی نمائش۔
گلوں کی نہیں گلبدنوں کی نمائش ـــــ میری گلبدن ماشاء اللہ ـــــ
چشمِ بد دور ـــــ میں نے سوچا۔

بین الاقوامی فلمی میلہ ـــــ انگرڈ تھونس کی اداکاری ـــــ جینتی مالا
کا پرفورمنس ـــــ لتا کی مدھر سُریلی تان۔

غالب اکیڈمی ـــــ غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات ـــــ یہ گہما گہمی،
یہ رونق ـــــ "تم سلامت رہو ہزار برس۔ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار" میں نے
تمہاری طرف دیکھ کر دھیمے سے گنگنایا۔ تم نے زہرشکن انگڑائی لی۔

رام لیلا میدان میں بادشاہ خان کی تقریر ـــــ لوگوں کا اژدہام ـــــ
معزز مہمان کا امن و سلامتی کا پیام!

تمہاری قربت میرا اقرار بنتی گئی۔ اپنی سانسوں کے ہر تار میں تمہاری محبت
کے موتی پروئے۔ یہ محبت کے موتی اگر ذرا سا بھی کھسکے، میرے جیون کی مالا بکھری! یہ
میں نے اکثر اپنی تنہائیوں میں سوچا۔ تمھیں میں نے ہر گام پہ اپنا ہم سفر پایا۔ ایک ـــــ
ایک قدم پر تمہاری مسکراہٹوں کے پھول کھلتے رہے۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں!

لیکن یہ کیا ـــــ!؟ یہ امیدوں کی قندیلیں کس نے بجھا دیں؟ سارا عالم
مہیب سناٹے اور دبیز اندھیروں میں کیسے ڈوب گیا ہے؟ یہ طوفان کہاں سے آگیا؟
جس نے میری خوشیوں کے چراغوں کو گل کر دیا؟ یہ بادِ سموم کے دہکتے جھونکے، یہ گرد آلود
جھکڑ کہاں سے آ رہے ہیں۔ میری مسرتوں کے چمن کو ریگ زار کس نے بنا دیا؟

یہ سسکتی ہوئی کائنات ـــــ! یہ اُجڑا ہوا دیار ـــــ! یہ لُٹا ہوا مسافر!!!

'ماں ـــــ! تم کیا جانو کہ تمہارے خط نے کیا قیامت ڈھائی ہے ـــــ! اس
نے میرا سب کچھ بدل دیا ہے ـــــ!!'

ماں کے خط کا ایک ایک لفظ میرے کانوں میں گونج رہا ہے ـــــ

'بیٹا ارون ـــــ اپنا پڑوسی سنتوش آرٹسٹ کل ہی دلی سے
اپنی تصویروں کی نمائش کے بعد واپس آیا ہے۔ اس نے بتایا ہے
نمائش میں تمہارے کھوئے ہوئے پتا جی سے ملاقات ہو گئی جو سنتوش
کے بچپن کے ساتھی تھے۔ سنتوش نے انھیں فوراً پہچان لیا۔ اس نے
آکر مجھے بتایا ہے۔ یہ بات تو بہت خوشی کی ہوئی کہ تمہارے کھوئے ہوئے
پتا کا سراغ ملا لیکن یہ سن کر الجھن سی ہوئی کہ انھوں نے اپنا مذہب تبدیل
کر کے ایک مسلمان دولتمند خاتون سے دلّی ہی میں شادی کر لی ہے اور
کرنل پرویز کے نام سے مشہور ہیں ـــــ میں چاہتی ہوں تم قانون کا
سہارا لے کر ان سے اپنا حق مانگو۔

تمہاری ماں'

غزالہ ـــــ یہ کیسی مصیبت ہے ـــــ! میں کس طرح کا حق مانگوں ـــــ؟
کس سے مانگوں ـــــ تم ہی بتاؤ نا ـــــ!؟ اب ہمیں جینے کا بھی کوئی حق رہ سکے گا ـــــ!؟
میں اپنے دل کے غم کو، دل کی وحشت کو کیا کروں ـــــ؟

میرے دل کے کینوس پر بنی پیار کی رنگین تصویر پر کس نے کالک پوت دی۔ مجھے
کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ یہ آنکھیں بے نور ہوتی جا رہی ہیں۔ اب یہ جمنا کی چنچل
موجیں میرے دل کے اضطراب کو ٹھنڈک بخشتی جا رہی ہیں۔ یہی موجیں ہیں جنھوں نے
نرمیش کمار شاد کو اپنی آغوش میں راحت دی تھی۔ میں بھی انھیں کا سہارا ڈھونڈ رہا ہوں۔
یہ دور تک پھیلا ہوا لامحدود آسمان ہمیشہ بے رحم رہا ہے۔ میری آواز ڈوبتی جا رہی
ہے۔ غزالہ! مجھے معاف کر دینا!

کاش میں تم سے کبھی نہ ملا ہوتا ـــــ!!

---

الزماں

...ہائیں کیا کرے کوئی
...ئیں تو کیا کرے کوئی

میرے گھر میں تو اِک کرن بھی نہیں
مہرِ تاباں ہوا کرے کوئی

...نے پہنا ہو دوستی کا لباس
...دشمن کا کیا کرے کوئی

ایک جھونکے کا منتظر ہے چراغ
اب تو آئے خدا کرے کوئی

...آنکھ جو کھو چکے ہیں ان کو نصیح
...آئینہ دے کے کیا کرے کوئی

قمر سنبھلی

آج ہم اس طرح کسی سے ملے
اجنبی جیسے اجنبی سے ملے

بے ارادہ نکل پڑے آنسو
مدتوں بعد جب کسی سے ملے

جیسے کچھ ہم سے واسطہ ہی نہیں
آج وہ ایسی بے رُخی سے ملے

گیسو و رخ کا ہائے وہ منظر
تیرگی جیسے روشنی سے ملے

مل کے قمؔر سے قمؔر ہوا احساس
آج ہم ایک آدمی سے ملے

آزاد گورداسپوری بی اے

آہ کرتے ہیں ترے بیمار اُٹھتے بیٹھتے
دردِ دل کا کرتے ہیں اظہار اُٹھتے بیٹھتے

دور کیا بدلا کہ ساقی نے نگاہیں پھیر لیں
شکوہ کرتے ہیں یہی میخوار اُٹھتے بیٹھتے

حسبِ وعدہ آج تک وہ بام پر آئے نہیں
عمر گزری ہے پسِ دیوار اُٹھتے بیٹھتے

اپنی فطرت پر ہیں قائم آج تک اہلِ وفا
نام لیتے ہیں ترا ہر بار اُٹھتے بیٹھتے

گو مخالف تھے مگر اب حضرت آزادؔ بھی
گنگناتے ہیں مرے اشعار اُٹھتے بیٹھتے

قادر محی الدین ماہر

سراپا جستجو بن کر پھرا ہوں کو بہ کو برسوں
بہا ہے چشمِ خوں آلود سے دِل کا لہو برسوں

بس اِک موہوم سا سایہ رہا کرتا تھا نظروں میں
نہ جانے کون تھا جس کی رہی ہے جستجو برسوں

جنوں بدنام ہے لیکن حقیقت یہ ہے دُنیا میں
خرد نے ہی پیا ہے زندگانی کا لہو برسوں

نمازِ عشق کو اِتنا نہ تو آساں سمجھ ماہرؔ
تجھے کرنا پڑیگا خونِ ارماں سے وضو برسوں

مرد !
صرف 5 پیسے
خرچ کر
آپ اپنے کنبے
محدود رکھنے
طاقت حاصل کرسکتے ہیں
NIRODH
SUBSIDISED PRICE
15 PAISE FOR 3
اب
ملک بھر میں
دستیاب
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے
رعایتی دام
نرودھ
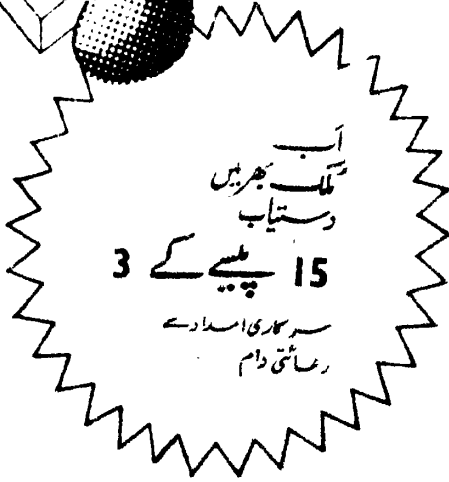
# ایک کالج گرل کی ڈائری

فکر تونسوی

ہر مہینے ایک نئی ڈائری ـــــ ڈائریوں کا یہ سلسلہ صرف تفریحِ طبع کے لئے لکھ رہا ہوں۔ انھیں پڑھ کر سنجیدہ ہو جانے والے حضرات سے مجھے صرف ہمدردی ہو سکتی ہے۔

۷ فروری ـــــ

گزشتہ سال یہی دن تھا جب میں سترہ سال کی جوان تھی۔ آج کی سات فروری نے مجھے جوان سے جوان تر کر دیا ہے۔ کیا آنے والی ہر سات فروری میرے شباب کو تیز و تند بناتی چلی جائے گی؟ ـــــ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے سامنے کھلی ہواؤں کا آسمان کی طرح وسیع و عریض سمندر پھیلا ہوا ہے اور میں ایک پتنگ کی طرح اُڑتی جا رہی ہوں۔ اُوپر ہی اُوپر! اُوپر ہی اُوپر ـــــ ہائے! اتنی بلندی پر جاتے ہوئے کتنی شرم آتی ہے۔

میرے بدن میں جیسے شور سا مچا ہوا ہے۔ ایک پھیلاؤ کی لذیذ سی حادثہ میرے انگ انگ میں پیدا ہو گئی ہے۔ یہ کیسا بدن ہے جو ایک سیلابی دریا کی طرح بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ یہ سیلاب میرے بدن کے ہر کنارے کو توڑتا، کاٹتا اور پھیلتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ اِس سیلاب کی منزل کہاں ہے؟ میں کچھ نہیں جانتی۔ اِس کاٹتے چھانٹتے سیلاب نے میری کئی بنجر اور بے آب و گیاہ دھرتیوں کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری دھرتی کا ہر بے آب و گیاہ حصہ لہلہانے لگا ہے اور اس میں پھول پر پھول کھل رہے ہیں، شاداب شاخیں جھولا جھول رہی ہیں۔ دھرتی کی ہر سوتی ہوئی چیز جاگ اُٹھی ہے ـــــ بدن کے اِس شور نے میری نیند اُچاٹ کر دی ہے۔ ایک ایک انگ ـــــ آنکھیں کھولے ہوئے جاگ رہا ہے اور میں سوچ رہی ہوں ـــــ ہائے! یہ کیا ہو رہا ہے! اتنی جلد مرنے جا رہا ہے، مجھے دم کیوں نہیں لینے دیتا؟

آہ! کہیں سے کچھ، ویسے کچھ، وہ شور و غل اِتنا تیز و تند ہے کہ خود مجھے اپنی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ کوئی دوسرا میری آواز کیسے سُنے گا؟

۱۲ فروری ـــــ

میرے اِرد گرد ایک خوفناک مرحلہ چکر لگا رہا ہے۔ ایک نرم و نازک سی سرگوشی پل پل، چھن چھن مجھے سُنائی دیتی رہتی ہے: "پیار کرو!" یہ سرگوشی شرم کے بوجھ تلے دبے ہوئے خلا میں سے جاگتی ہے۔ میں اُس سرگوشی کا کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ نہ اُسے جھٹکار سکتی ہوں، نہ اُس کے فرمان کی تعمیل کر سکتی ہوں۔ یہ سرگوشی میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی۔ کل میں نے اپنی گرل فرینڈ ششما سے پوچھا: "کیا تمھیں بھی ایسی سرگوشی سُنائی دیتی ہے؟" اُس نے کھلکھلا کر میرے کندھے پر ایک دھپ سی لگائی اور بولی: "قہہ قہہ قہہ! ایک سال پہلے مجھے بھی سُنائی دیا کرتی تھی لیکن آج کل نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ہے؟ مجھے تم سے بے حد ہمدردی ہے ڈارلنگ! اللہ! مجھ سے کچھ بھی نہ پوچھو لیٹے ہو گئیں۔ قہہ قہہ قہہ!"

ششما کا کیا مطلب تھا اِس سے۔ کیا وہ سچ مچ کسی سے پیار کر رہی ہے؟ اُس کی آنکھیں ایکدم شریر ہو گئی ہیں۔ بات کرتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اُس کا ہر لفظ ڈانس کرتے ہوئے باہر نکل رہا ہے۔ ڈانس کی یہ دُھنیں اُس نے کہاں سے سیکھیں؟ کیا اُس کیپٹن رتن سنگھ کے لڑکے موہن سے؟ پرسوں وہ یونیورسٹی کے کافی ہاؤس میں اُس کے ساتھ کافی پی رہی تھی۔ موہن کی آنکھیں بھی بالکل اُسی طرح شریر تھیں جیسی ششما کی آنکھیں۔ ہائے! یہ دونوں شرارتیں کیسے مل گئیں۔ کیا جب دو شرارتیں کافی کے ایک کپ میں گھل مل جائیں تو وہ سرگوشی بند ہو جاتی ہے؟ جسے میں چھوڑ سکتی ہوں نہ گلے لگا سکتی ہوں ـــــ کیسے یہ سب کچھ ہو جاتا ہے؟ کیسے؟ کیسے؟ کیسے؟

بس ایک ہی سوال ایک بے کیفی میں پھیل کر کھڑا ہوا ہے۔ ہر سوال کے پیچھے سُنہری سا سوال۔ ہر سوال ایک بھید۔ ہر سوال جواب سے محروم۔ میں اِس مسلسل سرگوشی پر بار بار کانپ اُٹھتی ہوں۔ میرا خیال ہے میں زندگی بھر ششما نہیں بن سکتی۔ کوئی موہن کا دیرینہ کافی کے کپ میں گھل مل نہیں سکتا۔ میری کافی تو تنہا ہی پی جاتی

ایک مرتبہ وجوں کمار نے مجھے بھی کافی پینے کی آفر دی تھی۔ لیکن میں . . . ؟

کیا میں جوں کمار کی ایک کانہیں ہے۔ شسٹماء وکو اور نہ جانے کتنی شسٹمائیں اور کتنی وجوییا ئیں کسی کپ کے ساتھ ٹکرا چکی ہیں؟ کتنی بری بات ہے۔ کیا اس دنیا کا ہر جوں کمار، ہر نوجوان لڑکی کو کافی کا کپ سمجھ کر پینا چاہتا ہے۔ میں کافی کا کپ بننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔

۲۷ فروری ———

گزشتہ دو ہفتے سے میں ڈائری نہ لکھ سکی۔ کیسے لکھتی؟ سکون کا ایک لمحہ بھی تو نہیں ملا مجھے۔ شہباش (ہائے! میں ڈائری میں اس کا اصلی نام بھی تو نہیں لکھ سکتی) میری تشنہ لبی کو بھگوتا ہوا میری تمناؤں کے سمن زار میں اچانک خاموشی سے داخل ہو گیا اور میری روح کے شور کو اور بھی تیز کر دیا —— لیکن اس شور میں اب پہلے کی سی کانٹوں کی چبھن نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایسا شور ہے جیسے جلترنگ کا ہوتا ہے۔ اس میں آہنگ ہے، سریلا پن ہے اور میرے اڑتے ہوئے پتنگ میں ایک رقص کا سا توازن پیدا ہو گیا ہے —— اور وہ سرگوشیاں کم ہو گئی ہیں۔ اب ان سرگوشیوں میں شرم تو ہے، خوف بھی ہے۔ لیکن اب ان سے بدن میں کپکپی نہیں اٹھتی۔ بلکہ ایک پراسرار سا سرور اس شرم اور خوف کو دور، بہت دور کسی پس منظر میں لے گیا ہے۔

شہباش —— کالج میں کرکٹ کا کھلاڑی ہے۔ آج سے چودہ دن پہلے (مجھے تو وہ دن اور لمحہ پوری رعنائی کے ساتھ یاد ہے) جب انٹر کالج میچ میں اس نے سنچری بنائی تھی تو میرے ہاتھوں سے بے ساختہ داد کی تالی بج اٹھی تھی۔ نہ جانے اسے کس نے بتا دیا تھا کہ دوسرے دن وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح میرے پاس آگیا۔ میں کالج کے برآمدے میں ایک بنچ پر اکیلی بیٹھی بائرن کی ایک نظم پڑھ رہی تھی۔ ہلتے ارادہ تو ایک دم مجھ پر جھک گیا۔ میں کانپ گئی۔ وہ بولا۔ "بائرن کی نظم ہے نا؟"

"ہوں" میں نے یوں کہا جیسے میں نے جلدی میں اس کی بات کا غلط ترجمہ کر دیا ہو۔

"اگر بائرن کرکٹ کا کھلاڑی ہوتا تو یہ نظمیں کبھی نہ لکھ سکتا" اس نے جان بوجھ کر ایسی بات کہہ دی جو جھٹ میری سمجھ میں آگئی۔ لیکن میں نے بات پلٹ دی۔

"بہت مشکل نظم ہے۔ اس کے مفہوم کی گہرائی تک پہنچنے کے لئے شاعر ہونا ضروری ہے۔"

"میں نے سنا ہے آپ بھی شاعری کرتی ہیں؟"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"جیسے آپ کو معلوم ہو گیا کہ کرکٹ میں سنچری بنائی جائے تو تالی بجانی چاہئے۔"

چند دن پہلے میں نے کالج میگزین میں واقعی اپنی ایک نظم بھیجی تھی۔ ایڈیٹر نے جی کھول کر اس کی تعریف کی تھی۔ اس نے کہا تھا آپ کی تصویر کے ساتھ اسے شائع کروں گا۔ کیا اس ایڈیٹر نے شہباش کو میری نظم دکھا دی تھی؟ کیا یہ بھی اسی ایڈیٹر نے بتایا تھا کہ میں نے کرکٹ کی سنچری پر تالی بجائی تھی؟ —— یہ کیسی زندگی ہے۔ کرکٹ اور شاعری کو ایک موڑ پر لا کر یکجا کر دیتی ہے۔ میری گوری گوری نرم و نازک ریشم ایسی انگلیاں کانپنے لگیں۔ اگر کسی نے میری ان کانپتی ہوئی انگلیوں کو دیکھ لیا تو . . . ؟ میں نے خوف سے اپنی انگلیاں چھپا لیں۔

"آپ نے کرکٹ کیسے سیکھی؟"

"جیسے آپ نے شاعری سیکھی۔"

"آپ تو مذاق کرتے ہیں۔"

"یہ مجھ پر الزام ہے۔ ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے کسی کے ساتھ مذاق نہیں کیا۔ خاص طور پر لڑکی سے۔ لڑکیوں کی عزت کرنا میرا پرم دھرم ہے۔"

وہ ہنس دیا۔ کیسی البیلی باتیں کرتا ہے۔

کاش! میں بھی ایسی خوبصورت اور لطیف باتیں کر سکتی۔ میں اس کی مزید باتوں کے نشے سے سرشار رہنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود چاہتی تھی کہ وہ جلدی سے جلدی چلا جائے۔ کیونکہ میں گھبرا رہی تھی —— دور کچھ کالج گرلز کا ایک جھنڈ شاید ہماری طرف دیکھ دیکھ کر کلکاریاں مار رہا تھا۔ میں ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اف! میرا تو انگلش کا پیریڈ ہے!" میں نے کہا۔

شہباش بولا۔ "کل انٹر کالج کرکٹ میچ کے

فائنل میں مجھے کھیلنا ہے۔ کیا میں کچھ تالیوں کا اعلان حاصل کر سکتا ہوں؟"

"میں کوشش کروں گی لیکن تالی ایک ہاتھ سے بجاؤں گی!" نہ جانے کیسے یہ عجیب فقرہ میرے منہ سے نکل گیا۔ بعد میں اس فقرے کو یاد کر کے میں بے حد پچھتائی۔

وہ بولا "نہیں، تالی ہمیشہ دو ہاتھوں سے بجا کرتی ہے۔"

آج جب میں یہ ڈائری لکھ رہی ہوں، شبھاش کے دو ہاتھوں سے تالی بجنے کا مفہوم پوری طرح اُبھر کر میرے سامنے آچکا ہے۔ کیونکہ گزشتہ دس بارہ دن میری زندگی کے مصروف ترین دن تھے۔ ہماری ملاقاتیں اتنی تیزی سے بڑھ جائیں گی کہ مجھے آج حیرت ہو رہی ہے۔ میرے اندر کا شور اور زیادہ تیز لیکن البیلا ہو گیا ہے۔ شبھاش میرے خوابوں میں بس گیا ہے۔ تعبیر کی پروا کئے بغیر ہم خوابوں کے جزیرے میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ اب تو کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا جو صرف میرا ہو۔ ہر لمحے میں شبھاش کی آواز جلترنگ کی طرح بجنے لگتی ہے۔

لیکن میرے ڈیڈی میری منگنی کی بات کیوں چلا رہے ہیں؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ میں شبھاش کے بغیر۔۔۔ وہ جان بھی کیسے سکتے ہیں؟ اور میں انھیں بتا بھی کیسے سکتی ہوں۔ پیار کی وادی میں ایک نیا خوف شامل ہو گیا ہے۔ کیا پیار کے نصیب میں ہمیشہ خوف ہی لکھا ہے؟

۱۰ مارچ ———

منگنی اور پیار ——— پیار اور منگنی ——— مرہم اور زخم کی طرح یہ دو لفظ میرے بدن کے ساتھ چپٹ گئے ہیں۔

وہ لوگ مجھے دیکھنے کے لئے آئے تھے اور مجھے بھیڑ بکری کی طرح دیکھ کر چلے گئے۔ تین عورتیں تھیں۔ شاید دو دو کلوگرام کے فرق کے ساتھ موٹی، بھدی اور توندیل۔ ایک لڑکا تھا۔ کافی سمارٹ! اور کیا یہ مذاق نہیں ہے کہ اُس کا نام بھی شبھاش تھا!

آہ! میں کسی سے بھی تو نہ کہہ سکی کہ میرا شبھاش اور ہے۔

اگرچہ میں نے دل ہی دل میں سینکڑوں بار کہا: مجھے ابھی پیار میں سرشار رہنے دو۔ منگنی میری اس سرشاری کو تتر بتر کر دے گی ——— نہ جانے انھوں نے میری بات سنی کہ نہیں ——— نہیں سنی ہو گی۔ وہ سبھی لوگ بہرے تھے۔

مجھے شبہ ہے کہ میں انھیں پسند آگئی ہوں۔ ڈیڈی ممی میرے بڑے بھائی سے یہی کہہ رہے تھے۔ میں نے خود سنا کیونکہ میں بہری نہیں ہوں۔ او گاڈ! مجھے بہرہ کیوں نہیں بنایا تم نے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لڑکی پسند آجائے اُس کی منگنی کر دینی چاہئے۔ پیار کے بغیر منگنی؟ نان سنس! پیار تو ابھی پروان چڑھ رہا ہے۔ پروان چڑھتے ہوئے پودے کو یوں مسلتے ہیں؟ وہ اندھے کیوں ہیں۔ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ پیار کا راستہ بائیں طرف کو جا رہا ہے اور منگنی کا راستہ دائیں طرف کو۔

میں یہ منگنی نہ کروں گی۔ ہرگز نہ کروں گی، نہیں کروں گی! (ایسے ہی کئی فلمی ڈائیلاگ میرے ذہن میں آ رہے ہیں)

بیسویں صدی دہلی مئی ۱۹۷۰ء

کیا اپنے شبھاش سے کہہ دوں کہ چلو، اُٹھو بھاگ چلیں۔ دُور، بہت دُور! وہاں جہاں آسمان اور زمین ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں۔ (شاعری بمعنی شاعری، او مائی گاڈ!)

۱۶ مارچ ———

آج میں شبھاش سے ملی تھی۔ وہ بھی تو اُداس ہے۔

میری منگنی کی بات ٹوٹ گئی ہے۔ عجیب بات ہے کہ خدا آج کل بھی فریاد سن لیتا ہے۔ میرے ہونے والے منگیتر اور اُس کے ڈیڈی میں ٹھن گئی ہے۔ لڑکا انقلابی معلوم ہوتا ہے۔ جہیز کا سخت مخالف ہے لیکن اُس کا ڈیڈی؟ وہ جہیز کو تو معمولی چیز سمجھتا ہے۔ حقیقی چیز تو ریفریجریٹر ہے، ٹیلی ویژن ہے، سکوٹر ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ اشیاء کی ایک طویل فہرست اُس کے وقار کی اُنگلی کے ساتھ لپٹ رہی ہے۔ اُس نے اپنی بیٹی کے جہیز میں تو اس سے بھی زیادہ قیمتی چیزیں دی تھیں ——— تو میں دوسرے کی بیٹی سے بدلہ کیوں نہ لوں؟

ہم نوجوان لڑکیوں کا بھی کیا نصیب ہے۔ ہم ہر وقت بدلے کی پھانسی پر لٹکتی رہتی ہیں۔

لیکن میں تو اُس پھانسی سے اُتار لی گئی ہوں۔ ڈیڈی اور بیٹے کی خانہ جنگی نے میری زندگی کی لاش کو ایک انجکشن دے دیا ہے۔ میں چند لمحوں کے لئے پھر زندہ ہو اُٹھی ہوں ——— لیکن یہ لمحے کتنے طویل ہوں گے؟ آخر کتنے؟

میں یہ خوشخبری لے کر شبھاش کے پاس گئی تھی لیکن وہ یہ سن کر اور اُداس ہو گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کی اپنی منگنی کی بات چل رہی ہے۔ میں کانپ اُٹھی۔ بھرّاتے ہوئے گلے کے ساتھ پوچھا: "تمھیں وہ لڑکی کیسی معلوم ہوئی؟"

"تم سے زیادہ خوبصورت ہے۔" وہ بولا۔

"تو کر لو اُس سے شادی!" میرے اس فقرے میں جیسے لاکھوں فریادیں چھپی ہوئی تھیں لیکن شبھاش بھی تو فریادی تھا۔ میں اُس کے دربار کی فریادی تھی، وہ میرے دربار کا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے دربار میں فریاد کر رہے تھے، ایک دوسرے کی زنجیرِ عدل کھڑکھڑا رہے تھے۔ ہم دونوں جہانگیر بن کر انصاف طلب کر رہے تھے۔ شبھاش نے جیسے ایک خاموش اور گھٹی ہوئی چیخ کے ساتھ کہا: "جو دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں وہ خود اُس نصیحت پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ سنا ہے تمھاری تو شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی ——— لڑکا کیسا ہے؟"

میں نے ایک اور خاموش چیخ ماری۔ "تم سے زیادہ سمارٹ ہے۔ زیادہ انقلابی!"

"مبارک ہو۔ میرج پر بُلاؤ گی نا؟ میں تمھیں ایک تحفہ دینا چاہوں گا۔"

"کیسا تحفہ ہو گا وہ؟"

"اپنے آنسوؤں کے جھوٹے موتی ایک مالا میں پرو دوں گا۔ سنا ہے تمھیں

[illegible] محبت پسند آسکتے ہیں؟"

یہ کہہ کر اُس نے پاگلوں کی طرح سر کو دو چار جھٹکے دیے اور پھر ایک طرف یوں چل دیا جیسے کسی کی بانہہ پکڑ کر اُسے اچانک جھٹک دے اور آزادی اور سُکھ کی سانس لینے لگے۔

میں اُس کے پیچھے بھاگی۔ میں جانتی تھی کہ اُس کا یہ سُکھ درد اور کرب کے خمیر سے اُٹھایا گیا ہے۔ میں اُسے بتانا چاہتی تھی کہ میری منگنی کی بات ٹوٹ گئی ہے۔ اِس لئے آؤ میں اور تم ایک دوسرے کی بانہہ پکڑ لیں اور پھر کسی انجانے راستے پر چل پڑیں۔ وہ انجانا راستہ جس پر چلتے ہوئے ہمارے ڈیڈی ممی کبھی بھٹک جائیں اور ہمیں پا نہ سکیں۔

لیکن یہ تو صرف ایک رُومانٹک سپنا تھا، حقیقت نہیں تھی۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ شبھاش واقعی چلا گیا تھا۔ اُس نے تو میری طرف پلٹ کر ایک نظر دیکھا بھی نہیں۔ کیا اُس نے میری باتوں کو حقیقت سمجھ لیا تھا؟ کیا وہ میری بانہہ چھوڑ کر سچ مچ کسی دوسری لڑکی کی بانہہ پکڑ لے گا؟

میں کیا کروں؟ اندھیرا ایک آسیب کی طرح مجھے اپنے گھیرے میں لے رہا ہے۔

۲۲ مارچ ——

آج شبھاش نے مجھے ٹیلیفون کیا تھا۔ اُس نے یہ کہہ کر مجھے تڑپا تڑپا دیا کہ اُس کی منگنی کی بات پکّی ہو گئی ہے اور اگلے ہفتے اُس کی شادی بھی ہو رہی ہے —— میں لرز اُٹھی "شبھاش! شبھاش! سنو تو" میں نے اُس سے کہا "تم مجھ سے ایک بار مِل تو لو۔ تمھیں میرے متعلق ایک غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اُس غلط فہمی کو دُور کرنے میں میری مدد کرو" لیکن اُس سنگ دل نے کورا جواب دے دیا کہ میں اِس فلمی قسم کی غلط فہمی کا قائل نہیں ہوں۔

اور پھر نہ جانے میں نے کتنے آنسو بہائے۔ جو سچے تھے۔ صاف ستھرے، شفّاف، بے گناہ آنسو —— اور اُن آنسوؤں کی نغمیں چلمن کے پردے میں، رات کو میں نے ایک خواب دیکھا کہ شبھاش کی شادی ہو گئی ہے اور شبِ عروسی میں جب اُس نے اپنی دُلہن کا گھونگھٹ کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ دُلہن میں ہی تھی۔

لیکن یہ تو ایک خواب ہی تھا۔ بالکل ایک فلمی خواب! اور جب خواب ٹوٹا تو میں اکیلی تھی اور آج کی ڈائری کا یہ ورق لکھ رہی تھی۔

۲۶ مارچ ——

واقعات کی رفتار اتنی تیز ہو جاتی گی —— میں نہیں جانتی تھی۔ کل شبھاش کی شادی ہے۔ دعوتی کارڈ میرے سامنے یوں پڑا ہے جیسے کوئی لاش میرے پاس پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجی گئی ہو۔ لاش کا پوسٹ مارٹم کرنا بھی کیسا بھدا مذاق ہے۔

اور جس لڑکی سے شبھاش کی شادی ہو رہی ہے اُس کا نام بھی ونود ہے۔ یہ کیسی دُنیا ہے؟ غلط ونود صحیح شبھاش سے شادی کر رہی ہے۔

۳۰ مارچ ——

گزشتہ چار دنوں سے میں جس انتقام کی آگ میں جل بھن رہی تھی وہ اب کچھ مدّھم پڑ گئی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں بھی اُس انقلابی شبھاش نمبر دو کے ساتھ شادی کر لوں گی۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کر لیا کہ وہ اپنے والدین کی جائداد پر ٹھوکر مار دے گا۔ ہم دونوں اگلے ہفتے سول میرج کر رہے ہیں۔

۸ اپریل ——

واقعات پھر اِس تیزی سے پلٹا کھا جائیں گے؟ کہ میں ششدر رہ گئی۔ کل جب میں اور شبھاش ڈسٹرکٹ کورٹ میں سول میرج کا فارم بھر رہے تھے، ہم دونوں کے ڈیڈی ممی اِس موقع پہ اچانک نمودار ہو گئے۔ وہ ہم دونوں کو یہ سمجھا کر واپس لے آئے کہ ہماری شادی باقاعدہ مذہبی رسومات کے ساتھ کی جائے گی۔

شاید دونوں خاندانوں کی عزّت ایک موڑ پر یکجا ہو گئی۔ شاید اُن دونوں میں کوئی باعزّت سمجھوتہ ہو گیا۔ میرے اور شبھاش کے درمیان جو انتقام اور انقلاب کا سمجھوتہ ہوا تھا، وہ کالعدم کر دیا گیا۔ عزّت اور انقلاب دونوں الگ الگ راستوں کے راہی ہیں۔

پرسوں شام کو شبھاش اور میں ایک دوسرے کے گلے میں جے مالا ڈالیں گے۔

مجھے یہ سب کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔ لیکن واقعات کی دھارا بہت تیز و تُند ہے۔ میری بے بسی قابلِ رحم ہے۔

۱۵ اپریل ——

آج میں نینی تال کے ہل اسٹیشن پر ہوں۔ آج نینی تال کی شفّاف اور وسیع جھیل کی ایک کشتی پر میں نے اور شبھاش نے سیر کی ہے۔ ہنی مون کے خالی لفظ کو اپنا مفہوم مِل گیا ہے۔ صحیح ونود غلط شبھاش کے ساتھ ہنی مون منا رہی ہے اور خوش ہے۔

لیکن یہ کیا؟ ہماری کشتی سے چند گز کی دُوری پر ایک اور کشتی بھی ہنی مون کو مفہوم عطا کر رہی تھی اور اُس میں صحیح شبھاش اور غلط ونود دونوں بیٹھے تھے اور دونوں خوش تھے!!

---

٭ بیسویں صدی نے گو ہم نے کبھی اشتہاروں کا پلندہ نہیں بنایا۔ اس میں ۲۴ اور [illegible] کے دو اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے جن کا مقصد خریداروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا ہوتا ہے۔ منیجر

# بھٹکتے سائے

نسیم احمد

گردھنی۔ آرہ (بہار)

مکرمی و محترمی! خلوص بیکراں

خدا آپ کو "خوش تر" رکھے!۔۔۔ اپنی تازہ تخلیق "بھٹکتے سائے" لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف!

خیر اندیش۔۔۔۔۔ نسیم احمد

اور ٹیکسی رک گئی۔۔۔

انجن بند کر کے سُنیل ماحول کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ فضا میں ایک آواز ابھری ——

"کون ہے؟" بوڑھے چوکیدار نے کھانستے ہوئے پوچھا۔

شاید اس بوڑھے کی رات کھانستے ہی کٹ جاتی تھی! آج سے بیس سال پہلے بوڑھا چوکیدار اس بنگلے کی رکھوالی پر متقرر ہوا تھا۔

ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ماحول پر قبرستان کا سکوت طاری تھا۔ ہوا سے ہلتے ہوئے درختوں کے پتے خوفناک آواز پیدا کر رہے تھے۔ جس سے ماحول اور بھی روح فرسا ہو گیا تھا۔ مینڈکوں کی کرخت آوازیں ماحول کی وحشت ناکی میں اور بھی اضافہ کر رہی تھیں۔

ابھی تک موٹر کی ہیڈ لائٹ روشن تھی جس میں بوڑھے چوکیدار کا اداس چہرہ ماضی کی تلخ یادوں کو اجاگر کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی حد تک جہاندیدہ تھیں۔

سُنیل نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بوڑھے چوکیدار سے کہا "میں اس علاقے میں چیف انجینئر کی حیثیت سے آیا ہوں۔ مجھے اس بنگلہ میں کچھ دن قیام کرنا ہے۔ لیکن جنگل کا ماحول میرے لئے بالکل نیا ہے" بوڑھے نے لالٹین ایک طرف رکھ دی اور ٹیکسی سے سامان نکال کر بنگلے کے ایک کشادہ کمرہ میں قرینے سے سجا دیا۔

"آپ کے کھانے کا بندوبست ہونا چاہئے نا صاحب؟" بوڑھے چوکیدار نے انگوچھا سے منہ کو پونچھتے ہوئے کہا۔

"اس وقت میرے پاس کھانا ہے۔ ہاں صبح سے کوئی انتظام کرنا ہوگا" سُنیل نے کہا۔

"شہر یہاں سے دو میل دور ہے۔ دو برس کاٹ سکوگے بابو؟"

"کٹ ہی جائے گا۔ اچھا تم آرام کرو۔ صبح ملاقات ہوگی"

بوڑھے نے ہاتھ میں لالٹین لے کر سُنیل کو سلام کیا اور کمرہ سے باہر نکل گیا۔

سُنیل بستر پر دراز ہوتے ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

صبح جب آنکھ کھلی تو کمرہ میں تیز دھوپ کی شعاعیں پھیل گئی تھیں سُنیل نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی تو اوہ گاڈ! نو بج گئے۔ ابھی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور بوڑھے کی آواز فضا میں گونجی "بابو! دن چڑھ آیا۔ اب تمہیں اپنے پروگرام کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے!"

سُنیل (Archaeological Department) محکمۂ تحفظ آثارِ قدیمہ میں انجینئر کی حیثیت سے پہلی بار اس علاقے میں آیا تھا۔ ناشتہ سے

فارغ ہونے کے بعد سُنیل نے بوڑھے چوکیدار کو اپنے کمرہ میں بلایا اور دس روپیہ نکال کر اُسے دیتے ہوئے کہا۔ "رکھ لو اور میرے کھانے کا انتظام تمھارے ذمہ رہا۔"

"میں اس کام کے لئے مقرر ہوں سرکار!" بوڑھے چوکیدار نے انکساری سے جواب دیا۔

"اچھا تم مجھے اِس علاقہ کے متعلق کچھ بتا سکتے ہو؟ تاکہ مجھے اپنے کام میں سہولت ہو" سُنیل نے کہا۔

سرسری طور پر چوکیدار نے سارے حالات سے آگاہ کیا اور سارے علاقے کا خاکہ کھینچ کر رکھ دیا۔ سُنیل نے محسوس کیا کہ بوڑھا کسی دیوی کے مندر کا ذکر کرتے ہوئے کچھ خائف ہے اور کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

---

- حقیقی خواہش کا سرچشمہ دل ہے۔ اگر دل تاریک ہے تو روشن آنکھیں بیکار ہیں۔ (حکیم بوعلی سینا)
- جو شخص اپنے کو بہت زیادہ عقل مند سمجھتا ہے وہی بڑا احمق ہے۔ (حکیم جالینوس)
- توبہ کے درخت کے لئے ندامت کے آنسوؤں کی آبیاری درکار ہے۔ (حضرت احمد ابن مسروقؒ)
- سب سے اچھی زندگی دوسروں کے کام آنا ہے۔ (حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ)
- نرم خو اور متواضع کے لئے جہنّم حرام ہے۔ (حضرت مجدّد الف ثانیؒ)

---

بوڑھا پھر کہنے لگا۔ کیونکہ اُس کے حواس یکجا ہو چکے تھے۔

"سرکار! پونم کی رات . . ."

"کیا ہوتا ہے؟ پونم کی رات کو؟" سُنیل نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"پونم کی رات؟ ہاں ہاں کہو" سُنیل نے پھر بوڑھے کو آگے کہنے کے لئے اُبھارا۔

"پونم کی رات بابوجی! رات بارہ بجے کے بعد ایک سفید سایہ اس علاقہ میں بھٹکتا پھرتا ہے اور صبح ہونے سے پہلے غائب ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ کسی کی بے چین آتما ہے جو شانتی کے لئے بھٹکتی ہے۔ وہ سایہ بابوجی! جنگل کے جنوبی حصے سے نمودار ہوتا ہے اور مندر کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ پھر چند لمحوں کے بعد مندر کے اندر سے کسی کے رونے کی آواز آتی ہے لیکن مندر سے نکلتے ہوئے اُس سایہ کو کسی نے نہیں دیکھا ــــ میں یہ سب بیس برسوں سے دیکھتا آرہا ہوں لیکن آج تک اُس سایہ سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔" بوڑھا یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ سُنیل بغیر جواب دئے ہی باہر چلا گیا۔

سُنیل سارا دن محکمہ تحفظ آثار قدیمہ کے افسر کی حیثیت سے گھومتا رہا۔ شام کے وقت گھومتے گھومتے ندی کے کنارے آکر بیٹھ گیا۔ سارے دن کی تھکن دُور کرنے ملائم اور نرم گھاس پر آنکھ بند کرکے لیٹ رہا۔ اس وقت تک دل و دماغ پر ایک نامعلوم سا بوجھ تھا۔ نہ جانے کب تک وہ اِسی طرح لیٹا رہا۔ لیکن پانی میں چھپاک سے کسی کے کودنے کی آواز سے وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا اور اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر دیکھنے لگا لیکن اُسے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ پھر بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے اپنی کار تک آیا اور ڈاک بنگلے کی طرف چل پڑا۔

موٹر کی گھرگھراہٹ سُن کر بوڑھے نے سر اُٹھا کر دیکھا سُنیل موٹر سے باہر آچکا تھا۔ تیز قدموں سے چلتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں پہنچا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ پھر سگریٹ سُلگا کر بوڑھے سے سُنی ہوئی باتوں پر غور کرنے لگا اور اُس کا ذہن ایک انجانے احساس سے کانپ اُٹھا۔ آج پونم کی رات ہے!!

"کھانا لگاؤں سرکار" بوڑھے کی آواز سے سُنیل کے خیالات منتشر ہو گئے۔

کھانا کھا کر سُنیل بنگلے کے لان میں کچھ دیر ٹہلنے کے بعد اپنے کمرے میں آکر اپنے پروگرام کے سلسلے میں رپورٹ لکھنے لگا۔ رپورٹ لکھتے وقت اُس نے دو تین بار محسوس کیا کہ کوئی کھڑکی سے جھانک رہا ہے۔ لیکن اُس طرف دیکھنے پر اُسے کچھ نظر نہ آیا۔ اپنی رپورٹ مکمل کرنے کے بعد سُنیل اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ لیکن سُنیل کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ پاس کی کھڑکی سے خنک ہوا اندر آرہی تھی۔ چاندنی شباب پر تھی اور فضا پر سکوت طاری تھا۔

اچانک کسی کے قہقہے کی آواز سُن کر سُنیل کانپ اُٹھا اور بستر چھوڑ کر کھڑکی کے پاس آپہنچا۔ اُس نے دیکھا ایک سایہ رینگتا ہوا قریب کی ڈھلوان سے اُتر رہا تھا۔ اپنے منتشر خیالات کو یکجا کرکے وہ سایہ کی حرکت پر غور کرنے لگا ــــ

'یہ سایہ کسی عورت ہی کا ہو سکتا ہے!' سُنیل کے خیالات نے سرگوشی کی۔ مختلف راستوں سے گزرتا ہوا وہ سایہ مندر کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ پھر کسی کے رونے کی آواز آنے لگی۔

کچھ دیر بعد آواز بند ہو گئی۔ سُنیل نے اپنے آپ کو بستر پر ڈال دیا۔ اُس وقت وہ اُسی سایہ کے متعلق سوچ رہا تھا اور سوچتے سوچتے نیند کی حسین آغوش میں جا پہنچا۔

صبح چوکیدار کے جگانے پر وہ بیدار ہوا لیکن رات کا واقعہ اُس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ جلد ناشتہ کرنے کے بعد سُنیل نے باہر جانے کے لئے تیار ہو کر چوکیدار سے کہا۔

"تم مندر تک میرے ساتھ چل سکتے ہو بابا؟"

"ضرور چلوں گا سرکار!" بوڑھے نے انکساری سے کہا۔

"اچھا شام کو سویرے ہی سب کام نپٹا لینا۔ میں تو رسے لوٹوں گا تو دیوی کا مندر دیکھنے چلیں گے۔"

شام کے چھ بج رہے تھے۔ بوڑھا اور سنیل مندر کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ لیکن دونوں اپنے اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے تھے۔ سنیل نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ لیکن بوڑھا کچھ خوف زدہ اور ہراساں تھا۔ کیونکہ بار بار اس کے دل و دماغ میں یہ بات آتی رہی کہ انھیں سیڑھیوں سے ہوکر وہ سفید سایہ مندر میں داخل ہوتا ہے۔ سنیل کی خاموشی اسے گراں گزر رہی تھی۔ اپنا خوف دور کرنے کے لئے بوڑھے نے کہا "سرکار! یہ مندر ایک ایسی کنواری لڑکی کی یاد دلاتا ہے جس نے برسوں اپنے کھوئے ہوئے پردیسی کی یاد میں پوجا کرتے ہوئے اپنی زندگی اس امید میں گزار دی کہ شاید اس کا مجازی خدا ایک دن اس کی زندگی میں لوٹ آئے! اور ایک صبح اس کی لاش اسی ڈھلوان کے دوسرے کنارے پر جھرنے کے پاس پائی گئی۔"

بوڑھے نے مندر کے اس کمرے میں پہنچ کر کہا "یہ کمرہ اسی کنواری لڑکی کی یادگار ہے۔ جسے گاؤں کے لوگوں نے بنوایا ہے اور اس میں اس کی تصویر آویزاں کر دی ہے۔ یہ کمرہ مندر کے دالان میں تھا جس سے ہوکر مندر کے اندرونی حصے دیکھے جاسکتے تھے۔ یہی اس دیوی کی تصویر ہے سرکار!"

اچانک سنیل کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ سر چکرانے لگا اور مندر کے گھنٹے اس کے کانوں میں لگاتار بجنے لگے۔

"آشا! تم!!" اس کے منہ سے نکلا۔

بے اختیار سنیل کے قدم آگے بڑھے اور اس کے ہاتھ تصویر کو حاصل کرنے کے لئے اٹھے ہی تھے کہ دوسرے لمحہ تصویر ایک چھلانگ کے ساتھ اس کے قدموں میں آگری۔

اور ماضی کے دھندلے سائے اس کے ذہن میں ابھرتے گئے ——

مدھو پور گاؤں کی وہ رومان پرور فضا —— چھٹکی چاندنی ——

جب سنیل اور آشا نے جیون ساتھی بن جانے کی قسم کھائی تھی . . .

ایم، ایس، سی کرنے کے بعد سنیل نے اپنی پھوپی کے گاؤں مدھو پور میں چند مہینے بتائے تھے جہاں آشا سے ملاقات ہوئی۔ گاؤں کے باہر آموں کے باغ میں دونوں کی محبت پروان چڑھی تھی۔ محبت جس میں سیتا کی سی پاکیزگی اور مریم کا سا تقدس جھلک رہا تھا۔

"پردیسی! مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ گے نا؟" آشا نے سنیل سے کہا تھا۔

"نہیں! نہیں! آشا بھگوان کے لئے تم ایسا مت سوچو۔"

پھر دونوں نے اس چھٹکی چاندنی میں اپنے مقدس پیار کو امر بنانے کا عہد کیا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ دونوں کے درمیان دولت اور امارت کی دیوار بلند ہوتی گئی اور ایک دن پردیسی آشا کی دنیا سے دور جا چکا تھا۔ آشا کے پیار کی کشتی بنا کسی پتوار کے زندگی کے ساگر میں ہچکولے کھانے لگی۔

سنیل کے دل پر آشا کی جدائی کے زخم رفتہ رفتہ مندمل ہوتے گئے۔ لیکن آشا کے دل کے زخم ناسور بن کر بہتے رہے اور اس کی تڑپ آشا کو تڑپاتی رہی۔

"عورت جب بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی!" آشا نے سوچا اور ایک رات اپنے پردیسی کی کھوج میں گھر سے نکل پڑی۔

---

- مسرت ایک انمول شے ہے جو اپنے نیک خیالات، بھلائی کے چھوٹے چھوٹے کاموں اور بے لوث خدمت سے حاصل ہوتی ہے۔
(ڈاکٹر مارڈن)
- کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنی صحت کا خیال رکھے۔ صحت کے بغیر انسان کچھ نہیں کرسکتا۔ (ڈاکٹر نپولین ہل)
- جو کام دماغ کو سب سے زیادہ پسند آئے وہی انسان کے لئے بہترین راستہ ہے۔ (سی۔ جی۔ ڈوڈان)
- دوستی ساتھ رہنے سہنے اور کھانے پینے کا نام نہیں۔ یہ دو دلوں کے ربط و اتصال کا نام ہے۔ (شیکسپیر)

---

"کہاں کھو گئے سرکار!" اچانک بوڑھے کی آواز پر سنیل چونک گیا۔ مندر کے گھنٹے خاموش ہو گئے تھے۔ ہر طرف چاندنی پھیل گئی تھی۔ دور جنگل سے گیدڑوں کی آواز آرہی تھی۔

"چلو بابو!" بوڑھے چوکیدار نے سنیل سے کہا۔

"آج! آشا کی بھٹکتی آتما کو شانتی مل گئی بابا!" سنیل نے سرد آہ بھر کر کہا اور پھر خیالات میں کھو گیا ——!!

# غزل

سعید اعجاز

ستم سے کیوں کرم جور تمام میرے بعد؟
کیا ہوئی بن کے بگڑنے کی ادا میرے بعد؟

یاد آنے نہ انہیں میری تباہی کا سبب
اس لیے آئینہ دیکھا نہ گیا میرے بعد

انقلابات کا میں خود ہی سبب تھا شاید
وقت نے پھر کبھی پلٹا نہ لیا میرے بعد

دیر و کعبہ کی عقیدت سے بچا کر دامن
کون چومے گا وہ نقشِ کفِ پا میرے بعد

مجھ کو یہ بات بھی ہے ننگِ وفا اے اعجاز
وہ ہوئے ہیں جو پشیمانِ جفا میرے بعد

# غزل

شاہد احسن مرادآبادی

دیکھے کوئی یہ اہلِ نظر کا کمال بھی
ہر شے میں دیکھتے ہیں کسی کا جمال بھی

یہ آرزو تھی اُن سے بہت کچھ کہیں گے ہم
اُن کے حضور کر نہ سکے اِک سوال بھی

کتنی طویل دو گے سزا انتظار کی
آ جاؤ اب، کہ بیت گئے ماہ و سال بھی

یہ ذوقِ میکشی ہے تو اِک روز دیکھنا
ہوگا جہاں نما مرا جامِ سفال بھی

احسن رہِ خلوص پہ تم گامزن تو ہو
رکھنا ذرا نظر میں زمانے کی چال بھی

# غزل

مس عزالہ اشفاق شاہجہانپوری

کبھی تو دستِ ساقی سے لبوں تک جام آئیگا
کبھی تو اپنا ذوقِ میگساری کام آئیگا

اُمیدِ موسمِ گُل میں یہ خوشیاں گلستاں والو
وہ دور آئے گا تو لیکن برائے نام آئیگا

مُصیبت سے نہ گھبرا جی نہ چھوڑ اے مبتلائے غم
کہ اس دنیا میں ہر آغاز کا انجام آئیگا

جو مرنے پر بھی کوئی صورتِ تسکین ہاتھ آئی
تو مر مر کر یہ جینا میرے کس دن کام آئیگا

یہ کیا معلوم تھا اپنی وفا بھی جرم ٹھہرے گی
ہمارے سر عزالہ یہ بھی اِک الزام آئیگا

# غزل

چندر پرکاش جوہر بجنوری

جو حقیقت تھی وہی آخر حقیقت رہ گئی ۔۔۔ مٹ گیا سب کچھ مگر باقی محبت رہ گئی
مدعائے دل کسی عنواں نہ پورا ہو سکا ۔۔۔ ہر تمنا تشنۂ حرف و حکایت رہ گئی
اُف وہ رہرو جو سرِ منزل بھٹکتا ہی رہا ۔۔۔ ہائے وہ کشتی جسے ساحل کی حسرت رہ گئی

اشک بھر آتے ہیں جوہر آج بھی بے اختیار
دل کو اُن کی یاد سے اِتنی تو نسبت رہ گئی

# دِلّی کا خط لندن کے نام

خوشتر گرامی

مائی ڈیر لندن!

یہ شیخی اور تعلّی کی بات نہیں تھی جب شاعر نے کہا تھا ؎

دِلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

اُس وقت شاعر کے پیشِ نظر دِلّی کی تہذیب و شرافت، یہاں کے اہلِ علم و کمال، یہاں کی عمارتیں اور شاہی محلات، یہاں کے کوچہ و بازار، علمی مجلسیں، ادبی محفلیں اور دُنیا کے مختلف گوشوں سے آتے ہوئے فنکار ہوں گے ـــــ مگر دِلّی آج جو عالم میں منتخب قرار پایا ہے تو ان میں سے کسی صفت کی بدولت نہیں ـــــ بلکہ یہ انتخاب آپ کے ذوق کے عین مُطابق ہوا ہے اور حق یہ ہے کہ آپ اس میں اوّل آتے تو آپ اِسے باعثِ افتخار بھی سمجھتے اور خوشی بھی حاصل کرتے۔ مجھے اِس پر نہ صرف خوشی نہیں ہوتی بلکہ افسوس بھی ہوا ہے ـــــ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ دِلّی کے فیشن زدہ اونچے گھرانے کی عورتوں میں صفِ ماتم بچھ گئی ہوگی۔ کیونکہ اُن میں اب اِس چیز کا رواج بڑھ رہا ہے۔

اخباروں میں نمایاں طور پر یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ـــــ دِلّی اِسکاچ وِہسکی کے لئے دُنیا میں سب سے مہنگا شہر ہے ـــــ اور شرم کی بات یہ ہے کہ دِلّی کو یہ "طرّۂ امتیاز" گاندھی جی کی جنم صدی کے دَوران میں حاصل ہوا ہے۔ مجھے خوشی ہوتی اگر اخباروں میں یہ سُرخی نظر آتی: "دِلّی جہاں اِسکاچ وِہسکی کا قحط ہے۔" بہرحال ؎

دِل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

کہ ؎

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

میرا نام یقیناً روشن ہوا کہ دِلّی میں اِسکاچ وِہسکی کی ایک بوتل کی قیمت ۳۲ ڈالر ہے ـــــ یہ فتویٰ آپ کے اخبار "فائنینشیل ٹائمز" نے دیا ہے۔ وِہسکی کی یہ قیمت بیروت سے پانچ گُنا ہے۔ خود آپ کے یہاں اِس کی قیمت نو ڈالر ہے جبکہ پیرس اور روم میں پانچ ڈالر، ہانگ کانگ، ورسنگاپور میں چھ ڈالر ہے۔ واشنگٹن میں ایک بوتل کی قیمت سات ڈالر اور نیویارک میں ساڑھے سات ڈالر ہے۔

میں علّامہ اقبالؔ کے الفاظ میں اپنے دل کا درد یوں کہہ سکتی ہوں ؎

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دَور کی دُھندلی سی اِک تصویر دیکھ

آج شراب کی قیمت کے اعتبار سے دِلّی اوّل نمبر پر ہے تو کل کہیں شراب خواروں کی صف میں اوّل نہ نکلے۔ کیونکہ اب سماج کی پریوں یعنی فیشن زدہ گھرانے کی عورتوں میں بھی شراب بار پا چکی ہے۔ اگر شراب یوں ہی بِکتی رہی اور اِس نے نئی دِلّی سے پُرانی دِلّی کا رُخ کر لیا اور گاندھی کا نام جپنے والوں نے اِس کی روک تھام نہ کی تو اندیشہ ہے کہ جمنا کی موجوں میں بھی سُرور و کیف پیدا ہو جائے گا اور کاک اُڑنے کی بجائے خُم پر خُم لنڈھائے جائیں گے ـــــ اور ہر پینے والا یہ عُذر کرے گا ؎

پیتا بغیرِ اِذن یہ کب تھی مری مجال
در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا

اب تک چُست پاجامے، تنگ پتلون اور جسم کے عضو عضو کو نمایاں کرنے والے لباس، اونچی ایڑی کے کھٹ کھٹ کرتے بُوٹ، ایوننگ اِن پیرس میں بسے ہوئے پیکر، کناٹ پلیس اور چاندنی چوک دِلّی کی زیب و زینت بڑھاتے ہیں۔ پھر آنکھوں میں خُمار اور لڑکھڑاتے قدم بھی نظر آئیں گے ـــــ ایک بوتل کے مستانے ہزار، کوئی یہاں گرا، کوئی وہاں گرا۔

شراب کے سلسلے میں ایک انوکھا امتیاز اور اِس امتیاز کا سبب اپنے پڑوس میں بھی مُلاحظہ فرمالیجئے ـــــ بون کی خبر ہے "مغربی جرمنی کے ساٹھ لاکھ عادی شراب نوشوں میں عورتوں کی تعداد دس لاکھ ہے اور یہ تعداد برابر بڑھ رہی ہے ـــــ نیوامبرگ کے ادارۂ شراب نوشی نے بتایا ہے کہ عورتوں میں شراب پینے کا رُجحان زیادہ تر گھریلو زندگی میں "تنہائی" کے مسئلہ

سے بڑھ رہا ہے جب کہ یہی نازک بدلوں، ہم تو اس نے اس کو عصرِ حاضر کی ایک نعمت سمجھا ہے۔

نیوا ہرگ کے ادیب کے مطالعے کا ماحصل یہ ہے کہ ـــــ "جدید زندگی میں گھر، بچوں اور سماجی ذمہ داریوں سے خالی ہوتا ہے اور عورتوں کے ذہن پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے۔"

اسی لئے اکبر الہ آبادی نے ہمیں خبردار کرتے ہوئے عورت کا "ناپ" یہ مقرر کیا تھا ؎

خاتونِ خانہ تو ہو سبھا کی پری نہ ہو

اور آج کی عورت خاتون خانہ کی بجائے سبھا کی پری بن گئی ہے۔ اس لئے سماجی ذمہ داریوں سے "بری الذمہ" ہونا بھی اس کے لئے لازمی ہو گیا ہے۔

آج انوکھے امتیاز کی بات چل نکلی ہے اور بات میں بات کچھ اس نوعیت کی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے آپ کو اپنی سرزمین کے ایک انوکھے جنازے کا دلچسپ اور انوکھا قصہ بھی سنا دوں ـــــ تامل ناڈو میں ایک جگہ ہے مایاورم۔ وہاں پچھلے دنوں بڑے باجے گاجے اور بینڈ کی ماتمی دھنوں میں جنازے کا ایک جلوس نکلا جس میں ایک نہیں آٹھ جنازے تھے۔ پھولوں سے لدے مکانوں کی چھتوں اور سڑک کے دونوں طرف سے پھولوں کی بارش راستے بھر جاری رہی۔ سارے راستے میں لوگوں کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے ـــــ یہ لیڈروں یا سیاست والوں کے جنازے نہیں تھے۔ کوئی مذہبی پیشوا بھی نہیں تھے اور یہ وطن کی آبرو اور حفاظت کے لئے مٹنے والے شہیدوں کا جلوس بھی نہیں تھا اور نہ عاشقوں کے جنازے تھے جو ذرا دھوم سے اٹھے۔ بلکہ یہ آٹھ جنازے "مرغوں مرغیوں" کے تھے۔ ان کے انتقال کا حادثہ جانکاہ اچانک پیش آیا تھا چونکہ موت اجتماعی واقع ہوئی تھی اس لئے وہ فارسی مثل کی تفسیر بن گئی۔

مرگِ انبوہ جشنے دارد

چنانچہ اچھا خاصہ جشن ہوا۔ گاؤں کے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ "مرغوں مرغیوں" کو عزت و اکرام کے ساتھ اٹھایا جائے۔ ان کو دھوم دھام سے غسل دیا۔ پھول چڑھائے گئے۔ پھولوں سے سجی ہوئی آٹھ گاڑیاں تیار کی گئیں۔ ان پر جنازوں کا جلوس نکلا۔ قبرستان لے جایا گیا اور انھیں آٹھ الگ الگ قبروں میں اتارا گیا۔

معلوم نہیں ان کے مزاروں پر کوئی کتبہ وغیرہ لگایا گیا ہے یا نہیں۔

مانگا گیا ہو تو دیوانِ غالب سے فال نکال لیں۔ جواب ملے گا ؎

قیامت اِک ہوائے تُند ہے خاکِ شہیداں پر

اِن سب کا چراغِ زندگی ایک ہی جھونکے میں تو گُل ہوا ہے۔

آپ اس کے جواب میں نیویارک کے کوچہ و بازار میں نکلنے والے ایک جلوس کو پیش کر سکتے ہیں۔ اُس کو بھی اتنی ہی پبلسٹی ملی اور لوگوں نے اُسے بہت شوق اور دلچسپی سے دیکھا ——— اِس جلوس میں ایک افریقی بندر، ایک گدھا، ایک سیاہ گھوڑا، جنوبی امریکہ کا چھوٹے قد کا اونٹ (لاما) دو بھیڑیں اور دو بکریاں شامل تھیں۔

اِس مُظاہرے کا اہتمام ایک متموّل اداکار تاجر مین کنگ نے کیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ میرا مقصد غلاظت اور گندگی کے خلاف پروٹسٹ کرنا تھا اور صاف ہوا پر زور دینا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ میئر کوئی دن نکالیں گے اور اُسے "انسانی ماحول" کا دن قرار دیں گے۔

مارمن کنگ کے جلوس میں شامل ایک بھیڑ کے گلے میں ایک تختی پڑی تھی جس پر لکھا تھا ——— "لوگ کہتے ہیں کہ مجھے بدبو آتی ہے"۔

اس کے برعکس بنکاک کی ایک خبر ہے کہ تھائی لینڈ کے میئر کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کیا گیا ہے جس میں ان پر شہر کو صاف نہ رکھنے کا الزام ہے۔ ان لوگوں نے مظاہرے کی بجائے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اِس کی پیروی تھائی لینڈ کے سابق بحری کمانڈر انچیف کر رہے ہیں۔

نیویارک والا طریقہ ہو یا بنکاک والا۔ بہرحال پتہ چلتا ہے کہ وہاں کچھ حسّاس لوگ ہیں۔ مگر میرے یہاں تو پچھلے دنوں ایک ہفتے سے زیادہ مدّت تک صفائی کرمچاریوں نے سڑکوں کو گندگی سے آلودہ کیا۔ کوچہ و بازار میں گندگی بکھیری۔ مگر کسی کے دل میں ذرا بھی احساس نہ ہوا۔

دلّی کے میئر نے نہ صرف یہ تماشہ "ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم" بن کر دیکھا۔ بلکہ کارپوریشن کے بھرے اجلاس میں اُن کی جن سنگھ پارٹی کے دو ممبروں نے اُن کی ناک کے نیچے "یوم انسانیت"، ایک اپوزیشن ممبر کو زدو کوب کر کے منایا۔ جس میں جوتے اور گھونسوں کا بے دریغ استعمال کیا گیا ——— میئر اور ایوان کے جن سنگھی لیڈر خاموشی سے یہ سب تماشا دیکھتے رہے۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ اُس دن میئر صاحب کو "پدم بھوشن" کے اعزاز سے نوازے جانے کا جشن بھی منایا جا رہا تھا ——— کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ تماشا اُسی جشن کا حصّہ اور "کلچرل پروگرام" کا جُز و تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ کارپوریشن کے اجلاس جن سنگھ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد کچھ ایسے ہی مناظر پیش کرتے رہتے ہیں اور میئر کی یہ عزت افزائی ——— بلکہ حوصلہ افزائی اِنھیں تماشوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ورنہ کجا پدم بھوشن اور کجا دِلّی کے میئر ——— دونوں میں بعد المشرقین ہے۔

مائی ڈیر! خط بہت لمبا ہو گیا۔ میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔ یار زندہ صحبت باقی۔ اللہ نگہبان۔ اللہ حافظ!

آپ کی
دِلّی

("ایشیا" دیکلی برمنگھم لندن کے شکریے کے ساتھ)

# صحت و زندگی

## ۱● چائے کے فائدے اور نقصان

چائے اب زندگی کے لوازمات اور ضروریات میں شامل ہو گئی ہے۔ ایسے کم ہی لوگ ہوں گے جو چائے نہ پیتے ہوں۔ بچے، بوڑھا، جوان اسے سب شوق اور رغبت سے پیتے ہیں۔ وقتی طور پر چائے پینے سے تازگی سی محسوس ہوتی ہے۔

اس کا مزاج گرم و خشک ہے۔ گرم عصبی مزاج والوں کے لئے اس کا زیادہ استعمال مُضر ہے۔ سرد اور بلغمی مزاج والوں کے لئے اعتدال سے چائے پینا فائدہ بخش ہے۔ ریاح کو دُور کرتی ہے۔ دردِ سر، گرانی، نیند اور غنودگی کے غلبے میں چائے پینے سے حواس میں چُستی محسوس ہونے لگتی ہے۔ جسمانی اور دماغی تکان دُور ہو جاتی ہے۔

گرم مزاج والے چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ ضرور کھائیں تاکہ اس کی مضرت کم ہو جائے۔

چائے قابض اور پیشاب آور ہے۔ بکثرت پینے سے ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔ طبیعت میں گرمی پیدا کرتی ہے۔ نیند اُڑا دیتی ہے۔ بکثرت پینے سے خون پتلا اور گندہ ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ عصبی توانائی کم ہو جاتی ہے اور خون اور اعصاب ہی کی دُرستی پر تمام اعمالِ حیات کی صحیح کارکردگی منحصر ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بھوک غائب، ہاضمہ ناقص اور صحت برباد ہو جاتی ہے

فرانس کے مشہور ڈاکٹر موسیو الیوی نے تجربات کی بنا پر لکھا ہے "بکثرت چائے پینے سے دماغی قوتوں میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ دماغ کی نازک رگیں کمزور اور قوتِ سامعہ ضعیف ہو جاتی ہے۔ کانوں میں مختلف قسم کی آوازیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ دل دھڑکنے لگتا ہے۔ دماغ میں اشتعالی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ چہرے کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ بکثرت پینے سے ہاضمہ کمزور ہو جاتا ہے۔"

ایک دوسرے ڈاکٹر کی رائے میں "بکثرت چائے پینے سے بھوک زائل ہو جاتی ہے۔ بدہضمی، اختلاجِ قلب، ذکاوتِ حِس، عصبی درد اور ہسٹریا کے دَورے اور کئی دوسرے عوارض لاحق ہو جاتے ہیں۔"

کھانے کے بعد چائے پینے سے اُسے ہضم کرتی ہے اور کھانے کی گرانی دُور کرتی ہے۔

## ۲● اپنے معدہ کی حفاظت کیجئے

آپ ہمیشہ تندرست و توانا اور صحت مند رہنا چاہتے ہیں تو اپنے معدہ کی حفاظت کیجئے۔ جسم میں معدہ سب سے ضروری چیز ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی معدہ سُست بن کر اپنا کام چھوڑ دے تو ہمارے سارے اعضاء اس سے متاثر ہوں گے۔ ساری جسمانی خرابیوں کی بنیاد معدہ کی خرابی ہی ہے۔

ہاضمہ بگڑ جانے کے ساتھ ہی دوسرے امراض کے حملے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ خون کا اچھا یا بُرا ہونا اعضائے ہاضمہ کے دُرست طور پر کام کرنے پر منحصر ہے اور جسم کی مناسب پرورش کے لئے خون کا صاف اور پاکیزہ ہونا نہایت ضروری ہے ـــــ معدہ کی حفاظت کے لئے، معدہ کو درست رکھنے کے لئے بہت باریک آٹے کی روٹی اور میدے سے بنی ہوئی چیزیں نہ کھانی چاہئیں۔ میدہ معدے کے لئے بہت نقصان دہ ہے۔ چکی کے پسے ہوئے، بے چھنے آٹے کی روٹی کھانی چاہیے۔ مشین سے پسا ہوا آٹا بہت باریک ہوتا ہے اور باریک آٹا معدہ کی دیواروں سے چمٹ کر ہاضمہ کو خراب کرتا ہے۔ قبض پیدا کرتا ہے اور قبض اُم الامراض یعنی بیماریوں کی ماں ہے بہت سے امراض قبض ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔

## ۳● آپ پریشان کیوں رہتے ہیں؟

آج کی دُنیا میں بیشتر لوگ غمگین اور پریشان خاطر ملیں گے۔

ہو سکتا ہے آپ بھی اُنھیں لوگوں میں ہوں ـــــ پریشان خاطری سے بچنے کے لئے برنارڈ شا نے بہت آسان اور بہت ارزاں نسخہ بتایا ہے۔ لکھا ہے ـــ "غمگین اور پریشان رہنے کا راز یہ ہے کہ آپ کے پاس یہ سوچنے کے لئے فرصت کہ آپ خوش ہیں یا نہیں؟ بد دلی اور شکستگی کا راز یہ ہے کہ آپ اس سوچ میں لگے رہیں کہ میں خوش ہوں یا نہیں؟ پریشان خاطری سے بچنے کے لئے آسان ترین اور ارزاں ترین نسخہ یہ ہے کہ کام کیجئے اور مصروف رہیئے!"

ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ـــ "اپنی پریشانی کے متعلق سوچنے کی پروا نہ کیجئے۔ کمرِ ہمت باندھ کر کسی کام میں مصروف ہو جایئے۔ آپ کا خون حرکت کرنے لگے گا۔ آپ کا ذہن متحرک ہو جائے گا اور آپ کے جسم کے اندر اُٹھتی ہوئی زندگی کی مثبت لہریں آپ کے دماغ سے پریشانیوں کو نکال دیں گی۔ مشغول رہیئے، مصروف رہیئے ـــــ پریشان خاطری کا یہ ارزاں ترین مداوا ہے اور مفید ترین بھی۔"

## ۴ • کامیابی کا راز

اگر آپ زندگی کی بازی گاہ میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو تصوّرات کے خوش آیند محل تعمیر کرنے کے بجائے حقیقت کے پرستار بنیئے۔

مشہور مفکر ڈوگلس لرٹن نے لکھا ہے ـــــ "یہ تو ہم سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کچھ لوگ تصوّرات کی دُنیا میں زندگی گزارتے ہیں اور وہ حقیقت اور تصوّر میں امتیاز نہیں کرتے۔ ہماری درسگاہوں کے گریجویٹ کی ایک کثیر تعداد ایسی ہے جو اِس طرح کی ذہنی بے بضاعتی کے شکار ہیں اور وہ تصوّر کو حقیقت کا نعم البدل سمجھتے ہیں۔ اُن میں فنونِ لطیفہ کے شوقین، ہر فن مولا لوگ، امارت پرست، عقل و دانش ظاہر کرنے والے لوگ شامل ہیں جن کی ساری زندگی ظاہر داری میں گزر جاتی ہے۔ جو حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کرکے رنگین و خوش آیند تصوّرات کے تاج محل تعمیر کرتے رہ جاتے ہیں" ـــ ایسے لوگ کبھی کامیابی کی منزل سے ہمکنار نہیں ہوسکتے۔

## ۵ • خوفناک انجام

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ انسان بڑھاپے میں بہت تجربہ کار ہو جاتا ہے۔ بہت حد تک یہ صحیح بھی ہے لیکن یہ کتنی حیرت ناک حقیقت ہے کہ وہ خود اپنی ذات کو اپنے اِس تجربے سے فائدہ نہیں پہنچاتا۔

مشہور مفکر سی۔ جی۔ ڈوکان نے لکھا ہے ـــــ "کام کے لئے جان دے دینا اِس لئے کہ کام آپ کو اور چیزوں کی نسبت عزیز ہے اور اُس کام کی وجہ سے آپ کو زندگی میں عزت اور اہمیت حاصل ہوتی ہے اور آپ اپنی زندگی کے آخری دنوں تک کام کرنے کے قابل ہیں۔ واقعی قابلِ قدر جذبہ ہے۔ لیکن تھوڑی سی زیادہ روزی کی خاطر! اور پھر اُس حالت میں جب کہ آپ کی ذہنی اور جسمانی قوتیں جواب دے رہی ہوں۔ ضرورت سے زیادہ کام کرنا بہت مضر اور مہلک ہے۔ اِس کا انجام بڑا خوفناک ہوتا ہے۔ یہ اپنے آپ پر ظلم کرنا ہے"

## ۶ • امرود ـــــ ایک مفید پھل

امرود سیب سے مُشابہت ہی نہیں رکھتا، اچھی قسم کا امرود سیب ہی کی طرح خوش ذائقہ بھی ہوتا ہے۔ اطبا کی رائے میں یہ نہایت مفید اور فرحت بخش پھل ہے۔ دل و دماغ اور معدے کو طاقت دیتا ہے۔ پھیپھڑوں کو موٹا اور طاقت ور بنانے کی بہت بڑی قوت رکھتا ہے۔ اِسے نمک اور سیاہ مرچ چھڑک کر کھانا کھانے سے پہلے کھانا مفید ہے۔ کھانا کھانے کے بعد امرود کھانا مُضر ہے اور قبض پیدا کرتا ہے۔

جن لوگوں کے مزاج میں سردی زیادہ ہو یا معدے میں رطوبت ہو اُنھیں نقصان دیتا ہے۔ خونی بواسیر میں بہت مفید بلکہ نافع ہے۔

ویدوں کی رائے میں بھی امرود بے حد مفید پھل ہے۔ صفرا، لیس دار بلغم اور بادی کو دُور کرتا ہے، دل کو فرحت بخشتا ہے، کمزوری کو دُور کرتا ہے۔ کھانسی، صفراوی بخار اور پیٹ کے درد میں مفید ہے۔

کھانے کے بعد قے ہو جاتی ہو تو امرود کھانے سے بند ہو جاتی ہے۔ کچا امرود زیادہ دیر شعلوں میں دبا کر کھایا جائے تو کھانسی دُور ہو جاتی ہے۔ کھانسی کے لئے یہ نہایت مفید آزمودہ گھریلو ٹوٹکہ ہے۔

امرود کے پتوں کو پانی میں پکا کر غرارے کرنے سے مُنہ کا ورم رفع ہو جاتا ہے۔ اِس عمل سے مسوڑے مضبوط اور دانت پائدار ہوتے ہیں۔ ہلتے ہوئے دانت بھی جم جاتے ہیں اور دانتوں کے درد کو آرام ہو جاتا ہے۔

پکے ہوئے امرود کی جیلی بھی بنائی جاتی ہے جو مرتبان میں رکھ کر عرصہ تک استعمال کی جاسکتی ہے۔

خوب پکے ہوئے امرودوں کو کچل کر تھوڑا پانی ڈال کر پکائیں۔ پھر کپڑے میں چھان لیں اور اس میں حسبِ ضرورت شکر شامل کر کے قوام کریں۔ امرود کی یہ جیلی نہایت لذیذ اور خوش ذائقہ ہوتی ہے۔

## ۷● رزمگاہِ حیات میں

زندگی کی رزمگاہ میں ہر طرح کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ آپ کے عزم و حوصلہ پر موقوف ہے کہ آپ ان سے شکست کھا جائیں یا فتح یاب و ظفریاب ہوں۔

زندگی کی رزمگاہ میں فتح حاصل کرنے کے لئے مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل کے اِس زریں مشورہ پر عمل کیجئے ـــــــ

"شکست اور فتح مترادف الفاظ ہیں۔ فتح و کامرانی اُن لوگوں کے قدم چومتی ہے جو شکست قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں"

## ۸● آپ ناکام کیوں ہوتے ہیں؟

کسی کاروبار میں آپ کی ناکامی کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ لیکن سب سے بڑا سبب، سب سے اہم سبب شریکِ کار یا کارپردازوں میں عدم اعتماد یا عدم تعاون ہوگا۔

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــ "انسانی قوت یا طاقت، مربوط فکر کو عمل کی منزل پر لانے کا دوسرا نام ہے۔ انسان کی کوئی جدوجہد اس وقت تک منظم نہیں کی جاسکتی جب تک اس کے ساتھ اس کے شریکِ کار یا اس کے ساتھ کام کرنے والے مکمل تعاون کا ثبوت نہ دیں۔ اگر کسی تجارت یا صنعت یا کاروبار کو زوال پذیر دیکھیں تو یقین کر لیجئے کہ اس کی تہہ میں کام کرنے والوں کی باہمی رنجش، عدم تعاون اور عدم اعتماد کارفرما ہے اور یہ سب عدم اعتماد کا نتیجہ ہے"

## ۹● زندگی کی عظمت کا راز

اگر آپ عظیم بننا چاہتے ہیں، اگر آپ اپنی زندگی کو عظیم بنانا چاہتے ہیں تو سب سے عظیم سبق ـــــ سب سے عظیم طاقت سے اپنا رشتہ مستحکم سے مستحکم تر بنائیے۔ اس کا قرب حاصل کیجئے، اس سے قریب تر ہو جائیے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ "انسان کی بیشتر طاقتیں اسی بات پر منحصر ہیں کہ وہ خدا سے کتنا نزدیک ہے۔ اس نے خدا سے کتنا رشتہ قائم و استوار کیا ہے۔ جتنا ہی وہ خدا سے قرب بڑھائے گا، اُتنی ہی اس کی صلاحیتیں بڑھتی جائیں گی۔ انسان کی زندگی اُتنی ہی عظیم ہو جائے گی خدا سے اس کا رشتہ جتنا گہرا ہوگا۔

## ۱۰● جب دردِ سر کی تکلیف ہو

۱۔ دردِ سر کی حالت میں لکھنا پڑھنا، غور و فکر کرنا اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والا کوئی کام مُضر ہے۔

۲۔ دردِ سر کے وقت آنکھیں بند کر کے ایسی جگہ آرام سے لیٹ جائیں جہاں تیز روشنی نہ ہو بلکہ تاریکی ہو۔ دردِ سر گرمی سے ہو تو کمرہ ٹھنڈا ہونا چاہئے۔ سردی سے ہو تو کمرے کو گرم رکھا جائے۔

۳۔ دردِ سر کی حالت میں سر دبوانا مفید ہے۔ سر کے گرد کوئی چوڑی پٹی یا رُومال باندھنے سے تکلیف کم ہو جاتی ہے۔

۴۔ دردِ سر کی حالت میں خاص کر اس وقت جب دردِ سر کے ساتھ بخار بھی ہو تو سر میں کوئی تیل یا پیشانی پر ٹھنڈا لیپ نہ لگائیں۔ اِس سے مرض کے بڑھ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ البتہ کسی کپڑے سے ہاتھ کی ہتھیلیوں اور پاؤں کے تلوؤں کو سہلائیں یا نیم گرم پانی سے پاشویہ کرائیں۔ اِن تدابیر سے خون اور حرارت کا میلان نیچے کی طرف ہو جائے گا اور دردِ سر میں سکون محسوس ہوگا۔

۵۔ دردِ سر خواہ کسی طرح کا ہو، اگر اس کے ساتھ قبض ہو تو اُسے دُور کرنا نہایت ضروری ہے۔

۶۔ چالیس سال کی عمر کے بعد اگر بے چین کر دینے والا دردِ سر ہو جائے تو اسے موتیا بند کا آغاز سمجھنا چاہئے۔ اِسی طرح ہر وقت دردِ سر رہنے سے بھی موتیا بند کا خطرہ ہوتا ہے۔ اگر موتیا بند نہ بھی ہو تو بینائی کمزور ہو جاتی ہے۔

۷۔ دردِ سر کی حالت میں کوئی غذا کھانا مناسب نہیں ہے۔ اگر بھوک زیادہ ہو تو کوئی زود ہضم غذا کھا سکتے ہیں۔ قابض اور بادی چیزوں سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ گرم دودھ بہت مفید ہے۔

## ناردرن ریلوے

# ٹائم ٹیبل میں تبدیلیاں

یکم اپریل 1970ء سے ایک آرام دہ ایکسپریس گاڑی نمبر 69 اپ/70 ڈاؤن الہ آباد اور لکھنؤ کے درمیان براستہ رائے بریلی چالو کی جارہی ہے۔ یہ الہ آباد سے 5 بج کر 15 منٹ پر صبح روانہ ہوگی اور 10 بج کر 25 منٹ پر لکھنؤ پہنچے گی۔ واپسی پر یہ لکھنؤ سے 4 بج کر 40 منٹ پر شام کو روانہ ہوگی اور 10 بج کر 15 منٹ پر شام کو الہ آباد پہنچے گی۔

### گاڑیاں جن میں توسیع کی گئی ہے

49 اپ/50 ڈاؤن میں توسیع کی جائے گی اور یہ لکھنؤ اور ظفر آباد کے درمیان براستہ سلطان پور چلے گی۔ 49 اپ ظفر آباد سے 11 بج کر 5 منٹ پر روانہ ہوگی اور 4 بج کر 40 منٹ پر لکھنؤ پہنچے گی۔ 50 ڈاؤن لکھنؤ سے 11 بج کر 55 منٹ پر صبح روانہ ہوگی اور ظفر آباد 5 بج کر 15 منٹ پر پہنچے گی۔ ایک دوسری گاڑی 2 این ڈی ایف/1 این ڈی ایف مابین فرید آباد اور پلول میں توسیع کی گئی ہے۔ 2 این ڈی ایف بطور 380 اپ نئی دہلی سے 6 بجے صبح روانہ ہوگی اور پلول 7 بج کر 50 منٹ پر صبح پہنچے گی جب کہ 1 این ڈی ایف بطور 379 ڈاؤن پلول سے 8 بج کر 15 منٹ پر روانہ ہوگی اور نئی دہلی 10 بج کر 10 منٹ پر پہنچے گی۔

### تھرو گاڑیاں

351 اپ/352 ڈاؤن جو سہارنپور اور لکھنؤ کے درمیان چل رہی ہے اور 1 لے ایل/2 لے ایل جو لکھنؤ اور الہ آباد کے درمیان چل رہی ہے اب بطور تھرو ٹرین مابین سہارنپور اور الہ آباد بطور 351 اپ/352 ڈاؤن چلے گی۔ 1 لے ایل/2 لے ایل منسوخ کر دی گئی ہے۔

### گاڑیاں جو اب ڈیزل سے چلیں گی

9 اپ/10 ڈاؤن ڈیزل ٹریکشن پر مابین مغل سرائے اور دہرہ دون چلے گی۔ اس طرح اس گاڑی

کی رفتار اور مسافروں کے لئے گنجائش میں اضافہ ہو جائے گا۔ مندرجہ ذیل مزید زائد کوچز ان گاڑیوں پر فراہم ہوں گے:-

(i) ایک تھرڈ کلاس کیرج مابین دہرہ دون اور ہوڑہ

(ii) ایک تھرڈ کلاس کیرج مابین دہرہ دون اور وارانسی (5 روز)

(iii) ایک تھرڈ کلاس کیرج مابین ہردوار اور وارانسی

(iv) ایک تھرڈ کلاس کیرج مابین دھنباد اور لکھنؤ (دھنباد اور وارانسی کے درمیان کی بجائے۔

(v) ایک جزوی ایرکنڈیشنڈ کوچ مابین وارانسی اور دہرہ دون گرمیوں کے دوران ہفتہ میں دو بار چلے گا۔ وارانسی سے منگل وار اور سنیچر وار کو اور دہرہ دون سے بدھ اور اتوار کو۔

## وقفہ میں اضافہ

41 / 68 اور 67 / 42 بمبئی ہوڑہ جنتا ایکسپریس کا وقفہ ہفتہ میں دو بار کی بجائے بڑھا کر تین بار کر دیا جائے گا۔

## گاڑیاں جن کا رُخ بدلا گیا

7 اپ / 63 ڈاؤن اور 64 اپ / 8 ڈاؤن براستہ آگرہ سٹی کی بجائے براستہ آگرہ فورٹ چلے گی۔ نمبر 1 اے سی اور نمبر 2 اے سی براستہ آگرہ فورٹ کی بجائے براستہ آگرہ سٹی چلے گی۔

## اہم تبدیلیاں

26 ڈاؤن امرتسر سے 6 بجے صبح کی بجائے 6 بج کر 35 منٹ پر صبح روانہ ہوگی۔ 16 اپ نئی دہلی سے 7 بج کر 15 منٹ شام کی بجائے 5 بجے شام روانہ ہوگی۔ 13 اپ دہلی سے 10 بج کر 5 منٹ صبح کی بجائے 11 بج کر 10 منٹ پر پہنچے گی۔ 10 ڈاؤن دہرہ دون سے 7 بج کر 15 منٹ شام کی بجائے 8 بج کر 55 منٹ پر شام کو روانہ ہوگی۔ 9 اپ دہرہ دون 9 بج کر 45 منٹ صبح کی بجائے 8 بج کر 45 منٹ صبح پہنچے گی۔ 66 / 62 ڈاؤن دہرہ دون سے 10 بجے شام کی بجائے 7 بج کر 10 منٹ شام چلے گی۔ 84 ڈاؤن لکھنؤ 7 بج کر 50 منٹ صبح کی بجائے 7 بج کر 30 منٹ پر پہنچے گی۔ 80 اپ تاج ایکسپریس نئی دہلی سے 7 بجے صبح کی بجائے 7 بج کر 15 منٹ صبح روانہ ہوگی۔

## مزید تھرڈ کلاس سلیپر ایکموڈیشن

ایک مزید جزوی 3 ٹائر سلیپر کوچ مابین میرٹھ شہر اور الہ آباد 6 کے ایم / 12 ڈاؤن اور 11 اپ / 1 کے ایم گاڑیوں

کے ساتھ چلے گا۔ ایک 2 ٹائر سلیپر کوچ ایک تھرڈ کلاس کی بجائے مابین بیکانیر اور آگرہ فورٹ 95 اپ/208 ڈاؤن اور 207 اپ/96 ڈاؤن ایم جی گاڑیوں کے ساتھ چلے گا۔

## II کلاس سلیپر ایکموڈیشن

سیکنڈ کلاس سلیپر کوچ مابین نئی دہلی اور مدراس 22 اپ/52 اپ اور 51 ڈاؤن/22 ڈاؤن کے ساتھ بجائے 26 اپ/15 ڈاؤن اور جی ٹی/اے سی ایکسپریسوں کے ساتھ چلے گا۔

## ایئر کنڈیشنڈ ایکموڈیشن

ایک جزوی ایئر کنڈیشنڈ کوچ 1 اپ/2 ڈاؤن میل گاڑیوں پر (دہلی۔کالکا) ہفتہ میں تین بار کی بجائے ہر روز چلے گا۔ ایک مکمل طور پر ایئر کنڈیشنڈ کوچ ہر روز 41 اپ مسوری ایکسپریس کے ساتھ دہلی سے دہرہ دون کو یکم اپریل 70ء سے اور 42 ڈاؤن کے ساتھ دہرہ دون سے دہلی کو ۲ اپریل 70ء سے چلے گا۔ ایک مکمل طور پر ایئر کنڈیشنڈ کوچ ہر روز مابین بمبئی سنٹرل اور پٹھانکوٹ 3 ڈاؤن/33 اپ اور 34 ڈاؤن/4 اپ میل گاڑیوں کے ساتھ چلے گا۔ علیحدہ اے سی کوچ مابین دہلی اور امرتسر 31 اپ/32 ڈاؤن میل گاڑیوں کے ساتھ چلے گا۔ ایک جزوی طور پر ایئر کنڈیشنڈ کوچ 91 اپ/92 ڈاؤن بیکانیر میل گاڑیوں کے ساتھ مابین دہلی اور بیکانیر ہفتہ میں دو بار ۳۱ جولائی 70ء تک دہلی سے ہر سوموار اور ویروار کو اور بیکانیر سے ہر منگل وار اور شکروار کو چلے گا۔ ایک جزوی طور پر ایئر کنڈیشنڈ کوچ 93 اپ/94 ڈاؤن دہلی جودھپور میل گاڑیوں کے ساتھ ہفتہ میں دو بار کی بجائے ہفتہ میں تین بار دہلی سے ہر سوموار، بدھ وار اور شکروار کو اور جودھپور سے ہر اتوار، منگل وار اور وروار کو چلے گا۔ جزوی طور پر ایئر کنڈیشنڈ کوچ جو 59 اپ/60 ڈاؤن سرینگر ایکسپریس گاڑیوں کے ساتھ مابین نئی دہلی اور پٹھانکوٹ ہفتہ میں تین بار چل رہے ہیں ختم کر دیئے جائیں گے۔

## تھرو/سیکشنل کیرج

ایک فرسٹ کلاس کوچ اور ایک تھرڈ کلاس (3 ٹائر) مابین بمبئی سنٹرل اور پٹھانکوٹ 3 ڈاؤن/33 اپ اور 34 ڈاؤن/4 اپ میل گاڑیوں کے ساتھ چلے گا۔ ایک تھرڈ کلاس کوچ جو مابین پھلیرہ جودھپور۔ماروار جنکشن 209 اپ/210 ڈاؤن کے ساتھ چل رہا ہے، بڑھا کر رتلام تک اور 209 اپ/219/216/69 اور 210/222/217/70 گاڑیوں کے ساتھ ماروار جنکشن کی بجائے رتلام کوچ سے بدل دیا جائے گا۔

مہربانی کر کے مزید تفصیلات کے لئے نیو ٹائم ٹیبل ملاحظہ کیجیے جو اہم ریلوے اسٹیشنوں پر ریلوے بکنگ/ریزرویشن/انکوائری آفس/بک شالوں پر فروخت ہو رہا ہے

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ نجی، اخلاق، تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش دریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر بیسویں صدی، دہلی)

---

**سعیدہ خاتون۔ بمبئی**

س۔ کچھ نصیحت کی باتیں بتایئے۔

ج۔ جادۂ حیات پر چلتے ہوئے خدائے پاک اور بزرگانِ دین کے اِن ارشادات کو مشعلِ راہ بنایئے ———

"کسی سے ناپسندیدہ بات نہ کرو۔"

"بہتر وہ لوگ ہیں جو قرض کو خوش دِلی سے ادا کرتے ہیں۔"

"جب عقل کامل ہوتی ہے تو گویائی کم ہو جاتی ہے۔"

"اپنے ظاہر اور باطن کو یکساں رکھو۔"

---

**جسونت کور۔ کان پور**

س۔ مہربانی کرکے بتایئے، وٹامن سی، کن کن چیزوں میں ہوتا ہے؟

ج۔ سبز ترکاریاں اور پھل وٹامن سی کا خزانہ ہیں۔ گوبھی، مولی، شلغم، ٹماٹر، پیاز، کھیرا، ککڑی، پالک، کاہو کی سبز پتیوں کا ساگ، کرم کلا، مرچی، لوبیا، چقندر، آملہ، سنگترہ، نارنگی، سیب، انگور، لیموں، مالٹا، پپیتا، آم، انناس میں وٹامن سی بہت زیادہ ہوتا ہے۔

س۔ مٹر کے بارے میں بھی کچھ بتایئے۔

ج۔ مٹر زود ہضم اور مقوّی غذا ہے۔ اس میں گندھک اور فاسفورس، نائٹروجن اور پروٹین کے اجزا و پائے جاتے ہیں۔ اعصاب اور عضلات کے لئے مُفید ہے۔ مٹر کھانے سے خون اور گوشت بڑھتا ہے۔ عورتوں کے دودھ میں اضافہ ہوتا ہے۔

---

**محمد شوکت۔ کشن گنج۔ پورنیہ**

س۔ لیڈر میں کن کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے؟

ج۔ لچھے دار تقریریں کرنا جانتا ہو۔ کسی مقابلہ میں شکست کھا کر بھی نہ شرمائے۔ خویش پروری کو عوام کی خدمت پر مقدم سمجھے۔ ضمیر کشی کرنے پر اُس کا ضمیر اُسے ملامت نہ کرے۔ جھوٹے وعدے کرنے میں طاق ہو۔

س۔ ہمارے مُلک کے لیڈروں میں یہ اوصاف ہیں یا نہیں؟

ج۔ ہمارے مُلک کے لیڈروں میں یہ اوصاف بدرجۂ اتم موجود ہیں!

---

**عبدالمجید خاں۔ برہان پور**

س۔ کانگریس کے دو ٹکڑے ہونے کا اصل سبب کیا ہے؟

ج۔ حصولِ اقتدار کی دَوڑ!

س۔ اِندرا گاندھی کا سیاسی مستقبل؟

ج۔ اُن کے حریفوں کی نظر میں تاریک ہے، درحقیقت روشن و تابناک ہے!

س۔ عدم کا کوئی شعر سُنایئے۔

ج۔ بِلا نہ جادہ، نہ منزل، نہ روشنی کا چراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری

---

**آتما سنگھ۔ امرتسر**

س۔ کچھ اچھی باتیں بتایئے۔

ج۔ مہاتما بدھ نے فرمایا ہے "کسی کا دل دُکھانا سب سے بڑا پاپ ہے۔" مہاتما تلسی داس نے فرمایا ہے "جو لوگ دُکھ کو سُکھ سمجھتے ہیں، اُن کے لئے کانٹے بھی پھول بن جاتے ہیں۔"

### [illegible] شیر۔ وجے واڑہ (آندھرا)

س۔ موجودہ ہندوستان آپ کی نظر میں؟
ج۔ ایسا عجائب گھر جس میں اتنی آوازوں کا شور ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی!

---

### روشن آرا۔ کلکتہ

س۔ آج کل کی لڑکیاں اتنا تنگ لباس کیوں پہنتی ہیں؟
ج۔ اس لئے کہ آج کے مرد ایسا ہی لباس پسند کرتے ہیں۔
س۔ کیا کوئی لڑکی فلمی دُنیا میں قدم رکھ کر شریف رہ سکتی ہے؟
ج۔ ہمیں اس کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔

---

### محمد عثمان نواز گولکنڈہ حیدرآباد دکن

س۔ خوشتر چچا! دُنیا میں سب سے اچھا پیشہ کیا ہے؟
ج۔ لیڈری!
س۔ کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں موجودہ دَور میں ہمارا مُلک کس شعبہ میں ترقی کر رہا ہے؟
ج۔ سچائی اور ایمان داری کے سوا ہمارا مُلک ہر شعبہ میں ترقی کر رہا ہے۔

---

### خواجہ فیروز بیلی سرائے بہار شریف

س۔ آج کل کے زمانے میں سب سے زہریلی چیز کیا ہے؟
ج۔ زہریلی ذہنیت!
س۔ ایک بُوند آنسو کی قیمت؟
ج۔ صاحبِ نظر کی نگاہ میں موتی سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

---

### کمال احمد صابر۔ اورنگ آباد گیا

س۔ ادیب یا شاعر بننے کے لئے کس وصف کا ہونا ضروری یا لازمی ہے؟
ج۔ حسّاس دل ــــ بینا آنکھیں ــــ بیدار ذہن۔
س۔ اگر توقّع کے خلاف بیوی مل جائے تو؟
ج۔ بیوی توقّع کے خلاف مل جائے، لیکن شوہر کو اپنی توقّع کے خلاف نہ سمجھتی ہو تو شوہر کو خوش ہونا چاہیئے کہ بیوی اُسے اپنی توقّع کے خلاف نہیں سمجھتی۔

---

### سُنیتا سیٹھی۔ نئی دہلی

س۔ سردیوں میں لوگ مونگ پھلی بہت کھاتے ہیں۔ آپ کی رائے میں مونگ پھلی مُفید ہے یا مُضر؟
ج۔ اعتدال سے کھائی جائے تو مونگ پھلی جسم کو طاقت بخشتی ہے۔ مونگ پھلی کا تیل بھی طاقت بخشتا ہے۔ خالی پیٹ مونگ پھلی نہ کھانی چاہیئے۔

---

### یاسمین۔ کلکتہ

س۔ میں چاند پر جانا چاہتی ہوں۔ کیا میری یہ خواہش ہندوستان سے باہر جا کر پوری ہو سکتی ہے؟
ج۔ بانو! آپ اپنے ہندوستان سے باہر جا کر چاند پر جانا چاہتی ہیں؟ اور حقیقت یہ ہے کہ ــــ

ماہ و انجم کا دَور ختم ہوا
ماند پڑ جائیں گے جہاں ہوں گے
اب ہماری زمین کے ذرّے ہی
آسمانوں پہ ضوفشاں ہوں گے

س۔ زندگی میں کامیابی کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے؟
ج۔ کامیاب انسانوں کے نقشِ قدم پر چل[illegible]
س۔ اپنی پسند کا ایک شعر سُنائیے۔
ج۔ پائے طلب کے واسطے کوئی نئی زمیں [illegible]
وادیٔ مہر و ماہ تو لغزشِ نیم گام ہے

---

### سیّد ابوالفضل ظفر۔ بیرپور۔ سہرسہ

س۔ چچا جان! آپ کا اصل نام کیا ہے؟
ج۔ اِس دَور میں جبکہ ہر چیز نقلی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا نام اصلی ہے، جو آپ "بیسویں صدی" کے ہر شمارہ میں دیکھتے ہیں
س۔ اپالو نمبر ۱۱ کے ذریعہ چاند پر انسان کو بھیجنے میں کُل کیا خرچ ہوا؟
ج۔ اِتنا زیادہ کہ سُن کر آپ غرقِ حیرت ہو جائیں گے!
س۔ ریڈیو کس نے ایجاد کیا؟
ج۔ اٹلی کے جی مارکونی نے۔

---

### اشوک کمار بی۔ اے۔ لدھیانہ

س۔ "بیسویں صدی" کے لئے اپنے افسانے بھیجوں تو آپ شائع کریں گے؟
ج۔ "بیسویں صدی" کے معیار کے ہوں گے تو شکریہ کے ساتھ شریکِ اشاعت کئے جائیں گے۔

---

### صابر حسین۔ بمبئی

س۔ چین کے پاس کتنی فوج ہے؟
ج۔ برطانوی فوجی تحقیقات کے شعبے کے ماہرین کی رپورٹ کے مطابق چین کی مسلح افواج کی تعداد ۲۷ لاکھ ۸۶ ہزار ہے۔

مس شہناز۔ نئی دہلی

س۔ ڈاکٹر ٹیگور کو کب نوبل پرائز ملا تھا؟

ج۔ ۱۹۱۳ء میں۔

س۔ ڈاکٹر ٹیگور کے بعد سی۔ وی۔ رمن کو نوبل پرائز ملا یا ڈاکٹر ہرگوبند کھورانہ کو؟

ج۔ سی۔ وی۔ رمن کو۔ سی۔ وی۔ رمن کو ۱۹۳۰ء میں نوبل پرائز ملا تھا۔ ڈاکٹر ہرگوبند کھورانہ کو ۱۹۶۸ء میں نوبل پرائز ملا۔

---

محمد شمس الدین قاضی۔ سرپور ٹاؤن (آندھرا)

س۔ انسان ناکامی و نامرادی سے گھبرا کر کیا کرتا ہے؟

ج۔ پست ہمت انسان خودکشی کر لیتا ہے۔ بلند حوصلہ انسان ناکامی کو کامیابی کا زینہ بنا لیتا ہے۔

س۔ خوشتر بھائی! آپ "بیسویں صدی" کے علاوہ بھی دوسرے رسالے کیوں نہیں نکالتے؟

ج۔ رسالہ نکالنا آسان کام نہیں ہے۔ ان حالات میں "بیسویں صدی" ہی کو اس پابندی اور اس آن بان سے نکالنا کہسار کا سینہ چیر کر جوئے شیر نکالنا ہے۔

---

ایچ۔ اے۔ فانی۔ حیدر

س۔ آج کل کی جوان لڑکیوں کے چست لباس پہننے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج۔ ان کے گھروں کے مردوں کی بے غیرتی پر لعنت بھیجنے کو جی چاہتا ہے۔

س۔ آئندہ بیس سال میں ہندوستان کی معاشی حالت کیسی ہوگی؟

ج۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا۔

س۔ زندگی، غم، خوشیاں، دولت، عزت، خوبی ۔۔۔ کن چیزوں کو عزیز رکھیں؟

ج۔ باعزت زندگی کو۔

---

رضیہ جمیل۔ لاہور

س۔ شاد مرحوم کا ایک قطعہ سنائیے۔

ج۔ اثر اندازیٔ نشاط و الم
حسبِ افتادِ طبع ہوتی ہے
کچھ دماغوں میں غم بھی ہنستے ہیں
کچھ دلوں میں خوشی بھی روتی ہے

س۔ ایک فکر انگیز و خیال افروز رباعی بھی سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

تاریکیٔ حالات کا شکوہ کیا
ان آتشیں لمحات کا شکوہ کیا
تم جل کے اگر شمع نہیں بن پائے
پھر پھیلی ہوئی رات کا شکوہ کیا

---

محمد مرتضیٰ حسن سیوان ضلع سارن

س۔ انسان کے سامنے مجبوری ہی مجبوری ہو تو اسے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ جب بھی بد دل نہ ہونا چاہئے حوصلہ نہ ہارنا چاہئے۔

س۔ سرورق کے لئے تصویر بنا کر بھیجوں تو قبول فرمائیں گے؟ اگر ہاں تو کس پتے پر بھیجوں؟

ج۔ اچھی تصویر ہوگی تو بصد شکریہ قبول کی جائے گی۔ تصویر ایڈیٹر "بیسویں صدی" دریا گنج دہلی کے نام بھیج سکتے ہیں۔

---

محمد عابد حسین۔ پورنیہ

س۔ تعلیم نسواں کے متعلق آپ کی رائے؟

ج۔ ہم عورتوں کی اتنی اور ایسی تعلیم کے حامی ہیں جو انھیں چراغ خانہ سے شمع محفل نہ بنا دے۔

س۔ پیاری زبان، پیاری زبان
اردو زبان، اردو زبان
یہ شعر کس شاعر کی تخلیق ہے؟

ج۔ ہمیں یہ نہیں معلوم یہ شعر کس کا ہے۔ ہاں! یہ شعر طاہرہ سعید کا ہے ؎

کتنی میٹھی زبان، کیسی پیاری زبان
میری اردو زبان، فخرِ ہندوستاں

---

ثریا پروین جانسی۔ بمبئی

س۔ ماضی کو نہ بھولنے کی ترکیب بتائیں۔

ج۔ بانو! ماضی کہاں بھولتا ہے۔ سنا نہیں آپ نے کسی نے کہا ہے ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

س۔ کوئی غمناک شعر سنائیے۔

ج۔ شبِ غم کی تیرگی میں مری آہ کے شرارے
کبھی بن گئے ہیں آنسو کبھی بن گئے ستارے

---

ایم۔ جے۔ احمد کشکل۔ سوبھے واڑہ

س۔ لڑکیاں ٹیڈی لباس کیوں پسند کرتی ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ ان کے گھر کے مرد بھی لباس پسند کرتے ہیں؟

---

زاہد انصاری۔ پربھنی

س۔ انسان جب غموں سے گھبرا جائے تو اسے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ غم کو خوشی بنا لینا چاہئے ۔۔۔ اسے اس حقیقت پر یقین رکھنا چاہئے ؎

مایوسِ انبساط رہے گا تمام عمر
وہ دل جو اس زمانے میں مانوسِ غم نہیں

س - خوشتر بھیا! منٹو، مجاز اور شاد کی موت کا ذمہ دار ---- ؟

ج - شراب خانہ خراب!

س - ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو کون کون سے عظیم افسانہ نگار دیے ہیں؟

ج - کئی عظیم افسانہ نگار [illegible] کا نام سرِ فہرست ہے۔

---

**[illegible] حیدر عابدی - علی گڑھ**

س - ہر ماہ "بیسویں صدی" دیکھ کر ایک نئی خوشی کیوں ہوتی ہے؟

ج - یہ آپ کے بلند ذوق کی دلیل ہے۔

س - آدمی ہردلعزیز کیسے بن سکتا ہے؟

ج - دوسروں کو خوشی دے کر، دوسروں کے غم کو اپنا غم بنا کر، ہردلعزیز انسانوں کے نقشِ قدم پر چل کر۔

س - اردو بولنے والوں کی سب سے زیادہ تعداد کہاں ہے؟

ج - بنگال اور مدراس کو چھوڑ کر سارے ہندوستان میں دوسری زبانوں سے زیادہ اردو بولی جاتی ہے۔

---

**حسن جمیل - گورکھپور**

س - بھیا! زندگی زندہ دلی کا نام ہے

یا

زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا؟

ج - زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔

س - کہتے ہیں کہ اُمید پہ جیتا ہے زمانہ وہ کیا کرے جس کو کوئی اُمید نہیں ہے؟

ج - سرد آہیں بھرتے ہوئے یہ گنگنایئے ؎

ترکِ اُمید بس کی بات نہیں

ورنہ اُمید کب بر آئی ہے

س - جو انسان زندگی کی بازی ہار گیا ہو کیا اسے جینے کا حق ہے؟

ج - کیوں نہیں۔ اِس لئے کہ ؎

آج بھی فردا پہ ہے جن کو یقیں

اُن کے ہونٹوں پر ہنسی ہے آج بھی

---

**ایس۔ ایم بدرالدین امینی۔ بانسپڑیا۔ ہگلی**

نذیر قمر تھویری۔ پونہ

س۔ انسان کو سکون خاطر کب اور کیسے ملتا ہے؟

ج۔ نیک کام کرنے، دوسروں کا دل دکھانے سے بچنے سے انسان کو ہر جگہ سکونِ خاطر نصیب ہوتا ہے۔

س۔ انسان انسانیت کی بلندی سے کب گر جاتا ہے؟

ج۔ جب انسانیت کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔

س۔ فلمی شاعروں کا کلام "بیسویں صدی" میں کیوں شائع نہیں ہوتا؟

ج۔ "بیسویں صدی" فلمی پرچہ نہیں ہے۔

---

محمد انوار الحسن صدیقی۔ عثمان آباد

س۔ خوشتر انکل! "بیسویں صدی" کے درخشاں ستاروں سے خط و کتابت کرنے کا متمنی ہوں۔ کیا وہ میرے خطوط کا جواب دیں گے؟

ج۔ دینا تو چاہئے۔ خط لکھ کر دیکھئے۔

س۔ عندلیب شادانی کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ تھوڑی تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انھیں کی یاد میری زندگی ہے

---

محمد سالم حسین تنویر۔ منگلی

س۔ گھر صحیح ہے یا گھرو؟

ج۔ گھر

س۔ عورت؟

ج۔ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

س۔ زرینہ نگار... مرحوم کی تصنیفات کیا ہیں؟

ج۔ "جیالا" "ملکار" "سنگم" "دو آتشہ" "میرا کلامِ منتخب" "میرا کلام نو بہ نو" "زار لنگ" "... تلے" "مطائبے" "سرقہ اور توارد"

"آواز اقبال" "غالب اور اس کی شاعری" "پانچ مقبول طنز و مزاح نگار" "جوش اور اس کی شاعری" "ادبی لطیفے" "محاورات غالب" "قاشیں"

---

محمد ذکریا گنگل (آندھرا)

س۔ انسان کو حقیقی خوشی کب حاصل ہوتی ہے؟

ج۔ دوسروں کو خوشی دے کر۔

س۔ خوشتر گرامی صاحب! غالب کا کوئی خوب تر شعر سنائیے۔

ج۔ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

س۔ چاند کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ ایک حیرت انگیز حقیقت!

---

عبد الصمد خاں۔ ناندیڑ

س۔ اچھے دوست کی پہچان؟

ج۔ اچھا دوست چین کے چاؤ جیسا نہیں ہوتا۔

س۔ ایک لطیفہ سنائیے۔

ج۔ یہ کس لطیفہ سے کم ہے کہ آپ سرگوشیوں میں ہم سے لطیفہ سننے کی فرمائش کر رہے ہیں۔

س۔ حضرت اکبر الہ آبادی کا ایک شعر سنائیے۔

ج۔ ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

---

غیاث الدین نیاز۔ بہار یونیورسٹی مظفرپور

س۔ پروانہ کے شمع کی طرف جانے کی وجہ رشک ہے یا محبت؟

ج۔ رشک نہ محبت ؎
پرائی آگ میں جلتا ہے کون دنیا میں
پتنگے آگ میں اپنی بنامِ شمع جلے

---

س۔ شادی کے بعد بھی ادھوری زندگی کی تکمیل نہ ہو سکے تو؟

ج۔ اپنے دل میں جھانک کر دیکھنا چاہئے کہ ایسا کیوں ہے؟

س۔ "بیسویں صدی" کا پہلا شمارہ کب شائع ہوا تھا؟

ج۔ اب سے ۴۴ سال پہلے۔

---

عابد انصاری۔ کلچرم شریف میدک (آندھرا)

س۔ کیا مذہب کا دوسرا نام انسانیت ہے؟ اگر نہیں تو مذہب اور انسانیت کا فرق بتائیے۔

ج۔ آپ کے اس سوال کا سلجھا ہوا جواب یہ ہے —— انسانیت سب سے اچھا مذہب ہے۔

س۔ عندلیب شادانی کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ شکریہ پرسشِ غم کا مگر اصرار نہ کر
پوچھنے والے یہ تیرا ہی کہیں راز نہ ہو

---

عباس علی۔ شاجاپور

س۔ ماضی کی یاد بھلائے نہ بھلائی جائے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ حال کے ہنگاموں میں کھو جانا چاہئے۔




[illegible] خوشتر گرامی —— مطبوعہ [illegible] دہلی [illegible] —— چھپ [illegible] بیسویں صدی [illegible]

# انعامی مُعمّہ نمبر ۱ حیدرآباد

# بیس ہزار نقد حاصل کیجئے

پہلا انعام بالکل درست حل پر پندرہ ہزار روپے

چار غلطیوں تک پانچ ہزار روپے

آخری تاریخ: ڈاک سے وصول ہونے والے حلوں کی آخری تاریخ ۲۵ اپریل ۱۹۷۰ء

پتہ: **انعامی مُعمّہ نمبر ۱**

اسپیٹل بلڈنگس عقب لائٹ ہاؤز ٹاکیز گن فونڈری حیدرآباد نمبر ۱ (اے۔ پی)

---

اِس مُعمّہ کے تمام جملے مختلف طبع شدہ اردو کتابوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفوں کے الفاظ جو اُن کتابوں میں درج ہیں اُن کے صحیح حل ہیں۔ آپ انھیں ان کتابوں میں تلاش کیجئے یا اپنی عقل و فراست کو کام میں لاتے ہوئے "ممکن الفاظ" میں سے صحیح حل تلاش کیجئے۔ ایک روپیہ فی حل کے حساب سے آپ جتنے بھی حل چاہیں بلغیر کسی ٹوکن کے روانہ کر سکتے ہیں۔ صحیح حل اخبارات سیاست، رہنمائے دکن، ملاپ اور انگارے (حیدرآباد) میں ۲۶ اپریل ۱۹۷۰ء کو شائع ہوگا۔

---

## اشارے

۱۔ بے موقع بحث و ــــــ کا نہ تھا میں نے جنرل ڈائر کے اقدام کو سراہا۔ (تکرار۔ اعتراض)

۲۔ ناطہ ــــــ مشکل تو ہے لیکن ہے ضروری۔ (توڑنا۔ جوڑنا)

۳۔ دُنیا کی کوئی زبان ایسی نہ ہوگی جس کی صرف و نحو ــــــ نہ لکھی ہو۔ (انگریزوں۔ عربوں)

۴۔ جگر صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ کوئی عورت ــــــ شعر نہیں کہہ سکتی وہ اسے غیر قدرتی سمجھتے ہیں۔ (اچھے۔ برے)

۵۔ یہ میری بہت بڑی ــــــ تھی کہ میں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو راہِ راست پر لاسکوں گا۔ (خوش فہمی۔ غلطی)

۶۔ اگر ایک شخص خود کو دُنیا کی ــــــ ترین ہستی سمجھتا ہے تو وہ ویسا ہی ہو جائے گا۔ (ظالم۔ مظلوم)

۷۔ صدیوں کی خاموشی ــــــ شعلہ نوائی مانگ رہی ہیں۔ (زبانیں۔ فضائیں)

۸۔ بعد تجربے کے مجھ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ اپنا اپنا وضع اور بولی اور لباس و ــــــ ہر کسی کو پسند ہے۔ (خوراک۔ عادت)

۹۔ سپاہی ــــــ میں داخل ہو [illegible] اور کسی [illegible] کئے بغیر فائرنگ شروع کر دی۔ (باغ۔ میدان)

۱۰۔ میں اللہ رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ مجھ کو [illegible] میں ــــــ کے سامنے مجھے ذلیل نہ کرے۔ (نیکوں۔ اپنوں)

۱۱۔ منٹو صاحب میں ــــــ خوبیوں کی ایک خوبی [illegible] کوشش کرے وہ کسی کو بولنے نہیں دیں گے۔ (کمی۔ سو)

۱۲۔ مگر فقط زبان انگریزی کا سیکھنا اتنا ــــــ نہ ہوگا۔ (مفید۔ مضر)

۱۳۔ انسان حیوانات کے مقابلہ نہایت باشعور ہستی [illegible] پیش نگاہ اس کا ــــــ و مستقبل ہے۔ (ماضی۔ حال)

۱۴۔ ہم میں ــــــ خوف کی شدت ہی پیدا کرتی ہے۔ (شجاعت۔ صداقت)

۱۵۔ موت کو اپنا ــــــ متصور نہ کیجئے۔ (دوست۔ دشمن)

۱۶۔ ہم میں جب کبھی کوئی ــــــ ابھرتا ہے تو ہم ایک بے چینی محسوس کرتے ہیں۔ (جذبہ۔ احساس)

۱۷۔ خوابوں کا مطالعہ بے حد دلچسپ ہے اور آپ اس سے بہت کچھ ــــــ سکتے ہیں۔ (سیکھ۔ دیکھ)

۱۸۔ کبھی ہم کو ایک ایسا ــــــ ملتا ہے جو اپنے کام میں منہمک [illegible] طاقت نہیں رکھتا۔ (نوجوان۔ جوان)

| نمبر | | | نمبر | | |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | تکرار | اعتراض | ۱۰ | نیکوں | اپنوں |
| ۲ | توڑنا | جوڑنا | ۱۱ | کمی | سو |
| ۳ | انگریزوں | عربوں | ۱۲ | مفید | مضر |
| ۴ | اچھے | برے | ۱۳ | ماضی | حال |
| ۵ | خوش فہمی | غلطی | ۱۴ | شجاعت | صداقت |
| ۶ | ظالم | مظلوم | ۱۵ | دوست | دشمن |
| ۷ | زبانیں | فضائیں | ۱۶ | جذبہ | احساس |
| ۸ | خوراک | عادت | ۱۷ | سیکھ | دیکھ |
| ۹ | باغ | میدان | ۱۸ | نوجوان | جوان |

**کوپن** میں انعامی معمہ نمبر ۱ حیدرآباد کے تمام شرائط سے متفق ہوں اور [illegible] آخری تسلیم کرتا ہوں۔ فی حل ایک روپیہ شرکت فیس داخلہ نقد [illegible] آرڈر روانہ کی گئی ہے اور رسید منسلک ہے جس کا نمبر ــــــ

مکمل نام ــــــ

مکمل پتہ ــــــ

ــــــ

پوسٹ ــــــ ڈسٹرکٹ ــــــ

شرکت کنندہ کے دستخط ــــــ

34th YEARS OF PUBLICATION

Telephones Office, 271637 Residence,

ری وغیرہ چودہ
حالات سے آگاہ کیا ۔

اردو کنونشن میں شریک ہونے والے مہمان
کشمیر کی گل پوشی کرتے ہوئے

جگر مرادآبادی

فوٹو: ایس سی رلسنے ہوشیارپور

اُردو کے عظیم افسانہ نگار جنابِ کرشن چندر نے بمبئی میں مراٹھی، گجراتی، بنگالی، تلگو، پنجابی اور سندھی وغیرہ چودہ زبانوں کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے سامنے اُردو کا مقدمہ رکھا اور انھیں صحیح صورتِ حالات سے آگاہ کیا۔

اُردو کی نامور افسانہ نگار خاتون محترمہ سلمیٰ صدیقی، بمبئی اُردو کنونشن میں شریک ہونے والے مہمانِ خصوصی جنابِ جی۔ ایم۔ صادق چیف منسٹر جموں اینڈ کشمیر کی گل پوشی کرتے ہوئے۔

ختہ دِنوں دِلّی کے شاعروں اور ادیبوں کی طرف سے اُردو کے نامور شاعر جناب گوپال متّل کو اُن کے تازہ شعری مجموعے "صحرا میں اذان" کی اِشاعت پر
مبارباد پیش کرنے کے لئے ایک عظیم الشان ادبی اجتماع ہوا جس کی صدارت ممتاز محقق اور ناقد جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے فرمائی۔

ے میں جناب کوثر چاندپوری نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا: "جناب گوپال متّل کی شخصیت کی مانند ہی اُن کی شاعری بھی پُرکشش اور دِل میں گھر کر لینے والی ہے"

جناب بسمل سعیدی نے ایک تہنیتی رباعی ارشاد فرمائی ؎

ہمت ہی سے کام لے رہے ہیں متل　　خشکی میں سفینہ کھے رہے ہیں متل
اس دور میں، یہ شعر سنا کر، بسمل　　صحرا میں اذان دے رہے ہیں متل

جناب رشید حسن خاں نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ: "جہاں ایک طرف گوپال متل صاحب کی شاعری کلاسیکی رکھ رکھاؤ کی حامل ہے وہاں دوسری طرف جدید مسئلات کی صحیح عکاسی بھی ان کے کلام میں ملتی ہے۔"

تقریری پروگرام کے اختتام پر جنابِ گوپال متّل غزل سرا ہیں سہ

مَصرف کے بغیر جل رہا ہوں　　میں سُونے مکان کا دِیا ہوں

منزل ہے نہ کوئی جادہ پھر بھی　　آشوبِ سفر میں مُبتلا ہوں

محمل بھی نہیں کوئی نظر میں　　صحرا کی بھی خاک چھانتا ہوں

منصُور، نہ دعویِ انا الحق　　سُولی پہ مگر لٹک رہا ہوں

اے اہلِ کرم نہیں میں سائل　　رستے پہ یونہی کھڑا ہُوا ہوں

اب شکوۂ سنگ و خِشت کیسا　　جب تیری گلی میں آگیا ہوں

اِس شہر میں وضعِ کج کُلاہی　　میں واقعی درخورِ سزا ہوں

مُشکل نہیں ترکِ عشق، لیکن
اِس کا بھی مآل جانتا ہوں

آئندہ پرچہ افسانہ نمبر ہوگا جس کی قیمت دو روپے فی پرچہ ہوگی

بیسویں صدی دہلی

مدیر خوشتر گرامی

جون ۱۹۷۰ء

ٹیلیفون دفتر ــــ ۲۷۱۶۳۴

ٹیلیفون رہائش ــــ ۶۱۹۹۳۷

# تیر و نشتر

"حکومت یو۔پی بدعنوانیوں کو ختم کرنے کا تہیّہ کر چکی ہے" ایک عنوان ـــــ اسی مقصد سے وزیروں کی فوج بھرتی کی گئی ہے۔

"وزیر کو رشوت پیش کرنے پر سزا" ایک خبر ـــــ میاں بڑہ راست دی ہوگی۔

"دلّی میں بھی اسکینڈل۔ لاکھوں کا گول مال" ـــــ یہ تو وہ ہے جو پکڑا گیا۔

"شاہراہوں کی تعمیر میں تاخیر کا ترقیات پر اثر پڑے گا" ایک عنوان ـــــ ترقّی سے کہیں زیادہ ٹھیکیداروں کے بنک بیلنس پر ـــــ اور اس سے بھی زیادہ وزیروں اور اُن کے بھائی بھتیجوں کو ملنے والے گپت دان پر پڑے گا۔

"جن سنگھی نیتا بادل سے ناخوش" ایک خبر ـــــ برس کر اُن کے گھروں کو سیراب نہیں کرتا۔

"یو۔پی میں آگ سے تباہی" ایک خبر ـــــ اس سے کہیں زیادہ اور مسلسل تباہی وزیروں کی فوج مچائے گی۔

"غریبوں کی ضروریات پر زیادہ توجّہ دی جائے" دلّی ایڈمنسٹریشن کی ہدایات ـــــ اچھّا تو یہ جا بجا فوّارے لگانے، باغ بنانے پر لاکھوں خرچ کرنا غریبوں کی ضروریات میں سے ہے۔

"سفید ہاتھی" ایک عنوان ـــــ جنھیں چرن سنگھ (یو۔پی) بنسی لال (ہریانہ) پرکاش سنگھ بادل (پنجاب) نے اپنی کابینہ میں رکھ لیا ہے۔

"کانگریسی کرسیاں خالی کر دیں" اٹل بہاری باجپائی ـــــ کیونکہ اعلیٰ حضرت جہاں پناہ ظلِ ہمایوں تشریف لاتے ہیں۔

پنجاب وزارت میں توسیع

---

"کانگرس کے دونوں گروپوں میں اتحاد ناممکن" تارکیشوری سنہا کا انکشاف ــــــ آپ سلامت ہیں تو دونوں گروپ کیا پورے ملک میں اتحاد ناممکن ہے۔

---

"کانگرس کے دونوں دھڑے اقتدار کے بھوکے ہیں" اٹل بہاری اجپائی ــــــ بجا فرمایا، آپ تو اقتدار کو ٹھکراتے پھرتے ہیں۔

---

"پاکستان کے آئندہ انتخابات۔ لیڈروں کی بھانت بھانت کی بولیاں" ــــــ خوش ہونا چاہیے کہ پاکستان پر ہندوستان کا سایہ پڑ گیا اور وہ بھی ہندوستان کے رنگ میں رنگ گئے۔

---

"میں نے اندرا کے خلاف کچھ نہیں کہا" سنت فتح سنگھ کا بیان ــــــ اور اگر کہا تو اپنے ہوم لینڈ میں کہا۔ وہاں بھی اگر کچھ کہنے کا حق نہیں تو پھر خاک ایسی زندگی پر۔

---

"جاپان میں ایک دن میں بیس ہزار شادیاں" ایک خبر ــــــ لڑکیوں کا ہول سیل بکنگ۔

---

"بچّوں کو سکولوں میں داخل کرانا ضروری" ایک عنوان ــــــ تاکہ ان میں جاہل لیڈر پیدا نہ ہوں۔

---

"بیروزگاری کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے گا" وزیرِ تعلیم کا بیان ــــــ یعنی یہ کہ

۱۔ اس کے کیا کیا فوائد ہیں۔
۲۔ اسے کس طرح سے فروغ دیا جائے۔
۳۔ ملک کے گوشے گوشے میں کیونکر پھیلایا جائے۔
۴۔ بیروزگاری کو تیزی سے پھیلانے والوں کو کیا ایوارڈ دیا جائے۔
۵۔ جو برسرِ روزگار ہیں انھیں بیروزگاروں کی صف میں کیسے شامل کیا جائے۔

---

• "مرکزی وزیر ستیہ نرائن سنہا بھی پیٹ میں۔ مکتہ کسٹم نے جرمانہ کیا" ایک خبر ——— یہ بھی بتایا ہوتا لپ اسٹک لائے تھے۔

---

• "اردو کا مقدمہ" شری جمنا داس اختر ——— جو گولڈ اسٹو نیج میں جمع ہے۔

---

• "پنجاب میں اکالی سیاست" ایک عنوان ——— مردانہ اکالی سیاست کا ذکر ہے یا زنانہ اکالی سیاست کا ——— اب تو دہاں زنانہ اکالی دل بھی بن گیا ہے۔

---

• "پسماندہ طبقوں کو سہولیات دی جائیں گی" چودھری بنسی لال کا اعلان ——— اعلان نہیں، بنسی لال کے جانے کہتے۔ اس نئے گرفی الحال تو چودھری صاحب ممبرانِ اسمبلی کی پسماندگی دور کرنے اور انہیں وزیر بنانے میں مصروف ہیں۔

---

• "بے خیائی کا مظاہرہ" ایک عنوان ——— کہ کانگریس سے نکال دیئے گئے، پھر بھی اپنے آپ کو کانگریسی کہتے ہیں۔

---

• "جموں و کشمیر میں بکری ٹیکس ختم کر دیا جائے" تاجروں کا مطالبہ ——— اور اس کی بجائے گدھوں پر ٹیکس عاید کر دیا جائے۔

---

• "جن سنگھ تاریخ سازی کرے گا" جن سنگھ کے صدر کا اعلان ——— اپنے آقا ولی نعمت انگریز بہادر کی طرح۔

---

• "مُردوں کے نام پر بھی گول مال" ایک عنوان ——— مُردوں کے نام پر کیا، خدا کے نام پر بھی کرتے ہیں۔ یہ بھگوان کو بھی نہیں بخشتے۔

---

• "جنوبی دلی میں گندے پانی کے اثرات" ایک خبر ——— ہیضہ، یرقان اور ملیریا کے لئے سہولتیں۔

---

گجرات کی گورنمنٹ ڈانوا ڈول
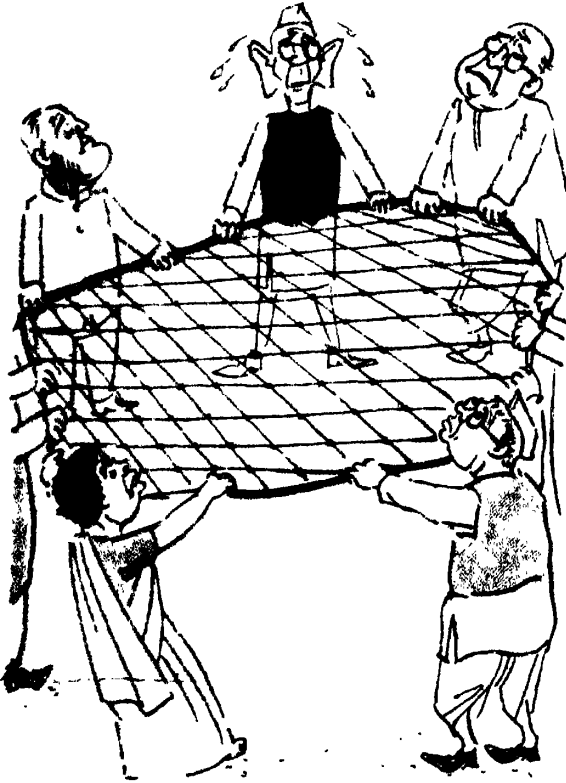
”یو۔پی میں وزیروں کی ایک پوری پلٹن قائم ہوگئی“ ایک عنوان۔

---

”پرکاش سنگھ بادل کے ڈپٹی کا ایک ... ایک خبر ــــــ کیا بارش کا اندیشہ تھا۔

”روہتک میں نیا ریسٹ ہاؤس بنے گا“ ایک خبر ــــــ تاکہ وزیروں اور ان کے لگے بندوں کو ٹھہرنے میں دشواری نہ ہو۔

”گیانی ذیل سنگھ کا استعفے سے انکار“ ایک خبر ــــــ اس لئے کہ صدارت انھیں ورثہ میں ملی ہے۔

”اسقاط کے قوانین“ ایک عنوان ــــــ فوراً ساقط کئے جائیں۔

”بھارتی بھاشاؤں کو اپناؤ“ ساہتیہ پریشد ہریانہ کا اعلان ــــــ مگر سوائے اردو کے۔ اردو پاکستان کی زبان ہے۔

”جمہوریت کی شان“ ایک عنوان ــــــ کہ حاکم وقت اندرا گاندھی کے خلاف گز گز بھر کی زبان نکلی ہوتی ہے۔

”یہ پاکستان ہے۔ امیروں کے لئے الگ قبرستان“ ــــــ اچھا ہوا۔ ایک جگہ قبریں ہوتیں تو غریبوں کو امیروں کے گناہوں کا بوجھ اٹھانا پڑتا۔

”روزِین ماہ بنسی لال وزارت کا تختہ الٹنے کی کوشش نہیں کروں گا“ راؤ بیریندر سنگھ ــــــ اس کے بعد انگور میٹھے [illegible] امکان ہے۔

”جن سنگھ نے سنت فتح سنگھ [illegible] مقرر کر دی“ ایک خبر ــــــ وزارت [illegible] ٹھیک کی رپورٹ دے دے گی۔

"مہنگائی سر پہ ہے" ایک عنوان ـــــ بیکاری اور وقت گزاری کا مشغلہ۔

"پنجاب جن سنگھ اور اکالی دل میں ایک بار پھر ٹھن گئی"

ایک خبر ـــــ

اس کے بعد آنے والی خبر ـــــ

"پنجاب میں جن سنگھ نے پھر اکالیوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے"

"گیہوں کی نقل و حمل سے متعلق حکم واپس" ایک خبر ـــــ نقل کی تعلی چھپتی ہوگی اور حمل ساقط کر دیا جائے گا۔

"بھارتیہ کرانتی دل کانگریس میں مدغم نہیں ہوگا" پرکاش ویر شاستری ـــــ یعنی مرغ بانگ نہ دے گا تو صبح نہ ہوگی۔

"اردو کے مسئلے کو آگے بڑھانے کے لئے دانشوروں کا اجتماع" ایک خبر ـــــ اجتماع کا نتیجہ ؎

نشستند و گفتند و برخاستند

"ہندوستان کے جسم کا ناسور" ایک عنوان ـــــ ایک نہیں تین۔ پہلے جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی تھی۔ اب سنڈیکیٹ بھی شامل ہو گئی۔

"بھارتیہ کرن کا مطلب تبدیلی مذہب نہیں" ایک عنوان ـــــ تو اور کیا صرف دھوتی باندھنا اور چوٹی رکھنا ہے۔

"لندن کی آبادی کم ہو رہی ہے" ایک خبر ـــــ دلی نواسی اس مصیبت کو دور کرنے کو تیار ہیں۔

"لوک سبھا میں ایک گھنٹے تک شور و غل" ایک خبر ـــــ لوک سبھا پر ایک گھنٹے کا خرچ معلوم ہو تو شور و غل کی قیمت نکل آئے۔

---

سنڈیکیٹ، جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی سے مل کر حکمران کانگریس کا مقابلہ کریں گے۔

## بلراج مدھوک

## خوشترگرامی

قدِ قیامت، چہرہ رُوسیاہیوں کا حامل، پیشانی کلنک کا ٹیکہ، آنکھیں شرم و حیا سے عاری، مہر و محبت سے خالی۔ ذلّت کا غم نہ رُسوائی کا افسوس۔ اِن کے لئے عزّت وہ خزانہ ہے جو خالی نہیں ہوتا
——— اِن خوبیوں کے مالک ہیں ———

شری بلراج مدھوک
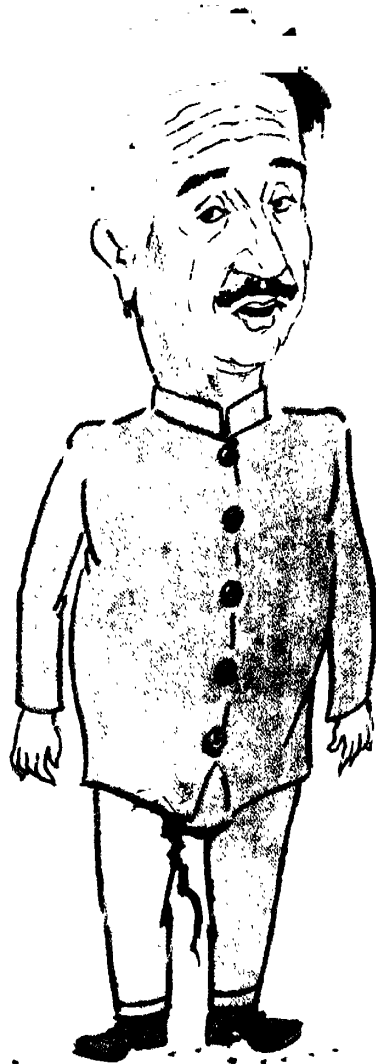
اسکردو ارضِ کشمیر کی یہ بدنصیبی ہے کہ آپ نے وہاں جنم لیا اور جب مادرِ مجبوری پر وقت پڑا تو اُس کے دُشمن نمبر ایک ثابت ہوئے۔ ہند اور کشمیر کے تعلقات کو بگاڑنے میں تاریخ کے مجرموں میں سرِ فہرست ہیں اور وہاں سے ایسے دُم دبا کر بھاگے کہ جب تک شیخ عبداللہ برسرِ اقتدار رہے اُدھر کا رُخ نہ کیا ——— نام سے ہندو، پیدائش کے اعتبار سے ہندوستانی۔ ہندو سبھیتا اور ہندو سنسکرتی کے ”ٹھیکیدار“ بھارتیہ کرن کے ”علمبردار“ مگر عمل سے نہ ہندو نہ ہندوستانی۔ سبھیتا کے چہرے کا داغ، سنسکرتی کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکا ——— ہندو کے لئے زہرِ قاتل مُسلمان کے لئے خوفِ باطل۔ نفرت و حقارت کی سیاست میں پل کر جوان ہوئے ہیں۔ آر۔ایس۔ایس کے کاشتہ، جن سنگھ کے پرداختہ۔ قومی یکجہتی کی جڑیں کاٹنے میں بغض و عناد کی ہوا میں سانس لیتے ہیں۔ تنگ دِل فطرت سے کوتاہ بین خصلت۔ قتل و غارتگری اور خونِ ناحق پر قہقہے لگاتے ہیں۔ ہندو اکثریت کے مُلک میں ”ہندو دھرم خطرے میں ہے“ کے نعرے لگاتے ہیں۔ ہندو کے دُشمن، مُسلمان کے دُشمن، سِکھ کے دُشمن، عیسائی کے دُشمن، مُلک و قوم کے دُشمن۔ حد تو یہ ہے کہ خود اپنی ذات کے بھی دُشمن ہیں ——— اِس پر یہ کہ لیڈرِ قوم ہیں۔ ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا۔ اب تو جن سنگھ میں بھی دال نہیں گلتی۔ زبردستی اُس کے گلے کا ہار ہیں۔ ایک دن طوقِ لعنت اُس سے بھی جُدا ہو جائے گا ——— امریکہ کا دلدادہ، اسرائیل کا شیدائی۔ اُن کے غم میں گھُلتا ہے۔ اُن کے نام کی مالا جپتا ہے۔ المختصر بقولِ غالب ؏

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے

# مشورہ

کرشن چندر ایم۔ اے

ڈویژن ایر فلو ریسینٹ فرانسس ہیونیو، سانتا کروز ویسٹ بمبئی نمبر ۵۴

خوشتر بھائی!

ایک اور افسانچہ "مشورہ" بھیج رہا ہوں ——— ڈاکٹروں نے فکر انگیز افسانے اور ناول نہ لکھنے کے لیے مشورہ ہی نہیں دیا ہے، منع کیا ہے۔ ہاں ہلکے پھلکے افسانچے اور خاکے لکھنے کی اجازت ہے۔ آپ کی محبت اور خلوص مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں اس حالت میں بھی جو بھی لکھوں، آپ ہی کی نذر کروں ——— میری صحت پہلے سے بہتر ہے۔ آپ کی علالت میرے لئے باعثِ تشویش ہے۔ اپنی صحت کا خیال رکھئے! یہ مشورہ نہیں، محبت بھرے دل کی آواز ہے!

آپ کا ——— کرشن چندر

میاں شرفو کے نام سے مشہور ہیں۔ ہمارے محلّے میں نہیں رہتے۔ لیکن بس کی جانب دو محلّے چھوڑ کر احاطے والی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ بزرگ صورت، سفید داڑھی، کچھ کام نہیں کرتے۔ ماں باپ بہت سارا روپیہ اور جائیداد چھوڑ کر مر گئے۔ آرام اور اطمینان ہے۔ لیکن کسی قدر کنجوسی سے کام لے کر رہتے ہیں۔ موٹر رکھ سکتے ہیں۔ لیکن صرف سائیکل پر اکتفا کرتے ہیں اور سائیکل بھی بے حد پرانی ہو چکی ہے۔ لیکن اسے بدلنے کو تیار نہیں۔ شادی کی ہے۔ لیکن کوئی بال بچہ نہیں ہے۔ صبح سائیکل لے کر گھومنے چلے جاتے ہیں اور اپنے احباب کے گھروں کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، شام کی چائے اپنے کسی دوست کے اصرار پر اس کے ہاں کھا لیتے ہیں۔ صرف رات کا کھانا گھر آ کر کھاتے ہیں۔ اس کے لیے بھی انہیں زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑتی۔ اکثر شام کے کھانے کا سامان دوست احباب کے ہاں سے منگا لیتے ہیں یا خود شام کو گھر آتے ہوئے لیتے آتے ہیں۔ صبح سے شام تک سارے شہر میں گھومتے رہتے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن کے کئی چکر لگا آتے ہیں۔ ریل گاڑیاں دیکھنا یا بسوں کے اڈے سے سواریوں کو اترتے چڑھتے دیکھنا ان کا خاص شغل ہے۔ ویسے تاش، چوسر، گنجفہ، شطرنج اور حقّے سے بھی دل بہلا لیتے ہیں۔ ہمیشہ عمدہ قسم کی بیڑی پیتے ہیں۔ سگریٹوں سے سخت نفرت ہے۔ اتنی دولت ہے اور گھر میں کوئی بال بچہ نہیں، پھر بھی کسی کو قرض نہیں دیتے۔ صرف مشورہ دیتے ہیں۔

شہر میں ایسا کوئی نہ ہوگا جو میاں شرفو کو نہ جانتا ہو یا جس نے ان کے مشورے سے فیض نہ پایا ہو۔ کیونکہ یہ صرف مشورہ ہی نہیں دیتے، اس پر عمل بھی کراتے ہیں۔ خدا نے وقت وافر دے رکھا ہے۔ کام کوئی نہیں۔ اس لیے انھوں نے مشورہ دینا بطور پیشہ اختیار کیا ہے اور اگر سچ پوچھئے تو وہ اس کے اہل بھی ہیں۔ جو آدمی صبح سے شام تک شہر کے بیس چکر لگاتا ہو، ریلوے اسٹیشن، بازار اور بسوں کے اڈے سے گہری واقفیت رکھتا ہو، اس پر پینتالیس برس کا تجربہ رکھتا ہو۔ وہ اگر مشورہ نہ دے گا تو کیا ہم آپ دیں گے۔ جنھوں نے ابھی ابھی کلرکی اختیار کی ہے۔

میاں شرفو مجھ پر خاص طور پر مہربان ہیں۔ ایک تو میری صورت ایسی ہے جسے دیکھتے ہی ہر شخص کو مجھ پر ترس آنے لگتا ہے اور وہ ازراہ خدا ترسی مجھے مشورہ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دوسرے مجھ میں قوتِ فیصلہ کا فقدان ہے۔ میں کسی بات کا فیصلہ خود نہیں کر سکتا۔ اس لیے اکثر و بیشتر

میاں شرفو ہی میری رہبری کرتے رہتے ہیں۔ پھر میاں شرفو سے جو مشورہ پتا ہے وہ دوسرے احباب دیتے رہتے ہیں اور اس طرح اپنی زندگی گزرتی جاتی ہے۔ اس طرح کہ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ مشورہ رکھتے تھے!

گزشتہ سال کی بات ہے۔ دو تین دن سے زکام میں مبتلا تھا۔ پہلے تو ٹالتا رہا۔ پھر زکام کو اسپرو، اناسین وغیرہ سے بہلاتا رہا۔ پھر ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ اس نے چند گولیاں دیں اور ایک بوتل میں پینے کی دوا تین روز کے لئے۔

میں دوا لے کر گھر آ رہا تھا کہ راستے میں میاں شرفو اپنی سائیکل چلاتے مل گئے۔ مجھے دیکھ کر بکمالِ مہربانی اپنی سائیکل سے اتر گئے۔ اور میری سرخ ناک کو دیکھ کر بولے۔

"نزلہ بگڑ گیا ہے!"

میں نے بگڑ کر کہا: "اور کیسا بگڑا ہے۔ کسی دوا سے ٹھیک ہی نہیں ہوتا!"

میاں شرفو مسکرا کر بولے: "ڈاکٹر کی دوا ہو گی!"

میں نے کہا: "جی ہاں! الحاج ڈاکٹر خیر الدین ایم بی بی ایس کا علاج کر رہا ہوں۔"

میاں شرفو نے اپنی کھچڑی داڑھی پر جو چگّی اور بکرے کی سی تھی ہاتھ پھیرا، بولے: "اماں تمھیں نزلہ وزلہ کچھ نہیں ہے۔ تمھاری طبیعت میں خشک گرمی کا فتور ہے۔ یہ نزلہ ڈاکٹر کی گرم گولیوں سے نہ جائے گا۔ اس کے لئے ——"

اتنا کہہ کر وہ رک گئے اور کچھ سوچنے لگے۔

میں نے پوچھا: "تو اس کے لئے کیا کیا جائے؟"

بولے: "تمھارے گھر چلتا ہوں۔ پیاس لگ رہی ہے۔ ایک گلاس شربت کا پی لوں تو بتاتا ہوں۔"

میں چند دنوں سے اپنے چنگی کے محکمے میں واقعی کچھ چڑچڑے پن اور گرم مزاجی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس لئے دل ہی دل میں میاں شرفو کے تجزیے کا قائل ہو گیا۔

میرے گھر پہنچ کر میاں شرفو نے بجلی کا پنکھا کھولا۔ رخ اپنی طرف کیا۔ پھر ایک گلاس شربت روح افزا کا پیا۔ پھر داڑھی پر ہاتھ پھیر کے بولے۔

"میاں! تمھیں گرمی کا نزلہ ہے اور یہ نزلہ گرم دوا کھانے سے اور بھی بگڑ جاتا ہے۔"

"یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔" میری بیوی بولی۔

"تم بیٹی ایسا کرو کہ بازار سے برف منگاؤ اور دو سیر دہی۔ اسے برف میں خوب ٹھنڈا کر کے اس کی لسی بناؤ۔ لیکن لسی میں زینہار شکر مت ڈالنا! شکر گرم ہوتی ہے۔ ذرا سا نمک ڈال دو۔ یہ سندری نمک نہیں چلے گا۔ لاہوری نمک چاہئے۔ میرے گھر پر تھا۔ مگر ختم ہو گیا ہے۔ تم ڈھیرو مل پنساری کے ہاں سے دو ڈلے نمک، لاہوری نمک کے منگا کے رکھ لو اور انھیں پیس کر لسی میں ڈال کر اور اوپر سے برف کی ڈلیاں گھول کر پلاتی جاؤ۔ اس کے سر پر بھی برف رکھو اور سینے پر بھی۔ شام تک خدا نے چاہا تو نزلہ کافور ہو جائے گا! مجھے دو روپے دو! میں ابھی بازار سے سب کچھ لے کے آتا ہوں۔"

میاں شرفو میں کمال کا گن ہے کہ جو مشورہ دیتے ہیں فوراً اس پہ عمل درآمد شروع کرا دیتے ہیں۔ بے چارے خود بازار گئے۔ لاہوری نمک، دہی، زیرہ اور برف کی سلی اٹھوا لائے۔ شام تک میرے سینے پر برف رکھتے رہے اور سر پر بھی۔ میری بیوی مجھے دن بھر ٹھنڈی یخ لسی پلاتی رہی۔ شام تک نزلہ دور ہو گیا۔ میاں شرفو خوش خوش اپنے گھر لوٹے اور جاتے ہوئے میری بیوی سے چند شلغم لے گئے۔ کیونکہ انھیں شلغم گوشت کا سالن بہت پسند ہے۔

ان کے جانے کے بعد رات میں میرے سینے میں گھر گھر کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ناک سے نزلہ اب بہتا نہ تھا۔ لیکن سینے میں جب کھانسا تو سا شروع ہو گیا تھا اور تنفس میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ بیوی نے ڈاکٹر کو جلدی سے بلایا۔ معلوم ہوا کہ نزلہ تو دور ہو چکا ہے۔ لیکن نمونیا شروع ہو چکا ہے۔

چنگی میں محرر ہوں۔ اس لئے آمدنی معقول ہے۔ تنخواہ ایک سو ستر روپے ہے۔ مگر آموں کے دو باغ ہیں جن کا میں مالک ہوں۔ اچھا مکان بھی ہے۔ چالیس بیگھے زمین بھی خرید لی ہے۔ یہ سب چنگی میں محرر ہونے کے فائدے ہیں۔ اگر کسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہوتا تو اس وقت تک دس ہزار سے زیادہ قرضہ اپنے سر پر چڑھا چکا ہوتا اور اگر کہیں ایم اے پی ایچ ڈی بھی ہوتا تو ریڈیو گرام، ریفریجریٹر، موٹر اور ایئر کنڈیشنر کی قسطیں ادا کرتے کرتے بوڑھا ہو جاتا!

پچھلے سال آموں کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ میرے دونوں باغ سات ہزار پر اٹھے تھے۔ یہ تو سب لوگ جانتے ہیں کہ آم کے باغ میں ایک سال

کم فصل ہوتی ہے دوسرے سال زیادہ ہوتی ہے تیسرے سال کم ہوتی ہے۔ چوتھے سال زیادہ ہوتی ہے اور اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اِس سال کم فصل کی باری تھی اور میں دونوں باغات کو تین تین ہزار پر اُٹھانے کی سوچ رہا تھا کہ اتنے میں میاں شرفو آگئے۔ اُن سے مشورہ طلب کیا تو ایکدم بھڑک کر بولے "لاحول ولاقوۃ! تم بھی کیا گئے گزرے زمانے کی توہمات کا ذکر کرتے ہو۔ میاں آج کل سائنس کا زمانہ ہے۔ سائنس کا! آم کی فصل کسی سال کم نہیں ہوتی۔ ہوتا یہ ہے کہ آب و ہوا کا چکر ایسا ہے کہ ایک سال باد و باراں کی زیادتی ہوتی ہے۔ آندھی اور طوفان سے کیری گر جاتی ہے۔ آم کی فصل تباہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے سال آندھی اور طوفان کم آتے ہیں۔ اِس لئے آم کی فصل بچ جاتی ہے۔ اگر تم اپنے دونوں باغات کے گرد اونچی باڑھ لگوا دو تو پیڑ طوفان کے تھپیڑوں سے بچ جائیں گے اور تم زیادہ دام پر اپنے باغ اُٹھا سکو گے۔

مشورہ نہایت معقول تھا۔ میں نے دونوں باغات کے گرد بانس کی ایک اونچی باڑھ لگوا دی۔ ایک معقول رقم خرچ ہو گئی مگر معقول مشوروں میں ہمیشہ معقول رقم خرچ ہوتی ہے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ اِس سال وہ آندھی آئی، وہ آندھی آئی کہ باڑھ تک کو اُکھاڑ کے لے گئی اور دونوں باغ سات سو روپے میں اُٹھے۔ حالانکہ اُس وقت جب میاں شرفو نے مشورہ دیا تھا، تین تین ہزار پر جا رہے تھے۔

میاں شرفو مجھے ڈانٹ کے بولے "تین ہزار کے لئے روتے ہو۔ یہ نہیں سوچتے ہو کہ اگر تم نے میرے مشورے پر عمل نہ کر کے باڑھ نہ لگوائی ہوتی تو اِس آندھی میں تمہارے کتنے آم کے پیڑ گر چکے ہوتے۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ آندھی کا سارا زور باڑھ پر ٹوٹ گیا اور باغ بچ گئے ——— بہرے پوچھو۔"

ہمارا شہر ایک قصبہ تھا جو بگڑتے بگڑتے شہر بن گیا۔ اِسی لئے اُس شہر میں پُرانی کوٹھیاں تھیں، جن میں پُرانے بُڈھے کو چوان رئیسوں کی گھوڑا گاڑیاں آ کے باندھتے تھے۔ پُرانی حویلیاں تھیں جیسی ایک ہماری تھی۔ نئے مزاج والوں کے لئے فلیٹ بن رہے تھے۔ سڑکوں پر موٹریں بھی دَوڑنے لگی تھیں۔ ابھی یہ قصبہ اچھی طرح شہر میں تبدیل نہ ہوا تھا۔ اِس لئے وقت وافر تھا۔ بے کاری کم تھی۔ شرافت زیادہ تھی۔ اِس لئے مشورے لئے دیئے اور قبول کئے جاتے تھے۔ بڑے شہروں میں کوئی کسی کو مشورہ نہیں دیتا مشورہ دینے اور [illegible] کے لئے کسی کے پاس وقت بھی کہاں ہے۔

میں نبتن، منگن اور چھگن رمی کھیل رہے تھے۔ اتوار کا دن تھا۔ بیچ بیچ میں پان کی گلوریاں آ جاتیں۔ پھر اِس بیچ میں میاں شرفو آگئے اور بلند آواز میں رمی کھیلنے والوں کو مشورہ دینے لگے۔ چھگن عام طور پر رمی میں کمزور پڑتا تھا۔ اِس لئے میاں شرفو زیادہ تر اُس پر برستے تھے۔ منگن مرے سے بے کار تھا۔ میاں شرفو نے اُسے صلاح دی کہ "برسات سر پر آرہی ہے۔ پھر سردی آجائے گی۔ بہترین وقت ہے یہ! میرا مشورہ مانو تو کوئلے اور لکڑی کا ایک ٹال کھول دو۔ وارے کے نیارے ہو جائیں گے اور تم نے چھگن پھر ایک قیمتی پتہ نیچے گرا دیا۔ ذرا اور انتظار کر لیتے تو نبتن کا غلام تمہارے قدموں میں حاضر ہوتا" منگن بولا "آج کل گیس کا زمانہ ہے لکڑی کوئلے کو کون پوچھتا ہے۔ سوچتا ہوں گیس کی ایک ایجنسی لے لوں۔"

"ایسی حماقت مت کرنا" شرفو میاں برافروختہ ہو کے بولے۔ "گیس کے سلنڈر اکثر پھٹ جاتے ہیں۔ پرسوں دسوئی صاحب کے محلے میں ایک عورت گیس کے سلنڈر پھٹنے سے مر گئی۔ پچھلے ماہ پنڈت دلیپ راج کی دھرم پتنی اِسی گیس کا شکار ہو گئی!

سلنڈر میں کہیں کوئی پیچ ڈھیلا تھا۔ گیس اُس میں سے نکل نکل کے کچن میں بھر گئی۔ جونہی پنڈت جی کی بیوی نے گیس کے چولہے کو ماچس دکھائی بھک سے سارا کچن اُڑ گیا۔ بیوی کے پُرزے پُرزے ہو گئے۔ اِمیاں پُرانے فیشن کی سگڑی ہی بہتر ہے اور یہ گوبھی کے چار پھول یہاں کیسے رکھے ہیں؟"

منگن نے کہا "بیوی نے گوشت گوبھی پکانے کو کہا تھا۔"

"تو ایک پھول کافی ہو گا اور اگر مہمان آنے والے ہوں تو زیادہ سے زیادہ دو پھول! اِس سے زیادہ گوبھی کے پھول گوشت میں ڈالو گے تو بادی ہو جائے گی۔ یہ میرا مشورہ ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" منگن دھیمے سُر میں بولا۔

"تو دو پھول میں لے جاؤں گا" میاں شرفو بولے اور چند لمحے خاموش رہ کر اُنھوں نے گوبھی کے دو بڑے پھول الگ کر لئے اور پھر اُنھوں نے اپنی توجہ نبتن کی طرف کی، جو اب تک اُن کے مشورے سے بچا ہوا تھا۔

"کیوں میاں نبتن!" میاں شرفو فرمانے لگے "تم کو میں نے جس دُکان سے سستی قمیصیں خرید کرنے کا مشورہ دیا تھا، وہاں سے کتنی قمیصیں لے کر آئے؟ تم تو میری ٹیکسی لے کر گئے تھے نا پرسوں؟"

"ہاں میاں!" نبتن کچھ روہانسا ہو کے بولا "مگر وہ دُکان مِلی ہی نہیں۔

میاں شرفو ہی میری رہبری کرتے رہتے ہیں۔ پھر میاں شرفو سے جو مشورہ بچتا ہے وہ دوسرے احباب دیتے رہتے ہیں اور اس طرح اپنی زندگی گزرتی جاتی ہے۔ اس طرح کہ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ مشورہ رکھتے تھے!

گزشتہ سال کی بات ہے۔ دو تین دن سے زکام میں مبتلا تھا۔ پہلے تو ٹالتا رہا۔ پھر زکام کو اسپرو، اناسین وغیرہ سے بہلاتا رہا۔ پھر ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ اس نے چند گولیاں دیں اور ایک بوتل میں پینے کی دوا تین روز کے لئے۔

میں دوا لے کر گھر آ ہی رہا تھا کہ راستے میں میاں شرفو اپنی سائیکل چلاتے مل گئے۔ مجھے دیکھ کر بکمالِ مہربانی اپنی سائیکل سے اُتر گئے۔ اور میری سرخ ناک کو دیکھ کر بولے۔

"نزلہ بگڑ گیا ہے!"

میں نے بگڑ کر کہا: "اور کیسا بگڑا ہے۔ کسی دوا سے ٹھیک ہی نہیں ہوتا!"

میاں شرفو مسکرا کر بولے: "ڈاکٹر کی دوا ہوگی!"

میں نے کہا: "جی ہاں! الحاج ڈاکٹر خیر الدین ایم بی بی ایس کا علاج کر رہا ہوں۔"

میاں شرفو نے اپنی کھچڑی داڑھی پر جو چُگّی اور بکرے کی سی تھی ہاتھ پھیرا اور بولے: "اماں تمھیں نزلہ وزلہ کچھ نہیں ہے۔ تمھاری طبیعت میں خشک گرمی کا فتور ہے۔ یہ نزلہ ڈاکٹر کی گرم گولیوں سے نہ جائے گا۔ اِس کے لئے ــــــ"

اتنا کہہ کر وہ رُک گئے اور کچھ سوچنے لگے۔

میں نے پوچھا: "تو اِس کے لئے کیا کیا جائے؟"

بولے: "تمھارے گھر چلتا ہوں۔ پیاس لگ رہی ہے۔ ایک گلاس شربت کا پی لوں تو بتاتا ہوں۔"

میں چند دنوں سے اپنے چُنگی کے محکمے میں واقعی کچھ چڑچڑے پن اور گرم مزاجی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اِس لئے دل ہی دل میں میاں شرفو کے تجزیے کا قائل ہو گیا۔

میرے گھر پہنچ کر میاں شرفو نے بجلی کا پنکھا کھولا۔ رُخ اپنی طرف کیا۔ پھر ایک گلاس شربت رُوح افزا کا پیا۔ پھر داڑھی پر ہاتھ پھیر کے بولے۔ "میاں! تمھیں گرمی کا نزلہ ہے اور یہ نزلہ گرم دوا کھانے سے اور بھی بگڑ جاتا ہے۔"

"یہی تو میں بھی کہتی ہوں" میری بیوی بولی۔

"تم بیٹی ایسا کرو کہ بازار سے برف منگاؤ اور دو سیر دہی لے کے برف میں خوب ٹھنڈا کر کے اُس کی لسی بناؤ۔ لیکن لسی میں نہ نہار شکر مت ڈالنا! شکر گرم ہوتی ہے۔ ذرا سا نمک ڈال دو۔ یہ سمندری نمک نہیں چلے گا۔ لاہوری نمک چاہئے۔ میرے گھر پر تھا۔ مگر ختم ہو گیا ہے۔ تم ڈھیرو مل پنساری کے ہاں سے دو ڈلے نمک، لاہوری نمک کے منگا کے رکھ لو اور انھیں پیس کر لسی میں ڈال کر اور اوپر سے برف کی ڈلیاں گھول کر پلاتی جاؤ۔ اُس کے سر پر بھی برف رکھو اور سینے پر بھی۔ شام تک خدا نے چاہا تو نزلہ کافور ہو جائے گا! مجھے دو روپے دو! میں ابھی بازار سے سب کچھ لے کے آتا ہوں۔"

میاں شرفو میں کمال کا گُن ہے کہ جو مشورہ دیتے ہیں فوراً اُس پر عمل درآمد شروع کرا دیتے ہیں۔ بے چارے خود بازار گئے۔ لاہوری نمک، دہی، زیرہ اور برف کی سِلی اُٹھوا لائے۔ شام تک میرے سینے پر برف رکھتے رہے اور سر پر بھی۔ میری بیوی مجھے دن بھر ٹھنڈی یخ لسی پلاتی رہی۔ شام تک نزلہ دُور ہو گیا۔ میاں شرفو خوش خوش اپنے گھر لوٹے اور جاتے جاتے میری بیوی سے چند شلغم لے گئے۔ کیونکہ انھیں شلغم گوشت کا سالن بہت پسند ہے۔

اُن کے جانے کے بعد رات میں میرے سینے میں گھر گھر کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ ناک سے نزلہ اب بہتا نہ تھا۔ لیکن سینے میں عجب کھچاؤ سا شروع ہو گیا تھا اور تنفس میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ بیوی نے ڈاکٹر کو جلدی سے بُلایا۔ معلوم ہوا کہ نزلہ تو دُور ہو چکا ہے لیکن نمونیا شروع ہو چکا ہے۔

چُنگی میں محرّر ہوں۔ اِس لئے آمدنی معقول ہے۔ تنخواہ ایک سو ستّرہ روپے ہے۔ مگر آموں کے دو باغ ہیں جن کا میں مالک ہوں۔ اچھا مکان بھی ہے۔ چالیس بیگھے زمین بھی خرید لی ہے۔ یہ سب چُنگی میں محرّر ہونے کے فائدے ہیں۔ اگر کسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہوتا تو اِس وقت تک دس ہزار سے زیادہ قرضہ اپنے سر چڑھا چکا ہوتا اور اگر کوئی ایم اے پی ایچ ڈی بھی ہوتا تو ریڈیو گرام، ریفریجریٹر، موٹر اور ایئر کنڈیشنر کی قسطیں ادا کرتے کرتے بُوڑھا ہو جاتا!

پچھلے سال آموں کی فصل بہت ہوئی تھی۔ میرے دو باغ [illegible] سات ہزار پر اُٹھے تھے۔ یہ تو سب لوگ جانتے ہیں کہ آم کے باغ میں ایک سال

کم فصل ہوتی ہے دوسرے سال زیادہ ہوتی ہے تیسرے سال کم ہوتی ہے۔ چوتھے سال زیادہ ہوتی ہے اور اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس سال کم فصل کی باری تھی اور میں دونوں باغات کو تین تین ہزار پر اُٹھانے کی سوچ رہا تھا کہ اتنے میں میاں شرفو آگئے۔ اُن سے مشورہ طلب کیا تو ایکدم بھڑک کر بولے "لاحول ولا قوۃ! تم بھی کیا گئے گزرے زمانے کی توہمات کا ذکر کرتے ہو۔ میاں آج کل سائنس کا زمانہ ہے۔ سائنس کا! آم کی فصل کسی سال کم نہیں ہوتی۔ ہوتا یہ ہے کہ آب و ہوا کا چکر ایسا ہے کہ ایک سال باد و باراں کی زیادتی ہوتی ہے۔ آندھی اور طوفان سے کیری گر جاتی ہے۔ آم کی فصل تباہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے سال آندھی اور طوفان کم آتے ہیں۔ اس لئے آم کی فصل بچ جاتی ہے۔ اگر تم اپنے دونوں باغات کے گرد اونچی باڑھ لگوا دو تو پیڑ طوفان کے تھپیڑوں سے بچ جائیں گے اور تم زیادہ دام پر اپنے باغ اُٹھا سکو گے۔

مشورہ نہایت معقول تھا۔ میں نے دونوں باغات کے گرد بانس کی ایک اونچی باڑھ لگوا دی۔ ایک معقول رقم خرچ ہو گئی مگر معقول مشوروں میں ہمیشہ معقول رقم خرچ ہوتی ہے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ اس سال وہ آندھی آئی، وہ آندھی آئی! کہ باڑھ تک کو اُکھاڑ کے لے گئی اور دونوں باغ سات سو روپے میں اُٹھے۔ حالانکہ اُس وقت جب میاں شرفو نے مشورہ دیا تھا، تین تین ہزار پر جا رہے تھے۔

میاں شرفو مجھے ڈانٹ کے بولے "تین ہزار کے لئے روتے ہو۔ یہ نہیں سوچتے ہو کہ اگر تم نے میرے مشورے پر عمل نہ کر کے باڑھ نہ لگوائی ہوتی تو اس آندھی میں تمھارے کتنے آم کے پیڑ گر چکے ہوتے۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ آندھی کا سارا زور باڑھ پر ٹوٹ گیا اور باغ بچ گئے ——— بہو سے پوچھو۔"

ہمارا شہر ایک قصبہ تھا جو بگڑتے بگڑتے شہر بن گیا۔ اسی لئے اُس شہر میں پرانی کوٹھیاں تھیں، جن میں پرانے بڈھے کوچوان رئیسوں کی گھوڑا گاڑیاں آکے باندھتے تھے۔ پرانی حویلیاں تھیں، جیسی ایک ہماری تھی۔ نئے مزاج والوں کے لئے فلیٹ بن رہے تھے۔ سڑکوں پر موٹریں بھی دوڑنے لگی تھیں۔ ابھی یہ قصبہ اچھی طرح شہر میں تبدیل نہ ہوا تھا۔ اس لئے وقت وافر تھا۔ بے کاری کم تھی۔ شرافت زیادہ تھی۔ اس لئے مشورے لئے دئے اور قبول کئے جاتے تھے۔ بڑے شہروں میں کوئی کسی کو مشورہ نہیں دیتا مشورہ دینے اور قبول کرنے کے لئے کسی کے پاس وقت بھی کہاں ہے۔

میں، نبن، منن اور چھنگن رمی کھیل رہے تھے۔ اتوار کا دن تھا۔ بیچ بیچ میں پان کی گلوریاں آجاتیں۔ پھر اس بیچ میں میاں شرفو آگئے اور بلند آواز میں رمی کھیلنے والوں کو مشورہ دینے لگے۔ چھنگن عام طور پر رمی میں کمزور پڑتا تھا۔ اس لئے میاں شرفو زیادہ تر اُس پر برستے تھے۔ منن عرصے سے بے کار تھا۔ میاں شرفو نے اُسے صلاح دی کہ "برسات سر پر آرہی ہے۔ پھر سردی آجائے گی۔ بہترین وقت ہے یہ! میرا مشورہ مانو تو کوئلے اور لکڑی کا ایک ٹال کھول دو۔ وارے کے نیارے ہو جائیں گے اور تم نے چھنگن پھر ایک قیمتی پتہ نیچے گرا دیا۔ ذرا اور انتظار کر لیتے تو نبن کا غلام تمھارے قدموں میں حاضر ہوتا۔" منن بولا "آج کل گیس کا زمانہ ہے لکڑی کوئلے کو کون پوچھتا ہے۔ سوچتا ہوں گیس کی ایک ایجنسی لے لوں۔"

"ایسی حماقت مت کرنا۔" شرفو میاں برافروختہ ہو کے بولے۔ "گیس کے سلنڈر اکثر پھٹ جاتے ہیں۔ پرسوں دسنوی صاحب کے محلے میں ایک عورت گیس کے سلنڈر پھٹنے سے مر گئی۔ پچھلے ماہ پنڈت دیس راج کی دھرم پتنی اسی گیس کا شکار ہو گئی!

سلنڈر میں کہیں کوئی پیچ ڈھیلا تھا۔ گیس اُس میں سے نکل نکل کے کچن میں بھرتی گئی۔ جونہی پنڈت جی کی بیوی نے گیس کے چولہے کو ماچس دکھائی بھک سے سارا کچن اُڑ گیا۔ بیوی کے پرزے پرزے ہو گئے۔ میاں پرانے فیشن کی سگڑی ہی بہتر ہے اور یہ گوبھی کے چار پھول یہاں کیسے رکھے ہیں؟"

منن نے کہا "بیوی نے گوشت گوبھی پکانے کو کہا تھا۔"

"تو ایک پھول کافی ہوگا اور اگر مہمان آنے والے ہوں تو زیادہ سے زیادہ دو پھول! اس سے زیادہ گوبھی کے پھول گوشت میں ڈالوگے تو بادی ہو جائے گی۔ یہ میرا مشورہ ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" منن دھیمے سُر میں بولا۔

"تو دو پھول میں لے جاؤں گا۔" میاں شرفو بولے اور چند لمحے خاموش رہ کر انھوں نے گوبھی کے دو بڑے پھول الگ کر لئے اور پھر انھوں نے اپنی توجہ نبن کی طرف کی، جو اب تک اُن کے مشورے سے بچا ہوا تھا۔

"کیوں میاں نبن!" میاں شرفو فرمانے لگے "تم کو میں نے جس دکان سے سستی قمیصیں خرید کرنے کا مشورہ دیا تھا، وہاں سے کتنی قمیصیں لے کر آئے؟ تم تو میری ٹیکسی لے کر گئے تھے نا پرسوں؟"

"ہاں میاں!" نبن کچھ روہانسا ہو کے بولا "مگر وہ دکان ملی ہی نہیں۔

جب آپ نے مجھے ٹیکسی دی تو ساڑھے سات روپے کا بھاڑا تو اُس وقت ہو چکا تھا۔ پھر لوپ پتے پانچ روپے اُس دُکان کو ڈھونڈنے میں نکل گئے۔ بہت مشکل سے وہ دُکان ملی تو معلوم ہوا کہ دکاندار کا دیوالہ پٹ چکا ہے۔ آپ نے شاید اُسے ہی بنائی قمیصیں بیچنے کے بجائے جوتے بیچنے کا مشورہ دیا تھا۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے سترہ روپے ٹیکسی کا بل ہو گیا!"

برسات آنے والی تھی۔ فصل کٹ کر سنبھالی جا چکی تھی۔ اِس سے پہلے میں گھاس اور چارہ کٹوا کر اپنے کھلیان میں الگ سے بندھوا دیتا تھا۔ جہاں وہ بندھا بندھا سال بھر محفوظ رہتا تھا۔ گھاس کے پولے ایسی سختی سے باندھے جاتے تھے کہ پوری برسات کا پانی اوپر ہی اوپر سے گزر جاتا تھا۔ اندر کی گھاس بالکل خشک رہتی تھی۔

اس بار میاں شرفو نے صلاح دی — "اماں! ایسی حماقت مت کرو۔ تمھاری آدھی حویلی ڈھنڈار خالی پڑی ہے۔ اُس میں گھاس بھوسہ سب بھروا کے محفوظ رکھ لو۔ ابھی چار دن کی بات ہے چھجو مل منشی کا سارا کھلیان جل گیا۔ جہاں غلّہ محفوظ کرتے ہو وہیں حویلی میں۔ ایک طرف بھوسہ بھی محفوظ کر لو۔"

چھجو مل کا بھوسہ جلنے کی خبر میں نے بھی سُنی تھی۔ اِس لئے میاں شرفو کا مشورہ سُن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ میں نے سوچا سمجھا، غور کیا تو اس مشورے میں بہت دَم نظر آیا۔

دوسرے ہفتے سارا بھوسہ کھلیان سے نکلوا کر حویلی میں بھروا لیا ایک طرف کو۔ بات یہ ہے کہ میاں شرفو کے مشورے ہوتے بڑے کارآمد ہیں۔ نہ جانے کیوں لوگ خواہ مخواہ اُن کے مشوروں سے چڑ جاتے ہیں۔

ایک دن ہم لوگ حویلی کے بڑے آنگن میں کدم کے پیڑ کے نیچے رمی کھیل رہے تھے۔ چاروں طرف دالانوں میں بھوسہ بھرا پڑا تھا۔ معلوم نہیں کس سے یہ حماقت سرزد ہوئی۔ نبّن سے یا مُنّن سے۔ کسی نے سگریٹ پی کر اُس کا آخری ٹکڑا اپنے پیچھے پھینک دیا۔ وہ دالان کے ایک کونے میں جا گرا۔ ہم لوگ رمی کھیلتے رہے۔ دھیرے دھیرے آگ لگتی گئی۔ جب شعلوں کی زبانیں چھت تک پہنچنے لگیں تو ہمیں معلوم ہوا۔ پہلے تو سب لوگ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ بیوی بچّوں کو حویلی سے کسی نہ کسی طرح نکالا۔ پھر قریب کے محلے سے آگ بجھانے والوں کو ٹیلی فون کیا۔ لیکن جب تک فائر انجن آئے بھوسے نے حویلی جلا کر راکھ کر دی!

میاں شرفو ذرا بھی نہ گھبرائے۔ پھول کی طرح کِھلتی ہوئی بشاشت سے بولے "حویلی جل گئی تو کیا ہوا۔ تم نے اِس کی انشورنس تو کرا رکھی ہو گی؟"

میں نے کہا "میں نے تو نہیں کرائی تھی۔"

میاں شرفو نے اپنا ماتھا پیٹ لیا: "ایسی حماقت؟ ایسی حماقت کر گھر میں بھوسہ بھر لیتے ہو اور انشورنس تک نہیں کراتے ہو؟ ہماری بیمہ کرا لیتے تو اِس وقت اِس جلی ہوئی حویلی کے دُگنے دام تمھیں مل جاتے!"

میں نے مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔

میاں شرفو میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بہت ملائمت سے بولے۔ "کوئی بات نہیں۔ اب نئی حویلی بنواؤ گے تو اُس کا بیمہ ضرور کروا لینا! سمجھے؟ یہ میرا مشورہ ہے . . . !!"

---

# خیر مقدم

ایم۔ ایل۔ دیپک شکوہ آبادی ایم۔ اے (علیگ)

زیبِ آغوشِ نظر ہے پھر کوئی مُہرۂ جمال — رُوحِ پروازِ تخیل، جانِ فردوسِ خیال

ہر ادا مستی بہ داماں، ہر نظر موجِ شراب — عارضِ خوش رنگ جیسے نو شگفتہ سے گلاب

جنبشِ ابرو میں جیسے صبحِ محشر کا سماں — وہ تبسم کوندتی ہوں جیسے پیہم بجلیاں

جام چھلکاتی شرابِ شوق کے آئی ہے وہ — اک پیامِ سرخوشی میرے لئے لائی ہے وہ

گردشِ ایام! مہلت چند ساعت کے لئے

منتظر برسوں سے تھا میں اس عنایت کے لئے

اتفاقاً آج چشمِ ملتفت پائی تو ہے — آج میرے مسکرانے کی گھڑی آئی تو ہے

آج پیمانے ملیں گے اُس کے دستِ ناز سے — آج چھلکیں گے نئے ساغر نئے انداز سے

آج ہو جانے کو ہے تسکینِ ذوقِ میکشی — آج ہے پی کر بہکنا عینِ حسنِ زندگی

ہو کے بیخود یوں اُچھالوں گا فضا میں جام کو — نیند آجائے بلا سے گردشِ ایام کو

آج وہ چھلکے گی ساغر سے گلابی دیکھنا

سارے عالم کو بنا دوں گا شرابی دیکھنا

آج جو عالم ہے دل کا، میں بتا سکتا نہیں — کوئی بھی میرے مقابل آج آسکتا نہیں

اہلِ دُنیا کی حقیقت کیا ہے اب میرے لئے — بابِ فردوسِ مسرت وا ہے اب میرے لئے

حسن خود کہتا ہے مجھکو اپنا حسنِ انتخاب — عالمِ امکاں میں میرا اب نہیں کوئی جواب

جلوۂ مہتاب وانجم تابشِ خاور نہیں

عشق میں دیپک مرا اب کوئی بھی ہمسر نہیں

Robin Ultramarine
STANDARD
QUALITY
MADE IN INDIA
RECKITT & COLMAN OF INDIA LTD.

# دستک

ڈاکٹر حامدی کاشمیری ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی

۲۹۶۔ جواہر نگر۔ سری نگر

برادرم! آداب

آپ کا خط ملا۔ قدر دانی اور محبت کے لئے بے حد ممنون ہوں۔ لیجئے ایک اور تازہ افسانہ "دستک" بھجوا رہا ہوں۔ یہ ایک نفسیاتی مطالعہ ہے، اُمید ہے پسند آئے گا ——— بمبئی کے حالیہ دورے کے خوشگوار اثرات دل و دماغ پر نقش ہیں۔ وہاں کے مخلص دوستوں اور "عزیزوں" کو بُھلانا ممکن نہیں۔ اُردو کنونشن کی بدولت کئی اہم ادبی شخصیتوں سے ملنے کا موقع ملا۔ کرشن جی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ وہ بڑی محبت اور خلوص سے پیش آئے۔ صحت کی خرابی سے وہ اِس لئے افسردہ خاطر نظر آئے، کیونکہ ڈاکٹر نے لکھنے سے منع کیا ہے۔ اِس سال وہ کشمیر آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم سب چشم براہ بیٹھے ہیں۔ کرشن چندر کی خلاق شخصیت تہذیبی سرمائے کی حیثیت رکھتی ہے۔ واجدہ تبسم اور اشفاق بھائی کی محبت اور شفقت نے ہمیں بے حد متاثر کیا۔ دونوں آپ کو یاد کرتے رہے اور عصمت آپا کی باغ و بہار شخصیت ——— اُن کی بے تکلف گفتگو، لطیفے، قہقہے اور اُردو کے بارے میں سنجیدہ کلامی دیر تک یاد رہے گی . . .

آپ کا ——— حامدی کاشمیری

دروازہ اندر سے بند تھا، کمرے میں کوئی نہ تھا۔ آیا گھر کا سارا کام کرکے، برتنوں کو مانجھ کر اور کمرے کو آئینہ خانہ بنا کے اپنی بھانجی کی شادی پر سیدپور گئی تھی، کل لوٹنے کا وعدہ کرکے۔ ابّا جان تو رات کے بارہ بجے سے پہلے کیا لوٹیں گے؟ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ سورج کی ڈھلتی روشنی اب کھڑکی کے ایک پٹ پر جھول رہی تھی اور جلد ہی دیوار سے پھسل کر بلڈنگ کے چھجّوں پر برسوں سے کھڑے کرکٹ پر کھیل جائے گی۔ کمرے میں ایک گدلا سا غبار پھیل رہا تھا۔ وارڈروب کے ساتھ شوکیس میں سیپ کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے کھلونے سے سکے تھے۔ نیچے بچھا ہوا رنگین قالین کا فرش بے داغ اور چمکیلا تھا۔ کونے میں سلیقے سے ایک دوسرے پر رکھے ہوئے برتن چپ تھے۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی، خاموش، بے حرکت، بغیر تبدیلی کے ——— لیکن آج ——— آج وہ خود کتنی بدلی ہوئی تھی ———!

وہ خود کو پہچان نہیں رہی تھی ———!

رہ رہ کر اُس کے ہاتھ پاؤں پسینے سے بھیگ جاتے۔ اُس کے ماتھے پر بھی پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہونے لگتیں۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ صدیوں تک کسی تاریک کنویں میں قید رہنے کے بعد آج روشنی کی بلندی پر آگئی ہے اور بھرپور سانس لے رہی ہے اور تازہ ہوا اُس کے خون کے بہاؤ میں بجلیاں دوڑا رہی ہے ——— یہ کمرہ، یہ وارڈروب، یہ قدِ آدم آئینہ، یہ انیچی، کونے میں رکھے ہوئے برتن، سٹوو، الماری میں رکھی ہوئی کتابیں، یہ بیڈ ——— وہ اِن سب چیزوں سے دُور جا رہی ہے، بہت دُور ———! سڑک کے آر پار دس دس منزلہ بلڈنگوں کو پھاند کر نیلی دھند میں لپٹی ہوئی بلندیوں پر پرواز کرے گی۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا اُس کا سارا جسم روشنی کی طرح ہلکا ہو گیا ہے۔ وہ بیڈ پر لیٹی اور اُس نے آنکھیں بند کیں۔

خلافِ معمول آج پوری چال میں دوپہر ہی سے سناٹا تھا۔ یہ خاموشی بڑی عجیب محسوس ہو رہی تھی۔ کمروں کے دروازے بند تھے۔ پیچھے پر قدموں کی کوئی آہٹ نہ تھی اور سیڑھی بھی چپ تھی۔ خدیجہ بی بی کے کمرے کے باہر چولہا ٹھنڈا تھا اور چند برتن ایک دوسرے پر رکھے پڑے تھے۔ آج نہ جانے لیلیٰ بھی کہاں چھپ گئی تھیں۔ کوئی خوانچے والا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔
اس کے دھلے ہوئے بال شانوں پر کھلے تھے اور امجد سامنے کھڑا تھا۔
"میں کل جا رہا ہوں ——!" اس کی آواز ویران تھی۔ بالکل اس کے چہرے کی طرح! !
"مجھے معلوم ہے ——!" وہ ساڑی کے پلو کو مروڑنے لگی۔
"آپ کے ساتھ بہت سی باتیں کرنا تھیں، لیکن ایک بات بھی نہ ہو سکی!"
"آپ بہت جلد جا رہے ہیں۔ کچھ دن اور ٹھہرنا تھا۔"
"کیا کروں، نوکری کا معاملہ ہے —— اور پھر ہماری نوکری ——"
وہ خاموش ہو گیا —— کرب انگیز خاموشی! وہ بے چین ہو گئی۔
"یہ وقت اتنی جلد بیت جائے گا مجھے اندازہ نہ تھا۔"
"وقت گزرتے دیر نہیں لگتی اور کتنی حقیقتیں خواب بن جاتی ہیں —— لیکن کچھ حقیقتیں دل میں زخموں کی طرح جاگتی رہتی ہیں —— میں آپ سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا راحت! —— زندگی نے مجھے ہر قدم پر زخم دیئے ہیں لیکن —— لیکن آپ نے کبھی مجھے بات کرنے کا موقع نہ دیا۔ میں اپنا دل کھول کے رکھ دیتا —— آپ نے مجھے ترسایا، میرا المیہ اس مسافر جیسا ہے، جو صدیوں تک ویرانوں اور سرابوں میں بھٹکنے کے بعد ایک شاداب چشمے پر پہنچتا ہے۔ اس کے پھٹے ہوئے ہونٹ چشمے پر جھکتے ہیں لیکن چشمہ اچانک اس سے دور ہو جاتا ہے اور وہ ——"
وہ اور زیادہ سننے کی تاب کہاں سے لاتی؟
"بس کیجئے ——" اس کا بس چلتا تو وہ ان کے پاؤں کو آنسوؤں سے دھو لیتی تاکہ ان کا دل صاف ہو جاتے۔ وہ فوراً سنبھل گئی۔ اس کے ہونٹ ساکت تھے۔
"آپ نے کبھی میرے کمرے میں قدم بھی نہ دھرا؟" وہ براہِ راست شکایت پر اتر آیا۔
"ایک بار بھی آپ کے پاس آتی تو عمر بھر کے لئے لوگوں کی زبانیں چلتی رہتیں اور پھر ——"
"راحت! لوگوں کی زبانیں یوں بھی چلتی رہتی ہیں، لیکن دنیا کے کاروبار کبھی بند نہیں ہوتے۔ —— تم لوگوں سے ڈرتی رہو گی تو وہ جینے کا حق بھی تم سے چھین لیں گے —— یہ قاتل لوگ!"
کتنی سچی بات تھی! امجد کی ہر بات دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی —— اور وہ بے بس ہو جاتی۔ اس کی بے چینی اور الجھن بڑھ جاتی اور یہ الجھن اور بے چینی اس وقت اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ جب تک وہ ان کے سامنے سے ہٹ کر اپنے کمرے میں نہ جاتی —— اپنے کمرے میں جا کر وہ آنکھیں بند کر لیتی اور پھر آہستہ آہستہ جذبات کے بھنور اتر جاتے اور اس کا وجود ہموار ہو جاتا۔ وہ کتاب کے اوراق الٹتی اور ہر چیز کو بھلا دیتی لیکن آج امجد نے اس کے لئے راہِ فرار باقی نہ چھوڑی تھی۔ وہ بولی۔
"چار بجے آیئے نا کمرے میں —— وہاں کوئی نہ ہوگا۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں ——"
اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا اور کمرے میں بیٹھی ہوئی وہ ہانپ رہی تھی۔
وہ چار بجے آ رہے ہیں ——
چار بجے ——!!
وقت لمحہ لمحہ گزر رہا تھا —— کمرے میں ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ وہ اٹھی اور اس نے قدِ آدم آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ اس کا قد تھوڑا چھوٹا تھا۔ لیکن پتلے پتلے ہونٹ اور ہونٹوں کے یہ کانپتے ہوئے [illegible] پر یہ بہترین کوالٹی کی لپ اسٹک —— اس کا کتابی چہرہ —— پہلے تو اس کا چہرہ بھرا بھرا رہتا اور کیا مجال چہرے کی جلد پہ ایک ہلکی سی [illegible] بھی ہو۔ لیکن اب معمولی سی ذہنی پریشانی سے اس کے چہرے پہ لکیریں ابھر آتی ہیں —— جھریاں؟ نہیں نہیں، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ اس سال مئی میں وہ اکتیس سال کی ہو جائے گی —— اکتیس سال! —— کیا وہ [illegible] تیس سال پیچھے چھوڑ آئی ہے؟ ایک طویل سفر —— اس کی ہم عمر لڑکیاں [illegible] اس سے کب کی بچھڑ چکی ہیں۔ ان کے گھر بس چکے ہیں —— [illegible] اکیلی رہ گئی ہے —— نہیں حسنی، جہاں آرا اور ناجرہ آپا [illegible] حسنی کی والدہ نے اس دن حساب جوڑ کر بتایا تھا کہ حسنی اس سے [illegible] سال بڑی ہے اور پھر جہاں آرا اور ناجرہ آپا تو حسنی سے دو دو سال بڑی ہیں —— یہ بھی ابھی کنواریاں ہیں اور وہ ان سبھوں سے زیادہ [illegible] مانی جاتی ہے۔

لیکن اس میں ایسی کون سی بات ہے ـــــ ہاں ـــــ اُس کی
یں ایک کشش ہے سبھی تو کہتے ہیں۔ اس دن امجد نے کہا تھا۔
"راحت! تمہاری یہ کاجل بھری آنکھیں جینے نہ دیں گی!" اور جب
نے ہنس کر کہا کہ وہ کبھی کاجل نہیں لگاتی تو وہ قریب آکر اس کی آنکھوں
ـس سے جھانکنے لگے ـــــ سچ مچ معائنہ ہی تو کر رہے تھے۔
"ہائے واہ ـــــ اللہ میاں نے اپنے ہاتھوں ان آنکھوں میں کاجل
لگائی پھیری ہے!" ان کی سانسوں میں کتنی حدت تھی۔ اس کا چہرہ جلتا
سوس ہوا۔
اس وقت بھی اس کا چہرہ جلتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ اس کے
ں کی لویں جن میں کانچ کے نیلے ٹاپس جڑے ہوئے ہیں، جل رہی ہیں۔
ی سانسوں میں بھی آگ ہے ـــ !
اس نے سینے کو دوپٹے سے ڈھک لیا۔ لیکن یہ دودھیا لہروں کا
اش ـــــ وہ شرمائی!
اور اسے یاد آیا ـــــ
محسن کی یہ عادت اُسے بالکل پسند نہ تھی کہ وہ ضبط کرنا جانتے ہی
۔ جب بھی ان سے سیدھے منہ بات کرو۔ وہ شرارت اور شوخی پر اُتر
، اور ـــــ وہ سر سے پیر تک کسمسا کر رہ جاتی!
اور جب ایک دن اس نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تو محسن بیچارے
یسے سانپ سونگھ گیا۔ ان کے چہرے پر سیاہی کی چادر پھیل گئی۔ ان کی آنکھوں
خون رسنے لگا ـــــ نہ جانے کتنی آرزوؤں کا خون! فوراً اُس کا دل
ج اُٹھا۔ محسن جتنے جذباتی تھے اُتنے ہی بھولے بھی تھے اور اُسے ان کا بھولا پن
سند تھا جسے ان کی بے بسی اور بیچارگی سے الگ کرنا مشکل تھا۔
"راحت! تمہیں کیا معلوم میری زندگی کتنی ویران ہے، کتنی سنسان
ـــــ فیکٹری سے لوٹتا ہوں تو گھر میں قدم رکھتے ہی جسم میں اُداسی اور
ہائی کا زہر پھیلتا ہے اور ساری ساری رات جاگتے گزر جاتی ہے ـــــ"
محسن کی سات سال پہلے شادی ہوئی تھی اور جس دن ان کی شادی
ہوئی، وہ دن اس کی انتہائی تیرہ بختی کا دن تھا۔ وہ دن اور وہ رات
ن نے کچھ نہ کھایا اور اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتے رہے۔ لیکن جب وہ
لہن کو دیکھنے کے خدیجہ بی بی کے گھر گئیں، تو وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ اس نے
لہن کو جیسے دیکھا تو وہ اُسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ اسے دلہن
لی یہ ادا ذرا بھی اچھی نہ معلوم ہوئی ـــــ اور پھر وہ محسن سے دور ہو گئی ـــــ

وہ محسن سے قریب تھی ہی کب؟ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا وہ محسن کو
دیکھتی رہی تھی۔ وہ صبح سویرے فیکٹری جاتا اور شام کو تھکا ماندہ لوٹتا اور دن
میں وہ کبھی کبھی خدیجہ بی بی کے گھر میں جاتی، کاموں میں اُس کا ہاتھ بٹاتی،
کبھی فرش پر جھاڑو پھیرتی، برتن صاف کرتی یا کپڑے دھوتی۔ ان سب کاموں
میں اُسے محسن کے کپڑے دھونے میں بے اندازہ مسرت ہوتی ـــــ وہ ایک
ایک کپڑے کو دل و جان سے دھو لیتی، دھوپ میں سکھاتی اور پھر پریس کرتی،
خدیجہ بی بی دعائیں دیتی اور محسن ـــــ؟ ان کے منہ سے کبھی
شکریہ کا ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ ناشکرے ـــــ لیکن جب بھی محسن نے کسی
دن اس سے بات کرنا چاہی وہ فوراً بھاگ گئی اور وہ افسردہ ہو کر رہ گئے۔
ان دنوں محسن کی منگنی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ بی۔ اے میں پڑھتی
تھی۔ نہ جانے کہاں سے یہ بھنک اس کے کان میں پڑ گئی کہ خدیجہ بی بی اُسے
اپنی بہو بنانا چاہتی ہے ـــــ یہ سن کر اس کی تو نیندیں ہی جل گئیں اور پھر
ابا جان سے اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا کہ بی۔ اے کرنے سے پہلے وہ ہرگز شادی
کے حق میں نہیں۔ اپنا فیصلہ سنا کر جب وہ تنہا رہ گئی تو وہ کتنا روئی ـــــ
کتنا روئی، لیکن اس کے آنسو کس نے دیکھے تھے؟
"عائشہ نے میرے گھر کو جہنم بنا رکھا تھا اور جب سے وہ میکے گئی ہے
میں نے خدا کا شکر ادا کیا ہے" محسن کہہ رہے تھے۔ سمندر کی شریر ہوائیں
اُن کی ویران آواز کو دور ریتیلے ساحل پر اُچھال رہی تھیں۔
عائشہ چار سال سے میکے میں ہے اور وہ شاید کبھی نہ لوٹے ـــــ
محسن کے چہرے کی ویرانی اس سے دیکھی نہ گئی۔
ایک لمحہ سمندر کی طرح پھیل چکا تھا ـــــ!
وہ آگ کی لہروں پر سے گزر کے آئی تھی ـــــ محسن کا گھر آباد ہو جائے گا،
ان کے بچے ہوں گے، ننھے ننھے ہنستے کھیلتے بچے ـــــ اور ان کے چہرے کی ویرانی
دھل جائے گی ـــــ لیکن محسن کی ہو کر لوگ کیا کہیں گے اور پھر ـــــ کیا اُسے
محسن سے محبت ہے؟ نہیں، اُسے تو صرف ان کی مظلومیت اور افسردگی بے چین
کرتی تھی۔ لیکن اگر ہر مظلوم کو دیکھ کر اس کا دل موم کی طرح بہہ نکلے تو؟ ـــــ
یہ دنیا تو مظلوموں سے اٹی پڑی ہے ـــــ وہ ہنس دی۔
اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ وہ کھڑی ہو گئی اور ٹھنڈی ریت کو
کپڑوں سے جھاڑنے لگی۔
"دیر ہو رہی ہے، میں جا رہی ہوں ـــــ کل تو اتوار ہے، میں سارا
دن گھر میں رہوں گی ـــــ آپ آیئے نا وہاں دوپہر کے بعد، وہیں باتیں ہوں گی۔"

اُس کی سانس ہموار تھی۔

اتوار کو نہا دھو کر اُس نے ایک نئی ساڑی پہنی۔ اُس کی رگ رگ میں ایک نامعلوم اضطراب بھر رہا تھا۔ ابا جان تو اتوار کو بھی گھر میں نہ بیٹھتے، روزانہ سات آٹھ میل چلنا اُن کی عادت تھی اور جب تک وہ یہ فاصلہ پیدل طے نہ کر لیتے، اُن کی طبیعت بجھی بجھی سی رہتی۔ سفید قمیص، پاجامہ اور قیمتی واسکٹ میں وہ اب بھی جوان معلوم ہو رہے تھے۔ سارے علاقے میں اُن کا دبدبہ قائم تھا۔ اُن کی لمبی گھنی مونچھیں اور چہرے کا جلال دیکھ کر بڑے رستموں کی سِٹّی گُم ہو جاتی۔ ذرا سا طیش آنے پر وہ آگا پیچھا دیکھے بغیر مرنے مارنے پر تُل جاتے ——!

"جس دن وہ تمھاری ممی کو ٹیکسی میں بٹھا کر لایا —" آیا دیدے گھما گھما کر کہتی "سارا علاقہ میں چُپ لگ گیا۔ اپنی کو تو خوف سے جان نِکل گیا۔ مجال ہے کوئی مردوا سامنے آئے۔ چال میں سب لوگ ہاگاں نے دروازوں پر تالے چڑھایا —— لیکن بی بی جی، کچھ نہ ہوا ——"

آیا نے بچپن ہی سے اُسے ساری کہانی سُنائی تھی۔ رحمت پورہ میں اُس کی ممی دسویں میں پڑھتی تھی اور ابا جان نے اُسے کئی بار بس سٹینڈ پر دیکھا تھا۔ ابا جان اُس سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے۔ ممی کی بھی یہی مرضی تھی۔ لیکن ممی کے ابا نے یہ کہہ کر پیغام لوٹایا تھا کہ وہ اُس لفنگے کے پلّے اپنی بیٹی کو باندھنے پر رضامند نہیں —— اور پھر صرف پندرہ دنوں کے بعد ابا جان ممی کو ٹیکسی میں بٹھا کر گھر لائے۔ سب سے پہلے برابر کی مسجد سے مولوی صاحب کو بُلوایا۔ نکاح پڑھوایا اور پھر دوسرے دن شاندار دعوت کی۔ آیا نے بتایا کہ ممی دُلہن بن کر بھی اُداس تھی، چُپ چاپ —— اور پھر وہ صرف دو سال زندہ رہی —— یہ ساری کہانی اُس نے آیا سے سُنی تھی اور جتنی کڑیاں رہ گئی تھیں، وہ خدیجہ نے جوڑی تھیں۔ ممی کے ابا اِس صدمے کو برداشت نہ کر سکے اور وہ بھی چھ مہینے کے بعد جنت کو سدھارے ——!

کتنی دلگداز کہانی تھی!

وہ اکثر اِس کہانی کے تانوں بانوں میں اُلجھ کر رہ جاتی اور پھر اُس آہنی جال سے اُس کا باہر نکلنا محال ہو جاتا تھا اور وہ اپنا سر ٹکرا کے رہ جاتی ——!!

محسن کے آنے کا وقت ہو رہا تھا ——!

معاً اُسے محسوس ہوا اُس کا سارا وجود آہنی تاروں میں جکڑ چُکا تھا۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ کھڑکی کے پردے اُڑ رہے تھے۔ کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ وہ پلنگ پر بے سُدھ پڑی تھی اور تیز تیز ہوا باہر بند دروازے پر دستک دے رہی تھی ——!

ٹھک ٹھک ٹھک ——!!

لیکن وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکی۔

اور شام تک یونہی پڑی رہی۔

شام کو ابا جان سے باتیں ہوئیں۔ اُنھوں نے امریکن جِپسم [illegible] کاروبار شروع کیا تھا اور کافی منافع کمایا تھا۔ جب بھی وہ کوئی بڑی رقم لے آتے تو اُس کے حوالے کر دیتے۔ گھر میں کیا آیا، کتنا خرچ ہوا، کتنا [illegible]، یہ سارے کام وہ خود کرتی۔ ابا جان اِس جھنجھٹ میں کب پڑنے والے تھے؟ وہ ہوا کی طرح آزاد تھے اور اُنھیں پابہ زنجیر کرنا ممکن نہ تھا۔ حالانکہ وہ [illegible] کہتے ——

"راحت بٹیا نے میرے پاؤں میں بیڑی ڈال دی ہے ——" اور آیا بھی کہتی ——

"جب سے بی بی جی بڑی ہو گیلہے، وہ موم کی طرح نرم ہو گیلا ہے۔"

لیکن وہ ابا جان سے ہمیشہ خائف رہی ——!

جب بی۔ اے کرنے کے بعد ابا جان کے پیہم اصرار کے باوجود [illegible] میں ایم۔ اے کرنے پر رضامند نہ ہوئی تو ابا جان سخت برہم ہوئے۔ وہ [illegible] اپنی ضد پر اَڑی رہی۔ کئی دن تک باپ بیٹی میں کوئی بات بھی نہ ہوئی۔ اچانک —— اُس کا جی تعلیم سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ کتاب ہاتھ میں لے کر اُسے وحشت ہو جاتی اور صفحوں کے صفحے پڑھنے کے باوجود اُس کے پلّے کچھ نہ پڑتا اور جھنجھلاہٹ اور بے بسی میں کتاب پھینک دیتی۔ وہ جاسوسی اور افسانوی ادب سے بھی دُور بھاگتی —— یہ افسانہ نگار خیالی گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ ایک لڑکی نے کسی مرد کو کیا دیکھا بس محبت سے دیوانی ہو گئی —— بکواس! اُس نے کبھی دل میں محبت کے جذبے کی سرسراہٹ بھی محسوس نہ کی۔ جب وہ نویں جماعت میں پڑھتی تھی تو نچلی منزل کے ماسٹر نجم الدین کے لڑکے شہاب کو دیکھ کر ایک بار اُس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ جب وہ نیشنل ٹرافی جیت کر آیا تھا۔ وہ اسکول کی ٹیم کا کپتان تھا۔ وہ اُسے اچھا لگا تھا اور وہ تھا بھی خوبصورت —— گورا چٹّا، بلند قد کا۔ اُس نے سیڑھی کے آخری زینے پر کئی بار اُس کا راستہ روکا تھا، بے شرم —— لیکن اُس نے بیزاری سے [illegible] —— یہ بھی کون سا طریقہ ہے؟ لیکن جب بھی اُس کے گھر لوٹنے کا وقت ہو جاتا وہ کھڑکی سے اُسے دیکھتی اور عجیب عجیب خواب بُنا کرتی۔ لیکن جب ماسٹر [illegible]

ایک سامنے سب پڑھی سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ شہاب کے لئے
راستہ کا ہاتھ ـــــ کہ ابا جان سے پہلے اُس نے مخالفت کا محاذ بنا لیا۔ ابا جان
واقعی اس بات کو یہاں تھا کہ لڑکا ابھی کوئی کام نہیں کرتا اور پھر اُس کے پاس
علیحدہ کمرہ بھی نہ تھا۔

مثلاً اسے ابا جان کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اُس کے دل میں دبا رہ کر
یہ خیال آ رہا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لے۔ باتوں باتوں میں اُس نے
کئی بار اس خواہش کو ہونٹوں پر لانے کا عزم کیا، لیکن ہر بار ابا جان کے چہرے
پر نظریں ڈال کر الفاظ اُس کے ہونٹوں پر آنے سے پہلے بکھر جاتے!

وہ اپنی بے بسی پر کڑھتی رہی۔

اُف ـــــ! وہ اُٹھی۔ اُس نے سارے خیالات ذہن کی سرحدوں سے
پرے جھٹک دیئے۔ نیچے پھولوں پر دھوپ بجھ رہی تھی۔ وہ سامنے سنگار ٹیبل پر
آئی۔ پوڈر، کریم، لپ اسٹک، ہیئر آئل، سینٹ ـــــ وہ خوشبوؤں میں
نہا گئی۔ اُس نے وارڈروب کا دروازہ کھولا اور قسم قسم کی قیمتی ساڑیوں پر
ایک نظر ڈال کر فیروزی رنگ کی ایک نئی ساڑی پہنی۔ امجد کو یہ ساڑی
ضرور پسند آئے گی۔

قدِ آدم آئینے میں اپنی نکھری ہوئی شبیہہ دیکھ کر وہ شرمائی۔

چار بج رہے تھے ـــــ

امجد آ رہے ہوں گے ـــــ اُس کا سینہ دہلنے لگا۔

وہ امجد کے سامنے آج اپنا دل کھول کے رکھ دے گی ـــــ جیسے
صدیوں سے اُس کی نس نس جس نا معلوم بوجھ سے گرانبار ہے۔ اُس بوجھ کو
آج وہ دُور جھٹک دے گی۔ وہ ہوا کی طرح سبک ہو جائے گی۔ سبک اور
آزاد! اور تمام رُکاوٹوں سے ٹکرا کر اپنا مستقبل سنوارے گی۔ وہ امجد کو
چاہتی ہے۔ وہ اُن کے ساتھ اور رنگ آباد جائے گی۔ ایک خاموش سا شہر،
جہاں کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ وہ خاموشی اور لگن سے اپنا گھر بسائے گی ـــــ
اپنے بچے ـــــ اِس شہر نے اُس کی جوانی کو زنگ آلود کر دیا اور اُس کے
کتنے خواب سوکھی پتّیوں کی طرح بکھر چکے ہیں ـــــ اُس کے خواب سوکھی پتّیوں
کی طرح بکھر رہے ہیں، بنجر زمین میں اُگے ہوئے پیڑ کی طرح ـــــ پتّیاں بکھر
رہی ہیں اور شہر کا شہر گرد و غبار میں ڈوبا جا رہا ہے۔ لوگ کھڑکیاں بند کر رہے ہیں
تا کہ یہ مسموم غبار اندر نہ آ جائے ـــــ یہ غبار کہاں سے اُٹھ رہا ہے؟

معاً اُسے محسوس ہوا سارا کمرہ گدلے غبار سے بھر گیا ہے۔ وہ اُٹھی سہمی
ہوئی اور اُس نے کھڑکی بند کی، کمرے میں سائے پھیل گئے ـــــ اُسے محسوس ہوا
اُن سے ترچھے سایوں میں اُس کا وجود بھی محض ایک سایہ ہے ـــ بے جان، بے حس ـــــ
ایک سایہ جو پتھر بن چکا ہے!

وہ بے حس و حرکت بیڈ پر پڑی رہی۔

اُس کا دایاں ہاتھ بیڈ سے بے سُدھ لٹکا رہا۔

اور دروازے پر برابر دستک ہوتی رہی ـــــ

ٹھک ٹھک ٹھک ـــــ!

گرد آلود خاموشی سنسناتی رہی ـــــ

وہ دستک کی آواز سن رہی تھی، جیسے دُور اجنبی راستوں پر آندھی
چلنے کی آواز آ رہی تھی اور ابھی ابھی کہیں بجلی گرنے والی ہو ـــــ!

خوف سے وہ کانپ رہی تھی!

اور جب شام کو اندھیرے میں دستک کھو گئی تو اُس نے پلکیں کھول دیں۔
اُس نے تھکی تھکی سی انگڑائی لی اور کھڑکی کھول دی۔ بازار میں روشنیاں جاگ
رہی تھیں اور مطلع بالکل صاف تھا۔ تیز روشنیاں اُس کی آنکھوں میں چبھ رہی
تھیں! اُس نے ایک لمبی سانس لی۔

اور دوسرے لمحے بستر پر آ گری۔

صبح کو وہ اُس وقت بھی جاگ رہی تھی، جب ابا جان نے دروازہ کھٹکھٹایا
اور اُسے پکارا۔ اُس نے خدیجہ بی بی کو صبح سے کئی بار بڑبڑاتے ہوئے گزرتے
محسوس کیا۔ ـ یہ وہ امجد کے لئے ناشتہ بنا رہی تھی اور پھر وہ اُس وقت بھی
ہمہ تن گوش تھی جب امجد سیڑھی کے قریب آئے۔ اُنھوں نے خدیجہ بی بی سے
رخصت چاہی اور عشرت آپا کی دُعائیں لیں۔ سیڑھی سے اُترنے سے پہلے وہ اُس
طرف آئے اور اُس کے کمرے کے باہر بند دروازے کے پاس رُک گئے۔ پھر آگے
بڑھے۔ اُنھوں نے ابا جان سے رخصت لی، پھر پلٹے، پھر ایک بار اُن کے قدم رُک
گئے اور ـــــ

وہ سیڑھی سے اُترے۔ قدموں کی چاپ اُبھری، ڈوبی، ڈوبتی ہی
چلی گئی

اب ساری چال میں گہرا سناٹا تھا!

کھڑکی سے نیچے صحن میں امجد ہاتھ میں سوٹ کیس لئے بوجھل قدم اُٹھا
رہے تھے اور وہ کھڑکی سے لگی اُنھیں دیکھتی رہی اور جب وہ پھاٹک سے
نکل کر بھیڑ میں گم ہو گئے تو کئی موٹے موٹے آنسو اُس کی آنکھوں سے اُبھرے
اور چہرے کو بھگو گئے!

اُس نے جلدی سے آنکھیں پونچھیں اور اندر چلی آئی!!

## اگر آپ "سینفورائزڈ" لیبل کے پیچھے جھانک کر دیکھیں...

...آپ دیکھیں گے کہ کتنے ہی لوگ متعدد طریقوں سے تجربات اور آزمائش کرنے، پیمائش کرنے اور رپورٹ مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ ماہرینِ فن "سینفورائزڈ" کے نمائندے ہیں جو اس چیز کا اطمینان کر لینا چاہتے ہیں کہ کپڑا نہ سکڑنے کے لئے اس ٹریڈ مارک کے مالکان کی عائد کی ہوئی شرائط کی پابندی کی جا رہی ہے۔

اگر آپ غور و فکر کے ساتھ اس لیبل پر نظرِ ثانی ڈالیں تو یہ بار بار دھونے پر بھی کپڑا نہ سکڑنے کی قابلِ اعتماد ضمانت نظر آئے گا۔ یہ آپ کو یقین دلاتا ہے کہ آپ اپنے روپئے کی پوری پوری قیمت وصول کر رہے ہیں اور آپکے خریدے ہوئے کپڑے اپنی اصلی فٹنگ پر قائم رہیں گے۔

آئندہ جب بھی آپ سُوتی یا سُوت ملے ہوئے کپڑے خریدیں ہمیشہ سینفورائزڈ کا لیبل دیکھ کر خریدیئے۔ یہ ٹریڈ مارک قطعاً قابلِ اعتماد ہے۔

**• SANFORIZED •**
REGD TD MK

رجسٹرڈ ٹریڈ مارک "سینفورائزڈ" کے مالکان کلیوٹ پی باڈی اینڈ کمپنی انکارپوریٹیڈ (محدود ذمہ داری کے ساتھ یو۔ایس۔اے میں قائم شدہ) نے شائع کیا۔ صرف اسی کپڑے سے متعلق ٹریڈ مارک کا استعمال کیا جاتا ہے یا کرنے کی اجازت دی جاتی ہے جو نہ سکڑنے کی کڑی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔

# قطعات

مان سنگھ خیال ایم۔ اے۔ ایم ایڈ

چاندنی رات اور ترے آنسو
ایسے حالات اور ترے آنسو
آج دُنیا میں کتنے تنہا ہیں!
میرے جذبات اور ترے آنسو

---

غم کے کاندھے پہ رکھ کے سر اپنا
چاندنی جب اُداس ہوتی ہے
پھر کوئی یاد میری آنکھوں میں
آنسوؤں سے لپٹ کے روتی ہے

---

خواب سا ایک سجا کے دیکھا ہے
تیری محفل میں آ کے دیکھا ہے
اپنے کچھ آنسوؤں کی قیمت پر
ہم نے بھی مسکرا کے دیکھا ہے

---

کفر ایمان ہو نہ جائے کہیں
دل پریشان ہو نہ جائے کہیں
آپ کی اجنبی نگاہوں سے
جان پہچان ہو نہ جائے کہیں

# غزل

بشیر فاروقی کاکوری بی۔ اے

ہم تیرے پاس آ کے پریشان ہیں بہت
ہم تجھ سے دُور رہنے کو تیار بھی نہیں

آپ ایک بار ترکِ تعلق پہ سو
فیصلہ مرے لئے دُشوار بھ

سنتے ہیں وہ بھی جشنِ بہاراں کے ساتھ ہیں
دامن میں جن کے پھول تو کیا خار بھی نہیں

اہلِ چمن نے اُن کو بنایا ہے با
نظمِ چمن سے جن کو سروکار

کیا کیا ستم ترے لئے برداشت کر لئے
اتنے تو ہم خود اپنے طلبگار بھی نہیں

سب پارسا ہیں پھر بھی ترے دس
مل جائے کوئی جام تو انکار بھ

ٹھہرے اگر تو دُور نکل جائے گی حیات
چلتے رہو کہ فرصتِ دیدار بھی نہیں

وعدوں پہ جن کے کاٹ دیں شامیں ہم اے بشیر
اب شہر میں وہ یارِ طرحدار بھی نہیں
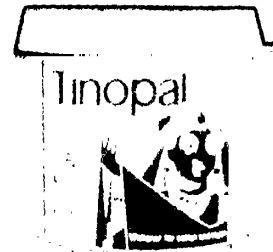
# کوئی عنوان نہیں

ایم۔ ایف۔ پرویز ایم۔ اے

۸۳۳۔ رویوار پیٹھ۔ پونا نمبر ۲ (مہاراشٹر)

مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! تسلیم

ذاکر صاحب کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا مزاج ناساز ہے۔ بھلا خوشتر بھی ناساز ہو سکتے ہیں؟ صاحب ٹال دیجئے اِس حالت کو۔ ابھی تو اکیسویں صدی کے شاندار استقبال کی تیاریاں کرنی ہیں۔ یہ تیس برس یوں گزر جائیں گے، ہم سب دُعا گو ہیں ــــــ ایک طویل عرصے سے "بیسویں صدی" میں شریک نہ ہو سکا۔ کچھ حادثات ہی ایسے ہو گئے تھے۔ ۲۵ فروری ۱۹۶۹ء کو میری بڑی بہن مس افتخار ناز بی۔ اے (آنرز) کا اچانک Tetanus سے انتقال ہو گیا۔ یہ انتہائی غیر متوقع خبر تھی۔ ہم وقت پر اُن تک پہنچ بھی نہ سکے۔ صبح دس بج کے پانچ منٹ پر اُن کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور ہم ساڑھے دس بجے اُن کے پاس پہنچے۔ موت اور زندگی کا فاصلہ کتنا کم ہوتا ہے۔ خوشتر بھیا بڑا دردناک سانحہ تھا یہ! خورشید نکہت کو آپ کا شفقت سے بھرپور نامہ ملا تو ہم سب بہت ہی متاثر ہوئے تھے ــــــ پھر زندگی میں ایک اور طوفان آیا ــــــ میں بڑے عجیب و غریب حالات میں گھِر گیا۔ شاید پھر کبھی بتا سکوں۔ اِتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے بھلائی کی طرف قدم بڑھائے تو بُرائی ملی اور مجھے انتہائی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا ــــــ! خیر چھوڑیئے۔ اب آپ کیسے ہیں؟ ــــــ ایک مختصر افسانہ ارسالِ خدمت ہے۔ کہانی میں جان بُوجھ کر تسلسل نہ رکھنا اور قارئین کو سوچنے کا موقع دینا میرا اپنا اسٹائل ہے۔ شاید پسند آئے جو اِس دَور کی کہانی ہے . . .

آپ کی صحت کا متمنی

ــــــ ایم۔ ایف۔ پرویز

جگ مگ کرتی ہوئی رات، جھلملاتی ہوئی روشنیاں، مدّھم مدّھم ستارے۔

نُور اور تاریکی، تاریکی اور نُور ــــــ اور میری تنہائی!

شور و غُل، چیخ و پُکار، ٹیکسیاں، بسیں، آٹو رکشا ــــــ بُوڑھے آدمی، جوان لڑکیاں، بچّے اور مائیں، طویل سڑک؟ اور یہ پُل! پُل کے نیچے سُوکھی ہوئی ندی، ندی کے کنارے جلتی ہوئی چِتا کی بھیانک آگ، بلند ہوتے ہوئے شعلے! سپنے اور سپنوں میں پُکارتی ہوئی ریکھا جیسے جنگل میں کوئل کی آواز، جیسے صحرا میں آندھی کا گیت۔ ہتھیلی پر بنی ہوئی ریکھائیں، پیشانی پر اُبھری ہوئی ریکھائیں، دل پر کھائی ہوئی چوٹیں۔ داغ، داغ، سپنوں کی راکھ، آوازوں کا دھواں، محبت کی پگھلتی ہوئی چاندنی، جلوؤں کے روشن گلاب، بجھے بجھے دل جیسے سہمے ہوئے خرگوش! زندگی میں کون سا تُک ہے، ڈھنگ ہے۔ کہاں چلیں، کہاں رُکیں۔ مرکز کہاں ہے، اسٹیشن کدھر ہے، پلیٹ فارم کون سا ہے؟ زندگی کا بس اسٹاپ کہاں ہے؟ ــــــ ہاں کبھی کبھی بس اسٹاپ ہی پر ریکھا مِلا کرتی تھی۔ چند لمحوں کے لئے، اور چلی جایا کرتی تھی۔ میں اُسے دیکھ کر مُسکراتا۔ وہ مجھے دیکھ کر مُسکراتی۔ اسٹاپ پر ٹھہرے ہوئے لوگ مِلے جُلے جذبات سے مغلوب ہو کر ہمیں دیکھتے اور ریکھا بے نیازی کی تصویر بن جاتی۔ پھر وہ چلی جاتی اور میں بھی چلا جاتا جیسے مندر کے پُجاری، سر جُھکایا اور چلے گئے۔

اُس حسین شام کو وسیع سمندر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ موجیں
رہی تھیں۔ موجوں پر رقص کرتی ہوئی سورج کی شعاعیں تھرتھرا رہی
دُور دُور تک پھیلی ہوئی سیاہ چٹانوں سے پانی ٹکرا رہا تھا۔ پہاڑ کے
رج کی آخری کرنوں کا جام چھلک رہا تھا۔ ریکھا کے بال یوں ہی سُنہرے تھے۔
ڈوبی ہوئی سورج کی کرنوں کی طرح! اُس کی چال میں موجوں کا یوں ہی
اور آواز میں تاروں کی جھنکار۔ بہت میٹھی، دل کو بہت دُور تک بہا
نے والی آواز!

"ریکھا ـــــ تم جانتی ہو تمہارا انتظار کب سے کر رہا ہوں؟"

"کب سے؟"

"یہ جو موجیں نظر آرہی ہیں نا ـــــ یہ یہاں سے کوئی دو سو فٹ پیچھے ـــــ!" میں نے کہا۔

"تب تو تم صبح ہی سے میرا انتظار کر رہے ہوگے!"

"رات ہی سے کر رہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "جب پچھلی شام تم جُدا تھیں۔"

"بکواس ہے! اِتنا انتظار کون کس کا کرتا ہے۔ میں نے تو کبھی اِتنا انتظار کیا۔"

"اور کل جو بکواس پکچر تم نے مجھے دکھائی تھی۔ ساری رات سر میں درد رہا۔ ڑ اور پروڈیوسر دونوں کو گالیاں دینی پڑیں۔"

"اچھا حضور بکواس ہی سہی۔ بیٹھو اور بکواس کرو!" وہ تنک کر بولی۔

"یہ ہپّی جیسا لباس کب سے پہننے لگی ہو؟"

"ہپّی جیسا ـــــ؟ کون کہتا ہے؟ ہپّی جیسے بال تو آپ نے بنوا رکھے ہیں۔ نوں ترشواتے نہیں۔ یہ مَیلی کچیلی جاکٹ ـــــ یہ چُست پاجامہ ـــــ اور یہ گلے میں موتی سی مالا ـــــ!"

"مالا نہیں ریکھا کہو ـــــ!" میں نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شکر کرو کہ ہپّی بنا ہوں زپّی نہیں بنا۔"

ہم بہت دیر تک سمندر کے کنارے بیٹھے ایک دوسرے کو چھیڑتے رہے۔ محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ دُنیا میں صرف ہم دو ہی رہتے ہیں۔ صرف ہمارا ہی رد ہے۔ دوسرا کوئی نہیں۔

پھر ریکھا چلی گئی۔ میں اپنے گھر لوٹ آیا۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی میں ساری ت پڑھنا چاہتا تھا۔ میں خاموش آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید سارے تارے مجھی کو دیکھ رہے تھے۔ میں باہر نکل آیا۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ سامنے قبرستان میں بڑے بڑے پُرانے برگد اور املی کے پیڑ سر اُٹھائے اور پیڑوں کی شاخوں سے چاند اُبھر رہا تھا۔ میرے قدم قبرستان کی طرف بڑھ گئے۔ میں اندھیرے میں آگے بڑھتا ہی رہا۔ صرف چاند کی مدّھم روشنی تھی۔ قبریں خاموش تھیں اور ہر طرف دردناک اُداسی چھائی تھی۔ ایک قبر کے کتبہ پر میری آنکھیں جم کر رہ گئیں۔ مجھے شیکسپیر کا ہیملٹ یاد آگیا ـــــ وہ گورکن یاد آئے جو قبر کھودتے کھودتے ایک کھوپڑی کو دیکھ کر قہقہہ لگاتے ہیں اور انسان کی بے ثباتی اور اُس کی شان و شوکت کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ پھر میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ صرف محسوس کرتا رہا۔ سوچنے اور محسوس کرنے میں بہت فرق ہے۔ میں نے محسوس کیا، زندگی کا انجام ایک ٹھنڈی اور گہری خاموشی ہے، ایک ابدی سکون ہے ـــــ ایک گہری نیند ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کتنا تڑپا دینے والا، کیسا عبرتناک، کیسا درد انگیز معلوم ہوتا ہے۔ جب محسوسات کی دُنیا سے نکلا تو صبح جاگ رہی تھی اور میری میز پر چائے کی پیالی سے گرم گرم نکلتی ہوئی بھاپ مجھے بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اُٹھ کر ہوا میں تحلیل ہو جانے والی بھاپ! جیسے محبت کا جذبہ! جیسے پیار کی آواز!

صبح بہت پیاری تھی۔ میں چاہتا ہوں ہر روز صبح اُٹھ کر پہلے نکلتے ہوئے سورج کا مُنہ دیکھوں، تب کوئی کام کروں۔ شام ہو تو کسی ندی کے کنارے اونچی ٹیکری پر کھڑے ہو کر سوکھے ہوئے پیڑ کے نیچے، گہری اُداس آنکھوں سے سورج کے ڈوبنے پر چند ماتمی آنسو دل میں جذب کروں اور پھر ہر قدم پر ایک فلسفی کی طرح سوچ میں ڈوبا بڑھتا چلا جاؤں نہ منزل معلوم، نہ مقصد!

---

ساون کی شام اپنے ساتھ گہرے غم لے آتی ہے۔ جس طرح خزاں کی دوپہر کو تیز چلتی ہوئی آندھی میں ایک پتہ کسی شاخ سے اُڑتا ہوا آئے اور ویران کھنڈر میں جا گرے اور تھرتھرائے ہوئے سوکھے پھولوں کی بُو فضاؤں میں تحلیل ہو کر اُداسی کا عالم اور گہرا کر جائے ـــــ اِسی طرح ساون کی شام مجھے بہت غمگین بنا دیتی ہے۔

میں ایک پہاڑی مقام پر رہتا ہوں۔ سردیوں کا موسم یہاں بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ گرمیاں زیادہ پریشان نہیں کرتیں۔ لیکن برسات کا موسم بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میں ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے اپنے کمرے میں مقیّد ہو جاتا ہوں۔ لیکن بہت تیز برسات کے بعد بہت خوشرنگ دھوپ نکل آتی ہے۔ آسمان بالکل نیلا معلوم ہوتا ہے اور راستے دُھلے دُھلے اور صاف ستھرے۔ کبھی کبھی ایسے میں میرا جی چاہتا ہے کیفے گول ایوننگ میں جا پہنچوں۔ وہاں شراب لنڈھائی جا رہی ہوگی۔ اِسٹرپ ٹیز

ہوگا۔ روشنی کے مرغولوں میں گلابی جسموں کے رقص کرتے ہوئے پیکروں سے میں بنگلہ خوبصورت دل دھڑک رہے ہوں گے۔ کیفے کے باہر رست کاریں کھڑی ہوں گی۔ خوبصورت جوانوں کے ساتھ خوبصورت ہوں گی اور پھر کسمساتی ہوئی انگڑائیاں، جیسے کسمساتے ہوئے نوٹوں ڑائیاں! غلط نہیں ہے۔ نوٹوں کی انگڑائیاں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ کی انگڑائیوں پر تو سارا عالم رقص کرتا ہے۔ کیفے کے اندر کی دُنیا، کیفے ہر کی دُنیا۔ نمدیں کا خوبصورت جسم! ماریا کی نشیلی آنکھیں! میں نے سوچا، تم چل رہا ہے۔ لوگ شراب پی کے بہک چکے ہوں گے۔ روشنیاں مدھم ہوں گی۔ انگارہ جیسی آنکھوں میں شعلے سے ناچ رہے ہوں گے۔ ہونٹوں مثالی بھی بڑھ گئی ہو گی۔ اب صرف ایک مدھم سا سُرخ بلب چُپ چاپ یہ دیکھ رہا ہو گا۔ لیکن یہاں دیکھتا کون ہے، سوچتا کون ہے۔ بوڑھے فر! شہرت کے بھوکے سیاستداں، پاگل جوگی سنیاسی، اسکول کے ٹیچر بڑے کلرک، کلرک کی بیمار بیوی، دُبلے بچے! اور کون سوچتا ہے؟ جس نک میں پانچ دس لاکھ کا بیلنس ہو، پورچ میں غیرملکی گاڑی، ایسر یشنڈ کمرے، خوبصورت عورتیں، عزت، شہرت ــــ وہ کیا سوچے؟

ریکھا نے مجھ سے محبت کی یا میں نے ریکھا سے۔ میں خود بھی نہیں جانتا۔ ہم بہت عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ میں چھٹیوں میں جاتے ان کے گھر چلا جاتا۔ پھر ہم پارک میں جاتے اور پھر یوں محسوس ہوتا ہم دوسرے کے لئے کچھ محسوس کرنے لگے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو قریب خوش ہوتے۔ جیسے یہی خوشی ہماری منزل ہو۔ لیکن یہ لمحے بہت جلد جاتے۔ میں اُسے بھول جاتا۔ وہ بھی مجھے بھول جاتی۔ ہم کافی عرصے تک دوسرے کی حالت سے ناآشنا رہتے اور جب ملتے تو کبھی یہ شکایت نہ کرتے تنے دنوں میں تم نے کیوں یاد نہ کیا؟ خط کیوں نہ لکھا؟ فون کیوں نہ کیا؟ کی کوشش کیوں نہ کی؟ بس دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش جاتے۔ ایسا معلوم ہوتا ابھی پہلی بار مل رہے ہوں۔

شام بہت طویل معلوم ہو رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ ریکھا کے ہاں جاؤں؟ میں نے سوچا اور جلدی جلدی کپڑے بدل کر تیار ہونے ۔ بڑی بہن کی سہیلیاں آئی ہوئی تھیں اور وہ میرے کمرے میں براجمان تھیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں صرف دو ہی کمرے تھے۔ ایک کچن اور ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم۔ کپڑے بدلنے کے لئے مجھے حمام کا استعمال کرنا پڑا۔ میں نے سُنا کہ لڑکیاں بہت زور زور سے باتیں کر رہی تھیں۔

"میں نے طے کر لیا ہے، میں شکیل ہی سے شادی کروں گی۔" ایک لڑکی کہہ رہی تھی۔

"کیا وہ بھی تمہیں چاہتا ہے؟" دوسری نے پوچھا۔

"نہیں ــــ!" اُس نے ایک لمبی سانس لی۔ "بس وہ میرے خیالوں کا شہزادہ ہے!" اُس نے کہا۔

"کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟" میری بہن نے پوچھا۔

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ "خوبصورتی کو کیا کرتی ہو۔ جی ــــ! اُس کا بنگلہ بہت خوبصورت ہے۔ بس جی چاہتا ہے اُڑ کر اُس خوبصورت لان میں پہنچ جاؤں اور ــــ!"

"ہائے تب تو ضرور شادی کر لے!" دوسری آواز آئی۔

میں ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک گیا۔ کیا ہر لڑکی کا خواب یہی ہوا کرتا ہے۔ وہ کسی ایسے خوبصورت خوابوں کے شہزادے کا گھر بسائے جس کا بنگلہ خوبصورت ہو اور وہاں لان ہو اور ــــ اور ــــ

"ہاں یہ زمانہ ہی ایسا ہے۔ اب کوئی لڑکی یہ نہیں چاہتی کہ وہ کسی ایسے گھر جائے جہاں بوڑھی ساس کے طعنے ہوں، نندوں کی نوک جھونک ہو، تنگ و تاریک کوٹھری میں صبح سے شام تک چولہے کے پاس بیٹھے بیٹھے کھانے پکانے اور برتن دھونے میں زندگی گزر جائے۔ شوہر کو دیوتا سمجھ کر اُس کی خدمت میں خود کو مٹا دیا جائے ــــ اب آزادی کا دور ہے۔ عورت ہر بندھن سے آزاد ہو چکی ہے!

"ٹھیک ہے۔ لیکن میرا مطلب یہ نہ تھا۔ میں تو کہہ رہا تھا کہ کیا کوئی لڑکی کسی آدمی کے دل میں جھانک کر کبھی نہیں دیکھنا چاہتی کہ وہ خوبصورت بھی ہے یا محض دولت اور ہوس کا غلام؟ کیا محبت صرف روپے پیسے کی محتاج بن گئی ہے؟'

میں اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔

باجی کا بچہ اب ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ وہ کرکٹ کھیل کر لوٹا تھا اور مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔

"بھیا ــــ!" وہ مجھے بھیا ہی کہتا تھا۔ "میں ٹیلی ویژن کے کورس کے لئے امریکہ جاؤں گا۔" اُس نے کہا۔ "اور میں ٹیلی ویژن کی فیکٹری کھولوں گا اور بھیا میں دو کاریں لوں گا اور بھیا میں بہت بڑا آدمی بنوں گا!"

کلرک کا بچہ! ٹیلی ویژن کی فیکٹری کھولے گا، امریکہ جائے گا، بڑا آدمی بنے گا!

اُس حسین شام کو میں سمندر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ موجیں
رہی تھیں۔ موجوں پر رقص کرتی ہوئی سورج کی شعاعیں تھرتھرا رہی
۔ دُور دُور تک پھیلی ہوئی سیاہ چٹانوں سے پانی ٹکرا رہا تھا۔ پہاڑ کے
سُورج کی آخری کرنوں کا جام چھلک رہا تھا۔ ریکھا کے بال یوں ہی سُنہرے تھے۔
یں ڈوبتی ہوئی سُورج کی کرنوں کی طرح! اُس کی چال میں موجوں کا یوں ہی
تھا اور آواز میں تاروں کی جھنکار، بہت میٹھی، دل کو بہت دُور تک سہا
لنے والی آواز!

"ریکھا ـــــ تم جانتی ہو تمھارا انتظار کب سے کر رہا ہوں؟"

"کب سے؟"

"یہ جو موجیں نظر آ رہی ہیں نا ـــــ یہ یہاں سے کوئی دو سَو فٹ پیچھے
ں ـــــ!" میں نے کہا۔

"تب تو تم صبح ہی سے میرا انتظار کر رہے ہوگے!"

"رات ہی سے کر رہا تھا" میں نے جواب دیا۔ "جب پچھلی شام تم جُدا
ہی تھیں"

"بکواس ہے! اِتنا انتظار کون کس کا کرتا ہے۔ میں نے تو کبھی اِتنا انتظار
ہیں کیا"

"اور کل جو بکواس پکچر تم نے مجھے دکھائی تھی۔ ساری رات سر میں درد رہا۔
ر کٹر اور پروڈیوسر دونوں کو گالیاں دینی پڑیں"

"اچھا حضور بکواس ہی سہی۔ بیٹھو اور بکواس کرو!" وہ ٹِنک کر بولی۔

"یہ ہپّی جیسا لباس کب سے پہننے لگی ہو؟"

"ہپّی جیسا ـــــ؟ کون کہتا ہے؟ ہپّی جیسے بال تو آپ نے بنوا رکھے ہیں۔
ہینوں ترشواتے نہیں۔ یہ مَیلی کُچیلی جاکٹ ـــــ یہ چُست پاجامہ ـــــ اور
نو یہ گلے میں موٹی سی مالا ـــــ!"

"مالا نہیں ریکھا کچھ ـــــ!" میں نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔
"شکر کرو کہ ہپّی بنا ہوں زِپّی نہیں بنا"

ہم بہت دیر تک سمندر کے کنارے بیٹھے ایک دوسرے کو چھیڑتے رہے۔
ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دُنیا میں صرف ہم دو ہی رہتے ہیں۔ صرف ہمارا ہی
وجود ہے۔ دوسرا کوئی نہیں۔

پھر ریکھا چلی گئی۔ میں اپنے گھر لوٹ آیا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی میں ساری
رات پڑھنا چاہتا تھا۔ میں خاموش آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید سارے
ستارے مجھی کو دیکھ رہے تھے۔ میں باہر نکل آیا۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ سامنے
قبرستان میں بڑے بڑے پُرانے برگد اور اِملی کے پیڑ سر سرا رہے تھے اور پیڑوں
کی شاخوں سے چاند اُبھر رہا تھا۔ میرے قدم قبرستان کی طرف بڑھ گئے۔ میں
اندھیرے میں آگے بڑھتا ہی رہا۔ صرف چاند کی مدھم روشنی تھی۔ قبریں خاموش
تھیں اور ہر طرف دردناک اُداسی چھائی تھی۔ ایک قبر کے کتبے پر میری آنکھیں
جم کر رہ گئیں۔ مجھے شیکسپیر کا ہیملٹ یاد آ گیا ـــــ وہ گورکن یاد آ گئے جو قبر
کھودتے کھودتے ایک کھوپڑی کو دیکھ کر قہقہہ لگاتے ہیں اور انسان کی
بے ثباتی اور اُس کی شان و شوکت کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ پھر میری آنکھیں
نم ہو گئیں۔ میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ صرف محسوس کرتا رہا۔ سوچنے اور محسوس
کرنے میں بہت فرق ہے۔ میں نے محسوس کیا، زندگی کا انجام ایک ٹھنڈی
اور گہری خاموشی ہے، ایک ابدی سکون ہے ـــــ ایک گہری نیند ہے۔
لیکن یہ سب کچھ کِتنا تڑپا دینے والا، کیسا عبرتناک، کیسا درد انگیز معلوم ہوتا ہے۔
جب محسوسات کی دُنیا سے نِکلا تو صبح جاگ رہی تھی اور میری میز پر چائے کی پیالی
سے گرم گرم نکلتی ہوئی بھاپ مجھے بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ
اُٹھ کر ہوا میں تحلیل ہو جانے والی بھاپ! جیسے محبت کا جذبہ! جیسے پپیہے کی آواز!

صبح بہت پیاری تھی۔ میں چاہتا ہوں ہر روز صبح اُٹھ کر پہلے نکلتے ہوئے
سُورج کا مُنہ دیکھوں، تب کوئی کام کروں۔ شام ہو تو کسی ندی کے کنارے
اونچی ٹیکری پر کھڑے ہو کر سوکھے ہوئے پیڑ کے نیچے، گہری اُداس آنکھوں سے
سُورج کے ڈوبنے پر چند ماتمی آنسو دل میں جذب کروں اور پھر ہر قدم پر ایک
فلسفی کی طرح سوچ میں ڈوبا بڑھتا چلا جاؤں نہ منزل معلوم، نہ مقصد!

---

ساون کی شام اپنے ساتھ گہرے غم لے آتی ہے۔ جس طرح خزاں کی دوپہر
کو تیز چلتی ہوئی آندھی میں ایک پتّہ کسی شاخ سے اُڑتا ہوا آ کے اور ویران کھنڈر
میں جا گرے اور چرمرائے ہوئے سوکھے پھولوں کی بُو فضاؤں میں تحلیل ہو کر اُداسی
کا عالم اور گہرا کر جائے ـــــ اِسی طرح ساون کی شام مجھے بہت غمگین بنا دیتی ہے۔

میں ایک پہاڑی مقام پر رہتا ہوں۔ سردیوں کا موسم یہاں بہت
خوشگوار ہوتا ہے۔ گرمیاں زیادہ پریشان نہیں کرتیں۔ لیکن برسات کا موسم
بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میں ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے
اپنے کمرے میں مقیّد ہو جاتا ہوں۔ لیکن بہت تیز برسات کے بعد بہت
خوشرنگ دھوپ نکل آتی ہے۔ آسمان بالکل نیلا معلوم ہوتا ہے اور راستے
دھلے دھلے اور صاف سُتھرے۔ کبھی کبھی ایسے میں میرا جی چاہتا ہے کیفے
گول ایوننگ میں جا پہنچوں۔ وہاں شراب لنڈھائی جا رہی ہوگی۔ اِسٹرپ ٹیز

رہا ہوگا۔ دھوئیں کے مرغولوں میں گلابی جسموں کے رقص کرتے ہوئے پیکروں سلتے میں بیکراں خوبصورت دل دھڑک رہے ہوں گے۔ کیفے کے باہر خوبصورت کاریں کھڑی ہوں گی۔ خوبصورت جوانوں کے ساتھ خوبصورت لڑکیاں ہوں گی اور پھر کسمساتی ہوئی انگڑائیاں، جیسے کسمساتے ہوئے لونڈوں کی انگڑائیاں! غلط نہیں ہے۔ لونڈوں کی انگڑائیاں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ لونڈوں کی انگڑائیوں پر تو سارا عالم رقص کرتا ہے۔ کیفے کے اندر کی دُنیا کیفے کے باہر کی دُنیا۔ زرینہ کا خوبصورت جسم! ماریا کی نشیلی آنکھیں! میں نے سوچا رقص تھم چکا ہے، لوگ شراب پی کے بہک چکے ہوں گے۔ روشنیاں مدھم پڑ گئی ہوں گی۔ انگارہ جیسی آنکھوں میں شعلے سے ناچ رہے ہوں گے۔ ہونٹوں کی بےتابی بھی بڑھ گئی ہوگی۔ اب صرف ایک مدھم سا سُرخ بلب چُپ چاپ یہ تماشہ دیکھ رہا ہوگا۔ لیکن یہاں دیکھتا کون ہے، سوچتا کون ہے۔ بُوڑھے فلاسفر، شہرت کے بھوکے سیاستداں، پاگل جوگی سنیاسی، اسکول کے ٹیچر اور گرتے پڑتے کلرک، کلرک کی بیمار بیوی، دُبلے بچے! اور کون سوچتا ہے؟ جس کے بنک میں پانچ دس لاکھ کا بیلنس ہو، پورچ میں فیئٹ کی گاڑی، ایئر کنڈیشنڈ کمرے، خوبصورت عورتیں، عزت، شہرت —— وہ کیا سوچے؟

ریکھا نے مجھ سے محبت کی یا میں نے ریکھا سے۔ میں خود بھی نہیں جانتا۔ لیکن ہم بہت عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ میں چھٹیوں میں جاتے پینے ان کے گھر چلا جاتا۔ پھر ہم پارک میں جاتے اور پھر یوں محسوس ہوتا ہم ایک دوسرے کے لئے کچھ محسوس کرنے لگے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو قریب پاکے خوش ہوتے۔ جیسے یہی خوشی ہماری منزل ہو۔ لیکن یہ لمحے بہت جلد گزر جاتے۔ میں اُسے بھول جاتا۔ وہ بھی مجھے بھول جاتی۔ ہم کافی عرصے تک ایک دوسرے کی حالت سے ناآشنا رہتے اور جب ملتے تو کبھی یہ شکایت نہ کرتے کہ اتنے دنوں میں تم نے کیوں یاد نہ کیا؟ خط کیوں نہ لکھا؟ فون کیوں نہ کیا؟ ملنے کی کوشش کیوں نہ کی؟ بس دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہو جاتے۔ ایسا معلوم ہوتا ابھی پہلی بار مل رہے ہوں۔

شام بہت طویل معلوم ہو رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کروں۔ 'ریکھا کے ہاں جاؤں؟' میں نے سوچا اور جلدی جلدی کپڑے بدل کر تیار ہونے لگا۔ بڑی بہن کی سہیلیاں آئی ہوئی تھیں اور وہ میرے کمرے میں براجمان تھیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں صرف دو ہی کمرے تھے۔ ایک کچن اور ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم۔ کپڑے بدلنے کے لئے مجھے حمام کا استعمال کرنا پڑا۔ میں نے سُنا کہ لڑکیاں بہت زور زور سے باتیں کر رہی تھیں۔

"میں نے طے کر لیا ہے، میں سنیل ہی سے شادی کروں گی۔" ایک لڑکی کہہ رہی تھی۔

"کیا وہ بھی تمھیں چاہتا ہے؟" دوسری نے پُوچھا۔

"نہیں —— !" اُس نے ایک لمبی سانس لی۔ "بس وہ میرے خیالوں کا شہزادہ ہے!" اُس نے کہا۔

"کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟" میری بہن نے پُوچھا۔

وہ کھِل کھِلا کر ہنسی۔ "خوبصورتی کو کیا کرتی ہو باجی —— ! اُس کا بنگلہ بہت خوبصورت ہے۔ بس جی چاہتا ہے اُڑ کر اُس خوبصورت لان میں پہنچ جاؤں اور —— !"

"ہائے تب تو ضرور شادی کر لے!" دوسری آواز آئی۔

میں ایک لمحے کے لئے ٹھٹک گیا۔ کیا ہر لڑکی کا خواب یہی ہوا کرتا ہے۔ وہ کسی ایسے خوبصورت خوابوں کے شہزادے کا گھر بسائے جس کا بنگلہ خوبصورت ہو اور وہاں لان ہو اور —— اور ——

'ہاں یہ زمانہ ہی ایسا ہے۔ اب کوئی لڑکی یہ نہیں چاہتی کہ وہ کسی ایسے گھر جائے جہاں بُوڑھی ساس کے طعنے ہوں، نندوں کی نوک جھونک ہو، تنگ و تاریک کوٹھری میں صبح سے شام تک چولہے کے پاس بیٹھے بیٹھے کھانے پکانے اور برتن دھونے میں زندگی گزر جائے۔ شوہر کو دیوتا سمجھ کر اُس کی خدمت میں خود کو مِٹا دیا جائے —— اب آزادی کا دَور ہے۔ عورت ہر بندھن سے آزاد ہو چکی ہے!

'ٹھیک ہے۔ لیکن میرا مطلب یہ نہ تھا۔ میں تو کہہ رہا تھا کہ کیا کوئی لڑکی کسی آدمی کے دل میں جھانک کر کبھی نہیں دیکھنا چاہتی کہ وہ خوبصورت بھی ہے یا محض دولت اور ہَوس کا غلام؟ کیا محبت صرف روپے پیسے کی محتاج بن گئی ہے؟'

میں اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔

باجی کا بچّہ اب ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ وہ کرکٹ کھیل کر لَوٹا تھا اور مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔

"بھیّا —— !" وہ مجھے بھیّا ہی کہتا تھا۔ "میں ٹیلی ویژن کے کورس کے لئے امریکہ جاؤں گا۔" اُس نے کہا۔ "اور میں ٹیلی ویژن کی فیکٹری کھولوں گا، اور بھیّا میں دو کاریں لوں گا اور بھیّا میں بہت بڑا آدمی بنوں گا!"

کلرک کا بچّہ! ٹیلی ویژن کی فیکٹری کھولے گا، امریکہ جائے گا، بڑا آدمی بنے گا!

اُس حسین شام کو بے سمندر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ موجیں رقص کر رہی تھیں۔ موجوں پر رقص کرتی ہوئی سورج کی شعاعیں تھرتھرا رہی تھیں۔ دُور دُور تک پھیلی ہوئی سیاہ چٹانوں سے پانی ٹکرا رہا تھا۔ پہاڑ کے پیچھے سورج کی آخری کرنوں کا جام چھلک رہا تھا۔ ریکھا کے بال یوں ہی سنہرے تھے۔ شام میں ڈوبتی ہوئی سورج کی کرنوں کی طرح! اُس کی چال میں موجوں کا یوں ہی خرام تھا اور آواز میں تاروں کی جھنکار، بہت میٹھی، دل کو بہت دُور دُور تک بہا لے جانے والی آواز!

"ریکھا ـــــ تم جانتی ہو تمھارا انتظار کب سے کر رہا ہوں؟"

"کب سے؟"

"یہ جو موجیں نظر آ رہی ہیں نا ـــــ یہ یہاں سے کوئی دو سَو فٹ پیچھے تھیں ـــــ!" میں نے کہا۔

"تب تو تم صبح ہی سے میرا انتظار کر رہے ہوگے!"

"رات ہی سے کر رہا تھا" میں نے جواب دیا۔ "جب پچھلی شام تم جُدا ہوئی تھیں۔"

"بکواس ہے! اِتنا انتظار کون کس کا کرتا ہے۔ میں نے تو کبھی اِتنا انتظار نہیں کیا۔"

"اور کل جو بکواس پکچر تم نے مجھے دکھائی تھی۔ ساری رات سر میں درد رہا۔ ڈائرکٹر اور پروڈیوسر دونوں کو گالیاں دینی پڑیں۔"

"اچھا حضور بکواس ہی سہی۔ بیٹھو اور بکواس کرو۔" وہ تنک کر بولی۔

"یہ ہپّی جیسا لباس کب سے پہننے لگی ہو؟"

"ہپّی جیسا ـــــ؟ کون کہتا ہے؟ ہپّی جیسے بال تو آپ نے بنوا رکھے ہیں۔ مہینوں ترشواتے نہیں۔ یہ میلی کچیلی جاکٹ ـــــ یہ چست پاجامہ ـــــ اور اُفوہ یہ گلے میں موتی سی مالا ـــــ!"

"مالا نہیں ریکھا کیمرہ ـــــ!" میں نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"شکر کرو کہ ہپّی بنا ہوں یپّی نہیں بنا۔"

ہم بہت دیر تک سمندر کے کنارے بیٹھے ایک دوسرے کو چھیڑتے رہے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دُنیا میں صرف ہم دو ہی رہتے ہیں۔ صرف ہمارا ہی وجود ہے۔ دوسرا کوئی نہیں۔

پھر ریکھا چلی گئی۔ میں اپنے گھر لوٹ آیا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی میں ساری رات پڑھنا چاہتا تھا۔ میں خاموش آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید سارے ستارے مجھی کو دیکھ رہے تھے۔ میں باہر نکل آیا۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ سامنے قبرستان میں بڑے بڑے پُرانے برگد اور املی کے پیڑ سر اٹھائے کھڑے تھے اور پیڑوں کی شاخوں سے چاند اُبھر رہا تھا۔ میرے قدم قبرستان کی طرف بڑھ گئے۔ میں اندھیرے میں آگے بڑھتا ہی رہا۔ صرف چاند کی مدھم روشنی تھی۔ قبریں خاموش تھیں اور ہر طرف دردناک اُداسی چھائی تھی۔ ایک قبر کے کتبے پر میری آنکھیں جم کر رہ گئیں۔ مجھے شیکسپیئر کا ہیملٹ یاد آگیا ـــــ وہ گورکن یاد آئے جو قبر کھودتے کھودتے ایک کھوپڑی کو دیکھ کر قہقہہ لگاتے ہیں اور انسان کی بے ثباتی اور اس کی شان و شوکت کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ پھر میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ صرف محسوس کرتا رہا۔ سوچنے اور محسوس کرنے میں بہت فرق ہے۔ میں نے محسوس کیا، زندگی کا انجام ایک شدید اور گہری خاموشی ہے، ایک ابدی سکون ہے ـــــ ایک گہری نیند ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کتنا تڑپا دینے والا، کیسا عبرتناک، کیسا درد انگیز معلوم ہوتا ہے۔

جب محسوسات کی دُنیا سے نکلا تو صبح جاگ رہی تھی اور میری میز پر چائے کی پیالی سے گرم گرم نکلتی ہوئی بھاپ مجھے بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اُٹھ کر ہوا میں تحلیل ہو جانے والی بھاپ! جیسے محبت کا جذبہ! جیسے پیار کی آواز!

صبح بہت پیاری تھی۔ میں چاہتا ہوں ہر روز صبح اُٹھ کر پہلے نکلتے ہوئے سورج کا منہ دیکھوں، تب کوئی کام کروں۔ شام ہو تو کسی ندی کے کنارے اونچی ٹیکری پر کھڑے ہو کر سوکھے ہوئے پیڑ کے پیچھے، گہری اُداس آنکھوں سے سورج کے ڈوبنے پر چند ماتمی آنسو دل میں جذب کروں اور پھر ہر قدم پر ایک فلسفی کی طرح سوچ میں ڈوبا بڑھتا چلا جاؤں نہ منزل معلوم، نہ مقصد!

---

ساون کی شام اپنے ساتھ گہرے غم لے آتی ہے۔ جس طرح خزاں کی دوپہر کو تیز چلتی ہوئی آندھی میں ایک پتّہ کسی شاخ سے اُڑتا ہوا آئے اور ویران کھنڈر میں جا گرے اور چرمرائے ہوئے سوکھے پھولوں کی بُو فضاؤں میں تحلیل ہو کر اُداسی کا عالم اور گہرا کر جائے ـــــ اِسی طرح ساون کی شام مجھے بہت غمگین بنا دیتی ہے۔

میں ایک پہاڑی مقام پر رہتا ہوں۔ سردیوں کا موسم یہاں بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ گرمیاں زیادہ پریشان نہیں کرتیں۔ لیکن برسات کا موسم بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میں ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے اپنے کمرے میں مقید ہو جاتا ہوں۔ لیکن بہت تیز برسات کے بعد بہت خوشرنگ دھوپ نکل آتی ہے۔ آسمان بالکل نیلا معلوم ہوتا ہے اور راستے دُھلے دُھلے اور صاف ستھرے۔ کبھی کبھی ایسے میں میرا جی چاہتا ہے کیفے گول اوپننگ میں جا پہنچوں۔ وہاں شراب لنڈھائی جا رہی ہوگی۔ اسٹرپ ٹیز

ہو رہا ہوگا۔ روشنیوں کے مرغولوں میں گلابی جسموں کے رقص کرتے ہوئے پیکروں کے سلسلے میں کتنے خوبصورت دل دھڑک رہے ہوں گے۔ کیفے کے باہر خوبصورت کاریں کھڑی ہوں گی۔ خوبصورت جوانوں کے ساتھ خوبصورت لڑکیاں ہوں گی اور پھر کسمساتی ہوئی انگڑائیاں جیسے کسمساتے ہوئے نوٹوں کی انگڑائیاں! غلط نہیں ہے۔ نوٹوں کی انگڑائیاں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ نوٹوں کی انگڑائیوں پر تو سارا عالم رقص کرتا ہے۔ کیفے کے اندر کی دُنیا، کیفے کے باہر کی دُنیا۔ ندرینہ کا خوبصورت جسم! ماریا کی نشیلی آنکھیں! میں نے سوچا، بارش تھم چکی ہے، لوگ شراب پی کے بہک چکے ہوں گے۔ روشنیاں مدّھم ہو گئی ہوں گی۔ انگارہ جیسی آنکھوں میں شعلے سے ناچ رہے ہوں گے۔ ہونٹوں کی بیتابی بھی بڑھ گئی ہو گی۔ اب صرف ایک مدّھم سا سُرخ بلب چُپ چاپ یہ تماشہ دیکھ رہا ہوگا۔ لیکن یہاں دیکھتا کون ہے، سوچتا کون ہے۔ بوڑھے فلاسفر، شہرت کے بھوکے سیاستداں، پاگل جوگی سنیاسی، ہائی سکول کے ٹیچر اور کُبڑے کلرک، کلرک کی بیمار بیوی، دُبلے بچے! اور کون سوچتا ہے؟ جس کے بنک میں پانچ دس لاکھ کا بیلنس ہو، پورچ میں فیئٹ کی گاڑی، ایئر کنڈیشنڈ کمرے، خوبصورت عورتیں، عزت، شہرت —— وہ کیا سوچے؟

ریکھا نے مجھ سے محبت کی یا میں نے ریکھا سے۔ میں خود بھی نہیں جانتا۔ لیکن ہم بہت عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ میں چھٹیوں میں چلتے پھرتے اُن کے گھر چلا جاتا۔ پھر ہم پارک میں جاتے اور پھر یوں محسوس ہوتا ہم ایک دوسرے کے لئے کچھ محسوس کرنے لگے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو قریب پا کے خوش ہوتے۔ جیسے یہی خوشی ہماری منزل ہو۔ لیکن یہ لمحے بہت جلد گزر جاتے۔ میں اُسے بھول جاتا۔ وہ بھی مجھے بھول جاتی۔ ہم کافی عرصے تک ایک دوسرے کی حالت سے ناآشنا رہتے اور جب ملتے تو کبھی یہ شکایت نہ کرتے کہ اتنے دنوں میں تم نے کیوں یاد نہ کیا؟ خط کیوں نہ لکھا؟ فون کیوں نہ کیا؟ ملنے کی کوشش کیوں نہ کی؟ بس دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہو جاتے۔ ایسا معلوم ہوتا ابھی پہلی بار مل رہے ہوں۔

شام بہت طویل معلوم ہو رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کروں۔ 'ریکھا کے ہاں جاؤں؟' میں نے سوچا اور جلدی جلدی کپڑے بدل کر تیار ہونے لگا۔ بڑی بہن کی سہیلیاں آئی ہوئی تھیں اور وہ میرے کمرے میں براجمان تھیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں صرف دو ہی کمرے تھے۔ ایک کچن اور ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم۔ کپڑے بدلنے کے لئے مجھے حمام کا استعمال کرنا پڑا۔ میں نے سُنا کہ لڑکیاں بہت زور زور سے باتیں کر رہی تھیں۔

"میں نے طے کر لیا ہے، میں شکیل ہی سے شادی کروں گی" ایک لڑکی کہہ رہی تھی۔

"کیا وہ بھی تمھیں چاہتا ہے؟" دوسری نے پُوچھا۔

"نہیں ——!" اُس نے ایک لمبی سانس لی "بس وہ میرے خیالوں کا شہزادہ ہے!" اُس نے کہا۔

"کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟" میری بہن نے پُوچھا۔

وہ کھِلکھلا کر ہنسی "خوبصورتی کو کیا کرتی ہو باجی ——! اُس کا بنگلہ بہت خوبصورت ہے۔ بس جی چاہتا ہے اُڑ کر اُس خوبصورت لان میں پہنچ جاؤں اور ——!"

"ہائے تب تو ضرور شادی کر لے!" دوسری آواز آئی۔

میں ایک لمحے کے لئے ٹھٹک گیا۔ کیا ہر لڑکی کا خواب یہی ہوا کرتا ہے۔ وہ کسی ایسے خوبصورت خوابوں کے شہزادے کا گھر بسائے جس کا بنگلہ خوبصورت ہو، اور وہاں لان ہو اور —— اور ——

'ہاں یہ زمانہ ہی ایسا ہے۔ اب کوئی لڑکی یہ نہیں چاہتی کہ وہ کسی ایسے گھر جائے جہاں بُوڑھی ساس کے طعنے ہوں، نندوں کی نوک جھونک ہو، تنگ و تاریک کوٹھری میں صبح سے شام تک چُولھے کے پاس بیٹھے بیٹھے کھانے پکانے اور برتن دھونے میں زندگی گزر جائے۔ شوہر کو دیوتا سمجھ کر اُس کی خدمت میں خود کو مِٹا دیا جائے —— اب آزادی کا دَور ہے۔ عورت ہر بندھن سے آزاد ہو چُکی ہے!

'ٹھیک ہے۔ لیکن میرا مطلب یہ نہ تھا۔ میں تو کہہ رہا تھا کہ کیا کوئی لڑکی کسی آدمی کے دل میں جھانک کر کبھی نہیں دیکھنا چاہتی کہ وہ خوبصورت بھی ہے یا محض دولت اور ہوس کا غلام؟ کیا محبت صرف روپے پیسے کی محتاج بن گئی ہے؟'

میں اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔

باجی کا بچّہ اب ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ وہ کرکٹ کھیل کر لَوٹا تھا اور مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔

"بھیّا ——!" وہ مجھے بھیّا ہی کہتا تھا "میں ٹیلی ویژن کے کورس کے لئے امریکہ جاؤں گا" اُس نے کہا "اور میں ٹیلی ویژن کی فیکٹری کھولوں گا، اور بھیّا میں دو کاریں لوں گا اور بھیّا میں بہت بڑا آدمی بنوں گا!"

کلرک کا بچّہ! ٹیلی ویژن کی فیکٹری کھولے گا، امریکہ جائے گا، بڑا آدمی بنے گا!

کیا ہر طرف یہی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ بڑا آدمی دولت مند ہی ہو سکتا ہے؟ جو آدمی ساری زندگی سوکھی روٹی کھا کے اپنے بچوں کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دیتا رہا وہ بڑا آدمی نہیں؟ میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ باہر سڑک پر بہت بھیڑ تھی۔ بہت سی خوبصورت لڑکیوں کا جھنڈ کا جھنڈ گزر گیا۔ مختلف کٹ کے لباس! لوگ کہتے ہیں یہ تو Sex of age ہے۔ اب تو ہندوستانی فلموں میں لوگ اور بھی جذبات انگیز مناظر دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ عریاں مناظر بھی۔ سنیما ہال میں سیٹیاں کیوں بج رہی ہیں۔ لڑکیاں کچھ سہمی سہمی سی نظر آ رہی ہیں۔ بعض نے گردن جھکائی ہے۔ خالہ جان نے تو آنکھوں پر رومال رکھ لیا ہے۔ چھوٹے بچے خاموش سہمے سہمے سے دیکھ رہے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ Moon age ہے چاند انسان کی نظروں سے چھپا نہیں رہ سکا۔ چاند کی دھرتی پر اُس کے قدم پہنچ چکے ہیں تو ایسی باتیں کیوں چھپی رہیں جو نہ راز ہیں نہ ظاہر ہیں۔ بحث کیوں؟ ہوا کو پیٹنے سے کیا حاصل؟

ریکھا بہت اچھی لڑکی ہے۔ ہر لڑکی اچھی ہوتی ہے لیکن بہت اچھی نہیں ہوتی۔ وہ بہت سیدھی سادی اور معصوم ہے۔ وہ کسی حسین لڑکی سے نہیں جلتی۔ کسی کی دولت کو دیکھ کر نہیں کڑھتی۔ اس کی آنکھوں میں کتنا پیار ہے، کتنی مٹھاس ہے۔ میں چاہتا ہوں ریکھا ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ میں اُسے اپنے پاس محسوس کر کے خوش ہو جاتا ہوں۔ لیکن کنوئیں میں جھانکنے سے پتا نہیں چلتا۔ میں نے ریکھا کو اپنے تصور میں ڈھال لیا۔ وہ کیسی ہے یہ میں درحقیقت نہیں جانتا۔ لیکن اپنے تصورات میں وہ مجھے نیک، فرمانبردار اور معصوم ہی دکھائی دیتی ہے۔ میں نے سوچا ہم ایک دوسرے کو خوش رکھنے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہیں۔ جب وہ کہتی ہے مجھے شیکسپیئر پسند نہیں تو میں کہتا ہوں مجھے بھی پسند نہیں ہے۔ اگر میں کہتا ہوں ہم آج انگریزی فلم دیکھیں گے تو وہ کہتی ہے ہاں ہم آج انگریزی فلم دیکھیں گے ـــــ جب شام کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بانس کے اونچے اونچے پیڑوں کی پتیوں سے ٹکراتی ہوئی چلتی اور گل مُہر کے سرخ پھول راستے پر دُور دُور تک بکھر جاتے اور گھنیرے پیڑوں میں کوئل درد بھری تانوں میں پکارنے لگتی اور جب جھیل کے نیلے نیلے پانی میں گلابی کنول سر جھکا کر لیٹ جاتے اور سفید بگلوں کے غول کے غول اُڑتے اُڑتے اُفق کی گہرائیوں میں گم ہو جاتے تب میرا جی چاہتا، ریکھا میرے سامنے رہے، میرے قریب رہے، میں اُسے دیکھوں اور دیکھتا رہوں اور وہ خاموش پلکیں جھکائے میرے سامنے بیٹھی رہے پھر دھیرے سے اُس کی پلکیں بوجھل ہو جائیں۔ پھر فضاؤں میں آسمانی نغمے گونجنے لگیں

پھر شہر میں آکر کشتیاں بنا کر شیں ــــــ اور پھر ریکھا کی بھینی بھینی خوشبو مہکتے ہوئے گیہوں کے کھیتوں کی طرح میرے نتھنوں میں بس جائے تب میں کچھ گنگناؤں۔ کوئی نغمہ چھیڑوں اور میرا نغمہ ساری کائنات میں گونج اٹھے۔ ریکھا مسکرا دے۔ اس کے ہونٹوں کی میٹھی مسکان سے میں نشہ میں پاگل ہو جاؤں۔ پھر چاند نکل آئے ــــــ اور میں اس کے شانوں پر سر رکھ کر سو جاؤں۔

لیکن یہ سب کچھ کیوں ہونے لگا۔ مگر مچھ کی پیٹھ پر بیٹھ کے ساحل پر پہنچنے کی کوشش کیسے کامیاب ہوگی۔

ریکھا کا باپ بڑا لالچی ہے۔ وہ کہتا ہے ریکھا کے لئے اس نے ایک جگہ بات طے کر لی ہے۔ بڑا آدمی ہے۔ پچاس ایکڑ زمین ہے۔ دو ٹرکٹر ہیں۔ چار لاریاں ہیں۔ اسٹیشن روڈ پر بڑا ہوٹل ہے اور اسمگلنگ کا بزنس ہے۔

ریکھا کی ماں اس سے بھی زیادہ لالچی ہے۔ یہ سنتے ہی اس کی رال ٹپکنے لگی۔ اس کی برسوں کی آرزو پوری ہوگئی۔ شاید جب وہ پیدا ہوئی تھی جبھی سے اس کی ماں نے ایسے بڑے آدمی کا خواب دیکھ رکھا تھا۔

ریکھا نے مجھے یہ سب باتیں بتا دیں۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ جب وہ یہ سب باتیں مجھے بتا رہی تھی، تب اس کی آنکھوں میں بہت چمک تھی۔ جب وہ کاروں کا ذکر کرتی تو اس کے چہرے پر حسرت کی ایک لکیر سی دوڑ جاتی۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ خاموشی سے یہ کہنا چاہتی ہو وہ چاہے تو اسی وقت ان سب کی حقدار بن سکتی ہے!

میں اُداس اور مایوس ہو گیا تھا۔ لیکن میں مُسکرا دیا۔ میں نے اُسے مبارکباد دی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ ریکھا نہیں میلوں دُور کھڑا ہوا کوئی دھندلا سایہ ہے۔ چھ سال کے بچے کی سلیٹ پر بنائی ہوئی لڑکی کی تصویر ہے، آسمان پر تیرتا ہوا ایک سفید بادل ہے!

اُس نے نظریں زمین میں گاڑ دیں۔ یہ میری شکست کا اعتراف تھا یا اُس کی فتح کا عجز؟ پھر میں نے دیکھا کہ راستے پر گلاب کی بے شمار پنکھڑیاں مسلی اور کچلی ہوئی پڑی ہیں۔ اُن میں سفید چنبیلی کے پھول بھی ہیں جو ریکھا کو بے حد پسند تھے۔ فضا عطر بیز ہو گئی ہے۔ ہر طرف تیز روشنی ہے اور میری آنکھوں سے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ کہیں میں طُور پر تو نہیں پہنچ گیا!

ــــــ میں نیم بے ہوش ہو گیا ہوں۔

---

کتنے دن بیت گئے۔ وقت بہتا بہتا کہاں پہنچ گیا۔ اُفق اب بھی سنہرے بادلوں سے ڈھکا ہے۔ ریکھا اپنے بنگلے کے لان میں کھڑی ہے۔ دو تین بچے اس کے آنگن میں کھیل رہے ہیں۔

"ممی ممی میں جیت گیا جیت گیا" اشوک نے ماں کے پیروں سے لپٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں ہارا نہیں ہوں" ببلو جیت بولا۔

"نہیں نہیں تم ہار گئے ہو!" ریکھا بولی۔ اُس کے ہونٹوں پر اب بھی وہی تیکھی مسکراہٹ تھی اور میں نے سوچا زندگی بھی تو یہی ہے۔ ہار اور جیت ــــــ دیکھتا ہوں پلٹ کے تو محسوس ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ زندگی میں ہار جاتے ہیں بہت سے جیت جاتے ہیں۔ بوڑھا دھنو اب بھی نالی صاف کر رہا ہے میں کھڑکی سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ ہماری موری کی نالیاں صاف کرتا ہے۔ رُکمنی اپنے شوہر کو گالیاں دے رہی ہے۔ اُس نے سارے پیسے شراب میں اُڑا دیئے تھے اور بچے کے لئے دودھ کو پیسے نہ تھے، اور اس کی ساری جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ اس کے میلے کپڑوں سے سڑی ہوئی بُو آتی تھی۔ گلیوں میں بچے گندی گالیاں بک رہے تھے۔ میں بور ہو رہا تھا۔ میں اخبار اُٹھا کر دیکھنے لگا ــــــ

شام کو احمد آباد میں مارے جانے والے لوگوں کا ماتم ہے۔ ماتم کے سلسلے میں ایک جلسہ کی رپورٹ دیکھی؟ اس کا عنوان کیا ہے؟ میں نے ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

پھر ریکھا کے چلانے کی آواز آئی "کمبخت! تم نے جینا حرام کر دیا!" ــــــ ننھے اشوک کا کان پکڑ کے اندر لے گئی اور اس کی مرمت شروع کر دی۔ اس کا شوہر کار سے آ پہنچا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک بہت خوبصورت سی لڑکی تھی۔ جو اُسی کے ساتھ کار سے اُتری۔ یہ اس کی دوسری بیوی تھی۔

اُس کا نام کیا ہوگا؟ میں دیر تک سوچتا رہا اور اپنے ہاتھ کی ریکھا دیکھ کے مُسکرا دیا۔ جن کا کوئی عنوان نہیں!!

---

قارئین کے مسلسل اصرار پر، اُن کی غلط فہمی دُور کرنے کے لیے ہم یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ادارہ 'بیسویں صدی دہلی' کا 'بیسویں صدی لاہور' سے کوئی تعلق نہیں۔ سوائے اِس کے کہ وہ ہمارے جملہ مضامین بلا حوالہ نقل کر لیتے ہیں اور ہمارے 'تیر و نشتر' اور 'صحت و زندگی' کے مضامین بھی اپنے نام سے شائع کر لیتے ہیں اور پڑھنے والوں کو مغالطہ میں رکھنے کے لئے ہمارے سرورق کا ہو بہو چربہ بھی چھاپ لیتے ہیں۔ منیجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶

# بڑھیا لذت رکھنا
## یہ رہی ایک بات

everest/900/PP/ur

## غزل

حقی حزیں، ایم۔ اے

ذوقِ طلب مرا حزیں کام عجب یہ کر گیا
اُن کا بھی سامنا ہوا آج تو میں جدھر گیا

رُخ پہ کسی کے یوں ہر اک تارِ نظر بکھر گیا
تابشِ حسن بڑھ گئی اور کوئی سنور گیا

آج بھی بہرِ عرضِ غم میری زباں کھل سکی
آج بھی آ کے وہ مرے حال سے بے خبر گیا

راہِ وفا میں جو کبھی تھا مرے ساتھ گامزن
ڈھونڈ رہا ہوں میں کہاں وہ مرا ہم سفر گیا

جیسے کہ تیری ذات سے دور کا واسطہ نہ ہو
یوں بھی کبھی کبھی ترے پاس سے میں گزر گیا

ہائے رے تیری یاد جو بن گئی جزوِ زندگی
اُف رے ترا خیال جو دل سے نہ عمر بھر گیا

تو نے یہ چوٹ کھائی کیا تجھ سے وہ کیا جدا ہوئے
تیرا تو رنگِ شاعری اور حزیں نکھر گیا

## غزل

قمر مرادآبادی

مے و جام تھے، شبِ ماہ تھی، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی یوں بھی گزری ہے زندگی تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تمہیں حدِ عشق کا پاس تھا کہ غم سے چہرہ اُداس تھا
کبھی چشمِ ناز تھی شبنمی، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بہارِ مستی و رنگ و بو، وہ نشاط و کیف کی گفتگو
وہ چمن وہ رات وہ چاندنی، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہر نظر میں عنایتیں، کبھی ہر ادا میں شرارتیں
کبھی بات بات پہ برہمی، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نظر نظر نئی داستاں، کبھی مہرباں کبھی بدگماں
کبھی دوستی کبھی دشمنی، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ دلوں میں شورشِ آرزو، وہ نظر نظر ہی میں گفتگو
وہی احتیاط کی زندگی، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ قرار و قول کی سادگی، وہ وفا کا عہد بھی سرسری
بڑے اعتماد کی دوستی، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جو ادا تھی روحِ شباب تھی، جو نظر تھی موجِ شراب تھی
وہ چمن وہ نغمہ وہ میکشی، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی سازِ دل پہ غزل کی لے، وہی صحنِ گلشن و دورِ مے
وہ قمرؔ کا نغمۂ سرمدی، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

## غز[ل]

غنی اعجاز

جنوں میں دیر سے خود کو پکارتا ہوں میں
جو گم ہے دامنِ صحرا میں وہ صدا ہوں میں

بدل گیا ہے زمانہ بدل گیا ہو[ں]
اب اپنی سمت بھی حیرت سے دیکھتا ہو[ں]

حیات ایک سزا ہے بھگت رہا ہوں میں
درِ قبول سے لوٹی ہوئی دُعا ہوں میں

جسے خود آپ ہی اپنے پہ پیار آ[...]
جفا کے دور میں وہ لغزشِ وفا ہو[ں]

جمالِ یار کی رعنائیاں زہے قسمت
نگاہِ حسن کے انداز میں کھو گیا ہوں میں

بس ایک جنبشِ لب تک جو رہ [...]
زبانِ شوق پہ وہ حرفِ مدعا ہو[ں]

اگر ہے جرم محبت تو پھر تکلف کیا
سراپا جرم ہوں تقصیر ہوں خطا ہوں [میں]

DETTOL

افسانہ

# بکھرے خواب

پروفیسر مس نگہت ریحانہ ایم۔ اے

بنگلہ نمبر ۲۔ نیر عثمانیہ مسجد۔ امراؤتی (مہاراشٹر اسٹیٹ)

محترم چچاجان! سلام بعد احترام

مدت بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوتی ہوں۔ قارئین سے اپنی طویل غیر حاضری کی معافی مانگتی ہے آپ کے توسط سے۔ یہ چند بکھرے خواب بہت مشکل سے یکجا کئے ہیں۔ جو آپ کی اور قارئین کی نذر ہیں۔ آپ نے انھیں شرفِ قبولیت بخشا تو مجھ پر کرم ہوگا ــــــ زیادہ کیا عرض کروں۔ بس آپ کی نظرِ کرم کی طلب گار ہوں۔ خدا کرے آپ اچھے ہوں۔ کبھی اس دُور اُفتادہ بھتیجی کو بھی پوچھ لیا کیجئے . . .

آپ کی بھتیجی ــــــ نگہت ریحانہ

"مجھے تنہا چھوڑے جا رہی ہو؟"

غم کی شدت سے اُس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ چہرے پر زردی سی چھا گئی۔

اُس نے اپنے ہونٹ کاٹ لئے۔

"ریشماں! تم سے جُدا ہو کر میں کیسے جی سکوں گا؟"

اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ وہ خاموش رہی۔

"کیا تم مجھے بھلا سکو گی؟"

اُس کی نرگسی آنکھوں میں آنسو کسی شریر بچّہ کی طرح مچلنے لگے۔

"میرے سوا کسی اور کی ہو سکو گی؟"

موتی جیسے چمکتے آنسو اُس کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر پھسل پڑے۔

"میرے بغیر ایک پل بھی جی سکو گی؟"

اُس کی آنکھیں بے اختیار برس پڑیں۔

"نہ جاؤ ریشماں! نہ جاؤ۔ تمھیں میرے پیار کی قسم!"

اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"اگر تم مجبور ہو تو پھر۔ تو پھر مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو!"

اُس کی ہلکی ہلکی سسکیاں فضا میں بکھرنے لگیں۔

"اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا تو آؤ۔ آؤ ریشماں! اسی خوبصورت جھیل میں جہاں ہمارے پیار کا کنول کھلا تھا، ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ساتھ ڈوب جائیں! یہ دُنیا ہمیں ایک ساتھ جینے نہیں دیتی تو کیا ہم ایک ساتھ مر تو سکتے ہیں!؟"

اور وہ نڈھال ہو کر رضا کی بانہوں میں گر پڑی۔

وقت کی رفتار تھم سی گئی۔ دلوں کی دھڑکنیں رُک سی گئیں۔ اُن کے جسم ساکت ہو گئے۔ لیکن یہ مدہوشی دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ ایک جھٹکے میں ریشماں رضا سے الگ ہو گئی۔ وقت دھیمی رفتار سے بڑھنے لگا۔ دلوں کی دھڑکنیں معمول پر آ گئیں اور وہ خوابوں کے جہاں سے حقیقت کی دُنیا میں آ گئے۔ جہاں اُنھیں ایک دوسرے سے بچھڑنا تھا۔

---

"آؤ! میری زندگی میں بکھرے اُجالوں کو گلے لگا کر اپنی تنہائی کے اندھیروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دو!"

"تنہائی کے اندھیرے یوں دُور نہیں ہوا کرتے نگہت! اُجالے اور گہرے ہو جائیں گے، تاریکیاں اور بڑھ جائیں گی۔ اِن تاریکیوں میں تم میرے ساتھ کہاں کہاں بھٹکتی پھرو گی؟ ڈوب جانے دو مجھے اِن تاریکیوں میں! اور اپنے لئے کوئی اُجالا تلاش کر لو۔ میری زندگی تو سراپا غم ہے۔ تم کہاں تک میرا ساتھ دو گی!؟"

# نام

جب کبھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں ــــــ قتیل شفائی

وہ فسانے جو مرے نام سے منسوب ہوئے
اُن فسانوں میں تری بات کبھی آجاتی ہے ــــــ قتیل شفائی

سُن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
اب ترا ہی نام لے کر کوئی غافل ہو گیا ــــــ فانی بدایونی

ہم طالبِ شہرت ہیں، ہمیں ننگ سے کیا کام؟
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا ــــــ شیفتہ

نفرت کا گماں گذرے ہے، میں رشک سے گذرا
کیوں کر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے ــــــ غالب

مُرسلہ ـ س، ع ـ اختر بمبئی

"میں اُفق کے اُس پار تک تمھارا ساتھ دے سکتی ہوں! میں اپنے حصّہ کی ساری خوشیاں تمھیں دے دوں گی اور تمھارے دُکھ کے کانٹے اپنی پلکوں سے چُن لوں گی۔ مجھے موقع تو دو۔"

"میں تمھارے پیار کا جواب پیار سے نہ دے سکوں گا تم نہیں جانتیں۔ محبت کی نہیں جاتی۔ ہو جاتی ہے۔ انسان زندگی میں صرف ایک بار کسی سے پیار کرتا ہے۔ میں نے بھی پیار کیا۔ ریشماں سے۔ میں اُسے حاصل کرنا چاہتا ہوں!"

"میں جانتی ہوں لیکن تم میرے ساتھ جو بھی سلوک کرو۔ میں تمھاری ہر بات کا جواب پیار سے دوں گی۔ تمھیں نے ابھی کہا ہے۔ محبّت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔ انسان زندگی میں صرف ایک بار کسی سے پیار کرتا ہے۔ میں نے بھی پیار کیا۔ تم سے! اور میں تمھیں پانا چاہتی ہوں!"

"مجھ سے تمھیں کچھ نہ ملے گا نگہت! جو خود تہی دست ہو وہ کسی کو کیا دے سکتا ہے۔"

"میں تم سے کچھ لینا نہیں چاہتی، تمھیں کچھ دینا چاہتی ہوں میں اپنے پیار کے پھولوں سے تمھارا دامن بھر دوں گی!!"

"تم نادان ہو! انہیں سمجھ سکتیں۔ پیار کا جواب پیار سے نہ ملے تو پیار ختم ہو جاتا ہے اور اس ایک جذبہ کی جگہ شک، رشک و حسد، ناراضگی، نفرت اور ایسے ہی ہزارہا جذبے دل میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کیے طرح پیار کا ایک سرا نفرت سے ملتا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب پیار ختم ہو جاتا ہے اور صرف نفرت ہی نفرت باقی رہ جاتی ہے ـــــ اور نگہت! اگر تمھارا پیار بھی نفرت میں بدل گیا تو خدا کی قسم! میں یہ غم نہ برداشت کر سکوں گا۔ میں مر جاؤں گا!!"

نگہت نے اپنی خوبصورت اُنگلیاں اُس کے لبوں پر رکھ دیں۔

"مرنے کی باتیں نہ کرو رضا! ابھی تو جینے کے دن ہیں۔"

"نگو! کاش تمھیں مجھ سے محبت نہ ہوتی!"

"رضا کاش تمھیں اُس سے محبت نہ ہوتی!"

"ایسا نہ کہو نگہت! اُس کا پیار ہی تو میری زندگی ہے!"

"زندگی نہ کہو! اُس پیار نے تو تمھیں موت سے قریب کر دیا!"

"نگہت! پلیز! اُسے کچھ نہ کہو۔ وہ مجبور تھی۔"

"مجبور نہیں بزدل کہو!! اور کچھ بے وفا بھی۔"

"نہیں نہیں! اِس میں اُس کا کیا قصور! تُم کیا جانو مجھ سے جُدا ہوتے وقت اُس کی کیا حالت تھی۔"

"اور تم کیا جانو۔ تمھارے اِنکار سے مجھ پر کیا بیتے گی!"

"کیسا اِنکار؟"

"اِتنی جلد بھول گئے۔ ہمارے بزرگوں نے ہمیں ایک دوسرے سے منسوب کر دیا ہے۔ اُس کا احترام...!!"

"احترام! اونہہ! اِس سے پہلے بھی اُنھوں نے ریشماں سے میرا رشتہ طے کیا تھا۔ کیا اُنھوں نے اُس کا احترام کیا تھا؟ میں پُوچھتا ہوں۔ اُس کے والدین اُسے اپنے ساتھ کیوں لے گئے؟ میرے والدین نے اُسے کیوں نہ روک لیا؟ اور.. اور اب تو میں کہتا ہوں۔ اگر ریشماں سے رشتہ ٹوٹ سکتا ہے تو سب رشتے توڑے جا سکتے ہیں۔ مجھے کسی کی پروا نہیں!"

"میری بھی نہیں؟ بڑے بے رحم ہو!"

"اُف خدایا! میں کیا کروں؟"

رضا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"رشتہ بھلے ہی توڑ دو لیکن رضا! کسی کا پیار بھرا دل نہیں توڑ سکتے۔"

اور یہ جملہ رضا کے ذہن میں چُبھ گیا۔ تھک ہار کر اُس نے اپنے آپ کو ماضی کے تصوّرات میں گُم کر دیا۔

---

"تم! تمھیں یہاں نہ آنا چاہئے تھا!" ریشماں پریشان ہو گئی۔

"میں سمجھا تھا مجھے دیکھ کر تم خوشی سے پھولی نہ سماؤ گی۔ لیکن تم تو مجھے دیکھ کر ایسے پریشان ہو گئیں جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ لیا ہو!"

"رضا! میرے تو خواب بھی میرے اپنے بس میں نہیں۔ نہ مجھے اپنی خوشی پر اختیار ہے نہ اپنے غموں پر قابو!"

"خوشیاں نہ سہی اپنے غم تو مجھے دے سکتی ہو؟"

"رضا! خدارا! اپنے زخموں کو یوں نہ کریدو!!"

"زخموں کی یہ خلش ہی تو اب زندگی بن گئی ہے ریشماں! ورنہ تمھارے بغیر اب اس دنیا میں رکھا ہی کیا ہے۔"

"رضا! مجھے بھول نہیں سکتے؟"

"اپنے بس میں ہوتا تو ضرور بھول جاتا!"

"میری ایک بات مانو گے؟"

"کیوں نہیں۔ تمھارے لئے میں کیا نہیں کر سکتا!"

"تم واپس چلے جاؤ!"

"یونہی واپس چلا جاؤں؟ نہیں! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ یا تو تمھیں ساتھ لے جاؤں گا۔ یا پھر خود بھی یہیں رہ جاؤں گا!"

"تم نے بہت دیر کر دی رضا! شادی طے ہو چکی۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"تم چاہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

"بات بہت آگے بڑھ چکی ہے۔"

"بات تو اس وقت بھی بڑھی تھی جب ہمارا رشتہ طے ہوا تھا۔ لیکن اس بات کو کتنی بے دردی سے ختم کر دیا گیا۔ اب یہ رشتہ بھی توڑا جا سکتا ہے۔"

"انہونی باتیں نہ سوچو یہ تمھارا دل توڑ دیں گی۔ کیوں اپنی زندگی کو طوفان کے حوالے کر رہے ہو۔ تم تنہا اس کا مقابلہ نہ کر سکو گے!!"

اور یہی ہوا۔ حالات کے طوفان میں رضا تنکے کی طرح بہہ گیا۔ کچھ نہ ہو سکا اور آخر کار ناکام و نامراد اسے ہندوستان واپس آنا پڑا۔

---

"آؤ! میری زلفوں کے سائے میں دم بھر آرام کر لو!"

"دم بھر نہیں نکہت! ہمیشہ کے لئے کہو! حوادث کے تپتے صحراؤں میں تنہا چلتے چلتے میں بری طرح تھک گیا ہوں۔ اپنے پیار کی ٹھنڈی چھاؤں میں مجھے سُلا دو۔ ابدی نیند!"

نکہت نے اس کے لبوں پر اپنا نرم و نازک ہاتھ رکھ دیا۔

"پھر مرنے کی باتیں کرنے لگے! یہ تو جینے کے دن ہیں۔"

# چاند

بادل کا آنچل لے کے راتوں کو مسکاتے چاند
صبح کو بن کر روپ تمہارا دھرتی پر آ جاتے چاند ——— یک

اُن کے رنگیں رخساروں پہ زلفوں کا عالم کیا خوب
چاند کے ماتھے پہ یہ جھومر کتنے اچھے لگتے ہیں! ——— نصیر غازی پوری

دل میں کھیتی تھیں بہت چاہ کی کرنیں لیکن
چاند کے قرب کی خواہش کبھی ایسی تو نہ تھی ——— عندلیب شادانی

چاند تاروں سے بھری یوں ہی تری مانگ رہے
تیرے دامن میں چمکتے رہیں الماس کے پھول ——— قمر

آج اس میں ہے ترے چاند سے مکھڑے کی جھلک
ورنہ ہونے کو تو ہر روز سحر ہوتی ہے ——— عشرت

مرسلہ:- سی، ایم۔ باسط۔ نیپو علی نگر

"کاش مجھے اس سے محبت نہ ہوتی!"

"کاش وہ اتنی مجبور نہ ہوتی!"

رضا نے سر اُٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس کا دل چاہا بے اختیار اس معصوم دیوی کے قدموں میں سر جھکا دے۔

اسی وقت نکہت نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اس کی پلکوں کو بند کر دیا۔ بس اس کی آواز تھی جو رضا کے کانوں میں امرت ٹپکا رہی تھی۔

"دکھ کے کانٹوں کے درمیان خوشی کے پھول بھی تو تمھارے دامن میں ہیں۔ انھیں اپنے وجود میں سمالو۔ شاید اس طرح کانٹوں کی چبھن کم ہو جائے۔"

اور رضا نے اس کی پھول سی ہتھیلیوں پر اپنے رخسار رکھ دئے اور دھیرے دھیرے اس کی بے قراریوں کو قرار آ گیا۔

---

"تم! تم اب یہاں کیوں آئی ہو؟"

"تم سے کچھ پانے کے لئے۔ تمھیں سب کچھ دینے کے لئے!"

"تم نے بہت دیر کر دی ریشماں! اب تمھیں دینے کے لئے میرے پاس کچھ نہ رہا۔"

"جانتی ہوں رضا! تمھاری شادی نکہت سے طے ہو چکی ہے۔ نکہت اچھی ہے

تمھیں نئی زندگی دی ہے۔ وہ مقدس ہستی تو پوجنے کے قابل ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ اُس مقدس ہستی کے حضور سر جھک ہی جاتا ہے۔"

"ہاں رضا! میں بھی اُس دیوی کے آگے سر جھکاؤں گی اور جس طرح دیوی دیوتاؤں کی پوجا کر کے اُن سے کچھ مانگا جاتا ہے۔ میں بھی اُس کے قدموں میں جھک کر اپنی خوشیوں کی بھیک مانگوں گی۔ میں تمھیں اُس سے مانگ لوں گی!"

"نہیں! یہ نہیں ہو سکتا!"

"ایسا نہ کہو رضا! میں بہت دُور سے چل کر تمھارے پاس آئی ہوں۔"

"میں بھی بہت دُور سے چل کر تمھارے پاس آیا تھا اور ——!!"

"طنز نہ کرو رضا! میری حالت دیکھو! وہ ریشماں جسے کبھی تم قلوپطرہ کہا کرتے تھے۔ اُس نے اپنے حُسن کو تمھارے پیار کی آگ میں ایسا جلا دیا کہ کچھ باقی نہ رہا۔ تمھارے ہندوستان واپس آنے کے بعد میری حالت گرتی ہی گئی۔ امّی سے دیکھا نہ گیا اُنھوں نے ڈیڈی سے بات کی۔ وہ تو مجھے شوٹ کر دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ بہت مشکل سے راضی ہوئے اور مجھے امّی کے ساتھ یہاں بھیج دیا۔ اب ہمارے درمیان کوئی دیوار نہیں۔ ہم ہمیشہ کے لئے ایک ہو سکتے ہیں!"

"ریشماں! انہونی باتیں نہ سوچو۔ تمھارا دل ٹوٹ جائے گا۔ میں اب اتنی دُور جا چکا ہوں کہ وہاں سے واپس آنا میرے لئے ناممکن ہے!"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں ریشماں! جس دیوی کے قدموں پر تم جھکنے کو تیار ہو۔ اُس سے مجھے محبت نہ سہی لیکن اتنی عقیدت ہو گئی ہے کہ میں اُس سے مُنہ نہیں موڑ سکتا۔ اُس نے مجھے نئی زندگی دی۔ پھر میں کیسے اُس کی زندگی اُس سے چھین لوں۔ اُس نے مجھے سہارا دیا۔ میں کیسے اُسے بے سہارا کر دوں۔ یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو!"

"رضا! پلیز!"

"نہیں ریشماں! نہیں! لوٹ جاؤ اپنی دُنیا میں۔ اپنے والدین کی مرضی کے آگے سر جھکا دو۔ اُس کیپٹن سے شادی کر لو جو بقول تمھارے ڈیڈی اِسی دُنیا میں تمھارے لئے ایک جنّت تیار کر رہا ہے۔ اپنی اُس جنّت کو سنوار کر رشکِ فردوس بنا دو میں بھی تمھیں اپنی فردوسِ گمشدہ سمجھ کر صبر کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"اُف!" ریشماں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور پھر شاخ سے ٹوٹے ہوئے پھول کی طرح صوفے پر گر گئی!!

---

"اُف! یہ کیا ہو گیا! نہیں! نہیں! میں تمھیں مرنے نہیں دوں گا۔ میں خدا سے تمھیں مانگ لوں گا!"

رضا نے دونوں ہاتھوں میں اُس کا چہرہ لے لیا اور پھر اُس کی آنکھوں کے آنسو اُس کی نرگسی آنکھوں کی جھیلوں میں ڈوب گئے۔

"موت میرا مقدر بن چکی ہے۔ اب دُنیا کی کوئی طاقت مجھے بچا نہیں سکتی۔ کئی بار سوچا خودکشی کر لوں اور آپ کے راستے سے ہٹ جاؤں، لیکن میں حرام موت مرنا نہیں چاہتی تھی۔ خدا کا ہزار شکر ہے کہ اُس نے موت کو فرشتۂ رحمت بنا کر بھیج دیا۔ آج معلوم ہوا موت اتنی خوبصورت بھی ہو سکتی ہے!"

"کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔ مرنے کا ذکر نہ کرو۔ یہ تو جینے کے دن ہیں۔ تمھیں نے تو مجھے یہ سبق سکھایا تھا۔ اب تمھیں مجھ سے منہ موڑ لینا چاہتی ہو۔ ابھی تو ہماری شادی ہونی باقی ہے۔ آج سے پورے چار دن بعد تمھارے در پر میری بارات آئے گی۔ تم دلہن بنو گی اور میں تمھیں رخصت کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"اپنا دل چھوٹا نہ کرو۔ تم دُولہا بنو گے۔ بارات بھی بہت دھوم سے نکلے گی۔ کیا ہو گا اگر وہ میرے در پر نہ آ کر اُس کے در پر چلی جائے۔ میں تو صرف تمھاری خوشی کے لئے زندہ رہی اور اب صرف تمھاری خوشی کے لئے مر رہی ہوں۔ میرا غم نہ کرنا ——— ایک وعدہ کر دو گے؟"

"میں کوئی وعدہ نہ کروں گا۔ بس تم جلد اچھی ہو جاؤ۔ پھر میں تمھیں اپنا لوں گا!"

"وقت بہت کم ہے۔" اُس نے رُک رُک کر کہا۔

"پلیز رضا! کہیں ایسا نہ ہو دل کی دل ہی میں رہ جائے۔ مرنے والے کی آخری خواہش کو ٹھکرایا نہیں کرتے۔"

نگہت نے اپنا کمزور ہاتھ آگے بڑھایا اور رضا نے اُسے تھام لیا۔ اُس کے ہونٹ کانپے۔

"ہاں! کہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ جو کہو گی، وہی کروں گا!"

"میری موت کا غم زیادہ عرصہ نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو وقت نکل جائے۔ تمھیں میری قسم میرے مرتے ہی ریشماں سے شادی کر لینا۔ بس یہی میری آخری آرزو ہے۔ اب میں سکون سے مر سکوں گی۔"

اور پھر نگہت پُرسکون ہو گئی۔ ابدی نیند سو گئی اور پھر ——— وہی ہوا جو رضا کا مقدر تھا۔ محرومی ——— اندھیرے ——— آنسو ——— سسکیاں۔۔۔!!

---

"ریشماں!"

"تم؟ تم کب آئے؟"

"بس ابھی ابھی خالہ جان کو سلام کر کے ادھر ہی آ رہا ہوں۔ تم نے نگہت کے بارے میں سُنا ہو گا؟"

"ہاں تمھارا تار مل گیا تھا۔ اِسی لئے تمھیں کچھ نہ لکھ سکی۔"

"اب کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اب تو ساری زندگی پڑی ہے باتیں کرنے کے لئے۔ قدرت نے ہمیں پھر مِلا دیا۔"

"ہاں رضا! قدرت نے ہمیں پھر مِلا دیا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑنے کو!"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟ ارے پگلی! اب تو ملن کی گھڑی آئی ہے اور تم بچھڑنے کی باتیں کرنے لگیں۔"

"کیا بغیر پھیرے بتلائے تم سمجھ نہیں سکتے۔ دیکھو رضا! اِن ہاتھوں میں رچی مہندی کو میں نے اپنے دل و جگر کے خون کی سُرخی دے دی۔ مانگ میں جگمگاتی افشاں کو اپنے آنسوؤں کی چمک دے دی۔ زندگی کے تمام اندھیروں کو ایک لڑی میں پرو کر سہاگ کی یہ نشانی بنا لی جو ہر دم میرے گلے میں کالی ناگن کی طرح لپٹی رہتی ہے۔ تمھاری خواہش کے مطابق میں نے کیپٹن حامد کی تیار کردہ جنت کو سنوار کر رشکِ فردوس بنا دیا۔ نگہت کے انتقال کے باعث تمھیں اپنی اِس موت کی اطلاع نہ دے سکی۔ شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ اُسے ملتوی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نگہت خوش قسمت تھی۔ اُس کے جنازے کو تمھارا کاندھا تو مِلا۔ ہم تو وہ بدنصیب ہیں جو اپنی لاش خود اپنے ہی کاندھے پر اُٹھائے زندگی کا سفر طے کر رہے ہیں!!"

"بس کرو ریشماں! ورنہ میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی!!"

"تمھارے ہاتھ میں یہ کیا ہے؟" ریشماں نے اپنے آنسوؤں کو پیتے ہوئے کہا۔

"یہ اندر رانہ محبت سمجھ کے لایا تھا۔ اب اِسے اپنی شادی کا تحفہ سمجھ لو۔ محبت کی نشانی ہے۔ اِسے سنبھال کر رکھنا!"

اور رضا نے رنگین کاغذ میں لپٹا تاج محل نکالا اور ریشماں کی طرف بڑھا دیا۔ ریشماں کا چہرہ بھی سنگِ مرمر کے تاج ہی کی طرح سفید نظر آ رہا تھا۔ رضا کی نظریں اُس کے چہرے سے ہٹ نہ سکیں۔ ریشماں نے ہاتھ بڑھا دئے۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور پھر نہ جانے کیا ہوا۔ تاج زمین پر گر پڑا۔ محبت کی آخری نشانی ٹوٹ گئی۔ رضا کے ٹوٹے دل کی طرح! ریشماں کے نازک جذبات کی طرح! اُن دونوں کی پھوٹی قسمت کی طرح! اگلے ہی لمحے دونوں جھکے ٹوٹے ہوئے تاج محل کے ٹکڑوں کو سمیٹ رہے تھے!!

---

سر میں درد چاہے جس وجہ سے ہو
ایک ہی
سیریڈون سے
غائب!
ایک ہی سیریڈون سے درد جلد دُور ہوجاتا ہے۔ اسکے علاوہ سیریڈون میں موجود خاص اجزاء کی بدولت نہ صرف سر کے درد، بدن کے درد یا دانت کے درد سے پیدا ہونے والا تناؤ ہی دُور ہوجاتا ہے بلکہ آپ میں ایک نئی چستی اور پھرتی بھی آجاتی ہے۔ یہی تو ہے سیریڈون کی خاصیت!
سیریڈون
روش
ناک بند ہونے اور سخت سردی زکام کی وجہ سے
سر میں درد
زیادہ کام کرنے یا عام تکان کی وجہ سے
سر میں درد
شور و غل کی وجہ سے
سر میں درد
شدید دھوپ اور گرمی کی وجہ سے
سر میں درد
آنکھوں پر بار پڑنے اور زیادہ پڑھنے لکھنے کی وجہ سے
سر میں درد
الجھن اور فکر کی وجہ سے
سر میں درد
روش، کی تیار کردہ

## عابد مناوری

وہ جو زحمت اُٹھائیں آنے کی
جاگے قسمت غریب خانے کی

گلستاں سے دُھواں سا اُٹھا ہے
مانگئے خیر آشیانے کی

بڑھ گئی اور بے قراریِ دل
جب خبر آئی اُن کے آنے کی

اُن کے وعدے پہ ہے یقین ہمیں
جن کو عادت ہے بھول جانے کی

حال اپنا جو کہنے بیٹھے ہم
کہہ گئے داستاں زمانے کی

بات کرتا ہے تُو بھی اے ناصح!
کس زمانے میں کس زمانے کی

عابدؔ اشعار کہنے سے پہلے
نبض پہچانئے زمانے کی

## پیام سعیدی

ظلمتِ مرگ کہیں سایۂ گیسو تو نہیں
تیرگیٔ گورکبھی ظالم ترا پہلو تو نہیں

درد کی جھیل میں بیتاب ہے اِک نیل کنول
وہ تری آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو تو نہیں

ٹمٹما سا دیا عکدۂ دِل میں جو ہے
سوچتا ہوں کہیں احساس کا جگنو تو نہیں

کوئی سایہ سا تعاقب میں ہے میرے کب سے
یادِ ماضی یہ بتا دے وہ کہیں تُو تو نہیں

ہر اِشارے پہ کھنچا جاتا ہوں زِنداں کی طرف
خمِ زنجیر کسی شوخ کا ابرو تو نہیں

چھیڑ جاتا ہے ہر اک موڑ پہ کوئی مجھ کو
تیری زُلفوں کی بھٹکتی ہوئی خوشبو تو نہیں

کتنے اشکوں کے چراغ آج ہیں پلکوں پہ پیامؔ
دیکھئے جشن کہیں آج لبِ جو تو نہیں

## واحد پریمی

اپنا گھر ہے کہ ایک دشت یاس
زندگی ہے کہ "رام کا بن باس"

راکھ کا ڈھیر بن گیا ہوں میں
جب بھی جاگا ہے شعلۂ احساس

کوئی ہلچل نہ زیست کے آثار
کس قدر شہرِ آرزو ہے اُداس

اپنے عالم میں ہم مقید ہیں
خستہ دل، خستہ حال، خستہ لباس

تلخیوں سے بھرا ہے جامِ حیات
کام آئی نہ اُن لبوں کی مٹھاس

دربدر ہم بھٹکتے پھرتے ہیں
عصرِ حاضر ہے کتنا قدر شناس

مے تو پھر مے ہے بارہا واحدؔ
زہر سے بھی بجھی نہ اپنی پیاس

LIFEBUOY
for health
LIFEBUOY
لائف بوائے
ہے جہاں
تندرستی
ہے وہاں
لائف بوائے صابن کے غسل سے بڑھ کر فرحت بخش اور
کوئی چیز نہیں۔ آپکو تازگی اور تندرستی عطا کرنے والی
ایسی اور کوئی چیز نہیں۔ دراصل، لائف بوائے
جیسا اور کوئی صابن نہیں ہونکہ...
لائف بوائے
میل میں چھپے
جراثیم کو دھو ڈالتا ہے
ہندوستان لیور کی ایک اعلیٰ پیشکش

طنزیہ

# جدیدیوں کی ایک غالب خور نظم

پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی ایم۔ اے

۱۷۰۵۔ پہاڑی بھوجلا دلی

ڈیر مُو ستر گرامی!

یار پرسوں بیسویں صدی کے امیرالمومنین یعنی تمہارے دفتر کے حضرت شُہا یعنی جناب صدیقی ملے تھے اور بتا رہے تھے کہ اب تم صحتیاب ہو کے پر بھی اچھے ہونے کا نام نہیں لے رہے ہو اور دفتر آنے میں بخل اور کسل محسوس کرتے ہو۔ مقصد یہ کہ کبھی آتے ہو کبھی نہیں۔ اِن حالات میں کون احمق ہے جو تمہاری خیریت پوچھنے تمہارے دفتر جائے اور اپنا کرایہ اور وقت دونوں ضائع کرے ؎

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں سبک سر ہو کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

اچھا یہ بتاؤ تمہیں شُہا بھوپالی بھی یاد ہیں؟ ہے ہے کیا آدھا قد پایا تھا مرحوم نے! رکشہ صدیقی کو کبھی اگر کالو نود و شُہا سے کم ہاتھ دیکھیں۔ اماں! میں نے تمام ناٹے قد والوں کو بلا کا ذہین پایا ہے۔ خود اپنے دفتر میں انہیں صدیقی صاحب کو دیکھو لو۔ کبھی کیا میتو ماؤں، میتو ماؤں (آہستہ آہستہ) چلکر دنیا کے سارے کام ایک جھپکتے انجام دیتے ہیں اور پھر آدھے جسم پر پورا کھوپڑا بھی ہمارے تمہارے کھوپڑے کی طرح خالی نہیں۔ اچھا خاصہ بھاری بھرکم کہ اگر کسی پورے قد والے کو ملجاتے تو نہ جانے دنیا پر کیا قیامت ڈھائے۔ تم یہ بُرا کر رہے ہو کہ اچھے ہونے کے بعد بھی شتر غمزے کرتے ہو۔ مصیبت یہ آن پڑی ہے کہ مجھے مرنے کی جلدی ہو رہی ہے اور صرف اِس کا انتظار ہے کہ تم پھر تُو چلنے پھرنے لگو تو مروں اور صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ ؏

مرے ماتم میں کس کس نے ہیں پہنے پیرہن کالے

پرسوں دمہ کا ایسا دورہ پڑا تھا کہ اگر تم سا غیرت دار ہوتا تو کب کا مرحوم ہو چکا ہوتا۔ حالت یہ تھی کہ پُورا جسم دورہ کی شدت سے "ہیروشیما" بنے جا رہا تھا وہ تو کہئے آکسیجن نے بچا لیا ورنہ آج مرے ہوئے حساب سے دو روز سے زیادہ ہو چکتے اور تم میرے چالیسویں میں شرکت کے لئے اپنے سیاہ نئے سوٹ کی ناپ دینے میں مصروف ہوتے۔ یہ جواب اتنی زیادہ مرنے جینے کی باتیں کرنے لگا ہوں۔ اُس کی ایک وجہ بتا دوں کہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۶ء سے اب تک مُردہ چلا آ رہا ہوں۔ ہر سال جب مارچ کا مہینہ آتا ہے تو اپنی موت کو یاد کرتا ہوں۔ یقین مانو یہ جو سب کچھ دوسرے رسائل اور بیسویں صدی کے لئے لکھتا پڑھتا ہوں بہت بڑا فراڈ ہے۔ یہ دراصل اُس وقت لکھتا ہوں جب اچھی طرح میک اپ کر لیتا ہوں اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھ لیتا ہوں کہ کوئی مجھے پہچان تو نہیں رہا ہے۔ یہ سارے قہقہے جو تمہیں کاغذ پر نظر آتے ہیں درحقیقت میری چیخیں ہیں۔ اِس لئے ؎

روتے روتے مرے ہنسنے پہ تعجب نہ کرو ہے وہی ذکر مگر دوسرے انداز میں ہے

یہ واقعہ تمہیں اِس لئے بتا رہا ہوں کہ اب کسی وقت بھی اخبارات کے غموں کے کالم میں سیاہ جدول میں تمہیں نظر آ سکتا ہوں۔

یہ حادثہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے اِس درجہ اندوہناک تھا کہ اُس کی شدت انسان کو مارنے سے بڑھ کر مزاح نگار بنا سکتی تھی
میری مزاح نگاری مُسلسل موت کا دوسرا نام ہے۔ —— اچھا چھوڑو اِس موضوع کو۔ زندگی کی نس بندی پر نہیں مرنا۔
اب یہ بتاؤ کہ اپریل میں ہمارے دوست جناب آنند نرائن ملّا ورا اُردو کے دوسرے سرپھرے جو دلّی میں اُردو کنونشن
کرنے جا رہے ہیں۔ اُس میں شریک ہو رہے ہو یا نہیں؟ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں یہ کانفرنس بھی گونگوں اور بہروں
کی ویسی ہی کانفرنس نہ ثابت ہو جیسی کہ بمبئی میں اُردو اور دوسری زبانوں کے دانشور منعقد کر چکے ہیں۔ اس وقت کر
کھل کر بات کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اب ملک کی تقریباً تمام سیاسی جماعتیں اپنے اصلی رُوپ میں نظر آ رہی ہیں اور
آپ نے اِس کا بھی بخوبی اندازہ کر لیا ہوگا کہ اُردو کے معاملہ میں سب کی سب ایک ہی جنس سے متعلق ہیں ؎

جو دم برداشتم مادہ برآمد

مجھے تو یو۔پی کے اِس سیاسی بہروپئے سی۔بی گپتا پر آتی ہے۔ اب جب وزارت سے بے یک بینی و دو گوش نکالا گیا
ہے تو اُردو اُردو چلّا رہا ہے۔ کوئی اِس سے پوچھے کہ تیرا مُنہ ہے یا کموڈ؟ جب تک وزیر اعلے بنا رہا اُس وقت تک اُردو کا
بدترین دشمن رہا اور اب جو نکالا گیا تو اُردو کو اُس کا جائز حق دلانے چلا ہے ؏

چہ دلاور است وزدے کہ بکف چراغ دارد!

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کی ہر پارٹی خواہ وہ سیاسی فرشتوں ہی کی بنائی ہوئی کیوں نہ ہو بہت
بڑا فریب ثابت ہو چکی۔ تمام پارٹیوں کا مقصد صرف بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے اور جنتا کے خون میں لُقمہ ڈبو کر کھانے کے سوا
اور کچھ نہیں۔ اِن سب کا مذہب اور سیاسی نمبر ایک ہی ہے۔ اِس وقت تو اُردو داں طبقہ کو صرف لین دین کی بات کرنا ہے۔ ۱۹۷۲ء
کے جنرل الکشن میں اب صرف دو ہی سال باقی ہیں۔ بلکہ اِس وقت کئی صوبے اندر ہی اندر جس سیاسی بدہضمی کا شکار ہیں۔
اُس کے پیش نظر ممکن ہے یہ بدہضمی وبائی شکل اختیار کر لے اور یہ چھوٹی آنتیں بڑی آنت پہ مُنہ ملنا شروع کر دیں اور مرکز
سے ۱۹۷۲ء سے پہلے ہی لیسین شریف کی آواز آنا شروع ہو جائے۔ اِن حالات میں اُردو داں طبقہ صرف اُس جماعت
کو ووٹ دے جو کُھل کر اُردو کی حمایت کرے اور اعلان کرے کہ ہم ہندی کو ملک کی سرکاری زبان اور اُردو کو بہار، یو۔پی
آندھرا اور دلّی وغیرہ کی ثانوی زبان تسلیم کرتے ہیں۔ زبانی وعدوں کا وقت گیا۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس آنجہانی کے وعدے آزادی
کے بعد دیکھ لئے۔ کتنے سیاسی مُنہ جو آزادی سے پہلے ہائے اُردو وا اور وائے اُردو کے نعرے لگاتے رہتے تھے۔ لسانی تعصب
کے لقوے کا شکار ہو گئے۔ بڑے بڑے سُورما جو کل تک مہاتما جی کے بھگت بنے قدم قدم پر رام اور رحمان کے نعرے
بلند کر رہے تھے، ہندی ہند و ہندوستان کے فرش پر لوٹن کبوتر بنے ہوتے ہیں۔ ملک کے گوشے گوشے میں جدھر دیکھئے
آپ کو علی بابا اور چالیس چوروں کی جماعتیں نظر آئیں گی۔ ان حالات میں اندرا تو اندرا اگر مہاتما جی بھی زندہ ہو جائیں تو اُن کی
بات بھی کوئی سُننے کو تیار نہ ہوگا۔ اب تو آپ کا نعرہ صرف یہ ہونا چاہیئے کہ اُردو کو اُس کا جائز حق دو اور ووٹ لو!
مجالس قانون ساز کی ممبری اب ایک بزنس بنکر رہ گئی ہے۔ دس لگاؤ بیس پاؤ! اِن حالات میں صرف سوٹے بازی
ہی کے سہارے آپ اپنی زبان اور اپنے کلچر کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔ جو کچھ کرنا ہے وہ جلد کیجئے۔ کیونکہ آنند نرائن مُلّا۔
خوشتر گرامی، پنڈت سُندر لال۔ شیو پرشاد سنہا، کنور مہندر سنگھ بیدی، اور مالک رام جیسے لوگ اب کبھی نہ پیدا
ہوں گے۔ یہ لوگ اب کیو میں کھڑے بس کے انتظار میں ہیں۔ نہ جانے کس وقت ؏

چل چل چنبیلی باغ میں

کہتے ہوئے داخلِ حسنات ہو جائیں —— اور ہاں! ایک مراد آباد میں مُردہ زندہ ہونے والی خبر بھی سنتے چلو۔

غالب طلب ہوگئے داغ دہلوی۔ ابھی ابھی ایک صاحب بتا رہے تھے کہ حضرت بریلوی صاحب جنکی ساری زندگی اُردو شاعری کرتے گذری اور جو اب اُردو کے صفِ اول کے شعراء میں شمار ہوتے ہیں اور اُردو کی حمایت کے معاملہ میں لوگ ابتک جن کے نام کی قسمیں تک کھا سکتے تھے۔ شاید وہ بیچارے اب دوسرے عالم میں آگئے ہیں۔ پیری اور ضعیفی ابتک انسان کی ساخت اور شکل و صورت بدل دیتی تھی لیکن ان کے بارے میں یہ ایک عجیب بات سننے میں آئی ہے کہ بڑھاپے نے اُن بیچارے کی ذہنیت کو بریلی کا سُرمہ بنا کر رکھ دیا ہے اور اب جو لوگ اُن سے ملکر واپس آتے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ رُوح کو قالب بدلتے تو سُنا تھا لیکن قالب کو رُوح بدلتے اس سیکولر دور ہی میں دیکھا گیا ہے۔ انہوں نے اُردو کی مخالفت میں ایک کتاب شائع کی ہے۔ جس میں اُردو زبان کو مسلمان قوم کی ایک سازش قرار دیا ہے اور اس کے وجود سے انکار کرتے ہوئے اپنی قوم کو جگایا ہے کہ وہ اُردو والوں سے ہوشیار رہیں۔ میں نے وہ کتاب نہیں دیکھی ہے۔ اِس لئے مجھے یقین نہیں آتا۔ یقین مانو جس وقت سے اُن کے بارے میں یہ بات سُنی ہے اِس کا اندازہ ہوا کہ خدا کا قہر بھی کیسی کیسی شکل میں نازل ہو سکتا ہے۔ اب جس وقت میں اُن کا تصور کرتا ہوں تو یہ سوچکر کانپ جاتا ہوں کہ جب موت سُنکر میرا یہ حال ہے تو اُن کے گھر والوں کا نہیں دیکھکر کیا حال ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں صحت کلی عطا فرمائے اور اُن کے پس ماندگان پر رحم فرمائے۔ مگر میں تو یہ دعا کروں گا کہ خدا کرے یہ خبر غلط ہو! ـــــ اِس وقت رات کے دو بجے ہیں۔ نیند کا کوسوں پتہ نہیں۔ جزبیں مار کر تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اِس کانفرنس میں تمہاری شرکت بہت ضروری ہے۔ غالباً اپریل کے دوسرے تیسرے ہفتہ میں ہوگی۔ اور ہاں "قدیمے" اور "غالب خستہ کے بغیر" کے عُنوان سے میری جو کتابیں زیرِ طبع تھیں چھپ گئی ہیں۔ اول الذکر کو پڑھ کر جدیدیوں کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ اور آخرالذکر کو پڑھ کر غالب صدی کے تر نوالے کھاتے ہوئے لوگوں کے پیٹ میں مروڑیں شروع ہو جائیں گی اور مجھے اتنا کوسیں گے کہ اِس بائیس سال کے عرصہ میں اُن کانگریسی نیتاؤں کو کیا کوسا گیا ہوگا جو ملک میں دودھ اور شہد کے بجائے گرانی اور ذخیرہ اندوزی کی نہریں بہا رہے ہیں ـــــ!

مخلص ـــــ غلام احمد فرقت کاکوروی

★

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ایک بات عرض کروں اور وہ بات بھی ایسی ہے جو ماہ سے بہت پہلے آپ لوگوں کے گوش گزار کرنے والی تھی لیکن بعض مجبوریوں کے باعث مجھے اُسے چھپائے رکھنا پڑا۔ مگر اب جدیدیت نے ملک میں ایک وبائی شکل اختیار کرلی ہے۔ اس لئے مجبوراً جدیدیوں سے متعلق مجھے چند انکشافات کرنا پڑ رہے ہیں۔

گزشتہ سال مرزا اسداللہ خاں غالب کی جو صد سالہ برسی عالمگیر پیمانہ پر ہمارے ملک نے منائی تھی اُس میں آپ کو حیرت ہوگی کہ خود مرزا صاحب بھی بنفسِ نفیس شریک تھے اور انہیں دو ہفتہ کے لئے سائنس والوں نے پیرول پر قبر سے باہر نکلوا لیا تھا۔ مجھے بھی اس واقعہ کی اطلاع نہ ہوتی اگر اتفاق سے میں اپنے جدید دوست کے یہاں جو نظام الدین میں رہتے ہیں اُس روز نہ پہنچ جاتا جہاں مرزا صاحب کو جدیدیوں نے بہلا کر دے کر بُلایا تھا کہ خود مرزا صاحب کی زبان سے اُن کے بہترین اشعار سُنے جائیں گے۔ مرزا صاحب اُن کے اِس چکمے میں آگئے اور جدیدیوں نے پہلے تو دو ایک شعر مرزا صاحب کو خوش کرنے کے لئے سُنے۔ اُس کے بعد مرزا صاحب کے پنڈ ہوگئے کہ وہ ایک نظم اُن کی بھی سُن لیں۔ مرزا صاحب کو کیا معلوم تھا کہ جدیدیوں کی ایک نظم اُن کیلئے سورہ یٰسین ثابت ہوگی۔ لیکن بندھا مار کھاتا ہے۔ اِس لئے بیچارے مرزا کر بھی کیا سکتے تھے۔ مجبوراً راضی ہوگئے اور جدیدیوں کے مجمع میں ایک آرام کرسی پر اِس طرح سر ٹیک کر لیٹ گئے جس طرح گھر کا کوئی پالتو بکرا قربانی سے بے خوف ہوکر بقر عید کے دن بھی اپنے مالک کے قدموں پہ سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور مالک اُس کی گردن پر چھری پھیر کر اُسے جنت مکانی بنا کر خود اپنے لئے خُلدِ بریں میں ایک سیٹ بُک کر لیتا ہے۔ بہر صورت میں جس وقت جلسہ گاہ میں پہنچا ہوں جدیدیوں کا کلام سُننے کے لئے مرزا صاحب کے

ریہرسل کرایا جا رہا تھا یا انھیں اِس طرح تسلی دی جا رہی تھی جس طرح کسی مریض کو کسی بڑے آپریشن سے پہلے اُس کے قریبی اعزا تسلی اور دلاسے دیتے ہیں۔ لیکن مرزا صاحب کے گرد و پیش جو چیزیں لا لا کر رکھی جا رہی تھیں اُنھیں دیکھ کر وہ متوحش ضرور ہو رہے تھے۔ مثلاً اُن کے سرہانے پہلے جسم میں گیس پہنچانے کی مشین رکھ دی گئی۔ اُس کے بعد پانچ سات بوتلیں ماء اللحم کی ایک میز پر ترتیب سے چن دی گئیں۔ اُس کے بعد سرہانے ایک فیشی خمیرہ گاؤزبان مروارید جواہر والا کی رکھ دی گئی۔ اِس کے بعد ایک نوجوان جو ذرا لمبے قد کے تھے اور انگریزی میں اردو بولتے تھے مرزا صاحب کے سامنے لائے گئے۔ اُن صاحب کو اِس سے پہلے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا، اِس لئے جب میں نے ایک صاحب سے اُن کی تعریف پوچھی تو اُنہوں نے کہا کہ آپ ہی اُس نُشّہ zone کے جدیدیوں کے امیر المومنین ہیں اور یو۔ پی کے جدیدیئے آپ ہی کو اپنا خلیفہ مانتے ہیں۔ اِس لئے آج آپ ہی اپنی ایک طویل مختصر نظم مرزا صاحب کے سامنے پڑھنے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ صاحب اِن معنوں میں ضرور ذہین معلوم ہوتے تھے کہ وہ ڈاکٹر جلیل سے جو ہندوستان کے مشہور نقاد آلِ احمد سرور کے داماد اور ہندوستان کے صفِ اوّل کے ڈاکٹر شمار کئے جاتے ہیں، برابر مرزا صاحب کے بلڈ پریشر اور اُن کی نبضوں کی رفتار دریافت کر کے اپنی نظم کو مرزا صاحب کی صحت کے ثبوت پر پوری طرح فٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس احتیاط کی وجہ غالباً یہ تھی کہ کچھ دن پہلے اخبارات میں ایک خبر شائع ہو چکی تھی کہ کسی جدیدیئے نے ایک معتبر اَدب برائے زندگی والے ادیب کو بغیر اُس کی قوتِ برداشت اور بلڈ پریشر کا اندازہ کئے اپنی ایک ہلکی پھلکی سی نظم سُنا دی تھی۔ جس کے نتیجہ میں وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ڈاکٹر جلیل بلا کے تجربہ کار ڈاکٹر ہیں۔ اِس لئے اُنہوں نے حفظِ ماتقدم کے لئے ایک گہری تام چینی کی پلیٹ میں انجکشن کے آلات گرم کرنے کے لئے چولہے پر چڑھوا دیئے تھے کہ نہ جانے نظم کے کس بند کے بعد مرزا صاحب کو طاقت کے انجکشن کی ضرورت پیش آ جائے۔ غرض مرزا صاحب کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھنے کے بعد ڈاکٹر جلیل نے مرزا صاحب کی نبض پہ ہاتھ رکھ کر جدیدیوں کے امیر المومنین سے کہا کہ اب آپ شروع ہو جائیے۔ لیکن اُنھوں نے ڈاکٹر صاحب سے گذارش کی کہ ازراہِ کرم آپ مرزا صاحب کی نبضوں پر سے سرِ دست ہاتھ ہٹا لیں۔ کیونکہ نظم شروع کرنے سے پہلے میں مرزا صاحب کو جدید نظم سُننے کے چند آداب سے روشناس کرانا چاہتا ہوں اور مرزا صاحب اُن آداب سے یکسر ناآشنا ہیں۔ اِس لئے ممکن ہے پڑھنے میں خدا نکردہ کوئی ایسی صورت پیش آ جائے جس سے وہ اللہ کو پیارے ہو جائیں اور نظم ادھوری رہ جائے۔ اِس لئے جب میں آپ سے کہوں اِس وقت آپ نبض پر ہاتھ رکھیں۔ اس کے بعد موصوف مرزا صاحب کو مخاطب کر کے بولے کہ مرزا صاحب آج ہمیں واقعی بڑی مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ آپ جیسی جلیل القدر ہستی ہم جدیدیوں میں تشریف فرما ہے اور اِس سے زیادہ ہم اِس وجہ سے بھی آپ کے ممنون ہیں کہ آپ نے ہمارا کلام بلا شرکتِ نظام سُننے پر ہماری ایک ادنیٰ گذارش کو قبولیت بخشا۔ ورنہ اِس ظلم گردش کے دور میں یقین مانئے مرزا صاحب کہ پچاس اور پچاس سے اوپر عمر والا اور پھول پیسوں کا نذرانہ پیش کرنے پر بھی ہمارا کلام سُننے کو تیار نہ ہوتا۔ اِن حالات کے پیشِ نظر ہم نے حکیموں و بعض ڈاکٹروں سے مشورہ کر کے اپنا کلام سُننے والوں کے لئے ایک ادبی کسرت نکالی ہے۔ جس سے ہمارا کلام سُننے والے ہر طرح کی روحانی و جسمانی تکلیف سے محفوظ رہ سکتے ہیں اور کلام سُنکر فوراً اپنے پیروں اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔

یہ سُن کر مرزا صاحب نے جو ابھی تک گرد و پیش کے حالات دیکھ کر خوش تھے اور یہ شعر گنگنا رہے تھے ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اُنہوں نے ذرا جھرجھری لی اور اُن ہی صاحب سے بولے "کیوں حضرت! سُننے کے آداب سے آپ کی کیا مُراد ہے؟"

جدیدیئے: "اس سے میری مُراد یہ ہے کہ جس طرح آپ کے زمانے میں مشاعروں میں شعرا ایک حلقہ میں بیٹھتے تھے اور شمع گردش کرتی تھی اور جس شاعر کے سامنے شمع آتی تھی وہ اپنا کلام سُناتا تھا۔ اُسی طرح ہم جدیدیوں نے آپ جیسے پڑھے لکھے لوگوں کے کلام کو سُنانے کے لئے کچھ آداب متعین کئے ہیں۔"

مرزا صاحب: "مثلاً!"

وہی صاحب: "مثلاً یہ کہ جب کوئی جدیدیا اپنا کلام آپ کے سامنے سُنانے جا رہا ہو تو آپ سب سے پہلے ہاتھوں کی دونوں مُٹھیوں کو پوری طاقت سے بند کر لیں۔ اُس کے بعد دانتوں کو بھینچ کر پڑھنے والے کے چہرے پر اپنی نظریں اسی طرح گاڑ دیں جیسے کوئی مسمریزم کی مشق کرتے وقت کسی نشان کو اپنا مرکز بنا لیتا ہے۔ اُس کے علاوہ اگر نظم کا کوئی ایسا بند جسے سُن کر آپ پر اپنا گریبان پھاڑ کر گھر سے بھاگ جانے والی کیفیت پیدا ہونے لگے تو آپ کو اُس کیفیت سے بچنے کے لئے چا

کہ آپ نظم کو کانوں کے بجائے آنکھوں سے سننا شروع کر دیں۔"

صاحب: "میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں آنکھوں سے نظم سننا شروع کر دوں۔

اس کا مطلب میں بالکل نہیں سمجھا۔"

صاحب: "قبلہ! معاف کیجئے گا۔ میں ہرگز ہرگز ایسی گزارش آپ سے نہ کرتا۔ لیکن ہم سب جدید یئے آپ کا بے حد احترام کرتے ہیں اور آپ کو اُردو ادب کا بہترین مکتوب نگار مانتے ہیں۔ اس لئے ہمیں آپ کی زندگی بہت عزیز ہے، لیکن حضور! معاف فرمائیے جہاں تک آپکی شاعری کا تعلق ہے اُسے ہم اپنی شاعری کے مقابلے میں لولی ہے اور پتھر کے زمانے کی شاعری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ آپ لوگوں کے کلام میں محبوب کی خوشامد اور خیر پکے سوا اور کوئی بات نہیں ہوتی اور آپ حضرات محبوب کی مفارقت میں رات دن روتے دھوتے رہتے ہیں یا اس طرح اپنا سارا وقت اور ساری انرجی ضائع کرتے ہیں۔ اس ہمارے زمانے میں آپ خود سوچئے کہ کس کے پاس اتنا فضول وقت ہے جو محبوب کی محبت اور اُس کی مفارقت میں ضائع کرے۔ اس لئے ہم جدیئے ہر کام کو ڈٹ کر کرتے ہیں۔ خواہ وہ عاشقی ہو یا شاعری۔ نہ تو ہم آپ کے خدا کو مانتے ہیں اور نہ تصوّف کو۔ اس لئے ہم لوگ آپ جیسے شعرا کا کلام جہاں کہیں دیکھتے ہیں کانوں سے پڑھتے اور آنکھوں سے سنتے ہیں۔"

مرزا صاحب: "جناب! یہ بات تو آپ نے عجیب و غریب بتائی کہ آپ حضرات نہ تو محبت کے قائل ہیں اور نہ خدا کے۔ آپ کے یہاں غمِ دوراں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ غمِ دوراں کا مقصد یہ ہوا کہ آپ ہر وقت شہر کے اندیشے میں دُبلے ہوتے رہتے ہیں اور ہم بوڑھے لوگوں کی باتوں کو جہالت پہ محمول کرتے ہیں۔ مثلاً تصوّف، ادب، مذہب اور اخلاق یہ ساری کی ساری چیزیں آپ کے نزدیک مہمل اور لچر ہیں۔"

دہوی صاحب: "مرزا صاحب آپ کیوں اس فضول بحث میں پڑتے ہیں۔ آپ ہم لوگوں کا کلام سُنئے اور اگر ہماری کسی نظم کا مفہوم آپ کے پلّے پڑ جائے تو عالمِ برزخ میں واپس جا کر وہاں کے لوگوں میں کبھی آپ ہم لوگوں کا تذکرہ کر دیجئے گا۔"

مرزا صاحب: "ارے صاحب مجھے آپ کے اس کہنے پر ایک صاحب جو ابھی اٹھارہ انیس سال پہلے آپ کی دنیا سے مر کر گئے ہیں یاد آ گئے۔ وہ کبھی تو نثر میں شعر و شاعری کرتے تھے اور اُنہوں نے اپنا نام میراجی رکھ چھوڑا تھا۔ جس کے باعث یہ پتہ چلانا دشوار تھا کہ وہ کس جنس سے متعلق ہیں۔ یہاں سے جانے کے بعد جب عالمِ برزخ میں ان بیچارے کو چھ سال کی قیدِ تنہائی کی سزا اس جُرم میں ہوئی ہے کہ اُنہوں نے اپنی نظم کا ایک بند عالمِ برزخ کے ایک ننھے فرشتے کو سنا دیا تھا۔ جس سے آٹھ گھنٹے تک اُس فرشتہ کے ہوش و حواس گم رہے تو عالمِ برزخ میں بڑی دھاچوکڑی مچی اور اُس کے بعد جب ملائکہ نے ان شاعر صاحب کی شکایت بارگاہِ ایزدی میں کی تو عالمِ برزخ میں قیدِ تنہائی اُن پر ٹھونک دی گئی۔ اس کے بعد جب سے چھوٹ کر آئے ہیں اُس وقت سے اب تک وہ چپ چپ لوہے کے دو لٹو اُچھالتے اکثر عالمِ برزخ کی سڑکوں پر نظر آتے ہیں۔ ایک بار سُنا تھا کہ عالمِ برزخ میں وہ محلہ میر صاحبان میں میر تقی میر علیہ الرحمتہ کے گھر پر اسی حالت میں پہنچ گئے تھے تو میر صاحب کی ڈیوڑھی کے کُتّوں نے اُنہیں اتنا پیٹا کہ وہ زمین پر گر پڑے اور لہو لہان ہو گئے۔ انھیں صاحب کے بارے میں ابھی ایک بات اور سُننے میں آئی ہے کہ کسی بنگالی لڑکی نے عالمِ برزخ کی ایک پولیس چوکی پر یہ رپورٹ درج کرائی ہے کہ جب تک یہ دنیا میں رہے اُس وقت تک اس لڑکی کی غیبت میں نہ جانے کیا کیا حرکتیں کرتے رہے، جس سے لڑکی کو عالمِ برزخ میں بے حد شرم محسوس ہوتی رہی۔"

دہوی صاحب، "خیر مرزا صاحب! اب آپ میرا کلام سُنئے۔ میراجی کو چھوڑیئے۔ ہم اپنے مقابلے میں اُن کی شاعری کو بھی لونڈا سمجھتے ہیں۔"

مرزا صاحب، "یہ سُن کر اپنی آرام کرسی پر لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور قاضی سجاد صاحب پرنسپل مسلم مکتب مسجد فتحپوری آپ پر سورہ یٰسین دم کر کے نظم پڑھنے والے صاحب کو اشارہ کرتے ہیں کہ اچھا حضور! نظم شروع کیجئے اور ڈاکٹر جلیل مرزا صاحب کی نبضوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور عتیق صدیقی دن۔ ٹو۔ تھری کہہ کر جب ایک چھوٹی بندوق کا فائر ہوا میں کرتے ہیں تو ہمارے جدیدیئے شاعر مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔)

جدیدیئے: "حضور سرپرست پہلا مصرع عرض کرتا ہوں۔ شاید کسی قابل ہو—
"شام کی مدبھری پلکوں میں چکناک غزالوں کے ہوا دار طیورؔ"
(مصرع ختم ہوتے ہی مرزا صاحب کے بوڑھے جسم میں ایک کپکپی دوڑ جاتی ہے اور مرزا صاحب اُس کے بعد غنودگی میں پڑ جاتے ہیں۔)

جدیدیئے: "کہیئے سب خیریت ہے! دوسرا مصرع حاضرِ خدمت ہے —

## غزل

رشی پٹیالوی

مشکلیں ہزار آئیں کامیاب آتے ہم
گمرہی کی منزل سے خود کو ڈھونڈ لائے ہم

تیری بے نیازی نے یہ بھی دن دکھایا ہے
آپ اپنی نظروں میں ہو گئے پرائے ہم

کھل گیا بھرم آخر زعمِ پارسائی کا
ہوش مند ہو کر بھی ہوش میں نہ آئے ہم

مطمئن ہیں کچھ ایسے غم نہیں اُجڑنے کا
اپنے گھر میں بھی ٹھہرے مان کر سرائے ہم

چارہ سازیاں کیسی بن گیا دوا دشمن
ان کی انجمن سے جو درد لے کر آئے ہم

اے رشی خدا حافظ اپنی خوش گمانی کا
ڈھونڈتے ہیں صحرا میں گیسوؤں کے سائے ہم

## غزل

بال کرشن گوپال مغموم بی اے

کفر دل میں مرے چھپا تو نہیں
میں کسی بت کو پوجتا تو نہیں

اس فسانے میں آپ بھی ہیں شریک
یہ فقط میرا ماجرا تو نہیں

بے رُخی میں بھی التفات کا رنگ
یہ کہیں آپ کی ادا تو نہیں

بڑھ رہا ہوں بہر قدم تری سمت
تُو ہی درپردہ رہنما تو نہیں

خارزارِ حیات ہے یارو!
کوئی گلپوش راستہ تو نہیں

کوئی کچھ بھی کہے تجھے مغموم!
آدمی تُو مگر بُرا تو نہیں

## غزل

ڈاکٹر مخدوم اشرف اشرف

اُس نگاہِ ناز کو میں کہوں تو کیا کہوں
دردِ مستقل کہوں، درد کی دوا کہوں

وہ جسے زبان سے جانِ مدعا کہوں
لاکھ بے وفا سہی میں نہ بے وفا کہوں

ذاتِ خالقِ جہاں ماورائے عقل ہے
جو سمجھ میں آ سکے اُس کو کیوں خدا کہوں

جو حرم کو پا گیا میکدے کی راہ سے
ایسے بادہ نوش کو کیوں نہ پارسا کہوں

سر کے ساتھ ساتھ ہی دل بھی سرنگوں ہے
سجدہ ہائے شوق کو جب کہیں روا کہوں

اشرف آج بزم میں جمع ہیں سب اہلِ فن
میری کیا بساط ہے میں کہوں تو کیا کہوں

## غزل

پروفیسر محسن بنارسی ایم اے

تصور میں آ کر وہ جب مسکرائے
غزل کے نئے ساز ہم نے اُٹھائے

دلوں سے اندھیرا مٹانے کی خاطر
دیئے ہم نے اپنے لہو سے جلائے

بہاروں کے پُرکیف موسم میں ہم کو
وہ [illegible] بہت یاد آئے
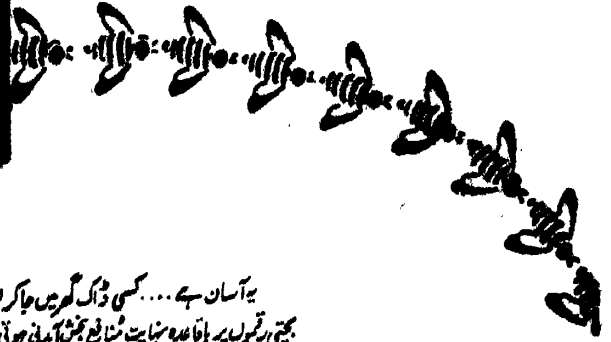
آپ کے لئے ایک نعمت!!
اب بچایئے
یہ آسان ہے.... کسی ڈاک گھر میں جاکر پوچھئے.... یکم اپریل سے چند نئی بچت اسکیمیں جاری ہیں۔ ان سے آپ کو اپنی بچتی رقموں پر باقاعدہ نہایت مُنافع بخش آمدنی ہوتی رہے گی....
● ڈاک گھر مکرر ڈیپازٹوں پر اب پہلے سے زیادہ یعنی 6½ فیصد سالانہ سُود ملتا ہے (جس پر ٹیکس لگتا ہے)۔ چنانچہ اگر آپ ہر ماہ 10 رُوپے بچاتے رہیں گے، تو 5 برس بعد یہی رقم 700 رُوپے ہو جائے گی۔
● ڈاک گھر سیونگز بنک میں اگر آپ کے کھاتے میں سال بھر کم از کم 100 رُوپے جمع رہیں گے، تو آپ کو ٹیکس سے بری 4 فیصد سالانہ سُود ملے گا.... اگر آپ اپنی رقم کا کوئی حصہ (جو 100 رُوپے کی حاصل الضرب کوئی بھی رقم ہو سکتی ہے) 3 برس تک جمع رکھیں گے، تو اس جمع رکھے ہوئے کھاتے پر آپ کو 4½ فیصد سالانہ سُود ملے گا.... اگر یہ رقم 2 برس تک جمع رکھی رہے گی تو اس پر 4½ فیصد سالانہ سُود ملے گا۔ اس طرح ڈاک گھر میں جمع رکھی ہوئی 100 رُوپے کی رقم 3 برس میں 114 روپے اور 2 برس میں 109 روپے ہو جائے گی۔
تفصیلات سبھی ڈاک گھروں اور قومی بچت آرگنائزیشن کے ضلع دفتروں سے دستیاب
زیادہ بچایئے
بچت کرنا اب پہلے سے زیادہ مُنافع بخش ہے۔
davp 69/607
قومی بچت آرگنائزیشن
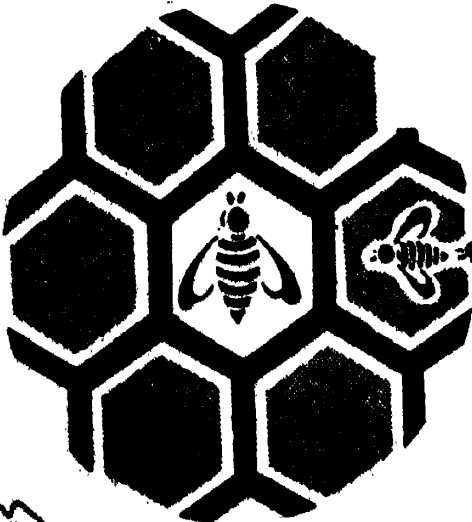
# کھویا ہوا پیار

شاکر کریمی

محلہ گنج نبرانند ہری مسجد بتیا (چمپارن) بہار

محترم المقام! اسلام و نیاز

"کھویا ہوا پیار" حاضر ہے۔ کہانی طویل لیکن دلچسپ ہے۔ میں نے پُورا پُورا خیال رکھا ہے کہ قارئین بور نہ ہوں۔ آپ کو کہانی پسند آ گئی تو سمجھوں گا میری محنت رائیگاں نہیں گئی....

آپ کا ——— شاکر کریمی

اب تو وہ خون بھی تھوکنے لگا تھا:

کثرتِ مئے نوشی نے اُس کے سینے کو چھلنی کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مرض جان لیوا ہے اور کسی وقت بھی زندگی کی دُھندلی شمع ہمیشہ کے لئے بجھ سکتی ہے۔ پھر بھی وہ مطمئن تھا جیسے موت اُس کا سب سے بڑا مدعا ہو۔

وہ زندگی کی کش مکش سے نجات کی راہ تک رہا تھا کہ ایک صبح چمکتی ہوئی کار اُس کے دروازے پر رُکی، ایک خُوش شکل، خُوش پوش نوجوان کار سے اُتر کر اُس کے کمرے میں داخل ہوا۔

"میں ڈاکٹر راج ہوں!"

"لیکن میں نے تو کسی ڈاکٹر کو نہیں بُلایا!"

"پھر بھی میں آپ تک پہنچ گیا ہوں!"

"میں کسی علاج کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ڈاکٹر!" اُس کی آواز میں بے حد نقاہت تھی۔

"زندگی سے فرار کا یہ راستہ غلط ہے، خُود سے انتقام لینے کے لئے دوسروں کے لئے جینا مرنے سے زیادہ کٹھن ہے!"

"کس کے لئے، کون ہے میرا اس دنیا میں جس کے لئے زندہ رہا جائے!"

اُس کے چہرے پر درد و کرب کی بے شمار لکیریں اُبھر آئیں۔

"یہ تنگ دلی ہے، اگر دل ہمالیہ کی طرح وِشال ہو تو پُوری دنیا اپنی نظر آتی ہے!"

زندگی کی آخری گھڑیوں میں اُسے اپنی شکست گراں گذری تھی، اُس نے بات بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔

"تم چاہتے کیا ہو ڈاکٹر؟"

"صرف اتنا کہ آپ میرے ساتھ چلیں، میں آپ کا علاج کرنا چاہتا ہوں! اور بس!"

"نہیں نہیں، مجھے زندگی سے زیادہ موت عزیز ہے!" اُس نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"موت تو ایک اٹل حقیقت ہے اُس سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن جب مرنا ہی ہے تو بزدلوں کی موت کیوں مرا جائے، مایوس موت کے بعد بھی روح پشیمان ہی رہتی ہے!"

وہ خاموش رہا۔

"اور کچھ نہیں یہ تو دیکھئے کہ میں آپ کو زندہ دیکھنا چاہتا ہوں، اپنے لئے نہیں تو میرے لئے ہی سہی!"

وہ خاموش رہا، جیسے موت سے پہلے ایک گہرا سکوت طاری ہو گیا ہو اُس پر۔

---

اچھی نگہداشت، ممکنہ احتیاطی تدابیر، بہتر علاج، ڈاکٹر راج اور دوسرے سینئر ڈاکٹروں کی بھرپور توجہ کے باوجود وہ مطمئن نہ تھا اور محسوس کر رہا تھا

# گفتگو

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ ناشاد گفتگو کرتے ——— ذوقؔ

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر ——— غالبؔ

تیرے ستم سے مجھکو ملا رتبہ سلیم
ایک وجہِ گفتگو نکل آئی خدا کے ساتھ ——— انورؔ

میری اُن کی گفتگو دیکھے کوئی
جیسے بندہ اور خدا باتیں کریں ——— نواب سعید

غلط بیر کے نہیں دیکھتا ہوں تیری طرف
یہ دیکھتا ہوں کہ اندازِ گفتگو کیا ہے ——— بسمل سعیدی

مرسلہ:۔ ڈاکٹر محمد عزیز الحق صدیقی شبلی

جیسے وہ تیزی سے موت کے قریب ہوتا جارہا ہے، لیکن ڈاکٹر راج مطمئن تھا کہ وہ رفتہ رفتہ خطرے سے باہر ہوتا جارہا ہے۔

اُسے اسپتال میں نرسوں کا وجود ایک آنکھ نہ بھاتا۔ جوان، خوبصورت عریاں پنڈلیوں والی نرسوں کو دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتا تھا۔ جب کوئی نرس اُسے دوا پلانے آتی تو وہ دوا پینے سے پہلے ہی اِس طرح منہ بناتا جیسے دنیا کی تمام تلخیاں اُس کے حلق میں اُنڈیل دی گئی ہوں۔ وہ کئی بار نرسوں سے کہہ چکا تھا کہ وہ اُس کے قریب نہ آئیں، اُسے وحشت ہوتی ہے اور نرسیں مُسکرا کر اُس کی باتوں کو نظر انداز کر دیتیں اور پھر اٹھلاتی، بل کھاتی، دوا کا گلاس، دوا سے بھری سرنج، ناشتہ اور کھانا لے کر اُس کے پاس آجاتیں ——— ایک دن مجبور ہو کر اُس نے ڈاکٹر راج سے کہہ ہی دیا۔

"تم میرے ساتھ چاہے کچھ بھی کرو۔ لیکن اتنا کرم ضرور کرو کہ اِن نرسوں کو مجھ تک آنے سے روک دو۔ اگر یہ نرسیں میرے قریب آتی رہیں تو میں موت سے پہلے ہی مر جاؤں گا۔ میری نظروں میں یہ ٹی بی کے جراثیم سے بھی زیادہ مہلک ہیں۔ یا پھر کسی نرس کے ہاتھوں مجھے زہر ہی دلوا دو!" اُس کی باتیں سُن کر ڈاکٹر راج کو حیرت ہوئی۔

"میں سمجھا نہیں، نرسوں سے اتنی شدید نفرت کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟"

"نہیں، لیکن مجھے نفرت ہے اِن نرسوں سے [illegible] سے [illegible]۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ عورت سے نفرت کی وجہ کوئی خاص [illegible] ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ عورت سے چوٹ کھائے ہوئے ہیں؟"

"نہیں، بس، میں نہیں چاہتا کہ برسوں کی دبی ہوئی [illegible]" اُس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"اور کچھ تو نہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ دنیا کی ہر عورت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ غلطی تو ان آنکھوں کی ہے جو اچھے اور بُرے کی پہچان نہیں کرتیں، خود دیکھئے آپ کو جنم دینے والی بھی تو ایک عورت ہی ہے۔ جس ماں کی گود میں ہم سدا کی گہرائیوں میں ٹھنڈک اور سکون محسوس کرتے ہیں، جس کا تصور ہی دنیا کی لافانی نعمتوں سے کہیں عظیم اور عظیم تر ہے!"

وہ آنکھیں بند کئے ڈاکٹر راج کی باتیں سُنتا رہا۔

ڈاکٹر راج نے سرنج میں دوا بھری اور اُس کے داہنے بازو میں انجکشن لگاتے ہوئے کہا۔

"قصور کسی اور کا نہیں ہوتا۔ میرا مطلب ہے دنیا کا کوئی فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد بُرا نہیں ہوتا۔ قصور تو اپنا ہوتا ہے۔ اگر کوئی ہم سے خفا ہے، بدظن ہے تو اُس کا یہ مطلب ہے کہ ضرور ہم ہی میں کوئی کمی یا خرابی ہے۔ اگر انسان اپنی بُرائیوں اور کمزوریوں پر نظر رکھے اور اُس کی اصلاح کرے تو پوری دنیا جنت نظر آنے لگی، کسی سے کسی کو کوئی شکایت نہ ہوگی۔"

وہ ڈاکٹر راج کی باتیں اِس طرح سُن رہا تھا جیسے ابتدائی درجے کا کوئی طالب علم اپنے معلم کی باتیں غور سے سُن کر سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"میرا خیال ہے آئندہ آپ کو کوئی شکایت نہ ہوگی۔ انسان کی زندگی کا ہر لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ اُس ایک لمحے کو کیوں کسی کے متعلق غلط رائے قائم کر کے برباد کیا جائے!"

پہلی بار اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی، اُس نے غور سے ڈاکٹر راج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہ جانے ابھی کتنے نشیب و فراز سے گذرنا ہے تمہیں، لیکن اتنی ساری باتیں تم نے کہاں سے سیکھیں ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر راج کے ہونٹوں پر پُرکشش مُسکراہٹ چمکنے لگی۔

"ڈاکٹری کی ڈگری تو میں نے بہار یونیورسٹی سے حاصل کی ہے لیکن ایک کامیاب انسان بننے کی ڈگری دنیا کی عظیم یونیورسٹی سے حاصل کر رہا ہوں

کوشش کر رہا ہوں، جانتے ہیں آپ وہ عظیم یونیورسٹی کون سی ہے؟ وہ یونیورسٹی ہے ماں کی گود!"

"مبارک ہے وہ گود جس میں تم پلے ہو۔ بے شک تم ایک کامیاب انسان ہو!" اُس کے ہونٹوں پر پُرخلوص مُسکراہٹ تھی۔

"میں ڈاکٹر بھی تو ہوں اور ایک ڈاکٹر کے لئے اچھا انسان ہونا ضروری ہے، ہے نا؟"

"بے شک!" آج مدتوں بعد اُس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک جاگ اُٹھی تھی۔

"اچھا اب آپ آرام کیجئے، ذہن سے ہر طرح کے خیال کو جھٹک دیجئے، موت کا تصور بھی۔ میں شام کو آؤں گا" وہ سوچنے لگا۔ یہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس خوبرو جواں سال ڈاکٹر، یہ اونچے آدرش جیسے انسان کے روپ میں فرشتہ۔ بے لوث، پاکیزہ، جو میرا کچھ بھی نہیں اور جسے سب کچھ سمجھ لینے کو جی چاہتا ہے ——— اور وہ ڈاکٹر راج کی باتوں پر غور کرنے لگا اور عورت سے نفرت کے امکان پر غور کرتے ہوئے ماضی کی وسعتوں میں کھو گیا۔

کالج کے زمانے میں وہ لڑکیوں میں بہت مقبول تھا۔ کئی لڑکیاں اُس کا قرب حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ کسی کو اُس کے گھونگھریالے بال پسند تھے تو کسی کو اُس کا بھرا بھرا صحت مند جسم۔ کسی کو اُس کی پُروقار شخصیت تو کسی کو اُس کی پُرلطف دلچسپ کشش باتیں۔ کوئی لڑکی اُسے کرکٹ کا باکمال کھلاڑی سمجھ کر اُس پر جان چھڑکتی تو کوئی اُس کی ایک مُسکراہٹ پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے کو بے قرار!

لیکن اُس کی نگاہوں میں تو صرف انجنا تھی جو ان ساری لڑکیوں سے مُختلف تھی، جس نے اور لڑکیوں کی طرح کبھی اپنی چاہت کا اظہار نہ کیا تھا۔ جب بھی انجنا سے سامنا ہوتا انجنا کی نگاہیں جُھک جاتیں، رخساروں پر حیا کی سُرخی دوڑ جاتی، ہونٹ صرف کپکپا کر رہ جاتے اور وہ اُس کے قریب سے سمٹ کر گذر جاتی، اُس کا دماغ انجنا کے جسم کی خوشبو سے معطر ہو جاتا۔

انجنا کے حُسن میں بلا کا بانکپن تھا، چال میں پھولوں سے لدی ڈالی کے لچک لچک جانے کا سا انداز تھا، آواز میں کانوں میں رس گھول دینے والا ترنم تھا، آنکھیں سرور بخشنے والی جیسے ہر وقت شراب کا ہلکا ہلکا نشہ رہتا ہو۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ انجنا بھی دل ہی دل میں اُسے چاہتی ہے لیکن اپنی چاہت کا اظہار کرنے کے لئے شرم و حیا کا بندھن نہ توڑ سکتی ہو۔

کیفے نشاط میں کافی کے ہلکے ہلکے گھونٹ لیتے ہوئے وہ انجنا کا

## لب

وہ ترے حسن کی قیمت سے نہیں ہیں واقف
پنکھڑی کو جو ترے لب کا بدل کہتے ہیں ——— قتیل شفائی

حسرتِ بوسہ پہ اختر یہ خیال آتا ہے
کیوں مرے لب نہ ہوں وہ برگ گلاب آلودہ ——— اختر شیرانی

صہبائے نے پہ جو گزرتی ہے
وہ لب نے نواز کیا جانے ——— جگر

رہیں گے چپ تو غمِ دل کے راز کھولیں گے
وہ لب ہلے تو ہواؤں میں رنگ گھولیں گے ——— محمود سعیدی

قاصد کا تجاہل بھی کسی کام نہ آیا
اُس لب پہ نہ آنا تھا مرا نام نہ آیا ——— جوہر ٹونکی

مُرسلہ: ایس ایس۔ ہنسکاری ایم اے سانگھڑ

انتظار کر رہا تھا، اُسے انجنا کے آنے کی اُمید نہیں تھی، لیکن ایک انجانا جذبہ اُسے انتظار کرنے پہ مجبور کر رہا تھا۔ شاید وہ آ ہی جائے ——— اُسے زیادہ دیر تک انتظار کی زحمت نہ اُٹھانی پڑی، انجنا ہولے ہولے قدم بڑھاتی اُس کے قریب آئی اور سامنے بیٹھ گئی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ انجنا سے کیا کہے، کیا باتیں کرے۔ اُس نے تو انجنا کو محض آزمائش کے طور پہ یہ دیکھنے کے لئے بُلایا تھا کہ وہ آتی ہے یا نہیں، اُس نے سوچا تھا اگر وہ آگئی تو اُسے یقین ہو جائے گا کہ انجنا کے دل میں اُس کے لئے جگہ ہے۔ اُسے اپنے آپ پر فخر محسوس ہونے لگا۔ کالج کی سب سے خوبصورت لڑکی اُس سے اِس قدر قریب تھی!

اور پھر تو ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کیفے نشاط، ٹاؤن پارک، والیکی نگر اور دوسری تفریح گاہوں میں وہ ملتے رہے، دل کے کنول کِھلتے رہے، حسین و دلکش خواب بُنتے رہے، محبت کے نشے میں سرشار وہ نت نئی تمناؤں کے جھولے میں ہچکولے کھاتے رہے، محبت پروان چڑھتی رہی، قسمیں کھائی گئیں، ساری زندگی ساتھ نبھانے کے عہد و پیمان ہوئے۔

---

شام ہو چلی تھی، سرد سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ بادل اُمڈ اُمڈ کر

آ رہے تھے، موسم متوالا ہو گیا تھا۔ ابھی وہ والیکی نگر کے ٹیکسی اسٹینڈ تک بھی نہ پہنچ سکے تھے کہ بارش نے انہیں گھیر لیا۔ اور انہیں والیکی نگر کے رسٹ ہاؤس میں پناہ لینی پڑی۔ وہ رسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں بارش رکنے کا انتظار کرتے رہے۔ انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی گئیں، طویل اور طویل، اور رات ہو گئی۔

والیکی نگر کی پُرفضا وادی، دُور تک پھیلے ہوئے پہاڑوں کے سلسلے، خوشگوار موسم، سرد سرد ہوائیں، موسلا دھار بارش، اور ------ اور تنہائی ------ انجنا کی نشیلی آنکھیں، کشادہ پیشانی پر چوٹ کھائی ناگن کی طرح مچلتی بالوں کی لٹ، شبنمی ہونٹ، سڈول بازو، گداز جسم، حُسن و شباب کا ہیجان انگیز سنگم ------ اُس کی نگاہیں انجنا کے جسم کو ٹٹولنے لگیں۔ دفعتاً بڑے زور کی بجلی کڑکی، انجنا چونک گئی، اور ڈر کر اُس کے کندھے سے لگ گئی ------ اور اُس رات کے بعد اب دونوں برابر ملنے لگے۔ کبھی کسی کیفے میں، کبھی پارک میں ------ جذبات کی گھٹائیں اُمڈ اُمڈ کر برستی رہیں۔ ہیجان انگیز کیف آگیں سیلاب کے تیز و تند دھاروں پر وہ بہتے رہے۔ سرور انگیز گہرائیوں میں ڈوبتے اور اُبھرتے رہے۔

انجنا کے قرب نے اُس کی زندگی میں ایک نئی راہ کھول دی۔ اُس کی نگاہیں بھٹکنے لگیں، خیالات منتشر ہونے لگے اور انجنا کے علاوہ اُس کی نگاہیں دوسرے خوبصورت جسموں پر پھسلنے لگیں۔ ہر خوبصورت جسم میں اُسے انجنا کا عکس نظر آنے لگا۔ وہ انجنا سے دُور ہوتا گیا۔

اور جب وہ اپنی ٹیم کے ساتھ بنگلور گیا تو وہاں بھی ایک لڑکی ہی اُس نے محسوس کیا کہ وہ سب سے زیادہ حسین، جاذبِ نظر، نازک اندام، جیسے ایک شعلہ انسانی پیکر میں ڈھل کر مہک رہا ہو، جیسے قیامت حُسن و شباب کے سانچے میں ڈھل گئی ہو ------ وہ کرکٹ کا بہت اچھا کھلاڑی تھا اور کتنی ہی لڑکیاں اُس کے کھیل ہی پر ریجھ جاتی تھیں۔ یہاں بھی کرکٹ کی دلدادہ وجینتی اُس کے کھیل پر ریجھ گئی تھی اور پھر اُس کا خوبصورت مردانہ جسم۔ وجینتی اُس سے ملتی رہی۔ وہ بھی وجینتی کے قریب آتا رہا۔ پھر تو وہ اتنے قریب ہوئے کہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو گئے۔ وجینتی سے شادی کے بعد وہ بنگلور ہی کا ہو کر رہ گیا جیسے راستہ بھول گیا ہو اپنے شہر کا۔ وقت گزرتا رہا۔ دن ہفتے مہینے بنتے رہے ------ وہ وجینتی کی گھنیری زلفوں میں ایسا اُلجھا کہ گزرتے ہوئے دنوں اور مہینوں کا بھی ہوش نہ رہا۔ اب اُس کے ذہن کے کسی گوشے میں نہ انجنا تھی اور نہ انجنا کی یاد اور نہ انجنا کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں کا تصور ------ اور جب ہوش میں آیا تو ایک مدت گزر چکی تھی۔ ازدواجی زندگی میں بے لطفی، تلخی، گلے اور شکوے کا زہر گھلنے لگا تھا۔ جیسے پُرسکون بہتی ہوئی ندی میں کنارے سے دراڑیں کٹ کٹ کر گر رہی ہوں۔ اُسے کلب، کیفے، ریسٹورانٹ، تفریح گاہوں اور خود اپنے گھر میں وجینتی کا اپنے دوستوں سے ملنا شاق گزرنے لگا۔ جب وہ دفتر سے لوٹ کر وجینتی کو گھر نہ پاتا اور وجینتی کچھ رات گئے تک لوٹتی تو وہ اُسے شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگتا۔ وہ وجینتی پہ پابندیاں عائد کرنا چاہتا۔ لیکن کھلی فضاؤں میں تیرنے والی رنگین تتلی قید و بند کے ہر بندھن کو توڑ کر پرواز کرتی رہی اور دونوں کے درمیان کشیدگی بڑھتی رہی۔

"تمہارا یوں روز روز گھر سے باہر رہنا اچھا نہیں لگتا!" اُس کے دفتر سے لوٹنے کے کافی دیر بعد وجینتی آئی تو اُس نے ترشی سے کہا۔

"تو کیا کروں، گھر میں قید رہوں؟"

"گھر گھر ہوتا ہے، قید خانہ نہیں!"

"اتنی اچھی ٹیم آئی ہے۔ ہزاروں لاکھوں لوگ میچ دیکھنے جاتے ہیں میں بھی چلی جاتی ہوں۔ تم تو جانتے ہو مجھے کرکٹ کا کتنا شوق ہے!"

"گھر بیٹھے اُس کی کمنٹری commentary ریڈیو پر سنا کرو۔"

"دیکھنے اور سننے میں بڑا فرق ہے، میں تو کہوں گی ایک دو دن کی چھٹی لے کر تم بھی دیکھ لو؟"

"مجھے فرصت نہیں، کل ہی دورے پر باہر جانا ہے اور کافی تیاری کرنی ہے!"

"حیرت ہے کرکٹ کے اتنے اچھے کھلاڑی ہوتے ہوئے بھی تم میچ نہیں دیکھ رہے ہو؟"

"کہا نا مجھے فرصت نہیں!"

"بہ یک وقت دونوں چیزیں کسی پلیئر میں نہیں ہوتیں لیکن ڈوگرے جتنا اچھا بیٹس مین ہے اتنا ہی اچھا باؤلر بھی، پرسنالٹی personality بھی خوب ہے، لمبا چوڑا جوان، کھیل کے میدان میں تو بس ہر وقت ہنستا ہی رہتا ہے!"

"ہوگا، مجھے اُس سے کیا لینا ہے؟"

---

تین دن بعد شام کو جب وہ دورے سے واپس آیا تو ملازم نے ایک بند لفافہ دیا۔ یہ وجینتی کا خط تھا، لکھا تھا ------ [illegible]

ہوں، انڈیا الیون اور ویسٹ انڈیز کا میچ دیکھنے۔ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ بعد لوٹ آؤں گی، خفا نہ ہونا تم تو جانتے ہی ہو کہ مجھے کرکٹ کا کتنا شوق ہے اپنا اور گھر کا خیال رکھنا۔

کئی ہفتے گزر گئے، ونیتی نہ آئی ——— ونیتی کے یہ جملے اُس کے کانوں میں زہر گھولتے رہے ——— "ڈوگرے جتنا اچھا بیٹس مین ہے اتنا ہی اچھا اور پرسنالٹی بھی خوب ہے، لمبا چوڑا جوان ....!"

اور ایک دن اُسے ونیتی کے ساتھ انجنا کی یاد آ گئی اور وہ دونوں میں موازنہ کرنے لگا۔ انجنا جسے وہ مجبور چھوڑ کر چلا آیا تھا اور ونیتی جو اُسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ انجنا اور ونیتی، ونیتی اور انجنا، کتنا فرق تھا دونوں میں؟ اور ان دونوں کے مشترکہ غموں سے نجات پانے کی کوشش میں وہ ایک بار پھر بھٹک گیا۔ انجنا کا غم غلط کرنے کے لئے وہ بیک وقت شراب کا سہارا ڈھونڈا اور ونیتی سے اُس کی نفرت اتنی بڑھی کہ اُس کا عورت پر سے اعتبار اُٹھ گیا عورتوں کے تصور ہی سے اُسے گھن آنے لگتی۔

اب اُس کی زندگی کا ماحصل دو ہی چیزیں تھیں، شراب اور عورت سے نفرت!! اور شراب نے اُسے اس منزل پلا کر کھڑا کر دیا تھا جہاں وہ موت کے لمحے گن رہا تھا!

"کیسی طبیعت ہے؟" ڈاکٹر راج کی پُرخلوص آواز نے اُس کے خیالوں کے تسلسل کو توڑ دیا۔

"ٹھیک ہی ہوں!" اُس نے بے دلی سے جواب دیا۔

"دواؤں کا استعمال پابندی سے ہو رہا ہے نا؟"

"اس کا جواب تو تمہاری نرسیں ہی دے سکتی ہیں، ویسے دن میں کئی بار گولیاں اور مکسچر کھلا پلا جاتی ہیں ایک دو انجکشن بھی لگا دیتی ہیں!"

"اب آپ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے" ڈاکٹر راج نے اُس کے سینے پر آلہ رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھتا ہوں مجھے اچھا کر کے تم میرا کیا مصرف نکالتے ہو!" اُس نے سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

"یہ بات ہے تو پھر دیکھئے گا، بہت بڑا مصرف نکالوں گا میں آپ کا!" ڈاکٹر راج کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"کیا؟"

"پھر بتاؤں گا، پہلے آپ صحت یاب ہو جائیں!"

وہ خاموش رہا۔

"اور ہاں، آج شام کو ڈاکٹر کرمی آپ کا ٹیسٹ لینے آئیں گے، اُس کے بعد آپ کو اُٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کی آزادی ہوگی۔"

---

آخری ایکسرے کی رپورٹ اُس کے لئے حیران کن تھی۔ ڈاکٹر راج نے اُسے بتایا کہ اب آپ بالکل اچھے ہیں، پھیپھڑے ایک تندرست انسان کے پھیپھڑوں سے کم نہیں، چلنے پھرنے کی اجازت ہے لیکن اِس پابندی کے ساتھ کہ آپ میری مرضی کے خلاف کہیں آ جا نہیں سکتے اور جہاں کھانے پینے میں احتیاط لازمی ہے وہاں شراب کے تصور کی بھی سخت ممانعت ہے۔

وہ ڈاکٹر راج کی باتیں غور سے سنتا رہا، آج اُسے ڈاکٹر راج کی باتیں بہت پیاری معلوم ہو رہی تھیں۔ اُسے ڈاکٹر کی زندگی کی چمک سے روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی اور پُرخلوص مسکراہٹیں کچھ جانی پہچانی معلوم ہو رہی تھیں۔ ڈاکٹر راج شروع ہی سے اُس کے لئے ایک معمہ تھا اور اب اُس کی شخصیت اُس کی نظروں میں اور بھی پُراسرار معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے ڈاکٹر راج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم میرا اتنا خیال رکھتے ہو، لیکن میں تمہارے بارے میں اتنے زیادہ کچھ نہ جان سکا کہ تم صرف ایک ڈاکٹر ہو!"

"ہاں، میں صرف ایک ڈاکٹر ہوں اور ایک کامیاب ڈاکٹر بننے کی کوشش میں مریضوں سے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔ میری ماں کی خواہش ہے کہ میں اِس پیشہ کو حصولِ زر کا ذریعہ نہ بننے دوں۔ بڑی بڑی مصیبتیں جھیل کر اسی لئے تو میری ماں نے مجھے ڈاکٹر بنایا ہے۔"

صحت یاب ہو جانے کے بعد بھی وہ اسپتال کے حدود سے باہر نہ نکل سکا تھا۔ وہ خود حیران تھا کہ وہ ڈاکٹر راج کا اِس قدر پابند کیوں ہو گیا ہے، جیسے ڈاکٹر راج ہی سب کچھ ہو اُس کا، اُس کی مرضی کا مالک اُس کی زندگی کے سفینے کا ناخدا!

---

مطلع ابر آلود تھا خنک ہوائیں چل رہی تھیں، ہر طرف سُرمئی اُجالا پھیلا ہوا تھا۔ برسوں بعد آج کی یہ شام اُسے بہت خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اسپتال کے برآمدے میں کھڑا ریلنگ پر کہنیاں ٹیکے سامنے دُور تک پھیلے ہوئے سبزہ زار کو تک رہا تھا۔ ہواؤں کے خوشگوار جھونکے جب پاس سے گزرتے تھے تو وہ ایک لمبی سانس لے کر صاف ستھری ہوا اپنے پھیپھڑوں میں جذب کر کے اک گونہ فرحت محسوس کرتا تھا۔ تمام

مرحلوں سے گذرنے کے بعد بھی آج اُسے زندگی حسین نظر آرہی تھی۔ وہ زیر لب بڑبڑایا ـــــ "میری یہ زندگی ڈاکٹر راج کی مرہونِ منت ہے!"

"گڈ ایوننگ!"

اُس نے پلٹ کر دیکھا، ڈاکٹر راج قریب ہی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"بہت بڑی عمر ہے تمہاری، ابھی تمہارا ہی خیال آیا تھا!"

"شکریہ، میں تو آپ کی دعاؤں کا محتاج ہوں!"

"وہ کیوں؟" ڈاکٹر راج دن بدن اس کے لئے معمہ ہی بنتا جارہا تھا۔

"ممکن ہے آپ کی دعائیں مجھے ایک اچھا انسان بنانے میں معاون ثابت ہوں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر تم اچھا بننے کی کوشش کررہے ہو تو پھر اچھائی کا معیار کیا ہے؟"

"میرے خیال سے اچھائی کا معیار یہ ہے کہ مرنے کے بعد روح پشیمان نہ ہو، کیا خیال ہے آپ کا؟" ڈاکٹر راج کی مسکراہٹ واضح ہوگئی۔

"اوہ، تم مجھے ہمیشہ اپنی باتوں سے شکست دے دیتے ہو۔"

"آپ کے لئے ایک خوشخبری لایا ہوں!"

"میرے لئے بھلا کیا خوشخبری ہوسکتی ہے، میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ تم نے جو زندگی مجھے دی ہے میں اِس کا کیا کروں گا؟"

"زندگی دینے اور لینے والا تو بھگوان ہے، لیکن اِس معاملے میں میں آپ کی مدد کروں گا کہ آپ اپنی زندگی کیسے بسر کریں۔"

"آخر تم میرے لئے کیا کیا کروگے، زندگی دی اور اب زندگی بسر کرنے کا تعین بھی کروگے۔ تمہاری شخصیت میرے لئے ایک معمہ ہوکر رہ گئی ہے، تم بتاتے کیوں نہیں کہ تم یہ سب کیوں کررہے ہو؟"

"میں ایک ڈاکٹر جو ہوں!"

"نہیں، ڈاکٹر صرف صحت کا ذمہ دار ہوتا ہے پوری زندگی کا نہیں!"

وہ ہمیشہ سے زیادہ مضطرب نظر آنے لگا۔

"تو آیئے، اب ہمارے سامنے دو معمے ہیں، آپ کی زندگی کا مصرف اور میں، ہم دونوں مل کر اِن معموں کا حل ڈھونڈیں!"

وہ اور کچھ کہے بغیر اپنے وارڈ کی طرف بڑھنے لگا۔

"ادھر نہیں، میرے ساتھ آیئے، آپ اسپتال سے ڈسچارج کردیئے گئے ہیں!"

"تو میں جہاں چاہوں جاسکتا ہوں؟" اُسے محسوس ہوا جیسے قید و بند کی زندگی سے نجات مل گئی ہو۔

"نہیں، ابھی کچھ دنوں آپ کو میرے ساتھ رہنا ہوگا، میرے بنگلے میں!"

"لیکن۔۔۔!"

"ممکن ہے اِن دونوں معموں کا حل ڈھونڈنے میں کچھ وقت لگ جائے، آپ کہیں اور چلے جائیں گے تو میں پھر کہاں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا!"

"تو کیا اِس سے پہلے بھی تم نے مجھے تلاش کیا ہے؟" اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں، بہت تلاش کے بعد آپ تک پہنچ پایا تھا۔ لیکن اب آپ کوئی اور سوال نہ کریں اور میرے ساتھ چلیں!"

اُس نے ایک بھرپور نظر ڈاکٹر راج پر ڈالی اور اپنے اندر بے شمار سوال لئے ڈاکٹر راج کے ساتھ چلنے لگا۔

"آیئے میں آپ کو اپنا بنگلہ دکھاؤں۔ یہ آفس، یہ ڈرائنگ روم، یہ میری ذاتی لائبریری اور یہ میرا بیڈ روم، آپ یہاں آرام کیجئے میں ابھی آیا!"

اُس نے نہایت ہی سلیقے سے سجائے ہوئے بیڈ روم کو دیکھا اور قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہوکر اپنا جائزہ لینے لگا۔ ایسا تو وہ جنون تھمنے سے پہلے بھی نہیں تھا۔ بھرے بھرے گال، آنکھوں میں زندگی کی چمک، چوڑا چکلا سینہ اور ـــــ اچانک وہ چونک گیا جیسے آئینے نے اُسے ڈرادیا ہو۔ اُس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا، آئینے کے ٹھیک سامنے لکھنے کی میز پر سنہرے فریم میں لگی تصویر مسکرارہی تھی۔ اُسے تصویر کچھ جانی پہچانی سی معلوم ہوئی۔ اُس نے ذہن پر زور دیا، یادوں کے بند دریچے کھلتے چلے گئے اور اُسے اُن دریچوں کے پیچھے ایک صورت مبہم، دھندلی سی نظر آئی اور اچانک آنکھوں پر پڑا ہوا طویل مدت کا دبیز پردہ ہٹ گیا۔ اُس نے بے تابانہ بڑھ کر تصویر اُٹھالی۔ حیرت و استعجاب کے عالم میں اُس کے مُنہ سے نکل گیا۔

"انجنا!"

وہ ابھی خود کو سنبھال بھی نہ پایا تھا کہ ڈاکٹر راج کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"آپ پہچانتے ہیں اِنہیں؟"

اُس کے ذہن میں جوار بھاٹا سا اُٹھ رہا تھا، ڈاکٹر راج کے سوال نے اُسے اور اُلجھن میں ڈال دیا۔ جیسے اُس کی کشتی بیکراں لہروں سے گذرتی ہوئی گرداب میں آپھنسی ہو۔ اُس نے ڈاکٹر راج کی طرف دیکھا جو جواب طلب

نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس نے تصویر میز پر رکھ دی اور ڈاکٹر راج کی طرف مُڑتے ہوئے بولا۔

"نہیں!"

"لیکن ابھی آپ نے اِن کا نام لیا تھا؟"

"تو کیا واقعی یہ انجنا کی تصویر ہے؟" اُس نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"ہاں، لیکن آپ کیسے جانتے ہیں انہیں؟"

"ہم کبھی ساتھ پڑھتے تھے!"

"بس، اور اِس سے زیادہ؟"

وہ تڑپ اُٹھا، اُسے محسوس ہونے لگا، ڈاکٹر راج کو اُس کے اور انجنا کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔ اُس نے آگے بڑھ کر ڈاکٹر راج کے بازوؤں کو تھام لیا اور جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"تم صرف مجھ سے سوال کئے جاؤ لیکن یہ نہ بتانا کہ تم کون ہو اور اِس تصویر سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"اگر تصویر ہی آپ کے سوالوں کا جواب دے دے تو؟" ڈاکٹر راج کے ہونٹوں پر پُراسرار مُسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے ڈاکٹر راج کو چھوڑ کر خود کو صوفے پر گرا دیا اور پھٹی پھٹی ویران آنکھوں سے ڈاکٹر راج کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں، ذہن سے ہر طرح کے خیال جھٹک کر تازہ دم ہونے کی کوشش کیجئے، میں آپ کے لئے ناشتہ بھیجتا ہوں!"

اِس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا ڈاکٹر راج بیڈ روم سے باہر نکل گیا۔

اُس کی نگاہیں پھر تصویر پر جم گئیں۔ انجنا کے ساتھ گزرے ہوئے بیشمار لمحوں، گھڑیوں، دنوں اور مہینوں نے ذہن پر یلغار کر دی۔ خیالوں کا ایک طوفان تھا جو اُمڈا اُمڈ کر آ رہا تھا، یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو دراز ہوتا جا رہا تھا۔ اُسے انجنا سے آخری ملاقات شدّت سے یاد آ رہی تھی بھیگی ہوئی پلکیں، لرزتے ہوئے ہونٹ، سہما ہوا جسم ——— اور اُس کی وہ باتیں جب وہ اپنی ٹیم کے ساتھ بنگلور کے لئے انجنا سے رخصت ہو رہا تھا، اُس نے کہا تھا ———

"میری کشتی کو بیچ بھنور میں چھوڑ کر جا رہے ہو، جلد آ کر کنارے لگا دینا، مجھے رُسوا اور بدنام ہونے سے بچا لینا، میں نے تمہیں اپنا سب کچھ مان کر ہی اپنے آپ کو تمہارے سپرد کیا ہے!"

"اُف! کتنا ذلیل ہوں میں! کس مصیبت میں چھوڑ آیا تھا انجنا کو، کن کن مصائب سے دوچار ہوئی ہوگی وہ!" اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

وہ اپنی سوچ میں گم تھا کہ پیروں کی چاپ نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

ایک بار پھر وہ حیران و سراسیمہ ہو گیا، آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں، جیسے وہ ڈاکٹر راج کے بیڈ روم میں نہیں کسی طلسمی دنیا میں آ گیا ہو ——— اُس کے سامنے میز پر ٹرے میں ناشتہ رکھا ہوا تھا اور قریب ہی کھڑی ہوئی عورت اُسے بغیر پلکیں جھپکائے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسوؤں کے قطرے اُبل پڑنے کو بے قرار، لرزتے ہوئے ہونٹ، تھر تھراتا ہوا جسم، اُس نے غور سے عورت کی طرف دیکھا۔ پھر اُس کی نگاہیں تصویر کی طرف مُڑ گئیں ——— تصویر اور یہ عورت، عورت اور یہ تصویر، ——— کتنا تضاد تھا، کتنا فرق تھا دونوں میں ——— وہ تڑپ اٹھا اور بڑھ کر اُس عورت کے بازوؤں کو تھام لیا۔

"انجنا....!" اور برسوں کے گلے، شکوے پگھل پگھل کر دونوں کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ انجنا کی سسکیاں فضا میں تیرنے لگیں۔

"تمہیں کیا پتہ کہ زمانے نے مجھ پر کتنے ستم توڑے ہیں، کن کن مصائب سے گذری ہوں میں، محبت اور وفا کے جرم میں تنہا کن کن کٹھن راستوں کو طے کیا ہے میں نے ——— زندگی کی اِن جاں گسل گھڑیوں میں ہر لمحہ تمہارا انتظار کیا کہ کب تم آ کر مجھے تھام لو ——— سیتا کو تو بارہ برس کا بن باس ہوا تھا لیکن میں نے تو....!"

اور اُس نے انجنا کے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ دی۔

"بس انجنا! بس ——— مجھے معاف کر دو!"

صبر و شکیب کا بند توڑ کر اشکوں کا سیلاب اُمڈ پڑا تھا۔

اپنی ماں کو ملول دیکھ کر مضطرب ہو جانے والا ستائیس سالہ ڈاکٹر راج پہلی بار انجنا کو روتے دیکھ کر دروازے میں کھڑا مسکرا رہا تھا....!!!

---

## غزل

پروفیسر مہندر پرتاپ چاند ایم اے

بہت دِنوں سے پریشاں ہے زندگی میری
کسی نے چھین لی اے دوست ہر خوشی میری

تمہاری یاد مری زندگی کا حاصل ہے
تمہاری یاد سے وابستہ زندگی میری

رُلا رہا جن کا غم ہمیشہ مجھے
اُڑا رہے ہیں وہی دوست اب ہنسی میری

سکوں نواز تھا کتنا غمِ محبت بھی!
کہ ڈھونڈتی ہے جسے آج ہر خوشی میری

جہاں اُمیدِ خوشی ہے نہ کوئی خوفِ اَلم
لئے چلی ہے وہاں مجھ کو بے خودی میری

## غزل

شکیل احمد عاصم بریلوی ایم کام، بی ٹی

جب بھی نظر تصورِ جاناں میں کھو گئی
دُنیا مری نگاہ میں فردوس ہو گئی

وہ مہرباں ہوئے تو جہاں ہو گیا خلاف
کھولی جو آنکھ وقت نے تقدیر سو گئی

راہِ وفا میں دیکھ کے عزمِ جواں مرا
خود میرے ساتھ گردشِ ایام ہو گئی

یہ غم نہیں کہ عشق میں رُسوا ہیں کو بکو
دُنیا اسی بہانے ہمیں جان تو گئی

عاصم کسی کے حسن سے ٹکرائی جو نگاہ
اُٹھتے ہی وہ اُسی کی طرفدار ہو گئی

## غزل

ڈاکٹر زیدی جعفر رضا ایم اے پی ایچ ڈی (علیگ)

ساون کی گھٹا بن کے برستی ہوئی آنکھیں
بھیگا ہوا موسم ہیں یہ بھیگی ہوئی آنکھیں

خوابوں میں اُتر آتی ہیں جب چاپ [illegible]
گزرے ہوئے لمحوں کی سسکتی ہوئی آنکھیں

سائل کی طرح آتی ہیں دروازۂ دل تک
کشکولِ تمنا لئے سہمی ہوئی آنکھیں

یہ سوچ کے جاتا نہیں مے خانے کی جانب
آجاتیں نہ پھر یاد وہ بھولی ہوئی آنکھیں

جعفر کو سناتی ہیں اشاروں کی زباں میں
افسانۂ دل نشے میں ڈوبی ہوئی آنکھیں

## غزل

مقبول فاروقی بی ایس سی (عثمانیہ)

پھر آج دِل کو نئے غم سے بیقرار کریں
کسی حسین ستمگر سے چل کے پیار کریں

مآلِ عشق پہ شبنم کو اشکبار کریں
شبِ فراق ستاروں کو سوگوار کریں

ملا ہے درسِ حیات اُس نگاہِ لطف سے آج
عجب نہیں کہ ہم اب زندگی سے پیار کریں

ہو جب یقیں کہ اِدھر اب نہ کوئی آئے گا
تو کس کی راہ تکیں، کس کا انتظار کریں؟

# اِک فرصتِ گناہ...

فرزانہ احمد

سی-۴۲، ایکسٹرنل افیئرز ہاسٹل، کرزن روڈ۔ نئی دہلی نمبر ا

محترم!

ایک کہانی "اِک فرصتِ گناہ" لے کر "بیسویں صدی" کی بزم میں حاضر ہو رہی ہوں۔ اُمید ہے پسند آئے گی۔
اپنی گرامی قدر رائے اور رسید سے نوازکر ممنون فرمائیں . . .

خلوص کیش ——— فرزانہ احمد

کل اور آج میں کتنا فرق ہے۔ کل تک میرے ذہن پر تم ہی تم چھائی ہوئی تھیں۔ تمھاری یاد، تمھاری آرزو اور تمھارا تصور، کل تک میرا وجود میرا اپنا تھا۔ میرا دل اور میرا دماغ سب تمھارے لئے تھے۔ میرے دل کے شفاف آئینے میں صرف ایک ہی پیکر کی تصویر جلوہ افروز تھی ——— اور وہ تم تھیں! لیکن آج ———
آج سب کچھ بدل گیا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کیا اِس طرح اچانک پلک جھپکتے میں کسی کی دُنیا یوں بدل سکتی ہے۔ تمناؤں اور آرزوؤں کے وہ خوبصورت محل جو میں نے بڑے ارمانوں سے اپنے دل کے نہاں خانوں میں سجا رکھے تھے۔ یوں ریت کے ڈھیر کی طرح بکھر جائیں گے۔ اس کا مجھے ذرا بھی احساس نہ تھا۔ میرے دل کی وادیوں میں کل جہاں مسرتوں کے پھول کِھلے ہوئے تھے، جہاں تم نے خود اپنے ہاتھوں سے پیار کے دیئے روشن کئے تھے۔ آج ایک سناٹا ہے، ایک بھیانک خاموشی! اور یہ تاریکی میرے احساسِ شکست کو اور اُبھار رہی ہے۔ شاید مایوسی کے اِس گھپ اندھیرے میں ڈوب کر میں پھر کبھی اُبھر نہ پاؤں۔

مجھے وہ دن یاد آ رہا ہے، جب تم سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ دن کسی شاعر کے تخیل کی طرح رنگین اور رومان پرور نہ تھا۔ نہ تو بہار کا موسم ہی اپنے شباب پر تھا اور نہ ہی فضا نُور برسا رہی تھی۔ وہ تو ایک سیدھی سادی سی سردیوں کی شام تھی۔ میں تمھارے خوبصورت سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھا یونہی کسی میگزین پر اچٹتی ہوئی سی نظر ڈال رہا تھا اور دل ہی دل میں تمھارے شوہر شجاع کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ اُس نے وقت کی پابندی نہ کی تھی اور ابھی تک آفس سے نہیں لوٹا تھا۔

شجاع اور میں اسکول کے پُرانے ساتھی تھے کسی زمانے میں ہم لنگوٹیا یار رہ چکے تھے اور اب جب کہ شجاع دِلّی میں ایک اعلیٰ عہدے پر مامور تھا اور میرا ابھی حال ہی میں لکھنؤ سے تبادلہ دِلّی ہو گیا تھا تو میں پُرانی یادیں تازہ کرنے تمھارے گھر چلا آیا تھا۔

میں یونہی بیٹھا اِسی اُلجھن میں تھا کہ شجاع آخر اور کتنا انتظار کروائے گا کہ اچانک کمرے کا پردہ ہِلا اور تم اندر آگئیں۔ تمھارے ہاتھ میں دو تین بڑے بڑے پیکٹ تھے اور تمھارے چہرے پر تھکن کے آثار ——— دونوں ہی اِس بات کا ثبوت تھے کہ تم ابھی ابھی شاپنگ سے لوٹی ہو۔ ڈرائنگ روم بے حد وسیع تھا اور کمرے میں مدھم سی لیمپ کی روشنی تھی۔ اِس لئے تمھاری نگاہ مجھ پر نہ پڑی۔ تم سیدھی کونے میں رکھے ہوئے خوبصورت سے دیوان کی طرف مُڑیں اور پیکٹ بے نیازی سے ایک طرف ڈال کر دیوان پر نیم دراز ہو گئیں۔ یکایک تقریباً چیخ کر تم نے اپنی خادمہ کو آواز دی۔ تمھارے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔

"ارے بھئی راحت! کیا اب ایک پیالی چائے بھی نہ ملے گی؟" پھر تم اپنے آپ ہی کچھ بولنے لگیں جیسے تمھیں کوئی بات بے حد ناگوار گزری ہو۔

اِس دوران میں جو مجھ پر گزر رہی تھی اُس کا تمھیں بالکل علم نہ تھا۔ میں تمھارے بڑے سے صوفے میں دھنسا ہوا اِس اُدھیڑ بُن میں تھا کہ اب کیا کروں اور کس طرح تمھیں اپنی طرف متوجہ کروں؟ اِسی پس و پیش میں چند لمحے گزرے ہوں گے کہ

انداز میری زندگی کا مقصد ہی بن کچھ تو بدل دیا تم نے۔ ہاں اِس کی ذمّہ دار تم ہی تو تھیں ـــــ صرف تم!

اُس دن میں آفس سے واپس آکر تھکا تھکا سا بیٹھا ہوا تھا۔ چائے کی پیالی ابھی ہونٹوں سے لگائی ہی تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی نے چونکا دیا۔ دوسری طرف تم تھیں ـــــ "شاہد آؤ میرے ساتھ گھومنے چلوگے؟" تم نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

"ضرور کیوں نہیں؟" میں نے کہا "کیا شجاع آفس سے آگیا ہے؟"
"نہیں شجاع نہیں چلیں گے۔ میں نے تمھارے لہجے کی تلخی کو اپنا وہم سمجھا۔ "آج وہ آفس سے دیر سے آئیں گے۔"

"کیوں خیر تو ہے دیبا؟" میرا دل کسی انجانے خوف سے لرز اٹھا۔ تم جھنجھلا گئیں۔

"اگر ساتھ چلنا ہو تو جلد آجاؤ!" اور تم نے فون رکھ دیا۔

میں جیسے تیسے ٹیکسی کر کے تمھارے ہاں پہنچا۔ راستہ بھر یہی سوچتا رہا اور یہی دعا کرتا رہا کہ الٰہی خیر ہو! تم باہر ہی اپنی کار کے پاس منتظر ملیں۔ تم نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ بس چپکے سے کار کا دروازہ کھول دیا۔ میں تمھارے برابر بیٹھ گیا اور تم نے کار اسٹارٹ کر دی۔ ہم دِلّی شہر کو پیچھے چھوڑتے ہوئے فرید آباد کی طرف جا رہے تھے۔

"میں جانتی ہوں شاہد تم حیران ہو گے کہ یہ آج مجھے کیا ہو گیا ہے؟" تم اچانک جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے جاگ پڑی تھیں "لیکن سچ جانو میں بہت عرصے سے تم سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ پتہ نہیں تم میرے بارے میں کیا سوچو گے۔ لیکن سچ کہتی ہوں شاہد مجھے اپنی یہ زندگی بالکل پسند نہیں۔ شجاع کے اور میرے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ تنہائی اور سکوت کا شیدائی ہے اور مجھے ہنگاموں سے پیار ہے۔ ہماری کسی عادت، کسی بات میں یکسانیت نہیں۔ پلیز شاہد! مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں بظاہر تمھیں بہت خوش نظر آتی ہوں نا ـــــ تم سوچ رہے ہوگے کہ میں بھی کتنی ناسمجھ ہوں۔ دنیا کی کون سی چیز مجھے میسّر نہیں ہے۔ لیکن یہ سب آرام، یہ آسائش، یہ زرق برق کپڑے، عالیشان سا مکان، نوکر چاکر اور ایک خوبصورت کار بھی انسان کو خوش رکھنے کے لئے کافی نہیں۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی اگر ذہنی آسودگی نہ ہو تو ان چیزوں کا رہنا نہ رہنا برابر ہے۔"

تم بول رہی تھیں اور میں دم بخود تھا۔ مجھے اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا تھا۔ میں نے سوچا شاید تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو اور ابھی ابھی کھل کھلا کر ہنس پڑو گی اور کہو گی ـــــ "دیکھا بے وقوف بن گئے نا!" لیکن میں نے دیکھا تمھاری آنکھوں میں زندگی کا سارا درد اور کرب سمٹ آیا تھا۔ تم نے کار روک دی۔ ہم فرید آباد لیک پہنچ چکے تھے۔ دھیرے دھیرے ٹہلتے ہوئے ہم پانی کے قریب آ گئے اور تم تھکی تھکی سی اُداس ایک طرف بیٹھ گئیں۔ دور پانی کی سطح پر غروب ہوتے ہوئے سورج نے آگ سی لگا رکھی تھی۔ پانی کی لہریں سورج کی طرف یوں اٹھتی تھیں جیسے اسے اپنی آغوش میں لے کر ہی اِس آگ کو ٹھنڈی کر پائیں گی۔ کیسا سہانا منظر تھا۔ میں نے تمھاری طرف دیکھا۔ کتنی پُرکشش تصویر تھی۔ تمھارے اُڑتے الجھے سے بال، تمھاری افسردہ آنکھیں اور تمھارے لرزتے ہوئے ہونٹ!

اُس وقت میری مدد کے لئے میری طرف بڑھا ہوا تمھارا ہاتھ مجھے جھٹک دینا چاہئے تھا۔ تمھیں ڈانٹنا چاہئے تھا اور زبردستی تمھیں گھر واپس لے جانا

•••──────•──────•••──────•──────•••

- صابر شخص سونے کی کان ہوتے ہیں۔ یہ آپ کا حوصلہ ہے کہ آپ ان سے کتنا سونا حاصل کرتے ہیں۔ (تلسی رامائن)
- سارا جہان چھان لے، تجھے تیرے نفس سے بڑھ کر کوئی دشمن نہ ملے گا۔ (سوامی سارشبدانند جی)
- عزت اور بزرگی کا ہر شخص آرزومند ہے لیکن اِن کے لئے عمل کوئی نہیں کرتا۔ (سوامی سارشبدانند جی)
- جس کا دل آزاد ہو وہ گندگی کا ٹوکرا اٹھائے ہوئے بھی راجہ ہے۔ (مہاتما گاندھی)
- آزادی ارتقا کا پہلا زینہ ہے۔ (سوامی وِویکانند جی)

•••──────•──────•••──────•──────•••

چاہئے تھا۔ مجھے کہنا چاہئے تھا ہوش کی دوا کرو دیبا ـــــ شجاع جیسے عظیم انسان کو ٹھکرا کر تم مجھ جیسے حقیر آدمی کی طرف کیوں بڑھ رہی ہو۔ لیکن ـــــ میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں فرشتہ تو نہیں تھا نا۔ شام کا وہ حسین سماں، تمھارا وہ افسردہ حُسن اور وہ بھیگی بھیگی آنکھیں۔ یہ سب میرے چٹان جیسے مضبوط عزم کو ہلا دینے کے لئے کافی تھے۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے جھک کر تمھاری لرزتی پلکوں پر سے گرتے ہوئے موتی اپنے ہونٹوں میں جذب کر لئے۔

اُس حسین شام کے بعد میں دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی بن گیا۔ دنیا کی ساری خوشیاں جیسے میرے قدموں کے آگے ڈھیر ہو گئیں۔ میری ہستی پر تم چھا گئیں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ۔

ہم اب بھی اُسی طرح ملتے۔ شجاع اب بھی ہمارے ساتھ رہتا لیکن اب

اچانک جیسے تم نے میرے دل کی بات تاڑلی ہو۔ تم یکلخت میری طرف پلٹیں اور گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ارے یہ آپ کب سے یہاں بیٹھے ہیں؟" تمھاری آواز میں کچھ گھبراہٹ اور کچھ ندامت کے ملے جلے جذبات تھے۔ میں نے گھبرا کر تمھاری طرف دیکھا۔ تم نے چاکلیٹی رنگ کے سلیکس پہن رکھے تھے اور چاکلیٹی ہی رنگ کا کُرتہ اور دوپٹہ تھا۔ تمھارا تھکا تھکا سا پژمُردہ چہرہ لیمپ کی مدّھم روشنی میں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سورج مکھی کا پیلا پیلا سا پھول ڈوبتے ہوئے سورج کو حسرت و یاس سے الوداع کہہ رہا ہو۔

تم نے میرے جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور بہت تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئیں۔ برابر کے کمرے سے تمھاری آواز مجھے صاف سُنائی دے رہی تھی۔ شاید تم

---

- اپنے اعمال و اخلاق کی اصلاح سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔
(حضرت شیخ ابو تراب بخشیؒ)
- خاموشی دانائی کی علامت ہے، گویائی بقدرِ حاجت ہونی چاہیے۔
(حضرت شیخ ابو بکر ورّاقؒ)
- اگر تم چاہتے ہو کہ دُشمن تک تمھارا راز نہ پہنچے تو دوست کو بھی اپنا راز دار نہ بناؤ۔ (حضرت شیخ فرید الدّین عطارؒ)
- سب سے زیادہ دولت مند وہ ہے جو سب سے زیادہ قانع ہے۔
(حضرت بابا فرید الدّین گنج شکرؒ)
- باتُونی آدمی کا دل بیمار ہوتا ہے۔ (حضرت شیخ فرید الدّین عطارؒ)

---

اپنی خادمہ کو ڈانٹ رہی تھیں کہ اُس نے تمھیں ایک اجنبی کی موجودگی سے خبردار کیوں نہ کیا تھا؟

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ تمھیں اور پریشان نہ کروں اور واپس چلا جاؤں کہ اتنے میں شُجاع آ گیا ـــــ بڑی مُدّتوں بعد ہم ملے تھے اِس لئے میں اُس سانحے کو بھُول گیا جو ابھی ابھی مجھ پر گزُرا تھا اور شُجاع سے باتوں میں کھو گیا۔ اِتنے میں قرینے سے سجی ہوئی ٹرالی میں گرم گرم چائے اور پکوڑے تمھاری خادمہ لے آئی اور ساتھ ہی تم بھی آ گئیں۔ تم نے اپنے بال سنوار لیے تھے اور ہلکی سی لپ اسٹک لگا لی تھی۔ تمھارا چہرہ تازہ کنول کی طرح کھِل اُٹھا تھا۔ شُجاع نے ہم دونوں کا تعارف کرایا۔ تم بہت گرمجوشی سے ملیں اور بہت اصرار سے مجھے چائے پلائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ابھی ابھی جو حادثہ ہوا تھا تم اُسے بالکل بھُول گئی ہو۔ میں دل ہی دل میں اِس بات پر حیران بھی تھا۔ اپنے اطمینان کے لئے آخر میں نے جرأت کر کے تم سے پوچھ ہی لیا۔

"دیکھئے اب تو آپ خفا نہیں ہیں نا؟"

"خفا؟" تم نے حیرت سے پُوچھا "اوہ!" اور تم کھِل کھِلا کر ہنس پڑیں "وہ تو میری عادت ہے" تم نے بے پرواہی سے کہا "میں جب بھی شاپنگ کر کے لَوٹتی ہوں یونہی سب پر بگڑا کرتی ہوں۔ شُجاع تو ایسے وقت میں موقع پا کر کہیں کھسک جاتے ہیں" اور تم نے پیار سے شُجاع کی طرف دیکھا۔

"جبھی تو آج میں آفس سے دیر سے آیا ہوں" شُجاع نے سنجیدگی سے کہا اور ہم سب ہنس پڑے۔ مجھے تمھارا یہ انداز بے حد پسند آیا۔ تمھاری اِس سادگی ـــــ اور بھولے پن سے اِس بات کا اقرار کر لینا کہ تمھیں جلد غصّہ آ جاتا ہے ـــــ اُس شام میں بہت دیر تک تمھارے ہاں رہا۔ تم نے اور شُجاع نے اصرار کر کے مجھے کھانے کے لئے روک لیا اور پھر اپنی کار میں تم مجھے گھر پہنچانے آئے۔ اُس رات اور اُس کے بعد اکثر میں تم لوگوں کے بارے میں سوچا کرتا۔ کتنا خوش قسمت ہے شُجاع کہ اُسے تم جیسی پیاری اور ذہین بیوی مِلی ہے۔ میں سوچتا ـــــ تم دونوں کتنے خوش نظر آتے تھے جیسے ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ گو بظاہر تم شُجاع سے خوب لڑائی کیا کرتیں اس کی ہر بات میں پخ نکالتیں اور بحث کرتیں۔ دن میں کئی کئی بار اُس سے رُوٹھ جاتیں لیکن تمھاری نظریں تو کسی کو دھوکا نہیں دے سکتی تھیں۔ اُن آنکھوں میں صرف ایک ہی آدمی کی تصویر جھلکتی تھی اور وہ خوش نصیب شُجاع تھا۔

تم دونوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا جیسے میرا معمول بن گیا۔ میں روز کسی نہ کسی بہانے تمھارے ہاں پہنچ جاتا یا تم دونوں مجھے کھینچ لے جاتے۔ کوئی ریستوران کوئی فلم یا کوئی اور جگہ ایسی نہ بچی ہو گی جہاں ہم ساتھ نہ دیکھے گئے ہوں۔ شُجاع کی ذہانت، سنجیدگی اور متانت سے گو میں پہلے ہی متاثّر تھا اب تمھاری شوخی اور الّھڑ پن بھی مجھے اپنی طرف کھینچنے لگے۔

اکثر ایسی حسین راتوں کی یادیں میرے دل پر نقش ہو گئی ہیں جب کہ ہم تینوں تمھارے ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے ہوئے کافی کی پیالی سامنے رکھے خوب گرم گرم بھُنی ہوئی مونگ پھلی کھاتے ہوئے گھنٹوں اُردو اور انگریزی ادب پر بحث کیا کرتے تھے۔ شیلے اور کیٹس سے لے کر منشی پریم چند اور کرشن چندر تک کوئی بھی ہماری تنقید کی زد سے نہ بچتا۔ کتنے پیارے دن تھے وہ جب دل میں یہ ٹیس نہ تھی، یہ درد نہ تھا، یہ اُلجھن نہ تھی ـــــ بس زندگی ایک مسلسل مُسکراہٹ بن کر رہ گئی تھی۔

ایک دن ـــــ اور وہ دن بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے کیونکہ اُس دن کے بعد سے پھر میں وہ پہلا سا انسان نہ رہا۔ میری راتیں بدل گئیں۔ میرے سوچنے کا

انداز میری زندگی کا مقصد ــــ سبھی کچھ تو بدل دیا تم نے۔ ہاں اس کی ذمہ دار تم ہی تو تھیں ـــــ صرف تم!

اُس دن میں آفس سے واپس آکر تھکا تھکا سا بیٹھا ہوا تھا۔ چائے کی پیالی ابھی ہونٹوں سے لگائی ہی تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی نے چونکا دیا۔ دوسری طرف تم تھیں ـــــ "شاہد آج میرے ساتھ گھومنے چلو گے" تم نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

"ضرور کیوں نہیں" میں نے کہا "کیا شجاع آفس سے آگیا ہے؟"

"نہیں شجاع نہیں چلیں گے" میں نے تمہارے لہجے کی تلخی کو اپنا وہم سمجھا "آج وہ آفس سے دیر سے آئیں گے"

"کیوں خیر تو ہے دیبا؟" میرا دل کسی انجانے خوف سے لرز اٹھا تم جھنجھلا گئیں۔

"اگر ساتھ چلنا ہو تو جلد آجاؤ!" اور تم نے فون رکھ دیا۔

میں جیسے تیسے ٹیکسی کر کے تمہارے ہاں پہنچا۔ راستہ بھر یہی سوچتا رہا اور یہی دعا کرتا رہا کہ الٰہی خیر ہو! تم باہر ہی اپنی کار کے پاس منتظر ملیں۔ تم نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ بس چپکے سے کار کا دروازہ کھول دیا۔ میں تمہارے برابر بیٹھ گیا اور تم نے کار اسٹارٹ کر دی۔ ہم دلی شہر کو پیچھے چھوڑتے ہوئے فرید آباد کی طرف جا رہے تھے۔

"میں جانتی ہوں شاہد تم حیران ہو گے کہ یہ آج مجھے کیا ہو گیا ہے؟" تم اچانک جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے جاگ پڑی تھیں "لیکن سچ جانو میں بہت عرصے سے تم سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ پتہ نہیں تم میرے بارے میں کیا سوچو گے۔ لیکن سچ کہتی ہوں شاہد مجھے اپنی یہ زندگی بالکل پسند نہیں۔ شجاع کے اور میرے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ تنہائی اور سکوت کا شیدائی ہے اور مجھے ہنگاموں سے پیار ہے۔ ہماری کسی عادت، کسی بات میں یکسانیت نہیں۔ پلیز شاہد! مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں بظاہر تمھیں بہت خوش نظر آتی ہوں نا ـــــ تم سوچ رہے ہو گے کہ میں بھی کتنی ناسمجھ ہوں۔ دنیا کی کون سی چیز مجھے میسر نہیں ہے۔ لیکن یہ سب آرام، یہ آسائش، یہ زرق برق کپڑے، عالیشان سا مکان، نوکر چاکر اور ایک خوبصورت کار ہی انسان کو خوش رکھنے کے لئے کافی نہیں۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی اگر ذہنی آسودگی نہ ہو تو ان چیزوں کا رہنا نہ رہنا برابر ہے۔"

تم بول رہی تھیں اور میں دم بخود تھا۔ مجھے اپنے کانوں پر، اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا تھا۔ میں نے سوچا شاید تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو اور ابھی ابھی کھلکھلا کر ہنس پڑو گی اور کہو گی ـــــ "دیکھا بے وقوف بن گئے نا" لیکن میں نے دیکھا تمھاری آنکھوں میں زندگی کا سارا درد اور کرب سمٹ آیا تھا۔ تم نے کار روک دی۔ ہم فرید آباد لیک پہنچ چکے تھے۔ دھیرے دھیرے ٹہلتے ہوئے ہم پانی کے قریب آگئے اور تم تھکی تھکی سی اُداس ایک طرف بیٹھ گئیں۔ دور پانی کی سطح پر غروب ہوتے ہوئے سورج نے آگ سی لگا رکھی تھی۔ پانی کی لہریں سورج کی طرف یوں اٹھتی تھیں جیسے اسے اپنی آغوش میں لے کر ہی اس آگ کو ٹھنڈی کر پائیں گی۔ کیسا سہانا منظر تھا۔ میں نے تمھاری طرف دیکھا۔ کتنی پُرکشش تصویر تھی۔ تمھارے اُڑتے اُڑتے سے بال، تمھاری افسردہ آنکھیں اور تمھارے لرزتے ہوئے ہونٹ!

اُس وقت میری مدد کے لئے میری طرف بڑھا ہوا تمھارا ہاتھ مجھے جھٹک دینا چاہئے تھا، تمھیں ڈانٹنا چاہئے تھا اور زبردستی تمھیں گھر واپس لے جانا

---

- مہاپُرش سونے کی کان ہوتے ہیں۔ یہ آپ کا حوصلہ ہے کہ آپ اُن سے کتنا سونا حاصل کرتے ہیں۔ (تلسی رامائن)
- سارا جہان چھان لے ر تجھے تیرے نفس سے بڑھ کر کوئی دشمن نہ ملے گا۔ (سوامی سار شبدانند جی)
- عزت اور بزرگی کا ہر شخص آرزو مند ہے لیکن اِن کے لئے عمل کوئی نہیں کرتا۔ (سوامی سار شبدانند جی)
- جس کا دل آزاد ہو وہ گندگی کا ٹوکرا اُٹھاتے ہوئے بھی راجہ ہے۔ (مہاتما گاندھی)
- آزادی ارتقا کا پہلا زینہ ہے۔ (سوامی وِویکانند جی)

---

چاہئے تھا۔ مجھے کہنا چاہئے تھا ہوش کی دوا کرو دیبا ـــــ شجاع جیسے عظیم انسان کو ٹھکرا کر تم مجھ جیسے حقیر آدمی کی طرف کیوں بڑھ رہی ہو۔ لیکن ـــــ میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں فرشتہ تو نہیں تھا نا۔ شام کا وہ حسین سماں، تمھارا وہ افسردہ حسن اور وہ بھیگی بھیگی آنکھیں۔ یہ سب میرے چٹان جیسے مضبوط عزم کو ہلا دینے کے لئے کافی تھے۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے جھک کر تمھاری لرزتی پلکوں پر سے گرتے ہوئے موتی اپنے ہونٹوں میں جذب کر لئے۔

اُس حسین شام کے بعد میں دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی بن گیا۔ دنیا کی ساری خوشیاں جیسے میرے قدموں کے آگے ڈھیر ہو گئیں۔ میری ہستی پر تم چھا گئیں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ۔

ہم اب بھی اسی طرح ملتے۔ شجاع اب بھی ہمارے ساتھ رہتا لیکن اب

تمھاری نظروں میں میرے لئے ایک پیغام ہوتا جسے میں آنکھوں ہی آنکھوں میں قبول [illegible] اکیلی بھی میرے ساتھ گھومنے جاتیں۔ میرے گھر آکر گھنٹوں مجھ سے [illegible] کیا کرتیں۔ وہ لمحے میری زندگی کے حسین ترین لمحے ہوتے۔ حالانکہ یہ بات نہ [illegible] کہ تمھارا حُسن اِتنا سحر انگیز تھا کہ میری آنکھوں میں کوئی اور نہ جچتا۔ تمھاری ہی چھوٹی بہن شبانہ بھی تو تھی ـــ بے حد خوبصورت۔ جیسے شاعر کا تخیل! اُس کی آنکھوں میں میں نے اپنے لئے محبت کے پیغام دیکھے تھے۔ لیکن تمھارا جادو مجھ پر چل چکا تھا۔ مجھے تمھارے سوا کوئی اچھا نہیں لگتا۔ گو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ تمھیں پا لینے کی آرزو کرنا ایسے ہی ہے جیسے چکور کا بار بار چاند کی طرف مائل پرواز ہونا۔ لیکن جب دل کو یہ یقین ہو کہ جس کی یاد میں وہ تڑپتا ہے، وہ بھی اُس کے لئے بے چین ہے تو جُدائی کی تڑپ میں بھی ایک لذّت محسوس ہوتی ہے۔ رات کو بستر میں بے چینی سے کروٹیں بدلنے کا اضطراب بھی کتنا سُرور آگیں ہوتا ہے۔ میرے دل کی بھی کچھ ایسی ہی حالت تھی۔ اُسے تڑپتا دیکھ کر ہی مجھے لُطف آتا تھا۔ میرے پیار میں سُورج کی تپش بھی تھی، شبنم کی ٹھنڈک بھی اور کلیوں کی سی معصومیت بھی ـــ میرے لئے تو یہی بات کافی تھی کہ تمھاری محبت مجھے حاصل تھی۔ تمھارا حسین تصوّر ہی میرے دل و دماغ کو فرحت بخشنے کے لئے بہت کچھ تھا۔

دن گزرتے رہے۔ تم میرے قریب آتی گئیں اور میں تمھاری کنول جیسی آنکھوں کی گہری جھیلوں میں ڈُوبتا گیا۔ یہاں تک کہ میں صرف تمھارا خیال بن کر رہ گیا! جب تم اپنا خوبصورت سا سر میرے کاندھے پر رکھے ہوتیں اور محبت کے نشے میں سرشار ہم گھنٹوں یونہی بیٹھے رہتے تو میں خدا سے صرف ایک ہی دُعا مانگا کرتا۔ کاش! یہ ایک پل، یہ حسین لمحہ کبھی ختم نہ ہو۔ وقت یہیں ٹھہر جائے۔ نہ اب کبھی صبح ہو نہ رات ہی آئے۔ بس یونہی ہم وقت کو اپنی باہوں میں اسیر کرلیں۔ ہم نے اپنی محبت کی نشانیاں ایک دوسرے کو دیں۔ چھوٹے موٹے تحفے جن کی قیمت دُنیا کی نظروں میں کچھ نہ سہی پیار کی نظروں میں بہت کچھ تھی۔

کل اور آج میں واقعی کتنا فرق ہے۔ آج کی رات میرے نصیب کی سب سے بھیانک رات ہے۔ آج بھی میرے دل کے آئینے میں تمھاری تصویر کا عکس موجود ہے۔ لیکن اب اُس کے خط و خال بدل رہے ہیں۔ جیسے ٹھہرے ہوئے پُرسکون پانی کی سطح پر کسی نے ایک کنکری پھینک دی ہو اور پانی میں ہلچل مچ گئی ہو۔ تمھارا چہرہ مسخ ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ تمھاری تصویر صاف دِکھائی نہیں دیتی۔ میں تنہا اپنے کمرے میں بیٹھا ہوں۔ سامنے جلے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ پتہ نہیں میں نے کتنی سگریٹ پیے ہیں اور کتنے اور پیوں گا۔ کیا دل کی یہ آگ کبھی نہ بجھے گی؟

آج شام ہی کی تو بات ہے۔ میں تمھارے ہاں گیا تھا۔ تم نے مجھے بلایا تھا۔ لیکن جب تمھارے گھر پہنچا تو تمھاری خادمہ نے بتایا کہ تم لوگ گھر پر نہیں ہو اور میرے لئے ڈرائنگ روم میں ایک خط چھوڑ گئے ہو ـــ میں نے دیکھا میز پر ایک بڑا سا پارسل خوبصورت رِبن سے بندھا ہوا رکھا تھا اور ساتھ ہی میرے نام کا ایک لفافہ۔ میں نے خط کھول لیا۔ یہ تمھاری تحریر تھی ـــ

ڈیر شاہد!

خط پڑھنے کے بعد تم پر نہ جانے کیا گزرے گی۔ ہو سکتا ہے بلکہ مجھے یقین ہے تم مجھ سے بے پناہ نفرت کرنے لگو گے اور بات بھی تو ایسی ہی ہے ـــ شاید تم اِس صدمے کو برداشت نہ کر سکو۔ لیکن تمھیں تو ابھی دُنیا میں بہت کچھ کرنا ہے۔ اس لئے ہمّت سے کام لو۔

شُجاع سے تمھاری تعریف سُنتے سُنتے میرے کان پک گئے تھے۔ تمھاری شرافت، تمھاری "فرشتہ خصلت" اور تمھاری دوستی کے وہ ہر دم گُن گایا کرتے تھے۔ آخر میں نے شُجاع کو چیلنج کیا کہ آج تک کوئی ایسا مرد پیدا نہیں ہوا جو پاس آئی ہوئی دولت کو ٹھکرا دے۔ چاہے اُس پر اُس کے جگری دوست ہی کا حق کیوں نہ ہو ـــ آگے تو تم جانتے ہی ہو۔ شُجاع اپنی شرط ہار چکے ہیں اور بے حد شرمندہ ہیں ـــ ہاں میں چاہتی تھی کہ تمھارے دیئے ہوئے تحفے بطور "یادگار" رکھ لوں لیکن شُجاع کو اس بات سے اتفاق نہیں ہے۔

آخر میں ایک بات کہوں؟ مجھ سے نفرت کرنے سے پہلے ذرا اپنا جائزہ بھی لے لینا ـــ!!

ـــ دیبا

---

مدیر "بیسویں صدی" کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

# غزل

**سید شکیل دسنوی بی۔ ایس سی (آنرز)**

ہے عارض پہ ترے رنگِ حیا آخرِ شب
حسن کچھ اور ہوا ہوش رُبا آخرِ شب

کسمانے لگے سوئے ہوئے ارماں کتنے
کس نے دی آکے درِ دل پہ صدا آخرِ شب

شمعِ اُمید و تمنّا، مہ و انجم کے چراغ
تم نہ جب آئے تو اک ایک بجھا آخرِ شب

وہ شبک لمس کسی ریشمی پیراہن کا
چھو کے تن یاد دلاتی ہے صبا آخرِ شب

سیل میں اشک کے ارماں کے سفینے ڈوبے
دل میں وہ درد کا طوفان اٹھا آخرِ شب

**مسعدی پرتاب گڑھی**

خون مانگے ہے نہ نذرانۂ سر مانگے ہے
زندگی ہم سے بس اک حسنِ نظر مانگے ہے

حسن خود بیں سے لگا رکھی ہے اُمیدِ وفا
عشق دیوانہ ہے، پتھر سے گُہر مانگے ہے

قطرۂ اشک جو ٹپکے تو لہو بن جائے
اتنی توفیق مرا دیدۂ تر مانگے ہے

اب تو یک رنگیِ فطرت ہے طبیعت پہ گراں
چشمِ مشتاق نئے شمس و قمر مانگے ہے

دل نے پائے تھے جو کل ذوقِ طلب میں تحفے
آج پھر زیست وہی زخمِ سفر مانگے ہے

**برجموھن شفق۔ بی۔ ایس سی**

دلِ بے تاب کی آہوں میں اثر کچھ بھی نہیں
ہم مرے جاتے ہیں اور اُن کو خبر کچھ بھی نہیں

اور ہی ہوں گے وہ جو تجھ سے ہراساں ہوں گے
مجھے اے گردشِ دوراں ترا ڈر کچھ بھی نہیں

میں پریشاں ہوں اِدھر اُن کی جفاؤں کے سبب
اور اُدھر میری وفاؤں کا اثر کچھ بھی نہیں

بے طرح اُن کے تصور میں تھے ہم کھوئے ہوئے
کب گئی رات، سحر آئی، خبر کچھ بھی نہیں

بے یقیں پھر کئے لیتا ہوں ترے وعدے کا
اپنے وعدے کا تجھے پاس مگر کچھ بھی نہیں

نبض مدھم ہے مری سانس ہے اکھڑا اکھڑا
اے اجل اب ترے آنے میں کسر کچھ بھی نہیں

اے شفق شاعری اِک فن ہے نہایت عمدہ
مگر افسوس کہ اب قدرِ ہنر کچھ بھی نہیں

**چندر پرکاش جوہر بجنوری**

لذّتِ عشق ملی تلخیِ آلام کے بعد
اب کسی جام کی حسرت نہیں اِس جام کے بعد

میں خطا کارِ محبت سہی لیکن اے دوست
زندگی اور نکھر آئی ہر الزام کے بعد

شمع کے جلتے ہی اے دوست بھر آئے آنسو
کل تجھے میں نے بہت یاد کیا شام کے بعد

بادۂ عشق میں کتنا تھا سرور اے جوہر
عمر بھر ہوش نہ آیا مجھے اک جام کے بعد

# Baisakhi

## brings new hope to Farmers

## پنجاب زرعی پیداوار میں ایک قدم اور آگے

- امسال اجناس کی پیداوار 63.90 لاکھ ٹن ہے جبکہ پچھلے سال 60.20 لاکھ ٹن تھی۔
- 35 لاکھ ایکڑ رقبہ زیادہ جھاڑ دینے والی قسموں کے تحت لایا گیا ہے جبکہ 69 - 1968ء میں 30 لاکھ ایکڑ رقبہ تھا۔
- سنٹرل فوڈ ریزرو کے 36 لاکھ ٹن میں سے پنجاب نے 25 لاکھ ٹن کا حصہ ڈالا ہے۔
- اس سال 10 لاکھ ٹن کھاد استعمال کی گئی ہے جبکہ گذشتہ سال 8.5 لاکھ ٹن استعمال کی گئی تھی۔
- کھادوں کی خرید کے لئے 35 کروڑ روپے کے کوآپریٹو قرضہ جات جبکہ گذشتہ سال یہ قرضہ جات 32.17 کروڑ روپے کے تھے۔
- 14 کروڑ روپے ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کے لگانے کے لئے مہیا کئے گئے ہیں جبکہ 69 - 1968ء کے لئے 11 کروڑ روپے مخصوص کئے گئے تھے۔

شائع کردہ:۔ محکمۂ اطلاعات اینڈ پبلسٹی۔ پنجاب

# پرچھائیں

سیّد وزیر حسین

مکان نمبر ۴۰۱-۲-۱۷، ریتی بازار، حیدرآباد نمبر ۲۳

مکرمی و محترمی جناب خوشتر گرامی صاحب! تسلیمات و نیاز

فروری کا "بیسویں صدی" نظر نواز ہوا۔ اپنے محبوب صحیفے کا ہر شمارہ اُمید سے بڑھ چڑھ کر ہوتا ہے۔ تیر و نشتر کے رنگین صفحات ہمیشہ دلچسپ اور حقیقت آمیز ہوتے ہیں۔ ان کمالات سے تو آپ کے بدترین حریف بھی آپ کی پُر عظمت شخصیت کے معترف ہیں اور ہمارے جیسے بے شمار مدّاحوں کے دل سے بے ساختہ داد نکل جاتی ہے ـــــ آپ نہ صرف اُردو ادب کے روحِ رواں اور رہنما ہیں، کئی سیاست دانوں کے لئے بھی رہنما ثابت ہوئے ہیں ـــــ اِس بار آپ کی خدمت میں جو افسانہ پیش کر رہا ہوں، اُمید ہے نئی تیکنک اور انوکھے پن کی بنا پر آپ کو پسند آئے گا۔ اِس افسانہ کا موضوع بھی محبت ہے۔ لیکن صرف کہانی کا مرکزی کردار یک طرفہ محبت میں مبتلا ہے۔ اِس کے علاوہ یہ کہانی دو نسوانی کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ نگار اور نیّر دونوں کی داستان ایک ہے، کردار ایک ہے۔ صرف وقت اور زمانے نے اُن کا نام بدل دیا ہے۔ افسانہ کے آغاز اور نقطۂ عروج کے بارے میں آپ پڑھ کر ہی بہتر اندازہ کر سکیں گے . . .

آپ کا ـــــ سیّد وزیر حسین

اب ریڈیو سے کوئی بے ہنگم گیت نشر ہو رہا تھا۔ پہلے تو نگار نے سوچا آواز دھیمی کر دے۔ لیکن گیت کا نہ کوئی سُر تھا نہ کوئی لَے۔ اُس نے ریڈیو بند کر دیا۔ اب ہر طرف سناٹا تھا۔ دودھیا بلب کی روشنی کے باوجود ہر سُو ویرانی برس رہی تھی۔

وہ سوئٹر بُنتے بُنتے تھک چکی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں، اب بھی اُس کے ہاتھ مسلسل کروشیا کی سوئی اور دھاگے سے کھیل رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی گردن اُٹھا کر دروازے کی طرف دیکھ لیتی اور پھر اپنی نظریں سوئٹر پر جما دیتی۔

اچانک گھڑی نے گیارہ بجائے۔

"اُف ـــــ وہ ابھی تک نہیں آیا!" نگار زیرِ لب بڑبڑائی۔ وہ اِس وقت اپنے نوجوان لڑکے زاہد کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ پہلا اتفاق تھا جو اِتنی دیر تک وہ گھر سے غیر حاضر رہا تھا۔ نگار اُن عورتوں میں سے تھی، جن کی زندگی کا مقصد صرف اَولاد کی تعلیم و تربیت ہی ہوتا ہے۔ اِسی لئے زاہد ایک ہونہار طالبعلم کے ساتھ ساتھ باکردار اور خوش اخلاق نوجوان تھا۔ اُس کے باپ نے اکثر غفلت برتی۔ لیکن ماں کی کڑی نگہداشت نے کبھی اُسے بے راہرو نہ ہونے دیا تھا۔

لیکن وہ کچھ دِنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ زاہد جیسے ہی بی ایس سی فائنل میں آیا ہے، اُس کا انداز بدلتا جا رہا ہے۔ اُس کی ہر بات کا رنگ بدل گیا ہے۔ کبھی ذرا سی بات پر دل کھول کر قہقہے بکھیرتا، کبھی معمولی سی بات پر طیش سے بپھر جاتا۔ اِن عادات کے پیشِ نظر یہ کچھ دُشوار نہ تھا کہ نگار اُس کے بدلتے ہوئے مزاج کو بھانپ لے۔

گہرے سکوت سے تنگ آکر نگار نے پھر ریڈیو کھول دیا۔ کمرہ ایک بار پھر مختلف قسم کے ساز و آواز سے گونج اُٹھا۔ گیت ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ باہر کسی کے

قدموں کی چاپ سنائی دی۔ نگار نے ریڈیو بند کر دیا اور ہلکی سی انگڑائی لے کر دروازے کے باہر دیکھنے لگی۔ آنے والا زاہد ہی تھا۔

"کھانا ٹھنڈا ہو گیا ہو گا، ابھی گرم کئے دیتی ہوں" وہ اِتنا کہہ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ زاہد لباس بدلتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ماں کی یہ شفقت کسی نہ کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ نگار کھانا لے آئی۔ وہ چُپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔ اِس دَوران نگار خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔

"آپ ابھی تک سوئی نہیں؟" زاہد نے اُٹھتے ہوئے پُوچھا۔

"نہیں ـــــ تمھارے ڈیڈی سو چکے ہیں۔ اگر جاگتے رہتے تو جانتے ہو اِتنی دیر سے آنے پر کتنا خفا ہوتے۔"

"کیا بتاؤں ممی ـــــ آج دوستوں کے بے حد اصرار پہ فرسٹ شو فلم جانا پڑا۔ اِس لئے مجھے اتفاقاً دیر ہو گئی" اُس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"فلم تو دس بجے تک ختم ہو گئی ہو گی" نگار نے تُرش روئی سے کہا۔

"وہ بات یہ ہوئی ـــــ دوستوں میں یونہی ایک مسئلہ پر بحث چھڑ گئی۔ اُسی میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ وہ سب تو ابھی گھر شاید نہ پہنچے ہوں، میں تو آپ کے خوف سے جلد بھاگ آیا۔"

نگار نے میز پر سے سوئٹر اُٹھاتے ہوئے پُوچھا "کیا تمھارے کچھ نئے دوست پیدا ہو گئے ہیں؟"

"جی ـــــ" وہ بے اختیار مُسکرا دیا "جی ـــــ جی نہیں وہی پُرانے دوست ہیں" اپنی بوکھلاہٹ پر وہ کھسیا کر رہ گیا۔

"بہرحال ـــــ یہ چھپنا چھوڑو۔ یہ رات گئے تک ایسے دوستوں کی صحبت ضرور کچھ نہ کچھ رنگ لائے گی۔"

زاہد اندر ہی اندر شرمندہ ہو رہا تھا کہ آج دیر سے آنے میں قطعاً دوستوں کا کوئی قصور نہ تھا۔ دوست تھے ہی کہاں۔ لیکن بہانہ سازی کے لئے دوستوں کا نام اِتنا ہی ضروری ہے جتنا علاج کے لئے دوا۔

"خیر چلو اب سو جاؤ ـــــ آئندہ احتیاط کرنا۔ اِتنی سردی میں دیر تک باہر رہنا صحت کے لئے نقصان دہ ہے" نگار یہ کہتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔

وہ کچھ دیر تک بیٹھا یوں ہی عادتاً پاؤں ہلاتا رہا۔ پھر یکایک اُٹھ کر شلف کی طرف بڑھا اور اُس میں سے ایک سُرخ جلد والی کتاب نکالی۔ کتاب کے اوراق کے درمیان ایک تصویر رکھی ہوئی تھی۔ زاہد نے مُسکرا کر تصویر ہاتھ میں لے لی اور اُسے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا "دیکھتا ہوں نیر ـــــ تم کب تک مجھ سے بھاگتی رہو گی!" پھر تصویر کو ہونٹوں کے قریب لا کر کتاب میں رکھتے ہوئے بولا "اچھا نیر ڈارلنگ، اگڈ نائٹ!"

زاہد نیر کے خیالات میں کچھ اِس طرح کھویا ہوا تھا کہ اُسے پتہ ہی نہ چلا نیچے کی کھڑکی سے دو آنکھیں بغور اُس کی حرکات کا جائزہ لے رہی ہیں۔ بجلی بجھا کر اطمینان سے لیٹ گیا۔ رات جو اب تک رینگ رہی تھی تیزی سے دوڑنے لگی۔ زاہد سو چُکا تھا۔ وہ اِس بات سے بے خبر تھا کہ رات اپنی تاریکی سمیت کھسک رہی ہے یا بھاگ رہی ہے۔ لیکن اِس کا اندازہ نگار کو ضرور تھا کیونکہ وہ بھی بستر پر کروٹیں لیتی جاگ رہی تھی۔

دوسری صبح اِتنی خوشگوار نہ تھی۔ نگار نے کتاب سے تصویر نکال کر بہت غور سے دیکھا۔ زاہد کمرے میں موجود نہ تھا۔ ایک خوبصورت لڑکی کی رنگین تصویر تھی۔ سبز جھاڑی کے قریب کھڑی یہ لڑکی واقعی ایک نوخیز کلی کی طرح شاداب نظر آ رہی تھی۔ سُرخ و سپید رنگ پر کھلتے ہوئے نقوش بہت ہی سادہ اور جاذبِ نظر تھے۔ تصویر اپنے پاس رکھتے ہوئے اُس نے سوچا "زاہد کا انتخاب تو بے حد داد طلب ہے۔ لیکن یہ ہے کون؟" ایسے ہی بے شمار سوالات سے اُس کا سکون چھن گیا تھا۔ زاہد کو اِس کا پتہ اُس وقت چلا جب وہ تیار ہو کر کالج جانے والا تھا۔ وہ پہلی بار اپنی ماں پر جھنجھلا کر رہ گیا۔

نگار پُوچھ رہی تھی "امتحان کو صرف دو مہینے ہیں اور تم محبت جیسی فضول اور لغو حرکتیں میں اپنا وقت برباد کر رہے ہو؟"

زاہد خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ کم عمر اور تعلیم یافتہ مائیں بھی اکثر اولاد کے لئے بہت دردِ سر بن جاتی ہیں۔ بہت مشکل سے اُس نے لب ہلائے "آپ کو غلط فہمی ہوئی ممی ـــــ میں خود امتحان کی تیاری میں لگا ہوا ہوں" زبان کا ساتھ دینے کے لئے چہرے پر ایسے تاثرات بھی پیدا کر لئے جو اِس بات کی گواہی دیں کہ واقعی وہ سچ کہتا ہے۔

"بکومت ـــــ رات میں نے خود دیکھا ہے تم کسی لڑکی کی تصویر سے باتیں کر رہے تھے" نگار کچھ دیر کے لئے رُکی اور پھر کہنے لگی "میں سوچتی تھی آخر زاہد اِتنا کیوں بدل گیا؟ اب سمجھ میں آیا صاحبزادے کسی سے پیار فرما رہے ہیں!"

"ممی پلیز ـــــ ایسی باتیں کرنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ یقیناً آپ کو میری طرف سے کسی نے بدگمان کیا ہے۔"

"نہیں ـــــ اِس کتاب میں وہ تصویر اب بھی موجود ہو گی جسے غالباً تم روزانہ دیکھنے کے عادی ہو" نگار نے اُسی کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

زاہد کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اُس نے حلق صاف کرتے ہوئے مُردہ سی آواز میں کہا۔

"دیکھ لیجئے اِس میں کوئی تصویر نہیں ہے" نگار نے ہاتھ بڑھا کر وہی کتاب نکالی جس سے کچھ دیر پہلے وہ تصویر نکال چکا تھا۔ اِس بار کچھ دیر تک ورق گردانی کرنے کے بعد وہ مصنوعی حیرت سے بولی۔

"ارے تصویر کہاں گئی؟"

"نہیں تھی ـــــ کوئی تصویر نہیں تھی ـــــ میں پہلے ہی کہہ رہا تھا، یقیناً آپ کو کچھ دھوکا ہوا ہوگا۔"

زاہد بظاہر مسرت کی اداکاری کرتے ہوئے بولا لیکن دل ہی دل میں وہ سر پیٹ چکا تھا، آخر تصویر کہاں گئی؟

نگار حسب عادت ایک طویل لیکچر دے کر چلی گئی۔ لیکن وہ تصویر کی دھن میں کھویا رہا۔ اُس نے بہت مشکل سے نیّر کی یہ تصویر حاصل کی تھی۔

کالج سے واپسی کے بعد اُس نے ایک بار پھر کتاب کی تلاشی لی جس کے درمیان کاغذ کا ایک پرزہ ملا جس پر تحریر تھا ـــــ "نتیجہ کے بعد فوٹو خود بخود مل جائے گا۔"

زاہد کو سکتہ سا ہو گیا۔ آخر یہ ماں کیا بلا ہے؟ وہ آج تک کبھی نگار کو سمجھنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ کبھی وہ انتہائی سخت گیر نظر آتی اور کبھی انتہائی شفیق۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ اُس کی بڑی بہن ہی ہو۔ جتنا وہ اِس معاملہ پر غور کرتا گیا اُس کی ندامت بڑھتی گئی۔ وہ اپنے آپ پر جھلّانے لگا۔ خواہ مخواہ اُس رات اِتنی بے پروائی سے نیّر کی تصویر دیکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اِسی پشیمانی میں اُس نے نگار کا سامنا کرنے کی بھی ہمّت نہ کی۔ اپنے کمرے ہی میں اُس نے چھوٹے بھائی بہن سے کھانا منگا لیا اور گئی رات تک اسٹڈی میں مصروف رہا۔ سونے سے پہلے اُس نے اپنی ڈائری نکالی اور گزرے ہوئے دو دنوں کی رُوداد قلمبند کرنے بیٹھ گیا۔

قلم چلانے سے پہلے اُس نے احتیاطاً آس پاس کا جائزہ لے لیا۔ نیّر قوسِ قزح کی طرح اُس کے ذہن کی سطح پر اُبھر آئی۔ وہ نیّر کے بارے میں لکھتا چلا گیا۔

نیّر اُس کی کلاس فیلو تھی۔ ایک ذہین لیکن مغرور طالبہ کی حیثیت سے اُس کا تعارف ہوا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں زاہد نے اپنے ذہن میں اُس کے لئے نرم گوشے محسوس کئے۔ بعد کی رسمی ملاقاتوں میں محبت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ لیکن نیّر زاہد کی اِس سیمابی کیفیت سے اُسی طرح انجان بنی رہی جیسے کوئی جاہل ڈکشنری سے ہو سکتا ہے۔ نیّر کا انداز کچھ ایسا تھا کہ وہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک زاہد ہی نہیں کالج کے کئی رنگین مزاج نوجوان اُس پر فریفتہ تھے۔ جنھیں نیّر کی مسلسل بے رخی سے تنگ آ کر اُس کا خیال بھلانا پڑا تھا۔ لیکن زاہد مجبور تھا۔ وہ کبھی نیّر کا خیال دل سے بھلانے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

کبھی کبھی نیّر ایسے دلرُبا انداز سے پیش آتی کہ اُسے یقین ہو جاتا وہ بھی اُس سے محبت کرتی ہے اور جب وہ ایسی انجان ہو جاتی جیسے اِن دونوں کے درمیان کبھی دل کا رشتہ ہی نہ رہا ہو تب اُسے شک ہونے لگتا، نیّر اُس سے نفرت کرتی ہے۔ اپنی محبوبہ کی اِس غیر مستقل مزاجی سے وہ یہ طے کرنے میں ناکام رہا کہ نیّر کا رویّہ دوستانہ ہے یا غیر دوستانہ۔ اُس نے کئی بار دل سے نیّر کو بھول جانے کی کوشش کی۔ لیکن اُس پری وش کو بھلانا ممکن نہ تھا۔ آج وہ اُس منزل پر کھڑا تھا، جہاں اُسے ہر سمت نیّر ہی کے جلوے نظر آ رہے تھے۔ زاہد واقعی نیّر سے محبت کرنے لگا تھا۔ وہ کالج اور کالج کے باہر نیّر کے پیچھے بھاگتا رہا، بغیر اِس خیال کے کہ اِس طرح کسی لڑکی سے دلچسپی ظاہر کرنا ایک غیر سطحی بات ہے۔ دل میں چھپی ہوئی محبت اُس کے ذہن پر حاوی ہو چکی تھی۔

کل اُسے پتہ چلا تھا، نیّر لبرٹی سینما اپنی تین سہیلیوں کے ساتھ جا رہی ہے۔ بس وہ بھی وہیں کے لئے روانہ ہو گیا۔ زاہد تنہا ہی تھا۔ مجبوراً نیّر کو اُسے بھی مدعو کرنا پڑا۔ اپنی خوش قسمتی کو سراہتا ہوا وہ سینما میں اُس کے ساتھ ہو گیا۔ پکچر کے دوران وہ نیّر کی بغل میں بیٹھا سوچتا رہا، آخر اِس بھاگ دوڑ کا انجام کیا ہوگا؟ پکچر ختم ہونے کے بعد نیّر کی دو سہیلیاں تو فوراً ٹیکسی سے گھر روانہ ہو گئیں۔ نیّر تیسری سہیلی کے ساتھ ٹیکسی تلاش کرنے کے لئے رُک گئی۔ زاہد اُن دونوں کا ہاتھ بٹانے کے لئے مصلحتاً ٹھہر رہا۔ اِس وقفہ میں اُسے نیّر سے تنہا بات کرنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے سوچا دل کی بات کہنے کا اِس سے بہتر وقت پھر کبھی نہیں مل سکتا۔ اُس نے ایک نئے حوصلے کے ساتھ نیّر کو آواز دی۔

"نیّر!"

"فرمایئے!" نیّر نے شوخ لہجے میں کہا۔ اُس کی آواز زاہد کے کانوں میں عیش و نشاط کی گھنٹیاں بجا رہی تھی۔ اُس کے خون کی روانی تیز ہو گئی۔ "میں اپنے دل کا درد تو تمھیں نہیں بتانا چاہتا صرف اِتنا پوچھوں گا کیا تم مجھ سے شادی کر سکتی ہو؟" اُس کی آواز بھرّا چکی تھی۔

"شادی ـــــ دیکھئے زاہد صاحب محبت پر تو مجھے یقین نہیں، جس سے بھی شادی کرنا ہوگا میرے والدین خود سوچ سمجھ کر کر دیں گے۔" نیّر نے سادگی سے جواب دیا۔

"لیکن مجھے تو تم سے بے پناہ محبت ہے۔ تم نہیں جانتیں میں تمہارے لئے کسی سے کڑی آزمائش سے بھی گزرنے کو تیار ہوں!"

"پھر وہی محبت! ارے محبت تو والدین کی ہوتی ہے اور عشق پر صوفیوں نے قبضہ کر لیا ہے۔" نیّر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"تم میرا مذاق اڑا رہی ہو؟" زاہد یوں ہی مسکرایا۔ "حالانکہ میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں۔"

"یہ ایک وقتی جذبہ ہے۔ بعد میں کسی کو محبت نہیں رہتی۔ میرا مشورہ مانئے تو میرا خیال دل سے نکال دیجئے۔"

زاہد کچھ کہنے جا رہا تھا، لیکن ٹیکسی مل گئی اور بات ادھوری رہ گئی۔

---

اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا وہ نیّر سے امتحان تک دور رہے گا۔ امتحان کے بعد اس سے شادی کرنے کی کوشش کرے گا۔ نیّر اس کا ایک خواب تھی۔ اگر اس خواب کی زندہ تعبیر مل جاتی تو وہ اسے اپنی زندگی کی معراج سمجھتا۔

---

زاہد نے دو مہینے بہت بے چینی سے گزارے۔ امتحان ہوا اور کچھ دنوں بعد جب نتیجہ نکلا تو اسے بہت خوشی ہوئی۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا تھا۔ زندگی کی پہلی منزل میں اسے قابلِ رشک کامیابی ہوئی تھی۔ اب اس کی نظریں اُن منزلوں کی جانب تھیں جو مستقبل کے دھندلکے سے اسے مسکرا کر اشارے کر رہی تھیں۔

دوسرے دن اسے تصویر کتاب میں مل گئی۔ نگار زاہد کی ڈائری سے واقف تھی لیکن اسے پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ تصویر والے واقعہ کے بعد سے وہ ڈائری بھی پڑھنے لگی۔ ڈائری کا ہر ورق نیّر کے تذکرے اور قصیدوں سے پُر تھا۔

زاہد نگار کی اس کھوج سے بالکل لاعلم تھا۔ وہ اپنی دانست میں شادی کی خواہش نہایت احتیاط کے ساتھ پوشیدہ رکھ دیا کرتا تھا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ گھر کا بھیدی ذہن میں گھس کر خیالات بھی چُرا سکتا ہے۔

ابتدا میں تو نگار کو نیّر سے کچھ عناد نہ تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اُس کا کردار سمجھا تا گیا اور اب یہ خواہش دل میں چٹکیاں لے رہی تھی نیّر کو کسی طرح دیکھے۔ بلکہ ہمیشہ کے لئے اسے بہو بنا کر گھر میں لا بٹھائے۔ اسے اپنے زاہد سے بے حد محبت تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی اس کی کوئی خواہش ادھوری رہ جائے۔

نگار زاہد کے خیالوں میں کھوئی رہی۔ اسے اپنی نوجوانی کا زمانہ یاد آگیا۔ اس نے بھی کالج میں پڑھا تھا۔ اس نے اُن تمام مراحل کو شرافت سے طے کیا جسے اکثر لڑکیاں طے کرتے وقت بہک جاتی ہیں۔ اس سن و سال میں ایک دو نوجوانوں کا محبت جتانا آج بھی اسے یاد تھا۔ لیکن اس نے کبھی کسی کو منہ نہ لگایا تھا۔ اسے یاد تھا اس کا ایک کلاس فیلو مکرّم اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ اس نے کتنی شان سے اس کی شادی کی پیشکش ٹھکرا دی تھی۔ یہ سب اسے اچھی طرح یاد تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی رحم کھا کر مکرّم سے شادی کرے اور ساری زندگی اپنے اس اقدام پر پچھتاتی رہے اور لوگ اس سے ہمدردی کرنے کے بجائے کہیں، "لو میرج کی تھی نا؟" نگار کے خیالات میں محبت ایک فرسودہ رسم تھی جسے پورا کرنا ہر نوجوان اپنی خاندانی ریت سمجھتا ہے۔ اسے زاہد کا اس طرح یکطرفہ محبت کرنا پسند نہ آیا۔ لیکن وہ مجبور تھی۔ اسے روکنے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ اب زاہد اس منزل پر تھا جہاں سے لوٹنا شکست کے مماثل تھا اور پھر نگار یہ نہیں دیکھ سکتی تھی، زاہد کے خوابوں کا محل محض اس کے اصولوں کی وجہ سے مسمار ہو جائے۔

---

زاہد کالج میں آفس کے قریب کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ دھوپ لان پر پھیلی ہوئی تھی۔ لڑکے لڑکیاں ایک ہجوم کی شکل میں آفس پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ وہ اُن سب سے الگ تھلگ اطمینان سے کھڑا دھوئیں کے مرغولے اُڑاتا جا رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر نیّر پر پڑی جو پُر تشویش نظروں سے آفس کی عمارت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر کامیابی کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے مسکرایا اور پھر اپنا وہی سوال دہرایا۔

نیّر نے ابرو چڑھاتے ہوئے جواب دیا "میں

آپ سے کہہ چکی ہوں۔"
"کیا؟" زاہد نے حیرت سے پوچھا۔
"میں آپ کو پسند نہیں کرتی۔ اس لئے اپنا دھیان کسی اور طرف لگائیے!" نیّر کا لہجہ ہمیشہ کی طرح خشک اور تلخ رہا۔
"آخر ناپسندیدگی کی کوئی خاص وجہ؟ کیا تم کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہو؟" زاہد کی آنکھوں سے ویرانی جھانک رہی تھی۔
"نہیں ــــ مجھے محبت سے سخت نفرت ہے نہ جانے کیوں!"
"میں اپنے گھر کی طرف سے تمہارے والدین تک پیغام بھجواؤں گا۔ ایسی صورت میں تو شادی کر لو گی نا؟"
"نہیں ـــ کسی صورت میں نہیں! میں کیسے بتاؤں آپ مجھے پسند نہیں!" نیّر کے چہرے سے انتشار برس رہا تھا۔
زاہد نے جھلا کر کہا: "پھر تمہیں پسند کون ہے؟"
"کوئی نہیں!" نیّر وہاں سے ہٹ گئی۔
زاہد کے ہاتھ سے سگریٹ چھوٹ گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے سجے بنائے شیش محل کو کسی نے ایک ہی ٹھوکر میں مسمار کر دیا ہو۔ وہ گم صم سا اسے دیکھتا رہا۔ نیّر کسی نازک سی شاخ کی طرح بل کھاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس طرح انکار پر زاہد کے دل و دماغ میں ہیجان برپا تھا۔ اس نے پہلے تو سوچا تھا نیّر نے یوں ہی بطور چھیڑ چھاڑ اس کی محبت کا مذاق اڑایا ہے۔ لیکن اب اسے یقین ہو چکا تھا نیّر اس سے بالکل محبت نہیں کرتی۔ اسے نفرت ہے۔ اسے اپنی زندگی کا کارواں بری طرح لٹتا ہوا نظر آ رہا تھا۔
نگار نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا اور اسے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ ہوئی کہ وہ کسی دماغی الجھن یا مایوسی کا شکار ہے۔ لاکھ پوچھنے پر بھی اس نے اصل بات نہ بتائی اور کھویا ہوا سا بستر پر گر گیا۔
دو دن اسی طرح گزر گئے ــــــ
اس دوران جیسے ہی نگار کو موقع ملا اس نے صفائی سے ڈائری اڑا لی اور اپنے کمرے میں پہنچ کر مطالعہ میں محو ہو گئی۔ جیسے جیسے وہ پڑھتی گئی زاہد کی اندرونی کیفیت سے آگاہ ہوتی گئی۔ ایک جگہ لکھا تھا ــــ
"شاید میری زندگی کا پہلا مقصد تو ناکام ہو گیا۔ اب میری زندگی میرے کسی کام کی نہیں۔ اب اس پر صرف ملک و قوم کا حق ہے۔ نیّر کو حاصل کرنے کے بعد میں ایک بہترین شہری کی حیثیت سے ملک کی خدمت کر سکتا تھا۔ لیکن اب میں ملٹری شارٹ سروس کمیشن میں حصہ لے کر اپنے دوسرے مقصد میں کامیاب ہونے کی کوشش کروں گا۔ میں اپنی آخری سانس تک نیّر کا خواب دیکھتا رہوں گا! وہ کہتی ہے میں اسے بھول جاؤں۔ کیونکہ میں اسے پسند نہیں۔ لیکن میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں ؎

کتنے غموں پہ چھائی ہوئی ہے تمہاری یاد
کب مجھ میں حوصلہ ہے کہ تم کو بھلا سکوں"

نگار کو یہ شعر پڑھ کر دلی تکلیف ہوئی۔ وہ سمجھ گئی نیّر کے انکار نے زاہد کی زندگی کا رخ ہی موڑ دیا ہے۔ نیّر کا پتہ دیکھ کر اس نے ڈائری بند کر دی۔
نگار نے فیصلہ کیا وہ نیّر کو زاہد سے شادی کے لئے راضی کرنے جائے گی۔ اس ارادے کے ساتھ ہی اس نے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اس شام اسے گھر سے نکلتے وقت عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ آج وہ ایک ایسے کام کے لئے جا رہی تھی جس کا نہ تو کوئی تجربہ تھا نہ خواب و خیال۔ وہ نیّر کے گھر پہنچ گئی۔
اس کے والدین موجود نہ تھے۔ اس نے سوچا منصوبے کے مطابق پیام دینے سے پہلے لڑکی کو راضی کر لینا ہی بہتر رہے گا۔ کیا پتہ کل وہ بالکل اکھڑ جائے۔
نیّر سے ملاقات ہوئی۔ زاہد کی محبوبہ کو پہچاننے میں اسے ذرا دیر نہ ہوئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس حسین لڑکی کو برسوں سے جانتی ہو۔ ان دونوں کی گفتگو رسمی باتوں سے شروع ہوئی۔ بات حقیقی موضوع پر آنے تک کمرے کی فضا کافی بوجھل ہو چکی تھی۔ نگار عجیب سی گھٹن محسوس کر رہی تھی۔ اس نے دل کڑا کر کے پوچھ ہی لیا۔
"بیٹی! میں جاننا چاہتی ہوں آخر زاہد میں کیا برائی ہے جس کی بنا پر تم نے شادی سے انکار کر دیا؟"
سن کر نیّر کچھ چونک گئی۔ اس نے اپنے دوپٹے سے کھیلتے ہوئے جواب دیا۔
"آپ سے کیا عرض کروں!" اس کا لہجہ خشک تھا۔ "میں مسٹر زاہد کو اتنا پسند نہیں کرتی کہ ان سے شادی کروں اور پھر مجھے یہ گوارہ نہیں کل ہمارے عزیز و اقارب یہ کہیں میں نے لو میرج کی۔"
"یہ بات کہ تم اسے زیادہ پسند نہیں کرتی ہو معمولی وجہ ہے۔ کون سی لڑکی شادی سے پہلے لڑکے کو پسند کر سکتی ہے۔ عزیز و اقارب لو میرج کا الزام لگائیں گے، اس وہم سے تم ایک سچی محبت کرنے والے کا دل توڑ رہی ہو۔ شادی کے بعد کون سوچتا ہے کل تک یہ محبت کرتے تھے یا نہیں کرتے تھے!" نگار اتنا کہہ کر رک گئی۔ اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔ غالباً بائیس برس پہلے تک تم نے بھی یہی جملہ اس سے کہا تھا۔
نیّر کہہ رہی تھی ـــ "مجھے وہ شخص قطعاً پسند نہیں آ سکتا جو کسی لڑکی کو

دیکھتے ہی فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس قدر محبت ــــ جب کہ لڑکی اُس کی طرف قطعاً مائل نہیں۔ اِس طرح کی یکطرفہ محبت کا کوئی اعتبار نہیں۔ یقین مانئے یہ ایک وقتی جذبہ ہے۔ اگر میں مسٹر زاہد کی محبت کا خیال کرنے بیٹھوں تو کئی اور نوجوان بھی نکلیں گے جو مجھے اِسی طرح چاہتے ہوں گے۔ آپ ہی بتایئے کیا میں دوسروں کی آرزوؤں کے لئے اپنی زندگی قربان کر دوں؟" اُس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"تم غلط کہتی ہو، زاہد سے زیادہ تمھیں کوئی نہیں چاہتا۔ کیا یہ ثبوت کافی نہیں کہ خود اُس کی ماں تمھیں اُس کے لئے منانے آئی ہے"

"آپ کو اپنے لڑکے سے پیار ہے آپ اُن کی محبت کا اعتبار کرسکتی ہیں۔ معاف کیجیے میں اتنا بڑا خطرہ لینے کو تیار نہیں"

"تمھارے خیالات پختہ نہیں بیٹی! زاہد تم سے بالکل ویسی ہی محبت کرتا ہے جیسی میں اُس سے کرتی ہوں اور وہی حقیقی محبت ہے" نگار نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"بہت فرق ہے محترمہ! ممتا اور ہوس میں زمین آسمان کا فرق ہے!" نیّر بادلِ ناخواستہ مُسکرا کر بولی۔

"میں اِس مٹی کے بنے ہوئے انسان سے محبت کی اُمید نہیں رکھ سکتی جس مٹی سے آدم خور درخت بھی پیدا ہوتے ہیں!"

"تم بہک رہی ہو لیکن تمھارے والدین میری آواز ضرور سُنیں گے"

"نہیں محترمہ! وہ کسی کو زبان دے چُکے ہیں" نیّر نے اُس کی بات کاٹی۔

"آخر تم زاہد سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں؟" نگار اِس بار چیخی تھی۔ نیّر کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اُس نے سنبھل کر جواب دیا۔

"یہ میری اپنی مرضی ہے۔ آپ مجھے کسی بات پر مجبور تو نہیں کرسکتیں"

"مجھے افسوس ہے میری اَولاد کے غلط انتخاب کی وجہ سے مجھے آج شرمندہ ہونا پڑا!" نگار کی آواز رُندھ گئی۔

کمرے پر ناخوشگوار فضا طاری تھی اور دونوں ایک دوسرے کو غصّے اور عجیب سے جذبے کے تحت گھورتی جا رہی تھیں۔ نگار کو آج کی شکست سے احساس ہو چُکا تھا، بائیس برس پہلے کی کامیابی بہت مہنگی ثابت ہوئی۔ آج اُسے وہ سب کچھ کہنا پڑا جو کبھی مکرمہ نے اُس سے کہا تھا اور وہی جُملے سُننا پڑے جو خود اُس نے کہے تھے۔ اُس سے سرزد ہوئے گناہ کی سزا اُس کے بیٹے زاہد کو مل رہی تھی۔ نگار نے اشک پیتے ہوئے اپنا آخری وار کیا۔

"دیکھو بیٹی نیّر ــــ نوجوانی میں تمھاری طرح میں بھی ایسا ہی سوچتی تھی میں نے بھی ضد میں کسی کا دل توڑا تھا۔ لیکن آج تم دیکھ رہی ہو جیسے اپنے کئے کی سزا میری اَولاد کو مل رہی ہے۔ آج اگر تم انکار کر دو گی تو یہی ریت بن جائے گی۔ اب آئندہ ہمیشہ انکار کی رسم پڑ جائے گی۔ مت بھولو وہ زمانہ جب تمھارا لڑکا جوان ہوگا اور اُسے بھی کسی سے محبت ہوگی اور اُس کی محبوبہ یونہی اُسے ٹھکرا دے گی جیسے آج تم زاہد کو ٹھکرا رہی ہو۔ حُسن اور جوانی کا نشہ ہر دم نہیں رہتا۔ تم بہت جلد جان جاؤ گی، ضد کا انجام بُرا ہوتا ہے" نگار کی یہ آواز بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

"میرا لڑکا کسی سے محبت نہ کرے گا" نیّر مُسکرائی۔

"محبت انسان کا پیدائشی حق ہے اور کوئی نوجوان اِس سے محروم ہونا پسند نہیں کرتا"

نگار بھی جواباً مُسکرائی۔ لیکن اُس کی مُسکراہٹ سے عجیب سی دہشت ٹپک رہی تھی۔

"آپ مجھے ناحق مجبور کر رہی ہیں، میں کہتے کہتے تھک گئی ہوں"

نیّر کے چہرے سے بیزاری مترشح تھی۔ نگار چُپ چاپ اُٹھ گئی۔

"چائے تو پیتی جایئے" نیّر کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"خون کے گھونٹ کافی ہیں!" نگار پلٹے بغیر یہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی "کتنی سنگدل ہے یہ لڑکی ــــ کمینی ــــ!" اُس نے سوچا "موسمِ سرما میں شروع ہونے والی محبتوں کا شاید یہی انجام ہوتا ہے۔ مجھ سے کتنی بڑی خطا سرزد ہوئی جو میں نے زاہد کے راز جاننے کی کوشش کی۔ میں نے زاہد کی ڈائری کو ہاتھ نہیں لگایا ہمیشہ کے لئے آگ میں ہاتھ رکھا ہے۔ کاش! میں زاہد کی اِس کہانی سے بےخبر ہوتی، کاش مجھے کچھ پتہ نہ ہوتا" وہ سہمی سہمی سی اپنے گھر مایوس لوٹ رہی تھی!!

## غزل

**نسیم شاہجہانپوری**

تری دُوری ہو یا ہو تیری قربت
محبت میں ہیں دونوں اک قیامت

زسرتاپا محبت بن چکا ہوں
نہ سمجھا پھر بھی مفہومِ محبت

نوازا جا رہا ہوں کیفِ غم سے
یہ کیا کم ہے فیضانِ محبت

نظر کے سامنے ہیں کس کے جلوے
بنا جاتا ہوں اک تصویرِ حیرت

نسیمؔ آیا نہ لب تک شکوۂ غم
سمجھتا ہوں میں آدابِ محبت

## غزل

**جلیس نجیب آبادی**

اُلجھے اُلجھے، سائے کالے گیسوؤں میں کھو گئے
بن کے آئے تھے تماشائی تماشہ ہو گئے

نام اُٹھ جائیگا دنیا سے وفا کا دوستو
موت کی آغوش میں تھک کر اگر ہم سو گئے

اُن سے پوچھے کوئی لطفِ گریۂ شامِ فراق
جو تمہاری آرزو میں روتے روتے سو گئے

خار و خس میں دب گئے ہوں جیسے کچھ جنگل کے پھول
کتنے اہلِ فن تھے جو گمنامیوں میں کھو گئے

کچھ تو کام آئے ہمارے اشکہائے غم جلیسؔ
ایک حد تک دل سے گردِ نامرادی دھو گئے

## غزل

**حسرت شادانی**

یہ دل جس کا تمنائی بہت ہے
مقدر سے وہ ہرجائی بہت ہے

تمہارا ذکر جس دم چھڑ گیا ہے
تمہاری یاد بھی آئی بہت ہے

کریں ہم کیسے، اظہارِ تمنا
جنوں کی اس میں رسوائی بہت ہے

نہاں پہلوئے گُل میں خار بھی ہیں
گلوں میں یوں تو رعنائی بہت ہے

نہ سوجھی عشق میں حسرتؔ کو منزل
جنوں نے راہ دکھلائی بہت ہے

## غزل

**رضا وارثی**

اور بڑھی دل کی بے تابی اشکوں کی طغیانی سے
غم کی آگ کہیں بہتر تھی آنکھوں کے اِس پانی سے

دردِ محبت اُن کے دل میں بھی انگڑائی لینے لگا
یعنی چشمہ پھوٹ رہا ہے پتھر کی پیشانی سے

اُن کے حُسن کے جلوؤں نے خود اُن کو بھی مسحور کیا
رہ رہ کر اب دیکھ رہے ہیں آئینہ حیرانی سے

آج بلندی پستی سے مجبور ہوئی جاتی ہے رضاؔ
چاند ستارے شرماتے ہیں ذرّوں کی تابانی سے

## منصوبہ بند کنبہ وہ ہے
## جس کے افراد کی دیکھ بھال آپ بخوبی کر سکتے ہیں

بھائی جان، مجھے بتائیے، آپ
کیسے اتنی اچھی زندگی
بسر کرتے ہیں۔

# تشنہ لبی

پروفیسر مس شوبی صدیقی ایم۔ اے۔ ایل ٹی

گورنمنٹ گرلز انٹر کالج فتحپور۔ یو۔ پی

محترم چچا جان! آداب

"تشنہ لبی" لے کر پہلی بار بزم "بیسویں صدی" میں شریک ہونے کی اجازت چاہتی ہوں۔ ایم۔ اے میں تھی تو اپنے اُستاد کی حوصلہ افزائی پر یونیورسٹی میگزین کے لئے افسانے لکھے تھے۔ سروس میں آئی تو ذہن پر جمود طاری ہو گیا۔ پھر بھی کوئی واقعہ نگاہوں کے سامنے سے گزرتا ہے تو میں اپنے آپ کو لکھنے سے نہیں روک پاتی۔ اِس افسانے کے بارے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ صرف ایک کہانی نہیں۔ خدا کرے یہ افسانہ آپ کو بھی پسند آ جائے....

آپ کی دعاؤں کی طلبگار ——— شوبی صدیقی

فضاؤں میں چاروں طرف گہرا سکوت چھایا ہوا تھا صرف ہواؤں کی سرد آہیں ماحول کو چند لمحوں کے لئے جاندار بنا دیتیں اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ یہ ایک منحوس کالی رات تھی۔ آسمان کا سینہ بھی سیاہ گھنیری غمگین گھٹاؤں سے داغدار بنا ہوا تھا، تھوڑی تھوڑی دیر پہ فطرت بھی اشک ریزی کرنے لگتی تھی — پورے گھر پہ قبرستان کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صفیہ نے ایک بار پھر طویل خط کے بے جان صفحات پلٹے اور رو پڑی۔

"عاشو! لوٹ آ، میری بہن! میری مظلوم دوست! زندگی کی دولت کوئی یوں نہیں لٹاتا!"

لیکن عاشو نہ لوٹی۔ اُس نے تو زندگی سے ناتہ ہی توڑ لیا تھا۔ ساری زندگی وہ ایک ہمدرد ساتھی اور محبت کرنے والی ہستی کی تلاش میں بھٹکتی رہی لیکن ساتھ دیا بھی تو موت نے۔ معصوم اور بے زبان لڑکی پیار کی بھیک مانگتے مانگتے تھک گئی۔ محبت کے لئے اُس کی آنکھیں ترستی رہیں۔ دل اور روح کی تشنگی نہ مٹ سکی۔ وہ ساری زندگی رو رو کر جیتی رہی۔ شاید اس امید پر کہ ایک دن اُس کے دل کے در پر کوئی پیار بھری دستک دے گا۔ روح کی سنسان راہوں پر کوئی اپنے محبت بھرے قدم رکھے گا۔ پیار بھرا دیپ جلائے گا اور یہ تاریک راہیں روشن ہو جائیں۔ لیکن محبت کا راہی آیا بھی۔ راہیں روشن بھی ہوئیں لیکن بے نیازی اور بے وفائی کے ایک ہی جھونکے سے محبت کا چراغ بجھ گیا۔ راہی لوٹ گیا کبھی واپس نہ آنے کا عہد کر کے!

"عاشو! تم کتنی ضدی تھیں۔ محبت کا چراغ کیا بجھا تم نے زندگی ہی کی شمع گل کر دی!" صفیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ خط کے صفحات پلٹتی رہی الفاظ آنسوؤں میں ڈوبتے رہے۔

بھابی! رات آپ مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔ میں آجکل اتنی پریشان کیوں رہتی ہوں؟ میرے چہرے پر اتنی اُداسی کیوں ہے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بھیانک طوفان آکر گزر گیا ہے۔ تمہارے چہرے پر اُس طوفان کی تباہ کاریاں صاف ظاہر ہو رہی ہیں۔ میں چونک پڑی تھی۔ آپ قیافہ شناس کب سے ہو گئیں۔ آپ نے سچ ہی اندازہ لگایا تھا۔ ایک بھیانک طوفان ہی تھا جو میرے ارمانوں، تمناؤں، خوابوں، خوشیوں کو روندتا ہوا بے رحمی سے گزر گیا تھا۔ لیکن اپنی بدنصیبی کی اِس داستان کو آپ سے کیسے بیان کرتی جس کے آغاز ہی میں خوشی سے جھوم جھوم اُٹھی تھی اور اپنے کو دنیا کی سب سے زیادہ خوش قسمت ہستی تصور کرنے لگی تھی۔ آپ کو میری شادی سے پہلی ملاقات کا واقعہ یاد ہے۔ جب آپ نے زبردستی شادی سے ملنے کے لئے مجھے بھیجا تھا اور جب میں مطمئن ہو کر واپس آگئی تھی تو آپ نے پوچھا تھا۔

"شامی تمہیں پسند ہیں ـــــ؟"

"ہاں بھابی! شامی صاحب بہت اچھے ہیں۔ میں تو ڈرتی تھی کہ وہ خوبصورت ہیں، قابل ڈاکٹر ہیں، ساتھ ہی ساتھ دولتمند ہیں۔ میری اُن کے سامنے حیثیت ہی کیا ــ؟ لیکن بھابی! وہ میری سوچ سے بہت نزدیک ہیں۔ وہ حُسن کے شیدائی نہیں۔"

"انہوں نے تُم سے کچھ پوچھا تھا ــ؟"

"ہاں ... ؟" وہ مُسکرا پڑی۔

"کیا ــــ؟" بھابی کا اشتیاق بڑھنے لگا۔

"یہی ... کہ آپ دولتمند ہیں پھر بھی بہت کنجوس ہیں ــ" وہ مُسکرا کر بھابی کی طرف دیکھنے لگی۔ بھابی حیران رہ گئیں۔ وہ کِھل کھلا کر ہنس پڑی۔

...........

- ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں سے احسان اور بھلائی کرتے رہو۔ (قرآنِ پاک)
- فتنہ کرنے والوں سے یہاں تک جنگ کرو کہ ملک میں فساد باقی نہ رہے۔ (قرآنِ پاک)
- اگر کسی کو غصہ آ جائے تو اُسے چاہیئے کہ سکوت اختیار کرے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- محبت آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- صبر اور ایمان میں وہی نسبت ہے جو سر کو جسم سے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- اپنے اعزا و اقربا سے اچھا سلوک کرو۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

...........

"حیران نہ ہوں۔ اُنہوں نے اپنی بات کی تشریح کی تو میں بھی چونک پڑی تھی۔ کہنے لگے آپ کے پاس خوبصورت آواز کی دولت ہے۔ لیکن آپ بہت کم باتیں کرتی ہیں۔"

"اوہ!" بھابی بے اختیار ہنس پڑیں۔

بھابی آج میں گزرے ہوتے ایک ایک واقعہ کو یاد کرتی ہوں تو دل کی عجیب حالت ہوتی جاتی ہے۔ ہاتھ کانپنے لگے ہیں۔ قلم ہاتھ سے چھوٹا جا رہا ہے اور مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی ہے۔ لیکن مجھے آج سنبھلنا ہوگا۔ میں تو آج وہ شمع بن گئی ہوں جو بجھنے سے پہلے ایک بار بھڑک اُٹھتی ہے۔ آنے والی صبح میری بے جان تحریر بن کر آپ کے سامنے آئے گی اور میرے جسم سے روح پرواز کر گئی ہوگی۔ جب سے شامی کا وہ خط آیا ہے۔ بھابی میں ایک ایک لمحہ کانٹوں میں گزار رہی ہوں۔ روح کے تار شکست ہو چکے ہیں۔ سانسوں کا [illegible] ہوگا۔ میری اُداسی کی وجہ جان کر آپ خوش نہ ہوتیں۔ ہو سکتا تھا آپ شامی [illegible] زہر اُگلتیں جو مجھے گوارہ نہ تھا۔

میں آپ سے کیسے بتاتی کہ میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ لُٹ چکا ہے۔ میں جس پر ناز کیا کرتی تھی وہی نہ رہا۔ میں جس کی [illegible] اور محبت کی قسمیں کھاتی تھی۔ وہ فریب دے گیا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ اپنی طرف سے میں نے ساری راہیں صاف کر لی ہیں۔ اب کوئی بھی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔ ہمیشہ آگ کے شعلوں سے دامن بچاتی رہی۔ لیکن دامن جل کر رہا! کانٹوں سے اپنا وجود بچاتی رہی لیکن کانٹوں نے لہولہان کر دیا۔ محبت کو ترستی ہوئی روح کو جب سرد، شیریں، شفاف پانی کا چشمہ نظر آیا تو بے اختیار جھک پڑی، لبوں کی تشنگی ابھی مٹی نہ تھی کہ وہی سرد و شیریں چشمہ آگ کے شعلوں میں بدل گیا۔ میرا سارا وجود جھلس گیا۔ لب جل گئے۔ سارے سینے میں آگ سی لگ گئی۔ میں مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ درد بڑھتا گیا۔ تکلیف اور جلن جان لیوا بنتی گئی۔ دم گھٹنے لگا اُف! کتنی جلن ہے اس وقت بھی میرے سینے میں ....

وہ اپنے پیار کا یقین دلاتے رہے۔ میں پہلو بچاتی رہی۔ وہ وفا کی قسمیں کھاتے رہے۔ میں بے یقینی کا اظہار کرتی رہی۔ وہ حسین خوابوں کا طلسم بُنتے رہے۔ میں بھیانک تعبیروں سے اُلجھتی رہی۔ کئی مہینے کے بعد ایک دن انہوں نے کہا۔

"عاشو! تمہیں دیکھ کر تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کبھی ہم ایک دوسرے سے الگ رہے ہی نہیں جنم جنم سے ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ شاید کبھی میں نے تمہارا ہی خواب دیکھا تھا۔"

لیکن میں نے ایک تلخ حقیقت کی طرف اُن کی توجہ دلائی۔

"میں خوبصورت نہیں ہوں شامی! ایسا نہ ہو کہ ایک دن آپ مجھے محبت کی اِن راہوں پر تنہا چھوڑ جائیں ــــ جب آپ کو کوئی حسین ساتھی مِل جائے تو آپ ...."

"عاشو! مجھے گالی مت دو۔ مجھے کہنے دو کہ میں نے حسینوں کی کبھی قدر نہیں کی۔ حُسن کی کسوٹی کیا ہے۔ حُسن کسے کہتے ہیں ــــ؟ یہ میرے دل سے پوچھو۔ کیا تُم خوبصورت نہیں؟ یہ میری نگاہوں سے پوچھو۔ تمہاری آنکھیں اتنی خوبصورت ہیں جیسے شراب کے دو بلوریں جام ــــ تمہاری آواز میں اتنی نغمگی ہے جیسے بہار کی نشیلی سرگوشیاں یا [illegible] ...

تمہارے چہرے کا سلونا پن بہار کی شام نے چرایا ہے۔ تم میں پھولوں کی رعنائی، شبنم کا تقدس ہے...“ اُن کی نگاہیں میرے چہرے پر تھیں اور میرا انگ انگ ایک انوکھی کیفیت سے کانپ رہا تھا۔ دل میں ایک میٹھی سی چبھن ہوئی۔ ایک ریلا سا اُٹھ کر آنکھوں میں چھا گیا۔ میرے ہونٹ جذبات کی شدت سے کانپنے لگے۔ پلکیں لرز لرز کر جھکنے لگیں.... آج میرے خوابوں کو تعبیر مل گئی تھی۔

اُنہوں نے میری پلکوں سے اُن آنسوؤں کو چن لیا۔

”عاشو روتے نہیں۔ تم روؤ گی تو ستاروں کا دل ٹوٹ جائے گا۔ میرا وجود پگھل جائے گا۔ وعدہ کرو تم کبھی نہ رؤو گی۔ وعدہ کرو عاشو!“ ان کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ میں نے اپنے لرزتے ہوئے لبوں کو اُن کی ہتھیلی کی پشت پر رکھ دیا۔

لیکن جو ایک پل بھی میری آنکھوں میں آنسو نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ آج اگر دیکھے میرا سارا وجود آنسوؤں کے سمندر میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ آج کہاں ہیں اُس کے ہمدردی کے الفاظ؟ کہاں کھو گئی اُس کی محبت!!

بھابی ادھر چند مہینوں سے میں شامی کو بہت پریشان دیکھتی۔ وہ بات کرتے کرتے کھو سے جاتے۔ جب کبھی میں اُس کی وجہ پوچھتی تو ہنس کر ٹال جاتے۔ لیکن اُن کے چہرے پر کرب کی پرچھائیاں صاف دکھائی دیتیں۔ وہ کہتے——

”پگلی! تمہارے خیالوں۔ تمہارے تصور کے سوا اب میرے پاس رہ ہی کیا گیا ہے۔ جس کے بارے میں سوچوں گا، تم میری سانسوں.... میری دھڑکنوں کے ایک ایک تار میں بندھ گئی ہو۔ تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی میں نہیں کر سکتا!“

میں اُن کے شیریں الفاظ میں کھو جاتی تو وہ کہتے ——

”عاشو! تم چپ نہ ہوا کرو۔ تم خاموش ہو جاتی ہو تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فضاؤں میں کہیں کوئی آواز نہیں۔ کوئی سرگوشی نہیں۔ ہواؤں کی سرسراہٹ بھی نہیں، کائنات افسردہ اور خاموش محسوس ہونے لگتی ہے۔ بہاروں کا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔“

”شامی! آپ تو ڈاکٹر سے شاعر بننے جا رہے ہیں!“ میں کھل کھلا کر ہنس پڑتی۔ وہ کہتے ”یہ شاعری نہیں عاشو! یہ میرے دل کی آواز ہے۔ رُوح کی حقیقت ہے۔ یہ محبت کی زبان ہے.... تم میری زندگی کا جزو لاینفک ہو!“

اُن کی ان پیار بھری باتوں میں میں کھو جاتی۔ دل سرگوشیاں کرتا —— میں نے ایسے ہی شریکِ حیات کی تمنا کی تھی جو مجھ سے بے پناہ پیار کرتا ہو۔ جس کے سامنے میں اپنے ہر زخم کو کھول کر رکھ دوں اور وہ اپنے پیار کا مرہم رکھ دے۔ میں اُس سے اپنے غم کو بیان کروں۔ وہ سنتا رہے۔ پھر اُس کے لب جھکیں.... اور جھکیں اور میری پلکوں پر چمکتے کانپتے ستاروں کو چوم لیں۔ ایک دن مجھے خاموش

دیکھ کر اُنہوں نے پوچھ لیا۔

”کیا سوچنے لگیں عاشو؟“

”کچھ نہیں——“

”کیا مجھ سے دل کی بات چھپاؤ گی؟ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں....“ وہ اُداس ہو گئے۔ میں کانپ گئی۔

”نہیں.... نہیں شامی! خدا کے لئے ایسا نہ کہیے۔ مجھے آپ پر اپنی ذات سے زیادہ بھروسہ ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ آپ سے نہیں اپنی قسمت سے۔ کہیں زمانہ ہمارے اس اٹوٹ پیار کے بندھن کو توڑ نہ دے.... میں پیار کے معاملے میں بہت بدقسمت ہوں شامی! جب بھی میں نے کوئی تمنا کی تو اتنی زبردست ٹھوکر لگی کہ پھر کوئی ارمان نہ کر سکی۔ اب تو کوئی خوشی سامنے آتی ہے تو روح لرز

---

- یقین ذہنی سلطنت کا نپولین ہے۔ (ڈاکٹر مارڈن)
- ہمارے جسم کو صحت مند رکھنے کے لئے قدرت ہر طرح ہماری مدد کرتی ہے۔ (ڈاکٹر مارڈن)
- احساسِ کمتری انسان کی شخصیت کو تباہ کر دیتا ہے۔ (ڈوگلس لرٹن)
- لالچ بُری بلا ہے۔ لالچی آدمی کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ (ڈوگلس لرٹن)
- عالمِ موجودات ایک کتاب ہے، جس کا ہر صفحہ معرفتِ الٰہی کا آئینہ دار ہے۔ (ڈاکٹر چاپر)
- کوئی اچھا کام برابر کرتے رہنے سے عادت بنتی ہے اور بہت سی اچھی عادتیں کردار کی تشکیل کرتی ہیں۔ (ایک مغربی مفکر)

---

اُٹھتی ہے.... ہر لمحہ بدنصیبی کا منحوس دیو مجھے ڈراتا رہتا ہے۔ مجھے اپنے سے کبھی جدا نہ کیجئے گا۔ کبھی نہیں! ورنہ میں مر جاؤں گی!“ میں روتی رہی۔ وہ آہستہ آہستہ مجھے تھپکیاں دیتے رہے۔ لیکن بالکل خاموش تھے۔ اُن کی آنکھوں میں نمی تھی۔ چہرہ بے حد اُداس تھا۔ وہ بے حد پریشان نظر آ رہے تھے اور پھر چپ چاپ اُٹھ کر چلے گئے۔

صفیہ نے کئی صفحات اُلٹ دیئے۔ یہ خط نہ تھا ایک بدنصیب لڑکی کی داستان تھی جو آج خلاؤں میں گم ہو گئی تھی۔ اندھیروں کا جزو ہو گئی تھی—— لامکاں کی وسعتوں میں کھو گئی تھی۔ اُس نے جو کچھ کہا تھا کر دکھایا۔ پیار کی ناکامی برداشت نہ کر سکی۔ صفیہ روتے روتے تھک چکی تھی۔ اُس کا دل ڈوبنے اضطراب سے مل رہا تھا۔ آنکھیں خشک تھیں۔ پپوٹے بھاری بھاری ہو رہے

تھے ماس نے خط کا آخری صفحہ پلٹا۔ گھڑیال نے دو بجنے کا اعلان کر دیا۔ بادل بہت زور سے گرجا اور کہیں دُور بجلی زور سے چمکی۔ وہ اُچھل پڑی۔ پھر آخری بار خط پر نظر ڈالی ——

بھابی! ایک بار آپ نے مجھ سے پوچھا، عاشو! کیا آج سوؤ گی نہیں؟ رات کے ڈھائی بج رہے ہیں۔ لیکن میں نے اُس کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا تھا۔ جواب دیتی تو آپ چونک پڑتیں مجھے تو ابدی نیند سونا تھا۔ آج آپ سونے کی ضد کر رہی ہیں کل آپ جاگنے کے لئے اصرار کریں گی لیکن میں جاگ نہ سکوں گی۔ اب میں موت کی آغوش میں پُرسکون نیند سونے جا رہی ہوں۔ شامی نے اپنے آخری خط میں لکھا ہے کہ اُنہوں نے مجھ سے فریب کیا ....... مجھے دھوکا دیا ..... جھوٹے پیار کا ناٹک کھیلتے رہے۔ مذاق کرتے رہے۔ اصل میں اُنھیں کبھی مجھ سے پیار نہ تھا۔ اُن کی شادی ہو چکی ہے۔ اُنہوں نے مجھے اپنی محبت کی قسم دے کر شادی کر لینے کے لئے کہا ہے۔ یہی بم تھا جس نے ہستی کا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔ میں پیار کو مذاق کا نشانہ کیسے بنتے دیکھ لیتی۔ پیار کی ذلت اور توہین مجھے گوارہ نہیں ..... میں اُن سے اب بھی محبت کرتی ہوں اِس لئے اُن کی آخری التجا نہ ٹھکراؤں گی۔ محبت کا تعلق جسم سے نہیں رُوح سے ہے۔ محبت کا دوسرا نام قربانی ہے۔ محبت کا سونا تو جدائی کی آگ میں تپ کر کندن بنتا ہے ..... آپ سے ایک آخری التجا ہے۔ بھابی! شامی کبھی مل جائیں تو اُن سے کہیے گا کہ اُن کے کہنے سے عاشو نے شادی کر لی تھی۔ وہ دُلہن بنی تھی۔ اُس نے سُرخ خونیں جوڑا پہنا تھا۔ پیشانی پر شبنمی موتیوں کا جھومر بھی تھا .... ہونٹوں پر وفا کی سُرخی بھی تھی —— کپڑوں میں سُہاگ کی کافوری خوشبو بھی تھی۔ بارات بھی سجی تھی ..... وہ آنسوؤں ..... چیخوں کے درمیان بابل کا گھر چھوڑ کر پردیس چلی گئی۔ صفیہ نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔ اب آگے کچھ پڑھنے کی اُس میں ہمت نہ تھی۔ شامی کے لئے اُس کے دل میں نفرت کا لاوہ پھوٹ پڑا تھا۔

---

"ممی! ممی ..... ڈاکٹر صاحب آئے ہیں"

"کون ڈاکٹر؟" وہ چونک پڑی۔ عاشو کی موت کو پندرہ دن ہو چکے تھے۔ لیکن زخم ابھی تک تازہ تھا۔ طارق بھاگ کر جا چکا تھا۔ وہ حیران حیران سی کھڑی تھی کہ باہر کی مانی پہچانی سی آواز پر اُس کا دماغ کھول اُٹھا۔ شامی آیا ہے! وہی شامی جو عاشو کا قاتل ہے۔ دل تو چاہا جوتے مار کر باہر نکال دے۔ لیکن کچھ سوچ کر اُس نے اُسے ڈرائنگ رُوم میں بٹھایا اور بہت سکون سے اُس سے ملنے گئی۔ وہ کرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

"بھابی عاشو کہاں ہے؟ اُسے چند منٹ کے لئے بُلا دیجئے —" وہ صفیہ کو دیکھ کر جلدی سے بول اُٹھا۔ اُس کے چہرے سے بے چینی اور پریشانی مترشح تھی۔ آنکھیں شب بیداری کے باعث سُرخ اور اُداس تھیں۔ صفیہ اُسے گھورتی رہی۔

"بھابی! میں جانتا ہوں آپ سب مجھ سے خفا ہیں۔ میں سب کچھ بتا دوں گا صرف تھوڑی دیر کے لئے عاشو کو بُلا دیجئے۔ پلیز بھابی!" اُس نے صفیہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ لیکن صفیہ نے اپنے ہاتھ جھٹک کر چھڑا لیے اور بڑے سفاکانہ انداز میں کہا۔

"عاشو اب کبھی نہ آئے گی ڈاکٹر! — تم یہاں سے چلے جاؤ!"

"بھابی اتنی بے رحم نہ بنئے ..... صرف ایک منٹ!" وہ مجسم التجا بن گیا۔

"تم نے اپنے ہی ہاتھوں عاشو کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے ڈاکٹر! —— عاشو تمہارا منحوس چہرہ دیکھنے سے پہلے قبر کی آغوش میں .....

"عاشو! —— عاشو!!" شامی کی چیخ بہت دردناک تھی۔ دل ہلا کر

وہ جھکتا چلا گیا۔ تو یم لڑکھڑائے اور وہ بے جان مجسمے کی طرح صوفے پر گر گیا۔ چہرہ سفید پڑ گیا۔ جسم پسینے سے تر تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ اُس کے منہ سے ہلکی ہلکی کراہ نکل رہی تھی۔ صفیہ کانپ اُٹھی۔ اُس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ آہستہ آہستہ شامی نے آنکھیں کھول دیں۔ اور کہنے لگا۔

"بھابی! آپ مجھے کوسئے... بُرا بھلا کہئے۔ ہاں میں نے عاشو کو خط لکھا تھا کیوں کہ میں عاشو سے بے پناہ محبت کرتا تھا... لیکن محبت کرنے والے زندگی لیتے نہیں دیتے ہیں... میں ڈاکٹر ہوتے ہوئے بدقسمتی سے کینسر کے بھیانک مرض میں مبتلا تھا۔ کینسر کا مریض موت سے رشتہ جوڑ کر آتا ہے عاشو سے شادی کر کے میں اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ درگور کیسے کر جاتا۔ کاش! مجھے یہ بات بہت پہلے معلوم ہوتی۔ یہ بات مجھے جب معلوم ہوئی، جب میں پیار میں بہت آگے بڑھ چکا تھا اکثر مجھے شدید درد کی شکایت ہوتی۔ میری آنتیں اینٹھنے لگتیں۔ میں درد سے بے ہوش ہونے لگتا۔ ڈاکٹروں کو بھی شروع میں نہ معلوم ہو سکا اور جب معلوم ہوا تھا عاشو میری روح میں سما چکی تھی۔ میں موت کو اپنے سامنے دیکھ کر کانپ اُٹھا۔ عاشو سے بچھڑنا مجھے گوارہ نہ تھا۔ کئی مہینے تک دل میں اور دماغ میں بحث ہوتی رہی... ضمیر نے مجھے ملامت کی۔ عاشو کو اگر میری بیماری معلوم بھی ہو جاتی تو وہ مجھ سے الگ نہ ہوتی۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے سے نفرت پیدا کرنے کے لئے اُسے ایک خط لکھا لیکن پندرہ دنوں تک میں بستر پر پڑا تڑپتا رہا۔ میں بیمار ہو گیا اور کل رات میں نے ایک بھیانک خواب دیکھا... تھا... میں نے دیکھا... عاشو آگ کے شعلوں میں گھری ہے... مجھے آواز دے رہی ہے!"

درد کی ایک لہر اُٹھی۔ اُس کی آواز بند ہو گئی۔ دانتوں نے ہونٹوں کو کچل ڈالا۔ اُس کا جسم درد کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ لیکن زبان خاموش تھی۔ آنکھوں کے گوشے بھیگے بھیگے سے تھے۔

"شامی! میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں!" صفیہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی ——

"نہیں بھابی... وقت گزر چکا ہے... عاشو مجھے بلا رہی ہے... عاشو!" درد کی ایک تیز لہر اُٹھی —— منہ سے خون اُبل پڑا۔ گردن ڈھلک گئی۔

صفیہ کی چیخ بہت دردناک تھی ——

---

غیر مطلوبہ مضامین واپس منگوانے کیلئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے بصورتِ دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھیئے۔ ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (لائبریرین بیسویں صدی دہلی)

## نسیمی شاہجہانپوری

(نو)محبت کا اثر دیکھ رہا ہوں
(ج)ہنی طرف اُن کی نظر دیکھ رہا ہوں

بدلی ہوئی ساقی کی نظر دیکھ رہا ہوں
میخانے کا اب رنگ دگر دیکھ رہا ہوں

(ی)ہ ہی کرشمے ہیں جدھر اُٹھتی ہیں نظریں
(ی)ا ہی تجلی ہے جدھر دیکھ رہا ہوں

آنکھوں سے یہ پامالیِ عالم کے مناظر
دیکھے نہیں جاتے ہیں مگر دیکھ رہا ہوں

دُنیا کی نگاہیں مری حالت پہ ہیں اے جام
ہیں گردشِ دوراں کی نظر دیکھ رہا ہوں

## شیدا رومانی

زندگی کے زہر کو پھولوں کا رس کہنا پڑا
یہ تو دل ہی جانتا ہے دل کو کیا سہنا پڑا

سارے عالم کو مسرت بانٹنے کے باوجود
بن کے آنسو زندگی کی آنکھ سے بہنا پڑا

ہم خزاں کے پھول ہیں بے گانۂ فصلِ بہار
درد کی خوشبو چھپائے عمر بھر رہنا پڑا

تیرے آنسو اپنی آنکھوں میں لئے پھرتے رہے
اور تیرے غم کو اکثر اپنا غم کہنا پڑا

اس طرح پائی ہے شیدا ہم نے جینے کی سزا
زندگی بھر زندگی کا ہر ستم سہنا پڑا

## مس غزالہ اشفاق شاہجہانپوری

مسرتیں مرا مقصود آخری تو نہیں
جو دُور دُور رہے غم سے زندگی تو نہیں

ترے خلوص پہ میں کر لوں اعتبار اے غم
مگر خوشی کی طرح تو بھی عارضی تو نہیں

قدم قدم پہ مصیبت نفس نفس پہ عذاب
یہ کوئی اور بلا ہوگی زندگی تو نہیں

ہر اک ہے گلشنِ ہستی میں اپنی دھن میں
یہ رونقیں یہ بہاریں نمائشی تو نہیں

غزالہ مجھ سے وہ کیوں بدگماں سے رہتے ہیں
مرے خلوصِ محبت میں کچھ کمی تو نہیں

---

## نشتر خیرآبادی

پھر تری یاد دلاتے ہیں مجھے
لوگ دانستہ ستاتے ہیں مجھے

زُلف بر دوش نشیلی آنکھیں
وہ تو لُوٹے لئے جاتے ہیں مجھے

میں نے یہ خواب نہ دیکھا ہو کہیں
وہ محبت سے بلاتے ہیں مجھے

اُن کے اشکوں میں بھی اب تو نشتر
دل کے ٹکڑے نظر آتے ہیں مجھے

# ایک جیب کترے کی ڈائری

فکر تونسوی

ہر مہینے ایک نئی ڈائری ——— ڈائریوں کا یہ سلسلہ صرف تفریح طبع کے لئے لکھ رہا ہوں۔ انھیں پڑھ کر سنجیدہ ہوجانے والے حضرات سے مجھے صرف ہمدردی ہوسکتی ہے۔

پہلی اپریل ———

آج اپریل فول منانے کا دن تھا۔ اس لئے میں نے اپنی آتما سے کہا "اے مکند لال کی آتما! آج لوگ دوسروں کو فول بنائیں گے، میں تمھیں بناؤں گا!" اور میں نے بھگوے کپڑے پہنے۔ ماتھے پر ماتھے سے بھی لمبی سیندوری تلک لگایا اور علاقے کے اُس مشہور مندر میں چلا گیا، جس کے پجاری کی جیب پچھلے مہینے کاٹی تھی۔ مجھے اُس پجاری پر غصہ بھی بہت آیا تھا۔ کیونکہ اس کی جیب میں سے کئی کھوٹے سکے بھی نکلے تھے۔ نہ جانے لوگ پوجا کے لئے کھوٹے سکے کیوں چڑھاتے ہیں۔

جب میں مندر میں پہنچا تو عقیدت مندوں کی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ بے اختیار میرا جی چاہا جیب کاٹنے کا یہ نادر موقع ہے لیکن آتما نے مجھے ایک زبردست فحش گالی دی کہ تم مرد ہو یا سیاسی لیڈر؟ وعدہ کرکے ایفا نہیں کرتے۔ میں ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہوگیا۔ اگرچہ مجھے آتما پر سخت طیش آیا کہ یہ کیسی ڈھیٹ ہے ہر وقت انسان کے ساتھ چمٹی رہتی ہے۔

شردھالوؤں کی بھیڑ کو چیر کر میں بھگوان کی مورتی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اندھی عقیدت کے ساتھ آنکھیں بند کرلیں۔ (اگرچہ کبھی کبھی ایک آنکھ تھوڑی سی کھول کر چڑھاوے کے دھن کی طرف بھی ضرور دیکھ لیتا تھا) اور پھر بھگوان کی مورتی کے سامنے حلف لیا کہ اگر میں آئندہ کسی کی جیب کاٹوں تو تم مجھے کانا یا بہرا یا دونوں بنا دینا! یہ حلف میں نے دل ہی دل میں لیا۔ کیونکہ بلند آواز میں لیتا تو ارد گرد کھڑے ہوئے لوگ سن لیتے۔ انسان کتنا مجبور ہے! ایمان دار بنتے ہوئے بھی اُسے لوگوں سے شرم آتی ہے۔

حلف لینے کے بعد جب میں چڑھاوے کے لئے جیب سے پیسے نکالنے لگا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری جیب کٹ چکی تھی!

اُس کے بعد سارا دن اُداس رہا۔ میں آتما کو فول بنانے نکلا تھا لیکن آتما نے مجھے فول بنا دیا! میں نے آتما سے پوچھا "یہ تم نے کیا حرکت کی؟ میں تو صرف تم سے اپریل فول کر رہا تھا۔ صدق دلی سے جیب کترنے سے توبہ تھوڑے کر رہا تھا۔ لیکن تم نے تو ایک سنجیدہ مذاق کر ڈالا کہ تم سچ مچ سو گئیں، نیک بن گئیں، غافل ہوگئیں اور کوئی میری جیب ہی کاٹ کر لے گیا۔ تمھیں چوکس رہنا چاہئے تھا۔"

آتما نے جواب دیا "قہہ قہہ قہہ قہہ!!"

میں نے کہا "شیم! شیم شیم!!"

تین اپریل ———

مندر میں جس آدمی نے میری جیب کاٹی تھی آج اُس کا پتہ چل گیا ہے۔ جیب کتروں کے گورو جسے ہم سب "جگی دادا" کہتے ہیں، آج مجھ سے ذکر کیا کہ آج کل مندروں میں بھی ٹٹ پونجئے شردھالو جانے لگے ہیں۔ پرسوں ہمارے گروہ کے ایک جیب کترے شمبھو نے ایک بھگوے کپڑوں والے بھگت کی جیب کاٹی تو اُس میں سے صرف سوا روپیہ اور ایک ادھ جلی بیڑی نکلی! ——— یہ کہہ کر جگی دادا قہقہہ مار کر ہنسا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ یہ سوا روپیہ اور ادھ جلی بیڑی تو میری جیب میں تھی۔ جی میں آئی کہ دادا کے سامنے اعتراف کرلوں کہ وہ مجھ ذات شریف ہی کی جیب تھی۔ لیکن پھر یہ سوچ کر لرز اُٹھا کہ دادا تو اپنے چابک سے میری چمڑی ادھیڑ دے گا اور ممکن ہے اپنے گروہ میں سے ہی خارج کر دے۔ کیونکہ یہ فنِ جیب کتری کی توہین ہے کہ جیب کترے کی ہی جیب کٹ جائے۔ دادا مجھے ان کرولی فائیڈ قرار دے دے گا۔ اس لئے میں اپنی ندامت کا یہ زہر چپ چاپ پی گیا۔

البتہ مجھے شمبھو سالے پر بہت غصہ آیا کہ اُس نے مجھے پہچانا کیوں نہیں۔ حالانکہ ہم نے کئی بار اکٹھے مل کر جیبیں صاف کی ہیں۔ دل میں فیصلہ کرلیا کہ کسی

دن جب شمبھو کسی کی جیب کاٹے گا، میں ہاتھ کی صفائی دکھا کر اس کی ہی جیب کاٹ لوں گا اور پھر جگّی دادا کے سامنے اُسے شرمندہ کر دوں گا۔

آج شام کو ایک بس شاپ پر اپنا "کاروبار" کرنے کے لیے گیا تھا۔ ایک نوجوان کا لجیٹ کا بٹوا اُڑا لیا۔ مگر اس بٹوے میں صرف ایک حسین لڑکی کا فوٹو نکلا۔ شاید اس کی کا لجیٹ محبوبہ ہوگی۔ فوٹو کی پشت پر لڑکی کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ میں نے اس ایڈریس پر فوٹو پوسٹ کر دیا اور اس کے نیچے کالجیٹ نوجوان کی طرف سے لکھ دیا "شکریہ کے ساتھ واپس!"

۱۴ اپریل ــــــــ

کئی دنوں سے کاروبار مدّھم ہے۔ جس جیب میں بھی ہاتھ ڈالتا ہوں، شرمناک سی رقم ہاتھ لگ رہی ہے۔ نہ جانے لوگوں کی آمدنی کم ہو گئی ہے یا مہنگائی بڑھ گئی ہے کہ لوگوں کی جیب میں پیسے ٹکتے ہی نہیں معلوم ہوتا ہے ہم سے بھی بڑے جیب کترے یعنی بلیک مارکیٹئے میدان میں سرگرم ہو گئے ہیں۔ آخر گورنمنٹ ان بلیک مارکیٹیوں کے خلاف سخت ایکشن کیوں نہیں لیتی۔ اُن کی وجہ سے ہمارے ایسے خاندانی اور شریف جیب کتروں کا بزنس تباہ ہو رہا ہے۔

مجھ پر قرض چڑھ گیا ہے۔ آمدنی نہ ہو تو قرض چڑھنا لازمی ہے۔ کاش! کوئی موٹی آسامی ہاتھ لگ جائے تو سارا دلدّر دور ہو جائے۔ جگّی دادا نے کئی بار پیغام بھیجا بلکہ دھمکی بھی دی کہ ہمارا بھتّہ ادا کر جاؤ نہیں تو پولیس کے ہاتھوں گرفتار کروا دوں گا! اُدھر علاقہ مدن پورہ کا چھوٹا تھانیدار بہت پریشان کر رہا ہے کہ ہمارا بھتّہ ابھی تک کیوں نہیں پہنچا؟ جگّی دادا اور چھوٹا تھانیدار دونوں ایک دوسرے کے ہمراز ہیں اور بھوتوں کی طرح ان کی روحیں میرے اِرد گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ سالے ڈکٹیٹر بنے پھرتے ہیں۔ ہمارے ایسے عوام کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ مفت خورے کہیں کے!

آج میں نے ایک راہ چلتے جیوتشی کو روک کر اُسے اپنے ہاتھ کی ریکھائیں دکھائیں کہ مہاراج! ذرا ان لکیروں کے اندر گھس جاؤ اور دیکھو کہ مجھ بدبخت کے نصیب میں کوئی دولت لکھی ہے یا نہیں؟ جیوتشی نے مجھ سے اکیاون پیسے لے کر بتایا کہ میری پچاس ہزار روپے کی لاٹری نکلنے والی ہے! میں نے اُٹھتے اُٹھتے جیوتشی کی جیب پر اپنی قسمت آزمائی تو اس میں سے صرف پچاس پیسے نکلے! یہ تھی گویا میری پچاس ہزار روپے کی لاٹری! لعنت ہے جاہل جیوتشیوں کی ایسی تیسی! اُن کا ایک ہزار روپیہ ایک پیسے کے برابر ہوتا ہے۔ کمبختوں کو میتھمیٹکس بھی نہیں آتا۔

۱۷ اپریل ــــــــ

سنیچر جو کئی ہفتوں سے میری تقدیر کے خانے میں پھسکڑا مارے بیٹھا تھا، اچانک بھاگ گیا ہے ــــــ اس کے فرار سے میرے اندر بہار آگئی۔ آج کا دن میری زندگی کا خوبصورت ترین دن تھا۔

آج ایک اعلیٰ ترین ہوٹل کے سامنے کھڑا تھا کہ اچانک تیزی سے ایک ٹیکسی آکر رُکی اور اس میں سے ایک خوش پوش ادھیڑ آدمی اور ایک ستم گر قسم کی نوجوان حسینہ باہر نکلی۔ راکٹ کی سی تیزی کے ساتھ میرے دونوں ہاتھ حرکت میں آئے اور دوسرے لمحہ میرے ہاتھ میں دو بٹوے آچکے تھے۔ دونوں کی مجموعی رقم ایک ہزار دو سو سولہ روپے تھی اور تیسرے منٹ میں میں نے دیکھا نوجوان حسینہ اور خوش پوش آدمی دونوں خوبصورت ہوٹل کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ ادھیڑ آدمی نوجوان حسینہ کا نازک گورا گورا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ دونوں قہقہے لگا رہے تھے۔ دونوں محبت کے نشے میں چُور تھے۔ محبت جو انسانوں کے ہوش و حواس گم کر دیتی ہے۔ وہ ہم جیب کتروں کے لیے نعمت غیر مترقبہ بن کر سامنے آتی ہے۔

وہ اس وقت قہقہے لگا رہے تھے، جب ہوٹل کا بیرا ان کے سامنے بل پیش کرے گا تو یہ دونوں زار و قطار روئیں گے۔ سچ ہے محبت صرف ہنساتی نہیں ہے، رُلاتی بھی ہے ــــ مجھے ان دونوں پر رحم بھی آیا کہ وہ ہوٹل کے منیجر کے سامنے کتنے شرمندہ ہوں گے۔ سارا عشق کافور ہو جائے گا۔ جی چاہا ان کی دُردشا دیکھنے کے لیے ہوٹل کے باہر کھڑا رہوں اور ممکن ہو تو کسی بہانے ان کی جیب میں دس روپے کا ایک نوٹ ڈال دوں تاکہ بیچارے ٹیکسی پر واپس تو جا سکیں۔ نوجوان حسینہ اگر پیدل چلے گی تو اس کے نرم و نازک تلووں میں چھالے پڑ جائیں گے۔

لیکن جیب تراشی کے عظیم اصولوں کے مطابق اس جگہ رُکنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لیے میں ایک ٹیکسی پر چلا گیا۔ قرض اُتار دیا۔ جگّی دادا اور چھوٹے تھانیدار کا بھتّہ بھی ادا کر دیا۔ بیوی کے لیے ایک ساڑی اور اپنے لیے خشک گوشت اور وہسکی خریدی اور اس وقت وہسکی کا پیگ سامنے رکھے آہستہ آہستہ نوش کر رہا ہوں اور ڈائری بھی لکھ رہا ہوں۔ کاش! مجھے اس عاشق بوڑھے کا ایڈریس مل جاتا تو اُنھیں شکریے کا ایک خط ہی لکھ دیتا۔

۲۰ اپریل ــــــــ

آج تین دن بعد گھر سے باہر نکلا تھا۔ ان کاٹے ہوئے [illegible] کا نشہ ابھی تک اُترا نہیں لیکن اُتار کا احساس ضرور شروع ہو گیا ہے۔ [illegible] سے مارکیٹ میں پھر آگیا کہ کہیں جیب تراشی کی پریکٹس نہ بھول جاؤں۔ [illegible] بھی اپنے ساتھ لے لیا کیونکہ اخباروں میں پڑھا تھا کہ آج کل [illegible] کی خاطر جیب کترے حضرات چھُرے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ [illegible] کاٹتے پکڑا گیا تو اس نے جیب کٹوانے والے کو نہیں [illegible]

پیٹ میں چھرا اُتار دیا۔ جب وہ بھاگنے میں کامیاب ہوا۔

ٹہلتے ٹہلتے ایک جلسہ گاہ میں جا پہنچا۔ ایک جگہ نو دس سال کے ایک چھوکرے کو لوگ پکڑے ہوئے تھے اور لاتوں، مکّوں اور طمانچوں سے اُسے "بااخلاق" بنا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ اُس نے ایک بوڑھے کی جیب میں سے تین روپے اُڑا لیے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس چھوکرے کو تڑاخ تڑاخ چانٹے رسید کیے جس سے اُس کی ساری جیب کتری نکل گئی اور اُس سے تین روپے لے کر بوڑھے کو واپس دے دیے اور اعلان کر دیا کہ میں خود اِس لونڈے کو تھانے میں لے جاؤں گا!

بوڑھے نے میرا شکریہ ادا کیا اور جب میں اُس لونڈے کو کان سے پکڑے تھانے کی طرف لے جا رہا تھا تو اُس بوڑھے کے تین روپے میری جیب میں واپس رکھے تھے۔ کیونکہ جب وہ بوڑھا میرا شکریہ ادا کر رہا تھا میں اُس کی جیب دوسری بار کاٹ رہا تھا! میں نے راستے میں اُس چھوکرے کو گالیاں دے کر اُن تین روپوں میں سے ایک روپیہ دے دیا اور اُسے سمجھایا کہ بے وقوف! جیب کاٹنا ہو تو پہلے کسی اُستاد سے یہ ہنر سیکھ لو۔ تمھارے ایسے ناکارہ جیب کتروں نے تو اِس فنِ لطیف کو رسوا کر دیا ہے۔

میں نے وہ دو روپے بھکاریوں میں بانٹ دیے۔ آخر وہ بھی انسان ہیں، انھیں بھی زندہ رہنے کا حق ہے۔ اگر خود جیب نہیں کتر سکتے تو جیب کتروں ہی کی کمائی کھائیں۔

**۲۵ اپریل ــــــــ**

بد قسمتی جب ساتھ دیتی ہے تو جیب کترا کسی کلرک کا بٹوا اُڑا لیتا ہے۔ آج اُس کلرک کا بٹوا اپنے سامنے رکھے میں اُس کی بد قسمتی اور اپنی بے وقوفی پر ہنس رہا ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ بٹوا نہ ہو سائن بورڈ ہو جس پر لکھا ہو "شمشان گھاٹ کو ــــ"

در حقیقت غلطی مجھ سے ہوئی۔ میں گذشتہ تین دن سے ایک رشوت خور کلرک کا پیچھا کر رہا تھا تاکہ وہ فلسفۂ مساوات کی رُو سے اپنی رشوت کا روپیہ ہم جیب کتروں میں بھی ففٹی ففٹی بانٹ سکے لیکن عین موقع پر وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا جس پر مجھے سخت غصّہ آ گیا اور میں نے غصّے میں آ کر ایک دوسرے کلرک کی جیب کاٹ لی۔ اُس میں سے جو کچھ برآمد ہوا، ذرا ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ ایک ٹیلرنگ شاپ کا بِل ساڑھے چھ روپے۔ یہ شاید ایک قمیص کا بِل تھا، جسے یہ کلرک نہ ادا کر سکا نہ قمیص لا سکا۔ حالانکہ مقررہ تاریخ کو دو ہفتے گزر چکے تھے!

۲۔ کلرک کے سالے کا ایک خط جس میں اُس نے دھمکی دی تھی کہ میں اپنے بال بچوں سمیت آپ کے گھر میں گرمی کی تعطیلات گزارنے آ رہا ہوں ــــــ شاید کلرک کے گھر کو اُس نے ہِل اسٹیشن سمجھ لیا تھا۔

۳۔ ایک چھوٹی سی ربڑ جو اُس نے اپنے بچے کے لیے دفتر سے چُرائی ہوگی۔

۴۔ "دُرنے لیے کنیا کی ضرورت" کے اشتہار کی ایک کٹنگ۔ اِس کا مطلب ہے، کلرک کی بیٹی اپنی جوانی کا بوجھ لیے اُس کے کندھے پر بیٹھی تھی!

۵۔ دس پیسے کا ایک رسیدی ٹکٹ (اُسے رسیدی ٹکٹ کی کیا ضرورت پڑی ہوگی، نہ جانے کیسے اُس کے ہاتھ لگ گیا) جو میرے لیے بھی بیکار تھا۔

۶۔ ایک فوٹوگراف جس میں کلرک اپنے پانچ بچوں اور ایک بائیسکل کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ بائیسکل بھی اُس کا چھٹا بچہ معلوم ہو رہی تھی!

۷۔ دو روپے کے ایک میلے کچیلے نوٹ کے تین ٹکڑے ــــــ وہ نوٹ اُس کی غیر منقولہ جائداد کے طور پر محفوظ رکھا ہوا تھا۔

اِس کے علاوہ کچھ انتہائی غیر ضروری کاغذات تھے۔ ایک میل سے بھری کنگھی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ بیش قیمت چیز جو کلرک مذکور کے ہارٹ فیل ہونے کا باعث بنے گی، وہ تھی دو روپے بیس پیسے کی نقد رقم! جس کے بل بوتے پر کلرک اِس مہینے کے آخری نازک دن گزارنا چاہتا تھا!

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ تمام چیزیں ایک رجسٹرڈ پیکیٹ کے ذریعہ کلرک مذکور کو پوسٹ کر دوں گا اور دو روپے بیس پیسے کی رقم اُس کی رجسٹریشن فیس پر خرچ کر دوں گا۔

اور آئندہ کے لیے میں نے حلف لے لیا ہے کہ جب بھی کسی کی جیب کاٹنے لگوں گا، اُس سے پہلے پوچھ لوں گا کہ تم کلرک تو نہیں ہو؟

۲۸ اپریل ــــــــ

آج میں جیل میں بیٹھا ہوں۔ کل فٹ بال میچ کے دوران میں اچانک جیب کاٹتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ میرا دوسرا ساتھی تو بٹوا لے کر فرار ہو گیا لیکن میں ہتّھے چڑھ گیا۔ البتہ داروغہ جیل جب مجھے اندر بند کرنے لگا تو میں نے اُس کی جیب سے بھی دس بارہ روپے کی رقم اُڑا لی!

مجھے افسوس صرف یہ ہے کہ یکم مئی سرکاری ملازموں کی تنخواہ کا دن ہے اور تنخواہ کے دن ایک جیب کترے کا جیل میں رہنا جیب تراشی کی تاریخ کا ایک المناک حادثہ ہے۔ میں نے جگّی دادا کو پیغام بھجوا دیا ہے کہ مجھے یکم مئی سے پہلے پہلے رہا کروا دے!!

---

# انعامی معمہ ۲ حیدرآباد
## بیس ہزار روپے نقد حاصل کیجئے

**پہلا انعام بالکل درست حل پر پندرہ ہزار روپے**

چار غلطیوں تک ۵ ہزار روپے

دستی و ڈاک سے وصول ہونے والے حلوں کی آخری تاریخ ۸ جون ۱۹۷۰ء ۲ بجے شب تک۔

صحیح حل ۱۰ جون ۱۹۷۰ء کو شائع کیا جائے گا۔

(فی حل صرف ایک روپیہ)

| | اشارے | ممکن الفاظ | |
|---|---|---|---|
| ۱ | زاہد سے مراد ایسا شخص ہے جو محض ـــــ کو کمال سمجھتا ہے۔ | اعمال | عبادت |
| ۲ | آخرت اندھیرا ہے جس کا چراغ ـــــ ہے۔ | نیک عمل | توبہ |
| ۳ | ہر بزدل انسان صرف ـــــ کا سہارا لیتا ہے، چاہے وہ اُس کی کتنی بھی توہین کر ڈالے۔ | بہادر | طاقتور |
| ۴ | زندگی گزارنے والوں کا کام یہ ـــــ کہ وہ قدرت سے پنجہ آزمائی کریں۔ | نہیں | ہے |
| ۵ | ہم آپ کے بادشاہ کی خدمت میں اپنے یہاں کے کچھ ـــــ کی وجہ سے حاضر ہوئے ہیں۔ | سپاہیوں | کم عقلوں |
| ۶ | [illegible] نہ مینا کے دونوں بیبیاں جیسی رہیں اور ـــــ نہ کیا۔ | پردہ | لحاظ |
| ۷ | ہماری جدید ترین تحقیقات بھی بتاتی ہیں کہ قدرت انسان کی ـــــ نہیں۔ | دشمن | دوست |
| ۸ | یہ نام نہیں لکھتے تھے بلکہ کسی ـــــ درجہ کے شاعر کی غزل کے بھرتی کے قافیے لگتے تھے | تیسرے | چوتھے |
| ۹ | اجی اپنا کیا ہے۔ خدا کی دین سمجھئے میں تو صرف ـــــ کا کرایہ دار ہوں۔ | جناب | خدا |
| ۱۰ | ان لوگوں نے وہ ـــــ استعمال نہیں کیا تھا جس سے اندر داخل ہوتے تھے۔ | دروازہ | راستہ |
| ۱۱ | دین ایک روحانی قوت ہے اور مادی طاقت بہم پہنچانے کے لئے ـــــ بھی ہے۔ | پکار | للکار |
| ۱۲ | یہاں نہ کوئی آنے کو ـــــ نہ جانے کو ٹوکے۔ | روکے | ٹوکے |
| ۱۳ | ساری کائنات ایک ہی ـــــ سے صادر ہوئی ہے۔ | ارادے | اشارے |
| ۱۴ | ان چھوٹی قوموں کی عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں ـــــ تعلیم یافتہ ہو گئی ہیں۔ | کم | بہت |
| ۱۵ | بس تم کو مناسب ہے کہ اپنی ـــــ کے مطابق بندگی کیا کرو۔ | طاقت | استطاعت |
| ۱۶ | تمہاری قوم جن باتوں کو بُرا سمجھتی ہے ان کو ـــــ کر دو۔ | بند | ختم |
| ۱۷ | اگر کوئی شخص اس نیت سے چوری اور ڈاکہ زنی کرے کہ جو مال اِسے حاصل ہوگا اس سے وہ غریبوں اور مسکینوں کی مدد کرے گا تو وہ بھی ـــــ کا مستحق ہوگا۔ | ثواب | عذاب |
| ۱۸ | بعض لوگ ہر موسم پر موسم کی چیزیں اپنے عزیزوں کے لئے ـــــ کیا کرتے ہیں۔ | ارسال | خیرات |

اس معمہ کے تمام جملے مختلف طبع شدہ اردو کتابوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفوں کے الفاظ جو ان کتابوں میں درج ہیں ان کے صحیح حل ہیں۔ آپ انھیں ان کتابوں میں تلاش کیجئے یا اپنی عقل و فراست کو کام میں لاتے ہوئے "ممکن الفاظ" میں سے صحیح حل تلاش کیجئے۔ حل شریک کرنے کے لئے آپ سادہ کاغذ پر اشارہ نمبر کے ساتھ دونوں ممکن لفظ نوٹ کیجئے اور جنھیں آپ درست نہیں سمجھتے انھیں سیاہی سے کاٹ دیجئے۔ ایک طبع شدہ کوپن کے ساتھ آپ جتنے بھی حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ کسی انعام کو کسی اور انعام پر ترجیح نہیں دی جائے گی۔

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | اعمال | عبادت | ۱۰ | دروازہ | راستہ |
| ۲ | نیک عمل | توبہ | ۱۱ | پکار | للکار |
| ۳ | بہادر | طاقتور | ۱۲ | روکے | ٹوکے |
| ۴ | نہیں | ہے | ۱۳ | ارادے | اشارے |
| ۵ | سپاہیوں | کم عقلوں | ۱۴ | کم | بہت |
| ۶ | پردہ | لحاظ | ۱۵ | طاقت | استطاعت |
| ۷ | دشمن | دوست | ۱۶ | بند | ختم |
| ۸ | تیسرے | چوتھے | ۱۷ | ثواب | عذاب |
| ۹ | جناب | خدا | ۱۸ | ارسال | خیرات |

**کوپن**

میں انعامی معمہ ۲ حیدرآباد کے تمام شرائط سے متفق ہوں اور ایڈیٹر کے فیصلہ کو آخری تسلیم کرتا ہوں۔ فی حل ایک روپیہ شرکت فیس ذریعہ نقد نامہ/منی آرڈر/پوسٹل آرڈر روانہ کی گئی ہے۔ اور رسید منسلک ہے جس کا نمبر ـــــ ہے۔

مکمل نام ـــــــــــــــــــ

مکمل پتہ ـــــــــــــــــــ

ـــــــــــــــــــ

پوسٹ ـــــ ڈسٹرکٹ ـــــ

دستخط ـــــ (خانہ ایڈیٹر)

پتہ:

**انعامی معمہ ۲ حیدرآباد**

آئیڈیل بلڈنگس عقب لائٹ ہاؤز ٹاکیز

گن فونڈری حیدرآباد ۱ آندھرا پردیش

# اے محبّت ترے انجام پہ رونا آیا

## محمد رفیع انصاری


مکان نمبر ۵۲ درگاہ روڈ، بھیونڈی، ضلع تھانہ، مہاراشٹرا


بزرگ و محترم! خلوص و احترام

بیسویں صدی کے لئے ایک اور تازہ افسانہ "اے محبت ترے انجام پہ رونا آیا" ارسال کر رہا ہوں جو کہ خطوط پر مشتمل ہے اُمید ہے آپ کو پسند آئے گا۔ مجھے آپ کی اور قارئین کرام کی گرانقدر رائے کا شدت سے انتظار رہے گا ....

آپ کا اپنا ——— محمد رفیع انصاری

مظہر منزل ۵۲، ایم۔ پی۔ روڈ، جھمری تلیا

۵ ستمبر ۶۸ء

محترمی! امجد صاحب! آداب

آج ہی ماہنامہ "عندلیب" کے قلمی دوستی کے کالم میں آپ کا نام نظر نواز ہوا۔ آپ کے مشغلے بہت پسند آئے۔ دل نے کہا کیوں نہ قلمی دوستی کا سہارا لے کر آپ سے دوستی کی جائے۔ اس لئے اپنی اِس خواہش کی تکمیل کے لئے یہ نامہ ارسال کر رہی ہوں۔

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف!

کچھ اپنے متعلق عرض کروں۔ میرا نام شاہدہ ہے۔ میں مقامی کالج کی ایک طالبہ ہوں۔ فیشن سے گہرا لگاؤ ہے۔ سیر و سیاحت کا بھی شوق رکھتی ہوں۔ کالج کی چھٹیاں اکثر سیر و تفریح ہی میں گذرتی ہیں۔ قلمی دوستی میرا دلچسپ مشغلہ ہے۔ لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ کسی کو خط لکھ رہی ہوں۔ آپ کے جواب کا شدت سے انتظار رہے گا۔ اچھا تو اب مجھے اجازت دیجئے۔

شاہدہ

---

تمہارے پاؤں چومیں گے میری تحریر کے ٹکڑے

آپ کا نامہ کیا ملا۔ جیسے سب کچھ مل گیا! میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ آپ کی دلکش تحریر پڑھ کر خوشی سے پاگل ہوا جا رہا ہوں آپ کے خط کا ایک ایک جملہ کتنی مٹھاس رکھتا ہے۔ جس کی لذت میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ اُن میں جو خلوص اور پیار بسا ہوا ہے اُسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ آپ کے اندازِ بیان کی شیرینی مصری کی ڈلیوں سے کم نہیں آپ کی تحریر کی چمک موتیوں سے کم نہیں!

میں کتنا خوش نصیب ہوں شاہدہ! کہ قلمی دوستی کے ذریعہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ اور بھی خطوط آئے لیکن آپ کے خط کی بات ہی نرالی ہے۔ اِس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں صرف آپ سے قلمی دوستی جاری رکھوں گا۔ میں یہ دوستی دل و جان سے قبول کرتا ہوں۔

آپ کے آئندہ خط کا جس بے چینی سے انتظار ہے وہ ناقابلِ بیان ہے!

آپ کا اپنا دوست ——— امجد

---

جھمری تلیا ——— ۲۴ ستمبر ۶۸ء

اچھے امجد! آداب

آپ کا خوبصورت خط ملا۔ آپ کی مبالغہ آرائی۔ دوستوں کی انجمن میں اچھے خاصے مذاق کا سامان بنی۔ میری کئی سہیلیوں نے آپ کے خط میں حد سے زیادہ دلچسپی لی۔ لیکن میں نے اُنہیں اُن کے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا۔

---

بمبئی— ۲۸ ستمبر ۶۸ء

محترمہ شاہدہ صاحبہ! آداب و تسلیمات

اگر تم طیش میں آکر میرا خط پھاڑ بھی ڈالو تو

آپ کے خط کی مقبولیت کلاس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اب تک دوستوں کی محفل میں موضوع گفتگو بنا ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ مجھ سے کہیں زیادہ اچھا لکھتے ہیں ادیب جو ٹھہرے۔

اِن دنوں میں بہت زیادہ مصروف ہوں۔ اس لئے کہ آئندہ ہفتہ میری سالگرہ ہے۔ یہ میری اٹھارہویں سالگرہ ہوگی۔ دعوت نامے بہت ہی قلیل تعداد میں چھپے تھے جو صرف رشتہ داروں ہی تک محدود ہے۔ میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ اُمید ہے بخش دو گے۔

اچھے امجد! اگر گستاخی نہ ہو تو آئندہ خط کے ساتھ اپنی تصویر بھی ارسال فرمائیں۔ تاکہ آپ کا دیدار تو ہو سکے۔

آپ کی دوست ——— شاہدہ

---

بمبئی، ۳ اکتوبر ۱۹۶۸ء

میری پیاری دوست! شاہدہ

تم سلامت رہو ہزار برس      ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

سب سے پہلے تو میں تمہیں سالگرہ کی مبارکباد دل کی گہرائی سے دیتا ہوں۔ خدا تمہیں تاقیامت سلامت رکھے۔ شاہدہ! میں اس خوشی کے موقع پر ایک نہایت ہی قیمتی کیمرہ، ایک خوبصورت ٹیپ ریکارڈر اور ایک خوبصورت سوئیٹر ارسال کر رہا ہوں۔ مجھے اُمید ہے تم ضرور قبول کرو گی۔ ساتھ ہی اپنی ایک تصویر بھی ارسال کر رہا ہوں۔

شاہدہ! تمہیں دیکھنے کو دل بہت بے قرار رہتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ پر لگا کر پہنچ جاؤں اور تمہارا دیدار کروں۔ گذشتہ رات تم میرے سپنے میں بھی آئی تھیں۔ تم واقعی بہت خوبصورت ہوں گی۔ خدا دل جلوں کی نظر بد سے بچائے۔ معاف کرنا میں لفظ تُم کا استعمال کر رہا ہوں۔ لیکن یہ محض بے تکلفی ہے۔

شاہدہ! یہ میری التجا ہے کہ آئندہ خط کا جواب دیتے وقت اپنی خوبصورت سی تصویر بھی ضرور بھیجنا۔ کم از کم تمہاری تصویر سے تو دل بہلایا کروں گا۔ سچ رات میں بھی تمہاری یاد ستاتی رہتی ہے اور تمہارا خیالی چہرہ تصور پہ چھایا رہتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے شاہدہ! کہ تم دور ہوتے ہوئے بھی بہت قریب محسوس ہوتی ہو۔ میں اپنے دل کے آئینے میں تمہیں پاتا ہوں۔ کاش تم بھی میرے احساسات و جذبات کو سمجھ سکو۔

دل کے آئینے میں تصویر تری رہتی ہے<br>
میں یہ سمجھا کوئی جنت کی پری رہتی ہے

تمہارا اپنا ——— امجد

---

جھمری تلیا، ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۸ء

اچھے امجد! ——— پیار بھرا آداب

سالگرہ کی دھوم دھام کو تمہارے خط نے دوبالا کر دیا! سہیلیوں نے جی بھر کے داد دی۔ اور اتنا اچھا دوست پانے پر میں دوہری مبارکباد کی مستحق ٹھہری۔ خدا کرے تم ہمیشہ میرے دوست بنے رہو۔ مجھے پُرخلوص خطوط لکھتے رہو اور میں اُن کا جواب دیتی رہوں۔ میں اپنے ہر دوست سے تمہارا ذکر کرتی ہوں۔ سب ہی مجھ سے رشک کرتے ہیں اور اپنی بدقسمتی پر روتے ہیں۔ امجد! خدارا تم مجھ سے جُدا نہ ہو جانا۔ ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ تمہاری تصویر توقع سے زیادہ خوبصورت ہے۔ کاش میں تُم سے مل سکتی۔ تُم سے خوب باتیں کر سکتی۔ تمہیں نزدیک سے دیکھ سکتی۔ بہرحال وہ دن دور نہیں جب ہم ایک دوسرے کو بخوبی پہچان لیں گے۔ تب ہی تو لطف آئے گا۔

مجھے کبھی تنہائی سے وحشت ہوتی ہے تو میں ریڈیو سے دل بہلانا چاہتی ہوں۔ لیکن کیا بتاؤں کم بخت ریڈیو بھی اچھا نہیں بجتا۔ اچھے امجد! تم کتنے خوش

یہ سب ہو کہ تمہیں زندگی کی تمام آسائشیں میسر ہیں۔ لیکن پھر بھی تم نہایت فراخ سا ہوں کی ہو اور مہربان دوست ہو۔ کاش تمہاری یہ مہربانی عرصہ تک ہم پر رہتی رہے۔

تمہاری دوست ——— شاہدہ

---

زاہدہ، بمبئی - ۲۹ اکتوبر ۶۸ء

میری اپنی شاہدہ! السلام علیکم!

اُمید ہے تم اچھی ہوں گی۔ تمھیں میں یہ خط تمہارے پچھلے خط کے جواب میں لکھ رہا ہوں جس نے مجھے جینے کا احساس دلایا ہے۔

شاہدہ! میں تمہیں ایک سچے دوست کا پیار دوں گا۔ بشرطیکہ تم بھی میرے ساتھ یہی سلوک کرو۔ مجھے زندگی کی تمام نعمتیں اور آسائشیں تو میسر ہیں، لیکن اس میں تمہاری دولت بھی شامل ہو جائے تو میں اپنے آپ کو بہت زیادہ خوش قسمت سمجھوں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اس طرف توجہ دو گی۔ اب تک تمہاری تصویر نہیں ملی آئندہ خط کے ساتھ اپنی تصویر ضرور بھیجنا۔ شاہدہ! میں تو اب تم بن رہ نہیں سکتا۔ تمہاری یاد ہر وقت آتی ہے۔ کہیں بھی جی نہیں لگتا۔ ہر وقت اُداس اُداس سا رہتا ہوں۔ کھانے پینے تک کی سُدھ بُدھ نہیں رہتی۔ ایسے میں تمہارا خط آجاتا ہے تو وہ خوشی ملتی ہے جو رہ رہ کر زندہ رہنے کا احساس دلاتی ہے۔

شاہدہ! میں تمہارے لئے ایک پاکٹ سائز خوبصورت ساٹرانسسٹر بھیج رہا ہوں۔ تاکہ تم تنہائی کی گھٹن کو دور کر سکو۔ یقین جانو اب میں زندہ ہوں تو صرف تمہارے لئے.... اور صرف تمہارے لئے....

صرف تمہارا ——— امجد

---

بمبئی - ۱ نومبر ۶۸ء

میری اپنی شاہدہ! خوش رہو۔

کافی دن بیت گئے تمہارا خط نہیں ملا۔ تم تو ہمیشہ فوراً خط لکھنے کی عادی ہو۔ آخر تمہیں کیا ہوگیا ہے شاہدہ۔ تمہارے ساتھ کوئی حادثہ تو نہیں پیش آیا۔ خدا نہ کرے تمہیں کچھ ہو۔ پھر آخر تمہیں کیا ہوگیا ہے شاہدہ۔ مجھے ضرور بتاؤ نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ بے چینی سے میرا بُرا حال ہے۔ خدا تمہیں سلامت اور خوش و خُرّم رکھے۔ میں دن رات تمہاری تندرستی کی دعا مانگتا ہوں۔ تمہاری اِس خاموشی نے مجھے دیوانہ بنادیا۔ میں پاگل ہوا جارہا ہوں۔ خدا کے لئے میرا یہ پاگل پن دُور کرو اور اپنی خیریت کی اطلاع دو۔

صرف تمہارا ——— امجد

---

۱۱ نومبر ۶۸ء

میرے احمق دوست ——— امجد

اُمید ہے تم ابھی پاگل نہ ہوئے ہوگے۔ اور اگر پاگل ہو ہی گئے ہوگے تو آج تمہارا پاگل پن دُور ہو جائے گا۔ ذرا خط کو سنبھال کر پڑھو کہیں ہاتھوں سے چھوٹ کر گر نہ پڑے۔ ہاں! تو ذرا کان کھول کر سنو میں شاہدہ نہیں شاہد ہوں؟ دیکھا امجد صاحب۔ بن گئے نا بے وقوف؟ احمق کہیں کے تجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے بھولے ہوگے۔ بھلا سوچو کوئی لڑکی اتنی جلد تمہارے چکر میں کیسے پھنس سکتی ہے۔ خیر اب تو تم بیوقوف بن چکے ہو لیکن آئندہ کے لئے ذرا احتیاط کرنا ورنہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔ تمہارے وہ قیمتی تحائف جو تم نے شاہدہ کو ارسال کئے تھے اُسے شاہد نے بذریعہ ڈاک لوٹا دیا ہے۔ جو بہت جلد تمہیں مل جائیں گے۔

تمہارا پُرانا دوست ——— شاہد

---



---

سبز انقلاب
اور ہم



davp 70/23



مُلک و قوم
کی
خدمت
1945 - 1970

مرکز کا
پانی و بجلی
کمیشن

# صحت و زندگی

## ۱• چھاچھ ——— ایک صحت بخش غذا

دہی سے تیار کرتے ہیں۔ بہت ارزاں اور بے حد مفید غذا ہے۔ اس کا مزاج سرد اور تر ہے۔ گرم مزاجوں کو بہت مفید اور بہت موافق ہے۔ سرد مزاجوں کو کم پینی چاہیئے۔ بھوک بڑھاتی ہے۔ بدن کو فربہ کرتی ہے، خون کی حدت کو کم کرتی ہے، معدہ اور جگر کی حدت اور سوزش کو دور کرتی ہے۔

ہماری خوراک کا کچھ غیر ہضم شدہ حصہ انتڑیوں میں رک کر سڑنے لگتا ہے۔ لیکن چھاچھ پینے سے انتڑیاں بالکل صاف ہو جاتی ہیں اور معدہ کو نئی قوت اور طاقت حاصل ہوتی ہے۔ چھاچھ قدرتی طور پر دافع امراض ہے۔

فرانس کے ڈاکٹر سچین نے اپنے تجربات کی روشنی میں لکھا ہے ———

"جسم کی پرورش کرنے کے لئے چھاچھ اعلیٰ درجہ کی غذا ہے۔ چھاچھ کے استعمال سے بڑھاپا جلد نہیں آتا۔

تازہ اور میٹھے دہی کی چھاچھ پینے سے آنتوں میں زہر پیدا کرنے والے جراثیم فوراً ہلاک ہو جاتے ہیں اور قوتِ ہاضمہ میں اضافہ ہوتا ہے۔"

چھاچھ میں کیلسیم، میگنیشیم، پروٹیم، سوڈیم، فاسفورس، کلورین، سلفر وغیرہ نمک ہوتے ہیں اور یہ سب گوشت اور ہڈی کی پرورش کرتے ہیں۔

ماہرینِ غذا کا متفقہ فیصلہ ہے کہ چھاچھ ایک مفید غذا ہے۔ چھاچھ پینے سے بڑھاپا جلد نہیں آتا اور عمر بڑھتی ہے۔ چھاچھ جسم کی پرورش کرنے والی غذا ہے۔ ترش چھاچھ پینے سے انتڑیوں میں زہر پیدا کرنے والے جراثیم ہلاک ہو جاتے ہیں ——— تپ دق اور سنگرہنی کے مریضوں کے لئے چھاچھ بہت مفید ہے۔ آیورویدک میں اسے مرض سنگرہنی کا قاتل بتایا گیا ہے۔

سردیوں کے موسم میں چھاچھ یا دہی کے ساتھ تھوڑی سی سونٹھ یا زیرہ کا اضافہ کر لینے سے چھاچھ نقصان نہیں کرتی ——— موسم برسات میں چھاچھ مضر ہے۔ اسے کم سے کم استعمال کریں۔

سرد موسم میں چھاچھ سونٹھ اور زیرہ کے بغیر ہرگز نہ پئیں بھینس کے دہی کی چھاچھ بہت چکنی، بھاری اور بلغم پیدا کرتی ہے۔ اسے سونٹھ، کالی مرچ، زیرہ اور نمک کے بغیر ہرگز نہ پئیں۔ گائے کے دہی کی چھاچھ بلاشبہ زیادہ مفید ہے۔

## ۲• حُسن و رعنائی کا راز

کسی نے کہا ہے اور بالکل سچ کہا ہے ———

خوش باش دمے کہ زندگانی این است!

خوش رہنے میں صحت اور زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ ایک مغربی مفکر نے کہا ہے ——— "ایک دلکش مسکراہٹ میں حُسن و خوبصورتی اور دلکشی و رعنائی ہی کا نہیں زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔"

ایک دوسرے دانشور نے کہا ہے ——— "اپنی زندگی کو طویل و حسین بنانا چاہتے ہو تو ہر حالت میں مسکراتے رہو۔ یہی نہیں دل کھول کر ہنسنے کو اپنا معمول بنا لو۔"

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ——— "دن بھر جو تم جاگتے ہوئے مسکرایا کرو، تم خواب میں ہنسا کرو گے۔ اپنی ناکامی پر مسکرا دو، تمھیں کامیابی و کامرانی حاصل ہوگی۔"

مسکراہٹ میں وہ جادو ہے جو بھدی اور بھونڈی صورت کو بھی دلفریب اور پُرکشش بنا دیتا ہے۔ مسکراتا ہوا چہرہ دوسروں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیتا ہے ——— تزئین و آرائش کے دوسرے لوازمات آپ کو اتنا حسین نہیں بنا سکتے جتنا ایک دلکش مسکراہٹ!

## ۳• صحت ہی زندگی ہے

"صحت ہی زندگی ہے" ——— اس حقیقت سے آگاہ اور آشنا ہونے کے باوجود بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنی کار یا اپنے کام کی مشین کا جتنا خیال رکھتے ہیں، اپنے جسم کی مشین، اپنی صحت کا اُتنا بھی خیال نہیں رکھتے۔

بیماری جسمانی تکلیف کے علاوہ کام میں حرج اور روز مرہ کے اخراجات میں اضافہ اور افراتفری کا بڑا سبب ہے۔ ہوا اور سورج کی روشنی، ماکولات و مشروبات، دانتوں کی حفاظت، طرزِ نشست و برخاست، لباس، ورزش اور نیند وغیرہ کے اصول ہر انسان کو معلوم ہونے چاہئیں۔ یہ حقیقت ہے کہ تندرست رہنے کا فن دوسرے تمام علم و فن سے زیادہ ضروری ہے۔ انسان اگر ہنر مند بھی ہے، لیکن بیمار رہتا ہے تو وہ نہ اپنی ذات کے لئے مفید ہے اور نہ معاشرہ کے لئے۔ اس کی زندگی اپنے لئے مصیبت ہے اور دوسروں کے لئے بھی!

## ۴• وقت ہر زخم کا مرہم ہے

مشہور مفکر جان ہومر نے لکھا ہے — "جوں جوں میری زندگی گزرتی گئی مجھے اندازہ ہوتا گیا کہ وقت خود بخود میری بہت سی پریشانیوں کو حل کر دیتا ہے۔ درحقیقت اکثر اوقات میرے لئے یہ یاد رکھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک ہفتہ پہلے میں کس چیز یا کس بات کے لئے پریشان تھا۔ اس لئے میں نے یہ اصول بنالیا ہے کہ کسی مسئلے پر، کسی مشکل کے لئے پیچ و تاب نہ کھایا جائے جب تک اُسے کم سے کم ایک ہفتہ نہ گزر جائے۔ یہ درست ہے کہ میں ایک ہفتے تک ایک وقت میں مسئلے کو اپنے دماغ سے بالکل ہی نہیں نکال سکتا۔ لیکن میں اتنا ضرور کرتا ہوں کہ اُسے مقررہ میعاد ختم ہونے تک اپنے دماغ پر حاوی نہیں ہونے دیتا۔ اس وقت تک یا تو مسئلہ حل ہو چکا ہوتا ہے یا میرے ذہنی رویئے میں اتنی تبدیلی آچکی ہوتی ہے کہ مجھے اس کے متعلق کوئی پریشانی محسوس نہیں ہوتی۔"

## ۵• زندگی کی جنگ جیتنے کے لئے

زندگی عیش و عشرت کی بزم اور سکھ کی سیج نہیں۔ زندگی رزمگاہ ہے۔ جو لوگ عزم و استقلال سے کام لیتے ہیں، زندگی کی جنگ میں ان کی فتح یقینی ہوتی ہے، اور جب وہ زندگی کی جنگ جیت لیتے ہیں تو زندگی ان کے لئے عیش و عشرت کی بزم اور سکھ کی سیج بن جاتی ہے۔ ایک مفکر نے لکھا ہے —

"زندگی کی جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایمان، خود اعتمادی، ہمت، وفاداری، محبت، مشاہدہ، بلند تصورات، قوت فیصلہ، صحیح خیالات، خوش طبعی، نظم و ضبط — اور ایسے ہی دوسرے سامان آپ کے پاس ہوں اور ان سے آپ نہایت دانشمندی اور ہوشمندی سے کام لیں۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو زندگی کی جنگ میں آپ یقیناً فتح مند و ظفر یاب ہوں گے۔"

## ۶• پریشانی کا بہترین تریاق

آج زندگی سراپا پریشانی بن گئی ہے۔ شاید ہی کوئی آدمی ہو جو آج کی دنیا میں پریشان نہ ہو — آیئے آپ کو پریشانی کا بہترین تریاق بتائیں۔ ہو سکتا ہے اسے پڑھ کر آپ ہنس دیں اور اس کے پریشانی کا بہترین تریاق ہونے کا آپ کو اسی لمحہ ثبوت مل جائے۔

امریکی کرنل ایڈی ایگن نے لکھا ہے — "اپنے تجربہ کی روشنی میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پریشانی کا بہترین تریاق ورزش ہے۔ جب آپ پریشان ہوں اپنے پٹھوں کو زیادہ، اپنے دماغ کو کم استعمال کیجئے۔ نتیجہ دیکھ کر آپ حیران ہو جائیں گے۔ اپنا تو یہی تجربہ ہے۔ اُدھر ورزش ہوئی اُدھر پریشانی غائب۔

میرا تجربہ ہے کہ جب تک کوئی شخص گولف یا ٹینس کھیل رہا ہو، یا کوئی اور ورزش کر رہا ہو، وہ اتنا مصروف ہوتا ہے کہ پریشان ہو ہی نہیں سکتا۔ تکالیف کے بڑے بڑے ذہنی پہاڑ چھوٹی چھوٹی خشک پہاڑیاں بن جاتے ہیں، جنھیں نئے خیالات اور افعال جلد ہموار کر دیتے ہیں۔

## ۷• زندگی کا صحت مندانہ نظریہ

عام طور پر لوگ بڑھاپا سے بے حد خائف رہتے ہیں، کتنے لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو بڑھاپا سے پہلے ہی حوصلہ کھو بیٹھتے ہیں لیکن جن لوگوں کا زندگی کے متعلق صحت مندانہ نظریہ ہوتا ہے وہ بڑھاپا سے خائف نہیں ہوتے۔ نہایت جرأت کے ساتھ بڑھاپا کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

مشہور مفکر سی۔ جی۔ ڈوکان نے لکھا ہے — "جن لوگوں کا زندگی کے متعلق صحت مندانہ نظریہ ہوتا ہے اُن کے خیال میں بڑھاپا جوانی پر فوقیت رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں زندگی کا اہم دور بڑھاپا ہے۔ اصل کام تو انسان کو بڑھاپے میں کرنا ہوتا ہے۔ اس عمر میں اگر آپ اپنی زندگی کے تمام کارناموں پر غور کرتے ہیں۔ گندم اور بھُس کو الگ الگ کرتے ہیں۔

"بڑھاپا زندگی کا وہ حصہ ہے جس سے آپ کو پورا فائدہ اٹھانا چاہئے اور اس سے آپ اسی طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب آپ بڑھاپا میں شکوہ اور شکوں سے زندگی بسر کرنے کے لئے جوانی ہی میں تیاری کر لیں، جو لوگ ایسا

ہیں، وہ بڑھاپے سے خائف نہیں ہوتے مسکراتے ہوئے بڑھاپے کا
خیر مقدم کرتے ہیں۔

## • زندگی کا بہتر اصول

اگر آپ پُرمسرت زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو زندگی کے کسی دَور
، زندگی کے کسی موڑ پر صحت کے اصولوں کا دامن نہ چھوڑئیے۔

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ "جو لوگ زندگی کی
...یں لوٹ چکے ہیں، اب ان کے آرام کرنے کے دن ہیں۔ انھیں ایسے
...سے پرہیز کرنا چاہئے جن سے دَورانِ خون تیز ہو جائے۔ مثلاً دوڑ کر
... پر چڑھنا یا ریل گاڑی چھوٹ جانے کے خوف سے تیز تیز قدم اٹھانا
چاہئے۔ عمر رسیدہ لوگوں کی یہ کوشش اس لئے خطرناک ہوتی ہے،
... خون کی نالیوں کی شریانوں اور رگوں کی دیواریں کمزور ہو جاتی ہیں
... بھی دل کی اعصابی دیواریں بھی کمزور پڑ جاتی ہیں۔ گُردے، پھیپھڑے،
... اور ہضم طعام کے دوسرے اعضاء بھی ساٹھ ستّر برس کی عمر میں
... تنا وہ نہیں رہتے جو بیس برس کی عمر میں ہوتے ہیں۔ بڑی عمر میں دل کی
... میں اور رگیں ضرور کمزور ہو جاتی ہیں۔ اِس لئے سارے معاملات میں
... ل برتنا، افراط و تفریط سے بچنا نہایت ہی اچھا اصُول ہے۔

## • دُنیا ایک آئینہ

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ "دُنیا ایک گنبد کی طرح
... جس میں بولو تو اپنی ہی آواز گونج کر لوَٹ آتی ہے۔ دُنیا وہ آئینہ ہے
... میں اپنا ہی عکس دکھائی دیتا ہے۔ ہم ہنستے ہیں تو وہ بھی ہنستا ہے، ہم
... تے ہیں تو وہ بھی روتا ہے ـــــ ایک بار کائنات کے حُسن کو اپنے دل میں
... ر دیکھو، تمھاری رُوح اُس حُسن سے جگمگا اُٹھے گی۔"

## • ایک بڑی بھُول

زندگی میں انسان بہت سی غلطیاں کرتا ہے۔ بہت سی غلطیاں کرتا
... ہے اور اُسے اِس کا احساس بھی نہیں ہوتا ـــــ مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن
... زندگی کی ایک بڑی بھُول کی طرف بہت سختی سے توجہ دلائی ہے۔ لکھا ہے
ـــــ صحت کی بُنیاد قائم کرنے اور تندرستی قائم رکھنے کے لئے سب سے ضروری
... یہ ہے کہ اُن عادتوں سے بچا جائے جو طاقت کو ضائع کرتی ہیں، جو جان کو کمزور
کر دیتی ہیں، جو بدن کو نکمّا کر دیتی ہیں۔

ہم خاموش رہنا تو جانتے ہی نہیں، آرام کی حالت میں بھی بے چین
رہتے ہیں۔ گھر میں بھی ہمیں چین نہیں آتا۔ ہر وقت، ہر لمحہ ہم اپنے قویٰ کو
بے دردی سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں علم نہیں کہ اِس زیاں اور نقصان کو
کس طرح بند کر دیں۔ ہمیں یہ بھی خبر نہیں کہ دن کو نہیں تو رات کو تو اپنی ذہنی
اور دماغی مشین کی رفتار کو کم کر دیں۔ نہیں ہم ایسا نہیں کرتے، رات کو بھی
اِس سے برابر کام لیتے رہتے ہیں۔ یہ بھُول خوفناک بھُول ہے!"

## ۱۱ • مسرّت کا راز

دُنیا میں ایسا کون ہوگا جسے خوشی کی تلاش نہ ہو، جسے مسرّت کی
جستجو نہ ہو۔ کسی نے کہا ہے ؎

جسے دیکھو خوشی کی جستجو ہے
مسرّت مستقل غم ہو گئی ہے

ایک دانشور نے خوشی کا راز اِن الفاظ میں بتایا ہے ـــــ "جو انسان
اُن نعمتوں پر قانع نہیں جو خدا نے اُسے عطا فرمائی ہیں اور اپنے سے زیادہ خوش حال
لوگوں کی طرف حسرت سے دیکھتا رہتا ہے، وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔"

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ "انسان کی مسرّت سے
محرومی اور بے اطمینانی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ کبھی اپنی حالات سے مطمئن نہیں
ہوتا۔ وہ کل کی جھوٹی اُمّیدوں میں آج کی مسرّت کھو دیتا ہے۔

دُنیا کی نصف آبادی کی ناخوشی کا سبب ہے ـــــ دوسروں سے حسد،
خود سے بے اطمینانی!"

جاوید جیدی۔ مونگیر

س۔ کیا اچھا اور خوبصورت لباس انسان کے عیبوں کی پردہ پوشی کر سکتا ہے؟

ج۔ اچھا اور خوبصورت لباس صرف سطحی نظر رکھنے والوں کو فریبِ نظر دے سکتا ہے۔

س۔ بڑوں نے کہا ہے ـــــ بدی کا بدلہ نیکی سے دو۔ لیکن کیا موجودہ دور میں یہ صحیح ہے؟

ج۔ چین کے چاؤ نے ثابت کر دیا کہ اس دور میں بڑوں کے اس نظریہ پر عمل کرنا صحیح نہیں۔

---

غلام مصطفیٰ دل۔ کلکتہ

س۔ غالب کا کوئی طنزیہ شعر سنائیے۔

ج۔ زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!

---

ایم سلیم۔ دھنسار۔ دھنباد

س۔ دنیا کی آبادی کتنی ہے؟

ج۔ تین ارب پچاس کروڑ۔

---

محمد اصغر علی نواب۔ دھنباد

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ غریب امیر نہیں بن سکتا؟

ج۔ یہ غلط ہے۔ بلند حوصلہ غریب امیر بن سکتا ہے۔

س۔ وہ کون سی شے ہے جو انسان کو منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی ہے؟

ج۔ ناقابلِ شکست عزم و حوصلہ!

س۔ عقلمند عشق کرتے ہیں یا شادی؟

ج۔ شادی۔

---

شیخ محمد عثمان آزاد۔ نصیر آباد

س۔ شادی ہونے کے کچھ ہی دن بعد گھر میں جھگڑا کیوں شروع ہو جاتا ہے؟

ج۔ اچھے گھروں میں جھگڑا نہیں ہوتا۔ برے گھروں میں شادی سے پہلے بھی جھگڑا ہوتا ہے اور شادی کے بعد بھی۔ اچھے گھروں میں شادی محبت لے کر آتی ہے، خوشی لے کر آتی ہے۔

س۔ کامیابی ناکامی کی صورت کب اختیار کرتی ہے؟

ج۔ جب کامیاب انسان بے راہرو ہو جاتا ہے۔

---

عبدالمعز خاں۔ بسرام پور (پلاموں)

س۔ غربت اور بدقسمتی؟

ج۔ بدقسمتی سے غربت کا کوئی تعلق نہیں ہے ـــ
اسے شکوہ سنجِ شوخیِ تقدیر دیکھنا
ذوقِ عمل ہی تیرا کہیں خام تو نہیں

س۔ لوگ کہتے ہیں صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ پھر امیر لوگ صبر کیوں نہیں کرتے؟

ج۔ امیر لوگ تو بیچارے بہت صبر کرتے ہیں۔ وہ جتنی دولت پاتے ہیں اسی پر صبر کر کے خاموش رہتے ہیں۔

---

ثریا خانم۔ بحرین

س۔ یہ قول کس کا ہے ـــ "عورت خوشبو، نغمہ، رقص اور روشنی کا مجموعہ ہے"؟

ج۔ شیکسپیر کا۔

س۔ عورت کے متعلق کچھ اور دانشوروں کے خیالات تحریر فرمائیں۔

ج۔ طامس مور نے کہا ہے ـــ "عورت رات کا تارا اور صبح کا اجالا ہے"
بالزاک نے کہا ہے ـــ "عورت ایک بربط ہے جس کے نغموں کے راز صرف اسی مرد پر ظاہر ہوتے ہیں جس کی انگلیاں اس کے تاروں پر ماہرانہ انداز میں کھیلنا جانتی ہوں۔"

---

سونیل کمار۔ شملہ

س۔ آج کل حکومت خاندانی منصوبہ بندی پر زور دے رہی ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ہمارے ملک میں کس اوسط سے آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے؟

ج۔ ڈاکٹر سوشیلا نیر نے ایک موقع پر اعداد و شمار بتاتے ہوئے کہا کہ اس وقت ملک کی آبادی میں ہر روز تیس ہزار کا اضافہ ہو رہا ہے۔

---

راج رتن سنگھ۔ دہلی

س۔ چین کے پاس کتنی فوج ہے؟

ج۔ برطانوی فوجی تحقیقاتی شعبے کے ماہرین کی رپورٹ کے مطابق چین کی مسلح افواج کی تعداد ۲۴ لاکھ ۸۶ ہزار ہے۔

---

شکنتلا سکسینہ۔ نئی دہلی

س۔ اب تک کتنے ہندوستانیوں کو نوبل پرائز ملا ہے؟

ج۔ تین ہندوستانیوں کو ـــ ڈاکٹر ٹیگور، ڈاکٹر سی۔ وی۔ رمن اور ڈاکٹر ہر گوبند کھورانہ کو۔

---

بیتا کماری۔ بنارس

س۔ پاکستان میں کتنے ہندو ہیں؟

ج۔ تقریباً ۸۲۶۸۰ ہزار۔

---

سید محمد اکرام اللہ۔ نظام پور۔ گیا

س۔ انسانیت کی تعریف؟
ج۔ قوم کے ماروں کی غمخواری
انسانیت کی معراج

س۔ انسان انسانیت سے کیوں گرتا جا رہا ہے؟
ج۔ اس لئے کہ اس نے انسانیت کا دامن چھوڑ دیا۔

س۔ سب سے اچھی مثنوی کس نے لکھی ہے؟
ج۔ میر حسن نے۔

---

طالب حسین لہریا سرائے۔ دربھنگہ

س۔ تیرِ نشتر بھائی! انسان کی حالت حیوان سے بھی بدتر کیوں ہوتی جا رہی ہے؟
ج۔ اس لئے کہ انسان انسانیت سے دُور ہوتا جا رہا ہے۔

---

ایم۔ اشرف شمسی۔ پیلی بھیت

س۔ کسی اردو شاعر کی صد سالہ برسی منانے کے لئے حکومت نے غالب کا انتخاب کیوں کیا؟
ج۔ اس لئے کہ غالب ہی اس کے مستحق تھے۔

---

مس نور جہاں ناز۔ پربھنی

س۔ بھیّا! زندگی تڑپنے اور سسکنے کا نام ہے، پھر انسان کیوں زندہ رہنا چاہتا ہے؟
ج۔ اس لئے کہ زندگی جیسی بھی ہو بہت پیاری ہے۔

---

.....

س۔ تیرِ نشتر آپ نے کب سے شروع کیا؟
ج۔ آج سے ۲۳ سال پہلے بیسویں صدی کے پہلے ہی شمارے سے۔

س۔ کیا روس اور چین میں مسجدیں ویران رہتی ہیں؟
ج۔ ایسا تو نہیں ہے۔

س۔ خان عبدالغفار خاں نے اپنی زندگی کے کتنے برس جیل میں کاٹے ہیں؟
ج۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصّہ جیل ہی میں گزرا ہے۔

---

خورشید عالم شمس۔ بلرام پور

س۔ مجاز کا اسمِ گرامی کیا تھا؟
ج۔ اسرار الحق۔

س۔ مجاز کا کوئی شعر سنائیے۔
ج۔ ہم کو یہ ضد کہ خود ہی اٹھائیں گے وہ نقاب
ان کو یہ انتظار تقاضہ کرے کوئی

س۔ کیا حسن حقیقت میں فریبِ نظر ہے؟
ج۔ جی ہاں! حسن فریبِ نظر ہے اور حسنِ نظر بھی! کسی نے کہا ہے ؎
رُخسار و لب کی بات نہ زلف و کمر کی بات
رنگینیِ جمال ہے حسنِ نظر کی بات

---

سلمیٰ شبنم۔ بحرین

س۔ بھائی جان! بتائیے، عورت کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے؟
ج۔ خود کو کمزور سمجھنا!

---

ناصر خاں۔ مگہر۔ بستی

س۔ صحیح لفظ کیا ہے غنڈہ یا گُنڈہ؟
ج۔ دونوں صحیح ہیں۔ ایک لُغواً، دوسرا استعمالِ عام کی رُو سے۔

---

س۔ [illegible]
ج۔ [illegible]

---

فلاسفی اختر پھلواری [illegible]

س۔ محبت خدا ہے تو خدا کیا [illegible]
ج۔ محبت خدا نہیں، خدا [illegible]
سب کچھ ہے!!

س۔ مہاتما بدھ نے اپنے دور میں لوگوں [illegible]
تعلیم دی تھی کہ ان کا نام [illegible]
ج۔ مہاتما بدھ نے لوگوں کو [illegible]
تعلیم دی تھی۔

---

کرتار سنگھ لدھیانہ

س۔ کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ ہندوستان [illegible]
کی تعداد کتنی ہے؟
ج۔ بصیرت کی آنکھوں سے محروم [illegible]
کروڑوں ہیں، ظاہری آنکھوں [illegible]
کی تعداد تقریباً چھ لاکھ ہے۔

Registered with the Registrar of Newspapers R. N. No. 630/57

34th YEARS OF PUBLICATION

AB

Telephones ... 271637 Residence. 619927

# RADIUM TONIC PILLS

نئی طاقت

نیا خون

## کمزوری کا زبردست علاج

## ریڈیم ٹانک پلز

نیا خون بکثرت پیدا کرکے نہ صرف کمزوری دور کرتی ہیں
بلکہ جسم میں زبردست طاقت بڑھاتی ہیں۔ وزن اور
خون کئی پونڈ بڑھ جاتا ہے۔ کھوئی ہوئی طاقت اور صحت
واپس لانے کے لئے ملک کے کونے کونے میں مشہو
مقبول ہیں اور لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے
کمزوری خواہ کسی وجہ سے ہو کمزور سے کمزور انسان کو
نئی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ تندرست نوجوان ریڈیم ٹانک
کے علاج سے اپنی طاقت کئی گنا بڑھا سکتے ہیں۔ قیمت مکمل
علاج صرف چھ روپے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

کلکتہ ایجنٹ:۔

امین اینڈ اسمٰعیل پرائیویٹ لمیٹیڈ

نمبر ۸۰ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۱

پتہ: ریڈیم کیمیکل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹیڈ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۱۱ دہلی

# بیسویں صدی

اگست

Rs.1-25

Biswin Sadi
DELHI

چھپتے ہوئے لباس کا چھپتا ہوا جمال

کرتا ہے تک انتظار جمال دوست ـــــ ساغر نظامی

فوٹو: تنویر امین تاجپوری

گذشتہ دنوں دہلی رائٹرز ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام جناب کرشن موہن کی شعری تصنیف "پیاس میری کلپنا کی" کی رسمِ اجراء ڈاکٹر پربھاکر ماچوے نے ادا کی۔ یہ کتاب ہندی رسم الخط میں شائع ہوئی ہے۔ ممتاز شعراء و ادباء شریکِ محفل تھے۔ جناب کرشن موہن اپنی نظم کا فن سنا رہے ہیں ——

مَیں شبدوں کی دھرتی ماں ہُوں
شبد مرے جیواں، انساں ہَیں
کچھ زندہ ہیں، کچھ بے جاں ہَیں
کویوں کی سُندر رچنائیں
میرا مستک چُوم رہی ہَیں
جیسے البیلی کنّیائیں
پی پی کر جوبن کی مدیرا جھوم رہی ہیں

مجھ سے پیار کریں تو من سے
شوبھا ہے اِن کے جوبن سے
میرے رُخ پر ویروں کے سندیش بھی چمکے
جو میرے جیون رکشک ہَیں
جن سے میری ساکھ بڑھی ہے
سوئے ہوئے بے رنگ لیکھ بھی
کرنا چاہیں اپنی زینتا سے میری دیکھ ریکھ بھی
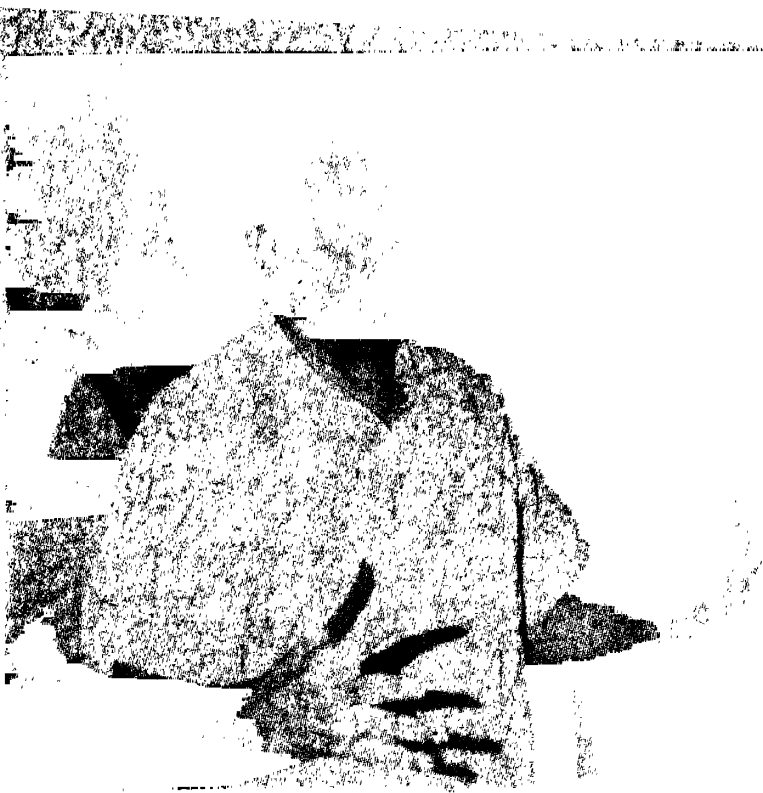
پربھاکر ماچوے نے اپنی تقریر میں کرشن موہن کی شاعری کے گنگا جمنی اوصاف پر روشنی ڈالی اور کتاب کی نظموں کو سراہتے ہوئے اس کی اشاعت پر مبارکباد دی ہے

نسیم قریشی نے کہا کہ کرشن موہن نے اردو شاعری کے جدید رجحانات کو نہایت خوش اسلوبی سے اپنایا ہے اور بعض روایت شکن تجربے بھی کئے ہیں۔

جون کی ایک شام کو نامور افسانہ نگار جناب گُربچن چندن نے حکومتِ ہند کے ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر اور اُردو کے ہمہ دان ادیب جناب علی جواد زیدی کے ساتھ کافی کی ایک محفل کا اہتمام کیا۔ یہ تقریب ادیبوں اور صحافیوں کا ایک بے نظیر اجتماع تھی ـــــ اُنھوں نے کہا "زیدی صاحب کے ساتھ ہم نے کئی بار کافی پی ہے۔ لیکن آج کی شام اِس لئے اہم ہے کہ آئندہ کم از کم ۷۵ روز تک ایسی شام نصیب نہ ہو سکے گی۔ زیدی صاحب امریکہ، برطانیہ، متحدہ عرب جمہوریہ اور پاکستان جا رہے ہیں۔ اِن کا یہ سفر سرکاری امُور کے سِلسلے میں ہے۔ لیکن یہ دَورہ اُردو ادب کے لئے بھی ایک نیک فال ہے۔ اِن کے ساتھ اِن کا علم و ادب کا سرمایہ بھی جائے گا جس کی بدولت مُمالکِ غیر میں ہندوستانی ادب کے سینکڑوں نئے مدّاح پیدا ہوں گے۔ آج ہمیں، اِنھیں رُخصت کہنا ہے ع

به سلامت روی و باز آئی

زیدی صاحب نے کہا "میرے دورے کا پروگرام یکایک سامنے آگیا اور پھر اس سے پیدا ہونے والی مصروفیات نے مجھے اس قدر گھیر لیا کہ میں دوستوں سے جدا ہونے کے خیال سے غافل سا ہو گیا۔ اب چندن صاحب نے جو یاد دلایا کہ میں ۷۵ روز تک آپ سے دور رہوں گا تو میرا دل و دماغ خیالِ فرقت سے کانپ اُٹھا۔ ممالکِ غیر میں میری شامیں خواہ کتنی ہی خوش تر ہوں۔ لیکن میں خوشتر صاحب کی محبت سے محروم رہوں گا۔ مالک رام صاحب کی شفقت نہ پا سکوں گا۔ رہبر صاحب کی صحبت اور گوپال متّل صاحب کی رفاقت نہ حاصل کر سکوں گا۔ کرشن موہن، درشن سنگھ دُگل، ساحر ہوشیارپوری، راز، خان غازی اور دیگر سب احباب مجھے یاد آئیں گے اور میں دیارِ غیر میں آج کی شام کی یادوں کا سہارا لیتا رہوں گا" ﴿

# بیسویں صدی

مئی


ٹیلیفون دفتر ـــــ ۲۸۱۶۳۷

ٹیلیفون رہائش ـــــ ۶۱۹۹۲۷

# تیر و نشتر

خوشتر گرامی

لاٹھی، چاقو اور خنجر چلانا بزدلی ہے

• "میں سیاسی زندگی سے دستبردار نہیں ہوں گا" مرارجی ڈیسائی کا بیان ——— اور جب تک وزیرِ اعظم نہ بن لوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا۔

---

• "وزیروں کی جائدادوں کی تحقیقات" ایک عنوان ——— کون کس کے کچے چٹھے سے بات کرے، کہیں کوئی اندر نہ کرا دے۔

---

• "بھوپال میں شری چوہان کی کار پر پتھر برسائے گئے" ایک خبر ——— پھولوں کی قلت ہوگی وہاں۔

---

• "دِلّی میں بجلی کے کرائسس کا اندیشہ" ایک خبر ——— جن سنگھی اپنے دیپک جلانا چاہتے ہیں۔

---

• "زمین اور جائداد کی قیمتیں گرنے لگیں" ایک خبر ——— غریب کو زمین سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اُس کا تعلق بناسپتی سے ہے اور اُس کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔

---

• "اندرا کے خلاف سیاہ جھنڈوں کا مظاہرہ" ایک خبر ——— تو سیاہیوں کا کارنامہ۔

---

• "سنت فتح سنگھ بوکھلا گئے۔ بنسی لال کے بیان سے نیند حرام" ایک عنوان ——— خواب آور گولیاں لے لیں۔

---

• "فرقہ وارانہ فسادات کے لئے حکمران پارٹی ذمہ دار" سنڈیکیٹ کانگریس کا ریزولیوشن ——— جن سنگھ کا بھی یہی خیال ہے۔ ہم خیال جماعتیں جو ہوئیں۔

---
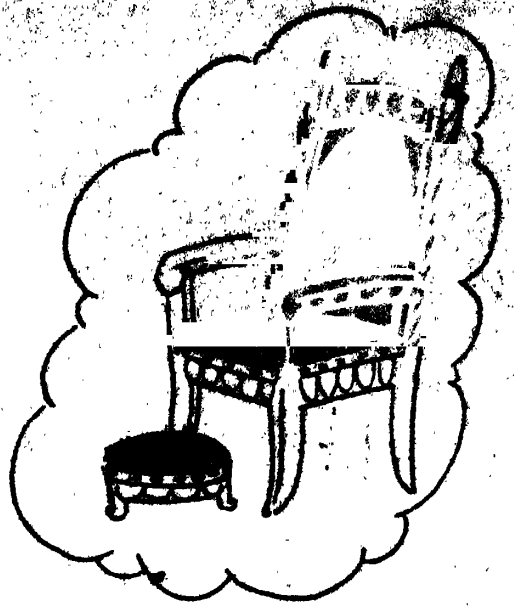
"میں مرتے دم تک سیاست سے دستبردار نہیں ہوں گا" مرارجی ڈیسائی ـــــ بلکہ مرنے سے پہلے وزیراعظم بھی بنوں گا۔

---

"سوشلزم کا تازہ ثبوت" ایک عنوان ـــــ بناسپتی کی قیمتیں بڑھ گئیں۔

---

"ہندوستان میں سب سے زیادہ طلاق کیرل میں ہوتے ہیں" ایک خبر ـــــ اسی لئے وہاں اسمبلی کو طلاق دینے کا واقعہ بھی کئی بار پیش آیا۔

---

"قومی ایکتا کونسل کا اجلاس۔ جن سنگھ کا نمائندہ شامل نہیں ہوا" ایک خبر ـــــ ایکتا کا دشمن جو ہوا۔

---

"مسلم لیگ کا فتنہ دلی میں بھی اٹھ جانے کے منصوبے" ایک عنوان ـــــ آر ایس ایس اور جماعت اسلامی کا فتنہ شاید دیوالی کو کیا کم تھا۔

---

"بناسپتی کی بلیک اچانک ختم" ایک خبر ـــــ سرکار نے قیمت بڑھا کر اسے قانونی صورت جو دے دی۔

---

"اندرا گاندھی نے ہندوستان کو روسی بلاک کے قریب لا کر ڈال دیا ہے" سنڈیکیٹ کے لیڈروں کا الزام ـــــ شکر ادا کرو کہ امریکی سامراجیوں کی گود میں نہیں ڈال دیا۔ تمہارا بس چل جاتا تو ہم [illegible] کے ہاتھ بک گئے ہوتے۔

---

"چاند کی یاترا کرنے والے امریکی خلاباز نومبر میں ہندوستان آئیں گے" ایک خبر ـــــ یہاں وہ چاند سے زیادہ حیرت انگیز اور دلچسپ چیزیں پائیں گے۔

سیاسی منڈی ہے، دل بدلو سیاستدان، وزارتوں کے عہدوں کے لئے لڑنے والے، بھائیوں کا گلا گھونٹنے والے، چپاتی باز راشٹریہ سنگھ، توڑ پھوڑ کرنے والے لٹیرے
اسمبلی اور پارلیمنٹوں کے وقار کو خاک میں ملانے والے لیڈر
ان کو دیکھیں گے تو یہ بھی بھاگیں گے
بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی

---

اٹل بہاری باجپائی نے جماعتِ اسلامی پر اور مسلم لیگ نے آر۔ایس۔ایس اور جن سنگھ پر پابندی لگانے کی مخالفت کی ہے۔

[illegible] ہسپتال دلّی میں مریضوں سے بدسلوکی" ایک خبر —— [illegible] سلوک کی [illegible] آپ کی [illegible] کا علاج کرانا بھی چاہتا ہے۔

---

"[illegible] میں نئے ٹیکس نہیں لگائے جائیں گے" وزیرِ اعلیٰ کا اعلان —— اعلان کی اصلی ہے مگر وزیرِ اعلیٰ اس پر قائم رہے۔

---

"بناسپتی کی قیمتوں میں اور اضافہ" ایک خبر —— ابھی اور ہوگا۔ سوشلسٹ سماج ہے۔ دیسی اور بناسپتی گھی کی قیمتیں ایک سطح پر لائی جائیں گی۔

---

"سرکاری افسروں کا گھیراؤ" ایک خبر —— کہ رشوت خوری، سینہ زوری، کنبہ پروری، دھونس اور دھاندلی بند کرو۔

---

"پنجاب کی عدالتوں سے فائلیں غائب" ایک خبر —— بادل برسے ہوں گے، فائلیں بہہ گئی ہوں گی۔

---

"بناسپتی کے نرخ نئی بلندی پر" ایک عنوان —— اصلی گھی تک پہنچنے کی کوشش ہے۔

---

"دلّی بجلی گھر کی آگ کا ذمہ دار جن سنگھ" ایک عنوان —— بجلی گھر کو آگ لگ گئی جن سنگھ کے چراغ سے۔

---

"ہوا کا رُخ نہ پہچانا تو خونی انقلاب آجائے گا" اندرا کی وارننگ —— اس لئے اپنے اپنے گھروں پر مرغِ باد نما لگالو تاکہ ہوا کے رُخ کا پتہ چلتا رہے۔

---

"پاکستان کے نظم و نسق میں عورتوں کو پورا حصہ دیا جائے" خواتین پارٹی کا مطالبہ —— تاکہ وہ ہندوستان کی خواتین کی ہم پلہ ہو سکیں۔

---

"طریقۂ امتحانات میں اصلاحات کا مطالبہ" ایک عنوان —— ایک اصلاح کافی ہے۔ نقل کو جائز قرار دے دیا جائے۔

---

بھارتیہ کرن کے مریض کے لئے دوائے بہت۔

---

"دلی میں بسیں بس اسٹاپ پر رکیں گی": ایک خبر —— تاکہ بس کی شکایت نہ رہے۔

---

"ڈسپلن نہ ہونے سے دیش میں بدامنی پھیل رہی ہے" کامراج جی بولے —— ذرا اپنے اور نجلنگپا کے گریبان میں جھانکیں۔

---

"ڈھاکہ میں بلیک آؤٹ": ایک خبر —— بلیک کرنے والوں کے لئے نادر موقع۔

---

"آسٹریلیا میں تعلیم حاصل کرنے میں پریشانی": ایک خبر —— کیا وہاں امتحان میں نقل کرنے کا موقع نہیں ملتا۔

---

"ہندو کون ہے": ایک عنوان —— صرف جن سنگھی، باقی کوئی نہیں۔

---

"بہار میں امتحان کے طریقے کو بہتر بنایا جائے گا": ایک خبر —— طلبا کو نقل کی اجازت مل جائے تو اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔

---

"مراد آباد میں ڈاکو پکڑے گئے": ایک خبر —— خبر پائندہ۔

---

"دلی میں صاف پانی کا مسئلہ": ایک عنوان —— دلی والوں کا منہ اس قابل نہیں کہ صاف پانی پئیں۔

---

"مشینی دماغ کے ہاتھوں انسانی دماغ کو مات": ایک خبر —— شرم تم کو مگر نہیں آتی —— حضرتِ انسان!

---

حکومتِ ہند کی ذمہ داری [illegible] کا بیان —— تو سمجھ جائیے کہ ایک ہی [illegible] بات پہ [illegible] آ رہا ہے۔

# آخری خط

یٰسین احمد

۱۷۔۸۔۳۳۴، چھاؤنی نادر علی بیگ، حیدرآباد نمبر ۳۳ (اے پی)

بھائی خوشتر صاحب! تسلیمات

"نقشِ سنگ" کی اشاعت کے بعد قارئین کے بہت سے تعریفی اور تنقیدی خطوط ملے۔ لیکن میں آپ کی رائے سے محروم رہا ــــــ اب ایک کہانی "آخری خط" ارسال کر رہا ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ آپ شرفِ قبولیت بخشیں گے۔ میری اس کہانی کا ایک اہم کردار جو آخر میں سامنے آتا ہے کچھ قابلِ رحم ہے۔ شدید مایوسی نے اُسے ایذا پسند بنا دیا ہے۔ یوں بھی کچھ لوگوں کے نزدیک انتقام لینے کا بہترین طریقہ یہی ہوتا ہے کہ آپ کو کسی اذیت یا کسی بڑی مصیبت کے حوالے کر دیں۔۔۔

آپ کا ــــــ یٰسین احمد

ان خطوط نے ماریا کی خاموش، پُرسکون زندگی میں ہلچل سی مچادی تھی۔ وہ جتنے پیار، محبت اور جذبات سے بھرے ہوئے ان خطوں اور اُن کے لکھنے والے کے بارے میں سوچتی اتنی ہی اس کی پریشانی اور اُلجھن بڑھنے لگتی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی یہ اُلجھن، یہ پریشانی ایک شدید بے بسی اور بے چارگی میں تبدیل ہو جاتی اور وہ ملول اور اُداس ہو جایا کرتی تھی۔ بہت شدت سے اُسے اپنی زندگی کے سونے پن اور ویرانی کا احساس ہونے لگتا تھا۔

مسلسل پچھلے دو ماہ سے ماریا کو وہ خطوط بہت پابندی سے مل رہے تھے۔ ہر صبح آفس میں اس کی میز کی دراز میں اس کے نام ایک خط لکھ کر ڈال دیا جایا کرتا تھا۔ شروع میں، پہلا خط دیکھ کر ماریا آگ بگولہ ہو گئی تھی۔ زخمی شیرنی کی طرح بپھر اُٹھی تھی۔ اس کا دل چاہا تھا کسی طرح وہ اس خط کے لکھنے والے کا سراغ لگائے اور اس کا منہ نوچ لے۔ اُسے ایسا مزہ چکھائے کہ وہ ساری زندگی یاد کرتا رہے۔ لیکن وہ ایسا کر نہ سکی تھی۔

آہستہ آہستہ اس کا غصہ دُور ہوتا گیا تھا اور پھر ماریا کو ان خطوں میں ایک دلچسپی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اُسے بہت بے تابی سے اس کے خطوں کا انتظار رہنے لگا تھا اور کسی دن چھٹی میں اُسے کوئی خط نہ ملتا تو وہ بہت بے چین سی رہتی اور وہ دن اضطراری کیفیت میں گزرتا۔

اس کے خط بہت دلچسپ ہوتے تھے۔ ایک ایک لفظ محبت، جذبات اور رومان سے بھرپور ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لکھنے والے نے اپنے دل کی ساری بے تاب دھڑکنوں کو سمو دیا ہے۔ جیسے اپنی آرزوؤں، تمناؤں کا سارا اور اپنی ناکام اُمنگوں کے سارے رنگ ان خطوں میں بھر دیے ہیں۔

ماریا اس کے خطوط پڑھ کر محسوس کیا کرتی تھی اور اُسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ خطوط جیتے جاگتے پیکر میں ڈھل گئے ہیں اور اس کے رفیق اور غم گسار بن گئے ہیں۔ اس کے دُکھوں کو سمیٹ رہے ہیں۔ سیاہ راتوں کی سرد تنہائیوں میں ملکوتی نغمے گنگنا رہے ہیں اور تب ماریا اپنے ماحول کی ساری تلخیوں کو بھول کر خیالوں کی ایسی دُنیا میں پہنچ جایا کرتی تھی جہاں وہ آسودگی، مسرت اور طمانیت سے ہمکنار ہوتی۔

ماریا کو پہلا خط تقریباً دو ماہ پہلے ملا تھا۔

اس دن وہ ذرا جلد آفس آئی تھی۔ اپنی میز پر بیٹھ کر اس نے جیسے ہی میز کی دراز کو کھینچا، اس کی نظر اندر رکھے ہوئے ایک لفافہ پر پڑی جس پر نمایاں حرفوں میں "مِس ماریا" لکھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً لفافہ اُٹھا لیا۔ حیرت

[illegible] ہوئے لفافہ چاک کیا، اندر سے خط نکالا۔ لکھنے والے نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ بس اتنا تحریر تھا ——

مِس ماریا

مجھے میرے نامساعد ماحول نے، میرے ناموافق حالات نے کبھی اتنا موقع نہ دیا کہ میں کائنات میں چاروں طرف بکھرے ہوئے حُسن و جمال کے اُن جلووں کو دیکھتا جن کی تعریف میں شاعروں نے قلم توڑ دیئے ہیں، مصوروں نے اَن گنت شاہکار تخلیق کئے ہیں۔ مجھے اِس محرومی کا احساس تھا لیکن اِس دفتر میں آنے کے بعد، جب سے آپ کو دیکھتا آ رہا ہوں مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اب میری پچھلی محرومی کی تلافی ہو گئی ہے۔ واقعی آپ بے انتہا خوبصورت ہیں۔ اتنی خوبصورت کہ ڈرتا ہوں کہیں کچھ کہنے سے آپ کا حُسن محدود نہ ہو جائے ——!

——

ماریا یہ خط پڑھ کر غصے سے آگ بگولہ ہو گئی تھی۔ زخمی شیرنی کی طرح بپھر اُٹھی تھی۔ حالانکہ اِس خط میں اُس کے حُسن کی تعریف کے سوا کوئی بات نہ تھی۔ پھر بھی اُس کی خودداری، حیا اور ہر قدم پر محتاط رہنے والی فطرت اِس کی بھی متحمل نہ تھی۔

اُس نے سوچا تھا۔ اِس خط کے بارے میں اپنے آفیسر کو بتا دینا چاہئے۔ اِس لئے وہ اُٹھی اور اپنے آفیسر کے کمرے کی طرف چل پڑی تھی۔

لیکن کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ ایکدم رُک گئی۔ یہی خیال دماغ میں آیا تھا کہ وہ آفیسر سے کیا کہے گی؟ کِس کی شکایت کرے گی؟ کِس کا نام بتائے گی؟ جب کہ لکھنے والے نے نہ اپنا نام لکھا ہے اور نہ وہ خود اُس کا نام جانتی ہے۔

اور پھر وہ چُپ چاپ وہاں سے اپنی میز کی طرف لوٹ گئی تھی۔

ماریا بے حد تنہائی پسند تھی۔ سب سے الگ تھلگ رہنے کی عادی تھی۔ ہر لمحہ اُس کے چہرے پر غیر معمولی متانت چھائی رہتی تھی۔ اِس لئے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اُس سے بے تکلفانہ انداز میں بات چیت کر سکے۔ حالانکہ وہ عرصے سے اُس آفس میں کام کر رہی تھی، لیکن اُس نے رسمی یا دفتری بات چیت کے علاوہ کسی سے کسی اور موضوع پر گفتگو نہیں کی تھی اور نہ کسی نے اِس کی جرأت کی تھی۔

لیکن اِس کے باوجود آج کسی نے اُسے یہ خط لکھ مارا تھا تو اُسے حیرت ہو رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی وہ خط لکھنے والا کون ہو [illegible]

سب سے پہلے اُس کا خیال حامد کی طرف گیا تھا۔

لیکن فوراً ہی اُس کے ذہن نے حامد کی طرف سے [illegible] کر دی تھی —— حامد نوجوان ہے، کنوارا ہے [illegible] لیکن وہ اِس طرح اُسے خط نہیں لکھ سکتا کیونکہ [illegible] ہے۔ اُسے خط لکھنا ہی ہوتا تو وہ نتائج کی پروا کئے بغیر [illegible] خط میں اپنا نام لکھ دیتا۔

اور اُس کے بعد ماریا کا خیال سروپ سنگھ کی طرف گیا تھا۔ لیکن اُس کا ذہن یہ ماننے کے لئے تیار نہ ہوا کہ وہ خط سروپ نے لکھا ہو [illegible] کی شادی ہو چکی تھی۔ اُس کی شادی ایک ایسی عورت سے اُس کے [illegible] نے کر دی تھی جو اُس سے عمر میں بڑی تھی اور کسی طرح اُس کے لائق نہ تھی اور وہ اپنی بیوی سے اتنا ہی خائف رہتا تھا جتنا کسی سرکس کا پالتو جانور رِنگ ماسٹر سے! جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ شعوری طور پر بھی عورت [illegible] خائف ہی نہ تھا متنفر تھا اور ایسے مرد کے بارے میں کیسے سوچا جا سکتا تھا کہ وہ کسی عورت کے حُسن کی تعریف میں ایسا خط لکھ سکتا ہے

اور پھر ایک لمحے کے لئے اُس کا ذہن اپنے آفس کے سپرنٹنڈنٹ شیام [illegible] کی طرف گیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے اُسے بھی مشتبہ افراد کی فہرست سے نکال دیا کیونکہ اُس میں ہمت اور جرأت کا فقدان تھا۔ وہ [illegible] محبت اور حُسن کے تذکروں میں حصہ ضرور لے سکتا تھا، کسی حد تک [illegible] لکھا سکتا تھا لیکن اپنے ہاتھوں سے ماریا جیسی عورت کو خط کبھی نہیں لکھ سکتا۔

اور اب اِس کے بعد آفس میں جو لوگ بچے تھے اُن کے بارے میں [illegible] بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ ماریا کو خط لکھ سکتے ہیں کیونکہ وہ اب عمر کی اُس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں ایسی لغویات سے زیادہ [illegible] ہے۔ وہ اپنے گھر بار اور بڑھتی ہوئی گرانی کے تذکرے [illegible] بگڑتی ہوئی سیاسی حالت پر تبصرہ کر سکتے تھے لیکن کسی [illegible] ایسا خط نہیں لکھ سکتے تھے!

"تو پھر یہ خط کس نے لکھا ہوگا؟"

ماریا دیر تک سوچتی رہی اور اندر ہی اندر [illegible] تھی۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ خط آفس ہی کے کسی آدمی نے لکھا [illegible]

بالآخر تنگ آ کر اُس نے سوچا [illegible]

[illegible] ... [illegible]
[illegible] دیکھتا ہے اور اس سے ملنے کی خواہش [illegible] سکوں
[illegible] اُس کے نزدیک [illegible] خطا کی کرتی
[illegible] خط لکھنے والے کو کوئی پیدا کرتی ہے۔

یہی سوچ کے بات [illegible] تھی!

لیکن پھر ایک خط اُس کی میز کی دراز میں موجود تھا!!

اور اِس بار اُس خط میں اُس کی شخصیت و کردار پر روشنی ڈالی گئی تھی [illegible] ہو گیا تھا۔ اُس کی باوقار متانت، شرمیلی شخصیت اور [illegible] فطرت کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے گئے تھے۔ [illegible] کسی ذہین [illegible] دی گئی تھی اور اِس بار بھی لکھنے والے نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔

ماریا یہ دوسرا خط دیکھ کر اور پریشان ہو گئی تھی۔ یہ تو وہ سمجھ گئی تھی کہ میز کی دراز میں وہ خط کس طرح ڈالے جا رہے ہیں۔ میز کی سطح پر دو تختوں کے جوڑ کی جگہ پر ایک پتلی سی دراڑ نمودار ہو گئی تھی جسے 'لیٹر بکس' کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔

اور اب پھر ماریا سوچتی رہ گئی کہ کس نے یہ خط لکھا ہو گا؟

اب وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں خطوں کا یہ سلسلہ چل نہ نکلے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اِس طرح خطوط لکھنے والے کا سراغ لگایا جائے اور اُسے منع کر دیا جائے۔ لیکن وہ 'شخص' کا سراغ کس طرح لگاتی؟

جب ماریا کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ کیوں نہ رشید سے مدد لی جائے؟

رشید اُس دفتر میں چپراسی تھا۔ پڑھا لکھا اور شریف نوجوان تھا۔ ایک اچھے خاندان کا فرد تھا لیکن بگڑے ہوئے حالات کا شکار۔ ماریا کو یقین تھا کہ وہ اِس معاملے میں اُس کی ضرور مدد کرے گا۔ لیکن پھر اُس نے سوچا رشید خط لکھنے والے کا پتہ لگائے یا نہ لگائے، یہ بعد کی بات ہے لیکن فی الحال [illegible] اُسے خطوں کے بارے میں بتانا ہو گا اور ایک [illegible] شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔

اور پھر اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور فیصلہ کیا کہ وہ خود ہی 'اُس' کا پتہ چلائے گی ـــــ لیکن اُس کا پتہ لگانے سے پہلے ہی دوسرے دن پھر تیسرا خط اُس کی میز کی دراز میں موجود تھا!

اور پھر تیسرے کے بعد چوتھا... اور پھر پانچواں... اور پھر خطوں کا یہ سلسلہ چل نکلا تھا اور اب ہر رات اُس کی میز کی دراز میں ایک خط ضرور ڈال دیا جاتا تھا۔

اور رفتہ رفتہ ماریا نے یہ سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ یہ خطوط کون لکھ رہا ہے؟ ہر صبح آفس میں آنے کے بعد ماریا اپنی میز کے قریب آتی، میز کی دراز کو کھینچتی اور خاموشی سے اندر پڑے ہوئے خط کو اٹھا لیتی اور چپ چاپ پڑھنے لگتی تھی اور پھر جیسے اُس کا معمول بن گیا تھا۔

---

دھیرے دھیرے وہ خطوط ماریا کے دل و دماغ پر چھاتے گئے۔ اُن خطوں میں ایسی رنگینی ہوتی تھی، خط لکھنے کا انداز اتنا دلچسپ ہوتا تھا کہ انھیں پڑھ کر ماریا غیر معمولی مسرت محسوس کرنے لگتی تھی۔ لذت و سُرور کا ایک گہرا احساس سارے اعصاب پر چھا جاتا تھا۔

آفس سے آنے کے بعد، راتوں کو اپنے کمرے کی تنہائیوں میں ڈوب کر وہ بار بار اُن خطوں کو پڑھا کرتی اور پھر پہروں اُن خطوں کے بارے میں، اُن خطوں کے لکھنے والے کے بارے میں سوچا کرتی تھی، جسے آج تک اُس نے نہیں پہچانا تھا۔ لیکن کبھی کبھی اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُن خطوں کے سارے حروف مل جل کر ایک انسانی چہرے میں ڈھل گئے ہیں اور یہ چہرہ ماریا کو پرایا ہوتے ہوئے بھی غیر نہیں لگتا۔ اجنبی ہوتے ہوئے بھی بیگانہ نہیں لگتا۔

کبھی کبھی وہ سوچا کرتی تھی کہ کہیں یہ خطوط اُس کی زندگی میں کوئی آگ نہ لگا دیں! کہیں اُس کے قدم لڑکھڑا نہ جائیں! دین، دُنیا، سماج اور حق اور سچائی کی اِس راہ سے وہ کہیں بھٹک نہ جائے جس پر وہ برسوں سے گامزن ہے!

اور یہ خیال آتے ہی وہ کانپ سی جایا کرتی تھی اور اپنے آپ فیصلہ کرتی تھی کہ خطوں کے اِس سلسلہ کو روکنا اُس کے بس کی بات تو نہیں ہے، لیکن وہ اِتنا ضرور کرے گی کہ آئندہ جو بھی خط آئے گا، اُسے بغیر پڑھے ہی پھاڑ ڈالے گی، جلا ڈالے گی!

لیکن کبھی وہ اِس فیصلہ پر عمل نہ کر سکی تھی!

---

اور آج جو خط ملا تھا اُسے پڑھ کر ماریا کے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ اُس نے صبح یہ خط میز کی دراز میں سے اُٹھایا تھا اور اب رات کے گیارہ بجے تھے۔ اِس اثنا میں وہ کئی بار اِس خط کو پڑھ چکی تھی اور ہر بار

اس نے بہت مشکل سے اپنے آنسوؤں کو روکا تھا۔

اس نے ایک بے حد طویل خط لکھا تھا۔ لیکن یہ فقرے ماریہ کے ذہن سے چپک گئے تھے

... مجھے اپنے مسائل اور اپنی حیثیت کا خیال نہ ہوتا تو میں اب سے بہت پہلے ہی کھل کر آپ کے سامنے آجاتا، اپنی شخصیت کو ظاہر کر دیتا۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ اس سے پہلے آپ کے دل میں اپنے لئے تھوڑی سی جگہ بنالوں، اپنی وفا کے ذریعہ، اپنی بے لوث محبت کے ذریعہ، اپنی خاموش پرستش کے ذریعہ اور اگر کسی کی پرستش خالی نہیں جاتی ہے تو مجھے اس کا یقین ہے کہ میں آپ کے دل میں اپنے لئے جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا ہوں اور اگر ایسا ہے تو ثبوت کے طور پر ایک خط لکھ کر وہیں رکھ دیجئے جہاں سے آپ میرے خطوط اٹھایا کرتی ہیں۔ میں ذات پات، اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے کے سارے امتیازات کو مٹا کر آپ کے سامنے آجاؤں گا اور کمتری کا وہ طوق، پستی کا وہ غلیظ گندہ لبادہ اتار کر پھینک دوں گا جسے مجھے میرے حالات نے پہنایا ہے جس سے مجھے نفرت ہے اور ایک ایسے نئے انداز، ایک ایسے [illegible] کی بنیاد رکھنے کے لئے تن من کی بازی لگا دوں گا جو آپ کے لئے بھی قابلِ قبول ہو۔

---

یہ خط پڑھ کر ماریہ کا سارا وجود موم کی طرح [illegible] خط سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ لیکن وہ اس کے لئے کیا کر سکتی [illegible] دے سکتی تھی اسے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں!

اور پھر وہ عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔

آج تک نادان دل کے بہکاوے میں آ کر اس نے اپنے [illegible] کے ریشمی پردوں میں چھپا رکھا تھا [illegible] کی پردہ پوشی کرتی رہی تھی۔ لیکن آج وہ اپنے دل کی [illegible] نہیں دینا چاہتی تھی۔ کیونکہ اب اس کے اندر کی عورت جاگ اٹھی تھی۔

اور اسی عورت نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنی عزت اور آبرو کو داغدار نہ ہونے دے گی۔ عورت کی لاج اور مریادا پر حرف نہ آنے دے گی۔ وہ [illegible] ایک خط لکھ کر ساری حقیقت بتا دے گی اور یہ پہلا اور آخری خط ہوگا!

یہ فیصلہ کرنے کے بعد اُس نے اطمینان سا محسوس کیا اور پھر اُسے نیند آنے سے پہلے بیٹھ گئی۔ خط لکھ کر لفافے میں رکھا اور لفافہ پر ماریا کی طرف سے لکھ کر بستر پر دراز ہو گئی۔

دوسرے دن شام کو آفس سے نکلنے سے پہلے اُس نے اپنا خط میز کی دراز میں اِس طرح پھنسا دیا کہ آسانی سے نظر آ سکے اور پھر وہ آفس سے نکل آئی تھی۔

ماریا نے اُس خط میں لکھا تھا ———

——— !

آپ سے یہ پوچھے بغیر کہ آپ کون ہیں، میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں کوئی پتھر دِل عورت نہیں ہوں، ایک عورت ہوں، میرے سینے میں پتھر نہیں، دل ہے اور دل میں جوش و جذبات ہیں، اُمنگیں ہیں۔ لیکن میں نے اپنے سارے جذبات، احساسات اور اُمنگوں کو تھپک تھپک کر موت کی نیند سُلا دیا ہے۔ پلی دو پلی کے لئے آپ کے خطوں نے اِن مُردہ اُمنگوں کو جھنجھوڑ ڈالا تھا اور یہی میری بہت بڑی غلطی تھی۔ مجھے تو چاہئے تھا کہ بہت پہلے ہی آپ کو کسی طرح حقیقت سے واقف کرا دیتی۔ اِس طرح بات یہاں تک نہ پہنچتی! مجھے آپ کے جذبات کا احساس ہے۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ آپ کے جذبے صادق ہیں، آپ کی محبت بے لوث ہے، پاک اور عظیم ہے۔ لیکن میں بدنصیب آپ کو کچھ نہیں دے سکتی۔ اِس لئے آپ کو پہلی اور آخری بار یہ خط لکھ رہی ہوں۔ اگر آپ کے دل میں میری سچّی محبت ہے تو خدارا اِس بدنصیب ماریا پر رحم کیجئے۔ زندگی کے یہ دو چار دن سکون اور اطمینان سے گزارنے دیجئے۔ اُس کے دامن پر کوئی داغ نہ آنے دیجئے کیونکہ وہ ایک معصوم بچّے کی ماں ہے جس کا مستقبل اُسے سنوارنا ہے۔ ایک اپاہج اور معذور شوہر کی بیوی ہے، جسے زندگی کی آخری سرحد تک سہارا دینا اُس کا ایمان ہے، فرض ہے!

میں ہوں بدنصیب ——— ماریا

---

اُن دنوں تلنگانہ ایجی ٹیشن کے سلسلے میں شہر میں بڑے ہنگامے ہو رہے تھے۔ علیحدہ تلنگانہ کے حامیوں نے افراتفری مچا رکھی تھی۔ سرکاری عمارتوں کو نذرِ آتش کیا جاتا، بسوں پر پتھراؤ کیا جاتا اور الیکٹرک اور فون کے کھمبے اُکھاڑ دیے جاتے تھے۔

حکومت نے اُنہیں ہنگاموں کے پیشِ نظر دو دن تک تعطیل کا اعلان کیا تھا۔

ماریا کا آفس بھی دو دن تک بند رہا اور دو دن بعد صبح صبح ماریا کے پاس آفس کا ایک چپراسی بھاگا بھاگا آیا اور اُس نے اطلاع دی کہ اُن کے آفس کو آگ لگا دی گئی ہے!

ماریا نے پریشان ہو کر پوچھا "کس نے آگ لگائی ———؟"

اُس نے جواب دیا "چوکیدار نے! اور سب کا خیال ہے کہ علیحدہ تلنگانہ کے حامیوں نے آگ لگائی ہے۔ لیکن رشید نے سب کے سامنے بیان دیا ہے کہ آگ اُس نے لگائی ہے۔"

ماریا کو یقین نہ آیا۔ رشید جیسا شریف آدمی ایسا کر سکتا ہے؟ اور پھر اُسے اِس حرکت سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟؟

وہ جلدی جلدی ناشتہ کر کے آفس پہنچی۔ اُس وقت تک آگ بجھا دی گئی تھی۔ پولیس سب کے بیانات لے چکی تھی اور اب اُس کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ آفس پہنچتے ہی سب سے پہلے ماریا کی نظر رشید پر پڑی جو ایک طرف چپ چاپ کھڑا تھا۔ اُسے آتے دیکھ کر رشید نے اپنی نگاہ اُٹھائی اور پھر ماریا کو گھورنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں کچھ عجیب سی وحشت تھی، یاسیت تھی، ماریا کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

ماریا کا بیان بھی لیا گیا اور پھر اُس کے بعد جب پولیس رشید کو لے کر جانے لگی تو متعلقہ آفیسر نے رشید کو مخاطب کیا اور بہت ہی دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا رشید کہ تم خواہ مخواہ یہ الزام اپنے سر کیوں لے رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آگ تم نے نہیں لگائی ———!"

رشید کے ہونٹوں پر ایک بجھی بجھی سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔

"نہیں سر! آگ میں نے لگائی ہے۔"

ماریا خاموش کھڑی اُسے گھورتی رہی اور اُس کے آفیسر نے پوچھا۔

"لیکن کیوں ———؟"

"بس دیوانگی سر!" رشید نے ماریا کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "آگ لگا کر دیکھنا چاہتا تھا کہ کہاں تک پھیلتی ہے!" اور پھر وہ ایک لمحے کے لئے رُکا اور اُسی طرح ماریا کے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا "ہاں یہ جُرم میرا ہے اور جُرم کی سزا مجھے ملنی ہی چاہئے ———!!"

# غزل

بِرج لال رعنا جی بی اے

زُلف چہرے سے ہٹاؤ تو غزل ہو جائے ۔ جلوۂ حُسن دکھاؤ تو غزل ہو جائے
آنکھ سے آنکھ مِلاؤ تو غزل ہو جائے ۔ ایک دو جام پلاؤ تو غزل ہو جائے

دل کے مندر میں بنائے ہیں جو خوابوں کے صنم ۔ اُن کو آنکھوں میں سجاؤ تو غزل ہو جائے
نہ سہی جلوۂ دیدار میسّر، نہ سہی ۔ تم تصوّر میں کبھی آؤ تو غزل ہو جائے
یہ نگاہوں کا تصادم یہ دلوں کی دھڑکن ۔ اِن کی تصویر بناؤ تو غزل ہو جائے
بند پلکوں کی زباں پر ہیں جو کچھ افسانے ۔ ان کو تحریر میں لاؤ تو غزل ہو جائے
اور پھر دو مرے افکار میں رنگینیٔ حُسن ۔ تُم ذرا دیر نہ جاؤ تو غزل ہو جائے
اِس خموشی پہ ہے رنگین بیانی قربان ۔ تُم ذرا لب جو ہلاؤ تو غزل ہو جائے
چاندنی بھی ہے چمن بھی ہے مے و مینا بھی ۔ تُم کبھی ایسے میں جو آؤ تو غزل ہو جائے
اِن سُلگتی ہوئی نظروں سے مرے سینے میں ۔ عشق کی شمع جلاؤ تو غزل ہو جائے
تُم اگر سازِ تبسّم پہ کبھی بھولے سے ۔ دل کا اک گیت سناؤ تو غزل ہو جائے
جام و ساغر سے تو ہر روز پیا کرتے ہیں ۔ آج آنکھوں سے پلاؤ تو غزل ہو جائے
محفلِ حُسن سے رنگین اُجالے لے کر ۔ خلوتِ عشق میں آؤ تو غزل ہو جائے
قامتِ حُسن جواں ہے وہ قیامت کی غزل ۔ حسن کا مصرع بھی اُٹھاؤ تو غزل ہو جائے
اپنے پروانے کو بھی شمعِ شبستانِ جمال ۔ اپنی خلوت میں بُلاؤ تو غزل ہو جائے

بھر کے ساغر کو مئے ناب سے جانِ رعنا
تُم اگر ساز اُٹھاؤ تو غزل ہو جائے

# نا آشنا

نور النہار اختر (علیگ)

۴۔ ذاکر باغ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

مکرمی و محترمی خورشید صاحب! تسلیمات

"بیسویں صدی" کے لئے ایک اور افسانہ "نا آشنا" ارسال خدمت کر رہی ہوں لیکن ڈر رہی ہوں پچھلے افسانے کی طرح کہیں یہ بھی واپس نہ آ جائے۔ زیر نظر افسانہ میں نے بہت محنت سے لکھا ہے۔ ایک پرانی بات نئے انداز سے پیش کی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اور قارئین "بیسویں صدی" دونوں ہی اسے پسند فرمائیں گے۔ جواب کا بے چینی سے انتظار رہے گا...

خلوص کیش ——— نور النہار اختر

★

"آؤ بیٹا چائے پی لو۔"

"آ رہا ہوں ماں!" راجیش چائے کی میز کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

ابھی وہ کرسی پر بیٹھ بھی نہ پایا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی ٹرن... ٹرن... ٹرن۔

راجیش نے بڑھ کر رسیور اٹھا لیا۔

"ہلو! میں ڈاکٹر راجیش بول رہا ہوں۔ آپ کون صاحب ہیں؟"

"پلیز ڈاکٹر جلدی آ جائیے! میری لڑکی سُنیتا کی طبیعت بہت خراب ہے!"

دوسری طرف سے مسٹر شرما کی آواز آئی۔

"ابھی حاضر ہوتا ہوں!" راجیش نے رسیور رکھ دیا اور ماں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ماں! میں چائے آ کر پیوں گا۔ مسٹر شرما کے یہاں جا رہا ہوں ان کی لڑکی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔"

"اچھا بیٹا!" ماں نے پیار سے کہا۔ "لیکن جلدی آنے کی کوشش کرنا۔"

تھوڑی دیر بعد راجیش سُنیتا کے پلنگ کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا [illegible] کی حالت میں دبکی ہوئی پڑی ہے۔ بخار کی شدت سے اس کا چہرہ کچھ نڈھال سا ہو گیا ہے۔ لیکن آنکھوں میں چمک اور چہرے پر شرم و حیا کی لکیریں اسی طرح نمایاں ہیں۔ خوبصورت گردن [illegible] سے نیچے اتر گئی ہے۔ بڑے بڑے ریشمیں بال بے ترتیب پھیلے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے پتلے پتلے ہونٹ زبان حال سے کچھ کہہ اٹھیں گے۔ بخار سے اس کے رخساروں کی سُرخی اور بھی بڑھ گئی تھی اور اُن پر پسینے کے قطرے بالکل ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے موسم بہار میں گلاب کے سُرخ پھولوں پر شبنم کے ننھے ننھے قطرے۔ ایسی نرم و نازک احساسات رکھنے والی لڑکی پلنگ پر بے سُدھ پڑی ہوئی تھی۔ راجیش نے پہنچتے ہی سُنیتا پر ایک نظر سر سے پیر تک ڈالی۔ اگر وہ ڈاکٹر نہ ہوتا تو اُسے دیکھتا ہی رہتا۔ لیکن اس نے سوچا وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اس گھر میں داخل ہوا ہے اور ڈاکٹر کا کام صرف علاج کرنا ہے اور بس!

راجیش نے اپنا ہاتھ سُنیتا کی نازک کلائی پر رکھ دیا۔ "کب سے بخار ہے انہیں؟"

"صبح اچھی بھلی کالج گئی تھی۔ وہاں سے واپس آئی تو بخار ہو گیا۔" مسٹر شرما بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔

اور اب راجیش کے ہاتھ میں سُنیتا کی سنگ مرمر جیسی بانہہ تھی وہ حسن کی گداز بانہوں میں پٹی باندھ کر بلڈ پریشر کا معائنہ کر رہا تھا کئی بار اس کی [illegible]

[illegible] بھی راجیش کے ہاتھ سے نکل گئی۔

[illegible] کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ اب وہ روز ہی اُسے دیکھنے جاتا۔ سُنیتا آہستہ آہستہ تندرست ہونے لگی اور ایک ماہ کے بعد تو وہ بالکل ہی اچھی ہو گئی۔ اُس کی مسکراہٹیں اور شوخیاں پھر واپس آ گئی تھیں۔ اُس کے حُسن کی کشش پھر لوٹ آئی تھی۔ اُس کے چہرے پر وہی بشاشت، رونق اور نکھار پھر آ گیا تھا۔ مسٹر شرما نے اُس کے لئے پھلوں اور وٹامنز کی فراہمی میں کوئی کمی نہ کی تھی۔ مسٹر شرما راجیش کے علاج سے بے حد خوش اور مطمئن تھے۔ آہستہ آہستہ دونوں قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔ علاج و معالجے کا سلسلہ تو کچھ دنوں بعد بند ہو گیا لیکن راجیش مسٹر شرما کے گھر اُسی طرح آتا رہا۔ اب اُس کی حیثیت ایک ڈاکٹر کی نہیں تھی، ایک محسن اور دوست کی ہو گئی تھی۔

---

دن گزرتے گئے۔ سُنیتا راجیش کے خوابوں کی ملکہ بن چکی تھی۔ وہ اُس کے دل و دماغ پر اُسی دن چھا گئی تھی جس دن وہ اُسے پہلی بار دیکھنے آیا تھا۔ وہ سُنیتا کا علاج کرنے آیا تھا لیکن اس حسین پیکر کو دیکھتے ہی وہ خود مریض بن چکا تھا۔ سُنیتا اچھی ہوتی گئی اور راجیش کے مرض میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ وہ ہر روز مسٹر شرما سے ملنے جاتا لیکن اُس کا خاص مقصد یہ ہوتا کہ وہ سُنیتا کی ایک جھلک دیکھ لے۔ کبھی کبھی اُس سے بات کرنے کا بھی موقع مل جاتا۔

راجیش اُس کے باپ کا دوست تھا، اِسی لئے سُنیتا اُس کی بے حد عزت کرتی تھی۔ وہ آتا تو چائے خود بنا کر اُسے دیتی اور ہمیشہ "ڈاکٹر صاحب" کہہ کر مخاطب کرتی۔ کبھی کبھی "ڈاکٹر راجیش" بھی اُس کے منہ سے نکل جاتا۔ وہ کبھی اُس سے ہنسی مذاق نہیں کرتی اور نہ اُس کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی۔ اُس کے آنے پر وہ بہت زیادہ مہذب اور باادب بن جاتی ـــــ سُنیتا کے اِس اندازِ گفتگو اور اِس پُر تکلف میل جول سے راجیش دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سُنیتا اُس سے اُسی طرح بولے اور بات کرے جس طرح وہ اپنے بے تکلف دوستوں سے باتیں کرتی ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ سُنیتا ہر وقت اُس کے سامنے تہذیب و آداب کا مجسمہ بنی رہے۔ آخر کار اُس نے ایک دن کہہ ہی دیا۔

"یہ آپ ہر وقت مجھے ڈاکٹر کیوں کہتی ہیں؟ یہ ہاسپٹل نہیں ہے، گھر ہے، اور اِس وقت نہ آپ مریض ہیں اور نہ میں آپ کا ڈاکٹر!"

سُنیتا سہم سی گئی۔ راجیش کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔ "یہ کیا ڈاکٹر ڈاکٹر کی رٹ لگا رکھی ہے؟" وہ کہتا ہی گیا۔

سُنیتا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "آپ نے مجھے نئی زندگی بخشی ہے۔ آپ میرے لئے دیوتا سے کم نہیں۔"

راجیش کے جسم پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا ہو۔ [illegible] مفلوج ہو کر رہ گئے ہوں۔

"دیوتا!" وہ سوچنے لگا۔

"آپ میرا علاج نہ کرتے تو میں شاید [illegible] زندگی بھر نہ بھول سکوں گی۔" سُنیتا اُسی طرح کہتی رہی۔ "مجھے ڈاکٹر [illegible] ہے کیونکہ مجھے ڈاکٹر بہت اچھے لگتے ہیں اور پھر آپ ہنستے ہیں [illegible] ویسے کہی کی جاتی ہے۔"

راجیش آخری جملے پر دانت پیس کر رہ گیا۔ اُس نے سوچا سُنیتا کو وہ کیسے سمجھائے، وہ اُس سے محبت کرتا ہے۔ کسی لمحہ اُس کا تصور اُسے چین [illegible] اپنے دل کو وہ کیسے سمجھائے کہ سُنیتا کو بھول جائے۔ وہ اُسے کیسے سمجھائے کہ اُس کا خیال آتے ہی دل دھڑک اُٹھتا ہے۔ سُنیتا کو بھول جانا اُس کے بس کی بات نہیں۔ وہ اُس کے بہت قریب آ چکا تھا۔ اُس کی رُوح کی گہرائیوں میں سُنیتا بس [illegible] لیکن سُنیتا کو اِس کا احساس تک نہیں تھا۔ راجیش کتنی بار سوچتا کہ وہ اُس سے اظہارِ محبت کر دے لیکن ہمت نہ ہوتی۔ کتنی بار ایسا اتفاق ہوا کہ گھر میں سُنیتا تنہا تھی لیکن پھر بھی راجیش اظہارِ محبت کی جرأت نہ کر سکا۔ دن بیتتے گئے اور خاموش محبت راجیش کے دل میں مستحکم ہوتی گئی۔

---

ایک دن شام کو راجیش ہاسپٹل سے گھر لوٹا تو اُس نے ماں کو بیمار پایا۔ وہ بے حد اُداس ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا، کاش سُنیتا دُلہن بن کر اِس گھر میں آ جاتی اور بوڑھی ماں کی سیوا کرتی۔ راجیش کو دیکھتے ہی ماں کے دل میں بھی یہ خیال آتا کہ کاش! اِس گھر کی کوئی بہو ہوتی جو میرے گھر کی مالکن بنتی۔

آخر ماں نے کہا ـــــ "بیٹا اب میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ اب تم [illegible] پیروں پر کھڑے ہو گئے ہو۔ میری یہ دِلی خواہش ہے کہ اِس گھر میں چاند [illegible] آ جائے۔"

"اِتنی جلدی کیا ہے ماں؟" راجیش نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تو شادی سے انکار کیوں کرتا ہے۔ کیا [illegible] کوئی لڑکی پسند کر رکھی ہے؟ مجھے بتا، میں اُس کے ماں باپ سے ملوں گی۔" ماں کہتی تھی کہ آج کل کے تعلیم یافتہ لڑکے شادی بیاہ کے معاملے میں کتنے زیادہ آزاد خیال ہوتے ہیں۔ وہ اپنی شادی وہیں کرتے ہیں جہاں اُن کا دل چاہتا ہے چاہے والدین کی مرضی ہو یا نہ ہو۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ راجیش کی شادی کسی غلط جگہ ہو جائے [illegible]

[illegible] ہے۔

راجیش [illegible] کے بغیر کہے سب کچھ سمجھ جاتی۔ [illegible] کے بغیر ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا اور سوچنے [illegible] زندگی کے سفر میں مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے اور ماں کی بھی یہ خواہش ہے [illegible] کہ وہ آج سنیتا سے ضرور اپنے جنم جنم کے پیار کا اقرار کرے گا۔ [illegible] کی طرح ہنستا ہوا پھول بن گئی تھی۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا، حسن و رعنائی نے عورت کا روپ دھار لیا ہے۔ اس نے اسی سال ایم۔ اے کی ڈگری لی تھی۔ مسٹر شرما نے سنیتا کی شادی ابھی تک اس لیے کہیں نہیں طے کی تھی کہ وہ زیرِ تعلیم تھی۔ تعلیم مکمل ہونے کے ساتھ ساتھ مسٹر شرما کو سنیتا کی شادی کی فکر ستانے لگی۔

---

اتوار کا دن تھا۔ راجیش خلافِ معمول صبح ہی صبح سنیتا کے گھر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے آج سب سے زیادہ قیمتی سوٹ زیبِ تن کیا۔ میک اپ بھی گھنٹوں کرتا رہا۔ دل میں آرزوؤں کی دُنیا لئے ہوئے اس نے اپنی کار مسٹر شرما کے پورٹیکو میں روکی۔ اس نے سوچا آج وہ سنیتا سے اپنے دل کی بات کہہ دے گا۔ وہ اس کی زندگی ہے، اس کے دل کی دھڑکن ہے!!

راجیش کو دیکھ کر سنیتا کے دل میں آج پہلی بار اس کے لئے کشش محسوس ہوئی۔ اس کی جاذبِ نظر شخصیت نے سنیتا کو آج پہلی بار متاثر کیا۔ راجیش کے لئے آج اس کے منہ سے پہلی بار "ہیلو راجیش" نکلا۔ سنیتا کے برتاؤ میں غیر معمولی تبدیلی دیکھ کر راجیش کو بے حد حیرت ہوئی۔ اس نے سوچا شاید خدا نے اس کی سن لی!

سنیتا آج پہلی بار راجیش کے بارے میں سوچنے لگی۔ راجیش کتنا اچھا ہے! خوبصورتی میں وہ کسی سے کم نہیں، بہترین ڈاکٹر ہے، دولت میں بھی وہ ہم لوگوں سے اونچا ہے۔ اس کے پاس کار ہے، بنگلہ ہے! خیالات کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ کون خوش نصیب لڑکی ہوگی جو راجیش کی بیوی بنے گی!

دُوسرے ہی لمحے اس کے دل میں خیال آیا: "یہ میں کیا سوچ رہی ہوں؟ راجیش ایک دولت مند انسان ہے۔ کتنے لوگ یہ چاہتے ہوں گے کہ ان کی لڑکی کی شادی اس سے ہو جائے!"

"کاش! میرے والد کی بھی یہی آرزو ہوتی!" وہ خیالات کی رَو میں بہتی چلی گئی۔

سنیتا راجیش کے لئے اندر چائے لینے چلی گئی۔ راجیش نے سوچا چائے کے دَور کے ساتھ ہی وہ اپنے دل کی بات شروع کرے گا۔ سنیتا بھی یہی سوچ رہی تھی کہ وہ آج راجیش سے سب کچھ کہہ دے گی۔

سنیتا چائے کی ٹرے لئے ہوئے ڈرائنگ رُوم میں داخل ہی ہو رہی تھی کہ مسٹر شرما باہر سے آگئے۔ انھوں نے راجیش کو دیکھتے ہی پُر زور آواز میں کہا۔ "مُبارک ہو راجیش صاحب! سنیتا کی شادی کا رشتہ بہت اچھی جگہ طے ہو گیا ہے۔ آج ہی شام کو وہ لوگ سنیتا کو دیکھنے آرہے ہیں!"

مسٹر شرما کی آواز سنیتا کے کانوں میں بجلی کی طرح گری۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے، چائے کی پیالیاں کانپنے لگیں جیسے اس کے ہاتھ میں رعشہ ہو یا کوئی زلزلہ آگیا ہو۔ وہ چائے رکھ کر فوراً اندر بھاگ گئی۔ اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ چہرے پر تحیّر تھا اور دل و دماغ پر اس کا قابو ختم ہو چکا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا وجود اسے دھوکا دے گیا ہو۔

زندگی میں پہلی بار اس نے کسی کے لئے اپنے دل میں جگہ محسوس کی تھی۔ لیکن بُنیاد پڑتے ہی آرزوؤں اور تمناؤں کا محل مسمار ہو چکا تھا۔ معصوم تمنا کی کلی ابھی پھول نہ بننے پائی تھی کہ گلچیں کے بے رحم ہاتھوں نے اُسے توڑ دیا۔

اِدھر راجیش کی بھی حالت کچھ کم قابلِ رحم نہیں تھی۔ یہ خبر سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ جیسے موسمِ خزاں میں بادِ سموم چلنے سے ہرے بھرے پتّے شاخوں میں زرد ہو جاتے ہیں۔ مسٹر شرما کے یہاں اس کے لئے ایک ایک پل قیامت کی گھڑی ہو رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کا وجود بیکار ہو چکا ہو۔ جیسے دُنیا کی ہر نعمت اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھین لی گئی ہو اور اس کے عوض غم و الم کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ بخش دیا گیا ہو۔ وہ مسٹر شرما سے اُکھڑی آواز اور ٹوٹے پھوٹے بے ربط جملوں میں باتیں کرنے کے بعد فوراً اپنے گھر واپس ہو گیا۔ اب کسی کام میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ ہاسپٹل سے اس نے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی تھی اور ماں سے بہانہ کر دیا کہ طبیعت اچھی نہیں۔ گھر میں پڑے پڑے سنیتا کی جُدائی کے غم نے اسے اور بھی مضمحل بنا دیا تھا۔

راجیش کئی روز تک جب مسٹر شرما کے گھر نہ گیا تو انھوں نے ملازم بھیج کر ایک دن اسے بُلوا لیا۔ انھوں نے راجیش کو سنیتا کی شادی کا کارڈ دیتے ہوئے کہا: "دیکھو راجیش! کارڈ کی تحریر کتنی اچھی ہے اور اس کا ڈیزائن کتنا پیارا ہے! ہو گئے نا تم میرے حُسنِ انتخاب کے قائل!"

راجیش نے کارڈ کی تحریر پڑھی تو اُسے محسوس ہوا جیسے یہ کسی کی شادی

راجیش نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا: ایک لڑکی تھی جس نے میری زندگی میں بہار بن کر قدم رکھا تھا۔ سُنیتا! تم اُس کا نام مت پوچھو تو اچھا ہے۔ مگر ہے وہ سنگدل!" سُنیتا ضبط نہ کر سکی۔

"میرے زخموں کو ہرا نہ کرو سُنیتا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" آنسوؤں کو رومال سے خشک کرتے ہوئے راجیش بولا۔

"ماضی کی کربناک یادوں کو بھول جائیے۔ کسی بے وفا کی محبت سے جگر پر جو زخم ہوئے ہیں انھیں مندمل کرنے کی کوشش کیجیے اور کسی اچھی لڑکی سے شادی کر لیجیے۔"

"میں اُسے کیسے بھول جاؤں سُنیتا! جس کی یاد اب بھی احساس کے نہاں خانے میں چپکے سے در آتی ہے۔ میں اُسے نہیں بھول سکتا سُنیتا، کبھی نہیں بھول سکتا!" راجیش بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔

سُنیتا سوچنے لگی کیا کوئی ایسی صورت نہیں جس سے میں راجیش کے غم کو دُھندلا سکوں۔ اُس کے دل کی اُجڑی دُنیا پھر آباد ہو سکے۔ راجیش نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ اِن کے مرنے کے بعد بھی وہ میرے غم میں شریک رہا ہے۔

سُنیتا ذہن پر زور دینے لگی ـــــ وہ کون ایسی لڑکی ہو سکتی ہے جس نے راجیش کو فریب دیا اور اِس کی زندگی کے مسرّت سے بھرے لمحات کو یاس و الم میں تبدیل کر دیا۔ اُسے کس چیز کی کمی راجیش میں محسوس ہوئی؟ سُنیتا سوچ سوچ کر تھک گئی لیکن اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے کئی روز تک راجیش سُنیتا سے نہ مل سکا۔ جب اُس سے نہ رہا گیا تو وہ اُس سے ملنے اُس کے گھر آئی۔

اُس کی بُوڑھی ماں نے بہت محبت سے کہا: "بیٹی بیٹھ جاؤ وہ ابھی آتا ہو گا۔"

سُنیتا پہلی بار راجیش کے گھر گئی تھی۔ اُس کا گھر نفاست پسندی کا خوبصورت نمونہ تھا۔ ہر چیز میں سلیقہ مندی تھی۔ چیزوں کی آرائش نے اُسے موہ لیا۔ راجیش کا ڈرائنگ رُوم تو نگار خانۂ چین سے کم نہ تھا۔ مُلک مُلک کے عجیب و غریب نوادرات سے اُس کا کمرہ آراستہ تھا۔ صوفوں کے ڈیزائن، دروازوں پر پڑے ہوئے پردے اور دیوار پر آویزاں تصویریں اُس کے لئے بے پناہ کشش رکھتی تھیں۔ وہ سوچنے لگی: کاش میں اِس گھر کی بہو ہوتی!

ڈرائنگ رُوم سے نکل کر وہ راجیش کے شب خوابی کے کمرے میں داخل ہوئی اور گہری نظر سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ میز پر اُسے کسی لڑکی کی تصویر نظر آئی۔ رشک و رقابت کی آگ سے وہ جل اُٹھی اور اُس نے سوچا شاید یہی وہ مہ جبین، پُر کشش و حسین ہے جس نے راجیش کی راتوں کی نیند حرام کر رکھی ہے اور اُس کی ہر مسرّت چھین لی ہے! جب قریب پہنچی تو ٹھٹک کر رہ گئی۔ یہ اُس کی تصویر تھی جو اُس نے ایم۔اے کی ڈگری ملنے کے بعد کھنچوائی تھی۔

"خوبصورت فریم میں لگی ہوئی سر سے پیر تک میری رنگین تصویر ہی راجیش کی حاصلِ زندگی ہو سکتی ہے!" وہ خوشی سے جھوم اُٹھی۔ اُس کے ذہن کے سارے دریچے کھل گئے اور ہر سمت سے مسرّت کے نغمے اُبل پڑے۔ اُس نے محسوس کیا اُس کے قدم زمین پر نہیں ہیں۔ سامنے لگے ہوئے قدِ آدم آئینے میں سُنیتا کا وجود متحرک اُٹھا۔

اُس کی نظر شیلف میں رکھے چند فلمی اور غیر فلمی رسالوں پر پڑی۔ اُس نے دیکھا اُن بے ترتیب رسالوں کے درمیان ایک چھوٹی سی ڈائری بھی پڑی ہوئی ہے۔ اُس نے ڈائری اُٹھا لی۔ لیکن خیال آیا کسی کی ڈائری نہ پڑھنی چاہیے۔ دُوسرے ہی لمحہ اُس کے دل نے کہا: راجیش ہی کی تو ہے جو اب میرا ہو چکا ہے! کئی ورق پلٹنے پر اُس میں اپنا نام دیکھ کر چونک پڑی۔ اب اُس نے اپنی بھرپُور نظر اُس ڈائری پر جما دی۔ یہ ڈائری راجیش کی آج تک کی زندگی کا سربستہ راز تھی! ڈائری کے آخری ورق کو وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو قابو میں کرتے ہوئے بار بار پڑھ رہی تھی۔

"آج وہ خود میری اِس پریشان زندگی کا راز جاننا چاہتی ہے۔ میرا دل چاہا اُسے سب کچھ بتا دوں۔ لیکن کوشش کے باوجود میں ایسا نہ کر سکا۔ میری زبان سے اُس وقت صرف اِتنا ہی نکل سکا: "ایک لڑکی تھی جس نے میری زندگی میں بہار بن کر قدم رکھا تھا لیکن یہ بہار جلد ہی خزاں میں تبدیل ہو گئی۔" تمھیں کیسے بتاؤں سُنیتا کہ وہ میرے پیار سے اب تک ناآشنا ہے۔ یہ کہنے کے بعد میرا دل چاہا کہ میں اُس سے ایک جملہ اور کہہ دوں: "سُنیتا وہ لڑکی تم ہی تو ہو!" لیکن میں یہ نہ کہہ سکا۔ میں اُس سے اِتنی بڑی بات نہ کہہ سکتا تھا۔ اگر میں اُس سے کہہ دیتا وہ نہ جانے میرے بارے میں کیا کیا سوچتی۔ وہ مجھے اِن کا قاتل سمجھتی۔ میں کوشش کے باوجود اُس کا سُہاگ نہ بچا سکا: وہ میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ کر اِس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ میں کتنا بدنصیب ہوں۔ زندگی میں پہلی بار سُنیتا کو گلے سے لگانے کا ارمان دل میں مچلا تھا۔ لیکن وہ کبھی پُورا نہ ہو سکا۔ میں سُنیتا سے اب بھی دل کی بے پناہ گہرائیوں سے محبت کرتا ہوں۔ بیوہ ہونے پر بھی میں اُس سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن کیا پتہ کہ وہ اب تک اپنے شوہر کے غم میں آنسو بہا رہی ہو اور اُس کی یاد میں اِسی طرح اپنی جوانی کے دن گزار دے۔ ابھی

شیتا کی قربت کیا ہے۔ ابھی تو بالکل نوجوان ہے۔ کاش شیتا کے ...... سے مجبور ہوتی؟"

شیتا کے منہ سے مسرت میں لپٹی ہوئی ایک چیخ سی نکل گئی۔ خوشی سے بے اختیار ہو کر اس نے ڈائری چوم لی۔ پھر اپنے سینے سے لگا کر خوش آئند خیالوں میں کھو گئی۔

---

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کیلئے چونکہ ہمارے پاس ٹکٹ ... اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھیں کیونکہ ہم واپسی سے معذور ہیں ...

---

## ...نجان

ناقم رضوی ایم۔ اے بی ایڈ ایل ایل۔ بی

...خبر تھی کہ جسے میں نے کبھی چاہا تھا
...سرہ ورسم محبت سے گریزاں ہوگی

جس کی باتوں نے جگایا تھا محبت کا فسوں
اب وہ بیتی ہوئی باتوں پہ پشیماں ہوگی

...ندتاروں نے کبھی جس کو کئے تھے سجدے
...خبر تھی کہ وہ ذروں سے بھی ارزاں ہوگی

مدتوں تک مری نظروں کا جو موضوع رہی
وہ کسی اور کے افسانے کا عنواں ہوگی

...ندگی بن کے رہی ساتھ جو اوّل اوّل
...خر آخر وہ چراغِ تہِ داماں ہوگی

میری خاطر جو پریشان رہا کرتی تھی
آج وہ میرے تصور سے پریشاں ہوگی

...پھول بن کر مری دنیا میں جو آئی تھی کبھی
...ج وہ غیر کی محفل میں گل افشاں ہوگی

دلِ برباد میں اکثر یہ خیال آتا ہے
کیا کبھی پھر وہ حریفِ غمِ دوراں ہوگی

پھر بہار آئے گی کیا میرے چمن کی جانب
کیا کبھی پھر وہ مرے دکھ کا درماں ہوگی

## غزل

پرکاش وار برنی

مندر میں ہے موجود نہ مسجد میں چھپا ہے
جس دل میں محبت ہے اسی دل میں خدا ہے

ہم زیست کو دوزخ کے سوا اور کہیں کیا
جب زلف کا سایا ہے، نہ آنچل کی ہوا ہے

یہ رات ہے یا آس کا سوکھا ہوا جنگل
یہ چاند ہے یا درد کے شعلوں کی چتا ہے

میں ایک جھلستا ہوا تپتا ہوا صحرا
تو ایک برستی ہوئی گھنگھور گھٹا ہے

دنیا جسے سمجھی ہے تبسم کا ترانہ
وہ میرے چٹختے ہوئے زخموں کی صدا ہے

اس راز کے رخ سے کبھی پردہ تو اٹھاؤ
وہ راز جو سنگ کے پہلو میں چھپا ہے

لو دینے لگے بجھتے دیئے دور افق تک
یہ کس نے اندھیرے میں ترا نام لیا ہے

تھی اتنی زباں پہلے کبھی دلکش مگر اس میں
خوشتر کی دعاؤں نے نیا رنگ بھرا ہے

اے پریتم کہیں پھر باز نہ آیک جانا
یہ تیری غزل ہو کسی دلہن کی قبا ہے

# پائل کی جھنکار

مس رضوانہ یوسف فاروقی بی۔اے، بی ایڈ (علیگ)
بذریعہ حسن تاج صاحب، ۱۲۹ کارٹر روڈ، باندرہ، بمبئی نمبر ۵۰

محترم چچاجان! سلام بصد احترام

"بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہونے کی جرأت کر رہی ہوں اور وہ بھی خاموشی سے نہیں، "پائل کی جھنکار" کے ساتھ! کسی شاعر نے کہا ہے ؎

پھیر سکتی نہیں تقوے سے مجھے کوئی صدا
شرط یہ ہے کہ وہ پازیب کی جھنکار نہ ہو

اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ "سب انگلیاں برابر نہیں ہوتیں" اس شعر کو حقیقت سے دور نہیں کہا جاسکتا۔ اس حقیقت کی عملی تشریحات آئے دن زندگی میں ہوتی رہی ہیں، اب بھی ہوتی ہیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی ـــــ اپنے دامن میں حقیقت لئے یہ افسانہ بھی اس شعر کی تشریح کا ایک حصہ ہے۔ . .

آپ کی گرانقدر رائے کی منتظر
خاکِ پا ـــــ رضوانہ

لوگ کہتے ہیں پائل کی جھنکار میں بڑی طاقت ہے! اور جب لوگ کہتے ہیں تو سچ ہی کہتے ہوں گے۔

'پائل کی جھنکار' کتنا خوبصورت مجموعۂ الفاظ ہے!! ذہن میں آتے ہی تصورات کے جھلملاتے آئینوں کے درمیان ایک حسین سی تصویر ابھرتی ہے، ایک جمیل پیکر نظر آتا ہے۔ خوبصورت، نازک، حسین و نازنین، سراپا بہار، چلتی ہوئی قیامت، ہاتھوں میں چوڑیوں کی کھنک، آنکھوں میں رنگین دھنک اور پیروں میں تھرکتی پائل کی کھنک ـــــ!

لیکن میں تو ایک معمولی سی عورت کا ذکر کر رہا ہوں۔ مگر عورت چاہے لیلیٰ ہو، حسین ہو یا کم، ہے تو مرد کی سب سے بڑی کمزوری! ـــــ میں یہاں جس واقعہ کا ذکر کروں گا وہ کہانی نہیں، حقیقت ہے۔ ہاں اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حقیقت نے اس کہانی کو جنم دیا ہے یا کہانی نے میرے عنوان میں جان ڈالی ہے۔ میرے خیال میں دونوں ہی ایک حقیقت کے دو نام ہو سکتے ہیں۔

انجن کا رُخ پونہ سے بمبئی کی طرف تھا۔ ٹرین پوری رفتار سے فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ ٹرین کی ادھ کھلی کھڑکیوں سے سرسراتی ہوئی ہوا میرے ہی خیالوں میں نہیں، شاید سارے مسافروں کے خیالات میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ میری سیٹ کے بالکل ہی سامنے ایک صحت مند نوجوان پاؤں سامنے کی طرف پھیلائے بہت اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اس نے گرین شرٹ پہن رکھی تھی اور سُرخ رنگ کی ٹائی۔ کچھ عجیب سا کمبینیشن (Combination) تھا لباس کا۔ بس وہ آدمی بذاتِ خود مجسّم اطمینان اور بے چینی کا سنگم دکھائی دے رہا تھا۔ میں بہت دیر سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار سامنے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر تو میں نے نظر انداز کیا، آخر مجھے تجسّس پیدا ہوا اور میں ہوا سے بچنے کا بہانہ کر کے اپنی سیٹ سے اُٹھا اور اس کے برابر جا بیٹھا۔ وقت گزارنے کے لئے میں نے اپنے ہینڈ بیگ سے اخبار نکالا اور یونہی دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے بھی ایک اُچٹتی ہوئی سی نگاہ سامنے کی طرف ڈالی تو معلوم ہوا کہ سامنے کی سیٹ کا آخری

کی وہ اُس کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے ـــــ وہاں ایک عورت بیٹھی تھی جو غالباً تنہا سفر کر رہی تھی۔ ایک بار دیکھنے کے بعد میں نے بھی نگاہ بچا بچا کر کئی بار اُس عورت کے چہرے پر نظریں ڈالیں۔ وہ بہت زیادہ خوبصورت تو نہ تھی لیکن اُسے معمولی صورت کہہ دینا بھی ناانصافی تھی۔ کیونکہ اُس کے چہرے کو ملیح بنانے میں قدرت نے بہت فیاضی سے کام لیا تھا۔ اُس نے اپنے جسم پر ایک معمولی سی ساری لپیٹ رکھی تھی اور پاؤں میں سادہ سی چپلیں۔ لیکن اِس سادگی میں بھی اُس کی خاموشی اور سنجیدگی سے کافی پُرکاری جھلک رہی تھی۔ تیکھے نین نقش، پتلے پتلے ہونٹ، جنھیں وہ کبھی کبھی اپنے موتی جیسے دانتوں تلے دبالیتی تھی، جھیل جیسی خاموش اور جھکی جھکی آنکھیں، جنھیں اُٹھنے کی بہت کم اجازت تھی۔ لیکن جو اُٹھتی تھیں تو نہ جانے کتنے دلوں کی دھڑکن بڑھادیتی تھیں۔

ایک عجیب بات جس نے اُسے اور زیادہ توجہ اور چہ میگوئیوں کا مرکز بنا دیا تھا، وہ یہ تھی کہ اُس کے برابر ہی ایک صاحب تشریف فرما تھے۔ بڑے اپٹوڈیٹ سے! انھوں نے کریم رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اُن کی خوبصورت ٹائی، چوڑے پٹے کی رِسٹ واچ اور پشیل شوز۔ یہ سب مِل کر اِس بات کا پتہ دے رہے تھے کہ یہ صاحب بمبئی کی زبان میں کسی سیٹھ سے کم نہیں تھے۔ وہ صاحب اِس عورت میں کافی دلچسپی لیتے نظر آرہے تھے۔ اُس سے کچھ باتیں بھی کر رہے تھے کبھی کبھی اُسے اپنے ناشتہ دان سے کھانے کی کچھ چیزیں پیش کرتے، کبھی تھرمس سے چائے نکال کر اُس کے آگے بڑھاتے۔ خدا جانے اُس سے اُن کا کیا رِشتہ تھا۔ بہرحال رِشتہ جو بھی ہو، عجیب عجیب سی نگاہیں اُن پر پڑ رہی تھیں۔ کچھ لوگ سرگوشی کر رہے تھے اور کچھ لوگ اونچی آواز میں اِن ڈائرکٹ (Indirect) طریقے سے فقرے اُچھال رہے تھے۔ کچھ کی نگاہیں اعتراضات کے تیر اور کچھ کی نگاہیں رقابت کے نشتر پھینک رہی تھیں۔ غرض جتنے مُنہ تھے اُتنی باتیں اور جتنی نگاہیں اُتنے انداز!

میں نے اخبار کا صفحہ پلٹتے ہوئے ایک بار سارے کمپارٹمنٹ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور پہلو بدل کر پھر بظاہر اخبار کی موٹی موٹی سُرخیاں دیکھنے میں مصروف ہوگیا۔ میرا بازو میرے برابر بیٹھے ہوئے اُس نوجوان سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا جو بڑے عجیب عجیب انداز سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اُس عورت کو دیکھ رہا تھا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ ٹرین ٹھہر گئی۔ میں نے پھر پہلو بدلا اور سامنے کی طرف جھک کر دیکھنے لگا کہ کون سا اسٹیشن آیا ہے؟ لیکن میں بورڈ نہ دیکھ سکا۔ کچھ لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ جس سے یہ معلوم ہوگیا کہ وہ لوناولا اسٹیشن تھا۔ بمبئی آنے میں ابھی کافی دیر تھی اور مجھے وی ٹی اُترنا تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی پیپر ایک طرف رکھا اور ہاتھ بڑھا کر سامنے کونے میں رکھا ہوا اپنا تھرمس اُٹھایا اور چائے انڈیل کر پینے لگا۔ تنہا جانے سفر میں مجھے چائے سی کیوں سوار ہو جاتی ہے یہ میں خود بھی نہیں جانتا۔ لیکن اُس وقت اِتنی چُستی ضرور آگئی تھی کہ اپنا تھرمس بیگ سے نکال اُٹھالیا سو رہ برابر بیٹھے ہوئے اُن گرین شرٹ والے صاحب سے کہا "بھائی صاحب ذرا ہاتھ بڑھا کر میرا تھرمس اُٹھا دیجیے، بڑی مہربانی ہوگی۔ آپ پاس نزدیک بیٹھے ہیں۔" میری سُستی شاید میرے خیالات نے ختم کر دی تھی اور میں خود ہی کچھ نہیں پارہا تھا کہ میرے اندر ہو کیا رہا ہے۔ طبیعت اچانک طور پر سامنے کو کھنچی جارہی تھی اور دل کی دھڑکنیں کبھی کبھی تیز ہوجاتی تھیں کہ کیا پتہ اِس اکیلی سفر کرتی ہوئی عورت کی خاموش نگاہوں اور اکیلے پن کو تماشا سمجھا جا رہا ہو!

کچھ دیر کے بعد ٹرین چل پڑی اور لوگ پھر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے جو پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے پہلو بدل لئے۔ اچانک میرے پیچھے والی سیٹ سے ایک جنٹلمین اُٹھے اور اُن حضرت کے برابر جاکر بیٹھ گئے جو اُس عورت میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے۔ ہمدردی کہیے یا رقابت، خدا جانے کس جذبے کے تحت اُن صاحب کو سمجھانے لگے۔ وہ صاحب انگلش کافی روانی سے بول رہے تھے اور طرزِ گفتگو سے کافی ایجوکیٹیڈ (Educated) معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی ساری باتیں تو میری سمجھ میں نہ آسکیں۔ لیکن اِتنا ضرور سمجھ میں آگیا کہ وہ صاحب اُن حضرت کو سمجھا رہے تھے کہ کسی غیر عورت کے ساتھ جو تنہا ہو اِتنا فری ہونا مناسب نہیں۔ کیونکہ ایسی باتیں دوسروں کی زبانوں کو اعتراض کا موقع دیتی ہیں۔ کھنڈالا اسٹیشن پر اُن صاحب کی جنھیں میں نے بمبئی کا سیٹھ کہا ہے، منزل آگئی تھی اور وہ وہاں اُتر گئے۔

---

اسٹیشن آتے گئے، مسافر اُترتے گئے۔ ایک اسٹیشن پر وہ عورت بھی غالباً کچھ خریدنے کے لئے اُتری۔ اچانک ٹی ٹی اُس کے پاس آگیا اور ٹکٹ طلب کرنے لگا۔ عورت نے بہت بے رُخی سے جواب دیا کہ اُس کے پاس صرف کلیان تک کا ٹکٹ ہے۔ لیکن وہ اور آگے تک جائے گی۔ ٹی ٹی نے بحث شروع کر دی۔ میری سیٹ بہت نزدیک ہی تھی۔ وہ بھاری بھرکم سا آدمی جو اَب تک چپ چاپ میرے برابر بیٹھا تھا، اپنی جگہ سے اُٹھا اور ٹی ٹی سے عورت کی وکالت کرنے لگا اور عورت سے کہنے لگا کہ میں آپ کا ٹکٹ خریدے دیتا ہوں۔ عورت نے اجنبی سے لہجے میں بڑی سختی سے جواب دیا کہ نہیں مجھے کسی کے ٹکٹ کی ضرورت نہیں۔ اور وہ حضرت کھسیانے ہو کر کمپارٹمنٹ میں لوٹ آئے اور میرے پاس بیٹھتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے ـــــ "دیکھیے صاحب کیا زمانہ آگیا ہے۔ کسی کے ساتھ ہمدردی کریں تو اُلٹے بُرے بنیں۔" میں اپنی مُسکراہٹ نہ روک سکا اور کہنے لگا: "ہاں صاحب! آجکل یہی کا

زرا عجیب ہے۔ اِس زمانہ میں نیکی اور بھلائی کا فیشن اب بہت اولڈ ہو چکا ہے؟ بہت سے مسافر میں اپنے دل میں سوچنے لگا۔ آجکل ہمدردی کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ خدا جانے اِن صاحب کو ہمدردی کی کون سی قسم تھی۔ یہ وہ خود جانتے ہیں ۰۰۰!

دادر اسٹیشن پر ٹرین نے ذرا دم لیا۔ بہت سے لوگ اُتر گئے۔ اب صرف چند لوگ اِدھر اُدھر کمپارٹمنٹ میں بیٹھے رہ گئے تھے اور اُترنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ وہ اب بھی سامنے تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں مجھ سے کچھ سرگوشیاں کرنے لگیں۔ اب مطلع صاف ہے ـــــ میری نگاہ پھر اُس عورت کی طرف اُٹھی۔ اُس کی نگاہوں کی برق ایک لمحے کے لئے میری نگاہوں سے ٹکرائی اور میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی ـــــ دل نے کہا۔ سبھی! تم نے بازی جیت لی ہے! کسی کی تنہا نگاہوں کو شاید تمہارا ہی انتظار تھا۔ میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ دل اور زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا کیونکہ وی ٹی اسٹیشن آنے ہی والا تھا۔ ٹی ٹی کی نگاہ اب تک اُس عورت پر تھی کیونکہ اُسے اُس سے بغیر ٹکٹ کے سفر کا جرمانہ وصول کرنا تھا۔

ایک جھٹکے کے ساتھ ٹرین وی ٹی اسٹیشن پر رک گئی۔ عورت کو زبردستی اُٹھا لیا گیا کیونکہ وہ اُترنے کے لئے تیار ہی نہ تھی۔ ٹی ٹی نے اُس سے ٹکٹ طلب کیا اور ٹکٹ دیکھتے ہی وہ حیرت سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اچانک مجمع میں سے کسی کی آواز آئی ـــــ "ارے یہ ٹکٹ کہاں ہے ـــــ یہ تو پاگل خانے کا نمبر ہے!"

میرا دماغ چکرا رہا تھا اور اِس ٹھوس حقیقت کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا جو میرے سامنے موجود تھی۔ اُس خوبصورت عورت کو چند آدمی پکڑ کر لے جانے لگے اور وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگی۔ اُس کے یہ قہقہے دُور تک میرے کانوں میں پائل کی جھنکار بن کر گونجتے رہے!!

---

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ (منیجر بیسویں صدی)

---

# غزل

پروفیسر بیتاب پیلی بھیتی ایم۔ کام (علیگ)

لب پہ پھر آج ذکرِ یار سہی ۔۔۔ دو گھڑی موسمِ بہار سہی

یاد پر تو نہیں مجھے قابو ۔۔۔ لاکھ اپنے پہ اختیار سہی

جیت تیری تجھے مبارک ہو ۔۔۔ میری تقدیر، میری ہار سہی

غم کا مارا تو غم کا مارا ہے ۔۔۔ گو مسرت سے ہمکنار سہی

چوم لے گی مرے قدم منزل ۔۔۔ پُرخطر تیری رہ گزار سہی

زندگی سے میں شرمسار نہیں ۔۔۔ زندگی مجھ سے شرمسار سہی

آج بیتاب تشنہ کامی کو
ساغرِ چشمِ میگسار سہی

# غزل

نسیم شاہجہانپوری

کلی جو کھلتے ہی مُرجھا گئی تو کیا ہوگا ۔۔۔ خزاں سے پہلے خزاں آگئی تو کیا ہوگا

یہ سوچتا ہوں کہ ترکِ تعلقات کے بعد ۔۔۔ تمہاری یاد کبھی آگئی تو کیا ہوگا

خزاں میں چاک گریباں ہیں جب دیوانے ۔۔۔ اگر چمن میں بہار آگئی تو کیا ہوگا

سکونِ دل کیلئے تم کو یاد کر لوں مگر ۔۔۔ تمہاری یاد بھی تڑپا گئی تو کیا ہوگا

سنا ہے آج وہ آئیں گے پرسشِ غم کو ۔۔۔ جواں سے پہلے اجل آگئی تو کیا ہوگا

فسانۂ غمِ دل اُن سے کہتے کہتے نسیم
ہمیں کو نیند اگر آگئی تو کیا ہوگا

آپ میں
۵۰,۰۰۰ روپے
کے انعامات ضرور جیتئے!
پہلا انعام ۲۰,۰۰۰/- روپے
دوسرا انعام ۵,۰۰۰/- روپے
تیسرا انعام ۲,۵۰۰/- روپے

# ادھورے سپنے

دلشاد علی خاں ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی (علیگ)

ڈسٹرکٹ ایمپلائمنٹ ایکسچینج، علی گڑھ (یو۔ پی)

خوش رہو بھیا!

آپ اُردو زبان اور ادب کی جس لگن سے خدمت کر رہے ہیں اِس کے بارے میں جتنا بھی کہا جائے کم ہی ہوگا۔ لیکن سرسید کی بسائی ہوئی علم و ادب کی اِس دُنیا میں، جس میں میں نے بھی پرورش پائی ہے، رسمی باتیں روایتی انداز میں کہنے کا دستور ذرا کم ہی ہے ورنہ ——— کہہ تو میں بھی سکتا ہوں کہ آپ کی ادبی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ آپ نے اُردو کے لئے یہ بھی کیا وہ بھی کیا . . . حال ہی میں آپ کی دِلّی سے گزر ہوا تھا۔ سوچا تھا کہ آپ سے بھی ملاقات ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ لیکن توبہ کیجئے۔ جب بھی فون اٹھایا ہر بار engaged۔ وقت بھی کم تھا۔ میں لوٹ آیا۔ خیر پھر کبھی سہی ——— "ادھورے سپنے" ایک نئی کہانی آپ کی نذر ہے، قبول فرمایئے . . .

خیر اندیش ——— دلشاد

★

اُس کی آنکھوں پر مسلّط اندھیروں نے اُس سے جینے کی ہر خواہش چھین لی تھی۔ لیکن ڈاکٹر کے خلوص اور لگن نے اُس کی سوئی ہوئی تمناؤں کو پھر جگا دیا۔ اُس کے چہرے پر شگفتگی کے رنگ لوٹ آئے۔ کوئی خیال اُس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ لے آیا جسے مایوسیاں برسوں پہلے چُرا لے گئی تھیں۔ وہ تاریکیوں کی دُنیا سے دُور بہت دُور چلی گئی۔ ہسپتال، آنکھوں پر بندھی پٹیاں اور آپریشن کی ناکامی کے امکانات ——— اُس کا ذہن اِن تمام تکلیف دہ احساسات کو پیچھے چھوڑتا ہوا اُسے تصورات کی رنگین وادیوں میں لے گیا۔ وہ تمناؤں کی نئے سرے سے تکمیل کرنے لگی۔ اُس نے ہر چیز کو بہت سلیقے سے سنوارا۔ ماضی کے [illegible] البم پر [illegible] کر جگاتی رہی۔ یہ میری پہلی البم کا گھر ہے۔ اُدھر [illegible] میں کھل رہی تھی۔ [illegible] اور [illegible] میں کتنی گہری [illegible]

رات گئے تک میں نہ جانے کیا کیا سوچا کرتی تھی، لکھا کرتی تھی۔ میری شُدم بیٹی سیما ——— کتنی شریر تھی۔ اُس روز جب چپکے چپکے آکر اُس نے میرے ہاتھ سے اُن کا فوٹو چھین لیا تو میں کتنی گھبرا گئی تھی۔ جب تک ایک ایک بات نہ پوچھ لی کمبخت نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کتنی شرم آئی تھی مجھے اُن کا نام بتانے میں۔ وہ باتیں بھی تو اچھی اچھی کیا کرتے تھے۔ بس یہی جی چاہتا وہ بولتے رہیں اور میں آنکھیں بند کئے سُنتی رہوں۔ کبھی کبھی تو اتنی کھو جاتی تھی اُن کی باتوں میں کہ مجھے یہ بھی نہ خیال رہتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اُسی دن اُنھوں نے نہ جانے کیا پُوچھا تھا مجھ سے۔ میں نے بس یوں ہی کہہ دیا "ہوں" تو اُنھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر پُوچھا "لے شنو! کیا سو رہی ہو؟" میں ایکدم چونک گئی۔ دل ایسے دھڑکنے لگا کہ بس اب آیا باہر! میں [illegible] زور سے ہنس پڑی اور پھر ——— اُس کے قہقہوں کی [illegible]

[illegible]

آپ میں
۵۰،۰۰۰ روپے
کے انعامات ضرور جیتیے!
پہلا انعام ۲۰،۰۰۰/- روپے
دوسرا انعام ۵،۰۰۰/- روپے
تیسرا انعام ۲،۵۰۰/- روپے
افغان سنو بیوٹی ایڈز "میرا روپ میری پسند" مقابلے میں حصہ لیجیے

# ادھورے سپنے

دِلشاد علی خاں ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی (علیگ)

ڈسٹرکٹ ایمپلائمنٹ ایکسچینج، علی گڑھ (یو۔پی)

خوش رہیا!

آپ اُردو زبان اور ادب کی جس لگن سے خدمت کر رہے ہیں اِس کے بارے میں جتنا بھی کہا جائے کم ہی ہوگا۔ لیکن سرسید کی بسائی ہوئی علم و ادب کی اِس دُنیا میں، جس میں میں نے بھی پرورش پائی ہے، رسمی باتیں روایتی انداز میں کہنے کا دستور ذرا کم ہی ہے ورنہ ـــــ کہہ تو میں بھی سکتا ہوں کہ آپ کی ادبی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ آپ نے اُردو کے لئے یہ بھی کیا وہ بھی کیا . . . حال ہی میں آپ کی دلّی سے گزر ہوا تھا۔ سوچا تھا کہ آپ سے بھی ملاقات ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ لیکن قہر کیجئے۔ جب بھی فون اُٹھایا ہر بار Engage۔ وقت بھی کم تھا۔ میں لوٹ آیا۔ خیر پھر کبھی سہی ـــــ "ادھورے سپنے" ایک نئی کہانی آپ کی نذر ہے، قبول فرمایئے . . .

خیر اندیش ـــــ دِلشاد

اُس کی آنکھوں پر مسلّط اندھیروں نے اُس سے جینے کی ہر خواہش چھین لی تھی۔ لیکن ڈاکٹر کے خلوص اور لگن نے اُس کی سوئی ہوئی تمناؤں کو پھر جگا دیا۔ اُس کے چہرے پر شگفتگی کے رنگ لوٹ آئے۔ کوئی خیال اُس کے ہونٹوں پر وہی مُسکراہٹ لے آیا جسے مایوسیاں برسوں پہلے چُرا لے گئی تھیں۔ وہ تاریکیوں کی دُنیا سے دُور، بہت دُور چلی گئی۔ ہسپتال، آنکھوں پر بندھی پٹیاں اور آپریشن کی ناکامی کے امکانات ـــــ اُس کا ذہن اِن تمام تکلیف دہ احساسات کو پیچھے چھوڑتا ہوا اُسے تصورات کی رنگین وادیوں میں لے گیا۔ وہ تمناؤں کی نئی صورت سے تخلیق کرنے لگی۔ اُس نے ہر چیز کو بہت سلیقے سے سنوارا۔ ماضی کے ہر گوشے پر وہ ٹھہر ٹھہر کر یادوں کو جگاتی رہی۔ یہ میری سہیلی انجم کا گھر ہے۔ اُدھر سڑک کے اُس پار پیلی سی کوٹھی میں سلمیٰ رہتی تھی۔ رعنا اور فرزانہ میں کتنی گہری دوستی تھی۔ یہاں ہاسٹل کے سامنے والے لان میں داخلے کے وقت نئی نئی لڑکیوں کو ہم کتنا ستایا کرتے تھے۔ یہ میرا کمرہ ہے یہ میرے ہاتھ کی بنائی ہوئی آئل پینٹنگ ہے جس پر مجھے انعام ملا تھا۔ اِس جگہ میری ٹیبل تھی جہاں بیٹھ کر

رات گئے تک میں نہ جانے کیا کیا سوچا کرتی تھی، لکھا کرتی تھی۔ میری روم میٹ سیما ـــــ کتنی شریر تھی۔ اُس روز جب چپکے چپکے آکر اُس نے میرے ہاتھ سے اُن کا فوٹو چھین لیا تو میں کتنی گھبرا گئی تھی۔ جب تک ایک ایک بات نہ پوچھ لی کمبخت نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کتنی شرم آئی تھی مجھے اُن کا نام بتانے میں۔ وہ باتیں بھی تو اچھی اچھی کیا کرتے تھے۔ بس یہ جی چاہتا وہ بولتے رہیں اور میں آنکھیں بند کئے سُنتی رہوں۔ کبھی کبھی تو اتنی کھو جاتی تھی اُن کی باتوں میں کہ مجھے یہ بھی نہ خیال رہتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اُسی دن اُنھوں نے نہ جانے کیا پوچھا تھا مجھ سے۔ میں نے بس یوں ہی کہہ دیا "ہوں" تو اُنھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر پوچھا: اے شمّو! کیا سو رہی ہو؟" میں ایکدم چونک گئی۔ دل ایسے دھڑکنے لگا کہ بس اب آیا باہر! میں جواب دینے کے بجائے زور سے ہنس پڑی اور پھر ـــــ اُس کے قہقہوں کی گونج نے تصورات سے نکل کر کمرے کی خاموشی کو توڑ دیا۔ ایکدم زور سے دروازہ کھلنے کی آواز سے اُس کے تصورات کے سلسلے ٹوٹ کر بکھر گئے اور وہ پھر ہسپتال، بیڈ اور اندھیروں کی دُنیا میں لوٹ آئی۔

"کیا ہوا شمع؟" ڈاکٹر نے گھبراہٹ میں اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ "تم اکیلی لیٹی لیٹی کیوں ہنس رہی تھیں اتنے زور زور سے؟"

"کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب! یونہی بس ایک بات یاد آگئی تھی۔" اُس نے سہم کر جھینپتے ہوئے کہا۔

"کون سی بات؟ ہم بھی تو سنیں۔" اور وہ پھر ایسے شرما گئی جیسے ڈاکٹر صاحب نے بھی نیما کی طرح چُپکے سے اُس کے دل میں جھانک کر کچھ دیکھ لیا ہو۔ اُس نے چاہا کہ جھوٹ موٹ کوئی بات بتا کر ٹال دے لیکن ڈاکٹر صاحب کا خلوص، ہمدردیاں اور روشن کی زندگی میں پھر اُجالوں کو واپس لانے کی بے لوث جدّوجہد ــــ اُس کے ارادہ کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہوگئی۔ اُس کے کانوں میں پچھلے آپریشن کے ناکام ہونے پر ڈاکٹروں کی آواز میں چھپی بے بسی گونجنے لگی "صرف ایک ہی راستہ ہے کہ آنکھیں تبدیل کر دی جائیں۔" ڈاکٹر کی سرگوشی کا ایک ایک لفظ اُس پر کتنا بڑا بوجھ بن گیا تھا۔ اُس کی اُمید کا ٹمٹماتا ہوا آخری دیا بھی بجھ گیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب میرا اگلا گھونٹ دیجئے!"

"نہیں شمع! اتنی مایوس نہ ہو۔ دُنیا میں ایسے بھی انسان ہیں جو دوسروں کی خوشیوں کے لئے اپنی آنکھیں Donate کر جاتے ہیں۔ کسی کا ایثار ان اندھیروں کو جگمگا دے گا۔"

وہ سوچنے لگی میری آنکھوں میں ڈاکٹر صاحب کا خلوص ہے، محبت ہے، فرض شناسی ہے۔ اگر وہ اتنی بھاگ دوڑ نہ کرتے تو یہ اندھیرے تو میری جان ہی لے لیتے اور پھر ڈاکٹر صاحب میرا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ نہ جانے کتنی بار مجھے دلاسہ دینے آتے ہیں۔ نرسوں سے زیادہ خود میرا خیال رکھتے ہیں۔ کھانے کا، پینے کا، دوا کا۔

"میرا مطلب یہ تھا، تم ٹھیک تو ہو؟" ڈاکٹر صاحب کی آواز نے پھر اُس کے خیالوں کی کڑیوں کو توڑ دیا۔

"ہاں ڈاکٹر صاحب! میں بالکل ٹھیک ہوں!" وہ مُسکراتے ہوئے بولی۔ "آپ کتنا خیال رکھتے ہیں میرا!"

"نہیں شمع! فرض کی ادائیگی کبھی احسان نہیں ہُوا کرتی ہے۔ یہ تو میرا فرض ہے۔" ڈاکٹر صاحب کے الفاظ کی عظمتوں کے بوجھ تلے اُس کے دل میں بسا ہر خوف دب کر رہ گیا۔

"اگر آپ کو جلدی نہ ہو تو بیٹھ جائیے ڈاکٹر صاحب۔" اُس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "میرا دل چاہتا ہے آپ کو ایک ایک بات بتا دوں تاکہ آپ بھی سمجھ جائیں کہ ان اندھیروں میں میری کتنی دھڑکنیں گھٹ گھٹ کر دم توڑ رہی تھیں۔"

"کل تمھاری پٹیاں کھل جائیں گی شمع۔ یہ دُنیا پھر تمھاری ہوگی، خواہشوں کی تکمیل کر لینا۔"

"ہاں ڈاکٹر صاحب! بس ایک بار روشنی آجائے میری آنکھوں میں۔ میں انھیں ڈھونڈ لوں گی جن کے انتظار میں میں پندرہ برس سے تڑپ رہی ہوں۔"

"کیسے ڈھونڈو گی؟" ڈاکٹر نے بہت اشتیاق سے پوچھا۔

"انھیں کو جن کی باتیں سوچتے سوچتے مجھے ہنسی آگئی تھی۔" اور وہ پھر ہنس پڑی۔

"تم بتاؤ تو شمع۔ میں بھی کوشش کروں گا تمھیں تمناؤں کی منزل تک پہنچانے کی۔"

وہ پھر ماضی کی طرف لوٹ گئی۔ اُن دنوں میں، جب پہلی بار اُس کے دل میں کسی کے لئے ہلکی ہلکی سی چبھن ہوئی تھی۔ وہ یادوں کی دُنیا میں کھو کر بولی "اُن سے میری پہلی ملاقات اپنی سہیلی فرحت کی سالگرہ کی تقریب میں ہوئی تھی۔ اُن کا اندازِ گفتگو اتنا پیارا تھا کہ ہم بہت جلد بے تکلف ہو گئے بالکل اِس طرح جیسے بہت پُرانی ملاقات رہی ہو۔ تعارف کے بعد وہ فرحت سے کہنے لگے "فرحت! تمھاری شمع تو بالکل ایسی ہیں جیسے ــــ شاہکار ہو کسی مُصوّر کا، اچھوتا اور انوکھا سا!"

"لو شمع تمھیں ایک پروانہ مِل گیا!" ذکیہ نے دھیرے سے چُٹکی لے کر کہا تو میں ایکدم شرما گئی اور وہ بھی گھبرا سے گئے۔

"مُصوّر کا شاہکار۔ اچھوتا۔ انوکھا۔" میرے کانوں میں دیر تک اُن کا جُملہ گونجتا رہا۔ اپنے کمرے میں جاکر میں گھنٹوں خود کو آئینے میں گھورتی رہی، کبھی شرماتی، کبھی لجاتی۔ غیر شعوری طور پر میرے قلم نے کاغذ پر سینکڑوں ہزاروں بار "پروانہ"، "شاہکار"، "سلیم" لکھا۔ مجھے کئی بار اپنی دیوانگی پر ہنسی آئی لیکن ــــ محبت تو خود دیوانی ہوتی ہے۔ کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی کہاں دیتی ہے۔ میں جس قدر دُور بھاگی اُن کا تصوّر اتنی ہی شدّت سے میرے خیالوں کو جکڑتا رہا اور میں بہتی چلی گئی جذبات کے طوفانوں میں!

پھر کئی بار فرحت کے گھر ملاقات ہوئی۔ وہ جتنی دیر تک باتیں کیا کرتے میں کھوئی کھوئی سی اُن کے چہرے کو تکا کرتی۔ جب وہ میری طرف دیکھتے میری سانس پھول جاتی۔ میں شرما کر آنکھیں جھکا لیتی۔ انھیں جاتے ہوئے دیکھ کر کچھ عجیب سا محسوس ہوتا لیکن میں کبھی کچھ نہ کہہ پاتی۔ ساوہ جتنے مہینے

[illegible] گیا ... [illegible] ---- نکلے

[illegible] گیا۔

ایک دن وہ کسی بہت جلدی میں تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی واپس جانے لگے۔ میں نے پوچھا "سلیم آج کیا تھوڑی دیر بھی باتیں نہ کر سکو گے؟" میری باتیں [illegible] سوالیہ نشان بن گئی۔ وہ حیران سے ہو گئے۔ تھوڑی دیر میری آنکھوں میں دیکھتے رہے پھر بولے: "شمو! اگر سچ بتاؤں تو بات یہ ہے کہ میں آج ہی رات کی گاڑی سے نینی تال جا رہا ہوں۔" میں ان سے پوچھنا چاہتی تھی لیکن الفاظ میرے گلے میں پھنس کر رہ گئے۔ وہ شاید میرا ان کہا ہوا سوال سمجھ گئے۔ "اب شاید امتحان کے وقت بھی نہ آسکوں گا۔" [illegible] میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ میرا جی چاہا اُن کا ہاتھ پکڑ کر روک لوں۔ [illegible] کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دوں۔ بتادوں انھیں کہ کس طرح راتوں کی تنہائیوں میں تمہارے خیالوں میں جلا کرتی ہوں۔

"شمو! تم جو نہیں کہہ پا رہی ہو میں سمجھ رہا ہوں۔"

"اگر ہو سکے تو شام کو ملنے آجایئے۔ میں انتظار کروں گی۔" میں نے بہت مشکل سے کہا۔ پھر وہ چلے گئے۔

میں گھنٹوں پہلے سے گیٹ پر اُن کا انتظار کرنے لگی۔ دور جب کوئی آتا ہوا نظر آتا تو میں آنکھیں بند کر لیتی۔ تصور کرتی کہ وہ اب اتنے قریب آگئے ہیں، اتنے قریب آگئے! بہت وقت گزر گیا انتظار کرتے کرتے۔ میں گیٹ کے پیچھے سے جھانکنے والی لڑکیاں ایک ایک کر کے باہر نکلتی رہیں۔ کوئی پیڑ کے نیچے کھڑی ہو کر باتوں میں مشغول ہو گئی۔ کوئی دیوار کا سہارا لے کر محو گفتگو ہو گئی۔ کوئی ہنس ہنس کر باتیں کرتی کرتی چہل قدمی کرنے لگی۔ لیکن میں ---- ادھورے انتظار کی تپش میں سلگتی رہی۔ دن ڈھل گیا۔ "بائی بائی" "خدا حافظ" "گڈ بائی" ---- سبھی لڑکیاں واپس اپنے اپنے کمروں کو چلی گئیں۔ ساری راہیں اداس اور ویران ہو گئیں۔ انھیں نہ آنا تھا نہ آئے۔ میں ساری رات روتی رہی۔ مجھے ایک پل نیند نہ آئی۔ میرے تصورات کی آنکھیں دراصل ---- گیٹ کی جھریوں سے تمام رات جھانکتی رہیں۔ میرے خیالات ان کا پیچھا کرتے رہے۔ میدان سے پہاڑوں کی بلندیوں تک میں انھیں پہنچاتی اور لوٹ آتی۔ اگلی صبح میں دیر تک تکیے میں منہ چھپائے پڑی رہی۔ نہ ناشتہ کیا، نہ کھانا کھایا۔ میری روم میٹ پوچھتی رہی کہ شمع کیا بات ہے؟ لیکن میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ شام کی ڈاک سے مجھے اُن کا لفافہ ملا۔ لکھا تھا ---- "شمو! میں تمہاری دلی کیفیت کو تمہاری بھیگی ہوئی آنکھوں سے سمجھ گیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ادھورا انتظار تمہاری نیند چھین لے گا۔ تم بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہو گی۔ میں نہ آیا۔ اگر سچ مچ تم مجھ سے پیار کرتی ہو تو شمع کی طرح خاموشی سے جل کر دیکھو۔ شمع ہو کر محبت میں جو ہلکا ہلکا نشہ آتا ہے اُس میں زیادہ سرور ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ اگر قریب رہ کر اس جنون اور دیوانگی میں بدل دیا جائے۔ تم اس جذبے کی شدت اور تقدس کی معراج پالو ---- یہی سوچ کر میں نے دوریاں برقرار رکھی ہیں۔" خط کے ساتھ انھوں نے اپنی تصویر بھی بھیجی تھی۔

اُن کی تصویر، اُن کا خط ---- میری زندگی کا محور بن گئے۔ پڑھنا لکھنا سب چھوٹ گیا۔ امتحان آیا اور گیا۔ میں چھٹیوں میں گھر واپس چلی گئی۔ ہم لوگ ہر سال گرمیاں گزارنے کے لئے شملہ جایا کرتے تھے لیکن میں نے ضد کر کے نینی تال کا پروگرام بنوا لیا۔ ممی، پاپا اور میں ---- ہم لوگ نینی تال چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر میں سلیم کو ڈھونڈنے لگی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا کرتی۔ ایک دن ---- میں یونہی بلا مقصد گھوم رہی تھی کہ وہ مجھے جھیل کے کنارے مل گئے۔

"کہاں ہو تم؟ میں کب سے تمھیں ڈھونڈ رہی ہوں!" میں نے خوشی سے دوڑ کر اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے۔ وہ بھی بے حد خوش ہوئے اور وہ ---- میرا ہاتھ تھامے تھامے دُور پہاڑیوں کے اُس پار لے گئے۔ وہ قدرت کے حسین مناظر کو کہانی کی طرح مجھے سمجھانے لگے: "دیکھو شمو! وہ پہاڑیاں ہیں نا؟" انھوں نے اشارہ کر کے مجھے دکھایا۔ "سردیوں میں بالکل ڈھک جاتی ہیں برف سے۔ رات کو جب کہیں کہیں مکانوں میں روشنی نظر آتی ہے تو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آسمان میں کہیں کہیں ستارے ٹمٹما رہے ہوں۔" وہ جدھر اشارہ کرتے میں دیکھنے لگ جاتی۔ وہ جو کچھ کہتے سنتی رہتی۔ جب گھومتے گھومتے میں تھک گئی تو ایک چشمے کے قریب لے جا کر بٹھا دیا انھوں نے مجھے۔ انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں بھر بھر کر مجھے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پلایا۔ وہ پلاتے رہے، میں پیتی رہی۔ جب وہ تھک گئے تو کہنے لگے: "کتنا پیو گی؟"

"بہت میٹھا ہے یہ پانی سلیم۔ جی چاہتا ہے پیتی ہی رہوں۔"

"ہٹ پگلی! یہ تو کھاری ہے!" انھوں نے ہنس کر اپنے گیلے ہاتھ میرے چہرے سے لگا دئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اُبلتے ہوئے جوالا مکھی پہاڑ پر ایکدم برف کی تہیں جم گئی ہوں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اُن کے ہاتھ پکڑ لئے۔ خاموشی سے بہنے والے چشمے گنگنا اُٹھے۔ پانی کے بہاؤ میں کسی شوخ چنچل حسینہ کے پیروں میں کھنکتے گھنگھروؤں کی سی جھنکار پیدا ہو گئی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اُن کے کاندھے پر سر ٹکا دیا اور پھر دل کی دھڑکنوں میں سارے شور دب کر رہ گئے۔ اُنھوں نے مجھ سے کچھ پوچھا۔ میں نے بس یونہی "ہوں" کہہ دیا۔

"اے شمو! کیا سو رہی ہو؟" انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر پوچھا تو میں زور سے ہنس پڑی۔

ہم اسی طرح روز ملا کرتے۔ گھنٹوں بیت جاتے باتیں کرتے کرتے۔ ایک

# ماتاجی

## بلونت گارگی ایم۔ اے

ہیڈ ڈیپارٹمنٹ آف انڈین تھیٹر، پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ نمبر ۱۴

جناب خوشتر صاحب!

ماتاجی اور چم چم بھیج رہا ہوں۔ مدت ہوئی آپ سے ملاقات ہوئے۔ امریکہ میں تین سال رہا لیکن دِلّی کی اپنی محفلیں یاد آتی رہیں۔ کناٹ پلیس، کافی ہاؤس اور دِلّی کی گلیاں! پہلے مجھے غالب کا یہ مصرع پسند تھا۔ "ہم نے مانا کہ رہیں دِلّی میں پر کھائیں گے کیا؟" لیکن جب کھانے کو ملا تو ذوق کے مصرع کی حقیقت کا بھید کھلا "کون جائے ذوق پر دِلّی کی گلیاں چھوڑ کر!" دِلّی سے اُردو کی یاد وابستہ ہے...

نیاز مند ——— بلونت گارگی

ماتاجی گیروی دھوتی کی لانگ پہنے، پنجوں کے بل بیٹھی گانجا مَل رہی تھی۔ جسم بھری ہوئی مشک جیسا ——— چکنی آبنوسی چام، چہرہ پر عمر کا تجربہ، ماتھے پر کُنتا ہوا قشقہ اور سر پہ جٹاؤں کا دو برجا۔

اُس نے شوشنکر کی صدا لگائی اور مجھے آشیرواد دی۔

اُس کے گرد پانچ نوجوان چیلے اور ایک چیلی بیٹھی تھی۔ یہ سارے امریکن ہپی تھے جو آتما کی شانتی کی تلاش میں دُنیا کھنگال کر بنارس آگئے تھے۔ یہاں انھوں نے گنگا کے گھاٹ پر ایک چھوٹی سی ہاؤس میں ماتاجی کی شرن لے رکھی تھی۔ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

ماتاجی نے لمبی چلم اُٹھائی اور اُس میں ٹھونک ٹھونک کر گانجا بھر گیلی جھالی کو بہت اہتمام سے چلم کے گرد لپیٹا اور دونوں ہاتھوں میں تھام کر اُسے جلایا۔ پھر چلم کو ماتھے سے لگا کر کراری آواز میں گرجی ———

"بم بم بم بم!!
الکھ نرنجن!
مسان کا دیوتا
شنکر کے سنگی؟"

اُس کی امریکن چیلی، جو جامنی دھوتی پہنے ہوئے تھی، ایکدم اُٹھی۔ اخبار کا ورق پھاڑ کر اُس نے بتی بنائی اور دیئے کی لو پر رکھ کر اُسے روشن کیا۔ ماتاجی نے چلم منہ سے لگائی اور چیلی نے اُسے آگ دی۔

ماتاجی نے کش لگا کر دھوئیں کی تیز تیز پانچ چھ بھبکیاں چھوڑیں۔ پھر سانس روک اور آنکھیں مُوند کر لمبا دم لگایا۔ جس سے گردن کی رگیں تن گئیں۔ جب اُس نے چلم منہ سے ہٹا کر چیلی کی طرف بڑھائی تو اُس کی آنکھوں میں سُرخ مہتابیاں جل رہی تھیں۔

چیلی نے سر جھکا کر چلم پکڑی اور ماتھے سے لگائی۔ ماتاجی نے 'الکھ نرنجن' کا نعرہ لگایا۔ چیلی نے تمرد میں آ کر کش کھینچا اور اُسی عقیدت سے چلم اپنے ساتھی کو تھمائی۔ ہر ہپی نے اِس ریت کا پالن کیا۔

سب کے بعد میری باری آئی۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر معافی چاہی۔ ماتاجی نے مجھ پر غصہ بھری نظر پھینکی اور اُس کے چہرہ پر آبنوسی مُسکراہٹ پھیل گئی۔ چلم اُلٹنے سے پہلے اُس نے دوہرا کش لگایا اور نیم غنودگی کے عالم میں تیز چمک دار پُتلیوں سے مجھے گھورا۔ اِس پُراسرار نظر میں یہ اشارہ تھا کہ وہ میرا قرض نبھا رہی ہے۔

گانجا پی کر ماتاجی بے سُدھ ہوگئی لیکن اُس کے چیلے مسرور ہو کر نیم بیٹھے آسنوں میں بیٹھے تھے۔ اُن پر وجد طاری تھا۔

[illegible] بہت سے سامان کی پوٹلیاں تھیں۔ اُن کے ننگے شانوں پر
[illegible] تھیں۔ دفعتاً [illegible] پولیس والوں کو دیکھا [illegible]
[illegible]
[illegible] گا" وہ گرجتی ہوئی نیچے اتری۔

[illegible] پولیس افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا۔

ماتاجی اُسی طرح بپھری ہوئی پولیس افسر کی طرف بڑھی اور اُس کے عین سامنے اکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کا چہرہ تپے ہوئے لوہے کی مانند نظر آ رہا تھا۔

"بکرم وسنت [illegible] آ گیا!"

سپاہی، ہپّی اور میں خاموش کھڑے ماتاجی اور پولیس افسر کو دیکھنے لگے۔

[illegible] سے وسنت [illegible] کی اور فلسفوں کی، دو قسم [illegible] کی۔

دونوں کی آنکھیں ملیں، کچھ شعلے بھڑکے اور جیسے فضا میں گم ہو گئے۔ ماتاجی کے ماتھے پر تشویش اُبھر آیا اور آنکھوں میں جوالا دہکنے لگی۔

پولیس افسر کی گھورتی ہوئی نظریں آہستہ آہستہ پھیکی پڑنے لگیں۔ وہ ماتاجی کے چہرے کو تک رہا تھا جیسے کوئی تیز رو ڈوبتے ہوئے سورج کو تک رہا ہو۔

اُس نے قدم پیچھے ہٹاتے، پستول پیٹی میں ڈال لیا اور سپاہیوں سے کہا۔

"اِن سب کو چھوڑ دو!"

پولیس افسر نظریں جھکائے ڈھلان پر چڑھنے لگا۔ سپاہی ہپّیوں کا سامان اُسی طرح چھوڑ کر اُس کے پیچھے چل دیئے۔

سارے ہپّی ماتاجی کے جلال اور روحانی طاقت سے متاثر تھے۔ میں خود بھی حیران تھا۔

ماتاجی نے مجھے اور چیلوں کو بٹھا کر بھوجن کھلایا۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ گنگا کے پانی میں اندھیرا گھلنے لگا تھا۔ میں نے رخصت چاہی۔ ماتاجی بولی: "آج اماوس ہے۔ پوجا ہوگی۔ تو بھی یہیں ٹھہر۔"

ماتاجی نے کورے دیئے گنگا کے پانی میں بھگو کر نکالے اور ان میں ناریل کا تیل بھرا۔ بتیاں بٹ کر دیوں کو شیوجی کی مورتی کے سامنے رکھا۔ وہ باہر گئی اور تھوڑی دیر بعد جب نہا کر لوٹی تو لال کناری والی کوری دھوتی پہنے ہوئے تھی۔ اُس کے لمبے بال گھٹنوں سے نیچے گر رہے تھے۔

اُس نے دیئے روشن کئے اور "بم بم بم بم" کا نعرہ لگایا۔ سارے ہپّیوں نے ایک ساتھ الکھ نرنجن کہا۔

ماتاجی بولی: "تم پوجا کرو۔ میں مسان کے دیوتا کو نمسکار کرکے جلد ہی لوٹوں گی۔" وہ اُٹھی اور اپنے چیلوں کو آشیرواد دے کر اندھیرے میں نکل گئی۔

ہپّیوں نے پوجا شروع کی۔ ناریل کا تیل جلنے اور شعلے کے تھرتھرانے سے دھوئیں سے کمرے میں غنودگی طاری تھی۔

ہم آدھی رات تک انتظار کرتے رہے لیکن ماتاجی نہ لوٹی۔ سب حیران تھے۔

اتنے میں کشتی کے تختے پر کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ اگلے لمحے ایک آدمی چھوٹے دروازے کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ ہمیں اُس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ صرف ململ کا سفید کرتا اور دھوتی نظر آ رہی تھی۔ وہ جھکا اور اندر داخل ہوا۔ بارعب چہرہ، بل کھاتی ہوئی کالی مونچھیں اور چھوٹے چھوٹے خمدار بال۔

اتنی رات گئے کون آ گیا؟ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

دھرم داس نے پوچھا: "آپ ماتاجی سے ملنے آئے ہیں؟"

"ہاں معاف کرنا میں نے آپ کو اس وقت تکلیف دی۔ وہ کہاں ہے؟"

دھرم داس نے اس کی طرف گھور کر دیکھا: "میں نے شاید آپ کو کہیں دیکھا ہے؟"

اجنبی مسکرایا۔ اس کی بل کھاتی ہوئی سیاہ مونچھوں میں سے مضبوط دانت چمکے۔ اُس نے کہا: "دن کے وقت میں کسی اور روپ میں تھا۔ اُس وقت میں ٹھاکر منگل سنگھ سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا، لیکن اب صرف منگل سنگھ ہوں!"

یہ سن کر میری اور دھرم داس کی نگاہیں ملیں۔

دھرم داس نے منگل سنگھ کو بٹھایا اور پُرسکون لہجے میں کہا: "ماتاجی آدھ گھنٹے سے گئی ہوئی ہے۔ کہہ گئی تھی کہ مسان کے دیوتا کو نمسکار کرکے جلدی لوٹوں گی۔"

منگل سنگھ ایک لمحے کے لئے رکا اور اُس کے بارعب چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں رینگیں۔ کچھ دیر ساکت بیٹھا گھورتا رہا اور پھر بولا: "اب وہ کبھی نہ آئے گی۔"

اتنا کہہ کر وہ بجھتے ہوئے دیوں کی طرف دیکھنے لگا!!

---

ایم اے

ہر گھڑی میں چراغ تھا پہلے
سینہ پر سے دل کا داغ تھا پہلے

بتا رہی ہے یہ دیوار پر لگی کالونچ
یہ وہ جگہ ہے جہاں اک چراغ تھا پہلے!

سنبھل کے رکھیے قدم اس زمینِ چمن پر
یہیں بھی ویرانہ باغ تھا پہلے!

شکستہ دل سے ہے وابستہ یادِ میخانہ
شکستہ ہو کے جو دل ہے ایاغ تھا پہلے

شکیل صورتِ دل ہے کرشمۂ تخلیق
ہر ایک ذرۂ ہستی دماغ تھا پہلے

نعیم مظفر نگری

کس سے ٹکرا گئیں نظریں مری انجانے میں
دل کہیں شہر میں لگتا ہے نہ ویرانے میں

نامۂ شوق مرا پڑھ کے ہوئے وہ خاموش
نظر آئی جو حقیقت اُنہیں افسانے میں

ڈال دی وقت نے ہر شخص کے چہرے پہ نقاب
اب کوئی فرق ہے اپنے میں نہ بیگانے میں

خانۂ دل میں تری یاد کا یہ عالم ہے
جیسے مہماں ہو مسرت کسی غم خانے میں

لب کشائی میں رہو تم نہایت محتاط
دیر لگتی نہیں کچھ بات بگڑ جانے میں

ارشد صدیقی ایم اے

شعاعِ مہر کا تنکا بھی بہت غنیمت ہے
شبِ الم یہ چمک بھی بہت غنیمت ہے

کسی کے عکسِ بدن سے نکھر رہی ہے سحر
یہ چاندنی، یہ دمک بھی بہت غنیمت ہے

اگر گلوں میں تمنا کی برق لہرا دے
تو زخمِ دل کی کسک بھی بہت غنیمت ہے

خلوصِ مہر و وفا کا یہ دلنشیں معیار
ہمارے دور تلک بھی بہت غنیمت ہے

سکوتِ شب کو اگر توڑ دے ترانۂ آہ
کلی کی ایک چٹک بھی بہت غنیمت ہے

عادت نظیر ایم اے

ہے سرگزشت وہی آج بھی زمانے کی
بدل گئی ہیں فقط سرخیاں فسانے کی

تری ذرا سی توجہ اگر ہو شاملِ حال
تو بے رخی ہے گوارا مجھے زمانے کی

وہ رازِ گلشنِ ہستی سمجھ بیٹھے ہیں
جنہیں خبر نہیں خود اپنے آشیانے کی

اداس کر گئی مجھے میری زندگی، یارب
روایتیں نہ بدل دے اگر زمانے کی

جب اپنے حال پہ ہم ہنس رہے ہیں خود ہی نظیر
تو کیوں ہے غیر پہ تہمت ہنسی اڑانے کی

# سوچتی ہوئی آگ

ایم۔ الیف۔ پرویز، ایم۔ اے

محترم بھائی جان! تسلیم

آپ نے یاد فرمایا یہ مسرت کی بات ہے۔ یہ ایک افسانوی کہانی "سوچتی ہوئی آگ" حاضر ہے۔ آپ کا نامہ محبت پایا اور ادھوری سے کہانی شروع کر دی۔ ویسے یہ تین شہروں میں بیٹھ کر مکمل ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں ادب میں تجربے ہونے چاہئیں۔ تکنیک کی طرف دھیان دیتے دیتے کہانی قدرے طویل ہو گئی ہے۔ لیکن سوچتا ہوں افسانہ نمبر میں ایک آدھ کہانی طویل ہی سہی۔ امید ہے پسند آئے گی۔ جلد ہی مختصر کہانی بھی ارسال کر دوں گا۔ پہلے آپ اس کہانی کی داد [illegible]

آپ کا ـــــ ایم۔ الیف۔ پرویز

جیسے دھیمی ہوا تیری زلفوں سے کلیاں اُڑاتی ہوئی ....

رات کسی شرمیلی گیسو کی مانند دھیرے دھیرے بھیگ رہی تھی، اور چیڑ کے جنگلوں میں گھنا اندھیرا تھا، مختلف قسم کے درختوں کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں بسی ہوئی تھی۔ سریکا میرے کندھے سے کندھا لگائے گردن جھکائے مٹی میں لکیریں بنا رہی تھی اور مجھ سے دھیرے دھیرے باتیں کر رہی تھی۔ اس کی آواز میں پریشانی گھلی ہوئی تھی۔ لیکن میں بظاہر مطمئن بیٹھا ستاروں کی جھلملاتی چادر میں اس ایک ستارے کو تلاش کر رہا تھا جس نے ابھی چمکنا بھی نہیں سیکھا تھا۔

"آپ اس کے ساتھ یہاں آئے تھے؟" سریکا اچانک پوچھ بیٹھی۔

"ہاں آیا تھا۔"

"آپ اسی جگہ بیٹھے تھے؟"

"ہاں، اسی پیڑ کے نیچے!"

وہ خاموش ہو گئی۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا آیا۔ میں ٹھٹھرنے لگا اور سریکا کے قریب سرک آیا۔ بے حد قریب۔ مجھے ایسا محسوس ہوا وہ اندر ہی اندر جیسے کچھ سوچ رہی ہے۔ ہر عورت کی طرح، اس موقع پر وہ رشک اور شک کی وادیوں میں بھٹک رہی ہے۔

"اب ہمیں چلنا چاہیے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا اور پھر ستاروں کی مدھم روشنی میں میں نے دیکھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں آنسو کے قطرے مچل رہے تھے۔

میں سمجھ نہ سکا دھیرے دھیرے آنسو اس کے رخسار پر کیوں ڈھلک آئے۔ ان آنسوؤں کا کیا مطلب تھا۔ شاید وہ مجھے مغموم دیکھ کر رو رہی تھی۔ شاید وہ میری بے بسی پر تڑپ رہی تھی۔ یا شاید پھر وہ اپنی ہی [illegible] میں اس سے پیار کر سکا۔ [illegible] اپنے دل میں [illegible] سکتا، اپنے وجود میں [illegible] محسوس کر سکتا، جیسے [illegible] محسوس کرتا ہوں۔

---

"تتلیاں خواب ہیں، اور پھول کھوئے ہوئے لمحے!"

ساری رات تیز ہوائیں چلتی رہیں۔ کبھی رک رک کر چیختی ہوئی ساحلوں کی طرح، کبھی مسلسل بہتے ہوئے دھارے کی طرح، اور سریکا چپ چاپ بستر پر لیٹی میری بے چینیاں اور اضطراب دیکھتی اور محسوس کرتی رہی۔ میں نہ جاگ رہا تھا نہ سو سکتا تھا۔ درد ناک کرب، مچلتی ہوئی شاموں کی طرح ذہن پہ منڈلا رہا تھا۔ ذہن کو جھنجھوڑ رہا تھا اور سریکا [illegible] نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی، اس کی بڑی بڑی نیلی آنکھیں موہوم شکووں سے پُر تھیں۔

[illegible] ہیں۔ پھر [illegible] دیکھ [illegible] سے میرے جسم
[illegible] اسکا دیکھا جا سکتا [illegible] لیکن
[illegible] رعب اور [illegible] کرنے کی کوشش
میں پسینہ پسینہ ہو جاتی ہے۔

پھر چاہت آگئی۔ جب بھی چاہت کی پیالی میرے سامنے آتی ہے مجھے ارچنا [illegible] یاد آتی ہیں اور اُس کی انگلیاں یاد آتی ہیں۔ میرا ہاتھ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے جیسے انگلی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، سریکا کی انگلیاں ارچنا جیسی نہیں ہیں۔ سریکا ارچنا کیوں نہیں ہے، ارچنا سریکا کیوں نہیں تھی میں سوچتا ہوں۔ میری آنکھوں میں اُداسی کے حلقے چھانے لگے ہیں عجیب سی گھٹن محسوس کرنے لگتا ہوں۔ میں سریکا کا ہاتھ تھام کے اپنی آنکھوں سے لگاتا ہوں اور پیار سے چوم لیتا ہوں۔ میں نہیں جانتا میں ایسا کیوں کرتا ہوں پھر میری نظر سریکا کے بازو پر پڑتی ہے "اُف! یہ تم نے کہاں سے جلایا؟" میں کچھ پریشان ہو کر پوچھتا ہوں۔ وہ گھبرا جاتی ہے۔

"میں نے خود ہی جلایا ہے" وہ جواب دیتی ہے۔

"واقعی بہت بڑی غلطی کر دی ہے" میں کہتا ہوں اور سریکا کی کسیلی چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہوں اور ایک اونچے پتھر پر جا کے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے قدم پتھر پہ چپک کر رہ گئے ہوں اور مجھے مجسمے کی طرح اس پتھر پر نصب کر دیا گیا ہو۔ میری آنکھیں متحرک ہیں۔ میں اپنے ہاتھوں کو ہلاتا ہوں۔ لیکن میرے پیر جم گئے ہیں۔ ان میں بڑی بڑی میخیں لگا دی گئی ہیں۔ سامنے [illegible] رنگ رنگ کے پھول کھلے ہیں۔ نیلے نیلے بیل اور جامنی [illegible] ہزاروں لاکھوں پھول۔ چاندنی راتوں میں یہ پھول جب چپ چاپ جاگ رہے ہوں گے اور ہوا انہیں چھیڑتی ہوگی، اور بھینی بھینی مہک فضا میں عطر گھولتی ہوگی تب چاروں طرف سکون اور شانتی کی دبیز چادر سی تن جاتی ہوگی۔ لیکن زندگی کے باغ میں ایسے کتنے پھول ہیں جو کھلتے بھی نہیں کہ مرجھا جاتے ہیں —— یکایک مجھے اپنی گردن پہ درد سا محسوس ہوتا ہے۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں —— ایک تنگ و تاریک گلی کے نکڑ پہ سردی سے ٹھٹھرا دینے والی ہوا میں ایک عورت سو رہی ہے۔ اُس کے پہلو میں ایک چھوٹا بچہ میلے چیتھڑوں میں لپٹا پڑا ہے۔ اُس کے پاس ہی ایک آدمی لیٹا ہے۔ وہ اُس کا شوہر ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی بغلیں کھجا رہا ہے۔ اُس کی انگلیوں کی رفتار اُس کی [illegible] کے ساتھ بدل رہی ہے۔ سردی سے وہ بھی ٹھٹھر رہا ہے اور اُس کی [illegible] سے اپنا جسم ڈھانکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ عورت سردی میں اکڑ رہی ہے۔ وہ سمٹ کے بیٹھ جاتی ہے اور اپنے گھٹنوں میں سر چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔ اُس کی پیٹھ ننگی ہے کیونکہ وہ سڑک پہ کام کرتی ہے اور بوجھ ڈھوتی ہے۔ گلی کے دوسرے نکڑ پر ایک چھوٹا سا نیم تاریک گھر ہے۔ وہاں ادھ مری روشنی میں دو تین آدمی ایک تخت پہ بیٹھے ہیں۔ ایک عورت گاؤں میں پہنے جانے والی چھوٹی چھوٹی ساری میں اداس بیٹھی ہے۔ اُس کے چہرے پر تھکن کا سیلاب ہے۔

میں نے پتھر سے پاؤں الگ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں اپنی ہمت ہار رہا تھا دفعتاً میری چیخ نکل گئی۔ میرے دائیں جانب بہت گہری کھڈ تھی اور اگر میں ذرا بھی گر جاتا تو شاید سیدھا کھڈ میں پہنچ جاتا۔

ارچنا —— !

سریکا —— !

امّی جان —— ! میں اپنی پوری قوت سے چیخنے کی کوشش کرتا ہوں اور سریکا گلاب کی دو ڈالیاں لئے خراماں خراماں میری طرف آتی ہے۔ وہ آج بہت خوش ہے جیسے شادی کی شام دُلہن کی سکھیاں خوش ہوتی ہیں۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیتی ہے۔ جلد میں پتھر سے کود پڑتا ہوں اور پتھر کو اپنی پوری قوت سے وادی میں دھکیل دیتا ہوں۔ ایک زوردار دھماکا ہوتا ہے اور سریکا مجھے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

سریکا اُسی گاؤں کی لڑکی ہے جہاں میری ماں نے جنم لیا تھا۔ سریکا اُسی آنگن میں کہیں کر بڑی ہوئی جہاں میری ماں اپنے بچپن میں گاؤں کے بچوں میں کھیلا کرتی تھی۔ ماں جب چھوٹی تھی تب اُس گاؤں میں صرف ایک اسکول تھا اور گاؤں میں ایک ہی ماسٹر صاحب تھے اور جب وہ چھوٹی تھیں اور اسکول گئی تھیں، تب ایک دن ماسٹر صاحب نے پہاڑے یاد نہ کرنے پر ڈانٹ پلائی تھی۔ ماں گھر آکر خوب روئی تھی اور اپنے ابا سے کہا تھا کہ موئے ماسٹر کی خوب مرمت کر دیں۔ لیکن اب گاؤں بہت پھیل گیا ہے۔ جگہ جگہ اسکول ہیں اور محلے محلے ماسٹر رہتے ہیں اور چیتھڑے پتلون اور اونچا بش شرٹ پہن کر گاؤں کے بازاروں میں گھومتے ہیں۔ اُس سڑک پر جہاں صرف بھینسیں چرا کرتی تھیں، رات دن بڑے بڑے ٹرک ٹروں ٹروں کرتے گزرتے رہتے ہیں اور سریکا اُسی گاؤں کی بھلی ہوئی لڑکی تھی۔ اُس نے کالج میں دو سال گزارے۔ لیکن بالکل سیدھی سادی، نیک اور معصوم تھی۔ جس پہ ایک نظر ڈالنے سے پہلے بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے۔ لیکن امی کو تو ایک بار دیکھتے ہی بھا گئی تھی۔ جیسے کسی فوٹوگرافر کو یکایک راہ چلتے کوئی من پسند منظر نظر آ جائے اور وہ کھٹ سے تصویر کھینچ لے اور امی نے بھی یہ تصویر کھینچ لی تھی۔

اور میں سوچ رہا تھا لڑکی کی پسند کی داد دینی پڑی۔ اچھی پسند لا رہی تھی۔
ارچنا مجھے تو کل ٹرین میں ملی تھی۔ اُس کی دلفریب مسکراہٹ ہر نگاہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ میں نے بھی اُسے دیکھا اور محسوس کیا جیسے بھرے ٹرین کے ڈبے میں صرف وہ لڑکی مجھے بہت پیاری نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ وہ دیر تک دیکھتی رہی۔ حیرت کہ لڑکیاں اتنی دیر تک پرائے مردوں کو دیکھتی ہیں۔ میں بھولا اور سوچا اُس کی آنکھوں میں کھو گیا۔ ٹرین رُک گئی۔ لوگ اُترنے لگے۔ وہ اُسی طرح ایک گوشے میں بیٹھی رہی، میں اُسی طرح زنجیر تھامے کھڑا رہا۔ کچھ دیر خاموشی رہی، پھر انجن زور سے چیخا اور ساتھ والی پٹری سے دندناتی ہوئی ایکسپریس ٹرین گذر گئی۔ پھر وہ اُٹھی اور آہستہ آہستہ اپنی نیلی ساری سنبھالتی ہوئی اُتر پڑی۔ میں بھی اُتر پڑا اور اُس دن سے ہر روز ہم اُسی ڈبے میں پائے جانے لگے ——— اور پھر محبت کی آگ نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آگ جلتی رہی، ہم سُلگتے رہے اور پھر ہماری شادی ہو گئی۔

---

کچھ سوچ رہے ہیں یہ سُلگتے ہوئے شعلے!
سریکا نفرہ وادی میں کچھ کھوج رہی تھی۔
"کیا دیکھ رہی ہو؟"
"وہ چھوٹی سی مٹیالی پگڈنڈی جس پر گھاٹی عورتوں کی ایک ٹولی سر پر لکڑیوں کا بوجھ لئے چلی جا رہی ہے۔"
"پھر وہ دوسری طرف دیکھ کر سوچنے لگی۔
"کیا سوچ رہی ہو؟"
"چمپا کی اُس ٹہنی کو دیکھ رہی ہوں، سب چڑیاں لپک لپک کر اُسی پہ گیت گا رہی ہیں، حالانکہ بہت سی شاخیں ہیں، بہت سی ٹہنیاں ہیں، وہی ٹہنی کیوں؟"
پھر ہم دونوں ایک پگڈنڈی کو دیکھنے لگے۔ ایک لڑکی اکیلی اُس پگڈنڈی پر چلی جا رہی تھی۔ اُس کے ساتھ اُس کی ماں تھی۔ لیکن ماں تھک کر بیٹھ گئی تھی۔ اب لڑکی اکیلی چلی جا رہی تھی۔ اُس کے سر پر بھاری بوجھ تھا۔ وہ غریبی کا بوجھ تھا۔ وہ اونچ نیچ کا بوجھ تھا۔ وہ انسانی نفرت کا بوجھ تھا، ہزاروں انسانوں کی نفرت کا بوجھ وہ اکیلی اُٹھائے لئے جا رہی تھی۔ کیوں کہ وہ بھوکی تھی اور بھوک ہر بوجھ اُٹھا لیتی ہے۔ ہر ظلم سہہ لیتی ہے۔
سریکا پھر مجھ سے دُور جا کر کھڑی ہو گئی۔ شاید وہ میرے ہوتے ہوئے بھی تنہائی محسوس کر رہی ہے۔

وہ اکیلی بہاروں میں تنہائی کی آگ میں سُلگ رہی ہے [illegible] ہونا چاہیئے۔ ارچنا بہت تنہا ہو گئی ہے۔ لیکن [illegible] ہوتا۔ وہ اچھی لڑکی تھی۔ اُس نے مجھے [illegible] آنکھ کے سامنے سے دُور کر دیا تھا۔ وہ خود لڑکی تھی [illegible] اب بھی مجھے پکار رہی ہے۔ میں اُسے اب بھی چاہتا ہوں اور اب بھی اُسے پانے کی تمنا ہے۔ جیسے میں خود کو فریب دے رہا ہوں۔ سریکا کو فریب دے رہا ہوں، اپنی ماں کو فریب دے رہا ہوں۔ میں اُسے نہیں بھول سکتا [illegible] بہت دُور کھڑی وہ اب بھی مجھے پکار رہی ہے۔
رات بہت ہی سرد تھی۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور [illegible] تُند تھیں۔ سریکا نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ایک خفیف احساس نے بدن کو جھنجھوڑ دیا۔
"آگ جلا دو۔ میں نے لکڑیاں جمع کر دی ہیں۔" میں نے سریکا سے کہا۔ وہ ماچس ڈھونڈنے لگی۔ اُس کی لمبی عریاں انگلیوں میں ماچس کی تیلی سے ایک سُرخ شعلہ اُٹھا اور مجھے محسوس ہوا، پل بھر میں شعلہ دہکتا ہوا [illegible] کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ وہ جلنے لگی۔ سر سے پیر تک شعلوں میں لپٹ گئی۔ اُس کے لمبے سیاہ گھنے بال جل کر کوئلہ ہو گئے۔ اُس کے بدن پر [illegible] ساری راکھ کا پلستر بن گئی اور اُس کے ہونٹ سُلگنے لگے۔ پھر آتشدان سے آگ بلند ہونے لگی۔ بہت اونچے اونچے شعلے اُٹھے۔ سُرخ دہکتے ہوئے ——— آگ اوپر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ آگ اوپر کی طرف کیوں اُٹھتی ہے۔ شعلے لپک لپک کر کس چیز کو پکڑ رہے ہیں ——— میں نہ جانے کہاں کھو گیا ——— پھر ———
آگ دھیمی ہو گئی۔ شعلوں کی بلندی گھٹ گئی۔ لکڑیوں کے سُرخ جلتے ہوئے ٹکڑے آتشدان میں جمع ہو گئے۔ اب آگ چپ چاپ اور دھیرے دھیرے جل رہی تھی جیسے کچھ سوچ رہی ہو، کسے جلائے، کسے بچائے۔ لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز ہوتی ہے۔ لیکن آگ کی آواز نہیں۔ آگ سوچ رہی ہے۔ کسی گہری سوچ میں گم ہے۔ سریکا کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ سریکا [illegible] آنسوؤں سے یہ شعلے نہیں بجھ سکتے۔ یوں رو رو کے ——— لکڑیاں سب جل گئیں۔ شعلے اب نہ اُٹھیں گے، آگ اب دب چکی۔
میں نے قریب رکھی ہوئی پانی سے بھری بالٹی آگ پر اُنڈیل دی اور سریکا کی چیخ نکل گئی۔
[illegible]

ایسے لگتا تھا کہ جیسے [illegible] تھے اور آنکھوں میں [illegible] ڈوب سے گئے تھے۔
[illegible] کی آگ میں سرخ ہو رہا تھا [illegible] تھی ——— میں نے
[illegible] سرخ کوری سے باہر جھانکتی ہوئی سرخ شفق کے رنگ
[illegible] دیکھنے لگا [illegible]

چہرے پہ سرخ چمک تھی۔ آگ چپ چاپ تھی شاید کہ سو رہی تھی!

مدیر بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے

## غزل

برجموہن شفق بی۔ایس سی

اُس شوخ سے جفا کا کوئی کیا گلا کرے
کیوں اتنی بات کے لئے اُس کو خفا کرے

میں جانتا ہوں عشق بڑا نامُراد ہے
کیا ہو جو اس میں تجھ کو خُدا مبتلا کرے

کاٹے ہیں ہجرِ دوست میں جو میں نے رات دِن
پھر گردشِ فلک نہ دکھائے خُدا کرے

پائی ہیں دردِ عشق میں کیا کیا لذّتیں!
اِس درد سے ہر اک کو خُدا آشنا کرے

سیکھا ہو جس نے چھین کے لینا ہر اک شے
کیوں طولِ زندگی کے لئے اِلتجا کرے

یہ جانتے ہوئے کہ نہ ہو گی کبھی قبول
وہ کون سا بشر ہے جو پھر بھی دُعا کرے

جب زندگی کا بوجھ اُٹھانا محال ہو
اُس وقت خود کُشی کے سوا کوئی کیا کرے

یہ زندگی تو جہدِ مسلسل کا نام ہے
ہر اک بشر کو چاہیئے اِس سے وفا کرے

ہے تجھ کو دیکھنا جو مرا ظرف اے شفق
پیرِ مُغاں سے کہہ درِ میخانہ وا کرے

## غزل

ایم۔ایچ نعمان انصاری ایم۔اے

فضا میں رنگ بکھیرو کلی کلی کے لئے
کِھلاؤ پھول چمن کی شگفتگی کے لئے

ہمارے ظرف کی قیمت فقط شراب نہیں
ہم اپنا ظرف نہ بیچیں گے میکشی کے لئے

نظر نظر سے جلائے ہیں زندگی میں چراغ
کرن کرن کو سمیٹا ہے روشنی کے لئے

مسرتیں ہیں جہاں میں مگر بہت محدود
خوشی ضرور ہے لیکن کسی کسی کے لئے

مری نگاہ کی خاطر یہ جلوہ سامانی
یہ التفات فراواں اِک اجنبی کے لئے!

تمہارے بعد بہاریں بھی آئی تھیں لیکن
فسردہ ہونٹ ترستے رہے ہنسی کے لئے

فریب کار زمانے میں دوستی کیسی
خلوص شرط ہے آداب دوستی کے لئے

تمہارا ابھی سے یہ درماندگی کا کیوں احساس
ابھی بہت سے مراحل ہیں زندگی کے لئے

## بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

نئے بچوں کی پیدائش اتفاق کی بجائے اب آپ کے اختیار میں ہے۔ نرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچے تبھی ہوں گے جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

## بچہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچے کی پیدائش ملتوی کرسکتے ہیں۔

نرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان و محفوظ طریقہ ہے۔ اس کے استعمال سے صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔

# نرودھ استعمال کیجیے

**فیملی پلاننگ کیلئے**
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے کم دام

**صرف 5 پیسے خرچ کرکے آپ اپنے کنبے کو محدود رکھنے کی طاقت حاصل کرسکتے ہیں**

نرودھ ہر جگہ ملتا ہے:-
پروویژن اسٹور، کریانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔

SSB 70/61

# کھردرے کاغذ

مشتاق احمد

([illegible] ... پہلی [illegible])

[illegible] مرحوم

خطوط پر مبنی ایک کہانی ماہنامہ بیسویں صدی کے لئے حاضر ہے۔ اُمید ہے آپ کو پسند آئے گی۔ پردیس کی تنہائیوں [illegible] کے دوران ادب کے لئے تھوڑا سا موقع بھی مل جائے تو غنیمت سمجھا جاتا ہے ....

——— مشتاق احمد

★

واشنگٹن، ۱۰ مارچ ۱۹۶۵ء

اچھے باور!

میں جانتی ہوں۔ تمہیں مجھ سے ہزاروں گلے۔ شکوے شکایتیں ہوں گی۔ پیار میں کئے جانے والے وعدے۔ وہ وفا کی قسمیں۔ جنہیں میں نے نئے جیون کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اُلفت کی دنیا میں مجھے گنہگار ٹھہرا سکتی ہیں لیکن باور کاش تم حالات کو ذہنی نہیں سماجی طور پر سمجھنے کی کوشش کرو تو تمہاری رضیہ مجبوریوں کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی دکھائی دے گی۔ ایک عورت .... اُس کا مقام .... اور میرا سماج جب اِن سب کو سطحی نہیں بُنیادی طور پہ سمجھ جاؤ گے تو میری بے وفائی کو ایک داغ سمجھ کر سینے سے لگانے کی بجائے خود کی تکمیل کرنے کی سعی کرو گے۔ جو میری تمنا ہے، تمہاری رضیہ کی آرزو ہے۔ کیا تم میری یہ آرزو پوری نہ کرو گے؟ ہاں۔ تم جو میری چھوٹی سے چھوٹی خواہش پر تڑپ تڑپ جایا کرتے تھے۔ اِتنی بڑی آرزو کو کیوں کر نظر انداز کر سکو گے۔

میں دنیا کے ہنگاموں میں کھو گئی ہوں۔ لیکن پھر بھی ذہن کا کوئی دریچہ کھلا رہ گیا ہے۔ جس میں سے جھانک کر تمہیں دیکھ لیتی ہوں۔ میری پوجا کے پھول جو اب کسی اور کی مورت پر چڑھائے جاتے ہیں شاید تمہارے قابل نہ ہوں۔ تمہارا مقام جو کبھی میرے دل میں تھا۔ اب دُور .... بہت دُور میری روح کی رسائی سے دُور نہ جانے کہاں جا پہنچا ہے کہ میرا شعور کیا اب اُس کی پُوجا سے شرماتا ہے۔

دیکھو باور! باہر جھانک کر دیکھو۔ شام اُداس ہے، بالکل میرے آنچل کی طرح اُفق پر نظر پڑی ہے تو زندگی میں پہلی بار غم کا مفہوم سمجھ سکی ہوں۔ لیکن میرے غم کا مداوا محض تمہاری خوشی ہے جسے میں اپنی زندگی سمجھتی ہوں تم سدا مسکراتے رہا کرو جب تم مسکراتے ہو تو بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہو۔ دیکھو اب تم مسکرا رہے ہو نا تو میں چلی چلی جا رہی ہوں۔

——— رضیہ

مری ہلز، ۱۴ اپریل ۱۹۶۵ء

رضیہ!

پیار ——— اِس میں کئے گئے وعدے۔ نہ بچھڑنے کی قسمیں۔ گلے۔ شکوے۔ یہ سب بازاری سی باتیں ہیں۔ جسے میرا ذہن قبول نہیں کرتا۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ زندگی ایک امانت ہے۔ جو جس جھولی کو بہتر سمجھتا ہے اُسی میں ڈال دیتا ہے۔ اِس میں کسی کا کیا دوش۔

میں بستر پر پڑا کھڑکی سے باہر جھانک رہا ہوں۔ چنار کے پتے ٹہنیوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر ہوا کے دوش پر لہراتے ہوئے ندی کے پانی میں گر رہے ہیں پانی کی لہریں اُنہیں ندی کی تہہ میں لے جائیں گی۔ جہاں یہ پتے موتی بن جائیں گے۔ ندی کے کنارے کنارے دُور تک پھیلی ہوئی پگڈنڈی بیوہ کی سُونی مانگ کی طرح دکھائی دے رہی ہے۔ یہ ایک ایسی جگہ پہ جا کر ختم ہو گی۔ جہاں

دوشیزہ اپنی زلفوں میں گلاب کے پھول سجاتے پردیسی کی راہ تک رہی ہوگی۔ جانے والے پردیسی کب لوٹ کر آتے ہیں؟ —— شام ڈھلے اس دوشیزہ کی پلکوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جیسے جگہ پہ گریں گی۔ وہاں جوہی اور چنبیلی کے پھول اُگ آئیں گے اور پھر کوئی اُن پھولوں کو چُن کر کسی مریض کے سرہانے گلدستہ بنا کر سجا دے گا۔ تاکہ کوئی افسردہ ذہن تھوڑی دیر کے لئے خوشبو سے معطر ہو سکے۔ اُلفت کی دنیا کی رونق دیکھ سکے۔

ہاں! میرے سرہانے بھی چنبیلی اور جوہی کے پھول سجے ہیں کوئی سجا گیا ہوگا۔ ہسپتال کی چہار دیواری کے باہر بھی پھول کھلے ہیں مریضوں کے دل کو روکنے کے لئے۔ تاکہ آسمان کا سینہ نہ چیر سکیں۔

—— باقر

---

- جو شخص جائز طریقے سے روپیہ کما کر اِس لئے پس انداز کرے کہ کسی سے سوال کرنے سے بچے اور اپنے بال بچوں اور ہمسایوں پر خرچ کرے، وہ قیامت کے دن خدا سے یوں ملے گا کہ اُس کا چہرہ ماہِ کامل کی طرح روشن ہوگا۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- علم وہ خزانہ ہے جس کا ذخیرہ بڑھتا ہی رہتا ہے۔ اِسے گردشِ ایام سے ضرر نہیں پہنچتا۔ (حضرتِ علی کرم اللہ وجہہٗ)
- مہمان کے لئے زیادہ خرچ کرنا اسراف نہیں۔
(حضرتِ عائشہ صدیقہؓ)

---

واشنگٹن، ۳۰ مئی ۱۹۶۵ء

باقر!

دیکھو! میری زلفوں میں چنبیلی کی مہک! ساری رات مدہوش رہی ہوں۔ پڑا ہے کہ کھُل کھُل جاتا ہے۔ کم بخت بال ہیں بھی تو اتنے بھاری کہ سنبھالے سنبھلتے نہیں۔ تم بھی تو باندھنے میں میرا ساتھ نہیں دے رہے۔ کتنے پیار سے اپنے شانوں پر بکھرا لیا کرتے تھے۔ پھر مدّتوں ہم دونوں مدہوش پیار کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اب تم نے تو ایک ایک کر کے پیار کی سبھی باتیں بھلا دیں۔ بانو کل کہہ رہی تھی کہ مرد ہوتے ہی بے وفا ہیں۔ شاید اُس کا اپنے خاوند سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ مجھے ابھی تک ہنسی آرہی ہے کہ کیا کوئی خاوند سے بھی جھگڑا کرتا ہے۔

میں —— میں تو اُن سے کبھی نہیں جھگڑی۔ شاید اسی لئے اُنھیں مجھ سے اور مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں۔

کل شام نمائش دیکھنے گئے تھے۔ وہاں سے میں نے ایک ساڑھی خریدی اُن کے لئے سوٹ خریدا۔ راستے میں آتے ہوئے نئی کار کا آرڈر دیا۔ ہم دونوں بہت خوش تھے۔ وہ مجھے گدگداتے تو میں ہنسی لوٹ پوٹ ہو جاتی لیکن اچانک ہی اُداس ہو گئی۔ وہ مجھے بہت دیر تک بہلاتے رہے کہتے والدین یاد آتے ہیں تو ہم دو ایک سال بعد تو وطن لوٹ چلیں گے۔ پھر میں بڑا آدمی بن جاؤں گا۔ ملک میں عزت ہوگی۔ دولت ہوگی۔

ہاں۔ مجھے کوئی یاد آرہا تھا۔

نہ جانے کون ——؟

رضیہ —— جو ایک پہیلی بن کر رہ گئی

مری ہلز، ۳ جولائی ۱۹۶۵ء

رضیہ!

ندی کے کنارے پتھر پہ بیٹھا ہوں۔ چھوٹی چھوٹی کنکریاں ندی میں پھینک رہا ہوں۔ جب چھوٹی سی کنکر ندی میں پھینکتا ہوں تو پانی میں ہلکی سی ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر سکوت چھا جاتا ہے۔ لیکن میرے دل میں اُٹھنے والا طوفان تیز سے تیز تر ہو جاتا ہے۔ کئی بار دو کنکر ایک ساتھ پھینکنے کی سعی کر چکا ہوں لیکن ناکام رہا ہوں۔ محسوس ہوتا ہے جیسے فضا روٹھ سی گئی ہے۔ دُور گرتے ہوئے آبشار میں کسی کے سسکیاں لے کے رونے کی صدا آرہی ہے بادل ماتمی لباس پہنے خاموش ہیں۔ ہرنیاں سر جھکائے آہستہ آہستہ نہ جانے کس جانب رواں ہیں۔ کان چوڑیوں کی کھنک سننے کو ترس ترس گئے ہیں۔ کئی بار ماضی آنکھوں سے چھلکا ہے۔ اُلفت۔ اُس کی رسمیں ایک ایک کر کے یاد آرہی ہیں۔ بند کوٹھری میں دولت کے ترازو میں تُل جانے والی محبت آج پھر میری ہستی کا مذاق اُڑا رہی ہے۔ لیکن میرا نحیف ذہن اب کسی آرزو کا حامل نہیں۔

میرا جی گھبرانے لگا ہے۔ چاہتا ہوں اُٹھ کر چلا جاؤں۔ اب یہاں کون آئے گا —— ؟ کون میرے کندھے پر آکر آہستہ سے ہاتھ رکھ دے گا۔ میرے مُڑ کر دیکھنے پر ہنسی کا ایک جھرنا پھوٹ پڑے گا۔ کائنات جھُومنے لگے گی۔ زُلفوں کی لٹ بکھرنے سے فضا میں خوشبو پھیل جائے گی۔ میرے مسکرا کر دیکھنے سے کوئی شرما شرما جائے گا —— نہیں —— اب ایسا نہ ہوگا۔ کبھی نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ پھر کبھی اس ندی پر لوٹ کر نہ آؤں گا۔ تم سے

بہت تڑپاتی ہو رضیہ! بہت!

باور ——— جو کبھی تمہاری آرزو تھا!

واشنگٹن، ۱۰ ستمبر ۱۹۶۵ء

میرے اچھے باور!

میں نے کبھی تمہیں نہیں ترسایا۔ سدا تمہارے لئے تڑپی ہوں۔ تم میرا پیچھا کبھی نہ چھوڑنا۔ ورنہ ہماری محبت کی آماجگاہ کو کون آباد رکھے گا۔ باور یہ تو ہمیشہ خوشی کی ساعتیں ہوتی ہیں۔ تم مجھے یاد کر کے اداس کیوں ہو جاتے ہو۔ دیکھو تو سہی تمہاری تصویر آنکھوں میں گھومنے لگی۔ میں شرما شرما سی گئی۔ اتنے میں بانو آ گئی۔ میری سہیلی ہے، قریب ہی رہتی ہے۔ اس سے اپنے دل کا حال کہہ لیتی ہوں تو بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ کبھی آنسو چھلکیں تو یہ اپنے دامن پر چن لیتی ہے۔ کل اس کے ساتھ بازار گئی تھی۔ اچانک سلیٹی ٹائی پر نظر پڑی جو تمہاری پسند ہے۔ جس کی گرہ کبھی میں خود باندھا کرتی تھی۔ میں نے وہ ٹائی خرید لی اپنے خاوند کے لئے اور کیا کر سکتی تھی۔ میں عورت ہوں نا! جو آنسو اور مجبوری دونوں کی حامل ہوتی ہے۔ اب میں ٹائی اُن کے گلے میں باندھا کروں گی تو وہ مجھے پیار کیا کریں گے۔ میں خوشی سے پھولی نہ سماؤں گی۔ اُن کے باہر جانے کے بعد دُور، بہت دُور پیار کی حسین وادی میں کھو جایا کروں گی۔ جہاں پیار مقدر میرے ماضی کا مذاق اڑانے کو تو میں مسکرا کر گزر جایا کروں گی۔

اچھا میں اب خط بند کرتی ہوں۔ اُن کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں کھانا پکانے لگی ہوں۔ تمہیں وہ فرائی والا گوشت پسند ہے نا؟ آج وہی پکاؤں گی۔

رضیہ ——— بھولی بسری یاد

مری ہلز، ۱۲ دسمبر ۱۹۶۵ء

رضیہ!

دُور ——— بہت دُور شہنائی کی آواز ——— ؟ کسی کا احساس مر گیا ہوگا!

تھوڑی دیر بعد ندی کے اس پار نئی نویلی دلہن آرزوؤں کو سمیٹے سہاگ رات کی پھولوں کی سیج پر کسی آہٹ کی منتظر ہوگی۔ سکھیوں نے ایک ایک کر کے چنی ہوئی مہندی کی پتیوں کو ہاتھوں پر رچایا ہوگا، تو جل اٹھے ہوں گے۔ کسی کے گرم گرم ہونٹ اُن جلتے ہوئے ہاتھوں کو پیار سے چومیں گے تو بدن میں ٹھنڈک کی لہر دوڑ جائے گی ——— سامنے پہاڑی پر چرواہا دیر تک سورج ڈوبنے کا منظر دیکھتا رہے گا۔ بکریاں حیرت و حسرت سے اپنے مالک کا چہرہ تکتی رہیں گی اور ——— اور پھر چرواہا بھی چلا جائے گا۔ سورج بھی ڈوب جائے گا۔ بکریاں بھی سر جھکائے چلتی جائیں گی۔

آج میں بھی جا رہا ہوں۔ ابھی ابھی ڈاکٹر کہہ کر گیا ہے کہ میں اب ٹھیک ہوں۔ اس آہوں اور دکھوں کی دنیا سے نکل کر پھر اسی بارونق دنیا میں چلا جاؤں گا جہاں میرا سب کچھ لٹ گیا تھا۔ پھر احساس کے لہو کا ایک ایک قطرہ جمع کر کے کسی کے لبوں پر سرخی کی تہہ جما کر ایک ڈوبتی ہوئی آرزو کو بچا لوں گا۔ میں اپنی ماں کی آرزو پوری کروں گا۔ جسے کتنا ارمان ہے۔ ایک گڑیا سی دلہن گھر میں لانے کا!

باور ——— جو کسی کا اعتماد کھو چکا ہے

---

- دوسروں کی خامیاں تلاش کرنے سے پہلے اپنی خامیاں تلاش کر لو۔ (ماتا ریحانہ جی)
- دنیا میں سب سے قابلِ رحم انسان وہ ہے، جو دولت مند ہے پھر بھی بخیل ہے۔ (ودیاپتی)
- بلند انسانوں کی پہچان یہ ہے کہ اگر ان سے کوئی کچھ مانگے تو وہ منہ سے کچھ کہنے کے بجائے کام پورا کرنے کے بعد ہی اس کا جواب دیتے ہیں۔ (کالیداس)
- انسانوں کی بے غرض خدمت کرنا ہی انسانیت کی معراج ہے۔ (مہاتما بدھ)

---

واشنگٹن، ۱۵ جنوری ۱۹۶۵ء

باور

میں جانتی ہوں، تمہیں یہ خط پڑھ کر خوشی نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ حقائق پر مبنی ہے اور حقائق ہمیشہ تلخ ہوتے ہیں۔ تم اب تندرست ہو۔ اپنی نئی زندگی کی ابتدا کرنے کے قابل ہو۔ جس کا میں نے مدت سے انتظار کیا۔ میں نہ چاہتی تھی کہ تمہیں میری وجہ سے کچھ ہو۔ میں تمام زندگی خود کو گناہ گار ٹھہراتی رہوں اور اپنے کندھوں پر کسی لاش کا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھروں۔ اس بڑے گناہ سے بچنے کے لئے میں ہر بار خط لکھ کر ایک چھوٹے گناہ کا ارتکاب کرتی رہی۔ دراصل میں نے تمہاری محبت کو اسی دن دفن کر دیا جس دن میری شادی ہوئی تھی اور میں اپنے خاوند کے ساتھ واشنگٹن چلی آئی تھی۔ آج میں بیوی ہی نہیں اپنے

بچے کی ماں بننے والی ہوں! میں مقدس سے مقدس الاؤ پر بھی کسی بھی الفت کو قربان کر سکتی ہوں۔

میں اپنی اِس چھوٹی سی دنیا میں خوش ہوں۔ بہت خوش ہوں۔ یہ دنیا میری زندگی ہے۔ میری حقیقت ہے۔ شادی سے پہلے کی زندگی، وہ محبت! میری ایک بھول تھی۔ اور کوئی بھی ناپختہ ذہن اُس بھول کا شکار ہو سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے، تم بھی جب کبھی نئی زندگی کی ابتدا کرو گے تو تمہیں بھی اپنی اُس بھول کا شدت سے احساس ہوگا۔

رضیہ ——— جو کبھی تمہاری تھی

مری ہلز، ۱ر مارچ ۱۹۶۶ء

محترمہ!

۲۴ر فروری ۱۹۶۵ء کی غمگین سی شام تھی۔ ہلکی ہلکی سی بوندا باندی ہو رہی تھی ——— باور بستر پہ ٹیک لگائے کھڑکی سے باہر فضا کو گھور رہا تھا۔ چہرے پہ سنجیدگی کے گہرے آثار تھے۔ وہ گم سم سا یونہی ایک ہی طرف ٹکٹکی باندھے تکے جا رہا تھا۔ میں اُسے دوا پلانے گئی تھی۔ اُس نے دوا میرے ہاتھ سے لی۔ دوا کی جانب غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اُسے میز پہ رکھ کر فضا میں نظریں جما دیں۔ میں نے دوا پینے کے لئے کہا۔

وہ یونہی خاموش رہا۔ چند لمحے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

سٹرس! اِس دنیا کی کوئی عورت کسی سے محبت نہیں کرتی۔ اس کائنات کی سب سے پہلی عورت نے بھی اپنے ہی خالق سے بے وفائی کی تھی۔ جسے میں نے چاہا وہ بھی حوا ہی کی بیٹی تھی۔ جسے نئے تجربات اور زندگی کی آرائشوں سے لگاؤ تھا۔ جب کسی نے دولت کی بولی لگائی۔ وہ اُس کے سنہرے ترازو میں تل گئی۔"

"نرس"

اُس نے لمبی سانس لے کر کہا ——— "عشق و محبت کی روایتی کہانیاں۔ سب فرضی ہیں۔ اُن میں ذرا بھی حقیقت کا شائبہ نہیں۔ آج تک مرد اور عورت الفت کے ترازو میں کبھی برابر نہیں تل سکے۔ کاش! کوئی عورت کی فطرت کو سمجھ سکتا۔

اِس کے بعد پھر اُس نے ایک لمبی آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔ سر تھکا سا۔ میں نے اُس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھ دیا۔ اُس کی پیشانی بخار سے تپ رہی تھی۔ دیر تک میں اُس کی پیشانی سہلاتی رہی۔ اُس نے اپنی محبت کی ساری داستان مجھ سے کہہ ڈالی۔ اُس نے بتایا کہ تم اُس سے محبت کرتی تھیں پھر کسی ڈاکٹر کی دولت کے لالچ میں آ کر اُس سے شادی کر لی۔ اور اُس کے ساتھ امریکہ چلی گئیں۔

اُس کے بعد باور نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں آپ کو اُس کے نام سے خطوط لکھتی رہوں گی۔ اُسے خوف تھا کہ کہیں شادی کی چند خوشیوں کے بعد تمہیں پیار کی یاد نہ ستائے۔ جو تمہارا جیون نہ جلا دے۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ میں آپ کو اُس وقت تک خطوط لکھتی رہوں، جب تک تم سماج کے بندھنوں میں پوری طرح بندھ نہ جاؤ۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ میں اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گھر چلی گئی۔ ساری رات باور کے بارے میں کئی سوچیں ذہن میں اُبھر کر ختم ہوتی رہیں۔

صبح سویرے جب ڈیوٹی پہ پہنچی تو باور کا بستر خالی تھا۔ میری آنکھوں سے اُس کے لئے دو آنسو بھی نہ بہہ سکے۔ کیونکہ میرا اُس کا رشتہ نرس اور مریض کا رشتہ تھا۔ آج اُسے مرے ہوئے مدتیں بیت گئی ہیں۔ تمہارے امریکہ جانے کے ٹھیک تین دن کے بعد وہ اپنے بستر پہ دم توڑ گیا تھا۔

تمہارے آج کے خط نے میری ڈیوٹی ختم کر دی۔ کاش! تم نے یہی بات پہلے خط میں لکھ دی ہوتی۔

لیکن ایک بات سوچتی ہوں کہ باور کا مرتے وقت بھی تمہارے متعلق سوچنا کتنا غلط انداز تھا! ——— میں نے تمہارے سارے خطوط جلا دئے ہیں۔

نرس ——— جو ایک عورت بھی ہے

**عرش صہبائی**

ہم تیز رَو ہیں گردشِ ایام کی طرح
مجبور ہم ہیں کوششِ ناکام کی طرح

آنکھوں کا ذکر کیا کہ محبت کے نام پر
دل بھی چھلک پڑا ہے کسی جام کی طرح

وہ مسکرا کے زہر بھرا جام بھی جو دے
پھر زہر بھی ہے بادۂ گلفام کی طرح

ایسے میں کوئی آتشیں نغمہ بکھیر دے
چپ چاپ ہے فضا دلِ ناکام کی طرح

وہ میری کائناتِ محبت پہ چھا گئے
ان کی طرح کبھی تو کبھی شام کی طرح

ہم تجھ کو مانتے ہیں مگر شرط یہ ہے عرشؔ
تیرا کلام بھی ہو ترے نام کی طرح

**چندر پرکاش جوہر بجنوری**

ہوش و خرد سے اکثر بیگانے بن گئے ہیں
ہم اُن کی انجمن میں دیوانے بن گئے ہیں

ساقی کی چشمِ میگوں جس سمت اُٹھ گئی ہے
مستی برس پڑی ہے میخانے بن گئے ہیں

اک میری داستاں کے عُنواں بدل بدل کر
کیا جانے آج کتنے افسانے بن گئے ہیں

جن بستیوں میں اب تک اہلِ جنوں نہ پہنچے
اُن بستیوں کے آخر ویرانے بن گئے ہیں

اپنا بنا کے ہم کو بیگانہ کہنے والے
ہم سب سے تیری خاطر بیگانے بن گئے ہیں

یہ انقلابِ دوراں کیا کیا ابھی دکھائے
اپنے بھی آج جوہرؔ بیگانے بن گئے ہیں

**والی آسی**

اب تمناؤں کی محفل نہ سجا دیوانے
لُٹ چکا شہرِ وفا ہوش میں آ دیوانے

اِتنی ویران ہے کیوں راہِ وفا دیوانے
مِٹ گئے کیا ترے نقشِ کفِ پا دیوانے

جُستجو میں تری شاید تجھے معلوم نہیں!
خاک اُڑاتی ہوئی پھرتی ہے صبا دیوانے

کب خدا جانے کسی بُت کا گزر ہو جائے
دل کو دل رہنے دے کعبہ نہ بنا دیوانے

اب وہ سنگیت نہ وہ گیت نہ وہ رس نہ وہ لَے
زندگی ہو گئی صحرا کی صدا دیوانے

جا کہیں بیٹھ کے تنہائی میں رو لے والیؔ
ٹھوکریں کوئے ملامت کی نہ کھا دیوانے

**نور کوہلی اکبر آبادی**

دستِ جنوں سے کام لیا ہے کبھی کبھی
دامن کسی کا تھام لیا ہے کبھی کبھی

جانے گا کیا وہ دردِ مُسلسل کی کیفیت
اُلفت کا جس نے جام لیا ہے کبھی کبھی

کچھ اِس طرح کہ جیسے سُنے اجنبی کی بات
اُس نے مِرا سلام لیا ہے کبھی کبھی

دانستہ چل کے ہم نے رہِ انبساط پر
غم سے بھی انتقام لیا ہے کبھی کبھی
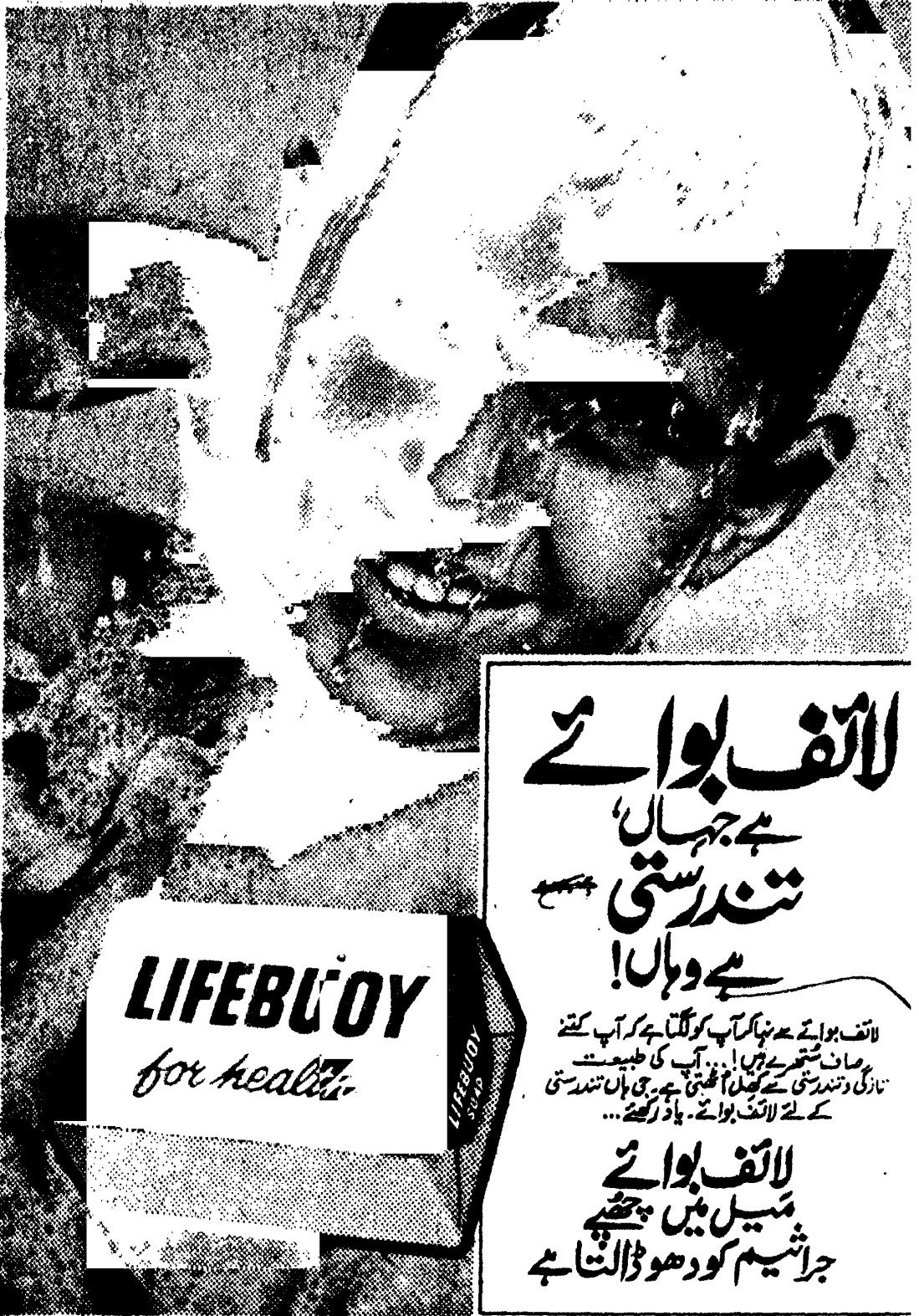
لائف بوائے
ہے جہاں،
تندرستی
ہے وہاں!
لائف بوائے سے نہاکر آپ کو لگتا ہے کہ آپ کتنے
صاف ستھرے ہیں!... آپ کی طبیعت
تازگی و تندرستی سے کھل اٹھتی ہے۔ جی ہاں تندرستی
کے لئے لائف بوائے۔ یاد رکھئے...
لائف بوائے
میل میں چھپے
جراثیم کو دھو ڈالتا ہے
LIFEBUOY
for health
LIFEBUOY
SOAP

# پچاس سال بعد

انیس قیوم فیاض بی۔ ایس سی (عثمانیہ)

۲۲، بی کلاس سلے پتی، حیدر آباد (اے۔ پی)

محترم چچا جان! تقدیس و احترام

میری شادی پر ہند و پاک سے بے شمار مبارکبادی خطوط اور ٹیلیگرامس موصول ہوئے۔ میں سمجھتی ہوں، یہ سب آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔ اس سے جہاں مجھے "بیسویں صدی" کی مقبولیت اور پسندیدگی کا اندازہ ہوا وہیں قارئین کے بے پناہ خلوص کا بھی اعتراف کرنا پڑا۔ میں اُن سب بھائی بہنوں کی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے مجھے یاد کیا اور "بیسویں صدی" کے توسط سے بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں ——— ایک افسانہ پیشِ خدمت ہے۔ دیکھیے اِس کا ہیرو اقبال اپنی روسی محبوبہ سے کیا کہہ رہا ہے ——— "میں وہ اقبال نہیں، وہ کوئی اور اقبال ہوگا!"

آپ کی گرانقدر رائے کا مجھے بے چینی سے انتظار رہے گا . . .

آپ کی دُعاؤں کی طالب

انیس قیوم فیاض

"تم بڑے ہو کر کیا بنو گے اقبال؟"

یہ سوال برسوں پہلے آرتیک میں ایک روسی لڑکی نے مجھ سے کیا تھا۔ ایک ننھی مُنّی سی لڑکی نتاشا نے۔

"میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے سوویت یونین آؤں گا۔ تمھارے یہاں کے ڈاکٹر کتنے اچھے ہیں!" میں نے بے حد خوش ہوتے ہوئے کہا تھا۔

دہلی کے ہوائی اڈّے سے ماسکو کے ہوائی اڈّے تک میرے ذہن میں سوویت یونین ہی کی سیر کا نقشہ چھایا رہا۔

بارہ برس کی معصوم عمر اور پھر ہزاروں کلومیٹر کی اُڑان کر کے ایک اجنبی ملک میں جانا یہ سب کچھ میرے لئے نیا تھا۔ میری ممی اور ڈیڈی مجھے رخصت کرنے کے لئے ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ انھوں نے میری پیٹھ تھپکی اور میں خوشی سے جھومتا طیارے میں سوار ہو گیا۔

پھر طیارہ فضا میں پرواز کر گیا۔ ممی ڈیڈی دیکھتے ہی رہ گئے۔ ہر دم میری آنکھیں منتظر تھیں کہ کب وہ گھڑی آئے جب یہ دیکھوں کہ کیا ہوگا۔ ہم ایک مہینے کی چھٹیوں پر سوویت یونین جا رہے تھے تاکہ روسی بچّوں کے ساتھ چھٹیاں منا سکیں۔ اُن کی تہذیب، طور و طریق سے لُطف اندوز ہو سکیں۔ ہندوستان کے بارے میں معلومات بہم پہنچا سکیں۔

ہم نے ایک مہینہ کیسے گزارا؟ اِس کا اظہار ہمیشہ ہی تشنۂ بیاں رہے گا۔

ہم سب سوویت بچّوں میں کچھ اِس طرح گھُل مِل گئے تھے جیسے یہ فاصلے، حدُود کچھ نہ ہوں۔

ہم خوب رنگ رلیاں مناتے اور سوویت لڑکے لڑکیوں کے ساتھ گھومنے، سیر سپاٹے کے لئے نکل جاتے۔ کبھی وہ منظر یاد آتا ہے جب ہم ایک اُونچی پہاڑی پر چڑھ رہے تھے، جس کی چوٹی پر کیمپ کے الاؤ کے لئے چوک سجایا گیا تھا۔

میں نے اپنے ہی آپ میں کہا۔

"یہ تو بہت تنگ راستہ ہے۔"

نہ جانے میرے کندھے سے کندھا مِلا کر چلنے والی ایک نوعمر لڑکی نے کیسے سُن لیا۔ بولی۔

"آپ شاید راستے کی بات کہہ رہے ہیں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ بڑا کٹھن راستہ ہے۔ پھر بھی مشکلوں کی پروا کئے بغیر چلتے رہنا اولوالعزمی کی نشانی ہے۔"

# زُلف

زُلف اُس شخ پہ جو بل کھائے تو ناگن ہو جائے
بس میں رنگیں سے لپٹ جائے تو کنگن ہو جائے ——— بسمل سعیدی

پُوچھ آ دیکھ اُن بازوؤں کی ویرانی
کھُلی نہ جن پہ کبھی زُلف مشکبو تیری ——— مخمور سعیدی

کیا زُلف سیہ شانوں پہ لہرائی ہوئی ہے
لگتا ہے کہ ساون کی گھٹا چھائی ہوئی ہے ——— پروفیسر محسن

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہیں
زُلف گر بن جاؤں تو شانے میں اُلجھا دے مجھے ——— مرزا غالب

ہر وہ عُقدہ جو تری زُلف گرہ گیر میں ہے
میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی مری تقدیر میں ہے ——— جگر مرادآبادی

مُرسلہ:- ایس۔ ایس۔ منکاری ایم۔ اے ناگپور

وہ مُسکرائی۔

اُس وقت میں بھی معصوم تھا، وہ بھی معصوم تھی۔ پھر بھی میں اُس کی ذہانت سے کافی متاثر ہوا اور اُس دن جبکہ روس میں ہندوستان کا قومی دن منایا جا رہا تھا۔ یہ روس والوں کی فراخدلی ہی تو تھی کہ ایسے موقعوں پر غیر مُلکی [illegible] ہوتے اُن تمام کے قومی دنوں کا احترام یکسانیت سے کیا جاتا [illegible] سب برابر دلچسپی لیتے کسی طرح کا کوئی امتیاز نہ برتا جاتا۔ ہندوستان کے قومی دن پر بھی الاؤ پر دو جھنڈے لہرائے، ایک ہندوستان کا اور دوسرا روس کا۔ پھر ہمارے کیمپ کے سربراہ نے ہندوستان کو سلامی دی، پھر سب سوویت کے نمائندہ بچّوں نے ہندوستانی بچّوں کو تحفے پیش کئے۔

اُس کے بعد لگنی واسیلوچ نے ہندوستان کے عظیم رہنما جواہر لال نہرو کی یاد دلائی۔ اُن کی بچّوں سے بے پناہ محبت کو پھر ایک بار یاد کیا۔

پھر ہم سب ٹولیوں کی شکل میں نکل گئے۔ روسی گیت، ہندوستانی گیت، ملے جلے گیت۔ پھر رقص ہوا۔ روسی بچّوں نے ہندوستانی بچّوں کا لباس پہنا اور ہندوستانی بچّوں نے روسیوں کا۔ کئی طرح کے ناچ ہوئے۔ یونانی، واجیانی، روسی، یوکرینی ——— پھر اندھیرا ہوا۔ پھر روشنیاں چمک اُٹھیں۔

سب ہی رقص سے لُطف اندوز ہوتے۔ پھر سب نے مل کر اپنا ہُنر دکھایا۔ یہ سب ایک کلب کے تحت ہو رہا تھا۔ کوئی ماڈل بنا رہا تھا، کوئی تصویر اُتار رہا تھا اور کوئی اپنی پسند کی کوئی چیز بنا رہا تھا۔ ہر ایک کو صرف دس منٹ کا وقفہ دیا گیا تھا۔

عجیب بات تھی ——— جس وقت ججوں نے فیصلہ سُنایا ہمیں وہ سبھی اور نتاشا ہی کی چیزیں بے حد پسند کی گئیں اور اوّل قرار پائیں۔ میں نے [illegible] لینن کی تصویر اُتاری تھی اور نتاشا نے ایک ماڈل بنایا تھا۔

اُس وقت جذبات و احساسات یہ سب سوچ کر لذّت آشنا ہو سکتے تھے کہ کس طرح میں اور نتاشا ساتھ ساتھ کامیاب ہوتے آ رہے تھے۔

اور بھی بہت سے مقابلے ہوئے لیکن میرے لئے ایک ہی مُقابلہ دلچسپی رکھتا تھا۔ فیشن پریڈ کا۔ اُس دن نتاشا نے بہت ہی خوبصورت لباس پہنا۔ سر سے پاؤں تک سُرخ ہی سُرخ!

اب اُسے اپنے بالوں میں دو سُرخ گُلاب لگانے تھے۔ جو اُسے بر وقت مل نہیں رہے تھے۔ جس کے لئے وہ بے حد پریشان نظر آ رہی تھی۔

میں نے کسی شریر بچّے کی طرح پاس والے باغیچہ سے دو سُرخ گُلاب توڑے اور نتاشا کے سامنے کر دئے۔

وہ مُسکرائی۔

"تھینک یو؟"

"مجھے یقین ہے آپ ہی کا نام اقبال ہے" اُس نو عمر لڑکی نے کہا۔

"ہاں! اور تمہارا نام نتاشا . . . !"

جواب میں وہ پھر مُسکرائی۔

"بہت اچھے ہیں آپ؟"

---

اس کے بعد ہم نے ساتھ ساتھ بہت سے کام کئے۔ مجھے ہندوستان [illegible] کی نمائش کرنے والوں کا ہاتھ بٹانا تھا۔ میرے ساتھ والی لڑکیاں اور لڑکے [illegible] ساتھ بہت سی چیزیں ہمیشہ لاتے تھے۔ خوبصورت [illegible] چوڑیاں، ہماسک، نقلی چہرے اور ہندوستانی رہنماؤں کی تصویریں۔

سبھی کو یہ نمائش بے حد پسند آئی۔ سب نے [illegible] سراہا۔

لیکن جب ہم دہلی لوٹنے لگے تو سب کے چہرے غمگین [illegible]

اُن معصوم چہروں کو یاد کرتا ہوں تو جھرجھری سی آ جاتی ہے۔ کاش [illegible] دیواریں نہ ہوتیں!

اچانک نتاشا میرے قریب آ گئی [illegible]

"تم بڑے ہو کر کیا بنو گے اقبال؟"

"میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے سوویت یونین آؤں گا۔ تمہارے یہاں کے ڈاکٹر کتنے اچھے ہیں۔ اس عرصہ میں تم بھی ڈاکٹر بن جانا ——— ہم تم پھر ملیں گے... اچھا ——— باقی... باقی!"

یہ تو ایک معصوم وعدہ تھا جس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

پھر ہمارا جہاز فلائی کر گیا۔ ہمارے دلوں میں بس ایک یاد سی کھٹک کے رہ گئی۔ روسی بچوں کی دوستی، اُن کی انسانی ہمدردی، یہ سب ہمارے دلوں کو مسحور کر چکی تھی اور ہم دلوں کے بھائی اُن سب پر کھو رہے تھے۔

"میں ڈاکٹر بنوں گا... میں ڈاکٹر بنوں گا!" ایک آوازِ بازگشت میرے کانوں میں گونج کر رہ گئی اور میری کومل زندگی کے سامنے ایک لق و دق صحرا منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ میری حسرتوں کو، میری آرزوؤں کو نگل جانے کے لئے!

میں نے خود کو اُس کے حوالے کر دیا کیونکہ دوسرے ہی سال ایک بلا نہ ناگہانی سے میرے والدین لقمۂ اجل ہو گئے۔ میں تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ صرف میٹریکولیشن کر سکا۔

میرا ڈاکٹر بننے کا خواب مجھ ہی میں دفن ہو گیا اور میں بن گیا شاعر———

ایک دردمند شاعر جو لوگوں کے دُکھ درد بانٹتا تھا، غم بٹورتا تھا اور خود خونِ جگر پیتا تھا۔

جو کیف و نشاط کے دریا بہاتا تھا، جو ہندوستان کی تاریخ کو خوبصورتی سے دُہراتا تھا

ایک سال ——— دو سال، تین، چار، پانچ ——— چھ، سات، آٹھ، نو ———

دس سال گزر گئے۔

میں چوبیس برس کا جوان ہو گیا۔ لیکن میرا جسم دُبلا پتلا تھا۔ عام روایتی شاعروں کی طرح! بعض وقت میں سوچتا۔ میں نے روسی بچوں کے آگے کس قدر مجبوری کا مظاہرہ کیا!

لیکن یہ تو مقدّر کی بات تھی۔

پھر میری شاعری پسندیدہ نظروں سے دیکھی جانے لگی۔ میں عوام کا محبوب شاعر بن گیا۔

اُس کے بعد نہ جانے کتنے برس گزر گئے۔ شاید اُنتالیس برس... مجھے کچھ یاد نہیں۔ ہاں مجھ میں جو تبدیلیاں اِن برسوں میں ہوئیں، اُن کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ میری آنکھیں مدھم ہو گئیں۔ آنکھوں کے دیئے ٹمٹمانے لگے۔ میرے چہرے پر جھرّیاں پڑنے لگیں۔ جسم مزید منحنی سا ہو گیا۔

## شمع

مرے افسانۂ دل سے زمانہ ہو گیا واقف
بہت اب شمع سے کھلتا ہوا پروانہ رہتا ہے ——— نامعلوم

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے ——— داغ

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری ——— اقبال

پروانے کی ہے موت پہ اے شمع مجھ کو رشک
تیرا شہیدِ ناز ترے رُو برو تو ہے ——— جنت کلکوی

کچھ شمع کی لَو میں ہی تاثیرِ کشش ہوگی
ہوتا نہیں پروانہ ہر آگ کا شیدائی ——— ناطق جونپوری

مرسلہ: ضیا عزیز فقیہ، نظام پور

لیکن میری شہرت چاروں سمت پھیل چکی تھی۔ دُور دُور تک میری تصانیف کے چرچے تھے۔ میں نے بہت سے روسی شاعروں کی تصانیف کا ترجمہ اُردو زبان میں کیا تھا۔

اور ایک دن مجھے میری خدمات کے صلے میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ دیا گیا!

میں نے فرطِ عقیدت سے، اپنے لاکھوں شیدائیوں کے ہجوم میں ہندوستان کی وزیرِ اعظم مسز گاندھی کے ہاتھوں یہ ایوارڈ پایا۔ جس میں آٹھ ہزار روپے بھی شامل تھے۔

اور آج ۶۳ برس کے سِن میں، میں پھر ماسکو شہر میں ہوں۔ مجھے دعوت پر دو ہفتے کی سیر کے لئے بلایا گیا ہے۔ بیتی ہوئی ایک ایک بات مجھے یاد آ رہی ہے۔

لیکن اب کی بار یہاں سورج کی تپش زیادہ ہے اور میرے بوڑھے جسم کے اندر ایک جوان دل دھڑک رہا ہے۔ کچھ عجیب طرح... شاید کسی کو پکار رہا ہے!

شاید نتاشا کو!

خدا جانے نتاشا کیسی ہو؟ وہ دس برس کی معصوم لڑکی تو ہرگز نہ ہوگی!

ساٹھ برس کی بڑھیا ہوگی۔ نہ جانے کس جذبے کے تحت میری آنکھیں [illegible] گئیں۔

اس روز مجھے لینن ہال میں اپنا کلام سنانے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔
میں نے اپنی پُرسوز آواز میں وہی نظم سنائی جو میں خاص اسی موقع [illegible] لئے لکھ لایا تھا جس میں میں نے شہر ماسکو کو مخاطب کیا تھا ——

پہلے کب آیا تھا کچھ یاد نہیں
لیکن آیا تھا قسم کھاتا ہوں
پھول تو پھول ہیں کانٹوں پہ ترے
اپنے ہونٹوں کے نشاں پاتا ہوں

میرے خوابوں کے وطن!

ایک ہجوم مجھ پر ٹوٹ پڑا افراطِ عقیدت میں، فرطِ محبت میں۔
میں جیسے ہی ہال سے باہر نکلا کسی نے مجھے روک لیا۔

ایک بوڑھی عورت مجھ سے مخاطب تھی۔
"مسٹر اقبال —— برسوں پہلے بھی یہاں ایک اقبال آیا تھا۔ [illegible] نوعمر۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ڈاکٹری پڑھنے سوویت یونین [illegible] لیکن وہ نہ آیا۔ کتنی صدیاں بیت گئیں۔ کتنے بچے جوان ہوگئے [illegible] اور کتنے بوڑھے مرکھپ گئے۔ لیکن میں کو بھی اسی اقبال کا انتظار [illegible] میں ڈاکٹر بنی تو اسی کی خاطر... لیکن وہ...؟"

میں نے دیکھا روتی ہوئی بوڑھی اس وقت بالکل دس برس کی معصوم نتاشا معلوم ہو رہی تھی!

"نہیں میڈم نہیں ——" میں نے سر کو جھٹک دیا۔
"میں وہ اقبال نہیں —— وہ کوئی اور اقبال ہوگا!
اقبال ہندوستان کا عظیم شاعر تھا نا؟
میں بھی اسی طرح شاعر ہوں —— صرف شاعر...!!"

---

# [illegible]زل

پروفیسر مہندر پرتاپ چاند ایم۔ اے

[illegible]ی تمہی چالیں خوب ہم سمجھتے ہیں
[illegible]بھی تجھ کو اے واعظ! محترم سمجھتے ہیں

اہلِ غم کی باتوں کو اہلِ غم ہی جانیں گے
اِن لطیف باتوں کو آپ کم سمجھتے ہیں

[illegible]نِ حق پرستی ہے اپنی مے پرستی بھی
[illegible]ن پائے ساقی کو ہم حرم سمجھتے ہیں

دشمنِ دل و جاں ہیں دوستوں کی سب باتیں
پھر بھی ہر ستم کو ہم اک کرم سمجھتے

قابلِ پرستش ہیں وہ عظیم لوگ اے چاند
جو پرائے غم کو بھی اپنا غم سمجھتے ہیں

# غزل

سیف سہسرامی

بدلی بدلی سی محبت کی فضا ہے جیسے
تم خفا ہو تو زمانہ بھی خفا ہے جیسے

ضبطِ غم پر یہی محسوس کیا ہے جیسے
اپنا ہی خونِ جگر ہم نے پیا ہے جیسے

مجھ سے نظریں بھی ملاتے ہوئے وہ ڈرتے ہیں
میری آنکھوں میں مرا درد چھپا ہے جیسے

کانپ اٹھتا ہے کچھ اس [illegible]
آندھیوں میں کوئی ننھا سا دیا ہے جیسے

وہ جفاؤں پہ بھی مسرور نظر آتے ہیں
یہ بھی اے سیف کوئی رسم وفا ہے جیسے

# جیت

بشیر عالم بی۔ اے

۲۱، حبیب اللہ ہوسٹل، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

محترم [illegible] صاحب، آداب

ایک افسانہ "جیت" لے کر "بیسویں صدی" کی بزم میں حاضر ہو رہا ہوں۔ یہ افسانہ میں نے کیٹس کی نظم *Ode to a Nightingale* کے ان اشعار سے متاثر ہو کر لکھا ہے ——

*"Where but to think is to be full of sorrow*
*And leaden-eyed despairs;*
*Where Beauty can not keep her lustrous eyes,*
*Or new Love pine at them beyond tomorrow.*

میں نے پلاٹ ڈیولپ کرنے میں کافی انرجی لگائی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں کیرکٹرز کے ساتھ انصاف نہ کر پایا ہوں، کیونکہ مجھے ایک حقیقت سے پردہ فاش کرنا تھا۔ پیار اور آنسو اسی طرح ایک ساتھ جڑے ہیں جس طرح جسم اور روح، اور جس [illegible]م فنا ہو جاتا ہے لیکن روح زندہ رہتی ہے اُسی طرح آنسو رومال کی تہوں میں ضرور جذب ہو سکتے ہیں لیکن وہ پیار کی روشنی جو مدھو کی قربت نے بخشی تھی، کبھی بجھ نہیں سکتی۔ میں اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ آپ کی حوصلہ افزائی میرے لیے مشعلِ راہ ہوگی...

نیاز مند —— بشیر عالم

یونیورسٹی میں دو سال گزارنے کے بعد میں یہاں کی ساری رنگ رلیوں سے آشنا ہو چکا تھا۔ اِسی یونیورسٹی کی حسین فضاؤں میں بی۔ اے کیا تھا لیکن جب سے میں نے ایم۔ اے میں داخلہ لیا ہے میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں اب تک بہت باتوں سے ناواقف تھا۔ خاص طور سے میں نے جو نئی بات پائی وہ لڑکیوں کی بے باک اور چنچل ادائیں ہیں۔ اِس کا اندازہ مجھے پہلے ہی دن ہو گیا میرے دو چار دوست ایسے تھے جنھیں میں جانتا تھا کہ انھوں نے بھی میرے مضمون میں داخلہ لیا ہے۔ یہ اتفاق تھا کہ جب میں پہلے دن کلاس اٹینڈ کرنے پہنچا تو [illegible]

چلے گئے تھے۔ میں لیکچر تھیٹر کے باہر ٹیچر کے آنے کا انتظار کر رہا تھا کہ چار لڑکیاں تیز ہوا کے جھونکے کی طرح میرے پاس آئیں۔ جن میں سے ہر ایک ہالی ووڈ کی ہیروئن معلوم ہو رہی تھی۔ ایک لڑکی میری طرف بڑھ کر اپنے بال پیشانی سے ہٹاتے ہوئے مخاطب ہوئی۔

"O Mr. What are you doing here?" (جناب! یہاں آپ کیا کر رہے ہیں؟)

میں نے ماحول کا جائزہ لیا اور بہت اطمینان سے بولا: ——

"observing the beauty of the [illegible]" (میں کلاس کی خوبصورتی

ایک لڑکی جو شاید انگریزی زیادہ نہ بول سکتی تھی بولی "یہ لوگ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" اس پر سبھی لڑکیاں قہقہہ لگاتی ہوئی نکل گئیں۔ مجھے سخت غصہ آرہا تھا اور دوسری طرف اُن کی بیباکی پر حیرت ہورہی تھی۔ میں اُن لڑکیوں کی اس بے باکی کو برداشت نہ کرسکتا تھا۔ اِس لئے پیریڈ ختم ہونے سے پہلے ہی آنند، جمال اور وجے سے سارا واقعہ بتادیا تاکہ کمرے کے باہر انہیں مزہ چکھایا جائے اور اُس لڑکی کو اشارے سے دکھا بھی دیا جس نے مجھ سے سوال کرنے کی جرأت کی تھی تاکہ اُسی کو ٹارگیٹ بنایا جائے۔ حاضری کے وقت اُس کا نام بھی معلوم ہوگیا۔ اُس کا نام مدھو تھا۔ پیریڈ ختم ہوا اور ہم لوگ جلدی سے کمرے کے باہر آکر اپنے شکار کی تاک میں آکر کھڑے ہوگئے۔ لیکن وہ تو

•••——•——•••——•——•••

- اپنے کو محنت و مشقت کا عادی بناؤ۔ آج تمہارے خادم موجود ہیں اور کل نہ ہوئے اور حالاتِ زمانہ سے یہ بعید نہیں تو اُس وقت تم بے دست و پا سے ہوگے۔ (ارسطاطالیس)
- خدا کی خوشنودی انسانوں کی خدمت میں ہے، تسبیح اور مُصلّیٰ میں نہیں۔ (شیخ سعدیؒ)
- محض ایک عیب کی وجہ سے انسان کی اور خوبیوں کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ (افلاطون)
- مسرت اُس حقیقی خوشی کا نام ہے، جسے حاصل کرنے پر متاسف نہیں ہونا پڑتا۔ (سقراط)

•••——•——•••——•——•••

غضب کی لڑکی نکلی۔ وہ اپنی اُنھیں سہیلیوں کے ساتھ اِس ناز و انداز سے گزر گئی کہ ہمت ہی نہ ہوئی کہ ہم اُس سے کچھ کہتے۔ پھر بھی ہم لوگوں نے جی نہ ہارا اور دوسرے دن کے لئے طے کیا کہ کل پیریڈ شروع ہونے سے پہلے ہی وہاں پہنچ جائیں گے۔

میں اور میرے دوست وقتِ معینہ پر یونیورسٹی پہنچ گئے۔ طلباء دھیرے دھیرے کلاس میں آرہے تھے۔ ہم کمرے کے باہر کھڑے اپنے اپنے ڈائیلاگ کی ریہرسل کر رہے تھے جو اُس لڑکی سے ابھی بولنے تھے۔ جب تک میں نے ڈیپارٹمنٹ کے باہر نظر دوڑائی۔ وہی لڑکی اپنے حُسن اور رعنائی سے بے نیاز شاخِ گُل کی طرح لچکتی چلی آرہی تھی۔ وہ ہمارے پاس سے گزری تو میں نے اشارے سے اُسے روک لیا اور اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجئے۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"کہیئے۔" اُس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

جب تک جمال بول پڑا۔

"مس مدھو! آپ ہماری بات سُننے کے بعد کیا کہیں گی میں جانتا ہوں۔ آپ کے حُسن کی تعریف کے سوا کر ہی کیا سکتے ہیں۔"

لیکن وجے نے جمال کی بات بیچ ہی کاٹ دی۔

"مدھو جی! آپ نہیں جانتیں اِن سب کا ایک ہی کام ہے لڑکیوں کو چھیڑنا!"

"اچھا!" اُس نے حیرت کے انداز میں کہا۔

"ویسے میں اپنے بارے میں کیا بتاؤں۔ تھوڑے ہی دنوں میں آپ کو معلوم ہوجائے گا۔ اگر آپ تھوڑی سی دیر زحمت گوارا کریں تو دل میں ایک طوفان مچادینے والی خبر سُنادوں؟"

"سُنائیے۔" وہ مطمئن لہجہ میں بولی۔

"کل رویندرالیہ میں مس لکھنؤ بیوٹی کا ٹیسٹ ہونے جارہا ہے۔ اُس میں آپ پارٹیسپیٹ (Participate) کریں۔ خدا نے آپ کو بے پناہ حُسن دیا ہے، اُس نے آپ کو بنانے میں نہ جانے کتنے دن اور کتنی راتیں ایک کردی ہوں گی۔ آپ ایوارڈ جیت کر اُسے تو یہ احساس دلادیجئے کہ اُس کی محنت رائیگاں نہیں گئی، اُسے اُس کی کاوش کا صلہ مل گیا۔"

وجے نے جیسے ہی بات پوری کی لڑکی پُر زور قہقہہ لگاتی ہوئی بولی۔

"آپ لوگ بھی عجیب ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگوں کو ابھی تک نہیں معلوم کہ آپ کے کلاس کی ایک اسٹوڈنٹ مس انڈیا بھی ہے اور وہ مس یونیورس کا نٹیسٹ میں حصہ لینے کے لئے بیرونِ ملک جارہی ہے اور وہ میں ہوں۔ سمجھے؟"

ہم لوگوں کا سر شرمندگی سے جھک گیا اور ہم اِس سے آگے کچھ نہ بول سکے۔ وہ بھی پیر پٹکتی ہوئی کلاس روم میں چلی گئی۔ دو پیریڈ لگاتار ہوتے رہے۔ لیکن تیسرا جو ڈاکٹر سریواستوا کا تھا، اُن کی غیر حاضری کی وجہ سے خالی تھا۔ پھر بھی ہم کلاس روم میں بیٹھے ایک شاعر پر بحث کر رہے تھے۔ اِتنے میں وہی لڑکی ہم لوگوں کے پاس آئی اور میری طرف مخاطب ہوکر بولی۔

"آپ تھوڑی دیر کے لئے تکلیف کریں میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

میں پریشان تھا کہ آخر یہ لڑکی مجھ سے کیا چاہتی ہے جو کل ہی سے میرے پیچھے پڑی ہے۔ میں اُس کے پیچھے ہولیا۔ وہ مجھے ایک طرف لے گئی۔

"میری وجہ سے آپ کو اور آپ کے دوستوں کو جو جذباتی تکالیف ہوئی ہیں اُس کے لئے میں بے حد شرمندہ ہوں۔ مجھے آپ معاف کر دیں۔"

میں یقین نہیں کر سکتا تھا کہ اتنی شوخ اور چنچل لڑکی اتنی Emotional ہو سکتی ہے۔ میں نے بھی جذباتی انداز میں جواب دیا۔

"ہماری طرف سے کوئی شکایت نہیں۔ ایسی بھی کیا بات ہے کہ آپ معافی مانگ رہی ہیں۔" حالانکہ مجھے اُس پر غصہ آیا تھا اور کبھی میں نے اُس سے انتقام لینے کے سارے پلان بنائے تھے۔ لیکن اُس کے جذباتی چہرے نے میرے دل کو پتھر سے موم کر دیا۔

اور پھر اُس نے آنکھوں میں گہری اُداسی لئے کہا: "میں نے اِس بات کو ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ میری یہ بیباکی اور دوسروں کو ٹیز (tease) کرنے کی عادت لوگوں کی تکلیف کا باعث بن جاتی ہے۔ ویسے نہ میں مس انڈیا ہوں اور نہ میں مس یونیورس بننے باہر ہی جا رہی ہوں اور نہ مجھے اس کا شوق ہی ہے۔"

میں نے بات میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا: "آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ اپنی کمپنی کی حرکتوں میں کم حصہ لیں۔"

"آپ نہیں جانتے یہ کمپنی میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ انھیں سہیلیوں میں تھوڑی دیر کے لئے سارا دکھ، ساری خوشی پا لیتی ہوں۔" اُس نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہا اور پھر بات ادھوری ہی رہ گئی۔

پیریڈ شروع ہو گیا۔

---

اِس گفتگو کے بعد وہ مجھ سے پھر ملی۔ کافی باتیں ہوئیں۔ کچھ کورس کی، کچھ اِدھر اُدھر کی۔ وہ عجیب لڑکی تھی۔ ہنستے ہنستے کسی بات پر بہت سنجیدہ ہو جاتی اور پھر اِتنا بہک جاتی کہ اپنے آپ کو کھو بیٹھتی۔ پھر بھی وہ میری توجہ کا مرکز بنی رہی اور اُس سے ملنے کا سلسلہ جاری رہا۔ باتوں میں اکثر کسی نہ کسی گہرے مسئلہ پر بحث ہوتی۔ وہ بہت اچھا جواب دیتی تھی اور اکثر اُسی کی جیت ہوتی تھی اور اب میں اُس کی باتوں پہ نہیں، اُس کے گلابی رُخساروں پر اُس کی گھنیری زُلفوں پر، اُس کی اسموکی (Smoky) آنکھوں پر زیادہ غور کرتا تھا۔ بات کرتے وقت اُس کی مومیا انگلیوں کو دیکھتا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ایک لڑکی کو اتنے قریب سے دیکھا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اُسے جس دن نہ دیکھتا محسوس ہوتا کہ کوئی بہت قیمتی چیز کھو گئی ہے۔ ایک انجان کسک میرے دل میں رہ رہ کر انگڑائیاں لیتی رہتی اور جب میں اُسے دیکھ لیتا، باتیں کر لیتا، محسوس ہوتا سارے جہان کی خوشیاں میرے قدموں کو چوم رہی ہیں۔

---

ایک دن میں صبح صبح کلاس پہنچا۔ میں نے دیکھا وہ دروازے پہ کھڑی میرا انتظار کر رہی ہے۔ بغیر کچھ کہے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی ڈیپارٹمنٹ کے باہر لے آئی اور چہکتے ہوئے بولی: "آج مجھے آپ سے بہت ضروری موضوع پر بات کرنا ہے۔" میں نے سر جھکا دیا۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر!" اور ہم ملک باغ کے اندر چلے گئے۔ اُس نے کافی کا آرڈر دے کر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"زندگی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

اُس کے اِس سوال پر میں کچھ دیر حیرت میں پڑ گیا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا: "میں کوئی فلاسفر تو نہیں ہوں، پھر بھی جواب دینے کی کوشش کروں گا۔" اور پھر میں اطمینان سے کرسی پر بیٹھ کر ٹیکتے ہوئے کہنے لگا: "میں مدھو!

---

- بُری کتابیں ایسا زہر ہیں جو جسم کو نہیں رُوح کو مار ڈالتی ہیں۔ (ٹالسٹائی)
- عادت کی زنجیریں دیکھنے میں کتنی چھوٹی نظر آتی ہیں لیکن آہستہ آہستہ اتنی مستحکم اور بڑی ہو جاتی ہیں کہ ساری زندگی توڑے نہیں ٹوٹتیں۔ (ڈاکٹر جانسن)
- سب سے بڑی دولت صحت مند جسم ہے۔ (ایمرسن)
- کتابیں جوانی میں رہنما، بڑھاپے میں تفریح اور تنہائی میں رفیق اور مونس و غمگسار ہیں۔ (سر جان لبک)
- جس نے خود کو پہچان لیا اُس نے خدا کو پہچان لیا۔ (شیکسپیئر)

---

اِس دُنیا میں انسان کے وجود کے ساتھ اُس کی زندگی شروع ہوتی ہے اور اپنی زندگی کے آغاز سے انجام تک وہ اِس دُنیا کو نئے رُوپ میں نئے انداز میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُسے اگر آج ناکامی کا سامنا ہوتا ہے تو وہ غم کے مارے مر نہیں جاتا، تڑپ تڑپ کر جان نہیں گنواتا، سسک سسک کر آنسوؤں کی جھیل میں اپنا وجود نہیں کھو بیٹھتا۔ بلکہ اِس آس پر سو جاتا ہے کہ صبح کا اُجالا اپنی دلکش ہوتی روشنی میں اُس کی کامیابی کا پیکر چھپا کر ضرور لائے گا! اور اِسی طرح وہ اپنی زندگی کو ایک آس پر قائم رکھتا ہے۔ اُس کے جتنے غم اور خوشیاں ہوتی ہیں زندگی میں اِس طرح گھل جاتی ہیں کہ وہ کبھی اپنی بدنصیبی اور بد قسمتی پر افسوس نہیں کرتا۔"

میں نے اپنی بات جیسے ہی پوری کی، مدھو مسکرا کر بول پڑی: "آپ بہت

# غزلیں

## کیف مرادآبادی

سب کی نظر میں عشرتِ حالی کس کو سناؤں کون سنے
غم کی کسی نے قصۂ جانی کس کو سناؤں کون سنے

حالِ دلِ مغموم ہوا کیا ہے تازہ جو ہے رنجِ فراق
زخم ہرا اور چوٹ پرانی کس کو سناؤں کون سنے

یاد میں اُس کی اب تک جانے کتنے دن روتے بیتے
گزری تھی اک رات سہانی کس کو سناؤں کون سنے

چشمِ کرم کا ایک اشارہ عشق سے جو چاہے لے لے
جنسِ گراں کی یہ ارزانی کس کو سناؤں کون سنے

لمحہ لمحہ کی شب کا دل نے کیسے گزارا ہے
وقت ہے کم قصہ طولانی کس کو سناؤں کون سنے

وہ مری ہر حالت سے باخبر اُن کی نگاہیں بیگانہ
وہ چپکے چپکے نگرانی کس کو سناؤں کون سنے

## رئیس رامپوری

ہم اِس روش سے غمِ زندگی کے ساتھ چلے
کہ جیسے کوئی کسی اجنبی کے ساتھ چلے

کسی کی مست نگاہیں جو کار فرما تھیں
تو آج بزم میں ساغر کسی کے ساتھ چلے

خرد کو راہ روی کا شعور آ جائے
جو چند گام وہ دیوانگی کے ساتھ چلے

جو ہم سفر نہیں کوئی تو اپنا سایہ ہے
بھروسہ یہ ہے کہ جیسے کسی کے ساتھ چلے

خیال اپنا تو یہ ہے کہ کاروانِ حیات
رئیس کچھ بھی ہو زندہ دلی کے ساتھ چلے
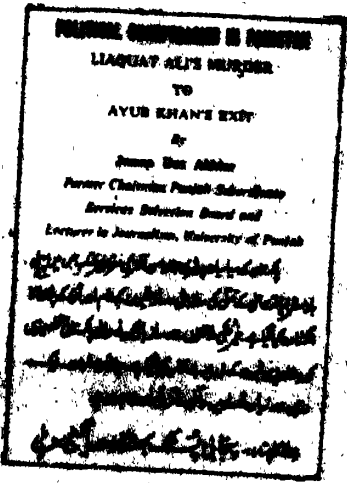
## آمر امیری

دیکھا تو لگا راز کہ دیکھا ہے کسی نے
کیا سحر دکھایا ہے تری جلوہ گری نے

کیوں شعلۂ آلام کا ممنون نہ ہو دل
اِس ذرّے کو خورشید بنایا ہے اُسی نے

پھر سجنے لگے میرے خیالوں کے در و بام
پھر رکھا قدم بزمِ تصور میں کسی نے

اِک لذتِ مانوس سے سرشار ہے ہر دل
کیا زخم لگایا تری بیگانہ روشی نے

اے کم نظرو وقت کی آہٹ پہ دھرو کان
آگاہ کیا ہے تمہیں ہر لمحہ کسی نے

## علی قیصر

آئینہ دارِ برقِ سرِ طور ہو گئے
نزدیک آ کے آپ بہت دُور ہو گئے

آلام کا ہجوم ہوا غم کا اژدہام
آیا ترا خیال تو مسرور ہو گئے

مقتل قدم قدم پہ سجایا ہے وقت نے
ہم لوگ اپنے دَور کے منصور ہو گئے

جن مشغلوں سے ہم نے ذرا جی لگا لیا
وہ مشغلے حیات کا دستور ہو گئے

بڑھتا گیا کسی کے تغافُل کا سلسلہ
قیصر جو دل میں زخم تھے ناسُور ہو گئے

اس بار آپ کا ٹیلی فون بل زیادہ آیا!! ذرا دھیان رکھئے۔
سکتا ہے آپ کی غیر حاضری میں کوئی شخص آپ کا ٹیلی فون ناجائز اور اندھا دھند استعمال
رہا ہو۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، بلاواسطہ ٹرنک ڈائلنگ کے شروع ہو جانے
سے ٹرنک کال اب لوکل کال کی طرح ہی کی جاتی ہیں۔
یجئے گا، کوئی آپ کے فون سے ٹرنک کال تو نہیں کرتا۔ یاد رکھئے پبلک ایس ٹی ڈی
ہاں آپ کے میٹر میں فی 100 کیلومیٹر کے فاصلے کے لئے فی منٹ مقامی یعنی لوکل کال کے
تقریباً 5 یونٹ درج ہو جاتے ہیں۔
دھیان رکھئے
اور بل کو بڑھنے سے روکئے
بھارتی ڈاک و تار

# سلسلے شاموں کے

شاہ نواز

نمبر ۶ اعلیم الدین اسٹریٹ۔ کلکتہ نمبر ۱۶

محترم خوشتر گرامی صاحب آداب و خلوص

ایک افسانہ "سلسلے شاموں کے" ارسال خدمت ہے۔ اُمید ہے پسند کئے گئے رسید اور آپ کی گرامی قدر رائے کے لئے چشم براہ رہوں گا۔ آپ کی رائے میرے لئے مشعل راہ ہوگی . . .

آپ کا ——— شاہ نواز

دل چاہتا ہے کہیں گم ہو جاؤں، کھو جاؤں۔ اِس طرح کہ نہ کوئی اور مجھے پا سکے نہ میں خود کو پا سکوں۔ یاد بالکل مٹ جائے۔ ہر جذبہ مر جائے۔ ہر احساس مُردہ ہو جائے۔ سوچنے، سمجھنے کی طاقت ختم ہو جائے لیکن ایسا کہاں ہو سکتا ہے کہ میں جو چاہوں وہ بن ہو جائے؟

ابھی کچھ دیر پہلے دوستوں میں تھا۔ ہر وقت ہنسنے والے باغ و بہار دوستوں میں مذاق ہو رہا تھا، قہقہے لگ رہے تھے۔ لیکن ہنستے ہنستے نہ جانے کہاں سے اچانک تمھارا چہرہ آنکھوں کے سامنے آگیا تو وہ سارا مذاق، وہ قہقہے سب بُرا معلوم ہونے لگا۔ میں اُٹھ آیا اور یہاں آکر لیٹ گیا۔

ساون کی مَیلی مَیلی دُھوپ آدھی چھت پر پھیلی ہوئی ہے۔ آسمان کے کچھ حصّہ پر بادلوں کے ٹکڑے آہستہ آہستہ تیر رہے ہیں۔ کچھ حصّہ صاف ہے۔ لیکن اُس شام تو آسمان بادلوں سے گھرا ہُوا تھا۔ سرد ہَوا کپکپی طاری کر رہی تھی۔ جنوری کی سرد ترین شام تھی وہ، جب تم سے مُلاقات ہوئی۔ لیکن تم سے ملنے کے بعد سردی کا سارا احساس ہی مِٹ گیا تھا۔

سُورج اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ کچھ ہی دیر میں اپنی منزل سے جا ملے گا اور شام اپنی تمام تازگی اور نکھار کے ساتھ ماحول پر محیط ہو جائے گی۔ لیکن وہ شامیں جو تمھارے ساتھ گزریں میرے احساس پر اب تک محیط ہیں۔

ایک شام ——— آسمان بالکل صاف و شفاف تھا۔ ٹھنڈی خوشگوار ہَوا گومتی میں لہریں پیدا کر رہی تھی۔

شہید اسمارک کے لان پر بیٹھے بیٹھے میں نے سگریٹ نکالا۔

"پھر سگریٹ! ابھی تو پی چکے ہیں" تم نے سگریٹ چھین کر پھینک دیا۔

"اماں لو بھئی! سبھی پھینک دو!" میں نے سارا پیکٹ تمھارے حوالے کر دیا اور تم نے نہایت اطمینان سے اُسے گومتی کے سپرد کر دیا۔

"ارے ارے! واقعی پھینک دیا۔ بڑا ظلم کرتی ہو!"

"آخر آپ کو سگریٹ پینے سے کیا ملتا ہے؟ جانتے ہیں کتنا نقصان کرتا ہے۔ پھر بھی پیتے ہیں اور پھر مُنہ سے ہر وقت سگریٹ کی بُو بھی آیا کرتی ہے۔"

"اور اس بُو کو ظاہر ہے آپ سے زیادہ کون محسوس کر سکتا ہے!" میں نے جملہ چُست کیا۔

"کیا مطلب؟" تم نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا پھر "اوہ! دھت!!" کہہ کر مُسکرا دیں اور نظریں جُھکا لیں۔

ایک اور ایسی ہی شام کو ——— سلور اوک کا پُر فضا ماحول تھا۔

"جی چاہتا ہے ایک فلم بنا ڈالوں" میں نے مِلک بادام کی چُسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"ضرور بنایئے!" تم مُسکرائیں۔

"جانتی ہو کس کہانی پر بناؤں گا۔ اپنی کی "نظارہ درمیاں ہے" اسکرین پلے اور مکالمے راجندر سنگھ بیدی سے لکھواؤں گا۔ گیت ساحر کے دُھنیں برمن دادا بنائیں گے۔ ڈائرکشن کے لئے بمل رائے ہوتے تو . . مگر اب

[illegible] وابستہ ہوتی ہے جسے ہم پا کسی کسی چاہت [illegible]
[illegible] سکتے ہیں۔"

"آپ اپنے کو اتنا بچپول کہتے ہیں" تم نے خفگی سے کہا تھا۔

"جی ہاں! جب آپ ہنستی ہوتی ہیں"

تم بے ساختہ ہنس پڑی تھیں۔

تمہاری اس ہنسی کی پرچھائیاں آج تک میری آنکھوں میں جھلملاتی ہیں اور دل کہتا ہے چاہے تم میری نہ بنتیں لیکن میرے سامنے بیٹھ کر صرف اسی طرح ہنسا کرتیں۔ وہی بے ساختہ ہنسی اور میں دیکھا کرتا۔ لیکن یہ آرزو پوری ہوتی نہ پوری ہو سکے گی کہ سب کچھ بھول جاؤں۔ تمہیں بھول جاؤں، تم سے متعلق ہر بات بھول جاؤں۔ کیونکہ جتنا بھولنا چاہتا ہوں اتنا ہی سب یاد آتا ہے۔ تمہاری ایک ایک بات یاد آتی ہے۔ تمہاری زندہ دلی، تمہارا اندازِ گفتگو سبھی کچھ تو۔

ایک بار تم کوئی رسالہ دیکھ رہی تھیں۔ اس میں کہیں پر ایک شعر تھا:

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر، کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں، مرا حق ہے فصلِ بہار پر

تم نے شعر پڑھنے کے بعد کہا تھا "اُف! یہ اکڑ!!"

تمہارے اس دلچسپ تبصرے پر میں کتنا ہنسا تھا۔ لیکن اب کبھی کسی بات پر ہنستا ہوں تو کہیں کوئی چھپا چھپا سا احساسِ ندامت سا ہونے لگتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے ہنسنے کا، خوش رہنے کا اب کوئی حق نہیں۔ بس چُپ چاپ جیے جاؤں۔

گھر والے کہتے ہیں اب شادی کر لو۔ ملازمت بھی تو مل گئی ہے۔ لیکن جس سے شادی کروں گا اُسے وہ پیار نہ دے سکوں گا جو دینا چاہئے، تو یہ اُس پر ظلم نہ ہوگا؟

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ کبھی کبھی دل چاہتا ہے یہاں سے کہیں دُور، بہت دُور چلا جاؤں۔ ایسی جگہ جہاں نہ کوئی مجھے جانتا ہو نہ میں کسی کو۔ جہاں سب اجنبی ہوں، بیگانے ہوں۔ اتنے اجنبی اور بیگانے کہ کسی کو اپنا کہنے کا تصور تک نہ پیدا ہو۔

تم سے کوئی شکوہ نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن کبھی کبھی یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ کبھی تمہیں اپنے کیے پر پچھتاوا ہو اور تم میرے پاس آکر جھکی جھکی نظروں سے اس کا اظہار کرو۔

لیکن تمہیں پچھتاوا کیوں ہو؟ تم نے تو جو کیا ٹھیک ہی کیا۔ ایک ایسا آدمی کسی کو کیا شکھ دے سکتا ہے جس کا کُل سرمایۂ حیات اُس کی چند کہانیاں ہوں!

یہ سب کچھ بالکل روایتی کہانیوں ہی کی طرح ہوا تھا۔ لیکن جو ہوا میں اُس کا تمہیں کوئی الزام نہ دوں گا۔ تمہارا کوئی قصور نہیں۔ قصور تو میرا ہی ہے۔ کیوں میں نے اِس انداز سے سوچا، کیوں اِتنا جذباتی ہو گیا۔ اتنے احساسات، اتنے خواب تم سے کیوں وابستہ کر لئے؟

زندگی بہت طویل محسوس ہونے لگی ہے یاسمین! کسی طرح صرف اتنا بتا دو کہ زندگی کا یہ طول کس طرح جھیلوں، کب تک جھیلوں؟

پتہ نہیں رات کب گہری ہوئی اور نہ یہ پتہ چلے گا کہ کب ختم ہو گئی، لیکن پتہ چلے یا نہ چلے رات تو ڈھل ہی جائے گی لیکن زندگی کا یہ طول۔۔۔!!

**محمد فیاض الدین احمد خاں فیاض گوالیاری بی۔ اے**

آپ نے دیکھی ہوں گی کچھ پرچھائیاں
آپ کیوں لیتے بھلا انگڑائیاں

تم رکے گھٹنے لگا سینے میں دم
تم چلے، چلنے لگیں پُروائیاں

اب بھی دوڑا ہیں اُجالوں کی طرف
میرے پیچھے پڑ گئیں پرچھائیاں

روشنی سے بھاگنے والے یہ دیکھ
تیرے آگے ہیں تری پرچھائیاں!

ان کو دیکھا سج گئی دل کی برات
دھڑکنوں میں بج اُٹھیں شہنائیاں

فکر کو فیاض اوجِ ماہ دے
کب تک آخر قافیہ پیمائیاں

**مس غزالہ اشفاق شاہجہانپوری**

منزلِ عشق میں آلام بہت ہوتے ہیں
لوگ اِس راہ میں ناکام بہت ہوتے ہیں

جن کی آغاز ہی آغاز پہ رہتی ہے نظر
ایسے بیگانۂ انجام بہت ہوتے ہیں

میرے گھر آتے ہی کہتے ہیں کہ: جانا ہے ہمیں
وہ جب آتے ہیں اُنہیں کام بہت ہوتے ہیں

شیشۂ دل کو مرے توڑ کے پچھتاؤ گے
جامِ جم ایک ہی تھا، جام بہت ہوتے ہیں

اے مری سمت سے منہ پھیر کے جانے والے
اس ادا میں تری پیغام بہت ہوتے ہیں

**مس نسیم پرویز**

ہم ترے دل کا راز کیا جانیں
کیوں ہے تو بے نیاز کیا جانیں

کیا گزرتی رہی ہے اِس دل پر
آپ بندہ نواز کیا جانیں

شیخ جی آپ راہِ اُلفت کے
یہ نشیب و فراز کیا جانیں

ظاہری حال دیکھنے والے
دلِ کا سوز و گداز کیا جانیں

ٹوٹ جاتا ہے کیسے شیشۂ دل
بے خبر، بے نیاز، کیا جانیں

ہے حقیقت کچھ اور سنئے پرویز
اسے اہلِ مجاز کیا جانیں

**حامد مینائی شاہجہانپوری**

زخم کچھ یادگارِ ستم رہ گئے — تم نے جو غم دئے تھے وہ غم رہ گئے
کیا کسی سے کہیں حالِ وارفتگی — کارواں چل دیا اور ہم رہ گئے
پی کے ساقی چلے بھی گئے بادہ کش — تشنہ لب تیری محفل میں ہم رہ گئے
دورِ حاضر میں گلچیں تو ہیں سیکڑوں — گُلستاں کے پرستار کم رہ گئے

اب نہ اہلِ کرم ہیں نہ وہ محفلیں
دل پہ حامد نقوشِ کرم رہ گئے

# خندۂ گل

## آفتاب احمد شوری

شاہین بک ڈپو، پکا باڑار، آسنسول

محترم خوشتر صاحب تسلیم

"خندۂ گل" لے کر پہلی بار "بیسویں صدی" کی عظیم پاکیزہ ادبی زندگی سے بھرپور ادبی محفل میں شریک ہو رہا ہوں۔ آپ نے کتنے لعلوں کو آفتاب بنایا ہے اس لئے یقین ہے کہ آپ مجھے بھی شرفِ باریابی بخشیں گے....

خلوص کار ——— آفتاب احمد شوری

★

### ● آم اور عوام ———

ایک بار بستی میں جون کے مہینے میں مشاعرہ ہوا۔ اُس کی رونق بڑھانے کے لئے جو شعراء باہر سے تشریف لائے تھے اُن کے اعزاز میں دوسرے دن میں نے غریب خانے پر آموں کی دعوت کا اہتمام کیا جس میں لوگ "دسہری" اور "سفیدے" کی قاشوں کے ساتھ ساتھ پُرلطف باتوں سے بھی محظوظ ہوئے۔ شکیل بدایونی دسہری جوانی میں بہت کم محبوب ہو گئے ایکے بعد دیگرے دو تین قاشیں منہ میں رکھتے ہوئے بولے۔

"لندن میں سب کچھ ہے لیکن آم وہاں کبھی نہیں۔"

اُن کے اس جملے پر نریش کمار شاد ہنس کر بولے۔

"وہاں آم نہیں ہیں تو کیا عوام تو ہیں"

### ● تنقید ———

حلقۂ اربابِ ذوق کی ایک نشست میں قتیل شفائی کے ایک بے تکلف دوست نے کہا

"آپ کی نظم پر ایک صاحب سخت تنقید کر رہے تھے۔"

قتیل نے پوچھا

"کیا وہ شاعر ہیں؟"

دوست نے جواب دیا۔

"نہیں"

قتیل نے یہ سن کر انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"جو لوگ کچھ کرتے ہیں وہ اکثر خاموش رہتے ہیں۔ لیکن جو کچھ نہیں کرتے وہ صرف تنقید کرتے ہیں۔"

### ● غلط فہمی ———

جوش ملسیانی نے کسی شخص پر خفا ہوتے ہوئے کہا ——

"میں تو آپ کو شریف آدمی سمجھا تھا"

"میں بھی آپ کو شریف ہی آدمی سمجھا تھا" اُس شخص نے برہمی میں بے سوچے سمجھے کہہ دیا۔

"تو آپ ٹھیک سمجھے۔ غلط فہمی مجھی کو ہوئی" جوش نے کمال عجز سے اعتراف کیا۔

### ● مشاعرے کے بعد ———

مشاعرے کے بعد عبدالحمید عدم سے کسی شاعر نے کہا

"قبلہ! حکومت ادیبوں کے لئے ایک علیحدہ کالونی بنا رہی ہے۔"

عدم نے حیران ہو کر کہا:

"ڈسٹرکٹ جیل میں یا سنٹرل جیل میں؟"

---

## ● تلخ چائے

کنہیا لال کپور ایک بار مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے کے لئے گئے۔

مولانائے موصوف نے ان کی بڑی خاطر مدارات کی اور خاص طور پر ان کے لئے چائے تیار کی جس کا رنگ گہرا سرخ تھا۔

کپور نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر منہ بنایا اور کہا

"یہ مدتخ ہے؟"

مولانا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا

"پیے جاؤ پیے جاؤ۔ حق ہمیشہ ہی تلخ ہوتا ہے!"

## ● سعادت مند

ایک ادبی محفل میں [illegible] نے [illegible] سے کہا

"[illegible] تمہارے سعادت [illegible] صاحب [illegible] کی اولاد سعادت مند ہوتی ہے [illegible] صاحب!" [illegible] نے [illegible] مسکراتے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن خوش قسمتی سے میرے [illegible] سعادت مند ہی ہیں!"

---

[illegible] کہ [illegible] سعادت مند [illegible]

[illegible] کتابت کر [illegible]

---

**فردوسِ گوش** حضرت عرش ملسیانی داغ مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ایسے صاحبِ فن اور صاحبِ فکر کا یہ تیسرا مجموعۂ کلام اپنی مثال آپ ہے۔ یہ کتاب اس سال کا بہترین ادبی تحفہ ہے۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب، کاغذ عمدہ۔ قیمت صرف چھ روپے

**دیوانِ غالب معہ شرح** ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی دیوانِ غالب کی یہ شرح موجودہ تمام شرحوں سے معتبر و مستند ہے۔ ہندوستان کے اہلِ علم نے اس کے بارے میں اچھی آراء کا اظہار کیا ہے۔ قیمت چھ روپے۔

**نغمۂ سرمد** شہید سرمد کی فارسی رباعیوں کا ترجمہ اردو رباعیوں میں۔ از عرش ملسیانی۔ سرمد کے سوانح بھی کتاب میں درج ہیں۔ پہلے اصل رباعی ہے اس کے نیچے اردو ترجمہ۔ اردو اور فارسی ادب اور تصوف کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نادر تحفہ۔ قیمت پانچ روپے

**شرارِ سنگ** ہندوستان کے مقبول و ممتاز شاعر حضرت عرش ملسیانی کا تیسرا مجموعۂ کلام۔ صدرِ جمہوریۂ ہند جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اس مجموعے کو بہت پسند فرمایا ہے۔ قیمت آٹھ روپے۔

**اردو کی مزاحیہ شاعری** مرتبہ جناب عرش ملسیانی۔ میر سے لے کر دورِ حاضر تک کے مزاحیہ اور طنزیہ کلام کا بے نظیر انتخاب۔ اس قسم کی کوئی کتاب اردو ادب میں موجود نہیں۔ پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔ پرانے شعراء کے ساتھ ساتھ سید محمد جعفری، مجید لاہوری، راجہ مہدی علی خاں، دلاور فگار، واہی، شاد عارفی اور بہت سے شعراء کا کلام اس میں درج ہے۔ اعلیٰ وارفع مزاح۔ ابتذال نام کو نہیں۔ مبسوط مقدمہ۔ کتاب نہایت دلچسپ بھی ہے اور تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اردو ادب میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ قیمت محض آٹھ روپے محصول ڈاک علاوہ۔

---

**مشہور افسانہ نگار حضرت** [illegible] مناسب [illegible] پر اصلاح [illegible] کرتے ہیں۔ ضرورت مند احباب خصوصاً نئے لکھنے والے اپنے [illegible] افسانوں اور کتابوں پر اصلاح کے لئے ایک مستند ادیب کی خدمات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ یا ٹکٹ بھیجئے۔

پتہ: حضرت [illegible] منگلور [illegible] ۔ یو۔ پی

---

سالِ رواں کا بہترین، معیاری اور دلچسپ ناول

**پتھر کا گلاب** جس میں نفسیاتی، رومانی اور سماجی حقیقتوں کی بڑی فنکاری کے ساتھ عکاسی کی گئی ہے۔ جناب کوثر چاندپوری کا ایسا ناول ہے جو ایک خیالی عورت کے کردار کا نہایت تابناک رُخ پیش کرتا ہے۔ بہترین طباعت و کتابت، اعلیٰ کاغذ۔ قیمت سات روپے۔

**طوفانِ بہار** روس کے عدیم المثال ناول نگار ترگنیف کا رومانی شاہکار جسے حضرت محمود جالندھری نے اردو کا لباس پہنایا۔ جس کا ترجمہ دنیا کی بیالیس زبانوں میں ہو چکا ہے۔ جس کا شمار دنیا کے دس عظیم رومانی ناولوں میں ہوتا ہے۔ جس کی دو کروڑ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ جسے دنیا کے مشہور نقادوں نے لافانی رومان قرار دیا ہے اور جسے اردو میں پہلی مرتبہ ادارہ "بیسویں صدی" دہلی نے شائع کیا ہے۔ یہ ناول پاکیزہ اور دلآویز رومان کی ایک دردانگیز داستان ہے۔ جاذبِ نظر کتابت وطباعت۔ عمدہ کاغذ، پختہ جلد۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

**آوازیں** ابھرتے ہوئے نوجوان [illegible] کے [illegible] رومان کی [illegible]۔ قیمت [illegible] روپے

**پیاسے بادل** جناب [illegible] کا دلچسپ ناول۔ [illegible] دلآویز رومان کی ایک [illegible] داستان [illegible] روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

## غزل

آزاد گورداسپوری بی۔ اے

خود نمائی کا جنوں ہے دل میں اگر بالائے بام دیکھ لیں تو ترسائیے

بات پردے میں کہنا تو اچھا نہیں سامنے آئیے بہانے آئیے

چُھپ کے ناوک چلانے سے کیا فائدہ چار آنکھیں ہوں سینہ بہ تیر آئیے

ہم ہیں سینہ سپر امتحاں گاہِ عشق میں تیر غمزوں کے برسائیے

یوں تو ہر وقت دل بستگی کے لئے سُنتے رہتے ہیں غیروں کی باتیں مگر

ایک دن قصۂ درد و فرقت مرا آپ سُننے کی زحمت بھی فرمائیے

ایسے ترکِ تعلق سے کیا فائدہ دل دکھانے کا کچھ سلسلہ تو رہے

میں کرم سے تو محروم ہو ہی چکا، اب ستم سے بھی مجھ کو نہ ترسائیے

شیخ جی واعظ کی بے وقت کی سرزنش سن کے مجبور رندوں کو کہنا پڑا

باغِ جنت مبارک رہے آپ کو، جامِ کوثر زبانی نہ چھلکائیے

جوشِ مستی میں چپکے سے پیکان میں شیخ صاحب سے آزاد نے کہہ دیا

زندگی کا اگر لطف اُٹھانا ہے کچھ میری جنت میں اک دن چلے آئیے

## غزل

قمر سنبھلی

دفعتاً آج نظر اُن کی پھری ہو جیسے

ہر تمنا مری دم توڑ گئی ہو جیسے

رنگ چہرے پہ کبھی آکے کبھی ابھرے ڈوبے

بزمِ خوباں میں مری بات چلی ہو جیسے

اُن کے ہونٹوں پہ وہ ہلکے سے تبسم کی ضیا

چاندنی غنچوں کے مُنہ چوم رہی ہو جیسے

میٹھی میٹھی سی اُس آواز کا جادو توبہ!

کوئی شے کانوں میں رس گھول رہی ہو جیسے

بارشِ سنگ ہوئی شہر میں جس سمت گئے

جُرمِ اُلفت کی سزا ہم کو ملی ہو جیسے

اِس قدر بھیڑ میں احساس ہے تنہائی کا

ابھی دلّی مجھے راس آ نہ سکی ہو جیسے

کل سرِ راہ قمر کون ملا تھا ہم کو

یوں لگا اُن سے ملاقات ہوئی ہو جیسے

## غزل

مظہر نسیم بی۔ اے

رُت ساون کی جب جب آئے

یاد کسی کی ڈس ڈس جائے

دیکھ لئے سب اپنے پرائے

کوئی نہیں جو درد بٹائے

رُوٹھا ہوا دل ایک نہ مانے

دردِ تمنا لاکھ منائے

جاگ رے مانجھی، جاگ رے سائیں

دیکھ وہ طوفاں اُمڈا آئے

جذبِ تصوّر اللہ! اللہ!!

جیسے کوئی پاس آتا جائے

دیکھ نسیم اب رنگِ زمانہ

کس کے ہاتھوں بدلا جائے

# Which other medium is so easily available to thousands like him, every day, at so little cost?

Men on the move, like Salesmen, you can be sure, are always buying their morning paper and their favourite magazine. Both available everywhere.

Because they want to keep in touch... with trade, business, entertainment, shares, prices—a solid 50%* of just sales and working class people alone, you will find, read Newspapers. Advertisements in Periodicals too attain a 50.4%** readership in the Rs. 301/500 group. The readership reaches 61.9%* among postgraduates.

There is a newspaper or magazine to reach every reader in his language at the lowest cost per thousand.

*(A.S.P. Readership Survey)*

***(Remember literacy is growing in this country at the rate of 5 million persons per year—and readership is growing with it.)*

***Address through the Press —it costs far less***

IENS

*Inserted in the interest of providing information for better advertising value by*

***THE INDIAN & EASTERN NEWSPAPER SOCIETY***

everest/760b/IENS

# ایک بابو کی ڈائری

فکر تونسوی

ہر مہینے ایک نئی ڈائری —— ڈائریوں کا یہ سلسلہ صحت تفریحِ طبع کے لئے لکھ رہا ہوں۔ انھیں پڑھ کر سنجیدہ ہوجانے والے حضرات سے مجھے صرف ہمدردی ہوسکتی ہے!

۳ مئی ۱۹۷۰ء ——

کل میسرز ٹھینگا رام چھینگا مل کے مالک جھینگا چند نے مجھے خوش کرنے کے لئے ۱۹۷۰ء کی ایک ڈائری عنایت فرمائی۔ کیونکہ میں نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ ریلوے کے گڈس پارسل کلرک ببو ناتھ سے آپ کا "مناسب" تعارف کرا دوں گا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے لفظ "مناسب" پر خاص زور دیا تھا۔ ایک لفظ کے بدلے میں ایک ڈائری مل جاتی ہے۔ مارکیٹ میں لفظ بھی بکتے ہیں۔ کتنی پیاری دُنیا ہے، کتنی پیاری مارکیٹ ہے!

سُنا ہے، ہر بڑا آدمی ڈائری لکھتا ہے۔ میں بھی ڈائری لکھنے لگا ہوں۔ مجھے شک ہو گیا ہے کہ میں بڑا آدمی ہوں یا بننے والا ہوں۔ جب میں چھوٹا سا تھا تو میرا والد کہا کرتا تھا "میرا بیٹا بڑا ہو کر سُبھاش بابو بنے گا۔" والد کی دعا کا ففٹی ففٹی اثر ہوا۔ یعنی میں سُبھاش بابو تو نہ بن سکا۔ صرف بابو بن گیا۔ مجھے اِس لفظ بابو سے سخت نفرت ہے۔ رکشا والا، تانگے والا، قُلی، چپراسی سبھی مجھے بابو کہہ کر بُلاتے ہیں۔ جب تک وہ مجھے بابو کہہ کر بُلاتے رہیں گے میں بڑا آدمی نہیں بن سکتا۔ کسی نے مجھے بتایا کہ بابو لفظ "باؤنہ" سے نکلا ہے جس کا مطلب "بندر" ہے۔ میں نے جب بھی آئینہ دیکھا ہے، مجھے بندر کہیں دکھائی نہ دیا۔ جس دن مجھے مجھ اپنے اندر بندر نظر آگیا وہ میرے لئے خودکشی کا دن ہوگا۔

میری بیوی اِدھر آرہی ہے۔ بندر کی بیوی! جب یہ دُلہن بن کر آئی تھی تو بالکل فلستار ۔۔۔ بانو معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اب چھ ہی سات سال میں [illegible]

[illegible]

اُسے بیوا رنگ۔ ابھی سے دو کر اب اُسے تنخواہ آنے تک ننگا رہنا پڑے گا۔

۶ مئی ۱۹۷۰ء ——

آج سارا دن بے حد مصروفیت رہی۔ مالک مکان آٹھویں بار مکان خالی کرنے کی دھمکی دینے آیا۔ آدھ گھنٹہ تک اُسے گالیاں دیں اور گالیاں کھائیں۔ گالیوں کے اِس کاروبار کے دوران ننھے بچّے کو بوتل میں سے دودھ بھی پلاتا رہا۔ کیونکہ میری سلم ایریا برہم کماریوں کے ست سنگ میں بھگوان کے ساتھ براہِ راست تعلقات قائم کرنے گئی ہوئی تھی۔ خاوند گالیاں کھاتا ہے۔ بیوی ست سنگ کرتی ہے۔ جب وہ لوٹی تو میں نے مالک مکان سے جتنی گالیاں کھائی تھیں، وہ بیوی کے حلق میں انڈیل دیں اور اُسے مشورہ دیا کہ تم پریم کی دیوی کے ساتھ بھاگ جاؤ۔ اُس نے مشورہ قبول کرنے کا اشارہ دیا۔ دفتر میں جاکر بڑے صاحب سے جھڑپ ہوگئی۔ اُس نے مجھے دھمکی دی کہ تمھارے خلاف ان ایفی شینسی کی کچھ رپورٹیں آئی ہیں۔ مالک مکان مجھے دھمکی دیتا ہے، میں بیوی کو دھمکی دیتا ہوں، بیوی بچّوں کو دھمکی دیتی ہے۔ ہر بڑا ہر چھوٹے کو دھمکیوں تلے پیستا جا رہا ہے۔ صاحب بڑا ہے، میں چھوٹا ہوں۔ اگر نوکری چھوٹ گئی، اگر بیوی برہم کماریوں کے ساتھ بھاگ گئی؟ میں ڈر گیا۔ صاحب سے وعدہ کر لیا کہ میسرز ٹھینگا مل کی دُکان سے آپ کے مکان کے لئے ایک من لوہے کا سریا لادوں گا۔ بیوی کو ٹیلیفون کر دیا کہ فی الحال برہم کماریوں کے ساتھ بھاگنے کا پروگرام ملتوی کر دو۔ مالک مکان کے گھر جاکر منت سماجت کی کہ میں رشوت لینے کا نیک کام شروع کر رہا ہوں [illegible] اور کیا کرتا۔ تین سو روپے ماہانہ [illegible] کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہے۔

[illegible]

کے ذمے لگا دیا۔ اس کے بعد من کی شانتی کے لئے ایک بھگوتی جاگرن میں شریک ہوا۔ اس وقت نیند نہیں آ رہی ہے اس لئے ڈائری لکھ رہا ہوں۔

۱۰ مئی ۱۹۷۰ء ——

آج کوئی خاص گھٹنا یا دُرگھٹنا نہیں ہوئی۔ اتوار کی چھٹی تھی۔ اس لئے سارا دن اکتاہٹ رہی۔ بیوی کے ساتھ فلم دیکھنے کا وعدہ کیا اور پھر توڑ دیا۔ تاش کھیلنے والے کچھ کلرک بابو آ گئے۔ وہ جوا کھیلنا چاہتے تھے میں نے صاف کہہ دیا کہ میں نے اپنے کیریکٹر کی تعمیر شروع کر دی ہے۔ اب میں جوا نہ کھیلوں گا۔ انھوں نے مجھے جو شیڈو کا خطاب دے دیا۔ میں نے ہنس کر قبول کر لیا۔ شام کو تفریح کے لئے بچوں کو لے کر میونسپل پارک میں چلا گیا اور ان کے ساتھ گھاس پر بیٹھ کر مونگ پھلیاں کھاتا رہا۔ کئی مہینوں بعد بچوں نے اعلان کیا کہ تم ہمارے ڈیڈی ہو۔ مونگ پھلیاں اور میونسپل پارک صرف دو چیزیں ایسی ہیں جو انسان کو ڈیڈی بنا دیتی ہیں۔ میں نے جب بچوں کو اپنے اوپر پیار برساتے دیکھا تو انھیں ان کی ممی کے خلاف بھڑکاتا رہا اور ان میں سے ایک بچے نے تو مجھ سے وعدہ بھی کر لیا کہ آئندہ ممی کے راز جانتے ہی سب سے پہلے آپ کو بتا دیا کروں گا۔

۱۲ مئی ۱۹۷۰ء

گزشتہ کئی دنوں سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے گھر کے سامنے والی چھت پر ایک نوجوان لڑکی ٹھیک اس وقت بال بکھیرے آ کھڑی ہوتی ہے جب میں دفتر جانے لگتا ہوں۔ وہ زلفوں کو کسی رقاصہ کے انداز میں جب جھٹکا دیتی ہے تو میرے دل میں جیسے گھنگھرو سے بج اٹھتے ہیں۔ شروع شروع میں تو مجھے نگاہیں ملانے کی جرأت نہ ہوتی۔ کیونکہ ایک تو میں کلرک ہوں۔ دوسرے محلے والے مجھے شریف آدمی بھی کہتے ہیں اور تیسرے یہ کہ پیار کرنے کے لئے ٹائم چاہئے۔ یہ ٹائم دفتر کے لئے مخصوص ہے۔ پیار کرنے کے لئے نہیں ——— لیکن ایک دن تنگ آ کر میں نے اسے ہاتھ سے سلام کر دیا۔ وہ کمبخت مسکرا دی۔ اس مسکراہٹ نے میرے اندر کا سارا نظام اتھل پتھل کر دیا۔ اس دن بس پر سوار ہوتے وقت اچانک اس کی مسکراہٹ یاد آ گئی تو بس سے پاؤں پھسل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روٹی کا ڈبہ تو بس میں آ گیا اور میں بس سے باہر گر پڑا۔

بیوی نے پوچھا تھا "ڈبہ کہاں گم کر آئے؟" میں نے اسے جواب دیا "چوری ہو گیا۔" اب میں اسے کیسے بتاتا کہ سامنے وہ جو زلفوں والی سانولی سلونی لڑکی رہتی ہے۔ ڈبہ اسی نے چرا لیا ہے۔

آج صبح وہ سانولی سلونی لڑکی چھت پر نہیں آئی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ جی چاہا آج محروم دیدار کو دفتر نہ جانا چاہئے۔ کئی منٹ تک اس سانولے سپنے کے

سورج ڈوبنے کے انتظار میں سڑک پر ٹہلتا رہا۔ پھر چھوٹا بچہ بالکونی سے مجھے بائی بائی کرتا رہا۔ (انگریز کا نالائق بچہ!) بچے کی اس حرکت سے گھبرا کر میں چل دیا۔ جاتے جاتے ایک ٹھنڈی آہ محبوبہ کی چھت کی طرف پھینک دی۔ سارا دن دفتر میں طبیعت مضمحل رہی۔ کسی کام کو جی نہ چاہا۔ شام کو اوور ٹائم پر بھی کام نہیں کیا اور جلدی ہی گھر لوٹ آیا۔ کیا دیکھتا ہوں —— کہ چاند میرے گھر کی بالکونی میں اتر آیا ہے اور میری بیوی کے ساتھ غیر ضروری باتوں میں مصروف ہے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکا۔ جیسے باہر نکل کر محبوبہ کے قدموں پر جا گرے گا۔ میں نے جلدی جلدی بیوی کی آنکھیں بچا کر محبوبہ سے آنکھ ملائی۔ ایک خاموش، مدھ بھری مسکراہٹ نے جواب دیا: "بائی بائی"!

بعد میں بیوی نے مجھے بتایا کہ ان لوگوں کا تبادلہ کانپور ہو گیا ہے اور وہ کل جا رہے ہیں۔ مجھے محبوبہ —— اتنی جلدی، بائی بائی کرنا تھا تو مسکرا کر کیوں دیکھا تھا۔ ابھی تو خاموش پیار گفتگو کی منزل میں تھا۔ ہونٹوں کو جنبش تک نہ ہوئی تھی۔ محبت کے دو بولوں کا تبادلہ تک نہ ہوا تھا اور تم چلی گئیں۔ اتنا مختصر پیار۔ اس سے پہلے کہ میں جرأت اظہار کر دوں، اندازِ گفتار سوچوں، تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں!

اب تو ڈائری لکھنے میں لطف آنے لگا تھا۔ اب کیا فائدہ ڈائری لکھنے کا۔ سوچ رہا ہوں ڈائری کے باقی صفحے میسرز شینگا مل کو لوٹا دوں۔ اس پیار میں میرے دو نقصان ہوئے۔ ایک تو دل ٹوٹ گیا اور دوسرے روٹی کا ڈبہ گم ہو گیا!

۱۱ مئی ۱۹۷۰ء ——

آج صبح ریشمیں زلفوں والی محبوبہ اپنی فیملی کے ساتھ ٹیکسی پر سوار ہو کر روانہ ہو گئی۔ میں نے عینک لگا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے وہ اداس تھی۔ میری عینک ساٹھ روپوں کی الٹرا ہے، جھوٹ نہیں بولتی۔

میں نے آج اس کے ہجر میں تڑپنے کے لئے دفتر سے چھٹی لے لی۔ اس کے جانے کے بعد بہت پچھتایا کہ اس سے کانپور کا ایڈریس ہی پوچھ لیتا۔ میرا سب کچھ چھین کر لے گئی۔ کم از کم اس کا ایڈریس تو میرے پاس رہ جاتا۔ سارا دن اپنی اس بے وقوفی اور محبوبہ کے مستقبل پر آہیں بھرتا رہا۔ آہیں بھرنے کے دوران میرا بڑا سالا آ گیا۔ اس کے ساتھ انتہائی لغو اور بے معنی باتیں کرتا رہا۔ وہ اپنی بہن کو چند دن کے لئے لینے آیا تھا۔ میں نے بخوشی اجازت دے دی۔ بچے اپنے انکل کو دیکھ کر مجھے بھول گئے۔ ایک تو محبوبہ کا ہجر اور اب بیوی کا ہجر۔ ایک میں آہیں ہیں تو دوسرے میں حسرت ہے۔ اس وقت بیوی بچے میرے سالے صاحب کے ساتھ سینما دیکھنے کے لئے گئے ہوئے ہیں اور میں گھر میں تنہا ہوں۔ یہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔ بار بار نگاہیں اس چھت کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ جہاں کبھی زلفیں لہرایا کرتی تھیں۔ وہاں ایک کتا بیٹھا کائیں کائیں کر رہا ہے۔

[illegible] ہوں ۔ جبکہ ترو ماں کے ملازمت نیک ہو گئے ہیں
[illegible] کی کرسی اور شلوار اختیار کر لوں ۔ رشوت کا کام بس
[illegible] روا ہے مجھے یہ [illegible] رشوت ہی سہی ہوا، دیانت کی مخالفت کے لئے کوئی
بہانہ تو رہنا ہی چاہئے۔

۴ مئی ۱۹۷۰ء ———

آج حسب ذیل کارہائے نمایاں سر انجام دئے:۔

۱۔ گھر کی چارپائیوں کی ادوائینیں کس دیں۔
۲۔ باورچی خانے کی مرمت کروائی اور گھر کے پانچ افراد کی بجائے چھ افراد کھولائے۔
۳۔ بلیک میں چائے کا ایک ڈبہ خرید لایا۔
۴۔ دفتر سے سٹیشنری چرائی۔ پکڑا گیا مگر کام آ گئی۔
۵۔ ایک دوست سے دس روپے ادھار لئے کیونکہ تنخواہ ختم ہو چکی تھی۔ یہ دس روپے لوٹانے کا ارادہ نہیں ہے کیونکہ اس دوست نے دو سال پہلے مجھ سے پانچ روپے ادھار لئے تھے لیکن ابھی تک نہیں لوٹائے تھے۔
۶۔ بیوی کو اس کے میکے میں اجنبیت خط لکھا کہ اسے تو لیٹر سمجھ کر جلدی لوٹ آؤ!
تمھارے بغیر مجھے در گوشت کا کھانا نہیں رکھا۔
۷۔ اپنا ایک ساتھی کلرک کے خلاف بڑے صاحب کو چٹھی لکھی کہ وہ ہر روز دفتر آ کر صرف حاضری لگاتا ہے اور پھر بھاگ جاتا ہے تحقیق کی جائے۔ اس چٹھی کے نیچے اپنا نام نہیں لکھا۔ اس کلرک نے بھی میری سٹیشنری چرانے کی رپورٹ کر دی تھی۔
۸۔ گھر لوٹتے وقت بس پر سوار ہوا۔ رش زیادہ تھا اس لئے میں نے کنڈکٹر سے ٹکٹ لینا مناسب نہ سمجھا۔
۹۔ فروٹ شاپ پر جا کر پھلوں کا ریٹ پوچھا۔ خریدے نہیں کیونکہ بے حد مہنگے تھے۔ گھر آ کر ایک "لیٹر ٹو دی ایڈیٹر" لکھا کہ مہنگائی نے ہم کلرکوں کی کمر توڑ دی ہے۔
۱۰۔ ایک بلی کو مارا۔ جو بیوی کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر دودھ پینا چاہتی تھی۔ لیکن ڈنڈا بلی کی بجائے دودھ کی کڑاہی کو جا لگا۔ دودھ الٹ گیا۔ نہ بلی کے کام آیا نہ میرے ——— میں اور بلی دونوں بہت دیر تک کف افسوس ملتے رہے۔

۲۵ مئی ۱۹۷۰ء ———

کل سے اہلیہ محترمہ تشریف لے آئی ہیں۔ آتے ہی انہوں نے دو اہم بلکہ سنسنی خیز خبریں سنائیں۔ ایک یہ کہ ان کا برخوردار عزیز از جان مبلغ چند روپے جوا کھیلتے ہوئے پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا جسے بمشکل سے تایا جی کے رشوت کی بدولت معافی مانگ کر رہا

کر لیا گیا اور دوسری خبر یہ کہ پانچویں عزیز از جان کی ڈلیوری کا وقت قریب آپہنچا ہے اس لئے بادب با ملاحظہ ہوشیار!

میں نے بیوی سے درست بستہ عرض کی کہ جہاں تک جوئے کے کیس کا تعلق ہے وہ خیال سے دیکھنے میں نہایت چھوٹا ہے۔ کیونکہ سنا ہے برخوردار کے تایا بھی بالکل اسی عمر میں جوا کھیلتے ہوئے حوالات تشریف لے گئے تھے۔ اس لئے تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

اور پانچویں برخوردار کی ڈلیوری کے سلسلے میں عرض یہ ہے کہ فیملی پلاننگ کا اصول توڑنے کا یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے جیسا کہ جلد سے جلد تم باز پید ا ہو جاتے ہیں جس سے ملک کا مستقبل خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اس لئے ہر شخص بیدار رہتے ہوئے جو کچھ میں لکھتی ہوں نہیں پلاننگ کی لال تکونوں کی طرف دیکھا کرو۔ مندر جانے کی بجائے لال تکونوں کی طرف دیکھنا زیادہ مفید ہے۔

ان دونوں سوالوں پر بیوی سے ان بن ہو گئی ہے۔ آج رات کا کھانا نہیں پکایا گیا۔ کھانا نہ ملنے سے میری آتما بڑی شانت ہو گئی ہے اور میں گوتم بدھ کی طرح آج رات کو نروان کی تلاش میں بھاگ جانا چاہتا ہوں۔

۳۰ مئی ۱۹۷۰ء ———

افسوس! کہ میں گوتم بدھ نہ بن سکا۔ کیونکہ لڑکی اس رات کو اچانک میری آنکھ لگ گئی اور صبح اس وقت کھلی جب میری بیوی میرے پلنگ کے پاس چائے کا گرم گرم کپ لئے کھڑی تھی۔ اس نے رو رو کر مجھ سے معافی مانگی۔ جو میں نے عطا کر دی اور پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھایا کہ ہم دونوں زندگی کی گاڑی کے دو پہئے ہیں۔ اس لئے الگ نہیں ہو سکتے۔ نہ کھی سوکھی کھائیں گے۔ لیکن دنیا کے سامنے رسوا نہ ہوں گے۔ ہمارا مطلب یقیناً یہی تھا کہ ہم اپنی ہی نگاہوں میں رسوا ہوتے رہیں تو کوئی ہرج نہیں جب نصیب میں کلرکی لکھی ہے تو پھر کیسا گوتم بدھ اور کیسی خانہ جنگی؟

گوتم بدھ نے آج دو روپے رشوت لی اور بچوں کے لئے غبارے اور رسالے خرید لایا۔

۲ جون ۱۹۷۰ء ———

کل ہمیں تنخواہ ملی تھی۔ تنخواہ سے زیادہ مسرت انگیز چیز یہ تھی کہ نئے گریڈ مقرر ہو جانے کے بعد گزشتہ ایک سال کا "ایریرز" (بقایا) کا روپیہ مل گیا۔ میں نے بیوی کو جیسے رنگ کی ایک نئی ساڑی لے دی۔ جسے پہن کر وہ یوں معلوم ہوتی تھی جیسے پہلی رات کی دلہن ہو۔ بے اختیار جی چاہا ہنی مون منانے کے لئے پہاڑ پر کسی مقام پر جایا جائے لیکن بیوی نے سمجھایا کہ آٹھ سال چاہیں گے۔ اس سال تو ڈلیوری ۹۹۰۰

# لوفر

## اظہر وجاہت

۲۳ - مین پوسٹل ۱۱ - اے ایم - بی، [illegible] لاہور

محترم!

میں ایک عرصے سے "بیسویں صدی" پڑھ رہا ہوں اور ہمیشہ سے دیکھتا آیا ہوں کہ آپ نے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ کہانی کے بارے میں صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ ایک نئے انداز کی کہانی ہے۔ اب یہ آپ کی فن شناس نگاہ پر موقوف ہے کہ یہ "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہو سکتی ہے یا نہیں!

آپ کا ——— اظہر وجاہت

---

★

"پروین"

"کیا ہے؟"

"مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

"لیکن مجھے کچھ نہیں سننا ہے۔"

"آخر اتنی ناراض کیوں ہو؟"

"آپ جاتے ہیں یا....."

"یا... کیا کہنا چاہتی ہو تم —؟"

"میں پرنسپل سے شکایت کروں؟"

"آخر کیوں؟" اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

"دماغ تو بجا ہے آپ کا؟"

"بالکل!"

"پاگل ہیں آپ!"

"وہ تو تم نے کر دیا ہے!"

"آخر آپ میرے پیچھے کیوں آ رہے ہیں؟"

"اور تم میرے آگے کیوں جا رہی ہو؟"

"لوفر!"

"نہیں دیوانہ!"

---

"پروین!"

"فرمائیے؟"

"آج میں بہت خوش ہوں!"

"میں کیا کروں؟"

"ناچو!"

"کیا؟"

"میں نے کہا نا؟"

---

"پروین!"

.......

"آج میں تم سے سب کچھ کہہ دینا چاہتا ہوں!"

"مجھے تم سے محبت ہے؟"

"اور مجھے تم سے نفرت ہے!"

"آخر کیوں؟"

[illegible]

[illegible]

"ہوں"

"تو کیا سوچ رہا ہے؟"

"لیکن اُس کے ساتھ کون ہے؟"

"ارے یہ تو خالدہ ہے؟"

"تو کیا اصغر خالدہ ...."

"نہیں.... نہیں یہ نہیں ہو سکتا؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"کیونکہ میں اُس سے محبت کرتی ہوں"

"لیکن تُمہیں کہاں معلوم کہ تُو اُس سے محبت کرتی ہے"

"میں بتا دوں گی"

---

"جاوید!"

"......؟"

"مجھے تُم سے کچھ کہنا ہے"

"لیکن مجھے کچھ نہیں سُننا"

"آخر کیوں؟ کیا تُم مجھے بھول گئے؟"

"نہیں"

"تو پھر وہ پہلی سی چھیڑ چھاڑ کیوں نہیں؟"

"بس یوں ہی"

"آؤ یہاں بیٹھو"

"میرا کلاس ہے"

"لیکن ابھی کچھ دیر ہے"

"لیکن مجھے جانا ہے"

"اچھا یہ تو بتاؤ آج تُم اتنے اُداس کیوں ہو؟"

"لیکن پروین! میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تمہاری نفرت اتنی جلدی محبت میں کیسے بدل گئی؟"

"میں تُم سے نفرت کب کرتی تھی"

"ابھی کچھ دن پہلے تو تُم نے....؟"

"ہاں ہاں لیکن وہ جھوٹ تھا!"

"کیا....؟"

"ہاں میں تو صرف تمہیں چھیڑنے اور پریشان کرنے کو ایسا کرتی تھی"

"لیکن تمہارے ساتھ وہ لڑکی کون تھی، خالدہ؟"

"ہاں وہ راستے میں مل گئی اور ہم ساتھ ساتھ باتیں کرتے چلے آئے"

"میں تو سمجھی تھی کہ شاید اُس سے بھی....؟"

"نہیں نہیں، محبت تو میں صرف تم سے کرتا ہوں"

"اور میں بھی!"

---

"پروین!"

"ہوں"

"مجھے تم سے کچھ کہنا ہے"

"میں جانتی ہوں"

"کیا؟"

"یہی کہ مجھے تُم سے محبت ہے!"

"اور تُم اِس کے جواب میں کیا کہو گی؟"

"لوفر"

اور پروین مُسکرا رہی تھی۔

# صحت و زندگی

## ۱ • صحت مند رہنے کے لئے

اگر آپ صحت مند رہنا چاہتے ہیں تو غذا اور آداب غذا کی طرف سے غفلت نہ برتیئے۔

جب تک خوب بھوک نہ معلوم ہو ہرگز کھانا نہ کھائیے اور ہمیشہ بھوک سے کچھ کم ہی کھانا کھائیے۔ انسان جن امراض میں مبتلا ہوتا ہے اُن میں سے اکثر کھانے کی زیادتی، بار بار کھانے اور غذا ہضم ہونے سے پہلے ہی دوبارہ کھا لینے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

زندگی کا مقصد محض کھانا نہیں ہے۔ کھانے سے صرف بقائے حیات مقصود ہے۔ نپولین کہتا تھا فاقہ کشی سے کم، بسیار خوری سے زیادہ جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ زیادہ کھا کر بہت سے لوگ اپنی قبریں اپنے ہاتھوں کھودتے ہیں۔

غذا بدل بدل کر کھانی چاہیئے۔ مختلف پھل اور ترکاریاں مختلف موسموں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اِس سے قدرت کا منشا بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ ایک غذا میں جن اجزا کی کمی ہوتی ہے دوسری غذا سے اُس کی تلافی ہو جاتی ہے۔ اِس لئے غذا بدل بدل کر کھانی چاہیئے۔

غذا مقررہ وقت پر کھانی چاہیئے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ بقراط نے کہا ہے ——— "بعض اوقات بے وقت کھانے سے ایسا اثر ہوتا ہے جیسا زہر سے! جب تک اچھی طرح بھوک نہ لگے، ہرگز نہ کھاؤ اور جب تھوڑی سی بھوک باقی ہو تو کھانا چھوڑ دو"

غذا خوب چبا چبا کر کھانی چاہیئے۔ غذا جتنی زیادہ چبائی جائے گی اُتنی ہی جلد ہضم ہوگی، اُتنی ہی جلد جزوِ بدن ہوگی۔

کھانے کے دوران میں یا کھانا کھانے کے فوراً بعد پانی نہ پینا چاہیئے۔ اِس طرح ہضمِ غذا میں فتور پیدا ہوتا ہے۔

---

## ۲ • قبض دُور کرنے کے لئے

اطبّا نے قبض کو اُم الامراض (امراض کی ماں) کہا ہے۔ قبض سے طرح طرح کے امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ اِس لئے بہتر تو یہ ہے کہ ایسی چیزیں نہ کھائیں جن سے قبض ہو۔ اگر قبض ہو جائے تو اُسے دُور کرنے کے لئے اِن تدابیر پر عمل کرنا چاہیئے:-

ناشتے اور کھانے کے اوقات متعین کر لیں اور ہمیشہ اُن کی پابندی کریں۔

پانی زیادہ پیئیں۔

روزانہ صبح کے وقت تیز قدموں کے ساتھ کم سے کم دو میل سیر کرنا کریں۔

روزانہ صبح کے ناشتے کے آدھے گھنٹے کے بعد ایک لیموں کا رس ایک گلاس یا آدھے گلاس پانی میں ملا کر پیئیں۔

گرم غذائیں کم کھائیں۔ ثقیل، دیر ہضم اور قابض غذائیں ہرگز نہ کھائیں۔

سبزی زیادہ کھائیں۔ گوشت جب بھی کھائیں اُس میں سبزی ملی ہوئی ہو۔ میدے کی روٹی یا میدے کی بنی ہوئی کوئی چیز نہ کھائیں۔ میدہ صحت کے لئے بہت مُضر چیز ہے۔ بغیر چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھائیں۔ سادہ اور زُود ہضم غذائیں کھانے کی عادت ڈالیں۔

قبض دُور کرنے اور قبض سے بچنے کے لئے پھل کھانا بھی اپنا معمول بنا لیجیئے۔ سنگترے، امرود، پختہ کیلے، خربوزہ، پپیتا، گھیا، پالک، توری، شلغم، گاجر، ٹنڈا، دلیا، گلقند، دودھ، دہی، آم، انجیر، ہڑ، بادام قبض دُور کرنے میں بے حد معاون ثابت ہوتے ہیں۔

قبض دُور کرنے اور قبض سے بچنے کے لئے اِن ہدایات پر عمل کرنا اپنا

معمول بنالیجئے۔

## ۳ ● خوف و ہراس صحت کے دشمن ہیں

اگر آپ صحت مند رہنا چاہتے ہیں تو خوف و ہراس سے بچئے۔ خوف و ہراس صحت کے دشمن ہیں۔

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــ "سائنس اپنے گوناگوں تجربات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ وہ قوت جسے ہم دماغ کہتے ہیں اس کا ہمارے معدہ کے فعل پر بہت گہرا اور شدید اثر پڑتا ہے۔ ہم میں سے کون اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ غم و غصہ ہمارے معدہ کو بُری طرح مجروح کر دیتا ہے اور یہ بعض اوقات اپنا کام بالکل چھوڑ دیتا ہے، جس کے باعث انسان دن بدن کمزور ہوتا چلا جاتا ہے یا کسی مستقل بیماری کا شکار ہو جاتا ہے۔"

## ۴ ● خدا ہمیں کسی طوفان سے آشنا کرے!

لوگ طوفانوں سے خوف کھاتے ہیں۔ لیکن بلند حوصلہ انسان خدا سے دُعا کرتے ہیں ـــــ خدا ہمیں کسی طوفان سے آشنا کر دے!

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے۔ ـــــ "بعض پودے ایسے ہوتے ہیں جنھیں جب تک مسلا نہ جائے خوشبو نہیں دیتے۔ اسی طرح بعض انسان بھی ایسے ہوتے ہیں جو کڑی جد و جہد میں پڑنے کے بعد ہی اپنی صلاحیتوں کی خوشبو بکھیرتے ہیں۔ ایسے لوگ آدھی سے زیادہ زندگی یوں ہی گزار دیتے ہیں۔ ایک دن اچانک ان کی زندگی میں طوفان آتا ہے جس کے تھپیڑوں سے ان کی صلاحیتوں کے بند دروازے کھل جاتے ہیں، جن کی موجودگی کا انھیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔"

اِس لئے آپ بھی خدا سے دُعا کیجئے ـــــ خدا ہمیں کسی طوفان سے آشنا کرے تاکہ اس طوفان کے تھپیڑوں سے آپ کی صلاحیتوں کے بند دروازے کھل جائیں۔

## ۵ ● کامیابی کا راز

"کامیابی ایسا ستارہ نہیں جو آسمان ہی پر چمکتا ہے اور آپ کی دسترس سے بہت دور ہے۔ کامیابی کا آفتاب ذرّہ بن کر آپ کے سامنے زمین پر دمک رہا ہے۔ اُسے دیکھنے کے لئے چشمِ بصیرت چاہئے۔"

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــ "دنیا میں آج تک کسی انسان نے اس وقت تک کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی جب تک اس نے معاوضہ سے بے نیاز ہو کر کام نہ کیا ہو۔ کیونکہ یہی قدرت کا قانون ہے اور جب تک انسان قدرت کی درسگاہ سے یہ سبق حاصل نہیں کرتا، وہ کبھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

اگر آپ اس کی افادیت جاننا چاہتے ہیں تو اپنی زندگی میں اس عادت کو داخل کر کے دیکھیئے۔ اس لئے کہ بعض حقائق ایسے ہیں جنھیں صرف تجربات ہی کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے۔"

## ۶ ● موسیقی ایک مؤثر ذریعۂ علاج ہے

"موسیقی سے خوشگوار جذبات بیدار اور برانگیختہ ہوتے ہیں اور ذہنی طور پر سُرور اور سکون پیدا ہوتا ہے۔ اِس لئے موسیقی کو مؤثر ذریعۂ علاج کہنا غلط نہ ہوگا۔ جالینوس نے بھی موسیقی کے ذریعہ امراض کے علاج کی تائید کی ہے۔

ترقی یافتہ ممالک میں دماغی امراض کے علاج کے لئے موسیقی کا استعمال کیا جا رہا ہے۔

اکثر دماغی امراض فکر و غم سے پیدا ہوتے ہیں [illegible]

نہایت کامیابی سے کیا جا سکتا ہے، جن کا تعلق اعصاب سے ہو۔ اعصاب پر موسیقی کا نمایاں اثر ہوتا ہے۔

## ۷● بہت بڑا سرمایہ

یہ جان کر آپ کو حیرت ہوگی اور مسرت بھی کہ آپ کے پاس دولت نہ ہو جب بھی بہت بڑا سرمایہ حاصل کر سکتے ہیں، بہت بڑے سرمایہ کے مالک بن سکتے ہیں۔

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ــــ "آپ واضح طور پر یہ سوچئے کہ آپ کا ذہن کیا کام کرنا چاہتا ہے اور پھر صرف اسی میں منہمک ہو جایئے۔ اِس طرح آپ ایک بڑا سرمایہ حاصل کر لیں گے اور کامیابی قدم قدم پر آپ کا استقبال کرے گی۔ لیکن آپ کی یہ خواہش محض آرزو یا تمنا نہ ہو، یہ شدید خواہش ہو اور آپ کے ذہن پر اِس طرح چھا جائے کہ آپ ہر قیمت پر اُسے عملی شکل دینے کو تیار ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے آپ کو اُس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑے اور بہت ممکن ہے آپ اُسے آسانی سے حاصل کر لیں لیکن ہر قیمت پر اُسے حاصل کرنے کے لئے آپ کو آمادہ ہو جانا چاہئے اور سارے خطرات کو پس پشت ڈال کر اس کے لئے جد و جہد کرنی چاہئے۔"

## ۸● بڑھاپے کا خیر مقدم مُسکراتے ہوئے کرو

بڑھاپے کے تصور ہی سے لوگ گھبراتے ہیں۔ بڑھاپا شروع ہوتے ہی دل افسردہ ہونے لگتا ہے۔ لیکن جوانی ہی میں بڑھاپے کی تیاری کی جائے تو بڑھاپا خوشگوار بن سکتا ہے۔

مشہور مفکر سی۔ جی۔ ڈرکان نے لکھا ہے ــــ "جوانی اِس طرح گزارو کہ مُسکراتے ہوئے بڑھاپے کا خیر مقدم کر سکو۔ جوانی میں خیال رکھو کہ بڑھاپے میں ہر طرح کا سکون میسّر ہو۔ اِس طرح انسان بہت امن سے دنیا کے پُرشور ہنگاموں سے باہر نکل جاتا ہے۔ نہ روٹی کمانے کی فکر کی غلامی ہوتی ہے اور نہ حالات کی مجبوریاں ہی دل کا سکون لوٹنے کا باعث بنتی ہیں۔ نہ انسان اُس وقت زندگی سے وابستہ بڑی بڑی آرزوؤں کی آگ میں جلتا ہے ــــ بڑھاپے میں روزمرّہ زندگی کی تلخیوں کو قریب نہ آنے دو۔

اگر تم ایسا کر سکتے ہو تو بڑھاپے سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں۔"

"بیسویں صدی" کا تازہ افسانہ نمبر بھی ہندوستان و پاکستان کے بلند پایہ ادبی جریدوں کی روایتی خوبیوں کا آئینہ دار ہے۔ "بیسویں صدی" کے کسی شمارہ پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہنا کہ وہ جنابِ خوشتر گرامی کے بلند ادبی ذوق اور معیار و حُسنِ ترتیب کی اعلیٰ قدروں کی عکاسی کرتا ہے۔ اب محض ایک روایتی بات محسوس ہوتی ہے۔ "بیسویں صدی" کا جب تصوّر ابھرے تو یہ تمام باتیں ذہن میں خود بخود آتی ہیں ــــ افسانہ نمبر میں اس بار بھی جنابِ خوشتر گرامی نے قارئین کو کچھ مرکزہ ادیبوں اور شاعروں سے متعارف کرایا ہے۔ . . . یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ نظم و نثر کا انتخاب معیاری ہے۔ تیر و نشتر اور سرگوشیاں اس شمارہ میں بھی طنز و مزاح کی اعلیٰ قدروں کی حامل نظر آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ باقاعدگی اور حُسن کے ساتھ "بیسویں صدی" کو اُس کے قارئین تک پہنچانا اردو دنیا پر جنابِ خوشتر گرامی کا ایک بڑا احسان ہے۔

بہار برنی
رکن ادارہ روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی

## ۹● اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کیجئے

قدرت نے ہر انسان کو کامیاب انسان بننے کی صلاحیت بخشی ہے۔
آپ بھی کامیاب انسان بن سکتے ہیں، غیر معمولی انسان بن سکتے ہیں۔

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ــــ "اگر آپ اپنی مخفی طاقتوں کو بیدار کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ہمیشہ ترقی کی راہ پر گامزن رہنا چاہئے۔ ذہن و رُوح کی طاقت کو بڑھاتے رہنا چاہئے۔"

انسان کے ارتقاء میں سب سے بڑی معاون حوصلہ افزا کتابیں ہیں۔ اعلیٰ پایہ کی کتابوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اگر برابر مطالعہ نہ کیا جائے تو ہمارے آدرش دھندلا جاتے ہیں۔

---

### رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ چیک کرنے کے بعد بیسویں ہر ماہ باقاعدگی سے سپرد ڈاک کیا جاتا۔ اس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہیں گے۔ نہ ملنے کی شکایت محکمۂ ڈاک سے بھی کیجئے۔ (منیجر رسالہ بیسویں صدی۔ [illegible]

---

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ غلط، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

---

**پیاری سلطانہ۔ وجے واڑہ**

س۔ بعض لوگوں کا خیال ہے آم زیادہ کھانے سے صحت کو نقصان ہوتا ہے۔ آپ بتایئے آم فائدہ بخش ہے یا نقصان دہ؟

ج۔ آم کا مزاج گرم تر ہے۔ یہ مقوی پھل ہے۔ اعضائے رئیسہ کو قوت بخشتا ہے۔ نیا خون پیدا کرتا ہے۔ آنتوں کو طاقت بخشتا ہے۔ جسم کو موٹا کرتا ہے۔ دافع قبض ہے۔ نہار منہ

**سیّد فیاض احمد آرزوؔ۔ ڈلیسر گڑھ**

س۔ عورت کی عقل کہاں ہوتی ہے؟

ج۔ جہاں سے کوئی مرد جیرا نہ سکے۔

س۔ انسان بلندی سے کب گرتا ہے؟

ج۔ جب اُس کا خیال، اُس کا کردار پست ہو جاتا ہے۔

س۔ عزت پیاری ہے یا دولت؟

ج۔ کبھی لوگ عزت پر دولت کو قربان کر دیا کرتے تھے، آج کی دنیا میں لوگ دولت کے لئے عزت کو قربان کر دیتے ہیں۔

ج۔ ہو سکتا ہے کسی طبیب کا یہ تجربہ ہو۔ جو آپ نے پڑھا ہے "بیسویں صدی" میں آپ نے اِس سلسلے میں جو کچھ پڑھا ہے۔ وہ بہت سے ماہرین کا تجربہ ہے۔

س۔ آملہ کے خواص بتا کر ممنون فرمائیں۔

ج۔ جدید طبی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ سارے پھلوں اور سبزیوں کے مقابلے میں آملہ میں سب سے زیادہ وٹامن سی پایا جاتا ہے۔ آملہ کا مزاج سرد خشک ہے۔ زود ہضم اور فرحت بخش ہے۔ خصوصاً دماغ اور آنکھوں کو بہت فائدہ پہنچاتا ہے۔

محمد عباس منور سارا ئچ (بہار)

س۔ جو قوم جیتا جاگتا قدم قدم پر ٹھوکریں ہی کھا رہی ہو وہ اپنی منزل کیسے پا سکتا ہے؟

ج۔ دنیا کی حقیقت پر یقین کر کے —— ناکامی ہی کامیابی کا زینہ بنتی ہے۔

س۔ کوشش کرنے کے بعد بھی آرزو پوری نہ ہو تو کیا کرنا چاہیے؟

ج۔ یہ سوچنا چاہیے، یہ دیکھنا چاہیے ——
ذوقِ عمل ہی تیرا کہیں خام تو نہیں!

س۔ غم دور کرنے کے لئے انسان کو کیا کرنا چاہیے؟

ج۔ غم کو خوشی بنا لینا چاہیے۔

---

محمد متین آس بھوپالی

س۔ کوئی ایسی بات بتائیے جس سے نصیحت ملے۔

ج۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے —— لوگوں کے ساتھ انصاف اور احسان کرو۔ وہ شخص مسلمان نہیں جو اپنا پیٹ بھرے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ہندوستان میں سب سے زیادہ کس مذہب کے لوگ ہیں؟

ج۔ ہندو مذہب کے۔

---

چندر پرکاش [illegible] نئی دہلی

س۔ [illegible] بہت شوقین ہے۔ پر منہ کے [illegible] آپ کے خیال میں [illegible] کا استعمال کیسا ہے؟

ج۔ بہت سے نقصان پہنچاتی ہے۔ دانتوں کو کمزور اور گلے کو بھی خراب کرتی ہے۔ دانتوں کی جڑوں کو کمزور کر کے پائیوریا کی بنا رکھتی ہے۔ نزلہ و زکام کی تحریک کرتی ہے۔ کھانسی، بلغم، ریح اور درد کے امراض میں سخت مضر ہے۔

---

سید ارشاد احمد گورکھپور

س۔ گرمی کے موسم میں کون کون سی ترکاریاں صحت کے لئے فائدہ بخش ہیں؟

ج۔ پیاز، کدو، ککڑی، بھنڈے، ٹینڈا، توری، گھیا، بھنڈی، توری، پیٹھا۔

س۔ اپنی پسند کا کوئی غمناک شعر سنائیے۔

ج۔ ہمیں غمناک اشعار پسند نہیں ہمیں تو ایسے اشعار پسند ہیں
خزاں کیسی، بہاریں کیا، غم سود و زیاں کب تک
نظر تیری نہ ہوگی زندگی کی رازداں کب تک

س۔ خوشتر بھیا مجھے کچھ اچھی باتیں بتائیے۔

ج۔ بُرے ساتھی سے تنہائی بہتر ہے —— غریب وہ نہیں ہے جس کے پاس دولت نہیں ہے۔ غریب وہ ہے جس کے خیالات میں غریبی ہے —— نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو، بُرائی اور سرکشی میں کسی کا ساتھ نہ دو۔

---

نیلوالحسن۔ علی گڑھ

س۔ کیا نکاح کے دو بول سارے رشتوں کو ختم کر دیتے ہیں؟

ج۔ ایسا تو نہیں ہوتا۔ نکاح کے دو بول، دو اجنبیوں میں ایک نیا رشتہ استوار کر کے ان کے ساتھ اور بہت سے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیتے ہیں۔

---

افروز عالم موتیہاری (بہار)

س۔ آج کل لڑکیاں اپنے والدین کا بوجھ کیوں بن گئی ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ سماج کے رسم و رواج نے انھیں والدین کے سر کا بوجھ بنا دیا ہے۔

س۔ لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ لڑکیوں کو ضروری تعلیم دینا بے حد ضروری ہے۔ ایسی تعلیم، اتنی تعلیم جو انھیں چراغِ خانہ سے شمعِ محفل نہ بنا دے۔

---

محمد اسرافیل انصاری۔ راج گڑھ ہوڑا

س۔ ان بزرگوں کا سلسلہ وار نمبر دیجئے
امام غزالی، مولانا روم، مولانا حالی، علامہ شبلی، ڈاکٹر اقبال۔

ج۔ آپ کی ترتیب درست ہی ہے۔

س۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا اردو کو ہندوستان کی قومی زبان بنانے کے بارے میں کیا خیال تھا اور ان بزرگوں نے اس کے لئے کیا کیا؟

ج۔ اردو ہندوستان کی قومی زبان بنتی تو ان دونوں کو مسرت ہوتی۔ یہ مسرت حاصل کرنے کے لئے ان بزرگوں نے حتی الامکان جدوجہد کی۔

---

شمیم اختر یاسمین۔ رانچی

س۔ لیڈر اور اداکار میں کیا فرق ہے؟

ج۔ کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ لیڈر بے حد کامیاب اداکاری کرتا ہے۔ فلم اداکار اس سے ذرا کم۔

س۔ زندگی کتنا بڑا فریب ہے؟

ج۔ زندگی فریب نہیں حسین اور عظیم حقیقت ہے

---

### ظفر احمد بھٹکل۔ کالی کٹ

س۔ چائے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے یا کافی؟

ج۔ دونوں نقصان دہ ہیں۔

س۔ کوئی غم انگیز شعر سنائیے۔

ج۔ ہم زندگی کے نوحہ خواں نہیں ہیں۔ کاروانِ حیات کے حُدی خواں ہیں۔ ہمیں تو ایسے اشعار پسند ہیں ؎

جادۂ زیست میں ہر غم ہے چراغِ منزل
دل ہو روشن تو کہیں تیرگیِ یاس نہیں

س۔ دل گھبرانے لگے تو کیا کرنا چاہیے؟

ج۔ خُدا کو یاد کرنا چاہیے۔ قرآنِ مجید میں خداوندِ پاک نے ارشاد فرمایا ہے ـــــ اللہ کے ذکر سے اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے۔

---

### فرید زماں۔ کلکتہ

س۔ زندگی بوجھ بن جائے تو؟

ج۔ زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے جدّوجہد کرنی چاہیے۔

س۔ آج کا انسان انسانیت سے گریزاں کیوں ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ آج کا انسان انسان نہیں رہا ؎

آدمی آدمی کے پیکر میں
اور کچھ ہوگا آدمی نہ رہا!

---

### سلمیٰ فردوس نقاش۔ سرینگر کشمیر

س۔ خوشتر چچا! نریش کمار شاد کے والد صاحب کا انتقال کیسے ہوا؟

ج۔ وہ گھر سے کہیں غائب ہوگئے۔

س۔ شاد صاحب کے نہ رہنے سے اُردو ادب میں جو خلاء پیدا ہوا ہے کیا وہ پُر ہو سکتا ہے؟

ج۔ فی الحال تو پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔

س۔ آج جبکہ انسان چاند کو تسخیر کر چکا ہے تو بتایئے مافوق الفطرت باتوں یا چیزوں کی کیا حیثیت ہے؟

ج۔ یہی ایک سوال نہیں، چاند کی تسخیر نے ایسے کئی سوال پیدا کر دیے ہیں، جن کا جواب دے کر لوگوں کو مطمئن کر دینا آسان نہیں۔

---

### محمد اصغر علی نواب۔ دھنباد

س۔ انسان بہت سارے گناہ کر کے، خُدا کے احکام کی خلاف ورزی کر کے بھی خُدا سے خیر و فلاح کی دُعا کیوں مانگتا ہے؟

ج۔ ایسا کر کے انسان خُدا کو فریب دیتا ہے۔ ساتھ ہی خود کو بھی!

س۔ کیا جذبات انسان کو کبھی کبھی گڑھے میں گرا دیتے ہیں؟

ج۔ جی ہاں کبھی کبھی دفورِ جذبات میں انسان اندھا ہو جاتا ہے۔

س۔ بیوی اپنے شوہر کو کب اچھا کہتی ہے؟

ج۔ جب شوہر اپنی بیوی کے سوا دوسری ساری عورتوں کو بدصورت اور بُری کہتا ہے۔

---

### ریاست حسین۔ رامپور

س۔ ڈاکٹر ٹیگور کو کب نوبل پرائز ملا تھا؟

ج۔ ۱۹۱۳ء میں۔

س۔ ڈاکٹر ٹیگور بڑے شاعر تھے یا علامہ اقبال؟

ج۔ دونوں عظیم شاعر تھے۔

---

### نزہت خاطمہ۔ فرنگی محل لکھنؤ

س۔ میرے خیال میں کسی زبان کو ختم کرنے کا آسان ذریعہ اُس کے رسم الخط کی تبدیلی ہے۔ کیا آپ اِس خیال سے متفق ہیں؟

ج۔ آپ کا خیال سو فیصدی دُرست ہے۔

س۔ اُردو کی ادیبہ رشید ... نے اُردو کے رسم الخط کی تبدیلی کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے کیا وہ اُردو کے ایک پہلو کو زیب دیتے ہیں؟

ج۔ ہم نے محترمہ کی وہ تحریر نہیں پڑھی۔ ویسے رسم الخط کی تبدیلی اُردو کے لئے سمِ قاتل ہوگی۔

---

### بذل الرحمٰن بیتاب۔ چھپنال پورنیہ

س۔ خان عبدالغفار خاں کے ہندوستان آنے کا کیا مقصد تھا؟

ج۔ تاکہ ہندوستان والوں کو مہاتما گاندھی کا دیا ہوا سبق یاد دلائیں جنھیں یہ بھولتے جا رہے ہیں، بلکہ بھول گئے ہیں۔

س۔ آجکل عوام میں بیکاری کیوں بڑھتی جا رہی ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ اربابِ حکومت کو اپنے خویش و اقارب کو باکار بنانے سے اتنی فرصت ہی نہیں کہ وہ عوام کی طرف متوجہ ہوں۔

س۔ لڑکیوں میں روز بروز عُریانیت کیوں بڑھتی جا رہی ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ اُن کے گھروں کے مرد عُریانیت پسند ہوگئے ہیں۔

---

### انوار احمد۔ شملہ

س۔ معلوماتِ عامّہ کے سلسلے میں کوئی حیرت انگیز بات بتایئے۔

ج۔ گِدھ ایک میل سے سات میل تک دیکھ سکتا ہے۔

مچھر کے ۲۲ دانت ہوتے ہیں جو خوردبین سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

---

### سید جاوید رمضانی بیکانیر

س۔ ہند میں اردو کا مستقبل ؟

ج۔ بظاہر تاریک ہے لیکن درحقیقت تاریک نہیں ہے۔ اردو کی خوبیاں اس کی بقا کی ضامن ہیں۔

س۔ جن سنگھ کا ہندوستان کے مسلمانوں کو بھارتیانے کا نعرہ لونۂ مسلم دشمنی ؟

ج۔ ایسا خواب ہے جو کبھی تعبیر [illegible] ایسا خیال ہے جو ملک [illegible] سم قاتل ہے !

---

### سید خوشتر۔ عثمان آباد

س۔ زندگی کی بہاریں روٹھ گئی ہیں۔ بتایئے انھیں کیسے مناؤں ؟

ج۔ اے رہرو دشتِ راہ طلب غمگین نہ بن مایوس نہ ہو
منزل کا پتہ مل جاتا ہے ہر گام پہ ٹھوکر کھانے سے

س۔ کوئی ایسا شعر سنایئے جس سے میرے دل کی کچھ ڈھارس بندھے۔

ج۔ حوصلے پست نہ ہوں ولولے پژمردہ نہ ہوں
وقت کے سانچے میں ڈھل کر ہی نکھرتی ہے حیات

---

### ایس فردوس بھٹکلی۔ بھٹکل

س۔ ہندوستان زرعی ملک ہے، پھر بھی غیر ترقی یافتہ کیوں ہے ؟

ج۔ اس لئے کہ ہندوستان کے سربراہوں نے ہندوستان کی قسمت سرمایہ داروں اور ذخیرہ اندوزوں کے ہاتھوں میں دے رکھی ہے

س۔ امیر کی نظر میں غریب ؟

ج۔ امیر کی نظر میں غریب انسان ہی نہیں ہوتا !

س۔ جگر کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ یہ روز و شب، یہ صبح و شام، یہ بستی، یہ ویرانے
سبھی بیدار ہیں، انساں اگر بیدار ہو جائے

---

### اے۔ این۔ کلکتہ

س۔ ادیبوں سے زیادہ شاعروں کی افزائش کا راز ؟

ج۔ شاعر نہیں تو متشاعر بن جانے کے لئے تُکبندی کر لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔

---

### کرامت اللہ خاں مدراسی۔ مدراس

س۔ کیا ہماری اردو زبان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی صوبے کی علاقائی زبان بننے کا شرف حاصل کرے ؟

ج۔ کیوں نہیں۔ اردو تو اس قابل ہے کہ سارے ملک کی قومی زبان بنتی۔

س۔ بمبئی کنونشن کے بعد اردو زبان کا مستقبل ؟

ج۔ گفتار کے غازی اسی طرح کردار کے غازی بن گئے تو اردو کا مستقبل یقیناً روشن و تابناک بن جائے گا۔

س۔ احساسِ کمتری کس طرح دور کیا جا سکتا ہے ؟

ج۔ اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کر کے۔

---

### سید امتیاز حسین بلگرامی۔ پٹنہ

س۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں آپ سے مل کر فخر محسوس کروں ؟

ج۔ آپ بصد شوق تشریف لا سکتے ہیں۔ ہماری آنکھیں فرشِ راہ ہوں گی ——
اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما

س۔ کسی تقریب میں آپ کو بلاؤں تو کیا آپ خاکسار کے غریب خانہ کو رونق بخشیں گے ؟

ج۔ کاش ! ہماری مصروفیت اور اہم ذمہ داریاں دل کا ساتھ دیں !

---

### بکرم سنگھ۔ لدھیانہ

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں اسرائیل میں کتنے یہودی اور عرب میں کتنے مسلمان ہیں ؟

ج۔ اسرائیل میں ۲۰ لاکھ یہودی، عرب میں ۸ کروڑ مسلمان ہیں۔

---

### ارملا سکسینہ بی۔ اے۔ نئی دہلی

س۔ دلاور فگار کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ عزت و رفعت و قوت کا نشاں بن کے رہے
اپنے ہاتھوں میں جو سہ رنگ علم ہے یارو !

س۔ نریش کمار شاد کا کوئی قطعہ سنایئے۔

ج۔ ایک معصوم سی اداسی کی
اس طرح دکھتی ہے پھولوں کو
کھوکھلے قہقہوں کے جھرمٹ میں
جیسے اک پُر خلوص آنسو ہو !

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں یہ اشعار کس کے ہیں ؟
دنیا ہے ارم سے بھی حسیں دیکھ ذرا
آکاش پہ ہنستی ہے زمیں دیکھ ذرا
آب آب ہوئے جاتے ہیں ماہ و انجم
لو دیتی ہے ذرّوں کی جبیں دیکھ ذرا

ج۔ یہ بھی شاد کی رباعی ہے۔

---

### ہدایت علی ساحل جھمری تلیا

س۔ حب الوطنی کی کیا شرائط ہیں ؟

ج۔ انسان کا یہ ایمان ہو ؎
خاکِ وطن از تختِ سلیماں خوشتر
خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

---

## جمشید پرویز زرتی بھاگل پور

س۔ ہر آدمی اپنے آپ کو ایماندار اور پرہیزگار ظاہر کرکے دوسروں پر رعب جمانے کی کوشش کیوں کرتا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے آج کی دنیا میں زندہ رہنے کے لئے فریب کاری ضروری ہے۔

س۔ آج کی دنیا میں زندہ رہنے کے لئے کیا فراڈ ضروری ہے؟

ج۔ خود فریبی میں مبتلا لوگ یہی سمجھتے ہیں۔

س۔ کسی شاعر کا ایک خوبصورت شعر سنایئے۔

ج۔ مہرباں وہ ہے تو راہِ زندگی میں دور تک
دھوپ نکلی ہے، سایۂ سرو چمن ہے دوستو!

---

## اقبال احمد راہی۔ جھریا

س۔ پیار اور ممتا دولت سے خریدی جا سکتی ہے؟

ج۔ حقیقی پیار، حقیقی ممتا دولت سے نہیں خریدی جا سکتی۔

س۔ اس زمانہ میں کس چیز کی سب سے زیادہ قدر ہوتی ہے؟

ج۔ دولت کی!

س۔ بھائی صاحب! انسانیت، بھائی چارہ، دوستی ——— آپ کی نظر میں کس کا درجہ بلند ہے؟

ج۔ انسانیت کا۔

---

## پرنس امتیاز احمد خاں

س۔ انسان زندگی سے کب بیزار ہو جاتا ہے؟

ج۔ جب انسان کی آنکھیں زندگی کا حسن، زندگی کی دلکشی دیکھنے سے عاری ہو جاتی ہیں۔

س۔ سب کی نگاہوں میں اچھا بن کر کس طرح رہا جا سکتا ہے؟

ج۔ سب کے دکھ سکھ کو اپنا دکھ سکھ سمجھ کر۔

س۔ انسان کی سب سے بڑی مجبوری کیا ہے؟

ج۔ انسان کی سب سے بڑی مجبوری یہ ہے کہ وہ اچھی راہ پر چلنا چاہتا ہے، لیکن حالات اس کی راہ میں کانٹے بچھا دیتے ہیں۔

---

## علی بابا شبیر بھٹکل۔ دبے [illegible]

س۔ بھیک مانگنے والا ایک پیسے کے لئے بڑی دعائیں دیتا ہے، پھر بھی لوگ یہ سودا پسند نہیں کرتے؟

ج۔ خدا انہیں یہ دولت، یہ مسرت حاصل کرنے کی توفیق دیتا ہے، وہ یہ سودا کرتے ہیں۔

س۔ شادی کرنے کے لئے کیسی لڑکی کا انتخاب کرنا چاہئے؟

ج۔ جو اچھی سیرت اور بلند اخلاق کے زیور سے آراستہ ہو۔

---

## عبدالرشید ساحل۔ ظہیر آباد

س۔ کیا دولت مند بننا گناہ ہے؟

ج۔ دولت مند بننا گناہ نہیں ہے، دوسروں کو بھی دولت مند بننے میں مدد نہ دینا گناہ ہے۔ اپنی دولت کے زعم میں کسی کا دل دکھانا گناہ ہے۔

س۔ عورت کے آنسو دیکھ کر مرد کا دل کیوں پگھل جاتا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ عورت کے آنسوؤں میں بلا کا سوز، بلا کی کشش ہوتی ہے۔

---

## وسیمہ جہاں آرا شیوی نبی نگر

س۔ کیا ہندوستان کی تقسیم سے پہلے بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوا کرتے تھے؟ اگر ہاں تو اس کے کیا اسباب تھے؟

ج۔ یہی اسباب، تعصب اور تنگ دلی!

---

## ملکہ انصاری شیوی نبی نگر

س۔ عورت کے فرائض کیا کیا ہیں؟

ج۔ سب سے بڑا فرض ہے اپنے گھر کو [illegible] جنت کا گہوارہ بنانا۔

س۔ کیا پردہ عورتوں کے لئے غلامی کی علامت ہے؟

ج۔ ہرگز نہیں۔ مناسب پردہ عورت کے وقار و افتخار کی ضمانت ہے!

---

## نسرین، احمرین، شاہین۔ دانم باڑہ

س۔ بھیا! کیا آپ بتلا سکتے ہیں ہندوستان کا سب سے بڑا افسانہ نگار کون ہے؟

ج۔ کرشن چندر۔



ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی ——— مطبوعہ یکشن پرنٹنگ ورکس دہلی و [illegible] دہلی، ٹائٹل و تصاویر پرنٹ پریس دہلی ——— پتہ: دفتر بیسویں صدی

# BISWIN SADI

24th YEARS OF PUBLICATION

Telephones Office. 271637 Residence. 619927


# RADIUM TONIC PILLS

نیا خون ــــ نئی طاقت

## کمزوری کا زبردست علاج

## ریڈیم ٹانک پلز

نیا خون بکثرت پیدا کرکے نہ صرف کمزوری دُور کرتی
بلکہ جسم میں زبردست طاقت بڑھاتی ہیں۔ وزن ا
خوبصورتی کئی پونڈ بڑھ جاتا ہے۔ کھوئی ہوئی طاقت اور صح
واپس لانے کے لئے مُلک کے کونے کونے میں مشہو
مقبول ہیں اور لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے
کمزوری خواہ کسی وجہ سے ہو کمزور سے کمزور انسان کو
نئی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ تندرست نوجوان ریڈیم ٹانک
کے علاج سے اپنی طاقت کئی گُنا بڑھا سکتے ہیں۔ قیمت
علاج صرف چھ روپے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

کلکتہ ایجنٹ:۔
امین اینڈ اسمٰعیل پرائیویٹ لمیٹڈ
نمبر ۸۰ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۱

ا۔ ۔۔ ریڈیم کیمیکل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۵

زُلفِ سیہ گھٹا ہے، آنکھیں شراب خانہ
توبہ شکن جوانی، انداز کافرانہ

فوٹو: ایم۔ ایس۔ دوبرا، دیوگرا، نئی دہلی

انجمنِ ترقّیٔ اُردو دِلّی کی طرف سے، برِّ صغیر ہند و پاک کے نامور شاعر جنابِ فیض احمد فیضؔ کے اعزاز میں ایک پُر تکلّف عصرانہ دیا گیا۔ جس میں انجمن کے اراکین اور عُہدہ داران کے علاوہ مقامی شعراء و ادباء، نامور صحافی اور برگزیدہ اہلِ ذوق بھی شریک ہوئے ــــــ پنڈت سُندر لال صدر، انجمنِ ترقّیٔ اُردو صوبۂ دِلّی اور جنابِ بہارؔ برنی سکریٹری انجمنِ ہذا نے معزز مہمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہندوستان میں اُن کی آمد پر اظہارِ مسرت کیا اور اُمید ظاہر کی کہ اِن کے اِس دورہ سے دونوں مُلکوں کے باہمی تعلّقات کو خوشگوار بنانے میں مدد ملے گی ــــــ پنڈت سُندر لال، جنابِ بہارؔ برنی خوشتر گرامی اور عبد اللطیف اعظمی نے برِّ صغیر کے اِس مایۂ ناز شاعر کو خوش آمدید کہا۔

چائے پیتے ہوئے فیض صاحب کے بائیں طرف جنابِ گلزار زتشی اور دائیں طرف ڈاکٹر خلیق انجم صدر شعبۂ اُردو کروڑی مل کالج دِلّی، خوشتر گرامی اور جنابِ بہسار برنی تبسّم ریز ہیں ۔

اِستقبالیہ میں جنابِ فِکر تونسوی کو دیکھا تو جنابِ فیض مسرور ہوکر اُن سے بغل گیر ہوگئے اور بہت سی

جنابِ بہار برنی نے مہمانِ خصوصی کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی تو خوشتر گرامی نے فیض صاحب سے کہا کہ ہندوستان کے کونے کونے میں آپ کے چاہنے والے موجود ہیں اور وہ آپ کے آٹو گراف کے طالب ہیں ——— اور پھر مسکراتے ہوتے جنابِ فیض نے قلم سنبھال لیا ـــ خوشتر گرامی نے اپنے مرحوم جگری دوست اختر شیرانی کے یہ اشعار پُرسوز آواز میں دُہرائے ———

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سُنا کس رنگ میں ہیں کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن وہ سروِ وطن، ریحانِ وطن
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی کسی کے سینے میں باقی ہے ہماری چاہ بتا؟
کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے اب یاروں میں کوئی، آہ بتا؟
او دیس سے آنے والے بتا لِلّٰلہ بتا، لِلّٰلہ بتا؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا ہم کو وطن کے باغوں کی مستانہ فضائیں بھول گئیں؟
برکھا کی بہاریں بھول گئیں ساون کی گھٹائیں بھول گئیں؟
دریا کے کنارے بھول گئے جنگل کی ہوائیں بھول گئیں؟
او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی مہکتے مندر سے ناقوس کی آواز آتی ہے؟
کیا اب بھی مقدس مسجد پر مستانہ اذاں تھراتی ہے؟
اور شام کے رنگیں سایوں پر عظمت کی جھلک چھا جاتی ہے؟
او دیس سے آنے والے بتا!

اب فیضؔ نے فرمایا" آپ نے جس پُرخلوص محبت سے میری عزّت افزائی کی اُس کے اظہار کے لئے میرے پاس وہ الفاظ نہیں جو میرے قلبی احساسات اور ربات کی صحیح ترجمانی کرسکیں"۔۔۔۔ جنابِ فیضؔ کا تازہ کلام سُن کر حاضرین جھُوم جھُوم اُٹھے۔ محترمہ بیگم حمیدہ سُلطان جنرل سیکریٹری انجمن ترقّی ردو صوبۂ دِلّی، فرمائش پر فرمائش کرتی گئیں اور جنابِ فیضؔ اپنا کلام سُناتے رہے۔ جب فیضؔ صاحب اِن اشعار تک آئے۔۔۔۔

جو پیرہن میں کوئی تار محتسب سے بچا

دراز دستیٔ پیرِ مغاں کی نذر ہُوا

اگر جراحتِ قاتل سے بخشوا لائے

تو دِل سیاستِ چارہ گراں کی نذر ہُوا

تو فضا داد و تحسین کی صداؤں سے گُونج اُٹھی۔

ٹیلیفون دفتر ——— ۲۷۱۹۳۷

ٹیلیفون رہائش ——— ۶۱۹۹۲۷




سالانہ قیمت خاص نمبروں سمیت ہندوستانی و پاکستانی

سکہ میں ——— چودہ روپے

غیر ممالک ——— بیس شلنگ

خوشتر گرامی

"کانگریس کا بٹوارہ دو ساتھیوں کا جھگڑا": آچاریہ کرپلانی کا بیان ——— جی نہیں، مرارجی ڈیسائی کو خزانہ کی وزارت اور سنجیوا ریڈی کو صدارت سے محروم کرنے کا جھگڑا ہے۔

---

"یو۔پی میں کرپشن کی روک تھام": ایک خبر ——— اسی لئے تو وزیروں کی فوج بنائی جا رہی ہے۔

---

"بھارتیہ کرانتی دل میں بھی پھوٹ": ایک خبر ——— سب پارٹیاں اس ہندوستانی پھل سے لطف اندوز ہو رہی ہیں تو کرانتی دل اس کا مزہ کیوں نہ چکھتا۔

---

"اندرا گاندھی سنڈیکیٹ پر برسیں": ایک خبر ——— بادل بن گئیں۔

---

"ملازمت پیشہ عورتوں کے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے سہولیات": ایک خبر ——— اور سیاست زدہ عورتوں کے بچوں کا کیا ہوگا؟

---

"سرکار بیکاری پر جلد قابو پالے گی": اندرا گاندھی ——— چرن سنگھ (یو۔پی) کی طرح وزیر بڑھا کر۔

---

"پنتھک ایکتا عزیز لیکن ۔ ۔ ۔!": ایک عنوان ——— لیکن لیڈری عزیز تر۔

---

"دلی ملک اسکیم کا دودھ پتلا آ رہا ہے": ایک خبر ——— اب پتا چلا کہ گھروں کے نلکے یوں سوکھے پڑے رہتے ہیں کہ پانی ملک اسکیم والوں کے یہاں چلا جاتا ہے۔

---

سنڈیکیٹ کانگریس، جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی کا ناکام گٹھ جوڑ۔

ناپاک گٹھ جوڑ

---

"میٹرو پولیٹن کانگریس پارٹی دِلّی میں شگاف" ایک خبر ـــــ برسات کا موسم جو ہُوا۔ بڑے بڑے بندروں میں شگاف پڑ رہے ہیں۔

---

"اندھا مُغل دِلّی کے بلیک ڈپو" ایک عنوان ـــــ اندھیر گردی کا شکار۔

---

"غلط رہنمائی ہی خطرے پیدا کرتی ہے" ایک خبر ـــــ اور عوام غلط کاریوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔

---

"جرائم میں تشویشناک اضافہ" ایک عنوان ـــــ لیڈروں میں ہولناک اضافے کا نتیجہ۔

---

"ریلوے اسٹیشنوں پر گداگری روکنے کے لئے اقدامات" ایک خبر ـــــ کیا سادھو سماج کے سنستھاپک وزیرِ ریلوے شری گلزاری لال نندہ سادھوؤں سے ناراض ہو گئے۔

---

"ماؤسی تنگ کیا کھاتا ہے، کیا پیتا ہے؟" ایک خبر ـــــ آدمی کا گوشت کھاتا ہے، آدمی کا خُون پیتا ہے۔

---

"بناسپتی کا سجاوٹ گرنے کی اُمید" ایک خبر ـــــ دھکّا دیجئے اُمید بر آئے گی۔

---

"تحصیل گوہانہ کے پٹواریوں کو کئی ماہ سے تنخواہ نہیں ملی" ایک خبر ـــــ اور بالائی آمدنی کا کیا حال رہا؟

---

"مذہب کو سیاست سے الگ رکھا جائے" ایک عنوان ـــــ اور جو سیاسی دُکانیں اسی بُنیاد پر چلتی ہیں؟

---

"مہنگائی کو روکا جائے" ایک عنوان ـــــ کسی طرح نہ رُکے تو اُسے ہمالیہ کھڑا کر دو۔

---

[illegible] حکومت کی ملازمت جاری رکھنے کے لئے ہاتھ پاؤں
مارے۔ مہاتما گاندھی سے ہوم سکریٹری کو سفارشی خط لکھا لیکن تنزلی کا
حکم [illegible] مرارجی ڈیسائی ڈپٹی [illegible] بن گئے۔ برطانوی سامراج کے وفادار
ملازم کی داستان ——— یہ تو پرانی داستان ہے، نئی یہ ہے کہ سیکولرزم اور
سوشلسٹ سماج کی حامی حکومت میں وزیر خزانہ اور نائب وزیر اعظم تھے۔
جب اندرا گاندھی نے وزارت خزانہ سے سبکدوش کر دیا اور نائب
وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹ گئے تو انہوں نے سیکولر جماعت جن سنگھ اور
[illegible] سوشلسٹ جماعت سوتنتر پارٹی سے پینگیں بڑھانی شروع کر دیں۔

---

"ہند میں نہ ہندو دھرم خطرے میں ہے نہ اسلام" الہ آباد میں
شری آئی کے گجرال کی تقریر ——— بلکہ اصل خطرہ دھرم اور مذہب کے
ٹھیکیداروں کو ہے۔

---

"سماج میں موجودہ ناانصافیوں کو دور کرنا ناگزیر" اندرا گاندھی
——— یعنی سماج کو اسی طرح پاک کرنا ہے جس طرح کانگرس کو مرارجی، پاٹل،
اتلیہ، سنجیوا اور گپتا سے کیا ہے۔

---

"یہ ناؤ چلے گی نہیں" ایک عنوان ——— گٹھ جوڑ والی۔

---

"اناج کی درآمد اگلے برس سے بند" ——— پھر ہوا
کھائیں گے۔

---

ایک غزل کا عنوان ہے ؎
حال کا نقشہ تو دیکھا ہے رنگِ مستقبل بھی دیکھ
یعنی حال میں تو وزارتِ خزانہ چھنی، نائب وزارتِ عظمیٰ گئی، مستقبل
میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

---

"دلی ایڈمنسٹریشن کی پالیسی کی مذمت۔ مدن گیر کیمپ میں
جن سنگھ کا پتلا جلایا گیا" ——— اور جن سنگھ کے راج میں۔ کیسا زمانہ
آگیا ہے!

---

گجرات سنڈیکیٹ کانگرس کو گٹھ جوڑ پر آمادہ کرنے میں مرارجی ڈیسائی ناکام۔

اکالی دل نے کانگریس کی شرائط مان لیں۔

---

• ”ریلوے ڈبوں کی قلت“: ایک خبر ——— کیا مسافروں نے اس میں بھی سفر شروع کر دیا؟

• ”وسط مدتی انتخابات نہیں ہوں گے“: اندرا گاندھی کا اعلان ——— اس لئے ٹکٹ لینے والے دِلّی آنے کا کشٹ نہ کریں۔

---

• ”متحدہ جمہوری محاذ کا منصوبہ ختم“ ——— ؎
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

• ”بمبئی میں سونے کی بارش“ ——— پھر بھی یہ گلہ ہے کہ ہم سرمایہ دار نہیں۔

---

• ”محنتی کسانوں کی سراہنا“: ایک خبر ——— باتونی سیاستدانوں کی طرف سے۔

• ”چینی میں مندہ، گڑ میں تیزی“: ایک عنوان ——— مرچوں میں نرمی، بناسپتی میں گرمی ——— یہ ہیں بازاروں کے بھاؤ۔

---

• ”دھوکے بازوں کا سرغنہ“: ایک خبر ——— سنڈیکیٹ کی طرف رُخ کرے، کھپ جائے گا۔

• ”دِلّی میں کاشتکاروں کے لئے مفید اسکیمیں“ ——— وزیروں کی کوٹھیوں میں غلّہ اُگاؤ، سبزی اُگاؤ۔

---

• ”مسلم لیگ، جن سنگھ سے گٹھ جوڑ کو تیار“ ——— ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے جو ہوئے۔

• ”راجستھان میں نابینا وکیل“: ایک خبر ——— اندھا دھند مقدمے بازی ہوگی۔

---

• "پاکستان کو اسلحہ دینے کے نتائج سنگین ہوں گے" امریکہ کو ہندوستان کی وارننگ ——— یہی ہوگا نا کہ جنگ بھڑکے گی، تو پھر ٹھیک ہے۔ امریکی ہتھیار دھڑا دھڑ فروخت ہوں گے۔

---

• "بنگلوں نے امیروں سے زیادہ اور غریبوں سے کم ٹیکس لینے کا فیصلہ کر لیا" ایک خبر ——— بلاشبہ لالاؤں اور ڈالمیاؤں کے سینوں پر سانپ لوٹ گئے۔

---

• "ایوب اور بھٹو دونوں کی ایک دوسرے کے خلاف قتل کی سازش" ایک خبر ——— دونوں آج کل خالی جو ہیں۔

---

• "ہنسی ہسپتال میں شکایت" ایک خبر ——— جو ہنسی ہنسی میں ہوگیا۔

---

• "قیدی کی ہسپتال میں موت" ——— قیدِ ہستی سے آزاد ہوگیا۔

---

• "بادل چیف منسٹر پنجاب دلی پہنچ گئے" ——— چنڈی گڑھ میں مسلسل جو چلک رہی تھی۔

---

• "دوسری شادی کے بعد پہلی بیوی کی یادگار قائم کرنے کا فیصلہ" ——— دوسری شادی بجائے خود یادگار ہے۔

---

• "قانون کے طلباء نے ہڑتال کر دی" ——— جو غیر قانونی تھی۔

---

• "کانسٹیبل کے خلاف غبن کا مقدمہ" ایک خبر ——— کیا اسے یہ کام سپرد تھا؟

---

• "وزیرِ اعظم معافی مانگیں" باجپائی کا مطالبہ ——— یہ منہ اور مسور کی دال!

---

• روس، ہند اور پاکستان سے سمجھوتہ کرانے کے لئے ایک اور تاشقند کانفرنس بلانے کی کوشش میں" ایک خبر

# نکسلائٹ

## خوشگرامی

چہرے پر دہشت زنی۔ ملک بھر میں دہشت زدگی۔ آنکھوں میں شعلے، ہر طرف آتشبار۔ ہاتھ میں بم جو اسکولوں، کالجوں، تھانوں اور سینماؤں پر گرتے ہیں۔ منہ سے خون کی پچکاریاں جاری۔ ہر طرف سے لعنت، ہر طرف سے پھٹکار۔ اس حلیہ کے ہیں ——

نکسلائٹ

نکسلباڑی میں پیدا ہوئے۔ جاگیرداروں زمینداروں کی ناانصافی نے جنم دیا۔ مغربی بنگال میں پروان چڑھے —— ہمالیہ کے اس پار کی سرخ آندھیوں نے قوت بخشی اور اب تو پورے تار ادھر ہی سے ہلتے ہیں —— ماؤ کا کلمہ پڑھتے ہیں، لال کتاب پر ایمان ہے۔ ہاتھوں میں سرخ جھنڈا تھامے نہ صرف ملک کی رگوں میں خون کی طرح دوڑنے پھرنے کے قائل ہیں بلکہ آنکھ سے ٹپکنے والا لہو بھی ہیں —— انسانوں کا گوشت کھاتے اور خون پیتے ہیں۔ ایسے درندے بن چکے ہیں کہ معصوم و مجرم کی تمیز ختم ہو چکی ہے۔ مار دھاڑ محبوب مشغلہ ہے۔ بیکاروں، بے گھروں، بے زمین لوگوں اور سرکش طالب علموں کی فوج بھرتی کرتے ہیں۔ ہر ایجی ٹیشن سے فائدہ اٹھانا، سوتے ہوئے فتنوں کو جگانا، سادہ لوح لوگوں کو سبز باغ دکھا کر لوٹ مار کے راستے پر لگانا، کسانوں کو فریب دینا، مزدوروں کو ورغلانا، مہاتما گاندھی کے بت توڑنا، گورودیو رابندرناتھ ٹیگور کی تصویریں تباہ کرنا، گاندھی ازم پر لٹریچر کو جلانا، صنعت کاروں، تاجروں، کارخانہ داروں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور زمینداروں اور اپنے مخالفوں کو دھمکی آمیز خطوط لکھنا، مظاہروں کے پردوں میں توڑ پھوڑ کرنا، جلسوں میں گڑبڑ کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ مختصر یہ کہ ہے ہیں یہ لوگ جو

جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوز دروں

# اوورٹائم

م۔ک۔ مہتاب ایم۔ اے

ڈبلیو۔ زیڈ۔ ۳۴۲ ہرشیو نگر۔ نئی دہلی نمبر ۱۸

مکرمی و محترمی خوشتر صاحب، آداب

افسانہ نمبر دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ خدا اس محفل کو تا دیر آباد رکھے۔ آپ نے اِس بار بہت سی ایسی ہستیوں کے دیدار حاصل کرنے کا موقع دیا جنھیں دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں۔۔۔ صدیقی صاحب سے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ آپ اب خوش و خرم ہیں۔۔۔ ایک کہانی "اوورٹائم" ارسال ہے۔ اُمید ہے آپ اور قارئین اِسے پسند کریں گے۔۔۔

آپ کا عزیز ۔۔۔۔۔ م۔ک۔ مہتاب

★

"واہیگورو! آج تو میری عزت تمھارے ہاتھ ہے۔ آج میں صحیح سلامت گھر پہنچ گئی تو اِس مہینے ضرور پرشاد چڑھاؤں گی۔ واہیگورو! تُو ہی اَسرِ دل کا آسرا ہے۔ تُو آج تک میری حفاظت کرتا آیا ہے۔ کیا آج نہیں کرے گا؟"

شجیتہ ٹائپ رائٹر سامنے رکھے آنکھیں بند کئے ہاتھ باندھے گورو مہاراج کا تصور کر کے اردا س کر رہی تھی۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ عملے کے سب کلرک اور خزانچی جا چکے تھے۔ جن میزوں کے اوپر لمبے تاروں سے بلب لٹک رہے تھے۔ ایک چپراسی ایک ایک کر کے سب بلب بجھاتا جا رہا تھا۔ اب صرف اُس کے سر پر ایک بلب روشن تھا جس کے نیچے وہ پتھر میں سے تراشی ہوئی مُورتی کی مانند بیٹھی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ پتھر کو پسینہ نہیں آتا۔ لیکن وہ پسینے میں بھیگی جا رہی تھی۔ رُومال بھیگ گیا تو دوپٹے کے آنچل سے پسینہ صاف کرنے لگی۔

آخر راجندر اُس سے اور کیا کام لینا چاہتا ہے۔ اُس نے دفتر کا سارا کام نپٹا دیا ہے۔ سب خطوط ڈاک میں بھجوا دیے ہیں۔ فائلیں سب درست کر دی ہیں۔ کل کا پروگرام بنا دیا ہے۔ اب کس لئے اوورٹائم بیٹھنا ہوگا جب کبھی چپراسی اُسے آکر کہتا "صاحب کہتے ہیں کہ آج اوورٹائم بیٹھنا ہوگا" تو یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے اُسے گولی مار دی ہو۔ آخر اِس کی وجہ کیا ہے؟ وہ سوچنے لگی۔ عملے کے کسی اور شخص کو اوورٹائم ملتا ہے تو وہ خوش ہو جاتا ہے لیکن اُسے سب سے زیادہ چڑ اسی لفظ سے تھی۔ اِس کی وجہ کیا تھی؟ کیا یہ کہ وہ کنواری ہے؟ خوبصورت ہے۔ زیادہ خوبصورتی بھی تو وبالِ جان بن جاتی ہے۔ اُس کی ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کی رفتار کمپنی میں کام کرنے والے سب سٹینوگرافروں سے زیادہ ہے اِس پر بھی سب یہی کہتے ہیں کہ صاحب کی پی اے ہونے کے لئے اہلیت کی سب سے بڑی خوبی اُس کی خوبصورتی ہے۔ کالی گھٹا کی طرح سیاہ گیسو، کٹیلے ابرو، نشیلی آنکھیں، بانکی چتون، مہکتا ہوا گورا بدن۔ ہاتھ رکھو تو پھسل پھسل جائے۔ وہ دیدہ و دانستہ بالوں کو کسی خوبصورت ڈھنگ سے نہ سنوارتی۔ سیدھی مانگ نکال کر بالوں کو لمبی چوٹی میں باندھ کر چھوڑ دیتی۔ سفید لباس پہن کر آجاتی۔ تاکہ اُس کا حسن کہیں عیب نہ بن جائے۔ لیکن دیکھنے والے پھر بھی کہتے کہ اِس سادگی میں قیامت کا بانکپن ہے۔ آج تو ٹرانسپورٹ کمپنی میں پری اُتر آئی ہے! اور اگر وہ کبھی غلطی سے رنگین ساڑی پہن کر یا آنکھوں میں کاجل لگا کر آجاتی تو اچھے بھلے بال بچے دار بابو لوگ بھی بظاہر اپنے رجسٹروں پر جھکے اُس کے کیبن کے دروازے میں سے جھانکتے رہتے۔ مگر ایشور نے اُس کی جلد میں کشش پیدا کر دی ہے تو وہ کیا کرے۔ وہ تو اِن مردوں کی تاک جھانک سے اُکتا کر کبھی کبھار سوچتی کہ اِس جلد ہی کو چھیل ڈالے۔ لیکن ڈرتی ہے کہ اگر نچلی تہہ اِس سے بھی خوبصورت نکلی تو کیا ہوگا؟ وہ زیادہ سے زیادہ بناؤ سنگھار سے گریز کر سکتی ہے۔ لیکن یہاں تو وہ کوئی فقیرانہ لباس

"پکچر دیکھنے"

"کس کے ساتھ؟"

"ایک لڑکی کے ساتھ"

"کیسی تھی وہ لڑکی؟" ... منجیت نے میز پر رکھ کر سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

... سانولی سی ... تھی۔ جلتا ہوا مرمر کا سا بدن۔ کالی گھٹا کی سیاہ گیسو۔ ناگن کی طرح لہراتی ہوئی چوٹی۔ کٹیلے ابرو، نشیلی آنکھیں، بانکی ... جتنی سادہ تھی اتنی ہی پرکار۔ اس طرح چلتی تھی جیسے نشے میں ... رہی ہو۔

"آپ جانتی ہیں وہ کون تھی؟"

"میں نہیں جانتی وہ کون تھی۔ بس اتنا جانتی ہوں راجندر کے ساتھ ہوتے وہ اور بھی خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔"

"کب لوٹیں گے؟"

"میں خود ان کا انتظار کر رہی ہوں۔ دیکھو کب لوٹیں۔"

"مجھے انھوں نے وقت دیا تھا۔ میں دس منٹ لیٹ ہو گئی ہوں۔"

"وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا دیوی جی۔ آپ پھر کسی وقت تشریف لیئے۔"

وہ لڑکی پرس اٹھا کر واپس چلی گئی۔ اس کے گیسوؤں میں اڑسا سبز اطلس کا پھول گال کے پاس لٹک رہا تھا اور چال میں افسردگی تھی۔ منجیت بید کی شاخ کی طرح کانپ رہی تھی۔ سر سے پاؤں تک پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ اس میں اتنا ... کہ اس نے صاحب سے ملنے والی ایک لڑکی کو یوں جھٹک دیا۔ صاحب اندر بیٹھے سب کچھ سن رہے ہوں گے۔ ابھی شیر کی طرح گرجنے لگیں گے۔ لیکن میں کیا کروں۔ مجھے اوور ٹائم نہیں چاہیے۔ مجھے گھر جانا ہے۔ ماں کا دانتوں کا سیٹ لے جانا ہے۔ بھائی کی کتابیں لے جانی ہیں۔ آخر ہمارے کاموں کی بھی کچھ اہمیت ہے۔ وہ غصے میں بڑبڑانے لگی۔ کچھ مسکرائی بھی کہ اسے ایکدم اچھا بہانہ سوجھ گیا اور ایک لڑکی کا نقشہ کھینچ کر اس نے اس حسینہ کو خوب پانی پانی کیا۔ اب اگر صاحب نے پوچھا تو...

اور پنسل پھر اس کے ہاتھوں میں کانپنے لگی۔

اتنے میں راجندر کے کیبن میں ایک ... گھنٹی کی آواز آئی۔ بتی بند ہو گئی۔ دروازہ کھلا۔ راجندر کمرے سے نکل کر منجیت کے کیبن میں آیا۔

منجیت بے بس کھڑی کانپ رہی تھی لیکن راجندر مسکرا رہا تھا۔

"جیت! اچھی کرو۔ چلو تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔"

منجیت نے جلدی سے چیزیں، چٹھیاں اور حاضری کے رجسٹر میں ... بھرنے لگی لیکن راجندر نے اس کے ہاتھ سے قلم لے لیا اور بولا۔

"رہنے دو۔ اب اس کی کیا ضرورت ہے!!"

---

# غزل

علی جواد زیدی ایم۔ اے

ہجوم عیش و طرب میں بھی ہے بشر تنہا
نفس نفس ہے مہاجر، نظر نظر تنہا

ہے میرا عکس یہ آئینے میں کہ دشمن ہے
اداس، تشنہ، ستم دیدہ، بے خبر، تنہا

یہ قتل گہ تو مرے بالپن کا آنگن تھی
اڑا کے لائی کہاں چشم معتبر تنہا

برا نہ مان مرے ہم سفر خدا کے لئے
چلوں گا میں بھی اسی راہ پر مگر تنہا

نہ جانے بھیگی ہیں پلکیں یہ کیوں دم رخصت
کہ میں رہا ہوں رہ غم میں عمر بھر تنہا

ہزار غم تھے، مگر حشر گاہ عالم میں
بفیض عشق ہوئی چین سے بسر تنہا

نثار کر دوں یہ پلکوں پہ کانپتی یادیں
کبھی تو آؤ ادھر بھی دم سحر تنہا

چلا تو آؤں میں سنسان رہگزر سے مگر
یہ سوچتا ہوں نہ رہ جائے رہ گزر تنہا

ہزار مجھ سے ہو منسوب یہ مری تو نہیں
حیات الجھی ہوئی، تلخ، مختصر، تنہا

جدھر سے گزرے تھے معصوم حسرتوں کے جلوس
سنا کہ آج ہے زیدی وہی ڈگر تنہا

## ...نہ کہنا

عظیم اقبال ایم اے

گنج نمبر ا، بتیا (بہار)

میرے محترم! السلام رحمت

ایک اور تخلیق ارسال ہے ـــ "یہ نہ کہنا" یہ بھی عورت کی نفسیات کی ایک کڑی ہے۔ عالیہ کے کردار کی پیشکش میرے لئے ایک نیا تجربہ ہے۔ میں نے اس کردار کے ساتھ خود اپنی بیشتر گھڑیاں گزاری ہیں۔ اس کی سانسوں کے زیر و بم کا اندازہ لگایا ہے۔ میں ایسے کردار کی کسک کو کس طور سے منعکس کر سکا ہوں یہ آپ دیکھیں، محسوس کریں۔ تخلیق کے لئے جانفشانی میرے لئے عبادت و ریاضت کا درجہ رکھتی ہے۔ میں کرداروں کی (اپنی) کائنات میں کھو کر افسانوں کے تار و پود سنوارتا ہوں ـــ زیر نظر کہانی کی تکنیک بھی جدید ہے۔

آپ کا ــــ عظیم اقبال

★

"... نہ جانے کیا ہو جاتا ہے مجھے؟

... محسوس ہوتا ہے جیسے چاند تاروں کی روشنی بجھ گئی ہو۔ آفتاب کی
یں بھی کہیں سمٹ گئی ہوں:

عالیہ نے اپنے نرم ملائم تکیے کے گرد اپنی باہوں کو کس کر کچھ نڈھال
ی ہو کر سوچا تھا۔

کیا سچ مچ دنیا اتنی تاریک ہو چلی ہے؟ جگنوؤں کی ٹمٹماتی دمک بھی
نو نہیں۔ وہ ساری رنگینیاں کہاں کھو گئیں، کہاں گم ہو گئیں؟ یہ تعفن کا سا
ماحول، یہ گھٹن، یہ اندھیرے۔۔۔!!"

آہستہ سے عالیہ نے کروٹ بدلی۔ بستر پر کچھ شکنیں ابھر آئیں۔ کلائیوں کی چوڑیاں ذرا کھنکیں۔ اس کے لبوں سے ہلکی ہلکی سسکیاں ابھریں۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو تکیے میں پیوست کر دیا۔ اس کی سانسیں ذرا ڈگمگا گئیں۔ وہ اپنے بازوؤں کے حصار کو بتدریج کم کرتی گئی۔ چاہتی تھی ہونٹوں کی ساری حدت تکیے میں جذب ہو جائے۔ وہ خود ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جائے۔

عالیہ کی رنگت گوری نہیں، سانولی بھی نہیں ہے۔ ہاں، کچھ کچھ مٹیالی ضرور ہے۔ اس کے چہرے کو گول نہیں کہہ سکتے۔ لمبوترہ بھی نہیں۔ کتابی بھی نہیں۔ اپنا منفرد خاکہ ہے۔ اس کے ہونٹ سرخ نہیں، پھیکے سے ہیں۔ ان میں شادابی بھی نہیں۔ اس کے دانت چھوٹے چھوٹے ہیں۔ سیپی بھی نہیں۔ اس کی بھویں کمان کی طرح ہیں۔ نہ آنکھیں شیر برساتی ہیں۔ ان آنکھوں میں شراب کی مستی بھی نہیں، شفق کا رنگ بھی نہیں، جھیل کی گہرائی بھی نہیں۔ اس کی گردن کے خم کو صراحی نما نہیں کہہ سکتے۔ اسے شاخِ گل بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس کی ناک کے نتھنوں کے ابھار یا ہونٹوں کے گوشے دلوں میں کوئی خاص جذبے بیدار نہیں کرتے۔ اس کا قد سرو کی طرح نکل جائے، ایسی بھی بات نہیں۔ جسم کے خطوط مکمل ہو کر پرکشش بن جائیں، یہ بھی نہیں۔ تبدیلیاں عین ممکن ہیں لیکن سحر انگیزی، دلفریبی اور دلکشی شاید ممکن نہیں۔

تکیے کے گرد ہی عالیہ کی باہیں، کلائیاں کسمسا کر رہ گئیں۔ دباؤ سے کانچ کی کوئی نازک سی چوڑی ٹوٹ گئی۔ ہلکی سی چبھن ہوئی۔ عالیہ نے دیکھا خون کا ایک قطرہ دائیں کلائی میں رس گیا ہے۔ اس نے چاہا خون کا یہ قطرہ اپنے ہونٹوں میں جذب کر لے تاکہ ان میں کچھ تو سرخی عود کر آئے۔

پھیکے پھیکے ہونٹ جیسے ان کا سارا رس [illegible]
نچوڑ لیا ـــ بھونروں نے، تتلیوں نے، شہد کی مکھیوں نے۔ [illegible]
انگلیوں اور ہتھیلیوں ہی کا لمس تو نصیب ہوا ہے۔۔۔!!

. . . اس کی پیشانی شکایت کرتا ہے، ہاتھ تنگ کر بالوں کو اوپر کھینچ کر پیچھے کے اور جو اس میں کوئی وسعت پیدا نہیں ہوتی بالوں کے جھرمٹ ابھر کر پیشانی پر چھا جاتے ہیں۔ اس سے اس کے چہرے کی تاریکی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں بے رونق، چمک نہیں ہے، سیاہ حلقوں میں دھنسی دھنسی بے جان سی ہیں۔ بھوؤں کی بے حس لکیریں اور صرف چند پلکوں کے باوجود ان آنکھوں کو جاذب نہیں بنا پاتیں۔

. . . اُف! اُدھر نیلوفر کی آنکھیں کیسی ہیں! جیسے نیل کی دریا نیل کی بے قرار موجیں مچل رہی ہوں، جو اُبھر کر . . . ہوں تو میری پلکیں گرنا بھول جاتی ہیں۔ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ آنکھیں میرے دل میں اتر جائیں گی۔ چاہتی ہوں ان آنکھیں اپنی پلکوں میں چھپا لوں . . .!

عالیہ پلنگ پر بیٹھی محو رہی تھی —— اس کے سارے جسم پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے رینگ رہے تھے۔ بغلیں بھیگ چلی تھیں۔ رخساروں سے، ٹھوڑی سے، گردن سے ڈھلک کر پھسل کر زیر گریباں جانے والی ٹھنڈی بوندیں اس کے دل کی آگ کو سرد نہیں کر پا رہی تھیں۔ اُن کی ہلکی سرسراہٹ سے اُس کے اعضا میں ارتعاش ہو رہا تھا۔ بہت آہستگی سے اس نے ہونٹوں کو کھولا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی نیم وا تھیں۔

عالیہ کا بدن بالکل سپاٹ سا ہے۔ اس کے اعضا میں کوئی نسائیت، کوئی توازن، کوئی ہم آہنگی نہیں۔ سر سے پیر تک یکساں، یک شکل، بد وضع، کوئی بھی عضو تو ایسا نہیں جس پر نگاہیں جم جائیں۔ جنہیں دیکھ کر ارمان جاگ پڑیں یہ تمنا گدگدی ہو جائے۔ کوئی بھی لباس اس کے جسم میں نکھار، کشش، رعنائی پیدا نہیں کرتا۔

. . . کتنے ولولے سے ریشمی ساڑی باندھی تھی میں نے۔ سر پر آنچل رکھ کر ایسے شرمائی تھی جیسے کوئی دلہن لجاتے، شرماتے۔ آنچل سنبھالتے سنبھالتے پھسل بھی گیا تھا۔ میں کچھ نادم، کچھ محجوب بھی ہوئی تھی۔ لیکن جمیل نے ذرا نگاہ بھی نہ اٹھائی۔ تحسین کے دو الفاظ کیا بولتا بھلا! مجھ میں کیا رکھا ہے؟ کیسی ہوں میں؟ اللہ! عورت ایسی ہی ہوتی ہے —— بے ہنگم، بے ڈول!!

عالیہ کی گرم سانسیں کچھ اسی انداز میں چل رہی تھیں جیسے موسم گرما میں لو کے تھپیڑے چلیں۔ اسی آنچ سے وہ خود پگھلی جا رہی تھی۔ احساس کی نسوں میں آگ سی پھیل رہی تھی۔ ہتھیلیوں سے شعلے سے لپک رہے تھے۔ لب و رخسار میں انگارے بھر گئے تھے۔

. . . اس کے چہرے پر تل اور مہاسے بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے ہیں۔

صرف ٹھوڑی پر ایک نہیں، دو نہیں، سات تل ہیں۔ گردن پر تلوں کی ایک ٹیڑھی میڑھی لکیر سی بن گئی ہے۔ پیشانی پر دائیں جانب ایک بڑا سا تل ہے۔ اس کے بالائی ہونٹ کے اوپر باریک روئیں ہیں۔ ایسے ہی جیسے مسیں بھیگ رہی ہوں۔ اس کے ہاتھوں پر بھدے بالوں کی سجاوٹ ہے۔

. . . آب و تاب لئے وہ عائشہ کی بانہیں، جیسے صندل سے تراش کر بنائی گئی ہوں۔ کتنی سجیلی، کتنی چکنی ہیں! چھوؤ تو ہاتھ پھسل جائے۔ دیکھ کر جی میں آئے گلے کا ہار بنا لو، پہن لو، ان کی پنہائیوں میں سمٹ جاؤ —— میری بانہیں کھردری، بھدی ہیں۔ ان پر پھیلے ہوئے سنہرے روئیں ایسے رہے ہیں جیسے سوکھی ہوئی گھاس!

. . . کیسی سرخی، کیسی تری، کیسی شادابی ہے رعنا کے ہونٹوں میں! جیسے گلاب کی کوئی نازک پنکھڑی ہو! ان کے لمس کے لئے انگلیاں کلبلا جائیں۔ اپنے کانپتے ہونٹوں میں رس آ جائے . . .!

. . . اور میں کیسی ہوں؟ میں کیسی ہوں! آپ اپنی آنکھوں میں رسوا! شرمسار!! یہ کاجل، یہ ٹیکے، یہ لٹیں، یہ نتھ، یہ کیل، یہ سرخی، یہ غازہ، یہ پھول، یہ مالائیں، یہ ڈھلکا ہوا آنچل، سرسراتے دوپٹے، لہراتی خوشبو! یہ جھلملے ستاروں کی جگمگ، یہ پوشاکوں کی دھنک —— سب بے رنگ، سب بے آب!!

عالیہ اپنے سارے جسم میں تشنج سی محسوس کر رہی تھی۔

ایسا بھی ممکن ہے اس کی سوچیں ایک دن اس کی چتا بن جائیں ——

. . . جمیل، میرے جمیل! تمہاری نظریں ادھر اٹھیں گی بھی کیسے! ادھر شعلے بھی نہیں، شبنم بھی نہیں۔ کوئی نور نہیں، کوئی جلوہ بھی نہیں۔ یہاں تو صرف گہن ہے، دھندلکے ہیں، تاریکیاں ہیں۔ ایسے میں تمہاری پلکیں جھک جائیں تو کیا ہوا، میرے قدم رک بھی جائیں تو کیا ہوا! پھر بھی کس کی آس ہے تمہیں کس کی تلاش ہے تمہیں، تم یہ نہ کہنا . . . یہ نہ کہنا . . .!!!

---

# بہارِ بے خزاں

پریم وار برٹنی

موہنی مورتی اجنتا کی | یہ سجاوٹ یہ روپ کیا کہیے
ایک تازہ ورق ہے سونے کا | تیرے مکھڑے کی دھوپ کیا کہیے

بت تراشوں کے خواب سے بھی لطیف | شاعروں کے خیال سے بھی بلند
استعارے، کنائے، تشبیہیں | تیری عظمت کو آسکے نہ پسند

تجھکو، میزانِ ماہ وانجم میں | آسمانوں نے تول کر دیکھا
اُڑ گئے ہوش دونوں عالم کے | تُونے جب آنکھ کھول کر دیکھا

دو مقدس عظیم تہذیبیں | تیری آنکھوں میں رقص کرتی ہیں
کفرو ایماں کے ہر تصور میں | تیرے جلووں کا رنگ بھرتی ہیں

نشہ ہوجائے، دیکھتے ہی جسے | وُہ محبت بھری شراب ہے تُو
تجھکو لیلیٰ کہوں کہ ہیر کہوں | عشق کی عظمتوں کا خواب ہے تُو

میں اگر ہوں چناب کا دریا | سوہنی کا گھڑا ہے تیرا وجُود
عشق ہر چیز سے بڑا ہے مگر | عشق سے بھی بڑا ہے تیرا وجُود

تُو اگر عشق میں سما جائے
ہر خزاں پر بہار چھا جائے

# شرط

محمد جمیل احسن ایم۔ ایس سی (علیگ)

دارالنزالۂ دوم کشمیر ہٹوٹس، سلیمان ہال، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محترم خوشتر گرامی صاحب تسلیم

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ "شیش محل کے کھنڈر" اور "تنہائی" کے بعد "شرط" حاضر ہے۔ افسانے کے متعلق آپ کی اور قارئین کی رائے کا منتظر ہوں . . .

—— محمد جمیل احسن

---

شام کے چار بجنے کو تھے۔ جاوید حسبِ معمول آرٹس فیکلٹی کے مین گیٹ کے دائیں جانب لان میں سیما کا منتظر تھا۔ گیٹ کی طرف تکتے تکتے اس کی آنکھیں دُکھنے لگی تھیں۔ اس نے بیزاری سے سر جھٹکا۔ جیب ٹٹول کر سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا۔ سگریٹ سلگا کر وہ سوچنے لگا۔ آخر انتظار کی گھڑیاں اتنی طویل کیوں ہو جاتی ہیں۔ گھڑی کی سوئیاں جامد سی معلوم ہوتی ہیں جیسے کائنات اپنے محور پر گردش کرتے کرتے یکایک تھم گئی ہو۔ اسے آئے ہوئے بمشکل آدھ گھنٹہ ہوا تھا لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے صدیوں سے یہیں بیٹھا سیما کی راہ تک رہا ہو۔ روز وہ سیما سے گلہ کرتا "آج تو تم نے بہت انتظار کرایا!" سیما حیرت سے کہتی "اپنی گھڑی دیکھو تو ٹھیک چار بج کر پانچ منٹ ہوتے ہیں۔ میری کلاس چار بجے ختم ہوتی ہے۔ اب اگر تم بارہ ہی بجے سے انتظار کرنے لگو تو میں کیا کروں" اور جاوید سوچتا کیا وہ واقعی پہلے آ جاتا ہے؟ جاوید کی کلاسز ایک بجے ختم ہو جاتی تھیں۔ تین ہی بجے سے جاوید سیما سے ملنے کی تیاری شروع کر دیتا۔ منہ ہاتھ دھوتے ہوئے، بال سنوارتے ہوئے۔ غرض ہر کام شروع کرنے سے پہلے اور ختم کرنے کے بعد وہ گھڑی دیکھتا اور آخر کار وقت کی سست رفتاری سے عاجز آ کر گھڑی کی طرف دیکھنا چھوڑ دیتا۔ اپنے خیال میں کافی اطمینان سے ٹہلتا ہوا ہوسٹل سے آرٹس فیکلٹی تک جاتا۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچتا تو وہی ساڑھے تین بج رہے ہوتے اور انتظار کا یہ آدھ گھنٹہ صدیوں کے برابر معلوم ہوتا!

سیما کی کلاس چار بجے ختم ہوتی تھی۔ وہ جاوید کے ساتھ آرٹس فیکلٹی سے نکلتی۔ دونوں ٹہلتے ہوئے شمشاد مارکیٹ کی کراسنگ تک آتے جہاں سے سیما بدر باغ جانے والی سڑک پر مڑ جاتی اور جاوید ہوسٹل کی طرف لوٹ پڑتا۔ کبھی سیما کی کلاس پہلے چھوٹ جاتی تو دونوں کچھ وقت یونیورسٹی کینٹین میں گزار لیتے یا لائبریری لان کے کسی گوشے میں بیٹھ کر مستقبل کے پلان بناتے۔

---

آرٹس فیکلٹی کے گھنٹے نے ٹن ٹن کر کے پیریڈ ختم ہونے کا اعلان کیا۔ جاوید نے سکون کی سانس لی۔ سگریٹ پھینک کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور رومال سے کپڑوں پر چمٹے ہوئے تنکے جھاڑتا ہوا لان سے نکل کر سمنٹ روش پر آ گیا۔ گیٹ سے سیما نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ "ہلو جاوید!" حسبِ معمول دلنواز مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھیل گئی۔ "تم کافی بور ہو گئے ہوگے، بشرطیکہ آدھ گھنٹے سے میرا انتظار کر رہے ہو؟" جاوید اس کی مسکراہٹ میں کھو کر انتظار کی ساری کلفت بھول جاتا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے یونیورسٹی روڈ پر دائیں طرف مڑ گئے۔ یونیورسٹی کینٹین اور زولوجی ڈیپارٹمنٹ کے بیچ سے گزرنے والی پتلی سڑک پر مڑتے ہوئے جاوید نے کہا "بھئی سیما! کل اتوار ہے، کتنے اتوار گزر گئے، پکچر کا پروگرام بن بن کر کینسل ہوتا رہا۔ چلو ایک پکچر دیکھ ہی لیں؟"

"ضرور بشرطیکہ مجھے اجازت مل گئی؟"

"تمہاری یہ شرطیں مجھے زندہ نہ چھوڑیں گی! ہر بات کے ساتھ ایک شرط لازمی ہے!"

"مگر کون سی پکچر دیکھیں گے؟" سیما شرط کی بات گول کر گئی "بشرطیکہ" سیما کا تکیہ کلام تھا اور شرطیں لگانا اس کی ہابی۔ لیکن یہ عجیب اتفاق تھا کہ جاوید سے جتنی شرطیں سیما نے لگائیں، وہ سب کی سب جاوید نے جیتیں۔

"میرا خیال ہے نشاط میں جیول تھیف دیکھیں" جاوید نے کہا۔

"بشرطیکہ جیول تھیف نشاط میں چل رہی ہو" حسبِ عادت سیما بولی۔

"کیا مطلب؟" جاوید نے سیما کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ جیول تھیف نشاط میں نہیں تصویر محل میں لگی ہوئی ہے"

"نہیں بھئی جیول تھیف نشاط میں ہی چل رہی ہے" جاوید یقین کے ساتھ بولا۔

"ہوگئی شرط!" سیما بھلا شرط لگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے کیوں جانے دیتی۔

"منظور! چلو ابھی شمشاد مارکیٹ میں ایڈورٹائزمنٹ بورڈ دیکھ لیتے ہیں"

شمشاد مارکیٹ میں حسبِ معمول کھنڈیل وال کی دکان کے اوپر شہر کے سنیماؤں کے بورڈ لگ رہے تھے۔ جاوید نے سیما کو ادھر متوجہ کیا "نشاط میں جیول تھیف تاریخ ۷ ارت"

"بولو کیا ہار رہی ہو؟" جاوید نے سیما کو چھیڑا۔

"اپنی سب سے عزیز چیز تو تم سے ہار ہی چکی ہوں۔ اب میرے پاس رہا ہی کیا ہے!" سیما نے جذباتی لہجے میں کہا اور جاوید لمحوں کی نغمگی میں کھو گیا۔

"اچھا تو کل کا پروگرام طے رہا میٹنی شو۔ خدا حافظ!" سیما بدر باغ جانے والی سڑک پر مڑ گئی اور جاوید سیما کے خیالوں میں کھویا ہوا ہوسٹل کی طرف لوٹ آیا۔

---

جاوید اور سیما کے فائنل امتحانات ختم ہو چکے تھے۔ جاوید گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ سیما کے اصرار پر وہ تین چار دن رک چکا تھا لیکن سیما اسے مزید روکنے پر مصر تھی۔

"تم کچھ دن اور رک جاؤ جاوید! نہ جانے کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔ جیسے . . . جیسے اب تمھیں پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گی!"

"بھئی سیما میں گھر خط لکھ چکا ہوں کہ اتوار کو پہنچ رہا ہوں اور آج بدھ ہے۔ ابھی تک میں یہیں ہوں۔ امی جان بہت پریشان ہوں گی۔ پھر مجھے امی جان سے اپنی اور تمھاری شادی کی بات بھی تو کرنی ہے" جاوید نے شرارت بھری نظروں سے سیما کو دیکھتے ہوئے کہا اور سیما نے شرم سے [illegible] جھکا لیا۔

"مجھے چھوڑنے تو آؤ گی نا؟"

"بشرطیکہ تم ٹرین اسٹیشن کے مطابق چلتے چلنے کا وعدہ کرو" [illegible] نے کہا اور کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

---

ٹرین آچکی تھی۔ جاوید اپنا سامان کمپارٹمنٹ میں رکھوا کر پلیٹ فارم پر کھڑا سیما سے باتیں کر رہا تھا۔ ٹرین نے پہلی وسل دی۔ جاوید نے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ سیما!"

"خدا حافظ!" سیما بھرائی ہوئی آواز میں بولی ——— "خط لکھتے رہنا جاوید اور اپنی امی سے جلد ہی . . ." غم کے باعث سیما جملہ پورا نہ کر سکی۔

"تم فکر نہ کرو سیما سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ عارضی جدائی دائمی ملاپ میں بدل جائے گی"

"جاوید! میں خدانخواستہ تمھیں پا نہ سکی تو زندہ نہ رہ سکوں گی!" [illegible] آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"شرط لگاتی ہو؟" جاوید سیما کا موڈ بدلنے کے لئے بولا۔

"ہاں جاوید یہ میری اور تمھاری آخری شرط ہوگی!" سیما آنسوؤں میں بھیگی ہوئی مسکراہٹ کے درمیان بولی۔

ٹرین نے آخری وسل دی اور رینگنے لگی۔ سیما کچھ دور تک گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ پھر پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر بھیگی ہوئی آنکھوں سے [illegible] کو رفتار پکڑتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جاوید بھی دروازے پر کھڑا ہاتھ ہلاتا رہا یہاں تک کہ سیما کا وجود بڑھتے ہوئے فاصلے کی خلاؤں میں گم ہو گیا۔

---

جاوید کو گھر آئے ہوئے کئی دن ہو گئے۔ دن تو چھوٹے بھائی بہنوں کی دلچسپ شرارتوں اور مختلف پروگراموں کی نذر ہو جاتا۔ لیکن جب وہ تنہا ہوتا سیما کی یاد بری طرح ستاتی۔ ابھی تک وہ امی سے سیما کے متعلق بات نہ کر سکا۔ وہ کسی مناسب وقت کا منتظر تھا اور آخر وہ وقت آ ہی گیا۔

ایک رات جب جاوید سونے کی تیاری کر رہا تھا اس کی امی کمرے میں داخل ہوئیں "جاوید تم مصروف تو نہیں ہو؟"

"نہیں امی جان بھلا آج کل مصروفیت کا کیا کام!"

"یہی کوئی دیر سے ختم ایک بات کہہ ڈالی تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ تم میری بات نہ ٹالو گے۔"

"امّی جان وقت تک آپ کے بیٹے نے آپ کی کوئی بات ٹالی ہے؟" جاوید نے امّی کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

جاوید کی امّی نے ٹیبل پر اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تصویریں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "جاوید اب ماشاء اللہ تم ایم۔ ایس سی کر چکے ہو۔ اتنے بڑے گھر کا انتظام اب مجھ سے نہیں سنبھلتا۔ میں چاہتی ہوں تمھاری شادی کر دوں۔ یہ کچھ تصویریں ہیں مجھے تو یہ سبھی لڑکیاں پسند ہیں۔ تم اپنی پسند بتاؤ۔"

جاوید نے ایک نظر تصویروں پر ڈالی۔ اُس کی نگاہوں میں سیما کا چہرہ گھوم گیا۔ "امّی جان! یہ لڑکیاں تو واقعی بہت اچھی ہیں لیکن سیما سے اچھی نہیں!"

"یہ سیما کون ہے؟" جاوید کی امّی نے تیز نظروں سے جاوید کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"امّی! سیما بہت اچھی لڑکی ہے۔ بہت نیک۔ شہر ہی میں دیکھا تھا۔"

جاوید نے اٹیچی کیس سے سیما کی تصویر نکال کر امّی کی گود میں ڈال دی۔

بہت دیر تک مختلف زاویوں سے سیما کی تصویر دیکھنے کے بعد انھوں نے کہا۔ "لڑکی تو واقعی اچھی ہے۔"

"لیکن کون ہے؟ کس کی لڑکی ہے؟ کہاں کی رہنے والی ہے؟"

جاوید نے سیما کے بارے میں تفصیلات بتائیں اور اس کے والد کا پتہ بھی نوٹ کرا دیا۔

"اچھا میں اِس سلسلے میں تمھارے ابّو جان سے بات کر لوں گی۔" امّی جان اُٹھتے ہوئے بولیں۔

"اچھی امّی! میں سیما ـــــ صرف سیما سے شادی کروں گا!" جاوید بچّوں کی طرح ضد کرتے ہوئے امّی سے لپٹ گیا۔

"اچھا اچھا یہ لاڈ پیار رہنے دے۔ اب سو جا رات بہت ہو گئی ہے۔"

اپنی امّی کے جانے کے بعد جاوید مستقبل کے رنگین سپنوں میں کھویا کھویا نہ جانے کب سو گیا۔

---

کوئی دو ہفتوں کے بعد جاوید کی امّی نے اُسے سیما کے والد کا خط دکھایا جس میں انھوں نے رشتے کی منظوری دیتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ جلد از جلد اِس فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتے ہیں۔ خوشی سے جاوید کے پیر زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اُس کے رنگین خوابوں کی دلفریب تعبیر اُس کے سامنے تھی!

دُوسرے دن ڈاک سے اُسے سیما کا مختصر سا خط ملا۔ جسے پڑھ کر جاوید پہلے تو گھبرا گیا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی گئی۔ لکھا تھا ـــــ

عزیز از جان جاوید! سلام خلوص و محبت

خُدا کرے تم بخیر ہو۔ ایک منحوس خبر تمھیں سُنا رہی ہوں۔ ابّا جان نے میری شادی کسی انور صاحب سے جو تمھارے ہی شہر کے رہنے والے ہیں تقریباً طے کر دی ہے۔ تیاریاں بھی شروع ہو گئی ہیں۔ جاوید جلد ہی کوئی راستہ نکالو۔ ورنہ میں کیا کروں گی؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ تفصیلات پھر لکھوں گی۔ اس وقت دل و دماغ قابو میں نہیں ہیں۔ خُدا حافظ!

تمھاری اور صرف تمھاری

سیما

جاوید سمجھ گیا کہ اُس کے ابّا جان نے رشتے کے خط میں اُس کا پورا نام انور جاوید نہ لکھ کر صرف انور لکھا ہوگا۔ جس سے سیما مغالطے میں آگئی۔ اُس نے سوچا کتنا لطف آئے گا جب اچانک سیما کو معلوم ہوگا کہ انور کوئی اور نہیں اُس کا جاوید ہے! یہ سوچ کر دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے اُس نے سیما کو لکھا ـــــ

سیما ڈیر!

یہ آخری خط تمھیں لکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنی امّی جان کو راضی کرنے کی پوری کوشش کی۔ لیکن وہ میری شادی دُوسری جگہ طے کر چکی ہیں۔ میں مجبور ہوں سیما! قسمت کے فیصلے کو بدلا نہیں جا سکتا۔ بہتری اِسی میں ہے کہ تم انور سے شادی کر لو۔ میں انھیں اچھی طرح جانتا ہوں بہت اچھے انسان ہیں۔ یہ میری تم سے آخری فرمائش ہے!

جاوید

---

شادی کی تاریخ آگئی۔ جاوید انور کے رُوپ میں سیما کو بیاہ لایا۔ سر کے درد کا بہانہ کر کے اُس نے آرسی مصحف کی رسم سے بھی انکار کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گھر پہنچنے سے پہلے سیما اُسے دیکھ لے۔

بارات واپس آئی۔ خُدا خُدا کر کے رات آئی۔ بہت سی رسموں سے گزرتا ہوا جاوید دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ حجلۂ عُروسی تک پہنچا۔ سیما تکیوں سے ٹیک لگائے کچھ تھکی تھکی سی سُرخ کپڑوں میں سرتاپا چھپی ہوئی بیٹھی تھی۔ جاوید آہستہ آہستہ سیما کے پاس پہنچا اور مسہری پر بیٹھتے ہوئے اُس نے اپنے خوابوں کا

حقیقی رُوپ دیکھنے کے لیے سیما کا گھونگھٹ اُلٹ دیا۔ لیکن . . .

سیما کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ اُس کے منہ سے خون کی ایک پتلی سی لکیر بہتی ہوئی سُرخ کپڑوں میں گم ہو گئی تھی۔ "سیما! سیما!" جاوید نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔ سیما نے جنبش تک نہ کی۔ اُس کے کپڑوں میں سے چھپے ہوئے دو خط نکل کر مسہری پر گر پڑے۔

جاوید نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک خط اُٹھایا۔

میرے مجازی خُدا انور صاحب!

میں آپ سے شرمندہ ہوں کہ میں آپ کو کوئی خوشی نہ دے سکی۔ میرے پاس اپنا تھا ہی کیا جو میں آپ کو دیتی۔ میں بہت پہلے کسی اور کی ہو چکی تھی۔ دوسرا خط جاوید صاحب تک پہنچانے کی زحمت کیجئے گا۔ مجھے یقین ہے آپ انھیں ضرور جانتے ہوں گے۔ مجھے معاف کر دیجئے گا۔

آپ کی گنہگار ——— سیما

جاوید کے ہاتھ سے خط چھوٹ کر گر پڑا۔ پھر تھرتھراتے ہاتھوں سے دوسرا خط اُٹھایا ———

جاوید پیارے! آخری سلام

میرے اور تمھارے درمیان جو آخری شرط لگی تھی، وہ میں جیت گئی۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے زندگی ہار کر بھی تم سے ایک شرط جیت لی۔ تمھاری آخری فرمائش کہ "میں انور صاحب سے شادی کر لوں" میں نے پوری کر دی۔ تناسخ پر اس غرض سے ایمان لے آئی ہوں کہ شاید اگلے جنم میں تم سے ملاقات ہو جائے۔

ہمیشہ تمھاری ——— سیما



# غزل

احمد وصی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

دِل کو خاموش جلاؤ نہ چتاؤں کی طرح
آنکھ برسا بھی دو اِک روز گھٹاؤں کی طرح

ہم نے چاہا کہ مہکنے لگیں کاغذ کے یہ پھول
آرزو کی بھی تو بچوں کی دعاؤں کی طرح!

جس طرف جاؤ اُدھر ایک سا غم ایک سا درد
زندگی بھول بھلیاں ہے گپھاؤں کی طرح

رات آتی رہیں اِس دِل سے کئی آوازیں
کسی گنبد کی پُر اسرار صداؤں کی طرح

کیا خبر یہ مجھے لے جا کے کہاں چھوڑے گا
وقت بے رحم ہے جنگل کی ہواؤں کی طرح

# غزل

سعادت نظیر ایم۔ اے

ہائے کیسی گردشِ حالات ہے؟
روزِ روشن بھی اندھیری رات ہے

جس کے ہاتھوں میری بربادی ہوئی
وہ بھی اب مغموم ہے کیا بات ہے؟

ترکِ اُلفت، اور ہم آشفتہ سر!
شیخ صاحب آپ کی کیا بات ہے!

ہوں چراغِ شوق لے کر گامزن
راہ مشکل ہے، اندھیری رات ہے

پھر بھڑک اُٹھی ہمارے دِل کی آگ
پھر وہی ہم ہیں، وہی برسات ہے

# وعدوں کا کیا...!

ایم۔ ایچ۔ خاں شاہجہانپوری

معرفت محمود خاں صاحب ٹال والے۔ ۳۰۵ بتاریں جلال نگر، شاہجہانپور۔ (یو۔پی)

مکرمی و معظمی! بسلام احترام

. . . ایک افسانہ "وعدوں کا کیا" پیشِ خدمت ہے۔ اُمید ہے پسند آئے گا۔ کسی قریبی شمارے میں شریک کرکے ممنون فرمائیں . . .

والسلام

——— ایم۔ ایچ۔ خاں

کالے کالے لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے، دراز دلکش پلکوں کے درمیان دو شوخ انگارے، تسبک تنی تنی ہوئی شتواں ناک، گلابی باریک لب، دونوں لبوں کے درمیان آبدار موتیوں کا متناسب سلسلہ، بیضوی شفاف ٹھوڑی اور اُس پر ننھا سا سیاہ تل ——— یہ تھی وہ، جسے میں پہلی بار دیکھ کر عورت کے تاثر میں کچھ سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ورنہ اِس سے پہلے میں نے عورت کے بارے میں سوچا ہی کب تھا؟ نہ اِس کی ضرورت ہی محسوس ہوئی تھی اور نہ خیال ہی آیا تھا۔

میں نے اُسے مرزا جی کے گھر دیکھا تھا۔ مرزا جی میرے پڑوس میں رہتے تھے۔ اُس دن اُن کے چھوٹے لڑکے کی پندرھویں سالگرہ کی تقریب تھی۔ وہ رقاصہ کی حیثیت سے آئی تھی۔ میں اُن دنوں جوان تھا۔ بزرگوں کی نظر بچا کر میں چپکے سے اُس محفلِ رقص و سرود میں چلا گیا تھا۔ میں جب پہنچا تھا تو وہ گا رہی تھی۔ اپنی تمام تر فتنہ سازیوں کے ساتھ وہ رقص کر رہی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ مجھے اچھی معلوم ہوئی تھی۔ اِتنی اچھی کہ ——— جب تک گانا ختم نہ ہوا میں گم صم آیا تھا۔ دوستوں کے گھیرے میں بیٹھا اُسے گھنٹوں دیکھتا رہا تھا۔ اُس نے میری طرف ایک بار بھی نہ دیکھا تھا۔ مجھے اِس کا کوئی گلہ بھی نہ تھا۔ اِتنی بڑی محفل میں وہ کیسے دیکھتی!

گانا ختم ہونے پر وہ سازندوں سمیت اُٹھ کر اُس کمرے میں پہنچ گئی تھی، جہاں مرزا جی نے اُس کے ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کیوں میرے قدم خود بخود اُس کمرے کی طرف اُٹھ گئے تھے۔ میں اُس کے پیچھے اُس کمرے تک پہنچ گیا تھا۔ میں وہاں پہنچا تھا تو وہ لباس تبدیل کر چکی تھی۔ وہ سفید کپڑوں میں سر سے پاؤں تک اور بھی نکھر آئی تھی۔ سادگی اُس پر نثار ہو رہی تھی۔ مجھ پر اُس کی نظر پڑی تھی تو وہ مجھے ایسی نگاہوں سے گھورنے لگی تھی جیسے پوچھنا چاہتی ہو "میں وہاں کیوں آیا ہوں"؛ لیکن اُس نے مجھ سے پوچھا نہیں تھا ——— وہ بولی تھی ———

"آیئے تشریف لایئے!" اُس کی آواز میٹھی سی تھی۔

میں کمرے میں چلا گیا تھا۔ تقریباً اُس کے پاس۔ وہ کمرے میں بالکل تنہا تھی۔ بس اُس کا مختصر سا سامان اُس کے پاس رکھا تھا۔ سازندے برابر والے کمرے میں ٹھہرے تھے۔ اُس نے نرمی سے بالوں کو جھٹک کر شانے سے ہٹا کر پشت کی طرف ڈالا تھا۔ کمرے کے گرد و پیش پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی تھی۔ پھر میری طرف دیکھا تھا اور مسہری پر بیٹھ گئی تھی۔ پھر مجھ سے بھی بیٹھنے کو کہا تھا ——— اور میں بلا تکلف بیٹھ گیا تھا۔

"آپ بہت اچھا گاتی ہیں!" بہت دیر بعد میں نے کہا تھا۔

وہ مسکرا پڑی تھی۔ ہونٹوں کو مخصوص انداز سے کھولا تھا اور بند کر لیا تھا جیسے غنچہ چٹکتے چٹکتے رہ جائے۔

"شکریہ!" وہ آہستہ سے بولی تھی۔

کئی لمحے خاموشی سے سسکتے رہے تھے!

"آپ ناچتی بھی بہت اچھا ہیں!"

"آپ کا بھی شکریہ!"

اُس کا لہجہ سرد سا تھا۔ اُس کے الفاظ میں بے پروائی کا طلسم تھا۔ میرے تعریفی الفاظ میں تاثر نہ تھا یا اُس نے مجھے اہمیت نہ دی تھی یا اُس کی یہ عادت رہی ہو۔ اِس چکر میں میں نہ پڑا تھا۔ میں تو بس اُس سے دو چار باتیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر بہت دیر تک میں اُس سے بات کرنے کا کوئی مناسب حیلہ ڈھونڈتا رہا تھا۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا تھا۔

"دو بج رہے ہیں۔ شاید آپ کو نیند آ رہی ہے۔ آرام کیجئے جا کر!"

"آپ سے کچھ باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔"

"کر لیجئے گا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں یہاں تین دن ٹھہروں گی۔ کل میرا پروگرام چوک میں گوپی مل صراف کے یہاں ہے۔ پرسوں نواب احسان اللہ خاں کے یہاں اور چوتھے دن میں میرٹھ چلی جاؤں گی۔ دن میں یہیں رہوں گی۔ میں نے یہ کمرے مرزا جی سے تین دن کے لئے لئے ہیں۔ جب جی چاہے چلے آیئے گا۔"

"اچھا تو میں کل دن میں آؤں گا۔" میں اُٹھ گیا تھا۔ "آپ ملیں گی نا؟"

"ہاں ـــــ ہاں ـــــ میں دن بھر ملوں گی۔"

میں چلنے لگا تو وہ بھی مسہری سے اُٹھ گئی تھی۔ میں باہر نکلا تو کچھ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ہوا بھی تیز تھی۔ چند ہی قدم چلا تھا کہ ہوائے اور شدت اختیار کر لی تھی۔ پھر یک بیک بارش بہت تیز ٹوٹ پڑی تھی۔ اُسی لمحہ مجھے اُس کی آواز سنائی دی تھی۔ میں بہت دُور نہ گیا تھا۔

"لوٹ آیئے! بارش بہت تیز ہو گئی ہے۔ آپ بھیگ جائیں گے!" اُس کی آواز کی مٹھاس بوندوں میں گھل کر میرے پاس آئی تو میرے قدم خود بخود رُک گئے تھے۔ میں لوٹ پڑا تھا۔ میں واپس نہ آتا تو واقعی شرابور ہو جاتا۔

"بیٹھ جایئے۔" اُس نے مُسکرا کے کہا تھا۔ اُس کے الفاظ میں طنز تھا، شوخی تھی۔ وہ بھی بیٹھ گئی، میں بھی بیٹھ گیا۔

پھر خاموشی!

"آپ نے اپنے بارے میں مجھے کچھ بتایا نہیں؟" وہ بولی تھی۔

"اور آپ نے بھی تو ـــــ!"

"آپ نے پوچھا ہی کب! چلئے جب تک ہم اپنے اپنے بارے میں کچھ کہہ لیں۔ بارش رُک جائے گی۔"

اُس کی باتیں دلچسپ تھیں، اُس کا لہجہ پُر اثر تھا۔

"میں آگرے میں رہتی ہوں۔ پھول منڈی میں میرا غریب خانہ ہے۔ پیشہ آپ کے سامنے ہے۔ اچھا گا لیتی ہوں، ناچ لیتی ہوں۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی شوقین گھیرے رہتا ہے۔ گانا بجانا اور سازندوں کی آمدنی الگ۔ کہیں نہ کہیں engagement رہتا ہے۔ گھر پر گانا ہوتا ہے۔ شوقین آ جاتے ہیں۔ آپ بھی کبھی تشریف لایئے۔ میرا نام مہ جبیں ہے۔"

"آپ کا نام بھی کتنا اچھا ہے!"

"اور میں ــ ــ ــ؟" اُس کے لپکتے شعلوں کا رُخ یک بیک میری طرف ہو گیا تھا۔

"چھوڑیئے ـــــ ہم ذاتیات پر رائے زنی کیوں کریں۔ یہ بتایئے کیا آپ اِس پیشے سے خوش ہیں ـــــ؟ میرا مطلب ناچنے گانے سے ہے۔"

"جن حالات کو بدلا نہ جا سکے اُن پر رائے زنی کرنا میری عادت نہیں ہے۔ خوشی کیا ہے، غم کیا ہے۔ اِس پر بھی کبھی میں نے غور نہیں کیا۔ زندگی کا کارواں یوں ہی گزر رہا ہے۔ اِس میں سوچوں کے بریک کیوں لگاؤں؟"

اُس کے الفاظ اتنے ٹھوس اور انداز فکر اتنا بالغ تھا کہ میں اُس کی طرف ایک گہری نگاہ سے دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس کے چہرے سے فلسفیانہ رعونت رِس رہی تھی۔ وہ پھر بولی تھی۔

"بارش شاید رُک گئی ہے۔ آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔ ویسے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں آپ کو ٹالنے پر مُصر ہوں۔ میری تو شب بیداری کی عادت ہے۔ آپ یقیناً بور ہو رہے ہوں گے۔ لیکن آپ نے اپنے بارے میں تو اب بھی کچھ نہیں بتایا؟"

"اچھا اجازت دیجئے۔ کل دن میں آؤں گا۔ پھر خوب باتیں کروں گا۔ آپ سے! آپ کی گفتگو سے واقعی ذہنی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔"

"شکریہ ـــــ" اُس نے داہنے ہاتھ کی چاروں اُنگلیوں کو یکجا کیا تھا اور پیشانی کی طرف لے جاتے ہوئے بولی تھی۔

میں چلا آیا تھا۔ اُس نے پھر دروازے تک میرا ساتھ دیا تھا۔

رات زیادہ ہو گئی تھی۔ اُس کے حسین تصوّر سے کھیلتے کھیلتے مجھے جلد ہی نیند آ گئی تھی۔ پھر دن میں مجھے اُس کے پاس جانے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ دُوسرے دن بھی نہ پہنچ سکا تھا۔ تیسرے دن بہت مشکل سے وقت نکال کر میں اُس تک جا سکا تھا۔ اتفاقاً اُس سے ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ بس جانے ہی والی تھی۔ ٹیکسی پر اُس کا سامان رکھا جا چکا تھا۔ شب کا آغاز تھا۔ دھندلے سائے لمبے ہو چلے تھے۔ اُس نے مجھے دیکھا، مُسکرائی اور ٹیکسی کا ہینڈل کے لئے ہاتھ بڑھا دیا تھا۔

"آپ آئے نہیں؟ ـــــ میں نے آپ کا انتظار کیا تھا!"

"آ تو گیا ہوں!"

"تو پھر آیئے ـــــ کچھ دیر ٹیکسی میں ساتھ رہئے گا اور کچھ دیر اسٹیشن پر؟"

اُس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا تھا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ مجھے بھی اپنے برابر بٹھا لیا تھا۔ ٹیکسی سٹی کی طرف آگے کو بڑھ گئی تھی۔ اُس کا ہاتھ میرے ہاتھ پر اب بھی رکھا تھا۔ آنچ دیتے ہوئے ہاتھ کا گداز میں محسوس کرتا رہا تھا۔ ہم بہت دیر تک یونہی اسکرین کو گھورتے رہے تھے ــــ بے مقصد ــــ اور راستے بھر خاموش رہے تھے۔ اُس کے بھی ہونٹ نہیں کھلے تھے۔ شاید وہ کچھ سوچتی رہی تھی۔

چند ہی منٹ بعد اسٹیشن آگیا تھا۔ وہ اپنی ریزرو سیٹ پر جاکر سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں بیٹھ گئی تھی۔ میں اب بھی اُس کے ساتھ تھا۔ گاڑی تیار کھڑی تھی۔ پلیٹ فارم کو لاتعداد وجود گھیرے رہے تھے۔ "اجنبی ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے کتنے مانوس ہیں ــــ!" میں نے سوچا تھا۔

میں نے کھڑکی سے سر اندر کر لیا تھا تو وہ اپنا بستر بچھا کر اُس پر لیٹ چکی تھی۔

"میں نے آپ کا دو دن بے حد انتظار کیا تھا۔ آپ آئے کیوں نہیں تھے؟"
وہ بولی تھی۔

"سارا دن کالج میں رہا تھا۔ شام کو پاپا گھر پر موجود رہے تھے۔ مجھے اپنے پاپا سے بہت ڈر لگتا ہے۔ وہ کرنل ہیں اور اُن کے فیلڈ والے ڈسپلن گھر میں بھی سختی سے رائج رہتے ہیں۔ کیا مجال جو کوئی اُن کی مرضی کے خلاف چل سکے۔ فوراً بندوق ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔"

میرے اظہارِ حقیقت پر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی۔ پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کاش! گاڑی لیٹ ہو جائے! اور اتفاقاً گاڑی ایک گھنٹہ دیر سے گئی تھی۔ پھر وہ بستر سے اُٹھ کر میرے برابر بیٹھ گئی تھی۔ وہ میری باتوں میں بہت دلچسپی کا اظہار کرنے لگی تھی۔ پھر دُنیا کے ہر موضوع پر ہم نے بات کی تھی۔ مرد ہوتے ہوئے بھی میں نے اپنے اندازِ گفتگو میں ہچکچاہٹ محسوس کی تھی اور وہ بِلا جھجک باتوں میں فراٹے بھر رہی تھی۔ میری کمزوری کو شاید اُس نے پرکھ لیا تھا۔ اکثر گفتگو کے دوران اُس نے میرا ہاتھ دبا کر کہا تھا۔
"آپ شرما کیوں رہے ہیں؟" وہ ہنس دی تھی۔ میں جھینپ سا گیا تھا۔
میں نے کئی بار اپنی اِس کمزوری پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے کہا تھا۔
"آپ کی باتوں میں وہ نشہ ہے کہ میں بار بار بہک جاتا ہوں" ــــ وہ مسکرا دی تھی۔ لیکن اُس کے چہرے پر حجاب نہ تھا، وہی بیباکی، وہی شوخی!
مجھے اُس وقت بہت غصہ آیا تھا جب گاڑی نے چیخ کر سیٹی دی تھی۔ اور دوسرے ہی لمحے رینگنے لگی تھی۔ میں اُس سے ہاتھ ملا کر اُتر آیا تھا۔ پھر اُس نے سر کھڑکی سے نکال کے تاکیداً کہا تھا: "دیکھئے آگرہ ضرور آئیے گا! ــــ میں آپ کا انتظار کروں گی ــــ اگر نہ آئے تو شکایت رہے گی! پتہ یاد رکھئے گا۔ پھول منڈی اور میرا نام نجمہ!" ابھی قدم میں کھڑکی سے لگا ساتھ ساتھ رینگتا رہا تھا۔ اُس نے پھر میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا: "آئیے گا نا ــــ؟"

"ہاں۔ ہاں ضرور آؤں گا! ایک ماہ بعد میرا امتحان شروع ہونے والا ہے۔ امتحان کے بعد آؤں گا۔"

"ہاں ضرور آئیے گا۔ آنے سے پہلے مجھے خط لکھ دیجئے گا تو زیادہ اچھا رہے گا تاکہ میں مل سکوں گھر پر۔"

گاڑی تیز ہو کر نکل گئی تھی۔ وہ بہت دُور تک کھڑکی سے باہر ہاتھ نکالے ہوا میں لہراتی رہی تھی۔ میں بھی اُسے دیکھتا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں میں اُداس گھر لوٹا تھا۔ جیسے کوئی شے گم ہو گئی تھی۔ کئی دن تک میں اُس کی پُرکشش شخصیت کو فراموش نہ کر سکا تھا۔ لیکن پھر امتحان کے دوران وہ بہت کم یاد آئی تھی۔ امتحان کے بعد بات آئی گئی ہو گئی تھی۔ میں اُسے تقریباً بھول سا گیا تھا اور نہ آگرہ ہی جا سکا تھا۔ نہ وہ مجھے پھر کہیں ملی ہی تھی۔ وقت کا سورج طلوع و غروب ہوتا رہا تھا۔ دن، مہینے اور سال پگھل پگھل کر اپنے نقش زمانے سے مٹاتے گئے تھے۔
آج اُس سے پھر اچانک سامنا ہو گیا تھا ــــ تقریباً پچیس سال بعد!
کتنا عجیب حادثہ تھا وہ! ــــ نہ جانے کیوں آج میں ہاسپٹل سے پیدل ہی بنگلے کو چل دیا تھا۔ ہاسپٹل کی کمپاؤنڈ سے نکلا ہی تھا کہ کچھ ننھی ننھی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ مجھے کچھ ایسی فرحت محسوس ہوئی تھی کہ میں واپس نہ ہوا تھا اور اپنی دُھن میں چلتا ہی رہا تھا۔ چند قدم آگے بڑھنے پر بارش کچھ تیز ہو گئی تھی۔ میں تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا لپک کر لوکل بس اسٹاپ کے شیڈ کے نیچے پہنچتے ہی چونک پڑا تھا۔ وہیں ایک کونے میں بارش سے پناہ لینے والے لوگوں کے درمیان نجمہ کھڑی تھی۔ اُس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں بھی پہلی نظر میں اُسے کچھ زیادہ پہچان نہ سکا تھا۔ لیکن کئی لمحے تک اُسے تصویرِ حیرت بنا ہوا گھورتا رہا تھا۔ پھر میرے شعور نے پچیس سال پہلے کی ذہن میں محفوظ اُس کی شبیہہ سے اُس کی مشابہت کی دلیل پیش کر دی تھی۔ مجھے جلد ہی فیصلہ کرنا پڑ گیا تھا کہ وہ نجمہ ہی ہے! وہ اب بھی مجھ سے بے خبر تھی اور میں اب بھی اُسے دُزدیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کا سراپا اب بھی اُتنا ہی پُرکشش تھا جتنا پچیس سال پہلے تھا! ذرا بھی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ وہی لمبے لمبے کالے بال، ویسے ہی گلابی ہونٹ، وہی شعلوں کی مانند دمکتی ہوئی بادامی آنکھیں، ٹھوڑی پر خوبصورت سا سیاہ تل۔ اب اُس کا نچلا ڈھلکا ہوا ہونٹ سمٹ کر اوپر والے سے جا ملا تھا۔ اداسے

مجھ میں گویا تھوڑی سی کمی آگئی تھی۔ لیکن مجموعی طور پر ایسا معلوم ہوتا تھا وہ اور پرکشش بن گئی ہے۔ بس اُس کا جسم ذرا کچھ بھاری ہو گیا تھا ورنہ وہ بالکل ویسی ہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا تھا کہ پچیس سال کا طویل خلاء لمحوں میں سمٹ کے رہ گیا ہے! اور اُس سے وہ مُلاقات کل کی بات ہے! لیکن یہ پچیس سال خود میری زندگی میں کتنے تغیرات لائے تھے۔ کتنے رنگ بھرے تھے، کتنے مٹائے تھے۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کرکے میں بلجیم چلا گیا تھا۔ پانچ سال بعد Heart specialist کی ڈگری لے کر وطن کو لوٹا تھا۔ چند سال ایک سرکاری ہاسپٹل میں سروس کی تھی۔ پھر اپنا عظیم ہرٹ ہاسپٹل کھولا تھا۔ شادی ہوئی تھی، بچے ہوئے تھے۔ ایک لڑکا امریکہ انجینئری پڑھنے چلا گیا تھا۔ میں جوانی کو خیرباد کہتا ہُوا بڑھاپے کی طرف گامزن ہو چلا تھا۔ سب کچھ کتنی جلدی ہو گیا تھا۔ میں سوچتا رہا تھا، وقت کی پرواز کتنی تیز ہوتی ہے۔ لمحوں میں زندگی گزر جاتی ہے۔ میرا ذہن پھر پچیس سال پیچھے کی طرف جھانکنے لگا تھا۔ مجھ سے اُس دن والی مُلاقات!

——— اُسی شدت سے محسوس ہو رہی تھی جیسے ابھی ابھی صرف چند لمحوں پہلے سب کچھ ہوا ہے۔ اچانک اُس کی نظر میری طرف اُٹھ گئی۔ لیکن اُس نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا تھا۔ پھر جب اُس نے دوسری بار دیکھا تو میرے چہرے پر اُس کی نگاہیں ٹھہر کر رہ گئی تھیں۔ میں نے یکسر بدلی ہوئی آنکھوں کو محسوس کیا تھا۔

"تم یہاں ——— تم؟" میں بے اختیار کہہ گیا تھا۔ اُس کے ہونٹ خوشی سے کھل کے رہ گئے تھے۔ میں نے بھی مُسکرانے کی کوشش کی تھی۔ نہ جانے کیوں میری نظر اُس کا سامنا نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ بھیڑ سے نکل کر میرے پاس آ گئی تھی۔ اُس نے پُوچھا تھا۔

"آپ اچھے تو ہیں؟"

میں صرف "ہاں" کہہ کے رہ گیا تھا۔ پھر میں کچھ نہ بول سکا تھا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ بادل کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔ کوئی ٹیکسی بھی دکھائی نہ دے رہی تھی۔

پھر اُس نے خود ہی کھڑے کھڑے اپنے بارے میں مختصراً مجھے بتایا تھا کہ مجھ سے ملاقات کے چند سال بعد اُس نے ناچنا گانا چھوڑ دیا تھا۔ اُس نے ریڈیو سنگر کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن میں نوکری کر لی تھی اور اب بھی دہلی کے Studio ہی میں ہے۔ عرصہ سے اُسے دل کی بیماری ہے تقریباً بیس سال سے۔ اُس نے بہت علاج کیا ہے لیکن کوئی افاقہ نہ ہُوا۔ اکثر ڈاکٹروں نے اُسے محض وہم بتایا اور ڈاکٹر نے کہا وہ اپنے سینے میں کچھ یادیں محفوظ کئے ہوئے ہے۔ اگر وہ اُن سے

نفسیاتی علاج ہی شاید شعور کو درست کر سکتی ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ مرض بڑھتا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی تو اس کی شدت سے دھڑکتا کہ کیا محسوس ہونے لگتا ہے یہ جو کچھ ہو رہا ہے گا اور ڈاکٹر عظیم ہر دو اسپیشلسٹ کی فہرست سُن کر انھیں Consult کرنے کیا آئی ہے ـــــ تم خود ہی کر دو ڈاکٹر عظیم ہی سے باتیں کر رہی ہے!

بارش سے جگمگاتی ہوئی سیاہ سڑک پر ایک ٹیکسی نظر پڑی تو مجھے کچھ اطمینان ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ٹیکسی لیا تھا۔ میں نے نجمہ سے گھر تک ڈراپ کر کے بنگلے پر چلنے کی درخواست کی تھی تو اس نے انکار نہ کیا تھا۔

"آؤ نجمہ! ـــــ یہی اپنا چھوٹا سا بنگلہ ہے اور وہی میں ہوں! جس کی تلاش میں تم دہلی سے بمبئی آئی ہو؟" میں نے اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔

اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا تھا اور بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

"عجیب اتفاق ہے! مجھے کیا معلوم تھا جہاں سے درد ملے گا اسی سے شفا کی بھیک مانگنے بھی پہنچنا پڑے گا؟"

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے لہجے میں طنز کا نشتر تھا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ملازم چائے لے آیا تھا۔ میں نے اس کی طرف پیالی بڑھاتے ہوئے کہا تھا "نجمہ! تمھیں یاد ہے ہماری پہلی ملاقات میں بھی بارش ہو رہی تھی۔ اس دن کتنا غیر متوقع پانی برسا تھا۔ لیکن موسم حسین ہو گیا تھا۔ ہم گھنٹوں باتیں کرتے رہے تھے۔"

"اور باتیں کیجئے ڈاکٹر صاحب ـــــ!" میں نے اس کی آواز کے کھوکھلے پن کو محسوس کیا تھا۔ وہ سامنے لگے فوٹو کو گھور رہی تھی۔ پھر بہت دیر بعد اس نے پوچھا تھا ـــــ "یہ آپ کی فیملی کی گروپ ہے؟"

"ہاں نجمہ! ـــــ اس میں میری بیوی اور میرے تینوں بچے ہیں۔ یہ گروپ چار پانچ سال پرانا ہے۔"

"آپ کی بیگم کہاں ہیں؟ ـــــ کیا مجھ سے نہ ملائیں گے انھیں؟"

"میری لڑکی کی شادی ہونے والی ہے۔ بیگم دہلی گئی ہوئی ہیں۔ میں بھی اب تک چلا جاتا۔ ایک بہت Serious کیس آگیا تو رکنا پڑ گیا۔ ایک ہفتے بعد چلا جاؤں گا۔"

وہ خاموش سی ہو گئی تھی۔ میں نے بات بدل دی تھی۔

"تمھارے شوہر کیا کرتے ہیں نجمہ؟"

"میں نے شادی نہیں کی!"

"کیوں؟"

"یوں ہی ـــــ میرا خیال تھا آپ نے بھی نہ کی ہوگی!" اس کے منہ سے الفاظ کے شعلے نکل پڑے۔ میں نے پھر بات کا رُخ بدل دیا۔ پھر ہم بہت سے دوسرے موضوعات پر باتیں کرتے رہے تھے۔ اس درمیان میں نے اُس کی باتوں کے لہجے اور چہرے کے خطوط سے ذرا بھی خوشی کا احساس محسوس نہ کیا تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اُداس ہوتی گئی تھی۔ میں نے اس کی بیماری کے بارے میں مزید تفصیل پوچھی تھی تو بھی اس نے بڑا طنزیہ جواب دیا تھا "حیرت ہے ڈاکٹر مریض سے اس کا مرض پوچھ رہا ہے!"

میں لاجواب ہو گیا تھا۔ پھر میں نے اسے جانے نہ دیا تھا۔ علاج کے لئے اپنے بنگلے پر ہی ٹھہرا لیا تھا۔ اس نے زیادہ احتجاج بھی نہ کیا تھا۔ دوسرے دن میں نے اسے Thoroughly Examine کیا تھا اور چوتھے دن دل کے آپریشن کو کہا تھا تو اس نے انکار کیا تھا اور نہ کسی طرح کی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے چہرے پر میں نے کوئی خاص تاثر نہ دیکھا تھا جیسے اسے زندہ رہنے کی کوئی خواہش ہی نہ ہو۔

چوتھے دن Operation Theatre میں جانے سے چند منٹ پہلے اس نے مجھے ایک طلائی ہار دے کر کہا تھا "پہلے مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کی صاحبزادی کی شادی ہے، بروقت کچھ بھی نہیں دے سکتی۔ میری طرف سے یہ ناچیز تحفہ اپنی صاحبزادی کو دے دیجئے گا۔ اگر آپ کی بیگم صاحبہ کچھ اس کے بارے میں پوچھیں تو کہہ دیجئے گا کہ یہ ہار اس نے دیا ہے جس سے میں نے کبھی کچھ وعدہ کیا تھا لیکن وعدوں کا کیا...!"

وہ زہر خند سے مسکرا کر میرے ساتھ Operation Theatre میں داخل ہو گئی تھی۔ ہر ضروری احتیاط برت کر میں نے اس کا آپریشن شروع کیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار آپریشن کرتے وقت میرے ہاتھ لرز رہے تھے۔ جیسے میں کوئی نیا کام کر رہا ہوں ـــــ اور آپریشن ناکام ہو چکا تھا! اپنی انتھک کوشش کے باوجود میں اسے جانبر نہ کر سکا تھا! اس کے دل کی دھڑکن میرے ہی ہاتھوں بند ہو گئی تھی۔ میرے ہاتھ سے Instruments چھوٹ کر گر پڑے تھے۔ اس کے مُردہ جسم سے تیزی سے اُبھرتی ہوئی ایک آواز میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اُترتی گئی تھی ـــــ "وعدوں کا کیا ـــــ!!"

شاہین جمالی چمپارنی

مری اُداس نگاہوں کے سامنے ہر دم | لئے رہے ہیں تری یاد کے حسیں سائے
دلِ حزیں کا ترے بعد آسرا ہے یہی | خدا کرے کہ تری یاد مجھ کو راس آئے

جدا ہوئے تجھے مجھ سے اب اک زمانہ ہوا | مرے قریب کبھی [illegible]
بسی ہوئی ہے مگر ذہن و فکر میں اب تک | ترے حسین سراپا کے لمس کی خوشبو

ترے فراق کا غم اس لئے نہیں مجھ کو | کہ دور رہ کے بھی ہر وقت میرے پاس ہے تو
ہے ہر گھڑی مری نظروں کے سامنے رقصاں | تری شبیہ، ترے عارض و لب و گیسو

وہ شامِ قرب، وہ وادی کا دل نشیں منظر | میں زندگی میں کبھی بھی بھلا نہیں سکتا
کہا تھا دیکھ کے جب چاند کی طرف تو نے | "تو اس کو دیکھ تو سکتا ہے پا نہیں سکتا"

یقیں نہ آیا تری بات پر مجھے اُس وقت | کہ ماہتابِ مجسم سے میں تھا ہم آغوش
فروغِ حسن سے معمور تھی فضا دل کی | نگاہِ شوق میں تھا تیرا جلوۂ خاموش

مگر یہ راز کھلا مجھ پہ ایک سال کے بعد | خیالِ خام تھا سودا تھا تجھ کو پا لینا
نکھر گئی ہے صداقت ترے مقولے کی | تجھے میں دیکھ ہی سکتا ہوں پا نہیں سکتا

میں پھر بھی خوش ہوں کہ اتنی تو تاب ہے مجھ میں | کبھی کبھی تجھے دیکھوں نگاہِ حسرت سے
یہ آسرا بھی مری زندگی کو کیا کم ہے! | میں آشنا ہوں عطائے غمِ محبت سے

مرا خیال، مری شاعری، مرا احساس | ترے تصورِ غم کا رہینِ منت ہے
دل و دماغ پہ چھایا ہے تیرا عکسِ جمال | شعور و فکر میں شامل تری ملاحت ہے

یہ اعترافِ حقیقت بھی دل کی ہے آواز | ہو کچھ یقین مری بات کا تجھے کہ نہ ہو
مرے حبیب تری دوستی کے صدقے میں | ملی ہے رفعتِ پروازِ فکر و فن مجھ کو

# کب صبح ہوگی؟

ابواللیث جاوید بی۔ کام

لیسل گنج۔ پلاموں (بہار)

محترم جناب خوشتر گرامی صاحب! خلوصِ بیکراں

آپ کی علالت کا سُن کر دل و دماغ بالکل بوجھل بوجھل سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ خدا کرے اب آپ رُو بہ صحت ہوں۔ آخر بے شمار دلوں سے نکلی ہوئی دُعائیں بے اثر تو نہ جائیں گی ——— ایک ہلکا پھلکا تفریحی افسانہ "کب صبح ہوگی" حاضرِ خدمت ہے۔ مجھے اُمید قوی ہے کہ آپ اسے ضرور پسند فرمائیں گے ——— اپریل ۱۹۷۰ء کے شمارہ میں شائع ہونے والے میرے افسانہ "گرتے گرتے" کے سلسلے میں بیرونِ ممالک سے بھی خطوط موصول ہوتے ہیں جن میں اکثر میں آپ کے ادبی کارناموں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ آپ کی بے لوث ادبی خدمات، انسانیت دوستی اور پُر خلوص شخصیت ضرب المثل بن گئی ہے . . .

نیک تمناؤں کے ساتھ

آپ کا بھائی ——— ابواللیث جاوید

لمبی سی چمچماتی پلاتی ماڈرن کلب کے پورٹیکو میں بہت آہستگی سے رُکی۔

شوفر نے جب دروازہ کھولا تو خوشبو کا طوفان سا اُمڈا۔

پچھلی نشست سے خوبرُو راکیش بڑی شان سے اُترا اور اُس کے بعد نازک اندام سی انوراگ شیرین کی سبز ساری میں ملبوس سبز پری کی طرح نمودار ہوئی۔ اُس نے کار سے اُترتے ہی اپنے وینٹی بیگ سے چھوٹا سا آئینہ نکالا اور چہرے کا جائزہ لے کر ہونٹوں پر لپ اسٹک پھیری۔ بالوں کے اونچے سے جُوڑے کو درست کیا اور راکیش کے پیچھے چلتی ہوئی کلب کے ہال میں داخل ہو گئے۔ ہال دلہن کی طرح سجا سنورا تھا۔ رنگین بلب قوسِ قزح کے سے رنگ بکھیر رہے تھے۔ بڑے بڑے رنگین غبارے جا بجا لٹک رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے ٹیبلوں کے گرد لگی کرسیوں پر خوش پوش جوڑے اِس انداز سے جلوہ گر تھے کہ ہر دیکھنے والے کو شاداب پھولوں کے گلدستے کا دھوکا ہوتا تھا۔ آرکسٹرا پر ہلکی ہلکی دُھن بج رہی تھی۔ سارا ماحول کیف و مستی میں ڈوبا ہوا تھا۔

راکیش اور انوراگ بھی ایک طرف خالی میز پر جا کر بیٹھ گئے۔

آج کلب نائٹ منائی جا رہی تھی۔ ساری رات کا پروگرام تھا۔ کلب کے ممبروں کے لئے یہ کلب نائٹ ماہ میں ایک بار منائی جاتی تھی جس میں ہر ممبر کو پروگرام کے کسی نہ کسی آئٹم میں حصّہ لینا پڑتا تھا۔

پروگرام نو بجے سے شروع ہونے والا تھا۔

ابھی نو بجنے میں آدھ گھنٹہ کی دیر تھی۔

راکیش نے بیٹھتے ہی انوراگ کو چھیڑا ——— "تمھاری پلکوں پر یہ اُداسیوں کے سائے کیوں تھرک رہے ہیں؟"

"نہیں تو ——— " انوراگ جیسے خواب سے چونکی۔ اُس کے رنگین لبوں پر مسکان بکھر گئی۔

"سُنا ہے چہرے کو دل کی کتاب کہتے ہیں ——— " راکیش آہستہ آہستہ ترنّم ریز تھا۔

"میرا دل اب میرے پاس رہا کہاں ——— وہ تو اب تمھارے قبضہ میں ہے ——— " انوراگ نے پہلی بار زبان سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔

اور راکیش جیسے جھُوم جھُوم گیا۔ ٹیبل پر رکھے گلدستہ سے اُس نے ایک شاداب سا گلاب توڑا اور انوراگ کے جُوڑے میں چُوم کر لگا دیا۔ انوراگ ——— آنکھیں

اس کے بعد [illegible] غزل شروع ہوئی۔

میں کیا کہوں [illegible] ہے
[illegible] ہے

بہت خوب ــــ بہت خوب ــــ مگر [illegible] اور
[illegible] ہوگیا۔

پھر [illegible] نے [illegible] کی ایک غزل سنائی۔

راکیش نے [illegible] سنائے۔

انوراگ نے کلاسیکل موسیقی سنائی۔ تالیوں کی گونج کا تسلسل دیر تک قائم رہا۔ پھر ایک کے بعد دیگرے کئی ممبروں نے حصہ لیا۔

رنگ اور راگ کی یہ محفل ایک بجے رات تک گرم رہی۔

پھر جام ٹکرائے اور فضا پر کیف طاری ہوتا گیا۔

آرکسٹرا پر کسی [illegible] کی دھن تھی اور سبھی قدم رقصاں ہوگئے۔

جسم سے جسم ٹکرا رہے تھے۔ دھنوں سے ہم آہنگ قدم اُٹھ رہے تھے بڑھ رہے تھے۔ خم دار کمروں پر ہاتھوں کی گرفت [illegible] رہی۔ سارے ماحول پر سبز روشنی پھیل گئی۔ انوراگ اور راکیش کی سانسوں کی اکھڑی اکھڑی رفتار تیز ہوتی رہی۔ سبھی جوڑے ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ جسم آہستہ آہستہ تھرکتے رہے۔ رخساروں پر سانسوں کی گرمی [illegible] رہی اور کیف و سرور کا عالم دیر تک قائم رہا۔ سارا ماحول شرابی شرابی ہوگیا۔

کلب نائٹ کی اس مست و مدہوش فضا نے صبح کے پانچ بجے دم توڑا۔

---

انوراگ آنکھیں بند کئے راکیش کے بازو سے لگی رہی۔ [illegible] سی سڑک پر پھسلتی رہی اور اسی تیز رفتاری سے راکیش کا ذہن ماضی کے کھنڈروں میں بھٹکتا رہا۔

تیز دھوپ میں جھلستا ہوا راکیش شہر کے چوراہے پر سائیکل کھڑی کر کے اخبار فروخت کرتا تھا۔

ٹائمز آف انڈیا ــــ سٹیٹس مین ــــ ہندوستان ٹائمز ــــ اور بہت سے اخبار [illegible] ایک فیمنا [illegible] راکیش [illegible] اس کے سامنے [illegible] گلاب ــــ کی [illegible] زلفیں۔

[illegible] کو محسوس کر گیا۔ وہ

# ہجر

کیا سنائے کوئی کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تجھ سے [illegible] مرنے سے آساں ہوگا ــــ [illegible]

پرسشِ وعدۂ [illegible] رنجِ جہاں کم کرلیں
زندگی ہجر [illegible] دشوار ہے آساں کرلیں ــــ [illegible]

ترے ہجر میں تیرے سر کی قسم
زندگی کبھی [illegible] راحت نہیں ــــ عشرت [illegible]

صدمۂ ہجر سے کہ بخت دگر سے [illegible]
آرزوئے وصل کی تکمیل نہیں ہونے پاتی ــــ جمیل سعیدی

یوں [illegible] ہوتا ہے گر [illegible] صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن آ بھی گئی وصل کی رات ــــ اسلم

مرسلہ: رشیدہ خان، مرادآباد

Femina کے ساتھ ساتھ اپنا دل بھی فروخت کر چکا تھا۔ اب اس کا یہ معمول ہوگیا تھا کہ صبح دس بجے اس شیریں آواز کا اسے شدت سے انتظار رہتا۔ جس دن وہ نہ آتی راکیش عجیب سی بے چینی محسوس کرتا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی قیمتی شے کھو گئی ہو۔ راکیش نے اکثر اپنے بے صبر دل کو سمجھایا تھا ــــ تو جھونپڑی میں رہ کر محلوں کے خواب کیوں دیکھ رہا ہے ــــ لیکن دل کا کچھ اور ہی جواب تھا۔ اپنی پسندیدہ چیز کی تمنا کرنا گناہ نہیں۔ ہوسکتا ہے کبھی اُمیدوں کی جگمگاتی صبح نمودار ہو جائے ــــ اور واقعی ایک ایسی سہانی سی صبح جگمگائی جس نے راکیش اخبار فروش کو اخبار کے پریس کا مالک بنا دیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ اسے قسمت کا کھیل ہی کہا جا سکتا ہے۔ انوراگ جو پہلے راکیش سے کتراتی تھی اب اس کے رگِ جاں سے بھی قریب آگئی تھی۔ یہ دولت کی کشش تھی، دولت کی چمک دمک تھی، جس نے انوراگ کو راکیش کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ راکیش کے دوستوں کے حلقے میں یہ بات گشت کرنے لگی تھی کہ انوراگ کے امتحانات کے نتیجے کے فوراً بعد ہی دونوں شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے۔ نیروتم اگروال جی کو بھی انوراگ کی پسند بہت موزوں معلوم ہوئی اور وہ بھی شادی کے لئے تقریباً رضامند ہوگئے تھے۔

راکیش خیالات کے تانے بانے میں الجھا ہوا [illegible]

# جشنِ شاعر

[illegible]

دسمبر کی تھی پہلی سہ پہر ۔۔۔ ہوا شہر میں جشنِ شاعر کا چرچا
ہوئے جمع اک ہوٹل کے ہال میں سب ۔۔۔ وکیل و مقرر، ادیب و سخن ور
کسی نے کہا اُن کو شیکسپیئر ثانی ۔۔۔ کسی نے کہا اُن کو ہمدوشِ اکبر
کسی نے نئے زاویے سے جو دیکھا ۔۔۔ تو ٹھہرا دیا اُن کو حالی کا ہمسر
کوئی آبروئے غزل اُن کو سمجھا ۔۔۔ کسی نے کہا اُن کے شعروں کو نشتر
غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہوئیں ۔۔۔ کھلے تھے ہر اک سو ستائش کے دفتر
جسے دیکھئے تھا "طرفدارِ غالب" ۔۔۔ مسلّم "سخن فہم" تھے جن میں اکثر
ہر اک اپنے انداز میں کہہ رہا تھا ۔۔۔ ستائش کے گل ہائے رنگیں نچھاور
مگر اس کا ردِ عمل بھی تھا لازم ۔۔۔ جو ہوتا ہے ایسے مواقع پہ اکثر
پکارے گئے بہرِ تقریر سالم ۔۔۔ جو مانے ہوئے ہیں ادیبوں کے افسر
"میں آیا نہیں بلکہ لایا گیا ہوں" ۔۔۔ کہا آپ نے صدرِ جلسہ سے مُڑ کر
کہا آپ نے وہ جو ناگفتنی تھا ۔۔۔ کنایوں میں پنہاں وضاحت کا دفتر
کہا شعر ہے اُن کا جذبے سے خالی ۔۔۔ علاقہ نہیں جن کو غربت سے یکسر
نہ حسنِ تغزّل نہ سوزِ دروں ہے ۔۔۔ تبرا ہے شیخ و برہمن کے اوپر
نہ بندش کی چستی نہ لہجہ ہی تیکھا ۔۔۔ توارد کا خطرہ نہ سرقے کا کچھ ڈر
کہ یہ ابتدا ہی سے بر خود غلط ہیں ۔۔۔ سمجھتے ہیں خود کو، ہر اک سے یہ برتر
اگرچہ یہ باتیں بڑی تو لگیں گی ۔۔۔ کہیں ہیں مگر چھوٹا بھائی سمجھ کر
ہوئی ختم تقریر اُن کی تو دیکھا ۔۔۔ بدلنے لگا سارے جلسے کا منظر

اگرچہ مقالہ نگار اور بھی تھے!
مگر کچھ نہ کہنا ہی سمجھے وہ بہتر

بڑھیا لذت رکھنا
یہ رہی ایک بات

ساتھ ہی قوت بخش ہونا
یہ رہی دوسری بات

اور اس قوت کو حاصل کرنے کا طریقہ کتنا مزیدار ہے کیسا لطف دیتا ہے!
پارلے گلوکو بسکٹ میں پروٹین اور وٹامنوں سے بھرپور دودھ، گیہوں اور شکر کے بہترین قوت بخش اجزا موجود ہیں۔

قدرتی طور پر

پارلے گلوکو بسکٹ

ہندوستان کے
سب سے زیادہ
بکنے والے
بسکٹ

خاص طور سے بچوں کے لئے بہترین خوراک ہیں

# تم بن جیون سُونا

پروفیسر مس نگہت ریحانہ ایم۔ اے

بلگرامپورہ نزد حفاظیہ مسجد امراؤتی (مہاراشٹر اسٹیٹ)

محترم چچا جان! سلام بصد احترام

ایک افسانہ "تم بن جیون سُونا" رسالے کی خدمت ہے۔ خدا کرے آپ کو پسند آجائے۔ آپ کی نظرِ عنایت میرے لئے سرمایہ فخر ہے۔ "اندھیرا اُجالا" کی اشاعت کو عرصہ گزر گیا۔ لیکن اب بھی ہند اور بیرونِ ہند سے خطوط آرہے ہیں جو "بیسویں صدی" کی بین الاقوامی شہرت کا ثبوت ہیں ——— افسانہ کے بارے میں کچھ نہ کہوں گی۔ فیصلہ ہمیشہ ہی آپ پر چھوڑا ہے۔ خدا کرے آپ اسی طرح اُردو ادب کی سرپرستی کرتے رہیں . . .

آپ کی بھتیجی ——— نگہت ریحانہ

"آپ سے ملئے! آپ ہیں مس سبرینہ ثانی! یہاں کے مشہور سیٹھ یوسف ثانی کی اکلوتی صاحبزادی!"

"اور آپ ہیں نواب ساحر ملک! حال ہی میں لندن میں ایک طویل عرصہ قیام کرنے کے بعد لوٹے ہیں۔ یہیں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ ہے۔"

"گلیڈ ٹو میٹ یو (Glad to meet you)" اُس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

جواب میں سبرینہ نے ایک طائرانہ نظر ساحر پر ڈالی اور رسمی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرے آگے بڑھ گئی۔ ساحر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ خجل ہو کر اُس نے اپنا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔

"اُف! کتنی مغرور لڑکی ہے! خیر کوئی بات نہیں۔ حُسن ہمیشہ ہی میرے سامنے جھکتا آیا ہے۔ پھولوں کی یہ ڈالی بھی ایک دن میرے آگے جھک کر رہے گی!" اور ساحر نے اپنے دل کو بہلا لیا۔ پھر بھی ایک بے نام سی خلش تھی جو اکثر اُسے تڑپا دیتی۔ نہ جانے کہاں سے انتقام کا ایک جذبہ آیا اور اُس کے دل میں گھر کر گیا۔ دونوں ایک ہی کلب کے ممبر تھے۔ اس لئے تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی لیکن بہت پھیکی اور بے لطف ——— پتھر سے پتھر ٹکرا گیا تھا، غرور سے غرور، دولت سے دولت، حُسن سے حُسن، انا سے انا!! اور اس ٹکراؤ نے دونوں کو قریب لانے کی بجائے اور دُور کر دیا۔ اتنا دُور کہ اُن کا پاس آنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گیا!!

اُس شام اتفاقاً دونوں تنہا کلب کی گیلری میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ لیکن یہ تنہائی بھی اُن کے لئے سُود مند ثابت نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ جھوٹے غرور اور انا کا پردہ دونوں کے درمیان ناقابلِ شکست چٹان بن کر حائل ہو گیا۔ اتنے میں پروفیسر شکیل اُدھر آنکلے۔

"ہلو! ساحر! آج کل تو صاحب بہادر عید کا چاند بن گئے ہیں!"

"وہ کیسے شکیل صاحب؟ میں تو روز ہی کلب آتا ہوں۔"

"یہ بھی کیا آنا۔ اِدھر آئے اُدھر چلے؟"

"ہاں! آج کل کچھ مصروف ہوں۔" اُس نے کنکھیوں سے سبرینہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں بھئی! اب تو مصروفیات ایسے ہی بڑھیں گی۔ شادی جو کر رہے ہو!"

سبرینہ کے چہرے کا رنگ ایک لمحہ کے لئے متغیر ہوا۔ لیکن اگلے ہی پل اُس نے اپنے چہرے پر بے نیازی کا نقاب ڈال لیا اور اس ایک ہی پل کے لئے چہرے کا متغیر ہونا ساحر کے دل کی جلن پر ٹھنڈے پھاہے کا کام کر گیا۔ انتقام کا جذبہ شدید ہو گیا اور شکیل کے سوال نے تو جیسے اُسے زبان دے دی۔

"ہمیں اپنی Would be کے بارے میں کچھ نہ بتاؤ گے؟"

"کیا بتاؤں۔ بس یوں سمجھ لیجئے، خوش قسمتی سے ایک ہیرا بن گیا؟"

"میں ہیرے کے بارے میں تو پوچھ رہا ہوں؟"

"میرے لئے تو وہ شبنم سے دُھلا، نکھرا نکھرا پھول ہے۔ اپنی زندگی تو سدا بہار بن گئی۔ خاندانِ سعادت سے تعلق رکھتی ہے۔ کروڑپتی باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اُس حسن کی مورتی کو قدرت نے بڑے پیار سے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اپنی اس خوبصورت تخلیق پر خود اُسے بھی ناز ہوگا۔ ایم۔ ایس سی کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اب پی ایچ۔ ڈی کرنے کا ارادہ ہے۔ اُن لوگوں کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔ صرف خوبصورت، پڑھا لکھا اور شریف نوجوان چاہیئے تھا۔ سو بندے پر نظرِ عنایت پڑ گئی۔ اب وہ ناز کی تعلیم کی تکمیل سے پہلے ہی ہماری شادی کر دینا چاہتے ہیں۔"

اُس نے چور نظروں سے سبرینہ کی طرف دیکھا لیکن وہ بہت محویت سے کسی کتاب کے مطالعہ میں غرق تھی۔ اب یہ اور بات ہے کہ وہ ہمہ تن گوش ہی ساحر کی شادی کا تکلیف دہ ذکر سن رہی تھی۔ ہاں! سبرینہ کے لئے تو یہ ذکر تکلیف دہ ہی تھا۔ لیکن اُس کے چہرے سے ساحر کوئی اندازہ نہ لگا سکا۔ سبرینہ کی اس بے اعتنائی پر اُس کے جذبات آگ بن گئے۔

"مغرور لڑکی! نہ جانے خود کو کیا سمجھتی ہے! خیر! جب ناز کو بیگم ساحر کے روپ میں دیکھے گی تو سارا غرور شیشہ کی طرح چکنا چور ہو جائے گا۔"

---

آج وہ بہت خوش تھی۔ ساحر نے تو یہی محسوس کیا جیسے سبرینہ کے انگ انگ سے خوشی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ ساحر سے نہ رہا گیا۔ آخر اُس نے پوچھ ہی لیا

"مس ثانی! آج آپ بہت خوش نظر آ رہی ہیں؟"

اُس کے چہرے پر قوسِ قزح کے سارے رنگ بکھر گئے اور ساحر اُن رنگوں میں کھو سا گیا۔ لیکن جلد ہی اُس نے اپنے دل پر قابو پا لیا۔ ایک لمحہ کے لئے سبرینہ بھی اُن کھوئی کھوئی آنکھوں میں گم سی ہو گئی۔ اُس کا دل زور سے دھڑک اٹھا اور اس دھڑکن نے جیسے اُس کے ہوش و حواس اُسے لوٹا دئے۔ اب وہ پھر پہلے کی طرح پُرسکون تھی۔

"آج شام ڈیڈی کی طرف سے ایک پارٹی دی جا رہی ہے۔ آپ بھی ضرور آیئے گا۔ کہنے آئی تھی نا۔"

"Oh ..... لیکن یہ کیسی خوشی ہے؟"

"یہ تو ڈیڈی ہی بتا سکیں گے! پھر آپ آ رہے ہیں نا؟"

"ضرور، ضرور؟"

"Promise؟"

بے خودی میں سبرینہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ زندگی میں پہلی بار اُس نے وہ ہاتھ تھام لیا ——— پھر ایک لمحہ کو دونوں کو سب کچھ بھول گیا۔ ساحر کے ذہن میں شہنائیاں بج اٹھیں۔ سبرینہ کے کانوں میں پائل کے گیت گونجنے لگے۔ جیسے آج ہی وہ دلہن بن کر رخصت ہو رہی ہو۔ جیسے وہ ہمیشہ کے لئے ساحر کی ہو گئی ہو، یا جیسے آج سدا کے لئے ساحر اُس کا ہو گیا ہو۔ جیسے جنم جنم کے دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے ہوں! جذبات کی شدت سے اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور ساحر ——— وہ تو کسی اور ہی دُنیا میں پہنچ گیا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے آج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہ سبرینہ کی گھنیری زلفوں کی چھاؤں میں گم ہو۔ سبرینہ کا ہاتھ کانپنے لگا۔ غیر ارادی طور پر ساحر نے اُس کا ہاتھ دبا دیا۔ لیکن اگلے ہی پل جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ سبرینہ نے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے الگ کر لیا۔ ساحر نے خفت مٹانے کے لئے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال لیا۔ مسحورکن خاموشی کو توڑتی ہوئی سبرینہ کی نقرئی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی: "آیئے گا نا! میں منتظر رہوں گی!"

---

"یہاں! ابھی آپ کو انتظار کی زحمت نہیں دی جائے گی۔ تھوڑی دیر بعد" ... اور دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ سبرینہ کی ایک ایک مسکراہٹ نے جانے کیا کر دیا کہ ساحر کے دل کی خزاں آلود کلی بہار کی ... لپیٹ میں آ گئی۔ اس کے لئے وقت کاٹنا مشکل ہو گیا۔ ایک پل ہزار صدی بن گیا! سبرینہ نے خاص طور پر مدعو کیا تھا۔ یہیں ایک احساس انتقام کی ... کر بیٹھوں گا۔ اس نے سوچ لیا ——— کہ وہ سبرینہ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دے گا! اور اس فیصلے کے بعد اس کی بے قراریوں کو قرار آ گیا۔

آج ثانی پیلیس میں جیسے ساری دنیا کی بہاریں سمٹ آئی تھیں۔ ساحر ایک نیم تاریک گوشے میں تنہا کھڑا اس جنتِ ارضی کا نظارہ کر رہا تھا۔ سگریٹ کے ہلکے ہلکے نشے نے اسے کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا۔ اتنے میں سبرینہ پھولوں کی ملکہ بنی نظر آئی۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر درد و کرب کی سیاہی پھیل گئی۔ لیکن اگلے ہی پل جب اس نے سبرینہ کو اس طرف آتے دیکھا تو جیسے چاند کا ٹھنڈا اجالا اسے اپنے گرد بکھرا نظر آنے لگا۔ سبرینہ اس کے قریب آ کر رک گئی اور بے حد دلآویز انداز میں گویا ہوئی۔

"ارے! آپ اِس نیم تاریک گوشے میں کیوں کھڑے ہوئے ہیں؟"

"بس یونہی! ذرا فاصلے سے اِس جگمگاتی محفل کو دیکھنا چاہتا تھا!"

ساتھ ہی اس کی نظریں اس نوجوان کی طرف اٹھ گئیں۔ سبرینہ کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔

"اوہ! میں تو آپ دونوں کا تعارف کرانا ہی بھول گئی۔ آپ ہیں نواب ساحر ملک! اور آپ . . . ڈاکٹر شہزاد۔"

"ٹھہرو رینہ بیٹی! ذرا ٹھہرو۔ ان کا تعارف میں کروائے دیتا ہوں؟"

سب نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سبرینہ کے ڈیڈی اسی طرف آ رہے تھے۔ قریب آتے ہوئے وہ بولے۔

"میں جانتا ہوں، تم پورا تعارف نہ کرا سکو گی۔ شرما جاؤ گی۔" انھوں نے اس نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ہیں مسٹر شہزاد! سال ہی میں لندن سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری لے کر آئے ہیں۔ اب دوبارہ ایم۔ ایس کرنے جائیں گے اور اپنے ساتھ رینہ بیٹی کو بھی اپنی دلہن بنا کر لے جائیں گے!"

اتنا کہہ کر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ سبرینہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔ شہزاد نے مسکرا کر گردن پھیر لی اور ساحر ——— اسے صرف اتنا محسوس ہوا جیسے

اُس کے جسم میں کوئی چیز ٹوٹ کر رہ گئی۔ چاند کے سامنے ... سمٹ کر ایک پتلی سی لکیر بن گیا۔ جو ایک نقطے میں تبدیل ہو گئی اور جب روشنی کی یہ آخری قندیل بھی بجھ گئی، تو وہ تاریکی کے تپتے صحرا میں اکیلا رہ گیا۔ سبرینہ کے ڈیڈی کبھی کے جا چکے تھے۔ اُسے خبر بھی نہ ہوئی کہ کب شہزاد سبرینہ کی بانہوں میں بانہیں ڈالے آگے بڑھ گیا۔ اُسے جب ہوش آیا تو اُس نے خود کو ثانی پیلیس کے باہری گیٹ پر تنہا کھڑا پایا۔ اندر روشنیاں تھیں۔ جن پر شہزاد کا قبضہ تھا۔ باہر تاریکی تھی۔ جو تنہائی کے غم میں سسک رہی تھی۔ نہ جانے کس جذبے سے مغلوب ہو کر اُس نے تاریکی کی آغوش میں خود کو گرا دیا۔

---

وقت گزرتا رہا۔ فاصلے بڑھتے رہے۔ ساحر اپنی توہین برداشت نہ کر سکا۔ سبرینہ سے اُسے ایسی اُمید نہ تھی۔ اُسے سبرینہ سے نفرت سی ہو گئی۔ اور یہ نفرت رنگ لے آئی۔ کچھ ہی عرصہ بعد ساحر اور ناز کی شادی کا خوبصورت دعوت نامہ میز پر پڑا سبرینہ کا منہ چڑا رہا تھا۔ ایک بجلی سی کوندی جو اس کے ارمانوں کو جلا کر راکھ کر گئی۔ ضبط و تحمل کے باوجود وہ شادی میں شریک نہ ہو سکی۔ ولیمہ کی دعوت میں بھی وہ کہیں نظر نہ آئی۔ ہاں ایک خوبصورت تحفہ تاج محل اُس نے ساحر کو بھجوا دیا۔ نہ جانے کیوں ناز کے ساتھ آنے والے لاکھوں کے جہیز سے وہ خوش نہ ہو سکا اور سبرینہ کے اِس تحفے کو اُس نے حاصلِ زندگی سمجھ لیا! جس محفل میں ساحر اور ناز جاتے سبرینہ وہاں موجود نہ ہوتی۔ اُس نے کلب جانا بھی چھوڑ دیا تھا اور سبرینہ کو رشک و حسد کی آگ میں جلانے کا ارمان ساحر کے دل کی خلش بن کر رہ گیا۔

اب اتفاق ہی سے کبھی دونوں کا سامنا ہوتا اور اُس وقت بھی ساحر کو سبرینہ کی پیشانی پر غرور کی شکنیں نظر آتیں، جو اُس کی اپنی آنکھوں میں بے نیازی کے رنگ بکھیر دیتیں ——— لیکن غرور اور انا کے اِس غلاف کے پیچھے ارمانوں کی سسکتی، تڑپتی لاشیں تھیں۔ جنھیں صرف سبرینہ ہی دیکھ سکتی تھی جن پر صرف وہ آنسو بہاتی تھی۔ اِس غم کو صرف وہی محسوس کر سکتی تھی۔ وہ غم جسے وہ خود سے دُور کر سکتی تھی۔ نہ کسی کو بتا سکتی تھی، نہ جس کا گلا گھونٹ سکتی تھی۔ یہ غم اُس کے وجود کو کھوکھلا کئے دے رہا تھا۔ پھر بھی جب کبھی ساحر کی موجودگی میں اُسے موقع ملتا وہ شہزاد کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتی۔ ساحر بھی بظاہر دلچسپی سے سُنتا لیکن اُس کا دل ——— وہ تو کبھی کا ٹوٹ چکا تھا۔ ناز کا پیار بھی اُس ٹوٹے دل کو جوڑ نہ سکا۔ اگر بھولے بھٹکے کبھی ملاقات ہو جاتی تو دونوں بلا تکلف ناز اور شہزاد کا

کرتے اور سکون پانے اور دل بہلانے کی ناکام کوشش میں اپنے زخموں کو کریدتے رہتے!!

ایک شام کسی پارٹی میں دونوں سے ملاقات ہوگئی۔ اتفاقاً بات نکل ہی پڑی۔ باتوں کے درمیان ساحر کی شادی کا ذکر نکل آیا۔ اچانک پروفیسر شنیل ساحر سے مخاطب ہوئے۔

"یہ تو تمھیں ماننا پڑے گا ساحر! کہ مس ثانی نے تمھیں ایسا نادر تحفہ دیا ہے، جس کی نظیر نہ ملے۔ اس سے بہتر تحفہ آپ انھیں نہیں دے سکتے بتایئے آپ انھیں کیا دیں گے؟"

ساحر نے گہری نظروں سے سبرینہ کی طرف دیکھا۔ چہرے پر بکھرے جذبات کے رنگوں کو بے نیازی کے پردے میں چھپاتے ہوئے وہ مسکرا پڑی۔ اس کی نظریں ساحر کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ نہیں —— درپردہ وہ اس کے چہرے کی بلائیں لے رہی تھی۔ اس کا دل نہ جانے کیوں بہت زور سے دھڑک اٹھا۔ ساحر نہ جانے کیا جواب دے؟

ساحر نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اس کا جواب شاید میں ابھی نہ دے سکوں۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا۔"

اور جب پروفیسر شنیل چلے گئے تو اس نے سبرینہ سے ایک بات

"مس ثانی! آپ بہت کچھ دے کر بھی مجھے کچھ نہ دے سکیں۔ شاہجہاں نے ممتاز کو محبت کی ایک نشانی دی تھی۔ تاج کے روپ میں۔ یہی تاج آپ نے تحفہ میں دیا۔ لیکن جو تحفہ میں آپ کو دوں گا وہ پیار اور محبت کے علاوہ قربانی اور ایثار کا مجسمہ ہوگا! جو ایک دن آپ کی زندگی کی دھڑکن بن جائے گا اور . . .!!"

اچانک وہ خاموش ہوگیا۔ جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔ بے اختیار اس نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ سبرینہ حیران سی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ ساحر اسے کچھ نہ سمجھا سکا۔ اس کے بعد نہ جانے کیا فاصلے اور بڑھ گئے —— یہ تو ہمیشہ ہی ہوتا آیا تھا۔ ہر بار جب وہ جدا ہو کر بچھڑتے، یہ فاصلے اور بڑھ جاتے!

سبرینہ کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ دن گزرتے رہے، فاصلے بڑھتے بڑھتے گئے —— بڑھتے ہی گئے اور تلخ حقیقت کے اس جام کو دونوں ہی نے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے بچھڑ چکے ہیں۔

جب انھوں نے ایک دوسرے کو تھامنا چاہا تو زمانے کا ساتھ دیا، آسمان نے انھیں جدا کر دیا اور جب وہ ملنے کے لئے تڑپے تو حالات نے بھی ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ موت کی خواہش کی تو وہ موت بن سے ہنستی گزر گئی۔ صبر و ضبط کا دامن تھامنا چاہا تو وہ دامن جھٹک کر پرے ہٹ گیا۔ اُمید کی چاہ کی تو ناامیدیوں کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئے۔ پھر بھی ایک دوسرے کی دلی کیفیات سے بے خبر، ایک دوسرے کے غم کو دل کے نہاں خانوں میں چھپائے جیتے رہے اور دن گزرتے رہے!!

آخر سبرینہ کی شادی کی تاریخ سر پہ آن پہنچی۔ اگلے دن احسن کی برات آنے والی تھی اور کل وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شہزاد کی ہو جانے والی تھی۔ ساحر ایک عرصہ سے کہیں روپوش ہوگیا تھا۔ اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ شادی کے ہنگامے ثانی پیلیس میں قیامت کا شور برپا کر رہے تھے —— لیکن دوسری صبح شہر والوں کے لئے قیامت سے کم نہ تھی! لرزتے ہاتھوں میں اخبار کانپ رہے تھے اور نگاہیں ایک خبر پر پھسل پڑ رہی تھیں —— سننے والوں کے کانوں پر، دیکھنے والوں کی آنکھوں پر اور سمجھنے والوں کے ذہنوں پر، محسوس کرنے والوں کے احساسات پر یہ خبر بجلی بن کر گری ——

"سیٹھ یوسف ثانی کی اکلوتی بیٹی مس سبرینہ نے معینہ وقت سے ایک دن پہلے ہی نواب معظم جاہ کے اکلوتے داماد نواب ساحر ملک سے شادی کر لی ——!!"

---

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| تصنیفات جناب محروم | | بیکراں | ۴/۵۰ | ابوالکلام آزاد | ۰/۲۵ |
| کاروانِ وطن | ۷/۵۰ | ستاروں سے ذروں تک | ۲/۷۵ | رفیع صاحب کے | ۰/۲۵ |
| بہارِ طفلی | ۳/۵۰ | وطن میں اجنبی | ۳/۵۰ | مزار پر | |
| نیرنگِ معانی | ۵/۰۰ | نوائے پریشاں | ۳/۵۰ | ماتمِ سالک | ۰/۲۵ |
| شعلۂ نوا | ۶/۵۰ | اقبال اور اس کا عہد | ۳/۰۰ | شاعر کی آواز | ۰/۲۵ |
| بچوں کی دنیا | ۴/۰۰ | میرے گذشتہ شب و روز | ۱/۲۵ | انتخابِ کلامِ آزاد | ۱/۰۰ |
| انتخابِ کلامِ محروم | ۱/۰۰ | ماتمِ نہرو | ۰/۷۵ | [illegible] ملک رام | ۵/۰۰ |
| تصنیفات جناب | | اجنتا | ۰/۷۵ | رموز و کنایات فراق | ۲/۵۰ |
| جگن ناتھ آزاد | | دہلی کی جامع مسجد | ۰/۲۵ | جگن ناتھ آزاد | |
| تلوک چند محروم | ۴/۰۰ | اردو | ۱/۲۵ | اردو کی شاعری — حمید سلطان | ۵/۰۰ |

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

### حق حزیں ایم اے

بتاؤ تم کو کہ روٹھ جاؤ جو مجھ سے تم کیا کیا کرو گے
کسی کا گلہ کرو گے، خود سے بھی کچھ خفا خفا سا کرو گے

ستائیگا جب تمہیں تنہائی، کرے گا کوئی نہ ہم نوائی
مجھے یقیں ہے نہ ہو سکے گا جو پاس میرا وفا کرو گے

ہزار چاہے مجھ سے دوری رہے گی دل میں تری ناصبوری
مجھے خیالات سے تم اپنے جلا کے کیوں کر جدا کرو گے

یہ عہدِ ظلمت ہے قربِ باہم کٹھن ہے تم پر بھی کیا کٹھن
مری نظر سے کبھی جو دور ہو کر مری نظر میں بسا کرو گے

حزیں کو آساں نہیں بھلانا کرو گے تم ضبط یہ تو مانا
چبھیں گے دل میں جو خار بن کر جو اشکِ غم تم پیا کرو گے

### شکیل احمد عاصم بلیاوی ایم اے بی ٹی

سیرِ چمن جو کوئی صبا انتظار نہیں
بہار تو ہے مگر رونقِ بہار نہیں

تمہارا غم بھی مرے دل کو ناگوار نہیں
انہیں کو میری محبت پہ اعتبار نہیں!

وہ بدنصیب کہاں جائے کیا کرے جس کو
خوشی بھی راس نہیں غم بھی سازگار نہیں

کبھی کبھی یہ طبیعت اداس اداس سی دل
یہ سوچتا ہوں کہیں وہ تو سوگوار نہیں!

ہم ان کے عشق میں دنیا لٹائے بیٹھے ہیں
وہ پھر بھی کہتے ہیں عاصم وفا شعار نہیں

### سید نسیم الحق گیاوی

رس بھری باتوں کا اور میٹھی نگاہوں کا فریب
کھا چکا ہوں بارہا میں خیر خواہوں کا فریب

چاہتا ہے دل کہ تارے آسماں سے توڑ لائے
ہائے اُس کافر کی دزدیدہ نگاہوں کا فریب

مہرباں وہ ہو گئے آفت کا مارا جان کر
کام آخر آ گیا لرزیدہ آہوں کا فریب

میکدے میں حضرتِ واعظ بھی آئے ہیں مگر
میکشوں کو دے کے ناکردہ گناہوں کا فریب

قافلے بھی چھٹ گئے منزل بھی پیچھے رہ گئی
زندگی اپنی تھی یا پیچیدہ راہوں کا فریب

### سعید اعجاز کامٹوی

اللہ اللہ گردشِ جام — گردشِ دوراں رام ہوئی
حسنِ رنگیں کی ہر بات — گلشن گلشن عام ہوئی
اور بڑھی بیتابیِ دل — سعیِ کرم ناکام ہوئی
توبہ توبہ روزِ فراق — صبح، برنگِ شام ہوئی

زیست نے مارا اے اعجاز
موت عبث بدنام ہوئی

# خوبصورت نام

**ذاکرہ**

گنج نمبر ۱، بتیا (چمپارن) بہار

برادرم سلام و نیاز!

خدا کرے اب آپ بالکل اچھے ہوں۔ ۔ اس کہانی کا کچھ اور عنوان بھی ہو سکتا تھا لیکن مجھے خوبصورت نام ہی خوبصورت معلوم ہوا۔ میرا خیال ہے یہ ایک اچھی نفرت کی کہانی ہے ۔۔۔۔ تین ملک سے تین خطوط لکھے گئے اور کہانی بن گئی۔ نقطۂ عروج بھی نیا اور دلچسپ ہے یقین ہے آپ اور قارئین ضرور پسند کریں گے۔

۔۔۔ میری کہانیوں "وہ اک بات" اور "گھر یا ہمارا پیار" کی پسندیدگی کے سلسلے میں بہت سارے خطوط قارئین کے اور مل رہے ہیں۔ قارئین کی پسند ہی میری کاوشوں کا بہترین معاوضہ ہے۔ ایک سال سے میں ذہنی طور پر بہت پریشان ہوں۔ پھر بھی اپنے ہمدردوں کے خط کا جواب دینا اتنا ہی ضروری سمجھتا ہوں جتنا ضروری سمجھتا ہوں کہانیاں لکھنا!....

آپ کا اپنا ۔۔۔۔۔ ذاکر

دہلی (انڈیا)

۲۰ مارچ ۱۹۷۰ء

جانِ نوشابہ!

تم سلامت رہو ہزار برس!

اجنبی ملک، اجنبی شہر اور اجنبی لوگوں کے درمیان تم یقیناً جدائی کا ایک ایک لمحہ گن گن کر گذار رہے ہو گے، میری یاد تمہیں تڑپاتی ہو گی، میرا خیال تمہیں مضطرب کرتا ہو گا، میرے ساتھ بیتے ہوئے دن اور لمحے تمہیں چین نہ لینے دیتے ہوں گے، تم چاہتے ہو گے کہ چار سالہ تعلیم کا باقی ایک سال پلک جھپکتے گذر جائے اور تم جلد سے جلد واپس آ کر مجھے اپنی بانہوں میں سمو، سینے سے لگا لو تاکہ پھر کبھی جُدائی کا ڈر نہ ہو، دوری کا خوف نہ ہو۔ لیکن میرے اچھے نوید! اب وہ دن کبھی نہ آئے گا، میں تمہاری نہ ہو سکوں گی۔ میری زلفوں کی گھنی چھاؤں اب تمہیں کبھی نصیب نہ ہو سکے گی، میں اپنی مسکراہٹیں تم پر نچھاور نہ کر سکوں گی، تم مجھے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے کر زمانے کے سرد و گرم سے نہ بچا سکو گے۔ تمہارے آنے تک وہ سب کچھ ہو چکا ہو گا جس کا تصور ہمیں مضطرب کر دیتا تھا، ہم تڑپ جاتے تھے، ڈر جاتے تھے۔ خوف سے کہ دوسرے کی بانہوں میں سمٹ سمٹ جاتے تھے۔ میری دنیا لٹ چکی ہو گی، ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں دے دیا جا چکا ہو گا، میں کسی اور کی ہو چکی ہوں گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے!

میں تو تمہارا انتظار دل کی دھڑکنیں گن گن کر زندگی کی آخری سانس تک کر سکتی تھی، لیکن اپنی بدنصیبی کو کیا کروں کہ مجبور اور بے بس ہو کر رہ گئی۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں بچپن ہی میں شفقتِ پدری سے محروم ہو گئی تھی۔ اب میری ماں پر دل کے دورے پڑنے لگے ہیں۔ زندگی سے مایوسی نے ان کی ایک دیرینہ اور آخری خواہش کو شدت سے بیدار کر دیا ہے۔ وہ جلد سے جلد میرے ہاتھ پیلے کر دینا چاہتی ہیں، اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں کے سامنے میرا گھر آباد کر دینا چاہتی ہیں، لیکن انہیں کیا پتہ کہ میں برباد ہو جاؤں گی۔ اب تو غشیاں بھی آنے لگے ہیں، کاش ایسے میں تم دور نہ ہوتے اور میں ہم

[illegible] ! میرے انور! میری مجبوریوں کو بے وفائی نہ سمجھنا، مجھے الزام نہ دینا، یہ سمجھ لینا ایک مجبور و بے زبان لڑکی اپنی قریب مرگ ماں کی خواہشوں پر قربان ہو گئی ——— بس ایک آخری التجا ہے میری تم سے، میرے لئے آنسو نہ بہانا، مجھے بھول جانا اور کسی اچھی لڑکی سے شادی کر کے اپنا گھر بسا لینا — اب رخصت ہوتی ہوں، پھر کبھی نہ ملنے کے لئے ——— خدا حافظ! میرے اچھے انور! خدا حافظ!!

مجبور و غم نصیب ——— نوشابہ

---

لندن (انگلینڈ)

۲۴ر جولائی [illegible]

میرے ہمدم، میرے دوست ساجد!

مہینوں بعد تمہیں خط لکھ رہا ہوں اور اس کے لئے میں اپنے آپ کو بہت مشکل سے آمادہ کر پایا ہوں۔ اس درمیان تمہارے کئی خطوط ملے اور جب کبھی جواب لکھنے بیٹھا کسی کی یاد نے دل میں چٹکی لی، اک ٹیس سی اٹھی، قلم ہاتھ سے چھوٹ گیا، آنکھوں میں آنسو آ گئے، ہر طرف دھند پھیل گئی اور ماضی کی جاں گسل یادوں نے بے چین کر دیا، بیتے ہوئے حسین دنوں کے تصور نے مضطرب کر دیا ——— اور پھر گھنٹوں بعد میں خود کو سنبھال پاتا ہوں، ایسا ہر روز ہوتا ہے۔ بھلا تمہیں کیا معلوم کہ میری حالت اُس مسافر کی سی ہے جو طویل اور کٹھن راستوں کو طے کرتا ہوا منزل کے قریب آ کر لُٹ گیا ہو، میں ایک ایسی کشتی ہوں جو طوفانی موجوں اور بپھری لہروں سے گزر کر ساحل کے قریب ڈوب گئی ہو۔ کاش میں وطن سے اتنا دور نہ ہوتا، مجبور نہ ہوتا۔ تم کہو گے میں بہک گیا ہوں۔ لندن کی رنگین فضا مجھے راس نہیں آئی، کاش ایسا ہی ہوتا۔ میں دیوانہ ہو جاتا، اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتا، سب کچھ بھول جاتا یا پھر لندن کی گہما گہمی میں کہیں کھو جاتا پھر کبھی نہ ملنے کے لئے، بہک جاتا پھر کبھی ہوش میں نہ آنے کے لئے، جس کا سب کچھ کھو گیا ہو وہ بھلا خود کو پا کر کرے گا بھی کیا؟

تم نے اپنے تازہ خط میں میری خاموشی کا غلط مطلب نکالا ہے۔ میں کسی سنہرے بالوں والی اور نیلی آنکھوں والی فرنگن کی اداؤں کا اسیر نہیں ہوا ہوں، یہ تمہارا وہم ہے، یہاں وفا نام کی کوئی چیز نہیں ملتی، دل لُبھانے والے انداز نہیں ملتے، مُسکراہٹیں ہیں لیکن پُر فریب، خوبصورت جسم ہیں لیکن تپاک کی گرمی سے محروم، جذبات میں ڈوبی سانسیں ہیں لیکن خوشبو سے عاری شراب کی بُو سے آلودہ، اور یہ ساری باتیں نہ ہوں تو بھی کیا، دل کا جو گوشہ کسی کے لئے مخصوص ہوتا ہے وہاں تم برسوں سے کوئی اور ہے جسے میں کبھی بھلا سکوں گا، کبھی نہ چھوڑ سکوں گا، اُس کے سینے پیکر کے جال خد و خال سے منظور نہ ہو سکوں گا۔ اس کے باوجود وہ میرے دل میں رہے گی، مندر میں دیوی کی مورتی کی طرح! جب تک میں زندہ ہوں گا۔

جی تو نہیں چاہتا کہ اُس ملک میں واپس آؤں جس نے مجھ سے چھین کر مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا، میری خوشیاں، میری آرزوئیں لیکن ایک طرف اپنے بزرگ والدین کا، دوسری طرف تمہاری بے لوث محبت کا یہی تقاضا ہے کہ آؤں اور باقی زندگی آنسو بہانے کے لئے، تڑپنے کے لئے، سسکنے کے لئے۔

امتحان ختم ہو گیا ہے، صرف نتیجہ کا انتظار ہے۔ انشاء اللہ ستمبر کی کسی تاریخ کو ہندوستان کے لئے روانہ ہو جاؤں گا، یقین ہے اس درمیان تم نے میرے گھر کا خیال رکھا ہوگا، میری سونپی ہوئی ذمہ داریوں سے غافل نہ ہوئے ہوگے۔

تمہارا دور افتادہ دوست ——— انور

---

لاہور (پاکستان)

۱۵ر اگست [illegible]

ڈیر، انور!

طویل انتظار کے بعد تمہارا خط ملا۔ ہائے، ہائے یہ کیسی باتیں کرنے لگے ہو تم، یہ کیسا روگ لگا لیا ہے تم نے اپنے دل کو، کاش تم نے مجھ پر بھروسہ کیا ہوتا، اپنی محبت کا تذکرہ کیا ہوتا، اپنی خوشیوں کے ساتھ مجھے اپنے غم میں بھی شریک کیا ہوتا۔ خیر جو ہونا تھا سو ہوا، یہ ضروری نہیں کہ جسے چاہا جائے اُسے پا بھی لیا جائے۔ پاک اور حقیقی محبت کا تعلق تو دل سے ہوتا ہے، یہ تو ایک بندھن ہے دو دلوں کے باہمی ملاپ کا۔ لیکن یہ کیا کہ اپنی زندگی میں کسی اور کو نہ آنے دینے کا فیصلہ کر لیا ہے، زندگی کے سفر میں کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں تو کسی مونس و غمخوار کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔ خواہ میری طرح کسی دوست کی شکل میں خواہ کسی اور بصورت ہم سفر کی شکل میں، تمہارا فیصلہ نظر ثانی کا محتاج ہے، آخر گھر گرہستی بھی کوئی چیز ہے۔ ان ساری باتوں پر پھر کبھی سوچیں گے پہلے تم آ تو جاؤ۔ تمہاری سونپی ہوئی ذمہ داریوں کا پورا پورا خیال رکھتا آیا ہوں، یہی دیکھو نا، تم نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ پروین کے لئے کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ رکھوں تاکہ تمہارے واپس آتے ہی اُس کے ہاتھ پیلے کر دیئے جائیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کوئی لڑکا مل جائے لیکن کوئی اچھا لڑکا میری نظروں میں نہ آیا۔ اگر آج کل تہذیب مغرب کے دلدادہ لڑکے تو اپنے ساتھ اپنی بیویوں کو بھی نمائش کی چیز بنا دیتے ہیں اور مجھے ایسے لڑکوں سے چڑ ہے، تم تو جانتے ہی ہو۔ ایک دن میں اپنے ڈرائنگ روم

کملا [illegible] چندر [illegible] ایم۔ اے

جو کہنی تھی بات کہہ نہ سکا [illegible]    اُن کے ہی گیت گائیں تو میں کیا کروں

مجھ کو خود داری عشق پہ تو بہت    خود وہ نزدیک آئیں تو میں کیا کروں

جل اٹھی شمعِ دل، چل رہی تھی اگر    ظلمتوں کی ہوائیں تو میں کیا کروں

دل سے خوشیوں کی رخصت گوارا سہی    غم بھی جب چھوڑ جائیں تو میں کیا کروں

جب بھی کوشش کروں بھولنے کی انہیں    اور وہ یاد آئیں تو میں کیا کروں

خونِ دل سے جلا تو رہا ہوں مگر    شمعیں بجھتی ہی جائیں تو میں کیا کروں

نازؔ جن کی کشش کھینچتی ہے مجھے

موت کی ہوں صدائیں تو میں کیا کروں

---

## غزل

چندر پرکاش جوہر بجنوری

بہارِ شام نہ رنگینیٔ سحر سے مجھے
نشاطِ دل ہے میسر تری نظر سے مجھے

قدم قدم پہ جبینِ نیاز جھکتی ہے
ہے ایک ربطِ نہاں تیری رہگزر سے مجھے

شعورِ عشق، شعورِ وفا، شعورِ حیات
ملی ہیں نعمتیں کیا کیا تری نظر سے مجھے

ابھی اجل کو پیامِ حیات دینا ہے
ابھی ہیں کام بہت عمرِ مختصر سے مجھے

گزر گئے ہیں وہ جس راہ سے کبھی اک بار
ہزار بار گزرنا پڑا اُدھر سے مجھے

جنوں سے بڑھ کے نہیں کوئی رہنما جوہرؔ
ملا ہے درس یہ اک صاحبِ نظر سے مجھے

شباب للت ایم۔ اے

[illegible]ل و حواس ہم سے ہمارے جدا ہوئے
[illegible] سے کچھ نہیں سہارے جدا ہوئے

کس بے بسی کے ساتھ تری بزمِ ناز سے
تیری نوازشات کے مارے جدا ہوئے

[illegible] ہم کہ آپ
[illegible] ہمارے، جدا ہوئے

انساں کے ساتھ ساتھ چلی تھی غم و نشاط
دریا سے دو گھڑی کنارے جدا ہوئے

پھر زندگی میں کوئی کٹھن موڑ آ گیا
[illegible] دوست ہاتھ سے چھوٹے

کیا ہم ابھی بہار کے تھے منتظر شبابؔ
[illegible] ہم سے مست نظارے جدا ہوئے

لیلا
Bata
سنڈک
رجسٹرڈ ٹریڈ مارک
باٹا کی مخصوص تفصیلات کے مطابق منتخب کارخانہ داروں کا تیار کردہ

# دردِ منت کشِ دوا...

اشرف قادری بی۔اے۔آنرز ایل ایل بی

پوسٹ آفس بتیا۔ چمپارن (بہار)

بھائی خورشید صاحب آداب و تسلیمات

ایک افسانہ "دردِ منت کشِ دوا..." ارسال کر رہا ہوں۔ یہ افسانہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اس آئینہ میں آج کی ماڈرن لڑکیاں اپنے چہرے دیکھ سکتی ہیں اور اگر چاہیں تو اس سے عبرت بھی حاصل کر سکتی ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں سمجھوں گا میری کاوش کا صلہ مل گیا۔ افسانہ میں ایک نئی تکنیک پیش کی گئی ہے۔ یقین ہے پسند آئے گی — آپ کی رائے کا منتظر...

—— اشرف قادری

★

میری اچھی شکیلہ!

میں سمجھتی ہوں کہ تم اچھی ہوگی۔ میں بھی بخیر ہوں۔ ابّا جان اور امّی جان بھی یوں سمجھو بخیر ہی ہیں۔ بڑھاپا تو بذاتِ خود ایک مستقل مرض ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کچھ دنوں سے کوئی ایسی بات نہیں ہوئی ہے جو باعثِ تفکر ہو۔ اُمید ہے چچا جان اور چچی جان اچھی ہوں گی۔

جواب دیر سے دے رہی ہوں۔ شاید تم مجھے کوس بھی رہی ہوگی اور نہ جانے کیا کیا سوچ رہی ہوگی۔ تمہارا سوچنا بھی بجا ہوگا۔ لیکن یہ بھی یقین ہے کہ یہ ضرور خیال کروگی کہ ہمارا خط لکھنے میں ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ تھوڑی سی تاخیر ہو گئی ہے۔ سمجھ لو کوئی ایسا حادثہ ہو گیا ہوگا جو خط لکھنے میں سدِ راہ بنا ہوگا۔

کیا بتاؤں کہ اصل بات کیا ہے؟ جی تو چاہتا ہے اسے راز ہی رہنے دوں۔ لیکن تم پہ مجھے پُورا بھروسہ ہے اس لئے تم سے ضرور کہوں گی۔

ایک دن میں ناول پڑھ رہی تھی کہ دایا نے کہا: "امّی بلا رہی ہیں۔" اور میں ابھی اختصر پڑھ ہی رہی تھی کہ ابّا جان نے پکارا اور میں بغیر جواب دیے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔ تم جانتی ہو ابّا جان اکنامکس کے پروفیسر ہیں۔ صوفہ میں دھنسے ہوئے کتاب دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے بغیر سر اُٹھاتے ہوئے کہا "سگریٹ!" اور میں سگریٹ لانے چلی گئی۔ لوٹتے ہوئے امّی جان نے کہا۔ "تمہارے ابّا نے چائے مانگی ہے۔ دایا کو کہہ دو لے جائے۔ چائے تیار ہے۔" دایا کو ٹرے میں چائے رکھنے کے لئے حکم دے کر میں ابّا جان کے کمرے کی طرف سگریٹ لانے کے لئے گئی۔ کمرہ میں "بیسویں صدی" کا تازہ شمارہ نظروں کے سامنے آگیا۔ اسے اٹھا کر دیکھنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے اسی میں کھو گئی۔ افسانہ ختم کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ سگریٹ اب تک نہ لے گئی! اور جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف گئی۔ پردہ ہٹاتے ہی میں تو حیرت رہ گئی! ایک خوبصورت نوجوان بیٹھا ابّا جان سے باتیں کر رہا تھا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی اس کی نگاہیں مجھ سے ملیں اور وہ مجھے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ابّا جان نے سگریٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا: "بیٹی یہ ہیں اختر صاحب۔ ابھی ابھی انھوں نے بی۔اے اکنامکس کے ساتھ پاس کیا ہے اور اب فقط ایم میں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔ یہ تمہارے کلاس میٹ ہی تو ہوں گے!" میرے ہاتھ آداب کے لئے غیر ارادی طور پر اٹھ گئے اور میں نے کہا: "بہت خوشی ہوئی۔" اختر نے بھی جواب دیتے ہوئے کہا: "اور مجھے بھی!" اس کے بعد میں وہاں سے چلی گئی۔

شکیلہ! میں وہاں سے چلی تو آئی لیکن رہ رہ کر دل میں عجیب گدگدی محسوس ہو رہی تھی۔ شام کسی طرح گزری۔ رات کو بستر پہ لیٹی تو بے چینی

[illegible] کہ اپنا پیچھا چھڑا [illegible]
[illegible] کی طرح [illegible] بات
[illegible] کر [illegible] گی
[illegible]

[illegible] ملاقات ہوئی اور پھر یہ سلسلہ
[illegible] اور سچ تو یہ ہے کہ ہمارا ایک ہی
[illegible] ملاقات کے کافی مواقع میسر تھے۔ والد بزرگوار ان میں
[illegible] ملنے پر بھی کوئی عذر و اعتراض نہ
[illegible] ایک دن وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور
[illegible] شعر جو پڑھے ہیں اندر تھی۔ مجھے خیال بھی نہ تھا کہ وہ
[illegible] خیال میں چلی آرہی تھی اور جوں ہی ڈرائنگ روم میں ایک
قدم رکھا [illegible] آواز آئی اور میں ٹھٹک گئی۔ دیکھا اختر چھت کی طرف نگاہیں جمائے
ایک غزل پڑھ رہے تھے۔

آشفتہ جمال میری چشمِ تر کہاں
ان کو غمِ فراق کی میرے خبر کہاں
شوقِ نیاز سجدہ تو میری جبیں میں ہے
لیکن خبر نہیں ہے کہ ہے تیرا در کہاں

وہ پڑھتے جاتے تھے اور میرا دل قابو سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ آخر دایا کو آواز دیتے ہوئے میں ڈرائنگ روم میں داخل ہونے لگی۔ پکارنے کی آواز سے وہ چونک گئے اور خاموش ہو گئے۔ مجھے اندر آتے ہوئے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کے چہرے کا رنگ عجیب طرح سے بدل رہا تھا۔ حیرت و استعجاب اور خوف و ہراس کے ملے جلے تاثرات اُن کے چہرے سے عیاں تھے۔ مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اختر صاحب کیوں خاموش ہو گئے؟ کون سی غزل پڑھ رہے تھے؟ بہت اچھی غزل تھی۔ آپ تو خوب پڑھتے ہیں صاحب۔" اور وہ تھے کہ بالکل خاموش، پیکرِ حیرت بنے میری طرف دیکھتے رہے اور زبان تھی کہ بالکل خاموش!
یہ معلوم ہوتا تھا کہ [illegible] اُن کے ہونٹ سی دیے گئے ہوں۔

[illegible] دایا نے ٹیبل پر [illegible] رکھتے ہوئے کہا: "چائے حاضر ہے!" میں چائے [illegible] لیتے ہوئے میں نے آج [illegible] ایک غزل سنائیے گے۔
[illegible] دلکش تھا ایک ایک شعر دل میں اترتا جا رہا تھا۔
[illegible] غزل پڑھتے پڑھتے

## شبِ ہجر

ہم شبِ ہجر میں، جب سوتی ہے ساری دُنیا
ذکر کرتے ہیں ترا چھپتے ہوئے تاروں سے ——— فراق

یوں گزرنے کو تو صدیاں بھی گزر جاتی ہیں
کوئی کیسے طرح ترے ہجر کی راتیں کاٹے ——— پریم وار برٹنی

اب بجھا دو یہ سسکتے ہوئے یادوں کے چراغ
ان سے کب ہجر کی راتوں میں اُجالا ہوگا ——— [illegible]

بزمِ خیال میں ترے حُسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی ——— فیض

اے حُسن ہم کو ہجر کی راتوں کا خوف کیا
تیرا خیال جاگے گا سویا کریں گے ہم ——— جذبی

مرسلہ: مس نکہت پہدرین کمہرولی لعل بنگلہ

وہ یکایک اُٹھے اور پان کی گلوریاں ہاتھ میں لیتے ہوئے کہنے لگے: "ریحانہ اب میں چلا!" اور وہ چلے گئے۔ میں انھیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی لیکن کچھ نہ کہہ سکی۔ میں اپنے کمرہ میں آکر بستر پر دراز ہو گئی اور خیالات میں کھو گئی۔

اچھا شکیلہ! اب رخصت ہوتی ہوں۔ پھر باتیں ہوں گی۔ چچا جان اور چچی جان کو تسلیم عرض کر دینا۔

تمھاری ——— ریحانہ

---

شکیلہ بہن!

خدا تمھیں خوش رکھے اور عمرِ دراز عطا فرمائیے۔ ہمیشہ سکون سے ہمکنار رکھے ——— تم اِس کا جو مطلب سمجھو، لیکن یہ میرے دل کی آواز ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ میں بے انتہا شرم محسوس کر رہی ہوں اور یہ بھی مانتی ہوں کہ یہ میری بڑی بے حیائی ہے جو میں تمھیں یہ خط لکھ رہی ہوں۔ لیکن کیا کرتی میری روح کو تا دمِ حیات اور ممکن ہے اِس کے بعد بھی سکون حاصل نہ ہوتا اگر میں یہ خط نہ لکھتی۔ میں بہت پریشان تھی کہ تم نے مجھے خط کا جواب کیوں نہ دیا؟ مجھے کیا معلوم کہ مجھ سے تمھیں رقابت پیدا ہو گئی ہے۔ یقین مانو مجھے یہ معلوم ہوتا کہ . . . سچ کہتی ہوں ایسی غلطی کی مرتکب نہ ہوتی۔ ہرگز ایسا نہ کرتی۔ میں جانتی ہوں کہ بھلا

[illegible] کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوگا۔ لیکن پھر بھی کھوئی ہوئی تھی کہ میرا
[illegible] ہو جائے۔ کئی دن کے بعد اپنی تاریخ کو وہ آئے تھے۔ کچھ دیر تک
[illegible] ٹہلتے ٹہلتے رہے۔ میں بھی بیٹھی رہی۔ یکایک وہ گنگنانے لگے اور
ترنم سے پڑھنے لگے ؎

جل رہی ہیں یک [illegible] تر نہیں ہے
مجھے محبت [illegible] کو اس کی خبر نہیں ہے
سنو حال دل پریشاں کہ کیا گزرتی ہے شام ہجراں
ختم ہو ایسی داستاں ہے یہ قصہ مختصر نہیں ہے

اور اس کے بعد بغیر کچھ کہے لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے چل دئے اور
[illegible] چند منٹ کے بعد اٹھی اور دروازے تک آئی۔ پردہ ہٹاتے ہی مجھے ایک
[illegible] گرا ہوا نظر آیا۔ میں نے اٹھا لیا۔ اوپر ہی لکھا ہوا تھا۔ "ایک مجبور کا پیغام اختر
کے نام"۔ تم ہی سوچو کتنا جاذب نظر تھا یہ جملہ! میں خط پڑھنے لگی ــــ اس میں
[illegible] نہیں کہ یہ حرکت بداخلاقی اور پست مزاجی کا ثبوت ہے۔ لیکن میں خود پر قابو
پا سکی۔

شکیلہ! خط حسرت و یاس کی تصویر تھا اور مایوسیوں کا مرقع!
[illegible] میں نسبت مستقل ہونے کی یاد دہانی، مجبور محبت کی طرف التفات رکھنے کی
[illegible] تھا اور کیا کیا نہ تھا۔۔ شروع میں لکھا تھا "سرتاج سلامت!" اور نیچے لکھا
تھا۔۔ آپ کی۔۔۔ اپنی مجبور روش!"

میں سارا خط پڑھنے کے باوجود تمہارے متعلق کچھ نہ سمجھ سکی۔ ہاں اتنا
خیال ضرور ہوا کہ اختر کسی اور کے ساتھ منسلک ہو گئے ہیں اور میں ہوں کہ۔۔۔
انہیں اپنانے کے لئے ہزاروں راہیں ڈھونڈ رہی ہوں! صوفہ میں دھنسی ہوئی
ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہی۔ اعضا بالکل مفلوج ہو گئے۔ لیکن میرے دل میں یہ
جذبہ پیدا ہوا کہ ــــ ریحانہ! تمہارے لئے یہ مناسب نہیں ہے۔ اختر کو اس نے
[illegible] تمناؤں سے دیکھا ہوگا اور دیکھ رہی ہوگی۔ اختر کو اپنانا تمہارے لئے کسی طرح
بھی جائز نہیں! اور میں نے محسوس کیا کہ دوسرے ہی لمحہ مجھ میں قوت پیدا
ہوئی اور دل میں یہ طے کر لیا کہ اختر اگر آجائیں تو ان سے معافی مانگ لوں گی
اور پھر ان سے کبھی نہ ملوں گی! [illegible]
ہوئے پسینہ میں تر اور اختر کی سانس تیز چل رہی تھی۔ [illegible]
لیکن آواز تیز سانس چلنے کی وجہ سے صاف نہیں تھی۔ میں نے [illegible]
خط ان کے سامنے پیش کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن زبان [illegible]
ہی ان کی نگاہیں جھک گئیں۔ چہرے پر دہشت برس رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ
اختر کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے ٹپکے اور میں بے تاب
ہو گئی۔ آخرکار میں نے اختر کے شانوں کو جھنجوڑ کر کہا "خدا کے لئے ایسا نہ کیجئے
اب میرا خیال بھی دل میں نہ لائیے۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ میرے لئے کچھ نہ سوچئے۔۔۔
اب۔۔۔ میں۔۔۔ میں نہ رہی۔۔۔ آپ۔۔۔ میں آپ کے لئے اجنبی ہوں۔۔۔
آپ مجھ سے اب کبھی نہ ملئے۔۔۔ مجھ سے نہ ملئے۔۔۔" اور وہ تھے کہ ٹپ ٹپ
آنسو بہاتے رہے۔ گھبرا کر اپنے رومال سے ان کے آنسو پونچھتے ہوئے میں نے
ان سے کہا: "اختر صاحب! اب میں برداشت نہیں کر سکتی۔ ایسا نہ کیجئے ورنہ
میں۔۔۔ میں سچ کہتی ہوں۔۔۔ میں۔۔۔ پاگل۔۔۔ پاگل ہو جاؤں گی!"

اختر واپس چلے گئے۔ شاید کبھی نہ آنے کے لئے!۔۔۔ اور اُس
وقت سے اب تک میری کیا حالت ہوئی ہوگی! اس کا اندازہ تم کر سکتی ہو۔
کیا کیا نہ کرنے کا خیال دامنگیر ہوا ہوگا! یہ تو غنیمت ہوا کہ تمہارا خط مل
گیا۔ یقین مانو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ تم شادی کے ریشمی
دھاگوں میں منسلک ہو رہی ہو۔ میری مبارکباد قبول کرو۔ اختر اور
تم دونوں لافانی محبت کا رشتہ استوار کر لو ــــ خدا کرے تمہاری حیات
کا دامن ہمیشہ مسرت کے پھولوں سے بھرا رہے۔

شکیلہ! تم سمجھتی ہوگی کہ تم کامیاب ہو گئیں اور میں سمجھتی
ہوں کہ میں! اب تم ہی بتاؤ میں جیتی تم ہاریں یا تم جیتیں میں ہاری؟؟

تمہاری ــــ ریحانہ

---

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ (منیجر بیسویں صدی)

# بُزدل

شفق سہرامی

کیمور گنج۔ سہسرام (بہار)

برادرِ محترم خوشتر گرامی صاحب باحترامِ عقیدت

ایک کہانی "بزدل" بھیج رہا ہوں۔ افسانہ نمبر کا اعلان دیکھ چکا ہوں۔ میری دیرینہ آرزو ہے کہ "بیسویں صدی" کے کسی نمبر میں آؤں ——— اُمید ہے کہ یہ کہانی آپ کو اور قارئینِ "بیسویں صدی" کو پسند آئے گی...

مخلص ——— شفق سہرامی

★

کوثر چلی گئی۔

مُرجھائے چہرے اور ڈبڈبائی آنکھوں سے فریاد کرتی ہوئی، اور وہ اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل کر بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ یوکلپٹس کے سائے میں شام اُتر آئی تھی۔ دھندلی دھندلی سی شام، ہلکا ہلکا سا اندھیرا۔ سڑکوں پر روشنیاں برسنے لگیں، دُکانیں جگمگا اٹھیں، معطر آنچل فضا میں لہرانے لگے اور شام کا دل دھڑکنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد شفق کجلا جائے گی تو اُن راہیوں کا کیا ہوگا جو شفق کی رنگینی میں گم ہو کر منزلوں سے بھٹک جائیں گے۔ اگر گھٹا ٹوپ اندھیرا ہوا، تارے نہ ہنسے، چاند پگھل کر نہ بہا تو اُن بھٹکے راہیوں کو منزل کیسے ملے گی؟

منزل ——— وہ لوگوں کی بھیڑ میں آگے بڑھتا رہا مضمحل قدموں سے۔ اُس کی منزل کہاں ہے؟ یہ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتے نقرئی قہقہے، یہ رنگین سائے، رنگین ملبوس کی جنوں خیز مہک، یہ شور و ہنگامہ۔ کیا یہ اُس کی منزل دلا سکتے ہیں۔ اُس کے دل کو سکون بخش سکتے ہیں؟ اُس کی منزل ایک حسین لڑکی تھی، اجنبی سی جسے اُس نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو، جس کی آواز پہلے کبھی نہ سنی ہو، جس کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو۔ اچانک وہ اُس کی دُلہن بن کر آجائے۔ سُرخ جوڑے میں ملبوس، پھولوں سے لدی ہوئی۔ جب وہ اُس کے کمرے میں داخل ہو کیف و سرور سے دل دھیرے دھیرے دھڑکتا رہے۔ دیکھوں، کیسی ہے میری شریکِ حیات! میرے خوابوں کی شہزادی!

پھر وہ اُس کے پلنگ پر بیٹھ کر اُس کا جھکا ہوا سر اُٹھانے کی کوشش کرے، گھونگھٹ اُٹھانا چاہے تو سُرخ سُرخ مخروطی اُنگلیاں گھونگھٹ سے اُلجھ جائیں اور وہ لاجونتی کا پھول بن جائے۔ پھر پیار کی حدّت سے دھیرے دھیرے دُلہن کا وجود پگھلنے لگے اور گھونگھٹ اُلٹ جائے۔ اُس کی پیشانی افشاں سے جگمگا رہی ہو، پلکیں ایک دوسرے سے جُڑی ہوئی ہوں، سانسیں کانپ رہی ہوں اور چہرے پر شفق کی سُرخی پھیل گئی ہو۔

"خدا کی قسم تم میرے خوابوں سے زیادہ حسین ہو؟" وہ اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لے، "آنکھیں کھولو میری زندگی! میں تمہاری آنکھوں میں اپنی جنت دیکھنا چاہتا ہوں۔ آنکھیں کھولو اور چھلکتی مے سے مجھے مدہوش کر دو۔ میں اِس وقت تمہارے سوا سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں۔ تم میں کھو جانا چاہتا ہوں؟"

اور وہ دھیرے دھیرے پلکیں اُٹھاتی نظروں سے نظریں ملتیں تو وہ لجا کر اُس کے سینے میں منہ چھپا لیتی۔ "مجھے اپنی بانہوں میں لے لو میرے محبوب! مجھے اپنے میں جذب کر لو۔ مدتوں کی پیاسی روح کو سیراب کر دو؟"

اور وہ فرطِ محبت سے اُسے اپنے سینے سے لگا لیتا۔

اور جب وہ دفتر سے لوٹتا وہ کچن میں کھانا بنا رہی ہوتی۔ وہ چپکے

[illegible] بانہوں میں لے لیا۔

"ہائے اللہ چھوڑیے کوئی ادھر آ جائے گی!"

"جب میں ادھر آگیا ہوں تو وہ کچھ نہیں کہہ سکتیں۔ تم کیوں گھبرا رہی ہو؟"

دوبارہ اُس کا ہاتھ چوم لیا۔

"آپ مجھے بے شرم بنا دیں گے کوئی اتنی بھی محبت کرتا ہے کہیں؟"

"محبت ہو کیا دیکھا کبھی نہیں ہے؟" وہ ایک ادا سے مسکرا گیا تو اُس کا دل چاہا وہ چیخ چیخ کر کہے: "ہاں میں جانتا ہوں، میرے ذہن میں اندھیرا ہے، میری روح میں اندھیرا ہے، میرا مستقبل تاریکی میں گم ہے۔ مجھ کو کیسے نظر آسکتا ہے تم اُسے اندھا بنا کر رکھو گے جس کی منزل اُس سے چھین لی جائے۔ اُس کے خوابوں کے تاج محل کو پتھر پھینک دیا جائے۔ وہ کانچ کے محل کی طرح بکھر جائے اور اُس کی کرچیں ستارے کی

• ——— • ——— •••

• بولنے سے پہلے اپنی بات کو میزانِ اعتدال میں تول لیا کرو۔
(حضرت یوسف اسباطؒ)

• احسان ہر جگہ بہتر ہے لیکن ہمسایہ کے ساتھ بہترین ہے۔
(حضرت مجدد الف ثانیؒ)

• حاسد اُس شخص کی طرح ہے جو اپنے دشمن کو پتھر مارنے کے لئے پتھر پھینکے لیکن وہ پتھر دشمن کو لگنے کے بجائے اُس کو مجروح کر دے اور دشمن دیکھ دیکھ کر ہنسے۔
(حضرت امام غزالیؒ)

• اپنے آپ کو سب سے بہتر سمجھ لینا جہالت ہے۔ ہر آدمی کو اپنے سے بہتر سمجھنا چاہئے۔
(حضرت امام غزالیؒ)

• ——— • ——— •••

زندگی دل میں چبھتی رہیں اور وہ اِس اُلجھن سے کبھی چھٹکارا نہ پا سکے۔ اُس کی روح کی دلدل میں طوفان آجائے اور اُس کے ارمان، تمنائیں، خواب بکھر جائیں۔ جب وہ منزل کی تلاش میں گھوم رہا تھا۔ کوثر سیاہ ابر کی طرح اُس کی زندگی پر چھا گئی۔ اُس کے ذہن میں اندھیرا ابھر گیا۔ اُس کا دل ہی جانتا تھا وہ اپنا وقت کیسے گزارتا تھا۔ نیند نہ آتی تو سوچتا رہتا، اُلجھتا رہتا کیسے وہ کوثر کو اپنی زندگی سے نکال دے اور پھر اپنی منزل کی تلاش میں نکل پڑے۔

"یہ کیا طریقہ ہے کوثر، تم ساری کہانیاں بکھیر دیتی ہو جسے پڑھنا ہو وہی فائل سے نکالا کرو۔"

لیکن اُس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ بستر پر بے حس و حرکت لیٹی رہی۔ دوپٹہ دور کرسی پر لہرا رہا تھا۔ لیکن کہانی ختم کر کے اُس نے ایک طویل انگڑائی لی۔ بکھرے بالوں کو سلجھایا پھر بولی۔

"کہانی تو اچھی ہے لیکن بہت کمزور ہے۔"

"ضرور ہوگا لیکن آپ میری کہانیاں پڑھتی ہی کیوں ہیں؟"

"آپ تو بُرا مان گئے۔ ایک اچھے فنکار کے لئے ضروری ہے کہ وہ [illegible] پر نظر رکھے۔ تنقید فن کو جلا دیتی ہے۔"

"پھر کسی وقت آپ کی نصیحت سن لوں گا۔ اس وقت تو [illegible] سونا چاہتا ہوں اس لئے آپ تشریف لے جائیے۔"

"سوچنے کے لئے تھوڑے سے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لئے [illegible] بادام کا تیل مفید ہوتا ہے۔ کہئے تو مالش کر دوں؟"

"تم جاؤ گی یا بکواس کئے جاؤ گی؟" اُسے غصہ آنے لگا۔

"ریلیکس پلیز؟" وہ ہاتھ اُٹھا کر بولی۔ "آپ مجھے تم نہیں کہہ سکتے؟"

اور جب اُس نے اُس کی چوٹی پکڑ کر جھٹکا دیا تو وہ روہانسی ہو کر چیخی۔

"اِس اِنسلٹ کے لئے میں ہتکِ عزت کا کیس کر دوں گی!"

"ارے ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟" ہاشمی کی امی آگئیں۔ "چھوڑ اس کی چوٹی۔ تجھے یہ بھی خیال نہیں کہ یہ ہماری مہمان ہے؟"

"مہمان ہی سمجھ کر تو چھوڑ دیتا ہوں ورنہ دل چاہتا ہے اِس کا سر توڑ دوں؟"

"ارے بس رہنے دیجئے۔ میرا سر اتنا کمزور نہیں کہ آپ جیسے آدمی سے ٹوٹ جائے؟"

وہ چوڑی سڑک پر گھوم گیا۔ دونوں طرف اونچی اونچی بلڈنگیں تھیں۔ چکنی سڑک پر کاریں تیزی سے پھسلتی جا رہی تھیں۔ ایسی تیز رفتار زندگی بھی کیا کہ کہیں دم لینے کی فرصت نہ ملے۔ انسان بھاگتا رہے، بھاگتا رہے اور جب تھک جائے بے دم ہو جائے تو ہزاروں طوفان دل میں لئے کسی رات چپ چاپ ویرانے میں جا سوئے۔ اُس بلبلے کی طرح جو پانی پر سر اُٹھاتا ہے پھر ٹوٹ کر پانی میں مل جاتا ہے اور اُس کا کوئی نشان پانی پر نہیں رہ جاتا۔ زندگی ایک پرچھائیں ہے۔ اُس کے پیچھے اتنی تیزی سے بھاگنے سے کیا حاصل۔ پرچھائیاں کب کس کے ہاتھ آئی ہیں لیکن جو دھوپ [illegible] زندگی نہیں۔ آخر وہ بھی تو انسان تھے جنہوں نے اِن پرچھائیوں پر [illegible] دھیرے دھیرے بھٹکتی ہوئی خوشی [illegible] ہر چیز کا لطف لیا جا سکے۔ لیکن یہاں تو ایک بھاگ دوڑ [illegible] اپنی جگہ سے ٹلنے کا نام نہیں لیتا۔ اگر غم کی گھٹائیں چھا جائیں تو اُن کے چھٹنے تک زندگی اندھیرے میں گم ہو جاتی ہے۔ خواب بکھر گئے تو اُن کے ٹکڑے سارے زندگی

50,000 روپے
کے انعامات ضرور جیتئے!
پہلا انعام 20,000/-
دوسرا انعام 5,000/-
تیسرا انعام 2,500/-
"میرا روپ میری پسند" مقابلے میں حصہ لیجئے

[illegible] قتیں ادا نہ ہو کر پیچھے لگتے رہیں۔ لیکن ایک [illegible]
[illegible] زندگی کی دنیا میں زندہ رہنا بے حد مشکل ہے۔ میں کسی کو دوش
[illegible] دیتی۔ یہ میری اپنی قسمت کی بات تھی کہ میرے شوہر، جن سے میں دم
تک محبت کرتی رہوں گی، اس کے عالم میں بھرے اچانک ہمیشہ کے لئے
جدا ہو گئے اور میری دنیا میں بالکل بے سہارا ہو گئی ——— اسی لئے
اپنی زندگی، اپنی ہستی مٹا دینے کو خود کشی کرنے جا رہی ہوں۔ خدا حافظ میرے
بچے! ——— خدا حافظ اے میری دنیا ——— !!

ایک بدنصیب عورت جسے زندگی راس نہ آسکی"

خط پڑھ کر میرے ہوش و حواس اڑ گئے۔ یہ پتہ دوبارہ تھا لیکن وقت کم تھا۔
کسی کی زندگی خطرے میں تھی۔ خود کشی! خود کشی!! ایک نوجوان عورت [illegible]
پہاڑیوں میں خود کشی کے ارادے سے آئی ہے۔ میں نے بے اختیار پہاڑی کی بلندیوں
کی طرف دیکھا۔ پہاڑی کی بلندیوں پر ڈوبتے سورج کی رنگین روشنی میں ایک
سایہ لڑکھڑاتا لرزتا سا سایہ! بے اختیار ایک خوفزدہ چیخ میرے منہ سے
نکل گئی۔ "رک جاؤ ——— لا" میں پوری قوت سے پکار اٹھا۔ میری آواز کی
بازگشت دور تک پہاڑیوں میں گونجتی رہی ——— "رک جاؤ! رک جاؤ! رک
جاؤ!" اپنی تمام تر طاقت و توانائی کے ساتھ دوڑتا ہوا جب میں اوپر پہنچا
تو تھک کر ہانپ گیا۔ ایک نامعلوم خوف نے میرے جسم پر لرزہ طاری کر دیا اور قریب
پہنچنے پر میں حیرت اور غم سے پکار اٹھا۔

"اوہ! محسنہ تم؟" مسز عثمانی دلربا کی وہ حسین مورتی سراپا سوال و غم
ہو گئی تھی۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ نظریں جھکائے سسکتی ہوئی بولی "آپ نے
مجھے کیوں پکارا؟ کیوں آواز دی؟ ممتا کی زنجیروں کو توڑ کر میں یہاں تک چلی
آئی تھی۔ لیکن آپ کی آواز کے کرب و اضطراب نے میرے حوصلے پست کر دیئے۔
میں بے بس ہو گئی ہوں! میں کتنی مجبور ہوں۔ دنیا مجھے جینے دیتی ہے اور نہ
مرنے ہی دیتی ہے؟"

"محسنہ ———!" میں نے کھوکھلی آواز میں کہا "دفتر میں اتنے دنوں
سے ہم ساتھ کام کر رہے ہیں۔ لیکن آج سے پہلے کبھی ہمیں ایک دوسرے کو
دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ غم تو زندگی کا لازمی جزو ہے۔ غم سے
مفر ممکن ہی نہیں۔ اس کے باوجود ——— ان تمام تلخیوں کے باوجود زندگی
[illegible] کیوں ضائع کر دی جائے۔ جینا ایک حماقت سہی لیکن وقت سے
پہلے [illegible] کوئی عقلمندی نہیں ہے!"

محسنہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ [illegible]
کی طرف چلنے لگے جہاں محسنہ کا معصوم بچہ رو رہا تھا [illegible]
تھا۔ بچے کو دیکھتے ہی محسنہ زخمی ناگن کی طرح تڑپ کر اس کی طرف بڑھی اور اسے
سینے سے لگا کر دیوانہ وار اس کے رخساروں کو چومتی ہوئی [illegible]
شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ [illegible]
قطرہ بھی سیاہ ہو گیا تھا۔ کائنات پر شب کی سیاہ ردا [illegible]
تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالوں میں کھوئے رہے۔ بچہ ماں کی [illegible]
آغوش میں سو گیا تھا۔

میں نے آہستہ سے کہا۔

"محسنہ۔ تمہارے شوہر کی طرح میری بیوی بھی مجھے جان سے زیادہ
پیاری تھی۔ میرے ننھے معصوم بچے بھی تمہارے لڑکے سے کم پیارے نہ تھے۔
میری زندگی کے واقعات حیرت انگیز طور پر تمہارے حالات سے ملتے جلتے ہیں۔
غم و آلام اور ناکامی و نامرادی کے اس راستے پر تم تنہا ہی نہیں ہو۔ میں بھی اسی
راہ کا آوارہ و پریشان راہی ہوں۔ میرا درد و دکھ تنہا ہے نہ تمہارا غم ہی صرف تمہارا
غم۔ ہم دونوں ہی حالات کے مارے ہوئے ہیں۔ بے سہارا مجبور۔ کیوں نہ ہم
ایک دوسرے کا سہارا بن جائیں۔ اپنے مشترکہ غم کا مقابلہ کیوں نہ مل جل کر کریں؟"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" وہ پیکر رعنائی لرزتی ہوئی آواز میں بولی "ایسا
ہرگز نہیں ہو سکتا!"

"تم چاہو تو ایسا ہو بھی سکتا ہے!" میں نے پر سکون لہجے میں کہا
"ہماری یہ رفاقت بے لوث اور پاکیزہ ہوگی۔ اس میں کسی جذباتی تعلق
کو دخل ہے نہ کسی اور غرض کو۔ ہمیں اپنی طبعی موت تک زندہ رہنا ہے۔ ہم جیتے
جاگتے انسانوں کی طرح ایک ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے
نئی زندگی کی طاقت و توانائی اور مسرتیں بخش سکتی ہو اور میں تمہارے معصوم
بچے کے لئے ایک شفیق باپ اور تمہارے لئے ایک قوی سہارا بن سکتا ہوں۔"

"لیکن ———؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"لیکن کیا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

محسنہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بچے کو گود میں اٹھا کر اٹھ گئی اور دھیرے
دھیرے سڑک پر چلنے لگی۔ میری کار کے پاس پہنچ کر وہ رک گئی۔ میں نے دروازہ
کھولا۔ وہ خاموشی سے نشست پر بیٹھ گئی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور
اگلی نشست پر بیٹھا ہی تھا ——— کہ محسنہ کی آواز سنائی دی ———
"شریف صاحب! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ کی [illegible]

# غزل

کیفؔ احمد صدیقی

جب کبھی خوابوں کے کسی موڑ سے ہم گذرے ہیں

سب سے بہت تیز قدم گذرے ہیں

شامِ تاریک میں جیسے کسی جنگل کا سفر

یوں زمانے کے بیاباں سے ہم گذرے ہیں

فرض کا بوجھ لئے دُکھتے ہوئے شانوں پر

شہر تا شہر ترے گشتہ غم گذرے ہیں

تیرہ بختی نے کبھی ساتھ نہ چھوڑا لیکن

روشنی بن کے تری راہ سے ہم گذرے ہیں

کیفؔ نقاد کا معصوم قلم کیا جانے

وحشتِ تخلیق سے جس حال میں ہم گذرے ہیں

# غزل

مس فرزانہ اشفاق شاہجہانپوری

مرحلے زیست کے دشوار نظر آتے ہیں

ہر طرف موت کے آثار نظر آتے ہیں

سامنے اُن کے جو ہم بات نہیں کر سکتے

ہم اُنہیں اور گنہگار نظر آتے ہیں

اک جھلک جنکی ہمارے لئے پیغام ہوا

ہائے ہم سے وہی بیزار نظر آتے ہیں!

یہی ہر دور میں ہوتا ہے کہ تعمیر کے ساتھ

کچھ تباہی کے بھی آثار نظر آتے ہیں

نہ ہے قسمت کہ قرار آکے سے بھولے نشاں

زینتِ سنگِ در یار نظر آتے ہیں

خوبصورت نہیں ہے؟" (مارکو سپین کا رہنے والا تھا)

اور پھر میری شامیں وینس کے ساتھ گزرنے لگیں۔ شہر میں گنتی کے سینما گھر تھے۔ ایک ہی فلم کئی بار دیکھی جاتی (اور ایک بار بھی سمجھ نہ آتی)، سمندر کے کنارے ریت پر سہ پہروں لیٹے رہتے۔

"تمھارے بال کتنے سیاہ ہیں!" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتی۔

شہر سے دُور کھنڈرات میں نکل جاتے: "ان ویرانوں میں کتنی زندگی ہے؟" وہ میرا ہاتھ تھامے کہتی۔ مجھے چاندنی راتیں بہت پسند تھیں۔ اُسے اندھیری راتوں میں آسمانوں پر چمکتے ہوئے ستارے پیارے معلوم ہوتے۔ وہ خود بھی ایک ستارہ تھی، تابناک ستارہ زہرہ!

زندگی کی نئی راہیں متعین ہو چکی تھیں، جن پر ہم مسکراتے، ہنستے رواں دواں تھے۔ میں کلب سے غیر حاضر رہنے لگا۔ کتنا سہانا تھا زندگی کا وہ دَور! دُنیائے رنگ و بُو وینس سے جدا ہو کر وقت گزارنا میرے لئے ایک مشکل بن چکی تھی۔ راتیں سگریٹ پھونکتے اور دن آفس میں اُونگھتے ہوئے گزرتے۔ شام کا انتظار بہت بے چینی سے رہتا۔ اکثر مائیکل اور مارکو فلیٹ میں ملنے آجاتے۔ مارکو کلب نہ آنے کا شکوہ کرتا۔ وینس کا ذکر کرتا، جو مجھے گراں گزرنے لگا تھا۔ میں محسوس کرنے لگا کہ وینس کے بغیر سپین کے مرغزار تو کیا دُنیا میں کسی بھی حسین چیز سے لطف اندوز نہ ہو سکوں گا۔

---

ایک دن مارکو صبح ہی صبح آفس آدھمکا۔ حسبِ عادت ایک آہِ دلدوز بلند کی اور کہا، وہ عنقریب وینس کو پرپوز کرنے والا ہے۔ میں چونک گیا۔ میں بھی کسی مناسب موقع پر ایسا ہی کرنے والا تھا۔ دل میں سوچا وہ مناسب موقع آج کی شام ہی ہوگی۔ مارکو کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا اور میں بے چینی سے شام کا انتظار کرنے لگا——

لیکن شام سے پہلے ہی مجھے ایک دُوسرے شہر میں ٹُور پر جانا پڑا۔ آفس سے اُٹھ کر فلیٹ پہنچا۔ سامانِ سفر باندھ کر گاڑی میں رکھنے کے بعد وینس کو رِنگ کیا۔ وہ گھر پر موجود نہ تھی۔ پیغام نوٹ کر لینے کے لئے تاکید کر کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ فرائض کی انجام دہی میں مجھے دو ہفتے گزر گئے۔ واپس آکر سب سے پہلے کلب پہنچا۔ ایک کمرے میں مارکو تنہا بیٹھا تھا۔ آنکھیں بند، دونوں بازو کرسی کے بازوؤں پر سے لٹکے ہوئے۔

گیندے کے پھول کی طرح زرد چہرے پر اُداسی کے گہرے سائے تھے۔ نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھا اور آنکھوں ہی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"شہر میں کون سی اچھی فلم چل رہی ہے؟" میں اپنے خیالوں سے چونک گیا۔ اُس کا ہاتھ اُسی طرح میرے ہاتھ میں تھا۔

"ساری فلمیں دیکھنے کے بعد ہی فیصلہ کر سکیں گے کہ کون سی اچھی تھی؟" میں نے تجویز کیا۔ اُس نے اگلے دن فلم دیکھنے کا وعدہ کیا۔

چاندنی کلب کے درختوں کی چوٹیوں پر پگھلی ہوئی چاندی بکھیرنے لگی تھی۔ صحرا کی پُرفسوں رات شروع ہو چکی تھی۔ رڈسن فیملی کسی جگہ مدعو تھی۔ وہ لوگ جلدی میں تھے۔ اُنھیں کلب کے دروازے سے نکلتے ہوئے میں دیکھتا رہا۔ اپنے قریب ہی کسی 'آہ' کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ مارکو سینے پر دونوں ہاتھ باندھے وینس کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر ڈُوبتی ہوئی چاندنی کا سُنہرا رنگ تھا۔ یا اُداسی کی زردی۔ مائیکل نے ہم دونوں کو باری باری غور سے دیکھا اور سینے پر صلیب بناتا ہوا فوارے کے چبوترے پر جا بیٹھا۔ ہم بھی بیٹھ گئے۔

"اپنی جان کو روگ مت لگاؤ دوست. . ." وہ براہِ راست مارکو سے مخاطب تھا۔ "وینس کا خیال دل سے نکال دو۔ اپنے گرد غور سے دیکھو دُنیا کتنی حسین ہے!"

"کسی ساتھی کے بغیر یہ زندگی کتنی بھیانک ہے، ویرلن ہے سنیور؟" مارکو بولا۔

"ضروری نہیں تم کسی کو اپنا ساتھی چُننا چاہو اور وہ ایسا ہی ہو۔"

"ایسا ہی ہوگا!" مارکو جذباتی ہو گیا۔

"تم امریکی لڑکیوں کو نہیں جانتے۔ ہر امریکی لڑکی بیک وقت ایک شخص کی منگیتر ہوتی ہے۔ دُوسرے سے محبت کرتی ہے اور کسی تیسرے سے شادی رچا لیتی ہے!"

مارکو، مائیکل کی طرف اُس ملزم کی طرح دیکھ رہا تھا جسے پھانسی کی سزا سُنا دی گئی ہو۔

"تم اِسے سمجھاؤ. . ." مائیکل مجھ سے مخاطب ہوا۔ "میں تو اتنی بار سمجھا چکا کہ اتنی بار اگر کوّے پر پاؤڈر مَلا جاتا تو وہ بھی سفید ہو جاتا!"

قارئین کے مسلسل اصرار پر، اُن کی غلط فہمی دُور کرنے کے لئے ہم یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ادارہ 'بیسویں صدی' دہلی کا 'بیسویں صدی' لاہور سے کوئی تعلق نہیں۔ سوائے اِس کے کہ وہ ہمارے جملہ مضامین بلا حوالہ نقل کر لیتے ہیں اور ہمارے 'تیرونشتر' اور 'صحت و زندگی' کے مضامین بھی اپنے نام سے شائع کر لیتے ہیں اور پڑھنے والوں کو مغالطے میں رکھنے کے لئے ہمارے سرورق کا ہو بہو چربہ بھی چھاپ لیتے ہیں۔ — مینیجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۲

میں نے قہقہہ لگایا۔ مارکو نے بھی کھل کھلا کر قہقہہ لگایا۔
ہم بہت دیر تک وہاں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے جو بیشتر ونیس کے متعلق تھیں۔ رات بھیگنے لگی تو ہم رخصت ہوئے۔

---

دوسرا دن بہت بے چینی سے گزرا۔
شام کے وقت فلیٹ میں پڑا ونیس کے متعلق سوچ رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی نے چونکا دیا: "پکچر کا وعدہ بھول گئے کیا؟"
یہ بھی بھولنے والی بات تھی۔ میں نے کہا: "میں تیار ہوں!"
"اور میں منتظر ہوں!!"
جلد ہی تیار ہو کر میں مارکو کے فلیٹ پر جا پہنچا۔ وہ دروازے ہی پر منتظر ملا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم سنیما ہاؤس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈین مارٹن کی کوئی فلم چل رہی تھی۔ نہ جانے کیسی فلم تھی۔ کتنے لوگ ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے تو کبھی کبھی سکرین پر مختلف رنگوں کے سائے رینگتے محسوس ہوتے اور بس۔ تصوّر میں ونیس کا ہاتھ میری گود میں تھا۔ اس کے سوا کچھ بھی خبر نہ تھی۔ یوں محسوس ہوا کہ چند لمحوں کے بعد فلم ختم ہو گئی۔ سنیما ہاؤس سے نکل کر ایک ریستوران میں جا بیٹھے۔ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، غیر متعلق باتیں۔
"مائیکل غیر ذمہ دار اور لاابالی آدمی ہے" اُس کا خیال تھا۔
اُس نے ایک آہ بھری، جو شاید آخری تھی۔
"سنیور! مجھے محض آپ ہی کا انتظار تھا۔ اب میں یہاں نہ رہ سکوں گا۔ شاید زندہ ہی نہ رہ سکوں!"
"وجہ؟" اُس کی سنجیدگی پر میں بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔
"ونیس سے ملاقات ہوئی؟"
"فلیٹ سے نکل کر سیدھا ادھر ہی آ رہا ہوں۔"
"تب آپ نہیں جانتے سنیور!"
"بھئی کوئی بات بھی تو بتاؤ۔"
"کل مائیکل اور ونیس ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو گئے! انھوں نے شادی کر لی!!"
میں سکتے میں آ گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسی وقت مائیکل اور ونیس ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔
"سنیور مائیکل اور سنیورا ونیس شادی کے لئے ایک بار پھر مبارکباد قبول کیجئے" جیسے مارکو کی آواز کسی گہرے کنویں سے آ رہی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے

"بیسویں صدی" کو بھی جانتے ہیں اور خوشتر گرامی کو بھی۔ نہ بیسویں صدی سے خوشتر گرامی کو الگ کیا جا سکتا ہے اور نہ خوشتر گرامی کو بیسویں صدی سے، اور یہ دونوں مل کر ایک ایسا سکون بن گئے ہیں جہاں سے بے شمار فنکاروں نے استفادہ حاصل کیا، نام کمایا اور شہرت پائی ——— اُردو کی بقا کے لئے "بیسویں صدی" کا ایک خاص رول ہے اور خوشتر گرامی کا ایک نمایاں پارٹ۔ اور یہی لگن اور محنت کا نام ہوتا ہے کبھی افسانہ نمبر، کبھی سالنامہ... نو ادیبوں اور شاعروں کی تصویریں بھی شامل ہیں اور ساتھ ہی اُن کی زبانی اُن کی کہانی۔ یہ ایک جدت ہے جو ہر خصوصی نمبر میں "بیسویں صدی" پیدا کرتا ہے ——— خوشتر گرامی مبارک کے مستحق ہیں جنھوں نے ایک ایسا گلدستہ پیش کیا ہے جس کی مہک عمر بھر تابندہ رہے گی ——— اس سے آج کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ کہ اُردو میں "بیسویں صدی" کا کوئی ثانی نہیں اور "بیسویں صدی" کی یہ لگن، اُردو دوستی سے، اُردو ادب کا گلستان مہک رہا ہے اور یہ گلستان ہمیشہ ہی مہکتا رہے گا ——— "بیسویں صدی" کا افسانہ نمبر قابلِ قدر بھی ہے اور دلکش بھی، جاندار بھی اور وزنی بھی ——— بعض افسانے تو شاہکار ہیں جن کا شمار اُردو کے بہترین افسانوں میں ہوگا۔
"رفتار" جموں

دھند سی چھائی ہوئی تھی ——— اور جب میں نے واقعات پر غور کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اور مارکو ہاروت و ماروت کی طرح کسی گہرے کنویں میں اُلٹے معلّق کر دئے گئے ہیں! اور ونیس ——— وہ تو دُور آسمانوں پر ستارے کی طرح چمک رہی تھی! ستارے جو ہمیشہ پہنچ سے دُور ہوتے ہیں۔ مائیکل کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے ———
"... تب ہاروت و ماروت کو ایک گہرے کنویں میں اُلٹا معلّق کر دیا گیا۔ اور ونیس آج بھی آسمان پر تابناک ستارے کی صورت میں چمک رہی ہے!!"

---

# نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| ایک گدھے کی سرگزشت | کرشن چندر | ۳/۹۵ |
| برف کے پھول | 〃 | ۴/۰۰ |
| پودے | 〃 | ۳/۰۰ |
| غدار | 〃 | ۳/۰۰ |
| فلمی قاعدہ | 〃 | ۴/۵۰ |
| لال تاج | 〃 | ۲/۷۵ |
| چاندی کا گھاؤ | 〃 | ۵/۵۰ |
| دروازہ | 〃 | ۲/۲۵ |
| نغمے کی موت | 〃 | ۲/۵۰ |
| ایک شمع دو پروانے | عادل رشید | ۲/۵۰ |
| تھکے پاؤں (حصہ اول) | 〃 | ۵/۰۰ |
| تھکے پاؤں (حصہ دوم) | 〃 | ۵/۵۰ |
| میر صاحب | 〃 | ۵/۰۰ |
| زندگی کا سفر | 〃 | ۴/۵۰ |
| دلِ ناداں | خان محبوب طرزی | ۲/۵۰ |
| رسّی جل گئی | 〃 | ۳/۰۰ |
| دودھ کی قیمت | منشی پریم چند | ۳/۰۰ |
| رُوحانی شادی | 〃 | ۱/۵۰ |
| خواب و خیال | 〃 | ۳/۵۰ |
| قولِ فیصل | مولانا ابوالکلام آزاد | ۲/۵۰ |
| پکچر ہاؤس | راشد سہوانی | ۴/۵۰ |
| ضرورتِ رشتہ | 〃 | ۳/۵۰ |
| میک اپ | 〃 | ۵/۲۵ |
| فردوسِ بریں | شرر لکھنوی | ۲/۰۰ |
| منصور موہنا | عبدالحلیم شرر | ۲/۲۵ |
| خوفناک قبیلہ | ایم۔ جے۔ عالم | ۵/۰۰ |
| خونخوار مرنجی | 〃 | ۵/۵۰ |
| خُمار | ہیرا لال شوق | ۳/۰۰ |

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| جگر کے پار | ہیرا لال شوق | ۲/۰۰ |
| نوائے دل | محمد فضل الرحمٰن خان فضل | ۱/۵۰ |
| پتوار | [illegible] | ۳/۵۰ |
| پُروائی | 〃 | ۴/۰۰ |
| دردناک افسانے | نسیم انہونوی | ۲/۰۰ |
| دکن کے چار چاند | صادق سردھنوی | ۵/۰۰ |
| دھرتی کے تیور | تاجور سامری | ۲/۷۵ |
| دل سے قریب | انتصار حسین | ۱/۷۵ |
| گمنام | 〃 | ۲/۵۰ |
| جیل کے دن جیل کی راتیں | ابراہیم جلیس | ۳/۰۰ |
| خوفناک جزیرہ | سراج انور | ۵/۰۰ |
| پیاسی ندیا | جمیل انجم | ۳/۰۰ |
| بیوی | آغا حشر کاشمیری | ۳/۵۰ |
| ڈارلنگ | نریش کمار شاد | ۲/۵۰ |
| ڈاکٹر فومانچو کی بیٹی | میکس رومہر | ۴/۰۰ |
| خونی پھول | باقر رضا مہدی | ۳/۵۰ |
| دشمن | ریوتی سرن شرما | ۵/۰۰ |
| چاندی | رئیس احمد جعفری | ۵/۰۰ |
| حالِ دل | بیگم توقیر | ۳/۵۰ |
| جنوبی ہند میں دو ہفتے | جگن ناتھ آزاد | ۱/۰۰ |
| ستاروں سے ذرّوں تک | 〃 | ۲/۷۵ |
| جلوے | نہال عظیم آبادی | ۳/۰۰ |
| جگنو اور ستارے | جیلانی بانو | ۱/۰۰ |
| جاگو اور جگاؤ | مہانند | ۱/۵۰ |
| میری بھابی | پروفیسر محمد جمیل | ۲/۵۰ |
| لیلیٰ کے خطوط | قاضی عبدالغفار | ۲/۵۰ |
| پیاسی دوشیزہ | ایم۔ احمد جاوید | ۴/۵۰ |
| اسمگلر | بدنام رفعی | ۲/۵۰ |

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| اسلام کا نظام مساجد | مولانا ظفیر الدین | ۵/۰۰ |
| ایک تھی انیتا | امرتا پریتم | ۳/۲۵ |
| بیوی اور بیسوا | کرشن چندر تیاگی | ۳/۵۰ |
| انقلاب آنے تک | رام لعل | ۳/۵۰ |
| پرائی تلوار | سیلاگ ساہنی | ۵/۲۵ |
| پہلی لڑکی | راز دواں | ۲/۹۵ |
| تاش کا جادوگر | پروفیسر ایس۔ ڈی۔ کھنگر | ۵/۰۰ |
| غم اور بھی ہیں | مسافر ٹانکپوری | ۴/۵۰ |
| فانوس | افسر آذری | ۱/۲۵ |
| کھلاڑی | وحشی محمود آبادی | ۴/۰۰ |
| کیمیاگر | محمد مجیب | ۳/۰۰ |
| کیا شادی، کیا غم | قیسی رامپوری | ۵/۰۰ |
| گھر آئے بدروا کارے | گوبند سنگھ | ۲/۰۰ |
| لالہ رنگ | ایم۔ قاضی | ۲/۵۰ |
| لالہ رُخ | مترجم ل۔ احمد اکبرآبادی | ۳/۵۰ |
| داغِ رسوائی | | ۳/۵۰ |
| نقدِ اقبال | میکش اکبرآبادی | ۴/۲۵ |
| سیاہ گلاب | اے حمید | ۳/۷۵ |
| سات سال | | ۵/۲۵ |
| سکہ | مائل ملیح آبادی | ۸/۰۰ |
| زمین اور خلا کی کھوج | مارگریٹ او ہائیڈ | ۳/۰۰ |
| وائرلیس ریڈیو گائڈ | نریندر ناتھ | ۶/۰۰ |
| رُوپ رس (ہندی) | کرشن موہن | ۱/۰۰ |
| رنگ محل | حمیدہ سلطانہ | ۶/۰۰ |
| رُوحانی عورت | مجاز الاعظمی | ۲/۰۰ |
| ڈرائیور کی ڈائری | کرشن کمار شرما | ۵/۰۰ |
| راہ کا کانٹا | شانتی رنجن بھٹاچاریہ | ۳/۰۰ |
| راکھ اور چنگاری | عارف مارہروی | ۱/۵۰ |

ملنے کا پتہ: رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

# صحت و زندگی

## ۱• انڈے کی دوائی افادیت

انڈے میں وہ سارے اجزاء موجود ہیں جو جسم کی پرورش اور نشوونما کے لئے ضروری ہیں۔ غذائی افادیت کے ساتھ ہی انڈا دوائی اعتبار سے بھی بے حد افادیت و اہمیت کا حامل ہے۔

اسے غذا نما دوا کہہ سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ غذا کی غذا اور دوا کی دوا ہے۔ یعنی غذا کے ذریعہ جسم کو دوا کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ جسم میں خون کی کمی ہو، ضعف باہ کی شکایت ہو، کمزوریٔ اعضائے رئیسہ ہو تو انڈا بلاشبہ ایک زود اثر دوا ہے اور دل و دماغ اور بصارت کی کمزوری دُور کرنے کے لئے انڈا ایک طاقت بخش غذا ہے۔

انڈا مادۂ تولید کو بڑھاتا ہے، قوّت باہ میں اضافہ کرتا ہے، بدن کو موٹا کرتا ہے اور دِق و سِل کے مریضوں کے لئے بے مثل مقوّی غذا اور دوا ہے۔

مُرغی کے انڈے کی بھُنی ہوئی زردی سخت تکلیف دہ دردوں کو تسکین دیتی ہے۔ اسے شہد کے ساتھ ملاکر استعمال کرنے سے مرضِ کلف میں فائدہ ہوتا ہے۔ اسے موانعِ اوَرام ادویہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ آگ یا گرم پانی سے جل جانے، گوکھ ادر پیڑو کے پھوڑے اور زخم میں بھی مفید ہے۔

انڈے کی سفیدی آنکھ کے درد کو تسکین دیتی ہے۔ بصارت کو تیز کرنے اور دل و دماغ کی کمزوری دُور کرنے کے لئے انڈا بے حد فائدہ بخش ہے۔

انڈے کی زردی کی تاثیر گرم ہے اور سفیدی سرد تر ہے اور دونوں مل کر غذائے معتدل ہے۔ سفیدی اور زردی ایک ساتھ کھانے سے گرم مزاجوں کو بھی موافق ہے۔ انڈے کا مزاج معتدل، مائل بہ گرمی ہے۔ گرم مزاجوں کو موسمِ گرما میں زیادہ استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

## ۲• بہترین غذا

خوشگوار زندگی گزارنے کے لئے کسی سمجھ دار انسان کو صحت کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا...... انسان کو صحت مند رکھنے کے لئے غذا سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اِس لئے اگر آپ صحت مند رہنا چاہتے ہیں تو اپنی غذا کا خاص خیال رکھئے۔ اپنی غذا کی طرف سے کبھی بے توجہی نہ برتئے۔ خیال رکھا کیجئے کہ آپ کی غذا غیر فطری نہ ہو۔

جسم غیر فطری غذا کو دُشمن کے برابر سمجھتا ہے اور جلد ہی اُسے باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہے پکائی ہوئی غذائیں دیر سے ہضم ہوتی ہیں۔ ایسی غذا جسے ہمارے حواسِ خمسہ قبول کریں، جسے تبدیلی کے بغیر اصلی حالت میں کھایا جا سکتا ہے، جو ہماری فطری ساخت کے مطابق ہو وہی بہترین غذا ہے۔

ہو سکتا ہے یہ باتیں آپ کو عجیب سی معلوم ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ باتیں حقیقت سے بہت قریب ہیں۔

## ۳• ایک وقت میں ایک کام کیجئے

اگر آپ اپنی زندگی کا دامن کامیابی کے پھُولوں سے بھرنا چاہتے ہیں تو ایک وقت میں ایک ہی کام پر ساری توجّہ، اپنی ساری صلاحیت و قوّت صَرف کیجئے۔

انگلستان کے ایک کامیاب اخبار نویس سر ہارس ورنفذ نے جو کئی درجن جرائد و صحائف کے مالک ہیں، اپنے طویل تجربات کی بناء پر لکھا ہے — "اگر آپ اپنے مقاصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو اپنی ساری قوّت، سارے خیالات اور سارے سرمایہ کو ایک ہی مقصد کو حاصل کرنے پر صرف کیجئے۔ جو لوگ اپنی قوّت و صلاحیت کو ایک وقت میں کئی کاموں پر صَرف کرتے ہیں، اُن میں کتنی ہی غیر معمولی صلاحیت کیوں نہ ہو وہ بہت کم کامیاب ہوتے ہیں"

امریکہ کی ایک کامیاب شخصیت کے یہ خیالات بھی آپ کے لئے مشعلِ راہ ہوں گے — "جو آدمی ہر وقت ایک ہی بات، ایک ہی مقصد کے بارے میں سوچتا رہتا ہے وہ اُس میں کئی نکتے پیدا کر لیتا ہے اور یہی کامیابی کا راز ہے"

## ۴● انسان کی سب سے بڑی بھوک

مشہور مفکر ڈاکٹر ڈنگ نے لکھا ہے ــــ "انسان جتنی جدوجہد کرے تو اس کی ساری خواہشیں پوری ہو جاتی ہیں۔ مگر اس میں ایک خواہش ایسی ہے جو تقریباً اتنی ہی شدید ہے جتنی کھانے یا نیند کی خواہش۔ لیکن اس کی تکمیل شاید ہی کبھی ہوتی ہو" اور وہ خواہش فرائڈ کے الفاظ میں "بڑا بننے کی اُمنگ" اور ڈیوی کے الفاظ میں "اہم بننے کی اُمنگ ہے۔"

ولیم جیمز نے کہا ہے ــــ "انسانی فطرت کی سب سے بڑی آرزو قدر شناسی کی بھوک ہے" ــــ تو یہ ہے انسان کی اہم بھوک! جو آدمی اس بھوک کی تسکین کرنا جانتا ہے وہ لوگوں کو اپنی مٹھی میں رکھ سکتا ہے۔ ان سے ہر کام لے سکتا ہے۔

## ۵● ایک اچھی عادت

معاوضہ سے بے نیاز ہو کر یا معاوضہ سے زیادہ کام کرنے کی عادت ایک اچھی عادت بلکہ سنہری عادت ہے۔ مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ــــ جو شخص معاوضہ سے زیادہ کام کرنے کا عادی ہوتا ہے، اُسے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ اگر اُسے ایک جگہ اِس عادت کا معاوضہ نہیں ملتا تو وہ کہیں اور سے اُس کا بدلہ حاصل کر لیتا ہے۔

جو شخص ایک اچھے اندازِ فکر کے ساتھ زیادہ کام کرنے کا عادی ہوتا ہے اُسے کام کی تلاش نہیں ہوتی، کام یا ملازمت اُسے خود تلاش کرتی ہوئی آتی ہے۔

## ۶● صحت کے لئے سنہرا اصول

صحت مند رہنے کے لئے سنہرا اصول یہ ہے کہ معدے پر کبھی زیادہ بار نہ ڈالا جائے۔ جو غذا اچھی طرح ہضم نہ ہو وہ محض فضلہ بنتی ہے۔ اُس سے جسم کو طاقت حاصل ہوتی ہے نہ توانائی چاہے وہ کتنی ہی طاقت بخش غذا ہو۔

دن میں ایک بار کھانا کھانے والے کا صحت بہت اچھی رہتی ہے۔

ایک حکیم کا قول ہے ــــ "روزانہ ۴۹ تولے سے زیادہ غذا نہ کھانی چاہئے۔ اِتنی غذا تیرا بوجھ اُٹھائے گی، تجھے تندرست و توانا رکھے گی۔ اِس سے زیادہ غذا کھائے گا تو تجھے اُس کا بوجھ اُٹھانا پڑے گا۔ تُو اُس کا بار بردار ہوگا!"

## ۷● کروندہ ــــ ایک مفید سبزی

برسات کے موسم میں سبزی منڈیوں میں کروندے بکثرت ملتے ہیں۔ مزاج کے اعتبار سے کروندے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ اِن کا اچار بہت لذیذ ہوتا ہے۔ پکے ہوتے کروندے کا مُربّہ بھی تیار کرتے ہیں۔ کچا کروندہ تنہا یا گوشت کے ساتھ پکا کر کھایا جاتا ہے۔ کروندے میں غذائیت بہت ہوتی ہے۔ یہ معدے اور آنتوں کو قوت دیتا ہے، اشتہا میں اضافہ کرتا ہے۔ اگر دست آتے ہوں تو اِن کے استعمال سے بند ہو جاتے ہیں۔ خون اور صفرا کے غلبہ میں بھی کروندے مفید ہوتے ہیں۔

## ۸● طاقت کا سرچشمہ

اگر آپ شاد و مسرور اور تندرست و توانا رہنا چاہتے ہیں تو مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن کے اِس زرّیں مشورے پر عمل کیجئے۔

کائنات کے ذرّے ذرّے میں خدا کا نور دیکھیں۔ اُس کی طاقت کو اپنے جسم کے رونگٹے رونگٹے میں محسوس کریں۔ خدا سے ہم آہنگی کا یہ جذبہ آپ کو طاقت دینے والا چشمہ ہو جائے گا، جس کی حیات آفریں دھارا آپ کی زندگی کو خوش حالی، مسرت اور صحت سے معمور کر دے گی۔

## ۹● صحت ہی زندگی ہے

انسان اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو، بڑی بڑی ڈگریاں رکھتا ہو بڑی بڑی

ہے جس کا جسم تندرست نہ ہو تو اُس کی ساری صلاحیتیں ساری بیکار ہو جاتی ہیں۔ صحت سے تہی دامن انسان زندگی کے ہر میدان میں ناکام رہتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے ـــــ صحت ہی زندگی ہے!

مشہور مفکر کے۔ نولس نے کہا ہے ـــــ صحت کی قدر و قیمت، صحت کی اہمیت آپ ہی کے لئے نہیں ہوتی۔ آپ کا افسر بھی آپ کو صحت مند دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔"

سکاٹ نے بالکل درست کہا ہے ـــــ ایک افسر یا مالک اُس آدمی کو ملازمت دینے میں ضرور ہچکچائے گا جو ذہنی طور پر تو اُس ملازمت کے معیار پر پورا اُترتا ہے، لیکن صحت کے اعتبار سے مقررہ معیار پر نہیں آتا، اس لئے کہ ملازمت کی ذمّے داریوں کو پورا کرنے کے لئے جسمانی صحت کا ہونا اُتنا ہی ضروری ہے جتنا ذہنی قابلیت کا۔ اُمّید واروں کے لئے بھی یہ سوچنا ہوگا پڑے گا کہ وہ ایسا کام کرے جس کے لئے اُس کی صحت اجازت نہیں دیتی۔

جس آدمی کی صحت اچھی ہوتی ہے، اُس کے لئے ملازمت یا دُوسرا کوئی کام حاصل کرنے کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ صحت مند انسان کی ظاہری شخصیت کا جادُو بھی کام کرتا ہے۔

## ۱۰● زندگی کی جنگ میں کامیاب ہونے کے لئے

ساری دُنیا کے مفکروں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ لاکھوں انسان زندگی کی جنگ میں صرف اپنے احساسِ کمتری کی وجہ سے ناکام رہ جاتے ہیں۔ زندگی کی جنگ میں انسان اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اُس میں یہ اعتماد پیدا نہ ہو جائے کہ اُسے ہر حال میں کامیاب و کامران ہونا ہے! انسان کو خود پر اعتماد ہونا چاہئے۔ جس آدمی کو خود اپنے پر اعتماد نہ ہو پھر دُوسرا بھلا کون اُس پر اعتماد کرے گا! خود جسے اپنے پر بھروسہ نہیں اُس کا کوئی اعتبار نہیں کر سکتا۔ ایسے لوگ زندگی میں جنگ میں کبھی کامیاب و کامران نہیں ہو سکتے۔

## ۱۱● صحت کی راہ

اکثر بیماریوں میں مریض کے لئے بہترین دوا دو تین وقت کھانے سے قطعی پرہیز ہوتا ہے۔ اِس طرح تھکے ہوئے معدے کو کچھ آرام ملتا ہے۔ دو تین دن تک پھلوں کا استعمال دماغی کام کرنے والے مریضوں کے لئے بے حد فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ اگر تھوڑے وقفہ کے فاقہ کے بعد کچھ دن تک بیمار ہلکا پھلکا، زُود ہضم کھانا کھائے تو بیماری پر بآسانی قابو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی مریض دو ماہ تک پرہیزی کھانا کھا کر دیکھے تو اُس پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ نفس کُشی اور احتیاط کی راہ صحت کی راہ ہے۔

پہلے دو سَو صفحات، دس تصویریں، چونسٹھ افسانہ نگار، چار طنز نگار، ساٹھ شاعر اور بیسیوں رنگین کارٹون ـــــ اگر ان سب چیزوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو بظاہر وہ "بیسویں صدی" کا افسانہ نمبر ۱۹۷۰ء کہلائے گا لیکن پورے صفحات باطن میں گے حالانکہ باطن کا قصّہ کچھ اور ہے۔ کیونکہ اِس افسانہ نمبر کے باطن و قارئین کے لئے ایسی ایسی دل گداز رنگینیاں، رعنائیاں اور تجربات پنہاں ہیں جن کے مطالعے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہمارے ملک کا اُردو ادب آج مُدرِشک کس منزل پر ہے۔ یہ نمبر ہمیں نئے اور پرانے ادبی سکول کی آویزش ہی نہیں بتاتا بلکہ دونوں کو شانہ بشانہ چلتے ہوئے دکھاتا ہے۔ یہ بڑی مسرت انگیز اور صحت مند بات ہے کہ اِس بزرگ ترین ماہنامہ کے غضب انگیز ایڈیٹر حضرت خوشتر گرامی قدماء کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کو بھی اُبھارنے اور ادبی امتیاز دینے کا تاریخی فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ زیرِ نظر افسانہ نمبر میں بھی وہ تمام ادبی حُسن اور جلال موجود ہے جو خوشتر صاحب کی ایک مستقل روایت بن چکی ہے۔ ہم اپنے اہلِ ذوق قارئین کو اِس گلدستۂ ادب کی خوشبوؤں سے لُطف اندوز ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔ . .

روزنامہ "ملاپ" دہلی

---

"بیسویں صدی" کو ہم نے کبھی اشتہاروں کا پلندہ نہیں بنایا۔ اِس میں ۴۲ اور بوگس قسم کے وہ اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے جن کا مقصد خریداروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا ہوتا ہے۔ منیجر

---

# قابلِ مطالعہ:- مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| صنم و حرم | شکیل بدایونی | ۴/۵۰ |
| رعنائیاں | ″ | ۳/۵۰ |
| شبستان | ″ | ۳/۵۰ |
| رنگینیاں | ″ | ۳/۵۰ |
| بند کواڑ | نریندر لوتھر | ۴/۰۰ |
| دار کی دعوت | احمد علی خاں منصور | ۳/۰۰ |
| دامانِ باغباں | مختلف شعراء کا کلام | ۵/۰۰ |
| بردہ فروش | جناداس اختر | ۲/۰۰ |
| سلکِ گہر | سالک عزیزی | ۴/۰۰ |
| آگ | جناداس اختر | ۲/۰۰ |
| کلیاتِ اختر شیرانی | اختر شیرانی | ۶/۰۰ |
| پرچھائیوں کا دیس (نظم اندیشہ) پر ایک طویل نظم | قیصر عثمانی | ۱/۷۵ |
| محبت کا مطلب | ظفر پیامی | ۳/۰۰ |
| داغ دل کے | ریاض ارشد | ۵/۰۰ |
| رنگلی پھول | ″ | ۵/۲۵ |
| ایک تھی آشا | ضیاء عظیم آبادی | ۴/۰۰ |
| پنگھٹ | ″ | ۴/۵۰ |
| بھونرے | ″ | ۴/۰۰ |
| اڑان | عارف مارہروی | ۵/۵۰ |
| روح کے زخم | ″ | ۵/۰۰ |
| بندھن | ″ | ۵/۵۰ |
| موت کے بعد | اظہار اثر | ۳/۵۰ |
| بولان جیل کا قیدی | بدنام رفعی | ۴/۰۰ |
| پتنگا | گورودت | ۴/۰۰ |
| آرسین لوپن جاسوس | تیرتھ رام فیروزپوری | ۵/۰۰ |
| سنہری ناگن | ″ | ۴/۵۰ |
| خوفناک پرچھائیاں | مخمور جالندھری | ۴/۰۰ |

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| چمگادڑ | مخمور جالندھری | ۲/۰۰ |
| بوڑھی چڑیل | ″ | ۴/۵۰ |
| ندربا | ″ | ۱۰/۰۰ |
| سونی وادیاں | کرشن گوپال عابد | ۳/۷۵ |
| قیصر و کسریٰ | نسیم حجازی | ۱۲/۰۰ |
| سالارِ حجاز | ″ | ۱۵/۰۰ |
| ناداں | رئیس احمد جعفری | ۱۰/۰۰ |
| فاخرہ | ″ | ۶/۰۰ |
| فرخندہ | ″ | ۱۰/۰۰ |
| جدائی | ″ | ۶/۷۵ |
| عاصمہ | تنویر زہرہ بخاری | ۷/۵۰ |
| گنوار | ″ | ۸/۰۰ |
| شازیہ | ″ | ۷/۰۰ |
| فارینا | ″ | ۵/۰۰ |
| معصوم تبسم | حسین فاطمہ | ۵/۰۰ |
| شبو | رضیہ بٹ | ۵/۰۰ |
| وحشی | ″ | ۷/۵۰ |
| مانجھی | ضیاء عظیم آبادی | ۳/۷۵ |
| شکیلہ | ″ | ۳/۷۵ |
| آبلہ پا | رضیہ فصیح احمد | ۷/۵۰ |
| انتظارِ موسمِ گل | ″ | ۵/۰۰ |
| خانم | عظمت رضا | ۵/۰۰ |
| جگر کے پار ہوتا | ″ | ۳/۷۵ |
| چشمہ | اے۔ آر۔ خاتون | ۱۵/۰۰ |
| فاکہہ | ″ | ۷/۵۰ |
| سات خیلائیں | ″ | ۱/۲۵ |
| تصویر | | ۸/۰۰ |
| صدف | سلمیٰ کنول | ۱۰/۰۰ |

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| صبا | سلمیٰ کنول | ۸/۰۰ |
| زری | زبیدہ سلطانہ | ۶/۰۰ |
| جوہر | ″ | ۶/۰۰ |
| فیروزہ | ″ | ۶/۰۰ |
| دستک نہ دو | الطاف فاطمہ | ۴/۰۰ |
| شعلہ | نیلوفر تیموری | ۶/۵۰ |
| زخم کھانے کے بعد | ریاض جاوید | ۷/۵۰ |
| شگوفے | شفیق الرحمٰن | ۴/۰۰ |
| نیکی کر تھانے جا | ابراہیم جلیس | ۳/۰۰ |
| اوپر شیروانی اندر پریشانی | ″ | ۲/۵۰ |
| جوکر | شوکت تھانوی | ۲/۰۰ |
| سلطنتِ خداداد | محمود خاں بنگلوری | ۱۵/۰۰ |
| غزالی | فاطمہ مبین | ۹/۰۰ |
| جنگِ اسرائیل | نسیم حجازی | ۴/۰۰ |
| غازی | ″ | ۸/۰۰ |
| آخری چٹان | ″ | ۸/۵۰ |
| گیت یہ میرے | حمیدہ مبین | ۶/۵۰ |
| کاکس | مسعود جاوید | ۱۲/۰۰ |
| وادیاں | اے حمید | ۴/۲۵ |
| بے وفا | نریندر شرما | ۴/۵۰ |
| منزل سے دور | ″ | ۴/۸۰ |
| فریاد | ″ | ۲/۷۵ |
| فریب | جمیل انجم | ۴/۰۰ |
| حماقت | مسافر لائلپوری | ۴/۵۰ |
| نقشوں کا راز | کمار جالندھری | ۲/۰۰ |
| ایک ناؤ کاغذ کی | وجیہ سوری | ۳/۵۰ |
| مرجانہ | بلقیس ظفر | ۲/۵۰ |
| عاشق | [illegible] | ۷/۰۰ |

ملنے کا پتہ:- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

سوال و جواب

# سرگوشیاں

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔ (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

---

### ارجن سنگھ۔ لدھیانہ

س۔ بھائی صاحب! آج کل جامن کا موسم ہے۔ جامن کے بارے میں کچھ بتلائیے۔ اِس میں صرف زبان کا ذائقہ ہی ہے یا کچھ فائدہ بھی ہے؟

ج۔ جامن میں بہت سے فائدے ہیں یہ ہاضم اور مقوی معدہ ہے۔ بھوک بڑھاتی ہے، خون صاف کرتی ہے، معدہ اور جگر کو قوت بخشتی ہے۔ گرم مزاج والوں کے لئے خصوصیت سے مفید ہے۔ ذیابیطس اور پیشاب کی زیادتی کے لئے فائدہ مند ہے بہت سارے فوائد کے ساتھ جامن قدرے قابض بھی ہے۔

### ہدایت علی ساحل۔ جھمری تلیا

س۔ بیسویں صدی کی مقبولیت کا راز؟

ج۔ تخلیقات کا بلند معیار ـــــ مندرجات کی ندرت و انفرادیت!

س۔ انسان کی سب سے بڑی دولت کیا ہے؟

ج۔ ایمان و اخلاق!

س۔ خانگی زندگی کب کامیاب ہو سکتی ہے؟

ج۔ جب شوہر اور بیوی میں باہم پُرخلوص پیار ہو۔ ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھیں۔

* * * * *

س۔ ریاض خیر آبادی کا کوئی مشہور شعر خمریات پر سُنائیے، اور کیا یہ صحیح ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی شراب نہیں پی؟

ج۔ جہاں تک ہماری معلومات ہیں حضرتِ ریاض شراب نہیں پیتے تھے۔ اُن کا ایک شعر سُنئے ؎

بڑے پاک باطن، بڑے صاف طینت
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

س۔ عجائباتِ عالم کتنے ہیں اور اُن میں اہرامِ مصر کس نمبر پر ہے؟

ج۔ کبھی عجائباتِ عالم کی تعداد سات تھی، اُن میں اہرامِ مصر بھی ہیں۔ لیکن اب تو ساری دُنیا عجائب خانہ بن گئی ہے!

### محمد مستنصر علی تشفیع۔ نلگنڈہ

س۔ ناکامی سے پہلے ہی جھپٹی جس اور کبھی مایوس کر دے تو انسان کو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ مایوسی موت، اُمید زندگی ہے۔ اِس حقیقت پر یقین کر کے اپنے دل میں جوش اور ولولہ لے کر آگے بڑھنا چاہئے۔

س۔ "بیسویں صدی" کے موجودہ افسانہ نگاروں میں سب سے پرانے افسانہ نگار کون ہیں؟

ج۔ کرشن چندر، کوثر چاند پوری، اختر ملیح آبادی، رام لعل۔

### ایم۔ اے۔ شمس بریلوی

س۔ کوئی ایسا ہنر بتائیے جس سے کم وقت میں زیادہ پیسے مل سکیں؟

ج۔ اگر آپ ابن الوقت بن سکیں تو لیڈری کا پیشہ اختیار کر لیجئے۔

س۔ رسول میرج کا کیا طریقہ ہے؟

ج۔ یہ کسی وکیل سے پوچھئے۔ ہم مشرقی تہذیب کے حامی ہی نہیں پرستار ہیں۔

### ارشد جہاں رعنا۔ چھپرہ

س۔ چچا جان! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ شہروں میں اتنی عریانیت کیوں ہے؟

ج۔ اس لئے کہ شہر کے لوگ فیشن کے زیادہ دلدادہ ہوتے ہیں۔

س۔ زندگی کیا ہے؟

ج۔ زندگی ہے پے بہ پے موجوں سے ٹکرانے کا نام ڈوب کر بحرِ حوادث میں اُبھر آنے کا نام

س۔ کچھ لوگ اپنی زندگی سے بیزار کیوں ہو جاتے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ وہ اپنی بد ذوقی، اپنی کاہلی سے زندگی کا سارا حُسن کھو چکے ہوتے ہیں۔

---

### شمس الحق اُجالا۔ دھن سار

س۔ فرقہ پرستی کی تعریف کیا ہے؟

ج۔ فرقہ پرستی ایسی آگ ہے جو امن و آشتی کے خرمن کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ فرقہ پرستی ایسی ڈائن ہے جو انسانیت کا لہو چوس لیتی ہے!

س۔ کیا مُلک میں فرقہ پرستی ختم ہوگی؟

ج۔ فرقہ پرستی کی آگ جب تک سارے مُلک کو جلا کر راکھ نہ کر دے گی شاید ختم نہ ہوگی۔

---

### کشور محبوب۔ پاکوڑ

س۔ عورتوں کو ناقص العقل کیوں کہا جاتا ہے؟

ج۔ عورتوں کو ناقص العقل کہنے والے خود ناقص العقل ہیں! عورت ناقص العقل ہوتی تو مَردوں کی سربراہ، مُلک کی ملکہ اور وزیرِ اعظم نہ ہوتی!

س۔ گناہ کرنے پر کب پچھتاوا نہیں ہوتا؟

ج۔ جب ضمیر سو جاتا ہے۔

س۔ لیڈری ازم کی انتہا؟

ج۔ لیڈری ازم کی انتہا اُس وقت ہوگی جب لیڈری ازم کے پرستار لباس سے یکسر بے نیاز ہو جائیں گے۔

---

### نذیر الدین احمد تحیر۔ راچور

س۔ بھارت دوسرے مُلکوں کی طرح ترقّی کیوں نہیں کر رہا ہے؟ ترقّی کے لئے بھارت کو کس چیز کی ضرورت ہے؟

ج۔ بھارت کی ترقّی کے لئے خویش پروری اور خود غرضی سے بلند ہو کر مُلک کی فلاح کے لئے کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔

س۔ اسی طرح بیکاری بڑھتی گئی تو کیا لوگ علم سے مُنہ پھیر لیں گے؟

ج۔ جو لوگ صرف تعلیم کے سہارے جینا چاہتے ہیں، ہو سکتا ہے ایسے لوگ علم کی طرف سے مُنہ پھیر لیں۔

---

### مِس زرینہ گوہر بلیاوی

س۔ انسان پر کس چیز کا اثر زیادہ پڑتا ہے۔ تعلیم و تربیت کا یا ماحول کا؟

ج۔ ماحول کا۔

س۔ کیا انسان کی سب سے بڑی بدنصیبی اُس کی مُفلسی ہے؟

ج۔ جی ہاں۔

س۔ زندگی پر کوئی شعر سُنائیے۔

ج۔ زندگی ہے غم و مسرت کا
مختصر اور طویل افسانہ

---

### بے بی ثریا۔ دہلی

س۔ بچوں کا سب سے پہلا رسالہ کب اور کہاں سے نکلا تھا اور اُس کا نام کیا تھا؟

ج۔ ۱۹۰۷ء میں لاہور سے نکلا تھا، اُس کا نام "پھول" تھا۔

س۔ اور یہ بھی بتائیے اُردو کا سب سے پہلا اخبار کس نے نکالا تھا اور اُس کا نام کیا تھا؟

ج۔ کئی تذکروں میں لکھا ہے کہ اُردو کا پہلا اخبار مولوی باقر علی نے جاری کیا تھا جس کا نام "دِلّی اُردو اخبار" تھا۔

---

### سیّد انور پاشاہ۔ بنگلور

س۔ اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق تاج محل کے متعلق ساحر لدھیانوی کا یہ خیال کہاں تک صحیح ہے؟

ج۔ یہ اپنے اپنے خیال کی بات ہے۔

س۔ عورت آپ کی نظر میں؟

ج۔ بے حد قابلِ احترام ہے! مرد سے زیادہ سزاوارِ احترام ہے!

س۔ میں نے عورت کو ہمیشہ دولت سے محبّت کرتے دیکھا۔ ایسا کیوں؟

ج۔ یہ حقیقت نہیں، مرد کی کم نظری ہے۔

---

### محمد احمد علوی جمالپوری۔ احمد آباد

س۔ میرے دماغ پر اُلجھنوں کا بوجھ رہتا ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ اُلجھنوں سے نکل جاؤں۔ لیکن یہ بوجھ کم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ بتائیے کیا کروں؟

ج۔ بیسویں صدی کے صحت و زندگی کے کالموں میں آپ کے اس سوال کا اطمینان بخش جواب ملے گا۔

---

### شیام کشور سیٹھی۔ کانپور

س۔ بھائی صاحب! کچھ اچھی باتیں بتلایئے۔

ج۔ سوامی ستیا نند جی نے اُپدیش دیا ہے — "اپنے اندر چھپی ہوئی برائی، بُرے خیال اور بُری نیت کے سوا کسی سے نہ ڈرو، رامائن میں لکھا ہے — مہا پُرش سونے کی کان ہوتے ہیں۔" یہ آپ کا حوصلہ ہے کہ آپ اُن سے کتنا سونا حاصل کرتے ہیں۔

---

### سوشیلا کماری۔ بنارس

س۔ میں دلّی میں پیدا ہوئی۔ اب بنارس میں رہتی ہوں، میں ہندی میں کہانیاں لکھتی ہوں۔ اردو بھی جانتی ہوں۔ مجھے اردو سے بھی ہندی ہی کی طرح پیار ہے۔ کیا آپ میری کہانیوں کو "بیسویں صدی" میں جگہ دیں گے؟

ج۔ اپنی کہانیاں بھیجیے۔ "بیسویں صدی" کے معیار اور انداز کی ہوں گی تو یقیناً "بیسویں صدی" میں جگہ پائیں گی۔ یہ خیال رکھیے گا کہ کہانیاں طویل نہ ہوں۔

---

### سرنام سنگھ۔ جالندھر

س۔ دیش کی آبادی میں بھیانک اضافہ کی بڑی چرچا ہو رہی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ دیش کی آبادی میں بھیانک اضافہ ہو رہا ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ وزیرِ صحت کے بیان کے مطابق مُلک کی آبادی میں ہر روز تیس ہزار کا اضافہ ہو رہا ہے۔

---

### چیت رام رسالپوری۔ لدھیانہ

س۔ خودکشی کرنا بزدلی ہے، انسانیت کی توہین ہے، خودکشی کرنے سے روح کو سکون نہیں ملتا، خودکشی کرنا اپنے دشمنوں کے آگے ہتھیار ڈال دینا ہے — کیا زیبُ النساء کا شاکر ان سب باتوں سے ناواقف تھے؟

ج۔ شاکر ان سارے حقائق سے آگاہ و آشنا تھے۔ لیکن غم و اندوہ کی کثرت نے انھیں پاگل بنا دیا۔

---

### نسیم احمد عثمانی الٰہ آبادی۔ ماکولی

س۔ مندرجہ ذیل اشعار کس شاعر کے ہیں؟ اور ان میں صحیح کون سا ہے؟

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

●

آگ دی صیّاد نے جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

ج۔ پہلا شعر صحیح ہے اور ثاقب لکھنوی کا ہے۔

---

### محمد ابو ریاض نیّر سیتا مڑھی

س۔ کلیم آجز کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ کلیم آجز نہیں، کلیم عاجز کہیے — ان کا ایک شعر سُنیے ؎

خرد زنجیر پہناتی رہے گی
جو دیوانے ہیں دیوانے رہیں گے

س۔ اُردو کا مقدمہ مسز گاندھی کے سامنے؟

ج۔ بہت دنوں سے پیش ہے! لیکن — رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند!

---

### عبّاس قریشی۔ امروہہ

س۔ اِرم فارسی زبان کا لفظ ہے یا عربی زبان کا؟

ج۔ عربی زبان کا۔

### شعیب سلیمان۔ سورت

س۔ کوئی افسانہ ادھورا رہ جائے تو؟

ج۔ "ادھورا افسانہ" اس کا اچھا عنوان ہوگا۔

س۔ زندگی یا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں؟

ج۔ زندگی سوز سے عبارت ہے
یہ کسی ساز کی نقیب نہیں
کس قدر بدنصیب انساں ہیں
کوئی بھی غم جنھیں نصیب نہیں

س۔ کوئی حسین شعر سنایئے۔

ج۔ سنیے ؎

چٹک رہی ہے کسی یاد کی کلی دل میں
نظر میں رقصِ بہاراں کی صبح و شام لئے

---

### امجد حسین۔ گیا

س۔ آپ کی نظر میں ہندوستان کی تقسیم؟

ج۔ افسوسناک ہی نہیں شرمناک بھی ہے!

س۔ ہندوستان کی تقسیم کا ذمہ دار کون ہے؟

ج۔ ہندوستان کی یکجہتی کے دشمن فرقہ پرست!

س۔ دنیا میں کس مذہب کے پیروکار سب سے زیادہ ہیں؟ دوسرے اور تیسرے نمبر پر کون مذاہب ہیں؟

ج۔ دنیا میں سب سے زیادہ عیسائی ہیں، پھر بودھ، پھر مسلمان۔

---

### رضیہ جمیل۔ کویت

س۔ بھائی جان! جوہانسبرگ کہاں ہے؟

ج۔ جنوبی افریقہ میں ہے۔ یہ سونے کی کان کے لئے مشہور ہے۔

**زین الحق مشتاق خیرآبادی**

میں کسی بڑی ڈگری نہ ہونا جس کے افسانے "بیسویں صدی" میں جگہ پائیں گے؟

"بیسویں صدی" کے معیار کے افسانے ہوں گے تو یقیناً جگہ پائیں گے۔ "بیسویں صدی" کا کوئی عام شمارہ تو کیا سالناموں میں بھی ایسے بہت سے فنکار شامل رہتے ہیں جن کے ناموں کے ساتھ کوئی چھوٹی ڈگری بھی نہیں ہے! ۱۹۷۰ء کا سالنامہ ہمارے سامنے ہے۔ اس میں ۲۴ ایسے فنکار شامل ہیں جن کے ناموں کے ساتھ کوئی ڈگری نہیں ہے۔

---

**محبوب مسرت نانڈیڑی**

انسان زندگی سے کب مایوس ہوجاتا ہے؟

جب حوصلہ کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔

س۔ میرے ایک دوست مرضِ عشق میں مبتلا ہیں۔ بتلائیے کیا کروں؟

ج۔ دعا کیجئے کہ خدا انہیں اس دیوانگی سے نجات دے۔

---

**ساگر سنگھ۔ انبالہ**

س۔ آپ بتا سکتے ہیں چاند زمین سے کتنے فاصلہ پر ہے؟

ج۔ تقریباً دو لاکھ اڑتیس ہزار میل کے فاصلہ پر۔

---

**عبداللطیف دلاور۔ بلگام**

س۔ جب سورج ڈوبنے لگتا ہے تو آسمان کتنے رنگ بدلنے لگتا ہے۔ جب کوئی دل ڈوبنے لگتا ہے تو؟

ج۔ جب دل ڈوبنے لگتا ہے تو چہرہ کا رنگ بدلتا ہے۔

س۔ جب زلزلہ آتا ہے تو ساری آبادی کو برباد کر دیتا ہے جب کوئی دل ٹوٹتا ہے تو؟

ج۔ کسی دوسرے کو برباد نہیں کرتا۔

س۔ غم اٹھانے کے لئے میں تو جیتے جاؤں گا؟

ج۔ آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو!

---

**اقبال احمد ناطق۔ گریڈیہہ**

س۔ ہماری حکومت فرقہ وارانہ فساد روکنے میں کیوں ناکام ہے؟

ج۔ اس لئے کہ حکومت کے حکام فرض ناشناس ہیں۔

س۔ موجودہ نظامِ حکومت کی کیا کیا خوبیاں ہیں؟

ج۔ دو چار، دس ہوں تو گنوائی بھی جا سکیں!

---

**محمد ناظم معصوم۔ شکشی**

۔ دنیا کا بدترین مجرم کون ہے؟
۔ جو امن و آشتی کے خرمن میں آگ لگاتا ہے!

۔ کیا سب سے بڑا اور قیمتی جہیز خود عفت مآب، شرمیلی اور سلیقہ شعار بیوی ہی ہے؟
۔ جی ہاں۔

۔ اُردو کا جائز مقام کیا ہے؟
۔ ہندی زبان کے بعد سرکاری طور پر اُردو کو علاقائی زبان تسلیم کیا جائے۔ سرکاری اداروں، عدالتوں اور ڈاک خانوں میں انگریزی اور ہندی کے ساتھ اُردو میں بھی کام ہو۔

---

**مس نکہت ملنی۔ کلکتہ**

۔ آپ مغربی تہذیب کے حامی ہیں یا مشرقی تہذیب کے؟
۔ ہم مشرقی تہذیب کے پرستار اور اس حقیقت کے قائل ہیں ــــــ

مشرق نورِ سحر کی وادی
مغرب ظلمتِ شب کا جنگل!

۔ چچا جان! کاغذ کا موجد کون ہے؟
۔ کاغذ بنانے کی مشین فرانس کے نکولس رابرٹ نے بنائی۔

---

**جمیل ملک۔ بحرین**

۔ کوئی حیات افروز شعر سنائیے۔
۔ سُنئے ؎

ہر ہر قدم پہ کتنے ستارے بکھر گئے
لیکن رہِ حیات ابھی کہکشاں نہیں

---

**نیاز احمد چھیپہ۔ ستارن**

س۔ انسان مختار ہے یا مجبور؟
ج۔ یہ سوال بہت نازک ہے۔ آپ کے اس سوال کے جواب میں ہم کہیں گے ؎

اللہ رے تیرے جبر کی دشوار نگاری
مختار لکھا ہے ہمیں مجبور بنا کر

س۔ انسانیت کا تقاضہ ... ؟
ج۔ جو انسان انسانیت کے تقاضے پورے نہیں کرتا وہ انسان نہیں ہے۔

س۔ آپ کا پورا نام؟
ج۔ حیرت ہے بہت سے لوگوں کی طرح آپ بھی ہمارے پورے نام کو ادھورا نام سمجھتے ہیں۔

---

**سید اعجاز احمد خاں۔ ہنمکنڈہ۔ دکن**

س۔ غم کو بھولنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟
ج۔ غم کو خوشی بنا لینا چاہیئے۔

---

**عبدالعزیز نادان۔ سرلوپرہ۔ کاغذ نگر۔ آندھرا**

س۔ بچوں کو شائستہ کس طرح بنایا جا سکتا ہے؟
ج۔ خود شائستہ بن کر!

س۔ انسان جھوٹ کب بولتا ہے؟
ج۔ جب یہ نہیں سمجھتا کہ ایک جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لئے سو جھوٹ بولنے پڑیں گے۔

س۔ جنت دولت سے حاصل ہو سکتی ہے یا نیک اعمال سے؟
ج۔ انسان دولت سے سب کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن جنت نیک اعمال ہی سے پا سکتا ہے۔

---

**محمد عزرائیل۔ پورنیہ**

س۔ ہمارے معاشرہ میں بڑھتی ہوئی بے حیائی کا ذمہ دار کون ہے۔ سینما، مرد، عورت یا موجودہ تعلیم؟
ج۔ ہمارے معاشرہ میں بڑھتی ہوئی بے حیائی کے ذمہ دار جدید تہذیب کے پرستار مرد ہیں۔

س۔ اپنا حق مانگنے سے نہ ملے تو کیا اُسے چھین لینا چاہیئے؟
ج۔ جی ہاں!

تیرگی اپنے مقدر کی مٹانے کے لئے
چھین کر چاند ستاروں سے اُجالا لے لو

س۔ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
اس کے ساتھ کا دوسرا مصرع کیا ہے اور یہ شعر کس کا ہے؟
ج۔ یہ غالب کے ایک شعر کا مصرع ہے۔ شعر یوں ہے ؎

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

س۔ انسان کو کبھی کبھی رونا چاہیئے یا نہیں؛ یعنی غم میں، دُکھ میں؟
ج۔ ماہرینِ نفسیات نے لکھا ہے کہ ہنسی کی طرح کبھی کبھی رونا بھی مفید ہوتا ہے۔

---

**مس سائرہ۔ علی گڑھ**

س۔ یہ خوبصورت شعر کس کا ہے ؎

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

ج۔ یہ خوبصورت شعر فیض کا ہے۔
س۔ اپنی پسند کا کوئی شعر سنائیے۔
ج۔ سُنئے ؎

محیطِ طوفاں کا خوف کھا کر میں کیوں کروں ناخدا کی خواہش
میں دور زلوں سے اپنی کشتی کا آپ ہی ناخدا رہا ہوں

---

ثریا پروین عباسی عباس خان۔ آفتاب کلکتہ

س۔ دُنیا کی سب سے حسین عورت کون ہے؟

ج۔ تاریخ قلوپطرہ کا نام بتاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے ؎

اک پرتوِ دلکش ہے خیالوں کے اثر کا
خود حُسن حقیقت نہیں دھوکا ہے نظر کا

س۔ مجھے رات میں نیند نہیں آتی؟

ج۔ آپ کو شب بیداری کی عظمت کا علم ہو گیا ہوگا۔

س۔ غالب کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

---

محمد بالا موسیٰ بی۔ مائینس (بہار)

س۔ کوئی زیادہ حساس ہو تو اُسے کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ کسی حد تک بے حس بننے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

س۔ میں نے انھیں بچپن سے جوانی تک بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ایک اچھے جیون ساتھی کے سارے اوصاف اُن میں ہیں۔ لیکن گھر والے بعض خاندانی جھگڑوں کے باعث اس رشتے کو منظور نہیں کرتے۔ بتایئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ گھر والوں کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ گھر والوں کو ناراض کر کے آپ خوشی نہیں پا سکتیں۔

---

یونس انور موسیٰ بی۔ مائنس

س۔ مرد کی سب سے بڑی خواہش؟

ج۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔

س۔ اولاد سے ماں زیادہ محبت کرتی ہے یا باپ؟

ج۔ ماں۔

---

سید غوث پاشا۔ آدونی (آندھرا)

س۔ نیکی کا چراغ؟

ج۔ نیکی کا چراغ وہ چراغ ہے جسے کوئی آندھی، کوئی طوفان نہیں بجھا سکتا! انسان کا سب سے بڑا فرض ہے دُنیا کے ظلمت کدے میں نیکی کا چراغ روشن کرنا!

س۔ بھیا! اُردو زبان کی ابتدائی تاریخ کیا ہے؟

ج۔ سرگوشیوں میں آپ کے اس سوال کا مفصل جواب کیسے دیا جا سکتا ہے۔ —— بقول "صاحب گلستانِ ہزار رنگ" برج بھاشا اُردو کی ماں ہے۔ اُردو کی بنیاد چودھویں صدی میں پڑی جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ ایک دوسرے مورخ نے لکھا ہے کہ اُردو کی بنیاد سترھویں صدی عیسوی میں اُس وقت پڑی جب ٹوڈرمل نے اکبر کے عہد میں مالگذاری کا قانون رائج کیا اور ہندی والوں کو فارسی سیکھنے کی ضرورت ہوئی۔ "تحقیق زبان ریختہ" کے مصنف نے لکھا ہے اُردو کی بنیاد شہاب الدین غوری کے حملے کے وقت پڑی۔

---

اشفاق اللہ اعظمی۔ اعظم گڑھ

س۔ داغ کس کے شاگرد تھے؟

ج۔ ذوق کے۔

---

اے۔ ایچ۔ خان جلیسری (ایٹہ)

س۔ خوشتر بھائی! کیا اب "بیسویں صدی" کی بزم میں کرشن چندر، ظفر پیامی، ظفر احمد نظامی، مخمور سعیدی شریک نہیں ہوتے؟

ج۔ "بیسویں صدی" کے ان فنکاروں کے دل "بیسویں صدی" سے دُور نہیں ہیں۔ یہ رگِ جاں کی طرح "بیسویں صدی" سے قریب ہیں اور ان میں سے کئی فنکاروں کو آپ اکثر "بیسویں صدی" کی بزم میں دیکھتے بھی ہیں۔

س۔ پروفیسر محمود الحسن چشتی کی نئی کتاب "نیم رات" آپ کے کتب خانہ میں ملے گی؟

ج۔ "بیسویں صدی" کے ادارہ سے آپ ہر فنکار کی کتابیں منگوا سکتے ہیں۔

س۔ شاد مرحوم کی کتاب "شاد اور اس کی شاعری" منگانے پر تین روپے قیمت کے علاوہ وی۔ پی کا خرچ بھی دینا ہوگا؟

ج۔ کسی ادارہ سے کتابیں منگائی جائیں تو وی۔ پی کا خرچ خریدار کے ذمہ لازمی طور پر ہوتا ہے۔

---

ثمینہ بانو۔ بریلی

س۔ یہ قول کس کا ہے —— عورت خوشبو، نغمہ، رقص اور روشنی کا مجموعہ ہے۔

ج۔ یہ قول شیکسپیئر کا ہے۔

---

شمیم اختر۔ الہ آباد

س۔ جگر مراد آبادی کا کوئی حیات افروز شعر سنایئے۔

ج۔ چلے ہو لئے زمانہ کبھی بجھا نہ سکے
قدم قدم پہ وہ اک شمعِ راہ پیدا کر

---

ششی کمار۔ نئی دہلی

س۔ امریکی گاندھی ڈاکٹر مارٹن لوتھر کو کب قتل کیا گیا؟

ج۔ اپریل ۱۹۶۸ء میں۔

---

**محمد یاسین [illegible]**

س۔ میں اپنی غزل بھیجوں، تو کیا آپ اسے "بیسویں صدی" میں اشاعت کا شرف بخشیں گے؟

ج۔ غزل "بیسویں صدی" کے معیار کی ہوگی تو شکریہ کے ساتھ شریکِ اشاعت کی جائے گی۔

س۔ انسان رو رو کے یکایک کب ہنستا ہے؟

ج۔ جب رونے کی انتہا ہو جاتی ہے۔ ایک مغربی مفکر نے کہا ہے — "خوشی غم ہی کا دوسرا روپ ہے"۔ ایک مشرقی شاعر نے کہا ہے ؎

مسرت کی تمنا ہے تو غم کی انتہا کر لے

---

**ایم نعیم پریشان۔ رانی گنج**

س۔ کیا ہر صبح انسان کی نئی زندگی ہوتی ہے؟

ج۔ جی ہاں، ہر صبح انسان کے لئے نئی زندگی کی نوید، حیاتِ تازہ کا پیام لے کر آتی ہے۔

س۔ اقبال کا کوئی اچھا سا شعر سنائیں۔

ج۔ اقبال کے سارے اشعار اچھے ہیں۔ ایک شعر سنئے ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

---

**این پیاسی۔ بھاگل پور**

س۔ خوشتر بھیا! سرمایہ دار ہم غریبوں کا خون کب تک چوستے رہیں گے؟

ج۔ دراصل دَور کی تقدیر ہے لیکن اے دوست صرف اک معرکۂ محنت و زر ہونے تک!

س۔ لوگ انسانیت کو کیوں بھولتے جا رہے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ انسان انسان نہ رہا ؎

آدمی آدمی کے پیکر میں
اور کچھ ہوگا آدمی نہ رہا

س۔ کیا شراب دل کی الجھن کو دُور کرتی ہے؟

ج۔ ایسا سمجھنا خود کو فریب دینا ہے۔ شراب کے متعلق بہت سے لوگ اِس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

---

**عابد انصاری کلچرم شریف۔ آندھرا**

س۔ شاد مرحوم کے والد کی موت کیسے ہوئی جس کے غم کی تاب نہ لا کر شاد نے جمنا میں ڈوب کر خودکشی کر لی؟

ج۔ شاد مرحوم کے والد شراب کے نشے میں یکایک گھر سے غائب ہو گئے۔ لاکھ پتہ لگانے پر بھی نہ ملے۔

س۔ شاد مرحوم کی بیوہ کے لئے آپ نے کچھ کیا ہے؟

ج۔ جو کچھ ہو سکا ہم نے کیا بلکہ اپنی ہمت سے زیادہ کیا۔ کاش! حالات دل کا ساتھ دیتے۔ کاش! ہم اُن کے لئے بہت کچھ کر سکتے!

س۔ وقت؟

ج۔ وقت کا ایک لمحہ ضائع نہ کیجئے۔ وقت ہی زندگی ہے!

---

**ایم فرحت بیگ۔ کانپور**

س۔ جس ملک میں غالب کی صد سالہ برسی منائی جائے اور اُن کی زبان اُردو کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے، وہاں اُردو کا مستقبل؟

ج۔ ؎ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

س۔ [illegible]

ج۔ دنیا [illegible]

---

**جمال شاہ۔ بیجاپور ۔ دھیا**

س۔ آزادی کا سب سے زیادہ فائدہ ہُوا؟ عوام کو، لیڈروں کو، سرمایہ داروں کو؟

ج۔ لیڈروں کو [illegible]

س۔ کوشش کے باوجود انسان [illegible] نہیں پاتا؟

ج۔ اِس لئے کہ ماضی کے نقوش [illegible] ہوتے ہیں۔

---

**عشرت سلطانہ۔ بھوپال**

س۔ بھائی جان! یہ شعر کس کا ہے ؎

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی [illegible]
تو اِس آنچل سے اِک پرچم بنا [illegible]

ج۔ یہ شعر اسرار الحق مجاز کا ہے۔






ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی — مطبوعہ [illegible] پرنٹنگ ورکس دہلی [illegible] — مقام اشاعت: دفتر بیسویں صدی [illegible]

BISWIN SADI

24th YEARS OF PUBLICATION

Telephones Office, 271637 Residence, 619027

بیسویں صدی دہلی
دسمبر
swin Sadi
DELH

زُلفوں میں مہکتی ہوئی شاموں کے دُھندلکے

عارِض پہ شفق رنگ سحر کھیل رہی ہے ——— مخمور سعیدی

فوٹو: شورنج این۔ شرما ہے

کس کے لئے آیا ہے لبوں پر یہ تبسم
اٹھی ہوئی یہ شوخ نظر کس کی طرف ہے ——— فارغ لکھنوی

فوٹو: سورج این. شرما ـ بھوپال

گذشتہ دنوں جےپور میں 'انجمنِ شعر و ادب' کے زیرِ اہتمام ہندوستان کے نامور اور باکمال غزل گو شاعر حضرتِ شکیل بدایونی مرحوم کی یاد "شامِ شکیل" کے نام سے منائی گئی۔ مقامی شعراء کے علاوہ ہندوستان کے مشاہیر شعرائے کرام نے شکیل مرحوم کی رُوح کو گُل ہائے عقیدت پیش کئے ـــــ جنابِ برکت اللہ خاں وزیرِ قانون راجستھان نے جو "شامِ شکیل" کے مہمانِ خصوصی تھے، اپنی تقریر میں فرمایا "اُردو اتحاد اور اعلیٰ ادبی قدروں کی علمبردار رہی ہے۔ زمانہ لاکھ کوشش کرے، نہ اُردو مٹی ہے نہ مِٹ سکے گی۔ یہ زندہ زبان ہے، یہ زندہ رہنے کے لئے بنی ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی" کو
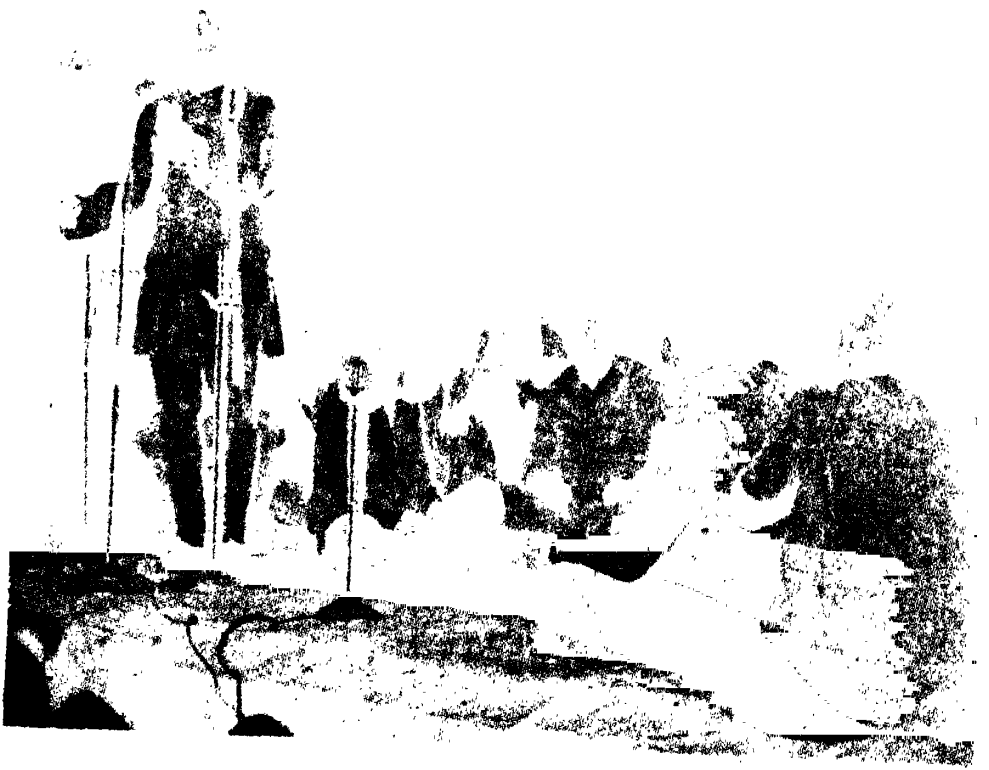
ناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اپنے مخصوص انداز میں نغمہ سرا ہیں

فکرِ دُنیا بھی نہیں ہے، غمِ عقبیٰ بھی نہیں
اس سے تسکیں ہو میسر مجھے ایسا بھی نہیں

وائے وہ عالمِ بے کیف کہ جس عالم میں
ہم تماشہ بھی نہیں محوِ تماشا بھی نہیں

سعیِ اخفائے محبت کی بھی حد ہوتی ہے
ایسے بیٹھے ہیں کہ جیسے مجھے دیکھا بھی نہیں

یہ بجا ترکِ تمنّا سے سکوں ملتا ہے
اس قدر سہل مگر ترکِ تمنّا بھی نہیں

بارِ خاطر ہیں تو محفل سے چلے جاتے ہیں
ہم تماشائی نہیں ہیں، تو تماشا بھی نہیں

راہی بلند شہری نے حضرتِ شکیل مرحوم کو اپنی نظم میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ؎

حاملِ طالعِ بیدار نہیں مر سکتا
طالبِ جلوۂ انوار نہیں مر سکتا
کشتۂ حسرتِ دیدار نہیں مر سکتا
قیدیِ گیسوئے خمدار نہیں مر سکتا
زیرِ شمشیر و سرِ دار نہیں مر سکتا
موت کے وار سے فنکار نہیں مر سکتا

جس کے افکار میں رخشندہ پیاماتِ جمیل
جس کے اشعار میں تابندہ خیالاتِ شکیل
جس کی گفتار میں رقصندہ ہوں جذباتِ جلیل
جس کے کردار سے ثابت ہو یہ قول اور یہ دلیل
صاحبِ عظمت و کردار نہیں مر سکتا
موت کے وار سے فنکار نہیں مر سکتا

برقِ احساس کڑکنے کی صدا سنتا ہو
شیشۂ دل کے کھنکنے کی صدا سنتا ہو
وہ جو غنچوں کے چٹکنے کی صدا سنتا ہو
دلِ فطرت کے دھڑکنے کی صدا سنتا ہو
ایسا فطرت کا پرستار نہیں مر سکتا
موت کے وار سے فنکار نہیں مر سکتا

جس کا ہر شعر ہر اِک دل کی صدا بن جائے
جس کا ہر لفظ اِک آئینِ وفا بن جائے
جس کا ہر اشکِ حزیں آبِ بقا بن جائے
جس کا ہر نقشِ قدم راہ نما بن جائے
کبھی وہ قافلہ سالار نہیں مر سکتا
موت کے وار سے فنکار نہیں مر سکتا

یہ پرچہ ماہنامہ ہوگا جس کی قیمت دو روپے فی پرچہ ہوگی۔

ٹیلیفون دفتر — ۲۸۱۶۴۳

ٹیلیفون رہائش — ۶۱۹۹۴۲

## و نشتر

**نوشتر گرامی**

"برطانیہ میں بیکاروں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے" ایک خبر
۔ برطانیہ والے ہندوستان سے سبق لیں۔ اُن سب کو سیاسی لیڈر
بدو رجنوں سیاسی جماعتیں بنا ڈالیں۔

---

"دلی کانگریس میں کوئی اختلاف نہیں" ایک خبر ـــــ صرف عہدوں
ہے۔ ورنہ سب اندرا گاندھی کی چھتری تلے جمع ہیں۔

---

"مدھیہ پردیش کے وزیر چند برسوں میں بڑے بڑے جاگیردار
ایک خبر ـــــ تو کیا صدیاں لگتیں؟

---

"مالیہ ادا نہ کرنے پر زمین قرق کی جائے گی" ایک خبر ـــــ لیکن
ایسی وزیر کا لڑکا، سالا، بہنوئی، بھتیجہ یا بھانجہ ہے تو پھر اُس کی طرف
اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔

---

"ڈیم ٹوٹنے پر ہزاروں چینی ہلاک" ـــــ ہمارے یہاں سے
اپنی منگالیں۔

---

"ہندوستان کا نمبر اول" ایک عنوان ـــــ کس چیز

۱۔ لیڈر پیدا کرنے میں۔
۲۔ عہدوں کی بھوک میں۔
۳۔ اقتدار کی رسہ کشی میں۔
۴۔ رشوت خوری اور رشوت رسانی میں۔
۵۔ تخریبی کارروائیوں میں۔
۶۔ دل بدلی میں۔
۷۔ چوری، ڈکیتی میں، بدمعاشی میں۔

"میرے وزارت میں شمولیت کی افواہیں بے بنیاد ہیں" چرن سنگھ
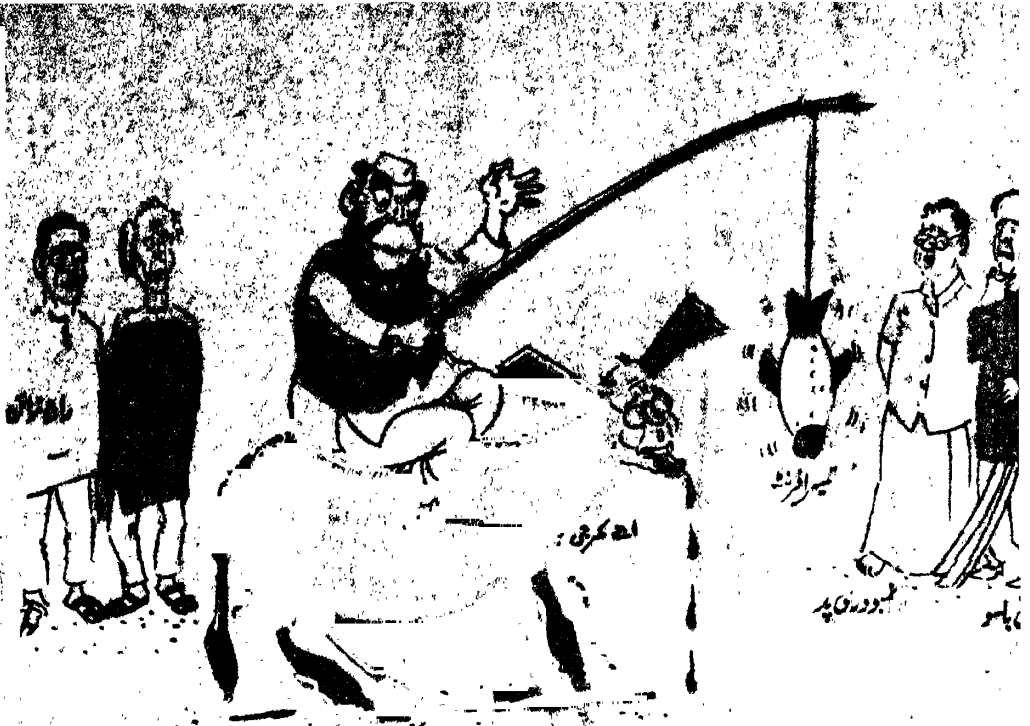
"اجے مکرجی بنگال میں تیسرا جمہوری محاذ بننے کے بارے میں پُرامید" ایک خبر

---

"جن سنگھ فرقہ پرست جماعت نہیں ہے" مُرارجی ڈیسائی ——
…سے اُس نے مُرارجی ڈیسائی کے سنڈیکیٹ سے گٹھ جوڑ کیا ہے۔

---

• پاکستان میں تعلیم یافتہ صرف چار فیصدی" ایک خبر —— آج کل وہاں
…ی زیادہ توجہ پارٹی سازی اور لیڈر گری پر ہے۔

---

• پنجاب کے ایک وزیر کی لڑکی کی شادی پر لاکھوں کے تحفے" ایک خبر
—— اکالی وزیر کے اِس کارنامے پر سنت فتح سنگھ کو مُبارکباد۔

---

• انتخاب کے بعد پتھراؤ کی مہم" ایک خبر —— ہارنے والی پارٹی کا
…وچھا ہتھیار۔

---

• دُنیا کو سب سے بڑا خطرہ ایٹمی ہتھیاروں سے ہے" صدر گری کا انتباہ
—— مگر ہندوستان باقی دُنیا سے الگ ہے اسے غیر فرقہ پرست لیڈروں سے خطرہ ہے۔

---

• طلباء گرفتار" ایک خبر ——

۱۔ بسوں میں بغیر ٹکٹ چلنے پر۔
۲۔ پولیس پر پتھراؤ کرنے پر۔
۳۔ کالج میں ہڑتال کرنے پر۔
۴۔ اُستاد کی داڑھی اکھاڑنے پر۔
۵۔ اسکول، کالج کو آگ لگانے پر۔
۶۔ آوارہ گردی کرنے پر۔

---

• ملک میں امن و قانون کا کوئی احترام نہیں" آچاریہ کرپلانی ——
یہ بات اُن اپوزیشن پارٹیوں کو سمجھانا چاہئے جن کی آپ اکثر رہنمائی فرماتے ہیں اور …
قانون کی دھجیاں اُڑاتی ہیں۔

---

"پاکستان سے بات چیت کی پیشکش پر جن سنگھ کو اعتراض" ——
پاکستان سے لڑائی چھڑنے کی بات پر اُسے خوشی حاصل ہوتی۔

---

امرتسر میں مرارجی کا سواگت۔ اندرا گاندھی زندہ باد کے نعرے۔

• [illegible] ایک خبر — کیا خواب آور گولیاں کھائی تھیں؟

---

• بنگال کا سیاسی بحران۔ ایک عنوان — لیڈروں کی بھیانک [illegible] کی بدولت۔

---

• ایک نئی عالمی جنگ کا خطرہ۔ چینی لیڈر کا بیان — چوری اور سینہ زوری۔ خود خطرہ پیدا کریں اور خود ہی شور مچائیں۔

---

• مسٹر گری کے دورۂ روس سے ہند اور روس کے تعلقات اور مضبوط ہو گئے۔ ایک خبر — امریکی اور چینیوں کے سینے پر سانپ لوٹ گئے۔

---

• آل انڈیا ریڈیو کے خلاف مقدمہ۔ ایس۔ ایس۔ پی کا نیا شغل — راشٹرپتی کے خلاف مقدمے کی کوشش میں ناکامی کے بعد ایس۔ ایس۔ پی کا نیا شغل ہے

بیکار مباش کچھ کیا کر

---

• لیڈر کہاں ہیں؟ ایک عنوان — سب لیڈر ہیں، یہاں جنتا کوئی نہیں۔

---

• مسلم لیگ کے متعلق وضاحت کیجئے۔ مسز اندرا گاندھی سے مطالبہ — وہ پہلے وضاحت کر چکی ہیں۔ ان کے پاس دو عینکیں ہیں۔ کیرالا جاتی تو دیکھتی ہیں مسلم لیگ فرقہ پرست نہیں۔ شمال میں آنے کے بعد دوسری عینک لگا لیا تو یہاں کی مسلم لیگ فرقہ پرست نظر آتی ہے۔

---

• گوالیار میں جیب کٹ گئی۔ ایک خبر — غنیمت ہے کوٹ باقی رہ گیا۔

---

• وزیر اعظم اسرائیل کی ضد۔ ایک عنوان — ضد نہیں، ہٹ دھرمی۔

---
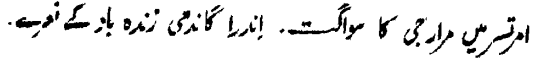
ماسکو میں اندرا گاندھی بات چیت

---

"شیوسینا کے لئے قانون زیر غور" ——— اسے ہندوستانی سماج میں باعزت مقام دینے کے لئے۔

---

"بے ٹکٹ مسافروں کے خلاف مہم" ایک خبر ——— ریلوے کا اپ گریڈ کرنے کے لئے یا بالائی آمدنی کی خاطر۔

---

"دلی کے کانگرسیوں میں بے چینی" ایک عنوان ——— میونسپل کارپوریشن کے ٹکٹوں کے لئے۔

---

"ہمیں زندہ رہنے کے لئے ہند پاک تعلقات بہتر کرنے ہوں گے" ڈھاکہ یونیورسٹی کے ——— کا بیان ——— بات تو خدا لگتی کہی ہے۔ مگر یہاں کے ——— اور وہاں کے بھٹوؤں کی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔

---

"چین کی قید سے رہائی" ایک خبر ——— مگر قید ہستی سے رہائی کے بعد۔

---

"حکمراں کانگریس اور پنجاب میں اکالی دل کے تعلقات میں کشیدگی" ایک خبر ——— اس لئے کہ اکالی پارٹی "دوستی اور پارٹی" جلدی جلدی بدلتے رہنا چاہتے ہیں۔

---

"سندھی رسم الخط کے لئے زبردست خطرہ" ایک خبر ——— اس مصیبت میں اردو والے بھی مبتلا ہیں۔ اس لئے ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

---

"جن سنگھ کا بنسی لال کو چیلنج" ایک عنوان ——— 
نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو

---

"یوپی کے بیسک اسکولوں کے لئے ہندی، اردو کتابیں" ایک عنوان ——— اصل مسئلہ تو ہندی کا ہے۔ اردو کا تو ویسے ہی جوڑ ملا لیا ہے۔

---

"پٹنہ کے ہسپتال میں بجلی غائب" ایک خبر —— مگر دیہات کے ہسپتال کے عوام اطمینان رکھیں اور ... کیونکہ دیہاتی ہسپتالوں میں ہمیشہ "چراغ گل پگڑی غائب" والا معاملہ ہوتا ہے۔

---

"سانپ کو سر اٹھانے سے پہلے کچل دیا جائے" ایک عنوان —— نہ کہ آر۔ ایس۔ ایس، شیوسینا اور مسلم لیگ کی طرح پنپنے دیا جائے۔

---

"اُردو کا دیوناگری رسم الخط استعمال کرنے کی تجویز" ایک عنوان —— بزدلی، چاپلوسی، کوتاہ نظری اور اپنی زبان سے دشمنی کی تجویز جو اُردو دشمن ہی پیش کر سکتے ہیں۔

---

"قومی جسمانی صحت مندی سے متعلق جدید کورس" —— منتقی ہے یا نہ کی۔

---

"ہیجڑوں کا دھرنا" ایک خبر —— یہی ایک کسر باقی تھی۔

---

"پہلوان چند گی رام ہریانہ سپورٹس کونسل میں" ایک خبر —— کونسل کو داؤ پیچ سکھانے کے لئے۔

---

"ہمیں انتظار کرنا چاہئے" ایک عنوان —— جب تک تباہی ہمیں سر سے پاؤں تک اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔

---

"ہندو پاکستان جانے کے لئے ہیضے کا سرٹیفکیٹ لے کر جائیں" ایک خبر —— تاکہ وہاں بے فکری سے مرغ و ماہی کی دعوتیں اُڑا سکیں۔

---

"بددیانت لوگ وزیر داخلہ سے زیادہ طاقتور" سابق وزیر داخلہ گلزاری لال نندہ کا بیان —— اپنی بزدلی کا کھلا اعتراف۔

---

"ریجی کے جلسے میں گڑبڑ" ایک خبر —— مسز اندرا گاندھی کے خلاف زبان درازی کی ہوگی۔

---

"پنجاب میں کولیشن منسٹری بناؤ یا اکالیوں کی حمایت ختم کرو" کانگریسیوں کا مطالبہ۔

# چرن سنگھ

خوشتر گرامی

*لمبوتر لٹکے گالوں جیسا بادامی چہرہ۔ بڑی بڑی آنکھیں جو بھوؤں سے دوہری بن جھانکتی ہے۔ کشادہ پیشانی سیاسی سیاہ کاریوں کا آئینہ۔ بار بار کٹنے کے باوجود اونچی ناک اس پر مونچھوں کی سیاہ پٹی۔ جس انسانی ڈھانچے کا یہ حلیہ ہو اسے سمجھو ———*

*چرن سنگھ*

قلابازیوں میں ماہر، دَل بدلوؤں کے اُستاد۔ نہ قول نہ فعل جہاں ملے چیف منسٹری کا تو اپرات وہیں گزاریں ساری رات۔ سی۔بی۔گپتا کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر یو۔پی کے چیف منسٹری کے سنگھاسن پر قبضہ کیا تھا۔ مگر زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ اُسی گپتا کے قدموں میں آگرے اور پھر نہ وزارت رہی نہ حکومت۔ جس کے لئے سوشلسٹ بن کر ایس۔ایس۔پی سے سانٹھ کر لیتے ہیں۔ جن سنگھیوں کے آگے کاسۂ گدائی لے کر پہنچ جاتے ہیں۔ سوتنتریوں کے تلوے چاٹ لیتے ہیں۔ سنڈیکیٹیوں کے بندۂ بے دام بن جاتے ہیں اور اُس کو نام دیتے ہیں 'بھارتیہ کرانتی' کا۔ کرانتی کاری تو تھے ہی نہیں۔ اب 'بھارتیہ' کہے جاسکتے ہیں۔ کبھی کانگریسی تھے۔ مگر اب سوشلسٹوں سے واسطہ پڑا تو کرانتی کا لیبل دکھلاتے ہیں۔ جن سنگھیوں سے کام پڑے تو بھارتیہ کی کھونٹی میں لٹکا لیتے ہیں۔ سنڈیکیٹ کو آولب بھا رہے ہوں تو اندرا کے خلاف زبان درازی کرنے سے نہیں چوکتے۔ اوپر سے کھدر کے چٹے اجلے کپڑے جن کے اندر چھپا ہوا ایک میلا دل رکھتے ہیں۔ انہیں دیکھ کبیرا رو دیتے ہیں ؎

تن اُجلا من کا جلا بگلے کا سا بھیک
ان سے تو کاگا بھلا جو باہر بھیتر ایک

افسانہ

# ایک چراغِ رہ گذر!

مسز فریدہ زین ایم۔ اے

معرفت ایم۔ زین العابدین سعید ایڈووکیٹ۔ ڈاکخانہ بھونگیر ضلع نلگنڈہ (اے۔ پی)

محترمی خورشید بھیا! سلام احترام

...اس بار "بیسویں صدی" کی بزم میں "ایک چراغِ رہ گذر" لے کر آئی ہوں تاکہ کوئی اس کے سہارے راہ ڈھونڈ لے —— "زخموں کے پھول" کی اشاعت پر ابھی تک خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ بیرونِ ملک کے خطوط کی تعداد زیادہ ہے جس سے "بیسویں صدی" کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جن قارئین نے میرے افسانے کو سراہا انھیں دل کی گہرائیوں سے شکریہ پیش کرتی ہوں۔

خلوص و ادب کے ساتھ

مسز فریدہ زین

"شہاب بھیا آگئے! شہاب بھیا آگئے!" گھر کے سارے بچے غل مچا رہے تھے۔

"ارے شہاب تم!" اسلم نے اُسے بھینچ لیا۔

"ہلو! مائی ڈیر بھیا! آہا تو پورے پچیس سال کے نوجوان معلوم ہو رہے ہو! سو اسمارٹ لُکنگ مَین۔۔" شہاب نے اسلم کو گود ہی میں لے لیا۔

"ارے رے۔۔ یہ کیا کرتے ہو؟ میں جانتا ہوں تم فوجی آدمی ہو۔ دیکھو تمھاری بھابی آ رہی ہیں۔" اسلم نے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا۔

"کہاں ہیں وہ ——؟ شادی بھی کر لی آپ نے اور ہمیں محروم رکھا بھابی کے دیدار سے؟ بلایئے نا!" شہاب نے اسلم کو گود سے اتار دیا۔

"ان سے ملو دیبا! یہی شہاب ہے میرا چچازاد بھائی! اگر یوں سمجھو اپنوں سے بڑھ کر ہے! جب اس نے آنکھ کھولی تو میری ہی انگلی تھام کر چلنا سیکھا —— اور مسٹر شہاب یہ ہیں آپ کی بھابی مسز دیبا اسلم!" اسلم نے تعارف کرایا۔

"تسلیمات!" شہاب قدرے جھک گیا۔

"بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر!" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"لیکن مجھے خوشی کے ساتھ دکھ بھی ہوا ہے۔" شہاب نے کہا۔

"وہ کیوں ——؟" اسلم پائپ صاف کرتے ہوئے بولا۔

"اس لئے کہ مجھے آپ دونوں کا جوڑا پسند نہیں آیا۔" وہ منہ سکوڑ کر بولا۔

"[illegible] —— کیا معنی؟" اسلم نے سٹپٹا کر سوال کیا۔

"مطلب یہ کہ اندھیرا اور اُجالا کبھی ساتھ چلتے ہیں؟ دیبا بھابی تو چاند کا اُجالا ہیں! وہ اُجالا آپ کے ماتھے پر کیوں چمک اٹھا۔ آپ کے لئے کوئی کالی کلوٹی موزوں ہوتی۔" اس نے کہا۔

"شریر کہیں کا!" اسلم کے قہقہے ابلتے رہے۔ دیبا سر جھکائے کھڑی رہی۔

یہ تھی دیبا اور شہاب کی پہلی ملاقات! شہاب اسلم کا چچازاد بھائی تھا۔ ان کا مشترکہ گھرانہ تھا۔ شہاب کے باپ کے انتقال کے بعد اسلم نے اُسے اپنے بیٹے کی طرح پالا۔ وہ بچپن ہی سے چلبلا تھا۔ سارا دن چھوٹی سی بندوق اٹھائے چڑیوں کا شکار کرتا پھرتا۔ بچپن کی اس عادت نے جوانی میں اُسے ایک اچھا کیپٹن بنا دیا تھا۔ کبھی چھٹیوں میں وہ گھر آ جاتا تو قیامت آ جاتی۔ بچے، بوڑھے سبھی اس سے پناہ مانگتے۔ اس کی نت نئی شرارتیں لوگوں کو بے حد بھاتی تھیں۔ جب تک وہ رہتا گھر کے سارے افراد سمجھتے میدانِ جنگ کے سارے بم یہیں پھٹ پڑے ہیں! شہاب سارے گھر کے لئے ہنسی کا طوفان اپنے ساتھ لاتا۔ اسلم کی شادی میں وہ شریک نہ ہو سکا تھا۔ اس زمانے میں وہ نیفا کی سرحدوں پر اپنے ملک کا محافظ بنا کھڑا تھا۔ اب ایک سال بعد اسے چھٹی ملی اور وہ گھر والوں سے ملنے آ گیا۔

دیبا اپنے کمرے میں بیٹھی اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ بے پناہ

"آنکھوں میں نمی سی ہے چپ چاپ سے بیٹھے ہیں
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے"

اُس نے آتے ہی یہ شعر پڑھا۔

"اوہ تم ——— بابا آؤ شہاب!" گالوں کو چومتی ہوئی شریر لٹ کو ہٹا کر دیبا نے کہا ———

"بن گئی ناگ ——— کالی گھٹا
زُلف کو جب سنوارا گیا"

شہاب نے دیبا کی زلفوں کو دیکھ کر کہا۔

"کہو کیا بات ہے؟" دیبا نے سوال کیا۔

"تم مخاطب بھی ہو، قریب بھی ہو!
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں"

شہاب شاعری کے مُوڈ میں تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔" دیبا کے موتی جیسے دانت چمک اُٹھے۔

"ہاں بھابی! کوئی حسین شے جب سامنے آجاتی ہے تو شاعر اپنے تصوّر کو اشعار کا جامہ پہناتا ہے، مصوّر رنگوں سے قوسِ قزح بنانے پر اُتر آتا ہے، قلمکار کاغذ کے صفحے سیاہ کر دیتا ہے اور ایک عام انسان صرف دیکھتا ہے۔ قُدرت کی صنّاعی کی دل ہی دل میں داد دیتا ہے۔ لیکن میں نے اشعار کا سہارا لیا ہے۔ پتہ نہیں کیا بات ہے آپ کو دیکھ کر بار بار شعر کہنے کو جی چاہتا ہے۔" شہاب نے کہا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ تم کتنے دن کی چھٹی پر آئے ہو؟"

"آپ کہیں تو عُمر بھر کی لے لوں!" وہ اُس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے بولا۔ دیبا جھینپ گئی۔

"اچھا یہ تو بتائیے آپ کہاں پیدا ہوئیں؟" شہاب نے غیر متوقع سوال کیا۔

"دِلّی میں ——— کیوں ———؟" اُس نے پُوچھا۔

"آپ غلط کہہ رہی ہیں۔ دِلّی میں اور حُسن کا ایسا نمونہ ——— ناممکن! یہ جو آپ کی آنکھیں ہیں نا! ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے بجلی سے تڑپ اور ستاروں سے چمک مانگ لائی ہیں۔ زُلفوں میں گھٹاؤں کی سیاہی سمٹ آئی ہے۔ ابرو ہلال کو شرمندہ کرتے ہیں۔ ہونٹوں کی دلکشی میں نہ جانے کتنے پھولوں کا رس سمویا ہُوا ہے۔ گردن شاخِ گُل کی طرح جھکی ہوئی۔ پلکوں کی چلمن سُورج کی کرنوں کو شرمندہ کرتی ہے۔ جب آپ پہ جھپکتی ہیں تو شبنم کی طرح چھنے کی [illegible] آنکھوں میں سمندر جیسی گہرائی ہے۔ اُن تیز نظروں کی تاب کوئی نہیں لاسکتا۔ پھر آپ دِلّی کی رہنے والی کیسے ہوئیں۔ آپ تو آسمان سے اُتری ہیں!" شہاب نے بے جھجک کہہ دیا۔

"تم بہت باتُونی ہو!" دیبا اُٹھ کر اندر چلی گئی۔

اُس کے کانوں میں بہت دیر تک شہاب کے جُملے گونجتے رہے۔ وہ سوچنے لگی، اُس نے ایسا کیوں کہا ———؟ اِن باتوں کا مطلب کیا ہے؟ کہیں وہ مجھ سے محبت تو نہیں کرتا ———؟ نہیں نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اُس کی بھابی ہوں۔ میں اسلم کی ہوں۔ اسلم کا بڑھاپا مجھے اُن سے کبھی دُور نہیں کر سکتا۔ اُن کے بچّے میرے بچّے ہیں۔ چچی نے مجھے اسلم سے بیاہ دیا۔ ہو سکتا ہے میری قسمت میں اُنہی کا ساتھ ہو گا۔ میں اسلم کی ہوں، اُس دیوتا کی جس کے قدموں میں مجھے پیار کے انمول موتی ملے۔ اُس کا سر اسلم کی تصویر کے آگے جُھک گیا۔

"اسلم میرے دیوتا!"

"اچھا تو پُوجا ہو رہی ہے بھیّا کی ———؟" شہاب کی آواز آئی۔

"نہیں تو ———" دیبا نے آنچل کو لپیٹ کر کہا۔

"دیبا بھابی! ایک بات کہوں بُرا تو نہ مانئے گا؟" شہاب نے کہا۔

"کہو ———" دیبا کرسی پر بیٹھ کر بولی۔

"مجھے آپ عام عورتوں سے الگ نظر آتی ہیں!"

"وہ کیوں ———؟" اُس نے حیرت سے سوال کیا۔

"اِس لئے کہ آپ میں وہ عام باتیں نہیں جو عام عورتوں میں ہوتی ہیں۔"

"عام باتیں کیا ہوتی ہیں شہاب؟ تم تو پاگل ہو۔" دیبا ہنس پڑی۔

"دیبا بھابی! آپ مجھے متضاد جذبوں کی حامل نظر آتی ہیں۔ کبھی آپ کی آنکھوں میں بے پناہ پیار ملتا ہے، کبھی کوئی تڑپ، کبھی کوئی پیاس، کبھی سنجیدگی۔ کبھی آپ کا انداز نوجوانوں کا سا نظر آتا ہے، کبھی آپ کو دیکھ کر مامتا کے جذبے کی تصدیق ہوتی ہے۔ بھیّا آپ سے کافی بڑے ہیں۔ پھر آپ کے ننھے ننھے سوتیلے بچّے بھی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسی لڑکی اِس گھر کی بہو کیسے بن گئی؟ بھیّا نے بچّوں کی خاطر شادی کی۔ مگر آپ کے سرپرستوں نے بھیّا سے آپ کو کیسے بیاہ دیا۔ میں دیکھتا ہوں صبح سے شام تک آپ گھر والوں کو پیار بانٹتی ہیں، محبّت کے تحفے دیتی ہیں، خلوص کے پھولوں سے سب کے دامن بھرتی ہیں۔ اِس کے بدلے آپ کو کیا ملتا ہے؟ کچھ نہیں! آپ کی عمر تو ابھی صرف اٹکھیلیوں کی تھی۔ لیکن اِس عمر میں آپ کی سنجیدگی مجھے بھی خوفزدہ کر دیتی ہے۔" شہاب کسی گہرائی میں ڈوب کر کہہ رہا تھا۔

"[illegible] کہ یہ اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے؟ میں گھر میں سب سے بڑی [illegible] بھیا اس گھر کے ذمہ دار فرد ہیں۔ میں اُن کی شریکِ زندگی ہوں۔ میرا فرض یہی تو ہے کہ ہر قدم اُن کے قدم سے ملا کر چلوں۔" دیبا نے کہا۔

"نہیں بھابی! آپ خود کو دھوکا دے رہی ہیں۔ آپ نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے ورنہ آپ کے سن و سال کی کوئی عورت ایسے ماحول میں اتنی خوش نہیں رہ سکتی۔"

"تمہارا خیال غلط ہے شہاب! خوشی کا جذبہ صرف ماحول سے نہیں پیدا ہوتا۔ یہ وہ جذبہ ہے جو ہر لمحہ، ہر پل ہمارے دل میں دھڑکتا رہتا ہے اور موقع کا متلاشی ہوتا ہے۔ محبت سن و سال، شکل و صورت کی محتاج نہیں۔ پیار کا دھارا کسی کے بھی دامن میں گر سکتا ہے، کوئی بھی اس امرت کو پی سکتا ہے۔ شرط صرف ظرف کی ہے۔ تم سمجھتے ہو میں اپنی زندگی سے خوش نہیں۔ یہ تمہارا خیال ہے۔ اس جگہ آکر تو میں نے جینا سیکھا۔ بھلا جہاں زندگی ملتی ہے۔ اس در پر آکر کوئی ہوائی نا اُمید اور مایوس بھی رہتا ہے۔ اسلم مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ یہی میرے لئے سب کچھ ہے۔ میرے سارے جذبات اُن کی محبت ہی کے محور پر گردش کرتے ہیں۔" دیبا نے سنجیدگی سے کہا۔

"محبت کا جذبہ تو ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے، دیکھیں گے کہ ہمارا جذبہ ہمیں کس محور پر لے جائے گا۔" شہاب اتنا کہہ کر چلا گیا۔

دیبا دن رات شہاب کی باتوں سے اُلجھی رہنے لگی۔ اُس کے خیالات کے سمندر میں طوفان برپا تھا۔ یہ سچ تھا کہ اُس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا، وقت کو مرہم جانا۔ اسلم کو محبت کے بدلے محبت دی، خدمت دی۔ اُس کے بچوں پر اپنی ممتا کے پھول نچھاور کر دئے۔ زندگی کو وقت کے ساتھ چلنا سکھا دیا مگر آج شہاب کی باتوں نے اُس کے زخموں کو کُرید دیا تھا۔ وہ سسک پڑی۔

---

آج صبح ہی سے پکنک پر جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں شہاب پیش پیش تھا۔ بچے تیار ہو رہے تھے۔ پکوان کی چیزیں قرینے سے رکھی جا رہی تھیں۔ شہاب کو گھر سے نکلنے کی جلدی تھی۔ وہ سیدھے دیبا کے کمرے میں چلا آیا۔ اسلم تیار ہو کر باہر نکل چکا تھا۔

"اوہ بھابی پلیز جلدی کیجئے نا!" وہ اندر داخل ہو کر کہنے لگا اور دُوسرے ہی پل ٹھٹک کر رہ گیا۔ دیبا نارنجی رنگ کی ساڑی میں ملبوس تھی۔ وہ ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے گُلاب کی پنکھڑی شبنم سے بھیگ گئی ہو۔

"آج شام سورج غروب نہ ہوگا!" شہاب نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں بھلا ——؟" دیبا نے مُڑ کر کہا۔

"اس کے شفق کی ساری سُرخی تو آپ نے لے لی! پھر بھلا وہ شرمندہ نہ ہو جائے گا۔" وہ بولا۔

"تم بہت شریر ہو!" وہ ہنس پڑی۔

"کاش میں اچھا بھی ہوتا!" اُس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"کس نے کہا تم بُرے ہو۔ تم بہت اچھے ہو شہاب!" دیبا نے کہا۔

"شکریہ! بڑے نصیب کہ ہم اچھوں میں شمار کئے جانے لگے بھابی! سچ تو یہ ہے کہ میں بہت بُرا ہوں۔ آپ کی زبان سے آج یہ سن کر اچھا ہو گیا۔" اُس نے بہت ہی دلآویز انداز میں کہا۔

"پاگل! —— چلو چلیں۔" وہ باہر نکل پڑے۔

قدرت کی کائنات کی رنگینیاں جوان قہقہوں سے اور زیادہ نکھر آئیں۔ اسلم، دیبا اور شہاب تاش اور کیرم سے دل بہلاتے رہے۔ دیبا کی جتنی تصویریں آسکتی تھیں شہاب نے اپنے کیمرے سے لے لیں۔ وقت گزر گیا، شام ڈھلنے کو آئی اور یہ حسین قافلہ اپنی منزل پر واپس آگیا۔

دُوسرے دن سویرے ہی اسلم کو دَورہ پر جانا تھا اور وہ کہہ رہا تھا آج نہ جائے گا کیونکہ دیبا کی سالگرہ تھی۔ دیبا نے اُسے سمجھایا کہ ایک بار سالگرہ نہ ہو سکی تو کیا ہُوا وہ اپنے فرض سے کوتاہی نہ کرے، فوراً بمبئی چلا جائے۔ اسلم بمشکل تمام تیار ہُوا۔ دیبا سے رُخصت ہوتے ہوئے اُس نے دو آنسو اُس کے ہاتھوں پر گرا دئے اور کہا۔

"دیبا! اِس بار تمہیں تحفے میں دو آنسو دے رہا ہوں۔ لیکن تم انھیں آنسو نہ سمجھو، یہ پیار کے موتی ہیں! بمبئی سے واپس آتے ہوئے تمہارے لئے موتیوں کا خوبصورت نیکلس لیتا آؤں گا۔ تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو نا! تمہاری قسم دیبا! میں اتنا کم ظرف تو نہ تھا کہ اپنی خوشی کے لئے کسی حسین لڑکی سے بیاہ کر لوں۔ میں جانتا ہوں تمہارے سپنوں کا تاج محل مجھ سے ملنے کے بعد ٹوٹ کر گر گیا۔ دیبا! پتہ نہیں تمہارے چچا نے تم پر ظلم کیا ہے یا مجھ پر! بخدا میں نے تو ان معصوم بچوں کی خاطر شادی کی تھی جو ماں کے پیار کو ترس رہے تھے۔ تمہارے چچا نے کہا تھا کہ اُن کے گھر میں کوئی غریب لڑکی رہتی ہے میں نے ہاں کہہ دی۔ اگر تمہیں دیکھ لیتا تو شاید کبھی تم پر ایسا ظلم نہ ہونے دیتا۔ دیبا! نہ جانے کیوں تمہیں دیکھ کر مجھے دُکھ ہو رہا ہے!" اسلم کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

"یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے بیٹھے بٹھائے میں کبھی حرفِ شکوہ زبان پر نہ لائی۔

"آپ ... کے جو ... میں ... کیسے بھول سکتی ہوں میں ... کہتی ہوں ... تو میں نے ... آپ نے ایسا کیوں سوچا، ایسا کیوں سوچا؟" وہ [illegible] سے ... گئی۔

اسلم رخصت ہو گیا۔

اُسی شام شہاب نے ایک پیکٹ دیبا کے ہاتھ میں تھما دیا۔
"یہ لیجئے بہن کر دکھائیے ـــــ" اس نے کہا۔
"یہ کیا ہے شہاب؟" دیبا نے کہا۔
"التجا! گذارش! التماس! درخواست!! اور کچھ کہوں بھابی؟" وہ ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا تھا۔

دیبا نے پیکٹ کھولا۔ اُس میں ایک ساڑی تھی گہرے آسمانی رنگ کی، جس پر دُور دُور پر ستارے چمک رہے تھے۔ دیبا نے ساڑھی باندھی، بال سنوارے اور باہر نکل آئی۔

"میں یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ آسمان پر چمکتے ستاروں کے درمیان یہ ماہتاب کیسے جگمگاتا ہے۔ اِسی لئے میں نے اِس جھوٹے آسمان پر یہ جھوٹے ستارے ٹنکوائے، لیکن اِس حقیقی چاند کے دامن پر سج کر وہ اور بھی کھِل گیا۔ زمین کے اِس چاند کے آگے آسمان کا چاند اپنی آب و تاب کھو بیٹھے گا۔" شہاب نے کہا۔
"بناتے کیوں ہو شہاب مجھے ـــــ!" دیبا نے کہا۔
"میری باتوں پر اعتماد کیجئے، میں مبالغہ نہیں کر رہا ہوں، میری زندگی میں آپ پہلی عورت ہیں جس نے مجھے اِتنا متاثر کیا۔ مم . . . میں . . . آپ سے" شہاب رُک گیا۔
"کہو رُک کیوں گئے ـــــ؟" دیبا نے کہا۔
"مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے!" وہ بولا۔
"تو اِس میں اِتنا گھبرانے کی کیا بات ہے؟ بزدل! کہیں محبت بھی اِس طرح خائف ہوتی ہے؟ میں بھی تم سے کہتی ہوں، مجھے تم سے محبت ہے۔" دیبا نے مُسکرا کر جواب دیا۔
"سچ ـــــ! آپ سچ کہہ رہی ہیں؟" وہ بے قابو ہو گیا۔
"ارے سچ تو کہہ رہی ہوں۔ میں تمھاری بھابی ہوں نا!"
"میں اُس محبت کی بات کر رہا ہوں جہاں حُسن حاکم اور عشق محکوم ہو جاتا ہے۔" شہاب بولا۔
"یہ اپنا اپنا خیال ہے۔ تم اپنے نظریئے پر قائم رہو اور میں اپنے اصولوں پر!" دیبا آگے بڑھ گئی۔

---

شہاب کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ وہ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ دیبا اُس کے کمرے میں پہنچی۔
"شہاب! تم جا تو رہے ہو لیکن خیریت کی اطلاع بھجواتے رہنا۔"
"میری زندگی ہی کیا دیبا بھابی! جیوں یا مروں کسی کی بلا سے ـــ

نہ جینے میں لذّت، نہ مرنے کی خواہش
خدا جانے کس موڑ پر زندگی ہے!"

"ایسی باتیں کیوں کرتے ہو شہاب! کیا تمھارا اپنا کوئی نہیں، ہم بھی تمھارے نہیں رہے؟" دیبا نے افسردگی سے سوال کیا۔

"میرا کوئی ہوتا تو زندگی کی سُنسان راہوں پر تنہا نہ چلتا، خود کو موت کے طوفان میں نہ کھو دیتا۔ نہ ماں نہ باپ نہ کوئی بہن! اسلم بھیّا میری زندگی کے امین ہیں۔ اُنھوں نے ماں باپ کا پیار دیا۔ زندگی کی ہر خوشی مجھ پر نثار دی مگر میری زندگی کی تنہا راتیں گیلی لکڑی کی طرح سُلگتی رہیں۔ اسلم بھیّا کا میرے خون کے ایک ایک قطرے پر حق ہے۔ وہ جتنا چاہیں بہا سکتے ہیں۔ اپنا سب کچھ میں اسلم بھیّا پر نثار کر سکتا ہوں! مگر جہاں تک میری اپنی زندگی کا سوال ہے وہ تو تنہا ہے، کسی بیوہ کی مانگ کی طرح، کسی بنجر زمین کی طرح، کسی سوکھے چشمے کی طرح، کسی سے پہلی بار پیار مانگا تو صرف گھُٹی ہوئی آرزو ہاتھ آئی!" شہاب کا گلا رُندھ گیا۔

"شہاب! تمھارے جذبات کی میں قدر کرتی ہوں۔ تم مجھ سے جتنا چاہو پیار مانگو، لٹا دوں گی تم پر۔ مگر میرے نظریات کو، میرے اصولوں کو مجروح نہ ہونے دو۔ تمھاری انوکھی ضد کو میں کیا کروں۔ تم شادی کر لو شہاب! تمھاری تنہائی ختم ہو جائے گی۔" دیبا بولی۔

"دیبا بھابی! محبت کے جذبے بہت بلند ہوتے ہیں، جو شخص اُن جذبوں کو چھُو لیتا ہے، سب کچھ پا جاتا ہے۔ میں تو ایسا راہی ہوں جسے خود اپنی منزل کا پتہ معلوم نہیں۔ میں جا رہا ہوں لیکن میری ہر سانس، میرے دل کی ہر دھڑکن آپ کے حکم کی منتظر رہے گی۔ جس دن آپ نے مجھے پکارا آپ کی قسم! میدانِ جنگ کی گولیاں مجھے نہ روک سکیں گی!" اِتنا کہہ کر وہ گھر سے نکل گیا۔ دیبا ایک آہ بھر کر کرسی پر گر پڑی۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

شہاب کچھ ہی دیر بعد پھر لوٹ آیا۔ اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھیں سُرخ تھیں۔ اُس کے ہاتھ میں ٹیلیگرام تھا۔
"تم واپس آ گئے شہاب؟" دیبا نے پُوچھا۔
"ایک بہت بُری خبر آپ کے لئے لایا ہوں ـــــ" اُس کی آواز گھُٹ گئی۔

...کیفیت ہے جلد کہو!" وہ بے چین ہو گئی۔

"آلم بھیا کار کے ایکسیڈنٹ میں اللہ کو پیارے ہو گئے!" یہ کہہ کر شہاب رو پڑا۔

"نہیں ۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا!" دیبا کی چیخ سے فضا کانپ اٹھی۔ بچے سہم کر دبک گئے۔

"بھابی! خدا نے بہت بڑی ناانصافی کی ہے آپ کے ساتھ ۔۔۔" شہاب دیبا کے قدموں میں لوٹ رہا تھا۔ دیبا پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اس کے بعد وہ یک بیک گم سم ہو گئی۔ شہاب نے دیبا کو دیکھا وہ سکتے کے عالم میں تھی۔ آنسو اُس کے گالوں پر جم گئے تھے۔

"دیبا بھابی؟!" شہاب چیخ اٹھا۔ بچوں کے رونے سے سارا ماحول لرز گیا مگر دیبا پر کوئی اثر نہ ہوا۔ شہاب نے فون کر کے ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے دیبا کو دیکھا اور کہا۔

"اچانک صدمے سے انھیں سکتہ ہو گیا ہے۔ ان کا ہوش میں آنا مشکل ہے۔ ہو سکتا ہے پھر کسی شاک سے یہ ہوش میں آ سکیں۔"

"کیسی شاک سے؟ ڈاکٹر! اس سے بڑھ کر صدمہ اور کیا ہوگا؟ ان کا سہاگ اُجڑ گیا۔ محبت کے شاداب چمن پر بجلی گر گئی۔ پیار کا گلزار جل کر خاک ہو گیا۔ ان کی مانگ سُونی ہو گئی۔ اِس سے بڑھ کر بھی کوئی غم ہے ڈاکٹر؟" شہاب بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ وہ دیبا کے قدموں میں پڑا رہا۔ شام بھی گئی، رات بھی گزر گئی، مگر دیبا اُسی عالم میں بیٹھی رہی۔ شہاب نے نظر اُٹھا کر دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر وہ اپنی اٹیچی کھولنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے اُس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اُس نے دیبا کو غور سے دیکھا اور پھر پستول کا نشانہ اپنے دائیں بازو پر رکھ لیا۔ کچھ لمحوں بعد فضا میں گولی چلنے کی آواز آئی اور اگلے ہی پل شہاب تڑپتا ہوا فرش پر تھا! گولی کے دھماکے سے دیبا چونک اُٹھی۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ شہاب پر نظر پڑتے ہی وہ چیخ اٹھی۔

"شہاب! یہ تمھیں کیا ہو گیا شہاب! آنکھیں کھولو!" وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اُسے اپنی کچھ سُدھ نہ رہی۔ وہ شہاب کو لے کر ہسپتال پہنچی۔

"ڈاکٹر! شہاب کو بچا لو!" اُس نے ڈاکٹر کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔

"میڈم! میں کوشش کروں گا۔ گولی تو نکل جائے گی۔ مگر خون کافی مقدار میں جا چکا ہے۔ ہمارے پاس بھی بلڈ بنک میں خون باقی نہیں رہا۔ اِس لیے مشکل ہے!" ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر! میرا خون لے لو۔ اِس کے کام آ جائے گا۔ اِسے بچا لو!" اُس نے روتے ہوئے کہا۔

"آپ خون دیں گی ۔۔۔ لیکن اِس وقت خود آپ کمزور ہو گئی ہیں۔"

ڈاکٹر سوچ میں پڑ گیا۔

"نہیں ڈاکٹر! سوچو مت۔ میرا خون لے لو! اِسے خون کا ایک ایک قطرہ اِس کے لیے ماں کے دودھ کی قیمت رکھتا ہے! میرا خون اِسے مِل جائے گا تو یہ بچ جائے گا۔ ڈاکٹر! پلیز! میری بات کو مت ٹالو۔ اِسے ممتا کی پکار سمجھو۔ یہ میرا بچہ ہے!" دیبا کی آواز گھٹتی چلی گئی۔

"آئیے میرے ساتھ!" ڈاکٹر نے دیبا کو اپنے ساتھ لے لیا۔

شہاب کا آپریشن کامیاب ہو چکا تھا۔ ہاسپٹل کے ایمرجنسی وارڈ میں شہاب اور دیبا الگ الگ پلنگوں پر لیٹے تھے۔ شہاب کی آنکھیں بند تھیں، خون کی بوندیں دیبا کے جسم سے نکل کر شہاب کی رگوں میں داخل ہو رہی تھیں۔ دیبا کے چہرے پر پُرسکون مسکراہٹ تھی، بالکل اُسی وفادار سپاہی کی طرح جو اپنے ملک کو اپنی جان بھینٹ دے کر مسکراتا ہے۔ شہاب نے آنکھیں کھولیں۔

"بھابی! تم کہاں ہو ۔۔۔؟" اُس نے پکارا۔

"مسٹر شہاب! آپ آرام کیجیے۔ آپ کی بھابی تو نہیں، ماں وہاں لیٹی ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"میری ماں؟ کیا کہہ رہے ہو ڈاکٹر؟ وہ تو کب کی اِس دُنیا سے جا چکیں۔ وہ کہاں سے آئیں گی؟" شہاب نے بے دلی سے کہا۔

"ماں کے مرنے سے ممتا کے جذبے نہیں مر سکتے مسٹر شہاب! وہ دیکھیے بھابی کے رُوپ میں آپ کی ماں اُس پلنگ پر پڑی ہے جس نے خود کو خطرہ میں ڈال کر آپ کو بچایا۔ آپ کی رگوں میں دوڑنے والا یہ خون اِسی ماں کے دودھ کی قیمت رکھتا ہے!" ڈاکٹر کی آواز بھر آ گئی۔

"بھابی ۔۔۔!" شہاب پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیبا کو دیکھتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دیبا کے پلنگ پر گر پڑا۔

"بھابی! تم نے ایسا کیوں کیا؟ خود کو خطرے میں ڈال کر مجھے کیوں زندگی دی تم نے؟ ایسا کیوں کیا ۔۔۔" وہ روتا رہا۔

"شہاب! یاد ہے تم نے ایک بار مجھ سے کہا تھا محبت کے جذبے بہت بلند ہوتے ہیں۔ جو انھیں چھو لیتا ہے سب کچھ پا لیتا ہے۔ آج میں نے انھیں جذبوں کو چھو لیا۔ زندگی میں بعض موڑ ایسے بھی آتے ہیں جہاں متضاد جذبے بیک وقت عمل کرتے ہیں۔ خوشیاں اور غم دل کے آنگن میں باہم رقص کرنے لگتے ہیں قہقہوں کے طوفان میں سسکیوں کی بھی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ میں آج زندگی کے اُسی

# ماریشس کے لئے
# 'پی' فارم ضروری نہیں!

اب تیس برس میں ایک مرتبہ ماریشس کے لئے بغیر 'پی' فارم کے
پرواز کیجئے۔ ماریشس کی پرواز کے لئے
'پی' فارم کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی اگرچہ آپ گذشتہ
تین سال کے اندر اندر بدیش یاترا پر جاچکے ہوں۔

اور اس خاص سہولت کے ساتھ جا سکتے جو صرف
ایئر انڈیا سے مل سکتی ہے!

آیئے! ماریشس کے لئے ایئر انڈیا کے آرامدہ ہوائی جہاز سے
پرواز کیجئے اور وہاں کے خوبصورت ساحلوں کا لطف اٹھایئے،
وہاں کے دلچسپ مناظر روح پرور نظاروں اور مونگوں کے
رنگ برنگی ریزوں کی بہار دیکھئے۔ فرانسیسی، چینی اور
ہندوستانی طرز کے لذیذ کھانے ذوق و شوق سے کھایئے۔
ایئر انڈیا کے ذریعے آپ ماریشس صرف ۱۲ گھنٹے میں جا پہنچیں گے

## بمبئی سے ہوائی جہاز ہر منگلوار کو روانہ ہوتے ہیں ایئر انڈیا

# پلکوں میں آنسو

پروفیسر ناز قادری ایم۔ اے

شعبۂ اردو بی۔ ایس۔ کالج، موتی پور (مظفر پور)

میرے حضور والا!

نیک خواہشات کے ساتھ "پلکوں میں آنسو" حاضرِ خدمت ہے۔ مجھے افسانے کے بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے۔ حسبِ معمول اس بار بھی آپ کی گرانقدر آراء اور فن شناس نگاہ کے فیصلے کا انتظار رہے گا ۔۔۔۔ "اندھیرا اُجالا" کی پسندیدگی کا خط ملا تھا۔ ناز نوازی کا بہت بہت شکریہ ۔۔۔۔ یا میری ہی بھاری قسمت ہے کی اشاعت پر اب تک دُور دراز سے خطوط آ رہے ہیں۔ ان خطوں نے ایک نئے افسانے کو جنم دیا ہے۔ یہ سب "بیسویں صدی" کی بین الاقوامی شہرت، آپ کی حوصلہ افزائی اور خلوص و محبت کا نتیجہ ہے . . .

خلوص کار ۔۔۔۔۔۔ ناز قادری

اور آج میرا سلا سکون درہم برہم ہو گیا ہے !!

درد کے تمام فاصلے سمٹ آئے ہیں۔ میرے سینے میں عجیب سی کسک چٹکیاں لے رہی ہے۔ شاید اس کے دل کا درد زہر بن کر میری روح کی گہرائیوں میں اتر رہا ہے اور میں امجد کے غم کی آگ میں سلگنے لگی ہوں۔

امجد شروع ہی سے سنجیدہ رہا ہے لیکن گذشتہ چند برسوں سے میں نے اُسے اکثر اُداس اور غمگین دیکھا ہے۔ اس کے چہرے پر ہر وقت غم و اندوہ جھلکتا رہتا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ہمیشہ درد و کرب کے سائے لہراتے دیکھے ہیں۔ میں اُسے اِس طرح مضمحل اور اُداس دیکھنا نہ چاہتی تھی۔ میں اس کی زندگی کے خزاں رسیدہ چمن میں سدا بہار کی مسکراتی ہوئی کلیاں، لہلہاتے ہوئے پھول اور جھومتی ہوئی ڈالیاں دیکھنا چاہتی تھی۔ میں اس سے اکثر کہتی ۔۔۔۔ "زندگی میں مسکراہٹ اور مسرت کافی اہمیت رکھتی ہے۔ ہماری زندگی کو کامیاب بناتی ہے اور ہم زندگی سے صحیح طور پر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ انسانی زندگی سے خوشی اور غم کا گہرا تعلق ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم غم ہی کو سب کچھ سمجھ کر اُسے اپنے سینے سے چمٹائے رکھیں۔ تم تو فنکار ہو، تمہارے چہرے پر اُداسی کی لکیریں زیب نہیں دیتیں۔ تم ہنسنا اور خوش رہنا سیکھو۔ زندگی کا راز مسرت میں مضمر ہے۔ تم مسکراہٹوں کی چاندنی سے زندگی کے مہیب اندھیرے کا سینہ چیرتے ہوئے ۔۔۔۔ میری اِن تلقین سے اُس کے خشک ہونٹوں پر پژمردہ تبسم اُبھرتا۔ اُس کی مسکراہٹ میں بھی حزن و ملال ہوتا!

میں اُس کی زندگی کی الم ناکی کے بارے میں جاننا چاہتی تھی جس نے اُس کے روز و شب کو حسرتوں میں بدل دیا تھا۔ آخر وہ کون سا غم ہے جس نے اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹیں نوچ لی ہیں، اُس کی خوشیاں اور مسرتیں اُس سے چھین لی ہیں لیکن میں کوشش کے باوجود معلوم نہ کر سکی۔ میں نے سوچا شاید شادی کے بعد اُس کی زلفِ حیات سنور جائے، اُس کا مستقبل چمک اُٹھے لیکن کوئی اُسے شادی کے لئے کہتا تو وہ ٹال جاتا۔ کبھی کبھی دبے لہجے میں کہتا وہ شادی کرے گا ہی نہیں۔ جب ڈسٹرکٹ جج کے یہاں سے پیغام آیا تو میں نے اُسے کافی سمجھایا کہ وہ یہ رشتہ قبول کر لے۔ میں اُس لڑکی کی تعریف و توصیف کرنے لگی تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا وہ آپ کی سی ہے؟"

"مجھ سے بھی زیادہ خوبصورت؟"

میں نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔

"کتنے خوش نصیب ہیں بھائی جان جنھوں نے آپ جیسی بیگم پائی ہے!؟"

وہ خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

آخر کار میری ضد اور پیار کے آگے اُس کی ایک نہ چل سکی۔ وہ مجبور ہو کر مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو گیا اور یہ خبر گھر کے لوگوں کے لئے بڑی مسرت ہوئی۔

لیکن منگنی کے دن ——

میں جیسے ہی اُس کے کمرے میں داخل ہوئی ٹھٹک کر رہ گئی۔ وہ بستر پر اوندھا پڑا سسک سسک کر رو رہا تھا۔ کمرے کی ساکت فضا میں اُس کی ہلکی ہلکی اور گھٹی گھٹی سی سسکیاں اُبھر رہی تھیں، اُبھر رہی تھیں اور ڈوب رہی تھیں۔ میرا جی چاہا اُس کے پاس جا کر پوچھوں، وہ کیوں رو رہا ہے؟ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ ایسے وقت ہمدردی جتانے اور تسلی دینے سے آنسو تھمتے نہیں، ہچکیاں اور بندھ جاتی ہیں، صبر و ضبط کا دامن چھوٹ جاتا ہے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگ و جمن بہنے لگتی ہے۔ اِس لئے میں دبے پاؤں لوٹ آئی۔

میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات اُبھرنے لگے —— یہ رشتہ تو اُس کی منظوری سے طے پایا تھا! وہ مجھ سے کہہ چکا ہے کہ وہ کسی سے محبت نہیں کرتا، تو پھر وہ کیوں رو رہا ہے؟! —— میرے ذہن میں بار بار یہ سوال اُبھرنے لگا۔

دوسرے دن شام کی چائے پر میں نے کہا۔

"ایک بات پوچھوں امجد؟"

"ضرور!"

"سچ سچ بتاؤ گے؟"

"کیوں نہیں!"

"کل تم کیوں رو رہے تھے؟"

وہ اُداس ہو گیا۔

"کیا تمھیں نجمہ پسند نہیں؟"

"کیوں؟!"

وہ متعجب ہوا۔

"تو پھر کل . . ."

"نہ جانے کیوں رنج کے لمحوں میں ہنسنے اور مسرت کے موقع پر رونے کو جی چاہتا ہے۔"

اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ضرور تمھارے دل میں کوئی درد ہے جو برابر نشتر لگاتا رہتا ہے۔"

اُس کے چہرے پر اُداسی اور اضمحلال کے سائے گہرے ہو گئے۔

"کیا تم کسی اور کو چاہتے ہو؟"

وہ خاموش رہا اور پھر اُٹھ کر جانا چاہا

"تمھیں بتانا ہی پڑے گا، آخر وہ کون ہے؟" میں نے اُس کا بازو پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"چھوڑیے، آپ کیا کیجئے گا پوچھ کر؟"

وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ابھی اُس کی شادی ہوئی ہے یا نہیں؟"

"ہو چکی۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"بہت پرانی۔"

"لیکن تم نے کبھی مجھ سے اُس کا ذکر نہیں کیا؟"

"ہاں —— نہیں کیا ——" اُس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا ——

"انسان جب کبھی کسی کو نہیں پا سکتا تو پھر اُس کی سعی کیوں کرے؟"

"کوشش کامیابی کی پہلی منزل ہے۔"

"پھر جانے دیجئے۔"

"تم نے اُس سے شادی کیوں نہ کی؟"

اور وہ جواب دئے بغیر اُٹھ کر چلا گیا۔

لیکن آج مجھ پر سب کچھ عیاں ہو گیا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی نے مجھے درد کے اتھاہ سمندر میں پھینک دیا ہے اور میرا وجود ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگا ہے۔ امجد کے شکستہ خوابوں کی کرچیاں میرے دل کی گہرائیوں میں چبھ رہی ہیں۔

میں ابھی ابھی امجد کے کمرے میں داخل ہوئی ہوں۔ وہ اب تک پلنگ پر نیند کے مزے لے رہا ہے۔ طلوعِ آفتاب کی سنہری کرنیں دریچے سے چھن چھن کر اُس کے رخسار چوم رہی ہیں۔ پلنگ کے پاس میز پر اُس کی ڈائری کھلی پڑی ہے۔ شاید وہ رات دیر تک جاگا ہے۔ میری نگاہیں ڈائری کی تحریروں میں اُلجھ گئی ہیں۔ کسی کی ڈائری پڑھنا اخلاقی جرم ہے لیکن میں دانستہ اِس گناہ کا ارتکاب کر رہی ہوں اور ڈائری اُٹھا کر پڑھنے لگی ہوں۔

". . . آج پھر ماضی کے تمام نقوش چمک اُٹھے ہیں۔ عظیم آباد کے حسین لمحات میری نظروں میں جگمگانے لگے ہیں اور میں بکھری ہوئی دیرینہ یادوں کو سمیٹنے لگا ہوں —— شہناز کے ساتھ بیتے ہوئے دنوں کی یادیں —— شہناز —— میری آرزوؤں کا پیکر، میری تمناؤں کی کائنات، میرے خیالوں کا مرکز، میرے خوبصورت خوابوں کی شہزادی —— شہناز —— جس کے ساتھ گزرے ہوئے حسین لمحات کی یادوں کے تیر آج بھی میرے دل کو چھیدتے رہتے ہیں۔

شہناز میری کلاس فیلو تھی۔ یوں تو کالج میں بہت سی لڑکیاں تھیں اور سب ایک سے ایک خوبصورت اور حسین تھیں۔ لیکن وہ ستاروں میں ماہتاب تھی! وہ قدرت کا [illegible] شاہکار تھی۔ صبیح پیشانی پر مریم کا تقدس، شبنم میں دُھلے ہوئے گلابی رُخساروں پر نکھار، کیف میں ڈوبی ہوئی آنکھوں پر لانبی لانبی نوکدار پلکوں کی خوشنما جھالر، تراشیدہ یاقوتی ہونٹوں پر مونا لیزا کا تبسم، متناسب جسم کے دلکش و جاذب نظر خطوط اور رفتار میں ایک شان تمکنت ؎

حسن اس شان سے چلتا ہے خدا ہو جیسے
زیر پا چاند ستاروں کی ردا ہو جیسے

اُس کے ملکوتی حُسن نے میرے احساسات کو جگا دیا۔ اُس میں ظاہری حُسن کے ساتھ باطنی خوبیاں بھی تھیں۔ اُس کی شخصیت تمام محاسن سے مزین تھی۔ اُس کی غیر معمولی علمی صلاحیت اور ذہانت نے مجھے کافی متاثر کیا۔ خصوصاً مزاج کی ہم آہنگی نے ہمیں ایک دُوسرے سے قریب تر کر دیا۔ ہمارا سبجکٹ بھی تو ایک ہی تھا!

رفتہ رفتہ ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا رہا اور دُوریاں قُربت میں مدغم ہوتی گئیں۔ کبھی کالج کینٹین میں چائے کی چسکی کے ساتھ ادبی بحث بھی چھڑ جاتی تو کبھی ہم لان میں سرما کی پیاری پیاری دھوپ میں گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ ہمیں ایک ساتھ دیکھ کر کتنے طلباء رشک کرتے۔ جب ہم ایک ساتھ ہوتے تو ہمیں ایک دلنواز فرحت و مسرت کا احساس ہوتا۔

ہماری ملاقاتوں کے لمحات ہفتے، مہینے اور سال میں ڈھلتے رہے اور ہمیں وقت کا احساس نہ رہا۔ ہماری زندگی رواں دواں ندی کی مانند گزرتی رہی۔ وہ بہار بن کر میری زندگی کے سن زار پر چھاتی گئی اور میرے دل کے چمن میں تمناؤں کی کلیاں کھلتی رہیں، آرزوؤں کے غنچے چٹکتے رہے۔ اُس کی قربت و رفاقت میں اُس کی میگوں آنکھیں مجھے مدہوش بناتی رہیں۔ میں شرابِ محبت پیتا رہا، پیتا رہا اور مخمور و بےخود ہوتا رہا۔ مُستقبل سے بے نیاز، انجام سے بے خبر! میرے دل میں آبِ زمزم کی طرح پاکیزہ اور گنگا جل کی مانند پوتر محبت بڑھتی رہی اور پروان چڑھتی رہی لیکن میں کبھی حرفِ محبت زبان پر نہ لا سکا اور اپنے من مندر میں اُس دیوی کی پُوجا کرتا رہا۔

سالانہ امتحان کے پرچہ کا آخری دن تھا۔ اُس کے بعد کالج طویل مُدت کے لئے بند ہو رہا تھا۔ ہم سبھی ساتھی آخری بار مل رہے تھے۔ مجھے شہناز کی جُدائی کا احساس دُکھ پہنچانے لگا۔ وہ بھی افسردہ سی تھی۔ میں نے اظہارِ محبت کرنا چاہا۔ لیکن حُسن اور محبت کے درمیان انسانیت کا پردہ حائل رہا۔ آس اور یاس دامنگیر رہی اور ہماری محبت شرمندۂ الفاظ نہ ہو سکی۔ ہم ایک دُوسرے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہ گئے۔ اُس کے بعد ہم سب کے سب شوکھے پتوں کی طرح بکھر گئے۔ ہماری رفاقت کے سرسبز و شاداب گلشن کی ساری کلیاں مُرجھا گئیں وہ سبھی پھول کمھلا گئے۔ کسی کو کسی کی خبر نہ رہی اور میں بھی اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ چلا گیا۔ لیکن شہناز کی یادوں کی شمع میرے دل میں روشن رہی ——— کچھ دنوں کے بعد جب . . .!"

ڈائری میرے ہاتھ سے گر گئی ہے اور ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میرا وجود شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ رگ و پے میں آگ سی لگ رہی ہے۔ میں اپنے کمرے میں آ کر کٹی ہوئی شاخ کی طرح پلنگ پر گر گئی ہوں اور میری آنکھیں نمناک ہو گئی ہیں، پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسوؤں میں بہتے ہوئے دلوں کی حسین تصویر جھلملانے لگی ہے!!

---

## غزل

پروفیسر آزاد گلاٹی ایم۔ اے

خرد کا بارِ گراں ہم کبھی اُٹھا نہ سکے
یہ اور بات ہے، حدِ جنوں تک آ نہ سکے

تمہاری پرسشِ پیہم کے باوجود اے دوست!
کچھ ایسے زخم تھے جو ہم تمہیں دکھا نہ سکے

جنونِ عشق میں وہ بھی مقام آیا تھا
کہ خود کو کھو بھی دیا، اور اُن کو پا نہ سکے

یہ شوقِ قطعِ تعلق بجا سہی، لیکن
تمہارا دل ہمیں شاید ابھی بھلا نہ سکے

کیا ہے غور کبھی اُس کے حال پر کہ جو شخص
تمہیں بھلا نہ سکے، تم کو یاد آ نہ سکے

بہت قریب سے دیکھا تھا ہم نے اُن کو مگر
دلوں کے فاصلے قربت کو راس آ نہ سکے

کچھ اس ادا سے سرِ بزم جھک گئی وہ نظر
جو نظم ہم نے سنانی تھی وہ سنا نہ سکے

کسی کی بزمِ طرب خیز میں بھی ہم آزاد
فریب کھا نہ سکے، یعنی مسکرا نہ سکے

## غزل

پروفیسر پرکاش ناتھ پرویز ایم۔ اے

راس ہمیں کیوں جام نہ آئے
غم میں کوئی جب کام نہ آئے

جن کے لئے تو وقت کی زد لے
پھر وہ ہمیں آیا م نہ آئے

غیروں سے شکوہ کیا معنی
ہم خود اپنے کام نہ آئے

دردِ محبت درد ہے ایسا
جس سے کبھی آرام نہ آئے

ہم سے بچھڑے روٹھ کے کوئی
یارب! ایسی شام نہ آئے

کھلتے نہیں اسرارِ ہستی
ہاتھ میں جب تک جام نہ آئے

کھیلے ہم اُس زلف سے برسوں
لیکن زیرِ دام نہ آئے

اے پرویز یہ ناممکن ہے
لب پر اُن کا نام نہ آئے

## غزل

ظہیر غازی پوری بی۔ اے

شراب کبھی نہ یں برسے نشہ وہیں پھیلے
سحابِ گیسوئے رنگیں جہاں کہیں پھیلے

ترے بدن پہ ترا پیرہن سلگ اٹھا
زمانہ بھر میں نہ یہ رنگِ آتشیں پھیلے

کبھی تو عارضِ تاباں سے روشنی کی متاع
بکھیر دو کہ ذرا صبحِ دل نشیں پھیلے

جلے مکاں تو دھواں اُٹھے شعلے بھی لیکن
جو دل جلے تو کہیں روشنی نہیں پھیلے

جنونِ عشق کو دنیا کبھی راس آ جائے
روش روش پہ اگر بوئے خوش یقیں پھیلے

ہمارے ذہن کی بالیدگی سے کم ہے اگر
کچھ ایسا ہو کہ ذرا اور یہ زمیں پھیلے

جلا رہا ہوں میں شمعِ وفا کہ پھر سے ظہیر
جہاں میں دلکشئ خلد آفریں پھیلے

# اِسی چائے سے مجھے چاہ ہے

تیز اور مزیدار چائے

رچبرو ہی بہترین مزے والی چائے ہے۔ اچھی اور گاڑھی اور تیز رچبرو کے ہر ایک پیکٹ سے آپ زیادہ تعداد میں پیالی پر پیالی چائے کا لطف اٹھاتے چلے جاتے ہیں۔

## لپٹن کی رچبرو

لپٹن یعنی اچھی چائے

LRC-4 URDU

بیسویں صدی دہلی ۱۹۷۰ء
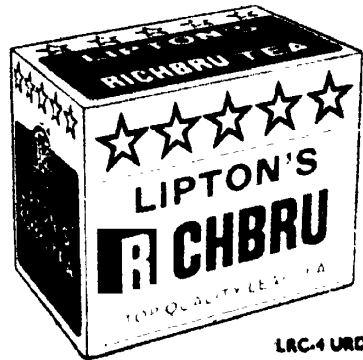
# پتھر کا انسان

انیس قیوم فیاض بی۔ایس سی (عثمانیہ)

۲۲۷۔سی۔ ملے پلی۔حیدرآباد نمبر ۲۸ (اے پی)

عزیزترین چچا جان! تقدیس و تکریم

ایک افسانہ "پتھر کا انسان" پیشِ خدمت ہے۔ افسانہ کیسا ہے اس کا فیصلہ تو آپ پر چھوڑتی ہوں، ویسے اتنا ضرور کہنے کی جرأت کروں گی کہ آپ نے اردو ادب میں جتنے چراغ روشن کئے ہیں اُن میں میرا نام بھی نمایاں ہے — دیکھئے نا کتنے "سادے خطوط" پچاس سال بعد کی تعریف میں آئے ہیں اور میں سمجھتی ہوں یہ میری نہیں آپ کی تعریف ہے... میں ڈاکٹر کیول دھیر صاحب کی بھی ممنون ہوں، جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اپنے افسانے پر آپ کی گرانقدر رائے کی سراپا منتظر رہوں گی۔ اللہ کرے آپ اچھے ہوں...

بے شمار دعاؤں کے ساتھ

آپ کی بھتیجی —— انیس قیوم فیاض

پروفیسر فرید نے شُدھا سے شادی کرلی!!

زمین جیسے چلتے چلتے تھم گئی۔ یا پھر سورج مغرب سے طلوع ہونے لگا۔

کسی کو ایک لمحہ کے لئے بھی یقین نہ آیا اور آتا بھی کیسے —— جب ایک پتھر سے پیار اور محبت کے سوتے پھوٹ پڑیں۔ یا پھر پتھر پگھل کر موم ہو جائے۔

ساری یونیورسٹی میں کھلبلی مچ گئی۔ بعضوں کی رائے تھی پروفیسر فرید اتنا نہیں گر سکتے۔ پروفیسر فرید ایسا تو نہیں کر سکتے۔ لیکن سب کو یقین کرتے ہی بنی۔ کیونکہ دوسرے ہی دن پروفیسر اور شُدھا ٹیکسی سے اترے تھے۔

پروفیسر فرید کی شخصیت ساری یونیورسٹی کے لئے قابلِ قدر اور قابلِ احترام تھی۔ چالیس برس کے سن میں بھی پروفیسر کچھ ایسی کشش رکھتے تھے کہ لڑکیاں بے اختیار اُن کی جانب کھنچی چلی آتی تھیں۔ کوئی اُن کی شخصیت سے مرعوب ہوتی تو کوئی اُن کے لباس کی نفاست سے متاثر ہوتی اور کوئی اُن کی آنکھوں کی گہرائی کو اپنی۔ لیکن پروفیسر نہ جانے کس مٹی کے بنے تھے کہ کسی کو لفٹ ہی نہ دیتے تھے۔ حالانکہ وہ بیچلر تھے۔

عاصمہ کے رومان سے کون واقف نہ تھا، اور نفیسہ کی پروفیسر پر مہربانیوں سے کون لاعلم نہ تھا۔ عاصمہ تو پروفیسر پر کچھ زیادہ ہی مر مٹی تھی۔ وہ اصرار کرکے روزانہ اپنی کار سے اُن کے فلیٹ چھوڑ آتی۔ اُن کی بار بار ضیافتیں کرتی لیکن پروفیسر متاثر نہ ہو سکے۔

نفیسہ سیٹھ امیر خان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ پروفیسر سے ہمیشہ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی۔ سائیکالوجی کے پیریڈ میں جو پروفیسر فرید کا مضمون تھا، وہ نت نئی شرارتیں کرتی۔ پروفیسر کو ستایا کرتی۔ کتنی بار تو پروفیسر نے ڈانٹ دیا لیکن اُس کی عادت میں ذرا بھی فرق نہ ہوا اور روز بروز اُن کی شرارتیں بڑھتی ہی گئیں۔

لڑکوں اور لڑکیوں کے رومانس تو خیر عام ہوا کرتے لیکن کسی اسٹوڈنٹ لڑکی کی کسی لکچرر یا پروفیسر میں دلچسپی —— دلچسپی لینے کی چیز ہوتی ہے۔ جس میں یونیورسٹی کا ہر فرد دلچسپی لیتا ہے۔ عاصمہ اور نفیسہ کی عنایتوں کا خوب مذاق اُڑایا گیا لیکن پروفیسر کی شفاف پیشانی پر کوئی شکن نہ آئی۔

غرض پروفیسر فرید کسی کے آگے جھکے نہیں۔ حالانکہ کتنی لڑکیاں انھیں اپنے دل کا مالک سمجھتی تھیں لیکن فاریہ کی پروفیسر میں دلچسپی بھی عجیب بات تھی۔ فاریہ ایک کرسچین لڑکی تھی۔ خوبصورت تھی۔ خاص طور سے اس کی آنکھیں بے پناہ کشش رکھتی تھیں۔

ایک بار پروفیسر سائیکالوجی کا کوئی لکچر دے رہے تھے جس میں نظروں کا

تذکرہ تھا انھوں نے خوبصورت آنکھوں کا حوالہ دیا اور اُن کی نظر فاریہ پر پڑی تو وہ مُسکرا پڑے۔ ساری لڑکیوں اور لڑکوں نے دیکھا، بلکہ محسوس کیا جیسے پروفیسر نے خوبصورت آنکھوں کا حوالہ دیتے ہوئے فاریہ کی طرف دیکھا تھا۔

سب کو سمجھتے بھلا کتنی دیر لگتی۔ کیونکہ ساری یونیورسٹی میں کسی کی آنکھیں جاذب نظر تھیں تو وہ تھیں فاریہ کی آنکھیں۔ اگنے چوڑے ابرو اور لمبی لمبی پلکیں ــــ اُس کی آنکھوں میں بلا کی معصومیت تھی۔ فاریہ کو پروفیسر سے دلچسپی ہوتی گئی اور وہ فرید ہی کے خواب دیکھنے لگی۔ لیکن پروفیسر فرید نے اُسے کبھی لفٹ نہ دی۔ نہ جانے کیوں وہ Reserve ہونا چاہتے تھے۔

پھر یونیورسٹی میں کھلبلی مچی۔

پروفیسر کے نام فاریہ نے خط لکھا۔

لیکن پروفیسر لفٹ دینے والوں میں سے نہ تھے۔ اِس لئے اُن کے کردار پر دھبّہ بھی نہ آسکا اور فاریہ نکال دی گئی۔

کچھ دنوں بعد ایک اور ہنگامہ ہوا۔ بی۔ اے فائنل کی اسٹوڈنٹ کا اغوا ہوگیا۔

اغوا! ــــ

یہ بات ہر سُننے والے کے لئے باعثِ حیرت تھی۔ کیونکہ جس لڑکی کا اغوا کیا گیا تھا، وہ بھی سائیکالوجی کی طالبہ تھی۔ لیکن پروفیسر کے مدّاحوں میں سے نہ تھی۔ پروفیسر نہ جانے کیوں اُس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیا کرتے تھے۔

وہ کوئی خوبصورت لڑکی نہ تھی، بس گوارا تھی۔ سانولا رنگ۔ گھنی گھنی ابروؤں کے نیچے چھوٹی چھوٹی ذہین آنکھیں ــــ ناک نسبتاً چھوٹی اور اُٹھی ہوئی۔ ہونٹ موٹے اور دہن چھوٹا۔

پروفیسر فرید نے اکثر نوٹ کیا جیسے وہ لڑکی کسی نفسیاتی بیماری کی شکار ہو۔ اُسے احساس ہے کہ کیوں نہ وہ بھی دُوسری لڑکیوں کی طرح حسین ہوئی؟ شاید اِس لئے وہ ڈریسنگ پر زیادہ توجہ دیا کرتی۔ ہمیشہ پُرکشش بھڑکیلے کپڑے پہنا کرتی۔ پروفیسر محسوس کرتے تھے کہ وہ دُوسروں کی نگاہوں کو اپنے ملبوسات سے متاثر کرنا چاہتی تھی۔ وہ ہر لباس پہنتی۔ سفید گھٹنوں کو چھُوتا ہوا فراک اسکرٹ، چوڑیوں والا پائجامہ لکھنوی کرتا، شرٹ، شلوار یا پھر ساڑی ــــ پھر کچھ دنوں بعد پروفیسر اُس کی نگاہوں میں عجیب خوشی محسوس کر رہے تھے۔ جیسے اُسے دونوں جہاں کی خوشیاں مل گئی ہوں! وہ پروفیسر کو آتے یا جاتے وقت [illegible] بھی کرنے لگی تھی۔ اِس غیر معمولی تبدیلی کا سُراغ لگانے کے لئے پروفیسر بے چین تھے۔

ایک دن وہ اپنے رُوم سے نکلے ہی تھے کہ اُس نے روک لیا۔

"سر ــــ!"

"واٹ ڈو یو وانٹ؟"

"سر! میں یہ پُوچھنا چاہ رہی تھی کہ کیا آپ اپنے کچھ گراں قدر لمحے مجھے دے سکیں گے؟ میں آپ سے ٹیوشن لینا چاہتی ہوں"

"اوہ ساری ــــ" پروفیسر ایکدم بوکھلا گئے۔

"میرے پاس وقت نہیں ہے"

"پلیز پروفیسر ــــ"

"نہیں آپ مجھے معاف کریں۔ ویسے آپ چاہیں تو مسٹر گھوش، میرے ایک دوست ہیں۔ اُنھیں ٹیوشن کے لئے آمادہ کرسکتا ہوں"

"تھینک یُو سر۔۔ مجھے ایک ٹیوٹر کی اشد ضرورت تھی"

"اوکے ــــ میں کوشش کروں گا اور کل ہی آپ کو جواب دوں گا"

اور دونوں اپنی اپنی راہ پر ہولئے۔

جس وقت پروفیسر لوٹے تو اُن کے دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی ــــ وہ اسٹاف رُوم میں آبیٹھے۔

پھر اُنھوں نے مسٹر گھوش کو ٹیوشن کے لئے آمادہ بھی کر لیا لیکن بعد میں اُنھیں یہ جاننے کی مُہلت ہی نہ ملی کہ وہ لڑکی پابندی سے ٹیوشن لے رہی ہے یا نہیں ــــ؟ کیونکہ اُن دنوں عجیب عجیب افواہیں یونیورسٹی کی فضا کو مکدّر کر رہی تھیں۔

پروفیسر جس لڑکی کی نفسیات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ افواہیں اُسی کے متعلق تھیں۔ وہ جب بھی باہر نکلتی اُس کے ساتھ دیواکر ہوتا۔ دونوں کلاس میٹ تھے۔ دیواکر انتہائی لوفر لڑکا تھا کسی نہ کسی لڑکی کے ساتھ اُس کے رُومانس کی افواہیں اُڑتی ہی رہتی تھیں۔

اور اب اُس کے ہاتھوں میں یہ نئی لڑکی کھلونا تھی۔

دونوں کلاس سے غائب رہنے لگے۔ ہر وقت وہ کسی ڈھکی چھپی جگہ بیٹھا کرتے اور اپنے خیالوں میں مگن ہوتے۔ اکثر اُن کا قیام [illegible] کے پیچھے ہوتا تھا۔ یہ پہاڑی یونیورسٹی کے عقبی حصّہ میں تھی۔ جہاں لوگوں کا گذر بہت کم ہوتا تھا۔

---

ایک دن پروفیسر فرید پرنسپل کے رُوم میں بیٹھے تھے کہ ایک بُوڑھا غریب جوڑا آنسو بہاتا رُوم میں داخل ہوگیا۔

"ہماری لڑکی تین دن سے غائب ہے مائی باپ۔۔"

پرنسپل صاحب کے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ اُن کے کانوں کو یقین نہ آیا کہ اُن کے کالج کی کوئی لڑکی غائب بھی ہوسکتی ہے!

اُنھیں دنوں یونیورسٹی کی فضا میں کسی کے اغوا کی خبریں گشت کر رہی تھیں اور لوگوں کے کہنے کے مطابق دیواکر اور شدھا غائب تھے!

شدھا ـــــ بدنصیب لڑکی! پروفیسر نے دل ہی دل میں کہا۔ شدھا کے
بہکے قدم ایک دن اُسے تباہی کی طرف لے جائیں گے۔ انھیں پورا یقین تھا
اُس کے والدین بُری طرح رو رہے تھے۔ اپنی غریبی کو کوس رہے تھے، اپنی
پر آنسو بہا رہے تھے اور قسمت کے اِس نئے مذاق پر بلبلا رہے تھے لیکن قسمت
اُن کی بیٹی کی لغزش پر مسکرا رہی تھی، ہنس رہی تھی ـــــ قہقہہ لگا رہی تھی!
پرنسپل صاحب اس کے سوا کیا کرتے کہ دیواکر کو کالج سے ہمیشہ کے لئے نکال دیتے۔
وہ بھی اِس سانحہ سے بے حد مغموم ہوئے۔
یونیورسٹی آفس، اسٹاف روم، تمام کلاسیں، لائبریری، لیبارٹریز اور یونیورسٹی
ہاسٹلس میں بھی شدھا اور دیواکر کا چرچا ہونے لگا، انہی کے تذکرے چلنے لگے۔
اور پھر ایک ٹھہراؤ سا آگیا ـــــ
جب پروفیسر فرید شدھا کا ہاتھ تھامے، کار سے اُترے ـــــ اُس نے سبز
رنگ کی چمکیلی ساڑی پہن رکھی تھی اور اُس کے گلے میں منگل سوتر مسکرا رہا تھا۔
پروفیسر کے ہونٹوں پر فاتحانہ شان تھی۔
"پروفیسر نے یہ کیا کیا ـــــ!؟"
ایک سرگوشی کامن روم سے آتی ہوئی سنائی دی اور پروفیسر اپنے دوست
کھنہ صاحب سے کہہ رہے تھے۔
"میں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا دوست! اغوا کے بعد شدھا کو یوں پھینک دیا گیا
تھا جیسے کوئی پھول کو مسل کر پھینک دیتا ہے۔ پھر اسے کون قبول کرتا؟ کون اُس مسلے
ہوئے پھول کو اُٹھا کر سونگھتا؟ شدھا بھی ایک لڑکی ہے، ظاہر ہے اُس کے بھی ارمان ہوں
گے ـــــ تمنائیں ہوں گی ـــــ اوروں کی طرح اسے بھی حسین شوہر پانے کی آرزو
رہی ہوگی۔ جو اب کسی طرح پوری نہ ہو سکتی تھی۔ اِس لئے میں نے فیصلہ کر لیا کہ شدھا کو
اپنا لوں گا۔"
"آپ کتنے عظیم ہیں پروفیسر ـــــ؟"
"زندگی تو یوں بھی گزر جاتی ہے میرے دوست ـــــ لیکن کچھ
کر دکھانے کی ٹھان لیں تو اور بات ہے"
پروفیسر فرید نے شانِ بے نیازی سے سر کو جھٹکا دیا۔
اور کھنہ صاحب نے اِس عظیم انسان کے ہاتھ چوم لئے!
شدھا آنسو بھری آنکھوں سے انھیں دیکھ رہی تھی!!

---

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر ضرور تحریر فرمائیے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد
میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرتے وقت منی آرڈر بھیجتے وقت خریداری نمبر لکھنا لازمی ہے۔ نیز

دیکھیے انکا چہرہ
کس قدر دلکش
صاف اور خوبصورت
نظر آرہا ہے...
جی ہاں
آپ بھی ایسی
نظر آسکتی ہیں!

# آپ کو صرف پونڈز کولڈ کریم اور ۷ روزہ حسن افزا پلان کی ضرورت ہے!

آپ کیا چاہتی ہیں. بالکل صاف، ملائم اور خوبصورت چہرہ اور وہ بھی جلد سے جلد تو پونڈز کولڈ کریم کا استعمال یہ سب کچھ آپکو صرف ۷ دنوں میں دے سکتا ہے!

## حسن افزا پلان اور اس پہ عمل

ایک ہفتہ تک ہر روز رات کے وقت پونڈز کولڈ کریم دو بار لگایئے۔ پہلی بار [illegible]

## دوسری بار استعمال سے حسن کا راز کھل جائے گا

دوبارہ پھر کریم لگایئے. دیکھیے حسن کا راز آپ پر کھل گیا نا؟ پونڈز کولڈ کریم مسامات کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتی اور چھپا ہوا میل صاف کر دیتی ہے جو پانی اور صابن سے ممکن نہیں ہے۔ اس طرح آپ کا چہرہ بالکل صاف ہو جاتا اور رنگ و روپ نکھر اٹھتا ہے۔

آٹھویں روز جب آپ سو کر اٹھتی ہیں تو آپ کا چہرہ اس قدر صاف، ملائم اور خوبصورت نظر آتا ہے کہ آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

اب آپ یہ عادت بنا لیجیے کہ روزانہ رات کو [illegible] پونڈز کولڈ کریم [illegible] آپ کا چہرہ [illegible] شاداب رہے۔

POND'S
COLD CREAM

**پونڈز کولڈ کریم - جلد کی صفائی کیلئے دنیا کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کریم!**

### کرشن گوپال مغموم بی اے

یہی پہلے مہکی زلفوں کے سائے
پھر آئے ہیں وہ پلکیں جھکائے

ابھی چاند چمکے گا اِن بدلیوں میں
ذرا گہرے ہو جائیں زلفوں کے سائے

مجھے موسمِ گل میں، برکھا کی رُت میں
تمہیں یاد آئے، بہت یاد آئے

اُجالا کریں گے وہ منزل بہ منزل
چراغِ محبت جو ہم نے جلائے

تمہیں ہو خیالوں میں خوابوں میں دِل میں
پھر آخر تمہیں کوئی کیونکر بھلائے؟

لرزتے رہے ہیں، لرزتے رہیں گے
مری زندگی پر ترے غم کے سائے

کوئی داد دے میرے جوشِ جنوں کی
خزاں میں بہاروں کے نغمے سنائے

یہی اک تمنا ہے مغموم! میری
مرا شوقِ دیدار اُن سے ملائے

### نسیم شاہجہانپوری

یوں بےرخی سے مجھ کو جو دیکھا کریں گے آپ
دل کی خلش میں اور اضافہ کریں گے آپ

تحقیرِ نازِ حسن گوارا کریں گے آپ
میں رُوٹھ جاؤں گا تو منایا کریں گے آپ

نازاں ہوں میں جنوں پہ مگر اس یقین کے ساتھ
دیوانہ کہہ کے مجھ کو پکارا کریں گے آپ

فردا پہ ٹالیے نہ کوئی جورِ ناروا
کل تک نہیں رہوں گا تو پھر کیا کریں گے آپ

یہ بات سچ سہی مجھے پھر بھی یقیں نہیں
ترکِ تعلقات گوارا کریں گے آپ

ضبطِ الم بخیر! وہ دن اب قریب ہیں
میرے ہر ایک غم کا مداوا کریں گے آپ

بہتر یہ ہے کہ سامنے آ ہی جائیے
کب تک مری نگاہ سے پردا کریں گے آپ

اِس آرزو میں کیوں نہ اُٹھاؤں نگاہِ شوق
دیکھوں گا جس طرف نظر آیا کریں گے آپ

یہ سوچ کر مٹا دیے اپنے نسیم کو
جب یہ نہیں رہے گا تو پھر کیا کریں گے آپ

### عرش صہبائی

رہِ ہستی میں ہیں ہر گام پہ آزار بہت
دل سلامت ہے اگر، دل کے طلبگار بہت

انہیں انکار سے آشا کی کرن پھوٹ پڑی
مطلعِ ذہن پہ جب چھا گئے انکار بہت

یہ ہے اِک معجزہ اُس دَور میں ہم زندہ ہیں
لوگ جس دَور میں جینے سے ہیں بیزار بہت

دیکھتے رہیے کہ اب فیصلہ کیا ہوتا ہے
زندگی موت سے ہے بر سرِ پیکار بہت

یہ گراں گزرے گا اُن کو جو ستم پیشہ ہیں!
اہلِ دل کس لئے خنداں ہیں سرِ دار بہت

اپنا یہ ظرف کہ ہنس ہنس کے مصائب جھیلے
زندگی نے دیے تا عمر گو آزار بہت

محفلوں کی یہ کبھی جان ہوا کرتے تھے
اب ہیں احباب کے بگڑے ہوئے اطوار بہت

چند احباب نے مرنے کی دُعائیں مانگیں
عرش اک بار ہوئے زیست میں بیمار بہت

افسانہ

# آنکھیں

نور شاہ

ہسپتال روڈ۔ درگاہ حضرت بل (کشمیر)

برادر محترم خوشتر گرامی صاحب آداب

"آنکھیں" بھجوا رہا ہوں۔ یہ میرے ایک دوست کی زندگی کا المیہ ہے جس میں نے افسانوی رنگ دینے کی

کوشش کی ہے۔ اُمید ہے کہانی آپ کو پسند آئے گی۔۔

آپ کا ـــــــ نور شاہ

اُن دونوں کے درمیان ایک دروازہ حائل تھا!

دروازے کے ایک طرف تاج تھی جس کی جھکی جھکی سی نگاہیں پُر شوق انداز میں بار بار جھانکا کرتی تھیں۔ دروازے کے دوسری طرف اختر تھا جس نے تاج کے رنگین آنچل کو بارہا لہراتے دیکھا تھا اور چوڑیوں کی کنواری کھنک سُنی تھی۔ گھبرائے ہوئے قدموں کی آہٹیں محسوس کی تھیں۔ لیکن اُس کے سامنے تاج کی پوری تصویر نہیں اُبھر پائی تھی۔ صرف ایک دُھندلا دُھندلا سا نامکمل نقش تھا۔

اِس شہر میں اختر کی نئی نئی پوسٹنگ ہوئی تھی اور اُسے بہت مشکل سے مکان کا یہ حصّہ کرایہ پر ملا تھا۔ وہ کشمیر سے اپنے ساتھ ایک نوکر بھی لایا تھا لیکن وادی کی گلفشاں پنہائیوں کا پروردہ پتھروں کے دیس کی گرمی برداشت نہ کر سکا اور ایک رات جب اختر ہسپتال سے لوٹا تو اُس کا نوکر چلا گیا تھا اور بھوک سے اُس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا اِس لئے اُس کی ڈیوٹی بھی عجیب ہوا کرتی تھی کبھی صبح اور کبھی شام۔ اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے اختر کی نگاہیں بار بار دروازے کے اُس طرف اُٹھ جاتیں اور اُس کا جی چاہ رہا تھا اِس کے پٹ کھول دے اور کھانے کی خوشبو کو جو دوسری طرف قید تھی اپنے پاس آنے دے۔ اُس خوشبو کے سامنے اُس سیمے گیلے پتھروں کی مہک بھی مات تھی۔ اُس نے ہمّت سے کام لے کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ خود ہی کھُل گیا۔ لیکن سامنے یہ کون تھی؟ مشین پر چلتے چلتے یہ کس کے ہاتھ رُک گئے تھے۔ کون تھی یہ جو ایک وحشی ہرنی کی طرح ٹھٹک کر رہ گئی۔ میلی سی قمیص اور گلابی دوپٹے میں چھپا یہ کس کا پیکر تھا جو صحن میں اُگے ہوئے اِن پھولوں کو یہ دلواریں اور یہ پردے اب تک کیوں چھپائے ہوئے تھے؟

"کیا ہے تاج؟"

یہ تاج تھی!!

"کچھ نہیں امّاں۔۔۔ وہ۔۔۔ دروازے پر کوئی ہے"

"میں اختر ہوں۔ میرا نوکر بھاگ گیا ہے"

تاج کی ماں قریب آئی۔

"کوئی بات نہیں۔ ایسا بھی کیا تکلّف۔۔۔ میں ابھی آئی"

جتنی دیر اختر کو رُکنا پڑا وہ لمحے بلائے جان ثابت نہ ہوئے کیونکہ اب اُسے بھوک کا احساس نہ تھا۔ شاید ایک پیاس، ایک تشنگی کا احساس تھا جو اُس کی نظروں کو تاج کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد پیدا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد تاج کی ماں لوٹ آئی اور اُس نے اُسے سینی دی۔ اپنی امّی کے پیچھے تاج کی آنکھیں اُسے گھور رہی تھیں۔

معلوم نہیں اُس نے کس طرح کھانا کھایا۔ بار بار اُس کی نظریں دروازے کی طرف اُٹھ جاتیں۔ بار بار وہم گزرتا کہ تاج اب بھی اُسے گھور رہی ہے۔ کھانا کھانے کے بعد اُس نے برتن واپس کرنے کے لئے دستک دی اور جب دروازے کے پیچھے اُسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اُس نے دروازے کا ایک پٹ کھول دیا۔ سینی لینے کے لئے اب جو ہاتھ بڑھے وہ تاج کی ماں کے نہ تھے۔ وہ سپید سپید بانہوں والے حنائی ہاتھ تھے، مخروطی انگلیوں والے ہاتھ تھے۔ اُس نے اِن ہاتھوں کو بے حد پُر اشتیاق نظروں سے دیکھا۔ ایک خواہش اُس کے دل و دماغ میں رینگتی ہوئی سرایت کر گئی ـــــ کاش!

وہ ان ہاتھوں کی خوبصورتی کو چوم سکے ـــــ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا صرف آنکھوں ہی آنکھوں میں چند تمناؤں کا تبادلہ ہو گیا!

وہ پلٹ گیا اور اس کی نظریں سامنے تپائی پر رکھی تصویر پر مرکوز ہو گئیں ـــــ یہ سلمیٰ کی تصویر تھی۔

'میرے حالات تو یہ ہیں۔۔۔'

اس نے سوچتے سوچتے اچانک کروٹ بدلی اور اس کے ساتھ ہی نہ جانے کتنی چوڑیوں کی مدھر کھنک اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ نہ جانے یہ کیسی آواز تھی جو اسے بار بار کچھ سوچنے پر اکسا رہی تھی۔

سلمیٰ ایک سوال بن کر سامنے آ گئی۔

صبح پھر وہی روحانی ہاتھ ناشتہ سنبھالے دروازے پر نظر آئے۔

"وہ لڑکا تو بھاگ گیا اب میں دوسرے نوکر کی تلاش میں ہوں" اختر نے کہا۔

"نہیں"

جیسے اختر کے دل کی دھڑکنیں رک گئیں جیسے اس کے ذہن کی تاریکیاں پھر اس کے خیالوں کی سنہری کرنوں سے جگمگانے لگیں۔ کل رات سونے سے پہلے اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ رات اس نے سپنا بھی دیکھا تھا۔۔ سلمیٰ ـــــ لیکن تاج کے ایک لفظ "نہیں" میں کتنی "ہاں" پوشیدہ تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ نوکر پھر اس کمرے میں آئے اور یہ دروازہ بند ہو جائے۔

اور پھر ہر صبح اور ہر شام تاج کے روپ میں روشنی کا پیکر نمودار ہوتا۔ تاج ایسے چل کر آتی جیسے بل کھاتی ہوئی ایک موج ساحل سے ملنے آ رہی ہو! اور جب کبھی اختر اس کی طرف چلا جاتا تو اسے محسوس ہوتا جیسے کمرے کا فرش بھی اس کے قدموں کی آہٹ کا منتظر ہے۔ اختر جب بھی جانے لگتا، کانسی کے کٹورے سے آواز آتی۔

"آپ جا رہے ہیں؟"

اور اختر سوچتا یہ شکوہ ہے یا رک جانے کا پیغام؟ اس ایک جملے میں محبت کی پوری تفسیر پوشیدہ تھی!

"کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں رک جاؤں؟"

تاج کا چہرہ جھک جاتا اور اختر کے قدم لوٹ آتے۔

---

جب سلمیٰ اختر کی زندگی میں اس کی بیوی بن کر آئی تھی تو اسے محسوس ہوا تھا جیسے سورج کی پہلی کرن شرمیلے انداز میں سنورتی پھیلتی اس کے دل کی اجنبی دھرتی پر اتر آئی تھی ـــــ اور اب وہ بہت دور تھی سینکڑوں میل دور اور تاج اس کے سامنے تھی، اس کے قریب۔۔۔ وہ زندگی کے اس دوراہے پر آ گیا تھا جہاں ایک راستہ محبت اور تعمیری زندگی کی طرف جاتا ہے اور دوسرا ہوس کی طرف۔ پہلے راستے پر بیوی کی محبت اور آرزوؤں کا گھر تھا، دوسرے راستے پر ایک رومانی کھیل! ـــــ زندگی کے دوراہے پر وہ کب سے یونہی گزار رہا وہ چاہتا تھا کہ یہ اضطراب ختم ہو جائے۔ یہ بے چینی، یہ ہر ہر لمحے کی تشنگی مٹ جائے اور وہ سکون سے سلمیٰ کے بارے میں سوچ سکے۔ شاید۔۔۔ یہ تاج اسے ستا رہی تھی۔ اسے ایک انجانی آگ میں جلتے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا وحشی دل ہر لمحے ایسا اضطراب عطا کئے جا رہا تھا جس کا حل۔۔۔!

رات کے اندھیرے میں ایک سوالیہ نشان ابھرتا ـــــ

'کیا تم مجھے بھول گئے اختر؟ بھول گئے کہ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں! تم نے تو کہا تھا مکان ملتے ہی تمہیں اپنے پاس بلاؤں گا ـــــ اتنی جلدی بھول گئے اپنے وعدے۔۔۔؟'

یہ آواز سلمیٰ کی تھی!!

اس دن اسے سلمیٰ بے اختیار یاد آئی۔ اس کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ ان لمحوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے اس نے سلمیٰ کے لئے فاختائی رنگ کی ساڑی، سینڈل اور ایک خوبصورت سا ہار خرید لیا۔ اس نے جب اپنے کمرے میں قدم رکھا تو سامنے تپائی پر کاغذ کا ایک پرزہ ملا۔ تاج نے لکھا تھا ـــــ

'اختر ـــــ دنیا کی ہر شے اپنے وجود کا اظہار چاہتی ہے۔ پھول اپنی خوشبو اس لئے بکھیرتے ہیں کہ کسی کا دماغ معطر ہو۔ سمندر کی لہریں اس لئے امڈ امڈ کر آتی ہیں کہ کنارے کے دل میں گدگداہٹ ہو۔ بادل اس لئے گھر گھر آتے ہیں کہ دھرتی کے وجود میں اپنے آپ کو گم کر دیں ـــــ ازل سے ابد تک یہ سلسلہ رواں دواں ہے۔ محبت کا اظہار انسانی تہذیب کی عظمت ہے، معراج ہے، سربلندی ہے۔ پھر محبت کے اظہار پر پابندیاں کب تک ـــــ!'

اختر نے اس مختصر سی تحریر کو پڑھا کئی بار پڑھا ـــــ دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلا اور تاج نمودار ہوئی۔

"کیا لائے ہو؟"

"کچھ چیزیں لایا ہوں"

"دیکھوں تو؟"

اس نے ایک ایک چیز کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"یہ سب کس کے لئے ہے؟"

اختر اُن آنکھوں میں چھپے عجیب سی بے قراری کی تاب نہ لا سکا۔ نہ جانے اُن آنکھوں میں کیسا جادو تھا۔ اُس نے کہا۔

"تمہارے لئے!"

"سچ ——؟"

"ہاں!"

"یہ ہار۔۔۔ یہ ساڑی، یہ۔۔۔!"

"سب تمہارے لئے!"

تاج سب چیزیں لے کر کمرے میں چلی گئی تو، سلمیٰ کی یاد ایک بار پھر اختر کے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں گُم ہو گئی —— کچھ سوچتے سوچتے وہ چونک پڑا۔ تاج وہی لباس پہنے دروازے میں کھڑی تھی۔

"تم ——؟"

"کیسی لگ رہی ہوں؟"

"قریب آؤ کہ تمہاری آنکھوں میں جھانک سکوں!"

"کیا میری آنکھیں اتنی بدصورت ہیں؟"

"نہیں —— وہ اتنی خوبصورت ہیں کہ اُن کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے اپنا وجود کسی گہرے ساگر میں ہلکورے کھاتا ہوا نظر آ رہا ہے!"

تاج قریب آئی۔

"ماں کہاں ہے؟"

"وہ کسی کام سے باہر گئی ہے —— یہ ہار تم میرے گلے میں پہنا دو!" تاج نے ہار اختر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اپنا چہرہ اُٹھاؤ!"

تاج اور قریب آئی۔ اختر کی بانہوں کا حلقہ بڑھا جب اُس کی انگلیوں نے گردن کے خم کو چھوا تو تاج کے جسم میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ وہ کسی اَن دیکھی دُنیا میں کھو گیا۔

"تاج!"

تاج نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ سے کہا "تم کتنے اچھے ہو!"

"اور تم میرے تخیل سے بھی زیادہ پیاری ہو! ایک ایسا خواب ہو جیسے میں ہر لمحہ سوتے جاگتے دیکھنا چاہتا ہوں!"

اُس کے بعد بے خودی کا ایسا عالم آیا کہ تاج نے اختر کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ پھر بے خودی کا یہ عالم ٹوٹ گیا —— اور وہ تیزی سے باہر چلی گئی۔

اُس کی سانسوں میں اب تک تاج کے بالوں کی مہک تھی۔

---

کئی روز بے عنوان گزر گئے۔

سلمیٰ نے ہسپتال میں اختر کے بچے کو جنم دیا اور خود ہمیشہ کی نیند سو گئی! اُس کی موت کی خبر سُن کر اختر کو دُکھ ہوا اور نہ خوشی۔ ایک بار بھی اُس کے دل میں اپنے بچے کی صورت دیکھنے کی خواہش پیدا نہ ہوئی۔ نہ جانے اُس کی آنکھیں کیسی ہوں، ہونٹ کیسے ہیں۔ وہ اُس آگ میں جلتا رہا جس نے ایک بیٹے کو اپنے باپ کی شفقت سے محروم کر دیا تھا۔

اور پھر کئی رنگ بدلے کئی موسم بدلے۔ خزاں سے بہار تک، سرما سے گرما تک اور وقت ایک تیز رفتار ہرنی کی طرح چھلانگیں لگاتے ہوئے تاج اور اختر کی زندگیوں کے آنگن میں گزرتا رہا۔ اس دوران تاج نے زندگی میں جو چاہا مل گیا لیکن وہ پھر بھی تشنہ تھی۔ شاید انسان ازل سے تشنہ اور پیاسا ہے۔ بہرحال اُس کی تشنگی کبھی نہیں بجھی —— تاج کو کبھی کبھی محسوس ہوتا جیسے اُس کی زندگی میں اب بھی ایک بڑا خلا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس کا اپنا ایک —— بڑا اور خوبصورت مکان ہو جس کے آنگن میں رنگ برنگے پھول ہوں جس کی دیواروں پر نقش کاری کی گئی ہو۔ جس کے فرش پر کشمیری قالین بچھے ہوں اور جس کی کھڑکیوں پر نیلے رنگ کے پردے سرسراتے ہوں۔ اِس کے علاوہ بھی تاج کے دل میں ایک اور شدید آرزو تھی، وہ چاہتی تھی۔۔۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا اُس کا ایک بیٹا ہو۔ اختر سے اُس نے کئی بار نئے مکان کے بارے میں باتیں کی تھیں۔ بیٹے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ یہ دونوں چیزیں اختر کے ہاتھوں میں ہوتیں تو وہ شاید اپنی ایک انگلی کے اشارے سے اِنھیں معرضِ وجود میں لاتا۔ لیکن مکان بنانے کے لئے ہزاروں رُدپوں کی ضرورت تھی اور بیٹا —— بھلا یہ انسان کے بس کی بات تھی؟! ایسے ہی وقت پر اختر کو اپنا بیٹا یاد آتا لیکن جس نے اُس کی صورت کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ چاہتا تھا کاش! تاج اُس کے بیٹے کو اپنا لے۔ اُس کے بارے میں پوچھے لیکن تاج اِتنا کچھ پانے کے بعد بھی تشنہ تھی! اختر تھا کہ اِتنا کچھ کھونے کے بعد بھی جیسے بہت کچھ پا یا تھا —— کس نے کیا پایا کیا کھویا؟ دونوں میں سے کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ اختر کو محسوس ہوتا جیسے وہ بے حد مجبور ہے۔ اُس کے پاؤں میں زنجیریں ہیں۔ وہ ہِل نہیں سکتا۔ اُس کی زبان گُنگ ہو گئی ہے۔ وہ بول نہیں سکتا۔ اُس کے دل پر ایک بہت بڑا پتھر ہے۔ بھاری بوجھ ہے۔ وہ دھڑک نہیں سکتا۔ وہ تاج کو بھی نہ چھوڑ سکتا تھا۔ تاج خود ہی اِس کے کمرے میں چل کر آئی تھی۔ تاج نے خود ہی اِس کے دل کے تاروں کو چھیڑا تھا۔ ایک نغمے

کی تخلیق کے لئے اور اس نغمے کی تخلیق کرتے کرتے دل کے ساز کے کتنے تار ٹوٹ گئے تھے لیکن تاج کے چہرے کی دمک، اس کے سانسوں کی مہک اور اس کی زلفوں کا کھل کھل جانا کیا وہ بھول سکے گا؟!!

---

ٹھہرئے!

ذرا میری طرف دیکھ لیجئے۔ آپ شاید سوچ رہے ہوں گے میں اس کہانی میں کہاں سے آٹپکا۔ ابھی بتائے دیتا ہوں کہ میں کون ہوں اور میرا اس کہانی سے کیا تعلق ہے؟ پہلے میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ کبھی کبھی یہ کہانیاں بھی حقیقت کا روپ اپنا لیتی ہیں۔ میری یہ کہانی بھی حقیقت ہے۔ اس کے کردار زندہ ہیں۔ آپ کے جانے پہچانے ہیں ــــــ!!

میں ہی اختر ہوں اور یہ میری زندگی کی حقیقی کہانی ہے لیکن ابھی یہ افسانہ ختم نہیں ہوا، اس کا آغاز ہے یہ۔ محبت جو نگاہوں سے پیدا ہوتی ہے، غزالوں میں پروان چڑھتی ہے اور جسے تاج اور میں نے مل کر ابدیت بخشی تھی، کیا اس طرح ختم ہو سکتی ہے۔ نہ جانے میرے دل میں یہ کیسی بے قراری ہے، کیسی تڑپ ہے۔ جب پرانی یادیں شدت اختیار کرنے لگتی ہیں تو میں نہ جانے کیوں شراب کا سہارا لیتا ہوں۔ فرار چاہتا ہوں ان لمحوں سے . . .

تاج کے پاس اب ایک خوبصورت کوٹھی ہے جس کی باہری دیواروں پر عشق پیچاں کی بیلیں آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں۔ اندرونی دیواروں پر رنگ و روغن چڑھا ہوا ہے۔ فرش پر ایرانی قالین بچھے ہیں۔ کھڑکیوں پر رنگین پردے لٹکے ہیں ــــــ یہ کوٹھی میر صاحب نے بنا کر دی ہے۔ وہ تو میں اسی دن جان گیا تھا جب میر صاحب نے تاج کے گھر آنا جانا شروع کر دیا تھا اور میر صاحب کی عمر کو نظر انداز کر کے تاج سج دھج کر، بن سنور کر میر صاحب کا انتظار کرنے لگی تھی۔

میں نے کئی بار تاج سے کہا مجھے میر صاحب کا اس طرح یہاں آنا پسند نہیں لیکن وہ ہر بار ٹال گئی۔ اپنی محبت کی تذلیل کون چاہے گا۔ میں جب چیخا چلایا تو تاج نے کہا ــــــ "تم سے میری بہتری دیکھی نہیں جاتی تو چلے کیوں نہیں جاتے۔ آخر ہمارا رشتہ کیا ہے؟" اس وقت میرا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور ایک ہنگامہ ہوا۔ صرف ایک آواز سنائی دی ــــــ "نکل جاؤ . . . جاؤ . . . جاؤ . . . !!"

آنسو تھم گئے ہیں ــــــ طوفان تھم گیا ہے۔

میں اب اپنے گھر میں ہوں۔ اپنے ہی کمرے میں لیٹا ہوں۔ اب آنچل میں رنگ نہیں، چوڑیوں میں کھنک نہیں، دبے دبے قدموں کی آہٹیں نہیں۔ وہ دروازہ ٹوٹ چکا ہے جو نگاہوں کی جلوہ گاہ بنا تھا۔ وہ ایک خواب تھا جو میں نے پانچ سال سوتے جاگتے دیکھا ہے، جس نے میری زندگی کا سارا سکون، میرے دل کی ساری شانتی مجھ سے چھین لی ہے۔ یہ کیسی نیند تھی ــــــ سامنے تپائی پر سلمیٰ کی تصویر پڑی ہے۔ بہت اداس، مغموم اور آنکھوں میں انتظار ــــــ

میرا بیٹا جب میرے سامنے آتا ہے تو میں اپنی پلکیں جھکا لیتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے بیٹے کی آنکھیں مجھ سے ایک سوال پوچھتی ہیں ــــــ ڈیڈی! میری ماں کہاں ہے؟ کس نے مار ڈالا میری ماں کو . . . ؟ اور میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ــــــ!!!

## غزل

پروفیسر ارشد صدیقی ایم۔ اے

شب ہوئے کیا رخونِ ارماں دیکھئے
کر کے تو روشن مشعلِ جاں دیکھئے

جب مقدر ہی جنوں ٹھہرا تو پھر اہلِ جنوں
رقص کرتے یا در و دیوارِ زنداں دیکھئے

م خوردہ پھر رہے تھے سب ہی اِس بستی کے لوگ
کر کے آپ کس کس کا گریباں دیکھئے

نکہتِ گُل ایک مرکز پر ٹھہرتی ہی نہ تھی
اہلِ گلشن کس طرح نبضِ بہاراں دیکھئے

ں آئیں ہیں موردِ الزام، لیکن دوستو
ب تلک نفسانیت کا رقصِ عریاں دیکھئے

آپ کیسے چارہ گر ہیں! آپ کا تو فرض تھا
زخم کی گہرائی سے پہلے نمکداں دیکھئے

باغبانوں کی یہی خواہش تھی اے ارشد کہ ہم
فصلِ گُل کے نام پر خونِ بہاراں دیکھئے

## غزل

پروفیسر مہندر پرتاپ چاند ایم۔ اے

جب بھی ضبط کا دامن چھوٹا
دل کا شیشہ اور بھی ٹوٹا

پھر بھی ہم خوش ہیں حالاں کہ
تیرا ہر وعدہ ہے جھوٹا

گلشن کی افسردہ کلیو!
کس نے تمہارا جوبن لوٹا؟

دل تو خدا کا گھر تھا لیکن
ایک حسیں کافر نے لوٹا

مرجھایا سا ہی رہتا ہے
من کی آشاؤں کا بوٹا

کس کی شکایت کس سے کیجے؟
حسن بھی جھوٹا عشق بھی جھوٹا

اس دنیا میں چاند! ہمیشہ
اپنوں نے اپنوں کو لوٹا

## غزل

مجاہد جل گانوی

میرے غم کا جسے احساس ذرا سا بھی نہیں
میں اسے دل سے بھلا دوں، یہ گوارا بھی نہیں

پاسِ آدابِ محبت ہے کہ ہوں مُہر بلب
اور مفہومِ خموشی وہ، سمجھتا بھی نہیں

مدتوں آنچ پڑی میرے بدن کی اُس پر
وہ صنم، سنگ ہے ایسا کہ پگھلا بھی نہیں

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے، کیا سمجھوں
اجنبی اب وہ نہیں ہے تو شناسا بھی نہیں

کہیں میلا نہ ہو چھونے سے وہ آئینۂ حسن
احتیاطاً میں اُسے ہاتھ لگاتا بھی نہیں

جو مری رات کے ماتھے کا ستارہ بن جائے
اب مرے ہاتھ میں ایسی کوئی ریکھا بھی نہیں

تیرے زخموں کا مداوا ہو مجاہد کیسے
سب ہی قاتل ہیں یہاں ایک مسیحا بھی نہیں

## غزل

سید شکیل دسنوی

رخصت اے ہوش و خرد ہم کو تیار آ ہی گیا — اب جہاں رہبر جنوں ہے وہ دیار آ ہی گیا
کس قدر دلکش ہے آخر کھا گئے ہم یہ فریب — آپ کے وعدے پہ دل کو اعتبار آ ہی گیا
شعلۂ غم جب بڑھا، دل کی تپش کچھ یوں بڑھی — اشک آنکھوں میں مری بن کر شرار آ ہی گیا

حسن کی ہر اک ادا پیاری ہے یوں تو اے شکیل
ہم کو لیکن سادگی پر اُن کی پیار آ ہی گیا

# خدا کی واپسی

ایم۔ ایف۔ پرویز ایم۔ اے

۸۳۳، روی وار پیٹھ، پونا نمبر ۲

توقیر اعظم تسلیمات

جب چاروں طرف آگ بھڑک رہی ہو، نفرت اور بربریت کی آگ! معصوم اور ننھے بچے، حسین دوشیزائیں اور پیاری مائیں اور عزیز بھائی اس میں جل رہے ہوں، تب انسان محبت اور رومان کی کیا باتیں کرے! لیجئے ایک کہانی "خدا کی واپسی" ارسال کر رہا ہوں۔ وہ پر اسرار لڑکی جس کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون تھی؟ کیا تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ فسادات کا شکار ہو گئی۔ ایک زندگی مٹ گئی، ایک کہانی ادھوری رہ گئی، ایک پھول شاخ سے نوچ لیا گیا۔ نہ جانے ایسی کتنی کلیاں ہمارے ہاں آئے دن ہونے والے فسادات کی نذر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ہم خدا اور مذہب کی تو بہت باتیں کرتے ہیں، لیکن انسان کی باتیں نہیں کرتے۔ جب تک ہم انسان کو نہ سمجھیں گے، اس کی قدر و قیمت نہ جانیں گے، مذہب اور خدا کا مفہوم کبھی ہماری سمجھ میں نہ آئے گا۔ مذہب اور فرقوں کے نام پر تشدد ہوتا رہے گا، خون بہتا رہے گا ——— افسانے کو مختصر کرنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ بہرحال۔ امید ہے پسند آئے گا۔۔۔

آپ کا ——— ایم۔ ایف۔ پرویز

کافی تلاش اور دوڑ دھوپ کے بعد مجھے شہر میں ایک کمرہ مل گیا۔ جب
ں نے اپنا سامان کمرے میں رکھا اور کمرے کو مقفل کرکے باہر نکلا تو شام گہری ہو چکی
ں۔ میں چابی گھماتا آہستہ آہستہ پھاٹک کی طرف بڑھنے لگا۔ باہر بہت اندھیرا تھ
ر راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چابی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر پتوں کے
ھیر میں گر گئی۔ میں جھک کر چابی ٹٹولنے لگا۔ لیکن کافی تلاش کے باوجود چابی نہ ملی۔
ں مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا کہ اچانک ایک خوبصورت سا ہاتھ آگے بڑھا اور چابی
ری طرف بڑھاتے ہوئے کسی نے کہا: "یہ رہی آپ کی چابی"۔ ایک خوبصورت سی
کی میرے پیچھے کھڑی تھی۔ چابی میرے ہاتھ میں تھما کر وہ پھاٹک سے باہر نکل گئی۔
اندھیرے میں اس کی سفید ساری جھلملا رہی تھی۔ اس کے بالوں میں لٹکا ہوا
مین کے پھولوں کا گچھا مرجھا چکا تھا لیکن اب بھی ان سے خوشبو پھوٹ رہی تھی۔

رات کے دس بجے شہر کی مختلف سڑکوں سے گزرتا گشت کرتا ہوا جب میں اپنے آپ کو اس شہر کی نئی گلیوں سے مانوس کرنے کی کوشش میں تھک کر واپس لوٹا تو میں نے دیکھا، پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ وہاں ایک چھوٹا سا بلب جھلملا رہا تھا اور ریلنگ سے لگی ہوئی وہی لڑکی خاموش کھڑی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے مجھے محسوس ہوا جیسے وہ میرا ہی انتظار کر رہی ہے۔ نیم تاریکی میں وہ بہت خوبصورت معلوم ہوئی۔ ایک عجیب مسرت سے میں کانپ گیا اور کمرے میں لوٹ آیا۔ جی چاہا پھر لوٹ جاؤں اور ایک نظر اسے دیکھ آؤں۔ کیسی آسمانی خوبصورتی ہے۔ نظر اٹھا کر بھی دیکھ نہ پایا اور وہ جھونکے کی طرح آئی اور چلی گئی۔

نئے مقام پر نیند کبھی جلد نہیں آتی۔ شاید نئے مقام سے ناواقفیت کی بنا پر بستر نوچتے ہوئے آتی ہو۔ میں نے سونے کی بہت کوشش کی، لیکن نیند نہ آئی۔ باہر گہری خموشی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں اب بھی تیز روشنی تھی۔ شاید کوئی اور بھی وہاں جاگ رہا ہے۔ لیکن کسی کی آواز نہیں آتی۔ اتنی خاموشی کیوں؟ میں پھر باہر نکل آیا اور

# یاد

تجھ کو یاد آئے تو ساری کائنات
ایک بھولی سی کہانی ہوگئی ——— امیر مینائی

رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے ——— فیض

پھر میں خدا کو بھول کے یادِ صنم میں ہوں
محروم! کیا کروں؟ یہی مرضی خدا کی ہے ——— تلوک چند محروم

نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں! ——— حسرت موہانی

اِس میں مدت سے تری یاد کی آہٹ بھی نہیں
دل کسی جنگلوں کی سنسان گلی ہو جیسے ——— عابد مناودی

مرسلہ: ایم۔ اے۔ انصر، کلکتہ

---

نے اِرد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ مکان کے سامنے ایک چھوٹی اور تنگ سڑک تھی۔ ستے میں کچھ گائیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ٹوٹی ہوئی کاروں کے مُردہ پنجر، ایک ری، جس کے نیچے دو تین لوگ ننگ دھڑنگ پڑے سو رہے تھے۔ میونسپلٹی کی کوڑے ٹ کی گاڑی، ایک کُتا جو کھینچ کھینچ کر گاڑی میں سے کسی چیز کو نوچ کھسوٹ رہا تھا۔ ری نظر ایک کھڑکی پر پڑی۔ ایک موٹی سی توند والا بنیا تجوری سے نکال نکال کر ٹ گن رہا تھا۔ پتہ نہیں اِس میں کتنے نوٹ اُس کے خون پسینے کی کمائی ہیں اور کتنے بچ کھسوٹ کا مال! میں نے اوپر نظر ڈالی تو دیکھا، پھر وہی لڑکی خاموش کھڑی مان کو تک رہی ہے۔ اُس وقت وہ مجھے بہت پُراسرار معلوم ہوئی۔ کیا واقعی یہ کی لڑکی ہے؟ اتنی خوبصورت کہ آنکھ ٹھہرے۔ کیسا شیتل، پُرسکون، معصوم، دلفریب، سین چہرہ ہے۔ جیسے شبنم میں ڈبویا پھول، جیسے سیاہ گھٹاؤں میں چھپی ہوئی سنہری ن! کیا اُسے کبھی نیند نہیں آتی؟ اِتنی رات گئے اُسے کس کا انتظار ہے؟

دُوسری صبح جب میں دفتر جانے کے لئے نِکلا تو پہلی نظر اُسی کے افسوں طراز سن پر پڑی۔ راستے سے گزرتے ہوئے میرے ذہن میں صرف اُسی کا پیکر تھا۔ اُسی کی ھیں تھیں اور شاید میں اُن کا اثر سارا دن محسوس کرتا رہا۔ جب جب اُس کا تصور آنے لتا، یوں محسوس ہوتا کوئی مجھے تھوڑی تھوڑی شراب پلا رہا ہے!

شام کو بہت بے چینی سے اُس کے دیدار کا منتظر تھا۔ لیکن وہ نظر نہ آئی۔

ساتھ والے کمرے سے کہ زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ ایک بوڑھے کی آواز تھی۔ وہ اپنی پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔

"ہاں، ہاں او وہ مجھے ملا تھا۔ سچ مچ ملا تھا۔ اُس نے مجھ سے بات بھی کی تھی لیکن میں اِس قابل نہ تھا کہ اُسے سمجھ سکوں، پہچان سکوں! آدمی جب پہلی بار دُوسرے آدمی سے ملتا ہے تو وہ اُسے بمشکل پہچان سکتا ہے۔ پھر خدا کو کوئی کیسے طرح اِتنی جلدی پہچان سکتا ہے۔ اُس نے کئی بار کہا، میں خدا ہوں، خدا ہوں، خدا ہوں! مجھے پہچان لے، جان لے! لیکن میں نے اُسے پہچاننے سے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ میرے تصور میں خدا تو صرف آسمان میں رہنے والی کسی مافوق الفطرت ہستی کا نام تھا!"

کہنے والا خاموش ہوگیا تھا۔ کچھ لمحوں کے لئے گہری خموشی رہی۔ میں سمجھ گیا شاید دو فلاسفر خدا کے متعلق بحث کر رہے تھے اور باہم جھگڑ رہے تھے۔ لوگ خدا کے متعلق کیوں سوچتے ہیں اور کیوں بحث کرتے ہیں۔ بحث تو انسان کے متعلق کرنی چاہئے کہ وہ کیسا ہے اور کیوں ہے اور کیسا ہے؟ کہتے ہیں رُوحانی تسکین کے لئے خدا کو یاد کیا جاتا ہے۔ دُکھ درد اور مصیبت میں، مجبوری اور لاچاری میں بس ایک خدا ہی یاد آتا ہے اور اُس کے ذکر سے دلوں کو سکون ملتا ہے، اطمینان ملتا ہے۔ لیکن جب جب میں نے لوگوں کو خدا کے بارے میں بات کرتے دیکھا اور سُنا، اُس کا نتیجہ صرف جھگڑے، فساد، خون خرابہ اور آخر میں جنگوں کی صورت میں نکلا! آخر خدا کا انسان کی دُشمنی سے کیا تعلق ہے؟ شیخ کا خدا الگ اور برہمن کا خدا الگ کیوں ہے؟ وہ خدا جب ہوا، پانی، روشنی، دھوپ، روٹی اور روزی دیتا ہے تب وہ شیخ و برہمن کا فرق کیوں نہیں کرتا۔ تازہ ہوا کے خوشگوار جھونکے، پھولوں کی بھینی بھینی نکہت، چاند کی ٹھنڈی شعاعیں، یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ شیخ کے پہلو کو گدگدا دیں، اُسے مہکا دیں، چمکا دیں اور برہمن کو اِن سے محروم کر دیا جائے؟ یہ تفریق اور انسانوں کی یہ شیرازہ بندی جس نے بھی کی ہے وہ خدا کا محبوب ہرگز نہیں ہو سکتا، وہ تو خدا کا دُشمن ہے جو اُس کی مخلوق کو حصّوں میں بانٹ کر نفرت کے پیڑ پودے اُگا کر خود اُس کی چھاؤں میں آرام کرنا چاہتا ہے۔

میں بہت دیر تک خدا کے متعلق سوچتا رہا۔ بوگن ویلیا کے جامنی پھولوں کی ایک ٹہنی کھڑکی سے اندر جھانک رہی تھی۔ دو نیلے نیلے پھول بہت معصومیت اور پیار سے مجھے تک رہے تھے۔ باہر ہوا کسی ستم رسیدہ بوڑھے کی مانند سسکیاں لے رہی تھی۔ تارے جھلملا رہے تھے۔ مہکتی ہوئی کلیوں سے سارا باغ رشکِ ارم بنا ہوا تھا۔ میں باہر نکل کر آسمانوں میں پھیلے ہوئے بھورے بادلوں کو دیکھنے لگا۔ یکایک کسی نے مجھے پکارا: "سُنئے!" میں مُڑا۔ سراپا حسن و جمال وہ پری میرے بہت ہی قریب

نزدیکی میں بہت کچھ کہہ بھی نہ سکا صرف اسے دیکھتا رہا۔ "جی —— فرمائیے!" اس نے شانِ لب کھولے۔

"وہ آپ کے ساتھ والے کمرے میں جو نوجوان رہتا ہے۔ اس سے بالکل نہ ملیے گا۔ کبھی وہ آپ کو بھی پاگل کر دے گا۔" اس نے کہا۔

"جی؟" اس سے پہلے کہ میں کچھ اور پوچھتا، وہ لوٹ چکی تھی۔ اس کے نازک ہونٹوں سے فضا میں بکھرتے ہوئے الفاظ کسی ملکہ کے فرمان کی طرح میرے کانوں کے پردوں سے بار بار ٹکراتے رہے۔ اس کی آواز کھنکتے ہوئے ساز سے مشابہ تھی۔ اور اس کا لہجہ آہستہ آہستہ گرتی ہوئی برف کی طرح ملائم اور سبک رو تھا۔ میں اس کی پرچھائیوں کو دیکھتا رہا۔

پھر بہت دنوں تک مجھے فرصت نہ ملی کہ میں کبھی ادھر ادھر نظر ڈالتا۔ میں اپنے کاموں میں بے انتہا الجھا ہوا تھا لیکن جب سے اس نے نوجوان سے ملنے سے منع کیا تھا، میری بے چینی اور تجسس اس سے ملنے کے لئے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اب تو اس نوجوان سے ملنا ہی چاہئے۔ یقیناً وہ بہت دلچسپ آدمی ہوگا! پھر اس نے مجھے منع کیوں کر دیا؟ ہو سکتا ہے دونوں میں کوئی پرانی دشمنی چلی آ رہی ہو۔

---

# ترکِ محبت

جنونِ محبت یہاں تک تو پہنچا
کہ ترکِ محبت کیا چاہتا ہوں —— قمر

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی —— حیات امروہوی

نہ اب تم سے محبت ترک اب ہو نہیں سکتا
ستارو، تم بتاؤ کس طرح اب ہم جدا ہوں گے —— شاد عظیم آبادی

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے —— ساحر لدھیانوی

نہ گھبرا اے دلِ ناداں ابھی ترکِ محبت پر
نصیبِ دشمناں جب کوئی یاد آیا کیا ہوگا —— خمار بارہ بنکوی

مرسلہ:- ناہید بانو بی۔ اے، گورکھپور

---

ایک رات میں کچھ اداس اور پریشان تھا۔ شاید یہ مسلسل ذہنی تھکان کا اثر تھا۔ میں اکیلا کمرے میں بیٹھا ریڈیو سن رہا تھا۔ اچانک لتا کی آواز نے میرے اداس موڈ کو اور بھی اداس بنا دیا۔ وہ ایک پُر درد گیت گا رہی تھی۔ اس کے دکھ بھرے لہجے میں بہت متاثر ہوا۔ نہ جانے کیوں دل بیٹھا جا رہا تھا۔ یہاں کسی کو نہیں جانتا، کس سے بات کروں؟ عجیب تنہائی ہے —— اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو۔ غالب اس تنہائی کے متلاشی تھے اور یہاں جان پر یہ آن پڑی ہے کہ رہیں تو کیا کریں۔ تنہائی کے اندھیرے میں مر رہیں یا تصورات کی دیواروں میں چھلانگیں لگاتے چلے جائیں۔ یکایک مجھے خیال آیا، کچھ پڑھ ڈالوں۔ زرگاؤں کی رانی! اس نے مجھے اور بھی حزیں اور شکستہ دل بنا دیا۔ آئرس مرڈوک! میں کچھ دیر Bruno's Dream پڑھتا رہا —— نئی بات کچھ بھی نہ تھی۔ لیکن آئرس کے بیباک اور فلسفیانہ انداز نے مجھے کتاب پڑھتے رہنے پر مجبور کر دیا۔ جب میں کلائمکس پر پہنچ گیا، جبکہ برونو طوفان میں بری طرح گھر جاتا ہے اور طوفانی بارش ہونے لگتی ہے تب یکایک کسی نے دروازے پر دستک دی۔ صبح کے پانچ بج چکے تھے۔ وہ لڑکی مجھے جاگتا دیکھ کر چونک پڑی تھی۔ شاید اس نے شیشے کی کھڑکیوں سے مجھے مطالعہ میں مصروف دیکھ لیا تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا اور کہا "اندر آ جائیے" کیونکہ باہر سرد ہوا تھی۔ لیکن وہ ایک قدم بھی اندر نہ آئی۔ صرف مجھے چپ چاپ دیکھتی رہی اور ویسے ہی لوٹ گئی۔ میں پھر دم بخود کھڑا حیران رہ گیا۔ جب یہ کچھ کہنا ہی نہیں چاہتی تو کیوں آتی ہے؟ کیوں مجھے پریشان کرتی ہے —— اُف! میں نے آنکھیں بند کر لیں اور شاید بہت گہرے سپنوں میں کھو گیا ——

میں بے انتہا مسرور ہوں۔ شیریں میرے سامنے کھڑی ہے، شرماتا حجاب! بے انتہا حسین! ہم ایک دوسرے کے ہو گئے ہیں۔ "میں یہاں آیا ہوں تب سے تم یونہی دور دور کھڑی مجھے ترسا رہی ہو۔ جلوے دکھا دکھا کے چھپ جاتی ہو۔ آخر بات کیا ہے۔ آج تو قریب آ جاؤ!"

"اوں —— ہوں —— !" وہ ایک قدم اور دور ہٹ جاتی ہے۔ "ابھی نہ آؤں گی۔ پہلے اپنی ممی کو یہاں لاؤ۔ مجھے ان سے ملنے کا بہت شوق ہے۔ میری ماں نہیں۔ میں ساری عمر تمہاری ممی کی خدمت کروں گی۔ تم سے تو بالکل بات نہ کروں گی بس ساری زندگی یونہی منہ چڑا کر بھاگ جایا کروں گی۔ تم زندگی بھر میری آرزو میں گزار دو گے۔ وہ آرزو کتنی قیمتی ہوگی —— میں ساری زندگی تمہیں پانے کی صرف حسرت ہی کیا کروں گی۔ وہ حسرت کتنی جانفزا ہوگی!!" وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ "نہیں نہیں نہیں!"

میں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ "شٹ اپ، یو فول! اب یہ سب کچھ نہ چلے گا! آؤ اس کھیت میں چلنے والے ہل کے ساتھ ساتھ دوڑتے چلے جائیں۔ پنڈلیوں تک مٹی میں

دھنس جاتی۔ سر میں خنک، کپڑوں میں آتی ہوئی ہوا سارے بدن میں دُھول ہی دُھول ہو جائے۔ آؤ۔۔۔ یہ دُور تک۔ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سارے کے سارے کھیت میرے ہیں اور ان میں اُگی ہوئی یہ گیہوں کی سرسبز بالیاں اور اُس طرف گملوں کے خوبصورت پھول! آؤ میرے ساتھ آؤ! ہوا بہت شوخ ہے، فضا بہت الھڑ ہے سارا جہاں اپنا ہے۔ یہ آسمان، یہ زمین یہ سارے نظارے!!! یہ سب میرے ہیں!!
جب آنکھ کھلی تو دھوپ کھڑکیوں سے جھانک رہی تھی [illegible]
نیچے گرا پڑا تھا۔

میں دبے قدموں بُوڑھے کے کمرے میں گیا۔ وہ کچھ لکھ رہا تھا شاید یہ اُس کی ڈائری تھی۔ مجھے آتے دیکھ کر ڈائری اُس نے اُٹھا کر تپائی پر رکھ دی اور پُرتپاک انداز میں مجھ سے ملا۔

"معلوم ہوتا ہے اِس شہر میں نئے آئے ہو۔ لیکن میں تمہارے متعلق بہت کچھ سُن چکا ہوں۔ تم شہر میں پڑھانے آئے ہو۔ کیا پڑھاؤ گے؟ اُردو، ہندی، انگریزی، مراٹھی، گجراتی، کنڑ؟ میرا تو خیال ہے ہمیں ان زبانیں پڑھنے، پڑھانے اور سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ لوگ زبانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ زبان کی نفرت انسان کی نفرت بن جاتی ہے۔ پروفیسر کچھ ایسا سبق پڑھاؤ کہ لوگ یہ بھول جائیں کہ وہ بنگالی ہیں یا راجستھانی، پنجابی ہیں یا مدراسی! بتاؤ کیا پڑھاؤ گے! کسی ایک زبان کو کیوں نہیں اپناتے؟"
وہ نہ جانے کتنی دیر تک یونہی بولتا رہتا، اگر میں مداخلت نہ کرتا "آپ کیا کرتے ہیں؟"

"میں تو بچپن سے بیکار ہوں، پاگل ہوں ۔۔۔۔۔ میرا کیا شغل ہو سکتا ہے!"
میں نے محسوس کیا کوئی چیز اندر ہی اندر اُسے بُری طرح چبھ رہی ہے اور وہ جھوٹے الفاظ کی آڑ میں اُسے چھپا رہا ہے۔
"لیکن کچھ تو کرتے ہوں گے آپ؟"
"ہاں ۔۔۔۔ کر رہا ہوں، بچپن سے کر رہا ہوں، خُدا کی تلاش ۔۔۔۔ اِ خُدا کا انتظار!! آدمی کو خُدا کی تلاش کرنی ہی چاہیئے۔ جس طرح بیوی یا محبوبہ کی تلاش کی جاتی ہے!"

"لیکن خُدا تو ہر آدمی کو نہیں مل سکتا!"
"ہاں مل سکتا ہے۔ خُدا مجھے مِلا تھا۔ وہ بہت مایوس تھا مجھے دیکھ کر اُس کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ اُبھری تھی اور پھر اُس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔"
"تم خُدا ہو کے روتے ہو؟" میں نے گھبرا کے اُس سے پُوچھا تھا۔
"ہاں ۔۔۔۔ !" خُدا نے جواب دیا تھا "مجھے تم لوگوں پہ رونا آتا ہے تم نے میری دُنیا برباد کر دی، تباہ کر دی، میرے مقصد اور میرے مفہوم کو خاک میں ملا دیا۔ اصل کو نقل سے بدل دیا۔ سچ کو جھوٹ بنا ڈالا۔ اندھوں کو آنکھیں دے دیں آنکھ والوں کو اندھا کر دیا۔۔" وہ کچھ دیر چُپ رہا پھر بولا: "میں نے ہوا کو چلنا سکھایا اور پھولوں کو مہکنا، میں نے چاند کو اُبھرنا سکھایا اور ستاروں کو چمکنا۔ دریاؤں کو بہنا اور پہاڑوں کو خاموش رہنا ۔۔۔۔۔ اور حُسن کو ناز و انداز، عشق کو اضطراب، جُستجو، سوز و جنوں! اور میں نے۔۔"

"میں نے تم سب انسانوں میں زندہ رہنے کی خواہشیں، خوشیاں، ارمان، مسرتیں، حسرتیں، جذبے پیدا کئے۔ لیکن تم نے زمین کے ساتھ ساتھ ان پر بھی حکومت شروع کر دی۔ جذبات و احساسات کو ستم اور ظلم کی زنجیروں میں جکڑ دیا، عقل کے گڑھے کھود دئے اور جہالت کو دفن کرنے کی کوشش میں خود ہی اُن گڑھوں میں گر پڑے ۔۔۔۔۔ اب تم روتے ہو، چلّاتے ہو، خُدا نے ہمیں کیوں پیدا کیا؟ یہ غریبی کیوں دی؟ یہ امیری کیوں بنائی؟ ہمیں بھوکا کیوں رکھا؟ ہمیں خوشیاں کیوں نہ دیں؟ ہمارے ساتھ یہ ناانصافی کی ۔۔۔۔۔ اپنے ہاتھ سے گلا کاٹ کر چیختے ہو خون کس نے کیا، خون کیوں بہہ رہا ہے ۔۔۔۔!!"

"لیکن قاعدے قانون اور اصول تو سماجی زندگی کی جان ہیں، اور اگر ہم۔۔"
"تم نہیں دیکھتے گلاب کے پھول برگد کے پیڑ پر نہیں اُگتے۔ کوّے کے پیٹ سے بھینس کا جنم نہیں ہوتا۔ پھولوں کی جگہ تتلیاں نہیں اُگتیں، سُورج سے شبنم نہیں ٹپکتی، بادلوں سے آگ نہیں برستی؟"
"اب خُدا کی آنکھوں میں غصہ کانپ رہا تھا۔ غصے کو برداشت کرنے کی مجھ میں تاب کہاں تھی۔ میں بھاگ نکلا۔"
رات گئے تک میں بُوڑھے کی باتوں میں اُلجھا رہا۔
رات میں میں نے اُس لڑکی کو کئی بار باہر ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ وہ کون تھی؟ اِس مقام سے اُس کا کیا تعلق ہے؟ کب سے یہاں رہتی ہے؟ وہ کس کی بیٹی ہے؟ کس کی بہن ہے؟ دُوسری رات میں نے فیصلہ کر لیا اب کی بار اُس بُوڑھے سے اِس لڑکی کے بارے میں بھی ضرور

قارئین سے مسلسل اِصرار پر الجھن کی غلط فہمی دُور کرنے کے لئے ہم یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ادارۂ 'بیسویں صدی' دہلی کا 'بیسویں صدی' لاہور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سوائے اِس کے کہ وہ ہمارے تمام مضامین بلا حوالہ نقل کر لیتے ہیں اور ہمارے 'تیر و نشتر' اور 'صحت و زندگی' کے مضامین بھی اپنے نام سے شائع کر لیتے ہیں اور پڑھنے والوں کو مغالطہ میں رکھنے کے لئے ہمارے سرورق کا ہو بہو چربہ بھی چھاپ لیتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ منیجر رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج دہلی نمبر ۶

جاننے کی کوشش کروں گا۔

جب میں نے بہت کُرید کُرید کر اُس سے تفصیل پوچھی تو اُس کی بے چین آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ پھر اُس کی گہری آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور اُس نے کہا۔

"ہر انسان کی زندگی ایک کہانی ہے، افسانہ ہے۔ تم سنو گے اور دلچسپی سے بیچ ہی میں چھوڑ دو گے۔ میں تمہیں کچھ بھی نہیں کہہ سکوں گا۔ ایک زندگی جو ساٹھ برس کی ہے کتنے دن ہوتے ہیں ساٹھ برسوں میں اور کتنی گھڑیاں اور کتنے لمحے ہوتے ہیں۔ ایک لمحہ دوسرے لمحے سے کتنا مختلف ہوتا ہے۔ پھر میں کیسے ان تمام لمحات کو یکجا کر کے ایک کہانی بنا دوں، کس لمحے سے اپنا ذکر شروع کروں؟ میں اتنا جانتا ہوں جس روز میں پیدا ہوا اُسی دن میرے باپ کو قتل کر دیا گیا — ایک چھوٹے سے پالنے میں میں جھول رہا تھا اور اُس پالنے کے قریب میرے باپ کی لاش خاک و خون میں لتھڑی پڑی تھی اور یہ سب دیکھ کر میری ماں کے سینے میں دودھ سوکھ گیا تھا اور میں بھوک سے بلک رہا تھا۔۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ ہم لوگ ایک ایسی گلی میں رہتے ہیں جہاں شام گئے تک اور آدھی رات کے بعد بھی طرح طرح کے لوگ آتے رہتے ہیں اور ماں اُن سے باتیں کرتی ہے۔ جب لوگ آتے ہیں تو وہ ہنستی ہے اور جب وہ چلے جاتے ہیں تو وہ روتی ہے۔ جب مجھے کچھ ہوش آیا تو میں نے ماں سے سب پوچھ لیا۔ باپ کے مرنے کے بعد بے سہارا جان کر اُسے یہاں آنے پر مجبور کر دیا تھا لوگوں نے۔ کیونکہ میرا باپ مسلمان تھا اور ماں ہندو تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہندو اور مسلمان کیا ہوتا ہے۔ لیکن میں ماں کو روتا دیکھ کر ہر دم یہی کہتا، "ماں چل بھاگ چلیں۔ یہاں سے دور! باہر تو بہت چوڑی سڑک ہے جس پر ہر دم تیز موٹریں دوڑتی ہیں اور بازار کتنا خوبصورت ہے۔ بچے کتابیں بغل میں دبائے اسکول جا رہے ہیں۔ مجھے یہ لوگ، یہ گلی، یہ بدبو پسند نہیں!! ماں اور سسکنے لگتی اور کہتی، بھیک مانگ کر تیری پرورش کیسے کی جا سکتی ہے؟

ایک شام جب میں ماں کے پاس بیٹھا اُس کے آنچل سے کھیل رہا تھا تب کچھ لوگ وہاں آئے۔ وہ میری ماں کو ایک کار میں بٹھا کر لے گئے — ماں نے کہا تھا میں جلد لوٹ آؤں گی، سو مت جانا! لیکن ساری رات گزر گئی، ماں نہ لوٹی۔ میں ساری رات نہ سویا۔ دوسری رات بھی نہ لوٹی، تیسری رات بھی نہیں — اور پھر ایک رات جب اُس مکان کی بوڑھی مالکن میرا سودا طے کر رہی تھی، میں چپکے سے بھاگ نکلا۔ بھاگتے بھاگتے سیدھا اسٹیشن پہنچا اور ایک ٹرین میں چڑھ گیا۔ اُس دن سے آج تک میں یہاں ہوں۔ میں نہیں جانتا میں کس شہر میں پیدا ہوا! کہاں سے بھاگ کر آیا؟ کہاں ہے میری ماں! اور کہاں ہے وہ خدا جس نے میرے ساتھ اتنی بے انصافی کی! اُس نے انسان کا روپ دے کر میرے ساتھ اتنا بھیانک سلوک کیوں کیا؟ کیا وہ مجھے جانور نہیں بنا سکتا تھا؟ کاش میں جانور ہوتا! — کسی دوسرے جانور کا محتاج تو نہ ہوتا — خدا مجھے چیل بنا دیتا، کوا بنا دیتا، کُتا ہی بنا دیتا۔ تاکہ دوسروں پر غرّا تو سکتا!!"

ایک سنہری شام جب سورج ڈھل رہا تھا اور سنہری رنگت نیلے شیشوں سے چھَن رہی تھی میں تیز ہواؤں میں اُڑتے پرندوں کو دیکھ رہا تھا کہ مجھے ایک آہٹ سی محسوس ہوئی۔

"ارے آپ ہیں۔ اتنے دن آپ کہاں رہیں؟ میں تو اُس بوڑھے کے متعلق سب کچھ جان چکا ہوں، لیکن آپ اپنے متعلق کچھ بتاتی ہی نہیں؟"

"آپ نہیں جانتے۔ میں حُسن و جمال، مسرت اور محبت، سُکھ اور امن، نغمہ اور لَے ہوں۔ میں موسیقیت ہوں، ترنّم ہوں، بہار ہوں، رنگ ہوں۔ یہ میری دنیا ہے، یہ میرے کھیت ہیں، یہ لہلہاتی وادیاں ہیں، یہ سبزہ زار ہیں، یہ پہاڑ ہیں، یہ پھول ہیں — یہ پرندے ہیں، یہ —"

یکایک باہر شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر شور و غل بڑھتا رہا — پھر بھاگ دوڑ، واویلا، چیخ و پکار۔ آگ! آگ! بچاؤ! اُف! آگ! مارو! طوفان، شور، غوغا، لاٹھیاں، پتھر، شیشے، گولیاں، پتھر اور آنسو گیس کے بلب، خون، خون! پھر خون کا سیلاب!!

ایک تیز چمکتی ہوئی چھُری میری آنکھوں کے سامنے لہرائی اور اُس لڑکی کے جسم سے خون کے فوارے چھوٹ پڑے۔

"فساد ہو گیا! دنگا ہو گیا — ہندو مسلمان کا دنگا ہو گیا!!" لوگ چیخنے لگے۔ ایک اور دلدوز چیخ اُبھری "کمینے! بدمعاش! خبردار میرے بچے کو ہاتھ نہ لگانا کُتّے!"

بہت سے لوگ جمع تھے اور سب ہنس رہے تھے۔ ایک نے بڑھ کر ایک چھوٹے بچے کو اٹھا کر آگ میں پھینک دیا — اب ایک دوسرے بچے کی باری تھی۔ عورت گڑگڑانے لگی، دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اب اُس کی آواز میں غصّے کی بجائے لاچاری، مایوسی اور بے چارگی تھی۔

"میرا بچہ! ہائے! اِسے چھوڑ دو۔ اسے چھوڑ دو۔ میں تمہارا دھرم، ایمان، مذہب سب کچھ قبول کرنے کو تیار ہوں! لیکن میرا بچہ مجھے دے دو! یہ میرا آخری بچہ ہے!" لیکن ایک زنگ آلود چھُرا اُس بچے کے پیٹ میں بھونک کر دیا جا چکا تھا!!

میں دوڑتا ہوا بوڑھے کے کمرے کی طرف گیا۔

"یہ سب کیا ہے۔ کیا خدا نہیں دیکھ رہا ہے؟ وہ کیوں چُپ ہے؟ یہ حیوانیت اور یہ درندگی —!" وہ مجھی سے کہہ رہا تھا۔ "میں خدا کو ضرور بتاؤں گا۔ ضرور ملوں گا اُس سے اور یہ سب بتا کر ہی دم لوں گا!"

"نہیں۔ وہ جا چکا ہے اِس دنیا سے بہت دور۔ اب وہ کبھی واپس نہ آئے گا!!"

میں نے آہستہ سے جواب دیا اور اُس لڑکی کی بے چین سی مُردہ آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ انہیں کس کی تلاش تھی؟؟

---

# غزل

محمد غلام محی الدین حبیبی القادری ساغرؔ کنگی

حسن ایسے چھپا ہے آنچل میں
ماہِ کامل ہو جیسے بادل میں

ہے بڑا فرق آج اور کل میں
کیا خبر کیا ہو صرف اک پل میں

یوں ہے جیون دکھوں کی ہلچل میں
جیسے دو بوند اشک جل تھل میں

آ کے ہم تیرے آج اور کل میں
پھنس گئے کشمکش کے دلدل میں

بیل بوٹے ہیں پیرہن میں ترے
یا ستارے گگن کے آنچل میں

ہر خوشی مٹ کے رہ گئی میری
زندگی کے غموں کی ہلچل میں

تجھ سے ہی رنگِ بزمِ رقص و سرود
راگ جیون کا تیری پایل میں

تیری آواز میں ہے ایسی مٹھاس
جیسے کوئل کی کوک جنگل میں

میرے دل میں ہے دردِ غم کی کسک
پھول خوشبو کے تیرے آنچل میں

تلخیاں زیست کی جھلکتی ہیں
میرے ماتھے کے ایک ایک بل میں

ہے نہاں میرے رنج و غم کا علاج
بادۂ ارغواں کی بوتل میں

آ کے دنیا میں یوں ہوا محسوس
جیسے ہم آ گئے ہوں مقتل میں

دل میں ساغرؔ خوشی کی آس لئے
ہم بھٹکتے ہیں غم کے جنگل میں

# غزل

آزادؔ گورداسپوری بی۔ اے

ہونٹوں پہ تبسم جو ترے کھیل رہا ہے
بیمارِ دلی ہی دردِ محبت کی دوا ہے

منجدھار سے بچ کر تو نکل آئے ہیں لیکن
سنتے ہیں کہ ساحل پہ بھی طوفان اٹھا ہے

ساقی میں تری چشمِ عنایت کے تصدق
جو تو نے پلائی ہے ضرورت سے سوا ہے

فرقت میں گنا کرتے ہیں جو رات کو تارے
وہ زلف کو کہتے ہیں کہ گھنگھور گھٹا ہے

کیوں سنتے نہیں قصۂ ناکامِ محبت
کیا بات ہے کیوں آپ نے دل تھام لیا ہے

ساغر سے صراحی سے برستی ہے اداسی
کس رند نے میخانے میں دم توڑ دیا ہے

کوئی نہیں غمخوار زمانے میں تو کیا غم
آزادؔ غریبوں کا مددگار خدا ہے

LIFEBUOY
health
لائف بوائے
ہے جہاں
تندرستی
ہے وہاں
لائف بوائے صابن کے غسل سے بڑھکر فرحت بخش اور
کوئی چیز نہیں۔ آپکو تازگی اور تندرستی عطا کرنیوالی
ایسی اور کوئی چیز نہیں۔ دراصل' لائف بوائے
جیسا اور کوئی صابن نہیں کیونکہ...
لائف بوائے
میل میں چھپے
جراثیم کو دھو ڈالتا ہے
ہندوستان لیور کی ایک اعلیٰ پیشکش

# بہت پُرانی بات

شاکر کریمی

گنج نمبر ا۔ بتیا (بہار)

بعد سلام و نیاز

"بہت پُرانی بات" حاضر خدمت ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ——— بات واقعی بہت پُرانی ہے مگر پیش کرنے کا انداز نیا ہے۔ لیکن قطعی فیصلہ تو جناب کی فن شناس نظریں ہی کر سکتی ہیں اور پھر بیسویں صدی کے بلند ذوق قارئین۔ حسب معمول آپ کی رائے کا انتظار رہے گا ۔ ۔ ۔

آپ کا اپنا ——— شاکر کریمی

"اللہ، یہ میں ہوں!"

اُس نے خود سے سرگوشی کی اور دلکش مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیلنے لگی۔ پہلے تو وہ چونک سی گئی تھی جیسے یہ وہ خود نہ ہو، اچانک کوئی اور اُس کے سامنے آکھڑی ہوئی ہو۔ سراپا حُسن، سراپا شباب ——— پھر وہ بہت انہماک سے آئینے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ قدِ آدم آئینے میں اُس کے قیامت خیز و غارت گرِ ہوش پیکر کا ہر نقش واضح تھا ——— اور وہ اپنے عکسِ جمیل میں کھو گئی۔

یہ کاکُلِ پُرخم، یہ چاند سی کشادہ پیشانی، محراب نُما ابروؤں کے نیچے نُکیلی پلکوں کے بیچ مخمور آنکھیں ——— مسجد سے دو قدم پہ گویا شراب خانہ! ——— یہ طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی طرح دہکتے رُخسار، یہ پتلے پتلے گلابی ہونٹ جیسے گُلاب کی کلی چٹک گئی ہو، یہ بلوریں گردن، یہ محشر بدوش شانے، اور جیسے حُسن و شباب کی ساری سحر انگیزیاں و رعنائیاں اسی کے پیکرِ جمیل میں سمٹ گئی ہوں، کھنچ کر ایک مرکز پر آگئی ہوں، جیسے صاف و شفاف جھیل میں سطحِ آب سے کچھ بلند کنول کے بن کھلے دو پھول! ——— وہ جھینپ گئی۔

وہ اپنے سراپا کا جائزہ لے رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی جیسے کوئی اُس کے کانوں کے قریب ڈوبتی اُبھرتی سانسوں کے درمیان سرگوشی کر رہا ہو ———

امرت سے دُھلی جبیں، ابرو کے ہلال
گردن کا یہ خم، یہ چھب، یہ حُسنِ خد و خال

ہر عضو میں یہ چمک، یہ نکہت کھا کر چاند
دب جاتا ہے صنعتِ جنت کا کمال!

اُسے محسوس ہونے لگا جیسے فراق کی "رُباعیاں" "رُوپ" کے صفحوں سے نکل کر اُس کے خوبصورت پیکر میں رچ بس گئی ہوں۔

اُس نے کلائی پر بندھی سنہری گھڑی دیکھی۔ پانچ بج چکے تھے۔ راشد اب آیا ہی چاہتا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی اور سوچنے لگی۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ چونک جائیں گے۔ حیرت سے اُن کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ جائیں گی۔ میرا یہ رُوپ رنگ، یہ نکھار اور یہ سنگھار اُن پر نشہ کی سی کیفیت طاری کر دے گا۔ وہ مُسکراتے ہوئے میری طرف بڑھیں گے۔ انھیں اپنی طرف آتے دیکھ کر میں سمٹ جاؤں گی، نگاہیں دوسری طرف پھیر لوں گی۔ میرا یہ انداز، میری یہ بے رُخی انھیں اور بھی بے چین کر دے گی اور ——— وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں گے۔

"پلیز، مائی سویٹ انجم پلیز ۔ ۔ آج تم بہت خوبصورت معلوم ہو رہی ہو، جیسے چودھویں کا چاند، جیسے کوئی اپسرا، جیسے جنتِ ارضی کی حُور، مجسم بہارِ حُسن و شباب کا شاہکار!"

میں بہر کیف طرح اُن سے دُور ہو جاؤں گی، دُور سے میرے کنکھیوں سے دیکھنے کا انداز انھیں مضطرب کر دے گا۔ وہ ہاتھ پھیلائے دیوانہ وار میری طرف

[illegible] واسطے دلہن سے انتظار کہوں
گی۔ جانے کتنا میں آپ سے نہیں بولیں گی؟ وہ منت سماجت کریں گے، پر میں ایک نہ
سنوں گی ــــــ اس رات کی طرح معصوم نہ بن جاؤں گی، جو رات اِس گھر میں
میری پہلی رات تھی۔ اللہ کتنی عجیب تھی وہ رات!

دُلہن کی طرح آراستہ کمرے میں پلنگ پر پھول ہی پھول بکھرے تھے۔
پھولوں کی لڑیاں پلنگ کے چاروں طرف لٹک رہی تھیں۔ فضا اُن پھولوں
کی بھینی بھینی خوشبوؤں سے معطر تھی۔ میں زرق برق سُرخ کپڑوں میں لپٹی
شرمائی سمٹی پلنگ پر ایک طرف بیٹھی تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ لیکن
گھونگھٹ کے اندر رمدماتی آنکھیں اُن کا انتظار کر رہی تھیں۔ ہر آہٹ پر اُن کے
آنے کا گُمان مجھے چونکا دیتا، ڈرا دیتا ــــــ اور ہر لمحہ اُن کے قُرب کا احساس

---

- دُنیا میں وہ سب سے کمزور ہے جو اپنی خواہش پر قابُو نہ رکھتا ہو اور سب سے قوی وہ ہے جو ضبط کی قوت رکھتا ہے۔ (حضرت داؤد علیہ السلام)
- کم گوئی میں حکمت، کم خوری میں صحت اور لوگوں سے کم ملنے جُلنے میں عافیت ہے۔ (حضرتِ عمر فاروقؓ)
- اگر اپنے دُشمن پر قابُو پاؤ، تو اُس کے شکریہ میں اُسے معاف کر دو۔ (حضرتِ علیؓ)
- اچھے اخلاق دس ہیں ــــ زبان کی سچائی، (باطل سے) جنگ کے وقت حملہ میں شدت، سائل کو دینا، احسان کا بدلہ، صلہ رحم، پڑوسی کی حفاظت، حقوق العباد، مہمان نوازی، حُسنِ خلق اور سب سے بڑھ کر شرم و حیا۔ (حضرتِ حسنؓ)

---

گُدگُدا بھی دیتا ــــــ عجیب کیفیت تھی اُس رات! ڈر بھی اور خوف بھی۔ کیف
میں ڈوبی ہوئی لذت بھی ــــــ اور پھر وہ گھڑی بھی آن پہنچی جو آئی تھی ــــــ
وہ میرے قریب آئے، قریب بیٹھے اور میرا گھونگھٹ اُلٹ دیا۔ میری ٹھوڑی کو
اپنی اُنگلیوں کے درمیان لے کر اُوپر اُٹھایا، مجھے دیکھا اور دیکھتے رہ گئے۔ جیسے
میری آنکھوں کی گہری جھیل میں ڈوب گئے ہوں، میرے حُسن نے اُنھیں مسحور کر دیا ہو،
اور پھر شدتِ جذبات سے لرزتی ہوئی اُن کی آواز میرے کانوں میں آئی۔
"آنکھیں کھولو، آنکھیں کھولو۔ میں تمھیں دیکھ رہا ہوں، تم مجھے دیکھو۔
دیکھو تو سہی میں کیسا ہوں!"

اُن کے بے حد اصرار پر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک نظر اُنھیں دیکھا
اور جھٹ گردن جھکا کر چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔ لیکن بُرا ہو میری اُس مُسکراہٹ کا
جو بجلی کی طرح کوند کر اُن کا حوصلہ بڑھا گئی ــــــ وہ میرے اور قریب کھسک
آئے، اِتنا قریب کہ اُن کی سانسوں کی گرمی سے گھونگھٹ کے اندر پسینے کے قطرے
ٹپکنے لگے۔ مجھ میں سما جانے کی ناکام کوشش اُنھیں تڑپا گئی۔ اُن کی سانسیں
اُلجھنے لگیں، آواز میں سوز و گداز کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ مجھے اُن پر ترس آ گیا
اور میں موم بن گئی۔ لیکن آج میں معصوم نہ بنوں گی۔ آج میں اپنی ساری شرطیں
منوا کر ہی مانوں گی۔ میں عورت ہوں اور عورت کا حُسن و شباب تو اچھے اچھوں
کے کس بل ڈھیلے کر دیتا ہے۔ جو کام بڑی سے بڑی طاقت نہیں کر سکتی، عورت
کی ایک مُسکراہٹ کر دیتی ہے۔ آج میں صاف صاف کہہ دوں گی کہ میں آپ کے
آفس جانے کے وقت تک سوتی رہوں تو آپ کو مجھ سے شکایت نہ ہونی چاہیے۔ اگر
دس بجے تک میری نیند نہ ٹوٹے تو اُس میں میرا کیا قصور، سونا اور مرنا تو برابر ہے نا!

اگر میں اپنے ہاتھوں آپ کا ناشتہ کھانا نہ لگاؤں، آپ کے کہنے پر بھی اپنے
ہاتھ سے چائے بنا کر پیش نہ کروں تو آپ کو بُرا نہ ماننا چاہیے۔ اِس کام کے لئے گھر میں
نوکر موجود ہی ہیں!

اگر شام کو آپ کے آفس سے آنے پر مُسکرا کر آپ کا استقبال نہ کروں، آگے
بڑھ کر خود ہی آپ کا کوٹ اُتار کر ہینگر پر نہ لٹکاؤں تو آپ کو مجھ سے کوئی شکایت
نہ ہونی چاہیے، کیونکہ مجھے اِس کی فُرصت کہاں، شام کا وقت تو میرے سجنے اور سنورنے کا ہے۔

اگر میں آپ سے پُوچھے بغیر اپنی کسی سہیلی کے گھر کہیں ٹہلنے یا پکچر دیکھنے چلی
جاؤں تو آپ کو مُنہ نہ پُھلانا ہوگا۔ آخر مجھے بھی تو کچھ نہ کچھ تفریح چاہیے۔

اگر آپ کے سر میں درد ہو اور آپ کی فرمائش پر خود نہ دبا کر اناسین کی دو
ٹکیاں کھا کر سو جانے کا مشورہ دوں تو ناراض ہونے کے بجائے آپ کو میرے
مشورے پر عمل کرنا ہوگا۔ کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ سر دبانے سے میری اُنگلیوں میں
درد ہو جائے!

اگر یہ سب منظور ہو تو آیئے، مجھ میں سما جایئے۔ میرا یہ حُسن، یہ شباب،
آنکھوں سے چھلکتی ہوئی شراب، گالوں کے گُلاب اور ہونٹوں کی کلیاں سب آپ کی
ہیں اور اگر یہ باتیں منظور نہیں تو جایئے، تڑپیئے، کچھ نہ ملے گا یہاں سے!

وہ اپنے خیالوں میں مگن تھی کہ کمرے کے باہر قدموں کی جانی پہچانی آہٹ
ہوئی۔ وہ ذرا اور ترچھی ہو کر بیٹھ گئی اور کنکھیوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔
راشد بوجھل قدموں سے کمرے میں داخل ہُوا۔ چہرے پر پسینے کے قطرے رینگ
رہے تھے، آنکھوں سے تھکن کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ اُس نے خاموش مگر بھرپور
نگاہ اُس پر ڈالی اور وہ اپنی جگہ بیٹھی سوچتی رہی ــــــ بس، وہ اب میری طرف
بڑھے ــــــ لیکن اُسے مایوسی ہوئی۔ راشد ٹیبل لیمپ کی طرف مُڑ گیا اور کپڑے

یک باتھ رُوم میں داخل ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی، لیکن
ایک اُمید باقی تھی۔ اُس نے اپنے دل کو تسلی دی۔ ہو سکتا ہے آج
کام کرنے سے ذہن پر زیادہ بوجھ ہو جبھی اُنھیں مجھ میں یہ خاص بات نظر نہ آئی۔
سکتا ہے باتھ رُوم سے تازہ دم ہو کر نکلنے پر میری طرف توجہ دیں، مجھ میں دلچسپی
کیونکہ شگفتگی بھی کوئی چیز ہے نا! اور وہ اس انداز سے سونے پہ
کہ جسم کا ہر خط نمایاں ہو گیا۔ باتھ رُوم کا دروازہ کھلا، راشد تولیے سے
ہاتھ پونچھتا باہر آیا اور اُس کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ تڑپ
اُس کے حُسن کا سارا طلسم ٹوٹ گیا، پاش پاش ہو گیا۔

راشد اُس کے قریب سے اس طرح گزر گیا تھا جیسے شراب خانے کے سامنے
کوئی بزرگ صفت انسان سانس روکے تیز تیز چلتا ہوا آگے نکل جائے۔ جیسے
طوائف کے کوٹھے کے نیچے سے کوئی پاکباز اور شریف آدمی نظریں جھکائے اس
طرح گزر جائے کہ اُسے اپنے گرد و پیش کی بھی خبر نہ ہو۔

وہ اپنی اس شکست پر جھنجھلا گئی۔ اپنے آپ کو نوچ ڈالا۔ دوسرے لمحے
کے حُسن میں چار چاند لگانے والے زیور کمرے میں بکھرے تھے۔ ساری کی قیمتی
ساڑی فرش پر پھیلی ہوئی تھی۔ اہتمام سے سنوارے گئے [illegible] اُلجھ گئے تھے
[illegible] چابکدستی سے کیا گیا میک اَپ خلط ملط ہو کر رہ گیا تھا اور وہ صوفے پر
اس طرح گہری گہری سانسیں لے رہی تھی جیسے بلندی سے پستی تک آتے
تھک کر نڈھال ہو گئی ہو۔

---

آج وہ بپھری بیٹھی تھی۔ آنکھوں کے گلابی ڈورے سُرخ ہو گئے تھے، چہرہ
تمتمایا ہوا تھا، غصے سے عضو عضو پھڑک رہا تھا۔

ہُوا یہ تھا کہ آج خلافِ معمول وہ سویرے اُٹھ گئی تھی۔ راشد اُس کے
سویرے اُٹھ جانے پر حیرت زدہ تھا لیکن جب ملازمہ نے اُسے بتایا کہ آج بی بی جی
اپنی سہیلیوں کے ساتھ پکنک پر جائیں گی تو وہ بھڑک اُٹھا تھا اور سختی سے
ڈانٹتے ہوئے منع کر دیا تھا کہ وہ میری اجازت کے بغیر پکنک تو کیا کہیں بھی نہیں
جا سکتی! اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اب اگر میری مرضی کے خلاف کچھ ہُوا تو
جو بھی نتیجہ برآمد ہو گا اُس کی ذمہ دار وہ خود ہو گی۔ آج یہ سب کچھ پہلی بار ہُوا تھا۔
جاتے جاتے اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ رات سے میری طبیعت کچھ اچھی نہیں، ہو سکتا
ہے آفس سے جلد ہی لَوٹ آؤں، ایسا نہ ہو کہ آکر تمھیں گھر نہ پاؤں!

دوپہر ہی کو راشد آفس سے واپس آ گیا لیکن وہ اُس کے سامنے نہ گئی
اور شام کا سُرمئی اُجالا جب رات کے اندھیرے میں کھو گیا تب بھی اُس نے یہ
جاننے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ آج وہ کہیں ٹہلنے کیوں نہ گیا۔ ایزی چیئر پر بیٹھ کر لان
میں کھِلے نیلے پیلے، سُرخ، نارنجی پھولوں سے دل کیوں نہ بہلایا اور وہ دوپہر سے
اب تک اپنے کمرے میں کیا کر رہا ہے۔ جب رات کچھ اور گہری ہو گئی تو وہ دوسرے
کمرے میں بے فکری کی نیند سو گئی۔ سو کر اُٹھی تو حسبِ معمول کافی دن چڑھ چکا تھا۔
اُسے یقین تھا کہ راشد آفس چلا گیا ہو گا۔ وہ کمرے سے باہر آئی۔ ابھی چند ہی قدم
چلی تھی کہ اس طرح ٹھٹک گئی جیسے کسی نے پیروں کو تھام لیا ہو۔ ایک انجانے خوف
سے اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس نرس کو
دیکھ رہی تھی جو دونوں ہاتھوں سے ایک ٹرے سنبھالے راشد کے کمرے میں داخل
ہو رہی تھی۔ اچانک راشد کے کمرے میں ہلکا سا چھناکا ہوا اور اُسے محسوس ہوا جیسے
اُس کی نرم نازک ریشمی چوڑیاں کلائیوں سے ٹوٹ کر فرش پر بکھر گئیں۔ اُس کے ذہن میں

---

- بے اطمینانی سب سے بڑا دُکھ ہے اور اطمینان سب سے بڑا سُکھ۔ اس لئے سُکھ کے خواہشمند انسان کو ہمیشہ مطمئن رہنا چاہئے۔ (مہاتما گوتم بدھ)
- تم ثمر اور صلہ کی خواہش کے بغیر عمل کرو۔ (بھگوت گیتا)
- جس نے ایک بار تم پر احسان کیا ہو وہ اگر تمھیں نقصان پہنچائے تو اُس احسان کو یاد کر کے اُسے معاف کر دو۔ (مہابھارت)
- جو مہربانی کرنے والے کو کمینہ سمجھتا ہے اُس سے زیادہ کمینہ کوئی دوسرا نہیں۔ ([illegible])
- انسانی بہتری کے لئے ست کرم کرتے رہنا سب سے بڑا دھرم ہے۔ (مہاتما گاندھی)

---

ہیجان سا پیدا ہو گیا جیسے ایک تیز و تند طوفان اُس کے سر سے گزر رہا ہو اور اُس کی
اُمنگ کی افشاں اِس طوفان میں منتشر ہوتی جا رہی ہو۔ اُس نے سر تھام لیا،
لبوں کو جنبش ہوئی: ’کیا اُن کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے؟‘

اور ایک اَن دیکھی قوت نے اُسے راشد کے کمرے میں کھینچ لیا۔ اُس نے
دیکھا نرس راشد کے سرہانے کھڑی سرنج میں دوا بھر رہی تھی اور راشد پلنگ پر
آنکھیں بند کئے بے سُدھ پڑا تھا۔ لمبی لمبی سانسیں آ رہی تھیں۔ سینہ دھونکنی کی طرح
چل رہا تھا، ہونٹ پُرسکون تھے، چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اُس کے استفسار پر ملازمہ
نے بتایا کہ صاحب کی طبیعت رات سے بہت خراب ہو گئی ہے۔ ساری رات
سانسیں ڈوبتی اُبھرتی رہی ہیں، جسم جلتا رہا ہے۔ دو گھنٹے پہلے ڈاکٹر رحمان دیکھ کر
گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے ڈبل نمونیہ ہو گیا ہے، حالت تشویش ناک ہے۔ دوپہر تک

طبیعت ٹھیک ہی ہے ورنہ۔۔ اُس نے ملازمہ کو ڈانٹ دیا۔ چپ رہ کمبخت بہت بک بک کرتی ہے اور تو نے مجھے خبر تک نہ کی؟" اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ملازمہ نے ایک نظر اُس کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر چلی گئی اور اُسے محسوس ہوا جیسے ملازمہ کی آنکھوں سے نکلی ہوئی بے شمار سوئیاں اُس کے اپنے وجود میں ڈوبتی چلی جا رہی ہوں۔ وہ مضطرب ہو گئی، قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ راشد کے سرہانے ہی بیٹھ گئی، اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اُسے اپنا ہاتھ جلتا ہوا محسوس ہوا اور اس جلن نے اُسے کچھ اس طرح تڑپایا کہ آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ اُس کی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسوؤں کے قطرے راشد کی پیشانی پر گر کر اِس طرح پھیل جاتے جیسے پتھر پر گر کر موتی ٹوٹ کر بکھر جائیں!

تیسرے دن!

سورج کی پہلی سنہری کرنیں بند کھڑکیوں کے شیشوں سے کمرے میں جھانک رہی تھیں۔ وہ راشد کے سرہانے بیٹھی آنکھیں بند کئے اپنی سوچ میں گم تھی۔ گذشتہ رات ہی سے اُسے ذکیہ آپا کی کہی ہوئی ایک پرانی بات بار بار یاد آ رہی تھی۔

اپنی شادی سے پانچ سال پہلے!

وہ ذکیہ آپا سے ملنے عظیم آباد گئی ہوئی تھی۔ دو چار ہی دنوں میں اُسے ذکیہ آپا پر غصہ آنے لگا تھا۔ وہ سوچنے لگتی آخر آپا کو ہوا کیا ہے جو وہ نوکروں اور ماماؤں کے ہوتے ہوئے دولھا بھائی کا سارا کام خود اتنی تندہی اور خوشی خوشی کرتی ہیں جیسے خوش ہو کر دولھا بھائی اُن کے نام کوئی جاگیر لکھ دیں گے۔ ماشاءاللہ آپا جوان ہیں، خوبصورت ہیں، پڑھی لکھی ہیں۔ انھیں اپنی پوزیشن کا خیال کرنا چاہئے۔ دولھا بھائی تو ویسے ہی اُن کے آگے پیچھے کتے کی طرح دُم ہلاتے پھرتے ہیں۔ انھیں اتنا سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے بھلا ــــــ ایک رات دولھا بھائی کے سر میں کچھ درد ہو گیا پھر تو آپا بے چین ہو گئیں جیسے درد دولھا بھائی کے سر میں نہیں اُن کے پورے جسم میں ہو۔ دوا کھلا دینے کے باوجود کبھی سر میں تیل ڈال کر مالش کرتیں، کبھی پیشانی پر بام لگاتیں تو کبھی درود شریف پڑھ پڑھ کر دَم کرتیں۔ گھر کے ہر فرد کو ہدایت دیتیں کہ کوئی زور سے نہ بولے، کوئی آواز نہ ہو اور دولھا بھائی کے منع کرنے پر بھی اُس وقت تک وہ اُن کا سر دباتی اور سہلاتی رہیں جب تک وہ سو نہ گئے۔ اُس وقت وہ آپا پر جھلا گئی تھی۔ اتنی بدحواس ہونے کی ضرورت کیا تھی بھلا۔ معمولی سا درد ہی تو تھا سر میں۔

دوسرے دن اپنی ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے جب اُس نے کہا کہ آپ تو دولھا بھائی کے سارے کام خود ہی اِس طرح کرتی ہیں جیسے آپ اُن کی بیوی نہیں لونڈی ہوں تو آپا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ابھی تو نہیں سمجھے گی اِن باتوں کو۔ جب تیری بھی شادی ہو جائے گی تو خود بخود یہ باتیں تیری سمجھ میں آ جائیں گی کہ بے لوث محبت اور انتھک خدمتوں ہی کا دوسرا نام بیوی ہے اور شوہر کی خوشی اُس کی مالک کی [illegible]

وہ خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اُسے اپنے بالوں میں کوئی شے سرسراتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اُس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور دیکھا راشد کی انگلیاں اُس کے بالوں میں اُلجھی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر زندگی مسکراہٹ بن کر جگمگا رہی تھی۔ اُسے راشد کے سیاہ حلقوں کے بیچ ناتواں پپوٹوں کے نیچے چھلکتی آنکھوں میں لپکتا ہوا انتہا پیار نظر آیا۔ راشد نے غور سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور نحیف آواز میں بولا۔

"یہ اُلجھے اُلجھے بال، یہ بوجھل پپوٹے، یہ آنکھوں کے سُرخ ڈورے، یہ مُرجھایا ہوا چہرہ، یہ ہونٹوں کی پژمردگی اور یہ میلی ساڑی۔ کیا حالت بنالی ہے تم نے اپنی؟"

اُس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن کہہ نہ سکی۔ لب تھرتھرا کر رہ گئے، آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ڈھلکنے سے پہلے ہی راشد نے آنسوؤں کے قطروں کو اپنی انگلیوں پر سنبھال لیا اور اُس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اپنی طرف جھکاتے ہوئے کہا۔

"خوش ہونے کے بجائے رو رہی ہو۔ اب تو میں بالکل اچھا ہوں بس صرف کمزوری ہے تمھاری توجہ رہی تو وہ بھی جلد ہی دُور ہو جائے گی۔ اب تم جاؤ نہا دھو کر کپڑے بدل لو، کچھ کھا پی لو، تھوڑی دیر آرام کر لو۔ میں جانتا ہوں کہ تین دنوں سے تم بالکل نہ سوئی ہو، کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے، ایک پل بھی آرام نہ کر سکی ہو!"

اور وہ راشد کے سینے پر سر رکھ کر اِس طرح بلکنے لگی جیسے آج وہ اپنا مقام پہچان گئی ہو، اپنے فرض سے آشنا ہو گئی ہو اور ذکیہ آپا کی کہی ہوئی بہت پرانی بات کا مفہوم آج اُس کی سمجھ میں آ گیا ہو!!

---

### ماہر القادری مدیر فاران کراچی

ناصح! یہ عاشقی ہے محبت کی بات ہے
شور و زیاں کا ذکر تو فرصت کی بات ہے

پیتا ہے کوئی جام سے کوئی نگاہ سے
یہ اپنے اپنے ذوق و طبیعت کی بات ہے

اے دوست! تیرے لطف و توجہ کا شکریہ
لیکن یہ ابتدائے محبت کی بات ہے

ہر حسن، ہر کمال، ہر اک منظرِ جمال
جیسے انہی کی شکل و شباہت کی بات ہے

اے ضبطِ غم سنبھال کہ ہوتا ہے راز فاش
اے چشمِ اشکبار ندامت کی بات ہے

ان کی طرف سے آئے ہیں اب کے پیامِ شوق
حیرت کا ہے مقام، مسرت کی بات ہے

ماہر ہے صنفِ نظم اپنی جگہ بلند
لیکن غزل لطیف نزاکت کی بات ہے

### علی افسر

دور اس بزمِ خرد سے ترے دیوانے ہیں
اک حقیقت کے جہاں سینکڑوں افسانے ہیں

دل شکستہ ہیں تری بزم میں ہم ہی ایسے
جیسے مینائے شب ٹوٹے ہوئے پیمانے ہیں

بے نیازانہ چلا ہوں میں رہِ ہستی میں
اب مری راہ میں کعبہ ہے نہ بتخانے ہیں

کتنا پُرکیف ہے عالم مرے ارمانوں کا
میں ہوں اور آپ کی یادوں کے صنم خانے ہیں

کہیں انوارِ حقیقت ہیں نہ آثارِ حیات
جس طرف دیکھئے ویرانے ہی ویرانے ہیں

کتنے بیگانوں کو اپنا لیا تو نے ساقی
اور ہم ہیں کہ تری بزم میں بیگانے ہیں

کس سے گلشن میں نبھے گی ترے دیوانے کی
اجنبی پھول ہیں اور خار بھی بیگانے ہیں

### اعجاز احمد صدیقی بی۔اے

لطف کی ان سے التجا کی ہے
ہم نے کتنی بڑی خطا کی ہے

کچھ اضافے ہی کی دعا کی ہے
دردِ دل کی یہی دوا کی ہے

پھیر لی ہے نگاہ تم نے بھی
خیر مرضی یہی خدا کی ہے

پائے جاناں پہ تھی جبینِ نیاز
ہم نے یوں بھی نماز ادا کی ہے

غم کو اپنا لیا ہے پہلے ہی
جب محبت کی ابتدا کی ہے

لب پہ ہے ان کے مسکراہٹ سی
دل نے شاید کوئی خطا کی ہے

اس میں اعجاز کا قصور نہیں
بیخودی آپ نے عطا کی ہے

### طرب میرٹھی ایم۔اے

ترا حسن بھی ہو رُسوا وہ مقام آ نہ جائے
مرے کانپتے لبوں پر ترا نام آ نہ جائے

ہے لبوں پہ مسکراہٹ وہ کھڑے ہیں زلف کھولے
مرا دل بہکتا ہے ناداں تہہِ دام آ نہ جائے

تری بے نیازیوں کی ہو دراز عمر ساقی!
کبھی مجھ سے تشنہ لب تک کوئی جام آ نہ جائے

وہی درد پھر اُٹھے گا جو طرب ہے جان لیوا
کہیں رات ہو نہ جائے کہیں شام آ نہ جائے
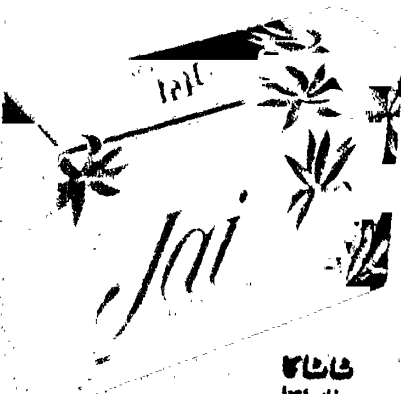
# خزاں رسیدہ کلی

نور النہار اختر (علیگ)

۳۔ ذاکر باغ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

محترم و معزز مدیر صاحب! تسلیمات

"ناآشنا" کی اشاعت کے لئے تہہ دل سے آپ کی ممنون ہوں۔ میرے اس افسانے کو قارئین نے بے حد پسند فرمایا۔ یہ سب آپ ہی کی کرم فرمائیوں کا نتیجہ ہے۔ آپ کی حوصلہ افزائی میرے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔ اس بار ایک تازہ ترین کہانی بعنوان "خزاں رسیدہ کلی" ارسال کر رہی ہوں۔ آپ کی رائے عالیہ اور بعد از اشاعت قارئین کی آراء کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ عورت کی جائز لغزش بھی اس کے لئے کتنی مہلک ثابت ہوتی ہے اور خاندان اور سماج کو اس کے وجود سے کتنی نفرت ہو جاتی ہے ـــــ یہی اس کہانی کا پس منظر ہے۔ امید کرتی ہوں اسے آپ ضرور شرفِ قبولیت بخشیں گے...

خلوص آگیں ـــــ نور النہار اختر

بدنصیب فرخ آج پھر اسی طنز کا نشانہ بن کر رہ گیا تھا، جس کا وہ ہوش سنبھالنے کے بعد ہی سے عادی ہو گیا تھا۔ ساری دنیا تو اسے حقارت بھری نظروں سے دیکھتی ہی تھی۔ لیکن آج اس کی محبوبہ نے بھی جو اسے حاصل کرنے کے لئے جان کی بازی تک لگا سکتی تھی، اسے دھتکار دیا تھا۔

"شبانہ! تم یقین کرو میری ماں ایسی نہیں ہو سکتی۔ میرے سر پر بھی کوئی ہاتھ رکھنے والا تھا جو آج اس دنیا میں نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے فرخ! میں تو تم پر یقین کر سکتی ہوں لیکن ڈیڈی کو کس طرح سمجھاؤں گی؟"

فرخ اپنی بے بسی کے تصور سے کانپ اٹھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

"فرخ! اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے ان آنسوؤں کو اپنا کہہ سکوں تو جاؤ اور اپنی ماں سے پوچھ کر تمہارا باپ کون ہے اور کہاں ہے؟"

شبانہ کی آواز غصے میں ملی ہوئی آواز حویلی کے ہر ایک گوشے میں گونج اٹھی۔

"ممی... ممی... ممی...!"

سلمیٰ فرخ کی یہ جنونانہ کیفیت دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ "کیا بات ہے بیٹا؟"

"بتلائیے ممی کیا یہ دنیا سچ کہتی ہے کہ آپ کی ناجائز اولاد ہوں؟"

"ممی آپ بولتی کیوں نہیں؟" فرخ نے سلمیٰ کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

یہ وہ فرخ تھا جو اپنی زندگی کی اٹھارہ بہاریں دیکھ چکا تھا۔ جس کے قدم شباب کی منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے اور جس کے ذہن پر جائز و ناجائز اور حرام و حلال کے تصورات آہستہ آہستہ مرتسم ہوتے جا رہے تھے۔

اس کی آنکھوں سے سیلِ رواں ابل پڑا۔

دفعتاً فضا میں ایک ارتعاش پیدا ہوا اور سلمیٰ کی انگلیوں کے نقوش فرخ کے رخسار پر ابھر آئے۔ زندگی میں پہلی بار آج فرخ اپنی ماں کے غیض و غضب کا نشانہ بنا تھا۔ فرخ کا ایک ہی جملہ سلمیٰ کی عفت کے لئے چیلنج تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو شاید کبھی طمانچہ نہ مارتی۔ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن اپنی عصمت پر حرف نہیں آنے دیتی۔ جہاں اس کی عصمت کا سوال سامنے آتا ہے، وہ جان کی بازی تک لگا دیتی ہے۔ عفت مآبی ہی ایک عورت کا حقیقی

[illegible] سے اُس کا درد [illegible] ہے فرخ نے آج اُس [illegible] سے سنا کرتی تھی آج اُس نے اُس ساز کو چھیڑا تھا جو ابھی تک [illegible] تھا۔ آج سلمیٰ کے ذہن میں وہ رُوح فرسا دن پھر تازہ ہو گئے جنھیں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فراموش کر چکی تھی۔ آج اُس کے دبے ہوئے جذبات کو آتش فشاں کی طرح بھڑک اُٹھے تھے۔ سلمیٰ سوچنے لگی وہ کس طرح فرخ کو گزرے ہوئے المناک واقعات سے رُوشناس کرائے۔ اُس کا ذہن اُلجھنوں کی تاریکیوں میں بھٹکنے لگا۔

---

بیس سال پہلے وہ نواب آصف کی حویلی میں دُلہن بنی بیٹھی تھی۔ نواب صاحب نے سلمیٰ کا عقد اپنے ایک عزیز دوست بیرسٹر عمران کے بڑے بیٹے اسلم سے کر دیا تھا۔ اسلم میڈیسن (Medicine) پڑھنے بمبئی جا رہا تھا۔ بیرسٹر عمران کا خیال تھا کہ اسلم جب ڈاکٹر بن جائے گا تو وہ خوب دھوم دھام سے اُس کی شادی کریں گے اور سلمیٰ کو رُخصت کر کے اپنے گھر لائیں گے۔

سلمیٰ دہلی یونیورسٹی کی ابھی بی۔ اے کی طالبہ تھی۔ ناز و نعم میں پلی ہوئی شوخ چنچل دوشیزہ اپنے مستقبل کی بربادیوں سے بے خبر جہاں کی رنگینیوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ سینما، کلب، ڈانس، پکنک اور طرح طرح کی سیر و تفریح اُس کے مشاغل تھے۔ لڑکیوں سے زیادہ سلمیٰ کی لڑکوں سے دوستی تھی۔ وہ نواب آصف کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس لئے والدین اُس پر جان نثار کرنے کو تیار رہتے تھے۔ نواب اور اُن کی بیگم نے سلمیٰ کی اس آزادی کو کبھی معیوب نہ سمجھا اور اُس کے معاملات میں کبھی مداخلت نہ کی۔ عقد کے دوسرے ہی دن اسلم بذریعہ پلین بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا۔

---

اسلم کو بمبئی گئے ہوئے پورے دو سال ہو چکے تھے۔ سلمیٰ نے ایم۔ اے کر لیا تھا۔ اُس کی زندگی میں اب پہلے سے بھی زیادہ آزادی آگئی تھی۔ والدین کی دولت وہ پانی کی طرح بہاتی تھی۔ یونیورسٹی کے سمسٹر کورس سے چھٹکارا پانے کے بعد وہ ذہنی راحت چاہتی تھی۔ امتحانات ختم ہونے کے بعد یونیورسٹی کا ایک چھوٹا سا ٹور سری نگر کو جا رہا تھا۔ اُس نے نواب صاحب سے ٹور میں جانے کی اجازت مانگی۔ نواب صاحب نے بیٹی کی دل شکنی مناسب نہ سمجھی اور فوراً اجازت دے دی۔

"تھینک یو ڈیڈی!" وہ خوشی سے ناچ اُٹھی۔

سلمیٰ اسلم کو اکثر خطوط لکھا کرتی تھی جن میں جدائی کی بے چینی اور مستقبل کے طرح طرح کے منصوبوں کے تذکرے ہوتے۔ سلمیٰ نے اسلم کو ایک خط میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ وہ اس سال گرمی کی چھٹیاں کشمیر میں گزارے گی۔

---

اسلم کے آنے میں اب صرف ایک سال باقی تھا جیسے جیسے [illegible] دن قریب آتے جاتے تھے نواب آصف اور اُن کی بیگم کی خوشیاں دوچند ہوتی جاتی تھیں۔ وہ سوچتے اسلم کے آنے پر وہ سلمیٰ کی رُخصتی کر دیں گے اور اس طرح ان کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ کیونکہ اُنھیں ڈر تھا کہ سلمیٰ کی بڑھتی ہوئی آزادی کہیں اُسے بے راہ روی کی طرف نہ لے جائے۔ سلمیٰ کی آزادی کو اب وہ لوگ اچھا نہیں سمجھتے تھے لیکن بیٹی کی دلجوئی کی خاطر زبان پر کبھی کوئی حرف نہ لاتے۔

ایک دن سلمیٰ کلب سے جلد واپس آگئی۔ اُسے آج چکر آ گیا تھا کوٹھی پہ پہنچ کر کار رُکتے ہی وہ لڑکھڑا گئی۔ بیگم سہارا دے کر اُسے اندر لائیں۔ اُنھیں کچھ شک ہوا اور فوراً ہی وہ حالات کی نزاکت کو بھانپ گئیں۔ نواب آصف کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ لیکن اُنھیں پھر بھی یہ یقین تھا کہ اُن کی بیٹی ایسا نہیں کر سکتی۔ چند مہینوں بعد شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

وہ فرخ کی پیدائش کا دن تھا۔ پاس پڑوس اور محلے میں ہر طرف چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ نواب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ دُنیاوی عزت و ناموس اور خاندانی وقار سبھی پر پانی پھر چکا تھا۔ سلمیٰ اُن کی اکلوتی بیٹی نہ ہوتی تو وہ اُسے شاید گولی کا نشانہ بنا دیتے۔ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے اُنھیں ایک دن ایسا بھی دیکھنا پڑے گا۔ بیگم اس غم کی تاب نہ لا سکیں اور ایک دن اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ نواب کی بھی حالت روز بروز بگڑتی ہی گئی۔ فرخ اب ایک سال کا ہو گیا تھا۔ نواب صاحب کو اب ہر وقت یہی فکر دامن گیر تھی کہ وہ اسلم کو کیا مُنہ دکھائیں گے۔ سلمیٰ اب اسلم کی امانت تھی۔ وہ اس امانت کی حفاظت نہ کر سکے تھے۔ وہ ہر وقت بستر پہ پڑے پڑے سوچتے رہتے، کاش! اسلم کے آنے سے پہلے مجھے موت آ جائے! اسلم چند ہفتوں میں دہلی آنے والا تھا۔ لکھنؤ سے بیرسٹر صاحب نے نواب صاحب کو خط لکھا تھا کہ شادی کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ صرف اسلم کے آنے کی دیر ہے۔ اُس کے آتے ہی ہم فوراً دُلہن کو رُخصت کر کے لے جائیں گے۔ نواب صاحب نے خط پڑھا تو اُن کے دل کو شدید ضرب پہنچی اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ ابھی دم توڑ دیں گے!

اسلم کے بمبئی سے آنے کا دن تھا۔ نواب صاحب اُداسی کے عالم میں بیٹھے ہوئے تھے کہ پوسٹ مین نے خط لا کر دیا۔ لکھا تھا ——

"میں بمبئی سے لکھنؤ کے لئے پلین سے روانہ ہوا لیکن بمبئی سے کچھ دُور راستے میں میرا جہاز ایئر کریش (Air Crash) کا شکار ہو گیا۔ میں بمبئی کے ایک ہسپتال میں زخمی پڑا ہوں۔ جان بچنے کی بہت کم اُمید ہے۔ ہو سکتا ہے آپ لوگوں سے ملاقات نہ ہو سکے۔ [illegible]

[illegible] آج سے دو سال پہلے میں نے
[illegible] ایک بچہ گود لیا تھا، وہ بالکل معصوم اور
[illegible] میں زندہ نہ رہوں تو آپ اُس کی شادی کسی
[illegible]

[illegible] نواب صاحب کو اپنی بیٹی کی پاکدامنی اور عفت مآبی پر فخر
[illegible] سلمیٰ کو بلا کر کہا۔
[illegible] تم نے ہمیں شک کی نظروں سے دیکھا۔ تم پر [illegible]
[illegible] عزیز و اقربا اور پڑوسیوں کے سامنے ذلیل ہونا پڑا۔"
[illegible] پڑھتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ یہ دوسرا خط تھا جو اسلم
[illegible] خبر لایا تھا۔
جب سلمیٰ کو ہوش آیا تو نواب صاحب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے
[illegible]

---

نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد سلمیٰ کو اور بھی دُکھ جھیلنے
[illegible] اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں ہی سے نظریں ملا سکتی تھی اور
[illegible] نہ دکھا سکتی تھی۔ وہ کیسے ثابت کرتی کہ وہ بے گناہ ہے، پاکدامن
[illegible] بالکل بے داغ ہے! اُس نے سوچا اگر دوسرے یقین نہیں
[illegible] لیکن وہ فرخ کو کیسے یقین دلائے گی کہ وہ اُس کی ناجائز اولاد
[illegible] کوئی وارث تھا، باپ تھا اور کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا تھا۔ سلمیٰ
[illegible] بدنصیب زندگی کے اٹھارہ سال گزار چکی تھی۔ احباب و اقربا
[illegible] کنارہ کش ہو گئے تھے۔ کوئی اُس کا شریکِ غم نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ارشد
[illegible] بولتے تھے اور جو کسی زمانے میں اُس سے شادی کی
[illegible] اُس کے سائے سے دُور بھاگنے لگا تھا!

---

اسلم کے انتقال کے دو ماہ بعد بمبئی سے ایک پچیس سالہ خوبرو نوجوان
[illegible] دریافت کرتا ہوا سلمیٰ کے پاس پہنچا۔ یہ اسلم کا جگری دوست
تھا۔ اُس نے [illegible] گفتگو ہی میں سلمیٰ کو بتا دیا کہ اسلم نے مرتے وقت مجھے سب
[illegible] اسلم کی مرتے وقت یہی خواہش تھی کہ میں فرخ کو باپ کی
[illegible] اور آپ کو شوہر کی دولت سے مالامال کر دوں۔
سلمیٰ پر سکوت طاری تھا۔ وہ گُم صُم بیٹھی رہی۔ اقبال پہلا شخص تھا،
جس نے اُس سے اظہارِ ہمدردی کیا تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جو اُس کے درد کا درماں
بن گیا تھا اور جو محبت اور خوشیوں کے خزانے لٹا چکا تھا۔

اقبال نے سکوت توڑتے ہوئے کہا "سلمیٰ صاحبہ! میں بہت بدنصیب ہوں۔
قدرت نے مجھے ایک دوست کے پیار سے محروم کر دیا اور آپ کو شوہر کی محبت سے۔
میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اُس کی آخری خواہش ضرور پوری کر دوں گا۔ خدا
کے لئے آپ مجھے اپنی اور فرخ کی خدمت کا موقع دیجئے۔"

سلمیٰ نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا "اقبال صاحب! میں آپ کی اس
قربانی اور ایثار کی قدر کرتی ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو کچھ نہ دے سکوں
گی۔ آپ میری محبت کبھی نہیں جیت سکتے۔ اسلم کی یاد میرے دل سے نکالے نہیں نکلتی
ہے۔ عورت زندگی میں صرف ایک ہی بار محبت کرتی ہے۔ میری تمناؤں کا مرکز صرف
اسلم تھا۔ میرے خواب، میری تمنائیں، میرے جذبات کا اُمڈتا ہوا سمندر اور شباب
کی ساری چیزیں اسلم کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔
اب تو اسلم کی صرف ایک ہی نشانی میرے کلیجے کی ٹھنڈک اور دل کا سکون ہے۔"
اقبال سلمیٰ کو کسی طرح نہ منا سکا اور بمبئی لوٹ گیا۔

---

کورٹ کے دو وکیل کوٹھی کی طرف بڑھے آ رہے تھے۔ سلمیٰ نے اپنے خیالات کا
تسلسل توڑا۔ اب وہ سینتیس سالہ ایک گھریلو عورت تھی جسے امورِ خانہ داری سے بہت
کم مہلت ملتی تھی۔ وکیل نے دریافت کیا "فرخ سن آف اسلم اسی مکان میں رہتے ہیں"
فرخ کے چہرے پر ایک چمک پیدا ہوئی جیسے اُس نے اپنا سب کچھ پا لیا ہو!
"جی ہاں فرمائیے کیا کام ہے؟" سلمیٰ نے حیرت و استعجاب کے عالم میں کہا۔
وکیل نے کہنا شروع کیا "اسلم صاحب انتقال کے وقت اپنی جائداد کا بہت
بڑا حصہ اپنے بیٹے فرخ کے نام لکھ گئے تھے۔ فرخ اب بالغ ہو گیا ہے۔ اس لئے اُسے یہ
کاغذات سونپے جاتے ہیں۔ آج سے یہ ساری جائداد اِس کی ہے"
فرخ سلمیٰ کے گلے سے بے اختیار لپٹ گیا۔ اُس نے سلمیٰ کو پشیمان نظروں سے
دیکھا جیسے اُس کی نگاہیں کہہ رہی ہوں ——— "اچھی ممی مجھے معاف کر دیجئے!"
سلمیٰ فرخ کو پیار کرتے ہوئے بولی: "بیٹا! میری خواہش ہے کہ تم
میڈیکل کے کمپیٹیشن کی تیاری کرو اور میڈیسن کی تعلیم کے لئے بمبئی جاؤ اور وہاں
سے بہت بڑے ڈاکٹر بن کر واپس آؤ تاکہ تمہارے باپ کا نام روشن ہو۔"
فرخ کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ سلمیٰ کی انگلیوں کے سرخ نشانات اُس کے
رخسار پر سے اسی طرح غائب ہو گئے تھے جس طرح آفتاب طلوع ہونے پر شفق غائب
ہو جاتی ہے۔ فرخ کی زندگی کا بھی آفتاب آج ہی طلوع ہوا تھا!!

---

# غزلیں

### ...ی بی اے

...ے فرصت گری، شوقِ ملاقات نہیں
...اب کبھی ہے مگر شدتِ جذبات نہیں

غم کی راہوں میں کوئی بھی تو مرے ساتھ نہیں
شہر ہیں ورنہ مری کس سے ملاقات نہیں

...رے حالِ پریشاں سے پریشان نہ ہو
...یہ بھی آنکھ مری نم ہے کوئی بات نہیں

میری غزلوں پہ ترے حسن کے احسان قبول
میں ترے ساتھ چلوں یہ مرے حالات نہیں

...کھلے گا تو مہک جائے گی آنگن آنگن
...ہ اک راز ہے یہ تو کوئی بات نہیں

چاند بچھڑی ہوئی دھرتی سے ملا صدیوں بعد
وہ بھی مل جائیں گے لیکن ابھی حالات نہیں

جتنے رنگین سوالات کئے تھے میں نے
اُتنے رنگین ان آنکھوں میں جوابات نہیں

### عبدالصمد تپش

نرم و نازک سا بدن ہے کہ کنول ہے کوئی
یہ تمہیں ہو کہ حسیں خواب کا پیکر کوئی

کیوں سرِ شام چلا آتا ہے صحنِ دل میں
بکھری بکھری سی لئے زُلفِ معنبر کوئی

خود کو معصوم سمجھنے کی بھی جرأت نہ رہی
جھانکتا رہتا ہے دن رات اب اندر کوئی

آج نکلے ہیں تو معلوم ہوا ہے اُن کو
کیوں نکلتا ہے کڑی دھوپ میں باہر کوئی

ابرِ تخئیل حسیں یوں ہے کہ جیسے کر لے
ادھ کھلی کھڑکی کے پردے کو برابر کوئی

اپنا اندازِ تپش کچھ تو بدلنا ہوگا
شعر وہ کیا کہ جو لگتا نہ ہو منتر کوئی

### حکیم محمد [illegible]

دل اگر دکھلائے شانِ جذبۂ کامل ابھی
موجِ طوفاں خیز ہی بن جائے خود ساحل ابھی

آؤ دکھلا دوں تمہارے سوزِ غم کی یادگار
ہے مرے سینے میں اک جلتا سا داغِ دل ابھی

ڈوبنے والوں کی کیا سمجھے گا یہ گہرائیاں
جب کنارہ گیر ہے آسودۂ ساحل ابھی

سدِّ راہِ عشق بن جائے نہ یہ خامی کہیں
اور پیدا کر تمنائی! گدازِ دل ابھی

تم نے کیا سنگیں نگاہیں اس پہ آ کر ڈال دیں
آئی تھی کانوں میں آوازِ شکستِ دل ابھی

پردہ والے بن گئے ایسے نظر آتے نہیں
ورنہ اگر میں کھینچ لوں یہ پردۂ حائل ابھی

کیا اسی منہ سے کرے گا اُن سے عرضِ مدعا
سیکھ آدابِ محبت کچھ دلِ بسمل ابھی

---

### ڈاکٹر [illegible] ایم۔ اے، پی ایچ ڈی

ناحق ہے گلہ ہم سے بے جا ہے شکایت بھی
ہم ٹوٹ کے آ جاتے آواز تو دی ہوتی

توہینِ محبت ہے اظہارِ تمنا بھی
بہتے ہوئے اشکوں سے ہم نے یہ نصیحت لی

احساس کی شدت بھی انسان کی دشمن ہے
چبھتی ہے سلیقے میں ہر بھول جوانی کی

گو ترکِ تعلق کو اک عمر ہوئی لیکن
سینے میں سلگتی ہے اک یاد کی چنگاری

افسانہ

# رول نمبر ۴

مشتاق اعظمی بی۔اے (آنرز)

پنچا بازار، آسنسول

جنابِ عالی! تسلیم

طویل مدت کے بعد "بیسویں صدی" کے لئے ایک کہانی لکھی ہے۔ اس کی اشاعت سے بعضوں کا نقصان اور بہتوں کا بھلا ہوگا...

مشتاق اعظمی

★

"میرے خدا! ایک ہفتے کے اندر تین ٹیلیفون اور چار شخصی سفارشیں اس سلسلے میں آ چکی ہیں۔ آپ پانچویں آدمی ہیں جو اس رول کی ——"

"سفارش میں آئے ہیں، یہی نا کہنا چاہتے ہیں آپ! لیکن سر! سفارش ہی تو اس دور میں صلاحیت کا سرٹیفکیٹ ہے اور پھر یہ میرے کیریر کا بھی تو سوال ہے۔"

"تو آپ کے کیریر کا واسطہ آپ ——"

"جی ہاں، رول نمبر ۴ میں ہی ہوں۔"

"اچھا تو یہ تم ہو۔ بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر! تم نے لکھا ہے اکبر کو طنز و مزاح کی شاعری میں اتنا بلند مقام ہرگز حاصل نہ ہوتا اگر اس کے دربار میں بیربل اور ملا دوپیازہ والی ظرافت کے چٹکلے نہ ہوتے —— اور نظیر اکبر آبادی ایک بلند پایہ شاعر تھے ہیں، اعلیٰ درجہ کے نثر نویس بھی تھے۔ انہیں اردو ناول نگاری کا بابا آدم کہا جاتا ہے۔ توبۃ النصوح اور مراۃ العروس ان کے بہترین ناول ہیں —— بھئی خوب! تم نے مطالعہ اور تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے؟"

"سر! دیکھئے نا، بات دراصل یہ ہے کہ ——"

"بات دراصل کچھ بھی ہو، میں نے کبھی کسی کے ساتھ کوئی رعایت کی ہے نہ کروں گا۔ جتنے نمبروں کے حقدار ہوگے اتنے نمبر تمہیں مل جائیں گے۔"

"لیکن سر! میرا یہ پرچہ بے حد خراب ہوا ہے۔ اگر اس میں ہائیسٹ مارکس نہ ملے تو ——"

"ہائیسٹ مارکس! تمہارا دماغ تو صحیح ہے؟"

"سر! اگر آپ کے پرچے میں مجھے ہائیسٹ مارکس نہ ملے تو میں ٹاپ کیسے کروں گا؟"

"غضب خدا کا! تم ٹاپ کرنے کی سوچ رہے ہو، گویا تمہیں یہ خوش فہمی بھی ہے۔"

"مجھے یقین ہے۔ اس لئے کہ دوسرے پرچوں میں مجھے ہائیسٹ مارکس ہی ملیں گے۔"

"لیکن کس طرح؟"

"جس طرح آپ مجھے ہائیسٹ مارکس دیں گے۔"

"تم بے حد بدتمیز معلوم ہوتے ہو۔ کان کھول کر سن لو، میں کبھی کسی سفارش کو خاطر میں نہیں لاتا۔"

"تو سر! مجھے ریسرچ اسکالرشپ کیسے ملے گا؟ وہ تو ٹاپ ہی کرنے والے کو ملتا ہے۔"

"خدارا، تم اردو ادب پر یہ احسان نہ کرو۔ تم پہلے ہی کافی داد تحقیق دے چکے ہو۔ اکبر اور نظیر کی روحیں تمہارے نام کے قصیدے پڑھتی ہوں گی۔"

"تو میں مایوس ہو جاؤں سر؟"

"کیا اب بھی تمہیں شک ہے؟ میں کسی کی حق تلفی نہیں کر سکتا۔ یہ میرا اصول ہے۔ مجھے خدا کے ہاں منہ دکھانا ہے۔"

# نامہ بر

## معراج انور

مکان ۴-۲-۶۵۴/۱۷، یاقوت پورہ۔ حیدرآباد نمبر ۲۳ (آندھرا پردیش)

محترمی! تسلیمات

....اس قدر افزائی کے لئے ممنون ہوں۔ آپ ہی نے مجھے گمنامی کی پستی سے شہرت و مقبولیت کی بلندی پر پہنچایا۔ "بیسویں صدی" ہی نے مجھے ادبی دنیا سے روشناس کرایا اور قارئین "بیسویں صدی" نے آگے بڑھنے کا حوصلہ بخشا....

نیک خواہشات کے ساتھ !.... مخلص ——— معراج انور

جمال صاحب! سلام خلوص

پہلے تو اس اندازِ تخاطب کے لئے معافی چاہوں گی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ آپ نے جس طرح مجھے "ڈیئر" بنا دیا، میں بھی آپ کو "ڈیئر" کہتی! لیکن جمال صاحب! گھبرایئے نہیں، کبھی نہ کبھی وہ منزل ضرور آئے گی، وہ دن ضرور آئے گا، جب میں آپ کو ڈیئر لکھوں گی۔ جلدی کام شیطان کا! جی ہاں محبت میں جلدی نہ کرنی چاہئے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں، اگر لیلیٰ مجنوں جلدی کر جاتے تو صرف میاں بیوی بن جاتے۔ لیکن اُنہیں تو لیلیٰ مجنوں بننا تھا! سوبن گئے! اور میں بھی پہلے لیلیٰ بننا پسند کروں گی اور آپ مجنوں، اور جب لیلیٰ مجنوں کے ناٹک سے دل بھر جائے تب کچھ اور سوچیں گے!

اچھا اب آیئے اپنے خط کی طرف ———!

بھئی کمال کر دیا ——— کل میں نے اُردو کی کتاب کھولی تو اُس میں آپ کا خط ملا۔ آپ نے یہ خط کب رکھ دیا؟ کیسے رکھ دیا؟ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ بہرحال آپ کے ہاتھ کی صفائی کی داد دینی پڑتی ہے!

آپ کا پورا خط صرف ایک جملہ پر مشتمل تھا ———

'یہ محبت کی ابتداء ہے!'

شاید اسی کو سمندر کو دریا میں بند کر دینا کہتے ہیں۔ اس چھوٹے سے جملے نے آپ کو یہ خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن میں سوچ رہی ہوں یہ محبت کی ابتداء کس طرح ہوئی؟ آپ نے مجھ میں کیا دیکھا جو ایک دم محبت کی ابتداء کرنے پر مجبور ہو گئے! میں یہ جاننے کی خواہش مند ہوں!

میں آپ کو بہت سی باتیں لکھنا چاہتی ہوں۔ اگر پہلے ہی خط میں اتنی ساری باتیں لکھ دوں تو آپ بھی کیا سوچیں گے ——— بڑی باتونی نکلی کالج میں چپ چپ رہنے والی لڑکی! تو اب اجازت چاہوں؟

——— انجم

---

ڈیئر انجم! سلام اُلفت

تمہارا خط پورے ایک ہفتہ کے بعد ملا، ہاں ڈیئر! کل میں نے کمپاس بکس کھولا تو اُس میں تمہارا خط ملا۔ تمہارے نازک سے ہاتھوں کا لکھا ہوا پیارا سا خط!!

تمہارا خط کئی بار پڑھا اور لطف لیتا رہا ——— کاش! میں نے اُسے اُسی دن پالیا ہوتا جس دن تم نے اُسے کمپاس بکس میں رکھا۔ ڈیئر! جب تم نے کمپاس بکس میں خط رکھا تو کسی اشارے سے بتا دیا ہوتا کہ خط اُس میں رکھا ہے۔ ملنا ہوں ہمارا کالج میں ملنا اور باتیں کرنا مشکل ہے۔ لیکن خط کی تاخیر، اُف! ——— تمہاری طرف سے خط نہ پاکر میں سمجھا میری محبت کی ابتداء ہی انتہا بن گئی! اور تم نے پہلے خط کو آخری خط بنا دیا! میں مایوس ہو گیا تھا۔ لیکن آج تمہارا خط

ڈیر انجم! اسلام خلوص

مجھے خط لکھو یا نہ لکھو میں تو ہمیشہ تمہیں ڈیر لکھوں گا اور اُس دن کا انتظار کروں گا جب میں تمہارے سامنے "ڈیر" بن جاؤں گا۔

تم نے مجھے کمتر کیوں سمجھ لیا ——؟ انجم! پھول کو پھول ہی کہا جاتا ہے حسن کو حسن کہنا کوئی حسن ایسا بھی ہوتا ہے جو بے مثال ہوتا ہے جیسے تمہارا حسن بھی بے مثال ہے!

تمہیں ادیب پسند ہیں، میں بھی کچھ لکھ لیتا ہوں ——— اپنا ایک افسانہ "فیصلہ" بھیج رہا ہوں۔ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ میری تخلیق کو کتنا پسند کرتی ہیں، مجھے کتنا چاہتی ہیں!

انجم! یہ سوال بڑی عجیب بات معلوم ہوتی ہے! اپنے دل کی دھڑکنیں سننے کا اتفاق ہوا ——— جانتی ہو کیا ہوا ——؟ میری دھڑکنوں میں تمہاری ہی آواز تھی! ایسا کیوں ہو رہا ہے انجم! میرے دل کی دھڑکنیں کہاں گئیں۔ کہیں تمہارے دل میں تو نہیں ——؟ اپنے دل کی آواز سن کر بتانا!

اُمید ہے تم جواب کے لئے انتظار نہ کراؤ گی۔

تمہارا ——— جمال

---

جمال صاحب! آداب و نیاز

عنایت نامہ ملا تھا اور ساتھ ہی افسانہ "فیصلہ"۔ کیا کہنے! افسانہ بہت پسند آیا۔ مختصر اور خوبصورت افسانہ! افسانہ پڑھ کر خوب صورت یادیں جاگ گئیں۔ ایک ادیب کی، ایک افسانہ نگار کی ——— واقعی ایک اچھا ادیب ہی اچھے افسانے لکھتا ہے۔

میرے دل کی دھڑکنیں آپ کی دھڑکنیں تو نہیں البتہ ایک افسانہ نگار کے دل کی دھڑکنیں ہیں۔ کیونکہ مجھے ادیب پسند ہیں، آپ بھی تو افسانہ نگار ہیں [illegible] اپنی تخلیق کب بھیج رہے ہیں؟ ہمارے خطوط پہنچا کر عفو بہت خوش ہے۔ کل آپ کی بہت تعریف کر رہا تھا، شاید آپ بھی اُسے خوش رکھنے کا خیال رکھتے ہیں۔

اب اجازت دیجئے گا۔ روز بروز امتحان کا بھوت قریب آ رہا ہے!

——— انجم

---

ڈیر انجم! اسلام شوق

اُمید ہے مزاج بخیر ہوگا اور مزاج بخیر ہی ہے کیونکہ تم ہمارے کالج

# انگڑائیاں

یوں تو کہتے ہیں جسے وہ ہے تبسم تیرا
جس کو کہتے ہیں قیامت تیری انگڑائی ہے ——— ناصر

اللہ اللہ عشق کی رعنائیاں
حسن خود لینے لگا انگڑائیاں ——— جگر مرادآبادی

انگڑائیاں بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ ——— نظام رامپوری

مجھ کو دونوں پہ پیار آتا ہے
شوق میرا تمہاری انگڑائی ——— شہود عابدی

تم پھر اُسی ادا سے انگڑائی لے کے ہنس دو
آ جائیگا پلٹ کر گذرا ہوا زمانہ ——— شکیل بدایونی

مرسلہ:- کوثر صدیقہ تعلقہ شاہ پور ضلع گلبرگہ

آسی ہو انجم [illegible] کالج میں بدنامی کا ڈر نہ ہوتا تو میں تم سے پوچھتا کیا بات ہے، مجھ سے کیا خفا ہو [illegible] خط کیوں نہیں لکھ رہی ہو ——؟ اور بہت ساری باتیں کرتا، اپنے دل کی باتیں!

میرے دو خط اور ساتھ ہی دو افسانے "کلائمکس" اور "گلاب کی پنکھڑی" ملے ہوں گے۔ اب یہ تیسرا خط اور ایک افسانہ "ایک خط ایک کہانی" حاضر ہے۔ خدارا جواب دو۔ ورنہ تمہارا جمال تمہاری یاد میں تڑپ تڑپ کر مر جائے گا! مانا کہ امتحان قریب ہے۔ لیکن کچھ وقت نکال کر خط میں صرف اتنا لکھ دو ——— "جمال میں اچھی ہوں، تمہارے افسانے ملے، تمہاری خیریت اور میرے افسانے ملنے کی اطلاع کافی ہے۔ بس سمجھوں گا مجھے سب کچھ مل گیا! میرے دل کا چین، میری تمام آرزوئیں! انجم! تم کہانیاں پسند کرتی ہو، تمہاری ہی خاطر میں اتنی محنت سے کہانیاں لکھتا ہوں تاکہ تم مجھے پسند کرو، میری کہانیوں کو پسند کرو۔

تمہارے خط کا آرزومند ——— جمال

---

مجاہد جمال صاحب اسلام خلوص

آپ کا افسانہ "فیصلہ" ملنے کی اطلاع میں دے چکی تھی پھر آپ کے

[illegible] سے بہت سلام کہو۔ کہو کب آ رہے ہو؟ میں انتظار کروں گی۔ [illegible] کہانی لکھی؟ تمہاری طرح تمہارے افسانوں کا بھی انتظار [illegible]

تمہاری صرف تمہاری ——— انجم

---

پیاری انجم! سلام محبت

تمہارا خط ملا ——— مزاج اچھا ہی ہے۔ گھر نہ آنے کی وجہ؟ کچھ آفس [illegible] مصروف رہا۔

تم نے ایک عجیب بات بتائی یعنی [illegible] جمال کے بارے میں۔ لیکن میں جو تمہیں بتانے والا ہوں وہ سن کر تم حیران رہ جاؤ گی۔ اتفاق در اتفاق اِسی کو کہتے ہیں!!

[illegible] جمال کو میں جانتا ہوں۔ ہمارے گھر کے قریب ہی رہتا ہے۔ ایک دن گھر آیا اور کہا

"شاہد بھائی! کوئی محبت بھرا خط لکھ دو!"

میں نے کہا ——— "کسے لکھ رہے ہو ——— ؟"

"ایک لڑکی کو ——— !"

"وہ تو میں جانتا ہوں، لڑکی ہی ہوگی، میرا مطلب ہے کیا نام ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ کیسی ہے؟"

"[illegible] ——— نام کے سوا میں کچھ نہیں بتا سکتا ——— اور نام ہے انجم!"

"انجم ——— !!" مجھے تم یاد آگئیں!

"ہاں جمال بھائی! انجم ——— !"

"کچھ اور بتاؤ گے ——— ؟"

"جمال بھائی! بات یہ ہے وہ افسانہ نگاری کو پسند کرتی ہے اور میں افسانے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا! ایک سطر بھی نہیں لکھ سکتا ——— اور ——— اور جمال بھائی میں ڈرتا ہوں کہیں آپ ہی اُس تک نہ پہنچ جائیں!"

[illegible] میں نے دل میں سوچا ——— "یہ نہیں جانتا میرے دل میں بھی کوئی انجم بستی ہے!"

پھر میں نے کہا ——— "بتاؤ کیا چاہتے ہو ——— ؟"

اُس نے کہا ——— "ایک محبت بھرا خط لکھوا دو اور اپنا کوئی افسانہ [illegible] اُسے اپنا بنا کر اُسے رام کر سکوں، شیشے میں اُتار سکوں!"

میں نے کہا ——— "میں خط دیکھ کر اُس کا جواب لکھوا دیتا ہوں!"

اُس نے ایک خط نکال کر دیا ——— لکھنے کے انداز سے مجھے شک ہوا کہیں تمہارا تو خط نہیں؟ لیکن تمہارا کیونکر ہو سکتا ہے؟ پھر میں نے اُسے ایک خوبصورت سا جواب لکھوا دیا ——— اور اپنا ایک افسانہ بھی نقل کرنے کی اجازت دے دی۔ اِسی طرح جب بھی خط آتا، وہ میرے پاس اُس کا جواب لکھوانے ضرور آتا اور میرا ایک افسانہ نقل کر کے لے جاتا۔ یہ سب پڑھ کر تم تعجب کر رہی ہوں گی اور ہنس رہی ہوں گی۔ انجم! تم نے اچھا کیا کہ اُس سے اِمتحان کے بعد تک خط لکھنے سے معذرت چاہی۔ اب خاموش ہی رہو۔ چند دنوں محبت کا بخار رہے گا، پھر اُتر جائے گا۔ اُسے میرے بارے میں بتاؤ گی تو وہ شرمندہ ہو جائے گا اور اُسے شرمندہ کرنا بُری بات ہے، تمہارا کیا خیال ہے؟

انجم! حقیقت میں تو میں نے تمہیں اور تم نے مجھے خط لکھے اور بیچارہ جمال بیچ میں "نامہ بر" کا رول ادا کرتا رہا!

میں جلد ہی آؤں گا۔ یہی باتیں ہم لطف لے لے کر پھر کریں گے۔

تمہارا ——— شاہد جمال

---

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ (منیجر [illegible])

---

SANFORIZED
چھاپ والے کپڑوں کی برآمدگی میں ۱۲۵ فیصدی اضافہ

# غزلیں

## ...ذکی

...کو حُسنِ نظر بھی نہ کریں
...بات ہے اُن کا ذکر بھی نہ کریں؟

ماتم نظمِ گلستاں کی اجازت نہ سہی
ذمہ دارانِ گلستاں کو خبر بھی نہ کریں؟

...الفت میں ہر اک موڑ پہ آئی یہ صدا!
...منزل ہو نظر میں تو سفر بھی نہ کریں

منزلیں دور سہی، راستے دشوار سہی
چل پڑے ہیں تو کوئی خوف و خطر بھی نہ کریں

اہلِ گلشن کو شکایات کا حق ہے لیکن
...نظمِ چمن زیر و زبر بھی نہ کریں

کیا ستم ہے کہ جو محروم ہیں فیضِ گل سے
شکوۂ تنگیٔ دامانِ نظر بھی نہ کریں

...نالے تو ہیں شکوے ہیں ہمارے اے دل
...حقائق سے مگر صرفِ نظر بھی نہ کریں

## ثریا پروین جاشی

اُس کی تقدیر کا پوچھنا کیا
جس کو دردِ محبت خدا دے

کھل اُٹھیں دل کی پژمردہ کلیاں
تو اگر زیرِ لب مسکرا دے

کچھ نہیں ہے تو اپنے ہی ہاتھوں
زہر ہی آکے مجھ کو پلا دے

اُس سے پوچھو محبت کی لذت
غم کے عالم میں جو مسکرا دے

جس میں جنت نظر آئے ساقی
پھر وہی جامِ رنگیں پلا دے

ہر قدم اک مقامِ امتحاں کا
ہائے رے یہ محبت کے جادے

اُن کی محفل میں اکثر ثریا
مجھ کو جانا پڑا بے ارادے

## جام نعیمی خواجہانپوری

گو زمانے کے لئے غیر ہیں، بیگانے ہیں
یہ شرف کم تو نہیں، ہم ترے دیوانے ہیں

اِن کی نظروں سے کوئی بات نہیں ہے مخفی
محرمِ رازِ دو عالم ترے دیوانے ہیں

کر دیا عشق نے رُسوائے زمانہ مجھکو
ایک دُنیا کی زباں پر مرے افسانے ہیں

سوچتے ہیں کسے دُنیا میں کہیں اب اپنا
جن کو اپنا کبھی سمجھا تھا، وہ بیگانے ہیں

کل جو میخانہ کی حالت تھی وہی آج بھی ہے
وہی ٹوٹے ہوئے شیشے وہی پیمانے ہیں

توبہ پھر لرزہ بر اندام ہوئی جاتی ہے
پھر گھٹا چھائی ہے پھر رقص میں پیمانے ہیں

جام وہ پا نہیں سکتے کبھی معراجِ جنوں
عظمتِ جیب و گریباں سے جو بیگانے ہیں

...مہاراج (ہوتے ہیں) اشتعال میں آگئے اور فلک شگاف نعرے
...

...چوپٹ ناتھ کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے!!"
...مشتعل ہجوم پر بدمعاش بھرکم داس نے ایک اور جلتی ہوئی مشعل
...ایک لاکھ مظلوم اور مفلس انقلابی جنتا مہاراج کے محل کا رُخ
...شاہی جبر و ستم پر جمہوریت کی آخری ضرب ہوگی —— ساتھیو!
ہمیں مہاراج چوپٹ ناتھ سے کوئی ذاتی کد نہیں۔ ہمیں تو بچے کچھے شاہی نظام
کی ...ہے۔ یہ شاہی محل عوام کی جائداد اور ملکیت ہے! اس کی اینٹیں
ہماری ...ہیں۔ ہم انھیں توڑنا نہیں چاہتے۔ آپ مجھے حکم دیجئے کہ میں ایک
لاکھ عوام کی مقدس آواز کو ساتھ لے کر شاہی محل میں گونجا دوں۔"
...گونجا دی جائے؟ مقدس آوازوں نے حکم دیا۔
...حکم دیجئے کہ مہاراج کو آخری موقع دیا جائے؟"

"...دے دیا جائے!"
اس جلسے کی ساری رپورٹ گیدڑ جنگ نے نمک مرچ لگا کر ہمارے سامنے
پیش کی اور ہم سے ایک وارنٹ گرفتاری پر دستخط کروا لئے کہ دیش اور رعایا
کے محافظ اعلیٰ مہاراج چوپٹ ناتھ جمہوریت کو فاسسٹ ہاتھوں سے بچانے
کے لئے غدار بھرکم داس کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا جائے۔"
وارنٹ پر دستخط کرنے کے بعد ہمارا دل اس دُنیا سے اُکتا گیا۔ جی
چاہا چوری چھپے محل سے نکل کر بن باس چلے جائیں۔ جہنم میں جائے یہ جمہوریت
اور اس کے جہنم ...نا! یہ بے ایمان لیڈر —— اپنی اس اُکتاہٹ کا اظہار ہم
چھوٹی رانی سے کرنے ہی والے تھے کہ دربان نے آکر اطلاع دی: "بھرکم داس
حضور سے شرفِ ملاقات کا متمنی ہے۔"
ہم حیران ہو گئے۔ کیا وہ ہمارے بجھتے ہوئے چراغ کو آخری پھونک
مارنے آیا ہے؟ ہم نے اُسے اندر آنے کی اجازت دے دی لیکن ہماری حیرت
کی کوئی حد نہ رہی۔ جب آتے ہی اُس نے ہمارے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔ پانچ مزید
سر اور پانچ لاکھ روپے کی ایک تھیلی بھی ہمارے قدموں پر آن گری۔
ہم نے کہا: "بھرکم داس! یہ کیا ہے؟"
وہ ...ے زخمی ...کی طرح کراہ کر بولا: "مہاراج! میں آپ کا قدیمی
نمک حلال ہوں۔ آپ کی زندگی خطرے میں ہے! غنیم آپ کو قتل کرکے خود
راج گدی پر قبضہ کرنے کی نیت رکھتا ہے!"
ہم نے استفسار کیا: "مگر یہ پانچ لاکھ روپے کس لئے ہیں؟"

برادرم خوشتر صاحب! تسلیم
گرامی نامہ باعثِ تعجب ہُوا۔ یہ غزل اِس سے قبل "بیسویں صدی"
میں کبھی نہیں شائع ہوئی۔ یہ صریحاً جھوٹ ہے۔ جن حضرات نے یہ شکایت
کی ہے اُن سے کہئے کہ "بیسویں صدی" کا وہ شمارہ مع سال بتائیں اور مبلغ
سو روپے کا انعام مجھ سے وصول کریں
تعجیلِ خاطر وامعنو عنی نہادادا است کے روپ میں یہ
غزل شاعروں، قوالوں اور ریڈیو آرٹسٹوں میں ضرور مقبول ہے۔
"بیسویں صدی" میرا محبوب مجلہ ہے اور اس محبوب کو محبوب تر
بنانے کی سعی میں میں گذشتہ اٹھارہ بیس سال سے آپ کا شریکِ کار ہوں۔
اس دوران میں میری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ اپنے بہترین غیر مطبوعہ
اشعار "بیسویں صدی" ہی کی نذر کر دوں —— اگر آپ مناسب خیال فرمائیں
تو میرے اِس وضاحتی خط کو چھاپ سکتے ہیں۔ خدا حافظ!
آپ کا ہمدم دیرینہ
امرت لعل عشرت

اُس نے پانچوں آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔ (جو منہ سے ہوئے تھے)
"یہ پانچ لاکھ روپے اِن پانچ نمک خواروں کی پیش کش ہے۔ یہ سوداگر زادے ہیں۔
جب انھیں معلوم ہوا کہ راجکمار کا جشن منانے کے لئے مہاراج اپنی پرجا سے
گڑگڑا کر مالی امداد کی اپیل کر رہے ہیں تو یہ کانپ اُٹھے اور مجھے اپنے ساتھ
کھینچ کر یہاں لے آئے۔ حالانکہ مہاراج! میں جانتا تھا کہ میرے وارنٹ گرفتاری
جاری ہو چکے ہیں۔ لیکن مہاراج! آپ مجھے بے شک جیل میں ڈال دیجئے لیکن یہ
پانچ لاکھ روپے ضرور قبول فرما لیجئے۔"
یہ کہہ کر بھرکم داس کا گلا بھر آیا۔ اُن پانچوں نمک خواروں کے گلے بھی
بھر آئے۔ اُن کی دیکھا دیکھی ہمارا گلا بھی بھر آیا اور ہم نے بے اختیار بھرکم داس کو
گلے سے لگا لیا۔ اپنی پہلی بے وقوفی پر پچھتائے اور اپنے سکریٹری خاص کو بُلا کر
دو نئے فرمان جاری کئے۔ ایک بھرکم داس کو پھر وزیرِ اعظم کے عہدے پر فائز
کرنے کا اور دوسرا گیدڑ جنگ کو دھوکا دینے کے جرم میں قید کرنے کا!
بن باس کا پروگرام منسوخ کر دیا گیا اور اُس کی بجائے راجکمار کے جشن کا
پروگرام منانے کا فیصلہ کر دیا گیا۔ کیونکہ اُن نمک خواروں نے عرض گزاری کہ یہ
پانچ لاکھ روپے تو جشن کی صرف ابتدائی قسط کے اخراجات کے لئے دیئے گئے
ہیں۔ پورے جشن کے اخراجات بھی ہم ہی ادا کریں گے۔ جمہوری نظام سے ہم

[illegible] یہ سطور ہم لکھ رہے ہیں۔ رات کے گیارہ بجے ہیں۔ صبح کا [illegible] شروع ہونے لگا؟ ہم کچھ نہیں جانتے۔ ابھی ابھی بڑی رانی نے [illegible] ہے کہ چھوٹی رانی بھی محل سے بھاگ گئی ہے۔ شک ہے کہ وہ بھی [illegible] کے ساتھ ہی گئی ہے —— ہنہہ! ورکر کی بچی!

ہم بڑی رانی کو گلے لگا کر بہت دیر تک چھوٹی رانی کی یاد میں روتے رہے۔

## جشنِ ولادت کی دھوم ——•

[illegible] کا اندیشہ تھا وہی ہوا۔ راجکمار بھرت دیو کا جنم دن [illegible] و احتشام سے منایا گیا۔ صبح سب سے پہلے چھوٹی رانی نے ہمیں مبارکباد دی۔ ہم نے حیرت ظاہر فرمائی اور غیر حاضری کا سبب پوچھا۔ وہ بولی "میں دھن [illegible] ... ایک فلمی گانے کی ریکارڈنگ دیکھنے گئی تھی۔" ہم نے خوش ہو کر چھوٹی رانی کو اعزاز بخشا یعنی اُس کے ہاتھ پر بوسہ عنایت فرمایا۔ اُس کے بعد راجکمار بھرت دیو کو زرق برق طلائی لباس پہنا کر لایا گیا۔ جس پر ہوائی جہازوں سے پھولوں کی بارش کی گئی۔ اُسے مبارکباد اور نادر تحفے دئے گئے۔ [illegible] کی ایک چنگیزی کمان، جاپان کا ایک ریشمی غالیچہ۔ ایک زمیندار نے اُسے پچاس [illegible] میں بھینٹ کی۔ (ایک دوسرے زمیندار نے ہمیں بھڑکایا کہ وہ زمین [illegible] دریا برد ہو چکی ہے۔ لیکن ہم بھڑکے ہی نہیں) ایک رئیس نے ایک دستاویز بھینٹ کی جس کی رو سے راجکمار اُس کی کھانڈ ساز ملوں کا آدھا مالک بن گیا۔ اس کے علاوہ طلائی کھلونے، طلائی پستول، طلائی تلواریں، طلائی زرہ بکتر۔ غرض بے شمار تحفے دئے گئے۔ پروفیسر شیتل داس نے راجکمار کو ایک قلم بھینٹ کیا اور کہا: بڑے ہو کر راجکمار کے زورِ قلم کی دھوم مچے گی اور وہ بہت بڑا شاعر [illegible]

[illegible] ہوا کہ عوام ہمارے راجکمار کو کوئی تحفہ دینے نہیں آئے۔ [illegible] نے ہمیں مطمئن کر دیا کہ جن امیروں اور رئیسوں نے راجکمار [illegible] عوام ہی کی کمائی تھے، اس لئے ان تحفوں کو بھی [illegible]

رات کو عوام کی دعوت سے ہمارے محل میں چراغاں کیا گیا اور عوام [illegible] کی [illegible] سے [illegible] دی گئی۔ مدعوین نے جی بھر کر بادہ نوشی کی اور کھانا کھایا۔ یہاں تک کہ ان کے کتوں اور ڈھیوں نے بھی پیٹ بھر کر کھایا اور پھر [illegible] سرشار ہو کر ایک دوسرے کی بیویوں کے ساتھ رقص کیا۔ ہم

نے بھی جی بھر کر داس کی موٹی بیوی کے ساتھ رقص کیا اور اپنی خوشی کو دوآتشہ کیا۔

اس جشن میں صرف ایک افسوسناک سانحہ ہوا کہ ایک شاعر گمنام نامرادآبادی کو پیٹا گیا۔ اُسے پچاس روپیہ دے کر جشن کے لئے ایک نظم لکھوائی گئی تھی۔ لیکن اُس بیچارے کی نظم کسی نے نہ سنی۔ اداس ہو کر اُس نے ہم سے فریاد کی کہ مہاراج میرے ساتھ ایک فوٹو کھنچوائیں۔ ہم نے نشے میں رضامندی ظاہر کر دی۔ لیکن جب فوٹو کھنچنے ہی لگا تھا کہ ہمارے ایک وزیر نے شاعر کو کان سے پکڑ کر مارا پیٹا اور باہر نکال دیا اور ہمیں کہا: "مہاراج! یہ شاعر ایک فراڈ ہے۔ آپ کے فوٹو کو رعایا میں جا کر فروخت کرے گا جس سے رعایا میں آپ کی تذلیل ہوگی۔"

ہم نے وزیر سے اتفاق ظاہر کیا لیکن شاعر پر رحم بھی آیا کیونکہ ہم بھی تو کبھی کبھی شاعری کیا کرتے تھے۔

ہمارے ذاتی خزانچی نے اطلاع دی کہ جشن پر حضور کے پانچ لاکھ روپے خرچ ہو گئے ہیں اور پندرہ لاکھ کے تحائف وصول ہوئے ہیں۔ چھوٹی رانی نے حساب لگا کر بتایا کہ تحائف سولہ لاکھ کے تھے۔ ایک لاکھ کے تحفے خزانچی ڈکار گیا ہے۔ ہم نے چھوٹی رانی کو سمجھایا کہ تو یوں کہیں میں ایک لاکھ کی ہیرا پھیری معمولی بھی ہے اور لازمی بھی۔

آج ہم رعایا کے نام ایک تقریر براڈکاسٹ کریں گے جس میں راجکمار کا جشنِ ولادت منانے پر رعایا کا شکریہ ادا کریں گے۔

---

**مضمون نگار حضرات** سے درخواست ہے کہ [illegible] لکھا کریں اور دو سطروں کے درمیان [illegible] ہے [illegible] چھپنے رہ جاتے ہیں [illegible] کے مضمون کے [illegible] ہے اپنے پاس مضمون کی نقل [illegible] شائع کرنے جاتے ہیں [illegible] کے ساتھ [illegible] اپنا پتہ لکھا ہوا [illegible] ٹکٹ [illegible]

---

سال رواں کا بہترین، معیاری اور دلچسپ ناول

**پتھر کا گلاب** جس میں نفسیاتی، رومانی اور سماجی حقیقتوں کی بڑی فنکاری کے ساتھ عکاسی کی گئی ہے [illegible] عورت کے کردار کا نہایت بھیانک رخ پیش کرتا ہے [illegible] قیمت [illegible]

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۱

میک اپ میں

# اوراقِ پریشاں

ایم۔ ایچ خان شاہجہاں پوری

محمود اللہ صاحب (پتال والے) ۳۰۵ ترین جلال نگر، شاہجہاں پور (یو۔پی)

مکرمی و محترمی! خلوص و نیاز

.....ایک حقیقت کو افسانہ کا روپ دے کر پیش کر رہا ہوں۔ شاید پسند آئے۔ افسانے کی ابتدائی ہی سطور سے افسانے کے معیار کا فیصلہ نہ کریں۔ افسانہ جذباتی ضرور ہے۔ لیکن کہیں بھی فحش اور معیار سے گرے ہوئے جملے نہ ملیں گے۔ ہر لحاظ سے افسانے کو اس انداز سے تراشا گیا ہے کہ "بیسویں صدی" کے ستھرے بلند معیار کے مطابق ہو ـــــ ہمیں پوری اُمید ہے کہ آپ نے اسے شرفِ قبولیت بخشا تو قارئین حضرات سے بھی شرفِ پسندیدگی حاصل کرے گا۔ خصوصیت سے بلند کردار مشرقی لڑکیاں، جو ایسے دَور سے گذرنے کا ارادہ رکھتی ہوں یا خدانخواستہ گذر رہی ہوں، وہ اِس افسانے سے سبق حاصل کریں۔ ہر کام وقت پر ہی مناسب ہوتا ہے اور کوئی کام وقت کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے کیا جائے [illegible] جاتا ہے ـــــ پیشِ خدمت افسانہ ایک ایسے ہی حادثہ کا عکاس ہے۔

مخلص ـــــ ایم۔ ایچ خان

★

جنونِ شوق کا حاصل نہ تم سمجھے نہ ہم سمجھے
کہاں دونوں کی ہے منزل نہ تم سمجھے نہ ہم سمجھے

لمحہ لمحوں میں بکھر کے رات آدھی سے بھی کچھ زیادہ بیت چکی تھی۔ ہر طرف بیکراں سناٹا پھیلا تھا۔ ماحول کے سینے پر سیاہی اور سکوت کا پرچم لہرا رہا تھا۔ لیکن میرے دل میں آتش فشاں کے پہاڑ سے پھٹتے معلوم ہو رہے تھے۔ میں اس طرح پلنگ پر پڑا تھا [illegible] کے دامن پر بدنما داغ ہوں! ایک غلیظ اور گھناؤنا داغ!

بستر پر بچھی ہوئی سفید چادر کی شکنیں صاف بتا رہی تھیں کہ میں نے [illegible] بے شمار کروٹوں سے اسے بار بار کچلا ہے۔ میرے ذہن اور ضمیر کے درمیان [illegible] کشمکش برپا تھی جیسے جنگ و جدل کے میدان میں بم پھٹ رہے ہوں ـــــ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان ذہنی تفکرات کی یلغار سے میرا دماغ پھٹ [illegible] ریزہ ہونے والا ہے ـــــ اور میرا ننگِ انسانیت وجود اس [illegible] [illegible] پھٹ جائے گا۔ آنکھوں میں ندامت کی [illegible] [illegible] دہکتی ہوئی بھٹی کی طرح آتش فشاں تھیں [illegible]

میں اب بھی جاگ رہا تھا۔ جیسے میری آنکھوں کو اب کبھی [illegible]

اور نیند آتی بھی کیونکر ـــــ یہ ضمیر کی برداشت سے باہر چبھن [illegible]، یہ جلن، یہ تپش، یہ تڑپ بھلا چین لینے دیتی۔ ایک طوفان تھا جو گزر چکا تھا لیکن اپنے ایسے نقش چھوڑ گیا تھا جو میرے وجود ہی کو ڈسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بلکہ ڈس رہے تھے!

"کاش ایسا نہ ہوا ہوتا!" میں خود سے کہنے لگتا۔ "لیکن جو کچھ ہو چکا ہے اُسے نظر انداز بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ اُس کے نقش بھی تو زندگی کے دامن سے مٹانا ممکن نہیں ہے!"

کبھی میں دل ہی دل میں عاصمہ سے گلہ کرنے لگتا۔ "عاصمہ! تم نے مجھے کہیں کا نہ رکھا! ایسا رُوسیاہ کیا ہے کہ زندگی بھر خود کو خود کے سامنے سُرخرو نہیں پا سکتا ـــــ اور تا حیات اُس کی تلافی بھی ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ تم نے مجھے وہ [illegible] جو میری راہ نہ تھی۔ تم خود بھی بہکیں اور مجھے بھی لغزش پر مائل کر دیا۔ [illegible] کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے! مناسب کیا ہے، نامناسب کیا ہے! ہم اسی دُنیا میں رہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ زندگی کی راہوں پر چلنا ہے۔ پھر اس کے اصولوں سے ہم کیوں پھرے؟ کیوں ہم اپنی رو میں اتنا آگے بڑھ گئے

[illegible] سامنے ہی کہتا تھا کہ میں کل صبح اُس کی موجودگی سے الجھن [illegible] کے سامنے [illegible] پر نظر پڑ گئی اور میں اُلٹے پاؤں واپس آگیا۔ لیکن آخر اس بے تعلقی اور بے اعتنائی کے سمندر میں کہاں تک میں خود کو ڈوبنے سے بچا سکتا۔

اور ایک دن ـــــ وہ ایک سرد ترین صبح تھی۔ امی گھر پر نہ تھیں۔ جمعہ کا دن تھا۔ عاصمہ تراد کے ساتھ ہی سوئی تھی۔ مجھے پتہ نہ تھا۔ جمعہ کی وجہ سے تراد کو صبح ہی اسکول جانا تھا اس لئے وہ منہ اندھیرے اُٹھکر باورچی خانے میں ناشتہ تیار کرنے چلی گئی تھی اور میں اپنی خواستہ پان کھانے کی غرض سے اُس کمرے میں چلا گیا تھا۔ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا تھا میری نگاہ عاصمہ پر پڑی تھی۔ ایک لمحے کو میری نگاہ میں ارتعاش آگیا تھا۔ یوں تو وہ سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھے تھی۔ لیکن اُس کا ایک ہاتھ لحاف کے باہر نکلا ہوا تھا۔ گورا گورا ہاتھ اور اُس میں سیاہ کانچ کی منقش چوڑیاں، جیسے چاند کی شعاع سے ناگنیں لپٹی ہوں۔ سمجھ نہ جانے کیوں [illegible] اور میری نگاہ اُس کے خوبصورت ہاتھ پر ٹھہر کر رہ گئی تھی ـــــ اور میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ کی ہتھیلی اس انداز سے کھلی تھی جیسے وہ کچھ مانگ رہی تھی۔ پھر مجھے نہ جانے کیا سوجھی تھی کہ میں نے اُس کی ہتھیلی پر چھالی کے چند دانے رکھ دیئے تھے۔ پھر میں فوراً اُلٹے پاؤں کمرے کے باہر آگیا تھا۔ اچھی طرح یاد ہے مجھے اس واقعہ اتنی سردی کے باوجود پسینہ آگیا تھا۔ کمرے سے نکلتے وقت میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ عاصمہ نے فوراً کروٹ بدل لی تھی، جس کا مطلب تھا وہ جاگ رہی تھی اور دانستہ ہاتھ پھیلائے تھی۔

یہاں سے میری بے تعلقی کا پہلا قدم تھا ـــــ اور میں نے اُسی وقت یہ بھی محسوس کیا تھا کہ [illegible] قدم [illegible] آگے بڑھ گئے تھے اور میرے [illegible] میں نے دانستہ کبھی ایسے حالات [illegible] کوشش کی تھی کہ اب وہ سامنے پڑے [illegible] گیا تھا [illegible] ایک دن میں کمرے میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔ [illegible] بج چکے ہوں گے۔ [illegible] شاید سب سو گئے تھے۔ اُسی وقت میں نے کمرے کے باہر ایک آواز سُنی۔ وہ آواز عاصمہ کی تھی ـــــ [illegible] اور [illegible] کو کھل جائے گا“

[illegible] آواز [illegible] اُس کے [illegible] اس وقت کوئی دیکھنے [illegible] گئے تھے جلدی سے گلوری اُٹھا کر میری ماں نے شکریہ ادا کیا اور میں دالان میں کھڑے کھڑے عاصمہ کی سرگوشی محسوس کرنے لگی۔ غنیمت تھا کہ دالان میں زیادہ روشنی نہ تھی جو میں صاف صاف اُس کا چہرہ دیکھ سکتا۔ چند لمحے بعد اُس نے دوبارہ ”شکریہ“ کہا تھا اور چلی گئی تھی۔

پھر ایک دن ـــــ اُس دن بھی رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے کمرے ہی میں سے تراد کو آواز دیکر پان مانگا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد میں نے دروازے کے پاس عاصمہ کی آواز سُنی تھی ـــــ ”لیجئے پان!“

میں کچھ حیرت سے چونک پڑا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا تھا ـــــ

”تراد پان لے کر کیوں نہ آئی؟“

”وہ سو گئی ہے!“

”تو پھر پان کی ایسی ضرورت بھی کیا تھی۔ جو تم چلی آئیں۔ ناحق تکلیف کی ـــ!“

”آپ نے پان مانگا تھا۔ میں لے آئی۔ تکلیف کیسی بات کی؟“

”تو پھر یہاں لاکر میز پر رکھ دو۔ [illegible] تو تراد سے کیوں مانگتا۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا تھا۔

وہ چند لمحے کے پس و پیش کے بعد پان لے کر کمرے میں چلی آئی تھی۔ میں اسی طرح سر جھکائے لکھتا رہا تھا اور وہ پان کی تھالی میرے سامنے میز پر رکھ کر چلدی تھی۔ میں نے شکریہ کہا تھا تو وہ چند قدم چل کر کمرے کی دہلیز کے پاس ٹھٹک کر بولی تھی ـــــ

”آپ مجھے شرمندہ کیوں کرتے ہیں؟ آپ عورت کو اتنی پست کیوں سمجھتے ہیں؟ آپ کے افسانوں میں بھی عورت کی بے وفائی اور جور و ستم کا ذکر ہی ہوتا ہے۔ مجھے آپ کی یہ بات پسند نہیں ہے۔ سب عورتیں ایک سی تو نہیں ہوتیں کسی کو آزما کر دیکھا ہوتا!“

”میں نے سب عورتوں کے بارے میں افسانے کہاں لکھے ہیں۔ لیکن چند کے بارے میں لکھے ہیں وہ یقیناً ایسی ہی ہوں گی۔ قلم کبھی جھوٹ نہیں بولتا عاصمہ!“

”آپ بھی سچے ہیں، آپ کا قلم بھی سچا ہے ـــــ باقی سب جھوٹ ہے“ [illegible] اس لہجے میں کہی تھی کہ میں اُس کی طرف دیکھنے کے لئے مجبور ہو گیا تھا۔ [illegible] میری نگاہ اُس پر جا پڑی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ آج پہلی بار میں نے اُسے نظر بھر کر دیکھا تھا۔ پھر نگاہ ہو گئے

اُس لمحے میں نے پہلی بار محسوس کیا تھا — وہ مجھے بہت اچھی لگنے لگی تھی۔ بہت دیر تک میں اُس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ مختلف زاویوں سے اُسی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اُس کے خیال نے میرا ذہن بکھیر دیا تھا۔ لیکن پھر میں نے بہت جلد اُن خیالات کا گلا گھونٹ دیا تھا اور لکھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

سردی دم توڑ رہی تھی، موسم گرما کی آمد آمد تھی۔ گھر کے سب لوگ کمروں سے نکل کے دالان میں سونے لگے تھے۔ لیکن میں اب بھی کمرے ہی میں سوتا تھا کیونکہ دالان میں ترانہ کے ساتھ عاصمہ سوتی تھی۔ ایک دن میں حسبِ معمول منہ اندھیرے اُٹھا تھا۔ کمرے کے باہر نکلا تھا تو

---

- (اللہ کو ماننے کے بعد) بہترین دانائی انسانوں سے محبت کرنا ہے۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- بلند ہمتی ایمان کی علامت ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- خدا بلند امور کو پسند، اور چھوٹے کاموں کو ناپسند کرتا ہے۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- دولت مند پر حسد نہ کرو، دولت کی لذتیں فانی و عارضی ہیں۔
(حضرت ادریس علیہ السّلام)
- خدا کے خوف سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے، شر پسندوں کی عمر کم ہو جاتی ہے۔ (حضرتِ سلیمان علیہ السّلام)

---

سب سے پہلے میری نظر عاصمہ پر پڑی تھی۔ شاید وہ سو رہی تھی۔ میں نے پہلی بار سوتے ہوئے حسن کی پُرکشش شگفتگی کے تاثر کے بارے میں سوچا تھا — حسن جو تصنع اور بناوٹ سے پاک فطری جاذبیت سے بھرپور تھا۔ کئی لمحے تک میں مسحور سا کھڑا اُسے دیکھتا رہا تھا۔ اُس کا ہاتھ اُس دن بھی کچھ مانگنے کے انداز میں کھلا تھا — اور میں بلا ارادہ بیلے کے پودے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ پھر میں نے چند پھول توڑے تھے اور لا کر عاصمہ کے کھلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دئے تھے۔ پھول میں نے قصداً اس کے ہاتھ پر اس انداز سے رکھے تھے کہ میری اُنگلیاں اُس کی اُنگلیوں سے مَس ہو جائیں اور جیسے ہی میری انگلیاں چھوئی تھیں عاصمہ کی اُنگلیوں نے میری انگلیوں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ یہ ایک دم غیر متوقع طور پر ہو گیا تھا۔ میں نے گھبرا کر اپنی انگلیوں کو چھڑانے کے لئے معمولی سی جدوجہد کی تھی۔ لیکن اس نے میری انگلیوں کو چھوڑا دیا تھا۔ پھر جانے کیوں میرا جی چاہا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑے رکھے۔ پھر اُس نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول دی تھیں۔ عاصمہ کی آنکھوں میں، میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔ اُن دریا جیسی آنکھوں میں کیا نہیں تھا — اُمڈتی ہوئی گھٹاؤں کی سیاہی، چھلکتے ہوئے آبشاروں کا ترنم، سمندر کی سی اتھاہ گہرائی اور جیسے رومانی افسانے کی جذباتی عبارت۔ وہ خاموش تھی، میں بھی خاموش رہا تھا۔ مجھے بس ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے شرابِ ناب پلا رہی ہے — اور میں مدہوش ہوتا جا رہا ہوں۔ مجھے ہوش اُس وقت آیا تھا جب ترانہ نے سوتے میں کروٹ بدلی تھی۔ عاصمہ نے فوراً میرا ہاتھ چھوڑ کر اپنا چہرہ چادر سے چھپا لیا تھا اور میں وہاں سے ہٹ آیا تھا۔ اس کے بعد عرصہ تک کوئی حادثہ پیش نہ آیا تھا۔

میری شادی کی بات عرصے سے چل رہی تھی۔ پھر بات پایۂ تکمیل کو پہونچ کر منگنی کی رسم تک پہونچ گئی تھی۔ اُسی دن عاصمہ شام کو میرے کمرے میں بہت بے تکلفی سے آگئی تھی۔ ترانہ اور امی کہیں گئی ہوئی تھیں۔ میں لکھ رہا تھا اور ایک دم اُسے اپنے سامنے کھڑی دیکھ کر چونک پڑا تھا۔ اُس نے کہا تھا، میں آپ کو پریشان کرنے نہیں آئی ہوں۔ صرف منگنی کی مُبارکباد دینے آئی ہوں۔ میری دُعا ہے کہ خدا کرے آپکی بیگم چاند تاروں سے زیادہ حسین ہوں، پروانوں سے زیادہ وفا پرست اور بلبل سے زیادہ والہانہ محبت کرنے والی! آپ دونوں ساری زندگی مسرور و شادماں رہیں — اور آپ دونوں کے حصّے میں اگر کوئی غم ہو تو خدا کرے وہ میرے دامن میں آجائے۔"
وہ کہتی گئی، میں اُس کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکا تھا۔ وہ فوراً چلی گئی تھی — اور میں نے محسوس کیا تھا، آخری جملہ کہتے کہتے اُس کی آواز میں ارتعاش آگیا تھا۔ اُس کے قدموں کی چاپ سے میں نے اپنی سانسوں میں ایک چبھن سی محسوس کی تھی اور میں سوچنے لگا تھا، میں بھی کتنا سنگدل ہوں کہ اُس کی منگنی کی رسم پر جو کچھ ہی دن پہلے ادا ہوئی تھی، میرے منہ سے مُبارکباد کے دو بول بھی نہ نکلے تھے۔ پھر بات آئی گئی ہو گئی تھی اور میں نے اُس کے بارے میں زیادہ نہ سوچا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے ذہن پر حاوی ہو جائے۔

اس طرح وقت کا کارواں کچھ اور آگے بڑھ گیا تھا۔

کل کی رات غضب کی رات تھی — میری زندگی کی ایک انقلاب بکنار رات! مجھے تند سیاہیوں کے اندھیرے میں دھکیلنے والی بھیانک رات!

کل ہی تو سب کچھ ہوا ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے یہ صدیوں پُرانی بات ہے۔ جیسے جنم جنم کا کوئی بچھڑا ہوا!

کل رات میں نے کمرے میں کچھ گرمی محسوس کی تھی اور رات کو دالان میں سونے کے لئے لیٹ گیا تھا۔ عاصمہ بھی دالان ہی میں سو رہی تھی۔ دالان کے ایک سرے پر میں اور دوسرے سرے پر عاصمہ سو رہی تھی۔ عاصمہ سے ذرا فاصلہ پر امّاں کا پلنگ پڑا تھا۔ میں رات کے گیارہ بجے تک پڑھتا رہا تھا۔ پھر کمرہ بند کر کے جب سونے کو بستر پر گیا تھا تو عاصمہ بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی اور ساتھ ہی کراہ بھی رہی تھی۔ اُسے بار بار چھینکیں آ رہی تھیں۔ آج شام ہی سے میں نے سُنا تھا کہ اُسے نزلے کی شکایت ہے۔ اُسے کافی تکلیف تھی میں نے اُسے نظر انداز کر کے سو جانے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے نیند نہ آئی تھی، نہ جانے کیوں؟ شاید اس وجہ سے کہ عاصمہ کو جو تکلیف تھی اُسے میرے دل نے بھی محسوس کیا تھا ——— اور برابر محسوس کر رہا تھا۔

بارہ ——— ایک ——— دو بج گئے تھے۔ وہ اب بھی جاگ رہی تھی۔ کروٹیں بدل رہی تھی۔ کراہ رہی تھی۔ میں بھی کروٹیں بدل بدل کے جاگ رہا تھا۔ سب سو رہے تھے۔ پھر مجھ سے رہا نہ گیا تھا۔ میرے کمرے میں نزلے کی گولیاں رکھی تھیں۔ میں چپکے سے اُٹھا تھا۔ کمرہ کھولا تھا اور گولیاں لے کر دھڑکتے دل اور دبے پاؤں سے عاصمہ کی طرف چل دیا تھا کہ کوئی جاگ نہ پڑے اور ہمدردی کا غلط افسانہ بن جائے۔ یہ سوچتے سوچتے میں عاصمہ کے پلنگ کے پاس پہونچ گیا تھا۔ میں نے آہستہ سے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اُس کا ماتھا بخار سے پھنک رہا تھا۔ بہت دیر تک میں ہاتھ یونہی رکھے رہا تھا۔ وہ جاگ رہی تھی لیکن کچھ بھی نہ بولی۔ پھر اُس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تھا اور مُسکرانے کی کوشش کر کے کہا تھا

"آپ کیوں آ گئے؟"

"اپنے اِس دل سے مجبور ہو کر جسے قدرت نے گوشت اور خون سے بنایا ہے کسی پتھر سے نہیں۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" اُس نے پھر مُسکرا کر کہا تھا "شکریہ! مزاج پُرسی کا!"

دوسرے ہی لمحے اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا اور بولی تھی "بہت درد ہو رہا ہے!"

"کہاں؟"

"یہاں!" اُس نے میرا ہاتھ لے جا کر اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر رکھ دیا تھا ——— اور مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میرا ہاتھ نادانستہ انگاروں پر پڑ گیا ہے! آنچ، جلن، تپن اور چُبھن ——— نہ جانے کیا کیا مجھے محسوس ہوا تھا لیکن اِس کے ساتھ ہی اُن دھڑکنوں میں کچھ ایسی فرحت و آسودگی بھی محسوس ہوئی تھی کہ میں نہ جانے کیوں اپنا ہاتھ ہٹا نہ سکا تھا۔ میں کتنی دیر اُس کے پاس بیٹھا تھا مجھے اِس کی بھی خبر نہ تھی۔ مجھے ہوش نہ تھا کہ میں جن انگاروں کے کھیل سے لطف اندوز ہو رہا تھا، ہوش آنے پر اُن کی جلن تڑپا تڑپا دے گی ——— اور میں ایک نشہ میں سرشار ہوتا چلا گیا تھا۔ مجھے ہوش اُس وقت آیا تھا جب بلّی نے الماری میں رکھی دودھ کی دیگچی پھینکی تھی اور سب لوگ جاگ پڑے تھے۔ اپنے ہی گھر میں میں چوروں کی طرح چل کے بستر تک آیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کئی پل تک میری سانس میرے سینے پر ہتھوڑے برسا تی رہی تھی۔ میں نے اُس پر قابو پانے کی جتنی کوشش کی تھی وہ اور بھی مجھے بے قابو کرتی گئی تھی۔ پھر سانس قابو میں آئی تھی تو میں نے وہی محسوس کیا تھا جو کسی گہری چوٹ کے ٹھنڈی پڑنے پر کیا جاتا ہے ——— اور وہ چوٹ جو ضمیر پر لگی ہو! میرے ضمیر نے چٹکیاں لے لے کر مجھے ساری رات جگایا تھا۔ مجھے ساری رات نیند نہ آئی تھی ——— اور عاصمہ نے بھی کروٹیں بدل بدل کے سحر کی تھی۔

صبح جب میں نے بستر چھوڑا تھا تو میری کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ پپوٹوں میں بھی سوزش تھی اور سر پر پچھلی رات کی ذرا سی لغزش کا بوجھ بھاری پتھر کی طرح رکھا ہوا معلوم ہو رہا تھا ——— برداشت سے باہر بوجھ اور دن میں نے کس عالم میں کاٹا تھا یہ میرا دل ہی جانتا ہے اور اب پھر وہی بھیانک سیاہ رات آ گئی تھی ——— عاصمہ آج بھی وہیں لیٹی تھی۔ میرا پلنگ بھی اُسی جگہ پڑا

---

- تعلیم کا مقصد انسانی علم میں اضافہ کرنا ہی نہیں ہے، اِس کا مقصد انسانی ذہن کی تشکیل ہے۔ (ڈاڈ ڈیک)
- مرد آنکھ ہے تو عورت اُس کی بینائی ہے، مرد پھُول ہے تو عورت اُس کی خوشبو ہے۔ (سقراط)
- پریشانی دُور کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اپنے کو کسی تعمیری کام میں مصروف رکھو۔ (جیمز رسل)
- تعلیم کا مقصد مثالی انسان کی تکمیل ہے۔ (چینی مفکر)
- کاش لوگ اپنے حق پر راضی رہیں اور انصاف انھیں عزیز ہو جائے۔ (نکے خسرو)

---

تھا۔ کافی رات گئے جاگنے کے باوجود مجھے نیند نہ آرہی تھی۔ ایک آگ
تھی جو میرے سراپا کو جلا رہی تھی ——— ندامت کی آگ جو میرے وجود کے گرد
شعلہ زن تھی، جو میرے وجود کو راکھ کر ڈالنا چاہتی تھی۔ ضمیر کی آواز چیخ چیخ کر
کچھ کہتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

کیوں تو نے قدم ایک بے بس لڑکی کی طرف اٹھائے؟ کیوں اُس کا ہاتھ
اپنے ہاتھ میں لیا؟ کیوں تو نے ضمیر سوز عمل کیا؟ عاصمہ کسی اور سے منسوب ہے
——— پھر کیا حق تھا تیرا اس کے ساتھ یہ؟ یہ سچ ہے کہ اس لغزش میں عاصمہ کی
نیت کو بھی دخل تھا، حالات کے اُلٹ پھیر نے تم دونوں کو قریب کیا، باتوں سے تیرے دل
میں بھی عاصمہ کے لئے کچھ محبت کے جذبات کو جنم دیا تھا، لیکن محبت کا یہ
تقاضہ تو نہیں کہ ضمیر کو پس پردہ ڈال دیا جائے، محبت لغزش تو نہیں سکھاتی۔
پھولوں کی شگفتگی سب کو اپنی طرف مائل کر سکتی ہے، لیکن ہر پھول چھونے
اور توڑنے کا حق کسی کو نہیں ہو سکتا۔ پھر کیوں تو نے ایسا کیا؟ یہ اخلاق و
ضمیر کے خلاف ہے۔ تیری اس لغزش کو دنیا تو کیا خدا بھی معاف نہ کرے گا؟
میں کانپ اُٹھا تھا۔ میرے دل و دماغ پر کوئی ہتھوڑے برسا رہا
تھا۔ پھر میں عاصمہ کی طرف سے منہ پھیرے چپکے سے اپنے بستر پر جا کر لیٹ
گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے عاصمہ نے کروٹ بدل لی تھی ——— اور اس کی چوڑیاں
ترنم خیز آواز میں کھنک اٹھی تھیں۔ میرے کانوں میں شہد سا ٹپکتا ہوا محسوس
ہوا تھا ——— اور پھر ضمیر کی چیخیں نہ جانے کہاں جا کر مر گئی تھیں۔ میں نے
کروٹ بدلتے عاصمہ کے پلنگ پر غیر ارادی طور سے دیکھ لیا تھا۔ بالکل
اُس کے سامنے ہلکی روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ اُس کے گرد دو چار پتنگے دیوانہ
وار منڈلا رہے تھے۔ بلب سے سر پھوڑ رہے تھے ——— ذرا سی روشنی سے محبت
کے لئے ——— میں بھی تو سر پھوڑ رہا تھا ——— تکیہ سے، ضمیر کی چوکھٹ پر!
عاصمہ نڈھال سی پڑی تھی۔

میں نے اپنی آنکھیں پھیر لیں ——— پھر تھوڑی دیر کے بعد میرے گرد
ندامت کی آواز تھی اور ضمیر کی چیخیں۔ میں بستر سے نیچے اُتر رہا تھا۔ سب
سو چکے تھے ——— گہری نیند! عاصمہ اور میں جاگ رہا تھا۔ رات کی سیاہی نے
دونوں کی نیندیں چھین لی تھیں۔ میں نے دو چار لمبی لمبی سانسیں لی تھیں
پھر میرے قدموں کا رُخ عاصمہ کی طرف تھا۔ کئی قدم میں نے تیزی سے
اس کی طرف بڑھائے تھے ——— لیکن پھر نہ جانے کیوں یک بیک میرے
قدم جم سے گئے تھے۔ میں ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ ایک انجانی طاقت نے
اُنہیں باندھ دیا تھا ——— نہ جانے وہ کونسی طاقت تھی؟

میں عاصمہ کی طرف جانے کے بجائے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے لائٹ
آن کی اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ بارہ بج رہے تھے۔ دونوں سوئیاں ہم آغوش تھیں
اور میں پھر نہ جانے کیا سوچنے لگا۔ لیکن پھر میں نے دوسرے ہی لمحے ان
آنے والے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک کاغذ
سامنے رکھا اور پھر قلم پکڑ کر لکھنے لگا ———

"ڈیر عاصمہ! سلامِ شوق ——— بلکہ سلامِ آخر!

لفظ آخر پر تم چونک پڑو گی۔ لیکن یہ حقیقت ہے ——— اور اس کے
ساتھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کو کچھ دن چاہا ہے۔ اس چاہت
نے ہم دونوں کو اندھا کر دیا تھا اور اس چاہت کی اندھیری، پُر خطر راہوں پر
ہم اتنی جلدی کتنی تیزی سے دوڑ پڑے۔ یہ بھول گئے کہ ہمارے راستے جدا ہیں
ہماری منزلیں الگ ہیں ——— اور الگ الگ منزلوں کے راہی ایک ساتھ ایک
راہ پر کیسے چل سکتے ہیں؟ اگر چلنے بھی لگتے ہیں تو بھٹک جاتے ہیں اور یہی ہمارے
ساتھ بھی ہوا۔ ہم بھی بھٹک گئے تھے اور یہ بھول گئے تھے کہ مناسب کیا ہے
نامناسب کیا ہے ——— صحیح کیا ہے، غلط کیا ہے! ہم اس حقیقت کو
کس طرح فراموش کر سکتے ہیں جو ماضی کے دو دُھندلے نقوش سے وابستہ ہے۔
ایک نقش میری زندگی سے لگا ہے کہ میں کسی کا ہونے والا شوہر ہوں! اور دُوسرا
نقش تمہاری زندگی سے وابستہ ہے کہ تم کسی اور کی امانت ہو! کس طرح ان
نقوش کو ہم ذہن سے کھرچ سکیں گے۔ شاید نہیں! پھر کب تک ہم اپنے اپنے ضمیر
پر ضرب کاری کرتے رہیں گے ——— ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے عاصمہ! ابھی ہم
اس راستے پر زیادہ دُور نہیں چلے ہیں۔ ابھی تو صرف چھوٹی سی غلطی کی ہے۔
لیکن آگے چل کر یہ چھوٹی سی غلطی بڑی غلطیوں کو جنم دے سکتی ہے۔ کیوں نہ ہم اس
راستے سے لوٹ آئیں اور بھول جائیں کہ ہم نے ایک مختصر سا سفر ساتھ ساتھ
طے کیا تھا۔ بالکل اسی طرح ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن جائیں جس طرح
کچھ عرصہ پہلے تھے ——— جیسے ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں! ہماری تقدیر
نے ہمارے حالات نے ہمارے ساتھ خوبصورت فریب کیا ہے ——— ہمیں
ایسے مرکز پر لا یا ہے جہاں ہمارے راستے الگ الگ ہیں۔ جہاں اب ہم
زندگی کی راہوں پر ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔

مجھے تمہاری چاہت کا احساس ہے! تمہارے جذبات کا پاس ہے!
لیکن ہم دونوں اپنی اپنی جگہ مجبور ہیں۔ اس لئے میری گذارش ہے کہ مجھے
اب بالکل بھول جاؤ۔ اپنی چاہت کا گلا گھونٹ لو۔ اپنے جذبات کو سماج کے
ضابطوں پر قربان کر دو۔ اس سے تمہیں ذہنی آسودگی حاصل ہوگی۔ میری

[illegible] اپنے ذہن سے بالکل ہی نکال کر دو۔ جیسے وہ دھوکے کھا چکا
ہے ——— مجھے معاف کر دینا۔ میں بہت جلد دوسرا مکان تلاش کر کے
[illegible] چھوڑ دینے کی کوشش کروں گا تاکہ تمہارے منظر سے بھی میں نہ گذروں
[illegible] سکوں۔ خدا حافظ!

بھٹکا ہوا راہی ——— مُحِب

میں نے خط ختم کیا ہی تھا کہ قدموں کی کھٹک مجھے دروازے پر سنائی
دی۔ ماھرہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں گھبرا گیا۔ وہ میرے
پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بھی کچھ پریشان، پریشان سی تھی ——— اُڑی اُڑی
سی۔ اُس کے بال شانوں پر بے ترتیبی سے بکھرے تھے۔ وہ چپ بھی لگی ہیں
[illegible] سینے کے زیر و بم سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ تیز تیز سانسیں لے رہی
ہے۔ کئی لمحے تک وہ مجھے دیکھتی رہی پھر بولی ——— "آپ سوئے نہیں؟"

"میں سونے کو لیٹا تھا لیکن نیند نہ آئی!"

"کیوں؟"

"یہ اپنے دل سے پوچھو۔ تمہیں نیند کیوں نہ آئی؟" میں نے کہا۔ "تم بھی
تو جاگ رہی ہو ——— آخر کیوں؟"

"مجھے بھی کمبخت نیند نہ آئی ——— نہ جانے کیوں! کیا آپ افسانہ
لکھ رہے تھے؟"

"ہاں! افسانہ ہی لکھ رہا تھا، لیکن افسانہ ختم ہو گیا!"

"اتنی جلدی ہی؟"

"کچھ افسانے شروع ہوتے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ دل نہ چاہتے ہوئے
بھی ختم کرنا پڑتا ہے۔ تم ہی فیصلہ کرو، اگر کوئی افسانہ بلا ارادہ بن گیا ہو تو کیا
اُسے جلدی ختم نہ کر دینا چاہئے؟"

"یہ تو افسانے کی نوعیت پر منحصر ہے!" وہ زیرِ لب مسکرا دی۔

"تو پھر یہ افسانہ پڑھ کر فیصلہ کر لو!" میں نے خط اُس کی طرف بڑھا دیا۔

میری انگلیاں کانپ رہی تھیں۔

وہ میرے پاس روشنی کی طرف کھسک آئی اور خط کھول کر پڑھنے
لگی۔ میں نے دوسری طرف منہ کر لیا تاکہ اُس کے چہرے کے تاثرات کو نہ دیکھ
سکوں۔ وہ خط پڑھ رہی تھی اور میں نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔ پھر میری
نگاہ اچانک اُس کی طرف اُٹھ گئی۔ وہ خط پڑھ چکی تھی۔ میں نے اُسے جس
حالت میں دیکھا نہیں کہہ سکتا کہ میں نے کیسے ضبط کیا۔

میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میری گذارش ہے، مجھے معاف
کر دینا ——— اور جو کچھ اِس افسانے میں لکھا ہے، اُس پر عمل کرنا ———
کیا خیال ہے؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک بھرپور نگاہ میرے اوپر اس طرح ڈالی
کہ میں اُس سے نظر نہ ملا سکا۔ پھر اُس نے اپنی مٹھی کو زور سے بھینچ کر خط کو موڑ
ڈالا اور پھینک دیا۔ پھر لڑکھڑاتے قدموں سے تیزی کے ساتھ کمرے سے
نکل گئی۔ میں نہ جانے کتنی دیر اُسی عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر شاید ہی اُٹھ گیا۔ کمرے
کی لالٹین کی لَو کو مدھم کیا اور اپنے بستر کی طرف چل دیا۔ ماھرہ کی سسکیوں
کی آواز آ رہی تھی۔ وہ شاید رو رہی تھی۔

میں نے ایک سرسری سی نگاہ اُس پر ڈالی۔ وہ بستر پر عجیب انداز سے لیٹی
تھی ——— جیسے کسی رومانی داستان کے اوراق بکھرے پڑے ہوں!!

---

خریداران بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد
کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

---

بھرپور
فصل پیدا کیجئے

## غزل

واحد پریمی

...ر گلشن سے کا مٹ جاتے صنم کی صورت
...ل کا نقش نہیں، نقشِ قدم کی صورت

...لت بیمار پہ بھاری ہے کہیں تارِ نفس
...ٹ جائے نہ ترے قول و قسم کی صورت

...کشورِ جو ایتنا مگر ہوش رہے
...جام چھلکے نہ کبھی دیدۂ نم کی صورت

کون ہے جس سے ہمیں پیار کے دو بول ملیں
آج کے لوگ ہیں پتھر کے صنم کی صورت

...ہم سا بد قسمت زمانے میں کوئی کیا ہوگا
ہم کو خوشیاں بھی ملیں درد و الم کی صورت

...ے پرستوں نے جلائے جو عقیدت کے چراغ
شامِ میخانہ بھی صبحِ حرم کی صورت

...فکر و احساس کی آنچوں سے پگھل کر واحد
...شل شمشیر ہوئی اپنے قلم کی صورت

## غزل

مس غزالہ اشفاق

اُمید کچھ دلائی ہے پھر چشمِ یار نے
ہم پھر سے زندگی کو چلے ہیں سنوارنے

یوں دل نہ توڑنا تھا تجھے اے نگاہِ ناز
دیکھا تھا کس اُمید سے اُمیدوار نے

اب تو خزاں پہ بھی نہ رہا کوئی اعتماد
کیا کیا فریب ہم کو دیئے ہیں بہار نے

غمخوار نے تو اور بھی غمگین کر دیا
ہم اپنے دل کا بوجھ گئے تھے اُتارنے

وہ بے بلائے آپ کے ہمراہ آگئی
میں زندگی کو جا ہی رہی تھی پکارنے

کیسا گلہ، کہاں کا گلہ، مختصر یہ ہے
"ہونٹوں کو سی دیا نگہِ شرمسار نے"

ہر پھول ایک شعلہ ہے ہر غنچہ اک شرر
گویا چمن میں آگ لگا دی بہار نے

## غزل

عشرت پروین ہاشمی

وہی تو صحنِ چمن میں بہار لائے ہیں
خزاں میں رہ کے بھی جو پھول مسکرائے ہیں

مرے رفیق مری سادگی پہ طنز نہ کر
کہ کچھ سمجھ کے ہی میں نے فریب کھائے ہیں

رہِ حیات میں بکھری ہے غم کی دھوپ تو کیا
ہمارے ساتھ تری آرزو کے سائے ہیں

میں جس بھی راہ سے زندگی سے گزری ہوں
قدم قدم پہ خوشی کے پیام آئے ہیں

جنہیں اَدائے تبسم سکھائی تھی میں نے
مجھی پہ آج وہی پھول مسکرائے ہیں

اُنہیں کے دم سے ہے ساقی وقارِ میخانہ
جو بے پیے تری محفل میں ڈگمگائے ہیں

اُٹھیں ہزار جفاؤں کی آندھیاں عشرت
ہم اپنے دل میں چراغِ وفا جلائے ہیں
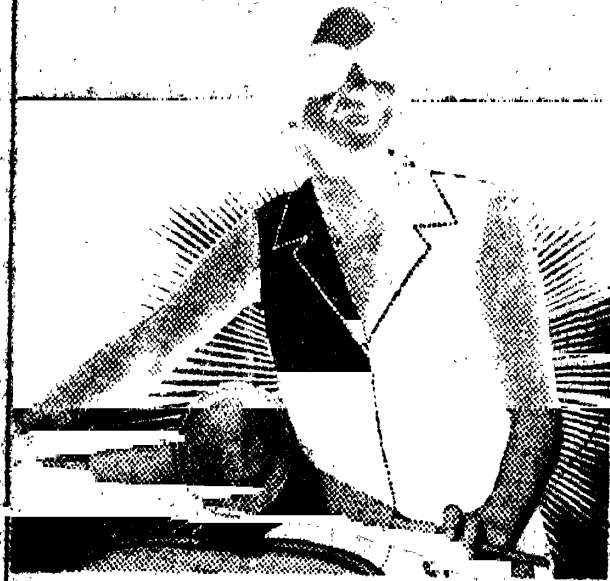
سپر سرف ہوں میں بار بار کے تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ برابری کے دعوے دار پاؤڈروں کی دُھلائی کے مقابلے میں، سپر سرف سے کپڑے کہیں زیادہ سفید دُھلتے ہیں۔
سپر سرف آپ کے کپڑوں کو ایسی بے داغ سفیدی بخشتا ہے جسے دیکھ کر دوسروں کو رشک آئے۔
کام چلاؤ پاؤڈر آپ خریدیں ہی کیوں؟
خریدیے تو ہندوستان کا بہترین پاؤڈر: سپر سرف۔

**سپر سرف سے کپڑے سب سے سفید دُھلتے ہیں**

(نیل یا فلورو کی ضرورت نہیں)

ہندستان لیور کی ایک اعلیٰ پیداوار

# صحت و زندگی

## ا۔ آلو ـــ بطور غذا اور دوا

یہ سبزی لذیذ بھی ہے اور بے حد مفید بھی۔ اس کا مزاج سرد و خشک ہے۔ بعض ڈاکٹروں کی رائے میں اس کا مزاج گرم ہے۔

تجربات کے بعد ڈاکٹروں کا فیصلہ ہے کہ ـــ "آلو بہترین غذاؤں میں سے ہے۔ آلو میں فولاد، کیلشیم، پوٹاشیم اور فاسفورس کافی مقدار میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ میگنیشیم، سوڈیم، گندھک، کلورین، آیوڈین، پروٹینز، تانبہ اور وٹامنز اے، بی اور سی بھی کافی مقدار میں ہوتا ہے۔ یہ چیزیں انسان کے جسم کی تعمیر و بقا کے لئے ضروری ہیں، اس لئے آلو نہایت فائدہ بخش غذا ہے۔"

بلا مبالغہ اس میں جسم کی تعمیر کرنے اور قوت و حرارت پیدا کرنے والے اجزاء کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ آلو بہت مقوی غذا ہے۔ صرف آلو کھا کر ہی انسان پورا طاقت ور اور تندرست رہ سکتا ہے۔ بعض سائنسداں کہتے ہیں کہ "ایک پونڈ آلو میں ایک پونڈ گوشت کے برابر مقوی اجزاء پائے جاتے ہیں۔"

آلو صرف بہت عمدہ غذا ہی نہیں بلکہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کی دوائی بھی ہے۔ اس کے استعمال سے یورک ایسڈ کی تیزی کم ہو جاتی ہے۔ پتھری کی حالت میں صرف آلو کی خوراک ہی پتھری کو کم کر دیتی ہے بشرطیکہ آلو کے ساتھ دن میں کم از کم تین چار سیر پانی روزانہ پیا جائے۔ اس طرح پتھری تحلیل ہو کر پیشاب کے ذریعہ خارج ہو جاتی ہے ـــ بعض ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ گردے کی پتھری میں صرف آلو کا زیادہ استعمال ہی پتھری کو توڑ کر خارج کر دیتا ہے۔

آلو میں فولاد اور کیلشیم بھی ہے اور چونکہ آلو نسبتاً ارزاں چیز ہے اس لئے یہ مقوی چیزیں اس سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ آلو میں معدنی نمک اور مختلف وٹامنز بھی دوسری سبزیوں کی نسبت بہت زیادہ ہیں جو بچوں کی نشوونما کے لئے بہت ضروری ہیں۔ اس لئے آلو بچوں کے لئے بہت مفید اور مقوی غذا ہے اور دودھ پینے والے بچوں کے لئے تو آلو کا شوربہ بے حد مفید ہے ـــ آلو کو ایک ایسی غذا کا ذخیرہ سمجھنا چاہئے جو موٹاپا کرتا ہے۔ اس لئے موٹے آدمیوں کے لئے آلو بہت مضر ہیں۔

آلوؤں سے پوری غذائیت حاصل کرنے کے لئے انھیں چھلکے سمیت اتنی دیر پانی میں اُبالا جائے کہ نرم ہو جائیں اور اُن کا چھلکا آسانی سے اتارا جا سکے۔ آلوؤں کو چھلکے سمیت اُبالنے سے اُن کی غذائیت کم ضائع ہوتی ہے، بلکہ محفوظ رہتی ہے۔ آلو چھلکے سمیت پکائے جائیں تو وہ قبض کشا ہوتے ہیں۔

آلو کے چھلکے میں معدنی اجزاء و فاسفورس، فولاد، پوٹاش، سوڈیم اور دیگر معدنی نمک بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے آپ آلو چھیل کر ہرگز استعمال نہ کریں۔ ورنہ آپ آلوؤں کے مفید اجزاء سے محروم ہو جائیں گے۔

کاٹ کر اُبالنے سے آلوؤں کے بہت سے غذائی اجزاء بالکل ضائع ہو جاتے ہیں۔ آلوؤں کو صرف اتنے پانی میں اُبالنا چاہئے کہ وہ جذب ہو جائیں۔ آلوؤں کو اُبال کر رکھ چھوڑنے سے بھی اُن کی افادیت کم ہو جاتی ہے۔ اس لئے آلوؤں کو تازہ بہ تازہ اُبال کر فوراً استعمال کر لینا چاہئے۔

کچھ لوگ آلوؤں کو باریک تراشنے کے بعد گھی یا تیل میں تل کر بھجیہ بنا کر کھاتے ہیں۔ یہ بھجیہ بہت لذیذ ہوتی ہے، لیکن اس طرح تمام وٹامنز ضائع ہو جاتے ہیں۔

آلو ریاح پیدا کرتے ہیں۔ یہ طبی اصول ہے کہ جو غذائیں ریاح پیدا کرتی ہیں وہ مقوی باہ ہوتی ہیں۔ آلو بادی اور بلغم بھی پیدا کرتے ہیں۔ اس لئے آلوؤں کی سبزی میں گرم مصالحے بہت ضروری ہیں۔

آلوؤں کے ساتھ چاول ہرگز استعمال نہ کریں۔ اس سے غذا میں تیزابیت بڑھ جاتی ہے جو مختلف امراض کا باعث ہوتی ہے ـــ انتڑیوں کی سوزش، جگر کی خرابی، درد گردہ، درد ریاح، گنٹھیا اور جلندھر کے امراض میں آلو بطور غذا اور دوا بہت مفید ہیں۔ اس کے استعمال سے یورک ایسڈ خارج ہو جاتا ہے۔

آلو بطور غذا استعمال کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ جس پانی میں آلو اُبالے جائیں اُس میں وٹامنز کی بھاری مقدار ہوتی ہے اُسے ہرگز پھینکنا نہیں چاہئے۔

نرودھ استعمال کیجئے
صرف 5 پیسے خرچ کرکے آپ اپنے کنبے کو محدود رکھنے کی طاقت حاصل کرسکتے ہیں

[illegible]

س۔ آپ اس وقت اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار کسے سمجھتے ہیں؟

ج۔ کرشن چندر کو۔ کرشن چندر اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں۔

سلیم احمد

[illegible]